نسل در نسل چلنے والے انتقام کی رُوداد
چاند کے قیدی
سیما غزل

ذاتی صفحہ

اس سے پہلے کہ آپ اس دلچسپ، حیرت خیز اور دہشت انگیز کتاب کا
العہ شروع کریں، میں اس کتاب کی مصنفہ سیما غزل کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ
ے ادارے سے وابستہ ہیں۔ اُن کی یہ پُراسرار داستان بھی ادارے ہی کے ایک جریدے 'سچی کہانیاں'
ں سلسلہ وار شائع ہوتی رہی ہے۔

یہ سطور اُن کا رسمی تعارف نہیں کہ اب وہ ادبی حلقوں میں خاصی جانی پہچانی قلم کار ہیں اور
عری کے حوالے سے بھی اپنا مقام بنا رہی ہیں۔ افسانہ نگاری اور شاعری انہیں اپنے والد مرحوم جناب شیب حزیں
ورثے میں ملی ہے جو ریڈیو پاکستان میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اور سیما نے بھی لکھنے کا آغاز
یو ہی سے کیا تھا، پھر وہ رسائل و جرائد میں لکھنے لگیں اور جب میرے ادارے سے 'سچی کہانیاں' کا اجراء
، میں آیا تو وہ اس سے وابستہ ہوگئیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہمیں ان کی صلاحیتوں کو جلا ملی تو یہ مبالغہ
نہ ہوگا۔

کچھ عرصہ 'سچی کہانیاں' میں کام کرنے کے بعد انہیں ادارے کے دوسرے ماہنامے 'دوشیزہ'
، انہوں نے قسط وار ناول لکھنا شروع کیے تو اُن سے 'سچی کہانیاں' کے لئے بھی پُراسرار اور مافوق
فطرت واقعات پر مشتمل ایک قسط وار ناول لکھنے کے لئے کہا گیا۔ اس فرمائش کی تکمیل میں انہوں نے
ند کے قیدی' تحریر کیا اور اتنے خوبصورت انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا کہ ہر قسط کے ساتھ قارئین کا
س اور اشتیاق بڑھتا چلا گیا۔ 'چاند کے قیدی' کی یہ کتابی شکل اسی اصرار کا نتیجہ ہے۔ اب یہ کتابی
، میں ادارہ 'گل قریش لائبریری' لاہور شائع کر رہا ہے۔

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں تو بے جا نہیں ہوگا کہ 'دوشیزہ' اور 'سچی کہانیاں' کے محترم
ن 'دوشیزہ' میں قسط وار شائع ہونے والے ناولوں کو بھی کتابی شکل میں شائع کرنے پر اصرار کیا ہے۔
، اس فرمائش کی تکمیل بھی جلد از جلد پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میرا نام ذ فار الحسن ہے مگر اب تو میرا نام خود مجھے بھی اجنبی لگتا ہے' لوگ مجھے شاہ جی کہتے ہیں۔

میں عام زندگی کی نرم و ملائم حقیقتوں اور لطافتوں کو ترستا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ نیند کسے کہتے ہیں اور سکون کیسا ہوتا ہے۔ ٹھہریئے میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو دادا کی طویل و عریض حویلی میں کھیلتے کودتے پایا تھا۔ میں اس وقت یقیناً خوش و خرم تھا اور عام سی زندگی گزار رہا تھا مگر آج مجھے اپنی وہ کیفیت یاد نہیں' کاش میرا حافظہ اس کیفیت اور اس پرسکون زندگی کو اپنی دسترس میں لا سکے۔ میں نے تو پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ میری سماعتیں عذاب آوازوں کی گرفت میں آگئیں۔ وہ پہلی چیخ جس نے میرے حواس چھین لیے تھے' دادی اماں کی تھی میں انھی کے پاس سویا کرتا تھا۔ دادی اماں مجھے بے پناہ چاہتی تھیں شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ان کا اکلوتا پوتا' میرے ابا بھی اکیلے ہی تھے اسی لیے پورے خاندان نے مجھے ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا وہ دن مجھے پوری طرح یاد ہیں مگر ان دنوں سے کچھ پہلے والی نرمیاں' ملائمتیں اور لطافتیں یاد نہیں۔

امروہہ کے محلہ قریشی کی یہ طویل و عریض حویلی سارے علاقے میں مشہور ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ شہرت میرے پر دادا تھے۔ سنا تھا کہ وہ بڑے اللہ والے اور پہنچے ہوئے آدمی تھے مگر ان کے مخالف کہتے تھے کہ ان کے قبضے میں کوئی جن تھا جس کے ذریعے انھوں نے کسی ہندو لڑکی کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکی انھیں حاصل تو نہ ہو سکی البتہ وہ عذابوں میں پڑ گئے۔ اس ہندو لڑکی نے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی۔ جس روز اس نے اپنی جان دی اس روز چاند کی چودھویں تاریخ تھی اور کہتے ہیں پھر ہر ماہ جب چاند کی چودھویں تاریخ ہوتی اور چاند کا عکس کنویں کے پانی پر جھلملا جاتا تو میرے پر دادا پر گویا عذاب اتر آتا تھا۔ اس رات یوں لگتا جیسے وہ صبح اپنے کمرے میں مردہ پڑے ملیں گے مگر ہر دوسری صبح وہ بے ہوش ملتے اور جب چاند پر زردی چھاتی وہ ہوش میں آجاتے۔ گویا چڑھتا چاند ان کے لیے عذاب اور ڈھلتا چاند زندگی کی نوید بن جاتا۔ پردادا مرزا دولت بیگ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے متعلق ہزاروں داستانیں مشہور تھیں۔ یہ بھی کہ وہ بہت عاشق مزاج تھے اور یہ بھی کہ ان جیسا جلاد صفت آدمی اس صدی میں کوئی نہ تھا۔ یہ تضاد کیوں کر تھا یہ تو میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے گھرانے پر انھی کی وجہ سے عذاب نازل ہوئے۔ شاید یہ اتفاق سمجھا گیا کہ میرے دادا اور میرے والد چودھویں تاریخ کو ٹھیک اس لمحے میں پیدا ہوئے جب چاند کا عکس کنویں کے پانی پر جھلملایا اور پھر میری پیدائش بھی عین اسی لمحے میں ہوئی۔ اس میں کیا راز تھا یہ کوئی نہ جان سکا لیکن جس روز میں پیدا ہوا اسی روز میرے پر دادا کی موت واقع ہوئی۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ ان کی لاش جب کمرے سے نکالی گئی تو اس میں اتنا تعفن تھا جیسے کئی روز پرانی لاش میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انھیں غسل دیے بغیر دفنا دیا گیا کہ انھیں غسل دینے پر کوئی آمادہ نہیں تھا۔

جب مجھے ہوش آیا اس وقت تک پر دادا مرزا دولت بیگ کی داستانیں قصہ پارینہ تو نہیں بنی تھیں مگر ان کی بازگشت کم ہو گئی تھی پھر ان کا ذکر ویسے بھی گھر میں کم ہوتا تھا کہ کہیں ہم بچوں کے کانوں میں نہ پڑے' اگر کوئی باہر سے کچھ سن کر آتا اور سوال کرتا تو بھی گھر کے لوگ اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیتے اور حتی الامکان کوشش کرتے کہ ہم میں سے کوئی زیادہ دیر تک باہر نہ رہ سکے۔ ویسے کہا جاتا تھا کہ میرے پر دادا کی موت کے بعد میرے خاندان والوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

میں اس وقت شاید چھ یا سات برس کا تھا جب دادی کی چیخ نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے پرسکون بچپن کا آخری دن تھا۔ میں کیونکہ دادی کے پاس سو رہا تھا اس لیے خوف سے پاگل ہو گیا شاید میں اندھا ہو گیا تھا اور ان کی ہولناک چیخ نے میرے حواس گم کر دیے تھے۔ مجھے ہوش نہیں رہا تھا جب ہوش آیا تو پتا چلا کہ دادی کا انتقال ہو چکا ہے۔ پورے گھر پر عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا لوبان اور کافور کی خوشبو کے علاوہ ایک عجیب سی کراہیت آمیز بدبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ علاقے کے جتنے لوگ بھی میت پر آئے تھے جلد ہی واپس چلے گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ پوری حویلی اس روز بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ دور دور تک بچھی ہوئی چاندنیاں خالی پڑی تھیں گھر کے لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے سب کے چہرے فق تھے۔

جلتی ہوئی اگربتیوں کا دھواں بے پناہ گاڑھا ہو کر پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اسی کمرے کے ایک کونے میں ایک تخت پر دادی اماں کی لاش رکھی تھی۔ بہت دور کے کمرے میں خاندان کی چند عورتیں یعنی میری پھوپیاں' چچیاں اور بہن قرآن خوانی کر رہی تھیں۔ اماں سپارہ لیے دادی اماں کے کمرے کے دروازے پر کھڑی قرآن پڑھ رہی تھیں میں انھی کے پہلو سے لگا کھڑا تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے اماں کو بڑی زور کا دھکا دیا ہو۔ اماں قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا گریں مگر اس دوران انھوں نے سپارے والا ہاتھ اس طرح اوپر اٹھا لیا تھا کہ اس کی بے حرمتی نہ ہو سکی۔ ان کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ نکلی مگر وہ سیدھی ہوتے ہی پھر سپارہ کھولے' آیتیں پڑھتی ہوئی لپک کر اسی دروازے تک پہنچ گئیں۔ یہ سب کچھ لمحوں میں ہو گیا تھا' میں البتہ چیخ چیخ کر رونے لگا تھا۔ ابا نے بھی شاید کچھ گڑبڑ محسوس کر لی تھی وہ لپکتے ہوئے باہر آئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "کک۔ کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر چیخے۔

اماں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ کچھ نہیں' نہ تو اماں نے نگاہیں سپارے سے ہٹائیں اور نہ ہی ان کی آواز رکی۔ میں ان چند لمحوں میں ہونے والے اس حیرت انگیز واقعے کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا جو انھیں سمجھاتا البتہ میری آواز اونچی اور اونچی' ہو گئی تھی۔ ابا نے مجھے گھسیٹ کر باہر لے جانا چاہا تو میں زمین میں لوٹ گیا مگر باہر نہ گیا بلکہ اماں کا دامن مضبوطی سے تھام لیا جس پر اماں نے ایک ہاتھ سے مجھے خود سے لپٹا لیا اور گردن کے اشارے سے ابا کو منع کر دیا۔ اماں کا رنگ بالکل پیلا ہو رہا تھا مگر وہ حیرت انگیز ضبط سے کام لے کر زور زور سے سپارہ پڑھ رہی تھیں۔ یہاں ہونے والی گڑبڑ کو شاید زنان خانے میں بھی لوگوں نے محسوس کر لیا تھا۔ میری چچیاں سپارے ہاتھوں میں لیے زنان خانے کی چوکھٹ پر کھڑی حیرت سے اماں کو تک رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر بلا کا خوف طاری تھا۔ اماں کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اماں کی آواز کی لرزش رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ صاف آواز میں تلاوت کر رہی تھیں۔ کمرے کے اندر چند اگربتیوں کا گاڑھا دھواں چکراتا ہوا سامنے والے روشن دان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس روشن دان سے دھوپ ایک لکیر کی صورت میں دادی اماں کے تخت پر پڑ رہی تھی اور اسی چمکیلی لکیر میں دھواں چکراتا ہوا اوپر اٹھ رہا تھا۔ یہ منظر مجھے بڑا اچھا لگا اور میں رونا بھول کر اسے بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔

چند ہی لمحوں بعد کمرا دھوئیں سے خالی ہو گیا۔ اب مجھے دادی اماں کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا مگر ان کا چہرہ دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس وقت بہت بدصورت اور کالی لگ رہی تھیں جبکہ وہ بے حد گوری' نازک اور خوب صورت سی تھیں۔ اماں نے لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر میت کی طرف دیکھا اور بدستور سپارہ پڑھتی رہیں پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ دھیرے دھیرے کمرے کے اندر سرکتی جا رہی ہیں۔ میں بھی ان کے پہلو سے لگا اندر سرک رہا تھا۔ اسی طرح ہم رفتہ رفتہ دادی اماں کے تخت کے قریب پہنچ گئے تب میری نگاہ پھر ان کے چہرے پر پڑی اور میں پھر حیرت زدہ رہ گیا۔ دادی اماں ویسی ہی خوبصورت تھیں' گوری اور پیاری سی۔ مجھے لگا جیسے دور سے دادی اماں خراب لگ رہی تھیں۔ اس وقت میں اس اسرار کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ میری چچیاں اور پھوپیاں اب دادی اماں کے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ تک آ چکی تھیں۔ ان سب کی آنکھوں میں حیرت اور چہرے پر اطمینان تھا۔ اب کافور' لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ دادی اماں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سکون سے سو رہی ہوں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا مردان خانے سے ابا' چچا' تایا اور دوسرے رشتے دار مرد بھی تیز تیز چلتے ہوئے دادی کے کمرے تک آ گئے۔ ان مردوں میں محلے کا کوئی نہ تھا اس لیے گھر کی عورتیں وہیں کھڑی رہیں۔ تمام لوگ اماں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی حیرت سے دیکھ رہے تھے پھر ابا نے میری بڑی بہن سے کچھ کہا۔ وہ لپک کر ایک طرف چلی گئیں ذرا دیر بعد وہ لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں پانی کا کٹورا تھا انھوں نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھا اور سہمی ہوئی اماں کے قریب آ گئیں۔ ان کی نگاہیں دادی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اماں اب بہت زور سے تلاوت کر رہی تھیں ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔ زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو کر دہکتے انگارے کی سی ہو گئی تھیں

اور تبھی سپارہ ختم ہو گیا وہ تخت کے پائے پر سر رکھ کر ہانپنے لگیں۔ جہانی آپا نے بڑھ کر پانی کا کٹورا ان کے خشک ہونٹوں سے لگا دیا جسے انھوں نے بڑی بے صبری سے پی لیا اور پھر وہ وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ اماں شاید بے ہوش ہو چکی تھیں اس لیے سارے گھر میں شور مچ گیا۔ کوئی پنکھا جھلنے لگا اور کوئی پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔ ابا دوڑ کر باہر نکل گئے۔ چند لمحوں بعد واپس آئے تو مولوی چاچا ان کے

دینے کے علاوہ لوگوں کو قرآن کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ وہ سہمے ہوئے تھے مگر پھر بھی وہ آیتوں کا ورد کرتے ہوئے دادی والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کسی نے دادی کے منہ پر چادر ڈال دی تھی۔ عورتوں نے دوپٹے میں منہ چھپا لیے تھے۔ جہانی آپا نے اماں کے اوپر بھی ہلکی سی چادر ڈال دی تھی اور چہرے پر دوپٹا ڈال دیا تھا۔ مولوی صاحب نے اماں کی نبض دیکھی۔ وہ حکیم بھی تھے۔ چند لمحے کچھ بڑبڑاتے رہے پھر پانی مانگا۔ پانی کے کٹورے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس پانی کے چھینٹے اماں کے چہرے اور جسم پر ڈالے پھر وہی کٹورا لے کر پورے کمرے میں چکر لگانے لگے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے پورے کمرے میں بکھیر رہے تھے۔ میں اماں کے پہلو سے لگا بیٹھا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اسی لمحے اماں کے جسم میں جنبش ہوئی۔ لوگوں کی سرگوشیاں تیز ہو گئیں اور مولوی صاحب مسکرا کر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بیگم بڑی ہمت والی خاتون ہیں مرزا صاحب!" انھوں نے مسکرا کر ابا سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب سب ٹھیک ہے۔ آپ میت کے غسل کا انتظام کیجیے" اتنا کہہ کر وہ مردان خانے کی طرف بڑھ گئے۔

اماں اب اٹھ کر بیٹھ چکی تھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے دادی کے چہرے سے چادر اٹھا کر دیکھا پھر پورے کمرے میں نگاہ دوڑائی اور الحمد اللہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئیں پھر شاید میں باہر چلا گیا یا شاید مردان خانے میں کیونکہ مجھے یاد نہیں کہ دادی کو کس نے نہلایا اور کس نے کفن پہنایا' ہاں اتنا یاد ہے کہ مولوی صاحب محلے کے کچھ مردوں کو لے آئے تھے مگر عورتوں نے ہمارے گھر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بات کا علم مجھے رشتے دار عورتوں کی گفتگو سے ہو گیا تھا۔ دادی کے جنازے میں بہت کم لوگ تھے۔ البتہ [illegible] ہر دریچے میں' ہر دروازے پر اور ہر کھڑکی میں عورتیں نظر آ رہی تھیں۔

دادی کے انتقال کے بعد ساری حویلی میں سناٹا سا چھا گیا ورنہ ان کی زندگی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ محلے بھر کی عورتیں ان سے ملنے آیا کرتی تھیں مگر جانے پھر کیا ہوا کہ عورتوں نے آنا چھوڑ دیا۔ اماں نماز روزے کی بڑی پابند تھیں صبح اٹھ کر قرآن کی تلاوت کرنا ان کے معمولات میں سے ایک تھا۔ ہم سب کی آنکھ تلاوت کی آواز پر ہی کھلا کرتی تھی۔ اماں سبھی کو نماز روزے کی پابندی کا درس دیتی تھیں۔ ہم بہن بھائی تو ان کے حکم کی تعمیل کرتے تھے مگر گھر کے دوسرے افراد پر ان کا بس نہ تھا' خاص طور پر میری دونوں پھوپیاں ہمیشہ اماں کی باتوں کا برا مانا کرتی تھیں۔ اماں روز صبح دادی کے کمرے کی صفائی کروا کر وہاں کلمے کی تسبیح پڑھا کرتی تھیں پھر اگر بتی سلگا کر دروازہ بند کر دیا کرتی تھیں۔ ابا نے مجھے مقامی اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ شام کو میں مولوی صاحب سے قرآن کا درس لیا کرتا اور رات کو اماں مجھ سے آیتیں سنا کرتی تھیں۔ یہ اماں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ میں نماز روزے کا پابند ہو گیا اور خدا کے ذکر سے مجھے سکون ملنے لگا۔

ابا علاقے کے بڑے زمین داروں میں سے ایک تھے دادا پردادا نے بڑی زمینیں چھوڑی تھیں۔ وہ تو مجھے تعلیم دلوانے پر بھی رضامند نہ تھے مگر اماں کی ضد کی وجہ سے انھوں نے مجھے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ انھی واقعات کی وجہ سے میری دونوں پھوپیوں کے رشتے نہیں آتے تھے اور وہ تیس پینتیس برس کی ہو چکی تھیں۔ چچا کی شادی مراد آباد میں ہوئی تھی شاید اس لیے ان کا گھر بس گیا تھا مگر چچیاں زیادہ تر میکے ہی میں رہتی تھیں بلکہ اب تو انھوں نے حویلی میں اپنے شوہروں اور بچوں کو بھی رہنے سے منع کر دیا تھا۔ میرے دونوں چچا مراد آباد ہی میں رہتے تھے تایا لکھنؤ میں تھے۔ اتنی بڑی حویلی میں صرف ابا اور ہم لوگ دادی کے ساتھ رہتے تھے۔ دادی کی موت کی وجہ سے ہی دونوں چچا اور تایا آ گئے تھے۔

دادی کے انتقال کے بعد ذرا سکون ہو گیا۔

[illegible] گزر گئے۔ دونوں پھوپیاں اب بوڑھی ہو [illegible] تھیں۔ اماں ان کی طرف سے بڑی پریشان رہتی تھیں۔ اس دوران میں چھوٹی پھوپی کے لیے رشتہ آ گیا۔ ان کے سسرال کا تعلق دہلی سے تھا۔ انھیں لوگوں نے بھڑکانے کی بہت کوشش کی مگر ذیشان صاحب جو میرے ہونے والے پھوپا تھے ان باتوں کے قائل نہ تھے اور ہمارے گھر والوں نے انھیں قائل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ کسی نہ کسی طرح پھوپی اپنے گھر کی ہو جائیں۔ سادگی سے نکاح کر کے انھیں رخصت کر دیا گیا۔ ابا نے جہیز کی بجائے انھیں زمین کا ایک ٹکڑا اور نقد رقم دی تھی۔ وہ لوگ نکاح کے فوراً بعد دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم سب نے سکھ کا سانس لیا' اماں تو اس رشتے پر بے پناہ خوش تھیں مگر دوسرے ہی دن ہمارے گھر میں پھر قیامت مچ گئی۔ دہلی سے تار آیا کہ میری پھوپی اور پھوپا دونوں کو پہلی رات ہی سانپ نے ڈس لیا۔ اب پھر ہمارے گھر سے ایک جنازہ نکلنا تھا مگر پھوپی کے سسر نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کیونکہ ان کے گھر آ چکی تھیں اور اب ان کے گھر کی فرد تھیں اس لیے

ان کی میت وہیں سے اٹھے گی ہم سب دہلی پہنچ گئے۔ مجھے خوف تھا کہ شاید دادی کی طرح پھوپی کی لاش سے بھی بدبو اٹھ رہی ہو گی۔ ان کا چہرہ بھی ہیبت ناک ہو گیا ہو گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ حیرت تو سب کو یہ تھی کہ پھوپی کا چہرہ بے حد جوان اور خوب صورت لگ رہا تھا بالکل گلابی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ سو رہی ہوں جبکہ پھوپا کا چہرہ سوج چکا تھا۔ رنگت نیلی ہو رہی تھی اور ناک سے گدلا گدلا پانی نکل رہا تھا اور ان کے پاس سے عجیب ناگوار سی بو آ رہی تھی۔

میری عمر اس وقت بارہ تیرہ برس کی تھی۔ اب میں سب کچھ سمجھ اور محسوس کر سکتا تھا۔ ان واقعات نے میرے تجسس کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ ہم اگلے روز امروہہ واپس آ گئے۔ میری بہنیں بہت سہمی ہوئی تھیں' بڑی پھوپی بھی زرد پڑ چکی تھی مگر اماں میں بڑا حوصلہ تھا۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی اور وہ مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔

ہم جس روز گھر پہنچے اس کے اگلے روز چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ ان حالات نے سب سے زیادہ اثر ابا پر ڈالا تھا۔ وہ ہر وقت گم صم رہتے اور اپنے کمرے میں پڑے رہتے تھے۔ پردادا مرزا صولت بیگ کا کمرا تیسری منزل پر تھا جسے ان کی موت کے بعد سے نہیں کھولا گیا تھا نہ ہی تیسری منزل پر کوئی جاتا تھا۔ گھر کی ویرانی اور وحشت نے مجھے گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں جب اپنے دوستوں کے گھر جاتا۔ [illegible] احساس محرومی شدت سے ہونے لگتا تھا۔ اب میں اس تمام چکر کو سمجھنا چاہتا تھا جاننا چاہتا تھا اور اس وحشت سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اتنے برس گزر چکے تھے اور میں نے اپنے گھر میں کوئی خوشی نہ دیکھی تھی۔ پھوپی کی شادی بھی یوں ہوئی تھی جیسے کوئی جرم کیا جا رہا ہو۔ سارے زمانے سے چھپا کر' سرگوشیوں میں سارے معاملات طے ہوئے تھے۔ بند کمرے میں نکاح کیا گیا اور رات کی تاریکی میں رخصت کر دیا گیا تھا۔ میں گھر میں خوشی دیکھنے کو ترس گیا۔ یہ اماں ہی کا دم تھا کہ وہ اب تک اس حویلی کو آباد کیے ہوئے تھیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اماں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔

میں اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا۔ ابا کا ارادہ تھا کہ وہ مجھے دہلی یا علی گڑھ ہوسٹل میں بھیج دیں تاکہ ان کی نسل آگے بڑھ سکے۔ اب خاندان میں میرے سوا کوئی لڑکا نہ تھا۔ بڑے چچا بے اولاد تھے۔ چھوٹے چچا کا ہر بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتا تھا۔ تایا کی ایک بیٹی تھی جو معذور پیدا ہوئی تھی اور اب ان کے سینوں پر کسی بھاری سل کی طرح دھری تھی۔ بولتے ہوئے بھی اس کی زبان لڑکھڑاتی تھی۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ پھوپی کے مرنے کے بعد جب ہم گھر پہنچے تو اگلے روز چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ ابا شام ہی سے بڑے بے چین تھے۔ وہ تیرھویں کی تمام رات صحن میں ٹہلتے رہے۔ اماں' بہنیں' پھوپی سب پریشان رہیں۔ ایک تو پھوپی کی موت نے سبھی کو صدمے سے بے حال کیا ہوا تھا پھر ابا کی کیفیت اور چودھویں رات کا خوف ہماری پوری حویلی پر چھایا ہوا تھا۔ اماں رات بھر قرآن کی تلاوت کرتی رہیں میں ان کے قریب ہی بیٹھا جائے نماز بچھائے تسبیح پڑھتا رہا۔ اگلا دن نکلتے ہی ابا کی حالت بگڑ گئی۔ انھیں سویرے ہی زبردستی بستر پر لٹایا گیا تھا۔ شام ڈھلے تک انھیں بری طرح بخار چڑھ چکا تھا۔ میں ڈاکٹر کو لایا۔ اس نے اچھی طرح معائنہ کیا مگر بخار چڑھنے کا سبب نہ جان سکا۔ ابا نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔ ڈاکٹر دوائیں دے کر چلا گیا۔ اس رات ہم سب ابا کے گرد بیٹھے رہے۔ اماں بڑے صبر والی عورت تھیں۔ اس حالت میں بھی انھوں نے اپنے حواسوں کو قابو کر رکھا تھا۔ وہ تمام رات سورہ یاسین پڑھتی رہیں۔ رات کے کسی پہر ابا کا بخار اتر گیا۔ وہ ایک دم چاق و چوبند ہو گئے۔ بڑی پھوپی نے چائے بنا کر دی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ چاند نکلا بھی اس کا عکس کنویں میں اترنے کا وقت بھی بیت چکا۔ یہ وقت تقریباً تین اور ساڑھے تین کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ میں نے اس رات پہلی مرتبہ خود میں بے پناہ تجسس پایا۔ کوئی میرے اندر تمام رات سرگوشیاں سی کرتا رہا کہ مجھے کنویں تک جانا چاہیے اور چاند کے عکس کو کنویں میں اترتے دیکھنا چاہیے مگر گھر کے سبھی افراد جاگ رہے تھے اور ابا کی حالت کے پیش نظر انھیں یوں چھوڑ کر جانا بھی کچھ مناسب نہ تھا۔ اس لیے میں خود پہ جبر کیے بیٹھا رہا۔ ایک بات آپ کو بتاتا چلوں کہ اتنی سی عمر سے ایسے واقعات دیکھنے' سننے اور محسوس کرنے کے باوجود مجھ میں خوف نام کی کوئی کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کبھی راتوں کو سوتے میں نہیں ڈرا تھا۔ ہماری حویلی بہت بڑی تھی۔ تین منزلیں تھیں جب سے چچا وغیرہ مراد آباد گئے تھے اوپر کی منزل بھی خالی پڑی تھی۔ صرف پچھلے حصے کے چند کمرے تھے جو ہمارے استعمال میں تھے۔ حویلی کے دائیں جانب کا سارا حصہ خالی پڑا تھا۔ کئی کمرے تھے جنھیں تالا لگا دیا گیا تھا۔ دائیں جانب کا بڑا برآمدہ بھی خالی پڑا رہتا تھا۔ برآمدے کے آگے کچا حصہ تھا پھر ایک بڑا چبوترا تھا جس کے دونوں جانب بڑے بڑے گول ستون اوپر تک چلے گئے تھے۔ کبھی پردادا کے زمانے میں اس چبوترے

جس کی صرف منڈیریں پکی تھیں اور باقی حصہ کچا تھا۔ سبز گھاس اگا کرتی تھی۔ منڈیروں کے ساتھ ساتھ گول کیاری تھی جس میں گلابوں کے کنج ہوا کرتے تھے اماں بتاتی ہیں کہ شام کو پردادا کی بیٹھک وہیں ہوا کرتی تھی۔ علاقے کے تمام لوگ وہیں آکر بیٹھا کرتے تھے۔ اسی چبوترے پر قوالی کی محفلیں جما کرتیں اور اسی جگہ مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ اب تو وہاں چند پرانے درختوں اور خاک و دھول کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ ہر طرف خشک پتے اڑا کرتے تھے۔ اس چبوترے کے سامنے بنے حوض کا پانی خشک ہو چکا تھا اور اب اس خالی حوض میں سوائے کوڑے کرکٹ کے کچھ نہ رہا تھا۔

اس لمبی چوڑی حویلی میں اس زمانے میں اتنے نوکر تھے جو چپہ چپہ صاف کر دیا کرتے تھے مگر ان خوفناک واقعات کے بعد اس حویلی کی تمام رونقیں دھیرے دھیرے ختم ہوتی چلی گئیں تھیں اور آج یہاں سوائے وحشت اور ویرانی کے یا چند نفوس کے خوفزدہ چہروں کے کچھ بھی نہ رہا تھا۔

اس وقت بھی چند خوفزدہ لوگ ابا کے گرد بیٹھے تھے۔ ابا چائے پینے کے دوران میں مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت بے پناہ چمک تھی۔ چائے کی پیالی خالی کر کے انھوں نے پھوپی کے ہاتھ میں دے دی اور ان سے کہا کہ بچیوں کو لے کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ابا اور اماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا تھا مگر ابا کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ اس لیے یہ بات سنتے ہی بہنوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"وقار الحسن!" ابا کی گونج دار آواز نے میرے قدم تھام لیے۔

"جی ابا!" میں نے پلٹ کر انھیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم ٹھہرو! تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

اماں نے انھیں ٹوکا دیا۔ "ارے جانے دیں، بچہ ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔"

"نہیں صدیقہ بیگم، یہ بات آج نہ ہو سکی تو پھر کبھی نہ ہو سکے گی۔" ابا نے عجیب سے انداز میں کہا۔

میں جھٹ ان کے قریب آبیٹھا۔ اس میں میرے تجسس کو بے پناہ دخل تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے ابا کسی راز سے پردہ اٹھانے والے ہیں۔ اماں کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ بہنیں بھی پلٹ کر دیکھنے لگی تھیں۔

"جاؤ لوگ" ابا نے انھیں دروازے میں کھڑے دیکھ کر جھڑکا۔ وہ سب چھپاک سے باہر نکل گئیں۔ ابا آہستگی سے لیٹ گئے اور چھت کو تکنے لگے۔

"وقار الحسن!" چند لمحوں بعد ابا گویا ہوئے۔ "تم اس خاندان کے آخری بیٹے ہو میں نہیں چاہتا کہ میرا نام لیوا بھی شکنتلا کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جائے، اس لیے میری بات غور سے سنو!"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اماں پھٹ پڑیں۔ "اتنے سے بچے کو۔ وہ ڈر جائے گا۔"

"نہیں اماں! میں نہیں ڈرتا۔" میں نے بے خوفی سے جواب دیا اور ابا کی طرف پلٹ پڑا۔ "آپ بتائیے ابا! مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

"شاباش بیٹا! تجھے ڈرنا بھی نہیں چاہیے۔ تیرے ساتھ بہت بڑی طاقت ہے، خدا کی، کبھی بھی خوفزدہ نہ ہونا بیٹا اور اپنے خاندان کو اس عذاب سے نجات دلانا۔ تو ایسا کر سکتا ہے بیٹا سن۔ وہ شکنتلا تھی۔ سوامی جوگند اناتھ کی بیٹی۔ خوب صورت، چاندنی سے گندھی ہوئی وہ لڑکی۔ میرے دادا نے اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کی تھیں مگر جب وہ رام نہ ہوئی تو اسے اٹھوا لیا۔ اس حویلی کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں اسے قید کر دیا۔ ہفتوں اس لڑکی کا کسی کو پتا نہ چلا پھر ایک روز جب دادا اس کے کمرے میں داخل ہوئے تب وہ کمرے سے نکل کر بھاگ گئی۔ اس کے دونوں پیروں میں چاندی کے دو کڑے تھے۔ ایک کڑا تو دادا کے کمرے میں پڑا رہ گیا مگر دوسرا کڑا خدا جانے کہاں چلا گیا وہ پائیں باغ سے ہوتی ہوئی اسٹیشن کے راستے میں آنے والے کنوئیں تک پہنچ گئی اور اس نے اس کنوئیں میں چھلانگ لگا دی چودھویں کی رات تھی اور اس وقت چاند کا عکس کنویں کے اندر پانی میں تیر رہا تھا اور بیٹا اب وہ چاند کے تیرتے ہوئے اسی عکس میں قید ہے۔ صبح یہ خبر آگ کی طرح علاقے میں پھیل گئی۔ لوگوں نے کنوئیں سے اس کی لاش نکالنا چاہی مگر ہر ڈول کے ساتھ چاندی جیسے چمک دار اور زہریلے سانپ آتے رہے۔ اس کی لاش نہ ملی، پہلے ہی روز کے بعد لوگ اتنے خوفزدہ ہوئے کہ انھوں نے اس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔ کنویں کو پاٹنے کی کوشش بھی کی گئی مگر کوئی بھی اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا بس یہ جانتا تھا کہ یا تو ایسا سوچنے والا مر جاتا تھا یا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا تھا پھر وہ دوبارہ علاقے میں نظر نہیں آتا تھا۔ سوامی جوگندر ناتھ شکنتلا کی خودکشی کا سن کر ہی دیوانے سے ہو گئے تھے۔ دادا پر اغوا اور قتل کا مقدمہ دائر ہو گیا مگر اغوا کا ثبوت نہ ملنے اور لاش کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ

سے انھیں باعزت بری کر دیا گیا۔ مقدمہ دائر ہونے اور پھر ان کی رہائی کا فیصلہ ہونے تک تو کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی مگر اس فیصلے کے اگلے روز اس جج کی خودکشی کی خبر آگئی۔ اس نے اپنے گھر کے آنگن میں لگے درخت سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی اور وہ لمحہ چودھویں کی رات کا وہی لمحہ تھا جب چاند کا عکس پانی میں اترتا ہے۔۔۔ اس کے بعد سے ہمارے خاندان پر یہ عذاب نازل ہونا شروع ہو گیا۔ شکنتلا کے پیروں کا یہ کڑا ایک اہم ثبوت تھا جسے دادا نے بڑی ہوشیاری سے چھپائے رکھا۔ یہ مجھے تمھارے دادا نے دیا تھا جنھیں یہ کڑا دو چھتی سے ملا تھا، میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے سوامی جی کا پتا چل جائے اور میں ان کو یہ کڑا دے کر اپنے دادا کے جرم کا اعتراف کر لوں مگر وہ تو یہاں سے ایسے غائب ہوئے کہ کچھ پتا ہی نہ چلا۔ دادا کی موت چاند کی چودہ تاریخ کو ہوئی تھی اور اسی رات میں نے تیسری منزل پر ایک سایہ سا منڈلاتا دیکھا تھا۔ جو کسی جوان لڑکی کا تھا جو اچانک رونے لگتا تھا میں بھی تمھاری طرح دلیر تھا وقار الحسن اسی لیے اس سائے کے پیچھے اوپر چلا گیا تھا وہ سایہ ایک خوبصورت عورت کا تھا اور دادا کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں دادا کے کمرے میں جانا چاہتا تھا مگر اسی وقت میرے والد یعنی تمھارے دادا مجھے پکارتے ہوئے سیڑھیوں تک آگئے اور میں ڈر کر نیچے چلا آیا پھر اسی رات کے کسی پہر دادا انتقال کر گئے۔" ابا اتنا کہہ کر لمحہ بھر کو رکے۔ میں بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ یہی سب کچھ تو میں تفصیل سے جاننا چاہتا تھا اب تک جو کچھ میں جان پایا تھا وہ لوگوں کی باتیں، گھر والوں کی سرگوشیاں یا افواہیں تھیں یا وہ کچھ تھا جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا مگر میرے دادا کی زندگی کے اصل واقعات اور بالخصوص یہ سنسنی خیز واقعات جان لینے کی خواہش اب پوری ہو رہی تھی۔

"پھر ابا!" میرا تجسس بول اٹھا۔

"ان کے انتقال کے بعد بڑا سکون ہو گیا تھا بیٹا۔ ہم سب نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ حویلی کی رونقیں لوٹ آئی تھیں، تمھارے دادا دوسرے قسم کے آدمی تھے۔ وہ بڑے نرم مزاج اور شریف آدمی تھے۔ یہاں انھیں ہر مذہب کے لوگ پسند کرتے تھے شاید اسی وجہ سے کئی برس تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا مگر پھر اچانک ہی حویلی میں عجیب عجیب سے واقعات ہونے لگے۔ ہر شخص کو یہاں سیڑھیوں پر منڈلاتی ایک لڑکی نظر آنے لگی جو کبھی کبھی دھیمی آواز میں رونے لگتی تھی۔ یہ لڑکی ہمیشہ تیرھویں اور چودھویں کی شب کو حویلی میں چکراتی محسوس ہوتی۔ رفتہ رفتہ یہاں کے ملازمین بھاگنے لگے باتیں محلے میں پھیلنا شروع ہوئیں تو محلے والوں کو پچھلے تمام واقعات یاد آگئے اور ہم پھر تنہا رہ گئے پھر ایک رات میرے والد کی حالت خراب ہو گئی۔ انھوں نے مجھے بلایا اور یہ کڑا دیا پھر مجھے یہ تمام واقعات تفصیل سے بتائے اور یہ بھی بتایا کہ میرے دادا نے کسی لڑکی کو اغوا کرنے اور اسے قید میں رکھنے کے دوران اس کے محبوب کو بھی قتل کر دیا تھا اور اس کی لاش بھی کہیں چھپا دی تھی۔ وہ لڑکی اسی لڑکے کی لاش ڈھونڈنے آتی ہے اور یہ بات خود اسی لڑکی کی روح نے میرے والد صاحب سے کہی تھی میرے والد نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکے کی لاش ڈھونڈ لیں گے مگر وہ ایسا کر نہ سکے کیونکہ اماں نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ حویلی کی کھدائی پر آمادہ نہیں تھیں۔ والد صاحب نے اس لڑکی کی روح سے جتنے عرصے کا وعدہ کیا تھا، وہ وقت بیتتا جا رہا تھا اور وہ وعدہ نبھانے میں ناکام ہو رہے تھے اور اس کا سبب صرف اماں تھیں۔"

"یعنی دادی۔" میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں۔ تمھاری دادی اور اسی وجہ سے تم نے دیکھا کہ ان کی موت گلے میں کسی ان دیکھی رسی کا پھندا پڑنے سے ہوئی اور ان کی لاش کی بھی وہی کیفیت ہوئی تھی جو میرے دادا کی لاش کی ہوئی تھی اگر تمھاری ماں کا حوصلہ نہ ہوتا تو شاید انھیں بھی بلا غسل دیے دفنا دینا پڑتا۔ بہرحال بیٹا شکنتلا نے کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ مجھے نظر تو کئی بار آئی۔ بڑی بے چین، بے کل اور اس کی سسکیاں بھی میرے لیے عذاب بنی رہیں مگر میں نہ اس سے بات کر سکا اور نہ ہی جان سکا کہ میں اس کی روح کو کس طرح سکون دے سکتا ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ وہ انتقام میں دیوانی ہو رہی ہے اس نے ہمارے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا ہے بیٹا اگر ہو سکے تو۔۔۔ تو سوامی جی کو تلاش کر کے یہ کڑا انھیں دے دینا اور اپنے پردادا کے جرم کا اعتراف کر لینا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں مگر شاید تم انھیں تلاش کر سکو۔ اور یہ۔۔۔ یہ اپنے پاس رکھ لو۔۔۔" اتنا کہہ کر ابا نے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا میری جانب بڑھا دی۔ "اس میں تعویز ہے بیٹا! یہ تمھاری حفاظت کرے گا۔ اسے خود سے جدا نہ کرنا۔"

ابھی ابا نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اماں کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ ان کی نگاہیں بائیں جانب کی کھڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ باہر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا وہ لپک کر کھڑکی کی طرف گئیں۔ میں چاندی کی وہ ڈبیا ہاتھ میں دبائے ان کے پیچھے

لپکا اور میں نے پہلی بار وہاں ایک سایہ دیکھ لیا۔ وہ سفید ساری میں لپٹی کسی دبلی پتلی سی لڑکی کا سایہ تھا اور وہ رونے کی بجائے دبی دبی آواز میں ہنس رہی تھی۔ اس کے چہرے پر درخت کا سایہ تھا اس لیے میں اس کے نقوش نہیں دیکھ سکا جبکہ اس کا پورا بدن چاندنی میں صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی ہنسی سن کر یوں لگا تھا جیسے قریب کے مندر میں کسی حاجت مند نے گھنٹیاں بجا دی ہوں۔ میں اور اماں حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے تبھی ابا کی کراہ نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم لپک کر ان کے قریب پہنچے تو وہ اپنا گلا پکڑے تڑپ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ منہ پورا کھل گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے کسی ان دیکھے پھندے یا ہاتھوں کو اپنی گردن سے ہٹانا چاہتے ہوں جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اماں چیخ کر ان پر جھپٹیں اور دوسرے ہی لمحے دھکا کھا کر زور سے سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائیں۔ ایک دلدوز چیخ ان کے حلق سے نکلی۔ میں دوسری دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ میرے قدم جیسے کسی نے جکڑ لیے تھے۔ میں کوشش کے باوجود نہ اماں کے پاس جا سکا اور نہ ابا کی مدد کر سکا اماں کی چیخ اور ابا کے حلق سے نکلنے والی غرغراہٹ اتنی اونچی تھی کہ بڑی پھوپی اور میری بہنیں روتی پیٹتی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ پھوپی تو ابا کی طرف بھاگیں اور بہنیں اماں کی طرف۔ میں کسی بت کی طرح دیوار سے لگا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ مجھے اب بھی کسی نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ میں باوجود کوشش کے اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ پورے جسم میں صرف میری آنکھیں تھیں جو سب کچھ دیکھ رہی تھیں ورنہ پورا جسم ہی بے جان ہو چکا تھا اور تبھی میں نے ابا کے گلے سے لپٹا ہوا سنہرے رنگ کا وہ سانپ دیکھ لیا جس نے ابا کی گردن کے گرد اپنا جسم لپیٹا ہوا تھا۔ ابا کے ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لینے میں ناکام تھے۔ وہ اپنے بل کس رہا تھا اور ابا کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلتی جا رہی تھیں۔ کمرے میں ایک بھونچال سا آیا تھا۔ پھوپی اور بہنیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ ابا کے حلق سے نکلنے والی غرغراہٹ خوفناک حد تک بلند ہو چکی تھی۔ اماں کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور ان کا بے جان جسم فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ کھڑکی سے باہر گہری تاریکی اور غضب کا سناٹا تھا یوں جیسے ساری دنیا مر چکی ہو۔ کسی کو اس حویلی کے اس اندرونی کمرے میں گونجنے والی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ابا بے حس و حرکت ہو گئے اسی لمحے کسی کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی اور پھر وہ آواز جیسے تمام کائنات کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔ پھوپی اور بہنوں کی آوازیں گھٹ کر رہ گئیں اور یوں لگنے لگا جیسے حویلی کے سارے کونوں، ساری دیواروں اور ساری کھڑکیوں میں وہی دبی دبی ہنسی بھری ہوئی تھی جو اس وقت پوری قوت سے ابھرنے لگی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر وہی سایہ دیکھا ہوا کے دوش پر چلتا، ساری میں لپٹا آہستہ آہستہ حویلی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس سایے کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی جیسے جھٹکا سا لگا اور میں حواسوں میں آگیا۔ میرے بے جان جسم میں جان پڑ گئی اور میں بھاگ کر پہلے ابا اور پھر اماں کے پاس پہنچ گیا ابا ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو چکے تھے مگر اماں بے ہوش تھیں۔ میں نے چیخ کر پانی مانگا۔ میری بہنیں اور پھوپی جواب بھی اپنے ہونٹوں کو بھینچے آنکھیں پھاڑے پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہی تھیں جیسے میری آواز سن کر ہوش میں آگئیں۔

پانی کے چھینٹے پڑتے ہی اماں کو ہوش آگیا۔ پھوپی ان کے ماتھے کا خون صاف کر کے دوپٹا باندھ چکی تھیں۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہوش آتے ہی اماں ابا کے پلنگ کی طرف لپکیں اور پھر ان کی دلدوز چیخوں نے ایک بار پھر قیامت مچا دی۔ پوری حویلی لرز اٹھی۔ میں اماں سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے پہلی بار اماں کو پچھاڑیں کھاتے دیکھا تھا۔ وہ مضبوط اور صابر سی عورت اس وقت ٹوٹ پھوٹ کر بری طرح بکھر چکی تھی۔

اگلے روز پھر حویلی میں دور تک سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اماں نے سب کو یہی بتایا تھا کہ ابا پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ بہن کی موت سے بے حال تھے، اس لیے دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ابا کے چہرے پر گلا گھونٹے جانے کے آثار قطعی نہ تھے نہ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر تھیں، نہ زبان نکلی ہوئی تھی اور نہ ہی گلے پر کوئی نشان تھا۔ پھوپی کی موت سے سب واقف تھے، دادی کی موت کا واقعہ بہت پرانا ہو چکا تھا اس لیے لوگوں نے ایسا کوئی خوف محسوس نہ کیا اور اس بار کمروں میں بچھی ہوئی چاندنیاں خالی نہ تھیں۔ جنازے میں کافی لوگ شریک تھے۔ یہ موت بالکل نارمل لگ رہی تھی اور کسی کو احساس بھی نہ تھا کہ رات اس حویلی کے مکینوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ کل رات پہلی بار سب نے وہ سایہ دیکھا اور اس کی ہنسی کی آواز سنی تھی۔ ابا کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے اور کرب سے تڑپتے دیکھا تھا۔

اماں پھر کمر کس کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ انھوں نے سب کو سمجھا دیا تھا۔ اب بھی ان کی آنکھیں سب پر لگی ہوئی

تھیں گو اس وقت وہ ایک کونے میں بیٹھی تھیں مگر سیپارہ اب بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ تلاوت کی میٹھی آواز میں لرزش ضرور تھی مگر زبان میں لڑکھڑاہٹ نام کو نہ تھی۔ میں مردان خانے سے زنان خانے کے چکر کاٹ رہا تھا۔ یہ سب سنبھالنا میرے اکیلے کے بس کا نہ تھا، تایا اور دونوں چچا صبح سویرے والی گاڑی سے آچکے تھے اور وہی سب کام سنبھالے ہوئے تھے مگر میں بھی حتی المقدور ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ میں نے ابا کا دیا ہوا چاندی کا تعویذ اپنی جیب میں رکھا ہوا تھا اور چاندی کا وہ کڑا جسے ابا نے رات مجھے دکھایا تھا، اپنے بکس میں کپڑوں کے درمیان چھپا چکا تھا۔ ابا کے سوئم کے روز میں اماں کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اماں خالی خالی آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھیں۔ پھوپی اور بہنیں اپنے کمرے میں تھیں۔ ابا کا پلنگ خالی تھا۔

اماں اچانک میری جانب مڑیں "وقار! تیرے پردادا جیسا جلاد ہم نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ شگفتہ تیسری لڑکی تھی۔"

"اماں! مگر میں نے تو۔ ابا کہہ رہے تھے۔"

"وہ تجھ سے کیا کہتے بیٹا! اپنے دادا کے کون کون سے عیب گنواتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب عذاب صرف شگفتہ کو مارنے ہی سے آرہے ہیں مگر میں جانتی ہوں بیٹا کہ یہاں دو اور معصوم لڑکیوں کی روحیں بھی ماتم کرتی ہیں۔ بین کرتی ہیں بیٹا، شاید تیرے باپ کو ان کے بارے میں علم نہ ہو مگر۔ مگر عصمت بیگم کی چیخیں میں نے سنی تھیں۔ اسے صولت بیگ کے قدموں میں گرے، گڑگڑاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔" اماں ایسے بول رہی تھیں جیسے خود سے باتیں کر رہی ہوں۔ میں بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔

"عصمت بیگم کون تھیں اماں؟" میں نے ان کے ماتھے پر آئے بالوں کو انگلیوں کی پوروں سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"مرزا نادر شاہ کی بیٹی تھیں، میری سہیلی۔ انھیں صولت بیگ نے میری شادی پر دیکھا تھا۔ شاید اسی وقت ان کی ہوس نے قسم کھالی تھی کہ وہ اسے تباہ و برباد کر دیں گے۔ میری شادی کے صرف تین ماہ بعد ہی کی بات ہے، میں دادا جی کو دودھ دینے اوپر گئی تھی۔ اس روز ہماری نوکرانی رحمت بی بی بیمار تھی۔ انھیں دودھ پہنچانا اسی کی ذمے داری تھی، وہ بخار میں نڈھال پڑی تھی، تب مجھے دھیان آیا کہ دادا جی کو دودھ دینا ہے۔ میں اس حویلی میں نئی آئی تھی۔ اس کے اسرار سے واقف تھی نہ طور طریقوں سے۔ میں دبے پاؤں اوپر پہنچی تو دادا جی کے کمرے سے آتی سسکیوں کی آواز نے میرے قدم تھام لیے۔ میں نے کان لگائے تو عصمت بیگم کی آواز سنائی دی جو دادا جی سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ رو رہی تھی، مگر جانے ان پر کیسا شیطان سوار تھا کہ انھوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ میں نے عصمت بیگم کی دبی دبی چیخوں کی آواز سنی اور الٹے قدموں نیچے بھاگی۔ میں تمھارے دادا کو بتانا چاہتی تھی مگر وہ باہر تھے۔ میں ساس کے کمرے میں گئی۔ وہ خاموش مورتی بنی بیٹھی تھیں۔ مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر انھوں نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ ہاتھ اٹھا کر بولیں۔ "دلھن بیگم! خاموش رہنا، یہاں لبوں پر آئے ہوئے الفاظ گلے کا پھندا بھی بن جاتے ہیں۔" ان کے لہجے میں کرب کے ساتھ ہی ایک عجیب سی سفاکی بھی تھی۔ میں گھبرا کر پلٹ گئی۔ میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر سب کو بتا دوں کہ عصمت بیگم کو خطرہ ہے۔ اسے بچا لو مگر عین اسی لمحے میں نے عصمت بیگم کو سسکتا ہوا سیڑھیوں سے اترتے دیکھا اور میں لپک کر دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ انھیں دیکھ کر دل کو ڈھارس ہوئی تھی۔ خیال آیا کہ دادا جی کو رحم آگیا ہوگا۔ میں عصمت بیگم کے باہر جانے تک یونہی دروازے کی آڑ میں کھڑی رہی میں ان کے سامنے آکر انھیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عصمت بیگم کے والد دادا جی کے دوستوں میں سے تھے۔ یہ برابر والی خالی حویلی انھی کی تھی۔ میں اس رات لمحہ بھر کو بھی نہ سو سکی تھی۔ شاید تڑکے میں کسی وقت آنکھ لگی ہوگی کہ رحمت بی بی نے جگا دیا۔ آنکھ کھلتے ہی جو خبر سنی وہ میرے ہوش اڑانے کو کافی تھی۔ عصمت بیگم نے گلے میں دوپٹے کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔"

اماں خاموش ہوئیں تو میں نے خود میں عجیب سنسنی سی محسوس کی۔ مجھے مرزا صولت بیگ سے شدید نفرت محسوس ہوئی اور شرم آئی کہ میں ایک ایسے شخص کی نسل سے ہوں جو بدترین، عیاش، قاتل اور سفاک تھا۔

"مرزا نادر شاہ شریف آدمی تھے۔ انھوں نے اس قصے کو اچھالنے کی بجائے دبانے کی کوشش کی اور ایک روز چپکے سے یہ حویلی چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔" اماں نے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اور اماں! وہ تیسری لڑکی کون تھی؟"

"وہ مالی کی بیٹی خیزراں تھی۔ چودہ پندرہ برس کی بچی، معصوم اور حیران آنکھوں والی۔ غریب کی بیٹی تھی اس لیے چکا چوند کو پسند کرتی تھی۔ مرزا صولت بیگ نے اسے اپنی امارت کی چمک دمک دکھائی، رنگین دوپٹے اور چوڑیاں، اور پھر انھی معمولی چیزوں نے اسے ڈس لیا۔ میں نے ہی اسے

آخری بار پھول باغ والی حویلی میں جاتے دیکھا تھا۔ میں اس روز مطلوب چچا کی بیٹی کی مہندی میں جا رہی تھی۔ ہمارے تانگے میں چاروں طرف چادریں تنی ہوئی تھیں۔ پھول باغ قریب آیا تو جانے کیوں میں نے پردے کی جھری سے اس جانب نگاہ کی۔ وہ ہرے رنگ کا کامدانی کا دوپٹا لپیٹے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی پھول باغ والی حویلی کے گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ میں اسے وہاں دیکھ کر چونک اٹھی تھی۔ کیوں کہ آج صبح ہی میں نے اپنی ساس کو کہتے سنا تھا کہ دادا جی آج تمام دن پھول باغ میں رہیں گے، ان کے کچھ انگریز دوست آرہے ہیں جن کے کھانے پینے کا بندوبست اس حویلی میں کیا گیا ہے۔ میں مطلوب چچا کے گھر تمام دن بے چین رہی۔ شام ہوتے ہی میں نے جہاں آرا کو ساتھ لیا اور گلیوں سے ہوتی ہوئی پھول باغ کی طرف چل دی۔ میں نے اپنی اماں کا برقع اوڑھا ہوا تھا اس لیے پہچان لیے جانے کا خوف بھی نہیں تھا اور پھر جہاں آرا میرے بھائی کے سالے کی بیٹی تھی۔ ابھی میں گیٹ سے اندر ہی داخل ہوئی تھی کہ میں نے پھول باغ کے بڑے حوض کے قریب دادا جی کو پریشانی کے عالم میں ٹہلتے دیکھا۔ وہ نوکروں پر چیخ رہے تھے اور نوکر حوض میں غوطے لگا لگا کر باہر آرہے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے دیکھا کہ غوطے لگا کر باہر آنے والے نوکر کسی چیز کو گھسیٹتے ہوئے دادا جی کے قریب لا رہے تھے۔ میں اس جگہ سے کافی دور تھی مگر پھر بھی گھسیٹی جانے والی چیز دادا جی کے پاس روشنی میں لائی گئی تو میں اس ہرے کامدانی کے دوپٹے کو پہچان گئی اور پھر مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ میں گرتی پڑتی واپس آگئی۔

مہندی کی رسم میں، میں کسی پتھر کے بت کی طرح شریک رہی۔ رہ رہ کر خزراں یاد آرہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لاش میں تبدیل ہو چکی تھی اور اب تک اسے وہیں پھول باغ کے کسی کونے میں دفن کیا جا چکا ہوگا۔ اس رات مطلوب چچا کے گھر رکنے کا پروگرام تھا مگر میں نے ملازم کو بھیج کر تانگا منگوا لیا اور رات کو گھر واپس آگئی۔ حویلی کی تیسری منزل روشن تھی گویا دادا جی واپس آچکے تھے۔ اس رات میں برداشت نہ کر سکی اور میں نے اپنی ساس کو خزراں اور عصمت بیگم کے بارے میں بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس پر کچھ نہ کچھ ہنگامہ ضرور ہوگا مگر میری ساس یعنی تمھاری دادی خاموشی سے سب کچھ سنتی رہیں اور جب بولیں تو ان کے لہجے اور چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔

"دلھن بیگم! یہ مردوں کے کھیل ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ ابا جی کیا کر رہے ہیں مگر۔ نادر شاہ نے مقدمہ واپس نہیں لیا تھا، اور۔ خزراں کے باپ نے ہمارے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی۔"

وقار الحسن! ان کے منہ سے یہ جملے سن کر میں ساکت رہ گئی۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ تیری دادی ایسی سفاک ہو سکتی ہیں۔ باہر سے نرم و ملائم، ہنس مکھ، رحم دل اور ملنسار نظر آنے والی ہستی اندر سے کیسی کرخت ہوگی یہ تو سوچا بھی نہ تھا میں نے۔ گویا دادی سب کچھ جانتے بوجھتے انجان بن کر ان کے ہر جرم کی معاونت کر رہی تھیں۔ محض معمولی دشمنی کی بنا پر۔ نادر شاہ کا مقدمہ زمین کے ایک ٹکڑے کی وجہ سے دائر ہوا تھا۔ جس کا نعم البدل یقیناً ان کی جوان بیٹی کی موت نہیں ہو سکتی تھی اور خزراں۔ وہ غریب معصوم لڑکی جسے اس مقدمے کی تفصیل بھی معلوم نہ تھی جس میں اس کے باپ نے گواہی دی تھی بے قصور ماری گئی اور شاید اس وجہ سے تیری دادی کی موت بھی بالکل اسی طرح ہوئی جس طرح دادا جی کی ہوئی تھی۔"

اماں کی پیشانی سے پسینا بہہ رہا تھا۔ ان کا چہرہ پیلا تھا۔ وہ اب بھی رو رہی تھیں۔

"اماں! مگر ابا نے تو کچھ نہیں کیا تھا نا۔ پھر۔ پھر وہ۔۔۔"
میں بول اٹھا۔

"انھوں نے اور ان کے باپ یعنی تیرے دادا نے شکنتلا سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ اس کے پیروں کا کڑا چھپا دیا تھا شاید اس لیے۔"

"مگر کیوں اماں!"

"جھوٹی عزت کی خاطر، اس حویلی کی جھوٹی آن بان کی خاطر۔ مگر مجھے یقین ہے وقار کہ تم۔۔ تم اس عذاب سے نجات حاصل کر لو گے۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا تمھیں بتا دیا ہے وقار الحسن تاکہ تم۔ تم شکنتلا کی روح کا سکون اسے لوٹا دو۔ میں جانتی ہوں کہ اب تمھاری باری ہے۔ اب وہ تمھارے پیچھے لگ جائے گی، تم خدا کو ہر لمحہ یاد کرتے رہنا۔ وہ تمھیں صرف ایک صورت میں نقصان پہنچانے سے باز رہے گی کہ تم حقیقت کو حقیقت سمجھو اور ظلم کے خلاف جہاد کرو۔ اسے سکون دینے کا عزم کرو۔ کسی عورت پر بری نگاہ نہ ڈالو۔ اپنے نفس کو قابو میں رکھنا وقار الحسن۔ میری ان نصیحتوں کو بھول نہ جانا۔ مجھے اپنی بچیوں کی فکر ہے، ان کی عمر نکل گئی تو۔ تو میں سکون سے مر بھی نہ پاؤں گی۔" اماں پھر رونے لگیں میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ اب تو خود مجھے بھی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ بہنیں بڑی ہو رہی ہیں ان کی طرف سے اماں کی پریشانی درست تھی۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اب کتنا عرصہ خاموشی رہے گی یا یہ کہ پھر کوئی نیا عذاب ہمارا منتظر ہوگا۔ بہر حال مجھے انتظار کرنا تھا سو میں صبر و سکون سے انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اب گھر میں اماں اور میرے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس کی طرف سے پریشانی ہوتی۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شکنتلا عورتوں اور بالخصوص کنواری لڑکیوں کے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کرتی تھی۔ ہاں وہ ہمارے خاندان کو آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے پھوپی کی شادی کے فوراً بعد انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ سب تمام واقعات چاند کی چودھویں تاریخ کو ہوا کرتے تھے۔ ایک رات، صرف ایک رات کا مخصوص پہر ہمارے لیے آزمائش کا وقت ہوا کرتا تھا اور ابھی اس میں کافی وقت تھا۔

یہ تمام کچھ وہ تھا جو میں نے سنا، ابا اور پھر اماں نے بھی یہی بات کی تھی کہ شکنتلا کی روح کو سکون دے دو تو وہ شاید ہمیں بخش دے مگر یہ بات میری سمجھ میں اب بھی نہیں آئی تھی کہ اس کی روح کو میں سکون کیونکر دے سکوں گا۔ سوامی جی کا بھی کچھ پتا نہ تھا اور نہ ہی میں ان کے بارے میں کچھ جانتا تھا نہ انھیں دیکھا تھا۔ اسی لیے میں نے اماں سے کہا کہ میں سوامی جی کو کس طرح ڈھونڈ سکتا ہوں۔ اماں نے مجھے ان کی تصویر دکھانے کا وعدہ کر لیا۔

پھر وہ پورا مہینہ گزر گیا۔ میں اب کچھ پرسکون ہو گیا تھا مگر میری نظر بہت گہری اور چوکنی ہو چکی تھی۔ میرا بچپن تو رخصت ہو ہی چکا تھا۔ اب میں کسی سمجھدار آدمی کی طرح سوچا کرتا تھا۔ مہینے بھر بعد ہی ایک روز اماں نے کہا کہ میں آج تیار رہوں۔ مغرب کے بعد وہ مجھے دادا جی کے کمرے میں لے جائیں گی جہاں دادا جی کے ساتھ سوامی جی کی تصویر بھی ہے۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھے دادا جی کو دیکھنے کی زیادہ خوشی تھی۔ وہ دن گزارنا میرے لیے محال ہو گیا۔ شام ہوتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ اس بے چینی کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی بس ایک عجیب طرح کی بے کلی تھی جو مجھے پریشان کیے ہوئے تھی۔ میں نے اپنی اس بے چینی کا اظہار اماں سے کیا۔

"ہاں وقار الحسن! بے چینی بلکہ گھبراہٹ تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔" اماں کے جواب نے مجھے مزید پریشان کر دیا۔

"اماں! میں۔۔ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ہم وہاں جائیں، میں۔۔ آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔ ہمیں فی الحال اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اب کوئی واقعہ نہ ہو۔"

میری بات سن کر اماں کے چہرے پر کچھ اطمینان چھا گیا یوں جیسے وہ بھی ایسا ہی چاہتی ہوں۔ ہم نے طے کر لیا کہ ہم وقتی طور پر انتظار کریں گے، پھر میں کچھ مصروف ہو گیا۔ ایک تو یہ کہ میرے امتحان ہونے والے تھے، دوسرے ابا کے بعد زمینوں کی دیکھ بھال کا سارا بوجھ مجھے سنبھالنا تھا۔ چچا نے تو اماں کو مشورہ دیا تھا کہ اب ہمیں زمینیں اور حویلی بیچ باچ کر مراد آباد میں بس جانا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ زمینیں بیچ کر اتنا کچھ مل جائے گا کہ میں کوئی اچھا بزنس کر لوں گا۔ ان کا یہ خیال اپنے مفاد کی وجہ سے بھی تھا۔ جب تک ابا حیات تھے وہ ایسی کوئی بات کرنے کی جرات نہ کر سکے تھے۔ ابا انھیں، چھوٹے چچا اور تایا جی کو ایک مناسب رقم ہر ماہ بھیجتے رہتے تھے۔ مجھے بھی اماں نے ہدایت کر دی تھی کہ میں سب سے پہلے ان لوگوں کو رقم بھیجا کروں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابا نے جن لوگوں کو زمینوں کی دیکھ بھال پر رکھا تھا وہ ایماندار لوگ تھے، خوف خدا رکھتے تھے اور ابا، اماں کے دکھ سکھ کا خیال رکھا تھا۔ بالخصوص خورشید چاچا، جنھوں نے سارا انتظام خود سنبھالا ہوا تھا۔ وہ دنیا میں اکیلے تھے۔ انھوں نے شادی بھی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی بکھیڑا نہ تھا۔ وہ وہیں زمین پر بنائی گئی ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتے تھے۔ جس میں تین کمرے تھے۔ ابا کے بعد انھوں نے مجھے ہر طرح اطمینان دلایا تھا کہ میں توجہ پڑھائی پر مبذول رکھوں اور وہ زمینوں کی دیکھ بھال

کرتے رہیں گے۔ فصلوں کا سارا حساب کتاب انھوں نے ابا کی موت کے فوراً بعد اماں کو دے دیا تھا۔ اماں ان کے کام سے مطمئن تھیں مگر ان کی سختی سے ہدایت تھی کہ پڑھائی کے بعد کا وقت میں زمینوں کے معاملات کو سمجھنے میں گزاروں۔

رفتہ رفتہ حالات پر سکون ہوتے گئے۔ میں امتحان دے کر فارغ ہو گیا۔ سنسنی خیز واقعات کا خاتمہ ہوا تو میری تمام توجہ زمینوں کی طرف ہو گئی۔ تعلیم بھی جاری رکھی اور دوسرے معاملات بھی سنبھالتا رہا۔ اب میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ ابا کی موت کو سال بھر گزر چکا تھا۔ ان کی برسی کے دن قریب آ رہے تھے۔ میں نے برسی کے انتظامات کر لیے تھے۔ برسی کے روز سے دو دن قبل ہی چھوٹے چچا' بڑے چچا اور تایا جی بھی آ گئے۔ تائی جی اپنی بیٹی کی وجہ سے نہ آ سکی تھیں۔ اماں نے تایا جی سے کہا کہ وہ بڑی پھوپی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہاں رہنے سے ان کا بر جڑ جائے۔ تایا جی نے ہامی بھر لی۔ میں نے اماں سے کہا کہ اس طرح وہ اکیلی ہو جائیں گی اور میری بہنیں بھی پھوپی سے بہت مانوس تھیں اور ان کی وجہ سے انھیں بڑی ڈھارس تھی مگر اماں کو نہ اپنی فکر تھی نہ بچیوں کی' انھیں تو صرف پھوپی کا غم کھائے جا رہا تھا۔ پھوپی یہاں سے جانے پر تیار نہ تھیں مگر بہرحال انھیں اماں کا فیصلہ ماننا پڑا۔

یہ برسی سے ایک روز پہلے کی بات ہے۔ رات میں کافی تھک کر سویا تھا۔ امید نہیں تھی کہ صبح سے پہلے آنکھ کھل سکے گی مگر جانے کیا ہوا؟ آدھی رات کو اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کر بستر سے کھڑا کر دیا۔ میں حیران کھڑا تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں کہ ہوا کیا اور میں سوتے سوتے یوں اچانک کھڑا کیسے ہو گیا' پھر جیسے ہی کچھ حواس بحال ہوئے میں نے دروازے کے قریب ایک سایہ سا دیکھا۔ گو اس کے خدوخال نظر نہیں آ رہے تھے' نہ ہی مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر پھر بھی مجھے نہ معلوم کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ سایہ مجھے بلا رہا ہے۔ مجھے کمرے سے باہر آنے کو کہہ رہا ہے۔ میں بے اختیار اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سایہ جو یقیناً کسی عورت کا تھا ہوا میں تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے تھا۔ اس وقت میرے اندر کوئی احساس نہ تھا' نہ ڈر' نہ حیرت اور نہ ہی تجسس۔ میں کسی مشین کی طرح اس کے اشارے پر حرکت کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ سایہ ایک جگہ تھم گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں مجھ سے کچھ فاصلے پر چھوٹے چچا کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اس سائے نے ہاتھ سے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور میں اس طرف بڑھ گیا میں جونہی کھڑکی کے قریب پہنچا' چچا کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ وہ وہاں اکیلے نہیں تھے بلکہ ان کے قریب ہی گنگوا موجود تھا۔ گنگوا ان کا ملازم تھا جو دیکھنے میں کوئی پہلوان لگتا تھا۔ چچا اس سے کہہ رہے تھے "ہشیار ہو کے جانا۔ وہ مریل سا بچہ ہے تمھیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔"

"مگر بابو جی! اگر کسی کو پتا چل گیا تو! سوچ لینا۔"

"باؤلا ہوا ہے کیا۔ اب اس حویلی میں سال بہ سال ایسی عجیب و غریب موتیں ہوتی رہی ہیں۔ اب تو یہاں پولیس بھی تفتیش کے لیے آتے ڈرتی ہے۔ علاوہ ازیں گھر والوں کو شک ہو گا نہ کسی اور کو' تو مارتے ہی یہ سفوف اس کی لاش پر مل دیجیو۔ وہ بدبو کے بھبکے اڑیں گے کہ کوئی غسل بھی دینے کو تیار نہ ہو گا۔ اب چٹکی بجاتے میں ساری جائیداد ہاتھ میں آ جائے گی' اور۔ اور یہ حویلی تو لے لیجیو۔"

"اتا ہی علوہ ہے تو آپ یہ کام کیوں نہیں کر لیتے' اور اب سے پہلے ہی کیوں نہ کر لیا۔ اتی عمر بھائی کا دست نگر بن کر گزار دی۔"

"ایک تو تو بولتا بہت ہے۔ ساری ذمے داری میری رہی۔ بس تو پھندے کو یوں کسیو کہ دم گھٹ جائے پر آنکھیں نہ ابل پڑیں۔"

میں ساری بات سمجھ چکا تھا اور یہ جان کر حیرت سے گنگ رہ گیا تھا کہ چچا مجھے قتل کروا رہے تھے' وہ اگر جائیداد کے لیے ایسا کر رہے تھے تو یہ بڑی گھٹیا بات تھی کیونکہ ابا اور اماں نے سب کا ہمیشہ بہت خیال رکھا تھا اور ہمیشہ بن مانگے ہی انھیں بہت کچھ دیا تھا۔ بغیر ذمے داری یا کسی محنت کے انھیں ہر ماہ ایک بڑی رقم مل جاتی تھی۔ وہ اگر مزید کچھ چاہتے تھے تو مانگ سکتے تھے مگر وہ مجھے قتل کرا کے تمام جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے' یہ بات میرے لیے دکھ کا باعث تھی۔ میں اب بھی وہیں کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ اسی لمحے مجھے اس سائے کا خیال آیا جس نے میری جان بچائی تھی اور مجھے سوتے سے اٹھا کر یہاں تک لایا تھا۔ میں پلٹا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اماں کو ساری بات بتا دوں مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ وہ پریشان ہو جائیں گی اور انھیں بے پناہ دکھ ہو گا۔ بہرحال اب مجھے اپنی جان بچانا تھی۔ میں دبے پاؤں برآمدہ عبور کر کے بہنوں کے کمرے کے برابر والے کمرے میں آ گیا جہاں اماں تہجد کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں وہیں کونے میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اماں نے سلام پھیر کر میری طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے وقارالحسن!"

"نیند نہیں آ رہی اماں!" میں نے جھوٹ بولا۔

"تمھاری آنکھوں میں نیند بھری ہے اور تم کہہ رہے ہو۔"

"اماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے پھر جھوٹ بولا۔ میں ان سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا۔

"یہاں لیٹ جاؤ۔" انھوں نے کہا اور تسبیح پڑھنے لگیں۔

میں نے پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اسی لمحے وہ سایہ لہراتا ہوا میری بند آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ میں یاد کر رہا تھا کہ وہ سایہ کیسا تھا اور کس کا تھا' اگر یہ شکنتلا کا سایہ تھا تو مجھے حیرت زدہ ہونا چاہیے کہ آج اس نے میری جان لینے کی بجائے میری جان بچائی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ ممکن ہے وہ خود میرا شکار کرنا چاہتی ہو اور ابھی وہ وقت نہ آیا ہو اسی لیے وہ کسی اور کے ہاتھوں میری موت کو پسند نہ کرتی ہو۔ جو کچھ بھی تھا میں اس کا شکر گزار تھا۔ اس نے آج مجھ پر احسان کیا تھا ورنہ چند ہی لمحوں بعد لوگوں کو میرے کمرے سے میری لاش ملتی اور کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ یہ حرکت چھوٹے چچا کی ہے' ان کی جس کو ابا اور اماں نے بچوں کی طرح پالا اور ان کا اپنے بچوں سے بڑھ کر خیال رکھا۔ میری لاش بھی دادی اماں کی لاش کی طرح ایک کونے میں پڑی رہتی اور غسل دیے بغیر دفنا دی جاتی۔ پھر جانے اماں اور بہنوں کا کیا حشر ہوتا یہ سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بس مجھے حیرت تھی تو صرف یہ کہ شکنتلا نے مجھے کیوں بچایا۔

میں ابھی اسی سوچ میں تھا' اماں تسبیح ختم کر کے جائے نماز اٹھا رہی تھیں کہ اچانک کسی کی چیخوں سے حویلی کے در و دیوار لرز گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کو کند آرے سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ ہم سب ہی اپنے اپنے کمروں سے بیک وقت نکل پڑے تھے۔ آوازوں کی سمت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بہنیں' چچیاں اور پھوپی بری طرح چیخ رہی تھیں اس لیے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چچا' تایا وغیرہ بھی سب کمرے سے نکل کر بڑے برآمدے کی طرف بھاگ پڑے تھے' شاید انھیں اس سمت سے آواز آتی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے چیخ کر سب کو خاموش کرایا اور خود بھی ان کے پیچھے لپکا' اسی لمحے چچا وغیرہ پلٹ کر دوسری سمت بھاگے ب آواز دائیں جانب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی

بھاگ دوڑ میں' میں چھوٹے چچا سے ٹکرا گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی چچا ساکت رہ گئے۔ "تت۔۔۔ تم۔۔؟"

"یہ آواز کس کی ہے؟" تایا پکارے۔ سب حواس باختہ تھے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ذبح ہونے کی سی کرب انگیز آوازیں جیسے ہواؤں کے دوش پر چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ تایا کی آواز پر سب بوکھلا اٹھے اور ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ خاندان کے سبھی افراد موجود تھے۔

"گنگوا۔" میرے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔ چھوٹے چچا کو جھٹکا سا لگا اور وہ بے تحاشہ میرے کمرے کی جانب دوڑ پڑے۔ ان کے پیچھے ہم سب بھی تھے۔ عورتوں کی اس طرف آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر اماں تسبیح ہاتھ میں لیے میرے پیچھے تھیں۔ بڑا برآمدہ عبور کرتے ہی ہم سب کی نگاہیں میرے کمرے کے دروازے پر جم گئیں جو ہوا کے ساتھ ہل رہا تھا۔

سب وہیں ٹھٹک گئے تھے۔ آواز اندر سے آ رہی تھی۔ ایسی خوفناک آواز تھی کہ کلیجہ دہل رہا تھا۔ میں نے آج پہلی بار دل کی دھڑکن کو تیز ہوتے محسوس کیا تھا۔ میں لرزتے قدموں سے آگے بڑھا۔ تایا جی نے میرا بازو پکڑ کر گھسیٹنا چاہا مگر میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور بغیر رکے اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ میں پوری جان سے لرز گیا۔ میں نے ایک دم پلٹ کر اماں کو وہیں دروازے پر روک دیا۔ "اماں! آپ۔۔۔ آپ جائیں۔"

"کک۔۔۔ کیوں! کون ہے؟۔۔۔ کیا ہوا ہے وقار۔۔۔؟"

"اماں! گنگوا ہے چھوٹے چچا کا ملازم۔"

"مگر وہ۔۔۔ یہاں۔۔۔" اماں حیرت سے بولیں۔

"آپ جائیں بھابی دلھن۔" چھوٹے چچا گھبرا کر بولے' پھر انھوں نے دور کھڑی چچی کو اشارہ کیا' وہ اماں کے منع کرنے کے باوجود انھیں زبردستی دوسری طرف لے گئیں۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ گنگوا بیچ فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رسی کا پھندا تھا۔ ایک نیلے رنگ کی شیشی اس کے پاس ہی پڑی تھی اور ایک موٹا سانپ اس کے سینے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ جس کی دم والا حصہ اب بھی گنگوا کے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ میں حیرت سے اس سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ سانپ کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بڑا شاہانہ تھا۔ یوں جیسے کوئی بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا ہو۔ وہ سانپ مجھے بے حد خوب صورت لگا اور مجھے اس سے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا۔ اصولاً اور قانون کے مطابق اس کی اطلاع دینا پولیس میں ضروری تھا'

حالانکہ میں جانتا تھا کہ کوئی پولیس والا یہاں آکر تفتیش کرنے پر تیار نہ ہو گا مگر اطلاع کرنا بہرحال ضروری تھا۔ میں نے تایا سے کہا کہ وہ تھانے اطلاع کرا دیں۔ سب ابھی تک دروازے کی چوکھٹ ہی میں مبہوت کھڑے تھے۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر سانپ کو مارنے یا بھگانے کی کوشش کرتا۔ گنگوا کا رنگ آہستہ آہستہ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر سانپ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لوں مگر یہ خواہش پوری کرنا بھی میرے بس میں نہ تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم سب وہیں کھڑے رہے۔ سانپ بالکل اسی انداز میں گنگوا کے سینے پر بیٹھا رہا۔ گھنٹے بھر بعد ہی علاقے کا ایس ایچ او دو سپاہیوں کے ساتھ چلا آیا مگر کمرے میں داخل ہونے کی ہمت اس نے بھی نہ کی۔ اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے ہی میں کھڑے ہو کر اندر دیکھا اور کچھ لکھتا رہا پھر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

"چھوٹے مرزا! میں نے یہاں آکر بہت سی داستانیں سنی تھیں مگر یقین نہیں کیا تھا۔ میں... میں اس سانپ کو گولی بھی مار سکتا ہوں مگر... میرا خیال ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہتر نہ ہو گا۔"

"ٹھیک کیا آپ نے... میں بھی آپ کو ایسا نہ کرنے دیتا۔ آپ بس ضروری کارروائی کریں تاکہ معاملہ الجھ نہ سکے۔"

"چھوٹے مرزا! میرا خیال ہے کہ یہ حویلی خالی کر دینا چاہیے۔ اس طرح تو آپ سب کی جان کو خطرہ ہے۔"

"ہماری جان کو ہر جگہ خطرہ ہے' آپ فکر نہ کریں۔"

مجھے ان کا یہ مشورہ پسند نہیں آیا تھا۔

ہم پھر اس کمرے کی طرف بڑھے' چچا تایا اور بڑے چچا سب ہماری ہی طرف متوجہ تھے۔ چھوٹے چچا کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت ان کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ وہ میری جگہ گنگوا کو دیکھ کر بری طرح دہشت زدہ ہو گئے تھے' اگر وہاں سانپ موجود نہ ہوتا تو شاید وہ گنگوا کے قتل کا شبہ مجھ پر کرتے مگر سانپ کی موجودگی نے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ اب مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میری حفاظت کر رہا ہے' اور یہ سب کچھ مجھے بچانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ہم کمرے کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب وہاں سانپ نہیں تھا۔ گنگوا کی لاش گہرے نیلے رنگ کی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونوں اور ناک سے ویسا ہی گدلا پانی نکل رہا تھا جیسا میں اب سے پہلے پھوپا کی ناک سے نکلتا دیکھ چکا تھا۔

اگلے روز ابا کی برسی تھی اور پھر ہمارے آنگن میں ایک جنازہ رکھا تھا۔ چھوٹے چچا کی حالت اب بھی بہت خراب تھی' وہ لاش کو مراد آباد لے جانا چاہتے تھے مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے زیادہ دیر تک رکھا جاتا۔ سب کے مشورے کے مطابق چچا نے اس کے گھر والوں کو یہیں بلوا لیا اور وہ لوگ رات کی گاڑی سے پہنچنے والے تھے۔ لاش کو اس وقت تک حویلی میں رکھنا ناممکن تھا کیونکہ بو چاروں طرف پھیلنے لگی تھی۔ ہم نے لاش کو حویلی کے پچھلے حصے میں بنے چبوترے پر رکھوا دیا۔ یہ حصہ کیونکہ بالکل الگ تھلگ اور کھلا تھا اس لیے بدبو ناقابل برداشت نہ تھی اور پھر اس حصے تک بھی اس شدت سے نہیں پھیل رہی تھی۔ ہمیں بہرحال اس کے خاندان والوں کا انتظار کرنا تھا۔ ہم مرد اسی حصے میں پلنگ ڈال کر بیٹھ گئے تھے جہاں لاش رکھی تھی۔ چھوٹے چچا نے غالباً رسی اور وہ شیشی کہیں غائب کر دی تھی جو گنگوا کے پاس پڑی تھی۔ میں نے بھی ان دونوں چیزوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ تھانے دار نے مجھ سے ان چیزوں کے بارے میں سوال کیے تھے مگر میں نے بلکہ سبھی نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ چھوٹے چچا کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ میں خود بھی الجھ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کو پی جاؤں یا سب کو بتا دوں کہ گنگوا مجھے مارنے آیا تھا' اگر میں یہ بات بتاتا تو پھر اماں کو مطمئن کرنا میرے لیے مشکل ہو جاتا کیونکہ میں اس کی موت سے کافی دیر پہلے ہی اماں کے پاس جا چکا تھا' پھر اماں کو ساری باتیں بتانا پڑتیں اور میں فی الحال ایسا نہیں چاہتا تھا۔

اب' ایک برس بعد کھیل پھر شروع ہو چکا تھا۔ میں اس چکر کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا جو اب میرے لیے آسان ہو چکا تھا مگر میں یہ بھی چاہتا تھا کہ میرے چچا تایا گنگوا کی طرح زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ اب اگر انھوں نے ایسی کوئی کوشش پھر کی تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے مروانے میں چھوٹے چچا کے علاوہ کون کون شامل ہے مگر جائیداد ایسی چیز ہوتی ہے جس کے لیے ایمان ڈگمگاتے دیر نہیں لگتی۔

شام کافی ڈھل گئی تھی۔ ہم سب چبوترے سے کافی فاصلے پر بیٹھے تھے' اسی لمحے میری نگاہ آسمان پر دور سے نکلتے چاند کی طرف اٹھ گئی تب مجھے یاد آیا کہ آج چودھویں کی رات ہے۔ ابھی تو چاند کے عکس کو کنویں کے پانی میں اترنے کو بڑا وقت پڑا تھا۔ گنگوا کے گھر والے آچکے تھے۔ بڑے قبرستان میں قبر کھودی جا چکی تھی۔ یہ پہلا جنازہ تھا جس میں' میں شریک تھا اور سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ ہم جنازہ لے کر قبرستان پہنچے' گنگوا کو دفنا کر جب سب لوگ گھر واپس آنے لگے تو میں وہیں رک گیا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے جاؤں۔ ابا' دادا' دادی اور بڑے دادا جی کی قبریں یہیں تھیں۔ بڑے دادا جی کی قبر تو برابر ہو چکی تھی صرف سنگ مرمر کا کتبہ تھا جو چاندنی میں چمک رہا تھا مگر دادی اور ابا کی قبر نہیں بیٹھی تھی۔ میں نے تمام قبروں پر اگر بتیاں سلگائیں۔ فاتحہ پڑھی اور ابا کی قبر کے سرہانے آبیٹھا۔

تایا میرا ارادہ سن کر حواس باختہ تھے۔ "باؤلے ہو گئے ہو تم۔ تمھاری اماں حویلی سر پر اٹھا لیں گی۔ نہ تو یہ وقت ہے یہاں ٹھہرنے کا اور... اور پھر آج چودھویں کی رات ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔"

"تایا جی! میں کچھ دیر میں واپس آجاؤں گا۔ میں یہاں بیٹھ کر تلاوت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں... تم ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلو گے۔ پھر چاہو تو چلے آنا مگر اماں کو بتا کر۔ اور میری مانو تو... جوانی کے جوش میں نہ آؤ۔ عقل سے کام لو' یہ رات ہمارے خاندان پر بہت بھاری گزرتی ہے۔ مجھے... مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ آج میں یہاں آیا ہی کیوں... برسی کا کوئی اور دن بھی تو مقرر ہو سکتا ہے۔" وہ بہت زیادہ پریشان تھے اور کسی صورت بھی مجھے چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ ان کی ضد کی وجہ سے میں چلا آیا حالانکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"پتا نہیں کیا عذاب ہے۔ یہ چاند کہیں دفع کیوں نہیں ہو جاتا۔ ہم تو اس چاند کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ رات ہمیشہ جاگتے اور وصیتیں کرتے گزرتی ہے۔" تایا ابو بڑبڑا رہے تھے۔

انھوں نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ ہم سب چاند کے قیدی ہو کر رہ گئے تھے مگر بھلا چاند کہاں جاتا' اسے تو نکلنا تھا' ہمیشہ نکلتے رہنا تھا۔ یہ عذاب ہمیں ہمیشہ کاٹنا تھا۔ یہ چودھویں کی رات جو لوگوں کی زندگیوں میں محبتیں' رنگینیاں اور لطافتیں لے کر آتی ہے ہمارے لیے موت کا گرداب بن کر رہ گئی تھی۔ میں اس قید سے رہائی چاہتا تھا۔ چودھویں رات کی تمام لطافتیں' اور رنگینیاں' سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ تبھی میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اپنے آپ کو چاند کا قیدی نہیں بننے دوں گا۔ اپنے خاندان کو اس عذاب سے نجات دلاؤں گا' چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔

آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ میں اسے کھونا

نہیں چاہتا تھا۔ ابا کے انتقال کے بعد سے ہی میں نے ہر چودھویں کی رات انتظار میں گزاری تھی مگر وہ تمام راتیں خاموش دبے پاؤں گزر گئی تھیں مگر یہ رات... مجھے لگ رہا تھا کہ آج کی رات میرے لیے بہت اہم ہے۔ کل شکنتلا میرے پاس آئی تھی گو اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا الٹا میری جان بچائی تھی اور یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ اس نے روایت سے ہٹ کر ایسا کیوں کیا۔ میں تایا ابو کی ضد اور پریشانی کی وجہ سے واپس تو آ گیا تھا مگر میرا دل بہت مضطرب تھا۔ ایک بے چینی سی تھی جو مجھے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اس رات تایا ابو نے عجیب قصہ نکال لیا۔ وہ بضد تھے کہ ہمیں یہ حویلی خالی کر کے مراد آباد شفٹ ہو جانا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم مراد آباد میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے خورشید چاچا ہے' میں کیونکہ تعلیم حاصل کر رہا ہوں اس لیے بھی میرا یہاں رہنا بے کار ہے۔ اس زمانے میں امروہہ میں کالج نہیں تھا اور مجھے کالج میں داخلے کے لیے ہرحال میں یہاں سے باہر جانا تھا۔ ابا مجھے دہلی یا علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کا اظہار وہ اماں سے کئی بار کر چکے تھے۔ اب جو تایا ابو نے قصہ نکالا تو میری بہنیں اور پھوپی سر ہو گئیں کہ ہم کب تک یہاں' اس لق ودق حویلی میں خوف اور تنہائی کی زندگی گزاریں۔ اماں یہ پشتینی حویلی چھوڑنے کو تیار تو نہ تھیں مگر یہ خیال تو انھیں بھی پریشان کر رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ لے دے کر میں ہی رہ گیا تھا۔ چچا تایا کی محفوظ زندگی نے انھیں بھی اس پر مجبور کر دیا اور رات کے پچھلے پہر یہ طے پا گیا کہ ہم سب تایا اور چچا کے ساتھ ہی مراد آباد چلے جائیں گے۔ میں اس فیصلے پر خوش نہیں تھا۔ کوئی اندر سے مجھے ٹھہر جانے کو کہہ رہا تھا مگر میں اماں اور بہنوں کی پریشانی سمجھ رہا تھا' سو میں نے ان کے فیصلے کو تسلیم کر لیا' مگر ساتھ ہی ساتھ دل میں اس عہد کو بھی دہرایا کہ میں اس حویلی سے اپنا ناتا کبھی نہیں توڑوں گا اور اس اسرار کو ختم کر کے رہوں گا۔ کافی رات گئے ہم اپنے اپنے بستروں پر پہنچے۔ مجھے اماں نے اس کمرے میں نہیں جانے دیا جہاں میں سوتا تھا اور جہاں کل رات گنگوا مارا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے کمرے ہی میں میرا پلنگ بھی ڈال دیا تھا۔ میں بستر پر لیٹ کر سوچوں میں ڈوب گیا۔ مجھے اس لمحے کا انتظار تھا جب چاند کا عکس کنویں میں اترتا۔ آج نامعلوم کیوں مجھے یقین سا ہوتا جا رہا تھا کہ شکنتلا مجھ تک ضرور پہنچے گی' کچھ نہ کچھ آج پھر ہو گا' کیا ہو گا یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اماں بستر پر لیٹتے ہی سو گئیں۔ انھوں نے ابا کے دیے ہوئے تعویز کو میرے گلے میں ڈال دیا تھا۔ کالے دھاگے پر کچھ پڑھ کر اور گرہیں لگا کر میری کمر میں پہنا دیا تھا اور سوتے سوتے مجھ پر آیت الکرسی کا دم بھی کر دیا تھا۔ میں خود بھی آیت الکرسی کا ورد کر رہا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ نیند نہ آنے کی وجہ صرف چودھویں رات ہی نہیں تھی بلکہ کل رات والی سازش بھی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے کہ اگر مجھے اس سائے نے نہ اٹھا دیا ہوتا تو اس وقت میں کسی قبر میں لیٹا اپنا حساب دے رہا ہوتا' اور اتنی بڑی بات کو پی جانا بھی کوئی کھیل نہ تھا۔ اب مجھے ایک ہی طرف سے نہیں دوسری طرف سے بھی خطرہ تھا۔ چچا اگر میرے خلاف اتنی بڑی سازش کر سکتے تھے تو وہ یہ کوشش دوبارہ بھی کر سکتے تھے۔ پھر تایا کا مراد آباد میں رہنے پر زور دینا مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ فیصلہ تو وہ ابا کے انتقال کے بعد بھی کر سکتے تھے' بلکہ اس فیصلے کا صحیح وقت ہی وہ تھا۔ اس وقت میں اب سے ایک برس چھوٹا تھا مگر شاید وہ لوگ منتظر تھے کہ کس چودھویں شب کو میرا نمبر آتا ہے۔ سال بھر گزرنے کے بعد بھی میں زندہ تھا' شاید اسی بات نے ان لوگوں کو پریشان کر دیا تھا۔ دادی کے انتقال کے بعد بھی چھے برس تک کوئی واقعہ نہ ہوا تھا' اور اب بھی کوئی گارنٹی نہ تھی کہ میں کب ان عذابوں کی بھینٹ چڑھتا ہوں۔ ابھی تو میں ان کی نظر میں ناسمجھ بچہ تھا۔ کچھ برسوں بعد تو میں معاملات کی اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھ لیتا۔

میں جوں جوں سوچ رہا تھا' ایک کتاب سی میرے سامنے کھلتی جا رہی تھی۔ سب کچھ یوں سامنے آتا جا رہا تھا جیسے کوئی ان دیکھے بورڈ پر سب کچھ لکھتا جا رہا ہو۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ میں بڑی آہستگی سے اٹھا۔ اسی لمحے کہیں دور پائل کی چھنک سی سنائی دی۔ میں نے کان کھڑے کر لیے۔ کچھ دیر یونہی پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا رہا۔ جب کافی دیر تک کوئی آواز نہ ہوئی تو میں نے اس چھنک کو اپنا وہم سمجھا اور دوبارہ لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ پائل کی چھنکار نے پھر مجھے چونکا دیا۔ اب آواز نسبتاً قریب سے آئی تھی اور بڑی واضح تھی۔ میں نے اماں کی طرف دیکھا کہ کہیں انھوں نے یہ آواز نہ سن لی ہو مگر وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر غضب کا سناٹا تھا۔ بہت دور برآمدے میں لگا بلب جل رہا تھا مگر اس کی روشنی بہت کم تھی۔ چاند کی روشنی ترچھی ہو کر صرف سامنے والی اونچی دیوار پر پڑ رہی تھی اور سارے صحن میں حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کا سایہ اندھیرا بن کر پھیلا ہوا تھا۔ میں وہیں دروازے کے پاس کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ گھڑی میری کلائی پر نہ تھی کہ وقت کا اندازہ کرتا مگر میرا خیال تھا کہ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ پائل کی چھنکار پھر کہیں کھو گئی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ چھنک میرا وہم تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ پوری حویلی کا ایک چکر لگا لوں مگر جانے کیا سوچ کر رک گیا۔ میں پلٹ کر کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ ہی دبی دبی سسکیوں کی آواز میرے پیروں سے لپٹ گئی اور میں وہیں بُت کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ آواز بھی پائل کی چھنک کی طرح معدوم ہو جائے گی مگر ایسا نہ ہوا بلکہ سسکیاں تواتر سے سنائی دینے لگیں۔ سسکیوں کی یہ آواز کسی لڑکی کی تھی اور بڑے برآمدے کے پاس سے آ رہی تھی۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہم جس حصے میں قیام پذیر تھے وہ بڑے برآمدے سے کافی فاصلے پر تھا۔ درمیان میں صحن تھا پھر سات کمرے تھے۔ ان کمروں کے درمیان میں کھلی راہداری سی تھی جس کا ایک دروازہ ہمارے حصے کے صحن کے بالکل سامنے تھا اور دوسرا حصہ دوسری طرف بڑے برآمدے میں تھا۔

یہ احساس ہوتے ہی کہ یہ آواز برآمدے سے آ رہی ہے' میں صحن عبور کر کے اس راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ راہداری میں داخل ہوتے ہی مجھے غیر فطری سی ٹھنڈک کا احساس ہوا یوں جیسے میں کسی سرد خانے سے گزر رہا ہوں۔ ٹھنڈی یخ ہوا میرے بدن میں سوئیاں سی چبھونے لگی۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نہ تو یہ سردیوں کا موسم تھا اور نہ ہی کل رات میں نے اس راہداری میں ایسی ٹھنڈک محسوس کی تھی جب میں یہاں سے وہاں تک ہزاروں چکر لگا رہا تھا۔ گھر کے سبھی لوگ یہی راہداری عبور کر کے اس حصے میں آئے تھے اور اسی حصے سے ہم نے گنگوا کی لاش لا کر اس چبوترے پر رکھی تھی۔

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ سسکیوں کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ اب مجھے دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ یوں کہ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں اور کچھ یوں بھی کہ برآمدے میں لگا بلب روشن تھا اس کے محدود حصے میں منجمد روشنی کا کچھ ہلکا پھلکا سا عکس اس چبوترے تک پہنچ رہا تھا۔ میں برآمدے تک پہنچا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ مجھ سے تقریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر کوئی سفید کپڑے میں لپٹا برگد کے بڑے پیڑ کے سائے میں بیٹھا تھا۔ قریب ہی چتا تیار تھی' لکڑیاں بالکل ایسے انداز میں رکھی تھیں جیسے کسی کی چتا تیار کی گئی ہو' پیڑ کے سائے میں بیٹھا وہ سایہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ میں کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ میرے بدن سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے پھوٹ رہے تھے' پسینے کی بہتی دھاروں کو میں بدن پر رینگتا محسوس کر رہا تھا۔ سسکیاں ہوا کے دوش پر تیر رہی تھیں۔ کبھی تیز اور کبھی ہلکی' کبھی پاس اور کبھی دور ہوتی یہ سسکیاں بڑی کرب انگیز تھیں۔ پھر میں نے وہاں ایک اور سایہ دیکھا۔ ابھی میں یہ سب دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے تایا ابو کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ مجھی کو پکار رہے تھے۔ میں تیزی سے پلٹا۔ وہ ہاتھ میں ٹارچ لیے اسی جانب آ رہے تھے' ان کے پیچھے اماں تھیں۔ میں نے گھبرا کر پھر برگد کے پیڑ کی طرف دیکھا' اب وہاں کچھ بھی نہ تھا' البتہ پائل کی ہلکی چھنکار مجھے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا تایا ابو تک پہنچ گیا۔ ان تک پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ واپس آتے ہوئے راہداری میں وہ ٹھنڈک نہیں تھی جو میں نے [illegible] برآمدے کی طرف جاتے محسوس کی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے۔ میرا تو دم ہی نکل گیا تھا۔" مجھے دیکھتے ہی اماں مجھ سے لپٹ گئیں۔

"پتا نہیں تمھارے اندر عقل کیوں نہیں ہے۔" تایا بگڑ کر بولے۔ "چلو ادھر۔"

ہم اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"بھابی دلھن! اس لڑکے کو سنبھال کر رکھیے۔ قبرستان میں بھی اوندھا ہو رہا تھا۔ بیٹا جی کا دل نہیں چاہ رہا تھا واپس آنے کو' اتنا کچھ ہو چکا اور ڈر' خوف نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے اس میں۔" وہ اب بھی غصے میں بولے جا رہے تھے۔

"بھائی صاحب! میں نے آپ کو خواہ مخواہ پریشان کیا۔ وہ تو میں نماز کے لیے اٹھی تو دیکھا کہ یہ بستر پر نہیں ہے۔" اماں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا اور مجھے اپنے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولیں۔ "زیادہ رستم بننے کی ضرورت نہیں ہے وقار' ہمارے پاس کھونے کے لیے اب کچھ نہیں رہا۔"

میں خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے آج ان لوگوں کی مداخلت کا بے حد افسوس تھا۔ تایا بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ اماں کچھ دیر بعد وضو کر کے اندر آئیں۔ مجھے وضو کرنے کا حکم دے کر وہ جائے نماز بچھانے لگیں۔ میں چپ چاپ باہر آ گیا۔ کمروں کے بائیں جانب باورچی خانہ تھا۔ اس کے باہر ہی تختی رکھی ہوئی تھی میں وہاں رکھی پیڑھی پر بیٹھ گیا اور وضو کرنے کے لیے قمیص کی آستینیں اوپر کرنے لگا۔ عین اسی لمحے میری نگاہ اس راہداری کی طرف اٹھ گئی۔ میرا جی چاہا کہ میں پھر اسی جگہ جا کر دیکھوں مگر اماں کے ڈر کی وجہ سے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور وضو کرنے لگا۔

کمرے میں داخل ہوا تو اماں نماز پڑھ چکی تھیں۔ میں نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہوا تو اماں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ وہ مجھے بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں وہیں ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"وقار الحسن! تم۔ وہاں کیوں گئے تھے؟"

"وہ اماں۔ میں۔"

"جھوٹ نہ بولنا وقار! میں کم از کم اپنی اولاد کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتی ہوں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے یا سچ۔ تم نے کل بھی مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں اس وقت سب کچھ سچ سچ سننا چاہتی ہوں۔"

میں حیرت سے اماں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میرا سچ انھیں کتنی پریشانیوں میں مبتلا کر دے گا۔ پھر بھی وہ مصر تھیں کہ میں سچ سچ انھیں سب کچھ بتا دوں۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا مگر یہ باتیں تو خود میرے سینے کا بھی بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ مجھے کسی نہ کسی سے تو یہ سب کچھ کہنا ہی تھا' پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اماں سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ وہ نہ صرف میری مدد کر سکتی تھیں بلکہ مجھے بہتر مشورہ بھی دے سکتی تھیں۔ تب میں نے دھیمی آواز میں انھیں سب کچھ بتا دیا۔ چھوٹے چچا کی سازش کے بارے میں سن کر میری توقع کے عین مطابق ان کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ انھیں امید نہیں تھی کہ جس کو انھوں نے بچوں کی طرح پالا ہے وہ ان کے خلاف ایسی خوفناک سازش بھی کر سکتا ہے۔ انھیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا مگر گنگوا کے پاس سے ملنے والی رسی اور شیشی نے انھیں یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ اس کا ان دونوں چیزوں کے ساتھ میرے کمرے میں موجود ہونا کوئی جواز نہیں رکھتا تھا۔

"مگر وقار الحسن! وہ کون تھا جس نے تمھیں جگایا ہو۔"

"وہ کوئی لڑکی تھی اماں!۔ اور آج۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے چبوترے پر جس لڑکی کے سائے کو دیکھا تھا وہ وہی تھی۔" پھر میں نے وہ سب کچھ بھی بیان کر دیا جو دیکھا تھا۔

"اب ایسی صورت میں ہمارا مراد آباد جانا مناسب ہے کہ نہیں۔!" اماں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں کوئی خطرہ نہیں' خطرہ صرف مجھے ہے اور میں وہاں نہیں رہوں گا۔ مجھے تو

الحال تعلیم حاصل کرنا ہے۔ میں علی گڑھ جانا چاہتا ہوں۔ وہیں ہوسٹل میں رہوں گا' مگر اماں! اس طرح ہم اس معاملے پر دھیان کیسے دے سکیں گے۔ اس بے چین روح کا سکون کیسے تلاش کریں گے؟"

"میں نہیں جانتی کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو سوامی جی بھی زندہ نہ ہوں گے اگر ہو سکے تو تم جے پور چلے جاؤ۔ جے پور میں شکنتلا کے کچھ خاندان والے رہتے ہیں۔ سوامی جی اکثر اپنے پوتے پوتیوں کے پاس جے پور جایا کرتے تھے۔ شاید تمہیں وہاں سے کوئی ایسی بات معلوم ہو سکے۔"

بات دل کو لگتی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جے پور جاؤں گا لیکن فی الوقت ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اماں کو مطمئن کر دیا تھا کہ مجھے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا اس لیے وہ میری جانب سے قطعی پریشان نہ ہوں۔ اس سائے کے مجھے جگانے اور بچانے کی بات سن کر تو اماں کو بھی اطمینان ہو گیا تھا۔ ہم نے اس رات بہت سی باتیں طے کیں۔ یہ فیصلہ کر لیا کہ اماں بہنوں اور پھوپی کو لے کر مراد آباد چلی جائیں۔ میں علی گڑھ جا کر یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ حویلی کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر میں نے اماں سے سختی سے کہہ دیا کہ اس حویلی کو بیچنے کی بات نہ کریں اور نہ ایسی کوئی بات مانیں۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں چچا اور تایا اماں کو مجبور کر سکتے ہیں کہ حویلی بیچ دی جائے۔

اگلے دن صبح ہی سے مراد آباد جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اماں نے ضروری سامان باندھ لیا۔ میں نے اماں کو اتنی رقم دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو مراد آباد میں کوئی مکان کرائے پر لے سکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اماں چچا یا تایا کے گھر جا کر رہیں۔ میری دونوں چچیاں بد اخلاق اور بد طینت عورتیں تھیں' اماں نے میری بات مان لی تھی۔ انھیں آج ہی مراد آباد کے لیے روانہ ہونا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اماں یہ سن کر بہت پریشان ہو گئیں کہ میں آج رات حویلی میں بالکل تنہا رہوں گا۔ میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ میں اگلے روز علی گڑھ روانہ ہو جاؤں گا۔ چچا تایا بھی میرے یہاں ٹھہرنے کے حق میں نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ میں بھی اسی وقت علی گڑھ چلا جاؤں۔ مجھے ان سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میں آج رات حویلی میں نہیں رہوں گا بلکہ اپنے دوست شرف الدین رضوی کے گھر رات گزاروں گا۔

بہرحال دوپہر تک وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ اماں نے بے پناہ نصیحتیں کیں۔ تعویز کا خیال رکھنے کو کہا۔ نماز روزے کی پابندی پر زور دیا' بہنیں میرے رکنے پر آبدیدہ تھیں۔ پھوپی بار بار مجھے پیار کر رہی تھیں' ان کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ میں خود بھی خود کو بڑا افسردہ محسوس کر رہا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں گھر والوں سے جدا ہو رہا تھا۔

میں انھیں چھوڑنے اسٹیشن تک گیا۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے کچھ گھبراہٹ محسوس کی۔ میں سیدھا شرف الدین کے گھر پہنچ گیا۔ صرف وہی جانتا تھا کہ میں مراد آباد کیوں نہیں گیا' اسے ان باتوں کا یقین نہیں تھا جو ہمارے خاندان کے بارے میں مشہور تھیں۔ یہ اتفاق تھا کہ ابا کی موت کے وقت وہ دہلی گیا ہوا تھا اور تین روز پہلے جب گنگوا مارا گیا' اس وقت وہ زمینوں پر تھا' کل ہی واپس آیا تھا اور اب تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اسے ان باتوں پر کبھی یقین نہ رہا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب مجھے اس کی ضرورت تھی کیونکہ کھیل اب میرے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ میں یہاں تنہا تھا اور کسی مددگار کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کے گھر گیا تو وہ موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چہک اٹھا۔ "وقار سنا ہے تمہاری طلسمی حویلی میں پھر کوئی واقعہ ہو گیا۔"

تب میں نے اسے گنگوا کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

"بس تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "یہ سارا جائیداد کا چکر ہے۔ تمہارے دادا جی سے یہ چکر چل رہا ہے اور اب تم آخری آدمی ہو۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ جائیداد کی خاطر ہی سارے ڈرامے کھیلے گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح تمہارے ساتھ کھیلا جا تا تھا۔ یار میری مانو تو جائیداد کا بٹوارا کر دو۔ سارا طلسم ختم ہو جائے گا۔"

"میں تمہاری بات مان لیتا شرف الدین اگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ سایہ نہ دیکھا ہوتا' اس کی سسکیاں نہ سنی ہوتیں۔ وہ سایہ پہلی بار میں نے ابا کی موت کے وقت دیکھا تھا' مگر بہت مبہم سا' دور سے۔ لیکن کل رات اور گنگوا کے قتل والی رات میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔" میں نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ! تم نے اسے کتنے قریب سے دیکھا تھا! اسے چھوا تھا؟ اس کے خدوخال دیکھے تھے؟" وہ کئی سوال ایک ساتھ کر گیا۔

"نہیں۔۔۔ وہ قریب تو تھی مگر۔۔۔ پتا نہیں روشنی ہونے کے باوجود میں اس کے خدوخال نہ دیکھ سکا اور وہ اتنے قریب نہ تھی کہ میں اسے چھو سکتا' پھر میں اسے چھو بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ کوئی انسان تو نہیں۔۔۔ روح ہے شرف الدین' میں پاگل ہوں' بھی تو اسے نہیں چھو سکتا۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم! بھیا جی! سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے اور پھر انسان جیسا شاطر یہاں کوئی جن بھی نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے تم میری بات مان کر دیکھو' جائیداد کے بٹوارے کے فوراً بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" اس نے پھر میرا انداق اڑایا۔

میں بہت پریشان تھا اس پر اس کی باتیں مجھے الجھا رہی تھیں۔ اس کی بات مان لینے کا تو کوئی جواز ہی نہ تھا۔ ٹھیک ہے کہ چچا نے ان واقعات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر محض اس بنا پر میں خود کو نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ "شرف الدین! تم صرف اتنا بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں!"

"لیکن۔۔۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو' دیکھو یار میں حساب کے مضمون میں ہمیشہ فیل ہوتا رہا ہوں۔ جائیداد کے چکر میں حساب کتاب کی ضرورت پڑے گی اور یہ میرے بس کی بات نہیں' میں برابر حصے نہیں کر پاؤں گا اور پھر تمہاری طرح وہ لوگ میری جان کے پیچھے بھی پڑ سکتے ہیں۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

میں جھنجلا کر وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ مجھے پکارتا ہی رہ گیا مگر میں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ نہ میری سنجیدگی کو محسوس کر رہا تھا اور نہ معاملے کی سنگینی کو' اس بات نے مجھے سخت مشتعل کر دیا اور میں نے اس سے مدد لینے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا تھا' میری موت جس طرح آنا تھی وہ تو آسمانوں میں لکھا جا چکا تھا مگر پھر بھی میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن میں خلوص نیت سے چاہتا تھا کہ میں اس معاملے کو حل کر سکوں۔ وہ واقعی کوئی روح ہے اور بے چین ہے تو میں اسے سکون پہنچا دوں۔ میں دادا جی کی' کی گئی ساری سفاکیوں کا حساب تو نہیں دے سکتا تھا مگر جس قدر ممکن تھا میں کرنے کو تیار تھا۔

میں سوچتا ہوا حویلی تک پہنچ گیا۔ پوری حویلی سنسان تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ میں کچھ خوف محسوس کر رہا تھا۔ آج یہاں میرے ہی قدموں کی چاپ میرا پیچھا کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ ہوتی تو یوں لگتا جیسے میرے قریب کہیں سانپ سرسرا رہے ہوں۔ میں نے پچھلے حصے میں جانے کی ہمت نہیں کی اور چپ چاپ اماں والے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا پھر ذہنی تھکن' جسمانی تھکن سے بڑھ کر تھی' لیٹے لیٹے میں جانے کب سو گیا۔

اچانک کسی شے سے میری آنکھ کھل گئی۔ یوں لگا جیسے مجھے اٹھایا گیا ہو۔ جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا جس کا احساس مجھے چند لمحوں بعد ہوا کیوں کہ آنکھ کھلتے ہی میں آنکھ کھلنے کا سبب سوچنے لگا تھا۔ اندھیرے کا احساس ہوتے ہی میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر بڑی مدہم روشنی تھی جس کی وجہ سے مجھے دروازے کا خلا کچھ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ میں اسی مدھم روشنی پر نگاہ جمائے اٹھا اور دیوار پر سوئچ تلاش کرنے لگا۔ بجلی آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ابھی ہم نے چند ہی کمروں میں فٹنگ کروائی تھی۔ کچھ دیر میں مجھے سوئچ مل گیا۔ میں نے جونہی بٹن دبایا' کسی آواز سے چونک اٹھا۔ روشنی کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کوئی مین گیٹ پر لگا پیتل کا کنڈا بجا رہا تھا۔ سونے کی وجہ سے مجھے وقت کا اندازہ نہ ہو سکا اور گھڑیال صرف میرے کمرے میں تھا۔ بہرحال مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ رات کافی گہری ہو چکی ہے۔ "اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" میں زیر لب بڑبڑایا۔ پھر میں نے آتشدان کے اوپر رکھی لالٹین اٹھائی' اسے جلایا اور لالٹین لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اماں تو مغرب کے وقت ہی طاقوں میں رکھے دیے جلا دیا کرتی تھیں جس سے صحن میں کافی روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ کنڈے کی کھٹ کھٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ لالٹین کے جلنے سے سائے بڑھ کر میرے قدموں سے الجھتے تو میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ جیسے ساری حویلی میں گونج رہی تھی۔ کمرے سے باہر گیٹ تک کا فاصلہ طے کرنے میں میرے پسینے چھوٹ چکے تھے۔ میں نے اتنی ہی دیر میں طے کر لیا تھا کہ میں آج رات یہاں نہیں گزاروں گا۔ شرف الدین کے گھر نہ گیا تو چچا مطلوب کے بیٹے کے پاس چلا جاؤں گا۔ وہاں تک جاتے جاتے میری پنڈلیوں میں درد ہو گیا' اس لیے کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بھاگ پڑوں اور میں خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ میں مین گیٹ کے قریب پہنچا تو دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی آواز' کوئی دستک نہ تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میرا وہم ہو گا پھر یاد آیا کہ جب میں گیٹ کی طرف آ رہا تھا اس وقت بھی کنڈا بجایا جا رہا تھا۔ "کون ہے؟" میں نے پکار کر پوچھا۔ میری آواز در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آئی تو میں خود ہی اپنی آواز سے ڈر گیا اور گھبرا کر گیٹ کھول دیا۔ سامنے ہی مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر کوئی جا رہا تھا جو میری آواز سن کر رک گیا۔ پلٹا ۔۔

پھر آہستہ قدموں سے میری جانب آنے لگا۔ باہر بھی اندھیرا تھا۔ پھر بھی میں نے دیکھ لیا کہ وہ کوئی آدمی تھا۔ "کک۔ کون۔؟" میں بولا تو زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

آنے والے نے زبردست قہقہہ لگایا۔ میں نے گھبرا کر دروازہ بند کرنا چاہا اسی وقت مجھے شرف الدین کی آواز سنائی دی۔ "ابے میں ہوں یار!" اور میں نے وہیں دیوار سے ٹیک لگا دی۔ "لو بھیا! آدمی سے تو ڈر گئے اور چلے ہو روح کو تسکین پہنچانے۔" اس کے لہجے میں اب بھی تمسخر تھا۔

"دیکھو شرف الدین۔ تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں ہے تو نہ کرو، مگر تم اس طرح میرا مضحکہ نہ اڑاؤ اور یہ کون سا وقت تھا آنے کا؟"

"میں نے سوچا ایسے وقت جاؤں جب یہاں روحوں کی بیٹھک لگی ہو۔ یار میں کبھی نہیں ملا کسی روح سے، بڑا شوق ہے یار۔ بچپن سے ہی بڑا شوق ہے۔ اماں ایک چڑیل کا قصہ سنایا کرتی تھیں، بڑا سسپنس تھا قصے میں، بڑا مزہ آتا تھا۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ ابھی رات کے صرف ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ اماں نے تمھارے لیے بھی کھانا بنا لیا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ تم یہاں، اس حویلی میں روحوں کے ساتھ رہو گے، اور میرا خیال ہے کہ روحیں کھانا پکانا نہیں جانتیں۔ چلو کھانا کھالیں۔"

"مجھے نہیں کھانا۔ تم نے بھلا میرے لیے یہ زحمت کیوں کرلی۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"محلے داری ہے یار! خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے آخر۔ چلو اب نخرہ نہ کرو ورنہ۔ چلو کھانا کھا کر واپس آجائیں گے، آج میں بھی یہیں رہوں گا۔ اچھا یہ بتاؤ وہ خوب صورت تو ہے نا۔ دراصل بدصورتی برداشت نہیں ہوتی۔" ہاتھ پھیلا کر اور کندھے اچکا کر بولا۔

"پھر وہی۔" میں نے اسے جھڑکا۔

"اچھا اب چلتے ہو یا۔"

اور میں جلتی ہوئی لالٹین اندر کی طرف رکھ کر اور گیٹ کا کنڈا لگا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا اور اپنی کمزوری اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ مجھے خوف نہیں تھا ورنہ میں یہاں بھلا کیوں رکتا، مگر پھر بھی میں انسان تو تھا۔ ماحول، انسان پر گہرا اثر ڈالتا ہے، ایک آسیب زدہ حویلی میں گھپ اندھیرا ہو، دور سے آتی آواز ہو اور تنہائی ہو تو انسان کچھ نہ کچھ تو خوف محسوس کرتا ہی ہے۔ وہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن اگر اس کی بھنک بھی شرف الدین کے کانوں میں پڑ جاتی تو وہ میرا جینا عذاب کر دیتا۔ وہ اب بھی بولے جا رہا تھا۔ روحوں، چڑیلوں اور بھوتوں کا مذاق اڑا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کچھ نہ جاننا، جان لینے سے کتنا اچھا ہے۔

ہم کچھ ہی دیر بعد شرف الدین کے گھر پہنچ گئے۔ بیٹھک میں دسترخوان لگا ہوا تھا۔ ہمارے جاتے ہی شگفتہ، شرف الدین کی چھوٹی بہن، کھانا لے آئی۔ میں نے شگفتہ کو بہت پہلے دیکھا تھا، شاید تین چار برس پہلے۔ وہ دبلی پتلی۔ سانولی سی لڑکی تھی۔ اس میں یاد رہ جانے والی کوئی بات نہ تھی مگر اس وقت میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سنہرے رنگ کی، بھرے بھرے بدن والی اور سیاہ خوب صورت آنکھوں والی لڑکی تھی۔ چپکے سے دل میں اتر جانے والی۔ وہ یوں میرے سامنے بھی پہلی بار آئی تھی۔ میں وہاں بیٹھا تھا۔ شرف الدین اندر گیا ہوا تھا اور شگفتہ دسترخوان پر پلیٹیں رکھ رہی تھی۔ اس کی جھکی جھکی پلکوں سے اور اس کے سنہرے رنگ سے کرنیں سی نکل کر چاروں طرف پھیلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں آج، اس لمحے میں جو کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا، میرے لیے بالکل نیا، اجنبی اور عجیب سا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے اب سے پہلے کسی لڑکی کو کہیں نہ دیکھا ہو۔ وہ خاموش، نگاہیں جھکائے کام میں لگی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی کلائی میں پڑی کانچ کی چوڑیاں آپس میں ٹکراتیں تو خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا ہو جاتا اور یہ ارتعاش میں اپنے سینے میں محسوس کرتا۔

"آیئے!" اس نے دھیرے سے کہا۔

اسی لمحے شرف الدین بھی آگیا۔ "آؤ یار۔" اس نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔ شگفتہ سلفچی اور لوٹا لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے صرف نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ میں اس کے قریب آگیا۔ دروازے کے ساتھ ہی کیاری بنی ہوئی تھی۔ اس نے میرے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ وہ اس لمحے مجھ سے اتنے قریب تھی کہ میں اس کے بدن سے اٹھتی خوشبوؤں کی لپٹوں میں ڈول سا گیا۔ اس کی کلائیوں میں جھلملاتی چوڑیاں رنگ سا بکھیر گئیں۔ میں گھبرا کر سیدھا ہو گیا۔ "شکریہ۔" میں نے دھیرے سے کہا اور جلدی سے پلٹ گیا۔ پلٹتے پلٹتے میں نے اس کے ہونٹوں کے کناروں میں مسکراہٹ دبی دیکھ لی تھی۔ شرف الدین بڑی بے چینی سے میرے آنے کا منتظر تھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

شگفتہ اسے یوں پاگلوں کی طرح کھانے پر ٹوٹتے دیکھ کر ہنس پڑی۔ "بھیا جی! اتنی بھوک ہے؟" جلترنگ سے بج اٹھے۔

"اور کیا۔ گھنٹوں اس کا کنڈا کھٹکھٹایا ہے۔ جناب استراحت فرما رہے تھے اور یہاں پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ یہ اماں بھی عجیب ہیں، سارے جہاں کا درد بس انھی کے جگر میں ہے۔ اور انھیں یہ بتانے والی تو تم تھیں کہ وقار الحسن کے گھر والے مراد آباد چلے گئے اور صاحبزادے یہاں تنہا ہیں۔ یہی بات تم صبح بتا سکتی تھیں تاکہ ہمیں تو وقت پر کھانا مل جاتا۔ بھئی پتا ہے میں سات بجے ہی کھانا کھا لیتا ہوں۔" وہ نوالے چباتے ہوئے مسلسل بولے جا رہا تھا۔

"اچھا اب تو کھانا کھا لیجیے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ مجھے بہن بھائی کا یہ مذاق بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک میرا گھرانا تھا کہ بہنوں کی پھٹی پھٹی آنکھیں اور خوفزدہ چہرے دیکھ کر ہنسنے مذاق کرنے کی بات تو دور رہی انھیں دیکھ کر مسکرانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا اگر کبھی جی چاہا تو صرف یہ کہ انھیں تسلی دوں، ہمدردی کروں اور بس۔ میں نے اپنی بہنوں کو ہنستے مسکراتے تو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ تو آپس میں باتیں بھی سرگوشیوں میں کیا کرتی تھیں۔ ہاں جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو یاد ہے کہ کھلے آنگن میں کھیلنے کو مچلا کرتے تھے اور بڑوں کی آنکھ بچا کر کبھی اگر ہم چبوترے کی طرف کھیلنے پہنچ جاتے تو اماں فوراً ہی آوازیں دینے لگتیں یا آکر ہم سب کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا کرتیں۔ ایسے میں جہانی آپا تو ہنستی چلی جاتیں مگر میں، شنو اور زرینہ رونے لگتے تھے۔ ہاجرہ اماں کی لاڈلی تھی اس لیے وہ کبھی سزا نہ پاتی تھی اور اماں ہمیشہ سب سے چھوٹی ہونے کا فائدہ دیتے ہوئے اسے بے قصور گردانتی تھیں۔

"کیا ہو گیا یار! کھانا کھالو۔ پتا نہیں پھر ملے کہ نہ ملے۔ ویسے آج چودھویں رات تو نہیں ہے نا؟" آخری جملہ شرف الدین نے شگفتہ سے کہا تھا۔

"کیوں۔ آپ کو چودھویں رات کیسے یاد آگئی۔" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ مجھے نہیں، یہ جو صاحب اس وقت بڑے معصوم بنے بیٹھے ہیں نا، یہ چودھویں رات کے بڑے دلدادہ ہیں۔ جان جاتی ہے ان کی چودھویں رات پر۔" اس نے طنز کیا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"بھیا جی!" اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ "ایسی باتیں نہ کریں۔ جس بات کو آپ مذاق سمجھتے ہیں اسے پورا علاقہ سچ جانتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کچھ؟ ابا سے پوچھیں، اماں سے پوچھیں، وہ بتائیں گے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔"

"ارے شگو! یہ کہانیاں ہیں سب۔ تم بھی کچے اعتقاد کی ہو۔ ارے بابا آج کے دور میں نہ جن ہیں نہ بھوت، اور روحوں کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو اسپرٹ ہوتی ہے انسان کی، انسان ختم ہوا تو یہ بھی ختم۔ اس کا کوئی وجود نہیں، کم از کم ہمارے مذہب میں ایسا کوئی قصہ نہیں کہ روحیں دنیا میں چکراتی پھر رہی ہیں، انتقام لے رہی ہیں۔ یا کسی سے محبت کر رہی ہیں۔ یہ سب تصورات ہندو کے ہاں ہیں، اور ہم کتنے پاگل ہیں، جو سنتے ہیں اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ اب تم اس کا دماغ خراب نہ کرو۔ ویسے دو چار روحیں تو میں بھی اسے دکھا سکتا ہوں۔" شرف الدین نے ہاتھ دھو کر گیلا ہاتھ ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"کہاں!" شگفتہ بول اٹھی۔

"قبرستان میں! ابھی کل ہی کی بات ہے جب میں زمینوں سے واپس آ رہا تھا تو تین چار آدمی قبروں کے قریب بیٹھے، سوری روحیں آدمی نہیں۔ روحیں، قبروں کے پاس بیٹھی شراب پی رہی تھیں۔ پھر ایک روح تو اٹھ کر ناچنے بھی لگی تھی، اگر مجاور ڈنڈا لے کر نہ آجاتا تو شاید مجرا صبح تک چلتا۔" اس نے پھر مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"تم نے کھانا کھا لیا؟" میں نے شرف الدین سے پوچھا۔ میں کافی سنجیدہ تھا۔ میری سنجیدگی دیکھ کر شگفتہ نے اپنی ہنسی گھونٹ لی تھی جو شرف الدین کی بات سن کر اس کے ہونٹوں پر چھلک آئی تھی۔

"جی حضور کھا لیا۔" وہ ذرا سا جھکا۔

"تو چلو۔"

"کہاں؟"

"قبرستان میں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔" میں نے بالکل اسی کے انداز میں کہا۔ "میں گنگوا کو دفنا کر سوچ رہا تھا کہ میں ابا، دادی اور دادا جی کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گا، کچھ دیر وہاں بیٹھوں گا پھر۔"

"کیوں۔" اس نے میری بات کاٹ دی اور میری جانب جھک کر سرگوشی کی۔ "کوئی مسئلہ ڈسکس کرنا ہے کیا؟"

"ہاں! مسئلہ ڈسکس کرنا ہے۔ تم چلتے ہو یا میں جاؤں!" میں کھڑا ہو گیا۔

"چلتا ہوں یار! وہ بھی اماں کی وجہ سے۔ یہ انھی کا حکم ہے کہ تمہیں تنہا نہ چھوڑا جائے۔ وہ تو چاہتی ہیں کہ تم یہیں رہ جاؤ مگر میں تمھاری عادت سے واقف ہوں۔ تم کسی حال میں بھی یہاں نہیں رکو گے۔ ویسے اماں نہیں جانتیں کہ میں بھی آج تمھارے ساتھ، تمھاری حویلی میں

رات گزاروں گا۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا ہے کہ ہم عاقل کے گھر رہیں گے۔(عاقل شرف الدین کا چچازاد تھا) اگر انھیں بھنک بھی پڑ گئی کہ رات حویلی میں گزارنے جارہا ہوں تو قیامت آجائے گی۔ وہ روحوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں' کہتی ہیں یہ دم میں مردوں کو سانٹ لیتی ہیں۔ پری والا ڈراما تو ہمارے ابا نے بھی کافی عرصہ چلایا تھا نا' بس وہیں سے بدکی ہوئی ہیں۔" وہ باتونی بولے ہی چلا گیا۔ اس کی باتوں پر تو اس وقت مجھے بھی ہنسی آگئی اور شگفتہ تو پیٹ پکڑ کر دوہری ہو گئی۔

"اچھا بھیا جی! میں ابا کو بتاؤں گی اور اماں سے بھی کہہ دوں گی کہ آپ وہاں جارہے ہیں۔"

"ارے نہیں شگو! اماں قیامت اٹھا دیں گی۔ اب تو وہ پری کو بھول گئی ہیں' پھر یاد آگئی تو ابا کا دانہ پانی کم از کم ہفتے بھر کو اٹھ جائے گا یہاں سے۔"

"آپ یہیں رہ جائیں نا۔ وہاں تو آپ کو خطرہ ہے۔" شگفتہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں خاتون! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو یونہی بکواس کرتا ہے۔"

"میں تمام واقعات جانتی ہوں۔ جہانی آپا نے بتایا تھا' اور اماں تو یہ سن کر پریشان ہو گئی تھیں کہ آپ اکیلے یہاں رک گئے ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ ہی چلے جانا چاہیے تھا۔"

"میں ایک دو روز میں چلا جاؤں گا۔" میرا جملہ سنتے ہی اس نے مجھے چونک کر دیکھا پھر جلدی سے سر جھکا کر برتن اٹھانے لگی۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے اسے میری یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

"اچھا اماں کو بتا کر آتا ہوں۔" شرف الدین یہ کہتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں اٹھ کر مونڈھے پر بیٹھ گیا اور شگفتہ کے روشن چہرے کو تکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ پلیٹیں اٹھا رہی تھی۔ اچانک اس نے نگاہ اٹھائی' مجھے اپنی جانب متوجہ پاکر کچھ جھجک گئی۔ میں بھی گھبرا گیا۔

"آپ۔ آپ چلے جائیں گے؟"

"جی!"

"کہاں؟"

"علی گڑھ۔"

"کیوں؟"

"پڑھنے۔ یہاں اکیلا کیسے رہوں گا؟ اماں تو مراد آباد لے جانا چاہتی تھیں مگر پھر میری تعلیم کا حرج ہو گا۔ میں علی

"وہاں کہاں رہیں گے؟"

"ہوسٹل میں۔"

"اکیلے؟"

میں ہنس پڑا۔ "وہاں تو بہت سے لڑکے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی اکیلا نہیں ہوتا۔"

"آیا تو کریں گے نا؟" اس کا جملہ میرے دل کو گدگدا گیا۔

"ہاں! حویلی خالی ہے۔ دیکھ بھال تو کرنا ہو گی۔"

"یہاں آپ کو تو بڑا خطرہ ہے۔ یہ حویلی منحوس ہے۔ میں تو کب سے جہانی آپا سے کہہ رہی تھی کہ اسے چھوڑ دیں۔"

"نہیں۔ وہ منحوس نہیں ہے۔ ہمارے پرکھوں کے کارناموں نے اسے منحوس بنا دیا ہے۔" میں نے دکھ سے کہا۔

"میں نے سنا ہے۔ دادی بتایا کرتی تھیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "دادا جی کی طرح کیا آپ کے والد بھی۔"

"نہیں۔" میں نے بات کاٹ دی۔ "میرے والد بہت شریف آدمی تھے۔"

"کیا وہاں سچ مچ روح ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں! میں اس سے مل چکا ہوں۔ دیکھا ہے میں نے خود۔"

اور وہ منہ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ "آپ نے؟ خود اپنی آنکھوں سے؟"

"ہاں!"

"کچھ کہا نہیں اس نے۔ میرا مطلب ہے نقصان۔"

"نہیں۔ وہ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ پھر خود ہی جھینپ گئی۔ "آپ کو ڈر نہیں لگا؟ کیسی تھی وہ؟"

"مجھے اچھی لگی اور ڈر بھی نہیں لگا۔ ویسے آپ کیوں چاہتی ہیں کہ وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بس۔" اس نے کہا اور پھر شرما کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں برتنوں کی ٹرے تھی۔ میرا جی چاہا کہ وہ یونہی میرے سامنے کھڑی رہے۔ پلکیں جھکائے۔ شرمائی شرمائی سی۔ مگر عین اسی لمحے شرف الدین آگیا۔ آتے ہی بول اٹھا۔ "اے چڑیل! اماں کو نہ بتا دینا کہ ہم حویلی جارہے ہیں۔"

وہ ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں اور شرف الدین باہر آگئے۔ "یار دیکھو! میں جلدی سونے کا عادی ہوں اور

موڈ بھی نہیں ہے۔"

"تو تم سے کون کہتا ہے کہ جاگو!"

"نہیں۔ بتا رہا ہوں۔ ویسے ہاں کوئی روح وغیرہ آجائے۔ نہیں فرض کرو آ ہی جائے۔" اس نے مجھے گھورتے دیکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تو مجھے جگا دینا۔ ڈرنا نہیں۔ میں اسے ذرا دھمکا کر بھگا بھی دوں گا اور اسی بہانے اسے دیکھ بھی لوں گا۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

"جی بہتر حضور! ضرور جگا دوں گا۔" میں نے جل کر کہا اور اس کی کمر پر دھپ لگائی۔

"نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے یار۔ ایک تو میں تمھارے ساتھ جارہا ہوں۔ گویا جان ہتھیلی پر رکھ دی ہے میں نے اور تم۔ تمھارا یہ ہتک آمیز رویہ۔"

اس نے کمر پر اس جگہ اشارہ کیا جہاں میں نے دھپ جمائی تھی۔

"اچھا بس۔ تم بولتے بہت ہو۔ تھکن نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے۔ جبھی تو جلدی سو جاتا ہوں' صرف اس لیے کہ زبان کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔"

"شکر ہے۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تم سوتے میں بھی بولتے رہتے ہو گے تو کیا ہو گا!" میں نے ہنستے ہنستے ہوئے کہا۔

حویلی قریب آگئی تھی۔ رات کے تقریباً پونے دس بج چکے تھے۔ میں گیٹ یونہی بھیڑ کر چلا گیا تھا اور لکڑی کا ایک ٹکڑا کنڈے میں اٹکا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس حویلی میں جانے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا۔ میں نے کنڈا ہٹایا اور ذیلی گیٹ کھول دیا۔ اندر لالٹین بدستور جل رہی تھی۔

"تمھارے ہاں چائے بنانے کا انتظام ہے؟"

"ہاں مگر مجھے چائے بنانا نہیں آتی۔"

"نہایت پھوہڑ ہو۔ روحوں کا آنا جانا ہے' کیا پلاؤ گے انھیں۔"

"یار شرف الدین! ایک بات بتاؤ۔ تم مسلسل میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو۔ آج تم میرے ساتھ یہاں رہو گے' اگر واقعی تمھاری ملاقات روح سے ہو گئی تو۔ تو کیا ہو گا۔ دیکھنے میں تو تم بہت بہادر لگتے ہو۔"

"اس میں کیا شک ہے! ورنہ دیکھو بھیا اگر ملاقات ہو ہی گئی تو تم فکر نہ کرو۔ باتوں میں الجھا کر گدی ناپ لوں گا' پھر ہم اس کا کریا کرم کر دیں گے اور یوں روح کو سکون آجائے گا' وہ یہ ساری آوارہ گردی بھول جائے گی۔"

مذاق مذاق میں اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ "ارے اوہ۔"

"کک۔ کیا ہو گیا۔ کیوں ڈرا رہے ہو یار۔" وہ گھگھیانے لگا۔

"تم نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے شرف الدین۔ یہ خیال تو کسی کو بھی نہیں آیا۔" میں نے جوش میں اس کا ہاتھ دبا دیا۔

"اف۔" وہ تڑپ اٹھا۔ "یار رہنے دو۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو' ویسے تو تم بہت لاغر دکھائی دیتے ہو' اتنی طاقت کہاں سے آگئی تمھارے اندر؟" وہ اب بھی اپنا ہاتھ سہلا رہا تھا۔

اب ہم اماں والے کمرے تک پہنچ گئے تھے۔ اندر بتی روشن تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر شرف الدین کو پلنگ پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "یہ بتاؤ! ہندو اپنی لاش کو جلاتے ہیں نا؟"

"اپنی نہیں دوسرے کی لاش کو جلاتے ہیں۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں ایک ہی بات ہے۔ اس نے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی لاش کسی کو نہیں ملی یا شاید کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔ اگر ہم اس کی لاش تلاش کر کے اسے شمشان گھاٹ لے جا کر جلا دیں تو۔ تو اسے سکون آجائے گا۔"

"ہم کیوں کہہ رہے ہو۔ ان لوگوں سے تمھاری پشتینی دوستی یا راہ و رسم ہے۔ مجھے اس چکر میں نہ ڈالو۔ مجھے چتا جلانے کا کوئی تجربہ نہیں۔"

شرف الدین خدا کے واسطے سنجیدہ ہو جاؤ۔" میں جھنجلا گیا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔ زیادہ سنجیدہ ہو کے مضحکہ خیز ہو جاتا ہوں۔ تم سوچو کیا کرنا ہے۔ میں اتنی دیر میں چائے بنا لیتا ہوں۔ باورچی خانہ کدھر ہے؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے باورچی خانہ بتا دیا اور خود وہیں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ یہ بات میرے دل کو لگتی تھی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ ایسا کرنے سے میں اس عذاب سے نجات پا لوں گا۔ پھر اچانک ہی مجھے پرسوں رات کا وہ سین یاد آگیا جو میں نے چبوترے کے پاس برگد کے درخت کے نیچے دیکھا تھا۔ وہ وہاں بیٹھی رو رہی تھی اور قریب ہی لکڑیاں اس انداز میں رکھی تھیں جیسے چتا تیار کی گئی ہو۔ "وہ مارا۔" میں ایک ہاتھ کی مٹھی دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے چلایا۔

"کیا مارا۔ ارے یار ملا تو دیتے۔ کتنا شوق تھا مجھے۔" وہ باورچی خانے ہی سے چلایا۔ پھر کچھ دیر بعد ہی وہ دو پیالیاں لیے اندر داخل ہوا۔

"ارے اتنی جلدی؟" میں چونک اٹھا۔

"چائے تو تیار تھی یار، تم نے بنائی تھی شاید۔ میں نے تو بس پیالیوں میں نکالی ہے۔ دیکھو گرم ہے نا!" اس نے پیالی میری طرف بڑھائی۔

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تیار تھی؟ لیکن میں نے تو نہیں بنائی تھی۔"

"دیکھو یار! میں دل کا بہت کمزور ہوں۔ اب یہ مت کہنا کہ چائے روح نے اپنے پیارے اور نازک ہاتھوں سے بنائی ہوگی۔ مجھے معلوم ہے یہ ہندو روحیں تو بہت ہی کاہل ہوتی ہیں۔"

میں غور سے اسے دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر وہ اتنی جلدی چائے بنا بھی نہیں سکتا تھا۔ ہمارے یہاں تیل کا چولہا یا گیس کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس زمانے میں یہ چیزیں کہاں ہوتی تھیں یا تو لکڑیاں جلانا پڑتی تھیں یا پھر کوئلوں کی انگیٹھی۔ میں پیالی تپائی پر رکھ کر باورچی خانے چلا آیا۔ انگیٹھی میں راکھ زیادہ تھی اور کوئلے کم تھے جو تھے ان پر بھی راکھ جمی ہوئی تھی۔ تپش سے احساس ہوتا تھا کہ انگیٹھی گرم ہے۔ ورنہ یہ نئی جلائی ہوئی آگ نہ تھی بلکہ لگتا تھا جیسے کافی دیر پہلے جلائی گئی ہو۔ دودھ کی دیگچی بھی گرم تھی۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اتنی سی دیر میں چائے بنا کر اور دودھ گرم کرکے شرف الدین کیسے ڈال سکتا تھا۔ میں کمرے میں واپس آیا تو شرف الدین مزے سے چائے پی رہا تھا۔ میں کچھ نہیں بولا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس موضوع پر زیادہ بات کی تو وہ میرا مزید مذاق اڑائے گا۔

"ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟" وہ خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"شرف الدین میرا خیال ہے کہ میں تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دوں تاکہ تم معاملے کی سنگینی اور اس کی حقیقت کو سمجھ سکو۔" اتنا کہہ کر وہ تمام واقعات جو مجھے اماں اور ابا نے بتائے تھے یا جو کچھ میں پھوپیوں اور بہنوں سے سن چکا تھا، میں نے اس کے گوش گزار کر دیے۔

اس بار وہ سنجیدگی سے سب کچھ سنتا رہا۔ درمیان میں جب بھی اس نے بولنے کی کوشش کی میں نے اسے روک دیا۔ سارے واقعات سننے کے بعد اس نے گہرا سانس لیا، ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور بولا۔ "ویسے یار دادا جی تھے بڑے جی دار آدمی۔ تمہارے ابا کے دادا تھے نا وہ؟"

"ہاں!"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اچھے خاصے بڈھے ہوں گے وہ تمہارے ابا کی شادی پر، مگر واقعات سے لگتا ہے جیسے اس عمر میں وہ بڑے جوان تھے۔"

"جب میرے ابا کی شادی ہوئی اس وقت ابا کی عمر بہ مشکل پندرہ برس ہوگی، اماں چودہ برس کی تھیں۔ دادا کی عمر اس وقت تیس پینتیس سے زیادہ کی نہ تھی اور دادا جی زیادہ سے زیادہ پچاس پچپن کے ہوں گے۔"

"حساب کتاب میں بڑے کھرے ہو؟" وہ ہنسا۔

"یہ سب اس لیے پتا ہے کہ خود میرے ذہن میں بھی یہ سوال اٹھا تھا۔ میں نے اماں سے پوچھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ دادا جی ان کی شادی کے وقت بڑے صحت مند، سرخ و سفید اور لمبے اونچے تھے۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پچاس برس سے اوپر کے ہوں گے۔ چوڑا سینہ، لمبا قد، قابل رشک صحت، وہ بالکل کسی فوجی کی طرح تھے، چاق و چوبند اور رعب دار۔"

"ہو سکتا ہے، مگر اتنی عمر میں ایسی عیاشی، چھوکروں والی حرکتیں! آخر ان کی اولاد تھی، اس کی بھی اولادیں تھیں انھیں لحاظ تو کرنا چاہیے تھا نا!" وہ ناراضگی سے بولا۔

"میں نے یہ سب باتیں اس لیے نہیں بتائی ہیں کہ تم ان کے کردار کا تجزیہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ اب تمہیں یقین آیا یا نہیں!"

"یار وقار الحسن! اپنی کھوپڑی میں تو یہ بات جاتی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دادا جی کو مارنے میں تمہارے دادا کا اور انھیں مارنے میں تمہارے ابا کا ہاتھ تھا بالکل ویسے ہی جیسے تمہارے چچا نے تمہیں مارنے کی سازش کی تھی، اور یہ سارا چکر صرف اور صرف جائیداد کا ہے۔ اس حویلی کو آسیب زدہ بنا کر یہ حویلی بھی تم لوگوں سے ہتھیانے کا پروگرام تھا۔ یہ تو تمہارے ابا اماں کا حوصلہ تھا کہ ایسے خوفناک واقعات ہونے کے باوجود وہ حویلی سے چمٹے رہے میں ہوتا تو پہلے ہی واقعے کے بعد حویلی خالی کر دیتا۔"

"دیکھو! میں ابھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ خود میں نے بھی اس سائے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور پھر اگر یہ چکر ہوتا تو اس روز گنگوا کی جان کیوں جاتی۔ وہ تو میری جان لینے آیا تھا۔ میں وہاں نہیں تھا تو پھر کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کیوں مارا گیا۔ اسے مارنے والا کوئی انسان نہیں تھا، ایک سانپ تھا جسے گنگوا کی گردن میں لپٹے سبھی نے دیکھا تھا۔ تھانیدار نے بھی۔"

"پالتو سانپ ہوگا۔ میں نے اکثر لوگوں کے گلے میں پڑے یا ہاتھوں میں لیے سانپ دیکھے ہیں یار۔"

"اچھا تو پھر گنگوا کو دفنانے کے بعد جو میں نے بڑے برآمدے کے پاس برگد کے پیڑ کے تلے دو سائے دیکھے تھے وہ رو رہی تھی۔ درمیان کی راہداری سرد خانہ بنی ہوئی تھی۔ چتا تیار تھی، وہ پائل کی چھنکار۔ اور پھر اماں اور تایا کے آنے پر سب کچھ غائب ہو جانا۔"

"یہ سب تمہارے ذہن کا، تمہاری نفسیات کا کھیل تھا۔ دیکھو وقار الحسن، سائنس یہ ثابت کر چکی ہے کہ آدمی جو چاہتا ہے دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، اگر تمہارا ذہن ان باتوں کو قبول نہ کرے تو کبھی کچھ نظر نہ آئے۔ بچپن ہی سے تمہارے ذہن کو اس سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ بچے کا ذہن موم کی طرح ہوتا ہے اسے چاہے جس طرح ڈھالو ڈھل جاتا ہے۔ تمہارے ذہن کی یہ تربیت تو بچپن سے جاری تھی جبکہ انسانی ذہن کا تو یہ عالم ہے کہ نظر بندی کے ماہر منٹوں میں اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اگر ہم کسی اکیلے، سنسان راستے پر، رات کی تاریکی میں کہیں جا رہے ہوں اور ذہن کسی سوچ میں ڈوبا ہو تو ہمیں راستے کی تنہائی اور تاریکی کا احساس بھی نہیں ہوتا اور ہم اسی طرح ایک لمبا راستہ عبور کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر تمہارا ذہن خالی ہو، تمہیں راستے کی تنہائی، اور تاریکی کا پورا ادراک ہو تب وہ فاصلہ چاہے کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو تم خوفزدہ ہو جاؤ گے، اپنی ہی چاپ تمہیں کسی اور کی موجودگی اور اپنے تعاقب کا احساس دلائے گی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم خوف سے بھاگ کھڑے ہو یا اس راستے کو عبور کرنے سے ہی احتراز کرو۔ آدمی بہت بڑا جن ہوتا ہے یار، اس کے اندر کی مخفی قوتیں اگر منفی انداز میں ظاہر ہوں تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا اور یہی قوتیں جب مثبت انداز میں ظاہر ہوتی ہیں تو وہ ولی اللہ بن جاتا ہے۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری دنیا گھوم لیتا ہے۔ ایک جگہ ہوتے ہوئے دوسری جگہ۔ دیکھا جاتا ہے، لوگوں کے مستقبل کو آئینے کی طرح صاف شفاف دیکھ لیتا ہے۔ اس کے ماضی کے سارے پرت کھول کر رکھ دیتا ہے۔ یہ انسانی ذہن کی سائنس ہے بھیا جی! تم کن چکروں میں پڑ گئے۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ میں حیرت سے اس کے مطالعے کو سن رہا تھا۔ "اور ایک بات اور ہے Moon Madness، یہ ایک باقاعدہ بیماری ہے۔ چڑھتا چاند انسان کے اوپر بڑے عجیب انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ تم نے جتنے بھی واقعات بتائے وہ سب چاند کی چودھویں تاریخ کو ہوئے، یا اس سے ایک روز پہلے یا ایک روز بعد۔ شاید تم نے اس بارے میں نہ پڑھا ہو مگر موقع ملتے ہی ضرور پڑھنا۔ اس بیماری کے اثرات جس شخص میں ہوں وہ انتہائی عجیب و غریب شخص بھی ہو سکتا ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے اور خود کو ختم بھی کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے خاندان میں یہ اثرات ورثے کی صورت میں چلے آ رہے ہیں۔ پہلے تمہارے پردادا، پھر دادا اور پھر باپ، اب شاید تمہاری باری ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا کوئی علاج ہے یا نہیں مگر میرا خیال ہے کہ تم کسی ماہر نفسیات سے مل لو۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہوا تو یوں لگا جیسے میرے سامنے شرف الدین نہ ہو بلکہ کوئی عالم فاضل پروفیسر بیٹھا ہو۔ اس کی کہی ہوئی تمام باتیں ٹھوس تھیں۔ حالانکہ میں اس عجیب و غریب بیماری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر پھر بھی اس سے یہ سب سن کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہی سچ کہہ رہا ہو۔

"اس بیماری کے اثرات تمہارے چچاؤں اور تایا میں بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک چچا کی حرکت سے تو ثابت ہو گیا کیونکہ انھوں نے تمہیں قتل کرانے کی کوشش کی، جائیداد کی خاطر ہی سہی مگر آدمی اتنا بڑا قدم نہیں اٹھاتا لیکن اگر اس میں Moon Madness کے اثرات ہوں تو وہ نتائج کی پروا بھی نہیں کرتا، بلکہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس بیماری کا اثر نہ ہو اور وہ واقعی ان واقعات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام نکالنا چاہتے ہوں۔"

"ایسا ہی ہے۔ انھوں نے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ تم نے جو کچھ کہا وہ سب ٹھیک لگتا ہے شرف الدین، مگر میرا دل نہیں مانتا۔ میں خود میں کوئی عجیب و غریب بات نہیں پاتا اور پھر تم یہ تو دیکھو کہ پردادا کے بعد میرے دادا کا کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی موت بھی طبعی تھی مگر میری دادی اور پھر ابا کی موت کے درمیان چھے برس کا لمبا عرصہ موجود ہے، اس تمام عرصے میں ابا پرسکون رہے تھے۔ کسی بھی چاندنی رات کو نہ ان پر کوئی دورہ پڑا نہ انھوں نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی اور نہ ہم نے ان میں کسی تبدیلی کو محسوس کیا سوائے یہ کہ ہر چودھویں شب ہمارے گھر پر اور ہر شخص پر گہرا سناٹا چھایا ہوتا تھا۔ ہم سب کسی خوفناک واقعے کے منتظر ہوتے تھے، تمام رات جاگ کر گزارتے تھے، اور بے پناہ خوف زدہ ہوتے تھے اور بس وہ رات گزرتے ہی ہمارے 'مد زندگی' کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اسی طرح چھے برس گزر گئے۔ ایسی کوئی بیماری ہوتی تو ہر چودھویں کی شب اثر انداز ہوتی۔

پھر جو کچھ اماں کے ساتھ ہوا۔ دادی کے انتقال کے بعد دن کا وقت تھا۔ وہ تلاوت کر رہی تھیں کہ کسی نے انھیں میرے سامنے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔ میاں شرف الدین ان باتوں کا تمھاری لاجک سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ماہر نفسیات اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے گا وہاں کوئی ایسے بزرگ جو اللہ والے ہوں' ان باتوں کے اسرار کو سمجھتے ہوں' ہمارے کام آ سکتے ہیں۔"

وہ چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں ٹکائے مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس وقت وہ کوئی مسخرہ پن نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اب سے پہلے اسے اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اب بھی میری باتوں کو حقیقت ماننے کو تیار نہیں ہے۔ تبھی میں نے کہا۔ "یہ چائے' جو تمھیں تیار اور گرم ملی تھی' اس کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے! جب تم یہاں آئے تھے تو میں سو رہا تھا اس کا تمھیں یقین ہے یا نہیں' یا میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ میں سو رہا تھا۔"

"ہاں مگر اس بات کا اس وقت کیا ذکر ہے؟"

"ذکر ہے' اب یہی ایک بات رہ جاتی ہے جس سے میں تمھیں قائل کر سکتا ہوں۔ خیر۔ تم کتنے بجے یہاں آئے تھے؟"

"شاید آٹھ ساڑھے آٹھ بجے۔" وہ اب اٹھ کر سیدھا بیٹھ چکا تھا۔ اس کی تمام توجہ میری جانب تھی۔ اس کی آنکھیں مجھے چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میں دروازے ہی سے تمھارے ساتھ چلا گیا تھا۔ ہم وہاں سے شاید دس بجے واپس آئے ہیں۔ ٹھیک!"

"تم۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ کچھ قریب سرک آیا۔

"صرف یہ کہ اگر میں نے آٹھ بجے چائے بنائی بھی تھی تو دو گھنٹے گزر جانے کے باوجود چائے اور دودھ گرم کیسے تھا! اتنا گرم کہ تمھیں گرم کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

اس کی آنکھیں لمحہ بھر کو پھیلیں' ان میں گہری سوچ کی سائے لہرائے' اور وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

"اور یہ میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں کہ جب تم آئے تو میں سو رہا تھا۔ میں اماں وغیرہ کو اسٹیشن چھوڑ کر واپس آتے ہی سو گیا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لیے لیٹتے ہی نیند آ گئی تھی۔ اس سلسلے میں تم سے جھوٹ بولنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں۔ اب تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو۔ کوئی جواز ہے تمھارے پاس!"

تھا۔ پھر وہ کھنکارا..

"ایک بات اور۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکا۔ "اماں چار بجے والی گاڑی سے گئی ہیں۔ اس حویلی میں کوئی ملازم نہیں اور رات کے وقت اس حویلی میں کوئی اور آنے کی جرأت نہیں کر سکتا.. پھر آنے والے کو کیا معلوم کہ میں واپس آؤں گا یا نہیں یا پھر یہ کہہ دو کہ چائے تم نے بنائی۔ تم جن ہو اور منٹوں میں انگیٹھی جلا کر' چائے بنا کر' کوئلوں کو پھونکیں مار کر آگ کو اتنا بجھا دیا کہ کوئلے انگاروں کی بجائے راکھ میں تبدیل ہو گئے۔ میں کچھ دیر پہلے یہی دیکھنے کے لیے باورچی خانے میں گیا تھا۔"

"یار وقار الحسن! ہم وہیں سوتے ہیں۔ میرے گھر میں' یا عاقل کے گھر چلے چلتے ہیں۔"

میں زور سے ہنس پڑا۔ "کیوں! کیا تم مون میڈنس کا شکار نہیں ہو سکتے۔ آج چاند کی سولہ تاریخ ہی تو ہے۔ دو دن گزر گئے تو کیا ہوا!؟"

"دیکھو وقار الحسن' میرا تمھارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے' ہاں یہ کام تم کر سکتے ہو۔" اب وہ فق ہو چکا تھا۔ "ہاں جب میں تمھارے گھر کھانا کھا رہا تھا تو اسی لمحے یہاں چائے بنا رہا تھا۔ عقل کے ناخن لو یار۔ اس ڈگر پر سوچو جس پر میں سوچ رہا ہوں۔ تمھارا لیکچر اپنی جگہ' مگر یہاں اس منطق کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وہ سو فی صد روح ہے' بے چین ہے' انتقام لیتی رہی ہے اور اب میں تہیہ کر چکا ہوں کہ جب تک اسے سکون نہیں دوں گا خود چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ شاید میرے اس عہد کی وجہ سے اس نے میری جان بچائی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ آئندہ بھی میرا ساتھ دے گی۔ میں جے پور جانا چاہتا ہوں۔ جہاں شکنتلا' کے خاندان کے کچھ لوگ رہتے ہیں۔ میں ان سے معلومات حاصل کروں گا۔ سوامی جی کو۔" اور تب ہی میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اماں سے کہا تھا کہ میں سوامی جی کو کس طرح پہچانوں گا' گو مجھے اب تک ان کے زندہ ہونے کا یقین نہیں تھا مگر میں پھر بھی انھیں دیکھنا چاہتا تھا جس پر اماں نے کہا تھا کہ وہ مجھے ان کی تصویر دکھائیں گی جو بہ قول ان کے پردادا نے کسی مصور سے بنوائی تھی مگر پھر یہ بات میں بھی بھول گیا اور شاید اماں بھی۔ میں نے پردادا کو بھی نہیں دیکھا تھا اسی لیے کہ ان کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ اس زمانے میں تصویروں کا نہ رواج تھا نہ کیمرے عام

"کیا ہوا! تم چپ کیوں ہو گئے۔" وہ چوکنا ہو گیا اور یوں

"نہیں میں' کچھ سوچنے لگا تھا۔ سنو! کیا تم میرے ساتھ تیسری منزل پر چلو گے' پردادا جی کے کمرے میں۔ وہاں ان کی ایک تصویر ہے' کسی مصور کی بنائی ہوئی جس میں ان کے ساتھ سوامی جی بھی ہیں' شکنتلا کے والد۔ میں ان دونوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت ـــ؟ پاگل ہوئے ہو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم نے میرا مغز پلپلا کر دیا ہے۔ اور یار تم کچھ بھی کہو' یہ روحوں والا چکر فراڈ ہی لگتا ہے مجھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ماحول' پچھلی سنی ہوئی افواہوں اور اب تمھاری بیان کردہ باتوں نے میرے ذہن کو ٹرانس میں لے لیا ہے' میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں۔ خوف سا' دل بھی غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا ہے مگر میرا خیال ہے کہ میں سو لوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔" وہ پھر سے اکھڑ گیا تھا۔

"گویا تم وہاں جانے سے خوفزدہ ہو!"

"نہیں! وہاں جانے سے خوفزدہ نہیں ہوں مگر رات کو ایک ایسے کمرے میں جانا جہاں برسوں سے کوئی نہ گیا ہو۔ جہاں کئی لڑکیوں پر مظالم ڈھائے گئے ہوں' ایک لڑکے کو قتل کیا گیا ہو' جو کبھی ایک عیاش بوڑھے کی رنگین خوابگاہ رہی ہو' میں پسند نہیں کرتا.. اور ذرا سوچو تو وہاں مکڑیوں کے جالے ہوں گے' گرد و غبار ہو گا' چمگادڑیں ہوں گی اور ممکن ہے کہ وہ کمرا ان سانپوں کا ڈیرا بھی ہو جو وقتاً فوقتاً اس حویلی میں مختلف ایکٹیو ٹیز کرتے رہے ہیں۔ نہ بابا۔ ہاں' اگر تم دن میں کہو تو میں چلنے کو تیار ہوں بلکہ میں ایک' دو آدمی پکڑ لوں گا جو اس کمرے کی جھاڑ پونچھ اور صفائی کر دیں گے۔"

اس کی بات صحیح تھی۔ وہ کمرا ہی کیا پوری منزل برسوں سے خالی پڑی تھی۔ اس منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں دو طرف سے اوپر جاتی تھیں' ایک تو حویلی کے اس حصے سے اور دوسری چبوترے کے دوسری جانب سے۔ اس حصے کی سیڑھیوں کو دروازہ لگا کر بند کر دیا گیا تھا تاکہ بچے وغیرہ اوپر نہ جا سکیں البتہ چبوترے کے دوسری جانب کا راستہ کھلا تھا اور بقول اماں کے پردادا جی کی بیٹھکیں کیونکہ چبوترے پر سجا کرتی تھیں اس لیے وہ اوپر جانے اور نیچے آنے کے لیے وہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ البتہ گھر کے افراد' دادی یا اماں وغیرہ اندرونی سیڑھیوں سے ہو کر ہی اوپر جایا کرتی تھیں جسے دادی ہی نے بند کرا دیا تھا۔ اس پر صندل کی لکڑی کا منقش دروازہ لگا دیا گیا تھا جس میں اوپر نیچے دو بڑے بڑے تالے ڈال دیے گئے تھے۔ وہ تالے اب زنگ آلود ہو چکے تھے۔ ان کی چابیوں کے بارے میں بھی کوئی

نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئیں اس لیے کہ ان کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

"ہاں! اب کیا ہو گیا!" شرف الدین نے مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں۔ تمھاری بات ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔ دن میں وہاں کی صفائی بھی کرا لیں گے اور پردادا جی کی تصویر بھی دیکھ لیں گے۔"

"جیو میرے یار! ویسے انھیں دیکھنے کا شوق تو مجھے بھی ہو گیا ہے۔ کمال آدمی تھا یار' بڑھاپے میں یہ عالم تھا تو جوانی میں تو غضب ڈھایا ہو گا۔ جوانی کے قصے کسی نے نہیں بتائے؟"

"نہیں۔ ظاہر ہے کہ کون بتاتا۔ ابا نے بھی مجھے صرف شکنتلا کا قصہ سنایا تھا۔ اماں جو کچھ جانتی تھیں بتا گئیں۔ دادی کچھ نہ کچھ جانتی ہوں گی مگر انھوں نے تو ہمیشہ اماں ہی کی بات پر آنکھیں نکالیں وہ کیا قصے سناتیں!"

"کاش میں تمھارے خاندان کا فرد ہوتا تو بال کی کھال نکال کر ہتھیلی پر رکھ چکا ہوتا۔"

"پھر وہی باتیں شروع کر دیں تم نے۔" میں نے اسے تنبیہہ کی۔

"تو تمھارا کیا خیال ہے' چائے والے معمولی واقعے سے مرعوب ہو گیا ہوں؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ واقعی اس کے چہرے پر اب خوف کے کوئی آثار نہ تھے۔

"یار وقار الحسن اب سو جانا چاہیے۔" اس نے میرے پلنگ پر لیٹتے ہوئے کہا میں نے لالٹین میں تیل دیکھا' کافی تھا۔ بتی گھما کر میں نے لالٹین کی لو کم کر دی اور اسے دروازے کے قریب رکھ دیا اور خود اماں والی مسہری پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی' ظاہر ہے میں اتنی دیر تک سوتا رہا تھا۔ اب نیند کا سوال ہی نہ تھا۔ شرف الدین شاید سو گیا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ میں آنکھیں موندے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا پھر میرا ذہن شرف الدین کی بتائی ہوئی باتوں کی طرف ہو گیا۔ یہ تو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان کی نفسیات بڑی پیچیدہ ہوتی ہے' مگر اس عجیب و غریب بیماری کے بارے میں' میں نے پہلی بار اس کی زبانی سنا تھا۔ شرف الدین مجھ سے کافی بڑا تھا' وہ پڑھا لکھا تھا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ہی پڑھتا تھا۔ اس کی وجہ سے میں بھی وہیں تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ پورے علاقے میں کتابی کیڑا مشہور تھا۔ کتاب کوئی بھی ہو اور کیسی بھی ہو اس کا پڑھنا ضروری تھا۔ جہاں جاتا وہاں کئی گھنٹے لائبریری میں

گھسا رہتا تھا۔ اس کی باتیں بڑی مدلل تھیں' اگر میں نے اس سارے کو نہ دیکھا ہوتا' اور میرے ساتھ یہ چند واقعات نہ ہوئے ہوتے تو میں فوراً ہی قائل ہو جاتا۔ اب بھی میرا دل کچھ کچھ ان باتوں کو تسلیم کر چکا تھا مگر ذہن پھر الجھا دیتا تھا۔ میری دوستی کی وجہ شرف الدین کی یہی ذہانت تھی ورنہ مجھ میں اور شرف الدین میں ہر لحاظ سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ملازمت پیشہ لوگ تھے' چھوٹا سا چار کمروں والا مکان تھا' مختصر گھرانا تھا۔ وہ شگفتہ اور اس کے ماں باپ مگر اس گھرانے پر مجھے رشک آیا کرتا تھا۔ بے حد شریف لوگ تھے۔ سیدھے سادے' دو روٹیوں اور دو جوڑے کپڑوں میں خوش رہنے والے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل تھے اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں۔ شرف الدین کے والد نے شرف الدین کو ہی نہیں شگفتہ کو بھی پڑھایا لکھایا تھا جب کہ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج قطعی نہ تھا۔ بس لڑکیاں گھروں میں قرآن اور حدیث کی تعلیم لیا کرتی تھیں۔ میری تینوں بہنیں قرآن پڑھ رہی تھیں۔ اماں اور ابا دونوں ہی لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ مرزا صولت بیگ کی نسل سے تھیں' جو جدی پشتی رئیس تھے اور ان کے خاندان میں لڑکیوں نے تو کیا لڑکوں نے بھی نوکری نہ کی تھی' پھر تعلیم کا بھلا کیا جواز تھا۔ ان کے خیال میں تعلیم صرف نوکری کے لیے حاصل کی جاتی تھی۔ ابا کے خیالات بھی یہی تھے مگر اماں کچھ کچھ آنے والے حالات کا ادراک رکھتی تھیں اور مجھے محض تعلیم دلانے کی خواہش مند تھیں۔ نوکری کا تو تصور بھی نہ تھا ان کے ذہن میں اور میں اس سلسلے میں ان کا احسان مند تھا۔ وہ اگر مجھے تعلیم نہ دلاتیں تو میں آج خود کو کتنا بے بس محسوس کرتا۔ شرف الدین کے سامنے سر اٹھانے کے قابل بھی نہ ہوتا۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بے پناہ شوق تھا۔ میرے شوق ہی کی خاطر انھوں نے دادی اور ابا کی بہت باتیں سنی تھیں۔

میں جانے کیا کیا سوچنے لگا۔ باہر جھینگروں کی آوازیں زندگی بن کر پھیلی ہوئی تھیں' شرف الدین کے خراٹے مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دے رہے تھے۔ باہر پیڑ پر گھونسلوں میں سوتی چڑیاں کبھی کبھی ایک دم شور مچا دیتیں۔ جیسے کوئی اندھیرے میں ان کے گھونسلوں میں نقب لگانے آ گیا ہو پھر رفتہ رفتہ ان کا شور ختم ہو جاتا تب صرف لمحہ بھر کو مجھے سناٹا گہرا ہوتا محسوس ہوتا مگر پھر جھینگروں کی مسلسل آنے والی آواز سناٹے کو مٹا دیتی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور باہر چلنے والی ہوا سے کبھی کبھی یوں چرچرا جاتا تھا جیسے اس مداخلت پر احتجاج کر رہا ہو۔ یہ چرچراہٹ کانوں کو گراں گزرتی تھی اس لیے میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

شرف الدین بے خبر سو رہا تھا۔ مجھے اس پر پیار آیا کہ اس نے میری خاطر کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا اور اب کیسی بے جگری سے پڑا سو رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہوا بستر پر جا لیٹا۔ وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا صرف اتنا علم تھا کہ اب بہت رات گزر چکی تھی۔ میں یہاں صرف دو روز اور رکنا چاہتا تھا پھر مجھے علی گڑھ جانا تھا۔ وہاں داخلے کی بات کرنا تھی' اگلا تعلیمی سال شروع ہونے میں ابھی تقریباً ڈیڑھ مہینا باقی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ داخلے کے فوراً بعد جے پور چلا جاؤں تاکہ اس دوران میں وہ سب کچھ بھی جان جاؤں جو مجھے بہرحال جاننا چاہیے۔

میں نے ذہن کو جھٹک کر آنکھیں موند لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ صبح اٹھوں تو طبیعت مضمحل ہو۔ شرف الدین سویرے جاگنے کا عادی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اٹھتے ہی مجھے اٹھا دے گا۔ میں تسبیح پڑھنے لگا کیونکہ تسبیح پڑھے بغیر مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ تسبیح پڑھتے پڑھتے مجھے کسی وقت نیند آ گئی۔ اسی رات میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں چبوترے پر کھڑا ہوں' گھر کے اندر سے عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں' باہر چبوترے کے پاس بہت سے مرد سفید کپڑوں میں ملبوس کھڑے ہیں۔ برگد کے درخت کے نیچے ایک نوجوان اوندھا پڑا ہے جس کا چہرہ میری طرف ہے اور لہولہان ہے۔ پاس ہی چتا تیار ہے اور اس میں شعلے دہک رہے ہیں۔ اسی برگد کے پیڑ کے نیچے ایک دبلی پتلی' خوب صورت سی لڑکی سفید جارجٹ کی ساری میں لپٹی ہوئی' سر جھکائے رو رہی ہے اور اس کے لمبے سیاہ بال چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں سفید پتھر کی مورتی ہے جس کے سر پر سنہرا دائرہ بنا ہوا ہے' اس مورتی کا نچلا حصہ خون آلود ہے' اس لڑکی کی دو انگلیاں بھی خون سے رنگی ہوئی ہیں۔ میں ان تمام لوگوں سے بہت دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ پھر اچانک وہ لڑکی سر اٹھا کر مجھے دیکھتی ہے' اشارے سے پاس بلاتی ہے' میں جب اس کے قریب پہنچتا ہوں' وہ سفید مورت کو میری جانب بڑھاتی ہے' پھر آسمان کی طرف دیکھ کر رونے لگتی ہے۔ میری آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ وہاں چاند پورا ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ چاند یوں ہلکورے کھانے لگتا ہے جیسے آسمان پر نہ ہو بلکہ سمندر کی لہروں کے درمیان تیر رہا ہو' اسی لمحے میں اپنے پیروں کی طرف دیکھتا ہوں جہاں ایک چاندی کی طرح چمکدار سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اسے دیکھ کر میں خوفزدہ ہو کر چیختا ہوں اور عین اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ میں بہت خوفزدہ تھا۔ میرے پورے بدن پر پسینا بہہ رہا تھا' دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں چند لمحے تو یونہی بے حس و حرکت لیٹا رہا پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی میری نگاہ شرف الدین کے بستر پر پڑی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بستر خالی تھا۔

میرے چاروں طرف سناٹا سا پھیلا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا جو سوئیاں بن کر بدن میں اترتا چلا جاتا ہے۔ میرے دل کے دھڑکنے سے میرا پورا بدن ہل رہا تھا' جھٹکے سے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک تو اس بھیانک خواب کا اثر تھا دوسرا شرف الدین کی غیر موجودگی نے تو جیسے میرے حواس ہی چھین لیے تھے۔ میں کافی دیر تک خود کو سنبھالتا رہا پھر میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہلکی روشنی سی پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید صبح ہونے والی تھی۔ روشنی دیکھ کر مجھے کچھ ڈھارس ہوئی اور خیال آیا کہ شرف الدین یقیناً "نماز کے لیے اٹھا ہو گا۔ اس خیال نے میرے وجود میں ہلکورے لیتے ہیجان میں خاصی کمی کر دی۔ میں نے ایک گہری سانس لی' چپل پہنے اور کلمہ پڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آیا تو دیکھا' واقعی آسمانوں کے کنارے سرمئی ہو چکے تھے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ گہرا سناٹا اور دور تک چھائی ویرانی نے مجھے پھر بوکھلا دیا۔ کوئی آہٹ نہ تھی۔ شرف الدین اگر غسل خانے میں ہوتا تو کوئی آواز تو ہوتی۔ میں پھر ساکت رہ گیا' دفعتاً غیر ارادی طور پر میرے منہ سے تیز آواز نکل گئی۔ "شرف الدین۔"

یہی آواز لوٹ کر آئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس وقت حویلی میں' میں تنہا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں پلٹ کر بڑے گیٹ کی طرف چل پڑا' بلکہ تقریباً" بھاگ پڑا۔ گیٹ بھی کھلا ہوا تھا مگر اس وقت مجھے بالکل احساس نہ ہوا' نہ ہی یہ خیال آیا کہ گیٹ کس نے کھولا ہے۔ یہ احساس تو حویلی سے تقریباً دس بارہ قدم دور پہنچ کر ہوا کہ جو گیٹ میں رات بند کر کے سویا تھا وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ شرف الدین ہی نے کھولا ہو گا' شاید رات ہی کے کسی پہر میرے سونے کے بعد وہ خوفزدہ ہو گیا ہو اور گھر بھاگ گیا ہو۔ اب میں کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ مجھے خود پر بھی ہنسی آئی کہ میں خوامخواہ خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے شکر بھیجا کہ شرف الدین نہیں تھا ورنہ اسے تو موقع مل جاتا اور وہ خوب مذاق اڑاتا۔ میں خجل سا ہو کر واپس حویلی چلا آیا۔

سوچا وضو کر کے بلکہ نماز پڑھ کے ہی شرف الدین کے گھر جاؤں گا۔ میں واپس کمرے میں آیا' بکس میں سے کپڑے نکالے۔ اماں میرے سارے کپڑے اور ضرورت کی تمام چیزیں اس کمرے میں بڑی ترتیب سے رکھ گئی تھیں۔ میں کپڑے لے کر غسل خانے تک چلا آیا۔ میں نے جونہی غسل خانے کے دروازے کو کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا یوں لگا جیسے قریب ہی کوئی ہنسا ہو۔ آواز بہت دبی دبی سی تھی مگر جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے کوئی عورت ہنسی ہو۔ میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ اب روشنی کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ شام کا سا جھٹپٹا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی مگر میں اس عورت کو نہ دیکھ سکا جس کی ہنسی مجھے سنائی دی تھی۔ میں کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر اپنا وہم سمجھ کر میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز قدموں سے بھاگ رہا ہو۔ یہ آہٹ مجھے برآمدے کے پاس محسوس ہوئی تھی۔ میں لپک کر وہاں تک پہنچ گیا اور پھر شرف الدین کو وہاں کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ چہرے پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں' آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

"تم۔۔۔!" میں کپڑے پھینک کر اس کی طرف بڑھا۔

"میں۔۔۔ میں یہاں کیسے آیا؟" اس نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

"کیسے آئے۔۔۔؟" میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر تیز قدموں سے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا' جہاں رات ہم دونوں سوئے تھے۔ میں نے زمین سے اپنے کپڑے اٹھائے اور اس کے پیچھے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے' پاؤں لٹکائے پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے گلاس میں پانی بھر کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے لمحہ بھر کو مجھے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر گلاس تھام لیا۔ گلاس میرے ہاتھ سے لیتے وقت اس کی انگلیاں میری ہتھیلی سے ٹکرائیں تو لگا جیسے میری ہتھیلی سے گرم گرم سلاخیں چھو گئی ہوں۔ میں اس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ آخر برآمدے میں کیا کرنے گیا تھا اور اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ پورا گلاس اس نے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ تبھی میری نگاہیں اس کی

نگاہوں سے ٹکرائیں۔ سرخ دہکتی ہوئی آنکھیں مجھے جسم کے آر پار دیکھتی محسوس ہوئیں۔

"شرف الدین!" میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

"ہوں۔" اس نے سر اٹھایا اور قمیص کے دامن سے چہرے پر آئے پسینے کو پونچھنے لگا۔ اس نے بہت جلدی خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلی وحشت حیرت انگیز طور پر معدوم ہو چکی تھی۔

"میں اٹھا تو تم نہیں تھے۔ میں پریشان ہو گیا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟"

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کی طرف کیا۔ ایک بار پھر قمیص کے دامن کو چہرے پر رگڑا پھر میری طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرایا۔ "میں ورزش کرنے کا عادی ہوں۔ حسب عادت آنکھ کھل گئی تھی۔ ورزش کرنے برآمدے میں چلا گیا تھا۔ میں برگد کے درخت کے نیچے ورزش کرنا چاہتا تھا۔ کسی بھی درخت کے نیچے یا باغ میں ورزش کرنا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔"

گو اس کی آواز میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ اب سے کچھ لمحے پہلے ہم ایک عجیب سی پچویشن میں تھے مگر پھر بھی نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی تھی جو غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، میں اس کی فطرت سے واقف تھا۔ وہ ہر بات اور ہر واقعے کو منطقی انداز سے دیکھتا تھا۔ جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا ہو گا جب تک اس کا کوئی منطقی جواز تلاش نہیں کر لے گا مجھے نہیں بتائے گا۔

"کچھ دیر پہلے تم جس حالت میں وہاں کھڑے تھے اور جس طرح تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یہاں کیسے آیا، کیا اس کے بعد بھی تم یہی کہو گے کہ تم ورزش کر رہے تھے؟" میں باوجود کوشش کے برداشت نہ کر سکا۔

وہ مسکرایا۔ "تم نے میری پوری بات نہیں سنی۔" اس نے پھر دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سنوارا۔ "میں نے کچھ دیر ورزش کی، بلکہ کافی دیر کی پھر اوپر جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ پسینا بہت آ چکا تھا اور سانس بھی بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی اس حالت پر حیرت ہوئی تھی لیکن شاید یہ اس لیے ہوا کہ پچھلے دو روز سے میں ورزش نہیں کر سکا تھا۔ بہرحال سیڑھیوں پر بیٹھتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی اور پھر جانے کیا ہوا میں سیڑھیوں سے گرا۔ گھبرا کر بھاگ کر برآمدے تک آ گیا اور تبھی تم میرے سامنے آ گئے۔ میں شاید نیند کی وجہ سے حواسوں میں نہیں تھا۔"

میں اس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر اس سے بحث کرنا بیکار تھا۔ میں سانس لے کر اٹھ گیا۔ "تم نہانا چاہو تو نہا لو، میں بعد میں نہا لوں گا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں! نہانا تو ہے مگر میں کیونکہ کپڑے نہیں لایا ہوں اس لیے گھر جا کر نہا لوں گا۔ تم فارغ ہو جاؤ۔ ہم گھر جا کر ناشتا کریں گے۔" اب وہ مکمل طور پر خود کو سنبھال چکا تھا۔

میں اسے غور سے دیکھتا ہوا غسل خانے چلا گیا۔ اس بار نہ تو کوئی ہنسی کی آواز آئی اور نہ ہی کسی قسم کی آہٹ ہوئی۔ میں نہا کر سیدھا باورچی خانے پہنچ گیا۔ نہ معلوم کیوں مجھے ایک آس سی تھی کہ شاید وہاں چائے بنی ہوئی ہو۔ یہ آس اس وقت دم توڑ گئی جب میری نگاہ انگیٹھی میں بھری ٹھنڈی راکھ پر پڑی۔ میں اپنی خوش فہمی پر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کل رات جو چائے ہمیں ملی تھی وہ کسی اور نے اور کیوں بنائی تھی۔ صرف شگفتہ کی بات ہوتی تو میں اس کے بارے میں سوچتا مگر اماں تو خزراں اور عصمت بیگم کا نام بھی لے چکی تھیں۔ بہرحال میں تولیے سے سر رگڑتا ہوا کمرے میں چلا آیا۔ شرف الدین ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا جس میں، میں اسے چھوڑ کر نہانے گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں جنہیں میں نے محسوس کر لیا تھا مگر اس وقت اس پر کچھ ظاہر نہ کیا۔ میرے کھنکھارنے پر وہ چونکا۔

"چلیں!" میں بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولا۔

ہم حویلی سے نکلے، میں نے حویلی کا بڑا کنڈا اٹکا کر گیٹ میں باہر سے تالا بھی ڈال دیا اور چابی اپنی ویسٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔ کچھ ہی دیر بعد میں شرف الدین کی بیٹھک میں تھا۔ شرف الدین مجھے جائے نماز دے گیا۔ میں نماز پڑھنے لگا۔ میں نے خدا سے اپنے مقاصد میں کامیابی کی دعا مانگی۔ کافی دیر تک استغفار کرتا رہا، ہر قسم کی شر انگیزی سے پناہ مانگتا رہا۔ شاید آپ میری ان باتوں کو بے وجہ طول کا نام دیں لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ میں جن حالات میں زندگی گزار رہا تھا، جو کچھ میں دیکھ اور سن چکا تھا وہ کس قدر دہشت انگیز اور دہلا دینے والا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ میرے پردادا کے گناہوں کو آج ان کی تیسری نسل بھی بھگت رہی تھی۔ میں پیدا ہوا تو گویا ان کے گناہوں کی صلیب میرے ناتواں کندھوں پر تھی اور اب اتنے برس گزر جانے کے باوجود میں ان عذابوں کا قیدی تھا۔ ان عذاب سے نجات کی دعا میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔ نماز پڑھتے ہوئے اب سے پہلے مجھ پر اتنی رقت طاری نہ ہوئی تھی جتنی ان عذابوں سے نکل جانے کا عزم کرنے کے بعد طاری ہو رہی تھی۔ ایک خدا ہی تو تھا جو میری مدد کر سکتا تھا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر نماز پڑھ رہا تھا کہ شرف الدین بیٹھک میں داخل ہوا۔ میں نے سلام پھیرا اور اٹھ کر جائے نماز تہہ کر دی۔

"ناشتا تیار ہو رہا ہے۔ اب تم اتنی دیر میں مجھے آئندہ کا پروگرام بتا دو۔" اس نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمھارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"میرا تو پروگرام ذرا دوسرے ٹائپ کا ہوتا ہے۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ تم ابھی تو یہیں ہونا! کہیں جا تو نہیں رہے؟"

"نہیں میں تین چار روز یہیں ہوں پھر دو روز کے لیے ذرا مراد آباد جاؤں گا پھر علی گڑھ۔"

"شرف الدین کل تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ حویلی اور شگفتہ والے موضوع سے کترا رہا ہے۔

"کیسا وعدہ!" وہ چونکا مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔

"حویلی کی تیسری منزل پر دادا مرزا صولت بیگ کے کمرے میں جانے، ان کی تصویر دیکھنے اور صفائی کرانے کا۔" میں نے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر کہا۔

اس نے گہرا سانس لیا پھر چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا۔ "وعدہ کیا ہے تو پورا کروں گا۔ تم فکر نہ کرو، ہم اس موضوع پر بھی بات کریں گے جس نے تمہیں صبح سے الجھن میں مبتلا کیا ہوا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

گویا اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ میری سوچ کو کس رنگ میں ڈھالنے پر زور دے گا بہرحال اس کا یہ روپ کچھ پراسرار سا تھا۔ ہم بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک چوڑیوں کے جلترنگ سے بج اٹھے۔ میری نگاہ بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ شگفتہ جھکی جھکی پلکوں پر کہکشاں سی بکھیرے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تانبے کی قلعی کی ہوئی چمک دار ٹرے تھی، جس پر کروشیا کے کام کا خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی بھینی بھینی مہک نے میرے چاروں طرف کا موسم ہی جیسے بدل کر رکھ دیا۔ میں ایک دم ہی کچھ اور بن گیا۔ وہ وقار الحسن جس کے چہرے پر فکر و پریشانی نے ہزاروں لکیریں سی ڈال دی تھیں خود کو شگفتہ اور نکھرا نکھرا سا محسوس کرنے لگا۔

"آداب!" شگفتہ نے سر کو خفیف سی حرکت دے کر کہا۔

"آداب۔" میں نے جانے کب اور کیسے جواب دیا کہ اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی کسی اور کی آواز لگی۔ وہ جیسے ہواؤں میں تیرتی ہوئی قریب آ گئی۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ سفید چاندنی بچھی تھی۔ اس نے ٹرے رکھ کر پہلے درمیان میں دسترخوان بچھایا پھر ٹرے میں رکھی پلیٹوں کو دسترخوان پر سجا دیا، پراٹھے انڈے، دہی، مکھن اور سالن سبھی کچھ تھا۔ وہ جھکی جھکی سی کام کرتی رہی۔ اس کی بانہوں کا سونا میری آنکھوں میں چکاچوند سی پھیلاتا رہا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے کسی نے آئینے کو سورج کے رخ پر رکھ کر میری آنکھوں میں چمکا دیا ہو۔ میں حیرت زدہ سا خاموش بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ شگفتہ اچھی تو تھی مگر اتنی اچھی، اتنی پیاری رات کے رات کیسے ہو گئی۔

"آیئے!" اس نے لمحہ بھر کو نگاہیں اٹھائی تھیں اور جیسے ہزاروں چاند ایک دم ہی طلوع ہو گئے تھے۔ چودھویں کے وہ چاند جن کی رنگینیاں اور لطافتیں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ میری محویت کو شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پھیل گئی۔ اس نے فوراً ہی نگاہیں شرف الدین کی طرف پھیر لیں۔ "آیئے بھیا جی!"

تبھی مجھے خجالت سی محسوس ہوئی۔ میں نے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں کھویا ہوا تھا۔ میں نے غنیمت جانا۔ شرف الدین کے بازو کو ہلایا تو وہ چونک اٹھا۔

"یار بات سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے بے دھیانی میں کہا۔

حالانکہ میری سمجھ میں ساری بات آ چکی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم مان کیوں نہیں لیتے شرف الدین کہ میں جو کچھ تمہیں بتا چکا ہوں وہ درست ہے، اب تو تمہیں مان ہی لینا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ رات تمہاری ملاقات بھی ہو چکی ہے۔"

"ملاقات۔" وہ چونکا "نہیں، اسے تم خواب کہہ سکتے ہو۔ خیر... اس موضوع پر تم سے بعد میں بات کروں گا۔ چند باتیں مجھے الجھن میں مبتلا کیے ہیں، میں انھیں جانے بغیر مفروضات پر بات نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ شگفتہ چائے دانی لے آئی تھی جس پر شیشوں کے کام والی ٹی کوزی ڈھکی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ناشتے میں شریک ہو مگر میں اسے کچھ کہہ نہ سکا۔ ہونٹوں کے کناروں میں دبی دبی مسکراہٹ سمیٹے وہ واپس چلی گئی۔

"ناشتا کرو۔" شرف الدین نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ رات کیا ہوا تھا؟" میں نے دھیرے سے کہا اور پلیٹ میں سالن نکالنے لگا۔

"ضرور بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ ہم شام کو اس موضوع پر بات کریں گے۔ آج رات میں پھر تمھارے ساتھ حویلی میں گزارنا چاہتا ہوں۔" اس نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

"اور وہ پردادا کا کمرا!"

"ہاں، وہ ہم آج ہی صاف کرالیں گے۔ حافظ جی کے بیٹے بشیر اور لڈن دونوں کو بلالیں گے۔" اس نے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

لڈن، رمضان کا بیٹا تھا۔ رمضان کبھی دادا کا ملازم ہوا کرتا تھا۔ اس نے حق نمک برسوں ادا کیا تھا مگر اب اس کے بڑھاپے نے اسے ناکارہ بنا دیا تھا۔ وہ گھٹیا کے مرض میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا لڈن، جسے ابا نے بیڑی بنانے کے کارخانے میں ملازمت دلا دی تھی۔ چھٹی کے بعد بھی وہ یہاں وہاں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا اور تھوڑے بہت پیسے بنا لیتا تھا۔ بڑا نڈر، بیباک اور ہنستے رہنے والا لڑکا تھا شاید اسی لیے شرف الدین نے اس کا انتخاب کیا تھا اور حافظ جی کا بیٹا بشیر پورا عامل بنا ہوا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ تعویز گنڈے کیا کرتا تھا۔ چھدری داڑھی، سفید ململ کا لمبا کرتا، لٹھے کا بڑے پائنچوں کا اونچا پاجامہ اور سر پر دوپلی ٹوپی نے اس کی شخصیت میں عجیب سا تجلجا پن پیدا کر دیا تھا۔ اس پر ہزاروں دعوے کرتا پھرتا تھا۔ بقول اس کے اس کے قبضے میں کئی جن اور چڑیلیں تھیں۔ وہ ہر ویران جگہ بے خوف و خطر پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس کے انتخاب کی بھی غالباً یہی وجہ تھی۔ وہ محنتی بھی تھا اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ بھی اس میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ مجھے یہاں پھر شرف الدین کی معاملہ فہمی کا قائل ہونا پڑا۔ شگفتہ نے بھی ناشتا ہمارے ساتھ ہی کیا، شاید اس لیے مجھے ناشتا بہت مزے دار اور ماحول بہت سہانا لگ رہا تھا۔

"بھیا جی!" اچانک، شگفتہ نے شرف الدین کو مخاطب کیا۔

"ہاں!" وہ اب بھی کھویا ہوا تھا۔

"رات آپ نے حویلی میں گزاری تھی؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب بہت مختصر دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میرا جی چاہا کہ میں شگفتہ کو رات والا قصہ سناؤں اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھے اور میں اس کی آنکھوں میں دور تک پھیل جاؤں، مگر شرف الدین کے انداز نے مجھے محتاط کر دیا۔ میں نے لمحہ بھر کو سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس نے آنکھیں پٹپٹا کر مجھے دیکھا، شاید اسے بھی یہی توقع تھی کہ اب میں اسے کچھ نہ کچھ ضرور بتاؤں گا مگر میں بھی خاموش رہا تو اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر پھیل گیا جس میں خوف بھی شامل تھا۔ وہ بہت غور سے شرف الدین کو دیکھنے لگی جیسے اس کے چہرے پر رات کے واقعات کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ دوسرے ہی لمحے شرف الدین یوں چونک اٹھا جیسے خاموشی کا لمس اسے جھنجوڑ گیا ہو۔ "ہاں شگی! رات وہیں گزاری تھی اور میرا اب تک کسی روح سے ٹکراؤ نہیں ہوا۔ یعنی جسے ٹکراؤ یا بالمشافہ ملاقات کہا جاسکے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس گتھی کو سلجھانے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"یعنی کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

اس بار شرف الدین نے اسے جواب نہیں دیا۔ وہ اتنی الجھ چکی تھی کہ اسے سامنے رکھی چائے کی اس پیالی کا دھیان بھی نہ تھا جو اس کی ہونٹوں کو چھو لینے کے لیے یقیناً بے تاب ہوگی۔

"جو کچھ ہوا ہے وہ اگر میری سمجھ میں آگیا تو میں تمھیں ضرور بتاؤں گا۔" چند لمحوں بعد شرف الدین نے کہا۔ وہ اس وقت بلا کا سنجیدہ اور متفکر لگ رہا تھا۔ میں نے ہی نہیں شاید شگفتہ نے بھی اسے پہلی بار اس قدر سنجیدہ دیکھا تھا۔

خاموشی پھر کمرے میں پھیل گئی، عجیب سا بوجھل پن تھا۔ مجھے یہ بوجھل پن سخت گراں گزرا کہ ایسا ہی بوجھل پن تو میری پوری زندگی پر حاوی رہا تھا۔ یہ بوجھل پن تو میری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا اور اسی بوجھل پن سے نجات کے لیے ہی تو میں کوشاں تھا۔ میری طبیعت مکدر ہوگئی۔ میں نے خاموشی سے چائے پی اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ دیواروں پر شرف الدین کے باپ دادا کی تصویریں لگی تھیں۔ میں لاشعوری طور پر شرف الدین کے دادا کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا جن کی آنکھوں میں بڑا وقار، بڑا سکون اور چہرے پر بلا کی شرافت تھی۔ کیا میرے پردادا کا چہرہ بھی ایسا ہی ہوگا! میں نے حسرت سے سوچا۔ تبھی میرے اندر ایک بے چینی سی پھیل گئی۔ میرا جی چاہا کہ ہم جلد از جلد حویلی پہنچ جائیں۔ میں ان کی تصویر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ شرف الدین بھی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔

"چلیں!" میں نے پوچھا۔

"ہاں چلو!" وہ فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ شگفتہ ہم دونوں کو کھوجتی رہ گئی اور ہم باہر نکل آئے۔ وہاں سے ہم سیدھے لڈن کے گھر پہنچے۔ لڈن کی ماں نے مجھے دیکھتے ہی میری بلائیں لینا شروع کر دیں۔ آواز دے کر لڈن کے باپ، رمضان کو میری آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ اندرونی برآمدے میں ایک کھٹیا پر لیٹا تھا جو یہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس کی خیر خیریت پوچھی۔

"چھوٹے مرزا! میں نے سنا ہے چھوٹی بہو بیگم مراد آباد چلی گئیں!" اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔ غالباً اسے دمے کی شکایت بھی ہو چکی تھی۔

"جی رمضو بابا! آپ کو کس نے بتایا؟"

"لڈن کی ماں بتا رہی تھی چھوٹے مرزا۔ انھوں نے یہ فیصلہ بہت دیر سے کیا، اگر پہلے کر لیتیں تو بڑے مرزا یوں۔" ابھی رمضو بابا نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ انھیں کھانسی آگئی۔ کھانسی اتنی خوف ناک تھی جیسے سینے میں کپڑا بننے والی کھڈی چل پڑی ہو۔ میں نے ان کی کمر سہلائی۔ شرف الدین بھاگ کر سامنے رکھی صراحی سے پانی انڈیل لایا۔ لڈن شاید اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ لڈن کی اماں لال رنگ کا کھانسی کا شربت لیے ہماری طرف لپکی۔

"حکیم جی کی دوا چھوڑ کر پتا نہیں کون سی دوا لے آیا یہ لڈن۔ مجھے لگتا ہے اس دوا نے الاؤ دہکا دیا ہے سینے میں۔" وہ بڑبڑائی اور چمچے میں دوا بھر کر ان کے حلق میں انڈیل دی۔ رمضو بابا کا چہرہ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔ اب بھی ان کے لاغر اور بوڑھے بدن کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ سینے کی غرغراہٹ اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ کافی دیر بعد کھانسی کا دورہ ختم ہوا تو وہ بے دم سے ہو کر لیٹ گئے۔ ان کے گلے کی تمام رگیں پھولی ہوئی تھیں، آنکھیں وحشت ناک حد تک پھیل چکی تھیں اور ان میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کان اور چہرہ اب بھی سرخ تھے۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اسی وقت لڈن تولیے سے سر صاف کرتا آگیا۔ وہ غالباً نہا کر نکلا تھا۔ باپ کی حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد لڈن کی اماں شربت بنا لائیں۔ اب رمضو بابا کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ اچانک میں چونک اٹھا بلکہ اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں رمضو بابا کا ادھورا جملہ سرسرا گیا تھا، یوں جیسے اچانک کوئی کیڑا پیر پر رینگ جائے یا آستین میں گھس جائے۔ "رمضو بابا!" میں بے ساختہ پکار اٹھا۔

"ہاں چھوٹے مرزا!" انھوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی آپ نے کہا تھا کہ اگر اماں حویلی چھوڑنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیتیں تو ابا۔ آپ کیا جانتے ہیں رمضو بابا! ابا کا انتقال تو ہارٹ اٹیک۔"

"نہیں چھوٹے مرزا۔" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "بڑے مرزا کا دل کتنا مضبوط تھا یہ آپ نہیں، میں جانتا ہوں۔ جو شخص اسٹیشن والے کنویں پر جا کر راتیں گزارتا ہو، جو مرزا صولت بیگ کے اندھے کمرے میں چودھویں کی خطرناک رات گزارا کرتا ہو، جو برآمدے کے پار برگد کے درخت کے نیچے چتا بناتا رہا ہو، وہ اتنا کمزور نہیں ہو سکتا کہ اس کا دل بند ہو جائے اور وہ مر جائے۔ وہ مرزا صولت بیگ جیسے جلاد، کا پوتا اور مرزا شجاعت بیگ جیسے بہادر شخص کا بیٹا تھا۔ اسے یوں مار دینا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔"

ان کی آواز میں بے پناہ نفرت تھی، یہ نفرت کسی کے لیے تھی میں نہ جان سکا مگر ان کے منہ سے یہ باتیں سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ مجھے ابا یا اماں کے علاوہ بھی کسی کی زبانی ایسی کسی بات کا علم نہ ہو سکا تھا کہ ابا اس کنویں پر راتیں گزارا کرتے تھے یا وہ پردادا کے کمرے میں بھی راتیں گزار چکے ہیں، اگر ایسا ہو بھی چکا تھا تو اچنبھے کی بات نہ تھی، یہ وہی تجسس ہو سکتا تھا جو اب میرے اندر بھی پروان چڑھ رہا تھا مگر برگد کے پیڑ تلے چتا بنانے والی بات میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، نہ ایسی کوئی بات دیکھی تھی اور نہ سنی تھی۔ نہ ہی اماں نے کسی ایسی بات کا ذکر کیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ اگر چتا بناتے تھے تو اس کا کیا کرتے تھے، اگر جلاتے تو اماں ہی کیا گھر کے سارے افراد کو پتا چل جاتا۔ اس درخت کے نیچے چتا بنی ہوئی تو صرف میں نے دیکھی تھی اور وہ یقیناً ابا کی بنائی ہوئی چتا نہیں ہو سکتی تھی اس لیے کہ تایا اور اماں کی آواز سن کر جب میں چونکا تھا تو وہ چتا بھی اس لڑکی کی طرح غائب ہو چکی تھی جسے میں نے وہاں روتے دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں گرہیں سی پڑتی جا رہی تھیں۔

"چھوٹے مرزا! بات بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ آپ نے یہاں رک کر کوئی عاقلانہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔" رمضو بابا کی آواز مجھے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔

"رمضو بابا!" میرے بجائے شرف الدین بول اٹھا۔ "آپ ہمارے بہت سے سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں مگر اس وقت نہیں۔ میں اور وقار الحسن شام کو آپ کے پاس

آئیں گے۔ اس وقت ہم لڈن کو لینے آئے ہیں۔ ہم مرزا صولت بیگ کے کمرے کی صفائی کرانا چاہتے ہیں' وقار ان کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے' ویسے اس کی تمام تر دلچسپی جوگند رناتھ سوامی جی کی تصویر سے وابستہ ہے' کیا آپ جوگند رناتھ کو جانتے ہیں؟"

شرف الدین جب یہ بتا رہا تھا تو میرا جی چاہا کہ میں اسے چپ کرا دوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ لڈن کو ہمارے ساتھ نہیں جانے دیں گے۔ شرف الدین کے بات ختم کرتے ہی میں نے رمضو بابا کی طرف دیکھا' حسب توقع کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ وہ بے چین ہو کر کہنیوں کے بل اٹھ گئے۔

"نہیں شرف الدین۔۔۔ ایسا نہیں کرو۔۔۔ جو چیز جہاں دفن ہے' اسے وہیں دفن رہنے دو۔ مجھے لڈن کی نہیں وقار الحسن کی زیادہ فکر ہے۔" الفاظ ان کی زبان سے یوں ادا ہو رہے تھے جیسے منہ میں بھرے جلتے ہوئے انگارے ہوں جنہیں جلد از جلد اگل کر وہ اذیت سے بچنا چاہتے ہوں۔

"میری فکر نہ کریں رمضو بابا! مجھے کچھ بھی نہیں ہو گا۔" میں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ منہ سے کچھ بھی نہ بولے مگر نڈھال سے ہو کر دوبارہ لیٹ گئے۔ ان کی نگاہیں چھت کی بلیوں پر اٹک کر رہ گئیں۔ سانس پھر پھولنے لگی اور ہونٹ بھنچ گئے۔

"آپ آرام کریں رمضو بابا۔ ہم شام کو آپ کے پاس آئیں گے۔" شرف الدین نے ان کا پلنگ سے لٹکا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ یوں لیٹے ہوئے جیسے انھوں نے کچھ بھی نہ سنا ہو یا ان کے ہاتھ کو کسی نے بھی نہ چھوا ہو۔ شرف الدین نے ان کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پھر پلنگ سے لٹک کر جھولنے لگا' اگر ان کی سانس دھونکنی کی مانند نہ چل رہی ہوتی اور آنکھوں کی گدلی سطح پر پتلیاں بے چینی سے حرکت نہ کر رہی ہوتیں تو میں انھیں مردہ سمجھ لیتا۔ میں اٹھنا نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ ان کی حالت تسلی بخش نہ تھی مگر جب شرف الدین نے دھیرے سے میرے کاندھے کو چھوا اور جب میں نے چونک کر لڈن اور شرف الدین کی طرف دیکھا تو دونوں ہی نے مجھے اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بادل نخواستہ وہاں سے اٹھ آیا۔ میں نے نکلتے نکلتے لڈن کی اماں کو رمضو بابا کا خیال رکھنے کا کہہ دیا۔ نہ معلوم مجھے کس بات کا دھڑکا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا جو مجھے بے چین کر رہا تھا۔ میرے قدموں کو بوجھل کر رہا تھا۔ شاید میں ان سے کچھ اور بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ ان کا مجھے پہلے ہی خیال کیوں نہ آیا۔ وہ میرے دادا کے خاص ملازم تھے۔ یقیناً پردادا کی زندگی میں ہی وہ ملازم ہوئے ہوں گے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً اسی برس تو ہو گی۔ اب سے شاید دس پندرہ برس پہلے تک وہ ہمارے ملازم تھے پھر انھوں نے باقاعدہ ملازمت تو چھوڑ دی تھی مگر گھر آنا نہیں چھوڑا تھا میں نے اکثر ابا کو ان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ جب بھی آتے ابا انھیں اپنی بیٹھک میں لے جاتے پھر گھنٹوں ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انھوں نے نوکری خود چھوڑی تھی یا کسی نے انھیں نکال دیا تھا۔ ممکن ہے وہ بھی پردادا کے زمانے میں نوکری چھوڑ گئے ہوں۔ کچھ بھی تھا مجھے اس بات کا احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ کچھ ایسی باتوں سے بھی واقف ہیں جن سے میں اب تک ناواقف رہا ہوں یا مجھے ناواقف رکھا گیا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اماں نے جب مجھے دوسری بہت سی باتیں بتا دیں تو ایسی کسی بات کے بارے میں مجھے آگاہ کیوں نہیں کیا جو بہرحال میرے بہت کام آ سکتی تھی۔

میں انھی سوچوں میں لڈن اور شرف الدین کے ساتھ چلتا رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ ہم کب حافظ جی کے گھر پہنچ گئے۔ حافظ جی کا بیٹا بشیر باہر درخت کے نیچے بچھی چوکی پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور چند حاجت مند اس کے گرد بیٹھے تھے۔ شرف الدین کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شرف الدین اس کے قریب پہنچ گیا اور نہ جانے اس سے کیا کیا کہتا رہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا' اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف تھا۔ وہ تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا مگر چند ہی منٹ بعد وہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ شرف الدین الفاظ کا جادوگر ہے۔ اس کے آگے بڑے سے بڑا شخص بھی حوصلے ہار سکتا ہے۔ میں اور لڈن کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد بشیر نے وہاں بیٹھے لوگوں سے کچھ کہا تو وہ لوگ ہاتھ جوڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بشیر گھر کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ شرف الدین کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ بشیر کو لیے ہوئے ہمارے قریب آ گیا۔

"وقار الحسن! تم ان دونوں کو لے کر حویلی پہنچو میں کھانا لے کر آ رہا ہوں۔"

"کھانا۔۔۔؟"

"ہاں! ظاہر ہے کہ ہم گھنٹہ بھر میں تو اپنے کام سے فارغ نہیں ہو سکتے اور ابھی ساڑھے دس بجے ہیں۔ میں بارہ بجے کھانے کا عادی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں لڈن اور بشیر کو لے کر حویلی کی طرف چل پڑا جب کہ شرف الدین راستے ہی میں ہم سے جدا ہو کر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا تھا۔ ہم حویلی پہنچے۔ میں نے ان دونوں کو اپنے کمرے میں بٹھایا۔ لڈن تو خاصا بے پروا نظر آ رہا تھا مگر بشیر کی آنکھیں کچھ پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ حویلی کی ایک ایک چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو تیزی سے گھما رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ بشیر اور لڈن پہلی مرتبہ حویلی کے اندر داخل ہوئے تھے' ابا کے پاس بھی جو لوگ آتے تھے وہ حویلی کے سامنے والے گیٹ سے آنے کی بجائے دائیں جانب بنے چھوٹے گیٹ سے داخل ہوتے تھے' اس گیٹ کے برابر والا بڑا ہال نما کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ گیٹ اس وقت بند تھا پھر کیونکہ گھر میں خواتین نہیں تھیں اس لیے میں انھیں اس طرف سے لے آیا تھا۔ ہمیں ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ شرف الدین کھانا لے کر آ گیا۔ ابھی کسی کو بھی بھوک نہیں تھی اس لیے یہ طے کیا گیا کہ پہلے تیسری منزل کو دیکھ لیا جائے پھر کھانا کھانے کے بعد صفائی کا کام شروع کیا جائے گا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ حویلی کے اندرونی حصے والی سیڑھیوں کو بڑا چوبی دروازہ لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور اس پر پڑے تالے بھی زنگ آلود ہو چکے تھے اس لیے اس دروازے کو کھولنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے میں ان تینوں کو لے کر برآمدے کے دوسرے طرف والے حصے میں آ گیا جہاں سے سیڑھیاں اوپر کی منزل پر جاتی تھیں۔ یہ وہی سیڑھیاں تھیں جنھیں مرزا صولت بیگ استعمال کرتے تھے اور جو عین چبوترے کے سامنے تھیں۔ سیڑھیاں دھول میں اٹی ہوئی تھیں۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر سیڑھیوں پر قدم رکھا تو اس پر بکھرے سوکھے پتے ہمارے پیروں تلے آ کر چرمرا گئے۔ سیڑھیاں مضبوط تھیں۔ شرف الدین ان سیڑھیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اسے اچانک چونک کر جھکتے ہوئے دیکھا۔ میں رک گیا۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جھکا ہوا سیڑھیوں کے اس حصے کی طرف کچھ تلاش کر رہا تھا جہاں سے ریلنگ کو سہارا دینے والا لکڑی کا ستون سا زمین میں پیوست تھا۔ دوسرے ہی لمحے جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں چاندی کی ایک باریک سی زنجیر تھی جس میں جگہ جگہ گھنگھرو پڑے تھے۔ وہ غالباً پازیب تھی اور میں اس پازیب کی حالت دیکھ کر چونک اٹھا' یوں لگتا تھا جیسے

نہ اٹھائی ہو بلکہ ابھی ابھی کسی سنار کے شوکیس سے نکالی ہو۔ پازیب نئی اور چمک دار تھی۔ میرے علاوہ لڈن اور بشیر بھی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شرف الدین نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور بولا۔ "حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ پازیب میری ہے اور یہ رات یہاں گر گئی تھی' جب میں ورزش کے بعد یہاں بیٹھ کر سو گیا تھا۔"

ممکن ہے بشیر اور لڈن اس کے جملے سے مطمئن ہو گئے ہوں مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ یہ وہ پائل بھی ہو سکتی تھی جس کی آواز میں کئی بار سن چکا تھا۔

شرف الدین نے مجھ سے نگاہیں چرا لیں اور پازیب کو اپنی جیب میں ڈال لیا پھر وہ بے خوف و خطر سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا اس کے پیچھے بشیر' لڈن اور آخر میں میں تھا۔ میرے اندر خوف سے زیادہ بے پناہ تجسس تھا۔ یہ وہ تجسس تھا جو جانے کب سے مجھ میں پل رہا تھا۔ میں آج زندگی میں پہلی بار ان سیڑھیوں پر قدم رکھ رہا تھا۔ ہم پہلی منزل پر پہنچے تو میری کیفیت بھی شرف الدین' بشیر اور لڈن سے مختلف نہ تھی۔ میں بھی ایک ایک چیز کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک طویل برآمدہ تھا جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لکڑی کے منقش ستون لگے تھے۔ ان ستونوں کے درمیان لکڑی کا جنگلا تھا جو سیڑھیوں کے دائیں اور بائیں دونوں جانب دور تک چلا گیا تھا۔ سامنے قطار سے تین دروازے تھے' تیسرے اور آخری دروازے سے کچھ فاصلے پر پھر ویسی ہی سیڑھیاں تھیں جو دوسری منزل پر جا رہی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ پہلی منزل پر جو کمرے بنے ہوئے تھے ان میں کیا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ پہلی منزل پر دونوں چچا اور تایا کے کمرے تھے جو انھوں نے اپنی اپنی شادیوں کے بعد تک استعمال کیے تھے مگر یہ عرصہ زیادہ طویل نہ تھا' پھر وہ لوگ مراد آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے ان بند کمروں میں ان کا بچا کھچا سامان ہو' بہرحال یہ کمرے ہمارے لیے اہم نہیں تھے۔ یہ بات شرف الدین بھی جانتا تھا اس لیے وہ بھی ان دروازوں پر پڑے زنگ آلود تالوں پر نگاہ ڈالتا ہوا ان سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا جو آخری کمرے سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ پہلی منزل کا یہ برآمدہ خاصا طویل تھا۔ ہمارے چلنے سے برآمدے کا چوبی فرش چرچرا رہا تھا۔ ریلنگ پر لگی مٹی ہمارے ہاتھوں پر لگ چکی تھی اور میں خاصی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ ہم سیڑھیاں عبور کر کے دوسری منزل پر پہنچے تو یہاں بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے' ان دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے' یعنی ان دروازوں پر تالے نہیں تھے البتہ لوہے کی بڑی بڑی کنڈیاں

تھیں جو بند تھیں۔ ان کنڈیوں کے اوپر کچھ فاصلے پر ایک پیتل کی زنجیر سی لٹکی ہوئی تھی۔ اس زنجیر کے دوسرے سرے پر پیتل کی ایک ٹھوس سلاخ تھی جو کنڈی میں اٹکائی گئی تھی۔ ہم نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی اور پھر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ اچانک شرف الدین پلٹا اور اس نے حیرت سے میرے سر کے اوپر سے دوسری طرف دیکھا۔ میں نے پلٹ کر اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ دور برآمدے کے آخری سرے پر چھت سے تقریباً تین فٹ نیچے دو چھتی بنی ہوئی تھی۔ اس دو چھتی کو بھی سامنے سے لکڑی کے دروازوں سے بند کیا گیا تھا۔ اس وقت ان دروازوں کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور اس کے کنڈے میں گیندے کے کئی ہار لٹکے ہوئے تھے۔ یہ ہار بہت زیادہ پرانے نہیں تھے، یوں لگتا تھا جیسے ایک، دو روز پہلے ہی انھیں لٹکایا گیا ہو۔ اسی دروازے پر نیچے سے اوپر تک سیاہی کی لمبی سی لکیر تھی جیسے اس لکیر کے عین نیچے کسی نے تیل یا گھی کا دیا جلایا ہو جس کی لو سے نکلنے والا گاڑھا دھواں یہ سیاہ لکیر ڈالتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا تھا۔ چھت پر بھی اس طرح کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اور شرف الدین غیر ارادی طور پر اس دو چھتی کی طرف بڑھ گئے۔ ہم نے ایسی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی جہاں یہ دیا رکھا جا سکتا ہو مگر وہاں نہ کوئی طاق تھی نہ ہی کوئی ایسا ریک وغیرہ لیکن دھوئیں کی یہ اوپر جاتی ہوئی سیاہی کی لکیر اس بات کا ثبوت تھی کہ یہاں دیا جلایا جاتا رہا ہے۔ دو چھتی کافی اونچی تھی ورنہ شاید ہم اس ہار کو بھی چھو کر دیکھتے۔ شرف الدین نے شاید اسی لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے سہارے اوپر پہنچا جا سکے مگر وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ قریب سے بھی گیندے کے پھول زیادہ پرانے نہیں لگ رہے تھے۔

میں نے اور شرف الدین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ کچھ سوچتا ہوا پلٹ گیا۔ اب اس کا رخ پھر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم جونہی سیڑھیوں کی طرف مڑے ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان سیڑھیوں پر بھی ایک اونچا چوبی دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس دروازے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ کنڈیاں پیتل کی تھیں اور ان تینوں میں پیتل کے بڑے بڑے تالے پڑے تھے۔ یہ سیڑھیاں مرزا صولت بیگ کے کمرے تک جاتی تھیں۔ مجھے چوبی دروازہ اور ان پڑے تالے دیکھ کر کافی مایوسی ہوئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان تالوں کی چابیاں کہاں ہیں۔ شرف الدین کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ہم لُٹے ہارے ہوئے جواری کی طرح کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"تمھارے پاس حویلی کی چابیاں ہیں؟" شرف الدین نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں ہیں تو سہی مگر میرا خیال ہے کہ ان میں ان تالوں کی چابیاں نہیں ہوں گی۔"

"ہم انھی چابیوں سے کوشش کریں گے۔ ویسے تم ابا کے کمرے میں ان چابیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ میرا خیال ہے کہ چابیاں انھی کے کمرے میں ہوں گی۔"

شرف الدین نے کہا تو مجھے بھی یہ یقین سا ہو گیا کہ چابیاں وہیں سے ملیں گی۔ بہرحال اب یہاں کھڑے رہنا بیکار تھا۔ اس لیے ہم لوگ واپس چلے آئے۔ نیچے آکر ہم نے ہاتھ منہ دھویا اس لیے کہ ہم پورے کے پورے مٹی میں اَٹ چکے تھے، یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی صحرا کو عبور کر کے آئے ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر میں باورچی خانے سے پلیٹیں اٹھا لایا۔ شریف الدین کھانا ٹفن میں لایا تھا۔ ہم نے اماں ہی کے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہی میری آنکھوں میں نیند بھر گئی۔ شرف الدین بھی اونگھنے لگا تھا۔ ہم چاروں قیلولہ کرنے کی نیت سے لیٹ گئے۔ ہمارا ارادہ سونے کا نہیں تھا، میں سر جھٹک جھٹک کر نیند بھگانے کی کوشش کرنے لگا اور ہر اس جگہ کے بارے میں سوچنے لگا جہاں چابیاں ملنے کا امکان تھا۔ ابا کا کمرا ابا کی موت کے بعد سے بند تھا۔ نہ معلوم کہ حویلی یہ روایت کیوں چلی آ رہی تھی کہ ہر مرنے والے کے کمرے کو بند کر دیا جاتا تھا۔ میں نے اماں ہی کو دیکھا تھا کہ وہ پہلے دادی کے کمرے میں اور بعد میں ابا کے کمرے میں بھی مغرب کے وقت روشنی کر کے، اگر بتی جلا کر تسبیحاں پڑھا کرتی تھیں مگر میں نے کبھی انھیں دادا یا پردادا کے کمرے میں یعنی اوپر کی منزل پر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ دادی اور ابا کا کمرا نچلے حصے میں تھا جہاں وہ پابندی سے روشنی کر کے تسبیحاں پڑھا کرتی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر چابیاں ابا کے کمرے میں نہ ملیں تو دادا کے کمرے میں تلاش کروں گا۔ دادا کا کمرا پہلی منزل پر تھا جہاں چچا اور تایا کا کمرا تھا۔ میں ان سوچوں میں گم جانے کب سو گیا، اور خدا جانے کب تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ گہری خاموشی طاری تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ شرف الدین، بشیر اور للٰن کہاں گئے کہ انھوں نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ میں تو دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنے لیٹا تھا پھر یہ اتنے...

مجھے پتا بھی نہ چلا۔ میں اماں کی مسہری پر لیٹا تھا جب کہ شرف الدین، بشیر اور للٰن نیچے چاندنی پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر لیٹ گئے تھے۔ میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اٹھا تو کسی چیز سے ٹکرا کر لڑکھڑا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں کسی انسانی جسم سے ٹکرایا ہوں۔ میرا دل پہلے تو بری طرح دھڑک اٹھا پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ مجھے خیال آیا کہ للٰن، بشیر یا شرف الدین ہوں گے مگر اس خیال سے پھر خوف میرے پورے وجود میں پھیل گیا۔ اگر میں انھی میں سے کسی سے ٹکرایا ہوں تو وہ اٹھے کیوں نہیں۔ میں دو قدم پیچھے ہو گیا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں ٹکرا جانے والے بدن کو چھو کر دیکھتا۔

میں نے اندازے سے دروازے کی طرف دیکھا جہاں ہلکا سا روشن خلا اس بات کا ثبوت تھا کہ میں نے صحیح سمت طے کی ہے۔ میں چند لمحے کھڑا رہا پھر بیٹھ گیا اور ہاتھوں سے آگے کی طرف ٹٹولتا ہوا بڑھا، چند لمحوں بعد ہی میرے ہاتھ کسی کے پیروں سے ٹکرائے اور ایک بے ساختہ قسم کی چیخ میرے حلق سے نکل کر دور تک پھیل گئی۔

چیخ نکلتے ہی میں نے کمرے میں ہلچل محسوس کی اور دوسرے ہی لمحے شرف الدین کی بھرائی ہوئی آواز میں للٰن اور بشیر کی بے ساختہ چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔

"کون ہے۔۔ کیا ہے۔۔؟"

"شرف الدین۔۔۔!"

"اندھیرا کس نے کیا؟"

آوازیں تینوں کی تھیں، ان تینوں کو اپنے قریب محسوس کر کے میری جان میں جان آئی۔

"شرف الدین۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر آواز دی تو اس کے آگے کی جانب پھیلے ہوئے ہاتھ میرے ہاتھوں میں آ گئے۔ وہ بھی شاید ٹٹول کر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وقار۔۔۔ سوئچ کس طرف ہے۔" شرف الدین کھڑا ہو گیا تھا اور اب مجھے اس کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا، پھر شاید ہم سب ہی کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں اور ہم سب ہی ایک دوسرے کو ہیولوں کی مانند نظر آنے لگے۔

"تمھاری دائیں جانب۔۔۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ للٰن اور بشیر کھسک کر میرے قریب آ چکے تھے۔ ان میں سے جانے کس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی، کوئی میرے قریب بیٹھا کانپ رہا تھا۔

"کون۔۔ بشیر؟" میں نے ہاتھ بڑھایا تو کسی کے گھٹنے سے ٹکرا گیا۔

"ہاں۔۔ چھوٹے مرزا۔۔ یہ۔۔ یہ اتنا اندھیرا کیسے ہو گیا۔۔ ابھی تو۔۔ ابھی تو دن ہے۔" اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، اچانک کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ لمحہ بھر کو ہم سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دوسرے ہی لمحے ہم سب ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

"دن نہیں ہے، رات ہو چکی ہے۔" شرف الدین کی آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔

"مگر۔۔۔ اتنی جلدی!" للٰن نے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا۔ "ابھی تو ہم سوئے تھے۔"

"بے وقوفوں کی سی باتیں نہ کرو۔ ہم ابھی نہیں سوئے تھے، دوپہر میں سوئے تھے۔ میں اور وقار الحسن تو خیر اس لیے اتنی دیر بے خبر سوتے رہے کہ ہم رات بہت دیر تک جاگے تھے اور سویرے سویرے اٹھ گئے تھے مگر تم دونوں پر کیوں نیند ٹوٹ پڑی تھی۔" شرف الدین نے غصے سے للٰن اور بشیر کی طرف دیکھا۔

"میں تو دوپہر میں سونے کا عادی بھی نہیں ہوں بھیا! پتا نہیں کیا ہو گیا۔! میری مانو تو یہاں سے چلے چلو۔ یہاں رات میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" بشیر اب کافی سنبھل چکا تھا مگر گھٹنے سکیڑے اور دونوں بازوؤں سے اپنے دونوں کندھے تھامے گٹھڑی سی بنا بیٹھا تھا۔

"بکواس نہ کرو۔ تم جانا چاہو تو جاؤ۔ ہم جس کام کا ارادہ کر کے آئے ہیں اسے کر کے ہی جائیں گے۔" شرف الدین نے بشیر کو جھڑک دیا پھر للٰن کی جانب مڑا۔

"کیوں للٰن! تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"بھیا! جہاں تم وہاں ہم۔ اپنے کو بالکل ڈر نہیں لگتا۔ اپنے قبضے میں کوئی جن بھوت نہیں ہے پھر بھی دل بڑا مضبوط ہے۔ نہ اپن کے گلے میں کوئی تعویز ہے۔" اس نے کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ تعویز کے ذکر پر بے اختیار میرا ہاتھ اپنے گلے کی طرف رینگ گیا۔ میرے گلے میں تعویز نہیں تھا۔ جلد ہی مجھے یاد آ گیا کہ تعویز میں نے صبح نہاتے ہوئے غسل خانے میں کھونٹی پر ٹانگ دیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں اس کونے کی طرف بڑھ گیا جہاں میں نے لالٹین رکھی تھی۔ لالٹین میں تیل نہیں تھا اور تیل کا ڈبا باورچی خانے میں تھا۔ مجھے اندھیرے میں باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی، میں نے اوپر بنی طاق پر ہاتھ سے ٹٹولا۔ توقع کے مطابق دیا سلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے لالٹین جلائی اور جلدی سے باورچی کی طرف بڑھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ

اس کی لو زیادہ دیر تک روشن نہیں رہ سکے گی۔ تیل کا ڈبا اٹھا کر میں واپس کمرے میں چلا آیا۔ لالٹین بجھا کر میں نے اسے تیل سے بھر دیا اور پھر جلا دیا۔ شرف الدین کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بشیر آنکھیں پھاڑے بیٹھا اسے تک رہا تھا اور لڈن اسی بے پروائی سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"مرزا صولت بیگ کے کمرے میں بجلی ہے؟" شرف الدین نے اچانک سر اٹھا کر سوال کیا۔

"نہیں۔ بجلی آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے اور اوپر کی منزلیں اس سے پہلے ہی بند کر دی گئی تھیں۔ بجلی صرف نچلے حصے کے انھی چند کمروں میں اور باورچی خانے میں لگوائی ہے۔"

"ہوں۔" اس نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"بھیا۔!" بشیر کی آواز سن کر ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "بھیا ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے' میں جاؤں!"

"جاؤ یار۔ میں سمجھا تھا کہ تم ڈرپوک نہیں ہو۔" شرف الدین جھنجلا گیا۔

"نہیں میں ڈرپوک نہیں ہوں بھیا مگر آتی رات کو۔ آپ نے تو کہا تھا کہ دن ہی دن میں کام ختم ہو جائے گا۔" وہ بہت خوفزدہ تھا۔

"بات سنو! یہ تم جن وغیرہ کیسے قابو میں کر لیتے ہو؟" شرف الدین اس کا تمسخر اڑایا۔

"ایسی کی بات ہے بھیا! میں تو صرف تعویز وغیرہ دیتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو وہ بوتلیں جو تم مجھے دکھا رہے تھے اور جن میں تمھارے ابا نے نیلا پیلا دھواں بھر رکھا تھا وہ کیا چکر ہے؟"

"وہ تو۔ وہ تو ابا جانتے ہیں۔"

"یار تم لوگ اپنی جہالت سے کیوں معصوم لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہو' اور تم ایسے ہی تعویز گنڈے کرنے والے ہو تو کچھ تعویز اپنے گلے میں کیوں نہیں ڈال لیتے۔"

"ڈالے تو ہیں۔" اس نے فوراً اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر تعویزوں کا ایک گچھا سا باہر نکال لیا۔

ایک بے ساختہ قسم کا قہقہہ لڈن اور شرف الدین کے حلق سے پھوٹ نکلا۔

"ابے اتنے تعویز ڈال کے بھی گھگھیا رہا ہے؟" لڈن نے اپنے میلے میلے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"جن باتوں پر خود تم لوگوں کو اعتقاد نہیں ہے ان سے دوسرے لوگوں کی معصومیت کیوں خریدتے ہو تم لوگ!" شرف الدین سخت غصے کے باوجود بھی نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"بھیا میں جاؤں!" بشیر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"جا یار۔ دفع ہو۔" شرف الدین نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا پھر اس نے پہلے میری طرف اور پھر لالٹین کی طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس اندھیرے میں تو باہر نکلتے ہوئے اس کا دم ہی نکل جائے گا۔ میں لالٹین لے کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے غسل خانے سے اپنا تعویز بھی لینا تھا اور شرف الدین کی باتیں سننے کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میرے تعویز کے بارے میں کچھ پتا چلے۔ بشیر مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر کھل اٹھا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بڑے گیٹ تک پہنچ گئے۔ ہم میں سے گھڑی کسی کے پاس نہ تھی کہ وقت کا پتا چلتا مگر میرا اندازہ تھا کہ آٹھ ساڑھے آٹھ ہوئے ہوں گے۔ ڈھلتا چاند تھا اس لیے دیر ہی سے نکلتا تھا سو ساری حویلی میں گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گیٹ کھولتے ہی باہر سے کچھ روشنی رینگ کر اندر چلی آئی۔ کچھ فاصلے پر تاج الدین کی پان بیڑی کی دکان کھلی ہوئی تھی۔ وہاں لالٹین لٹک رہی تھی اور کچھ لوگ بھی کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر بشیر کو کافی ڈھارس ہوئی اور وہ خدا حافظ کہہ کر دکان کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے گیٹ میں کنڈا لگایا اور واپس چل پڑا۔ میں اماں کے کمرے میں جانے کے بجائے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اماں کے کمرے سے نکلنے والی روشنی نے اسی حصے میں کافی اجالا کر رکھا تھا۔ غسل خانے کے قریب جا کر میں نے دروازہ کھولا اور لالٹین لیے اندر داخل ہو گیا۔ لالٹین اونچی کر کے میں نے کھونٹی پر نگاہ ڈالی۔ وہاں تعویز نہیں تھا۔ میں ساکت رہ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ صبح میں نے تعویز وہیں ٹانگا تھا۔ پھر بھی میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اوپر بنے طاق پر ہاتھ سے ٹٹولا۔ اپنے میلے کپڑوں کو جھاڑ کر دیکھا۔ پانی کی ٹنکی کے اوپر اور صابن رکھنے والی کھچی کے اوپر ہر جگہ تلاش کیا۔ تعویز کہیں بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بے اختیار میری نگاہ اوپر کی طرف اٹھ گئی' اوپر کچھ لکڑی کی بلیاں رکھی تھیں۔ میں نے شاید آپ کو پہلے نہیں بتایا کہ اس غسل خانے میں بھی ایک چھوٹی سی دو چھتی بنی تھی جسے ابا نے لوہے کی ٹنکی لگانے کے لیے بنوایا تھا مگر پھر جانے کیوں ٹنکی نہ لگوائی۔ اس دو چھتی پر ہی لکڑی کی یہ گز گز بھر کی چپٹی چپٹی بلیاں رکھی ہوئی تھیں جن کے سرے باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ میں نے لالٹین والا ہاتھ اوپر کیا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ میرا تعویز

ایک بلی کے سرے میں لٹکا ہوا تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر میرا حیران ہونا بجا تھا کیونکہ یہ بلیاں کافی اونچائی پر رکھی تھیں اور وہاں تک میرا ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ وہاں اسے کس نے ٹانگا یہ سوچنا تو بعد کی بات تھی سب سے پہلے تو اسے اتارنے کا مسئلہ تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا پھر پیڑا سرکا کر میں اس پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ تعویز کی طرف بڑھایا' وہ اب بھی بالشت بھر میرے ہاتھ سے اونچا تھا۔ میں لالٹین لے کر باہر آ گیا۔ باہر نالی صاف کرنے والی سلاخ رکھی تھی' میں اسے اٹھا کر دوبارہ غسل خانے میں پہنچ گیا۔ اب مجھے یوں گھبراہٹ ہونے لگی تھی کہ شرف الدین میرے غائب ہو جانے پر کڑھ رہا ہو گا' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میرے پیچھے یہاں تک پہنچ جاتا اور اگر اسے پتا چلتا کہ میں وہ تعویز اتارنے کی کوشش میں لگا ہوں تو۔ یہی سوچتا ہوا میں غسل خانے میں داخل ہوا اور اس سلاخ کی مدد سے تعویز اتار لیا۔ اسے گلے میں ڈالنے کی بجائے میں نے جلدی سے جیب میں رکھا اور تیز قدموں سے پلٹ کر اماں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ شرف الدین غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔

"کیوں۔ کوئی خاص میٹنگ تھی تمھاری روحوں سے جو یوں ہمیں ہونقوں کی طرح بیٹھا چھوڑ کر غائب ہو گئے۔"

"مم۔ میں ذرا کام سے۔ یار میں غسل خانے میں گیا تھا۔"

"تو کیا کر رہے تھے؟" اس نے طنزیہ انداز سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"خیر فضول باتیں چھوڑو' اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے لالٹین کی لو نیچی کرتے ہوئے کہا۔

"میں اسی لیے تمھارے انتظار میں تھا۔ تم نے چابیاں ڈھونڈ لیں؟"

"نہیں۔ چابیاں ابا کے کمرے میں ڈھونڈنا ہوں گی' اور وہاں میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔" میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا۔

"تو چلو یار۔ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" وہ جھنجلا گیا۔

"وقت میں نے ضائع نہیں کیا ہے۔ تم شاید کھانے میں بھنگ ڈال کر لائے تھے۔" میں نے چڑ کر جواب دیا۔

وہ چونک اٹھا۔ "بھنگ۔!"

"کیوں! اس میں چونکنے کی کیا بات ہے' ظاہر ہے تم یہ تو مانو گے نہیں کہ کوئی ان دیکھی چیز' انھیں شکنتلا کی روح یا پھر کسی اور کی روح ہمیں صولت بیگ کے کمرے میں جانے سے روکنا چاہتی ہے تبھی ہم سب گہری نیند سو گئے تھے۔"

میں نے منہ بنا کر کہا۔

وہ خالی خالی آنکھوں سے مجھے تکتا رہا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

"چلو!" اچانک وہ کھڑا ہو گیا۔

اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر لڈن بھی انگڑائی لیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں نے لالٹین اٹھالی۔ اماں کے کمرے کے بعد تین کمرے اور تھے' ایک بہنوں کا' پھر پھوپیوں کا' پھر میرا اور اس کے بعد ابا کا کمرا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اندر جھانکا مگر اندر گہرا اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑی لالٹین کی روشنی نے کمرے کے فرش پر سلاخوں والی کھڑکی بنا دینے کے سوا کچھ بھی نہ کیا۔ میں اصل میں وقت دیکھنا چاہ رہا تھا مگر دیوار پر لگی گھڑیال تک لالٹین کی روشنی اتنی نہیں پہنچ رہی تھی کہ میں وقت دیکھ سکوں۔ شرف الدین آگے بڑھ گیا تھا اس لیے میں لپک کر اس کے قریب چلا گیا۔ میں کمرے سے نکلتے وقت ابا کے کمرے کی چابی لانا نہیں بھولا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ یہ دروازہ پورے ایک سال اور پانچ دن کے بعد کھل رہا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی میری نگاہ مخالف سمت بنی اس کھڑکی پر پڑی جہاں میں نے پہلی بار شکنتلا کی روح کو دیکھا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"یہاں بجلی نہیں ہے کیا؟" شرف الدین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں۔ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے بائیں سمت دیوار پر لگے سوئچ کو آن کر دیا۔ کمرا روشن ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے ابا ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گئے ہوں۔ ان کی مخصوص عطر کی مہک نے مجھے ہی نہیں شرف الدین کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر غالباً" اس خوشبو کو محسوس کیا۔ لڈن البتہ کافی بیزاری سے کھڑا اپنی کمر کھجا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک جانب جھکا ہوا تھا۔ میں ابا کے کمرے میں دائیں جانب رکھی لکڑی کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری بے حد قیمتی اور خوب صورت الماری تھی۔ اس کے کنڈے چاندی کے تھے اور اس کے دونوں پٹوں کے کناروں پر چاندی کی پتری چڑھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں الماریوں کے لاک ایسے نہیں ہوتے تھے جیسے اب ہوتے ہیں بلکہ ایک چپٹی سی کنڈی لگی ہوتی تھی' وہ اس میں بھی لگی ہوئی تھی اور اس کنڈی میں چاندی ہی کے چھوٹے چھوٹے تالے پڑے تھے۔ انھی تالوں میں چاندی کی کنجیاں لگی ہوئی تھی۔ غالباً اس الماری میں ایسی کوئی قیمتی چیز نہ تھی تبھی تو اماں نے کنجیاں اس میں لگی چھوڑ دی تھیں

میں نے آگے بڑھ کر کنجی گھمائی ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ تالے کھل گئے۔ میں نے پوری الماری چھان ماری مگر اس میں کوئی چابی یا کنجی نہ ملی۔ الماری کی دراز میں بھی میں نے اچھی طرح دیکھ لیا مگر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شرف الدین بھی کمرے میں ہر جگہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے تو بستر تک پلٹ دیا تھا۔ طاق کھنگال ڈالے، پلنگ کے نیچے رکھا ٹین کا بڑا بکس کھول کر اس میں رکھی رضائیاں، تکیے، گدے سبھی نکال کر فرش پر ڈھیر لگا دیے۔ جب کنجی ہاتھ نہ آئی تو میں نے دوبارہ ابا کے کمرے کو سمیٹا، کمرے پر آخری نگاہ ڈالی اور دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ شرف الدین نے میرا کندھا دبا کر مجھے روک دیا۔

"وہاں دیکھا ہے تم نے؟" اس نے دیوار میں لگے اس لکڑی کے تختے کی طرف اشارہ کیا جس پر جزدان میں لپٹا قرآن پاک رکھا تھا۔

"وہاں نہیں ہو سکتی۔ وہاں کلام پاک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر میں چابیاں چھپانا چاہتا تو وہیں رکھتا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے کونے میں رکھا مونڈھا اٹھا کر دیوار کے قریب رکھا اور اس پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا نظر آ گیا۔ میں ایک بار پھر اس سے مرعوب ہو گیا، اس کے اندازے عموماً درست ہوتے تھے۔ چابیاں مل جانے پر میں بڑا خوش تھا۔ میری ایک بڑی خواہش آج پوری ہونے والی تھی۔ بس ایک دھڑکا تھا کہ شاید شرف الدین یہ معاملہ کل پر ٹال دے کیونکہ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کل بھی رات ہو جانے کی وجہ سے شرف الدین نے یہ معاملہ آج دن پر ڈال دیا تھا۔

ہم چابیاں لے کر واپس اماں کے کمرے میں چلے آئے۔ میری نگاہیں شرف الدین کے چہرے پر لگی ہوئی تھی، میری خواہش تھی کہ یہ کام آج ہی ہو جائے۔ میں نے اماں سے یہاں دو دن رہنے کی اجازت لی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ پریشان ہوں گی پھر مجھے علی گڑھ بھی جانا تھا ورنہ میرے داخلے میں مشکلات بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ داخلے کے فوراً بعد میں جے پور جانا چاہتا تھا اور وہاں جانے کے لیے جوگندر ناتھ سوامی جی کی تصویر دیکھنا ضروری تھا۔ کل کی رات والے معمولی واقعے کے علاوہ یہاں اب تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسی کوئی بات ہو کیونکہ جب تک شرف الدین میرا ساتھ دے رہا تھا، میرے حوصلے بلند تھے اگر وہ میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا تو میرے لیے دشواریاں بڑھ سکتی تھی گو جس کام کا میں بیڑا اٹھا چکا تھا اسے ہر حال میں انجام تک پہنچاتا مگر پھر بھی میری ڈھارس بندھانے کو شرف الدین کا وجود کافی اہم تھا۔

شرف الدین چابیاں ہاتھ میں لیے کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا۔ لڈن پر بیزاری اتنی زیادہ طاری ہو چکی تھی کہ اب وہ باقاعدہ جمائیاں لے رہا تھا، حالانکہ وہ گھنٹوں سویا تھا۔

"شرف الدین بابو! اپنے تو کو زنگ لگنے لگا ہے۔ کام ہے تو بتاؤ ورنہ۔" لڈن سر کھجلاتے ہوئے بولا۔

شرف الدین نے بھنوں اٹھا کر اسے دیکھا پھر مجھے دیکھتا رہا اور اچانک کھڑا ہو گیا۔ "چلو اللہ کا نام لے کر چلتے ہیں۔"

مجھے اس کا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی۔ اب یقین سا ہو گیا تھا کہ شرف الدین بھی میری باتوں پر اعتبار کرنے لگا ہے۔ اسے یقین ہو چکا ہے کہ شکنتلا کی روح نے اس حویلی پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہ ہمیں وہاں پہنچنے پر پریشان بھی کر سکتی ہے، اسی خیال سے میں نے کہا۔ "شرف الدین! تم گھبراؤ نہیں، کم از کم شکنتلا تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اس لیے کہ وہ جانتی ہو گی، ہم کیا کرنے جا رہے ہیں اور اس کا مقصد کیا ہے؟"

اس نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "باؤلے ہوئے ہو کیا؟ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں ان خرافات پر یقین نہیں کرتا۔ میں صرف اس لیے رات میں وہاں جانے سے بچ رہا تھا کہ میں وہاں کوئی ایسی چیز تلاش کر سکوں جو اس صدیوں پر محیط راز پر سے پردا اٹھا سکے، اور بہتر طور پر تلاشی لینے کے لیے دن کی روشنی زیادہ مناسب ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ بجلی نہیں ہے۔ اب اس وقت صرف تمھاری خواہش پوری ہو سکتی ہے کہ تم اپنے پردادا کا کمرا دیکھ لو گے اور وہ کیا ہیں۔ ان کے یار غار، جن کی لونڈیا کو تمھارے پردادا نے حلوہ سمجھ کر کھانے کی کوشش کی اور بقول تمھارے وہ حلوہ ہڈی بن کر پورے خاندان کے حلق میں اٹکا ہوا ہے۔"

اس کی یہ گفتگو اس کے پچھلے رویے کے قطعی خلاف تھی۔ مجھے اس کا انداز بے حد برا لگا۔ جی چاہا کہ چابیاں اس کے ہاتھ سے لے کر اسے کہہ دوں کہ وہ جا سکتا ہے مگر اتنی بداخلاقی کی جرات نہ ہوئی، میں چند لمحے خاموش رہ کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ شرف الدین اور لڈن باہر کی طرف چل پڑے تھے۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ جب ہم سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو مجھے بڑی مدھم سی آہٹ محسوس ہوئی۔ یوں جیسے کوئی تیسری منزل پر موجود ہو۔ میں نے چونک کے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ لالٹین میرے ہاتھ میں تھی جس کی روشنی اتنی نہیں تھی کہ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگا سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی یا اس نے آواز پر دھیان نہیں دیا تھا۔ میں نے بھی ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے دوسری منزل تک پہنچ گئے۔ لالٹین کی روشنی میں ہمارے آگے کی طرف پھیلتے اور لہراتے سائے بڑے ہیبت ناک لگ رہے تھے۔ یہاں آ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں تنہا اگر یہاں تک آ بھی جاتا تو شاید مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتا۔ ہم دوسری منزل کی ان سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے جہاں چوبی دروازہ لگا تھا اور جس دروازے میں بڑے تالوں کی چابیاں اب بھی شرف الدین کے ہاتھ میں تھیں۔ اس نے لالٹین قریب کرنے کا اشارہ کیا، میں اس کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔ اب لالٹین کی روشنی سیدھی تالے پر پڑ رہی تھی۔ شرف الدین جھک کر تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ چابی اسی تالے کی تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ مسلسل کوشش کے باوجود تالا نہیں کھل رہا تھا۔ تالے لوہے کے ہوتے تو میں سوچتا کہ شاید اندر زنگ لگ چکا ہے مگر وہ پیتل کے تالے تھے، اور پیتل ہی کی چابیاں تھیں۔ شرف الدین جھکتے جھکتے تھک گیا تو زمین پر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ یہاں گہرا سناٹا تھا، صرف ہم تینوں کے ہلنے سے اگر آہٹ ہوتی تو میرا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ یہ میرے لیے خاصی ہیبت ناک بات تھی کہ ہم رات کے اس سناٹے اور اندھیرے میں ایک ایسے کمرے کے باہر کھڑے تھے جس کمرے میں عصمت بیگم لوٹی گئی تھی۔ جہاں شکنتلا کو روندا گیا تھا اور بہ قول اماں کے اسی کمرے میں شکنتلا کے محبوب کو قتل بھی کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسے جلاد صفت آدمی کا کمرا تھا جس سے میں شدید نفرت محسوس کر رہا تھا۔ یہی وہ کمرا تھا جہاں سے کسی عورت کے بین کرنے کی آوازیں پوری حویلی میں گونجا کرتی تھیں۔ اسی کمرے میں شکنتلا کی روح بےقرار پھرا کرتی تھی۔ میں کیونکہ یہ ساری باتیں جانتا تھا اس لیے اس ہیبت ناکی کو بھی شدت سے محسوس کر رہا تھا مگر شرف الدین کے لیے یہاں، اندھیرے، سناٹے اور ویرانی کے سوا کچھ بھی تعجب خیز نہ تھا۔ لڈن کے بارے میں مجھے زیادہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اس بارے میں کس حد تک جانتا ہے اور جو کچھ جانتا ہے اس پر یقین بھی کرتا ہے یا نہیں۔ میں انھی سوچوں میں گم چاروں طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ میرے کان کسی آواز پر لگے تھے مگر چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ اچانک ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ شرف الدین نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے تالا کنڈی سے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور کھڑا ہو کر دوسرے تالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہمیں اوپر آئے تقریباً بیس منٹ ہو گئے تھے۔ ابھی نہ معلوم کتنی دیر اور لگتی، میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی مگر نیچے جا کر پانی پینے کی ہمت نہیں تھی۔ دوسرا تالا بھی جلدی کھل گیا۔ اب صرف ایک تالا باقی تھا اور میرے دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ شرف الدین نے تیسرے تالے میں کنجی ڈال کر جونہی گھمائی، کلک کی آواز گونجی اور تالا کھل گیا۔ شرف الدین نے یہ تالے بھی اپنی جیب میں ڈال لیے پھر دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ یہ آواز ایسی خوفناک تھی کہ میں بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، خود شرف الدین بھی گھبرا گیا تھا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ سب سے پہلے اندر داخل ہونے والا شرف الدین تھا۔ اس کے پیچھے میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ یہاں صرف دو کمرے بنے تھے۔ یعنی ہمارے سامنے دو دروازے تھے۔ دونوں دروازے بند تھے مگر ان میں تالا نہیں تھا صرف کنڈیاں لگی ہوئی تھی۔ باہر کا یہ حصہ نچلے برآمدے جیسا تھا مگر اس برآمدے کو لکڑی کی دیواریں بنا کر ہال سا بنا لیا گیا تھا۔ یہاں دیوار کے ساتھ لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، کرسیاں سیاہ قیمتی لکڑی کی تھیں۔ درمیان میں گول میز رکھی تھی جو اوپر سے نیچے تک لکڑی کے باریک کام سے مزین تھی اور چاروں طرف سے بند تھی۔ دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ کتابوں کا ایک شیلف رکھا تھا جس میں موٹی موٹی کتابیں تھیں۔ اس کے برابر میں سیمنٹ کا ایک بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر پیتل کا بڑا سے پالے میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس میں غالباً کبھی کوئی پودا لگا ہو گا کیونکہ یہ اس قسم کا پیتل کا گملا تھا جیسے آپ اس زمانے میں بھی دیکھتے ہوں گے۔ اس چبوترے کے برابر میں جو کمرا تھا وہ غالباً" پردادا مرزا صولت بیگ کا تھا۔ میں ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ شرف الدین بھی گھوم پھر کر ہر چیز کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ چونکا پھر میرے ہاتھ سے لالٹین لے کر اس چبوترے کی طرف بڑھ گیا۔ پیتل کے گملے کی مٹی کو اس نے انگلیوں کی پوروں سے چھوا پھر وہی انگلی ناک تک لے جا کر سونگھنے لگا۔ میں اسے حیرت سے

دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں یہاں کچھ عجیب سی بدبو محسوس نہیں ہو رہی؟" اس نے سرسراتی سی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

اس کے کہنے پر میں نے گہرا سانس لیا اور تیزی سے سر ہلایا۔ "واقعی!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا مگر اب شرف الدین میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کمرے کے دروازے کی کنڈی کھول رہا تھا۔ کنڈی ایک کرخت سی آواز کے ساتھ کھل گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور لالٹین لیے اندر داخل ہو گیا۔ میں ابھی دو چار قدم اس سے پیچھے تھا کہ اچانک ایک عجیب سی آواز گونجی اور کوئی چیز شرف الدین کے اوپر سے اڑتی ہوئی باہر نکلی، شرف الدین لڑکھڑایا، اگر وہ دروازے کے پٹ کو نہ پکڑ لیتا تو الٹ کر گر چکا ہوتا۔ کمرے سے باہر آنے والی چیز پر نگاہ پڑتے ہی میں چیخ اٹھا۔ میرے چیخنے، شرف الدین کے لڑکھڑانے اور اس کی آواز سے لڈن بوکھلا کر واپس سیڑھیوں کی جانب بھاگا۔ لمحہ بھر کو جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ ہماری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ کیا چیز تھی جو اڑتی ہوئی باہر نکلی ہے۔ میں تو باقاعدہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ چیز اچانک ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اب کوئی آواز بھی نہ تھی۔ شرف الدین ساکت کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر وہ آگے بڑھا، لالٹین والا ہاتھ اس نے اوپر کی طرف اٹھایا اور میری نگاہ اک وال کلاک پر پڑی جس کے پنڈولم پر چمگادڑ چمٹی ہوئی تھی۔ پنڈولم ساکت تھا۔ وال کلاک لکڑی کی اس دیوار پر ٹنگا ہوا تھا جسے غالباً بعد میں بنایا گیا تھا۔ چمگادڑ دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور شرف الدین تو ہنس پڑا۔

"دیکھا اس لیے کہتا تھا کہ دن کی روشنی میں آتے۔ اب نہیں اندر اور کتنی ہوں گی۔" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اب میرے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہم واپس چلے جائیں۔ عین اسی لمحے مجھے لڈن کا خیال آیا۔

"لڈن کہاں ہے؟"

میری بات سن کر شرف الدین نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

"سیڑھیوں کی طرف بھاگا تھا۔" میں نے دوبارہ کہا۔

"لڈن... لڈن..." شرف الدین نے سیڑھیوں کے قریب جا کر آوازیں دیں مگر ہمیں کوئی جواب نہ ملا۔ غالباً وہ جا چکا تھا۔

"شرف الدین! میرا خیال ہے کہ ہم بھی واپس چلتے ہیں۔ کل دن میں آجائیں گے۔" میں نے اپنی آواز کی لرزش کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھیا! فضول وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تم اپنے پردادا کی تصویر لو اور چلو۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر جی بھر کے دیکھ لینا۔ مجھے کل مراد آباد جانا ہے۔" شرف الدین یہ کہتا ہوا پھر کمرے کی طرف پلٹ گیا۔ میں اس کے پیچھے ہی داخل ہوا۔ یہ پردادا کی خواب گاہ تھی اتنی خوب صورت خواب گاہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کمرے کے وسط میں گول مسہری رکھی تھی جس پر چھت سے لے کر زمین تک باریک سفید جال کی مچھر دانی لٹکی ہوئی تھی۔ دیواروں پر خوب صورت عورتوں کی عریاں، بڑی بڑی تصویریں ٹنگی تھیں۔ دائیں جانب سیاہ قیمتی لکڑی کی الماری، اسی لکڑی کے گول فریم میں جڑا آئینہ اور اس آئینے کے سامنے ایک اونچا سا اسٹول رکھا تھا۔ بائیں جانب پوری دیوار پر سفید ریشمی پردے پڑے تھے۔ چھتوں پر فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ دیواروں میں جگہ جگہ طاقچے بنے ہوئے تھے۔ ان طاقچوں میں موم بتی دان رکھے تھے۔ ایک کونے میں پیتل کی باریک جالی سے بنا صراحی نما برتن رکھا تھا۔ ایک جانب بنے آتش دان پر پردادا مرزا صولت بیگ کی تصویر رکھی تھی۔ "وہ... شرف الدین..." میں نے اس جانب اشارہ کیا۔ وہ لالٹین لیے اسی آتش دان کے قریب آ گیا۔ لالٹین کی روشنی میں مرزا صولت بیگ کا چہرہ مجھے زندہ انسان کا چہرہ لگا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گھنی داڑھی مونچھیں، موٹے مگر پرکشش ہونٹ، سیاہ گھنگریالے بال اور چہرے پر بلا کا رعب اور دبدبہ۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہوں۔ یہ تصویر کسی بہترین مصور نے بنائی تھی، ماتھے پر پڑی تیوریاں، چہرے پر مسکرانے سے بن جانے والی لکیریں، آنکھوں کے کونوں میں باریک جھریاں، ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت اور پروقار شخص کی قد آدم تصویر تھی۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس مرزا صولت بیگ میرے سامنے موجود تھے۔

"کیا تمہیں یقین ہے یہی مرزا صولت بیگ ہیں؟" شرف الدین نے پوچھا۔

"ہاں اماں نے بتایا تھا اس کمرے میں ان کی تصویر ہے اور جو نقشہ اماں نے کھینچا تھا وہ ہو بہو یہی تھا۔"

"اب چلو، اٹھاؤ یار، اپنے کمرے میں جا کر دیکھنا۔" شرف الدین نے مجھے ساکت کھڑے دیکھ کر کہا۔

"مگر... یہاں جوگندر ناتھ کی تصویر بھی ہے۔ اماں تو بتا رہی تھیں کہ یہاں ایک تصویر میں دونوں..."

"یہ تو اٹھاؤ۔ دوسری بھی تلاش کرتے ہیں۔" شرف الدین نے جھلا کر کہا۔

میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر اٹھالی۔ تصویر اٹھاتے ہی میں چونک پڑا۔ اس بڑی تصویر کے پیچھے مجھے وہ تصویر بھی مل گئی جس میں مرزا صولت بیگ کے ساتھ ایک ہندو کی تصویر بھی تھی۔

"چلو تمہارا کام بن گیا۔" دوسری تصویر پر نگاہ پڑتے ہی شرف الدین بول اٹھا۔ "لاؤ یہ مجھے دے دو اور اب چلنے کی کرو، پتا نہیں کیا بج گیا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں اماں سے کہہ کر آیا تھا کہ میں گھنٹہ بھر بعد واپس آجاؤں گا۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔"

اب میں خود بھی وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم دونوں پردادا کے کمرے سے باہر آ گئے۔ شرف الدین نے کمرے کے دروازے میں کنڈی لگائی۔ میں نے لالٹین اٹھا کر اس چمگادڑ کو دیکھنا چاہا۔ وہ اب بھی پنڈولم سے چمٹی لٹک رہی تھی۔ شرف الدین کنڈی لگا کر پلٹا، اس کی نگاہ بھی وال کلاک پر پڑی پھر ہم دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر ہم نے وہ بڑا چوبی دروازہ بھی بند کر دیا۔ شرف الدین نے تینوں تالے اسی طرح ڈال دیے اور چابیاں میری طرف بڑھا دیں جنہیں میں نے اپنے جیب میں ڈال لیا۔ ہم نیچے جانے کے لیے پلٹے، اسی لمحے ہمارے نتھنوں میں گیندے کی خوشبو گھس گئی۔ میری اور شرف الدین کی نگاہ اس دو چھتی کی جانب اٹھ گئی، دروازے کے پٹ میں گیندے کے تازہ پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔

"دیکھا... دیکھا تم نے...! یہاں کوئی تھا۔ یہ ہار..." میں نے کہنا چاہا۔

"یہ ہار پہلے بھی موجود تھے۔" شرف الدین نے منہ بنا کر کہا۔

"مگر یہ خوشبو..."

"تمہاری ناک بند ہوگی، یہ خوشبو بھی موجود تھی۔"

"شرف الدین... ہم اس وقت اس کے بہت قریب بھی گئے تھے مگر اس وقت یہ خوشبو اتنی تیز محسوس نہیں ہوئی تھی۔"

"تم اس وقت محسوس زیادہ کر رہے ہو۔" اس نے یوں کہا جیسے کوئی کسی بچے کے سوالات سے الجھ کر اسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے مزید کچھ کہنا بیکار سمجھا اور اس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔ مرزا صولت بیگ کی بڑی تصویر میں نے اٹھائی ہوئی تھی اور چھوٹی تصویر جس میں مرزا صولت بیگ کے علاوہ جوگندر ناتھ بھی تھے، شرف الدین کے پاس تھی۔ لالٹین بھی اسی کے پاس تھی۔ وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم اماں کے کمرے کے دروازے پر کھڑے، حیرت سے لڈن کو دیکھ رہے تھے۔ لڈن نیچے فرش پر بچھی چاندنی پر بے خبر سو رہا تھا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو کر حویلی سے بھاگ گیا ہوگا۔" شرف الدین بڑبڑایا۔

"یہ انسان ہے یا حیوان...! اتنا بے حس... یا تو خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا یا یہاں پڑا خراٹے لے رہا ہے۔" میں نے مرزا صولت بیگ کی تصویر کارنس پر رکھتے ہوئے کہا۔

شرف الدین نے آگے بڑھ کر لڈن کو ہلایا۔ وہ کچھ بڑبڑایا اور کروٹ لے کر پھر سو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اب کیا کرنا ہے شرف الدین بابو! کہو تو ہم جائیں۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ شاید اسے کسی نہ کسی جگہ [illegible] رہنے کی عادت تھی۔

میں اور شرف الدین ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دوپہر کا سویا ابھی ابھی اٹھا ہو۔ میں بولنے ہی والا تھا کہ اچانک شرف الدین بول اٹھا۔ "ہم تو اوپر سے ہو کر آبھی گئے اور تم اب تک پڑے سو رہے ہو۔" ایسا کہتے ہوئے وہ لڈن کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تو ہمیں کیا پتا اٹھا دیا ہوتا۔" اس نے کھیسیں نکالیں۔ "تو کیا ہم جائیں! پتا نہیں ابا کیسے ہوں گے۔"

اس کے اس جملے نے مجھے بھی چونکا دیا۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ رمضو بابا کی طبیعت خراب تھی۔ "ہاں تم جاؤ۔" میں بول اٹھا۔ "ہم بھی رات کو شرف الدین کے گھر جاتے ہوئے آئیں گے۔"

اتنا سنتے ہی وہ جمائی لے کر کھڑا ہو گیا۔ شرف الدین اب بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں خود بھی لڈن کے رویے پر حیران تھا۔ بالکل بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ اوپر گیا تھا اور پھر خوفزدہ ہو کر واپس آگیا تھا۔ بہرحال میں اس وقت اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے کہ میرا تمام دھیان مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ کی اسی تصویر کی طرف تھا جو ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔

لڈن ہمیں خدا حافظ کہتا ہوا چل گیا۔ بشیر کی طرح اس نے مجھ سے گیٹ تک لالٹین لے کر چلنے کی فرمائش نہیں کی۔ اس کے جاتے ہی میں اس کارنس کی طرف متوجہ ہو گیا جہاں میں نے پردادا مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ سوامی جی کی تصویر رکھی تھی۔ مرزا صولت بیگ کی قد آدم تصویر جس میں وہ تنہا تھے، اب بھی شرف الدین کے ہاتھ

میں تھی۔ یہاں کی تیز روشنی میں مجھے مرزا صولت بیگ ایک کریہہ، جابر، اور انتہائی ناپسندیدہ شخص لگے، ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پھیلا ہوا شر آنکھوں کے کناروں پر باریک چمکیلی لکیر کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک کسی کی آنکھوں میں ایسی خباثت محسوس نہیں کی تھی جیسی مجھے ان کی آنکھوں میں محسوس ہو رہی تھی، ان کی نسبت جوگندر ناتھ کی آنکھوں میں مسکراہٹ اور چہرے پر ملائمت محسوس ہوئی۔ گول چہرے، چوڑی اور پھیلی ہوئی ناک اور موٹے ہونٹوں والے جوگندر ناتھ میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ ذہن میں اچھا تاثر پھیلا دینے والی کوئی چیز، ان کی چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی آنکھیں، ماتھے پر پڑی چند گہری لکیریں، اور ہونٹوں کے کناروں کو ذرا ابھار دینے والی دو لائنیں نظر آنے کے باوجود مجموعی تاثر کو زائل کرنے میں ناکام تھی، یہ ملائمت شاید ان کی ذات کی تھی جو چہرے پر منعکس ہو رہی تھی یا ممکن ہے کہ ان کے برابر میں مرزا صولت بیگ کا کرخت چہرہ، آنکھوں میں دور تک پھیلی سنگلانی اور ایک دوسرے میں پیوست ہونٹوں پر جما تکبر، جوگندر ناتھ کو زیادہ نرم خو ثابت کرنے میں معاون ہو۔ میں دونوں کی تصویر میں گم تھا کہ شرف الدین نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے وقار الحسن کہ کم از کم تمہارے پردادا "موون میڈنس" نامی بیماری کے پرانے مریض تھے۔"

"کیا مطلب؟" میں بھنا گیا۔

"یار یہ چہرہ قطعی طور پر ایک ابنارمل آدمی کا چہرہ لگتا ہے۔ جب آدمی تصویر کھنچوانے یا بنوانے بیٹھتا ہے تو خوامخواہ، نہ جانتے ہوئے بھی چہرے کے عضلات کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے، مسکرانے لگتا ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ کوشش انھوں نے بھی کی ہوگی، اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہوں گے لیکن دیکھو۔ اس کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں میں بھری وحشت اور چہرے پر پھیلا تاثر مٹانے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ تصویر تم کسی بھی ماہر نفسیات کے پاس رکھ دو، میں شرط لگاتا ہوں کہ وہ۔۔۔ انھیں پاگل قرار دے گا، سوری، ہاں! لیکن وہ کہے گا کہ یہ ایک پاگل آدمی تصویر ہے۔"

"شرف الدین۔۔۔! تم میرے پردادا کے بارے میں گفتگو کر رہے ہو۔"

"میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں وقار الحسن! میں صرف اسی لیے ان کے کمرے تک گیا تھا کہ ان کے کمرے کی اندرونی حالت، ان کی تصویر یا ایسی ہی ان کی کچھ ذاتی چیزوں کو دیکھ کر ان کی شخصیت اور ان کی فطرت کے بارے میں اندازہ لگا سکوں، کیا تم یقین کرو گے کہ جو خاکہ میں نے اپنے ذہن میں بنایا تھا وہ ہوبہو یہی تھا۔"

"دیکھو شرف الدین! میں نے پہلے روز ہی جب تم سے مدد مانگی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تم سے اپنے اسی مسئلے کے لیے مدد مانگ رہا ہوں، تم نے مدد کا ٹالیا" وعدہ بھی کر لیا تھا مگر تم تو میرے مسئلے کو ماننے کے لیے ہی تیار نہیں ہو۔ تم میری مدد کیا کرو گے؟ یہ باتیں کر کے تم مجھے مزید بے سکون کرو گے۔ میں آج تمہیں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں، تم اچھی طرح سوچ کر مجھے بتانا کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو تاکہ میں اسی حساب سے اپنے معاملات دیکھوں۔"

میری سنجیدگی کو اس نے شدت سے محسوس کیا۔ وہ چند لمحے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا تو اس کا لہجہ نرم اور انداز مشفقانہ تھا۔ "وقار الحسن! تم صرف ایک مرتبہ اس مسئلے کو اس طرح دیکھو جس طرح میں دیکھ رہا ہوں تو یقین کرو تم اس تاریکی سے نکل آؤ گے۔"

اس کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ میں پھٹ پڑا "شرف الدین! اگر تم یہ سمجھ رہے ہوں کہ تمہارے جھوٹ بولنے سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ تم یقین کیوں نہیں کر لیتے کہ میں سنی سنائی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔"

"جھوٹ۔۔۔! میں نے اب تک تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا وقار الحسن۔۔۔"

"بولا ہے تم نے جھوٹ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آج تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ تم نے اس تمام چکر کو ماننا نہ ماننا انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ تم ورزش نہیں کر رہے تھے، یہ بات میں جانتا ہوں۔ تم شگفتہ سے اگر ملے نہیں ہو تو تم نے رات اسے دیکھا ضرور ہے، تم ان سیڑھیوں پر کیا کر رہے تھے، جب تم بھاگتے ہوئے میرے سامنے آ گئے تھے تو تم حواس باختہ تھے۔ تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم یہاں کیسے آئے؟ اور۔۔۔ اور وہ جو پائل تمہیں ملی تھی وہ بھی۔۔۔ تمہاری نہیں ہے۔" میں ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

وہ سر جھکائے تمام باتیں سنتا رہا۔ "ہاں۔" اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا مگر اس جھوٹ کی وجہ صرف اتنی تھی کہ میں کچھ وقت چاہتا تھا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا اسے سمجھنا چاہتا تھا، اور میں سمجھ گیا۔ میں آج ہی اس جھوٹ کی وضاحت کر دیتا، رات کو جب ہم کھانا کھا کر واپس یہاں رات گزارنے آتے تو میں تمہیں بتا دیتا مگر اب۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے۔"

اس نے آخری جملہ یوں ادا کیا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کی نگاہیں مرزا صولت بیگ کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

"مگر جو کچھ میں بتا رہا ہوں اس پر تمہیں یقین کرنا ہوگا، یقین نہ کرو تو بھی بتا دینا۔ میں اپنی بات کی صداقت کا ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔"

"تم کہو۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی وہی منطقی باتیں کرے گا اور اس کی منطق سارے جگ سے نرالی ہوتی ہے۔

"میرے تایا کو سوتے میں چلنے کی بیماری تھی۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "میں نے اماں، دادی اور بابا کی زبان ان کے قصے سنے تھے مگر انھیں محض کہانی سمجھتا رہا۔ بعض واقعات دلچسپ ہیں اس لیے سنانے والوں نے بھی ہنسی مذاق ہی میں سنا دیے مگر اس بیماری کی سنگینی کو محسوس نہیں کیا۔ ایک روز جب وہ صرف چھبیس برس کے تھے، دو پیارے پیارے بچوں کے باپ تھے تب اپنی اسی بیماری کے ہاتھوں موت کا شکار ہو گئے۔ وہ نیند میں چلتے ہوئے ریلوے لائن پر پہنچ گئے تھے۔ رات کے کسی پہر ایک تیز رفتار ٹرین انھیں اڑاتی ہوئی دور تک لے گئی اور پھر۔۔۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا تو میں نے سناٹے کی گونج سی محسوس کی۔ رات اب گہری ہو گئی تھی۔ شاید دس بج چکے تھے۔ اماں کے کمرے کی کھڑکی کے اس پار نظر آنے والی چار دیواری پر چاندنی ترچھی ہو کر پڑ رہی تھی۔

"پتا نہیں لوگ بات کو اس طرح کیوں نہیں لیتے ہیں جس طرح اصل میں ہوتی ہے۔ میرے بابا اور دادا دادی اگر اس بات کو شروع ہی میں بیماری تسلیم کر لیتے تو شاید ان کا انجام یہ نہ ہوتا، اور اب۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں خود بھی اسی بیماری کا شکار ہو چکا ہوں۔ اس سے قبل، دو برس پہلے علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی میں یہی ہو چکا ہے، میں اپنے کمرے میں سویا تھا اور جب آنکھ کھلی تو میں بیرونی گیٹ کے قریب گھاس میں پڑا ہوا تھا۔"

"تمہاری ان تمام باتوں کا تعلق میرے معاملے سے تو نہیں ہے! تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم سوتے میں چلنے کی وجہ سے رات کسی وقت ان سیڑھیوں تک چلے گئے تھے۔" میں نے لمحہ بھر کر چپ ہو کر اسے دیکھا۔ "چلو یہ بات مان بھی لی جائے تو۔۔۔ وہ پائل؟"

"ہاں۔۔۔ بس یہ چیز میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے۔ ویسے تم زیادہ خوش قسمت ہو۔ تمہاری بہنیں پائل ضرور پہنتی ہوں گی اور انھیں گئے آج تیسرا دن ہے۔ مراد آباد جاؤ تو یہ پائل لیتے جانا۔" اس نے جیب سے پائل نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

میں نے خاموشی سے پائل اس سے لے لی چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ اب بھی مرزا صولت بیگ کی تصویر کو گھور رہا تھا۔ "کیا تم میرے ساتھ جے پور چلو گے؟" میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے جے پور دیکھنے کا شوق ہے۔ وہ پنک سٹی کہلاتا ہے اور تم تو جانتے ہو نا کہ گلابی رنگ بھرپور زندگی کا عکاس رنگ ہے۔ میں وہاں راجے مہاراجوں کے محل بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی دو مہینے کی چھٹیاں ہیں۔"

"میں وہاں گھومنے نہیں۔۔۔ شگفتہ کے ماں باپ والوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ جوگندر ناتھ بعد میں جے پور چلے گئے تھے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے!" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔ "یہ بڑے میاں اتنے برس گزر جانے کے باوجود زندہ ہوں گے؟" اس نے کارنس پر رکھی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"ممکن ہے نہ ہوں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"یقیناً نہیں ہوں گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "اب گھر چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟"

"چلو!" میں کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں حویلی کے گیٹ بند کر کے شرف الدین کے گھر کی طرف چل پڑے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اماں بے چین ہوں گی۔ میں نے ان سے دو روز یہاں رہنے کا کہا تھا۔ وعدے کے مطابق مجھے آج یا کل صبح سویرے ہی یہاں سے روانہ ہو جانا تھا اور میں اب تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سوچ لیا کہ آج ہی رات میں اماں کو خط لکھ دوں گا۔ انھیں خیریت کی اطلاع پہنچ جائے گی تو وہ پرسکون ہو جائیں گی۔ ہم سوچوں میں گم شرف الدین کے گھر تک پہنچ گئے۔ دروازے پر نگاہ پڑتے ہی مجھے شگفتہ کا خیال آ گیا۔ میری آنکھوں میں ستارے جھلملا اٹھے، الجھا ہوا ذہن بالکل صاف ہو گیا۔ شرف الدین نے آگے بڑھ کر کنڈی بجائی اور کھٹاک سے دروازہ کھل گیا۔ حسب توقع شگفتہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آ۔۔۔ آپ لوگ۔۔۔ اتنی دیر کیوں کر دی؟"

"خیریت ہے نا!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"آں۔۔۔!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "ہاں خیریت

ہے، مگر میں آپ لوگوں کے لیے پریشان تھی۔"

"پرانی عادت ہے تمھاری کوئی نئی بات کرو۔ اماں کہاں ہیں؟" شرف الدین نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اندر۔۔۔ نماز پڑھ رہی ہیں۔ وہ بھی بار بار پوچھ رہی تھیں۔" شگفتہ نے مجھ سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

شرف الدین مجھے بیٹھنے کا کہہ کر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ شگفتہ دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی تھی۔ وہ اس وقت گلابی رنگ کا سوٹ پہنے تھی۔ تبھی شرف الدین کا جملہ میرے ذہن میں گونج اٹھا۔ "گلابی رنگ بھرپور زندگی کا عکس رنگ ہے۔" اس نے سچ ہی تو کہا تھا۔ زندگی اپنے بھرپور رنگ میں میرے سامنے موجود تھی۔ گلابی رخسار، گلابی ہونٹ۔۔۔ اور آنکھوں میں گلابی ڈورے۔

"سچ۔۔۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"جی!" اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا، جانے میری نگاہوں میں ایسا کیا تھا کہ وہ لمحہ بھر میری آنکھوں میں نہیں دیکھ پاتی تھی۔ اس نے جھجک کر نگاہیں دوسری جانب پھیردیں اور دھیرے سے کہا۔ "بیٹھیے بھیا کو تو ابھی بہت دیر تک ڈانٹ پڑے گی۔" اس کی آواز میں ایک پرکشش سی لرزش تھی۔

"کیوں؟"

بابا نے مراد آباد جانے کو کہا تھا۔ میں تایا کے ہاں جانا چاہتی ہوں۔ اگلے ماہ ان کی بیٹی کی شادی ہے۔"

"مراد آباد تو مجھے بھی جانا ہے۔" میں غیر ارادی طور پر کہہ بیٹھا حالانکہ میرا مراد آباد جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ: چانک گلابی رنگ پورے کمرے میں پھیل گیا ہے۔

"سچ!" ہزاروں ستارے سے لمحہ بھر کو جگمگا اٹھے۔

"بالکل سچ۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت آہٹ ہوئی۔ میں نے نگاہیں دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں پر ٹکا دیں۔ شگفتہ ایک جانب رکھی تپائی پر پڑا میز پوش ٹھیک کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے شرف الدین اندر داخل ہوا۔

"یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے۔" وہ آتے ہی مجھ پر دھاڑا۔

"کک۔ کیا ہوا ہے؟" میں بوکھلا گیا، یوں جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔ شگفتہ کی حالت بھی مجھ سے کچھ مختلف نہ تھی۔

"یار دیکھو! یہ روحوں وحوں کا چکر ٹھیک نہیں ہے۔ میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرو اور اس مسئلے کا کوئی معقول حل نکالو۔ جائیداد کا بٹوارا نہایت مناسب حل ہے۔ آج میں نے اماں سے تمھارے چکر میں ڈانٹ کھائی ہے۔"

میں نے حیرت سے شرف الدین کو دیکھا۔ یہ وہ آدمی نہیں تھا جو آج دن بھر میرے ساتھ رہا تھا۔

"یعنی دوسرے معنوں میں تم میری مدد سے انکار کررہے ہو!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھائی میں تمھاری ہر قسم کی مدد کو تیار ہوں مگر تم تو گڑے مردے اکھاڑنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہو۔ اب بھلا جوگندر ناتھ سوامی جی کو تلاش کرنے جے پور جانے کی کوئی تک ہے! بھیا وہ تمھارے پردادے کے ہم عصر تھے۔ اب آب حیات تو انھوں نے پی نہیں ہوگی کہ آپ کے جے پور جاتے ہی وہ اپنی چوکھٹ پر آپ کو آشیرواد دینے آجائیں گے۔ ہاں ان کے درشن کا وعدہ تھا وہ میں نے پورا کردیا۔ ایک وعدہ تمھارے وعدہ کے کمرے کی صفائی کا تھا تو میرا خیال ہے کہ شکنتلا کی روح کافی سگھڑ ہے۔ مجھے تو وہاں مکڑی کے جالے تک نظر نہیں آئے۔ باہر کا حصہ البتہ گندہ ہے۔"

اس نے سچ کہا تھا۔ مجھے اس کا احساس پہلے نہیں ہوا تھا۔ اب اس کے کہنے پر مرزا صولت بیگ کا کمرا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ کمرا جو برسوں سے بند پڑا تھا، اس میں سے صرف ایک چمگادڑ نکلی تھی۔ وہ بھی جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی وہاں پہنچ گئی ہوگی۔ لالٹین کی روشنی میں جو کچھ بھی دکھائی دیا اس میں واقعی کہیں مکڑی کے جالے نظر نہیں آئے تھے، یہاں تک کہ مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ کی تصویروں کو جو فریم ہم اٹھا کر لائے تھے ان پر مٹی کا ذرہ تک محسوس نہیں ہوا تھا۔ ان خیالوں نے میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑا دی۔ "ہاں شرف الدین! یہ تمھارے سوچنے کی بات ہے۔ تم غور کرو کہ وہ کمرا جو برسوں سے بند پڑا ہے، وہ اتنا صاف ستھرا کیسے تھا؟"

مجھے لگا جیسے اس کے چہرے پر سایا سا آکر گزر گیا ہو۔ جیسے مذاق میں کی گئی بات کی سنگینی کو اس نے اب محسوس کیا ہو۔

"تم کہہ رہے تھے کہ تمھاری اماں سب کمروں میں مغرب کے وقت دیئے جلا کر اگربتی سلگایا کرتی تھیں اور تسبیح پڑھا کرتی تھیں۔" اس نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

"سب کمروں میں نہیں۔۔۔ صرف دادی اور ابا کے کمرے میں، وہ بھی اس لیے کہ یہ نچلے حصے میں تھے، اوپر کی منزل تو دادی نے صولت بیگ کے مرتے ہی بند کرادی تھی اور دوسری منزل کی سیڑھیوں پر لکڑی کا دروازہ ابا نے لگوایا تھا۔"

"چلو یہ تو ثابت ہوگیا کہ شکنتلا کی روح کافی سگھڑ ہے مگر جب وہ مرزا صولت بیگ سے انتقام لے رہی ہے بلکہ اس کی پوری نسل کے پیچھے پڑی ہوئی ہے تو پھر بھلا وہ اس کمرے کی صفائی میں کیوں گم رہتی ہے؟"

"اس لیے کہ اب وہاں مرزا صولت بیگ نہیں ہیں اور وہ اپنے محبوب کی تلاش میں ہے، وہ وہاں آتی ہے، اسے تلاش کرتی ہے۔"

"غالباً" حال ہی میں تمھاری اس سے میٹنگ ہوچکی ہے اور شاید تم دونوں نے اس معاملے کو ڈسکس بھی کیا ہے۔ "کیوں؟" اس کے لہجے میں تنز تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہ میری اس سے کوئی میٹنگ ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے اس سے اس معاملے کو ڈسکس کیا ہے لیکن جو کچھ پتا چلا ہے اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس سے بھی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، اگر اس معاملے کو تسلیم کیا جائے تو اور اگر نہ کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ مذاق اڑایا جاسکتا ہے۔" میرے لہجے میں تلخی گھل چکی تھی۔

"بھیا جی! آپ مان کیوں نہیں لیتے؟" شگفتہ کی آواز نے میرے لہجے ہی کی نہیں میرے پورے وجود کی تلخی مٹا کر اسے شہد آگیں کردیا۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور ہماری باتیں سن رہی تھی۔

"اچھا بس۔۔۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم فافٹ کھانا تیار کرو ہمیں جانا بھی ہے۔" اس نے پلنگ پر دیوار کے سہارے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

شگفتہ اندر چلی گئی۔ میرا موڈ شرف الدین کی باتوں سے کافی حد تک خراب ہوچکا تھا۔ میں اس معاملے پر کچھ سوچنا اور کوئی عمل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ تو لمحوں میں کرلیا کہ میں کھانے کے بعد سیدھا لڈن کے گھر جاؤں گا۔ رمضو بابا کی خیریت دریافت کرنے کے بعد حویلی چلا جاؤں گا، اگر ممکن ہوسکا تو لڈن کو ساتھ لے لوں گا ورنہ تنہا رہوں گا۔ مجھے ابھی کافی مسئلے نمٹانے تھے۔ اماں کی طرف سے بھی مجھے کافی پریشانی تھی۔ انھیں خط بھی لکھنا تھا مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر شرف الدین اور شگفتہ مراد آباد جارہے ہیں تو میں ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔ اماں مجھے دیکھ کر زیادہ سکون محسوس کریں گی۔ میں انھیں بہتر طور پر تسلی دے سکوں گا اور ویسے بھی مجھے اطمینان ہوجائے گا کہ وہ لوگ وہاں مطمئن ہیں یا نہیں۔

"اے میاں۔۔۔!" شرف الدین نے ہاتھ میری آنکھوں کے آگے لہرایا تو میں سوچوں کے حصار سے باہر آگیا۔

"ہوں۔۔۔!" میں نے سر اٹھایا۔

"کھانا کھاؤ۔" شرف الدین نے کہا۔

میں اور شرف الدین ہاتھ دھونے باہر آگئے۔ شگفتہ لوٹا لیے کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھوں پر پانی ڈالا اور ہم دسترخوان پر آبیٹھے۔ شگفتہ ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ "میں کھانا نہ کھاؤں تو یہ گی بھی بھوکی رہتی ہے۔" شرف الدین نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اور جب تم نہیں ہوتے ہو تو۔۔۔؟" میں نے کن انکھیوں سے شگفتہ کی طرف دیکھا۔

"تب اماں بہلا پھسلا کر اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر کھلاتی ہیں۔ میرے آنے کے بعد یہ میرے انتظار میں سوکھتی رہتی ہے۔"

شگفتہ سامنے بیٹھی مسکراتی رہی۔ کھانا ختم ہوتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں۔۔۔! چائے تو پی لیں۔" شرف الدین نے مجھے جوتے پہنتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں بس۔۔۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔ میرا دھیان رمضو بابا کی طرف لگا ہوا ہے۔ نہ معلوم ان کی طبیعت اب کیسی ہے۔ صبح سے یہ وقت ہوگیا، ویسے بھی میرے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں جن کے جواب یقیناً رمضو بابا کے پاس موجود ہیں۔"

"ارے ہاں۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا۔ چلو میں بھی چلتا ہوں۔" وہ بھی کھڑا ہوگیا۔ شگفتہ بجھ سی گئی مگر میرے پاس وقت بہت کم تھا۔

ہم دونوں وہاں سے سیدھے لڈن کے گھر پہنچے۔ کافی رات گزر چکی تھی۔ زیادہ تر لوگ سرشام ہی سے سوجاتے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ لڈن وغیرہ جاگ رہے ہوں۔

میری دعا پوری ہوگئی۔ ہم دروازے پر ہی تھے کہ ہمیں لڈن نظر آگیا۔ وہ دہلیز پر بیٹھا جلدی جلدی بیڑی پی رہا تھا۔

"کسی سے شرط لگی ہے کیا بیڑی پینے کی؟" شرف الدین نے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"نہیں بابو! ابا خود تو ساری زندگی دھویں کا مرغولہ بنا رہا اب مجھے بیڑی پینے سے روکتا ہے حالانکہ میں تو کبھی کبھی ہی پیتا ہوں۔" اس نے آخری کش لے کر بیڑی دور اچھال دی۔

دیکھنا بدبو آرہی ہے؟" اس نے فوراً ہی منہ کھول کر "ہا" کیا۔ لگ رہا ہے کہ بیڑی پی ہے؟"

"نہیں۔" شرف الدین نے جلدی سے ناک پر ہاتھ رکھ ـ "لگ رہا ہے کہ جیسے سیب کھا کر بیٹھے ہو۔"

"پاس بھی جاؤ تو سمجھ جاتا ہے کہ بیڑی پی کر آیا ہوں۔" اس نے آستین سے ماتھے کو رگڑ کر کہا۔

"نا تجربہ کاری ہے۔ قیافہ شناسی سے بھی نابلد ہیں۔" شرف الدین انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور میں ہنسی دبانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ آج جب ہم وقار الحسن کی حویلی میں اوپر کی منزل کا دروازہ کھول رہے تھے تو تم بھاگے کیوں تھے؟" شرف الدین نے اچانک سوال کر ڈالا۔

"لو جی لو۔ میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ ایک دم اکڑ گیا۔ "آپ مجھے لے کر چلئے پھر دیکھئے پتا نہیں کتنے پھنے خان لٹا چکا ہوں۔ ویسے وہاں تھا ہی کیا جو بھاگتا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ صفائی کرنا ہے، وہ جب کہو گے کردوں گا مگر دونی لوں گا۔"

دروازے کے بالکل اوپر جلتے پیلے رنگ کے بلب کی مدقوق سی روشنی میں میں اس کے چہرے کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں کھڑا ہوا تھا، ممکن ہے شرف الدین نے کچھ دیکھا اور اندازہ لگایا ہو۔ بہرحال باتوں سے تو یہ لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ ٹھیک کیسے ہوسکتا ہے۔ جب ہم اسے لے کر اوپر گئے تھے تو وہ اپنے حواسوں میں تھا، پھر جب وہ بھاگا تھا تو بھی یقیناً حواسوں میں ہوگا ورنہ سیدھا اماں کے کمرے میں جانے کا اسے ہوش نہ ہوتا اور وہ وہاں یوں تمالیٹ کر نہ سو گیا ہوتا۔

میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی اماں کی آواز آئی، وہ لڈن کو آواز دے رہی تھی۔ لڈن اندر جانے لگا تو میں نے کہا۔ وہ رمضو بابا کو بتادے کہ میں آیا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ وہ سر ہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔

"جھوٹ بول رہا ہے۔" اس کے اندر جاتے ہی شرف الدین نے کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں وضاحت چاہتا تھا اس لیے میں نے یہ سوال کیا۔

"یہی کہ وہ اس حادثے سے بے خبر ہے۔"

"گویا وہ حادثہ اس کے ساتھ ہوا تھا؟" وہ وہاں سے خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا اور وہاں جاکر سو بھی گیا!"

کیا تم وہاں موجود نہیں تھے؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "کیا یہ قصہ میں نے تمہیں سنایا ہے؟"

"میں وہاں موجود تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے ا... میں کہا۔ "جو کچھ ہوا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ کوئی خوفزدہ آدمی بے فکری سے سو بھی سکتا ہے۔ وہ بھی حادثہ ہوتے ہی خوفزدہ ہوتے ہی۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا؟ اپنے اوپر جانے ہی کو تسلیم نہیں کررہا۔ چاند کی ... تاریخیں ہیں وقار الحسن مگر اثرات تم پر ابھی سے ... ہورہے ہیں۔"

"نہیں بات یہ نہیں ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ... کہ اس حویلی میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب با... ہوتی رہتی ہیں۔"

"وہ عجیب و غریب اس لیے لگتی ہیں کہ انھیں بغیر ... سمجھے من وعن مان لیا گیا ہے۔ اس روز اگر گنگوا کا داؤ ... چکا ہوتا تو شاید تم اس حویلی کے وہ آخری فرد ہوتے شکنتلا کے انتقام کی بھینٹ چڑھ گیا ہوتا۔ کیا میں غلط ... رہا ہوں؟"

میں پھر چپ ہوگیا۔ شاید اس کی اس بات کا جوا... میرے پاس نہیں تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ... میری باتوں پر یقین کرنے کو قطعی تیار نہ تھا۔ وہ معاملے سلجھانے کی بجائے مجھے اور الجھا رہا تھا۔ میرے اس فیصلے میں استقامت آگئی کہ میں اس مسئلے کو تاج گا۔ اس ... لڈن کی اماں دروازے پر چلی آئیں۔ ہم نے انھیں سلا... کیا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ رمضو بابا دوپہر سے ہما... انتظار کررہے ہیں۔

میں اور شرف الدین اندر پہنچے۔ ان کی حالت پہلے ... کافی بہتر تھی۔ اب وہ گاؤ تکیے سے ٹی لگائے لیٹے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ پھیل گئی مگر ... معلوم کیوں مجھے ان کے مسکرانے کا کم اور غمگین ہونے ... زیادہ احساس ہوا۔ لڈن وہیں قریب بچھی چٹائی پر دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔

"مجھے لڈن نے بتایا کہ تم دونوں نے غالباً" اپنا فیصلہ تبدیل کردیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" میں نے بے اختیار پہلے لڈن کی طرف پھر رمضو بابا کی طرف دیکھا۔

"تم مرزا صولت بیگ کے کمرے کی صفائی کرنا چاہتے تھے نا! اچھا کیا جو تم نے ایسا نہیں کیا۔"

"نہیں بابا! آپ کو لڈن نے غلط بتایا ہے۔ ہم نے فیصلہ تبدیل نہیں کیا، ہم ان کے کمرے میں ان کی تصویر لینے ... جو ہم لے آئے۔ البتہ صفائی رات ہوجانے کی وجہ سے ... نہیں کرسکے۔ ویسے وہاں صفائی کی ضرورت بھی نہیں ہے ... میرے ذہن میں کمرے کا جو نقشہ تھا وہ ویسا نہیں نکلا۔ میں سمجھا تھا کہ اس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوگا۔ مکڑی کے جالے سارے کمرے میں لگے ہوں گے۔ چمگادڑوں نے اس کمرے کو اپنی خواب گاہ بنا لیا ہوگا۔ سامان دھول میں اٹا ہوگا مگر وہاں تو نقشہ ہی دوسرا تھا۔" شرف الدین کی ... ان کو وہ بہت غور سے سن رہے تھے۔ اس نے بات ختم کی ... رمضو بابا کے ہونٹوں پر جم جانے والی مسکراہٹ پگھل ... گئی۔ ہونٹ سکڑ گئے اور آنکھوں میں بے کلی سی بھر گئی۔

"تم۔۔ تم دونوں وہاں گئے تھے؟" ان کی آواز سرسراتی ... سرگوشی لگی یوں جیسے تیز ہوا کا جھونکا کان کی لویں چھو کر ... گزر گیا ہو۔

"جی بابا!" میں نے جواب دیا۔ میں انھیں بہت غور سے ... دیکھ رہا تھا۔

"آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟" ان کا سانس پھولنے ... لگا تھا۔

"سولہ۔" میں نے جواب دیا تو یوں لگا جیسے اچانک ان ... کے قریب ہی کہیں کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ وہ اتنی ہی زور سے ... اچھلے تھے کہ میں اور شرف الدین دونوں گھبرا کر کھڑے ... ہوگئے۔ مجھے ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر ... آئے۔ ان کے رخساروں کے نیچے لٹکی کھال یوں ہل رہی ... تھی جیسے انھیں کپکپی چڑھ گئی ہو۔ آنکھیں پھیل کر خوفناک ... ہو رہی تھیں اور ان میں سفیدی سی بھر گئی تھی۔

لڈن بھاگ کر اپنی اماں کو بلا لایا جو شاید سو گئی تھیں۔

"اسے کیا ہوا انھیں؟" وہ گھبرائی ہوئی تھیں۔

"شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" شرف الدین نے ... کہا۔

"نہیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ چلی جاؤ۔" رمضو بابا پھٹی پھٹی آواز ... میں چیخ پڑے۔

میں نے حیرت سے رمضو بابا کو دیکھا۔ اب وہ نڈھال ... سے بستر پر ڈھیر ہوگئے تھے۔ ان پر غشی طاری ہونے لگی ... تھی۔ آنکھیں یوں بند ہورہی تھیں جیسے وہ برسوں سے بے ... خوابی کا شکار رہے ہوں۔ وہ بار بار آنکھیں کھولنے کی ... کوشش کررہے تھے۔ "رمضو بابا! کیا بات ہے۔۔ آج کیا ... بات ہے؟" میں نے جھک کر سرگوشی کی۔

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ ہر بات میں پراسراریت ڈھونڈتے ہو۔ ان کی طبیعت صبح سے خراب تھی اس ... وقت بھی ان کی حالت۔۔۔" شرف الدین بول اٹھا۔

"نہیں۔۔۔" رمضو بابا نے ہاتھ اٹھا کر شرف الدین کی بات کاٹ دی۔ "آج ادھر نہیں جاتا۔۔۔" وہ یوں بولے جیسے الفاظ ان کے حلق میں پھنسے ہوئے ہوں۔

"آج کیا بات ہے بابا!" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔ میں جلد از جلد ان سے ساری بات اگلوا لینا چاہتا تھا۔

"آج۔۔۔ آج ہی تو۔۔۔ وقت کیا ہوا ہے لڈن؟" انھوں نے اچانک زور سے پوچھا۔

"پونے گیارہ بج گئے ہیں۔" لڈن نے کارنس پر رکھی چھوٹی سی ٹائم پیس میں دیکھ کر جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔" وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "آج غضب ہوجائے گا۔ تم لوگوں نے آج وہاں قدم کیوں رکھا۔"

"رمضو بابا! میرا خیال ہے کہ آپ صاف صاف بات کریں۔" شرف الدین انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ مجھے اس لمحے شرف الدین بہت ناپسندیدہ اور قابل نفرت لگا۔ میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں۔

رمضو بابا نے بھی شاید اس کے لہجے کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ پھر لیٹ گئے۔ اب وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کررہے تھے۔ انھوں نے اپنے نگاہیں مجھ پر ٹکادیں۔ "وقار الحسن! تم اگر پندرہ منٹ گزرنے سے پہلے ان تصویروں کو ان کی جگہ پہنچا سکو تو پہنچا دو۔"

"مگر کیوں؟" شرف الدین تنک کر بولا۔ "جن تصویروں کو ہم نے بڑی محنت اور مشقت کے بعد وہاں سے نکالا ہے انھیں وہاں کیسے پہنچادیں اور کیوں؟"

"اس لیے کہ۔۔۔ شکنتلا آج سوگ مناتی ہے، چتا روشن کرتی ہے۔ خود سوزی کرتی ہے اور آج کی رات اس کی غضب ناکی بڑھ جاتی ہے۔ وہ تصویروں کو وہاں نہ پاکر کچھ بھی کرسکتی ہے۔" انھوں نے چیختے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ سخت غصے میں لگ رہے تھے پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ "بہو بیگم نے تمہیں یہاں کیوں چھوڑ دیا ہے کیوں کہ یہ بے وقوفی اور بچپنے کی حرکت۔ وہ تو جانتی ہیں کہ آج کی رات پرکاش کا خون ہوگیا تھا۔ انھوں نے تو خود اسے۔۔۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔۔۔" ان کے ان الفاظ نے مجھے گم صم کردیا تھا۔ میں کسی بت کی طرح کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر غش کھا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں مند چکی تھیں۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ مگر لب ہل رہے تھے، میں نے اپنا کان ان کے ہونٹوں کے قریب کرلیا مگر میں سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں سننا چاہتا تھا، جاننا چاہتا تھا کہ

اماں نے کیا کیا ہے؟ پرکاش کون تھا۔ اسے کیوں قتل کیا گیا۔ اسے کس نے قتل کیا مگر ان کے حلق سے نکلنے والی آواز غرغراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔ سینے میں پھر کپڑا بننے کی کھڈی سی چل پڑی تھی۔ لڈن، شرف الدین 'لڈن کی اماں اور میں' ہم سب بت بنے کھڑے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ جیسے کسی نے جھنجوڑ دیا ہو جیسے کوئی مجھ میں سرگوشیاں کر رہا ہو۔ مجھے حویلی پہنچ جانے کو کہہ رہا ہو۔ میں جھرجھری لے کر رہ گیا اور تبھی میں نے اپنے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کیا۔ بہت قریب پھر جانے کیا ہوا۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگ اٹھا۔ شرف الدین مجھے پکارتا رہ گیا مگر میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں بالکل ہوش کھو چکا تھا مجھے صرف اتنا ہوش تھا کہ میں بھاگ رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح سرپٹ ـــ شرف الدین اور لڈن کی آوازیں اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں کہیں دور رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں حویلی کے دروازے پر کھڑا تھا میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور پسینا دھاریں بن کر بہہ رہا تھا۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا شاید لالٹین بجھ چکی تھی۔ اماں کے کمرے کی لائٹ میں جلی چھوڑ گیا تھا مگر لگتا تھا جیسے وہ بھی کسی نے بند کردی ہے یا شاید میں ہی بند کر گیا تھا۔ میں نے دھیرے سے قدم آگے بڑھایا اور عین اسی لمحے میری نگاہ بالکل سامنے' اوپر کی منزل کی اس کھڑکی پر پڑی جو مرزا صولت بیگ کے کمرے میں کھلتی تھی اور میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ایک بدن شعلوں میں لپٹا جھوم رہا تھا۔ کمرے کے اندر بھڑکتے شعلوں کی زبانیں باہر ہواؤں میں لپک رہی تھیں اور ایک عورت کی کرب ناک چیخوں نے پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ میں حواس باختہ ہو گیا اور بے اختیار اس برآمدے کی طرف بھاگا جہاں سے سیڑھیاں اوپر کی جانب جاتی تھیں۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ میں اس وقت تنہا کہاں جا رہا ہوں' نہ خوف تھا نہ کسی قسم کا ڈر' بس ایک ہی خیال تھا کہ میں اس عورت کو بچا لوں' جو شعلوں میں لپٹی کرب سے چیخ رہی ہے۔ نہ معلوم کیوں مجھے قطعی یہ خیال نہ آیا کہ یہ سب میری نظروں کا دھوکا ہے یا یہ کہ میں پہنچ بھی نہ پاؤں گا۔ جب وہاں پہنچوں گا تو کچھ بھی نہ ہوگا' نہ ہی یہ خیال آیا کہ وہ شکنتلا کی روح ہے' کوئی گوشت پوست کی عورت نہیں۔ صرف ایک دھن سوار تھی کہ میں کسی بھی طرح وہاں پہنچ جاؤں اور اسے بچالوں۔ اسی دھن نے میرے پیروں میں پہیے لگا دیے تھے اور میں تیز رفتاری سے سیڑھیاں عبور کرتا ہوا پہلی منزل پر پہنچ... سیڑھیوں تک پہنچتے ہی میرا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کی طرف گیا تھا جہاں چابیاں موجود تھیں مگر جب میں سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسی لمحے مجھے یہ فکر بھی نہ آیا کہ دروازہ کس نے کھولا۔ میں عرض کر چکا ہوں میں حواس باختہ تھا۔ میری آنکھوں کے آگے تاریکی شعلوں میں گھری ایک عورت کا ہیولا تھا۔ اور بس۔ میں دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں دروازہ کھلا ملا۔ میں جونہی اندر لکڑی کے بنے اس... کمرے میں داخل ہوا گہرے سناٹے کا احساس شدید... جبکہ اب سے ایک لمحہ پہلے تک اس عورت کی کرب ناک چیخیں پوری حویلی میں گونج رہی تھیں۔ گہرے سناٹے... اچانک گھڑی کی ٹک ٹک نے مجھے ٹھٹکا دیا۔ مرزا صو... بیگ کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور لکڑی کی دیوار پر... گھڑی' جس پر آج پردادا کے کمرے سے نکلنے والی... چپک گئی تھی' اس وقت ٹھیک چل رہی تھی۔ اس گھڑی کی سوئیاں دو بجا رہی تھیں۔ اس میں بنے خانے میں... ۱۹۴۳ء کی تاریخ چمک رہی تھی' نہ معلوم یہ کیسی گھڑی تھی جس میں ہندسوں کے علاوہ یہ تاریخ بھی یوں جھلملا رہی... جیسے ننھے ننھے قمقمے جل جل کر بجھ رہے ہوں۔ میں... سے اس گھڑی کو تک رہا تھا کہ اچانک میری کمر سے... یخ ہوا ٹکرائی یوں جیسے میری پشت پر کوئی کھڑکی اچانک کھل گئی ہو اور جیسے باہر برفانی ہوائیں چل رہی ہوں جو... کھل جانے کی وجہ سے مجھ تک پہنچ رہی ہوں۔ میں... سے پلٹا۔ مرزا صولت بیگ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر نہ آگ کے شعلے تھے' نہ کوئی عورت' میں گیا... طرف کھلنے والی کھڑکی بھی بند تھی۔ کمرے میں رکھے پلنگ پر بچھی چادر پر مسلے ہوئے گیندے کے پھولوں... علاوہ خون کے دھبے تھے جو مجھے یہاں سے اتنے صاف نظر آ رہے تھے جیسے میں انھیں بالکل قریب سے دیکھ رہا ہو... مجھ پر سکتہ سا طاری تھا' میرا بدن پتھرا چکا تھا۔ پیر من... کے ہو گئے تھے۔ میں اپنے بدن کو جنبش دینے سے قا... تھا۔ میرے سر کا پچھلا حصہ اندر سے یخ محسوس ہو... یوں جیسے کسی نے میری کھوپڑی کے اندر برف پگھلا دی... میں نے کمرے میں داخل ہونا چاہا مگر ناکام رہا۔ میرے... گویا زمین میں گڑ کر رہ گئے تھے۔ گہرا سناٹا' گھڑی کی ٹک... اور یخ بستگی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا... جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا... جیسے میں کئی دن سے یہاں یونہی ساکت کھڑا ہوں' کھڑ...

...ندھوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار... اور میں اپنے اندر اور باہر کی کیفیت کو عام حالات سے... شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ اچانک مجھے اس... کا خوف لاحق ہو گیا کہ یہ ٹھنڈک پورے بدن میں سرایت کر گئی تو میں مرجاؤں گا۔ میں نے پوری قوت سے... چاہا مگر میرے لب ہل بھی نہ سکے' نہ میں خود کو جنبش... پایا۔ میری نگاہیں اب بھی مرزا صولت بیگ کے پلنگ... چادر پر لگے خون کے دھبوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک... محسوس ہوا جیسے خون کے یہ دھبے آہستہ آہستہ اپنا حجم بڑھا رہے ہوں' جیسے خون چادر پر پھیلتا جا رہا ہو پھر دوسرے ہی لمحے کسی عورت کی سسکیاں گونجنے لگیں' یہ سسکیاں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی میں نے ایک بار پہلے اس برآمدے میں گونجتی سنی تھیں اور وہاں سے برگد کے نیچے بیٹھی عورت کو دیکھا تھا جو وہاں بنی چتا کے قریب بیٹھی رو رہی تھی۔ بالکل وہی سسکیاں تھیں اور پھر میں حیران رہ گیا۔ جوں جوں سسکیاں بلند ہو رہی تھیں' میرے بدن میں اوپر سے نیچے بہنے والی ٹھنڈک ختم ہوتی جا رہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے اپنے بدن میں اور باہر ہوا میں کچھ گرمی محسوس کی پھر میں نے محسوس کیا جیسے اب میں اپنے آپ کو ہلا جلا سکتا ہوں۔ میں نے یقین کرنے کے لیے اپنے بھنچے ہوئے ہونٹوں کو جنبش دی' ایک آہ میرے لبوں سے خارج ہوئی۔ فوراً ہی میں نے قدم اٹھایا اور پھر میں بغیر کسی کوشش کے آگے بڑھتا چلا گیا۔ مرزا صولت بیگ کا کمرا جوں کا توں تھا' جیسا ہم اس سے قبل دیکھ چکے تھے۔ قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ ہم لڈن کے گھر رات کے گیارہ بجے پہنچے تھے' وہاں رمضو بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ آج چاند کی سولہ تاریخ ہے اور تم لوگوں نے مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ سوامی کی تصویریں وہاں سے ہٹا کر اچھا نہیں کیا۔ اسے آج ہی واپس وہاں پہنچا دو' اور پھر اچانک جیسے کسی نے مجھے وہاں سے حویلی پہنچنے کا حکم دے دیا تھا بلکہ یوں لگا تھا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو اور میں وہیں سے شرف الدین کو پکارتا چھوڑ کر حویلی کی طرف بھاگ پڑا تھا' گویا رات کے ساڑھے گیارہ بجے یا بارہ بجے کا وقت تھا' میں پندرہ بیس منٹ بعد ہی حویلی پہنچ گیا تھا اور وہاں سے بھاگتا ہوا اوپر پہنچ گیا تھا۔ آپ خود سوچ لیں کہ یہ سارا عرصہ' کتنے وقت پر مشتمل رہا ہوگا مگر اس وقت۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس وقت' یہاں اوپر کی منزل پر دن پھیلا ہوا تھا۔ مرزا صولت بیگ کے کمرے کی بند کھڑکیوں سے باہر دن نکل...

...دبی ہوئی... ہوا تھا مگر پھر اچانک ہی میں چونک اٹھا تھا۔ کمرے کی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ چاروں طرف سے بند ہونے کے باوجود کمرا روشن تھا۔ اندر داخل ہو کر میں حیران رہ گیا۔ پیتل کا باریک جالی والا لیمپ زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ سوامی جی کی جو تصاویر میں اور شرف الدین اماں کے کمرے میں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں کارنس پر رکھی تھیں اور ان تصویروں پر خون کے دھبے پڑے تھے جن سے مرزا صولت بیگ کا چہرہ بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ ان تصاویر کے سامنے ایک بالشت بھر کا سفید دھات سے بنا مجسمہ پڑا تھا جس کا ایک سرا خون آلود تھا۔ خون بالکل تازہ تھا۔ نہ معلوم میرے جی میں کیا آیا کہ میں نے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس خون کو محسوس کرنا چاہا۔ خون میری انگلی کی پور پر لگ گیا۔ تازہ اور سرخ خون۔ میں نے گھبرا کر انگلی کارنس سے رگڑ ڈالی۔ خون تقریباً صاف ہو گیا۔ عورت کی سسکیوں کی آواز اب کمرے سے نہیں بلکہ کمرے کے باہر سے آ رہی تھی' میں نے اس آواز پر دھیان دیے بغیر گیندے کے پھولوں کو چھوا' وہ مسلے ہوئے پھول تھے۔ چادر پر پھیل جانے والا خون بھی تازہ اور سرخ تھا۔ پلنگ سے نیچے قالین پر دونوں تکیے بے ترتیبی سے پڑے تھے جبکہ ہم آج ہی ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی دیکھ کر گئے تھے۔ میں گہری نگاہوں سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ وہ مجسمہ جس کا سرا خون آلود ہے وہ ابا نے یا شاید اماں نے مجھے دیا تھا اور میں اسے اپنے کمرے میں چھپا چکا ہوں' اس کے ساتھ ہی وہ چاندی کا کڑا بھی ہے جس کے بارے میں ابا نے بتایا تھا کہ وہ انھیں دو چھتی سے ملا تھا اور شکنتلا کا تھا۔ اس کڑے کا خیال آتے ہی میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں' جب تصویریں یہاں پہنچ چکی تھیں' مجسمہ بھی یہیں تھا تو اسے بھی یہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔

میں الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ میرے باہر آتے ہی کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا جیسے کسی نے بند کیا ہو۔ میں ساکت رہ گیا۔ پہلے گہرے سناٹے کا اور پھر اچانک ہی بے پناہ شور کا احساس ہوا۔ گھڑی کی ٹک ٹک کا شور' عورت کی سسکیاں' دبی دبی کراہیں' سب گڈمڈ ہو رہی تھیں اور بے پناہ شور محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا! تیز ہوا کی وجہ سے مسلسل ہل رہا تھا جس کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز کانوں کو بہت ناگوار گزر رہی

...تی میں ... کے دروازے ... کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے پنڈولیم پر چگادڑ چپٹی ہوئی تھی۔ پنڈولیم ہل رہا تھا۔ ہندسے اور تاریخ ویسے ہی چمک رہی تھی اور گھڑی کی سوئیاں اب دو بج کر بیس منٹ کا اعلان کر رہی تھیں۔ خوف کی لہر اچانک ہی میرے وجود میں دوڑی تھی۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہی میری نگاہ عین سامنے دو چھتی پر پڑی جہاں ہم نے گیندے کے پھول اور دھوئیں کی لکیر دیکھی تھی۔ دھوئیں کی اس لکیر کے عین نیچے یعنی دو چھتی سے دو فٹ نیچے مگر زمین سے تقریباً پانچ فٹ اوپر ہوا میں معلق ایک دیا جل رہا تھا۔ گیندے کے پھول کے موٹے موٹے ہار دو چھتی کے کنڈے میں لٹک رہے تھے اور اب سسکیوں کی آواز دو چھتی کے اندر سے آ رہی تھی۔ یہاں۔ گہری تاریکی تھی اور دیئے کی روشنی بھی ایک محدود حصے کو روشن کر رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کی جالی سے باہر جھانکا' رات کا پچھلا پہر تھا' پوری حویلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خوف کی لہر بڑھتے بڑھتے بجلی بن کر بدن میں پھیل گئی۔ میری ٹانگیں بری طرح کانپنے لگیں۔ سسکیوں کی آواز نے میرے دل کو جیسے جکڑ لیا تھا۔ سیڑھیوں پر بے پناہ اندھیرا تھا پھر بھی دیئے کی روشنی میں مجھے سیڑھیوں کے کنارے پر لگی ریلنگ نظر آ رہی تھی۔ میں بھاگتا ہوا اس طرف بڑھا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ میری پشت پر سسکیوں کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے شگفتہ میرے پیچھے آ رہی ہو۔ مجھے پکار رہی ہو' روک رہی ہو اور میں بھاگتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ یہ احساس ہو رہا تھا جیسے میں لحہ بھر کو بھی رکا تو شگفتہ مجھے پکڑ لے گی۔ میں دوسری منزل سے پہلی منزل کی سیڑھیوں تک پہنچ گیا اور اسی لمحے یوں لگا جیسے کسی نے پیچھے سے میرے گریبان کو پکڑنے کی کوشش کی ہو۔ میری گردن میں جھٹکا لگا اور میں اپنا توازن کھو بیٹھا۔ سیڑھیوں سے نیچے کی طرف گرتے ہوئے مجھے صرف ایک ہی احساس تھا کہ جیسے میں لوہے کی سیڑھیوں سے گر رہا ہوں اور میرے بدن کی ہڈی ہڈی چٹختی جا رہی ہے۔ جس جگہ میں پہنچ چکا تھا وہاں سے نیچے سیڑھیاں زیادہ نہیں تھیں پھر بھی میں کافی دیر تک مسلسل گرتا رہا جیسے ہزاروں سیڑھیوں سے گر رہا ہوں اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

○

ہوش آیا تو میں اماں کے کمرے میں تھا۔ ہوش آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں اماں کی مسہری پر لیٹا تھا۔ میرے دونوں بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میرا ایک پاؤں بھی پٹیوں میں لپٹا ہوا اور نیچے سے ایڑی تک پیلی پیلی ہو رہی تھی۔ شاید کسی نے اماں کی طرح ہلدی اور تیل لگا کر پٹی باندھی تھی۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ جھٹکے سے اٹھ بیٹھنے کی وجہ سے تو سر گھوم کر رہ گیا۔ میں نے کراہ کر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ تب پتا چلا کہ سر پر بھی پٹیاں بندھی ہیں' میرا پورا بدن دکھ تو رہا تھا مگر ان پر ایسی چوٹیں نہ تھیں۔ ابھی میں سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا' میرے ساتھ کیا ہوا ہے کہ اچانک جیسے آنکھوں میں روشنی کا جھماکا ہوا اور تمام واقعات اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ذہن میں گھومنے لگے۔ میں نے باوجود شدید تکلیف کے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا۔ میں کمرے میں تنہا تھا۔ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اماں کی مسہری کے سرہانے لکڑی کی تپائی رکھی تھی۔ اس پر کچھ دوائیں' ایک چائے کا کپ' روئی' پٹی اور پانی کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ اٹھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی کہ باہر جا کر دیکھتا کہ میرے ساتھ کون ہے' کس نے مجھے یہاں لٹایا ہے' کس نے مرہم پٹی کی اور کون ہے جو میری اس قدر تندہی سے خدمت کر رہا ہے۔ بیٹھے رہنا بھی محال ہو گیا تو میں بے دم سا بستر پر گر گیا۔ میں نے ایک بار پھر ذہن کو ٹٹولا۔ مجھے یاد آ گیا میں کہ رات سیڑھیوں سے گرتے ہوئے بے ہوش ہوا تھا۔ اس وقت میں نے شگفتہ کے سوا وہاں کسی اور کی موجودگی قطعی محسوس نہیں کی تھی۔ صرف شگفتہ کی سسکیاں تھیں جو میرا تعاقب کر رہی تھیں یا میرے پیروں سے زنجیر کی طرح لپٹ رہی تھیں۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سب کچھ شگفتہ نے خود کیا ہے؟ یہ سوالات مجھے بے چین کر رہے تھے۔ خاندان والوں کی بلکہ میری بھی توقعات کے خلاف اس کا رویہ بھی حیران کر رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں وہ میرے اوپر مہربان تھی۔ میرے ساتھ اب تک' سوائے ان سیڑھیوں سے گرنے کے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا جسے میں شگفتہ کے انتقام کی شروعات سمجھتا۔ میں جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ جانے اماں کیا سوچ رہی ہوں گی۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہوں گی۔ چچا اور تایا ابو نے ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا ہو گا' بالخصوص میں چچا کی طرف سے پریشان تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ پھر ایسی کوئی چال چلنے کی کوشش کریں گے جس سے جائیداد ان کے ہاتھ آ سکے لیکن پھر بھی مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ وہ اماں' جہانی آپا اور شنو آپا کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن بہرحال وہ انھیں پریشان تو کر ہی سکتے تھے اور اب ساری بات جان جانے کے بعد اماں کا

کان ہونا بھی بجا تھا۔ میں جلد از جلد ان تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی وقت مجھے کمرے سے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ شرف الدین تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی صراحی تھی۔ اس نے صراحی کمرے کے باہر سایے میں رکھ دی۔ پیتل کا گلاس اس صراحی کے منہ پر اوندھایا اور پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ میری طرف لپکا۔ "وقار الحسن! کیسے ہو تم۔! اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

میں مسکرایا اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے تکیے اٹھا کر مسہری کے سرہانے لمبائی میں ٹکا دیئے۔ میں اس کے سہارے سے اٹھ بیٹھا۔ "اب ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم۔ تم یہاں کب آئے! کیا دروازہ کھلا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمھاری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے' میرا مطلب کیفیت سے ہے' ورنہ تمھارے جسم پر تو کافی چوٹیں ہیں۔" وہ اس وقت سنجیدہ اور پریشان تھا۔

"ہاں مگر تم۔!"

"میں رات تمھارے پیچھے ہی تو تھا۔ تمھیں ہوا کیا تھا؟ اتنی آوازیں دیں مگر تم نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں بس بھاگتے ہی چلے گئے۔ میں یہاں پہنچا تو تم کہیں بھی نہیں تھے۔ لڈن اور میں تمھیں کافی دیر تلاش کرتے رہے' پھر اچانک لڈن کو خیال آیا' وہ بڑے برآمدے کی طرف چلا گیا۔ میں تمھیں دوسری طرف تلاش کر رہا تھا۔ لڈن نے آواز دی اور وہاں پہنچنے پر تم سیڑھیوں کے نیچے بے ہوش پڑے مل گئے' پھر ہم تمھیں یہاں لے آئے۔ لڈن تو چلا گیا مگر میں تمھیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں تمھیں گھر لے جا سکتا تھا ورنہ اماں سوال کر کر کے دماغ پلپلا کر دیتیں۔ پتا نہیں انھوں نے کیا سوچا ہو گا۔ میں اب تک گھر نہیں جا سکا۔ شگفتہ بھی بہت پریشان ہو گی' اگر تم ٹھیک ہو' یعنی تکلیف محسوس نہ کر رہے ہو تو گھر چلے چلو۔"

وہ بتا رہا تھا اور میں حیرت سے سن رہا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا تھا اس سے تو ایسا لگتا تھا جیسے میں آیا ہوں اور وہ میرے پیچھے آئے ہیں اور میں انھیں اسی وقت سیڑھیوں پر پڑا مل گیا جبکہ جو کچھ یہاں آ کر میں نے دیکھا تھا اور جتنا وقت میں اوپر رہا تھا' وہ کم سے کم بھی گھنٹا بھر تو ہو گا ہی۔

"تمھارے زیادہ گہرا کوئی زخم نہیں ہے۔ بس جگہ جگہ سے رگڑ لگنے کی وجہ سے کھال گھس گئی ہے' چھل گیا ہے' یا پیر میں شاید موچ آئی ہے' سوج گیا تھا۔ میں نے ہلدی اور تیل مل دیا تھا۔ ویسے بھی یار تیمارداری کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا اس لیے بس کام چلا لیا۔"

"شریف الدین! تم میرے یہاں پہنچنے کے کتنی دیر بعد پہنچے تھے؟" میں نے سوال کیا۔ ایک آس تھی کہ شاید اس نے بھی کچھ دیکھا ہو اور یوں وہ میری باتوں کا قائل ہو گیا ہو۔

"میں تم سے شاید بیس پچیس قدم دور تھا' اب خود اندازہ کر لو۔ ویسے میں بھاگتا تو تم سے تیز ہوں مگر رات تو یوں لگ رہا تھا جیسے تمھارے پیچھے جنگلی لگے ہوئے ہیں۔ تم سالانہ دوڑ میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟"

"تو کیا بیس پچیس منٹ بعد ہی تم نے مجھے دیکھ لیا تھا!" میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیس پچیس منٹ نہیں بھیا! میں نے بیس پچیس قدم کہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھاگتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھے ہو' پورے زور میں دروازے سے ٹکرائے ہو اور گر گئے ہو۔ اتنی دیر میں ہم تم تک پہنچ گئے ہیں۔"

"کون سے دروازے سے؟ کیا برآمدے سے شروع ہونے والی سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا؟"

میرے سوال نے اسے چونکا دیا۔ اس نے لمحہ بھر کو سوچتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ "نہیں۔ وہ دروازہ تو بند تھا۔"

"تو گویا میں برآمدے میں گیا۔ سیڑھیاں تک پہنچا اور وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا' پھر یہ چوٹیں۔ یہ چھلی ہوئی کہنیاں' یہ پیر کی موچ۔ کیا رات بھر میں تم نے نہیں سوچا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟" اب میں اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیوں نے میرے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ میں اپنی تکلیف بھول کر پھر اسے قائل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

"ہاں۔ بظاہر تو یہی ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

"بظاہر تو یہی ہوا ہے مگر۔ کیا تم پوچھو گے نہیں کہ کیا ہوا تھا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا اور اسی لمحے مجھے مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ سوامی جی کی وہ تصویریں یاد آ گئیں جو میں مرزا صولت بیگ کے کمرے میں دیکھ چکا تھا اور جن پر خون لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہ کارنس کی طرف اٹھ گئی جہاں ہم نے وہ دونوں تصاویر رکھی تھیں۔ تصویریں وہاں نہیں تھیں۔ بے اختیار میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی دیکھی۔ اس کی پور پر

آبلہ پڑا ہوا تھا جیسے انگلی کسی انگارے سے چپک گئی ہو۔ آبلہ تازہ تھا اور اس میں اب بھی پانی بھرا تھا۔ میں نے حیرت سے اس آبلے کو دیکھا۔ شرف الدین مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے شہادت کی انگلی اس کے سامنے کردی۔ "اور وہ تصویریں کہاں ہیں؟"

تب اس نے گہرا سانس لیا۔ اٹھا اور اماں کی مسہری کے پائنتی کو گیا پھر اس نے جھک کر کچھ اٹھایا اور جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں وہی تصویر تھی اور مرزا صولت بیگ کے چہرے پر اب بھی خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے مگر اس وقت یہ خون کے دھبے سیاہ تھے۔ میں بے دم ہو کر بستر پر ڈھے گیا۔ شرف الدین نے تصویریں واپس دیوار سے لگا کر رکھ دیں اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آگیا۔

"یہ تصویریں کہاں تھیں؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"جب میں تمھیں اٹھا کر یہاں لایا تو یہ تصویریں یہیں کارنس پر رکھی تھیں مگر۔ اس حالت میں کہ مرزا صولت بیگ کا چہرہ خون آلود تھا۔ میری نظر اس پر پڑی تو میں خود بھی حیران ہوا تھا لیکن وقار الحسن! یہ مت بھولو کہ تم سے یہ حویلی خالی کرانے کے لیے جو سازش کی گئی ہے وہ بڑی منظم ہے۔ تمھارے چچا تایا کو یہ علم تھا کہ تم ان کے جانے کے دوسرے روز ہی علی گڑھ چلے جاؤ گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ آج چوتھا روز ہے اور تم یہیں ہو۔ ممکن ہے پروگرام کے مطابق انھوں نے کسی کو یہاں بھیجا ہو' اس نے تمھیں یہاں دیکھا اور آج جب ہم یہ تصاویر نیچے لے آئے' اور پھر گھر چلے گئے تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے یہ حرکت کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمھیں بھی اسی نے زخمی کیا ہو۔"

"خدا کے لیے شرف الدین! خدا کے لیے میری باتوں پر یقین کرو۔" میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا' پھر میں نے اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات تفصیل سے بتائے۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں اسے دکھائی دے رہا ہوں اور نہ میری باتیں اس کی سماعت تک پہنچ رہی ہیں۔ وہ براہ راست میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھاتا تو اس کی نگاہیں دیوار کو تکنے لگتیں۔

"شرف الدین! للن کے باپ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سولہ تاریخ کو خود سوزی کرتی ہے۔ میں حیران صرف اس بات پر ہوں کہ اماں نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔" و[ہ] چپ رہا۔

"آج شام مراد آباد سے میرا ایک دوست آرہا [ہے] اس سے مل لینا۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح بولا۔

"کیوں! اس معاملے سے اس دوست کا کیا تعل[ق] ... میں الجھ گیا۔

"وہ ماہر نفسیات ہے۔" شرف الدین نے ... میں کہا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں بے ا[ختیار] ساختہ چیخ پڑا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ نکل جاؤ اسی وقت چلے جاؤ میرے سامنے سے' نہیں ... سے۔ چلے جاؤ۔" مجھ پر دورہ سا پڑ گیا تھا۔ وہ ... میں بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں گہرا ... وہ شاید مجھے پاگل یا بیمار سمجھ رہا تھا۔ میں غصے کی ... رو پڑا۔ "تم۔ تم یقین کیوں نہیں کرتے ہو؟ ... روتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ جو واقعات تم نے مجھے سنا[ئے] ... ہوئے نہیں بلکہ تمھارے دماغ میں کسی فلم ... ہے۔ میں تمھارے پیچھے تھا' میرے ساتھ لڈ[ن] ... صرف بیس پچیس قدم کا فاصلہ تھا ہم میں اور ... تم یہ ضد ہو کہ میں تمھاری سنائی ہوئی کہانی ... لوں۔" وہ غصے میں کھڑا ہو گیا پھر اس نے ٹہلنا ...

"دیکھو وقار الحسن! میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب تم جھوٹ بول رہے ہو۔ نہیں تم حرف حرف ... یہ سب صرف تم دیکھتے اور محسوس کرتے ہو ... یہ ہے کہ آسیب تمھارے ذہن میں ہے' تم ... بچپن ہی سے اس قدر کچلا گیا ہے' ایسی خرا[فات] ... بھری گئی ہیں کہ تم نے اپنے اندر ایک پوری ... بہ قول تمھاری اماں کے خزراں اور عظمت ... صولت بیگ کی شکار ہوئی تھیں پھر اب تک ... کیوں نہیں دیکھا یا انھوں نے تم سے یا اس ... انتقام لینے کی کوشش کیوں نہیں کی' یا پھر ان ... حویلی میں کیوں نہیں روتیں' بین کرتیں؟ ... الحسن کو ہندو ما۔ تھالوجی میں اس یقین کو بڑ[ا] ... ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی مقصد' ایسا مقص[د] ... درجہ حاوی رہا ہو' پورا نہ ہوا ہو اور وہ مر ... روح یہیں دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور ا[سے] ... کرنے کے بعد ہی سکون پاتی ہے۔ اس میں ... جذباتی وابستگی بہت امپورٹنٹ ہوتی ہے۔ ...

... جس کا بچہ چھوٹا ہو' اکلوتا ہو یا وہ اسے بے پناہ ... ہو۔ اس کے بن ایک پل بھی گزارنا اس کے لیے ... ہو تب اس کی روح اس دنیا میں' اسی بچے کے گرد ... اور بے کل سی منڈلاتی رہتی ہے' اگر اس کا شوہر ... شادی کر کے اس بچے کی سوتیلی ماں لے آئے تب ... بچے کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی طرح کی بہت سی ... میں دے سکتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ جو کچھ میں ... ' تم سمجھ گئے ہو۔ یہاں شکنتلا کا چکر یہ ہے ... کے محبوب کو قتل کر کے اسی حویلی میں دفنا دیا گیا ... نے اس کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔ ... سب جانتے ہیں تمھارے پردادا مرزا صولت بیگ ... تمھارے دادا مرزا شبیہ الحسن بھی' تمھارے باپ اظہار الحسن بھی اور اب تم یعنی وقار الحسن بھی' تم یہاں پلے بڑھے ہو' جہاں ہندو ما۔ تھالوجی کا اثر مسلم ... مالوجی سے زیادہ ہے اس لیے کہ تم سب نے آنکھ کھلتے ... ماحول کو دیکھا' محسوس کیا اور خود میں کسی حد تک ... بھی کیا ہے۔ مون میڈنس جو بیماری ہے تمھارے ... اس کا شکار رہے' اس کا شکار ہونے کے بعد ان کے ... نے جن تصورات کو مجسم دیکھا وہ وہی تھے جنھیں ان ... ماغ نے شروع ہی سے زیادہ جاذب اور لطیف محسوس ... یہ تصورات اور یہ اختراعات سینہ بہ سینہ منتقل بھی ... یوں تم اسی تصوراتی دنیا میں زندہ ہو' جب بھی چاند ... میں ایک خاص زاویے سے تمھارے بدن پر پڑتی ... تمھارے جذبات ایک خاص رنگ اختیار کر لیتے ہیں' ... کچھ دیکھتے' سنتے اور محسوس کرتے ہو جو تم دیکھنا' سننا ... سوس کرنا چاہتے ہو اور کیونکہ اس وقت تمھارا ... شعور پر حاوی ہوتا ہے اس لیے تمھیں وہی دنیا نظر ... ہے۔ کیا تم میری بات کو سن رہے ہو؟ سمجھ رہے ہو؟' ... نے دھیرے سے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ میں گم صم بیٹھا ... باتیں سن رہا تھا۔ یوں جیسے اس نے مجھے ہپناٹائز کر لیا ... میرے پاس صرف سماعت ہی رہی ہو اور سب کچھ ... چکا ہو۔

... ایسے واقعات بھی ہیں وقار الحسن کہ ہوئے' اور ان ... وغریب واقعات کو سب نے دیکھا مگر تمھارا معاملہ مختلف ہے۔ بلکہ بہت مختلف ہے' یہاں تمھارے ... کے علاوہ بھی کچھ ہر کی قوتیں دوسروں کو یہ باور کراتا ... ہیں کہ یہ سب حقیقت ہے۔ ان کی اس حرکت کا ... تمھاری جائیداد ہے' تم خود ہی دیکھ چکے ہو۔" ... تم نے اس ایک واقعے کو ایشو بنا لیا ہے شرف الدین!

مگر تم نے کبھی یہ ذکر نہیں کیا کہ گنگوا کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ تم چاہو تو پولیس اسٹیشن جا کر دیکھ سکتے ہو۔ اس لیے کہ یہ میرے پردادا کے زمانے کی بات نہیں کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ تھانہ انچارج وہی ہے' اس کے ساتھ آنے والے سپاہی بھی وہی ہیں۔ ہمارے ذہن کی اختراع تھی' تصوراتی باتیں تھیں تو گنگوا کے سینے پر بیٹھا سانپ انچارج کو کیسے دکھائی دیا۔ سپاہیوں کو کیوں کر نظر آیا۔ میری پھوپی' بہنیں اور اماں تو مون میڈنس کا شکار نہیں ہیں ناں یا تم انھیں بھی۔"

"نہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "سانپ کوئی مافوق الفطرت چیز نہیں' اور امروہہ میں تو بڑے بڑے اور عجیب و غریب اقسام کے سانپ موجود ہیں' اگر تم نے نہیں دیکھے تو میں تمھیں دکھا سکتا ہوں۔ وہ اسی لیے سب کو دکھائی دیا کہ وہ تھا۔ اس نے گنگوا کو ڈسا تھا' ممکن ہے بقول تمھارے اپنی دم اس کے گلے میں لپیٹ کر اس کا دم بھی گھونٹ دیا ہو۔ اس میں کون سی بات انہونی ہے! بولو۔ بولو نا! بہرحال میرے خیال میں ڈاکٹر عارف صدیقی سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ صرف میرے کہنے سے یہاں آرہا ہے۔" شرف الدین نے تپائی پر رکھا پانی کا گلاس منہ سے لگایا اور اسے خالی کر کے رکھ دیا۔ قمیص کی آستین سے منہ پونچھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ "ارے ہاں۔" اچانک وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھری سنجیدگی پل میں غائب ہو گئی اس کی جگہ شرارت کی چمک ابھر آئی۔ "تم نے کچھ دیر پہلے مجھے نکل جانے کو کہا تھا۔ اور تم اس وقت غصے میں بھی تھے' میں بالکل بھول گیا۔ اب۔ اب جا رہا ہوں اور اس وقت تک واپس نہیں آؤں گا جب تک تم آکر اپنے رویے کی معافی نہیں مانگو گے۔" اس نے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا تو مجھے ہنسی آگئی اور میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا' بالکل اسی لمحے میری نگاہ تپائی پر رکھے اس گلاس پر پڑی جسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی شرف الدین نے خالی کر کے رکھا تھا۔ وہ پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں چونک اٹھا۔ میرے چونک اٹھنے کو شرف الدین نے بھی محسوس کیا۔ وہ جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔

"کیا بات ہے! کیا پھر کسی نے رابطہ کیا ہے تم سے؟" اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"نن۔ نہیں۔ میں کیونکہ زخمی ہوں' بیمار ہوں اور تم جا رہے ہو اس لیے ذرا مجھے پانی پلا دو۔ گلاس میں رکھا پانی تو تم پی چکے ہو اور صراحی اتنی دور رکھی ہے کہ میں اٹھا نہیں پاؤں گا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں ... یہ میں کر سکتا ہوں کیونکہ میں کسی کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ کندھے جھکائے' سر کو ایک طرف ڈالے' بڑے مضحکہ خیز انداز میں گھوم کر دوسری طرف آیا اور تپائی پر رکھا گلاس اٹھانے لگا۔ میں بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے توقع کے مطابق اسے بڑی زور سے چونکتے دیکھا پھر گلاس کی طرف دیکھا۔ وہ لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں جانے کیوں خوشی محسوس کرنے لگا' وہ کچھ دیر بونقوں کی طرح اس بھرے ہوئے گلاس کو دیکھتا رہا پھر اس نے چاروں طرف' میز پر' کرسی پر' پلنگ کے نیچے ہر جگہ شاید اس خالی گلاس کو تلاش کیا جسے اس نے خالی کر کے رکھا تھا' مگر وہاں کوئی دوسرا گلاس ہوتا تو نظر آتا۔ اس دوران میں وہ بار بار مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔

"شرف الدین! میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں ہوں۔ پانی تم پی کر گلاس خالی کر چکے ہو اور گلاس ... گلاس بھرا رکھا ہے۔ کیا یہ سب کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے یا یہ صرف میں ہی دیکھ رہا ہوں۔" میں نے پھر طنز کیا۔

"وقار الحسن! یہ ... یہ سب کیا ہے؟" وہ ہکلانے لگا۔ اس کی فصاحت و بلاغت دھری رہ گئی۔

"یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ سب کیا ہے ...!" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "تم نے میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کر کے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ میں جو کام نمٹانا چاہتا ہوں تم اس میں میرا ساتھ نہیں دے رہے اور میں ... میں تنہا یہ سب کرتے ہوئے گھبرا رہا ہوں شاید اس لیے کہ مجھ میں ہمت کی کمی ہے۔"

"سپ ... پانی دوں!" اس نے میری بات نظرانداز کر دی۔

"ہاں ..." میں نے ہاتھ بڑھایا۔

اس نے بڑی احتیاط سے گلاس اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس کی نگاہیں چھلکتے ہوئے پانی پر تھیں۔ پانی اس کے ہاتھ پر بھی گرا تھا اور چادر کے کونے پر بھی۔ میں نے گلاس لے کر منہ سے لگایا اور اسے خالی کر کے پھر اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "یار! تم تو زبردست جادوگر ہو۔ یہ سب کہاں سے سیکھا تم نے؟" اچانک اس کے لہجے میں شوخی در آئی۔ "پچھلے برس علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک شخص آیا تھا۔ اس نے سر پر ایک لمبا سا ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے ایک ایسا کرتب دکھایا تھا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ اس یونیورسٹی میں درمیان کی ایک عمارت ایسی تھی جس کی کوئی دوسری منزل نہیں تھی اسی لیے وہاں

سیڑھیاں بھی نہیں تھی' یعنی چھت پر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا' دوسری منزل تو کیں خیر کہیں بھی نہیں تھی' اس کچھ دوسرے کرتب دکھانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے با[ہر] چلا گیا' ٹی بریک ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے سا[تھ] ایک اونٹ بھی تھا۔ اس نے اس اونٹ کو پوری عمار[ت] میں گھمایا پھر جا کر دروازے سے باہر چھوڑ آیا۔ دو سر[ے] چھوٹے موٹے کرتب دکھا کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے [کے] دو تین منٹ بعد ہی وہ اونٹ چھت پر ٹہلتا نظر آیا۔ ہم س[ب] حیرت سے پاگل ہو گئے۔ اونٹ والا اسے ڈھونڈتا [ہوا] یونیورسٹی آ گیا اور خوب شور مچایا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کیسے اتارا جائے پھر ایک لڑکے کو ترکیب سوجھی۔ اس نے ہوسٹل کے تمام لڑکوں کے بستر لا کر ا[نہیں] سیڑھیوں کی طرح رکھا' کچھ بستر باہر محلے سے منگائے' ا[ور] چڑھا' اس کے ساتھ کچھ دوسرے لڑکے بھی تھے تب ا[س] طرح یعنی انھی بستروں کے ذریعے اونٹ کو نیچے اتارا گیا۔"

وہ بول رہا تھا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے کپڑے [پھاڑ] کر چیختا ہوا حویلی سے باہر نکل جاؤں میں نے دانت کچکچا[کر] اسے دیکھا' وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ "میں پھر بعد آؤں گا۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے آواز لگا[ئی]

"اماں پریشان ہوں گی' کھانا بھی لیتا آؤں گا۔" یہ کہتا ہو[ا] چلا گیا۔

میری کنپٹیوں میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں تکیے ٹھیک کیے اور لیٹ گیا۔ مجھے ان واقعات سے [زیادہ] شرف الدین نے پریشان کیا ہوا تھا۔ اب میں نے سو[چا] کہ جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے تنہا ہی کرنا ہے۔ اس نے م[یرے] اعصاب شل کر دیئے تھے' میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج [رات] یہاں گزار کر اگلے روز مراد آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ اور بہنوں سے مل کر اگلے روز ہی جے پور کی ٹرین پکڑ[وں] گا۔ جے پور کا خیال آتے ہی میری نگاہ کارنس پر پڑی [جو] خالی تھی۔ تصویریں تو اماں کی پائنتی کی طرف دیوار [سے لگی] رکھی تھیں اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ شاید خو[ن کے] ان دھبوں کی وجہ سے شرف الدین نے انھیں سامنے [کے] رخ پر نہیں رکھا تھا۔ میں دھیرے سے اٹھا۔ میرا بایاں [پیر] بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اسی طرف پاؤں میں موچ [آئی] تھی' وہ سوج کر کپا بن چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنی ٹانگ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پٹی کی طرف سرکائی اور [جھک] کر وہ تصویریں اٹھالیں۔ یہ دیکھ کر میں حیران ہو گیا کہ تصویروں پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔ وہ ویسی ہی صاف تھیں جیسی ہم کل اٹھا کر نیچے لائے تھے۔ میں نے ا[نھیں]

[اسی] پوزیشن میں واپس وہیں رکھ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ شرف [الدین] انھیں وہاں سے خود اٹھائے ورنہ وہ کہہ دیتا کہ میں نے کسی طرح اسے صاف کر دیا ہے۔ تصویریں واپس رکھ کر میں پھر لیٹ گیا۔

میرے آنکھیں بند کرتے ہی رات والا پورا واقعہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مرزا صولت بیگ کا کمرا' چلتی ہوئی گھڑی' بستر پر خون کے دھبے اور گیندے کے مسلے ہوئے پھول' دو چھتی پر کنڈے میں لٹکے پھولوں کے ہار' ہوا میں معلق جلتا ہوا دیا۔ ایک ایک چیز میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب میرے اندر کوئی خوف نہ تھا۔ میں یہاں' اس حویلی میں تنہا تھا۔ عجیب ہو کا سا عالم تھا' تمام باتیں مجھے یاد تھیں' اور ابھی ابھی گلاس والی بات پر تو مجھے یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ شگفتہ میرے قریب ہی موجود ہے پھر بھی کوئی ڈر' کوئی خوف نہ تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے ہوا کا ہلکا سا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا ہو۔ یوں جیسے کوئی قریب آئے تو اس کے کپڑوں اور اس کے جسم کی [خوشبو لیے] ہوا کا ہلکا سا جھونکا آیا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کوئی نہیں تھا مگر کسی کی موجودگی کا احساس مجھے پھر [اسی] شدت سے ہوا۔ تبھی جانے میرے دل میں کیا آئی کہ [میں] بول اٹھا۔ "شگفتہ! تم جانتی ہو کہ میں' میں کیا سوچتا [ہوں' کیا] چاہتا ہوں' میری مدد کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ [میں] کیا کر سکتا ہوں۔ تمہارے چین کی خاطر مجھے کیا کرنا [چا]ہیے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ شرف الدین میرا ساتھ [د]ینے کو تیار نہیں' میں شرف الدین کے بغیر خود کو کمزور پاتا [ہو]ں۔ پلیز میری مدد کرو۔"

مجھے کوئی جواب تو نہیں ملا یوں لگا جیسے کوئی ایک بار پھر [می]رے بالکل قریب سے گزر کر دروازے کی طرف گیا ہو۔ [کچ]ھ دیر بعد ہی مجھے پائل کی آواز سنائی دی۔ بے اختیار میرا [ہا]تھ اپنی جیب کی طرف رینگ گیا۔ اس میں پائل موجود [تھ]ی۔ تعویز کی چاندی کی ڈبیا بھی تھی۔ میں نے وہ تعویز نکال [ک]ر کالے دھاگے کو گلے میں ڈال لیا اور تعویز کی ڈبیا قمیص [ک]ے اندر چھپا کر اوپر کا بٹن لگا لیا۔

جانے کیوں اور کیسے میرے اندر ایک اطمینان کی سی [کیف]یت پھیل گئی۔ میری آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہونے [لگ]ے اور میں نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر [لیں]۔ میں کب سویا اور کتنی دیر سویا مجھے کچھ پتا نہیں مگر [ج]ب اٹھا تو یوں لگا جیسے برسوں تک سوتا رہا ہوں۔ طبیعت [میں] ایک سرشاری اور سرور کی سی کیفیت تھی۔ تازہ دم ... [بد]ن کی تکلیف غائب ہو چکی ... تھی ...

تکلیف نہیں تھی اور پاؤں کی سوجن کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ میں بستر سے اٹھا۔ میں نے دونوں پاؤں زمین پر رکھے اور کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پیر میں تکلیف ہو گی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے صراحی سے پانی نکال کر پیا۔ چند قدم چلا۔ دروازے سے باہر بیرونی گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ بند تھا شاید شرف الدین اسے باہر سے بند کر گیا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ آسمان پر سرمئی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ پرندوں کا بے پناہ شور تھا کیونکہ برآمدے کے دوسری طرف برگد کے درخت پر بہت سے پرندوں کا بسیرا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی دروازے پر کھڑا رہا پھر واپس کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میں آیندہ کی پلاننگ کرنا چاہتا تھا۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں اس کام کو تنہا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چار پانچ دن یہاں ضائع ہو چکے تھے۔ مزید وقت کا زیاں میرے لیے بہتر نہ تھا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ' شگفتہ نے کہا تھا وہ اور شرف الدین مراد آباد جائیں گے' مگر یہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ کس روز ان کا وہاں جانے کا ارادہ ہے۔ میں نے سوچا کہ شرف الدین آ جائے تو اس سے پوچھوں گا اور انھی کے ساتھ مراد آباد نکل جاؤں گا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ شرف الدین آ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ "خیریت؟" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"تمہارے راج میں بھلا خیریت کیسی! گھر پہنچا تو ابا کی ناک لال ہو رہی تھی اور اماں کی آنکھیں۔" اس نے تام چینی کا ٹفن کیریئر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ابا غصے میں ہوں تو ان کی ناک لال ہو جاتی ہے اور اماں روتی ہیں تو ان کی آنکھیں لال ہو جاتی ہیں۔ شگفتہ اپنے کمرے میں بند تھی' اسے میں نے ہی جا کر نکالا تھا مگر وہ بہت ناراض ہے۔ ہمیں مراد آباد جانا تھا۔ ابا کا خیال ہے کہ میں آوارہ ہوتا جا رہا ہوں۔ اماں کہتی ہیں غیر ذمے دار ہو گیا ہوں اور شگفتہ میرے اور تمہارے لیے پریشان تھی' مجھے دیکھتے ہی وہ ناراض ہو گئی۔" "شرف الدین! میرا خیال ہے کہ ہم مراد آباد چلے چلیں۔" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"پھر شگفتہ کا کیا ہو گا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اب تک بات واضح نہیں ہوئی' یہاں بیٹھ کر تماشے دیکھنے سے بہتر ہے کہ میں جے پور جا کر ... ان سے معلومات حاصل کروں۔"

اور خون تک پہنچ چکے ہیں۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ "ویسے میں چاہتا تھا کہ معاملات کی تہ تک پہنچ سکوں مگر لگتا ہے سب بیکار ہے۔ عارف آگیا ہے' شگفتہ بتا رہی تھی کہ وہ رات آٹھ بجے تک آئے گا۔ تم اس سے مل لینا۔ میرا خیال ہے کہ ملنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسے بھی آج ہم یہیں روک لیں گے اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔"

"اعتراض کی کیا بات ہے! ویسے مراد آباد جانے کا کیا ہوا؟"

"ابا نے حکم دیا ہے کہ اگر میں کل شگفتہ کو لے کر مراد آباد روانہ نہ ہوا تو وہ میرے ناخلف ہونے کا سرٹیفکیٹ' عاق نامے کے ساتھ اخبار کو بھجوا دیں گے لہٰذا میں ہر صورت میں کل شام والی گاڑی سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ٹھیک ہے پھر تم آج اپنی تیاری کر لینا۔ کھانا نکالوں' مجھے تو بہت بھوک ہے۔ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔"

"ہاں۔ بھوک تو مجھے بھی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں ہاتھ منہ دھونا چاہتا تھا۔

"ارے تم ٹھیک ہو؟" وہ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر چونک اٹھا۔

"ہاں۔ اور میرا خیال ہے کہ پہلے تم یہ ساری پٹیاں کھول دو' میں الجھن محسوس کر رہا ہوں۔"

یہ سن کر اس نے میری دونوں کہنیوں سے پٹیاں کھولیں۔ قارئین پٹیاں کھولتے ہی شرف الدین کا منہ تو کھلا ہی خود میرا منہ بھی حیرت سے کھل گیا اس لیے کہ وہاں کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ شرف الدین چند لمحے حیرت سے میری کہنی کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے جلدی سے میرے سر پر بندھی پٹی کھول کر دیکھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے سر پر کہاں اور کیسا زخم آیا تھا' نہ مجھے کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں بیٹھا رہا۔ شرف الدین پٹی کھول کر تیزی سے میرے پاؤں کی طرف بڑھا۔ تیل اور ہلدی والی پٹی کھولی۔ پاؤں بالکل ٹھیک تھا حتیٰ کہ اس پر ہلدی کا نشان تک نہ تھا جبکہ شرف الدین نے بڑی فراخ دلی سے ہلدی اور تیل ملا ہو گا کیونکہ تقریباً تمام پٹی تیل اور ہلدی میں جکڑی ہوئی تھی۔

"یہ۔ یہ سب۔!"

"میں نے جادو کیا تھا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میں تمہیں کسی بھی وقت خرگوش بنا سکتا ہوں ذرا بچ کر

رہنا۔" میں مسکرایا۔

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں یقینی تھی۔

"چلو ہاتھ دھو لو تاکہ کھانا کھایا جا سکے۔ یاد رہ سے پلیٹیں لے آئیں گے۔" میں یہ کہتا ہوا کھڑا ہو دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے۔ غسل خا باہر بھی ایک ٹنکی رکھی تھی۔ وہیں ٹنکی ہی میں بنی میں صابن رکھا تھا۔ میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ شرف الدین نے ہاتھ دھوئے۔ میں کھڑا ہوا انگو ہوئے تولیہ سے منہ اور گردن رگڑ رہا تھا کہ شر ٹونٹی بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری طرف اور میں نے تولیہ اس کی طرف بڑھا دی۔ اچانک ٹونٹی کھل گئی اور پانی تیز آواز سے بہنے لگا۔ میں الدین دونوں ہی اچھل پڑے۔ ہم نے ایک دو دیکھا۔ شرف الدین نے آگے بڑھ کر ٹونٹی بند جھینپ کر بولا۔ "شاید میں ٹھیک سے بند نہیں کر پا

میں اور شرف الدین کمرے کی طرف بڑھ دو چار قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ٹونٹی پھر کھ دونوں ٹھٹک کر رہ گئے' ہم نے پلٹ کر ٹنکی کی طر وہ ہونقوں کی طرح کبھی کھلی ہوئی ٹنکی کو اور کبھی تھا۔ اس بار میں نے آگے بڑھ کر ٹونٹی بند کی اور طرح جما کر سیدھا ہو گیا۔ چند لمحے ہم وہیں کھڑ طرف دیکھتے رہے جیسے وہ پھر کھل جائے گی مگر کافی کھلی تو ہم باورچی خانے کی طرف چل پڑے۔ م جا کر پلیٹیں اٹھائیں اور باہر آگیا۔ شرف الدین ٹنکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی اس کیفیت اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے قطعی خوف محسوس نہیں میں خوش تھا اور جان گیا تھا کہ شگفتہ شرف الد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں خود کو بہ محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں پلیٹیں لیے کمرے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم دونوں اچھل بڑے سلیقے سے چاندنی پر سجا ہوا تھا۔ پلیٹیں سب موجود تھے۔ ٹفن کھلا ہوا رکھا تھا۔ پانی کا تھا اور دو گلاس بھی قریب ہی رکھے تھے۔ ہم سے دیکھ رہے تھے کہ اچانک شرف الدین بول وہ دیکھو۔" اس نے کارنس کی طرف اشا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ سوامی جی کی تصو

ئی تھیں۔ صاف ستھری اور بالکل اسی انداز میں جس راز میں ہم نے کل اوپر سے یہاں لا کر رکھی تھیں۔

"شرف الدین! کیا اب تم قائل ہو گئے ہو یا اب بھی ں سمجھ رہے ہو کہ یہ سب میرا جادو ہے۔" میں نے یرے سے کہا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ آؤ کھانا کھاؤ۔" اس بار وہ بولا تو نارمل تھا۔

چند لمحے میں اس کے چہرے پر اس کی سوچ کھوجتا رہا پھر ندنی پر بیٹھ گیا۔ شرف الدین خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ ں نے بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور کھانا کھاتا رہا۔ کھانا ما کر ہم فارغ ہوئے تو اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے برتن سمیٹے اور انھیں باورچی خانے میں رکھ آیا۔ شرف دین نے ٹفن بند کر لیا۔ میں کمرے میں واپس آیا تو وہ ٹفن لیے چلنے کو تیار تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "چلیں! عارف نے والا ہو گا۔ چائے پی کر اور اسے ساتھ لے کر آ جائیں گے۔"

"چلو!" میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ شرف الدین نے پان کے کھوکھے پر رک کر ن لیا۔ پان والا بوڑھا کافی پرانا آدمی تھا۔ مجھے دیکھ کر ونک اٹھا۔

"چھوٹے مرزا! آپ! آپ گئے نہیں؟"

"نہیں۔ لیکن کل چلا جاؤں گا۔" میں نے پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ میں پان کبھی کبھی ہی کھاتا تھا۔

"او میں تو سمجھا تھا کہ آپ جا چکے ہیں۔"

"تو میں نے بتایا تو تھا کہ چھوٹے مرزا نہیں گئے۔" وڑھے کا بیٹا پان لگاتے ہوئے بولا۔ "چھوٹے مرزا آپ کو رنہیں لگتا! مجھ سے تو کھوکھے پر بھی رات کو اکیلا نہیں بیٹھا جاتا۔"

"تو چپ رہ۔" بوڑھے نے جھڑک دیا۔ "مرزا ابھی کچھ دیر پہلے ایک عورت آئی تھی۔ آپ کو پوچھ رہی تھی۔ مجھے کیا پتا' میں نے کہہ دیا کہ وہ تو مراد آباد چلے گئے۔"

"کون۔ کون عورت!؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پتا نہیں جی! عصمت نام بتایا تھا۔ کہتی تھی مراد آباد میں ملاقات کر لوں گی۔" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عصمت!؟" ـب زیر لب بڑبڑایا۔ کافی سوچا مگر یاد نہ آیا۔ خیال آیا کہ شاید مطلوب چچا کے گھر سے کوئی آیا ہو۔

اماں وہاں جاتی رہتی تھیں اور اب انھیں گئے کافی دن ہو گئے تھے' وہ لوگ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اماں وغیرہ مراد آباد چلی گئی ہیں۔ میں نے سوچا کہ واپسی پر ادھر کا چکر لگا لوں گا۔

"اچھا چچا! اب اگر کوئی آئے تو کہنا میں کل مراد آباد جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور شرف الدین کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ہم تھوڑی ہی دیر بعد اس کے دروازے پر تھے۔

دروازہ حسب توقع شگفتہ نے کھولا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی' مجھے یوں لگا جیسے وہ کھل اٹھی ہو۔ اسی لمحے جانے مجھے کیا خیال آیا اور کیسے میں نے اتنی جرات کر لی کہ اسے زبان چڑا دی۔ ایسا کرتے ہوئے میں شرف الدین کے پیچھے ہو گیا تھا تاکہ وہ نہ دیکھ سکے۔ اس کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ شرف الدین مجھے بیٹھک میں بٹھا کر خود اندر چلا گیا۔ شگفتہ بھی اندر جا چکی تھی۔ چند لمحے بعد وہ آئی تو چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ٹرے تپائی پر رکھی اور تپائی میرے قریب لے آئی۔

"اتنی جلدی آپ نے چائے بنا لی!" میں نے پوچھا۔

"بھیا جی کہہ کر گئے تھے کہ وہ سات بجے تک آ جائیں گے۔ میں نے پہلے ہی چائے دم پر رکھ دی تھی۔ میں۔ میں بہت پریشان تھی۔ بھیا جی نے کچھ تھوڑا بہت بتایا تھا۔ آپ تنہا حویلی میں کیسے رہ جاتے ہیں۔ وہاں آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔"

"نہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا' اگر پہنچنا ہوتا تو اب تک پہنچ چکا ہوتا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں اور پیالیوں میں چائے بنانے لگی۔ "آپ مراد آباد کب جا رہی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہمیں تو تین روز پہلے چلے جانا تھا۔ آج اگست کی ۴ تاریخ ہے اور ۱۸ اگست کو چنے چچا کی بیٹی کا نکاح ہے۔ اب دیکھیے بھیا جی کہہ رہے ہیں کہ کل چلے چلیں گے' ابا بھی بہت ناراض تھے۔"

"کیا ابا اور اماں نہیں جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک روز پہلے جا پائیں گے کیونکہ یہاں شاہ ولایت کا عرس ہے اور اس کا تمام انتظام بھی ابا ہی کو کرنا ہے اس لیے۔"

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" میں بول اٹھا۔ شاہ

ولایت کا مزار امروہہ میں بے پناہ شہرت رکھتا تھا۔ یہاں کے بچھو بھی بہت مشہور ہیں' یہ بڑے بڑے خوفناک صورتوں کے بچھو اس مزار کے احاطے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے' لوگ انھیں ہاتھ پر اٹھا لیا کرتے تھے لیکن انھیں لے کر اگر کوئی احاطے سے باہر آجائے تو ڈنک مار دیتے تھے۔ اس مزار کا کام انتظام سادات امروہہ کے ذمے تھا اور اب بھی انھی کے ذمے ہے۔ میرے باپ دادا بھی شاہ ولایت کو بہت مانتے تھے' ان کے عرس کے انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اسی حساب سے مجھے بھی اس طرف دھیان دینا چاہیے تھا مگر میں تو خود اتنے عذابوں میں گھر چکا تھا کہ ہر بات ذہن سے نکل گئی تھی۔

"آپ تو یہاں ہوں گے نا۔ چلے جائیے گا۔" اس نے پیالی میری طرف بڑھائی۔

"کیوں۔ کیا میں آپ لوگوں کے ساتھ مراد آباد نہیں جا سکتا؟" میں نے جھک کر پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"آں۔" وہ چونک اٹھی۔ "کیا آپ کا ارادہ مراد آباد جانے کا ہے؟" اس کے لہجے میں پر مسرت حیرت تھی۔

"جی! میں اماں کی طرف سے پریشان ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ میری طرف سے پریشان ہوں گی۔ میں بھی آپ کے ساتھ کل مراد آباد چل رہا ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو!"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارا سفر اچھا گزرے گا؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا جی! وقار الحسن صاحب بھی مراد آباد جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" شگفتہ نے اسے آتے دیکھا تو چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہہ تو رہے تھے مگر ذرا سوچ سمجھ کر۔ یہ تو روحوں کے جلو میں جائیں گے' میں تو خیر زیادہ لفٹ نہیں کراتا روحوں کو اس لیے مسئلہ نہیں ہے مگر تم۔ تمھیں سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے۔"

"اللہ بھیا جی! آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں! کیا آپ کو اب تک یقین نہیں آیا' اب تو اس کی ملاقات آپ سے بھی ہو چکی ہے۔"

میں چونک اٹھا۔ شرف الدین کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ "ملاقات ہو چکی ہے؟" میں بڑبڑایا۔ "شرف الدین!"

"ہاں وقار الحسن! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ گو میں اب بھی کسی منطق کی تلاش میں ہوں مگر۔ رات میں نے بھی بالکل اسی طرح دیکھا تھا جیسے تم چتا کے پاس اسے روتا دیکھ چکے ہو۔" اس کا لہجہ د[illegible] نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "رات جب لڈن تمھیں کم[illegible] تلاش کر رہا تھا اس وقت میں سیدھا بڑے برآ[illegible] طرف گیا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یقین تھا کہ تم [illegible] طرف ملو گے۔ میں نے تمھیں وہیں دیکھ لیا مگر۔" جھجک کر خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا؟" میں بے چینی سے پہلو بدل کر بولا پورے انہماک سے قریب بیٹھی سن رہی تھی۔ چہرے پر خوف مگر آنکھوں میں تجسس تھا۔

"مگر عجیب و غریب حالت میں۔ میں نے بیڑ[illegible] ایک عورت کا سایہ سا بیٹھا دیکھا۔ وہ گھٹنوں پر سر [illegible] رہی تھی۔ اس کی سسکیاں پوری حویلی میں [illegible] تھیں۔ برگد کے نیچے چتا رکھی ہوئی تھی اور تم۔ پر لیٹے ہوئے تھے۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اس کی زبا[ن] سنتے ہی میری پیشانی پر پسینا پھوٹ نکلا۔ خوف سے [illegible] میں دھڑکنے لگا۔

"تم۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کوئی۔ فلمی [illegible] رہے ہو شرف الدین۔ ایسا۔ خوفناک مذاق۔" م[illegible] میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"آج میں سچ بول رہا ہوں تو تم یقین کرنے کو [illegible] ہو۔" اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ "کل [illegible] تمھاری باتوں کو خرافات اور فلمی اسٹوری سمجھ[illegible] کل رات کا واقعہ میں نے خود دیکھا اور محسوس [illegible] جانتے ہو میں نے خود۔ اپنے ان ہاتھوں سے تمھیں [illegible] سے اتارا اور اماں کے کمرے میں لا کر لٹایا تھا او[ر] تمھیں وہاں چھوڑ کر واپس گیا تو۔ تو وہاں کچھ نہیں [illegible] وہ چتا' نہ عورت کا سایہ اور نہ ہی حویلی میں [illegible] سسکیاں۔ حویلی میں سناٹا تھا۔ بہت گہرا سناٹا اور [illegible] دور سے گھڑی کی ٹک ٹک کی تیز آواز اماں کے کم[رے تک] پہنچ رہی تھی۔"

وہ یہ سب کچھ بتا رہا تھا اور میری ایسی کیفیت [illegible] جیسے میں پہلی بار کسی سے ایسے واقعات سن رہا ہو[ں] [illegible] نے۔ اس نے مجھے چتا پر کیوں لٹایا تھا اور میں سیڑھیوں سے گرا تھا۔" میں ہونقوں کی طرح پوچھ

"آپ لوگ کیوں گئے تھے وہاں پر!" شگفتہ وحشت ناک [آو]از میں چیخ پڑی۔ وہ مارے خوف کے پیلی ہو رہی تھی۔

"شگی۔ پلیز۔ آہستہ بولو ورنہ ابا۔" شرف الدین نے [اس]کے ہاتھ تھام لیے۔

وہ ایک دم گھٹنوں میں منہ دے کر رو دی۔ "اگر۔ اگر [آ]پ دونوں کو کچھ ہو جاتا تو۔ تو ہم کیا کرتے؟" اس نے [رو]تے ہوئے شرف الدین کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

"شگفتہ! وقار الحسن ٹھیک کہتا ہے۔ وہ ہمیں کوئی نقصان [نہیں] پہنچانا چاہتی۔ کوئی ایسا مقصد پورا کرانا چاہتی ہے جسے [پورا] کرنے پر قادر نہیں ہے۔ تم ڈرو نہیں' بہت سے ایسے [واقع]ات ہو چکے ہیں جو ہم نے تمھیں نہیں بتائے لیکن اگر [ڈ]رو گی تو میں تمھیں کبھی راز دار نہیں بناؤں گا۔ میں اب [تک و]قار الحسن کی باتوں کو خرافات سمجھتا رہا اور ڈرتا رہا [کہ] یہ خود ہی ایسی الٹی سیدھی باتیں کر کے خود کو نقصان [پہنچا]ئے گا مگر۔ جو کچھ کل رات ہوا ہے اس نے میری سوچ [کا ا]نداز ہی بدل دیا ہے' حالانکہ میں کل بھی اسے [ہیو]ما-تھالوجی کے بارے میں بتا کر اس کا دھیان ہٹانے کی [کوش]ش کر رہا تھا لیکن دراصل میں نے رات ہی جب یہ [بے]ہوش تھا یا شاید سویا ہوا تھا' ہندوما-تھالوجی پر ایک [کتاب] کا مطالعہ کیا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ چکا تھا اس کے [بار]ے میں جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ عقائد جس کے بھی [ہوں] اور جس قوم سے بھی وابستہ ہوں" ان کی کوئی نہ کوئی [حقیقت ضرور] ہوتی ہے۔ یہ بھی میں نے اسی کتاب میں پڑھا تھا کہ [ایک] عام آدمی اگر لوہے کی کیلیں لگے تختے پر لیٹ جائے تو [زخمی] ہو کر جان دے دے مگر یہاں ایسے سادھو سنت بھی [ہیں] جو مہینوں اس تختے پر لیٹے رہتے ہیں جن میں زنگ آلود [کیلی]ں لگی ہوتی ہیں۔ کئی لوگ ہمالیہ پر برسوں ایک ٹانگ [پر] کھڑے رہتے ہیں یا اونچے درخت کی کسی کمزور سی شاخ [سے] لٹکے رہتے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر کھال منڈھ جاتی ہے [مگر] سانس کی ڈور نہیں ٹوٹتی۔ ان کی مخفی قوتیں ابھر کر [سام]نے آجاتی ہیں۔ ہزاروں عجیب و غریب واقعات جنم لیتے [ہیں] پھر یہ روح کے انتقام کی کہانی تو ویسے بھی بہت عام [ہے] ایسا کہیں نہ کہیں' کبھی نہ کبھی ہوا ہو گا۔ ہو رہا ہو گا یا [ہونے] والا ہو گا جبھی تو کہانیاں بنیں۔ انسان وہی کچھ لکھتا [او]ر محسوس کرتا ہے جو اپنے تصور میں لا سکتا ہے اور [تصور] میں وہی چیز آتی ہے جس کا کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی [شکل] میں وجود ہو۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا تو گہرا سناٹا سا

پھیل گیا۔ میں اس کے سحر انگیز لہجے' اس کی مستند معلومات اور فصاحت و بلاغت کا تو پہلے ہی سے قائل تھا مگر اب تک وہ میری تردید میں بولتا رہا تھا' میری مخالفت کرتا رہا تھا تو مجھے لگتا تھا جیسے میں دنیا کا بے وقوف ترین آدمی ہوں جو ان خرافات میں پڑا ہوں مگر اب جب وہ میری موافقت میں بول رہا تھا تو لگ رہا تھا جیسے بڑے بڑے منکر کو بھی راہ پر لے آئے گا۔ مجھے وہ سب کچھ سو فی صد حقیقت لگنے لگا جسے شاید کبھی میں نے محض وہم' کوئی شعبدہ یا اپنی نفسیات کا کارنامہ سمجھا ہو گا۔

شرف الدین کی سوچ بدلنے کی جتنی خوشی مجھے تھی' میں بیان نہیں کر سکتا۔ اب مجھے سب کچھ بے پناہ سہل لگ رہا تھا۔ شگفتہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی۔ اب اس کے چہرے پر خوف کم اور تجسس زیادہ تھا۔ "وہ سایہ عورت کا تھا بھیا جی! کیسی تھی وہ؟"

"ہاں یہ بھی عجیب بات ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "وقار الحسن! تمھیں اس کے نقوش یاد ہیں' یعنی شکنتلا کیسی شکل کی ہے' کچھ یاد ہے تمھیں' تم نے اسے کئی مرتبہ دیکھا ہے نا!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔ آں۔ اس کا چہرہ گول ہے' سنہرا رنگ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے کی سب سے جاذب چیزیں ہیں۔ اس کے بال گہرے سیاہ' گھنے لمبے اور ہلکے سے گھنگھریالے ہیں اور۔ اس کے چہرے پر دائیں رخسار پر ہونٹوں سے کچھ اوپر سیاہ تل ہے۔" میں نے اس کا خاکہ ذہن میں لاتے ہوئے تفصیل سے بتایا۔

"ہاں۔ ہاں بالکل یہی۔ یہی تھی۔ یہی نقش' یہی رنگ اور۔ سنو!" وہ چونک کر بولا۔ "کیا تم نے اسے روشنی میں دیکھا تھا! اتنی تیز روشنی میں کہ اس کے رخسار کا تل بھی نظر آگیا؟"

تب میں اچھل پڑا۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے دور سے ایک سایے کی طرح دیکھا تھا۔ ابا کے کمرے کی کھڑکی سے جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس کا فاصلہ کم سے کم پچیس قدم ہو گا' اور وہ باہر اندھیرے میں تھی جبکہ میں' پھوپی اور بہنیں سب ابا کے کمرے میں تھے اور کمرا روشن تھا۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہوں گے کہ اگر کمرے میں روشنی ہو تو باہر اندھیرے میں کھڑا آدمی بھی ہمیں نظر نہیں آتا بلکہ اس کا ہیولا بھی بڑی مشکل سے دکھائی دیتا ہے اور دوسری بار جب اس نے سوتے سے مجھے

جگایا تھا۔ اس وقت بھی وہ اندھیرے میں تھی۔ مجھ سے آگے چل رہی تھی۔ اس روز گہرے اندھیرے کے علاوہ میں گہری نیند اور مدہوشی کی سی کیفیت میں بھی تھا۔ تیسری بار ابا کی برسی کے بعد گنگوا کے دفنائے جانے کے بعد جب میں نے اسے بڑے برآمدے کے اس طرف چتا کے قریب روتے دیکھا تھا تب بھی وہ سایے کی طرح نظر آئی تھی اور اس روز تو وہ گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے اس کے نقش بھلا کیسے نظر آ سکتے تھے' اس کا رنگ' آنکھیں حتیٰ کہ رخسار کا تل۔ میں حیرت سے شرف الدین کو تک رہا تھا۔

"ہاں وقارالحسن! میں نے بھی اسے اندھیرے میں دیکھا تھا اور وہ سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی مگر اب۔ جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو وہ اپنے قد' کاٹھ' رنگ اور واضح نقوش کے ساتھ میرے ذہن میں آجاتی ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے اس نے میری سوچ جان لی ہو۔ "میرا خیال تھا کہ میرے ذہن میں کسی ایسی عورت کا تصور چھا گیا ہے جسے میں نے کہیں دیکھا ہوگا اور وہ میرے ذہن میں کہیں رہ گئی ہوگی اس لیے میں نے تم سے پوچھا تھا۔ یہ سوچ کہ شاید میں ٹھیک سوچ رہا ہوں مگر جو حلیہ تم نے بتایا ہے وہ میرے ذہن میں آجانے والی شکنتلا ہی کا حلیہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کی سوچوں میں زمین آسمان کا فرق ہے' اس میں عمر' مطالعے اور تجربے کا بھی بڑا حصہ ہے۔ تمھارے نزدیک حسین ہونے کا تصور یقیناً اپنی عمر اور تجربے کے مطابق ہوگا اس لیے یہاں بات سو فی صد حقیقت لگتی ہے۔ تل برابر بھی فرق نہیں ہے۔

وہ رکا' اس نے شگفتہ سے پانی لانے کو کہا۔

"بھیا جی ابھی نہیں سنائیے گا۔ میں پانی لے آؤں پھر بتائیے گا۔" شگفتہ نے ٹھنک کر کہا اور بچوں کی طرح بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ وہ بہت جلدی پانی لے آئی پانی گلاس میں سے چھلک رہا تھا۔ میں اس کی کیفیت دیکھ کر ہنس پڑا۔ وہ خجل ہو گئی۔

"بتائیے۔ اب بتائیے نا!" وہ پھر وہیں بچھی چاندنی پر شرف الدین کے بالکل سامنے سر اٹھا کر بیٹھ گئی۔

"کیا بتاؤں' بات صرف اور صرف اتنی ہے کہ جن باتوں کو میں محض وقارالحسن کے دماغ کا فتور سمجھتا تھا اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔" پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ "میں نے اپنے دوست عارف صدیقی سے پہلے اپنا معائنہ کرایا تھا۔ وہ آج صبح آچکا ہے۔ اس نے میرا مکمل چیک اپ کر کے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل صحت مند قرار دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی رپورٹ تمھارے بارے میں بھی بالکل یہی ہوگی۔"

میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت بیرونی دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوئی۔ شرف الدین اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دروازے پر کوئی تھا کیونکہ شرف الدین کی اور آنے والے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے شرف الدین تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"کیا ہوا؟" میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ۔ لڈن تھا۔ رمضو بابا کو کسی نے قتل کر دیا۔"

"کیا۔؟ میں چیخ پڑا۔ "قتل انھیں؟ مگر کیوں کس نے۔؟"

میں بھی اس کے پیچھے تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر آگیا۔ مجھے حیرت تھی کہ بھلا رمضو بابا جیسے ضعیف' اور بیمار شخص سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے' اس غریب کے پاس بھلا کیا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ لڈن باہر ہمارا منتظر تھا۔ ہم تینوں تقریباً دوڑتے ہوئے لڈن کے گھر تک پہنچے۔ گھر کے سامنے ایک مجمع موجود تھا۔ پولیس بھی آئی ہوئی تھی۔ لڈن کے رشتے دار بین کر رہے تھے۔ لڈن کی بوڑھی ماں پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ یوں تو رمضو بابا ویسے ہی قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے تھے' دوسرے پل کی خبر نہ تھی' یوں مر جاتے تو سب کو صبر آجاتا کہ عمر پوری ہو گئی اور خدا نے اٹھا لیا اس عمر میں' اتنے بیمار آدمی کا گلا کٹا دیکھ کر تو لڈن کی ماں کو کیا دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی غش آگیا تھا۔ میں اور شرف الدین بڑی مشکل سے رمضو بابا تک پہنچ سکے۔ شرف الدین ہی نے پولیس انسپکٹر کو سمجھا بجھا کر اس وقت بیان لینے سے باز رکھا کیونکہ نہ لڈن ہوش میں تھا اور نہ اس کی ماں۔ گھر میں ان دو نفوس کے سوا تیسرا کوئی تھا بھی نہیں اور وہ ان دونوں سے بیان لینے پر مصر تھے۔ انسپکٹر بھلا آدمی تھا۔ شرف الدین کے سمجھانے کے بعد اس نے ضروری کارروائی مکمل کی' اور بعد میں آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اور شرف الدین رمضو بابا کو دیکھ پائے ورنہ تو ان پر چادر ڈالی ہوئی تھی۔ شرف الدین نے جونہی ان کے چہرے سے چادر اٹھائی' مجھے ابکائی آنے لگی۔ ان کی گردن جسم سے الگ تھی صرف گدی کا پچھلا حصہ کٹنے سے رہ گیا تھا۔ ان کا چہرہ بہت ہیبت ناک ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر رہ گئی تھیں۔ مجھے ان کی کھلی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ خوف بھرا محسوس ہوا۔ ان کا لاغر اور خفیف بدن تڑا مڑا سا پڑا تھا۔ شرف الدین پھر ان کے جسم پر چادر ڈالنے لگا اسی لمحے میری نگاہ رمضو بابا کے اس ہاتھ پر پڑی جو مڑا ہوا ان کے کان کے پاس تک آگیا تھا۔ ان کی مٹھی بند تھی۔ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان سے سنہری سی کوئی چیز نظر آرہی تھی۔ میں نے شرف الدین کو کہنی ماری اور اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ "شرف الدین! رمضو بابا کے ہاتھ میں کچھ ہے۔"

شرف الدین نے پہلے چونک کر مجھے دیکھا پھر گردن موڑ کر رمضو بابا کے ہاتھ کو دیکھا۔ شاید اسے بھی وہ چیز نظر آگئی تھی۔ ہمارے پیچھے لڈن' اور دوسرے کچھ مرد اور عورتیں موجود تھے جو اچک اچک کر رمضو بابا کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"چلیں آپ سب باہر چلیں۔" شرف الدین نے فوراً چادر ڈال کر لوگوں سے کہا۔

کمرے میں تیز بھنبھناہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی رو رہا تھا' کوئی تبصرہ کر رہا تھا۔ کسی کی ناک سے شوں شوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ یہ سب باہر جانے کو تیار نہ تھے۔ شرف الدین نے ایک بار پھر زور سے کہا کہ سب باہر چلیں مگر اس بار بھی کسی پر اثر نہ ہوا تب شرف الدین نے لڈن سے کہا کہ ان سب کو کمرے سے باہر نکالے اور جا کر غسل کا انتظام کرے۔ کافی دیر بعد کمرا خالی ہو گیا۔ شرف الدین نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور تیزی سے رمضو بابا کی طرف پلٹا اس نے ان کی بند مٹھی کھولنے کی بہت کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ ہاتھ میں دبی سنہری چیز نکالنے میں کامیاب ہوا۔ وہ سونے کا جھالا تھا۔ میں نے اور شرف الدین نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جھالا کافی بھاری اور قیمتی تھا۔ رمضو بابا غریب آدمی تھے' ان کی بیوی کے پاس تو سونے کا ایک چھلا بھی نہیں تھا پھر مرتے وقت میں ان کے ہاتھ میں اس قیمتی جھالے کی موجودگی ہمارے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ باہر دروازے پر آنے والوں کا شور تھا۔ میں اور شرف الدین باہر آگئے۔ جھالا شرف الدین نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میری ہی طرح اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ہم باہر آکر گلی میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ لوگ آتے رہے اور جاتے رہے۔ رمضو بابا کو غسل دیا گیا۔ ان کی میت تیار ہو گئی اور ہم یونہی بیٹھے اپنی اپنی جگہ کچھ سوچتے رہے۔ میرے ذہن میں جانے کیوں بار بار ایک ہی خیال آرہا تھا کہ رمضو بابا کا قتل کرنے والی کوئی عورت ہے۔ کون' یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

کافی رات ہو گئی تھی۔ شاید رات کے گیارہ بجے ہوں گے جب انھیں قبرستان لے جایا گیا۔ ہم انھیں دفنا کر سیدھے شرف الدین کے گھر آئے' وہاں باہر ہی میں عارف صدیقی مل گئے جو کئی گھنٹوں سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شگفتہ بھی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی کھانا نکال دیا۔ ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ پھر شرف الدین نے شگفتہ سے کہا کہ وہ کل شام تک اپنا سامان تیار کر لے۔ ہم کل شام والی ٹرین سے مراد آباد روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ اندر جا کر اماں اور ابا کو بھی بتا آیا اور ان سے کہا کہ ہم عارف صدیقی کے بھائی کے گھر جا رہے ہیں۔ وہ وعدہ کر آیا تھا کہ دوپہر سے پہلے ہم واپس آجائیں گے اور کل ہی شام مراد آباد کے لیے روانہ بھی ہو جائیں گے۔ راستے میں' میں نے شرف الدین سے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ کوئی عورت تھی۔"

"اس جھالے کی وجہ سے۔"

"وہ جھالا رمضو بابا کا بھی ہو سکتا ہے' خواہ وہ کہیں سے بھی آیا ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ معذور تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے گھر میں اتنی قیمتی چیز کی موجودگی ممکن ہی نہیں ہے۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"ساری باتیں بے وقوفی کی ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پولیس رپورٹ کے مطابق انھیں آدھی رات کو قتل کیا گیا ہے۔ اتنی رات گئے کسی عورت کا وہاں آنا' قتل کرنا' ممکن ہی نہیں جب کہ جھالا بقول تمھارے' بلکہ واقعی قیمتی ہے' گویا عورت امیر بھی تھی۔ یہ جس ڈیزائن کا جھالا ہے میرا خیال ہے نواب گھرانوں کی خواتین ہی اس ڈیزائن کا زیور استعمال کرتی ہیں اور ایک بات اور سن لو کہ وہ عورت مسلمان ہے جس کا یہ جھالا ہے کیونکہ ہندو عورتیں اس طرح کا زیور نہیں پہنتیں۔"

"بات صحیح ہے' میری سمجھ میں تو یہی نہیں آ رہا کہ کوئی بھی ر مفو بابا کو کیوں قتل کرے گا' عورت ہو یا مرد۔"

"یہ تم رکھ لو۔" اس نے جیب سے جھالا نکال کر دیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی اسی طرح کا تھا جیسے ہمارے خاندان کی عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ کافی بھاری بھی تھا۔ میں نے اسے اپنی واسکوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

"اسے اگر پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ قاتل کا پتا چلا لے گی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اب تم جاسوس بننے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے اسے بغیر اس جھالے کے کام کرنے دو بعد میں دیکھیں گے۔"

عارف صدیقی خاموشی سے ہمارے ساتھ تھا۔ اس سے قبل ہی شرف الدین اس سے میرا تعارف کرا چکا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ' سلجھا ہوا اور ذہین آدمی لگا تھا۔ میں اس کی بھرپور شخصیت سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ہونٹوں پر دھیمی مگر گہری مسکراہٹ سامنے والے کو پہلی ہی ملاقات میں اس کا گرویدہ بنا سکتی تھی۔ اسے واقعی نفسیاتی ڈاکٹر ہی ہونا چاہیے تھا۔

ہم تمام راستے خاموش رہے۔ اب شاید رات کے بارہ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ عارف صدیقی کی چوڑی کلائی پر چمک دار ریسٹ واچ بندھی تھی مگر میں اس سے وقت پوچھ کر اپنی کم مائیگی کے احساس کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا۔ ہم پندرہ بیس منٹ بعد ہی حویلی پہنچ گئے۔ گیٹ باہر سے بھی بند تھا اور میں کنڈا گھما کر اندر سے بھی بند کر گیا تھا۔ میں نے چابی نکال کر تالا کھولا۔ چھوٹا گیٹ کھولتے ہی میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ میں کسی غیر معمولی بات کا اندازہ لگانا چاہتا تھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ابھی ہم اندر داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک لڑکے نے ہمیں پیچھے سے آواز دی۔ وہ گلی میں ایک دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ میں ٹھٹک گیا۔

"پان والے بابا آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"مجھے؟" شرف الدین نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نئی جی۔ انھیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"جاؤ اور دو پان بھی لیتے آنا' الائچی خوشبو والے۔" شرف الدین نے کہا اور عارف کو لے کر حویلی میں داخل ہو گیا۔

میں پان والے بابا کے پاس پہنچا تو وہ اونگ ر

"بابا!" میں نے آواز دی۔ وہ چونک اٹھے۔

"ارے ہاں چھوٹے مرزا۔ یہ۔ یہ لفافہ وہ خا گئی تھیں۔" انھوں نے ایک اخبار کے کاغذ کا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے حیرت سے اس تھیلے دیکھا۔ ہاتھ بھر کا تھیلا تھا۔ میں نے تھیلا ان سے اسے کھولا اور اندر جھانکا۔ اندر ایک چھوٹی ڈ تھی۔

"کون خاتون تھیں وہ؟" میں نے پوچھا۔ "اور کب آئی تھیں؟"

"آپ کے جاتے ہی آئی تھیں۔ میں نے کہہ د شرف الدین میاں کے ساتھ گئے ہیں' وہ وہیں دیکھ کہنے لگیں کہ میں شہر سے باہر جا رہی ہوں۔ وقت نہ اس لیے میں ہی یہ آپ تک پہنچا دوں۔"

"نام کیا بتایا تھا انھوں نے؟"

"عصمت جہاں۔ اور ہاں آپ کی اماں کو بھی بہ کہا تھا انھوں نے۔"

"سیاہ برقعہ پہنے تھیں اور چہرے پر نقاب تھا' د ہدایت کا وقت تھا حلیہ کیا خاک نظر آتا! ارے یا تانگے والے سے پوچھ لو کہ کہاں سے آئی تھیں یا کہ تمیں' وہی لایا تھا انھیں۔" اتنا کہہ کر بابا نے جما

"صرف تمھارے انتظار میں جاگ رہا تھا' سفر تو۔ کہ کے ابا کو کسی نے قتل کر دیا؟"

"جی!" میں نے مختصراً کہا۔

"ہوا کیا تھا! کسی نے مارا کچھ پتا بھی چلا۔" بڑے اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئے اور مجھے سخت بے چینی تھی کہ لفافے میں موجود ڈبیا کھولوں۔ منوا تانگے والے سے ان خ کے بارے میں پتا کروں اور سارا قصہ شرف الدین کو سناؤں' مجھے اب تک یاد نہیں آیا تھا کہ عصمت جہاں ہیں اور انھیں میری تلاش کیوں ہے' وہ آج ہی سری آئی تھیں پھر بھی میرا انتظار نہ کیا' اگر چاہتیں تو شرف الدین کے گھر تک پہنچ سکتی تھیں۔ موہبہ تھا ہی کتنا بڑا پھر تمام ہی لوگ سبھی کو جانتے تھے پھر منوا تو خیر ہر ایک حسب و نسب سے واقف تھا۔ اسے اشارہ بھی کر دیتیں سید حا دروازے پر پہنچا دیتا۔

"ارے بھیا بتایا نہیں تم نے؟" انھوں نے مجھے

"بابا یہ سب تو مجھے نہیں پتا اور اب اجازت دیجیے۔ رے ساتھ مہمان ہیں کہیں گے کہ خود باہر گیا تو لوٹا ہی ں۔ ان کے رہنے کا بندوبست کرنا ہے۔" میں نے ذرت کی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتے میں ن بنوائے بغیر تیز قدموں سے حویلی کی طرف چل پڑا۔ میں نتا تھا کہ اب اگر پان بنانے کو کہا تو اتنی دیر میں بنیں گے یں لندن کے ابا ہی کے قتل کی نہیں بلکہ ملک میں ہونے لے ہر جرم کی داستان سنا چکا ہوں گا۔

وہ پیچھے بڑبڑاتے رہ گئے مگر میں نے پروانہ کی' میرا میان ان خاتون کی طرف تھا۔ نہ معلوم انھیں مجھ سے یا کون سا ضروری کام تھا۔ کچھ اتا پتا بھی تو نہیں بتایا تھا ھوں نے کہ میں ان تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ انھی وچوں میں غرق میں حویلی میں پہنچ گیا۔ شرف الدین اور رف گفتگو میں منہمک تھے' مجھے دیکھتے ہی چپ ہو گئے اور رف الدین بولا۔ "تم پانوں کے کھیت میں نکل گئے تھے یا؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا' مسہری پر بیٹھ کر میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں سے مخملی ڈبیا نکالی اور جونہی اس ڈبیا کھولا' میں ہی نہیں خود شرف الدین بھی یوں اچھلا جیسے سے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ سونے کا وہی جھالا تھا جسے ں راستے میں اپنی جیب میں رکھ چکا تھا۔ میں نے بے ختیار ہاتھ جیب میں ڈالا اور پھر میرا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ی جھالا موجود تھا۔ گویا پان والے بابا سے جو جھالا ملا تھا وہ سرے کان کا تھا۔ میں نے دونوں جھالے لے کر دیکھا' یہ الوں کی جوڑی تھی۔ میں ہکا بکا دیکھتا چلا گیا۔

"کہاں سے ملا یہ؟ شرف الدین نے دونوں جھالے برے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے تمام کہانی سنا دی۔ یہاں سے جاتے ہوئے وہ بھی سن چکا تھا کہ کوئی خاتون مجھے پوچھتی ہوئی آئی تھیں۔ "کون ہیں یہ عصمت جہاں؟" اس نے سرسراتی واز میں پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھتے وئے کہا۔

"یہ کوئی بھی ہیں وقار الحسن' ان کا اس قتل سے گہرا تعلق ہے اور۔ اور یہ جھالا انھوں نے تمھیں کیوں بھیجا ہے۔ انھیں کیسے پتا چلا کہ ایک کان کا جھالا انھوں نے تمھیں کیوں بھیجا ہے۔ انھیں کیسے پتا چلا کہ ایک کان کا

جھالا ہمارے پاس ہے۔"

"میں کیاں جانوں یار!۔ میں اس وقت سے تمھارے سامنے ہوں۔" پھر میں عارف صدیقی کی طرف متوجہ ہوا۔

"معاف کیجیے گا عارف صاحب! مسائل نے مجھے اس بری طرح گھیرا ہوا ہے کہ آدب دوستی اور آدب مہمان نوازی تک بھول گیا۔" میں نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں پلیز۔ پلیز آپ یہ بار ذہن پر نہ ڈالیں۔ مجھے اپنے گھر کا ایک فرد تصور کریں۔ مجھے شرف الدین تمام کچھ بتا چکا ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں آپ کو ہلکا پھلکا اور فریش دیکھنا چاہتا ہوں۔ پلیز۔ اس نے اتنے محبت اور اپنائیت بھرے لہجے میں بات کی کہ واقعی میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

"بہت شکریہ عارف صاحب! میں نے کچھ اور کہنا چاہا مگر شرف الدین پر نگاہ پڑتے ہی چونک اٹھا۔ وہ دونوں جھالوں کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر پھیلائے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اچانک چونک اٹھا۔

"منو کا گھر دیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں وہ محلہ قریشی میں رہتا ہے مگر اتنی رات گئے۔"

"تم رات سے خوف زدہ ہو یا محلہ قریشی سے!" وہ جھنجلا گیا۔

"اوہ' میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت اسے محض یہ معلوم کرنے کے لیے اٹھانا کہ وہ کون خاتون تھیں' مناسب ہو گا؟"

"ہاں۔ اگر وہ خاتون کسی انسان کی قاتل رہی ہوں تو کسی کو بھی' کسی بھی وقت اٹھا کر پوچھا جا سکتا ہے۔" وہ غصے میں بھپر گیا۔

"شرف الدین!" عارف صدیقی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم جذباتی ہو رہے ہو۔ پہلے طے کرو کہ تمھیں کیا کرنا ہے پھر قدم اٹھاؤ۔" اس کی بات سن کر شرف الدین نرم ہو گیا۔

"اس قتل کی تحقیقات تمھارے ذمے کم از کم قانونی طور پر نہیں ہیں' ہاں اخلاقی طور پر جو ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے اس کے لیے تم کام کر سکتے ہو مگر اس میں تم کسی اور کے ساتھ بد اخلاقی کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ اتنی رات گئے تانگے والے کو اٹھانا اس کے ساتھ بد اخلاقی ہو گی۔"

عارف بڑی خوب صورتی سے اسے سمجھا گیا۔

"یہ عصمت جہاں کون ہیں! اور تمہیں کیوں تلاش کر رہی ہیں۔ اس جھالے کا تم تک پہنچانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" شرف الدین جیسے سوچوں کے بھنور میں چکر کھا رہا تھا۔ اس نے اتنے بہت سے سوال کر ڈالے۔

"میں خود بھی اس سلسلے میں کافی پریشان ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ خاتون کون ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ مطلوب چچا کے گھر جا کر معلوم کروں گا مگر وقت ہی نہیں ملتا۔"

"کل ہمارے پاس وقت نہیں ہے، لیکن خیر! ہم اس معاملے کو مراد آباد سے واپس آ کر دیکھ لیں گے۔ تم فی الوقت یہ دونوں جھالے اپنے پاس رکھو لیکن یہاں حویلی میں مت چھوڑنا بلکہ اپنے ساتھ مراد آباد لے چلنا۔ یہاں محفوظ نہیں ہوں گے۔"

یوں کہنے کو تو اس نے بات ختم کر دی مگر میرے ذہن میں جیسے مکڑی نے جالے سے بن دیے تھے۔ یہ بات میرے لیے کم دہشت انگیز نہیں تھی کہ جس بندے کو رات قتل ہونے والے کی بند مٹھی سے نکلا تھا اس کا دوسرا بندہ کوئی خاتون میرے لیے دے گئی تھیں، کیوں۔۔۔ آخر میرا اس سے کیا تعلق تھا۔ وہ خاتون کون تھیں؟" یہ وہ سوال تھے جنھوں نے مجھے آندھیوں کی زد پر لا کھڑا کیا تھا مگر عارف صدیقی کی موجودگی نے مجھے اور شرف الدین کو الجھنوں کے اس عمیق سمندر سے بڑی جلدی نجات دلا دی۔ اس کا نرم لہجہ، خوب صورت انداز اور ہلکی پھلکی باتوں نے ہمیں سب کچھ بھلا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنے اسی پرانے موضوع پر آ گئے۔ عارف کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں اس لیے کہ نفسیاتی الجھنوں یا مسائل کا شکار کئی پشتیں ایک ہی قسم کے مسائل کا شکار نہیں ہو سکتیں بلکہ حالات اور ارد گرد کے ماحول کے زیر اثر الجھنوں کی اقسام تبدیل ہو جاتی ہیں اور ان میں عرصے اور عمر سے متعلق بھی کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو تبدیلی کی بڑی وجہ بنتی ہیں مثلاً جو شکل و صورت مرزا صولت بیگ کو نظر آتی ہو گی یا ان کے زمانے میں کسی کو نظر آئی ہو گی، وہ مجھے من و عن ویسی ہی دکھائی نہیں دے سکتی اگر یہ محض نفسیاتی کجی کی وجہ سے پیدا کردہ کوئی تصوراتی چیز ہو۔ ماحول، زمانہ اور عمر کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے یہ تسلیم کر لیا کہ وہ خود بھی مافوق الفطرت چیزوں کا قائل ہے اور ایسے بہت سے واقعات سائنسی توجیہ کے بغیر بھی رونما ہوئے ہیں اور مسلم حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

مجھے اس کی باتوں سے بہت ڈھارس ہوئی۔ وہ با[تیں] میرے بجائے، شرف الدین کے لیے زیادہ ضروری تھی[ں]۔ ہر چیز کی لاجک کی کھوج میں رہتا تھا۔ اس کے بعد عا[رف] نے تفصیل سے مجھ سے واقعات پوچھے، بعض مرتبہ ایک واقعے کو وہ اچانک دوبارہ پوچھ لیتا تھا یا کسی اور واقعے [کے] دوران کسی ایک چیز کے بارے میں سوال بھی کر لیا کرتا [تھا]۔ اس تمام رات ہم جاگتے رہے۔ عارف پوچھتا رہا، میں [اور] شرف الدین اسے بتاتے رہے۔ شاید آدھے ہی گھنٹے بعد [ہم] رمضو بابا کے قتل، ان خاتون اور سونے کے ان جھالوں [کو] بھول چکے تھے۔ پوری رات بڑے سکون سے گزری، [کوئی] خوف زدہ کر دینے والا واقعہ نہ ہوا، نہ کسی قسم کی کوئی ایسی با[ت] ہوئی جو ہمیں ڈسٹرب کرتی۔ صبح ہو گئی، ہماری آنکھوں [میں] قطعی نیند نہ تھی۔ عارف کو دس بجے دہلی کے لیے روانہ [ہونا] تھا، ہم نے ہوٹل میں جا کر چائے پی۔ اسے رخصت کر[کے]

ہم شرف الدین کے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک شرف الدین محلہ قریشی کی طرف مڑ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ منوا مل جا[ئے] گا مگر میرا خیال غلط نکلا۔ وہ گھر کے آگے کھڑا گھوڑے تانگے میں جوت رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مسکرایا۔

"کیسے ہیں چھوٹے مرزا!"

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟"

"بس جی رہے ہیں، اللہ کا کرم ہے۔ آپ یہاں کہاں؟"

"ہم آپ کے پاس آئے تھے۔ کوئی خاتون ہماری حو[یلی] آئی تھیں، ہمیں پوچھتی ہوئی۔ آپ کے تانگے میں آ[ئی] تھیں۔"

"ہاں یاد آیا۔۔۔ آئی تو تھیں مگر جب آپ نہیں ملے [تو] پان والے بابا سے کچھ کہہ کر واپس لوٹ گئی تھیں۔" اس نے گھوڑے کے سامنے پانی کی بالٹی رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"انھی کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھیں! میرا مطلب ہے آپ کے تانگے میں کہاں سے بیٹھی تھیں۔ میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی اور مجھے آج مراد آباد جانا ہے۔ بڑی الجھن رہے گی اگر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سوچتا ہوں خود ہی ان کا پتا کر کے ان سے مل لوں۔"

میری بات سن کر منوا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں میں سوچ سی لہرا گئی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر دھیرے

سے بولا۔ "چھوٹے مرزا! ایک بات کہوں؟"

میرا دل دھڑک اٹھا۔ "ہاں کہیے۔"

"برا نہ مانیے گا۔ بات کچھ اچھی نہیں لگ رہی مگر چھپانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔" وہ کان کھجاتے ہوئے بولا۔

"آپ بے دھڑک کہیے ہم برا نہیں مانیں گے۔" مجھ سے پہلے شرف الدین نے کہا۔

"وہ مجھے کچھ یونہی سی لگی تھیں اس لیے کہ رات کا وقت تھا، میں قبرستان والی سڑک سے گھر لوٹ رہا تھا۔ قبرستان سے نکلی تھیں۔ پہلے تو اندھیرے میں مجھے پتا نہیں چلا کہ کون ہے مگر ایک دم جب وہ تانگے کے سامنے آ گئیں تو مجھے تانگا روکنا پڑا۔ میں نے انھیں قبرستان سے باہر آتے دیکھا تھا، انھیں کیا ایک ہیولے کو دیکھا تھا۔ خیال آیا کہ مجاور ہو گا مگر اب انھیں اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ انھوں نے تانگا رکتے ہی مجھے آپ کی حویلی چلنے کو کہا اور میرا جواب سنے بغیر تانگے میں بیٹھ گئیں۔ عجیب بات تھی، ان کے نزدیک آتے ہی گھوڑا بدکنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تھا اور پھر مجھے حیرت بھی ہوئی ان کے پاس سے عطر گلاب کی بے پناہ خوشبو آ رہی تھی۔ بری طرح عطر چھڑکا تھا انھوں نے خود پر۔۔۔ اور پھر میں یہ جانتا تھا کہ آپ کے گھر والے مراد آباد جا چکے ہیں، آپ تنہا ہیں اس لیے چھوٹے مرزا تھوڑی سی ناگواری محسوس ہوئی تھی ہمیں۔ پھر سوچا کہ بھئی اپنی اپنی زندگی ہے، بھلا ہماری کیا بساط کہ کسی نواب زادے کی زندگی میں دخل دیں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی بات کا رد عمل تلاش کر رہا تھا۔

"پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ وہ واپس بھی تو آپ ہی کے ساتھ گئی تھیں ناں!" شرف الدین نے بے چینی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ واپس بھی میرے ہی ساتھ گئی تھیں اور وہیں۔ اسی قبرستان کی اس سڑک پر، بالکل وہیں اتر گئی تھیں۔ جب وہ سڑک پر اتری تھیں تو۔۔۔ تو اچانک کافور کی اتنی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی کہ میں گھبرا گیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا، شاید وہ کرایہ دے رہی تھیں مگر چھوٹے مرزا ہمارا دل جانے کیوں اچانک پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ ان خاتون کی دلیری پر حیرت بھی ہوئی اور ڈر بھی لگا۔ ہم کرایہ چھوڑ کر آ گئے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی شرف الدین نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ "آؤ۔" پھر وہ رکا نہیں مجھے گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"ٹھہرو تو۔"

"ٹھہرنے کا وقت نہیں ہے۔ میری بات سنو! اماں نے تمھاری اماں نے بتایا تھا کہ مرزا صولت بیگ نے مالی کی بیٹی خزراں کے علاوہ نادر شاہ کی بیٹی عصمت جہاں کو بھی۔۔۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ میں اچھل پڑا۔ اب یاد آیا کہ عصمت جہاں کا نام سن کر میرے ذہن میں ایک عجیب سی چبھن کا احساس کیوں ہوا تھا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں مگر۔۔۔"

"کچھ بھی نہیں، بات صاف ہو گئی۔ یہ وہی عصمت جہاں تھیں اور وقار الحسن میری بات کو لکھ لو کہ ان کا تعلق رمضو بابا سے ضرور ہو گا۔ کسی نہ کسی طور کسی نہ کسی طرح وہ اس معاملے میں ملوث ضرور رہے ہوں گے، اسی لیے عصمت جہاں نے انھیں قتل کر دیا۔ لکھ لو سونی صدی بات ہے۔"

"مگر شرف الدین رمضو بابا بنیادی طور پر بہت شریف آدمی تھے۔"

"میں ان کی شرافت پر شک نہیں کر رہا مگر یہ بتاؤ کہ مرزا صولت بیگ کی بد معاشیوں کے خلاف آواز اٹھانا کسی کے بس کی بات تھی! خواہ وہ کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ انھی کے زمانے میں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ میں یہ نہیں جانتا کہ ان کے زمانے میں اس وقت جب عصمت جہاں والا واقعہ ہوا ہے وہ حویلی میں تھے یا نہیں۔"

"بہرحال کچھ بھی ہو۔ رمضو بابا کے قتل کا معمہ تو حل ہو ہی گیا۔ اور مزے کی بات یہ کہ سلسلہ کے بعد اب عصمت جہاں کا انتقام بھی شروع ہو چکا ہے ہوشیار رہنا وقار الحسن، وہ بھی تم سے رابطے کے لیے بے چین ہے۔" وہ پھر شوخ ہو گیا۔

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ ایسے خوف ناک حالات میں بھی شوخ ہو سکتا تھا۔ مجھے اس پر رشک آیا۔

"ویسے میرا خیال ہے کہ عصمت جہاں بیگم کے معاملے میں تصدیق کر لی جائے تو اچھا ہے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ قبرستان چلتے ہیں۔ عصمت بیگم نہ ملیں تو ان کی قبر تو مل ہی جائے گی۔"

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ادھر جاؤں۔ بغیر جانے

ہی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی عصمت جہاں تھیں مگر نہ معلوم کیوں میں شرف الدین سے یہ بات نہ کہہ سکا۔ ہم بازار کی طرف نکل آئے' وہاں سائیکل رکشا لے کر ہم قبرستان کو چل دیے۔ قبرستان کی دیوار شروع ہونے سے پہلے ہی پھول والے کی دکان تھی۔ شرف الدین نے سائیکل رکشا وہیں رکوا لیا۔ اتر کر کچھ پھول لیے اگر بتی لی اور ہم دونوں قبرستان کے اندر داخل ہو گئے۔ "تم دائیں اطراف کی قبریں دیکھو میں بائیں طرف نظر رکھتا ہوں۔" شرف الدین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

میں دائیں جانب کی قبروں پر نگاہ رکھے آگے بڑھتا رہا۔ ہم پچاس قدم ہی چلے ہوں گے کہ شرف الدین نے مجھے آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ میں جان گیا کہ وہ عصمت جہاں کی قبر دیکھ چکا ہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اس کی طرف چل دیا۔ حسب توقع وہاں عصمت جہاں کی قبر موجود تھی۔ مگر ایک غیر متوقع بات نے مجھے اور شرف الدین کو چونکا دیا' وہ تازہ گلابوں کا گلدستہ۔ یوں لگتا تھا جیسے گلاب کے یہ تازہ پھول آج اور ابھی کسی نے رکھے ہوں۔ پھول کی پتیوں پر پانی کے قطرے ابھی تک چمک رہے تھے۔ ہم دونوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ بات میرے لیے اچنبھے کا باعث یوں تھی کہ بہ قول اماں کے مالی کے خاندان کے سبھی لوگ یہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ اماں نے بتایا تھا کہ عصمت جہاں کی خودکشی کے بعد نادر شاہ ایک روز رات کے وقت چپکے سے یہ علاقہ چھوڑ گئے تھے' پھر ایسی صورت میں وہ کون تھا جس نے یہاں پھول رکھے تھے۔ میں یہ تمام باتیں سوچ رہا تھا اور شرف الدین' اگر بتی جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس نے چار اگر بتیاں جلا کر چاروں کناروں پر گاڑ دیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے پھول' اس گلدستے کے پاس رکھ دیے' پھر ہم نے فاتحہ پڑھی' اس دوران میں میری نگاہ قبر کے سرہانے لگے کتبے پر تھی جس پر عصمت جہاں کا نام سنہری حروف میں چمک رہا تھا۔ ولدیت نادر شاہ لکھی تھی گویا وہ غیر شادی شدہ تھیں۔ اس لمحے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مرزا صولت بیگ کی نفرت سوا ہو گئی' کیسا ظالم شخص تھا جس نے ایک جوان لڑکی کو موت کی کھائیوں میں اترنے پر مجبور کیا تھا۔

ہم فاتحہ پڑھ کر خاموشی سے اس راستے پر چلنے لگے جو باہر کی طرف جاتا تھا۔ میری طبیعت پر عجیب سا بوجھل پن تھا۔ شرف الدین بھی خاموش تھا۔ میں عصمت جہاں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اگر حویلی آنے والی یہی خاتون تھیں' یا ان کی روح تھی تو وہ جھالا میرے لیے کیوں دے گئی تھی۔ کیا وہ جان چکی تھی کہ ہم رمضو بابا کی مٹھی میں دبا جھالا حاصل کر چکے ہیں؟ اگر ایسا تھا بھی تو بھلا دوسرا جھالا دینے کی کیا تک تھی' ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ جھالا بھی ہمارے پاس سے غائب ہو جاتا۔ میں یہ سب سوچتا رہا مگر میں نے اس کا ذکر شرف الدین سے نہیں کیا۔ بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ہم شرف الدین کے گھر پہنچے تو صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ اس کے ابا غصے میں بپھرے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ ان کا رخ شرف الدین کی طرف تھا۔ "کیوں میاں! یہ گل چھرے کب تک اڑائے جائیں گے' کب تک آوارہ گردیاں ہوں گی!"

"جی وہ۔ عارف۔۔۔"

"خبردار جو کوئی بات منہ سے نکالی۔" پھر وہ اچانک میری طرف پلٹے۔ "میاں کافی شریف سمجھتا تھا میں تمھیں' امید ہی نہیں تھی کہ اظہار الحسن کا بیٹا کبھی آوارہ گرد بھی ہو سکتا ہے۔ تم اسی لیے رکے تھے یہاں!"

"نہیں خالو آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" میری ٹانگیں کانپ اٹھیں۔ مجھے پہلی بار کسی نے اس طرح ڈانٹا تھا۔ میں نے سنا تو تھا کہ شرف الدین کے ابا بہت غصہ ور آدمی ہیں مگر آج پہلی بار یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

"اچھا گویا اس میں بھی ہماری ہی سمجھ کا قصور ہے۔ آپ خود بڑے معقول ہیں' میاں ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ خود بھی ذمے داری کا احساس کرو اور دوسروں کو بھی کرنے دو۔" اتنا کہہ کر وہ پھر شرف الدین سے مخاطب ہوئے۔ "آج آپ مجھے امروہہ میں نظر نہ آئیں سمجھے! انشمن کا تیسرا خط آ چکا ہے۔ شگفتہ رو رو کر ہلکا ہو چکی ہے خاندان والے کیا سوچتے ہوں گے کہ شادی سر پر آ گئی اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں پہنچا۔ پہلی شادی ہے ان کے گھر کی۔ کچھ ادب آداب کی بھی سدھ بدھ ہے آپ کو؟"

"ابا میں آج شام کی ٹرین سے جا رہا ہوں۔ شگفتہ سے کہہ دیا تھا کہ تیار رہے۔"

"وہ کئی روز سے تیار ہے' آپ کو ہی فرصت نہیں آوارہ گردیوں سے۔" وہ دھاڑے۔

"ارے میں نے کہا ذرا بات تو سنیے!" اندر سے خالہ کی آواز ابھری۔

انھوں نے بھنا کر دروازے میں پڑی حق اٹھائی۔

"کیوں! طرف داری کرنا ہو گی آپ کو اپنے لاڈلے کی۔"

"ارے اتنے بڑے لڑکے کو اس کے دوست کے سامنے ڈانٹ رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کیجیے۔"

"وہ اتنا بڑا لڑکا اس دوست کے ساتھ آوارہ گردیاں کر رہا ہے۔ اسے تو کچھ خیال نہیں ہے۔"

خالہ اٹھ کر کمرے میں آ گئیں۔ میں نے جلدی سے انھیں سلام کیا۔ انھی کے پیچھے سہمی ہوئی شگفتہ بھی تھی۔

"وعلیکم سلام بیٹا! ذرا خیال نہ کرنا۔ ان کا غصہ ذرا سا تیز ہو[تا] ہے۔" وہ خجل سی ہو کر بولیں اور پھر میاں سے مخاطب ہوئیں۔ "اب آ تو گیا ہے اور آج مراد آباد جا بھی رہا ہے۔"

"پانچ دن میں آٹھویں بار سن رہا ہوں۔" وہ بڑبڑائے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ خالہ ان کے پیچھے ہی باہر چلی گئیں۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی پھر شرف الدین نے گہری سانس لی۔ "دیکھ لیا تم نے!"

"چھوڑیں بھیا جی!" اچانک شگفتہ بول اٹھی۔ وہ اب بھی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ "اس میں ان کا کیا قصور؟" اس نے میری طرف دیکھا۔ "میں نے بتا دیا تھا کہ لڈن کے والد کو کسی نے قتل کر دیا ہے وہاں گئے ہیں تو کہنے لگے' کیا صاحبزادے اب جاسوسی کریں گے؟"

میں ہنس پڑا۔ "یہ تو شرلاک ہومز بنے ہوئے ہیں۔ راتوں رات نہ صرف انھوں نے رمضو بابا کے قتل کا معمہ حل کر دیا بلکہ اور بھی کئی مسئلے نمٹا دیے۔"

"اچھا اب تم چپ رہو۔" وہ بھنا گیا۔ "یہ سب تمھاری وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اب پھوٹو یہاں سے اور حویلی جا کر اپنا سامان لے آؤ۔ میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔ اب تو گھر سے باہر قدم بھی رکھا تو قیامت آ جائے گی۔ تم سامان لے کر یہاں پہنچو' شام کو یہیں سے اسٹیشن چلے چلیں گے۔"

"بھیا جی! میں چائے کا پانی رکھ کر آئی تھی۔ آپ لوگوں نے تو ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا۔" شگفتہ بولی۔

"ہاں۔ بھی سوری۔ پہلے ناشتا کر لو۔" شرف الدین نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

"نہیں' صرف چائے پیوں گا۔" میں نے جواب دیا اور شگفتہ یہ سنتے ہی باہر چلی گئی۔

"مراد آباد میں کتنے دن رکنے کا پروگرام ہے؟" شرف الدین نے سوال کیا۔

"میں تو زیادہ دن رکنا نہیں چاہتا۔ یہ تو تم پر منحصر ہے میرا خیال ہے کہ ہم وہاں سے علی گڑھ چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ داخلہ نکل جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا انتظام میں کر چکا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ تمھارا داخلے کا فارم میں نے منگوایا ہے' وہ بھر دینا۔ اب مجھے اپنا پروگرام بتاؤ تاکہ کچھ طے کیا جا سکے۔"

"میں جے پور جانا چاہتا ہوں۔"

"وہاں جا کر کیا کرو گے؟" وہ جھنجلا گیا۔

"شکنتلا کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔"

"مثلاً!"

"مثلاً یہ کہ۔۔ کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اب کیا کیا جائے کہ وہ۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور کیا کیا جائے گا' جواب میرے خیال میں تمھاری اماں ہی تمھیں دے دیں گی۔ رمضو بابا کی بات بھول گئے تم انھوں نے کہا تھا کہ تمھارے ابا چاند کی چودہ کو کنویں پر جاتے رہے ہیں۔ اوپر کی منزل پر بھی راتیں گزارتے رہے ہیں اور یہ بات تمھاری اماں نے تمھیں نہیں بتائی پھر وہ یہ پرکاش والی بات۔۔ انھوں نے کہا تھا کہ تمھاری اماں نے اپنے ہاتھوں سے اسے۔ آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس ادھوری بات کو بھی تمھاری اماں ہی مکمل کر سکتی ہیں۔ اور ہاں یہ عصمت جہاں والا معاملہ۔۔ انھیں ضرور بتانا۔ شاید وہ اس سلسلے میں بھی کچھ بتا سکیں۔ جھالے ہیں نا تمھارے پاس؟"

"ہاں۔" میں نے اندرونی جیب کو چھوتے ہوئے جواب دیا "مگر میں جے پور جانا چاہتا ہوں شرف الدین! اس طرح ہم کم از کم اس کے خاندان والوں سے مل کر یہ تو باور کرا دیں گے کہ۔۔ ہمیں ان سے ہمدردی ہے' ہم شکنتلا کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

"وقار الحسن! تمھارے ہمدردی ان کا نقصان پورا نہیں کر سکتی اور وہ بھی اتنے برسوں بعد۔ اب تو شاید ان کا غم بھی ہلکا ہو چکا ہو گا بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی وہاں تم سے پوچھے کہ جی کون شکنتلا۔؟ ان لوگوں کا اس معاملے

سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بھائی بہن یا ماں باپ جانے زندہ بھی ہوں گے یا نہیں ویسے بھی اتنے برس بعد جاکر اس کی تعزیت کرنا ان کے غم کو کریدنا ہے' ان کے دکھوں کو بیدار کرتا ہے۔ میری مانو تو بس شگفتہ سے ہی تعلق رکھو' میرا مطلب ہے کہ اسے سکون پہنچانے کی ترکیب کرو۔ میں خود تمھاری اماں سے بات کروں گا۔"

میں اس کی باتوں سے الجھن کا شکار ہو گیا۔ اس کی بات بھی درست تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں جانا محض وقت کا زیاں ہوتا۔ میں خاموش ہو گیا اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ شگفتہ چائے لے آئی۔ میں نے چائے پی اور جانے کو کھڑا ہو گیا۔ شگفتہ نے مجھے تنہا جاتے دیکھ کر خوف کا اظہار کیا۔

"ارے اس کی پروا نہ کرو۔ اس پر تو وہ مہربان ہے۔ جیسے محبوب پر ہوتی ہے۔ روح عاشق ہو گئی ہے اس پر' اس کا تو اب کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

شریف الدین کی بات سن کر شگفتہ کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکر چلا گیا۔ مجھے شرف الدین کی بات بری لگی' میں بے چین ہو گیا مگر کچھ بھی نہ کر سکا۔

شگفتہ آہستگی سے اٹھی۔ چائے کی ٹرے میں خالی کپ رکھے اور باہر چلی گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ میں بوجھل دل لیے کھڑا ہو گیا۔ شرف الدین سے رخصت ہو کر میں سیدھا حویلی پہنچ گیا۔ اماں کے کمرے میں میرے کپڑے رکھے تھے۔ میں نہایا' کپڑے بدلے اور دو جوڑے' چھوٹے بیگ میں رکھ لیے۔ اپنی ضرورت کی چند اور چیزیں رکھیں۔ پھر اچانک مجھے اس کڑے کا خیال آیا جسے میں نے اپنے کمرے میں رکھے بکس میں رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے لے جانا تو بیکار ہے مگر میں اسے ایک نظر دیکھ کر اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اماں نے مجھے اپنے کمرے میں نہ جانے کی تاکید کی تھی مگر میں نے چابیاں لیں اور اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ تالا کھولتے ہوئے لمحہ بھر کو میرے دل میں خوف سا بھر گیا تھا۔ گنگوا کی موت کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ سنہرا اور مقناطیسی کشش والا سانپ ذہن میں لہرا گیا مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ دروازہ کھولا۔ کمرا عجیب سی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ صاف ستھرا کمرا دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میری مسہری کے دائیں جانب بکس رکھا تھا۔ میں سیدھا اس طرف بڑھ گیا۔ بکس کھول کر میں نے وہ کڑا تلاش کیا وہ کپڑوں کے بالکل نیچے رکھا تھا۔

اس کے ساتھ ہی دھات کا سفید رنگ کا مجسمہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے سرے پر خون جما ہوا تھا۔ یہ وہی مجسمہ تھا جسے میں اس روز مرزا صولت بیگ کے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے گھبرا کر بکس بند کر دیا۔ میری پیشانی پر پسینا ابھر آیا تھا۔ میں نے بکس بند کیا' اس میں تالا ڈالا' کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر میں باہر نکل آیا۔ اماں کے کمرے میں واپس آیا تو نہ معلوم کیوں ایسا لگا جیسے ابھی ابھی یہاں کوئی تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے میں کسی کی موجودگی کا ثبوت سمجھتا مگر پھر بھی کسی کے آنے اور چلے جانے کا احساس رہا۔ جو بیگ میں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار کر چکا تھا وہ ویسے ہی رکھا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور کمرے کو بند کر کے باہر آگیا۔ حویلی کا بڑا گیٹ بھی میں نے بند کیا۔ تالا ڈالا اور پھریان والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔ انھیں میں نے بتایا کہ میں مراد آباد جا رہا ہوں۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گئے۔ انھوں نے سب کو سلام کہنے کی تاکید کی پھر میں شرف الدین کے گھر کی طرف چل پڑا۔ دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں شرف الدین کے گھر پہنچا تو وہ میرا ہی منتظر تھا۔ شگفتہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"سچ! کیا آپ بھی چلیں گے؟" اس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی!"

"میں جانی آپا سے ملنے کو بے چین تھی۔ وہ تو جاتے ہوئے مل کر بھی نہیں گئیں۔ اب مجھے ان سے ملانے لے چلیں گے؟"

"ضرور۔ وہ بھی آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"مجھے بھیا نے سب کچھ بتا دیا۔ سچ کتنا خوفناک ہے یہ سب کچھ اور آپ۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا؟"

"پہلے لگتا تھا۔ اب تو سمجھیں ڈر ڈر کر بے حس ہو گیا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا چلو اب کھانے کا انتظام کرو' ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے اور ہاں راستے کے لیے کھانا رکھ لینا۔" شرف الدین کی بات سن کر شگفتہ کھڑی ہو گئی۔

"اماں یہ اٹھے پکا رہی ہیں' کلیجی بھون لی ہے اور آلو پالک کی بھجیا بھی بنا لی ہے۔ یہ ہم ساتھ لے چلیں گے۔" اس نے کہا اور ایڑیوں پر گھوم کر باہر چلی گئی۔ وہ مراد آباد جانے پر بے حد خوش تھی۔

ہم نے کھانا کھایا' کچھ دیر آرام کیا۔ امروہہ سے شام سات بجے ٹرین چلتی تھی جو رات گیارہ ساڑھے گیارہ تک مراد آباد پہنچا دیتی تھی۔ یوں تو وہاں سے بسیں بھی چلتی تھیں مگر ٹرین کا سفر محفوظ ترین سفر تھا اور شرف الدین کے ابا نے سختی سے تاکید کی تھی۔ شگفتہ کے ساتھ ٹرین میں سفر کیا جائے' پوری بوگی کا کرایہ دے کر بوگی لی جائے اور دروازے اور کھڑکیاں احتیاط سے بند کر کے تمام سفر طے کیا جائے ورنہ اگر ہم بس سے سفر کرتے تو شاید دو ڈھائی گھنٹے ہی میں مراد آباد پہنچ جاتے۔ خود شگفتہ کو بھی ٹرین کا سفر پسند تھا۔ وہاں بے چاری لڑکیاں کہیں برسوں میں تو ٹرین میں بیٹھا کرتی تھیں۔ شگفتہ کو بھی شادی کی تقریب میں شرکت سے زیادہ ٹرین میں سفر کرنے کی خوشی تھی۔ وہ اڑی اڑی پھر رہی تھی۔ اس نے ساری تیاری کر لی تھی۔ ابا گھر پر ہی تھے اور دو بار بیٹھک میں جھانک کر شرف الدین کی موجودگی کا یقین کر چکے تھے۔ ایک بار تو آکر وہ یہ پوچھ چکے تھے کہ یہ صاحب زادے وہاں بھی تمھارے ہی دم میں نمدے کے رہیں گے۔ جس پر شرف الدین نے بتایا تھا کہ میں اسٹیشن سے اپنے تایا کے گھر چلا جاؤں گا۔ اس پر وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے تھے اور باہر جاتے ہی خالہ نے انھیں ڈانٹا تھا۔ ان کا جملہ مجھے اور شرف الدین کو صاف سنائی دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔ "ارے کیا سٹھیا گئے ہو! کیوں بچے کے پیچھے پڑے ہو۔ اپنی ماں کے پاس جا رہا ہے اور پھر اچھا ہی تو ہے' رات کا سفر ہے' بچے اکیلے سفر کرتے تو دل ہولتا رہتا۔ دوسرا ہٹ ہو گئی' مجھے بھی اطمینان رہے گا۔"

انھوں نے کیا جواب دیا یہ پتا نہ چل سکا تھا۔ کھانے کے بعد چائے پی کر ہم کافی تازہ دم ہو چکے تھے۔ میں اور شرف الدین بیٹھے باتیں کرتے رہیں' یہ ساری باتیں کالج سے متعلق تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم حویلی اور اس کے پر اسرار واقعات کو قطعی بھول گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ شگفتہ کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ وہ بار بار آکر پوچھ رہی تھی کہ ہم کب چلیں گے۔

میں اس کے بچپنے پر ہنس پڑتا تھا اور شرف الدین نے اپنے بال نوچنے لگتا تھا۔ "بابا ٹرین کا وقت ہو گا تو اس سے گھنٹا بھر پہلے ہی نکلیں گے کیا ابھی سے جا کر بیٹھ جائیں؟"

اور وہ زبان دانتوں تلے داب کر جلدی سے لوٹ جاتی۔ شام چھے بجے ہم تیار ہو گئے۔ شرف الدین تانگا لے آیا۔

شگفتہ نے برقعہ پہن لیا۔ میں اسے برقعے میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے سیاہ بادلوں سے چودھویں کا چاند جھانک رہا ہو۔ اس کے رخساروں پر تمتماہٹ تھی' آنکھوں میں جیسے ڈھیروں جگنو اڑ رہے تھے۔ خالہ نے اسے ہزاروں نصیحتیں کیں' پھر شرف الدین کو اس کا خیال رکھنے اور خاندان میں عزت کو بٹا نہ لگانے کی تاکید بھی کی' مجھ سے درخواست کی کہ میں بھی ان دونوں کا خیال رکھوں اور بالخصوص شرف الدین کو زیادہ دیر گھر سے باہر نہ رہنے دوں۔ ابا کو شاید خالہ نے اندر ہی رہنے کو کہہ دیا تھا جب ہی وہ باہر نہیں آئے' شگفتہ اور شرف الدین اندر جا کر ہی انھیں سلام کر آئے تھے۔ میں نے شرف الدین سے اپنا سلام بھی کہلوا دیا تھا۔

ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور بارہ تیرہ منٹ بعد ہی اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہ ٹرین بہت آہستہ چلتی تھی اور رات کے وقت چلتی تھی اس لیے اس پر رش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے شرف الدین نے اس ٹرین کا انتخاب کیا تھا۔ ہم ٹکٹ لینے پہنچے تو کوپے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ایک کوپے میں چار آدمیوں کی گنجائش ہوتی تھی' یہ مخصوص کوپے ہوتے تھے۔ شرف الدین نے اسے بک کر لیا۔ ہمارے پاس سامان زیادہ نہیں تھا اس لیے ہم اپنا سامان لیے خود ہی کوپے میں بیٹھ گئے۔ میں نے اسٹیشن سے صراحی لے کر اس میں پانی بھر لیا تھا۔ شگفتہ بے پناہ خوش تھی۔ میں نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے لیں۔ یہ چیزیں میں نے اسٹیشن ہی سے خرید لی تھیں۔ سات بجے ٹرین روانہ ہوئی تو شگفتہ کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ میں اور شرف الدین باتیں کرنے لگے۔ کافی دیر باتیں کرتے رہے پھر مجھے تو نیند آنے لگی۔ ہم تمام رات کے جاگے ہوئے تھے۔ دن میں بھی سونے کا موقع نہ ملا تھا۔ میں اوپر والی برتھ پر چلا گیا۔ شرف الدین کو میں نے تاکید کر دی کہ وہ نہ سوئے' میں گھنٹا بھر بعد اٹھ جاؤں گا پھر وہ سو لے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم دونوں شگفتہ کو یوں تنہا چھوڑ کر سو جائیں۔ اس کی آنکھوں میں تو دور دور تک نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں برتھ پر جا لیٹا۔ شرف الدین وہیں شگفتہ کے پاس بیٹھا رہا۔

مجھے بے پناہ نیند اور تھکن تھی۔ میں لیٹتے ہی غافل ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو یوں لگا جیسے کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔ میں چند لمحے تو یونہی لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ ہلکے ہلکے جھٹکوں کی وجہ سے لگ رہا تھا کہ ٹرین چل رہی ہے لیکن میں ان

جھٹکوں کی وجہ سے نہیں اٹھا تھا۔ میرے بدن میں عجیب قسم کی سنسنی سی پھیلی ہوئی محسوس ہوئی' میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ بوگی میں گہری خاموشی تھی۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا' شگفتہ سیٹ پر گٹھڑی سی بنی سو رہی تھی۔ سامنے کی برتھ پر شرف الدین خراٹے لے رہا تھا۔ میں پھر اپنے جاگ اٹھنے کی وجہ تلاش کرنے لگا۔ اسی وقت مجھے ایک کراہ سنائی دی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ یہ آواز میرے بالمقابل اوپر کی برتھ سے آئی تھی۔ بوگی میں اس طرف اندھیرا تھا صرف ہماری طرف کا چھوٹا سا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی بہت کم تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اس برتھ پر دیکھا۔ کوئی سیاہ کمبل میں لپٹا لیٹا تھا۔ میں تیزی سے نیچے اترا میں نے شرف الدین کو جگانا چاہا اسی وقت پھر کوئی کراہا۔ آواز مردانہ تھی اور وہ پانی مانگ رہا تھا۔ میں اس وقت یہ بھول گیا کہ ہم پوری بوگی بک کرا چکے ہیں' اس کے پانی مانگنے پر میں شرف الدین کو جگائے بغیر صراحی کی طرف پلٹ پڑا جو شگفتہ کی سیٹ کے نیچے رکھی تھی۔ میں نے گلاس میں پانی نکالا اور اس برتھ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ شخص پھر کراہا اور پھر اس نے پانی مانگا۔ شاید وہ بیمار تھا۔ میں نے دھیرے سے پکارا۔ "پانی لے لیجیے۔"

میری آواز سنتے ہی اس نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹا دیا' اور مجھے یوں لگا جیسے میں پتھرا گیا ہوں۔ اس کے چہرے پر کھال نہیں تھی۔ اتنی کم روشنی میں بھی مجھے اس کا چہرہ بالکل نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر گوشت اور چربی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ صرف کالی کالی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نہ ہونٹوں پر کھال تھی نہ چہرے پر۔ میں گلاس لیے بغیر پلٹ گیا اور شرف الدین کے برابر جا بیٹھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ خوف سے آواز بند ہو گئی تھی۔ میں نے شرف الدین کو ہلایا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پریشان ہو گیا پھر میں نے انگلی سے اس برتھ کی طرف اشارہ کیا۔ جونہی شرف الدین کی نگاہ اس پر پڑی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہے یہ؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ شاید راستے میں چڑھا ہے۔"

"ابھی اتارتا ہوں۔" وہ اس طرف بڑھنے لگا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں شرف الدین۔ اس کے قریب مت جانا۔ شاید اسے کوئی خطرناک بیماری ہے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ اس کے چہرے کی کھال جھڑ چکی ہے۔ میں نے اسے قریب بھی نہیں جانے دیا کہ جانے کیسی بیماری ہے' لگ ہی نہ جائے۔ وہ واپس بیٹھ گیا۔ شگفتہ اب بھی سو رہی تھی۔ میں اور شرف الدین حیران و پریشان بیٹھے اس کمبل میں لپٹے شخص کو دیکھ رہے تھے۔

"ایسے تو سفر نہیں کٹ سکتا۔" شرف الدین نے جھنجلا کر کہا۔

"اگلے اسٹیشن پر ہم جگہ بدل لیں گے۔" میرا خیال ہے کہ اب زیادہ سفر باقی نہیں رہا۔" میں نے سرگوشی کی۔

"کیوں ہم نے یہ بوگی کیا ان کے لیے بک کرائی تھی؟" اس نے نتھنے پھلا کر کہا۔

"چھوڑو یار۔ بیمار آدمی ہے۔ اسے اٹھانے' اسے سمجھانے میں کہیں مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔ ٹرین آدمی سے زیادہ خالی ہے۔ ہم کسی اور بوگی میں چلے جائیں گے۔ وہ چپ ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں شگفتہ بھی اٹھ گئی۔ اسے اپنے سو جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے کھانا نکالنے کے لیے کہا مگر میرا جی نہ چاہا۔ اس آدمی کو دیکھنے کے بعد سے ہی مجھے ابکائیاں آ رہی تھیں۔ شرف الدین نے اسے بتایا کہ ہم بوگی تبدیل کر رہے ہیں وہاں کھانا کھائیں گے۔ وہ حیران ہوئی مگر کچھ بولی نہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی ایک پھاٹک سے پہلے رک گئی۔ میں نے فوراً اتر کر ٹرین کے اگلے ڈبے کو دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ میں نے شرف الدین سے کہا کہ وہ سامان کھڑکی سے مجھے دے دے۔ اس نے سامان مجھے دے دیا جسے میں نے اگلے ڈبے میں رکھ دیا۔ میرے پیچھے ہی شرف الدین بھی شگفتہ کو لیے اسی ڈبے میں آ گیا۔ ہم نے گھوم کر ساری سیٹوں کو دیکھا۔ ڈبا پورا خالی تھا۔ شرف الدین نے دونوں طرف کے دروازے لاک کر دیے۔ یہاں روشنی کچھ زیادہ تھی۔ ہم سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شگفتہ کھانا نکالنے لگی۔ اس نے سیٹ پر ہی دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ میں اور شرف الدین باری باری ہاتھ دھو کر آ گئے۔ شگفتہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ میں پلیٹ میں سالن نکالنے لگا۔ اس وقت میں اور شرف الدین اچھل پڑے۔ شگفتہ کی چیخ نے ہمارے اوسان اڑا دیے۔ ہم دونوں اٹھ کر اس طرف بھاگے جس طرف شگفتہ گئی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی میرے اور شرف الدین کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔

وہاں وہی شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر کھال نہ تھی۔ لال لال گوشت اور سفید چربی صاف نظر آ رہی تھی جو ملگجی روشنی میں بڑا دہشت ناک اور خوفناک لگ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ شرف الدین کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ میں اس قدر ہوش میں تھا کہ میں نے شگفتہ کو جھومتے اور بند آنکھوں سے ایک جانب جھکتے دیکھا تو لپک کر اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی' اگر میں اسے تھام نہ لیتا تو وہ نیچے گر چکی ہوتی۔

"تت۔ کون ہو تم؟" میں نے اپنے لہجے کی کپکپی پر بڑی کوششوں سے قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

وہ کسی مجسمے کی طرح کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کندھوں پر سیاہ کمبل ڈالا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کی لمبی لمبی گھنگریالی لٹیں اس کے کندھوں کو چھو رہی تھیں۔ میری نگاہ اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں پھر جونہی میری نگاہ اس کی ننگی پنڈلیوں اور پھر پیروں پر پڑی میں لرز کر رہ گیا۔ پنڈلیوں اور پیروں پر بھی کھال نہیں تھی۔ ناخن نچے ہوئے لگ رہے تھے اور ان پر خون چھلک رہا تھا۔ میرا پورا بدن کانپنے لگا تھا۔ شگفتہ کے بوجھ نے میرا ایک بازو اور کندھا شل کر دیا تھا۔ شرف الدین کسی پتھر کی طرح کھڑا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے شرف الدین کو جھنجوڑ ڈالا مگر وہ یوں ہلا اور پھر ساکت ہو گیا جیسے گوشت پوست کا نہ ہو بلکہ پلاسٹک کا بنا ہوا ہو۔ خوف سے میری کنپٹیوں میں دھماکے سے ہونے لگے۔ تنہا رہ جانے کے احساس نے مجھے کچھ مضبوط کر دیا۔ یہ احساس کہ اب جو کچھ بھی کرنا ہے مجھی کو کرنا ہے' میرے کچھ حوصلے بڑھا گیا۔ میں الٹے قدموں چلتے ہوئے پیچھے کی سیٹ کے قریب پہنچا اور شگفتہ کے بے ہوش بدن کو سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے اسے پشت کی سیٹ سے ٹکا کر بٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایک جانب کو لڑھک گئی۔ اس کے بوجھ سے آزاد ہوتے ہی میں پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہوا جو اب بھی ساکت کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دوستانہ چمک محسوس کی۔ ایک ملائمت سی تھی اس کی آنکھوں میں' باقی چہرے پہ تو نگاہ ڈالتے ہوئے جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی۔

میں ایک قدم آگے بڑھا۔ "تم۔ کون ہو اور۔" میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی' کھڑکیاں دروازے سب بند تھے۔ ٹرین پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ "تم اس بوگی میں کیسے آئے ہو؟"

"پپا۔ پانی۔!" اس کے ادھڑے ہوئے ہونٹ ہلے تو ایک عجیب کراہیت سی سینے میں بل کھانے لگی۔

میں نے چند لمحے سوچا پھر صراحی کی طرف بڑھ گیا۔ گلاس میں پانی لے کر میں واپس آیا تو وہاں شرف الدین ساکت کھڑا تھا۔ شگفتہ سیٹ پر اوندھی پڑی تھی اور ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ادھڑی ہوئی کھال والا شخص جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ خوف کے مارے میری گھگھی بندھ گئی حالانکہ اس کے سامنے میں خود پر قابو پائے رہا تھا۔ نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے مجھے اس کے سامنے سنبھالے رکھا۔ میں اس سے مخاطب بھی ہوا بلکہ میں نے کافی دیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا بھی تھا۔ گلاس کا پانی چھلکنے لگا۔ میرے جسم پر طاری لرزا کپکپی میں بدل گیا تھا۔ مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا تو میں شگفتہ والی سیٹ پر ٹک گیا۔ گلاس میں نے نیچے رکھ دیا۔ میں نہیں جانتا' مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں نے خود پر کتنی دیر میں قابو پایا۔ نارمل ہوتے ہی میں شرف الدین کی طرف بڑھا۔ وہ اب بھی اسی پوزیشن میں کھڑا' پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں ویران بلکہ بے جان سی لگیں تو ایک کرب ناک احساس مجھے دہلا گیا۔ میں نے اکثر فلموں میں دیکھا تھا کہ کسی کو اسی طرح کھڑے کھڑے یا بیٹھے بیٹھے سکتہ ہو جاتا ہے اور جیسے ہی اسے چھوا جاتا ہے' وہ ایک جانب لڑھک جاتا ہے۔ لمحہ بھر کو میرا دل کانپ اٹھا۔ شرف الدین کی اماں کا جملہ کانوں میں گونج اٹھا۔ "آپ کیوں بولے جاتے ہیں' بچے اکیلے جا رہے ہیں' وہ ساتھ ہوگا تو دوسرا ہٹ ہو جائے گی اور پھر مجھے بھی اطمینان رہے گا۔" وہ مطمئن ہوں گی مگر میں انہیں کیا جواب دوں گا! کیا بتاؤں گا کہ شرف الدین کو کیا ہوا۔ شگفتہ بے ہوش ہے' بوگی کے دروازے بند ہیں' یہاں میرے سوا دوسرا کوئی نہیں اور۔ اور۔ مجھے چکر سا آ گیا اور میرا ہاتھ بے اختیار ہو کر شرف الدین کی طرف بڑھا۔ میں شاید اس کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ جونہی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ یوں لگا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ مجھے بھی اور شرف الدین کو بھی۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی اچھل پڑا۔

"وقارالحسن!" وہ ایک دم چیخ اٹھا۔ میں اسے زندہ سلامت دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے پہلے چاروں طرف

دیکھا پھر شگفتہ کو سیٹ پر اوندھے دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ "کیا ہوا اسے۔ ہاں۔ ہاں وہ کہاں گیا۔؟ کدھر گیا وہ۔" وہ وحشت زدہ سا چاروں طرف گھوم گیا۔

"تم اسے دیکھو۔ وہ اب یہاں نہیں ہے۔" میں نے نیچے سے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر جیسے بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ شگفتہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھادیا۔ اس نے پہلے شگفتہ کی نبض دیکھی پھر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے۔ ہاتھ بھگو کر اس کے ماتھے پر پھیرا۔ میری نگاہیں شگفتہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کا رنگ زرد تھا پھر بھی اس کے حسن میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ لمبی لمبی سیاہ پلکیں ساکت تھیں، چہرے پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بالوں کی بھیگی ہوئی لٹیں اس کے ماتھے پر چپکی ہوئی تھیں اور بھیگے ہوئے ہونٹ پورے وجود میں ایک کیف آگیں سنسنی سی پھیلا رہے تھے۔ معاف کیجیے گا میں خود بھی ایسے حالات میں اپنی اس کیفیت پر حیران اور پشیمان ہوا تھا، یقیناً آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ آدمی ایسے حالات میں بھلا ایسی کیفیت سے کیسے دوچار ہوسکتا ہے مگر میرے ساتھ ایسا ہوا تھا اور میں کیونکہ پوری دیانتداری سے اپنی یہ حیرت انگیز آپ بیتی لکھنا چاہتا ہوں اس لیے اگر کہیں آپ کو کچھ ناگوار بھی گزرے تو معاف کردیجئے گا۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ شگفتہ کا حسن جس قدر میں نے اس وقت دیکھا اور محسوس کیا تھا شاید اب سے پہلے محسوس نہیں کرسکا تھا۔ اس کی ستارہ آنکھیں چمک رہی ہوں تو نظر اس کے چاند چہرے پہ ٹھہرتی ہی نہیں تھی پھر اب سے پہلے میں نے جب بھی دیکھا فاصلے سے یا پھر چور نگاہوں ہی سے دیکھا تھا مگر اس وقت شرف الدین کے ساتھ ہی میں بھی اس پر جھکا ہوا تھا۔ شرف الدین بے حد پریشان لگ رہا تھا۔ شگفتہ کے چہرے پر بار بار پانی کے چھینٹے مارتا اور پھر مجھے بے بسی سے دیکھنے لگتا تھا مگر میرے اندر کوئی اضطراب نہ تھا۔ عجیب سا اطمینان تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، وہ نارمل تھی۔ شاید بہت خفیف سا فرق رہا ہو جسے میں نوٹ نہیں کرسکا تھا۔ میں نے سورۃ الناس پڑھی اور شگفتہ کے چہرے پر پھونک ماردی۔ مجھے اس وقت اماں کی بات یاد آگئی تھی۔ وہ ہمیشہ تاکید کرتی تھیں کہ خوف میں سورۃ الناس پڑھا کردیا آیت الکرسی۔

"وقار! سن! شگفتہ کو۔"

ابھی شرف الدین نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ میں نے شگفتہ کی پلکوں کو لرزتے دیکھ کر اسے اشارہ کیا۔ وہ شگفتہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ہوش میں آرہی تھی، کچھ دیر اس کی لمبی سیاہ پلکیں لرزتی رہیں پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے میں اچانک ہی قمقمے روشن ہوگئے ہوں۔

"کیسی ہیں آپ؟" میں ایک دم بول اٹھا۔ وہ خاموش اور حیران نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی شرف الدین کو دیکھتی رہی پھر اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کک۔ کیا ہوا۔ کیا ہوگیا تھا مجھے!" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی پھر اس نے جلدی سے خود کو تین گز کے دوپٹے میں لپیٹ لیا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ یوں بے سدھ اور خود سے بیگانہ پڑی تھی۔

اس کے سوال پر میں نے اور شرف الدین نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا پھر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی ہمیں دیکھ رہی تھی پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر تھی جب کہ ہم لوگ پچھلی برتھ پر بیٹھے تھے۔ ہمارا سامان وغیرہ وہیں تھا۔

"میں یہاں کیسے آئی؟" اس نے پھر حیرت سے پوچھا۔ "اوہ۔!" پھر وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ میرا دل دھڑک اٹھا ورنہ اس سے قبل اس کی حیرت دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا تھا کہ وہ سب کچھ بھول چکی ہے اسے اس ہیبت ناک شخص کا چہرہ یاد نہیں رہا اور یہ میرے لیے خوش آئند بات تھی ورنہ وہ ڈرتی رہتی اور ہمارا یہ سفر پریشانی میں کٹتا۔

"تم۔ تم۔ تمہی وہ۔" شرف الدین نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"شاید آپ کو چکر آگیا تھا۔ یا شاید۔"

"اوہ ہاں۔" وہ چونک اٹھی۔ میں پھر ڈر گیا مگر اس کے چہرے پر خوف کا تاثر بالکل نہ تھا۔ "میں ہاتھ دھونے گئی تھی۔ میں نے غسل خانے کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ پہلے تو کھلا ہی نہیں اور پھر ایک دم ہی جھٹکے سے کھل گیا، میں اپنے ہی زور میں آگے بڑھی پھر۔ پھر شاید وہ میرے سر سے ٹکرا گیا۔ میرے سر میں چوٹ لگ گئی۔ اللہ ابھی تک تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے سر کو دائیں طرف سے دبا کر کہا۔

میں نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا اور شرف الدین کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کرکے کہا۔

"چلو بھئی بھوک لگ رہی ہے۔ مراد آباد بھی شاید آنے والا ہے۔" شرف اور شگفتہ کھڑے ہوگئے۔ شرف الدین کی آنکھوں میں بے پناہ الجھن تھی۔ الجھن ہونا ہی چاہیے تھی اور وہ دونوں ہی اس شخص کو دیکھ چکے تھے جب کہ شگفتہ بھی اسی کو دیکھ کر چیخی تھی اور وہ غسل خانے کی طرف تو ابھی مڑی ہی نہیں تھی پھر اس کی سنائی ہوئی کہانی پر شرف الدین کو حیران ہونا ہی چاہئے تھا۔ خود میں بھی اس کہانی پر حیران تھا اور مسلسل گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سوائے معصومیت کی سنہری چمک کے کچھ بھی نہ تھا۔ شاید وہ اس لیے ایسا کہہ رہی ہو کہ ہم گھبرا نہ جائیں، یہ خیال آیا مگر فوراً ہی میں نے اسے رد کردیا۔ اول تو وہ اتنی پختہ ذہن یا پختہ عمر کی نہیں تھی کہ اپنا خوف چھپا کر ہمیں گھبراہٹ سے بچاتی اور نہ ہی وہ چالاک اور گھاگ تھی کہ کسی بھی وجہ سے اس معاملے کو گول کرجاتی۔ اب ایک ہی بات رہ گئی تھی کہ واقعی وہ سب کچھ بھول گئی ہو، اور واقعی اسے وہی سب کچھ یاد ہو جو اس نے ہمیں بتایا تھا۔ اب تو کچھ بھی ہوسکتا تھا، کوئی بھی انہونی بات، ناقابل یقین واقعہ، حادثہ، سانحہ، کچھ بھی، بالکل اسی طرح جس طرح وہ بند بوگی میں آیا اور جس طرح غائب ہوگیا۔ میں یہ سوچتا ہوا اپنی سیٹ پر آگیا جب کہ شرف الدین شگفتہ کا بازو تھامے وہاں لے آیا۔ کھانا نکلا ہوا تھا۔ شگفتہ نے سگھڑ لڑکیوں کی طرح ہمیں پلیٹوں میں سالن نکال کردیا۔ ڈلیا میں روٹی رکھ دی اور خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

میری بھوک اڑ گئی تھی مگر میں پھر بھی نوالہ توڑنے لگا۔ شرف الدین بھی بڑی بے دلی سے نوالہ چبا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگی جب کہ شگفتہ بڑے انہماک سے کھانا کھا رہی تھی۔ میری ہی طرح شرف الدین بھی اسے بار بار دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہیں۔ ٹرین اچھی خاصی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے یعنی ٹرین کو امروہہ سے روانہ ہوئے شاید ڈھائی تین گھنٹے تو ہوگئے تھے مگر دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا، دونوں جانب اندھیرا تھا اور لق ودق

میدان تھے۔ ٹرین میں ہونے والی روشنی زمین پر ہمارے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔

سوائے ٹرین کی چھک چھک کے کوئی آواز نہ تھی۔ نہ معلوم کیوں اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے پوری ٹرین خالی ہو۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ بھی چڑھادیا اور جھانک کر باہر دیکھا۔ کہیں کسی کی موجودگی محسوس نہ ہوئی۔ زمین پر پڑنے والی روشنی صرف ہماری کھڑکیوں ہی کی نہ تھی بلکہ دور تک تمام ہی کھڑکیوں کی روشنی زمین پر پڑ رہی تھی جب کہ صرف میرا اور سامنے کھڑکی کے قریب بیٹھی شگفتہ کا سایہ ہی ان دو کھڑکیوں کے عکس میں نظر آرہا تھا۔ جب کہ زمین پر پڑنے والے پوری ٹرین کی تمام کھڑکیوں کے روشن چوکھٹے خالی تھے۔ مجھے اپنے بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ خیال ہی دل ڈبونے کو کافی تھا کہ اگر جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے، وہ حقیقت ہوا اور اس حقیقت کا احساس شرف الدین اور شگفتہ کو بھی ہوگیا تو کیا ہوگا؟

"بھیا جی!" اچانک میں چونک اٹھا۔ شگفتہ شرف الدین سے مخاطب تھی۔ "آپ بہت پریشان ہیں؟ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔" اس نے اس کی پلیٹ کو دیکھ کر کہا پھر اس کی نگاہ میری پلیٹ پر پڑی۔ وہ شکوہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہی مجھے بھوک نہیں ہے اور میں پریشان نہیں ہوں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔" شرف الدین نے جواب دیا۔

"اور آپ کو بھی بھوک نہیں ہے؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

"جی! پتا نہیں کیا بات ہے! ممکن ہے ایسا ڈپریشن کی وجہ سے ہوا ہو۔" میں نے پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے لمحہ بھر کو مجھے دیکھا پھر برتن سمیٹنے لگی۔ "بھیا جی! ہم کتنی دیر میں پہنچیں گے؟" برتن سمیٹ کر وہ سیٹ پر پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم پہنچنے والے ہوں گے۔ ٹرین تو کافی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔" شرف الدین نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ میری طرف دیکھنے لگا جیسے مجھ سے تصدیق چاہتا ہو اور میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ نہ معلوم کیوں میں خوفزدہ تھا۔ جانے کون سی بات تھی جو اندر ہی اندر مجھے لرزا رہی تھی۔ میں نگاہیں چرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کافی وقت گزر چکا تھا اور اب تک درمیان میں

کوئی آبادی بھی نظر نہیں آئی تھی جب کہ امروہہ سے مراد آباد کے درمیان شاید کہیں کہیں ہی ایسا علاقہ تھا جو سنسان ہو ورنہ چھوٹی چھوٹی بستیاں تو تمام راستے میں آتی رہتی تھیں۔

"پتا نہیں کیا بجا ہے؟ مجھے تو بہت نیند آرہی ہے۔" شگفتہ نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔

"آپ لیٹ جائیے۔ نیند آئے تو سوجائیے۔ مراد آباد آتے ہی ہم آپ کو اٹھادیں گے۔" میں نے کہا تو اس نے شرف الدین کی طرف دیکھا جیسے اس سے اجازت کی خواہاں ہو۔

"ہاں تم۔ اوپر برتھ پر لیٹ جاؤ۔" شرف الدین یہ کہہ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے تمام برتھوں پر نظر ڈالی۔ میری نگاہیں بھی اس کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ پوری بوگی کا جائزہ لینے لگیں' شاید وہ بھی وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو میں دیکھ رہا تھا۔ یہ اطمینان ہونے کے بعد کہ سب کچھ ٹھیک ہے شرف الدین نے چھوٹا سا تکیہ اور ایک چادر اوپر رکھ دی پھر شگفتہ کو اوپر جانے میں مدد دی' جب شگفتہ لیٹ گئی تو وہ اس کی برتھ کے سامنے والی سیٹ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس پر نگاہ رکھ سکے۔ میں اب خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کررہا تھا۔ شگفتہ کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی میں نے پشت ٹکادی۔ اب میری نگاہیں شرف الدین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی جھکے اور کبھی اوپر نگاہ کرکے شگفتہ کو دیکھتا تھا مگر خاموش تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شگفتہ کے سونے کا منتظر ہے۔ میں نے نگاہیں کھڑکی سے باہر ان روشن چوکھٹوں پر جمادیں جہاں اب میرا اور شرف الدین کا عکس نظر آرہا تھا۔ اب بھی پہلے ہی کی طرح تمام روشن چوکھٹے خالی تھے اور پہلے ہی کی طرح کا نہ معلوم سا خوف مجھ میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شرف الدین کو اپنے اس خوف کے بارے میں بتاؤں یا نہیں! شگفتہ شاید ابھی تک سوئی نہیں تھی یا شرف الدین کسی گہری سوچ میں تھا۔ یوں میں فیصلہ کرتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے پورا احساس تھا کہ شرف الدین اور شگفتہ کے ساتھ پیش آنے والے تمام حالات کا ذمے دار میں ہوں۔ میں اگر ان لوگوں کے ساتھ نہ آتا تو شاید یہ سب نہ ہوتا مگر میں تو ان حسین لمحوں کی سنگت کے لیے ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا جس میں شگفتہ مجھ سے بہت قریب ہوتی' کئی گھنٹے ہم ساتھ ہوتے' میں اسے کئی گھنٹے تک مسلسل اپنے سامنے دیکھتا' یہ احساس

ہی میرے لیے بڑا کیف آگیں تھا مگر یہاں تو الٹا ہوگیا' اس کی قربت کا کوئی لطیف احساس رہا ہی نہیں تھا۔ ایک بات مجھے میری بری طرح کھٹک رہی تھی' وہ یہ کہ آخر وہ شخص کون تھا۔ پہلے تو میں اسے کوئی بیمار آدمی سمجھا تھا جو کسی بھی طرح اس بوگی میں سوار ہوگیا تھا مگر اب اس کا اس بند بوگی میں آنا اور پھر یوں اچانک غائب ہوجانا مجھے الجھن میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ اگر اس کا تعلق ہماری کہانی سے تھا یا سنگتلا کی روح سے تھا تو یہ کافی حیرت انگیز بات تھی کیونکہ اب تک میں نے ہر شخص سے صرف اور صرف سنگتلا کے بارے میں ہی سنا تھا یا اب عصمت جہاں میرے سامنے آئی تھیں' کسی مرد کا تو کہیں کوئی ذکر ہی نہ تھا پھر یہ کون تھا؟ یہ سوال کنڈلی مارے میرے دماغ میں پھنکار رہا تھا۔

"وقار الحسن!" اچانک شرف الدین نے مخاطب کیا تو میں چونک اٹھا۔

"ہوں! شگفتہ سوگئی؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"ہاں۔ وقار الحسن وہ کون تھا! میں نے اسے دیکھا تھا پھر پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ آج میں نے پہلی بار اس کی یہ کیفیت دیکھی تھی۔

"شرف الدین میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا! میں خود اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"تم نے اسے جانے کیوں دیا! ہم اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کرسکتے تھے۔ وہ بند بوگی میں آخر داخل کیسے ہوا؟"

"میرے بس میں ہوتا تو میں اسے کبھی نہ جانے دیتا کم از کم اس سے یہ ضرور پوچھتا کہ وہ کیوں ہمارا پیچھا کررہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ گیا نہیں تھا شرف الدین! اچانک غائب ہوگیا۔ ایسا جیسے ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا تعلق بھی سنگتلا کی قوم سے ہے۔"

"لگتا تو یہی ہے مگر۔ یہ آخر تھا کون۔ میں نے اب تک اس تمام کہانی میں کسی مرد کا ذکر نہیں سنا۔"

"کیوں۔ رمضو بابا کی بات بھول گئے کیا اوہ۔ وہ سنگتلا کا محبوب' جسے تمہارے دادا مار کر وہیں کہیں دفن کرچکے ہیں' جس کی تلاش میں سنگتلا کی روح خوار ہوتی پھررہی ہے۔"

[illegible] اچھل پڑا۔ مجھے رمضو بابا کی بات بھی یاد [illegible] انھوں نے کسی پرکاش کا ذکر کیا تھا' اور یہ بھی ہوسکتا [illegible] سنگتلا کا وہی محبوب ہو جس کی تلاش میں اور جس [illegible] میں وہ حویلی میں چکراتی پھررہی ہے۔" ہاں۔ مگر یہ [illegible] کسی کے سامنے نہیں آیا پھر اب؟"

[illegible] ضروری نہیں کہ ساری روحیں ترتیب سے کام [illegible] کی پابند ہوں۔ ممکن ہے ان کے یہاں یہی طریقہ [illegible] ہو۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا جس پر مجھے [illegible] آگئی۔ شرف الدین کی یہی بات مجھے پسند تھی کہ وہ بہت [illegible] خود کو تبدیل کرلیتا تھا اور اس تبدیلی میں اس کی ہمت [illegible] دخل تھا۔ "ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی [illegible] میں نے اسے دیکھا تو تھا مگر پھر۔ پھر مجھے کچھ یاد [illegible] "اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔" اور شگفتہ کب [illegible] کیسے بے ہوش ہوئی تم نے دیکھا کہ اسے بھی کچھ یاد [illegible]"

"ہاں شرف الدین! جو کچھ بھی ہوا اس تمام وقت صرف [illegible] ہوش میں تھا۔ تم سکتے کے سے عالم میں کھڑے رہ [illegible] تھے بلکہ یقین کرو ایک لمحے کو تو میں ڈر گیا تھا۔ یوں لگا تھا [illegible] تم مرچکے ہو۔ تم جس پوزیشن میں کھڑے تھے اسی میں [illegible] رہ گئے جب کہ شگفتہ تو ہمارے پہنچتے ہی بے ہوش [illegible] تھی۔ میں نے تمہیں پکڑ کر ہلایا تھا مگر تم میں قطعی کوئی [illegible] نہ ہوئی۔ تمہارا جسم میرے ہلانے سے ہلا تو تھا مگر [illegible] جیسے پلاسٹک کا آدمی ہلا ہو اور وہ۔ وہ عجیب سی نگاہوں [illegible] مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پھر پانی مانگا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اور یہاں کیسے آیا مگر [illegible] نے میری بات کا جواب نہیں دیا' اس تمام کے باوجود شرف الدین کہ وہ اس طرح اچانک آکر ہمیں خوفزدہ کررہا [illegible] اس کی آنکھوں میں دوستانہ چمک تھی' میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے غصہ' نفرت یا ایسا ہی کوئی جذبہ محسوس نہ کیا بلکہ ایک ملائمت سی محسوس کی تھی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے سوچا کہ اسے پانی دے کر اطمینان سے پوچھوں گا کہ وہ [illegible] ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اس وقت تک میں [illegible] کوئی جیتا جاگتا انسان ہی سمجھا تھا' میں پانی لینے گیا اور [illegible] واپس لے کر آیا تو۔ تو وہ غائب تھا۔ اسی لمحے تم [illegible] میں آگئے۔"

"وقار الحسن! تم نے غور کیا کہ اب تم سے ساری ہی [illegible] رابطہ کررہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کی نظر میں

تم کافی اثر و رسوخ والے آدمی ہو۔" اس نے [illegible] کر کہا۔ میں بھی ہنس دیا۔ "بات تو ٹھیک کہی ہے تم نے شرف الدین [illegible] کیوں؟ میں ایک کمزور سا آدمی ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں تنہا کچھ نہیں کرپاؤں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری شدت سے خواہش تھی کہ تم میرا ساتھ دو مگر تم قائل ہی نہ ہوتے تھے' اب قائل ہوگئے ہو تو یہ سب کچھ ہورہا ہے۔ ممکن ہے یہ تمہاری وجہ سے ہورہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے خیالات سے تمام روحیں اب تک واقف ہوچکی ہوں گی۔"

"میں نہیں جانتا شرف الدین لیکن۔ لیکن اس وقت جو کچھ ہورہا ہے وہ غلط ہے' شگفتہ ہمارے ساتھ ہے اور میں اس کی وجہ سے کافی ڈسٹرب ہوں۔"

"یہی بات مجھے بھی پریشان کررہی ہے۔" اس نے پر سوچ انداز میں جواب دیا۔

"شرف الدین! ہمیں امروہہ سے چلے کتنا عرصہ ہوچکا ہوگا؟" بالآخر میں ضبط نہ کرپایا۔

وہ چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ ابھر آئی۔ پھر یکایک وہ پریشان ہوگیا۔ "کافی دیر ہوگئی ہے وقار الحسن! اب تک۔ اب تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔" پھر وہ اچانک اٹھا اور اس نے کھڑکی کا شیشہ کھول کر باہر جھانکا میری نگاہیں بھی کھلی کھڑکی سے پار ہوگئیں۔ یہ دیکھ کر میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف لپکا کہ دور سے بتیاں نظر آرہی [illegible] اسی لمحے میری نگاہ زمین پر پڑنے والے روشن چوکھٹوں پر پڑیں' تقریباً ہر کھڑکی سے لوگوں کے سائے نظر آرہے تھے۔ ایک گہما گہمی سی محسوس ہورہی تھی۔ اس وقت کسی کھڑکی سے ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی' کسی شخص نے گلاس باہر نکال کر پانی پھینکا جس کے چھینٹے میرے اور شرف الدین کے چہرے پر پڑے اور ہم دونوں نے بے ساختہ سر اندر کرلیے۔ "میرا خیال ہے کہ ہم پہنچنے والے ہیں۔"

اور اسی لمحے ٹرین نے وسل دی۔ اس کی تیز آواز نے گویا زندگی دوڑادی۔ شگفتہ نے آنکھیں کھول کر سر اٹھایا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ شرف الدین نے بھی اسے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ "شگو اٹھو' مراد آباد آگیا۔" اور وہ اس کا سہارا لے کر نیچے اتر آئی۔ میرے اندر دور دور تک

گہرا اطمینان پھیل گیا۔ شگفتہ نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور برقعہ پہن کر بیٹھ گئی۔ اب روشنیاں قریب آچکی تھیں۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی پھر وہ دھیمی ہوتے ہوتے اسٹیشن سے کچھ ادھر ٹھہر گئی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شاید پٹڑی خالی نہیں تھی اس لیے ٹرین رک چکی تھی۔ میری نگاہیں دوسرے ڈبوں پر پڑیں' اکثر ڈبوں کے دروازوں پر لوگ کھڑے تھے۔ کچھ کھڑکی میں سے جھانک رہے تھے۔ اسی لمحے میں نے اسے برابر والے ڈبے سے اترتے دیکھا۔ وہ کمبل لپیٹے اندھیرے میں اتر رہا تھا۔ ڈبے سے اتر کر اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اس گہرے اندھیرے میں بھی مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہی ادھڑی ہوئی کھال' وہی آنکھوں میں ملائمت اور دوستانہ چمک۔

"اچھا دوست۔۔۔ میں حویلی میں تمھارا انتظار کروں گا چاند کی چودھویں رات کو۔" یہ آواز میری سماعت سے نہیں بلکہ میرے دماغ کے اندر میرے پورے وجود کی دیواروں سے ٹکرائی تھی' یوں جیسے وہ میرے اندر کہیں بیٹھا ہو' پھر وہ اچانک ہی پلٹا اور مڑ کر ریل کی چمک دار پٹڑیوں چلتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ آواز عجیب سی تھی۔ بھرائی ہوئی بھاری آواز' اس آواز کا ارتعاش کافی دیر تک میں نے اپنے سینے میں' اپنے دماغ میں محسوس کیا۔ میں اب بھی اندھیرے میں اسی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جس طرف وہ گیا تھا۔ میں بالکل گم صم تھا' چونکا اس وقت جب ریل ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ متحرک ہو گئی۔

"او بھیا!" شرف الدین نے میرے کاندھے کو تھپتھپایا۔ "مراد آباد آگیا۔"

میں پلٹا اور اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس چیک کرنے لگا۔ شگفتہ تیار بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا' مدہم سا خود مجھے بھی وقت کے زیاں کا شدت سے احساس ہوا۔ اتنا خوب صورت وقت عجیب وحشت خیز لمحات میں کٹ چکا تھا۔ قارئین میں نے شروع میں ہی آپ کو بتایا تھا کہ میں نے جس روز دادی کی کرب انگیز چیخ سن کر آنکھ کھولی تھی اسی روز سکون اور زندگی کی تمام تر لطافتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ خوفناک حالات کا تسلسل میرا سایہ بن کر رہ گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میرے کون سے گناہ کی سزا تھی' بہرحال میں اس پہلی لطافت سے بھی محروم ہو گیا تھا مگر شگفتہ کے لیے اپنے دل میں محبت کی حدت کو میں نے بڑھتے ہوئے محسوس کیا تھا' کچھ اس کی نگاہوں نے مجھے یقین دلا دیا

تھا کہ وہ میرے متعلق بھی اسی طرح سوچ رہی ہے جیسا اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مجھے ایسا موقع ضرور ملے گا جب میں اسے صاف کھلے الفاظ میں بتا سکوں گا کہ وہ دنیا کی پہلی لڑکی ہے جسے کر میں دل کے دھڑکنے کا مفہوم سمجھ پایا ہوں۔ میں اسے بھی بتانا چاہتا تھا کہ میں اسے اپنانے کا عزم کر چکا ہوں اسے ہر حال میں میرا انتظار کرنا ہے مگر میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور اب جانے یہ موقع پھر والا تھا بھی کہ نہیں!

میں انھی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ریل ایک ست رک گئی۔ مراد آباد آگیا تھا مگر اتنی رات ہونے کی سے اسٹیشن پر رش نہیں تھا۔ اکا دکا قلی ننگے فرش پر بے خبر سو رہے تھے۔ گاڑی رکنے اور مسافروں کے اتر پر ایک دو قلی بڑبڑاتے ہوئے اٹھے تھے مگر مسافروں پر ڈال کر پھر کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ یہاں جتنے بھی مسافر اترے تھے ان میں سے کسی کے بھی اتنا سامان نہ تھا کہ وہ قلی کی ضرورت محسوس کر یہاں سے دہلی کے لیے سوار ہونے والے دو چار مسا کے سامان کے ساتھ ضرور قلی چاق و چوبند تھے اور رکتے ہی ڈبوں کی طرف لپکے تھے۔ میں وہاں موجود ہر کو غور سے دیکھ رہا تھا شاید میں لاشعوری طور پر اسی کی تلاش میں تھا۔ ہم اسٹیشن سے نکل کر سڑک پر آ وہاں کئی سائیکل رکشا اور تانگے کھڑے تھے۔ ہمیں ہی ایک تانگے والا لپکا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم تانگے میں سوار ایک سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ میں پہلے شگفتہ اور شرف کو ان کے چچا کے گھر چھوڑنا چاہتا تھا پھر میرا اپنے گھر جانے کا ارادہ تھا۔ میں شاید آپ کو پہلے ہی بتا چکا کہ میرے تایا اور میرے چچا مراد آباد میں ایک ہی رہتے تھے۔ یہ گھر میرے ابا ہی نے ان دونوں کو خر تھا۔ یہ کافی بڑا گھر تھا' یہاں اتنی گنجائش تھی کہ اماں چھوٹی پھوپی اور میری دونوں بہنیں رہ سکیں مگر پھر نے اماں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے لیے مکان تلاش کرلیں۔ فی الحال کرائے پر لے لیں وہاں مکان خرید لوں گا۔ میں غالباً یہ بھی بتا چکا خورشید چچا زمینوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور حساب دیا کرتے تھے۔ اب میں نے سوچا تھا کہ خور

رقم منگوا کر میں جلد ہی مکان خرید لوں گا تاکہ اماں اطمینان سے رہ سکیں۔ اب اماں اگر مکان لے بھی چکی تھیں تو میں نہیں جانتا تھا اس لیے اس وقت مجھے بہرحال چچا کے گھر ہی جانا تھا۔ چچا کا گھر شرف الدین کے' چچا کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا بلکہ پہلے میرے چچا کا گھر آتا تھا پھر شرف الدین کے چچا کا اس لیے شرف الدین نے کہا بھی کہ میں اتر جاؤں مگر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اتنی رات گئے شگفتہ کی موجودگی میں' میں شرف الدین کو تنہا چھوڑ دوں چنانچہ میں نے پہلے ان لوگوں کو اتارا اور جب تک شرف الدین کے چچا زاد فرقان حیدر نے آکر دروازہ نہ کھولا اس وقت تک میں وہیں کھڑا رہا۔ اترتے ہوئے شگفتہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہو۔ اس کی نگاہوں میں پیاس تھی جس کی شدت میں نے خود میں محسوس کی۔ میں نے فوراً ہی شرف الدین سے کہا کہ میں کل دن میں کسی وقت وہاں چکر لگا لوں گا' اصل میں تو میں یہ بات شگفتہ سے کہنا چاہتا تھا۔ فرقان حیدر نے مجھے اندر آنے اور کھانا کھا کر جانے کی دعوت دی مگر میں نے معذرت کر لی اور ان کو خدا حافظ کہہ کر دوبارہ تانگے میں آ بیٹھا۔ غالباً دس بارہ منٹ بعد ہی میں چچا کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ شاید سب لوگ سو چکے تھے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو تایا نے دروازہ کھولا۔ وہ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور لپک کر مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ ان کے انداز میں کچھ ایسی وارفتگی تھی کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میرے قتل کے منصوبے میں وہ شامل نہیں تھے۔

"تم۔۔۔ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو نا؟" انھوں نے مجھے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے اپنی بات کا جواب خود اپنی نگاہوں کے یقین کے ساتھ پانا چاہتے ہوں۔

"جی تایا! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمھاری اماں نے تو جان ہلکان کر رکھی ہے اپنی۔ سارا دن تمھاری فکر میں بولائی بولائی پھرتی ہیں اور تمام رات جاگ کر تسبیحیاں پڑھتی ہیں۔"

"جی! میں جانتا تھا۔ کہاں ہیں اماں؟ اور جہانی آپا' شنو آپا اور باقی سب خیریت سے ہیں نا! تائی کیسی ہیں اور رانا۔۔۔ کوثر ٹھیک ہے نا؟" میں نے سب کے بارے میں پوچھ ڈالا۔ کوثر ان کی بیٹی تھی جو اپاہج تھی۔

"سب ٹھیک ہیں بھئی اور تمھاری اماں تو جاگ رہی ہوں گی۔ شنو اور جہانی شاید سو چکی ہیں۔" وہ پلٹے اور مجھے لیے ہوئے برآمدے میں چلے آئے۔ اس برآمدے کو لکڑی کی جالی لگا کر انھوں نے ہال سا بنا لیا تھا۔ وہ خود غالباً اسی ہال میں سوتے تھے کیونکہ ان کا پلنگ وہیں پڑا تھا۔ سامنے مونڈھے رکھے تھے۔ "تم بیٹھو' کھانا کھایا ہے تم نے؟"

"ہاں تایا میں کھانا کھا چکا ہوں۔ میں اماں سے۔۔۔"

"ہاں بھئی وہ دائیں طرف والے دونوں کمرے تمھاری اماں اور بہنوں کے استعمال میں ہیں۔ وہ کونے والے کمرے میں ہوں گی' سب وہیں سوتے ہیں' بٹن بھی انھی کے ساتھ ہے۔" بٹن وہ چھوٹی پھوپی کو کہتے تھے۔ ان کا نام بتول تھا۔ یہ سنتے ہی میں اپنا اٹیچی کیس اٹھائے کونے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا' میں نے تایا سے کہا کہ وہ سو جائیں مگر وہ ہنس کر بولے۔

"بھئی کھانا کھا چکے ہو' چائے تو پیو گے نا اور ان میں سے کوئی نہ کوئی چائے بنانے کو اٹھے گا' تمھارے طفیل ہم بھی فیض یاب ہو جائیں گے۔ ویسے وقار میاں یہ سچ ہے کہ تمھارے آجانے سے سینے پر دھری سل سرک گئی ہے' تمھاری جولانی طبیعت کی وجہ سے میں کافی پریشان تھا اور ہاں سنو!" وہ اٹھ کر قریب آگئے۔ "پھر تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی اور تم کہاں سے آ رہے ہو! علی گڑھ سے یا امروہہ سے؟"

"امروہہ سے۔ علی گڑھ مجھے شرف الدین کے ساتھ جانا تھا اور شرف الدین کو کچھ دن رک کر جانا تھا۔ وہاں کچھ کام تھے پھر یہاں مراد آباد میں اس کے چچا کی بیٹی کی شادی تھی۔ یہاں بھی آنا تھا' سو میں اسی کے ساتھ آیا ہوں۔ یہاں سے علی گڑھ جاؤں گا۔" میں نے انھیں تفصیل سے بتایا۔

"دیکھا۔ میں جانتا تھا۔۔۔ جانتا تھا کہ تم دوسرے روز علی گڑھ روانہ ہونے والے نہیں ہو۔" وہ ایک دم بکھر گئے۔ "اور تم نے تو کہا تھا کہ تم دوسرے ہی روز روانہ ہو جاؤ گے۔ میاں اگر میں جانتا۔۔۔ تو۔۔۔" ان کی آواز کافی اونچی ہو گئی تھی۔

میں نے ان کا بازو پکڑ کر سرگوشی کی۔ "تایا! سب جاگ جائیں گے۔"

"ہیں۔۔۔!" وہ یوں چونکے جیسے انھیں سوتے سے جگا دیا ہو۔ "ہاں۔۔۔ کوئی جاگا تو نہیں!" انھوں نے چاروں طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں جاگا مگر۔ ممکن ہے تائی جاگ گئی ہوں۔" میں نے اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ تائی سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جاتیں تو واقعی ایسا ہنگامہ مچاتیں کہ گھر والے تو گھر والے' محلے والے بھی اٹھ جاتے۔ وہ دھمکی کارگر رہی اور تایا لپک کر پلنگ تک پہنچ گئے پھر مجھے دیکھ کر ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے چادر میں دبک کر لیٹ گئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ اماں جاگ رہی ہوں گی' اگر سوئی بھی ہوں گی تو تایا کی آواز پر جاگ اٹھی ہوں گی۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ وہ حسب سابق اور حسب توقع جائے نماز بچھائے بیٹھی تھیں۔ دروازے کی جانب ان کی پشت تھی' اس لیے مجھے وہ نہ دیکھ سکیں۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ ایک پلنگ پر جہانی آپا اور شنو آپا بے خبر سو رہی تھیں' دوسرے پلنگ پر چھوٹی پھوپی کروٹ لیے لیٹی تھیں' اماں کا پلنگ دروازے کے قریب تھا اور اس وقت خالی تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار اپنے گھر والوں سے اتنے روز تک جدا رہا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں ضبط نہ کرسکا اور آگے بڑھ کر شنو آپا کے پاؤں کا انگوٹھا ہلایا۔ پہلے تو انھوں نے کسمسا کر کروٹ بدل لی مگر دوسرے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں۔

"ہائے وقار۔ تم۔!" ان کی آواز پر جہانی آپا بھی اٹھ گئیں۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں کی باچھیں کھلی پڑی تھیں۔ جہانی آپا نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیے اور رو پڑیں۔ اماں سب کی آوازیں سن چکی تھیں مگر نماز میں مصروف تھیں۔ شنو آپا نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر پھوپی کو بھی اٹھا دیا حالانکہ میں نہ نہ کرتا رہ گیا تھا۔ پھوپی اٹھیں تو مجھے دیکھ کر لپک کر میرے قریب آگئیں۔

"کہاں رہ گیا تھا تو۔" وہ بھی بے ساختہ رو پڑیں۔ میں نے اپنی بہنوں اور پھوپی کے پیار کا یہ مظاہرہ آج پہلی بار دیکھا تھا شاید اس لیے کہ میں ان لوگوں سے پہلی بار ہی اتنے روز تک الگ رہا تھا۔

اسی وقت اماں نے بھی سلام پھیرا اور پلٹ کر مجھے دیکھا پھر تڑپ کر آگے بڑھیں اور مجھ سے لپٹ گئیں۔ "وقار الحسن! تم ٹھیک ہو نا۔ میرا تو کلیجہ ہی پھٹ جاتا تھا کہ کہیں تمھیں۔ کل تو میں نے تمھارے تایا سے صاف کہہ دیا تھا کہ یا تو وقار الحسن کو لے آؤ یا پھر ہمیں امروہہ چھوڑ آؤ۔

بہنیں بھی کڑھ کڑھ کر آدھی رہ گئیں۔" انھوں نے اپنی آنکھوں کے کونے صاف کرتے ہوئے کہا۔

مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ آج میں خود کو بہت اہم سمجھ رہا تھا پھر میں نے انھیں بتایا کہ میں شرف الدین کے ساتھ آیا ہوں۔ اماں یہ سن کر سینہ پکڑ کر رہ گئیں تھیں کہ میں اتنے روز امروہہ ہی میں رہا ہوں۔ وہ بھی میری وعدہ خلافی پر ناراض تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں سمجھایا کہ میرا اکیلا علی گڑھ جانا بیکار تھا اور شرف الدین اپنے کام ختم کیے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ اماں میرے چہرے پر کچھ کھوج رہی تھیں۔ میں نے خود کو بہت خوش و خرم ظاہر کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں ایک دم پریشان کردوں۔ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ شنو آپا میرے کہنے پر چائے بنانے جا چکی تھیں' پھوپی ان کے ساتھ تھیں جب کہ جہانی آپا اور اماں میرے پاس بیٹھی میرے چہرے پر' میری آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

"وقار الحسن!" اماں نے دھیرے سے پکارا۔

"جی اماں!" میں نے انھیں دیکھا۔

"تم اتنے روز خیریت سے تو رہے ہو نا؟ میرا مطلب ہے کہ سنگستلا۔"

"اماں! میں بہت تھک چکا ہوں ویسے میں آپ کے سامنے ہوں' اگر خیریت سے نہ ہوتا تو بھلا یوں یہاں بیٹھا ہوتا۔"

"چھوڑیں اماں۔ اب تو فکر چھوڑ دیں۔ ٹھیک تو کہہ رہا ہے' ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس شکر کریں خدا نے ہماری سن لی اور بھائی خیریت سے آگیا۔" جہانی آپا نے اماں کو ٹوک دیا پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گئیں۔ "وقار ہم سب کی جانیں سولی پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اب تم کہیں نہ جانا۔ میں تو کہتی ہوں علی گڑھ جانے کی بھی کیا ضرورت ہے تم نے جتنا پڑھ لیا کافی نہیں ہے کیا؟ یہیں کوئی کاروبار کرلو۔"

"جہانی آپا! پلیز۔ میری تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ مجھے امروہہ میں رہ کر کچھ نہیں ہوا تو بھلا علی گڑھ میں کیا ہوگا۔ میں چھٹیوں میں آتا رہوں گا۔"

اس وقت پھوپی اور شنو آپا بھی آگئیں۔ میں نے تایا کے لیے چائے کا پیالہ لیا اور ان کے پلنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بے خبر سو رہے تھے میں واپس آگیا۔ ہم سب ہی کافی دیر جاگتے رہے۔ میں پہلی بار اپنی بہنوں کو خوش دیکھ رہا تھا۔ پھوپی کے چہرے پر بھی گلاب سے کھلتے محسوس ہو رہے

تھے۔ اماں کے چہرے پر پھیلا تردد بھی ختم ہو چکا تھا۔ ان کے ہاتھ میں اب بھی تسبیح تھی مگر وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھی ہم سب کی گفتگو سن رہی تھیں۔ میں ٹرین کے جھوٹے قصے سناتا رہا۔ شاید یہ جھوٹے قصے میں انھیں اس لیے سنا رہا تھا کہ وہ لوگ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھیں اور اگر میں یہ جھوٹے قصے نہ سناتا تو ان کے سوالات حویلی میں ہونے والے واقعات کے بارے میں ہوتے اور وہ خوفناک قصے سنا کر میں انھیں دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "چلو جہانی' شنو اب اسے آرام کرنے دو۔ دیکھو تو کتنا تھکا ہوا آیا ہے۔" اماں نے کہا۔

میں واقعی بہت تھکا ہوا تھا اور سونا بھی چاہتا تھا مگر اس لمحے مجھے اپنی زندگی کی جو پہلی خوشی اور محبتوں کا اتنا بے باک اظہار ملا تھا اسے کھو دینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔

میری تھکاوٹ کے بارے میں سن کر میری بہنوں نے اپنا پلنگ خالی کردیا۔ شنو آپا اماں کے پاس اور جہانی آپا چھوٹی پھوپی کے پاس جا کر لیٹ گئیں۔ میں لیٹا تو میری کمر میں درد کی ایک شدید قسم کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بہ مشکل اپنی کراہ کو دبایا۔ میں سخت نیند کے باوجود کافی دیر تک سو نہیں پایا اس ادھڑی ہوئی کھال والے شخص کی سرگوشی چپکے سے میرے ذہن میں گونج اٹھی۔ اس نے حویلی میں دوبارہ ملنے کو کہا تھا۔ اس بات سے کم از کم یہ بات ضرور واضح ہو گئی تھی کہ اس شخص کا تعلق بھی ہماری ہی حویلی سے تھا ورنہ وہ چودھویں کی رات کو پھر حویلی میں ملنے کا کیوں کہتا! پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا کہ یہ محض میرا وہم بھی تو ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس شخص نے مجھے نہیں کہی تھی بلکہ میں نے خود میں گونجتی محسوس کی تھی۔ اس خیال نے مجھے کافی مطمئن کردیا اور میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ یہی بات ہوگی۔ اچھا ہوا جو میں نے شرف الدین کو یہ بات نہیں بتائی تھی ورنہ وہ تو کافی مذاق اڑاتا۔ ٹھیک ہے کہ وہ بھی اب سنگستلا کے معاملے میں قائل ہو گیا تھا مگر ضروری تو نہیں کہ وہ میری ہر بے سروپا بات کو حقیقت سمجھ لے۔ وہ بھی مجھے یہی بات کہتا کہ یہ میرا وہم ہے۔ میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ جب بھی آنکھیں بند کرکے سونے کی شعوری کوشش کرتا' اس کا بغیر کھال کا خوفناک چہرہ سامنے آجاتا۔ وہ یقیناً کوڑھ قسم کی کسی بیماری کا شکار تھا۔

"پھر وہ ہوا میں تحلیل کیسے ہو گیا؟" یہ سوال میرے ہی اندر سے ابھرا تھا۔

میں پانی لینے گیا تھا۔ کیا معلوم وہ اسی وقت دروازہ کھول کر چلا گیا ہو۔ میں نے واپس آکر دروازہ چیک ہی کب کیا تھا بلکہ شرف الدین کے ہوش میں آتے ہی میں اور وہ' دونوں ہی شگفتہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔" میں نے تاویل پیش کی۔ "پھر جب ہم مراد آباد پر اترنے لگے تھے تو بھی شرف الدین پہلے دروازے سے باہر نکلا تھا اور میں سامان کھڑکی سے اسے دینے کے لیے کھڑکی ہی کے پاس کھڑا رہا تھا۔ کیا پتا دروازہ کھلا ہوا ہو۔ میں خود ہی خود کو دلاسا دے رہا تھا پھر جانے کب اور کیسے مجھے نیند آگئی اور میں ایسا بے خبر سویا کہ گھر کے تمام لوگوں کے اٹھ جانے کے باوجود بے سدھ پڑا سوتا رہا۔ میں گزشتہ چار پانچ روز سے جی بھر کر سویا بھی تو نہیں تھا شاید وہی تھکن تھی جو میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔

شنو آپا نے سوا نو بجے مجھے اٹھایا۔ وقت کے بارے میں انھوں نے مجھے بتایا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں پہلی مرتبہ اتنی دیر تک سویا تھا ورنہ ہمیشہ فجر کی نماز کے وقت اٹھ جایا کرتا تھا۔ مجھے نماز کے نکل جانے کا بہت قلق ہوا۔ شنو آپا نے بتایا کہ اماں نے اور پھر جہانی آپا نے فجر کے وقت مجھے اٹھانے کی بہت کوشش کی مگر میں تو بالکل بے ہوش پڑا سو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اماں نے کیسے برداشت کرلیا ورنہ وہ تو پانی کا جگ انڈیل کر اٹھا دیتیں' بڑی پھوپی کو اکثر وہ اسی طرح اٹھایا کرتی تھیں' چھوٹی پھوپی نے کبھی فجر کی نماز کی پابندی نہیں کی تھی مگر بڑی پھوپی کے انتقال کے بعد وہ بھی فجر کے وقت اٹھ جایا کرتی تھیں۔ میں نے اس بارے میں شنو آپا سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ جب میں کسی طرح نہ اٹھا تو اماں نے خود ہی شنو آپا کو منع کردیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ جانے ہمارے آنے کے بعد سے سویا بھی ہے کہ نہیں۔

انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں اٹھ کر غسل خانے چلا گیا۔ شنو آپا میرے کپڑے غسل خانے میں کھونٹی پر ٹانگ چکی تھیں۔ میں اپنی واسکوٹ سونے سے پہلے اتار چکا تھا۔ غسل خانے کے قریب پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ جھالوں کی جوڑی اسی واسکوٹ میں ہے۔ میں الٹے پاؤں کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں نے واسکوٹ میں سے جھالے نکال لیے اور اسے اپنے پلنگ کا گدا اٹھا کر سرہانے رکھ دیا۔ اب میں مطمئن تھا۔ کچھ دیر بعد میں نہا دھو کر فارغ ہو گیا۔ میں نے قضا نماز ادا کی اور تایا کے پاس جا پہنچا' اماں اور تائی بھی وہیں تھیں' کوثر

بھی ایک کھٹولے پر سیدھے پڑی تھی۔ میں سب کو سلام کرکے کوثر کی طرف بڑھ گیا۔ کوثر اور میں ہم عمر تھے۔ اسے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اس کا نچلا دھڑ بیکار تھا جب کہ چہرے مہرے سے وہ کافی صحت مند لگتی تھی۔ آنکھوں میں چمک بھی تھی مگر پھر بھی آنکھوں سے گہری اداسی کا احساس ہوتا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ کر اس کی خیریت پوچھنے لگا۔ وہ مجھ سے مل کر کافی خوش تھی۔ اس نے شکایت بھی کی میں نے اب سے پہلے اس سے ملنے یا اس کی خیریت پوچھنے کی زحمت نہ کی۔ اسی وقت چھوٹی چچی باہر آئیں۔ ان کی تیوریوں پر حسب عادت بل پڑے ہوئے تھے۔

"لو بھلا اس خاندان میں کسی کی خیریت یا خیر خبر لینے کا رواج ہی کب ہے!" انھوں نے اپنی تیز آواز میں کہا اور تایا کے سرہانے کی میز سے پاندان اٹھا کر مونڈھے پر جا بیٹھیں۔

"وہاں یہ بات بھی ہے!" تایا اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ "بھئی جب سارا خاندان ہی مزاج آشنا ہو تو اس کی ضرورت ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے اور میاں! سچ پوچھو تو اس وقت تک ہر جگہ خیریت ہی ہوتی ہے جب تک کوئی ایسی ویسی اطلاع نہ آجائے۔"

وہ چچی پر طنز کر رہے تھے۔ وہ کافی تیز مزاج کی تھیں اور مشہور تھا کہ ان کی زبان کندھوں پر پڑی رہتی ہے۔ مزاج کی تیز وہ ہمیشہ سے تھیں مگر اب اولاد کی محرومی نے تو انھیں دو آتشہ بنا ڈالا تھا۔ سب سے زیادہ وہ اماں سے جلتی تھیں اس لیے کہ سب بھائیوں کی بیویوں میں وہی ایک صاحب اولاد تھیں یوں تو تایا کے بھی بیٹی تھی کوثر' مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا' البتہ میں' جہانی آپا اور شنو آپا نہ صرف یہ کہ صحت مند تھے' جوان تھے بلکہ ابا اور اماں کی تربیت نے ہمیں کافی سدھارا ہوا تھا۔ جہانی آپا اور شنو آپا بے حد سگھڑ تھیں کیوں کہ اماں سگھڑ تھیں اور ان کا سگھڑ آپا پورے خاندان میں مثال بنا ہوا تھا جبکہ چچی مزاج کی تیز ہونے کے علاوہ پھوہڑ بھی تھیں اور پھر خدا نے انھیں اولاد جیسی نعمت سے بھی محروم رکھا تھا۔ ان تمام باتوں نے مل کر انھیں انتہائی بدمزاج' لو اور بد زبان بنا ڈالا تھا اور چچا۔۔۔ جنہیں میں بہت پیار کرتا تھا' جنھیں بہت محبت والا' شفیق اور مہربان سمجھتا تھا ان کا پول تو مجھ پہ کھل ہی چکا تھا۔ دکھ کی ایک لہر سی مجھ میں دوڑ گئی۔

چچی نے تایا کی بات کا جواب تو نہ دیا مگر سانپ کی پھنکار جیسی "ہوں" ان کے منہ سے نکلی اور وہ پاندان پٹخ کر بڑبڑ کرتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"بات کرتی ہے کہ سیسہ انڈیلتی ہے کانوں میں' اے میں نے کہا بہرا کرنے کی بھی کوئی دوا ہے تمھارے حکیم جی کے پاس یا نہیں؟" تائی نے تایا سے پوچھا۔

"اللہ بھلا کرے حکیم جی کا' بہرا کرنے کی دوا ایجاد تو کی تھی مگر زیادہ تر خود ہی استعمال کرکے ختم کردی اپنی بیوی کی وجہ سے۔ یادداشت پٹ ہوئی تو بیوی سے نسخہ پوچھتے رہے۔ اب بیوی جواب دیتی ہیں اور انھیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ جو شیشی میں کچھ تھوڑی بہت چپڑی ہوئی رہ گئی تھی وہ میں نے استعمال کرلی۔" انھوں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں ہنسی برداشت نہ کرسکا۔ "اے بھائی دلھن! بچاری دکھیا ہے' چھوڑیں بھی۔" اماں نے تائی کے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔

"اے تو دکھیا ہونے کا یہ مطلب کہاں سے نکل گیا کہ سارے زمانے کو الزام دیتے پھرو۔ ہم نے کیا ہے انھیں دکھیا! اور اولاد تو اللہ کی دین ہے' ہماری ہی قسمت دیکھ لو۔ باقی انھیں کوئی غم نہیں۔ اللہ بخشے اظہار الحسن نے ہمیشہ خیال رکھا' ذرا جو کسی بات کی فکر ہونے دی ہو اور دلھن تمھارا ہی ظرف ہے کہ اب تک بھگت رہی ہو۔ میں تو کہوں حصہ دے دلا کر الگ کرو۔ اچھا برا ان کی قسمت کا' تم ساری ساری عمر بھرتی رہو گی تب بھی منہ سے پھول نہ جھڑنے والے۔"

ان کا یہ جملہ مجھے بچھو کے ڈنک کی طرح لگا۔ میں نے چونک کر تایا کو دیکھا۔ وہ لاتعلق سے حصے کی طرف متوجہ تھے۔ مجھے لگا جیسے تائی اور تایا بھی چچا کے اس منصوبے میں شریک تھے۔ اماں بھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ غالباً ان کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی۔

"بھائی صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟" اماں نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ وہ نہ پوچھتیں تو میں یہ پوچھنے کا ارادہ کرچکا تھا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ جو میں سوچ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

"آں۔۔۔" وہ چونکے۔ "کیا ہوا۔۔۔ کچھ پوچھا تم نے؟"

"ہاں میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ لبن میاں اپنے حصہ لینا چاہتے ہیں تو انھیں دے نہ دیا جائے!"

"حصہ لینا چاہتے ہیں؟" انھوں نے حیرت سے پہلے اماں کی طرف دیکھا پھر تائی کو اور پھر مجھے دیکھ کر نتھنے پھلا لیے۔

"یعنی اب اس خاندان کے حصے بخرے بھی ہونے باقی ہیں!" وہ کافی غصے میں لگ رہے تھے۔ ان سے ایسی اداکاری کی توقع نہیں تھی مجھے۔

"آپ سمجھے نہیں شاید؟" تائی نے پان لگاتے ہوئے کہا۔

"اور اللہ کرے آپ لوگوں کی باتیں ہم ساری عمر نہ سمجھیں۔" انھوں نے غصے میں کہا اور حقے کی چلم کریدنے لگے۔

"ارے توبہ ہے۔۔۔ آپ سے بات کرنا تو۔۔۔" تائی نے دوپٹا کان کے پیچھے اڑس کر منہ پھیر لیا۔

"بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔۔۔ ہے نا! کہہ دیجیے' کہہ دیجیے' صرف ایک یہی محاورہ رہ گیا تھا' ورنہ تو سارے محاورے ہمارے ہی اوپر صادق ہوتے آئے ہیں۔"

"ارے توبہ ہے' جو جی میں آئے کیجیے' میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ بات تو پوری سنی نہیں ہے آپ نے اور۔۔۔"

"مفہوم پورا سمجھ لیا ہے۔" انھوں نے تائی کو غصے سے گھورا۔ "اور آج کان کھول کر سن لو۔ آیندہ میں یہ بات کبھی کسی کی زبان سے نہ سنوں' نہ اظہار الحسن نے کبھی کوئی لی کی اور نہ وقار الحسن سے مجھے ایسی کوئی توقع ہے۔"

"تایا! اگر چچا ایسا چاہتے ہیں تو حرج ہی کیا ہے۔ میں بھی اس بڑی ذمے داری سے بچ جاؤں گا۔ ویسے بھی یہ ان کا حق ہے۔" میں نے دبے لہجے میں کہا۔

"میاں باؤلے ہوئے ہو!" انھوں نے پہلو بدلا۔ "تم کیا جانو کہ حق کیا ہے۔ اس بات کو دبا ہی رہنے دو' جو کچھ جیسا چل رہا ہے اسے چلنے دو۔ نوٹوں کے کبوتر بن کر اڑ جائیں گے۔ تیا پانچا ہو جائے گا ساری جایداد کا۔" وہ بے پناہ غصے میں آچکے تھے۔ ان کا چہرہ تپنے لگا تھا اور آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنے خیال پر شرمندگی ہوئی۔ اماں کے چہرے پر بھی خجالت تھی۔ اب بات صاف ہو چکی تھی کہ یہ سارا کھیل چچا اکیلے ہی کھیل رہے ہیں۔

"میاں بیٹھے بٹھائے عزت بنی ہوئی ہے' گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں اور انھیں بھلا روپے پیسے کی کیا کمی محسوس ہوئی کہ تمھیں یہ خیال آیا۔" وہ تائی پر برس پڑے۔

تائی جواب دیے بغیر اٹھ کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ اماں بھی روٹی پکانے کا بہانہ کرکے اٹھ گئیں' میں چور سا بنا بیٹھا رہ گیا۔ کوثر سہمی ہوئی سی تھی۔ چچی کا کہیں پتا نہ تھا۔ تایا کی

آواز ان تک بھی گئی ہوگی مگر انھیں تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چچا غالباً گھر میں نہیں تھے اس لیے وہ اب تک نظر نہیں آئے تھے۔

"چچا کہاں ہیں تایا؟" میں نے پوچھا تو وہ بھنا گئے۔

"کسی کوٹھے پر چڑھے کبوتر بازی کر رہے ہوں گے اور بھلا کہاں جائیں گے؟ میاں کبوتر باز ہیں اور بیوی جملے باز۔"

میں بہت زمانوں بعد یہاں آیا تھا' شاید بچپن میں آیا ہوں گا۔ میں ان لوگوں کے رہن سہن سے' ان کی سرگرمیوں سے قطعی ناواقف تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ بڑے رکھ رکھاؤ کے عادی ہوں گے کیوں کہ ہمارے ہاں تو اونچی آواز میں بولنا ہی عیب سمجھا جاتا تھا' اب اندازہ ہوا کہ یہ سب اماں کا کمال تھا۔ لوگ ان کی تعریف غلط نہیں کیا کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تایا اور چچا کے مراد آباد آجانے کے باوجود دادی ہمی لوگوں کے ساتھ رہی تھیں۔ دادی کے بارے میں بھی یہی سنا گیا تھا کہ طبیعت کی تیز تھیں' ان کا گزارا کم از کم چچی تائی کے ساتھ ہونا بہت ہی مشکل تھا۔

میں بھوک کا بہانہ کرکے اٹھ گیا۔ بھوک واقعی لگ رہی تھی۔ میں اتنی دیر سے اٹھا تھا کہ ناشتے کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا البتہ میں نے شنو آپا سے کہہ کر چائے بنوالی تھی۔ میں اماں والے کمرے میں آیا تو اماں ایسے بیٹھی تھیں جیسے میری ہی منتظر ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی بول اٹھیں۔ "وقار الحسن! میں پریشان ہوں۔ وہاں کے حالات جاننا چاہتی ہوں۔"

میں خود بھی اماں سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں اتنے بہت سے لوگوں میں یہی وقت مناسب لگا' رات کو تو بہنیں اور پھوپی یہیں ہوتی تھیں۔ باہر چچی' تائی اور تایا وغیرہ تھے اس وقت بہنیں اور پھوپی کام میں لگی ہوئی تھیں' میں نے موقع غنیمت جانا۔

"اماں! رمضو بابا کو کسی نے قتل کردیا۔"

"کیا؟" وہ اچھل پڑیں۔ "کیا کہہ رہے ہو وقار الحسن! وہ۔۔۔ وہ تو اتنے ضعیف اور۔۔۔"

"جی! اس کے باوجود انھیں قتل کردیا گیا اور جانتی ہیں کہ انھیں قتل کرنے والی کوئی عورت تھی۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا اور ان کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

"عورت۔۔۔ کیا تم۔۔۔ تم باؤلے ہوگئے ہو وقار الحسن!" ان کا چہرہ پیلا ہو چکا تھا۔ "کوئی عورت قتل کیسے کرسکتی

ہے؟" ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں کرسکتی قتل! عورت تو بہت بڑے بڑے کام کرسکتی ہے اماں۔" میں نے پھر کہا۔

"میں۔۔۔ میں نہیں مان سکتی اور پھر بھلا وہ بوڑھا آدمی جو پہلے ہی قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہو' اسے کون قتل کرے گا! کیا اس کی بیوی نے۔۔۔!"

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "نہیں اماں! اسے جس عورت نے قتل کیا ہے اسے آپ جانتی تھیں۔۔۔ اور وہ آپ کو جانتی ہے۔"

"کیا بکتے ہو؟" اماں آہستہ مگر کرخت لہجے میں بولیں۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسے ہمارے خاندان کی کسی عورت نے قتل کیا ہے!"

"کیا خاندان سے باہر کی عورتوں سے آپ کا میل ملاپ نہیں تھا؟" میں نے الٹا سوال کرڈالا۔

"وقارالحسن! اپنا لہجہ درست کرو اور کھل کر بات کرو کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ میرے خیال میں' میں ایسی کسی عورت سے میل ملاپ نہیں رکھ سکتی جو عمر کے کسی بھی حصے میں کسی کو قتل کرنے کی ہمت رکھتی ہو۔" ان کے لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی اور مجھے بھی شدت سے احساس ہوا کہ میرا لہجہ درست نہیں ہے۔ میں نہ معلوم کس وجہ سے اماں کو قصوروار سمجھ رہا تھا۔ شاید رمضو بابا کی ادھوری بات نے میرے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کردی تھی پھر انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ بابا ہر چودھویں کی رات اس کنویں پر گزارا کرتے تھے اور اماں یہ بات مجھ سے چھپا گئی تھیں۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں۔ اماں کو تفصیل سے ہر بات بتانا ناگزیر ہوچکا تھا' کچھ اس لیے بھی کہ کچھ باتیں میرے لیے وضاحت طلب تھیں۔ میں نے اپنے سرہانے سے جھالوں کی جوڑی والا لفافہ نکالا اور اماں کے سامنے اپنی ہتھیلی پر الٹ دیا۔ سونے کے وہ جھالے دیکھ کر اماں اچھل پڑیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کہاں سے ملے تھیں؟ کیا نادر شاہ کے پاس سے کوئی آیا تھا؟"

"کون نادر شاہ؟" میں نے حیرت سے اماں کو دیکھا۔

"عصمت جہاں کے باپ۔" اب اچھلنے کی باری میری تھی۔ عصمت جہاں والی بات کو دل اب بھی قبول نہیں کرپایا تھا جی چاہتا تھا کہ اس بات کی تردید ہوجائے کہ مجھ

سے ملنے آنے والی خاتون عصمت جہاں ہی تھیں یا ر
بابا کو قتل کرنے والی عصمت جہاں تھیں۔

"نہیں اماں۔۔۔ عصمت جہاں خود آئی تھیں۔" میں
دھیرے سے کہا تو انھوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں پا
ہوگیا ہوں۔

"وقارالحسن' میرا دل بہت کمزور ہوچکا ہے' یہ تم ا
فول بک رہے ہو یا۔۔۔ یا مذاق کررہے ہو۔"

"اماں نہ میں اول فول بک رہا ہوں اور نہ ہی مذاق
ہوں۔" میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ پھر میں
انھیں ساری تفصیل بتادی کہ کس طرح ایک برقعہ پو
خاتون ایک جھالا پان والے بابا کو دے گئیں اور دوسرا
رمضو بابا کی مٹھی سے حاصل کیا گیا۔ میں نے انھیں یہ
بتایا کہ انھوں نے اماں کو سلام کہلوایا ہے۔ اماں بہت
سب کچھ سنتی رہیں۔

"اماں! مجھے لگتا ہے کہ یہ جھالے عصمت جہاں کے
مگر۔۔۔ وہ یہ مجھے کیوں دے گئیں؟"

"یہ۔۔۔ یہ جھالے میرے ہیں۔" اماں نے بہت د
لہجے میں کہا' میں اچھل پڑا۔ شاید اماں کو اندازہ نہیں تھا
وہ کیا کہہ رہی ہیں' اگر یہ بات انھوں نے کسی اور
سامنے کہی ہوتی یا ایک جھالا رمضو بابا کی مٹھی سے پول
برآمد کرچکی ہوتی تو اماں کی اس بات کا انجام کیا ہوتا' میر
سوچ کر ہی لرز گیا۔

"آپ کے ہیں مگر۔۔۔"

"ہاں وقارالحسن! یہ جھالے عصمت جہاں مجھ
اپنے چچازاد کی شادی پر مانگ کرلے گئی تھیں اور م
صولت بیگ نے جب عصمت جہاں کو اٹھوایا اس وقت
یہ جھالے پہنے ہوئے تھیں۔ جب میں نے انھیں صول
بیگ کے کمرے سے لڑکھڑاتے ہوئے نکل کر باہر جاتے د
تھا تب بھی یہ جھالے ان کے کانوں میں تھے۔ شاید
انھیں واپس کرنے آئی ہوں اور تبھی مرزا صولت بیگ
نے۔"

"مگر یہ دوسرا جھالا رمضو بابا کی مٹھی میں کیسے پہنچا۔
ہے کہ وہ۔"

"ہاں۔" اماں نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ بات م
نے بھی سنی تھی کہ عصمت جہاں کو ان کے کمرے م
پہنچانے والے رمضو بابا تھے۔"

"کس سے سنی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

میں نے تمہاری دادی کو کہتے سنا تھا۔ وہ رمضو بابا کو
رہی تھیں' شاید اس بات کا ذکر بابا نے کسی سے کیا تھا
نہیں کیا بات تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "رمضو! نادر شاہ
صولت بیگ کے دوستوں میں سے ہیں۔ ڈائن بھی
گھر چھوڑ کر کھاتی ہے۔" ان کی اس بات سے مجھے پتا
اس سازش کارروائی میں کہیں نہ کہیں رمضو بابا کا ہاتھ
تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے تھے کہ انھیں ورغلا کر
صولت بیگ تک پہنچا دیں۔"

"اماں! اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یعنی عصمت
نے یہ جھالے آپ تک پہنچا کر یہی جتانے کی کوشش
ہے کہ وہ کم از کم رمضو بابا سے اپنا انتقام لینے میں
یاب ہوگئی ہیں' پھر انھوں نے آپ کی امانت بھی آپ
پہنچادی لیکن اماں آپ نے بتایا تھا کہ ان کا خاندان
ہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں اور شرف الدین ان کی قبر پر
تو وہاں تازہ گلابوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ کیا ان کے
ان کا کوئی فرد اب بھی امروہہ میں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ ہاں شاید۔۔۔ مگر وہ ان کے خاندان کا نہیں۔"
کھوئے کھوئے لہجہ میں بولیں۔

"کون اماں!"

"فیض اللہ سید کا بیٹا' ہمایوں فیض اللہ۔ یہ لوگ محلہ
میں رہتے تھے۔ ہمایوں فیض اللہ' فوج میں تھے'
ت جہاں کو پسند کیا تو رشتہ بھی بھیجا مگر نادر شاہ کے
ان میں شادی خاندان سے باہر نہیں کی جاتی تھی۔ سو
ر کردیا گیا۔ کاش نادر شاہ مان جاتے تو وہ جلد ہی شادی
کے پٹیالہ جاچکی ہوتیں۔ ان کی پوسٹنگ ان دنوں پٹیالہ
تھی اور وہ شادی بھی انھیں چھٹیوں میں کرنا چاہتے
۔ عصمت جہاں نے بھی ہمایوں کو دیکھا تھا اور پسند بھی
نے لگی تھیں۔ میرے ذریعے انھوں نے اپنی اماں تک
ناپسندیدگی کی بات بھی پہنچائی تھی مگر ان کی اماں نے
انٹ دیا تھا۔"

"اماں یہ پرکاش کون تھا؟" میں نے اچانک ہی پوچھا۔
کا رنگ ایک بار پھر ایک دم پیلا پڑ گیا۔ انھوں نے
کر مجھے دیکھا۔ وہ کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھی خلاؤں
گھورتی رہیں۔ میں منتظر تھا' نہ جانے کیوں میرا دل
نے لگا اور دھیرے دھیرے اس کی دھڑکن کنپٹیوں میں
ہونے لگی۔ ان کی پراسرار خاموشی مجھے مضطرب

کیے دے رہی تھی۔ "اماں!" میں نے ان کے دونوں ہاتھ پیر تھام لیے۔ "اماں! مجھے ہر بات بتادیں' اگر کوئی بات میرے علم میں نہ ہوئی تو۔ تو مجھے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔" میں نے ان کی دکھتی رگ کو چھولیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ بیٹے وقارالحسن! تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" وہ گھبرا اٹھیں۔

"اسی لیے کہتا ہوں اماں کہ مجھے ہر بات بتادیں' کسی بھی بات کا چھپانا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔"

"پرکاش۔۔۔!" اماں کے لبوں سے ایک آہ نکلی۔ "وہ شکنتلا کا منگیتر تھا۔ اس کا محبوب' جس رات مرزا صولت بیگ نے شکنتلا کو لوٹا تھا بیٹا' وہ۔۔۔ وہ حویلی میں گھس آیا تھا۔ جانے اسے کیسے خبر ہوگئی تھی' شاید لوگ سچ کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اور سچا پیار کرنے والے محبوب کی تکلیف کو اپنے وجود میں محسوس کرتے ہیں۔ بالکل یہی اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ شکنتلا کو مرزا صولت بیگ نے تین روز تک اپنی قید میں رکھا تھا۔ میں نے تمہارے ابا سے سنا تھا کہ اسے دوسری منزل کی دوچھتی میں بند کیا گیا تھا۔ دوسری ہی رات کو پرکاش جیسے اس کی خوشبو کا پیچھا کرتا ہوا اس حویلی تک پہنچ گیا۔ وہ کسی طرح تیسری منزل تک بھی پہنچ گیا تھا۔ یہ باتیں تمہارے ابا نے مجھے بتائی تھیں' انھیں یہ سب کیسے پتا چلا یہ انھوں نے مجھے مرنے سے صرف ایک روز پہلے بتایا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ پرکاش ابھی دوسری منزل پر ہی تھا کہ اسے شکنتلا کی سسکیوں کی آواز سنائی دی' وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا' شکنتلا کو آوازیں دینے لگا' یہ آواز جونہی مرزا صولت بیگ تک پہنچیں' انھوں نے اپنے خاص ملازموں کی مدد سے اسے پکڑ لیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ شکنتلا کے ہاتھ پیر باندھ کر اور منہ بند کرکے اسے دوچھتی سے نکال کر مرزا صولت بیگ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور پرکاش کو اس دوچھتی میں قید کردیا گیا۔ اسی رات شکنتلا کو لوٹا گیا' اس کی عصمت تار تار کردی گئی اور جانے کس طرح اسی رات شکنتلا وہاں سے بھاگ نکلی۔ اسے معلوم تھا کہ پرکاش اس دوچھتی میں قید ہے مگر اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اسے آزاد کراتی' اس نے چیخ کر اسے بتایا کہ وہ جارہی ہے اور پھر وہ بھاگتی چلی گئی۔ مرزا صولت بیگ کو اس نے ایک دھات کے مجسمے سے زخمی کردیا تھا پھر اس نے اسٹیشن کے راستے میں آنے والے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر

لی۔ تمھارے ابا نے بتایا کہ ایک روز تیسری منزل کی دو چھتی میں آگ لگ گئی۔ یہ آگ کیسے لگی اور کس نے لگائی' یہ پوچھنے کی نہ کسی میں ہمت تھی اور نہ جرات۔ نہ ہی اس وقت کسی کو اوپر آنے دیا گیا۔ بس نیچے سے لوگوں نے شعلے بھڑکتے دیکھے جب سب لوگ چیختے ہوئے اوپر بھاگے تو مرزا صولت بیگ نے انھیں سیڑھیوں سے ہی یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ کچھ نہیں ہوا۔ کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت تمھارے ابا کو شک ہو گیا کہ کوئی ایسی بات ہے جسے وہ چھپا رہے ہیں۔ اسی رات وہ دبے پاؤں اوپر پہنچ گئے۔ تیسری منزل تو بند تھی مگر دوسری منزل کی دو چھتی باہر تک کالی ہو چکی تھی' دیواروں پر گاڑھا دھواں جما ہوا تھا۔ وہ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھے تب انھیں کراہیں سنائی دیں' انھیں لگا کہ جیسے اندر کوئی ہے اور شدید کرب کی حالت میں ہے۔ انھوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر باہر پڑے ہوئے موٹے تالے کو وہ کسی طرح بھی نہ کھول سکے' توڑنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ وہ لگاتار تین روز تک اوپر جاتے رہے' ہر رات وہ مختلف چابیاں چرا کر اپنی جیب میں رکھ لیتے تھے اور رات گئے جب انھیں مرزا صولت بیگ کے سو جانے کا یقین ہو جاتا تھا تب اوپر پہنچ کر ان چابیوں کو آزماتے تھے مگر وہ ناکام رہے۔ تیسرے روز وہاں سے آنے والی کراہوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔ انھیں خوف ہوا کہ اندر جو بھی ہے وہ مر بھی سکتا ہے' ممکن مر ہی گیا ہو۔ اتفاق سے اس روز مرزا صولت بیگ کو انگریز جنرل کی پارٹی میں جانا تھا پھر ان کے ساتھ شکار پر بھی جانا تھا۔ وہ تین روز کا پروگرام بنا کر گئے تھے۔ یہ موقع غنیمت سمجھ کر تمھارے ابا نے اس دو چھتی کو کھول لیا' تالے توڑ دیے اور پھر۔۔۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں ایک شخص کی لاش پڑی ہے جو بری طرح جل چکا ہے' اس کے چہرے پر چربی اور کہیں کہیں گوشت نظر آ رہا تھا۔ اسے پوری طرح جلایا بھی نہیں گیا تھا' یوں لگتا تھا جیسے مرزا صولت بیگ اسے جلا کر مارنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے بلکہ مقصد صرف اسے اذیت دینا تھا۔" اماں لمحہ بھر کو رکیں تو میں نے خود ہی ٹھنڈی لہریں سی دوڑتی محسوس کیں' وہ جو حلیہ بتا رہی تھیں وہ بالکل اسی شخص کا سا تھا جسے میں ٹرین میں دیکھ چکا تھا۔ وہی چہرے پر چربی اور گوشت' ادھڑی ہوئی کھال' بالکل ایسے جیسے جل گیا ہو' میں تو اسے کوئی خطرناک بیماری سمجھا تھا مگر جب اماں نے بتایا کہ وہ جل چکا تھا اور چربی اور گوشت چہرے پر موجود تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ایسا ہی تھا۔

"وقار الحسن! اس کی حالت اتنی خراب تھی تمھارے والد دہشت کی وجہ سے کئی روز تک بیمار رہے یہ بات انھوں نے اس خوف سے کسی کو نہیں بتائی کہ آ کر ٹوٹے ہوئے تالے دیکھ لیں گے اور قیامت مچا گئے۔ ویسے بھی اس وقت تمھارے ابا کی عمر اتنی زیا تھی کہ انھیں سمجھ دار کہا جاتا اسی لیے انھیں ایسی ترکیب نہ سوجھی کہ وہ بات بنا سکتے یا کم از کم اپنے ابا صورت حال سے آگاہ کر سکتے۔ وہ تو لاش دیکھ کر ہی بیا گئے پھر دادا کا خوف ایسا بیٹھا کہ انھوں نے چپ ہی لی۔ بالکل گم صم ہو کر رہ گئے۔ سنا ہے کئی ماہ تک مسلسل علاج ہوا تب کہیں جا کر ٹھیک ہوئے۔

دادا واپس آ گئے مگر وہ حیرت انگیز طور پر خاموشی کیے رہے' تمھارے ابا کا ڈر کے مارے دم نکلتا رہا قیامت نہ آئی جس کا انھیں انتظار تھا بلکہ ان کے آنے تیسرے روز اوپر پتائی کا سامان جانے لگا اور پتا چلا کہ روز آگ لگ جانے کی وجہ سے اوپری منزل کی دیوا دھویں سے کالی ہو گئی تھیں اس لیے وہاں چونا کیا ہے۔ مجھ سے شادی کے بعد ایک روز تمھارے ابا کی ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مرزا صولت بیگ مرے دوسرا مہینا تھا۔ انھوں نے دو چھتی میں دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے تب بھی کسی کو کچھ نہ بتایا۔ کے والد کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے تمھارے ابا کو سب کچھ بتایا اور وہ کڑا دیا' وہ نہیں جانتے تھے کہ تمھا ابا سب پتہ جانتے ہیں بلکہ اس شخص کو دیکھ بھی چکے تھے مرزا صولت بیگ نے جلا کر مار دیا تھا۔ ان دن سے قبل ہی حویلی کے بہت سے لوگوں کو بالخصوص مرزا شکنتلا کی روح نظر آ چکی تھی جو بین کرتی تھی' پورنا میں چلاتی تھی اور اکثر اوپر کی منزل سے اس کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔ وہ پرکاش کو تلاش کرتی تھی۔ صولت بیگ نے جانے اس کی لاش کہاں دفنا دی کہ کوشش کے اسے تمھارے ابا تلاش نہیں کر پائے۔ تمھارے دادا بھی شاید ان باتوں سے واقف تھے کہ انھوں نے جو کڑا تمھارے ابا کو دیا تھا وہ انھیں دو چھتی ہی سے ملا تھا۔ ممکن ہے انھوں نے بھی وہاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔" اماں چپ ہو کر یوں پر ہاتھ پھیرنے لگیں جیسے ان کا حلق خشک ہو گیا ہو۔ جس کے چپ ہونے پر جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔ میں لپک کر باہر نکلا اور برآمدے میں رکھے گھڑے سے پانی نکال لایا۔ اماں نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔

"وقار الحسن! اب شاید کوئی بات ایسی نہیں جو تم سے چھپی ہوئی ہو۔ جو کچھ مجھے یاد تھا وہ سب میں نے تمھیں بتا دیا ہے۔"

"نہیں اماں' ابھی کچھ باتیں باقی ہیں۔" پھر میں نے اماں کو مقبرہ والی بات بتائی جو انھوں نے ادھوری چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ تو جانتی تھیں' انھوں نے تو پرکاش کو خود اپنے ہاتھوں سے' اور بس اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکے تھے۔ اماں! انھوں نے ایسا کیوں کہا وہ کیا بتانا چاہتے تھے؟" میں نے کہا تو اماں کچھ دیر یوں سوچتی رہیں جیسے کچھ یاد کر رہی ہوں پھر اچانک بولیں۔

"ارے ہاں۔۔۔ وہ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ تمھارے ابا کے مرنے کے بعد کی' میں ان سے کچھ اگلوانا چاہتی تھی' میں چاہتی تھی کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ وہ اس سارے کھیل میں مرزا صولت بیگ کے دست راست تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں کہ پرکاش کو کہاں دفنایا گیا ہے اس لیے کہ میں اس کی لاش کو ایک جگہ دفن دیکھ چکی ہوں اور پھر میں نے وہاں فرش کو پکا کرا دیا۔ ورنہ مرزا صولت بیگ تو مر چکے ہیں' البتہ وہ پھانسی پر چڑھائے جا سکتے ہیں۔ یہ سن کر وہ بوکھلا گئے تھے مگر انھوں نے اقرار پھر بھی نہ کیا۔ البتہ چاند کی سولہ تاریخ کو وہ حویلی ضرور آتے تھے۔ اس روز وہ بڑے برآمدے میں ایسی جگہ مصلا بچھا کر نماز پڑھا کرتے تھے جہاں سے اوپر کی منزل انھیں صاف نظر آتی تھی' اس روز وہ تمام رات عبادت کرتے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرتے تھے۔ انھوں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھول کر بھی نہ جائے کی سولہ تاریخ کو' بلکہ چودہ سے سولہ تک اوپر کی منزل کی طرف نہ جائے۔ انھیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی' اس لیے کہ جب سے حویلی میں شکنتلا کی روح کو چکراتے دیکھا گیا تھا سب نے اس طرف پھٹکنا ہی چھوڑ دیا تھا' تمھارے چچے' تائے یہاں آ گئے تھے اور دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادی نے کبھی سیڑھیوں پر قدم ہی نہ رکھا پھر اوپر بھلا کون جاتا! ہمارے لیے تو یہ خونی راتیں اتنی وحشت ناک ہوتی تھیں کہ ہم تو اپنے کمروں میں بند ہو کر گزار دیتے تھے۔"

ابھی شاید اماں کچھ اور بھی بتاتیں مگر اس وقت چھوٹی پھوپی آ گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ سب لوگ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر برآمدے میں لے آیا۔ دسترخوان پر چچا بھی موجود تھے۔ میں نے انھیں سلام کیا' انھوں نے جواب بھی دیا اور میری خیر خیریت بھی معلوم کی مگر نگاہیں چرائے رہے۔ چچی کے ماتھے پر حسب معمول بل پڑے تھے۔ چچا کا موڈ بھی خراب ہی لگ رہا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اماں وغیرہ کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اماں پہلے ہی کم عذاب نہیں جھیل چکی تھیں کہ اب ان لوگوں کے پھولے ہوئے منہ اور طنزیہ باتیں برداشت کرتیں۔ مجھے ان لوگوں کے رویے پر حیرت ہوئی حالانکہ انھیں اماں کے ساتھ بہت اچھا رویہ رکھنا چاہیے تھا' وہی ان لوگوں کا ہمیشہ سے خیال کرتی آئی تھیں' تائی اماں اور تایا کا رویہ البتہ اماں کے ساتھ اچھا تھا۔ میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ پہلے اماں کو الگ گھر لے کر دوں گا پھر علی گڑھ جانے کی سوچوں گا۔ خورشید چاچا کو اتوار کو یہاں آنا تھا۔ وہ ہر مہینے کی آخری اتوار کو اماں کو حساب کتاب دینے آیا کرتے تھے' میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مراد آباد آیا کریں۔ میں نے سوچ لیا کہ اتوار کو ان سے کہہ دوں گا کہ وہ اتنی رقم کا فوری انتظام کر دیں کہ اماں کو گھر لے کر دیا جا سکے۔ فی الحال میں نے تایا وغیرہ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں پہلے مکان دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں فائنل بات کر کے ہی تایا وغیرہ کو بتاؤں گا ورنہ وہ میرے ارادے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ جہانی آپا اور شنو آپا کے چہرے کافی کھلے ہوئے تھے۔ ان کی صحت واضح طور پر اچھی ہو گئی تھی مگر اماں کا چہرہ ستا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ صرف میری پریشانی ہو گی۔ کھانے کے بعد جہانی آپا نے سب کے لیے لسی بنائی' شاید یہ لوگ لسی پی کر سو جانے کے عادی تھے' یہاں کی دوپہریں بڑی گرم اور لمبی ہوتی تھیں۔ میں لسی نہ پی سکا۔ گھر کے سبھی افراد قیلولے کے لیے لیٹ گئے۔ جہانی آپا اور شنو آپا کے علاوہ پھوپی بھی مجھ سے کچھ سننے کی متمنی تھیں۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ اب حویلی میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اب وہاں سکون ہے تو انھوں نے مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" پھوپی نے دھیمے انداز میں کہا کیونکہ اماں آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔

"یہ ہوا ہے پھوپی! کم از کم مجھے تو کسی رو... نے پریشان نہیں کیا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ویسے اب آپ لوگ حویلی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔"

"کیا اب ہم وہاں کبھی نہیں جائیں گے؟" شنو آپا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں' نہیں وقار! میرے بھیا کچھ ایسا کرو کہ ہم وہاں کبھی نہ جائیں۔" جہانی آپا نے سہم کر کہا اور میں ہنس پڑا۔

"آپ وہاں کبھی نہیں جائیں گی۔ میں یہیں مکان خریدنے کا سوچ رہا ہوں۔" میری بات سن کر شنو آپا اور جہانی آپا کے علاوہ چھوٹی پھوپی کے چہرے پر بھی خوشی جھلک اٹھی۔

"جگ جگ جیئو بھیا! وہاں کی زندگی تو موت سے بھی بدتر تھی۔ پردادے کے گناہوں کا عذاب ہم بھگت رہے تھے۔" جہانی آپا نے کہا تو مجھے شدت سے احساس ہوا کہ واقعی وہ لوگ تو جیسے اب زندہ ہوئی ہیں۔ میں نے ان کے چہروں پر' ان کی آنکھوں میں سوائے خوف اور ڈر کے کبھی کوئی دوسرا تاثر دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی۔

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر رفتہ رفتہ سبھی سو گئے۔ میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی بس یونہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ بند آنکھوں میں شگفتہ یوں دبے پاؤں آ گئی جیسے تیز دھوپ میں اچانک کوئی بادل کا ٹکڑا سورج کے اور میرے بیچ آ گیا ہو۔ اس کی ستارہ سی آنکھوں میں بھرا شکوہ' لہریں لیتا ہوا پیار اور جھکی جھکی پلکوں پر لرزتا شرم کا احساس' اسے کتنا خوب صورت بنائے ہوئے تھا۔ میں بے ساختہ مسکرا اٹھا تبھی مجھے خیال آیا کہ اگر میں جہانی آپا کو شگفتہ کے بارے میں بتا دوں تو... تو شاید وہ اماں کو بتا دیں اور پھر... اس سے آگے میں نہیں سوچ سکا۔ ایک بات واضح کر دوں کہ اس زمانے میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ پہلے بہنوں کی شادی کی جائے پھر بھائی اپنی شادی کے بارے میں سوچے۔ نہ یہ تھا کہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تب ہی شادی کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ تعلیم کی وہ اہمیت نہ تھی جو آج ہے' اس زمانے میں صرف خاندانی شرافت اور نیک نامی دیکھی جاتی تھی' لڑکے عموماً خاندانی روایات کے مطابق ہی پلتے بڑھتے تھے اس لیے خاندانی شرافت ہی ان کی شرافت کا معیار ہوتی تھی' رہی دولت تو وہ بھی زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تو تھی ہی' پردادا صولت بیگ

نے اپنی عیاشی پر بڑا پیسا لٹایا اور برباد کیا تھا مگر پھر بھی ج... پھول باغ اور امروہہ کے نواح میں آم اور جامن... باغات کے علاوہ کئی جوہڑ بھی تھے جن میں منوں حساب سے سنگھاڑے بھی ہوتے تھے۔ ان سے اتنی آ... ہو جاتی تھی کہ پورا سال عزت سے گزر جاتا تھا۔ صرف... اور چچی ہی ایسے تھے جن کے منہ ہمیشہ بنے رہے اور وہ... مستقل خود کو ناآسودہ ظاہر کرتے رہے ورنہ جو کچھ ا... ملتا تھا وہ ان دو آدمیوں کے لیے کافی تھا۔ تایا قناعت... تھے' اماں بھی بے حد سلیقہ شعار اور قناعت پسند تھیں... ہمارے اخراجات محدود تھے یہی وجہ تھی کہ ہمارے پا... اتنی رقم ہمیشہ بچ جاتی تھی جس سے وقت ضرورت کوئی بڑا کام کیا جا سکتا تھا۔ ابا نے تایا اور چاچا کو یہ مکان خر... تھا جو ان دونوں کا تھا' اب میں اماں کو بھی یہاں مکان... کر دینا چاہتا تھا۔

ہاں تو میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ میں اب سنجیدگی... شگفتہ کے بارے میں سوچ رہا تھا گو حالات جس ڈھب... چل رہے تھے مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں شکنتلا کی روح... سکون دیے بغیر سکون سے بیٹھ سکوں گا مگر بہرحال معاملات تو جانے کب تک یونہی چلتے۔ مجھے فکر تھی صرف اتنی کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو چھوٹی عمر میں بیاہ دیا جاتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شگفتہ کے والدین نے کہ... اس کا رشتہ طے کر دیا ہو اگر ابھی اس کا رشتہ طے نہیں تھا تو مجھے امید تھی کہ شرف الدین بہرحال مجھے ترجیح د... گا۔ وہ میری اچھی بری عادت سے واقف تھا اور م... صولت بیگ کے سوا میری خاندانی شرافت میں بھی کو... شک نہ تھا۔ میں جوں جوں شگفتہ کے بارے میں سوچ رہا... گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی' کوئی اندر سے مجھے چٹکیاں... رہا تھا۔ سرگوشیاں کر رہا تھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے ا... وقت گزر گیا تو میرے ہاتھ صرف مایوسی ہی آئے گی۔ م... نے سوچا کہ اماں سے اجازت لے کر جہانی آپا اور شنو آپا... شرف الدین کے چچا کے گھر لے جاؤں گا تاکہ وہ شگفتہ... مل لیں' اور جاتے ہوئے انھیں راستے میں ہی اپنی خواہش... کے بارے میں بتا دوں گا' یوں وہ اسے اس لحاظ سے دیکھ... پھر اماں کو راضی بھی کر سکیں گی۔

شام کو میں نے اماں کو بتایا کہ شرف الدین اور شگفتہ... یہاں آئے ہوئے ہیں اور شگفتہ جہانی آپا اور شنو آپا سے م... چاہتی تھی۔ پہلے تو اماں نے کہا کہ انھیں یہاں آنا چاہیے...

...مگر میں جہانی آپا کو بتا چکا تھا کہ ہمیں وہاں جانا ہے۔ ...وں نے اور شنو آپا نے بھی ضد کی تو اماں بھیجنے پر تیار ہو ...ئیں۔ انھوں نے چھوٹی پھوپی کو بھی ہمارے ساتھ کر دیا۔ ...وہاں پہنچے تو شگفتہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ جہانی آپا سے لپٹ ...ی' ہزار گلے شکوے کیے کہ وہ آتے ہوئے اس سے مل کر ...ی نہ آئیں۔ میں جہانی آپا کو راستے ہی میں بتا چکا تھا کہ ...ں کیا چاہتا ہوں بلکہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ شگفتہ سے ...ی اس سلسلے میں رائے لے لیں۔ شگفتہ کی آنکھوں میں جو ...کچھ میں نے پڑھا تھا اسے میں وہم تو نہیں کہہ سکتا تھا مگر پھر ...ی کوئی واضح بات نہ تھی کہ جسے میں اس کی پسندیدگی یا ...رضامندی سمجھتا۔ جہانی آپا اور شنو آپا پھوپی کے ساتھ اندر ...چلی گئیں اور میں شرف الدین کے ساتھ باہر کی مردانہ ...بیٹھک میں آ گیا۔ وہاں شرف الدین کے چچا زاد بھی تھے۔ ...کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں شرف الدین ...کو خاصا مضطرب محسوس کر رہا تھا۔ وہ الجھا ہوا دکھائی دے ...رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے چچا زاد کسی کام سے باہر گئے تو وہ ...ایک دم میرے نزدیک سرک آیا۔

"کیا ہوا وقار الحسن! تم نے اماں سے پوچھا؟" وہ یوں ...بولا جیسے پھٹ پڑا ہو۔

میں اس کی بے قراری پر ہنس دیا۔ "ہاں... اور بہت ...سی باتیں واضح ہو چکی ہیں۔ لیکن اتنی پریشانی والی کوئی بات ...نہیں کہ تم یوں مضطرب ہو۔"

"میرے اضطراب کی وجہ یہ نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں ...کی انگلیوں کو چٹخاتے ہوئے بولا۔

"پھر... پھر کیا بات ہے؟"

"وقار الحسن! رات میں نے خواب دیکھا تھا۔"

"مبارک ہو' تم بھی اس عمر کو پہنچ گئے کہ تمہیں خواب ...دکھائی دینے لگے۔" میں نے جل کر کہا۔ "خواب دیکھنا اور ...مضطرب ہونا' مطلب کیا ہے تمھارا؟"

وہ کچھ دیر سر اٹھائے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ...گہری سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں گہری الجھن۔ "میں نے ...خواب میں سوامی جوگندر ناتھ کو دیکھا تھا۔ وہ... وقار وہ رو رہے تھے۔"

میں چونک اٹھا۔ "ہیں... رو رہے تھے اور... اور وہ ...تمہیں کیوں نظر آئے؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ... وہ تمھارے خواب میں کیا کرنے آئے تھے؟" میں اب بھی ہونقوں کی طرح سوال کر رہا تھا۔

"میں نے انھیں جاگیر دینے کا وعدہ کیا تھا۔" وہ جل گیا۔ "یار کمال کرتے ہو! تمہیں پہلا سوال یہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ رو کیوں رہے تھے۔ تم علی گڑھ یونیورسٹی کے سب سے کند ذہن اسٹوڈینٹ ہو گئے ہو۔"

میں گڑبڑا گیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میرے تمام سوالات بے وقوفی کے تھے۔ "ہاں۔ بتاؤ وہ کیا کہہ رہے تھے' اور سنو! وہ کیسے تھے' میرا مطلب ہے کہ تصویر جیسے یا اور بڈھے؟"

"یار لگتا ہے وہ اب تک زندہ ہیں۔" اس نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔

"ہاں... ان کے لمبے بال روئی کے گالوں ایسے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں' چہرے پر صرف کھال منڈھی ہوئی تھی اور وہ ایک غار میں پتھروں پر بیٹھے تھے۔ وہ تصویر والے جوگندر ناتھ سے بہت مختلف تھے۔ رو رہے تھے اور پتا ہے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کیا؟" میں تجسس کے مارے اس سے اور قریب ہو گیا۔

"وہ کہہ رہے تھے' میری بچی واپس چلی جا۔ یوں ہواؤں میں پھرتی رہی' یوں چاندنی میں جکڑی رہی تو دوسرا جنم کیسے لے گی... ! تجھے تو لوٹ کر آنا ہے شکنتلا' لوٹ کر آنا ہے۔ وقار ان کی آواز میں جانے کیا تھا کہ میں رو رہا اور جانتے ہو پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں رو رہا تھا۔ بہت دیر تک میں خود کو نہیں سنبھال سکا۔ دیر تک روتا رہا۔" وہ کافی دل گرفتہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو گہری خاموشی چھا گئی۔ فضا میں بوجھل پن بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ خود میں بھی جانے کیوں آبدیدہ ہو گیا تھا۔

"وہ زندہ ہیں وقار..." شرف الدین اچانک بولا۔ "ہمیں ان تک پہنچنا ہے۔ میں کل رات' خواب میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"ہیں... کب؟" میں نے پھر ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"خواب میں یار... تم پورا خواب تو سنو! میں نے دیکھا کہ میں تمھاری حویلی سے نکلا ہوں۔ مین گیٹ سے باہر آتے ہی میرے سامنے ایک عجیب سا جنگل آ گیا ہے' جنگل بھی نہیں بلکہ ایک سنسان سا علاقہ ہے جہاں جگہ جگہ

جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں بڑے بڑے اور گھنے درخت ہیں۔ میں آگے ہی آگے جا رہا ہوں پھر اچانک میرے سامنے ایک کھائی سی آ گئی' یہ کھائی بہت طویل ہے' دور تک پھیلی ہوئی' اور اس کھائی میں دور دور تک جھاڑیاں اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں ہیں۔ ان چٹانوں کے درمیان دریا بہہ رہا ہے اور آگے جا کر پہاڑ سے آ گئے ہیں' یعنی یوں سمجھو کہ میں ایک دوسرے پہاڑ پر کھڑا تھا' درمیان میں وہ کھائی سی تھی اور پھر ایک پہاڑ تھا' پھر پتا نہیں کیسے اس کھائی میں پہنچ گیا' سامنے والے پہاڑ کے قریب اور پھر میں اوپر چڑھنے لگا' وہیں ایک غار میں جوگندر ناتھ سوامی بیٹھے ہیں۔ میں اندر داخل نہیں ہوا بلکہ وہیں کھڑے ہو کر اندر جھانکنے لگا' وہ تصویر والے سوامی جی سے بہت مختلف تھے مگر پتا نہیں کیسے میں نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ رو رہے تھے اور شکنتلا سے کہہ رہے تھے کہ میری بچی واپس چلی جا۔ میں انھیں دیکھتا رہا اور روتا رہا پھر اچانک وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے اور بولے۔ "میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ ایک چھوٹا سا کام کر دو گے تو وہ واپس چلی جائے گی' اسے لوٹ کر بھی تو آنا ہے۔ یوں تو دیر ہو جائے گی اور وقت نکل گیا تو پھر کوئی طاقت اسے واپس نہیں پہنچ سکے گی پھر سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ بہت مشکل ہو جائے گا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ تب میں ڈرتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ انھوں نے سرگوشی میں کہا۔ "آؤ گے نا؟ اس کو ساتھ لے کر آنا۔" انھوں نے کسی کا نام نہیں لیا تھا وقار مگر یوں لگا جیسے وہ تمھارے بارے میں کہہ رہے ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے' وہ شکتی اسی میں ہے' اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں تمھیں لے کر ضرور ان کے پاس آؤں گا۔"

نہ معلوم کیوں یہ سب سن کر میرے اندر ایک خوشی کی سی کیفیت پھیلنے لگی یوں جیسے کسی بہت بڑے آدمی نے میرے تعریف کی ہو' یا میری صلاحیتوں کا سرعام اعتراف کیا ہو' پھر اچانک میں چونک اٹھا۔ "یار شرف الدین! وہ جگہ کون سی تھی۔ ایسی تو کوئی جگہ نہ امروہہ میں ہے اور نہ آس پاس کہیں اور دیکھی ہے۔"

"میں خود بھی اس الجھن میں ہوں۔ ایسی کوئی جگہ میرے علم میں بھی نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں نقشے سے تلاش کروں' شاید نظر آ جائے۔"

"مگر یہ تو بڑا وقت طلب کام ہو گا' اور دیکھو انھوں نے خود کہا ہے کہ وقت نکل گیا تو بہت مشکل ہو گی' سب کچھ ہو جائے گا۔"

"اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں' ہم کندھوں پر سامان کر پورا انڈیا گھومنے تو نہیں نکل سکتے۔ جے پور کا وہ عل نہیں لگ رہا تھا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ یا پھر انتظار کرو کہ وہ خواب میں دوبارہ آ کر جگہ بھی بتا دیں۔" وہ جھنجھلا سا گیا تھا۔

پھر ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے' میں نے اسے تمام باتیں بتا دیں جو اماں سے معلوم ہوئی تھیں۔ پر کا کے بارے میں جان کر وہ بھی حیران رہ گیا تھا۔ "یار! یا میری سمجھ میں نہیں آ رہی' آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ یوں تو ہماری تمام زندگی ہی ان چکروں میں گزر جائے گی' آخر ان روحوں کو کیا حق ہے کہ یوں ہمیں پریشان کرتی پھریں' خود تو مر گئیں ہماری زندگی کیوں حرام کرنا چاہتی ہیں!" وہ رفتہ رفتہ اپنی پرانی جون میں آتا جا رہا تھا۔

"ہاں شرف الدین! میں خود بھی ان پے در پے واقعات سے بیزار ہو گیا ہوں۔" میں نے سچائی سے کام لے کر کہا۔

"چلو صرف شکنتلا کی بات ہوتی تو خیر تھی۔ اسے خا ہونے کا ایڈوانٹیج حاصل ہے مگر یہ تو ساری فیملی ہی پیچھے پڑ گئی۔" وہ بڑبڑایا۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"اب تو ان چکروں میں تم بھی انوالو ہو گئے ہو۔ تم جوگندر ناتھ تک تو تمھیں جانا ہی پڑے گا۔" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں۔ ویسے اس میں میرے تجسس کو بڑا دخل ہے۔ میں نے کبھی روحیں نہیں دیکھی تھیں نہ جن اور بھوت پر یقین رکھتا تھا مگر اب تو یوں لگ رہا ہے کہ واقعات کی رفتار یہی رہی تو بہت جلد میں خود بھی بھوتوں میں شمار کیا جانے لگوں گا۔"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ اسی وقت اندر سے ایک بچہ بیٹھک میں داخل ہوا۔ "آپ کو جہانی آپا بلا رہی ہیں۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر بیٹھک کے دروازے کے قریب آ گیا۔ وہاں جہانی آپا کھڑی تھیں۔

"چلنا نہیں ہے کیا! اماں جان کہا جائیں گی' کہہ تھیں دیر نہ کرنا۔"

"ہاں آپ لوگ تیار ہو جائیں۔"

"ہم تیار ہیں۔" جہانی آپا کی آواز سن کر شرف الدین کھڑا ہو گیا۔

"ارے آپ لوگ کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"نہیں یار۔ اماں نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ وہ اکیلی پریشان ہو رہی ہوں گی' کافی دیر بھی تو ہو گئی ہے۔"

شرف الدین تیار نہ تھا مگر میری ضد دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اسی وقت شگفتہ نے ٹرے آگے بڑھا دی جسے شرف الدین نے تھام لیا۔ مجھے شگفتہ کی جھلک ہی نظر آئی مگر اس جھلک کی چکا چوند آنکھوں میں بھر گئی۔ اس کی جھکی ہوئی پلکوں کے نیچے چمکتی ہوئی آنکھوں میں شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی' ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ آپا اس سے میرے بارے میں بات کر چکی ہیں۔

شرف الدین چائے کی ٹرے لیے پلٹ گیا تبھی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جہانی آپا سے پوچھا کہ کیا ہوا اور انھوں نے آنکھوں ہی کے اشارے سے جواب دیا کہ سب ٹھیک ہے۔ بے پناہ خوشی سے میں بے چین ہو گیا کہ جلدی سے جہانی آپا سے پوچھوں کہ کیا کہا' مگر چائے تو مجھے پینا ہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی چائے پی' گرم گرم چائے پینے سے میرا منہ بھی جل گیا اور آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"کیا ٹرین چھوٹ رہی ہے؟" شرف الدین نے میری بے چینی کو محسوس کر لیا۔

"نہیں یار! اماں اتنے روز مجھ سے جدا رہ کر کافی کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کی طرف سے پریشانی ہے' اب تم گھر آ جانا اور بتانا کہ آیندہ کیا پروگرام ہے۔ میں شاید دو تین روز یہاں رکوں گا۔ اماں کو گھر لے کر دینا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں کل تو نہیں ہاں پرسوں ضرور آ جاؤں گا۔ ہمیں علی گڑھ جانا ہے' اور ہاں سنو! پرسوں شام کو حسینہ کا نکاح ہے' تم سب ضرور آنا۔"

میں نے شرف الدین کی دعوت قبول کر لی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ وہاں سے چل پڑے۔ تانگا لیا اور بیٹھتے ہی جہانی آپا کی طرف متوجہ ہو گیا جو مہین نقاب سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "آپا کیا ہوا؟"

"اتنی جلدی کیا ہے! راستے میں بات کرو گے کیا؟ گھر پہنچ کر بتاؤں گی۔" انھوں نے دبے دبے لہجے میں کہا اور میں کسمسا کر کوچوان کی طرف دیکھنے لگا۔ تانگے کے پچھلے حصے میں جہانی آپا' شنو آپا اور پھوپی بیٹھی تھیں' میں کوچوان کے برابر میں بیٹھا تھا اور صاف محسوس کر رہا تھا کہ کوچوان کی تمام تر توجہ ہماری طرف ہے' میں نے بھی یہاں بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ گھر تک کا راستہ بے پناہ بے چینی اور اضطراب میں کٹا۔ شگفتہ کی جھکی جھکی پلکیں مسلسل آنکھوں کے سامنے لرز رہی تھیں۔ عجیب میٹھا میٹھا سرور سا محسوس ہو رہا تھا۔ دس بارہ منٹ کا یہ فاصلہ صدیوں پر محیط ہو کر رہ گیا تھا' مجھے صرف گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں اس کے قدم گن رہا تھا' رفتہ رفتہ مجھے گھوڑے پر غصہ آنے لگا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ کوچوان کے ہاتھ سے چابک چھین کر دو چار گھوڑے کو لگا دوں' اس وقت مجھے صرف اس گھوڑے سے نہیں بلکہ دنیا کے تمام گھوڑوں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے وہیں پر قسم کھا لی کہ کچھ بھی ہو جائے آیندہ اس منحوس سواری میں نہیں بیٹھوں گا۔

"ہاں بڑے صاحب! اب کس طرف جایئے گا؟" کوچوان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اس گھوڑے کو کچھ کھلاتے پلاتے نہیں ہو کیا؟" میں نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا بڑے صاحب!" اس نے حیران ہو کر پہلے مجھے پھر اپنے گھوڑے کی طرف دیکھا۔

"چلا تو جاتا نہیں ہے اس سے اور تم نے اسے تانگے میں جوتا ہوا ہے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"جی بڑا پھرتیلا ہے یہ تو' دیکھیں منٹوں میں پہنچا دیا آپ کو۔ یہیں اتریں گے یا کسی طرف مڑنا ہے؟" اس نے کہا تو میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ چچا والی گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔

"اوہ۔ ہاں یہ اس طرف لے لو۔" میں خجل سا ہو گیا۔ میں واقعی ہوش میں نہیں تھا اور خواہ مخواہ غصے میں کھول رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر اترتے ہوئے میں نے گھوڑے کو ایسے دیکھا جیسے جاننا چاہتا ہوں کہ کہیں وہ میرے خیالات جان تو نہیں گیا۔

"بڑی پہچان لگتی ہے آپ کو گھوڑوں کی۔ اعلیٰ نسل کا شیر ہے یہ' بھاگنے میں بالکل چیتا ہے چیتا۔" اس نے کرایہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور میں مسکرا کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ جہانی آپا' شنو آپا اور پھوپی پہلے ہی اتر کر اندر جا چکی تھیں۔

اماں ہماری منتظر تھیں۔ جہانی آپا برقعہ اتار کر کمرے میں ٹانگنے گئیں تو میں ان کے پیچھے ہی چل پڑا۔ "جہانی آپا!" میں نے گھگیائے ہوتے ہوئے انھیں پکارا۔

"توبہ ہے وقار الحسن! تم تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ بھئی ابھی ہم بہت تھک گئے ہیں، کچھ قیلولہ کرلیں پھر بتائیں گے۔" انھوں نے چڑانے کے لیے جمائی لی۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ یہ میرے لیے دوہری خوشی تھی، ایک یہ کہ شگفتہ نے جواب ضرور اثبات میں دیا ہوگا دوسرا یہ کہ میری بہن زندگی میں پہلی بار مجھ سے شرارت کررہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی اور ہونٹوں پر وہی دبی ہنسی۔ میرا دل تشکر کے جذبات سے بھر گیا اور خیال آیا کہ میں نے مراد آباد میں بسنے کا فیصلہ بہت دیر سے کیا ہے۔

"جہانی آپا اب بتایئے تو سہی۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے کہ ان چکروں میں بھی پڑنے لگے۔ بھئی ہم نے لڑکی دیکھ لی، اب اماں کو بتا دیں گے، انھیں پسند آئی تو شگن بھجوا کر ان کا عندیہ لے لیا جائے گا، شگن کا تھال واپس آگیا تو سمجھو چھٹی۔" انھوں نے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"جہانی آپا میں یہ سب کچھ نہیں پوچھ رہا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شگفتہ کا ردعمل کیا تھا!" میں نے انھیں سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اوہ اچھا۔" انھوں نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "ہم تو بہت بے وقوف ہیں، اتنی سی بات ہی پلے نہیں پڑی۔" وہ خوامخواہ معاملے کو طول دے رہی تھیں۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں اماں نہ آجائیں، وہ آجاتیں تو جہانی آپا کو تو بہانہ ہی مل جاتا۔

"بتایئے نا۔ خدا کے لیے بتا بھی دیں۔" میں نے بے چینی سے دونوں ہتھیلیاں ملیں۔

"اف۔!" انھوں نے گہرا سانس لیا۔ "بھئی جب ہم نے انھیں بتایا کہ ہمارے بھیا اب شادی کرنے کے موڈ میں ہیں تو پہلے تو وہ چونک اٹھیں پھر کچھ گھبرا گئیں، پھر سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھنے لگیں اور پھر۔ پھر انھوں نے سر جھکا لیا۔" انھوں نے یوں دونوں ہاتھ کو ہلا کر نیچے کرلیا جیسے بات ختم کردی ہو۔

"پھر۔ پھر کیا ہوا!"

"پھر۔ پھر۔!" وہ سوچنے کے انداز میں چھت کو تکنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے وقوف بنا رہی ہیں۔ شرارت کررہی ہیں، تب میں جھنجلا کر کھڑا ہوگیا۔

"ٹھیک ہے نہ بتائیں۔ میں خود پوچھ لوں گا۔" میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا، اس آس پر کہ وہ آواز دے لیں گی۔

"مجھے بھی ضرور بتانا۔" انھوں نے آواز لگائی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔ یادداشت جو یہاں آکر بیٹ ہو گئی ہے۔"

"اچھا جہانی آپا۔ یاد رکھیے گا یہ بات۔" میں نے منہ پھلا کر کہا تو وہ ہنستی ہوئی میرے قریب آگئیں۔

"چندا وہ راضی ہے۔ لگتا ہے امروہہ میں اسی وجہ سے رکے تھے۔" انھوں نے میری ٹھوڑی کو اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔

"سچ آپا!" میں یہی تو سننا چاہتا تھا۔ "کہیں سے شگن آیا تو نہیں اس کا!"

"نہیں، لیکن وقار میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ اس شادی میں ضرور وہ کسی نہ کسی کی آنکھوں میں کھب جائے گی۔ انھوں نے شادی پر بلاوا دیا ہے۔ کل تک ان کی اماں بھی آجائیں گی۔ ہمیں اس شادی میں ضرور جانا چاہیے اور میں اماں سے بات کروں گی، انھیں اس شادی میں جلدی سے ان کی اماں کے کان میں بات ڈالنا ہوگی ورنہ تو بھیا ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔"

جہانی آپا اتنا کہہ کر باہر چلی گئیں اور میں پلنگ کی پٹی پر ٹک گیا۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ شگفتہ کا سجیلا روپ ایسا ہی تھا کہ اسے کوئی بھی پسند کرسکتا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ہمارے ہاں لڑکی کا عندیہ لینے کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے، یوں جیسے وہ انسان نہ ہو گھر کی کارنس پر رکھی کوئی بے جان سی چیز۔ اپنی شادی کے سلسلے میں اماں سے بات کرنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں میرا ہم عمر کوئی لڑکا نہیں تھا کہ اس کی زبانی بات آگے بڑھاتا۔ جہانی آپا یا شنو آپا اور چھوٹی پھوپی ہی رہ گئی تھیں مگر مجھے کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اماں نے انکار کردیا، کسی دوسری لڑکی کی بات کی تو وہ ان سے نہ تو بحث کرپائیں گی اور نہ انھیں میری مرضی بتا کر قائل ہی کرنے کی ہمت کرپائیں گی۔ لے دے کر ایک تایا رہ گئے تھے جو ذرا ہنسی مذاق کرنے کی وجہ سے مجھ سے کچھ بے تکلف تھے لیکن ان سے بات کرنے کے لیے مجھے بڑی ہمت پیدا کرنا پڑتی۔ آخر سوچتے سوچتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تایا سے بات کرہی لینی چاہیے۔ ادھر میں جہانی آپا کو بھی کہہ چکا تھا کہ وہ آج ہی اماں سے بات کرلیں تاکہ پرسوں نکاح کی دعوت پر وہ شگفتہ

کو دیکھ بھی لیں اور فوراً ہی بات کانوں میں بھی ڈال دیں۔

شام گہری ہونے لگی تو میں تایا کے پاس آبیٹھا۔ جہانی آپا نے صحن میں چھڑکاؤ کرکے پلنگ بچھا دیے تھے۔ پلنگوں پر سفید چادریں بچھا دی تھیں، تایا وہیں بیٹھے حقے کی چلم تازہ کررہے تھے۔

"لایئے تایا میں دہکا دوں۔" میں ان کے قریب جا بیٹھا۔

"رہنے دو میاں! یہ عورتوں والے کام مت کیا کرو۔ تمھاری تائی انگارے کرید گئی ہیں۔ انھی انگاروں میں اپنی جوانی اور تمباکو کی نکیا تلاش کررہا ہوں۔" انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ میں ہنس پڑا۔

"تایا اگر تائی نے سن لیا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ چنگاریاں اور اڑا جائیں گی، اور کیا ہونا ہے میاں۔" انھوں نے چلم حقے پر جماتے ہوئے کہا اور حقے کی نے تھام کر پلنگ پر جا بیٹھے۔ "بھئی جب سے گنگو ابھرا ہے، حقے کی بڑی پریشانی ہو گئی ہمیں۔ وہ تھا تو کم از کم بار بار تمھاری تائی کا منہ تو نہیں دیکھنا پڑتا تھا۔" انھوں نے کہا اور نے کو ہونٹوں میں دبا لیا۔ تیز گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری اور دب گئی۔

میں اسی سوچ میں تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ میری نگاہیں چلم پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیوں میاں! انگاروں میں کیا کریدنے لگے!"

"وہ تایا۔ جب آپ کی تائی سے شادی ہوئی تو کیا آپ انھیں دیکھ چکے تھے؟"

"ارے میاں کہاں۔! بھلا دیکھ چکے ہوتے تو یہ حالت ہوتی!"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ "سچ بتایئے تایا۔ اس زمانے میں بھی کیا لڑکے اور لڑکی سے پوچھے بغیر شادی ہو جاتی تھی یا دونوں کی پسند کا بھی خیال کیا جاتا تھا۔"

"ممکن ہے لڑکی سے پوچھا گیا ہو۔ انھوں نے تو ہاں کہنا ہی تھی۔ بہرحال ہم سے کسی نے نہیں پوچھا تھا ورنہ۔ ویسے میاں تم یہ باتیں کیوں کررہے ہو؟" وہ چونک سے گئے۔ تھے تو جہاندیدہ آدمی، ممکن ہے سمجھ گئے ہوں۔ میں گڑبڑا گیا۔

"وہ۔ ویسے ہی تایا۔ مذاق میں۔" میں بالکل بوکھلا گیا، جس قدر ہمت باندھی تھی سب ٹوٹ گئی۔

"مذاق میں؟ بھئی تمھارا ہمارا مذاق کا کون سا رشتہ ہے؟ چلو اب پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دیتے ہیں۔ دراصل تمھاری تائی اماں کو تو ہم نے دیکھا نہیں تھا البتہ ان کی تعریفیں بہت سنی تھیں۔ تمھاری تائی، ہمارے ابا کی پھوپی زاد بہن کی بیٹی تھیں۔ بس سنی سنائی باتوں پر یقین کرلیا سو انجام تمھارے سامنے ہے۔" انھوں نے گہرا سانس لیا، میں بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کرسکا۔

"تایا تو آپ سے کسی نے پوچھا تو ہوگا ناکہ لڑکی پسند بھی ہے یا نہیں!"

"ہاں ہماری اماں نے پوچھا تھا۔ وہ بھی اس چکر میں کہ ابا اس شادی پر بہ خوشی راضی تھے اور وہ بادل نخواستہ۔"

"تایا۔! اگر کسی کو کوئی لڑکی اچھی لگتی ہو تو اس سے اس کی شادی کردیتے تھے لوگ!"

"میاں وقار الحسن! تم کچھ بہکی بہکی سی باتیں نہیں کررہے؟ بھئی کوئی چکر وکر ہے کیا؟" دوسرا جملہ انھوں نے سرگوشی کے انداز میں ادا کیا۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں اصل بات انھیں بتا دیتا۔ کچھ ہمت بندھ گئی تھی۔ "ہاں تایا۔ وہ بات یہ ہے کہ۔" میں پھر جھجک گیا اور انگلیاں چٹخانے لگا۔

"میاں ایک بات کہنے کے لیے جو تم اتنی دیر سے تمہید

باندھ رہے ہو' میرے زخم کرید رہے ہو۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو' بھئی زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا! یہی ناکہ جھڑک دیا جائے گا! تو میاں جھڑکیاں تو تمہیں ساری زندگی ہی بھگتنا ہیں' ایک ہماری بھی سہی۔ بولو کیا بات ہے؟"

تب میں نے انھیں شگفتہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور حقہ گڑگڑاتے رہے۔ میں بات کہہ کر خاموش ہو گیا مگر وہ یونہی بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ مجھے ان کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تھی۔

"ہوں۔!" ایک لمبی ہوں کھینچ کر انھوں نے سر اٹھایا۔ "ہاں میاں' ہیں تو وہ بھی خاندانی لوگ۔"

"تایا!۔ آپ اماں سے کہیں اور آپ بھی چلیں ناں شادی میں' وہاں ان کے ابا سے مل لیجیے گا۔"

"ہاں بھئی شادیوں میں جانے کا تو ہمیں بھی بہت شوق ہے' ہم تو اکثر اپنے ایسے دوستوں سے شادی کے دعوت نامے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے جو شادی میں جانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ ان کی جگہ ہم شریک ہو جایا کرتے تھے' ضرور چلیں گے' اور تمھاری اماں سے ہم آج ہی بات کر لیں گے' ویسے کیا نام ہے شرف الدین کے باوا کا؟"

"سید سبط حسن نام ہے' اماں جانتی ہیں انھیں اور شگفتہ کو دیکھ تو چکی ہیں مگر بہت پہلے' ان کی اماں سے بھی واقف ہیں۔" میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ سر ہلا کر پھر حقے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں ایک معرکہ سر کر چکا تھا۔ اب جہانی آپا سے معلوم کرنا تھا کہ انھوں نے کیا کیا! میں چائے لانے کا بہانہ کر کے سیدھا اماں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اماں مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر انھوں نے اشارے سے مجھے پاس بلایا پھر مجھ پر پھونک ماری' ماتھے کے اوپر انگوٹھا رکھ کر کچھ دیر کچھ پڑھتی رہیں پھر پھونک مار کر مجھے جانے کا اشارہ کر دیا۔ جہانی آپا وہاں نہیں تھیں' پھوپی نے بتایا کہ وہ تائی سے کلام پاک پڑھ رہی ہیں۔ یہ سن کر میں وضو کر کے نماز پڑھنے چل دیا۔ تایا سے میں نے مسجد کا پتا کر لیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مسجد کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ میرے سامنے آ گئے۔

"السلام علیکم!" میں نے ہاتھ اٹھا کر انھیں سلام کیا۔

"وعلیکم سلام' جیتے رہو۔" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ [illegible]ں تیزی سے آگے بڑھنے لگا تبھی انھوں نے مجھے آواز دے لی۔ "میاں صاجزادے!"

"جی حضور!" میں رک گیا۔ "فرمایئے؟" میں ان کے قریب چلا گیا۔

کچھ دیر گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ "سنہرے بابا کا نام سنا ہے تم نے؟" انھوں نے اچانک سوال کیا۔

"جی! میں کچھ حیران ہو گیا۔

"سنہرے بابا۔ سبز گنبد والی مسجد کے باہر برگد کے درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں۔ موقع ملے تو ان سے مل لینا۔" یہ کہہ کر وہ برابر والی گلی میں مڑ گئے! اور میں ہونقوں کی طرح کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

"میاں جماعت کھڑی ہو چکی ہے۔" میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک صاحب نے مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر کہا اور میں پلٹ کر تیزی سے ان صاحب کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اپنی آستین کھولتے ہوئے مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔

ایک عجب کیفیت ہو گئی تھی میری۔ ایک کانٹا سا چبھ کر رہ گیا تھا۔ نماز میں بار بار انھی بزرگ کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا تھا "سنہرے بابا" کا نام بار بار کانوں میں گونج رہا تھا۔ جیسے تیسے نماز ادا کی' خدا سے اس بے دھیانی کی گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگی اور پلٹ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ میری نگاہیں انھی بزرگ کی تلاش میں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ انھیں ابھی یہیں ہونا چاہئے تھا' مگر وہ مجھے نظر نہ آئے۔ دل بوجھل سا ہو گیا تھا۔ میں سر جھکائے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ گلی میں داخل ہوا تو دروازے پر شرف الدین کو کھڑے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے تو پرسوں آ[illegible] کو کہا تھا۔ وہ دروازے پر کھڑا تایا سے باتیں کر رہا تھا۔ [illegible] معلوم کیوں میں مضطرب ہو گیا۔ خیال آیا کہ ضرور کوئی ا[illegible] ویسی بات ہوئی ہو گی ورنہ شرف الدین سے ابھی چند [illegible] پہلے ہی تو رخصت ہو کر گھر پہنچا تھا۔ میں نے رفتار تیز کر دی۔

مجھے دیکھ کر تایا یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے کہ میاں ا[illegible] بیٹھک میں جا بیٹھو تو اچھا ہے' ان کے اندر جاتے ہی شرف الدین نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔

"کیا ہو گیا' شرف الدین؟"

"یار عجیب بات ہوئی۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ [illegible] آہستہ قدموں سے چلنے لگا۔ میں بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ "[illegible]ں نماز پڑھنے جا رہا تھا' دیر ہو گئی تھی اس لیے تیز تیز [illegible] ہوا جا رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ سے ٹکرا گیا۔ میں نے جھٹ معافی مانگی اور پھر مسجد کی طرف بڑھ گیا' انھوں نے مجھے آواز دے لی اور بولے۔

"میاں صاجزادے۔ سنہرے بابا کا نام سنا ہے تم نے!"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ اچھل پڑا۔

"ہاں۔ ہاں یہی تو۔ بالکل یہی کہا تھا مگر۔ تم' تمہیں کیسے پتا!" [illegible]س کا رنگ سفید ہو گیا۔

"یہی کہا تھا؟" میرے رخساروں پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "شرف الدین۔!" خوف کے مارے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ "کیونکہ بالکل یہی۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ نماز کے لیے جاتے ہوئے میں بھی ان سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا اور پھر۔ انھوں نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا کہ سبز گنبد والی مسجد کے باہر برگد کے درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں' موقع ملے تو ان سے مل لوں۔"

"اوہ۔" اس نے پاس لگے بجلی کے کھمبے کو پکڑ لیا۔ "یہ تم نے مجھے کن چکروں میں ڈال دیا وقار۔"

"اب یہ باتیں نہ کرو۔ سوچو کہ یہ سب کیا ہے' وہ بزرگ کون تھے اور یہ سنہرے بابا۔ تمہیں کچھ پتا ہے ان کے بارے میں؟"

"نہیں' میں نے تو پہلی بار نام سنا ہے۔"

"میں تایا سے پوچھوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ میں نے ہتھیلیاں اپنے کپڑوں سے رگڑتے ہوئے کہا۔ وہ پسیج گئی تھیں۔

"وقار!۔ ابھی نہ چلیں! پوچھ لیں گے کسی سے۔"

"نہیں نہیں۔ اماں اس وقت کہیں نہیں جانے دیں گی۔"

"ڈرتے ہو؟"

"بات ڈرنے کی نہیں اور بھلا ان سے کیوں ڈروں گا' زندہ سلامت ہیں' میں تو روحوں سے بھی نہیں ڈرتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی چلا جائے' میں رات بھر اس تجسس کے عالم میں سو نہیں سکتا۔" شرف الدین نے کہا۔

"اچھا تم ٹھہرو' میں اندر کے حالات دیکھ کر آتا ہوں۔" میں نے اسے وہیں چھوڑا اور خود اندر داخل ہو گیا۔ تایا بڑے برآمدے میں جا چکے تھے۔ اماں' تائی' پھوپی اور شنو آپا وغیرہ سب وہیں بیٹھیں تھیں' مجھے دیکھتے ہی سب چپ ہو گئے' یوں لگا جیسے بات میرے ہی بارے میں ہو رہی تھی۔ جہانی آپا معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"وہ اماں میں ذرا اپنے دوست شرف الدین کے ساتھ جا رہا ہوں۔ جلدی آ جاؤں گا۔"

"یہ وقت ہے کہیں جانے کا؟" اماں کچھ ناگواری سے بولیں۔

"حالانکہ یہی وقت ہوتا ہے کہیں جانے کا۔" تایا مسکرا کر بولے۔ "ٹھیک ہے جاؤ' ویسے بھی میاں کچھ زنانی قسم کی باتیں ہو رہی ہیں اسی لیے ہم نے تمھاری چچی کو بھی نہیں بٹھایا۔"

میں مسکرا کر پلٹا تو تایا نے آواز دے لی۔ "اے میاں وقار! سنو تو' یہ کوئی صاحب آئے تھے وہ دے گئے ہیں۔" اتنا کہہ کر انھوں نے تکیے کے نیچے سے ایک رقعہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں رقعہ لے کر روشنی کے قریب ہو گیا۔ جونہی اس پر لکھی تحریر پر میری نگاہیں پڑیں میں اچھل پڑا۔

تحریر میرے لیے قطعی انجان ہونے کے باوجود جو کچھ اس میں لکھا تھا وہ میرے لیے انجانا نہ تھا۔ لکھا تھا "تمھارا آج ہی سنہرے بابا سے ملنا بے حد ضروری ہے ورنہ تم کسی ایسی مصیبت میں بھی گرفتار ہو سکتے ہو جس سے چھٹکارا ممکن نہ ہو۔"

میرے اچھل پڑنے کو اماں نے خاص طور پر محسوس کیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر میرے قریب آ گئیں۔ "وقار الحسن! کیا بات ہے۔ کس کا رقعہ ہے۔ کیا لکھا ہے اس میں؟"

"کک۔ کچھ نہیں اماں۔" میں فوراً ہی ہنس پڑا۔ یونہی بے وجہ۔ شاید میں اپنے اندر کی چکر کھاتی ہوئی سی کیفیت کو چھپانا چاہتا تھا۔ "یہ شرف الدین عجیب آدمی ہے' بھلا یہ بھی کوئی مذاق ہوا!؟" میں جانے کیا کیا کہہ کر اماں کو مطمئن کرنا چاہ رہا تھا۔

"وقار الحسن!" اماں کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "تمھارے اندر جھوٹ بولنے کی صلاحیت نہیں ہے' تم بہت پھوہڑپن سے جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہے ہو۔" اماں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

عجیب سا ماحول ہو گیا تھا۔ تایا' تائی' پھوپی اور میری دونوں بہنیں ہماری ہی طرف متوجہ تھیں' میں ان لوگوں کے سامنے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔

"اماں چپ ہو جایئے۔" میں نے سرگوشی کی تو وہ سمجھ گئیں کہ میں یہاں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ انھوں نے

پلٹ کر تایا وغیرہ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے دلھن!" تایا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی۔" انھوں نے تیزی سے کہا اور میرا بازو پکڑ کر صحن میں نکل آئیں۔ "اب بولو!"

انھوں نے مجھے اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ میں کوئی بات گھڑ سکتا۔ اب صاف صاف بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو میں نے انھیں صاف صاف سب کچھ بتا دیا۔ سنہرے بابا کا ذکر سن کر ان کی آنکھوں میں سوچ کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔

"یہ نام میں نے بھی سنا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔

"پر کہاں۔۔ کس سے۔۔؟"

"اماں میرا اور شرف الدین کا خیال ہے کہ ہمیں سنہرے بابا کے پاس ضرور جانا چاہیے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟"

"ہاں۔۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ سنو! تم ان سے کہنا کہ ان روحوں سے حویلی کو خالی کرا دیں۔ میں یہاں دہاں نہیں رہ سکتی۔ میں حویلی جانا چاہتی ہوں۔"

"آپ اجازت دیں تو میں شرفلدین کے ساتھ سنہرے بابا کو تلاش کروں۔"

"تم اپنے تایا سے کیوں نہیں پوچھتے۔۔؟ وہ جانتے ہوں گے۔" اتنا کہہ کر اماں نے پلٹ کر تایا کی طرف دیکھا۔ باقی تمام لوگ اب بھی ہماری طرف متوجہ تھے' میری بہنوں کے چہروں پر ہلدی گھنڈی ہوئی تھی۔ شاید انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی بات ہے۔۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔ میں ان کے چہروں پر جو سکون دیکھ چکا تھا اسے ہمیشہ دیکھنا چاہتا تھا مگر اماں کی جلد بازی نے انھیں پھر خوف کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا تھا۔

"تایا!" میں نے تایا کو آواز دی تو احساس ہوا کہ گھر میں کتنا گہرا سناٹا چھا چکا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر قریب آ گئے۔ ان کے چہرے پر بھی گہری تشویش کے آثار تھے۔ "کیا بات ہے! تم لوگ بتاتے کیوں نہیں!" ان کی آواز میں وحشت تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہے تایا۔۔ آپ تو۔۔ یہ اماں خوامخواہ ہی سب کو پریشان کر دیتی ہیں۔ میرا دوست شرف الدین کہتا ہے کہ یہاں اس نے کسی سنہرے بابا کا ذکر سنا ہے۔ اس نے مجھے ان سے ملنے کا مشورہ دیا ہے۔ بس اتنی سی بات کو اماں نے پتا نہیں کیا بنا دیا۔ آپ کو پتا ہے کہ یہ سنہرے بابا کون ہیں اور کہاں بیٹھتے ہیں!"

انھوں نے گہرا سانس لیا۔ "دلھن! خود تو تم ہولاتی ہی ہو' بچوں کو بھی خوفزدہ کر دیتی ہو۔ دیکھو تو بچیوں کا چہرہ اتر گیا۔" اتنا کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "امراؤ حیدر کا گھر دیکھا ہے تم نے؟"

"کون امراؤ حیدر؟" میں نے کہا۔

"بھائی نبن کے سسر۔۔!" وہ یوں بولے جیسے سارے زمانے کے سسروں کی میرے پاس لسٹ موجود ہو۔

"یہ کیا جانے بے چارہ۔ کبھی امروہہ سے باہر نکلا ہو تو کسی کو پہچانے بھی۔" اماں بڑبڑائیں۔

"یوں کرو۔۔ سویرے میں خود لے چلوں گا۔" تایا اتنا کہہ کر پلٹ گئے۔

"اماں!" میں نے ان کے برآمدے میں پہنچنے کے بعد سرگوشی کی۔ "میں اور شرف الدین تلاش کر لیں گے۔ ہمارا آج ہی ان سے ملنا ضروری ہے۔ وہ بہت پہنچے ہوئے لگتے ہیں' میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ آپ پریشان نہ ہوئیے گا۔ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔ وقار الحسن! انھیں ایک ایک بات بتا دینا۔"

"آپ فکر نہ کیجیے۔" میں اتنا کہہ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شرف الدین باہر کھمبے کے نیچے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف جھپٹا۔

"تم کیا سو گئے تھے؟"

"نہیں۔۔۔" یہ کہہ کر میں نے وہ رقعہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے رقعہ ہاتھ میں لے کر حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ "یہ۔۔ کسے پہنچانا ہے۔۔؟"

"کسی کو پہنچانا نہیں ہے' اسے پڑھ لو۔"

یہ سنتے ہی وہ رقعہ لے کر کھمبے کے بالکل نیچے چلا گیا جہاں کم روشنی کا بلب لگا ہوا تھا۔ اسی روشنی میں' میں نے اس کی آنکھیں پھیلتے اور سکڑتے دیکھیں۔ "یہ۔۔ یہ۔۔ کہاں سے آیا؟"

تب میں نے اسے تمام بات بتا دی۔

"وقار الحسن! اب چل پڑو۔ میں چاہتا ہوں کہ گھر پر اطلاع دے دوں کہ مجھے دیر ہو جائے گی ورنہ وہ لوگ میرے یوں غائب ہونے پر پریشان ہو جائیں گے۔ اطلاع دے کر ہم گنبد والی مسجد چلیں گے۔"

پھر میں اور شرف الدین تیز رفتاری سے چل پڑے۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ شرف الدین کے چچا کا گھر تایا کے

گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پانچ منٹ بعد ہی وہاں پہنچ گئے۔ شرف الدین نے اندر جا کر اطلاع کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ اپنے چچا زاد فرقان سے گنبد والی مسجد کی طرف جانے والے راستے کا پوچھ آیا تھا۔ یہ مسجد یہاں سے دور نہیں تھی۔ پیسے نہ میری جیب میں تھے اور نہ شرف الدین کی جیب میں لہٰذا ہم نے سواری کے بارے میں سوچا ہی نہیں اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس چوک پر پہنچ گئے جہاں سے سیدھے ہاتھ کو جانے والا راستہ ہمیں گنبد والی مسجد تک لے جاتا۔ اس راستے پر قدم رکھتے ہی یوں لگا تھا جیسے ہم نے کسی سنسان جنگل میں قدم رکھ دیا ہو۔ جھینگروں کے بولنے کی تیز آواز کے ساتھ ہی سناٹے کا احساس بھی بڑھ رہا تھا جب کہ ابھی چند قدم دور ہی ہوٹل سے سہگل کے گانے کی آواز اور لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھرپور زندگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے اس راستے پر مڑتے ہی چاروں طرف قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا ہو یا ہم اس ہوٹل سے میلوں دور نکل آئے ہوں۔ اس خاموشی کو میں نے اور شرف الدین دونوں ہی نے شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس گلی میں دونوں جانب مکان بنے ہوئے تھے مگر نہ معلوم کیوں لگتا تھا جیسے سارے ہی مکان غیر آباد ہوں یا ان سب کے مکین سرِ شام ہی سو جانے کے عادی ہوں۔ تقریباً بیس پچیس قدم چلنے کے بعد ہی ہمیں مسجد کا گنبد نظر آنے لگا۔ اس مسجد کے باہر چند دکانیں تھیں جہاں جائے نماز' تسبیح اور کلام پاک مل جاتے تھے۔ ایک دکان مٹی کے لوٹوں' اور ٹوپیوں کی بھی تھی۔ ان دکانوں میں دکان دار بھی موجود تھے مگر پھر بھی گہرے سناٹے کا احساس کم نہیں ہوا تھا۔ چند قدم اور چلے تو سامنے مسجد کی چوڑی چوڑی سیڑھیاں نظر آ گئیں۔

"تمھارا نام وقار الحسن ہے!" اچانک سیڑھیوں کے کونے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے سر اٹھا کر پوچھا۔

میں اور شرف الدین ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس کوئی فقیر تھا۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے رنگین موتیوں کی کئی مالائیں پڑی تھیں۔ "جی۔ مگر۔ میں وقار الحسن ہوں۔۔ ہمیں۔۔"

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "بابا تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے مسجد کی سیڑھیوں کے انتہائی بائیں جانب۔ بنے اس چھوٹے سے کمرے کی طرف اشارہ کیا جس میں ہونے والی ہلکی روشنی پتلے سے دروازے سے باہر فرش پر پڑ رہی تھی۔

میں نے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ چند ثانیے ہم دونوں اس فقیر کی طرف دیکھتے رہے پھر شرف الدین نے میرا ہاتھ دبایا۔ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے میں خوف تو نہیں کہہ سکتا' شاید میں مرعوب تھا۔ دل پر ایک بوجھ سا لگتا تھا۔ میں اور شرف الدین مڑ کر اس کٹیا کی طرف چل پڑے۔ ابھی ہم دروازے کے قریب پہنچے تھے کہ میں نے انھی بزرگ کو دروازے سے نکلتے دیکھا جنھوں نے آج دوپہر میں مسجد جاتے ہوئے راستے میں مجھے سنہرے بابا کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر انھیں سلام کیا' شرف الدین بھی ہونقوں کی طرح انھیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھا کر آداب کیا تھا۔

"یہ۔۔ یہ۔۔" وہ ہکلایا۔

"وہی تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے مسجد جاتے ہوئے آج مجھے۔۔۔"

"اور مجھے بھی۔۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

وہ بزرگ ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرائے۔ سلام کا جواب دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "اگر تم نہ آتے تو۔۔ اوہ سنو برخوردار! سنہرے بابا کی ہدایت پر عمل کرنا۔ وہی تمھیں اس خوف ناک چکر سے نکال سکتے ہیں۔" پھر اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا وہ پلٹ کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اندر جانے کی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شرف الدین نے آگے بڑھ کر دروازے سے اندر جھانکا۔

"آؤ شرف الدین!" اندر سے بھاری اور بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔

وہ جھٹ اندر داخل ہو گیا اندر جانے سے قبل اس نے چپل باہر ہی اتار دیے تھے۔ اب میری بھی ہمت ہو گئی اور میں بھی چپل اتار کر اندر داخل ہوا۔ شرف الدین سامنے بیٹھے بزرگ کے قریب دوزانو بیٹھا ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہا تھا۔ ان بزرگ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ لوگ انھیں سنہرے بابا کیوں کہتے ہیں۔ وہ شاید اسی پچاسی سال کے تھے۔ ان کے گھنے اور گھنگریالے لمبے بال بالکل سفید تھے اور ان کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ سونے کی طرح سنہری اور چمک دار تھا۔ آنکھیں بھوری اور چمک دار تھیں' ان کی بھنویں اور پلکیں بھی سفید تھیں مگر ان میں بھی عجیب سی سنہرے رنگ کی چمک تھی۔ ناک اور

رخسار کا درمیانی حصہ بالکل گلابی تھا۔ ان کے سفید بالوں کے علاوہ ان میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے ان کی عمر کا اندازہ ہوتا۔ ان کا جسم توانا تھا' ہاتھ پیر مضبوط اور چوڑے چوڑے تھے۔ ان کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بڑی نرم اور خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

میں نے جھکتے ہوئے سلام کیا اور شرف الدین کی تقلید میں ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ان کے اندر ایک عجیب سا وقار تھا جو سامنے والے کو مسحور اور مرعوب کردیتا تھا۔

"وقار الحسن! تم نے بہت دیر کردی۔" انھوں نے بھاری آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "تمھیں سر شام ہی آجانا چاہیے تھا۔"

"بابا۔۔۔وہ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" انھوں نے ہاتھ اٹھایا۔ "کچھ دیر انتظار کرو۔" اتنا کہہ کر وہ سر جھکا کر اور آنکھیں بند کر کے غالباً کسی وظیفے میں مصروف ہوگئے۔

میں نے انھیں مصروف دیکھ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کافی چھوٹا سا کمرا تھا جسے حجرہ کہا جاسکتا تھا۔ اس حجرے میں چٹائی بچھی تھی جس پر ہم لوگ بیٹھے تھے۔ سنہرے بابا مخملیں جائے نماز پر بیٹھے تھے۔ دیوار پر بنے دو طاقچوں میں موم بتی روشن تھی۔ ایک چھوٹا سا لیمپ بھی ایک طاقچے پر رکھا تھا جس کی چمنی ایک طرف سے بالکل سیاہ ہو رہی تھی۔ اس لیمپ کے پاس جزدان میں لپٹا ہوا کلام پاک رکھا تھا' ایک کیل میں کئی مختلف رنگوں کی تسبیحیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک لوٹا' ایک سلفچی اور مٹی کا گھڑا رکھا تھا' کمرے کی دیواریں اندر سے کچی تھیں اور اس پر چکنی مٹی لیپی ہوئی تھی' غالباً اسی وجہ سے کمرے میں ٹھنڈک تھی۔ دائیں جانب کی دیوار پر بہت نیچے ایک کھڑکی تھی جس پر ہلکے پیلے رنگ کا پردہ پڑا تھا۔ یہ کھڑکی غالباً مسجد کے دائیں جانب کی گلی میں کھلتی تھی۔ اس کمرے میں کوئی ایسی خاصی چیز یا خاص بات نہ تھی جو مجھے چونکاتی' شاید اس وجہ سے جو کیفیت میں اندر داخل ہونے سے قبل محسوس کر رہا تھا وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ میرے اندر گہرا اطمینان اور سکون پھیلا ہوا تھا۔ کوئی بوجھ' کوئی خوف کچھ بھی نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں یہاں بار بار آچکا ہوں۔

شرف الدین بھی کمرے کا جائزہ لینے میں منہمک تھا۔ سنہرے بابا اب بھی وظیفے میں مصروف تھے۔ ان کی انگلیوں میں عقیق اور فیروزے کی موٹی انگوٹھیاں تھیں اور فیروزی دانوں کی تسبیح ان کی انگلیوں کے درمیان تیزی سے گھوم رہی تھی۔ ان کے گرد ایک سنہری سا ہالا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے بدن میں کہیں موم بتیاں سی روشن ہوں۔ ایک بات میں نے شدت سے محسوس کی کہ ان کی جانب دیکھتے ہوئے بدن میں ٹھنڈک اور فرحت انگیز سی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے' شاید پانچ یا چھے منٹ بعد سنہرے بابا نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور نامانوس سے الفاظ ان کے منہ سے نکلنے لگے۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ عربی زبان کے الفاظ نہیں تھے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ چند ہی لمحوں بعد انھوں نے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیر کر آنکھیں کھول دیں۔ میں اور شرف الدین پہلو بدل کر سیدھے ہوگئے۔

"تم جس کام کا قصد لے کر نکلے ہو' وہ بے وقوفی تمھیں ساری عمر کے لیے زندہ درگور کردے گی لڑکے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

"میں۔۔۔! میں سمجھا نہیں۔" میں نے جھجک کر کہا۔

"تم شکنتلا کی روح کو سکون پہنچا سکتے ہو مگر کیا تم نے سوچا کہ ایسا کرنے کے بعد کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ۔۔۔ اسے سکون مل گیا تو ہم بھی حویلی میں سکون سے رہ سکیں گے۔"

"یہ تمھاری خوش گمانی ہے۔ اسے سکون مل گیا تو وہ دوسرا جنم لے گی اور اس کا دوسرا جنم تمھارے گلے میں آہنی پھندا بن جائے گا۔"

"جی!" میں واقعی کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"تمھارے پاس بابا معظم کا تعویز ہے۔ وہ تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی لیکن اس کا دوسرا جنم لینا تمھارے لیے تباہی ہوگا۔"

میرا ہاتھ بے اختیار اپنے گریبان کی طرف رینگ گیا۔ ابا کا دیا ہوا تعویز میرے گلے میں تھا جسے میں پہننا نہیں بھولا تھا۔

"اس تعویز کو ہمیشہ پہنے رہنا وقار الحسن! اس تعویز کا حصار کسی کو بھی تمھارے قریب نہیں آنے دے گا۔"

"بابا!" شرف الدین پہلو بدل کر بول اٹھا۔ "شاید آپ کو کچھ بھی بتانا ضروری نہیں ہے۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں پھر آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آخر ہم ان چکروں سے کیسے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ شکنتلا پھر پرکاش۔۔۔ اور وہ عصمت جہاں۔"

"وہ عصمت جہاں نہیں تھیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بول اٹھے۔

"جی۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

"یہ کارنامہ شکنتلا کا ہے۔" وہ بول اٹھے۔ "عصمت جہاں خود کشی کی وجہ سے عذاب مسلسل میں ضرور ہیں مگر ان کا یوں دوبارہ آنا اور جلوہ بھی کرانا ممکن نہیں۔" پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ "وقار الحسن! تم اگر ان عذابوں سے نکلنا چاہتے ہو تو تمھیں میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ کچھ وظائف کرنا ہوں گے جنھیں مکمل کرنے کے بعد تم شکنتلا کی روح کو اپنے تابع کر سکو گے پھر وہ تمھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکے گی بلکہ تم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکو گے۔ تمھیں اپنے پرداوا کے گناہوں کے نقش مٹانا ہوں گے۔ یہ کام کٹھن ضرور ہے مگر لیکن تم میں وہ قوت دیکھ رہا ہوں جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے اور شاید اسی قوت کو شکنتلا اور جوگندر ناتھ نے بھی محسوس کرلیا ہے۔ بولو! کیا تم میری ہدایات پر عمل کرنے کو تیار ہو؟"

"بابا۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہوگا!" میں نہ معلوم کیوں خوفزدہ ہوگیا تھا۔

"تمھیں سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس رہنا ہوگا۔"

اور میرا دل بیٹھ گیا۔ میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"وقار الحسن! تمھارے ایک جانب گہری کھائی ہے اور دوسری جانب اونچی دیوار' تم چاہو تو اس اونچی دیوار کو عبور کرکے خود کو بچا سکتے ہو۔ دیوار کو عبور کرنا محنت طلب کام ضرور ہے۔ مگر ناممکن نہیں۔ دوسری صورت میں تم بہت گہرائیوں میں گرتے چلے جاؤ گے۔ تم ان پستیوں کا ادراک نہیں کر سکتے جو تمھیں دھیرے دھیرے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ میں فیصلہ تمھارے اوپر چھوڑتا ہوں مگر اتنا یاد رکھنا کہ پستیاں تمھارے بے حد قریب ہیں اور تم ان میں گرنے ہی والے ہو۔ جاؤ۔۔۔ سوچو' تمھارا فیصلہ ہم تک پہنچ جائے گا۔"

آخری جملہ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ بات ختم کرچکے ہوں۔ ان کا سر جھک کر سینے سے جا لگا تھا۔ آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ میں نے پہلے شرف الدین کو پھر بابا کو دیکھا۔ شرف الدین بڑی گہری نگاہوں سے انھیں دیکھ رہا تھا پھر اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اور شرف الدین خاموشی سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سنہرے بابا کا رویہ' ان کی باتیں میری سمجھ میں قطعی نہیں آئی تھیں' مگر دل ان کی باتوں پر یقین اور عمل کرنے پر مصر تھا۔ ایک انجانا سا خوف پھر دامن گیر ہوگیا تھا۔ میں شکنتلا کو سکون پہنچانا چاہتا تھا تاکہ وہ حویلی میں چکرانا ختم کردے' پرکاش کی لاش ڈھونڈ کر اس کے حوالے کردینا چاہتا تھا تاکہ میں اپنی ماں کی خواہش کے مطابق حویلی کو آباد کرسکوں اور بابا کہتے تھے کہ اس کا سکون مجھے تباہی سے دوچار کردے گا۔ انھی سوچوں میں گم ہم وہ گلی عبور کر آئے۔ شرف الدین بھی خاموش تھا' شاید وہ بھی کسی گہری سوچ میں تھا۔ گلی عبور کرتے ہی چاروں طرف سے بے پناہ شور نے ہمیں بوکھلا دیا۔ لوگوں کی آوازیں' ہوٹل میں ہونے والی ریکارڈنگ' تانگے والوں کی ٹخ ٹخ اور سائیکل رکشا والوں کی "بچو بھیا! بچو۔" کی آوازوں نے جیسے ہمیں ہوش و حواس بخش دیے ہوں۔

"آؤ یہاں چائے پیتے ہیں۔" شرف الدین نے اس ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ میں خود بھی چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں ہوٹل کے باہر پڑی بینچوں پر بیٹھ گئے۔ شرف الدین نے چائے منگوائی۔

"وقار الحسن! کیا خیال ہے؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"سمجھ میں نہیں آرہا۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں جواب دیا اور چائے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"میرا خیال ہے کہ میری سمجھ میں سب کچھ آچکا ہے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"کیا تمھیں ایسا نہیں لگا جیسے سنہرے بابا تمھیں دنیاداری سے الگ کر رہے ہوں۔ انھوں نے کہا تھا کہ تمھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"ہاں پھر؟"

"پھر یہ کہ وہ تمھارے ذریعے شکنتلا کی روح کو قابو میں کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں عصمت جہاں بھی عصمت جہاں نہیں تھیں بلکہ وہ کارنامہ شکنتلا کا تھا۔ تم شکنتلا کے قائل ہو چکے ہو۔ اس کی مدد بھی کرنا چاہتے ہو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ تمھیں دھوکا دے' اور پھر عصمت جہاں بن کر' رمضو بابا کو قتل کر کے اور تمھاری اماں کے ادھار لیے ہوئے جھمکے واپس کرنے سے اس کا کون سا

مقصد حل ہوتا ہے۔ مجھے تو دال میں کچھ کچھ کالا لگ رہا ہے۔"

"مقصد؟۔ تم کھل کے بات کیوں نہیں کرتے؟" میں جھنجلا گیا۔ ویسے اس نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔

"مقصد یہ ہے بھیا جی کہ یہ تمھارے خلاف کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ جب تمھیں قتل کرنے کا ڈراما کھیلا جا سکتا ہے تو تمھیں اس طرح دنیا داری سے الگ کرنے کا ڈراما تو سوفی صد کامیاب بھی ہو سکتا ہے اور کسی پر بات بھی آنے کا خطرہ نہیں ہے۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

" تمھارا مطلب ہے کہ چچا۔۔۔"

"سمجھ دار ہو گئے ہو۔" وہ مسکرایا۔

"شرف الدین تمھارا حافظہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "تم بھول گئے کہ شگفتلا کی روح امروہہ والی حویلی میں ہی رہ گئی ہے اور سنہرے بابا مراد آباد میں رہتے ہیں' اور یہ بھی بھول گئے ہو کہ ہم نے سنہرے بابا کو کچھ نہیں بتایا بلکہ ان کے آدمی نے ہم تک ان کا پیغام پہنچایا اور وہ سب کچھ جانتے تھے۔ شگفتلا کے بارے میں بھی' پرکاش کے بارے میں بھی اور جو گندر ناتھ کے بارے میں بھی' اور شرف الدین جو کچھ وہاں ہمارے ساتھ ہوا اس سے چچا ناواقف تھے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ شگفتلا وغیرہ کے بارے میں وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر عصمت جہاں کے بارے میں انھیں کچھ علم نہیں۔"

"کیا یہ باتیں تم نے کسی کو نہیں بتائیں؟" اس نے کچھ جھک کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیا اماں کو بھی نہیں۔؟"

"مگر اماں چچا کے بارے میں جانتی ہیں' انھوں نے یہ باتیں کسی کو بھی نہیں بتائی ہوں گی' حتیٰ کہ تایا بھی ان باتوں سے لاعلم ہیں۔"

"کیا اماں کو بتاتے ہوئے تم نے اطمینان کر لیا تھا کہ یہ باتیں کوئی نہیں سن رہا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

لمحہ بھر کو میں ٹھٹک گیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ باتیں کسی نے نہیں سنیں!"

"خیال نہیں یقین سے بتاؤ۔"

"چچا اس وقت گھر میں نہیں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے کچھ نہیں سنا ہو گا۔" کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر میرا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا تھا جب میں اماں کو یہ سب باتیں بتا رہا تھا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ یہ باتیں اماں کے کمرے میں ہو رہی تھیں۔ میں نے بالکل غور نہیں کیا تھا کہ ہماری باتیں کوئی سن سکتا ہے' لیکن یہ میں جانتا تھا کہ اس وقت چچا گھر میں نہیں تھے۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ تمھاری باتیں کسی نے سنی ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"شرف الدین! سنہرے بابا یہاں مشہور ہیں' یہ بات مجھے تایا سے معلوم ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ بھلا چچا کا ساتھ کیوں دیں گے' جس آدمی کو دنیا داری سے محبت ہی نہ ہو وہ یہ سب کچھ کیوں کرے گا؟"

"میں نے کب کہا کہ وہ دنیا داری کے لیے یہ سب کر رہے ہیں' لیکن وہ جس کام سے لگاؤ رکھتے ہیں' اس پر پوری دسترس حاصل کرنے کے لیے تو کر سکتے ہیں ناں! میرا خیال ہے کہ وہ شگفتلا کو قابو میں کرنے کے لیے ہی یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شگفتلا براہ راست ان کے قابو میں نہیں آئے گی البتہ تمھارے قابو میں آ سکتی ہے۔ وہ تمھیں اپنا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں' وہ شگفتلا کو کیوں اپنے قابو میں کرنا چاہتے ہیں یہ میں نہیں جانتا' ممکن ہے وہ اپنی مشہوری کے لیے ایسا کرنا چاہتے ہوں مگر۔"

"بس کرو' شرف الدین! مجھے ڈر ہے کہ تمھارے خیالات وہ جان چکے ہوں گے اور میں تمھیں کوئی نقصان پہنچا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کر شرف الدین نے اپنی جیبیں ٹٹول کر کچھ سکے نکالے اور میز پر رکھ کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

"گویا تم سنہرے بابا کے لیے خود کو وقف کر دینے پر تیار ہو۔ یعنی اب تم سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے معنوں میں مجھے اور باقی سب کو ہی تم سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔"

"یہ میں نے کب کہا ہے لیکن تمھاری جیسی بدگمانی بھی نہیں ہے مجھے۔ میں اس بارے میں سوچوں گا۔ جس کام کا بیڑا میں دو برس پہلے اٹھا چکا ہوں اسے یوں چٹکیوں میں جھٹک دینا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں شگفتلا کو مظلوم سمجھتا ہوں۔ میں اسے سکون دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"ظاہر ہے' وہ اتنے عرصے تمھارا ساتھ دیتی آئی ہے پھر بھلا نقصان کیوں پہنچائے گی۔ یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی اور سچ جانو تو یہی بات مجھے کھٹکی ہے۔ سنہرے بابا کے بہ قول اس کا دوسرا جنم تمھارے لیے آہنی پھندا بن جائے گا مگر کیوں۔؟ کیا وہ اتنی احسان فراموش ہو گی کہ جو شخص اس کے سکون کا باعث بنے وہ اسی کے گلے کا آہنی پھندا بن جائے۔"

"شرف الدین! خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ میں آج کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا۔ میرا دماغ بہت بوجھل ہے۔ میں اس بارے میں بعد میں سوچوں گا۔" میں نے کنپٹی دباتے ہوئے کہا۔

ہم گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جونہی ہم اپنی گلی میں مڑے' ایک سایہ تیزی سے اگلی گلی میں غائب ہو گیا۔ اتفاق سے میری اور شرف الدین کی نگاہیں اس جانب تھیں اور ہم دونوں ہی نے اس سائے کو گلی میں غائب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں تو ٹھٹک کر رہ گیا مگر شرف الدین بھاگ پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ یہ گلی تایا کے گھر کے پچھواڑے کی گلی سے جا کر ملتی تھی۔ اس گلی میں بہت اندھیرا تھا۔ میں اور شرف الدین گلی میں داخل ہوئے تو وہاں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اب تک چھپ چکا تھا۔ ممکن ہے کسی گھر میں داخل ہو گیا ہو۔ تایا کے گھر کی پچھلی طرف کوئی دروازہ نہ تھا البتہ کھڑکیاں تھیں۔ شرف الدین اسی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دماغ میں چھپے خناس کو میں سمجھ رہا تھا۔ وہ اس چکر کو چچا سے جوڑنا چاہتا تھا۔ غالباً اس طرف آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ بھاگنے والے کے اسی گھر میں داخل ہونے کو ثابت کرنا چاہتا تھا مگر یہاں کی سپاٹ دیوار اور کھڑکیوں میں لگی لوہے کی سلاخیں دیکھ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اوپر بنا چھجا کافی اونچا تھا۔ گو اس چھجے کے دوسری طرف چچا اور چچی کا کمرا اور چھوٹا سا دالان تھا۔ اس چھجے کے اوپر کبوتر کے کابک بنے ہوئے تھے مگر نیچے سے وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

"وقار الحسن! تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر یہ کوئی روح تھی تو اسے بھاگ کر کہیں چھپنے کی کیا ضرورت تھی' وہ تو دھواں بن کر بھی تحلیل ہو سکتی تھی۔"

"شرف الدین! ہمیں سوچنے کے لیے وقت اور سکون کی ضرورت ہے' اور یہ وقت اور سکون ہمارے پاس ہے' اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمھاری مخالفت تو نہیں کر رہا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ کافی جذباتی ہو رہا تھا۔

"جی نہیں ہمارے' پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ابا اور اماں آ چکے ہیں' پرسوں نکاح ہے اور شاید دو روز بعد ہی وہ شگفتہ کو لے کر روانہ ہو جائیں گے اور تب ہی مجھے علی گڑھ جانا ہے۔ تمھارا جانا تو شاید کھٹائی میں پڑ چکا ہے۔ اب تمھیں داخلے کی تو کوئی ضرورت نہیں' نہ تم امروہہ جاؤ گے بلکہ شاید اب تم سے ملنے مجھے سنہرے بابا کے حجرے میں آنا پڑے' وہ بھی اس صورت میں جب تم کسی وظیفے یا جنتر منتر سے فراغت پا چکے ہو۔" اس نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

میں ہنس پڑا۔ "اور جنتر منتر سے فراغت تو مجھے ملے گی ہی نہیں۔ روحوں کو قابو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مخنچو! ویسے میرا جب جی چاہے گا تمھیں کسی روح کے ذریعے بلوا لیا کروں گا۔ پلک جھپکتے میں تم علی گڑھ سے یہاں پہنچ جاؤ گے' تمھارا کرایہ اور وقت بچ جایا کرے گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چلو ورنہ اب ہمیں آوارہ گردی کے الزام میں پکڑا بھی جا سکتا ہے' ممکن ہے لوگ ہمیں اچکا سمجھ کر پولس کے حوالے کر دیں۔"

"یار میں اب' اس وقت گھر کیسے جاؤں گا!" وہ متفکر ہو کر بولا۔

"تم یہیں سو جاؤ۔ میں برآمدے میں پلنگ ڈال لوں گا۔" میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ وہ چپ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی رات گئے گھر جائے گا تو سبھی لوگ اٹھ جائیں گے' جب کہ اماں میرے لیے اب تک جاگ رہی ہوں گی۔

ہم چند ہی لمحوں بعد دروازے پر کھڑے تھے۔ میں نے کواڑ پر لٹکا کنڈا ہلایا' چند منٹ بعد ہی مجھے کسی کی چاپ سنائی دی اور پھر آنے والے نے کنڈی گرا دی۔

دروازے پر چچا کو دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ "آ۔۔۔ آپ؟"

"میاں یہ بمبئی نہیں ہے۔" انھوں نے آہستہ مگر تلخ لہجے میں کہا۔ "مراد آباد ہے اور یہاں شرفا رہتے ہیں۔ یوں رات رات بھر گلیوں میں گھومنا یہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس وقت تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

اس سے قبل کہ میں انھیں کوئی جواب دیتا' اماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آ گئیں۔ انھیں دیکھتے ہی چچا جلدی سے بڑے برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔

"ان سے پوچھو یہ خود کہاں سے آرہے ہیں۔" شرف الدین دھیرے سے بولا۔ میں نے اسے کہنی ماری تو وہ چپ ہو گیا اور اماں کو دیکھ کر انھیں آداب کیا۔

"جیتے رہو۔ تم شرف الدین ہو؟"

"جی خالہ جان! دیر ہو جانے پر شرمندہ ہیں مگر۔۔۔"

"میں جانتی ہوں۔ میں تم ہی دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ آؤ اندر آجاؤ۔" اتنا کہہ کر اماں نے راستہ چھوڑ دیا۔ چچا غالباً اوپر جا چکے تھے۔ ہم دونوں اندر چلے آئے۔ تایا ابھی تک جاگ رہے تھے۔ وہ ہماری آواز سن کر قریب آگئے۔

میں اماں کو بتا چکا تھا کہ شرف الدین اس وقت گھر نہیں جا سکتا اس لیے اس کے سونے کا انتظام یہیں کر دیں۔ وہ غالباً ہمارے سونے کا انتظام کرنے چلی گئی تھیں۔ تایا اپنا پلنگ کھینچ کر دالان میں لے آئے۔ میں موڑھے اٹھا لایا۔ شاید اماں تایا کو کچھ بتا چکی تھیں۔ انھوں نے بیٹھتے ہی پوچھ لیا کہ کیا ہوا اور سنہرے بابا ملے یا نہیں۔ میری بجائے شرف الدین نے انھیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

"ہوں۔۔۔ سب کھیل تماشے ہیں۔" تایا بڑبڑائے۔ "میاں سیدھے سیدھے اپنے دھندے سے لگو۔ علی گڑھ بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ اس حویلی کو بیچ باچ کر الگ کرو، یہاں مکان خریدو اور کوئی کاروبار کر لو۔ اجداد کی جاگیر سینے سے لگائے رکھو گے تو ان کے گناہ ثواب بھی تمھارے ہی حصے میں آئیں گے۔" وہ کافی تلخ ہو رہے تھے۔

"نہیں تایا! میرا ضمیر مطمئن نہیں ہو گا۔ میں نے بہت سی باتیں آپ کو نہیں بتائیں اس لیے آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم نے حویلی چھوڑ دی تب بھی ہم شکنتلا سے جان نہیں چھڑا سکتے۔"

"کیوں۔ مرزا صولت بیگ تمھارے تو پرداوے تھے ناں مگر میرے تو وہ داوے تھے۔ شکنتلا نے میرا پیچھا کیوں نہیں کیا! یا تمھارے چچا ہی کے پیچھے کیوں نہ پڑ گئی؟ بات صرف اتنی ہے میاں کہ تمھاری اماں اس حویلی کو اپنی شان بنائے بیٹھی ہیں۔ ہم جب سے امروہہ چھوڑ کر آئے ہیں یہاں سکون سے لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ یقین نہ ہو تو تم بھی آزما لو۔"

"تایا ٹھیک کہتے ہیں وقار الحسن! ویسے بھی تم یہاں مکان خریدنے کا قصد کر ہی چکے ہو۔" شرف الدین کو تو جیسے موقع ہی مل گیا۔

مکان خریدنے والی بات سن کر تایا چونک اٹھے۔ "یہ قصد کب فرمایا صاحب زادے نے؟" انھوں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا تایا۔ میں خود بھی بہنوں کو اس قدر خوفزدہ دیکھ چکا ہوں وہاں پر کہ سوچتا ہوں یہیں رہ جاؤں۔"

"پھر بھلا کیا قباحت ہے؟"

"اماں واپس حویلی جانا چاہتی ہیں۔"

"رہنے دو میاں! اتنے بہت سوں کو ان کی چاہت پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ بس میں نے کہہ دیا کہ اب امروہہ کا کوئی نام نہیں لے گا۔" انھوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"بچو! تم کھانا کھا لو۔" اسی وقت اماں نے آکر کہا۔ ہم دونوں ہی بھوکے تھے۔ ہاتھ دھو کر بڑے برآمدے میں چلے آئے جہاں اماں نے سفید چاندنی بچھا کر دسترخوان لگا دیا تھا۔ تایا حقے کی چلم کریدنے لگے، حقے کی نے ہونٹوں تک پہنچی تو راکھ کے نیچے دبے کوئلے لو اٹھے۔ اماں ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ میں نے اماں کو سنہرے بابا سے ملاقات کی تفصیل بتائی تو چپ ہو گئیں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے حجرے میں ان کے ساتھ رہ جانے والی بات نے انھیں چپ لگا دی تھی۔

"دلھن یہ ایک ہی بیٹا ہے تمھارا! اور تمھارا ہی کیا ہمارے خاندان میں یہی ایک نام لیوا ہے۔ اب اگر تم چاہتی ہو کہ یہ سب کچھ تیاگ کر ہمالیہ کی چوٹی پر جا بیٹھے تو بسم اللہ ورنہ حویلی کا سودا سر سے نکال دو۔ یہاں آخر تمھیں کیا تکلیف ہے اور حویلی میں جن لوگوں کی تالیں گزر تھیں وہ تو سب یہاں آباد ہو گئے پھر تم کیوں یہ ضد ہو؟ بیٹیوں کا ساتھ ہے، روحوں کا کیا بھروسا! کچھ الٹا سیدھا ان کے ساتھ ہو گیا تو رہی سہی عزت بھی نیلام ہو جائے گی۔ تمھیں نصر اللہ بیگ کے گھرانے کا بکھرنا یاد نہیں ہے شاید؟ ان کی جوان بیٹی پر جن عاشق ہو گیا تھا۔ پردے لگا کر پالکی میں سفر کرنے والی لڑکی ناچتی ہوئی نکل آئی تھی سڑکوں پر، لوگ منہ پھیر کر چلے گئے تھے۔ کمہار کے بیٹے نے قابو کیا تھا اسے۔ اس کے بعد شرم سے علاقہ ہی چھوڑ گیا تھا۔ نصر اللہ بیگ کی گردن پھر ساری زندگی نہ اٹھ سکی، لاکھ سمجھایا کہ جن بھوت کا معاملہ تھا مگر وہ شریف آدمی دنوں میں ساری جائیداد کوڑیوں کے مول بیچ کر دہلی چلا گیا۔ سنا ہے ان کی بہو نے بھی میکے سے ناتا محض اسی لیے توڑ لیا کہ یہاں ان کی نند کے چرچے تھے اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھیں۔ پتا نہیں بے چارے کے ساتھ کیا ہوا، کسی سے ملتے ہی نہ تھے کہ خیر خبر مل جاتی۔ ویسے دلھن تمھاری مرضی مگر میں لڑکیوں کو دوبارہ چاند کا قیدی بنانے کے حق میں نہیں ہوں۔ تمھیں کیا پتا ہر چودھویں کی رات ہم لوگ یہاں سولی لٹکے گزارا کرتے تھے کہ یا اللہ خیر کرنا۔ بعد میں کئی روز تک ہر آہٹ پر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی خبر نہ آئی ہو۔"

تایا بولتے رہے، چلم سے چنگاریاں نکلتی رہیں، اماں دھلتی رہیں اور ہم لوگ کھانا کھاتے رہے۔ مجھے حیرت تو شرف الدین پر تھی۔ وہ ان چکروں میں گھر کر کتنا کمزور اور ڈرپوک سا ہو گیا تھا مگر اس وقت وہ بالکل پرانا والا شرف الدین لگ رہا تھا، وہی جو ہمیشہ میرا مذاق اڑاتا رہا، جو شکنتلا والے معاملے کو حقیقت ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ وہ شرف الدین جو آج دن میں ان بزرگ کا پیغام سن کر بھاگا بھاگا میرے پاس چلا آیا تھا اور وہی شرف الدین جس نے سنہرے بابا سے آج ہی ملنے پر اصرار کیا تھا، وہ اس وقت بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ وہ تایا کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ پرکاش نے مراد آباد تک ہمارا تعاقب کیا تھا۔ گویا ثابت کر دیا تھا کہ ہم چاہے کہیں بھی چلے جائیں، شکنتلا سے کیے ہوئے وعدے سے نہیں پھر سکتے۔

میں خاموش تھا۔ میں اس وقت کچھ بھی سوچنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سنہرے بابا کی پیشکش میرے لیے مشکل ترین پیش کش تھی۔ ممکن تھا کہ میں ان سے معذرت بھی کر لیتا مگر اس کا مطلب قطعی یہ نہ تھا کہ میں ان کی ذات سے ہی منکر ہو جاؤں یا اس سارے معاملے کو ایک سازش سمجھ کر ذہن سے نکال دوں۔ میں سہولت سے سب کچھ سوچنا اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اماں سے مشورہ کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اس وقت کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

تایا کافی ناراض تھے۔ اماں پر اب بھی چپ لگی تھی۔ شرف الدین تایا سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا اور تایا اس سے بہت خوش لگ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں جہانی آپا نے اماں کو آواز دی۔ اماں اٹھ کر ان کے قریب چلی گئیں۔ وہ لوٹ کر آئیں تو ان کے ہاتھ میں تانبے کا بڑا سا خوان تھا۔ اس خوان میں پیالے رکھے تھے اور پیالوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"اوہ خالہ جان! آپ بہت اچھی ہیں۔ اس وقت چائے کی شدید طلب تھی۔" شرف الدین چہکا۔

"یہ تمھاری خالہ جان کا کارنامہ نہیں میاں، ہمارا کارنامہ ہے۔ ہم نے کہہ دیا تھا کہ چائے ضرور چلے گی۔" تایا نے خوان پر سے پیالا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میاں پینے کی ساری چیزیں حرام قرار دے دیں مگر چائے کے بارے میں کسی نے نہ سوچا۔ نشہ تو اس میں بھی ہے۔"

اماں کے چہرے پر ناگوار سا تاثر پھیل گیا۔ میں نے جھینپ کر اپنی توجہ پیالے پر مرکوز کر لی۔ اماں دسترخوان سمیٹ کر اٹھ گئیں، شرف الدین کی آنکھیں چمک رہی تھیں، اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اماں کے جاتے ہی وہ بول اٹھا۔ "وقار الحسن! بڑے خوش قسمت ہو۔ تایا تو بڑی آئیڈیل شخصیت کے مالک ہیں۔ تمھیں تو قدر کرنا چاہیے۔"

"میاں قدر ہی تو نہیں کی کسی نے ورنہ یہاں جنگلوں میں پڑے ہوتے بھلا؟"

"وقار الحسن!" اماں نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "تمھارا اور شرف الدین کا بستر بیٹھک میں لگا دیا ہے۔ بہت رات گزر چکی ہے اب تم دونوں سو جاؤ۔"

"آدمی بوڑھا ہو کر کتنا اکیلا ہو جاتا ہے۔" تایا نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "خصوصاً مرد، عورت سے تو بچے بے تکلف رہتے ہیں، بے تکلف نہ بھی ہوں تو اپنا دکھ سکھ اسی سے کہتے ہیں مگر مرد باپ۔ تایا یا چچا، خواہ کسی بھی روپ میں ہو، ایک فاضل پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔"

"آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں تایا!" میں دکھی ہو گیا۔ ان کا بھیگا ہوا لہجہ، انداز اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کا عکاس تھا۔

"ارے بھئی، اب یہی دیکھ لو کہ ماں اپنی بچی کے پاس سو رہی ہے۔ بچی کو جو کچھ کہنا سننا ہوتا ہے ماں سے کہتی سنتی ہے، چھوٹے بھائی مروت اور لحاظ کی آڑ لے کر چھپتے پھرتے ہیں، اور بھتیجے۔ بھتیجے بغلیں جھانکتے ہیں اور ادب آداب کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتے، جو کچھ دیر پاس بیٹھ بھی جائیں تو ان کی اماں ایسے گھورتی ہیں جیسے کچھ دیر اور بیٹھے رہے تو کبوتر بن جائیں گے۔" تایا نے فوراً ہی اپنے لہجے پر قابو پا لیا اور شوخ ہو گئے۔

"نہیں تایا! اماں اس لیے تو نہیں کہہ رہیں۔ آپ کو پتا

ہے کتنی رات گزر چکی ہے' اور میں تو آپ سے کافی باتیں کرتا ہوں۔"

"ہاں وقار الحسن! تم آئے ہو تو یوں لگا ہے جیسے ہم بھی زندہ ہیں ورنہ لگتا تھا کہ شیشے کے تابوت میں بند کر دیے گئے ہیں جہاں سے سب کچھ نظر تو آتا ہے مگر ہم کسی منظر کا حصہ نہیں رہے۔"

"تایا پلیز! ایسا تو نہ سوچیے۔ ایک آپ ہی تو ہیں جن سے کچھ دیر باتیں کر لیتے ہیں ورنہ چچا تو یوں اکھڑے اکھڑے پھرتے ہیں جیسے ___"

"ان کی تو خیر تم بات ہی مت کرو۔ ان کا سب کچھ یا تو کبوتر ہیں یا ان کی منکوحہ۔ کبوتروں کو تو ہماری نظر میں اس لحاظ سے برتری حاصل ہے کہ وہ کان نہیں بھرتے اور گھر کے دوسرے افراد سے حسد نہیں کرتے مگر ___"

"چھوڑیں تایا!" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ مجھے یقین تھا کہ چچا نہ صرف یہ کہ جاگ رہے ہوں گے بلکہ عین ممکن تھا کہ کن سوئیاں بھی لے رہے ہوں۔ ان کو یہاں بیٹھے اور وہ بھی اس وقت دیکھ کر میرے ذہن میں ہمیں پھانس سی چبھ رہی تھی۔ شرف الدین کے الفاظ اندر چٹکیاں (چھریاں) ڈال رہے تھے۔ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر تایا تو لگتا تھا پوری نیند لے کر اٹھے ہیں۔ مجھے نیند بالکل نہیں تھی اور چائے پی کر تو تھکن بھی غائب ہو چکی تھی مگر میں تنہائی چاہتا تھا تاکہ سنہرے بابا کی باتوں پر غور کر سکوں مگر ابھی کچھ دیر پہلے تایا نے جو باتیں کی تھیں انھیں سن کر دل نہیں چاہا کہ ان سے اجازت لوں۔ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ شرف الدین ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اماں کے کمرے کی بتی روشن تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ غصے میں بل کھا رہی ہوں گی۔ وہ مجھے سونے کا حکم دے کر گئی تھیں اور یہاں سے اٹھنا ہی خواب لگ رہا تھا۔

"ارے ہاں میاں شرف الدین! تمھارے باوا آ گئے؟"

"جی! جی ہاں تایا۔ دو روز بعد واپس امروہہ چلے جائیں گے۔ آپ نکاح میں آئیں گے نا' وقار الحسن نے آپ کو بتایا بھی ہے یا نہیں!"

"ہاں بھئی بتایا ہے' غالباً تمھاری چچا زاد کی شادی ہے۔ بھئی شادیوں میں تو ہم ضرور جاتے ہیں چاہے وہ کسی کی بھی چچا زاد کی ہو مگر اس شادی میں تو ہم ویسے بھی ایک خاص مقصد لے کر جا رہے ہیں۔"

میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ مجھے تایا کا شرف الدین سے اس وقت یہ گفتگو کرنا اچھا نہیں لگا تھا اور خاص طور پر میرے سامنے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے اس انداز میں بات کی جائے۔ میں نے کھنکار کر تایا کو متوجہ کیا۔ وہ غالباً سمجھ گئے کہ میں اس وقت یہ گفتگو نہیں چاہتا۔

"کیسا مقصد؟" شرف الدین ان سے پوچھ رہا تھا۔

"چھوڑو میاں! وقار الحسن کی اماں کا سیر بھر خون تو اب تک جل ہی چکا ہوگا۔ انھیں اور کچھ تو نہ سوجھے گا لیکن وہ تمھاری تائی اماں کو ضرور اٹھا دیں گی' تمھاری تائی کو ہمارے خاندان کی عورتیں اکثر ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرتی ہیں۔"

شرف الدین زور سے ہنس پڑا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اکثر زوروں کا رن بھی پڑتا ہوگا۔"

"اوہ کوئی ایسا ویسا! بس دھول ہی دھول اڑتی نظر آتی ہے اور جب یہ دھول بیٹھتی ہے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ صرف ستارے سے ناچتے نظر آتے ہیں۔" پھر شرف الدین کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "اکثر یہ ستارے بھی نظر نہیں آتے۔ صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں یا کئی روز تک طبیب نظر آتے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے یہیں پڑاؤ ڈال لیا ہو۔"

میں اور شرف الدین ان کی باتوں پر ہنستے رہے۔ اماں کے کمرے سے کچھ آوازیں آئیں پھر خاموشی چھا گئی۔ "لو بھیا! خطرہ قریب آتا محسوس ہو رہا ہے۔ چلو اب تم لوگ بھی سو جاؤ ورنہ خیر نہیں ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ میں ان کا پلنگ پھر برآمدے میں ڈال آیا۔

جس بیٹھک میں اماں نے ہم دونوں کے سونے کا انتظام کیا تھا وہ غالباً اکثر بند ہی رہتی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل بھی میں نے اس میں کنڈی ہی لگی دیکھی تھی۔ میں شرف الدین کو لے کر بیٹھک میں چلا گیا۔ وہاں فرش پر چوڑا گدا ڈال کر اماں نے اس پر چادر بچھا دی تھی اور تکیے رکھ دیے تھے۔ کمرے کی دوسری چیزوں پر دھول سی جمی تھی۔ شرف الدین تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔

"میں سونے کے موڈ میں ہوں۔" میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "اگر تم باتیں کرنا چاہتے ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم پہلو بچانا چاہتے ہو۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "لیکن اس وقت میں خود بھی باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم سو جاؤ وقار الحسن! مگر اس

حوالے پر خوب سوچ لینا۔ تم نے تایا کی باتوں سے بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ سنہرے بابا کس قدر مشہور ہیں۔"

"تم نے بات شروع کر دی۔" میں بڑبڑایا۔

"سوری۔ شب بخیر۔" اس نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"شب بخیر" میں بھی کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ جائے گی مگر الٹا ہو گیا۔ شرف الدین تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگا اور نیند میری نگاہوں سے کوسوں دور بھاگ گئی۔ میں نے آنکھیں بند تو کر لی تھیں مگر اپنے سامنے شکنتلا کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جھٹ آنکھیں کھول دی تھیں پھر میں تمام رات نہ سو سکا۔ سنہرے بابا کی باتوں پر جوں جوں میں نے غور کیا مجھے یقین ہوتا گیا کہ میں ان پر عمل نہیں کر سکوں گا۔ ان کی بات پر عمل کرنے کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں اپنی ماں اور بہنوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا۔ وہ میرے وجود کو ترس جاتیں۔ شکنتلا سے وعدہ خلافی کرتا۔ پرکاش کو یونہی خلاؤں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا۔ جوگندر ناتھ کے سینے پر لگے زخموں کو رہنے دیتا' مرزا صولت بیگ کے لگائے ہوئے داغ تمام عمر کے لیے میرے ضمیر پر ناسور کی طرح پکتے رہتے۔ میں تو ان داغوں کو مٹانا چاہتا تھا۔ میں نے مرتے ہوئے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں کچھ نہ کر سکا تو کم از کم جوگندر ناتھ کے سامنے جا کر اپنے پردادے کے گناہ کا اقرار کر لوں گا' شاید اس طرح ان کے زخموں کی دکھن اور میرے ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہو سکے جب کہ سنہرے بابا کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ دوسرے معنوں میں وہ مجھے وعدہ خلافی پر اکسا رہے تھے۔ یہ سب سوچتے سوچتے میرے سر میں درد ہو گیا۔ میرے سامنے میرا مستقبل تھا۔ میری دونوں بہنوں کا مستقبل تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں۔ میرا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تایا کی بات پر عمل کروں۔ حویلی بیچ دوں یا یونہی پڑی رہنے دوں' اور یہاں کوئی کاروبار شروع کر کے سب کچھ بھول جاؤں۔ نہ سنہرے بابا کے بارے میں سوچوں اور نہ ہی شکنتلا کے بارے میں۔ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں کل اماں کے سامنے ساری بات رکھ کر ان سے مشورہ لوں گا اور جیسا وہ کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں کچھ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ شاید اسی وجہ سے کچھ ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی۔ صبح سویرے ہی مجھے شرف الدین نے اٹھا دیا۔ اسے گھر جانا تھا۔ وہ میرے اصرار کے باوجود چائے پیے بغیر ہی چلا گیا۔ اس نے شام کو آنے کا کہا تھا۔ میں اٹھ کر اماں کے کمرے میں آیا۔ جہانی آپا' پھوپی اور شنو آپا غالباً باورچی خانے میں تھیں۔ اماں چھپر کھٹ پر خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ میں نے یہ وقت غنیمت جانا اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے رات والی بات تفصیل سے بتائی اور کہا کہ میں ان کا مشورہ چاہتا ہوں۔ جیسا وہ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ میں نے انھیں یہ بھی بتا دیا کہ تایا اور شرف الدین کا کیا خیال ہے۔ وہ میری باتیں سن کر کچھ دیر تک خاموش رہیں۔

"میں اس حویلی کو بیچنے کے حق میں نہیں ہوں وقار الحسن! تم نہیں جانتے کہ ان میں گزارے ہوئے اتنے برس میری زندگی کے کس قدر اہم سال تھے۔ میں وہاں ہونے والے لمحے لمحے کی داستان کبھی بھلا نہیں سکتی۔ خود میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ کچھ بھی ہو شکنتلا کی روح کو سکون ہو جائے۔ وہ حویلی اگر خالی بھی رہی تو ہمارے نام سے پہچانی جائے گی اور اس حویلی سے وابستہ ہر تلخ یاد اور ہر اہم بات بھی ہم سے وابستہ رہے گی۔ میں یہ تلخ وابستگی ختم کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے تمھارے والد سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہاں ہونے والے ہر ظلم کا نام و نشان تک مٹا دوں گی' میں اس حویلی کو وہ شان و شوکت عطا کروں گی جو اب سے پچاس برس پہلے اس حویلی کا طرۂ امتیاز تھی۔ اب اگر تم کوئی فیصلہ کرو تو یہ خیال رکھنا کہ آج نہیں تو کل' ہمیں وہ حویلی آباد کرنا ہے۔ میں نہ رہی تو تمھیں اس حویلی سے وابستہ ہر تلخ یاد کو مٹانا ہوگا۔ میں اس حویلی کے اندھیرے ختم کر کے اس کے کونے کونے میں دیے جلانے کی متمنی ہوں' اور یہ سب کچھ کیسے ہوگا' یہ تمھیں سوچنا ہے۔ تمھیں اپنے باپ سے کیے ہوئے وعدے کو نبھانا ہے کہ تمھارے وعدے کا ایفا ہی میرے وعدے کی پاس داری ہوگی۔"

اماں پورے پر اعتماد اور مضبوط لہجے میں بول رہی تھیں۔ میں نے ان میں اتنی مضبوطی اور ایسا اعتماد پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ مجھے شرمندگی ہوئی کہ میں مرد ہو کر ہار گیا اور وہ عورت ہو کر بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں۔

"ٹھیک ہے اماں!" میں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا' لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" انھوں نے استفہامیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"آپ بہنوں کے ساتھ یہیں رہیں گی۔ میں یہاں مکان خرید لیتا ہوں۔ میں کسی کاروبار کو بھی آہستہ آہستہ فروغ دوں گا اور حویلی کی خبرگیری بھی کرتا رہوں گا' لیکن اماں مجھے پھر ہر حال میں جوگندر ناتھ تک پہنچنا ہے۔ مجھے بہرحال آپ سے کچھ عرصے تک جدا ہونا ہوگا۔ آپ کو میری جدائی صبر و تحمل سے برداشت کرنا ہوگی۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں وقار! مگر اپنے ابا کا دیا ہوا تعویز ہمیشہ اپنے گلے میں لٹکائے رکھنا۔ وہ تمھیں ہر آفت سے بچائے رکھے گا۔ تم چاہو تو سنہرے بابا تک اپنا فیصلہ بھی پہنچا سکتے ہو مگر انھیں اتنا بتا دینا کہ تم شگفتہ کی روح کو سکون دیے بغیر اسے قابو میں نہیں کر سکتے پھر اگر وہ چاہیں اور راضی ہو جائیں تو مجھے تمھاری جدائی شاق نہیں گزرے گی' کم از کم یہ امید تو ہوگی کہ تم ایک نہ ایک روز حویلی کو آباد کرو گے۔"

"ٹھیک ہے اماں! میں آج شام ہی کو سنہرے بابا کے پاس جاؤں گا۔" میں اتنا کہہ کر اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد نہا کر نکلا تو شنو آپا نے ناشتے کی اطلاع دی۔ کھانا ناشتا سب ساتھ ہی کھایا کرتے تھے۔ دسترخوان بڑے برآمدے میں لگا دیا جاتا تھا۔ میں اور اماں وہاں پہنچے تو چچا چچی بھی موجود تھے۔ نہ معلوم کیوں چچا کا رویہ بے حد اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ چچی کی تیوریوں پر تو حسب معمول بل پڑے تھے۔ تائی اور کوثر بھی تھیں اور تایا بھی۔

"آؤ میاں! ناشتے یا کھانے پر رنگ رنگ کے لوگ نہ ہوں تو کھانے ناشتے کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔" تایا نے آستینیں الٹتے ہوئے کہا اور دسترخوان کے قریب بیٹھ گئے۔ "بھئی ہمیں تو بچپن سے ایسی عادت پڑی ہے کہ بڑھاپے تک نہیں گئی۔ اللہ بخشے ہماری دادی کو' تین رنگ کا منہ تھا ان کا۔ ادھر ہماری اماں بیٹھیں اور ادھر ان کے چہرے پر رنگ گرے ہوئے۔ دادا نے تو کبھی انھیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا' انھی کی تقلید میں ہم بھی نگاہیں چرائے رہتے تھے۔ بس دادی ہی کی آنکھیں تھیں کہ سرچ لائٹ کی طرح چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں۔ پٹیالہ جیل میں اگر انھیں چوکیدار بنا دیا جاتا تو حکام کو اتنی بڑی بڑی لائٹیں لگانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور نہ بجلی کا اتنا خرچا ہوتا۔"

"اونہہ' چپ ہو کر ناشتا کیجیے۔" تائی نے پہلو بدل کر چچی کی طرف دیکھا پھر بولیں۔

"بیوی! ایک یہ زبان ہی تو رہ گئی ہے چٹخارے کے لیے' اب کھانوں میں تو وہ تیکھا پن رہا نہیں کہ عادت پوری ہو۔"

"اچھا بس۔" وہ پھنکاریں۔

میں تایا کی بذلہ سنجی پر منہ دبائے ہنس رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انھیں چچی سے اللہ واسطے کا بیر ہے' ان کی ہر بات کا تعلق انھی سے ہوتا ہے۔ وہ بھی خوب سمجھدار تھیں' اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان کا ہدف کون ہے۔ نوالے ایسے توڑ رہی تھیں جیسے کسی کی گردن توڑ رہی ہوں۔ اماں اور پھوپی گردن ڈالے چپ چاپ ناشتے میں مصروف تھیں جیسے کچھ سمجھی ہی نہ ہوں یا کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"بڑے بھائی!" اچانک چچا بول اٹھے۔

"جی چھوٹے بھائی!" تایا نے لہسن کی چٹنی نوالے پر لگاتے ہوئے سر اٹھایا۔

"اختری کی چھوٹی بہن ہیں ناں۔۔۔ مصطفائی۔۔۔"

"ہاں شاید ہیں تو۔" تایا نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ "خیریت سے تو ہیں!"

"نہیں ان کے پھیپھڑوں میں پانی اتر آیا ہے۔" چچا نے مغموم لہجے میں کہا۔

"دیدوں کا پانی!" وہ دھیرے سے چونک کر بولے۔

"بڑے بھائی!" چچا نے احتجاج کیا۔ "ہر وقت کا مذاق بھلا نہیں لگتا۔ اختری بہت دل گرفتہ ہیں۔ مصطفائی کے میاں محکمہ آبادکاری میں ملازم ہیں' وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ میں اور اختری کچھ روز کے لیے دہلی جانا چاہتے ہیں۔" ان کا لہجہ بڑا ہی نرم تھا۔

"بسم اللہ۔ چلے جاؤ۔ بھلا اس قدر تردد کی کیا ضرورت ہے۔"

"اے میں نے کہا مجھے اور دلھن کو بھی جانا چاہیے۔" تائی بول اٹھیں۔

چچی کے ماتھے پر پڑی تیوریوں کے بل صاف ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا اور ناک کی پھنگ لال ہو گئی تھی۔ انھوں نے دوپٹے کے پلو میں ناک سنکی۔ تایا نے جبڑے بھینچ کر انھیں دیکھا پھر جونہی چچی کی نگاہ اٹھی' وہ فوراً چہرے کے تاثرات بدل کر بولے۔

"ارے بھئی جانا تو چاہیے لیکن یہ گھر کی ساری کی ساری عورتیں یوں ایک دم غائب ہو گئیں تو بچوں کا کیا ہوگا؟"

"نہیں بھابی دلھن! یوں سب کا جانا تو ٹھیک نہیں ہے۔" اماں بول اٹھیں۔ "آپ اختری کے ساتھ چلی جائیے پھر جب آپ آجائیں گی تب ہی میں ہو آؤں گی۔"

پھر دہلی جانے کا پروگرام بننے لگا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ خورشید چاچا کے آنے کی اطلاع ملی۔ میں انھیں لیے ہوئے بیٹھک میں چلا آیا۔ اماں نے سویرے ہی بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کرا دی تھی۔ خورشید چاچا پیسا لے کر آئے تھے۔ میں خوش ہو گیا۔

"میاں چھوٹے مرزا! حویلی سے آئے ہوئے کے روز ہو گئے آپ کو؟"

"چار پانچ روز ہو گئے خورشید چاچا۔ کیوں خیریت تو ہے! کیا آپ امروہہ گئے تھے؟"

"ہاں' میرے بھتیجے کے ہاں بیٹا ہوا تھا' تب گیا تھا۔ ہمایوں بیگ نام کے کوئی صاحب آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے یہاں کا پتا دیا ہے اور۔۔۔ اور وہ' رمضو بابا کی بیوی بھی وفات پا گئیں۔"

"ہیں۔۔۔!" میں اچھل پڑا۔ "وہ تو اچھی بھلی تھیں۔ لڈن کہاں ہے؟"

"ہاں تھیں تو اچھی بھلی۔ ابھی رمضو بابا کا دسواں بھی نہ ہوا تھا کہ ایک روز اچانک ہی گر کر' پٹ سے مر گئیں۔ لڈن کہتا ہے خوف سے موت آگئی۔"

"خوف سے۔۔۔ کیا۔ کیا مطلب؟" میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"پتا نہیں عجیب عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔ شاید دماغ قابو میں نہیں رہا۔ آپ بتائیے کوئی مکان وکان دیکھا آپ نے؟"

"جی۔ نہیں خورشید چاچا! اب دیکھوں گا۔" میرا دماغ الجھ گیا تھا۔

"ایک ہندو ساہوکار کا مکان ہے یہاں پر' وہ بیچنا چاہتا ہے۔ رقم بھی زیادہ نہیں مانگتا۔ اگر چاہیں تو میں دکھا دوں۔ اس نے مجھے رقعہ لکھ دیا ہے' اس کا بھتیجا یہاں رہتا ہے۔ وہ گھر دکھا دے گا۔"

"ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے۔" میں کافی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ وہاں ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ لڈن کے اکیلے رہ جانے کا صدمہ بھی کم نہ تھا۔ میں نے چاچا سے کہا کہ وہ اب امروہہ جائیں تو لڈن کو یہاں میرے پاس بھیج دیں۔ خدا جانے کیوں میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے گھر کی ویرانی کا سبب میں ہوں اس لیے کہ رمضو بابا کا قتل میرے پردادے کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کی اماں کی موت کا سبب بھی جاننا چاہتا تھا۔

خورشید چاچا ایک روز رکنے کا ارادہ رکھتے تھے اس لیے میں نے شام میں گھر دیکھنے کا پروگرام بنا لیا' پھر اماں نے خورشید چاچا سے حساب کتاب لیا۔ کچھ ہدایات دیں' میں اس دوران میں لڈن ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اماں بھی لڈن کی ماں کی موت کا سن کر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ لڈن کی ماں نے اماں کی بڑی خدمت کی تھی۔

میں نے اسی دوپہر کو تایا سے مشورہ کیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے مگر انھوں نے کہہ دیا۔ "میاں یہاں سے دور ہوا تو سمجھو ہمارے لیے بیکار ہے۔ لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ یہاں سے قریب ہونا چاہیے۔"

بات ان کی بھی ٹھیک تھی۔ وہ تمام روز میں نے گھر میں گزارا۔ تائی' چچی اور چچا دہلی کے لیے روانہ ہونے لگے تو میں انھیں اسٹیشن تک چھوڑنے گیا۔ واپسی پر میں نے سوچا کہ شرف الدین کے پاس ہو لوں' سچی بات تو یہ تھی کہ دل شگفتہ کو دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا مگر ہمت نہ ہوئی۔ دل کو دلاسا دیتا ہوا واپس گھر چلا آیا۔ خورشید چاچا اور تایا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے مکان کے بارے میں اماں کو بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ہم دیکھ آئیں' اگر پسند آگیا تو وہ بھی دیکھ لیں گی۔ سرشام ہی میں' تایا اور خورشید چاچا مکان دیکھنے چل پڑے۔ یہ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اچھا بڑا مکان تھا۔ پہلی منزل پر تین کمرے تھے اور نیچے بہت بڑے دالان کے علاوہ پانچ بڑے بڑے کمرے تھے۔ اس مکان میں داخل ہو کر نہ معلوم کیوں وہ مجھے اپنی حویلی کا سا لگا۔ شاید اس لیے کہ وہاں پر بھی پہلی منزل کی سیڑھیاں ایک بڑے برآمدے کو عبور کرنے کے بعد کھلے اور کچے صحن میں سے اوپر جاتی تھیں۔ باورچی خانہ اور غسل خانہ' اوپر بھی تھا۔ مجھے مکان بہت پسند آیا۔ اونچی اونچی چھتیں تھیں اور کھلے روشن اور ہوادار کمرے۔ مجھے یقین تھا کہ اماں کو بھی یہ مکان پسند آئے گا۔ خورشید چاچا کو چھوڑ کر میں اور تایا گھر آگئے۔ خورشید چاچا کو کہیں جانا تھا پھر اس ساہوکار سے بھی بات کرنا تھی۔ انھوں نے رات کو گھر پہنچنے کا وعدہ کیا اور ہم سے الگ ہو گئے۔ تایا کو مکان بہت پسند آیا تھا۔ ہم نے اماں کو بتایا تو اماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انھوں

نے مجھے بتایا کہ شرف الدین آیا تھا اور مغرب کے بعد آنے کا کہہ گیا ہے۔ میں اور تایا کھانا کھا کر کچھ دیر باتیں کرتے رہے مجھے بڑی نیند آ رہی تھی اس لیے میں کھانا کھا کر سو گیا۔

اماں نے شام کو اٹھایا۔ میں نہا دھو کر چائے پی رہا تھا کہ شرف الدین کے آنے کی اطلاع ملی۔ میں نے شرف الدین کو اپنے اور اماں کے فیصلے کے بارے میں بتایا اور مکان کے بارے میں بھی اطلاع دی۔ میں نے اسے کہا کہ ہمیں ابھی سنہرے بابا کے پاس جانا ہے۔ وہ تیار ہو گیا۔ چائے پیتے ہی ہم سبز گنبد والی مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد کی سیڑھیوں پر وہی فقیر مل گیا جس نے کل مجھ سے میرا نام پوچھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سر نفی میں ہلانا شروع کر دیا اور بولا۔ "جاؤ۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ" اب سب کچھ ختم ہو گیا۔" میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ ایسے میں شرف الدین نے حوصلہ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر سنہرے بابا کے حجرے کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ پاگل ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن یہ اس روز تو پاگل نہیں تھا جب اس نے میرا نام لیا تھا۔" میں گھبرایا ہوا تھا۔

"یار! تم اتنی لمبی زندگی کیسے گزار دو گے؟ ایسے ایسے کئی بازی گر ملیں گے تمہیں۔"

"شرف الدین چپ ہو جاؤ۔ تم بعض اوقات بہت بے باک ہو جاتے ہو۔ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔" میں نے پسینے میں بھیگی ہتھیلیوں کو کرتے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

ہم حجرے کے قریب پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ کچھ برقعہ پوش خواتین بیٹھی تھیں۔ ایک بڑی بی قریب ہی بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر ایک موٹا سا سیٹھ ٹائپ کا آدمی چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا دیگیں کھلوا رہا تھا۔ شاید یہ لنگر کی دیگیں تھیں۔ بند دروازہ دیکھ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھ سے پہلے ہی شرف الدین نے آگے بڑھ کر اسی موٹے آدمی سے بابا کے بارے میں پوچھا۔

"وہ آج ہمالیہ کی طرف چلے گئے ہیں۔ اب تو مہینے ... بھر کے بعد ہی لوٹیں گے۔"

میں اور شرف الدین مایوس ہو گئے۔ "وہ کیوں چلے گئے!" میں زیر لب بڑبڑایا۔

"اس لیے بیٹا کہ تم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔" کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آفت آنے والی ہے' وہ اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں مگر چند نادانوں کی وجہ سے وہ آفت آ کر رہتی ہے۔ ایسے میں وہ یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں بچانے کی کوشش کی مگر۔ خود تمہیں ہی اپنا احساس نہیں تو بھلا وہ کیا کرتے!"

یہ وہی بزرگ تھے جنھوں نے مسجد جاتے ہوئے پہلی بار مجھے سنہرے بابا سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔

"ہوں۔ تو بابا لوگوں کو آفت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں!" شرف الدین کے لہجے میں طنز تھا۔

ان بزرگ نے پہلے گھور کر شرف الدین کو دیکھا پھر فوراً ہی ان کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔ "نہیں۔ وہ وہاں اس آفت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کریں گے اور۔ یہ بھی ممکن ہے کہ برے وقت پر پہنچ جائیں۔ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ تم جوان ہو' زندگی کے اتار چڑھاؤ سے ناواقف' یہ بچے ہیں۔ نہ عمر ہے نہ علم' نہ تجربہ' نہ مشاہدہ ایسے میں بھلا بابا انھیں تنہا کیسے چھوڑ سکتے ہیں! مایوسی کفر ہے بیٹا اور بدگمانی گناہ۔" اتنا کہہ کر وہ بزرگ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر' اسے تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔

دل پر جیسے منوں بوجھ سا آ گرا۔ پچھتاوے کا احساس دل و دماغ پر بری طرح چھا گیا۔ ایک خوف سا محسوس ہونے لگا کہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ پتا نہیں جو فیصلہ کیا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں! پھر میں نے خدا پر بھروسا کر لیا۔ اب تو بس اسی کی ذات تھی جو مجھے آفتوں سے بچا سکتی تھی۔ سنہرے بابا کے چلے جانے نے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا۔ طبیعت گری گری سی لگنے لگی۔ شرف الدین نے میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔

"وقار الحسن! تمہیں یاد ہے نا کہ اس رقعے میں لکھا تھا' آج ہی سنہرے بابا سے مل لو ورنہ کسی بڑی مصیبت میں بھی گرفتار ہو سکتے ہو' اسی قسم کا کچھ مفہوم تھا' ہے نا!"

"ہاں! کچھ ایسا ہی لکھا تھا۔" میں نے نڈھال سے لہجے میں جواب دیا۔

"اور کچھ بھی نہ ہوا۔ رات سکون سے گزری میں بھی کل رات تمہارے ساتھ تھا۔ خوب مزے سے سویا اور غالباً تم نے بھی کوئی ایسی ویسی بات محسوس نہیں کی اور پھر آج کا سارا دن بھی غالباً کسی انہونی بات کے بغیر ہی گزر گیا۔ کیوں۔ غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں۔ بات تو ٹھیک ہے نہ۔"

"پھر تمہارے منہ پر بارہ کیوں بجنے لگے میری مانو تو اس سارے چکر کو ذہن سے نکال دو۔ جوان آدمی ہو یار اور آنکھوں میں ابھی سے بڑھاپا اترا ہوا ہے۔ تم تو بہت جلدی مر جاؤ گے۔"

اس کی تمام باتوں نے گہرا اثر دکھایا۔ میں خود بھی سوچنے لگا کہ رقعے کی تحریر سے تو لگتا تھا جیسے اگر میں اس رات نہ ملا تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا اور۔ اب تک حالات نہ صرف قابو میں تھے بلکہ ٹھیک ٹھاک جا رہے تھے' پھر ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ شرف الدین نے چچا کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ دہلی گئے ہیں۔ وہ یہ بات سن کر چونک اٹھا۔

"وہ آج ہی چلے گئے اور آج ہی سنہرے بابا بھی چلے گئے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا مگر میں نے اس کا جملہ سن لیا۔ بس یوں انجان بن گیا جیسے میں نے کچھ بھی نہ سنا ہو۔ پتا نہیں کیوں میں اس کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"تم نے چچا سے پوچھا تھا کہ وہ کل رات اندھیری گلی میں کیا کر رہے تھے؟" اچانک وہ بولا۔

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" میں جھنجلا گیا۔ "مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ چچا ہی تھے اور پھر تمہارے پاس کون سا ثبوت ہے' جو تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ ٹھیک ہے کہ وہ کسی کام میں ہوں گے مگر انھیں اور سنہرے بابا کو تو نہیں ملاؤ۔ سنہرے بابا دنیا داری میں نہیں ہیں۔ یہ بات تم میرے دل سے نہیں نکال سکتے۔"

"میرا ارادہ تمہارے دل سے کسی بات کو نکالنے کا نہیں بلکہ تمہاری کھوپڑی میں چند کام کی باتیں ڈالنے کا ہے۔"

"شرف الدین!" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ مجھے اچانک ہی یاد آ گیا تھا کہ میں اب تک اسے لڈن کی ماں کی موت کے بارے میں نہیں بتا سکا۔

"کیا ہو گیا بھیا!" اس نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ لڈن کی اماں۔"

"لڈن کی اماں۔ کہاں ہیں!" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ مر گئیں۔"

"ہیں!" وہ بھی اچھل پڑا' پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا تو وہ بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "یار وہ تو بڑے کرارے مزاج کی خاتون تھیں' وہ خوف سے کیسے مر سکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ معمولی قسم کا خوف تو انھیں نہیں مار سکتا۔ کوئی۔ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے خورشید چاچا سے کہا ہے کہ وہ لڈن کو میرے پاس بھیج دیں۔ وہ آئے گا تبھی اس سے اصل صورت حال پتا چل سکتی ہے۔"

"یار کیا دھرا تو تمہارے پردادے کا تھا' منسو بابا خواہ مخواہ ہی چکر میں آ گئے۔ اب انھوں نے ایسا تو کچھ نہ کیا ہو گا کہ گھر کا گھر مار دیا جائے' وہ بھی اتنے برسوں بعد۔"

"میری تو عقل خبط ہوتی جا رہی ہے۔ سچ پوچھو تو ان چکروں سے اب گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے سب کچھ بدل جائے' کچھ بھی نہ رہے اور میں بھی بے فکری سے زندگی گزار دوں۔"

ہم باتیں کرتے کرتے گھر تک پہنچ گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید شرف الدین آج اپنے گھر کی طرف چل پڑے اور مجھے شگفتہ کی جھلک ہی دیکھنے کو مل جائے۔ اسے دیکھے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے اور ان چند دنوں ہی میں مجھے اپنی محبت کی شدت کا احساس ہو گیا تھا۔ ان تمام چکروں کے باوجود کوئی دن بھی ایسا نہ گزرا تھا جب مجھے اس کا خیال نہ آیا ہو' اس کی آنکھوں میں بھرے ستارے رہ رہ کر میری آنکھوں میں چمک اٹھتے تھے۔ میں نکاح کے روز کا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی پورا ایک دن' ایک رات اور پورا آدھا دن پڑا تھا۔ پرسوں نکاح تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ اماں زنان خانے میں شگفتہ کی اماں سے اور تایا مردان خانے میں شگفتہ کے ابا سے بات کریں گے۔ اس روز مجھے امید تھی کہ میں بھی اسے دیکھ سکوں گا۔ اک ذرا سی آس تھی کہ شاید آج اسے دیکھ سکوں مگر وہ بھی کسی ستارے ہی کی طرح چمک کر بجھ چکی تھی۔

"اچھا وقار الحسن! اب کل کا دن میں بہت مصروف رہوں گا۔ ابا ویسے ہی میرے غائب ہونے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ پوچھ رہے تھے کہ وہ صاحب زادے یہاں اب بھی موجود ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ تو امروہہ چلا گیا۔ نہ کہتا تو اب تک وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر تمہارے گھر تک پہنچ گئے ہوتے۔ اب غائب ہوتا ہوں اور وہ پوچھتے ہیں تو کہہ دیتا ہوں کہ پھولوں کی لڑیوں کا آرڈر دینے گیا تھا یا چچی نے رنگائی کے لیے کپڑے دیئے تھے' وہ پہنچا کر آ رہا ہوں۔ افراتفری اتنی ہے کہ تصدیق کر ہی نہیں پاتے۔ زنان خانے

کی طرف سر اٹھا کر بھی چلیں تو اماں درمیان میں آ کر ایسے گھورتی ہیں کہ گھنٹوں غسل خانے تک نہیں جا پاتے۔"

میں ہنس پڑا۔ "تمھارے ابا کو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ تفتیشی افسر کے فرائض بہت عمدگی سے انجام دے سکتے ہیں۔"

"کاش میں ابا سے بڑا ہوتا تو بچپن ہی سے انھیں پولیس میں بھرتی کرا دیتا۔" اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "چلو خیر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ تم لوگ پرسوں آ رہے ہو نا!"

"ہاں۔ ہم ضرور آئیں گے۔"

پھر وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ گھر میں کافی سناٹا تھا۔ چچی، چچا اور تائی کی غیر موجودگی سے گھر ویران ہو گیا تھا، پھوپی اور بہنیں باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھیں، اماں نماز پڑھ رہی تھیں اور تایا خاموش بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے پاس بلا لیا۔

"میاں اب ذرا سنجیدگی سے بتاؤ کہ تمھارا کیا پروگرام ہے۔" وہ واقعی سنجیدہ تھے۔

میں نے انھیں اپنے فیصلے اور اماں کے مشورے سے آگاہ کیا۔ وہ گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے، پھر بولے۔ "یعنی وہ حویلی نہیں بکے گی!"

"آپ لوگ اس حویلی کو کیوں بیچنا چاہتے ہیں تایا! وہ ۔۔۔ وہ ہماری پہچان ہے۔"

"وہ پہچان اس قدر بگڑ چکی ہے کہ۔۔۔"

"نہیں تایا!" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "وہ پہچان نہیں بگڑی ہے اگر لوگوں کے ذہن میں کوئی غلط تاثر ہے بھی تو میں تہیہ کر چکا ہوں کہ اس تاثر کو بدل ڈالوں گا۔ آپ یہ تو سوچیے کہ اس حویلی کے بک جانے سے شگفتہ ہمارا پیچھا تو نہیں چھوڑ دے گی۔ کیا آپ بڑی پھوپو اور ان کے شوہر کی موت بھول گئے؟ وہ تو دیرہ دون میں تھے، امروہہ میں تو نہیں تھے۔"

میری بات سن کر ان کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں ابھر آئیں! "امروہہ ہمارا آبائی شہر ہے، ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے میاں! اب تم اچھے برے کی تمیز کر سکتے ہو۔ کہیں دشواری محسوس کرو تو مشورہ ضرور کر لینا۔ اب اللہ کا نام لے کر مکان کا سودا کر لو باقی جو مقدر میں ہوگا وہ تو ہو کر رہے گا۔" انھوں نے کہا اور تکیہ ٹھیک کر کے لیٹ گئے۔

اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ میرے مقدر میں کیا ہے۔ نہ مجھے یہ گمان تھا کہ کسی کا مقدر اس قدر خراب بھی ہو سکتا ہے۔ میں کاتب تقدیر کا قائل تھا اور ہوں، یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے پتا نہیں ان کا مطلب کیا ہوتا ہے، میرے خیال میں تو جب تقدیر بدلنے لگتی ہے تو آدمی خود بخود ایسی تدابیر اختیار کرنے لگتا ہے جو اسے وہیں لے جاتی ہیں جہاں کاتب تقدیر لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے خیال میں ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ مجھے اپنے عقل مند ہونے پر کوئی غرور نہ تھا اس لیے میں نے سب سے مشورہ بھی کیا تھا اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے پر راضی تھا۔ شگفتہ کو سکون دینے کا وعدہ میں نے اپنے ضمیر کی خلش کی وجہ سے کیا تھا اور میرے خیال میں یہ میری نیکی تھی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے کوئی غلط کام کر کے اپنی تقدیر کو تباہی کی طرف موڑ دیا تھا۔ آنے والے وقت کے قدموں کی آہٹ اتنی سبک تھی کہ میں اندازہ کر لیتا کہ وہ اپنے جلو میں کیسی قیامتیں سمیٹے ہے، ممکن ہی نہ تھا۔ گزشتہ حالات اور معاملات کی وجہ سے جو گرہیں ذہن میں پڑ چکی تھیں وہ آیندہ لائحہ عمل طے کرتے ہی کم ہو گئی تھیں، طبیعت کی بے چینی اور بوجھل پن کم ہو گیا تھا اس لیے میں دوسری طرح سوچنے لگا تھا۔ اب گھر بار کے متعلق سوچتا تھا، شگفتہ کے بارے میں سوچتا تھا یا اپنے مستقبل کے بارے میں۔ اسی رات خورشید چاچا سودا پکا کر آئے۔ میں نے اگلے روز کچہری جا کر قانونی کارروائی پوری کی، تایا میرے ساتھ تھے۔ اس ساہوکار سے اس روز میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ ساہوکار ہونے کے باوجود سادھو لگتا تھا۔ اس کے بدن پہ گوشت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں انتہائی چمک دار اور سرخ تھیں۔ اس نے جوگیا رنگ کی دھوتی اور کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کے منڈھے ہوئے سر کے پچھلی جانب گدی سے کچھ اوپر چوٹی لٹک رہی تھی۔ گلے میں رودراکچھ کی مالا پڑی تھی۔ ایسی مالائیں میں نے پنڈتوں، تانترکوں اور جادو منتر کرنے والوں کے گلوں میں دیکھی تھیں۔ نیپال کے پہاڑوں پر پیدا ہونے والے ایک مشہور درخت کے پھلوں سے نکلنے والے اس بیج کو لوگ جادو منتر کا توڑ سمجھ کر پہنتے تھے۔ اس کے پپوٹوں میں کمزوریں تھیں۔ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بے جان چہرے پر انتہائی جاندار اور بے چین آنکھیں لگا دی ہوں۔ میں اسے دیکھ کر حیران تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ یہ سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھا، سر پر سفید پگڑی تھی۔ وہی ہر کام میں آگے آگے تھا۔ وہ سادھو نما ساہوکار تو کچہری میں ایک لمبی راہداری میں پڑی بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ جہاں اس کے دستخط کی ضرورت پڑتی، اس کے ساتھ والا آدمی یا تو اسے بلا لیتا اور کبھی اس کے پاس کاغذ لے جا کر دستخط لے لیتا تھا۔

ہم تین بجے کچہری سے فارغ ہوئے، خورشید چاچا بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ کاغذات مکمل ہو جانے کے بعد خورشید چاچا نے مجھے مبارک باد دی۔ تایا نے پیٹھ تھپکی۔ میں مسکرا رہا تھا۔ تایا اور خورشید چاچا کا شکریہ ادا کر رہا تھا، اسی وقت وہ سادھو نما شخص اور اس کا ساتھی میرے قریب آ گئے۔ "اب ہم چلتے ہیں۔" سفید دھوتی والے شخص نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہم سے کہا۔ اس کے برابر ہی میں سادھو نما شخص کھڑا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس کے نمسکار کا جواب دیا اور اسی لمحے میری نگاہ سادھو کے چہرے پر پڑی، اس کی آنکھوں میں عجیب سی بات تھی، کوئی ایسا تاثر جو میرے دماغ میں کیڑوں کی طرح رینگ گیا۔ ان آنکھوں کی ساری بے چینی جیسے میرے دماغ میں منتقل ہو گئی۔ ایک سرسراہٹ سی تھی جو میں نے اپنے رگ وپے میں محسوس کی۔ اس شخص نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر پلٹ گیا مگر میں مبہوت سا ویسے ہی کھڑا رہ گیا۔ یوں لگا تھا جیسے وہ اپنی آنکھیں میرے دماغ میں چھوڑ گیا ہو۔

"چلو میاں۔۔۔ یا ارادہ بدل گیا!" تایا نے میرا بازو چھوا تو میں اچھل پڑا۔ یوں جیسے مجھے نیند سے جگا دیا گیا ہو۔

"وقار الحسن! کیا بات ہے؟" تایا نے میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی تشویش سے پوچھا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں تایا۔۔۔ میری طبیعت۔۔۔" میں واقعی نڈھال سا ہو گیا تھا۔ ٹانگوں میں بالکل دم ہی نہ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، میرے پیچھے صرف چند قدم کے فاصلے پر ایک بنچ پڑی تھی جس پر ایک ہندو عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی اور اس کے پہلو میں پانچ برس کا بچہ بیٹھا لٹکی ہوئی ٹانگیں زور زور سے ہلا رہا تھا۔ میں لپک کر اس بنچ پر بیٹھ گیا۔ تایا میری حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔

"خورشید! جاؤ جلدی سے سوڈا لے آؤ۔" انھوں نے جیب سے روپیا نکال کر انھیں دیتے ہوئے کہا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں مرزا، میں ابھی لایا۔" وہ روپیا لیے بغیر باہر کی طرف لپک گئے۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی نے ہنڈولے میں بٹھا دیا ہو اور ہنڈولا بہت تیزی کے ساتھ چکر کھا رہا ہو۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ خورشید چاچا سوڈے کی بوتل لے آئے۔ میں نے بہ مشکل آدھی بوتل پی۔ تایا میری حالت سے بہت زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد مجھے گھر لے جائیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا مگر میرے اندر دم ہی نہ تھا کہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکوں۔ آخر خورشید چچا نے میرا ایک بازو اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھا اور اپنا بازو میری گردن میں ڈال کر مجھے اٹھایا۔ دوسری جانب سے تایا مجھے سنبھالے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ہم کیسے سڑک تک آئے۔ تایا نے ایک تانگے والے کو آواز دے کر روک لیا۔ تمام راستے مجھے اندر اور باہر چاروں طرف گہرے سناٹے کا سا احساس ہوتا رہا حالانکہ یہ ایک بھری پری سڑک تھی۔ گاڑیاں، سائیکل رکشا، تانگے اور بسیں چل رہی تھیں۔ لوگ آجا رہے تھے۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر لگتا تھا جیسے کوئی خاموش فلم دیکھ رہا ہوں۔ بس میرے دماغ میں ایک عجیب سی سرسراہٹ تھی جیسے ننگے اور پکے فرش پر کوئی ناخن سے لکیریں کھینچ رہا ہو۔ ایک ناگوار سی آواز تھی۔ میں نے بے اختیار کئی بار اپنے کان بند کیے مگر یہ آواز بھلا کیسے بند ہوتی، یہ تو میرے اندر کی آواز تھی باہر سے آنے والی آواز ہوتی تو شاید کم ہو جاتی یا ختم ہو جاتی پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ ہم گھر تک کب اور کیسے پہنچے۔ مجھ پر شاید غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس غنودگی کے عالم میں بھی اسی شخص کی آنکھیں میرے دماغ میں چمکتی رہی تھیں اور اسی غنودگی کے عالم میں، میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ ان آنکھوں کے جھپکنے سے ہی وہ ناگوار سی آواز پیدا ہو رہی ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میری کیفیت کچھ سنبھل گئی تھی۔ اماں کی گھبرائی ہوئی آواز اور بہنوں کی دبی دبی چیخوں کی آواز میرے کانوں تک پہنچی تو میں نے بڑی کوشش کے بعد اپنی آنکھیں کھولیں۔ غالباً چاچا اور تایا مجھے اندر لے کر آ گئے تھے اور اس وقت میں بڑے برآمدے میں تایا کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اماں، بہنیں اور پھوپی میرے چاروں طرف جمع تھیں۔ تایا کچھ بتا رہے تھے مگر مجھ پر گہری نیند طاری تھی اور پھر مجھے پتا ہی نہ چلا۔ میں شاید گہری نیند سو گیا تھا۔

آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ برآمدے کے بڑے دروازے میں اوپر لوہے کے کنڈے سے لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ کارنس پر رکھے دو بڑے لیمپوں کی روشنی نے

برآمدے، کو روشن کیا ہوا تھا۔ اماں میرے دائیں جانب جائے نماز بچھائے نماز میں مشغول تھیں۔ تایا اونچی نشست والی بید کی آرام کرسی پر نیم دراز حقے کی نے منہ میں دابے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ جہانی آپا گھر میں لوبان کی دھونی دے رہی تھیں۔ مجھے جاگتا دیکھ کر تایا جلدی سے میرے قریب آگئے۔

"وقار میاں! اب کیسے ہو؟" ان کے چہرے پر فکرمندی تھی۔

میں خود کو بالکل چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا اس لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کافی بہتر ہوں تایا!"

اسی وقت اماں نے سلام پھیرا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ پڑھتی رہیں اور پھر جلدی سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ میرے چہرے اور باقی بدن پر پھیرے۔ "وقار! کیسے ہو بیٹا! کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ان کی آوازیں سن کر جہانی آپا، شنو آپا اور پھوپی بھی لپک کر میرے قریب آگئیں۔

"میں... میں بالکل ٹھیک ہوں اماں... پتا نہیں اس وقت کیا ہو گیا تھا۔ آپ لوگ پریشان نہیں ہوں۔ واللہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ان سب کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر کہا۔ پھوپی جلدی سے پلٹ گئیں، چند لمحوں بعد واپس لوٹیں تو ان کی ہتھیلی پہ لال ثابت مرچیں اور نمک تھا۔ انھوں نے جلدی سے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور میری نظر اتارنے لگیں۔ نظر اتار کر انھوں نے ہتھیلی انگیٹھی میں الٹ دی۔ یہ انگیٹھی اکثر سلگانے کے لیے صحن میں رکھ دی جاتی تھی۔ اماں نے مجھے لٹا دیا حالانکہ میں بالکل ٹھیک تھا۔ تایا کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ میں نے جہانی آپا سے چائے کی فرمائش کی۔

"کچھ کھا لو بیٹا! کب سے بھوکے ہو۔" اماں نے کہا اور پلٹ کر شنو آپا سے بات کرنے لگیں۔ اسی لمحے ہم سب چونک اٹھے۔ انگیٹھی سے چرمراہٹ کی سی آوازیں آنے لگی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے گہرا، گاڑھا دھواں اٹھنے لگا۔ دھواں اٹھتے ہی پورے گھر میں عجیب سی سڑاند پھیل گئی۔ ایسی کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ اماں پہلے تو آنکھیں پھاڑے انگیٹھی کی طرف دیکھتی رہیں پھر دوپٹا ناک پر رکھے دور ہٹتی چلی گئیں، پھر ہم سب ہی ناک پر قمیص کا دامن، تولیہ اور دوپٹے رکھے تیزی سے کھلے صحن میں نکل آئے۔ اس قدر تیز اور عجیب و غریب قسم کی بدبو تھی جو ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ خورشید چاچا جو غالباً میری حالت کے پیش نظر آج رک گئے تھے اور بیٹھک میں تھے گھبرا کر باہر نکل آئے۔

"ارے کیا جل رہا ہے... بوا دیکھو تو کیا جل گیا۔" وہ اتنا ہی کہہ سکے پھر انھیں بھی ناک پر رومال رکھنا پڑا۔ میں ساکت کھڑا حیرت سے انگیٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ چرمراہٹ کی آواز تو یوں آ رہی تھی جیسے اس میں کوئی مومی کاغذ جل رہا ہو۔ دھواں بھی اتنا ہی گاڑھا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں گھر سے باہر نکل جاؤں۔ خورشید چاچا تو اوسہ کرتے ہوئے گھر سے باہر جا چکے تھے مگر میں اماں، بہنوں اور پھوپی کو خوفزدہ چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تایا بھی بت بنے کھڑے تھے۔ بہنیں خوفزدہ نگاہوں سے انگیٹھی کو دیکھ رہی تھیں۔ میں ان کو اشارہ کرتا ہوا کونے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اماں بھی جیسے ہوش میں آگئیں۔ انھوں نے جلدی سے شنو آپا کا ہاتھ پکڑا، جہانی آپا اور پھوپی کو اشارہ کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ تایا ہمارے پیچھے ہی تھے۔

ہم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پچھلی طرف بنی کھڑکیاں کھول دیں۔ ان کے پردے سلاخوں میں اڑس دیے۔ اماں اور بہن دونوں بے پردگی کے خیال سے اسی کھڑکی کے نیچے دیوار کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں اور منہ اٹھا کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔

"دیکھا اماں! بھائی کو کیسی بری نظر لگی تھی؟" جہانی بولیں۔ جہانی آپا ناک سے دوپٹا ہٹا کر بولی تھیں اور یہ انھوں نے دوپٹا ناک پر نہیں رکھا تھا۔

میں نے اماں کو اور اماں نے مجھے دیکھا۔ میں نے اور اماں نے ایک ساتھ ہی ناک پر سے کپڑا ہٹایا۔ گہرا سانس لیا۔ وہاں کوئی بدبو نہ تھی۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کیونکہ اگر گھر کے کونے میں کہیں کپڑا، کاغذ یا نظر کی مرچیں جل رہی ہوں تو پورے گھر میں بلکہ گھر سے باہر تک بدبو پھیل جاتی ہے جب کہ یہاں، اس کمرے میں ہلکی سی بدبو کا بھی احساس نہیں تھا۔ تایا کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ وہ بھی تولیہ منہ پر سے ہٹا چکے تھے۔ ہم تینوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر تایا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہمیں کمرے میں آئے شاید دو یا تین منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ ہم نے باہر جھانکا، انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے، چٹخ رہے تھے چنگاریاں اڑ رہی تھیں، نہ دھواں تھا نہ بدبو

بہنیں اور پھوپی بھی ہمارے پیچھے ہی باہر نکل آئیں۔

"اماں بھائی کو نظر کا تعویز ڈال دیں۔" شنو آپا نے کہا۔

"بھابی دلھن! یہ... یہ مرچوں کے جلنے کی بدبو تو نہیں تھی۔" پھوپی بولیں تو جیسے سب ہی چونک اٹھے۔ دونوں بہنیں سر اٹھا کر ہمیں دیکھنے لگیں۔ یہ بات میرے علاوہ شاید اماں بھی جانتی تھیں اور تایا بھی مگر ہم یہ بات کہہ نہیں سکتے تھے۔ پھوپی کی بات نے سناٹا سا پھیلا دیا۔

"ارے نہیں... کسی کی بہت بری نظر ہو تو ایسی ہی بدبو اٹھتی ہے، اور پھر نظر تو جانور کی بھی لگتی ہے۔ اماں بی کہا کرتی تھیں کہ جانوروں کی نظر بہت بری ہوتی ہے اور بدبو سے گھر بھر جاتا ہے۔"

پتا نہیں اماں کے جملے کے کھوکھلے پن کو کسی نے محسوس کیا یا نہیں مگر میں خوب محسوس کر رہا تھا۔ تایا کو چپ سی لگی تھی۔ خورشید چاچا ابھی تک باہر تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھولا اور خورشید چاچا کو دیکھ کر کہا۔ "آجایئے خورشید چاچا۔ اب سب ٹھیک ہے۔"

"ہیں۔" وہ چونکے۔ "یہاں باہر تو کوئی بدبو نہیں۔"

"جہانی آپا نے نظر اتار کر مرچیں جلائی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اچھا۔" وہ سر ہلاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے ٹھٹک کر رک گئے، پلٹے اور بولے۔ "مرچیں جلائی تھیں! میاں یہ تو... یہ تو چربی جلنے کی بدبو تھی، بلکہ سڑے ہوئے گوشت کے جلنے کی سی بو۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر پلٹ کر بہنوں اور اماں کی طرف دیکھا کہ کہیں انھوں نے تو نہیں سن لیا مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اماں تایا سے بات کر رہی تھیں۔ بہنیں برآمدے میں نہیں تھیں اور پھوپی انگیٹھی اٹھائے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھیں۔

"چپ ہو جایئے خورشید چاچا۔" میں نے سرگوشی کی۔ انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ قد میں مجھ سے کافی ٹھگنے تھے۔ ان کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرت ابھری اور وہ بیٹھک کی طرف بڑھ گئے۔ وہ رات کیسے گزری، یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اماں نے تو ساری رات عبادت اور ختم وظیفے کرتے ہوئے گزاری اور میں تمام رات اپنے اندر وہی بے چینی محسوس کرتا رہا جو دن میں محسوس کی تھی، مانگنے اور کچے فرش پر ناخن کھرچنے کی سی آواز، یا انگیٹھی میں مومی کاغذ کے جلنے سے ہونے والی چرچراہٹ کی سی آواز مجھے تمام رات کبھی اپنے تکیے میں سے اور کبھی اپنے دماغ میں سے آتی محسوس ہوتی رہی۔ قسم کھانے کو میں پلک بھی نہیں جھپکا سکا مگر سویرے اذان کی آواز کے ساتھ ہی میرے اندر ٹھاٹھیں مارنے والا بے چینی کا سمندر جیسے تھم گیا، سناٹا اور سکون سا محسوس ہوا۔ میں نے فجر کی نماز ادا کی اور بستر پر لیٹ کر ایسا سویا کہ پھر دن چڑھے ہی آنکھ کھلی۔ اماں مجھے نماز پڑھتا دیکھ چکی تھیں اس لیے انھوں نے مجھے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

دن میں پتا چلا کہ اماں نے خورشید چاچا کو روک لیا ہے تاکہ وہ نئے مکان کی جھاڑ پونچھ کروا لیں۔ انھوں نے دو کرایے کے آدمی پکڑ لیے جنھوں نے ان کے ساتھ مل کر پورے مکان کو آئینے کی طرح چمکا دیا۔

"بوا چاہو تو آج ہی وہاں منتقل ہو جاؤ۔" خورشید چاچا نے دوپہر کو کھانے کے وقت کہا۔

"نہیں خورشید چاچا! یہاں تایا اور کوثر اکیلے رہ جائیں گے۔ چچی، چچا اور تائی آجائیں تب جائیں گے اور آج تو شرف الدین کے چچا کے گھر شادی میں جانا ہے۔" مجھے اچانک ہی یاد آگیا تھا ورنہ تایا اور اماں تو شاید بھول چکے تھے۔ میں نے تایا اور اماں کو تیار ہونے کے لیے کہا۔ چچی تائی کے نہ ہونے کی وجہ سے اماں نے کوثر کے پاس دونوں بہنوں اور پھوپی کو چھوڑا، خورشید چچا کو ان کی رکھوالی پر مامور کر کے میں، تایا اور اماں نکاح میں چلے گئے۔ وہاں میری عجیب کیفیت رہی۔ شگفتہ کئی بار شرمائی شرمائی سی میرے سامنے آئی مگر میں اسے اجنبیوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔ کوئی احساس، کوئی کیفیت میرے اندر رنگ نہ ابھار سکی۔ شرف الدین بہت مصروف تھا۔ تایا نے شگفتہ کے ابا سے اور اماں نے شگفتہ کی اماں سے بات کی یا نہیں، مجھے پتا نہیں چلا اور نہ میں نے کچھ جاننے کی کوشش کی۔ نہ معلوم کیوں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں جلدی سے یہاں سے چلا جاؤں، اسی لیے میں وہاں سے اماں اور تایا کو لے کر جلدی واپس آگیا۔ میں نے شرف الدین کو بتا دیا تھا کہ میں مکان نہ صرف خرید چکا ہوں بلکہ وہاں کی صفائی بھی ہو چکی ہے۔ اسی رات شرف الدین ایک نوجوان کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ چچا کے گھر میں جگہ نہیں ہے، جگہ جگہ سے آئے مہمان بھرے ہیں، وہ نوجوان چند دریوں میں تکیے لپیٹے کندھے پر لادے کھڑا تھا۔ شرف الدین نے کہا کہ وہ

میرے ساتھ میرے نئے مکان میں سونا چاہتا ہے۔ میں نے تایا اور اماں سے ذکر کیا۔ انھوں نے اجازت دے دی لیکن خورشید چاچا کو بھی میرے ساتھ کردیا۔ میں نے اور خورشید چاچا نے دو دریاں' چادریں اور تکیے لیے اور اسی جانب چل پڑے۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ مکان شرف الدین کو بہت پسند آیا۔

"یار وقار! یہ حویلی جیسا نہیں ہے!" وہ اچانک بولا۔

میں مسکرایا۔ "ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ پسند بھی شاید اسی لیے آیا ہے۔" پھر میں نے شرف الدین سے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ ان کے خاندانی نوکر کا بیٹا ہے۔ آوارہ گردی کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ گھر میں ٹکتا نہیں۔ باپ ہر وقت کڑھتا اور گالیاں دیتا رہتا ہے۔ بھاگ کر بمبئی چلا گیا تھا۔ دو روز پہلے ہی شاید چھے ماہ بعد اس کے ہاتھ لگا تو وہ چچا کے پاس لے آیا کہ اسے کام دھندے پر لگالیں اور سختی کریں' شاید سنبھل جائے۔ لڑکا سیدھا سادا اور خاموش طبیعت کا تھا۔ میں نے اسے ایک کمرے میں سونے کو کہا۔ میں اور شرف الدین دوسرے کمرے میں بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ خورشید چاچا نے باہر دالان میں سونا زیادہ پسند کیا۔ میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ شرف الدین تو اتنا تھکا ہوا تھا کہ بے چارہ لیٹتے ہی بے خبر ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے بھی نیند آگئی۔ وہ بڑا بھیانک خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنی حویلی میں ہوں۔ تنہا ہوں اور آہستہ آہستہ اوپر کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہا ہوں۔ پہلی' دوسری اور پھر تیسری منزل پر آکر میں رک گیا ہوں۔ گہرے سناٹے میں ایک آواز آہستہ آہستہ ابھر کر دور تک پھیلتی جارہی ہے۔ وہ آواز ایسی ہے جیسے کوئی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ میں سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں مرزا صولت بیگ کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اچانک مجھے سیڑھیوں پر چاپ سنائی دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی مجھ پر جھپٹنے والا ہے۔ میں تیزی سے پلٹتا ہوں اور اپنے سامنے اس مکان کے سابق مالک اور سادھو نما ساہوکار کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ اس کے گندے گندے دانت نکلے ہوئے ہیں' چہرے پر خباثت پھیلی ہوئی ہے۔ آنکھوں میں جیسے چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں اور وہ دونوں ہاتھوں کو میری طرف بڑھائے میرے قریب آرہا ہے۔ میں پیچھے ہٹ رہا ہوں مگر پیچھے دیوار آجانے کی وجہ سے بے بس ہوگیا ہوں۔ وہ شخص بالکل قریب آگیا ہے اور اب اس کی آنکھیں میرے سامنے بڑی بڑی سی ہو کر پھیل گئی ہیں اوہ۔ ان آنکھوں میں سفید رنگ کے لمبے لمبے سے کیڑے کلبلا رہے ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے مار دینا چاہتا ہو۔ اس کی انگلیاں لوہے کی سی تھیں اور ناخن آگے کو مڑے ہوئے اور سلاخوں ایسے تھے۔ تبھی میں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ میرے ہاتھ ایک تیز اور چمک دار چھری کے دستے پر جمے ہوئے تھے اور پھر میں نے پوری قوت سے وہ چھری سامنے والے شخص کے سینے میں اتار دی۔ تبھی ایک چیخ گونجی اوہ۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرے ہاتھوں میں خون آلود چھری تھی۔ لال لال خون میری انگلیوں کے درمیان میں سے بہہ رہا تھا اور میں کسی بت کی طرح کھڑا تھا۔ اچانک مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ خواب یا حقیقت! دوسرے ہی لمحے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز میرے قریب آکر رک گئی پھر کسی نے مجھے جھنجھوڑا اور تبھی میں نے اپنے سامنے پڑے جسم کو تڑپتے دیکھا' اور پھر میں چیخ کر اس پر جھکتا چلا گیا۔

مجھے صرف اتنا ہوش تھا کہ میں چیخ رہا ہوں۔ کوٹھی کے درودیوار میری اور اس زخمی آدمی کی چیخوں سے گونج رہے ہیں۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چھری میرے ہاتھوں سے گر چکی تھی۔ میں اندھوں کی طرح زمین پر پڑے وجود کو اپنی بانہوں میں بھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بری طرح چیخ رہا تھا۔ ہم دونوں کی چیخنے کی آوازوں کے ساتھ اور دوسری آوازیں بھی تھیں جو گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ پیچھے سے کوئی مجھے دوسری جانب کھینچ رہا تھا اور میرا نام لے کر مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ ایک طوفان سا تھا' بھونچال سا تھا جو پوری کوٹھی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کا گول دائرہ بھی' کبھی میری بند آنکھوں میں سرخ دائرہ سا بنا رہا تھا۔ عین اسی لمحے جب میں کسی سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کسی نے میری کنپٹی پر بہت زور سے مکا مارا۔ میرے سر میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور پھر میرا جسم ایک جانب کو لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے گرتے گرتے صرف اتنا سوچا تھا کہ میرے ہاتھوں قتل ہونے والا شرف الدین تھا یا خورشید چاچا؟

میں نہیں جانتا کہ مجھے کتنے گھنٹوں بعد ہوش آیا یا کتنے دنوں بعد' ہوش آیا تو میرا ذہن کسی کورے کاغذ کی مانند تھا۔ چھت کی موٹی موٹی بلیاں میری نگاہوں کے سامنے تھیں۔ میں ایک بڑے سے ہال نما کمرے کے وسط میں فرش پر پڑا تھا۔ چند لمحے میں یونہی پڑا رہا پھر اچانک جیسے میرے ذہن میں فلم کی ریل چل پڑی۔ خون میں لتھڑا ہوا جسم آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ایک لیمپ آتش دان کے اوپر بنے ریک پر رکھا تھا جو روشن تھا۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کھڑکیوں اور دروازے سے باہر پھیلا اندھیرا ابھی گہری رات ہونے کا ثبوت تھا۔ میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں اپنی جگہ پر سویا ہوا ہوں۔ وہ سب خواب تھا۔ ایک بھیانک خواب' مگر جونہی میری نگاہ اپنے کپڑوں اور ہاتھوں پر پڑی میں لرز اٹھا۔ میرے ہاتھ خون میں تر تھے' کپڑوں پر جابجا خون کے بڑے بڑے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے بے اختیار شرف الدین کو آواز دی۔ میرے حلق سے پھٹی پھٹی سی آواز نکلی اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"شرف الدین!" میں پھر دھاڑا اور زور زور سے رونے لگا' اسی وقت خورشید چاچا گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں وحشت بھری تھی میں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیے۔ وہ لپک کر میرے قریب آگئے اور مجھے اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے لپٹا لیا۔ اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ میرے ہاتھوں قتل ہونے والا شرف الدین تھا۔

"بٹوا۔۔۔ خود کو سنبھالو۔۔۔ خود کو سنبھالو بٹوا۔۔۔" خورشید چاچا یہ کہتے کہتے خود بھی رو پڑے پھر مجھے خود سے الگ کرتے ہوئے بولے۔ "میں۔۔۔ پانی لاتا ہوں۔۔۔" اب میں نے انھیں قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ بہت دیر سے رو رہے ہوں۔ ان کے کپڑوں پر بھی جابجا خون کے دھبے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنے گھومتے ہوئے سر کو تھام لیا۔ وہ آستین سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

"یا اللہ۔۔۔ یہ میں نے کیا کردیا؟ میں۔۔۔ میں شگفتہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میں۔۔۔ میں کیا کروں گا میرے مالک۔۔۔! یہ کیا ہوگیا۔۔۔؟ شرف الدین۔۔۔ شرف الدین یہ میں نے تیرے ساتھ کیا کردیا" میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا لیا پھر یہ خیال آتا "آیا تھا کہ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ میں قتل کرچکا ہوں۔ پولیس مجھے گرفتار کرلے گی اوہ۔ اور پھر مجھے پھانسی کی سزا ہوجائے گی۔ یہ خیال آتے ہی میں جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک اماں کا ہیولا سا سامنے آگیا۔ "ہمیں چھوڑ کر کہاں جائے گا بیٹا!" یوں لگا جیسے اماں قریب آرہی ہوں۔ میں لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں اس وقت خود کو بڑا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میں واقعی اماں اور بہنوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا تھا پھر یہ قتل کون سا چھپ جاتا؟ شرف الدین گھر پر بتا کر آیا ہوگا کہ وہ میرے گھر آرہا ہے۔ تایا' اماں' بہنیں' پھوپی سبھی جانتے تھے کہ ہم یہاں سونے آئے ہیں پھر خورشید چاچا نے خود اپنی آنکھوں سے یہ قتل دیکھا تھا پھر۔ پھر۔۔۔ میرے بھاگنے سے کیا ہوگا! میں پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اسی وقت میں نے عجیب سی آواز سنی یوں جیسے کسی چیز کو گھسیٹا جارہا ہو۔ دروازے پر آہٹ بھی سنائی دی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا اور دروازے پر شرف الدین کو دیکھ کر اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "شرف الدین۔۔۔!" میں چیخ کر اس کی طرف لپکا۔ "دیکھو۔۔۔ دیکھو شرف الدین! میں نے کیسا بھیانک خواب دیکھا تھا اور دیکھو تو یہ خون۔۔۔ یہ میرے ہاتھ دیکھو۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔۔۔ میں۔۔۔ میں سمجھا تھا کہ میں نے تمھیں۔۔۔ اوہ۔" میں نے شرف الدین کو اپنے سینے سے لگالیا۔ بے پایاں خوشی سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ شرف الدین میری کمر کو تھپک رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ وقار الحسن۔۔۔!" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ پھر میرے دونوں کندھوں کو پکڑ کر مجھے خود سے جدا کیا۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے اور ہاتھ بھی خون سے تر ہو رہے تھے میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" میں نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وحشت زدہ ہو کر اپنے ہاتھوں اور کپڑوں کو دیکھنے لگا' پھر میں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا گیا یہاں تک کہ میں دیوار سے جا لگا۔ شرف الدین نڈھال سا دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑا تھا اور تاسف بھری نگاہوں سے مجھے تک رہا تھا۔ اسی وقت خورشید چاچا پانی کا کٹورا تھامے اندر داخل ہوئے۔ ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے مجھے اور زیادہ وحشت زدہ کرگئے۔ "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سب کیا ہے۔۔۔ کیا ہوگیا

شرف الدین۔۔۔یہ خون یہ کہاں سے آیا۔۔؟" میں پھر چیخ پڑا۔

خورشید چاچا نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ "بیٹا لو پانی پی لو۔۔" اتنا کہہ کر انہوں نے کٹورا میرے ہونٹوں سے لگادیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرے حلق میں ہی نہیں زبان پر بھی کانٹے اگ آئے تھے۔ میں ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی گیا پھر پھسلتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے بدن میں جان نہیں رہی تھی۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

شرف الدین تھکے تھکے قدموں سے میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ خورشید چاچا بھی کٹورا کارنس پر رکھ کر میرے قریب آگئے۔ "وقار الحسن!" شرف الدین کی آواز یوں آئی جیسے وہ کسی پاتال سے بول رہا ہو۔ "وقار! تم نے رحیمو کو قتل کردیا ہے۔"

یہ جملہ نہیں دھماکا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ ان دونوں کو زندہ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا وہ بھیانک خواب تھا۔ شرف الدین کے ساتھ آیا نوجوان تو میرے ذہن میں کہیں دور دور بھی نہ تھا۔ میں اسے قطعی بھول چکا تھا۔ کپڑوں پر لگے ان خون کے دھبوں کو میں ان روحوں کا کارنامہ سمجھ رہا تھا جنہوں نے میری زندگی عذاب بنا ڈالی تھی مگر شرف الدین کے انکشاف نے مجھ پر خوف کا لرزہ طاری کردیا تھا۔ مجھے چکر آنے لگے، پورا کمرا گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کے لیے ہاتھ چلائے تو شرف الدین نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔ شرف الدین نے میرے گال تھپتھپائے۔ وہ مجھے آوازیں دے رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مجھے بہت دور سے پکار رہا ہو۔

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی اپنے حواسوں میں نہ تھا۔ خورشید چاچا بھی مجھے آوازیں دے رہے تھے پھر میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑے تو میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"وقار الحسن! جو کچھ ہوگیا سو ہوگیا، اب خود کو سنبھالو۔ آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے ہمیں اس سے بچنا ہے۔ مرد بنو وقار الحسن! ہمیں اس لاش سے چھٹکارا پانا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے ہی اس ہولناک ڈرامے کے تمام آثار مٹانا ہیں ورنہ تم۔۔۔ تم گرفتار بھی ہوسکتے ہو۔"

یوں لگا جیسے اس کے کہے ہوئے یہ جملے کوئی ایسا منتر ہوں جنہوں نے میرے بدن میں روح پھونک دی ہو۔ آنے والے خوفناک حالات سے بچنے کے اس مبہم سے خیال نے میری توانائیاں یکجا کردیں اور میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ گو نہ میرے بدن میں جان تھی، نہ ذہن پوری طرح کام کررہا تھا مگر جس خوف نے میرے وجود کو جکڑ لیا تھا اسی خوف نے مجھے طاقت بھی عطا کردی تھی۔ اس وقت میری وہی کیفیت تھی جو موت کے منہ میں جانے والے کی ہوسکتی ہے جو مرتے مرتے بھی خود کو بچانے کے لیے آخری زور لگادیتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ خبر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی پورے زمانے میں پھیل جائے گی پھر جو کچھ ہوگا وہ ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اس سے قبل مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یا محسوس کررہا ہوں وہ حقیقت ہے مگر اب مجھے یقین آچکا تھا کہ وہ ہولناک واقعہ خواب نہیں حقیقت تھا۔

"یہ۔۔یہ سب کیسے ہوا شرف الدین؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز میں اب بھی کپکپاہٹ تھی۔

"یہ تو تم ہمیں بتاؤ گے دوست! میں تو بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے کسی کو ذبح کردیا ہو۔ رحیمو کے چیخنے کی آواز ایسی ہی خوفناک تھی، کچھ دیر کو تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر میں اچھل کر باہر کی طرف بھاگا کیوں کہ آواز مسلسل آرہی تھی۔ جب میں اٹھا تھا تو مجھے تمہاری غیر موجودگی کا قطعی احساس نہیں ہوا تھا۔ لمحہ بھر کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم میرے پاس سوئے تھے اور اس وقت وہاں نہیں ہو۔ میں باہر آیا تو خورشید چاچا بھی گھبرائے ہوئے کھڑے تھے اور آواز کی سمت کا اندازہ لگا رہے تھے۔ صحن میں کچھ روشنی تھی۔ اچانک ہمیں احساس ہوا کہ آواز سیڑھیوں کی طرف سے آرہی ہے۔ میں اور خورشید چاچا دونوں اسی طرف بھاگے۔ خورشید چاچا کے پاس ٹارچ تھی اس لیے ہم سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے وہ ہولناک منظر دیکھا۔ تمہاری آنکھیں بند تھیں اور تم رحیمو پر چھری سے وار کرچکے تھے۔ تم میں اس وقت بلا کی طاقت تھی۔ تم نے چھری کو اس کے سینے سے نکال کر دوبارہ مارنا چاہا تبھی ہم نے تمہیں پیچھے سے پکڑلیا۔ اس دوران میں رحیمو کی چیخ نے تمہیں بھی جھنجوڑ دیا تھا پھر۔۔۔ پھر تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ تم روتے ہوئے اس پر گر پڑے تھے اور بری طرح چیخ رہے تھے۔ تمہیں ہٹانے کی

کوشش جب بیکار ہوگئی تو۔۔ تو مجھے مجبوراً تمہاری کنپٹی پر گھونسا مار کر بے ہوش کرنا پڑا، ورنہ تمہاری چیخوں سے سارا محلہ اٹھ جاتا۔ محلے والوں کے اٹھ جانے کا خدشہ تو ہمیں ہوچکا تھا کیوں کہ پہلے رحیمو اور پھر تمہاری چیخوں نے پوری کوٹھی کو لرزا دیا تھا اسی لیے میں فوراً ہی تمہیں اٹھا کر یہاں لے آیا پھر ہم کافی دیر تک انتظار کرتے رہے کہ اب کوئی آیا، اب کوئی آیا مگر۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے ان چیخوں کی آوازیں باہر نہیں گئی ہوں۔ میں نے اور خورشید چاچا نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں اوپر کی منزل پر جاکر بھی دور دور تک دیکھ چکا ہوں۔ ہر طرف گہرا اندھیرا اور سناٹا ہے۔ یہ اطمینان ہوجانے کے بعد کہ کسی کو اس واقعے کی اطلاع نہیں ہوئی، میں اور خورشید چاچا رحیمو کی لاش کو سیڑھیوں سے اٹھا کر چھوٹے کمرے میں لے آئے۔"

"رحیمو کی لاش۔۔؟ کیا۔۔ کیا وہ مرچکا ہے؟" میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں۔۔۔ چھری دستے تک اس کے دل میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ صرف ایک ہی مرتبہ چیخ سکا تھا۔" شرف الدین نے قمیص کے دامن سے چہرے پر آیا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ "اب سب سے بڑا مسئلہ اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا ہے۔ ہمیں یہ کام صبح ہونے سے پہلے کرنا ہے۔"

"میاں اب دیر نہ کرو۔ روشنی پھیلتے ہی یہ کام مشکل ہوجائے گا۔" خورشید چاچا بول اٹھے۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"مگر لاش کو کہاں ٹھکانے لگاؤ گے؟ اس کا قتل کیسے چھپ سکتا ہے شرف الدین۔۔۔ تم۔۔۔ تم لوگ بھی میری وجہ سے مشکل میں پڑ سکتے ہو۔ تم۔۔۔ تم پولیس کو لے آؤ۔۔ میں یہاں انتظار کروں گا۔" میں ہمت ہار بیٹھا تھا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ آؤ ہماری مدد کرو۔" شرف الدین نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ خورشید چاچا نے کونے میں رکھی لالٹین اٹھا کر روشن کی اور ہمارے ساتھ باہر نکل آئے۔ شرف الدین مجھے لیے ہوئے کونے والے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کے بیچوں بیچ رحیمو کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ میں اسے دیکھ کر لرز اٹھا۔ ایک جیتا جاگتا انسان میرے ہاتھوں لاش میں تبدیل ہوچکا تھا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ میں نے تو کبھی کسی جانور یا کیڑے مکوڑے کو بھی مارنے کی ہمت نہیں کی تھی اور کہاں میں ایک انسان کے سینے میں چھری پیوست کرچکا تھا۔ اس وقت اگر میں آپ کو اپنی کیفیت بتانے بیٹھ گیا تو صفحے کے صفحے سیاہ ہوجائیں گے، ایک نرم دل بلکہ بزدل انسان کو قاتل بننے میں دیر تو نہیں لگتی جیسے لمحوں میں، میں قاتل بن گیا تھا مگر احساسات اور کیفیات کا ایک طویل پل تھا جسے لمحوں میں عبور کرتے ہوئے بھی میں نڈھال ہوچکا تھا یوں لگتا تھا جیسے اذیت کی صدیاں مجھ پر گزر گئی ہوں۔

شرف الدین میری کیفیت سے بے خبر تیزی سے آگے بڑھا تب میں نے دیکھا کہ اس نے رحیمو کے سینے پر مٹی ڈالی ہوئی تھی۔ غالباً خون بند کرنے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ یہاں فرش پر خون نہیں تھا۔ "وقار الحسن! میں پورا گھر دیکھ چکا ہوں۔ یہ کمرا سب سے الگ تھلگ ہے۔ کافی چھوٹا بھی ہے۔ میں نے اور خورشید چاچا نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اسے اسی میں دفن کردیں گے۔ تم اسے اسٹور کے طور پر استعمال کرنا تاکہ خطرہ کم سے کم ہو۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں سیمنٹ موجود ہے غالباً جب اس کی سیڑھیوں پر سیمنٹ کیا گیا تھا تبھی بچا ہوگا۔ ہم اسے یہاں دفن کرنے کے بعد فرش پر سیمنٹ کردیں گے۔ یہاں بیلچا اور پھاوڑا موجود ہے۔" وہ بولتا جارہا تھا۔ خورشید چاچا لالٹین قریب رکھ کر پھاوڑا اٹھا چکے تھے مگر شرف الدین نے پھاوڑا ان کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے فرش کھودنا شروع کردیا۔

خورشید چاچا باہر چلے گئے۔ بیس منٹ بعد وہ کمرے میں داخل ہوئے تو چادر لپیٹے ہوئے تھے اور ایک چادر ان کے ہاتھ میں تھی۔

"بیٹا! تم بھی چادر لپیٹ کر کپڑے مجھے دے دو۔ میں دھوکر ڈال دوں۔ ورنہ خون کے دھبے رہ جائیں گے۔ پوری طرح تو یہ اب بھی صاف نہیں ہوں گے مگر کافی حد تک صاف ہوجائیں گے۔ میں گھر جاکر سویرے ہی اپنے اور تمہارے کپڑے لے آؤں گا۔" وہ ٹھیک کہہ رہے تھے یہ کپڑے ہمارے لیے پھانسی کا پھندا بن سکتے تھے۔

اتنا سنتے ہی میں نے ان کے ہاتھ سے چادر لے لی اور ان دونوں کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی کہ باہر جاکر کپڑے بدلتا۔ میں نے چادر کو چاروں طرف لپیٹا اور کرتا پاجامہ اتار کر خورشید چاچا کے حوالے کردیا۔ اب میں خود کو کافی حد تک بہتر محسوس کررہا

تھا' ذہن نے پوری طرح کام کرنا شروع کردیا تھا۔ خورشید چاچا کے جاتے ہی میں نے بیلچا اٹھالیا اور شرف الدین کے کھودے ہوئے حصے سے مٹی ہٹانے لگا۔ خورشید چاچا کچھ دیر کے بعد واپس آگئے۔

پتا نہیں ہمیں کتنے گھنٹے لگے مگر صبح کی سپیدی کے ساتھ ہی ہم اسے دفنا چکے تھے۔ خورشید چاچا نے فرش کی مٹی برابر کردی تھی۔ اس پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے بٹھادیا تھا' چاروں طرف پھیل جانے والی مٹی کو ایک پھٹے ہوئے کپڑے سے سمیٹ کر کھودے ہوئے حصے پر ڈال دیا تھا۔ اب روشنی پھیلنے لگی تھی۔ میرا اور شرف الدین کا تھکن سے برا حال تھا مگر ہم نے آرام کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ خورشید چاچا کپڑے پہن کر گھر چلے گئے تاکہ وہاں سے ہمارے لیے اور اپنے لیے کپڑے لے آئیں۔

میں اور شرف الدین ان سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے جہاں میں نے رحیمو کو قتل کیا تھا۔ سیڑھیوں پر خون کے دھبے تھے جنہیں صاف کرنا ضروری تھا۔ میں نے خورشید چاچا سے وہ چادر لے لی تھی جو وہ لپیٹے ہوئے تھے۔ شرف الدین کھی کے خالی کنستر میں پانی بھر لایا پھر ہم دونوں نے چادر کے دو ٹکڑے کرلیے اور اسے پانی میں بھگو کر خون کے دھبے صاف کرنے لگے۔

سورج کی کرنیں آنگن میں اترنے سے پہلے ہی خورشید چاچا ہمارے کپڑے اور ناشتا لے کر آگئے۔ غالباً اماں نے ہمارا ناشتا بھیج دیا تھا۔ پتا نہیں خورشید چاچا نے ان سے کیا کہا ہوگا ورنہ تو انھوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ سویرے میں گھر آجاؤں۔ اس وقت تک ہم تمام کاموں سے فارغ ہوچکے تھے۔ سیڑھیاں صاف ہوچکی تھیں ہم نے کوٹھی کا چپہ چپہ دیکھ کر اطمینان کرلیا تھا۔ صحن کے ایک حصے میں جہاں کچھ خون گرا تھا' ہم نے وہاں سے مٹی کھود کر نالی میں پانی کے ساتھ بہادی تھی اس کمرے کے دروازے پر تالا ڈال دیا تھا جس میں رحیمو کو دفنایا گیا تھا۔ اس کوٹھی کے پچھلے حصے میں میٹھے پانی کا کنواں تھا' وہاں سے بالٹیاں بھر بھر کر ہم نے سیڑھیوں پر خوب پانی بہادیا تھا۔ خورشید چاچا کے آنے تک میں اور شرف الدین نہا چکے تھے اور ہم دونوں چادروں میں لپٹے بیٹھے تھے۔ خورشید چاچا میرے دو جوڑے لے آئے تھے' اپنے کپڑے بھی بدل کر آئے تھے۔ انھوں نے ہمیں کپڑے دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے پرانے کپڑے لپیٹ کر انھیں دے دیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ناشتا کرنے کے بعد خورشید چاچا وہ کپڑوں کی گٹھڑی لے کر باہر چلے گئے۔ ہمیں انھوں نے یہیں رکنے کو کہا تھا۔ میں اور شرف الدین اس قدر نڈھال ہوچکے تھے کہ ناشتا کرتے ہی بے[...] سے بستروں پر گر گئے۔

لیٹنے کے بعد شرف الدین نے مجھ سے پوچھا کہ اب بتاؤ۔ تم نے رحیمو کو کیوں قتل کیا۔ تب میں نے اسے پوری تفصیل بتادی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں رحیمو کو تو کیا کسی کو بھی قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے وہ خواب سنادیا۔ وہ بڑی توجہ سے سب کچھ سنتا رہا۔ میں نے بات ختم کی تو وہ چونک پڑا پھر گھبرا کر کھڑا ہو[...] اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی۔

"کک۔۔۔ کیا ہوا؟" میں بھی گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

"وہ۔۔۔ وقار وہ چھری۔۔۔ وہ چھری کہاں ہے! اسے تو اس لاش کے ساتھ دفن کرنا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ باہر کی طرف بھاگ اٹھا۔ میں بھی یہ سن کر بوکھلا گیا اور اس کے پیچھے لپکا۔ اس دوران میں' میں یہ بھی سوچتا رہا تھا کہ ہم کوٹھی کا چپہ چپہ دیکھ چکے تھے۔ ہم نے بڑی باریکی سے دیکھا تھا کہ خون کا کوئی دھبا ہماری نگاہ سے اوجھل نہ رہ جائے مگر اس دوران میں ہمیں کہیں بھی وہ چھری نظر نہیں آئی تھی۔ سیڑھیوں پر' نہ ہی کمرے میں لاش کے آس پاس۔ مجھے بھی یقین تھا کہ اسے لاش کے ساتھ دفن بھی نہیں کیا [...] میں یہ سب کچھ لمحوں میں سوچ چکا تھا۔ شرف الدین [...] سے پہلے اس چھوٹے کمرے میں گھسا جہاں ہم نے رحیمو کو دفنایا تھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہاں چاروں طرف [...] اور ڈھونڈنے کے بعد وہ وہاں سے نکل آیا۔ اس نے دروازے میں تالا ڈال دیا اور لپکتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا' میں اس کے پیچھے تھا اور یاد بھی کرتا جارہا تھا کہ [میں] نے چھری کب ہاتھوں سے چھوڑی تھی۔ مجھے تو اتنا [یاد] تھا کہ جب میں رحیمو کی لاش پر جھکا تھا اسی وقت میرے ہاتھ سے چھری گر گئی تھی۔ ہم سیڑھیوں پر پہنچ گئے وہاں کچھ نہ تھا۔ سیڑھیاں تو ہم خوب اچھی طرح دھو چکے [تھے]۔ میں نے شرف الدین کو یاد دلایا کہ جب اس نے میری [کمر] پر مکا مارا تھا' چھری اسی وقت میرے ہاتھ سے گری [تھی] اسے بھی یاد آچکا تھا پھر بھی ہم نے پوری حویلی کا [کونا کونا] چھان مارا۔ ان کمروں میں بھی دیکھ لیا جہاں ہم نے [...] نہیں رکھا تھا۔ اب صرف ایک ہی بات رہ گئی تھی [...] خورشید چاچا نے وہ چھری وہاں سے اٹھائی ہو اور شا[ید]

چھپادی ہو۔ اب ہمیں خورشید چاچا کا انتظار کرنا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سوچوں میں ڈوبے تھے۔ سورج کی کرنوں نے پورے آنگن کو روشن کردیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اماں میرے نہ پہنچنے سے پریشان ہوں گی مگر ہمیں خورشید چاچا کا انتظار کرنا تھا۔ جانے وہ کیوں ہمیں یہاں رکنے کو کہہ گئے تھے۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے ذہن کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی آئینے پر گہری دھند جمی ہو یا جیسے وہاں بہت سی مکڑیوں نے ہزاروں جالے سے بن رکھے ہوں۔ میں باوجود کوشش کے یہ نہیں سوچ پارہا تھا کہ آخر میں نے یہ قتل کیسے کردیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں جس کمرے میں سویا تھا وہ سیڑھیوں سے چوتھا کمرا تھا' اور یہاں سے سیڑھیاں تقریباً تیس قدم کے فاصلے پر تھی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ میں سوتے میں وہاں تک کیسے پہنچا! دوسری بات یہ کہ رحیمو کو جس کمرے میں سلایا گیا تھا وہ بھی سیڑھیوں سے دور تھا۔ وہ سیڑھیوں پر کیوں گیا؟ وہ چھری کہاں سے آئی جس سے میں نے اس پر وار کیا تھا پھر وہ چھری کہاں چلی گئی؟ یہ سب کچھ معمہ تھا جس کا کوئی بھی سرا نہیں مل رہا تھا۔ میرے دماغ کی نسیں چٹخنے لگیں' میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟" شرف الدین نے چونک کر پوچھا۔

"گھبراہٹ ہورہی ہے۔ شرف الدین! رحیمو کی گمشدگی اور اس سے قبل تمھارے ساتھ یہاں تک آنا۔ بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے کیے ہوئے گناہ کی سزا تمھیں اور خورشید چاچا کو ملے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے اسے یوں دفنا کر اچھا نہیں کیا۔"

"فضول باتیں سوچ کر خود کو ہلکان مت کرو وقار الحسن! اگر تم نے یہ قتل دانستہ کیا ہوتا تو کم از کم میں تو کبھی تمھارا ساتھ نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ ایسی قوتیں ہیں جو تمھیں کسی لمبے چکر میں ڈالنا چاہ رہی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تم ناکردہ گناہ کی سزا بھگتو۔ رہا رحیمو کی گمشدگی کا مسئلہ' تو یہ مشکل نہیں ہے۔ میں اس کے باپ سے کہہ دوں گا کہ وہ رات کو یا صبح سویرے کہیں چلا گیا۔ وہ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ بھاگ چکا ہے۔ اس کا باپ جانتا ہے کہ وہ یہاں ٹکنے والا نہیں ہے۔ یہ بات آئی گئی ہوجائے گی مگر وقار الحسن! میرا خیال ہے کہ اب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔ یہ سلوھو کیا چیز ہے اور تم سے کیا چاہتا ہے' تمھارا کیا اندازہ ہے؟"

"میں تو نہیں سمجھتا کہ وہ مجھ سے کچھ چاہتا ہوگا۔ اس کا میرا کوئی تعلق نہیں ہے' میں نے اسے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا اور۔۔۔ اور شرف الدین' اس نے تو مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ جو کچھ بھی وہاں کچہری میں ہوا وہ صرف میرے محسوسات تھے۔ میں اسے الزام نہیں دے سکتا' اور رات جو کچھ ہوا وہ ایک بھیانک خواب تھا۔ اب میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے اور کب ہوگیا اور اس کے پیچھے کون سی قوت ہے جو مجھے اس حال کو پہنچا گئی ہے۔ بہت سے سوال ہیں جو تشنہ ہیں میں ان کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کرسکتا۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔

"مثلاً؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مثلاً یہ کہ میں سیڑھیوں تک کیسے پہنچا؟ میں تو یہاں سویا تھا' پھر رحیمو وہاں کیوں گیا؟ چھری کہاں سے آئی اور پھر کہاں غائب ہوگئی؟ خواب کے بارے میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی عجیب و غریب شکل و صورت اور حرکتوں کی وجہ سے میرے ذہن میں رہ گیا ہوگا اور میں نے اسے خواب میں دیکھ لیا مگر۔۔۔ وہ چھری؟"

"وقار الحسن! سب واقعات ایسے تھے جنہیں تم کھل کر بیان کرسکتے ہو مگر یہ واقعہ ایسا نہیں کہ تم کسی سے اس کا تذکرہ بھی کرو' حتیٰ کہ تم اپنی اماں تک کو اس ہولناک واقعے کے بارے میں نہیں بتاسکتے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں تم کس سے مدد حاصل کرسکتے ہو۔ کیا تمھارے خیال میں اس واقعے کے پیچھے شکنتلا کا ہاتھ ہوسکتا ہے یا پرکاش کا؟"

"نہیں۔۔۔ میں ایسا سوچ ہی نہیں سکتا شرف الدین۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے سنہرے بابا کی ہدایات پر عمل نہ کرکے اپنے لیے عذاب مول لیے ہیں۔ تمھیں یاد ہے! انھوں نے کہا تھا کہ جلد ہی فیصلہ کرلو' پستی تمھارے بہت قریب ہے' اور جب ان بزرگ نے ہمیں فوراً ہی سنہرے بابا سے ملنے کو کہا تھا اور کہا تھا کہ تمھیں آج ہی ان سے مل لینا چاہیے ورنہ تم ایک نہ ختم نہ ہونے والے عذاب میں گھر جاؤ گے تو تم نے بھی اور میں نے بھی' ان کی بات کو محض اس لیے رد کردیا تھا کہ وہ رات پرسکون گزری تھی۔ میرے خیال میں اس معاملے میں صرف اور صرف سنہرے بابا ہی ہماری مدد کرسکتے ہیں۔"

"مگر وہ ہمالیہ پر جاچکے ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کب تک واپس آئیں گے۔" اس کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ یوں تو وہ صرف ایک ہی رات میں اپنی عمر سے بہت بڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی ذہین آنکھوں میں ایک دھندی پھیلی ہوئی محسوس ہورہی تھی مگر سنہرے بابا کی غیر موجودگی میں بے بسی کو شاید اس نے بھی اسی شدت سے محسوس کیا تھا جس قدر میں محسوس کر رہا تھا۔ "ہم ایسا کرسکتے ہیں کہ ان کے حجرے تک جائیں شاید ہمیں وہ بزرگ مل جائیں جنھوں نے ان سے ملنے کا پتا بتایا تھا۔ ان سے پوچھیں گے کہ سنہرے بابا تک پہنچنے کا کیا ذریعہ ہوسکتا ہے۔"

"ہاں۔۔ یہ کوشش کی جاسکتی ہے۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

اب دھوپ آنگن میں بھر چکی تھی۔ شاید گیارہ بج چکے تھے۔ مجھے بھی گھر جانا چاہیے تھا اور شرف الدین کو بھی مگر ہماری ہمت نہیں ہورہی تھی۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ بس ساری دنیا ختم ہوجائے یا پھر میں ہی دنیا میں نہ رہوں۔ ہماری قوت فیصلہ سلب ہوچکی تھی۔

"آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟" شرف الدین نے اچانک سوال کیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ چکا تھا' پھر ہم دونوں ہی نے جلدی جلدی حساب لگایا۔ آج چاند کی دس تاریخ تھی۔ میں نے گہرا سانس لیا۔ شرف الدین کے سوال کرنے پر میں جان چکا تھا کہ وہ پھر میری اس حرکت کو اس عجیب و غریب بیماری "مون میڈنس" سے تعبیر کرے گا مگر یہ جان کر کہ آج چاند کی دس تاریخ ہے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے سوچ رہے تھے کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شرف الدین نے دروازہ کھولا۔ خورشید چاچا تھے۔ ایک کپڑے کا تھیلا ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد تھیلا فرش پر الٹ دیا۔ اس میں سیمنٹ کرنے کا سامان تھا۔ وہ ضرورت کی چیزیں لے کر اور شرف الدین کے کمرے کی چابی مانگ کر باہر جانے لگے اسی لمحے میں اور شرف الدین دونوں ایک ساتھ ہی انھیں پکار اٹھے۔

"کیا بات ہے؟" وہ ٹھٹک گئے۔

میں شرف الدین کی طرف دیکھنے لگا۔ شرف الدین نے کہا۔ "خورشید چاچا! وہ چھری۔۔ وہ چھری آپ نے کہیں رکھی ہے جس سے۔۔"

"چھری۔۔؟" انھوں نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر بولے۔ "نہیں۔۔ وہ تو وہیں سیڑھیوں پر پڑی تھی۔ جب ہم رحیمو کی لاش اٹھا کر کمرے میں لا رہے تھے تو وہ وہیں تھی۔ میں نے پیر سے اسے ایک طرف کردیا تھا۔ کیا۔ کیا وہ تم نے اٹھائی نہیں تھی۔۔ اسے تو لاش کے ساتھ دفنا دینا چاہیے تھا۔"

پھر میں نے انھیں بتایا کہ اس چھری کا کہیں پتا نہیں ہے۔ ہم نے کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ یہ سن کر ان کے چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ وہ بری طرح نروس ہوگئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ رحیمو کے کپڑوں میں الجھ کر اس کے ساتھ ہی دفن ہوچکی ہے۔ ورنہ کہیں تو ملتی۔" شرف الدین نے جلدی سے کہا۔

اس کی بات میں وزن تھا۔ مجھے بھی یہی لگا جیسے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ خورشید چاچا بھی مطمئن ہوگئے۔ انھوں نے ہم سے کہہ دیا کہ ہم چاہیں تو اب چلے جائیں۔ وہ خود ہی فرش کو سیمنٹ کرکے اور سب ٹھیک ٹھاک کرکے آجائیں گے۔ میں اور شرف الدین اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے پیروں میں تو جیسے جان ہی نہ تھی مگر شرف الدین اپنے حوصلے اور حواس بحال کرچکا تھا' وہ مجھے گھر کے دروازے پر چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہم نے راستے ہی میں طے کرلیا تھا کہ شام کو سنہرے بابا کے حجرے کی طرف جائیں گے شاید کوئی سبیل نکل آئے۔

میں گھر میں داخل ہوا تو اماں کی تیوریوں پر بل پڑے تھے۔ تایا حکمت کی کوئی بہت پرانی کتاب پڑھ رہے تھے۔ بہنیں اور پھوپی کاموں میں معروف تھیں۔ سب کچھ نارمل تھا' معمول کے مطابق۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ کل کی رات مجھ پر کیسی قیامت بن کر گزری ہے۔ اماں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ کل رات انھوں نے اپنے جس بیٹے کو اس گھر سے رخصت کیا تھا وہ صرف ایک ہی رات میں سفاک قاتل بن کر لوٹا ہے۔ ایک ایسا قاتل جس نے بے وجہ' بے سبب ہی ایک معصوم اور جوان آدمی کو موت کے کنویں میں دھکیل دیا ہے۔ اماں کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میں سرتاپا لرز اٹھا۔ یہ سوچ کر ہی دماغ جھنجھنا گیا کہ اگر اماں کو پتا چل گیا کہ میں کیا سے کیا بن گیا ہوں اور وہ مکان جس میں انھیں منتقل ہونا ہے اسی مکان کے ایک کمرے میں ایک ایسے شخص کی لاش دفن ہے جسے وہ جانتی تک نہیں مگر اس اجنبی کا قاتل ان کا بیٹا ہے تو کیا ہوگا۔؟

"کیا تم اب نمازوں سے بھی گئے؟" انھوں نے مجھے دیکھتے ہی غصے سے کہا۔

"ن۔۔ نہیں تو اماں۔۔ نماز تو ہم نے پڑھ لی تھی۔ میں اور شرف الدین دونوں۔۔" میں اس سے زیادہ جھوٹ نہیں بول سکا۔ نماز کے بارے میں یہ میرا پہلا جھوٹ تھا۔ انھوں نے میرے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے ورنہ وہ میرا جھوٹ پکڑ لیتیں۔ وہ تو سوال پوچھ کر چاول چھننے میں لگ گئی تھیں۔

"تمھیں ناشتا گھر آکر کرنا چاہیے تھا۔۔ وہاں اکیلے گھر میں' جہاں نہ برتن نہ دری' وہاں ناشتا کرنے کی کیا تک تھی؟"

"دراصل اماں! ہم لوگ وہاں بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ شرف الدین نے قصہ ہی ایسا چھیڑ دیا تھا کہ۔۔"

"اور اسی وجہ سے میں لڑکوں کے اکیلے کہیں رہنے کی قائل نہیں' وقت ضائع کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔" وہ ابھی تک ناراض تھیں۔ اس دوران میں تایا نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا پھر کتاب بند کرکے قریب آگئے۔

"دلہن وقار الحسن کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی اور تم ہو کہ جرح کیے جارہی ہو۔ دیکھو تو اس کی آنکھیں۔۔"

اور میں گھبرا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اماں میری آنکھوں میں دیکھیں۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے اماں آرپار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں نے جھوٹ بولا ہو یا ان سے کچھ چھپایا ہو اور وہ پھر بھی سب کچھ نہ جان گئی ہوں۔ میں نے نگاہیں جھکالیں۔

"نہیں تایا!۔۔ یہ جاگنے کی وجہ سے ایسی ہورہی ہیں۔ میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر اماں کی طرف سے رخ پھیر لیا تھا۔ "کچھ دیر سولوں گا تو ٹھیک ہوجاؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اس وقت سوؤ گے؟" اماں نے جھٹکے سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں اماں۔۔ دوپہر میں سولوں گا۔" میں اتنا کہہ کر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ سامنے سے شنو آپا آرہی تھیں۔

میں نے شنو آپا سے کہا کہ اگر ہوسکے تو مجھے گرم گرم چائے اور سردرد کی گولی دے دیں پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرا سر بہت بھاری ہورہا تھا' درد کی ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ میں سر پر دوپٹا باندھے لیٹا تھا۔ ابھی مجھے لیٹے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اماں آگئیں۔ میں انھیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"لیٹے رہو۔" انھوں نے نرم لہجے میں کہا اور ہاتھ کی پشت کو میرے رخسار سے چھوا۔ "تمہیں بہت تیز بخار ہے۔ تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی، تمہیں یہ بدپرہیزی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"اماں وہ۔۔۔ شرف الدین کے گھر جگہ نہیں تھی۔ وہ یہاں سونے آیا تھا۔ میں اسے کیسے منع کرتا! میں اسے بتا چکا تھا کہ ہم نے گھر کی جھاڑ پونچھ کر چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے مگر رات بھر جاگنا بھلا کیا تک تھی۔ اپنی صحت کا تم خود خیال نہیں کرو گے تو کوئی اور کیوں کرے گا۔

اور ہاں۔۔۔ میں نے شگفتہ کی اماں سے بات کی تھ
دل دھڑک اٹھا۔ اس بات کو تو میں بھول ہی چکا تھا
نے شرف الدین کی چچا زاد کی شادی میں میرے لیے
ہوگی۔ میں نے تایا سے بھی کہا تھا کہ وہ شرف الدین
سے بات کریں۔ میں دھڑکتے دل سے اماں کی طرف
تھا۔ وہ چپ تھیں اور گہری نگاہوں سے مجھے
تھیں۔

"جج۔۔۔ جی اماں۔۔۔!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"انھوں نے کچھ کہا تو نہیں میرا مطلب ہے ا
نہیں کیا مگر پوری طرح رضامندی بھی ظاہر نہیں ک
کے ابا سے بات کرنے کو کہا ہے اور تمہارے تا
تھے کہ ان کے باوا نے یہاں اس موضوع پر بات
سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم وہ
نبھائیں۔ ان سے بات کرنے کے لیے امروہہ آئ
ہماری بات سنیں گے۔"

"جی۔۔۔!" میں ہونقوں کی طرح بولا۔

"بس میں نے کہا کہ بات تمہارے علم میں
کہیں تم یہ نہ سوچو کہ ہم نے بات نہیں کی۔ ا
جا کر ہی بات ہو سکتی ہے۔ تم سوچ لو کہ کب چلنا
مکان میں منتقل ہونے سے پہلے ویسے بھی میرا
ضروری ہے۔ وہاں سے ضروری سامان بھی تو لانا۔
دلھن آجائیں تو لڑکیوں کو ان کی نگرانی میں چھوڑ
چلے چلیں گے، تایا کو بھی ساتھ لے لینا' ان کے
وہی نمٹ سکتے ہیں۔" اتنا کہہ کر اماں کھڑی ہو گئیں
کر بولیں۔ "شام میں ڈاکٹر کو دکھا لو۔ میرا خیال ہے
مرتبہ اسپتال جا کر اچھی طرح معائنہ کروالو۔"

"جی اماں!" میں اتنا کہہ کر رہ گیا۔ اماں کے
میں دھم سے بستر پر گر گیا۔ میرے سر میں دھماکے
تھے۔ شدید درد نے مجھے بے حال کیا ہوا تھا۔ واقعی
بخار تھا۔ شنو آپا گولی اور چائے لے آئیں۔ میں
کر چائے پی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں
سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں سونا چاہتا تھا۔ بے خبر
تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی آنکھوں میں چبھ
رہی تھی۔ میں نے اپنا بازو آنکھوں پہ رکھ لیا۔ ا
اماں کی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں۔ انھوں نے
بارے میں بات کر لی تھی۔ ان لوگوں نے امروہہ

ے کو کہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تقریباً" رضامند ہیں
ۂ انکار کرنا ہوتا تو یہاں بھی صاف انکار کر سکتے تھے۔ ان
وں سے ایسی بداخلاقی کی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی دور بلا
انکار کرتے یا اگر شگفتہ کی بات کہیں اور طے ہو چکی ہوتی
ھی وہ بتا دیتے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے مگر۔۔۔ ان کی
ں سے یہی لگا تھا کہ وہ رضامند ہو جائیں گے مگر۔۔۔ کیا
ف الدین بھی راضی ہو جائے گا؟ پہلے تو میری ساری
یدیں اسی سے وابستہ تھیں کہ وہ ہر حال میں میری طرف
اری کرے گا مگر اب۔۔۔ حالات ایک خوفناک موڑ پر پہنچ
ے تھے۔ میرے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا تھا۔ اس قتل کے
ے چاہے کوئی ان دیکھی طاقت ہی کیوں نہ ہو، قتل تو
رے ہاتھوں ہی ہوا تھا۔ اگر کسی کو پتا چل جاتا یا رحیمو کی
ں برآمد ہو جاتی تو پکڑا تو میں ہی جاتا نا۔۔۔! سزا تو مجھی کو
ا تھی، یہ تو ممکن نہ تھا کہ میں اس قتل کا الزام کسی ان
ھی طاقت کے سر ڈال دیتا۔ اب ایسے میں کیا شرف
ین میری طرف داری کرے گا؟ یہ وہ خوفناک سوال تھا
ں نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میں جانتا تھا کہ دوستی دوسری
یں شرف الدین دوست ہونے کی حیثیت سے میرا پورا
تھ دے گا اور دے رہا تھا مگر کیا وہ اپنی بہن کو ایک قاتل
ے حوالے کر سکتا تھا؟ نہیں۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں
رے گا۔ میں قاتل نہ بھی ہوتا تو بھی یہ مشکل لگنے لگا تھا
ونکہ جو چکر میرے ساتھ شروع ہو چکے تھے وہ ایسے غیر
ی تھے کہ وہ یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے
را دل بیٹھنے لگا۔ شگفتہ کی تارا سی آنکھیں، ان میں بھری
ار کی چمک میری آنکھوں میں لہرا گئی۔ میں نے تصور ہی
ور میں اس سے معافی مانگی کہ میں زیادہ عرصے اس کا
اتھ نہیں دے سکا۔ وہ یقیناً میرے پیار کی منتظر تھی، اس
یار کی منتظر تھی جس کا ابھی میں نے اظہار بھی نہیں کیا
تا۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں تھا، مجھے یقین تھا کہ اسے میرے
یار کا پورا ادراک ہے، اور یہی دعویٰ میں اپنے بارے میں
ھی کر سکتا تھا، جتنی گہری اور یقینی باتیں آنکھیں کر جاتی ہیں
ثاید ہونٹ نہیں کر پاتے۔

میں اس موضوع پر جس قدر سوچتا رہا اسی قدر مجھے یقین
ہوتا گیا کہ میں کبھی بھی اپنے اس خواب کی تعبیر نہیں
پا سکوں گا، مجھے شگفتہ کو بھولنا ہوگا، صرف شگفتہ ہی کو نہیں
دنیا کے ہر لطیف جذبے، ہر خوشی اور ہر آسائش کو بھولنا

ہوگا۔ میں تو اب ایک ایسی سرنگ میں داخل ہو چکا تھا جس کا کوئی سرا نہیں تھا، جہاں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہیں تھی، جہاں گھپ اندھیرا تھا، اذیت تھی، خوف تھا اور بس۔

میں جانے کب تک انھی تکلیف دہ سوچوں میں گھرا رہا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے شگفتہ کا خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے، میں بہنوں کے بارے میں زیادہ حساس ہو گیا، اب میری پریشانی یہ تھی کہ کسی بھی طرح ان دونوں بہنوں کو بیاہ کر اپنے بوجھ کو کم کر لوں، مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ بہرحال میں نے سوچ لیا تھا کہ اس سلسلے میں اماں سے بات کروں گا۔ پھوپی کی ذمے داری تو تایا بھی اٹھا سکتے تھے مگر بہنوں کی ذمے داری سے میں خود عہدہ برآ ہونا چاہتا تھا۔

وقت کب گزر گیا، میں کب سو گیا مجھے پتا نہیں چلا۔ اٹھا تو طبیعت کا بوجھل پن کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ اماں جو میرے لیے کافی پریشان تھیں۔ مجھے بہتر دیکھ کر مطمئن ہو گئیں۔ تایا میرے منتظر تھے۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "آؤ میاں وقار! اب کیسے ہو؟" انھوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب ٹھیک ہوں تایا۔" میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

تایا نے پھوپی کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا پھر وہ مجھے بتانے لگے کہ شادی میں شگفتہ کے ابا نے ان کی بات سن کر کیسے برے برے منہ بنائے تھے پھر ہنستے ہوئے بولے۔ "میاں وہ آدمی تو کسی ڈھب سے نہیں لگتے۔"

میں ہنس کر چپ ہو گیا۔

"میاں ان کا لڑکا۔۔۔ کیا نام ہے اس کا! ہاں شرف الدین۔۔۔ اس کا بھی اپنے باوا کے بارے میں یہی خیال ہوگا کیوں کہ آدمی مروت کا ہے اس لیے کہہ نہیں سکتا ہوگا۔ وہ اپنے باوا سے زیادہ معقول آدمی ہے۔"

میں اب بھی کچھ نہ بولا تو وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "تم ملے ہو اس کے باوا سے؟"

"جی ہاں۔۔۔ کئی بار۔۔۔ امروہہ میں ملاقات ہو گئی تھی۔"

"تمہارے بارے میں بڑے عجیب و غریب خیالات ہیں ان کے۔ کہہ رہے تھے کہ لڑکا آوارہ مزاج کا ہے۔ لونڈوں کے ساتھ گھومنے کے سوا اسے کچھ نہیں آتا۔"

"جی تایا۔۔۔ اماں کے امروہہ آنے کے بعد شرف الدین میرے ساتھ حویلی میں رہا تھا کیوں کہ مجھے تنہا حویلی میں

رہتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ دوسرے روز میں اس کے ساتھ ہی اس کے گھر گیا تھا تو انھوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار مجھ سے بھی کیا تھا۔"

"اچھا۔ گویا اپنے لڑکے کی آوارہ مزاجی کو تمھارے سر تھوپ دیا۔" انھوں نے حقے کی چلم کو کریدتے ہوئے کہا۔

اس وقت دروازے پر کھٹکے کی آواز ہوئی۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید شرف الدین آیا ہو۔ میں نے دروازہ کھولا تو خورشید چاچا تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر سکون تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اطمینان دلایا اور چپکے سے گھر کی چابیاں میری مٹھی میں دے دیں۔ میں نے چابیاں فوراً ہی اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لیں۔

"آؤ بھئی خورشید چاچا۔" تایا نے آواز لگائی۔ خورشید چاچا تایا سے کافی چھوٹے ہوں گے مگر تایا ہمیشہ انھیں خورشید چاچا ہی کہتے تھے۔ وہ میرے ساتھ تایا کے پاس آگئے۔ پھوپی چائے بنا کر لے آئی تھیں۔ ہم نے ساتھ ہی بیٹھ کر چائے پی۔ تایا خورشید چاچا سے زمینوں کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ خورشید چاچا نے بتایا کہ سویرے وہ امروہہ چلے جائیں گے پھر وہاں سے زمین پر چلے جائیں گے۔ میں نے خورشید چاچا کو یاد دلایا کہ انھیں وہاں جاتے ہی لڈن کو میرے پاس بھیجنا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا پھر ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔ اب دن کی روشنی سرمئی اندھیرے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مجھے شرف الدین کا شدت سے انتظار تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آنے والی رات سے مجھے خوف آرہا تھا۔ میں رات ہونے سے پہلے سنہرے بابا کے حجرے تک جانا چاہتا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ بابا مجھے مل جائیں جنھوں نے پہلی بار مجھے سنہرے بابا کا پیغام پہنچایا تھا۔

تایا نے میری بے چینی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ خورشید چاچا سے باتیں کر رہے تھے مگر بار بار ان کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر جاتی تھیں تبھی خورشید چاچا انھیں اپنی جانب متوجہ کر لیتے۔ ہر پل جیسے میرے دل پر سے 'بہت بھاری قدم رکھتا ہوا گزر رہا تھا۔ ایک خوف تھا' ایک اذیت ناک کیفیت تھی جو تھرتھری بن کر میرے بدن میں سمائی ہوئی تھی حالانکہ اب سے کچھ دیر پہلے جب میں سو کر اٹھا تھا تو میں خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود شرف الدین کی طرف چل پڑوں۔ یہ خیال آتے ہی اماں کے پاس گیا۔ وہ نماز کی تیاری کر رہی تھیں مجھے انھوں نے استفہامیہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ دل میں ہوک سی اٹھی کہ کاش میں اماں کو بتا سکتا کہ ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ جو کچھ وہ صولت مرزا' دادی وغیرہ کے ساتھ ہوتے دیکھ چکی تھیں میرے ساتھ آنے والے حالات ان سے کہیں زیادہ خوفناک تھے یقین تھا کہ وہ یہ سب سن کر برداشت نہ کر پائیں گی ورنہ انھیں سب کچھ بتا دیتا۔

"کیا بات ہے وقار؟ کیا سوچ رہے ہو؟" انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اماں! میں شرف الدین کی طرف جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"اماں! میرا اس وقت اس کے ساتھ سنہرے بابا کے حجرے تک جانا ضروری ہے۔"

"غالباً تم بتا چکے ہو کہ سنہرے بابا یہاں نہیں ہیں۔" انھوں نے جائے نماز بچھاتے ہوئے کہا۔ ان کا لہجہ سرد تھا۔

"جی اماں! وہ تو نہیں ہیں مگر جن بزرگ نے ہمیں پہنچایا تھا' وہ ضرور مل جائیں گے۔ میں ان سے سنہرے بابا کے بارے میں معلومات کروں گا۔ اماں! یہ معاملہ ایسا ہے جسے یوں چھوڑ کر بیٹھ جایا جائے۔ آپ سمجھ رہی ہیں اماں؟ ہم کسی بڑی مصیبت میں بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔" میں یہ کہتے کہتے اندر سے لرز رہا تھا۔

"وقار الحسن!" اماں اب گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے جھک کر جائے نماز کا کونا موڑا۔

"آؤ۔ یہاں بیٹھو۔" انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا پھر اٹھیں۔

"وقار۔ تم۔ تم کانپ رہے ہو بیٹا۔ بیٹھو۔" انھوں نے جلدی سے مجھے چھپر کھٹ پر بٹھا دیا۔ "کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ۔"

"نہیں اماں کچھ ہوا نہیں ہے مگر۔ مگر کچھ بھی ہے۔"

"وقار! بیٹا حالات ایسے نہیں ہیں کہ تم مجھ سے چھپاؤ۔" انھوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں! میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ مم۔ مجھے خوف آرہا ہے۔ ڈر لگ رہا ہے اماں۔" میں نے ان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"ڈرو مت۔ خدا پر بھروسا رکھو بیٹا! خدا کا ذکر کیا کرو۔ اس سے پناہ مانگا کرو۔ وہ بہت بڑا سہارا ہے۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے اور تم کیا محسوس کر رہے ہو۔"

میں نے لمحہ بھر کو سوچا پھر انھیں رات والا خواب سنا دیا۔ انھیں اس سادھو کے بارے میں بتا دیا مگر دو اہم باتیں حذف کر گیا' ایک یہ کہ وہ خواب نہیں حقیقت تھی اور میں رحمو کو قتل کر چکا ہوں بلکہ اسے دفنا بھی چکا ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ سادھو ہی ہمارے نئے مکان کا سابقہ مالک ہے۔ میں نے انھیں یہ بتایا تھا کہ اسے میں نے پہلی بار کچہری میں دیکھا تھا اور پھر جو میری کیفیت ہوئی تھی وہ ان سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا اور یہ خواب سن کر اماں خود بھی بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ "یا خدا تو رحم کرنا۔" انھوں نے سر اٹھا کر کہا۔

"بس اماں۔ میں اس لیے بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اب میں رو پڑا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر اماں بھی رو پڑیں اور دوپٹے کے پلو سے میرے آنسو پونچھنے لگیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا جاؤ لیکن جلدی آجانا۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں پریشان رہوں گی۔ اور ہاں سنو! میں جلد از جلد امروہہ جانا چاہتی ہوں۔ کل تمھاری تائی اور چچی آجائیں گی۔ میں نے خورشید چاچا کو روک لیا ہے۔ ہم انھی کے ساتھ امروہہ جائیں گے۔" ایسا کہتے ہوئے اماں کے چہرے پر بڑی سختی تھی' ایک عزم' یوں جیسے انھوں نے کوئی اہم فیصلہ کر لیا ہو۔ ان کے لہجے میں تحکم بھی تھا گویا میں کوئی عذر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایسے حالات میں مجھے امروہہ جانا چاہیے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ بہرحال یہ باتیں سوچنے کے لیے ابھی بہت وقت تھا۔ اماں سے اجازت ملتے ہی میں باہر کی طرف لپکا۔ خورشید چاچا اب بھی تایا کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے خورشید چاچا کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"بھئی کہاں؟" تایا نے حقے کی نے منہ سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"تایا ابھی آتا ہوں۔ شرف الدین کے گھر جا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ بھئی اس لڑکے کو لے آنا۔ عجیب بات ہے اس لڑکے میں' ساتھ بیٹھا ہو تو میں خود کو اس کا ہم عمر سمجھنے لگتا ہوں۔"

"جی تایا کوشش کروں گا ورنہ آپ میرے بارے میں اس کے ابا کے خیالات جان ہی چکے ہیں۔"

"ہاں بھئی۔ میرا خیال ہے کہ ان باوا کے تمام اندازے اسی طرح ہمیشہ غلط نکلتے ہوں گے' جبھی ان کے چہرے پر عمر سے زیادہ بڑھاپا چھا چکا ہے۔ نوجوانوں سے کافی حسد کرتے ہیں وہ۔" تایا نے حقے کی نے کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"جی۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ خورشید چاچا میرے ساتھ تھے۔ ہم جونھی گلی کے کونے پر پہنچے ہمیں دور سے آتا ہوا شرف الدین نظر آگیا۔ میں نے رفتار تیز کر دی۔ "کہاں رہ گئے تھے" میں نے قریب جاتے ہی پوچھا۔

"آج اماں اور ابا واپس جا رہے تھے اس لیے دیر ہو گئی۔ انھیں ٹرین میں بٹھا کر آرہا ہوں۔ کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں خود کو۔" وہ مسکرایا۔

"شرف الدین! جو کچھ ہو چکا اس کے بعد بھی تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر سکتے ہو؟"

"بس یہی ایک خرابی ہے تمھارے اندر' یار ماضی سے لپٹے رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔"

اس کا انداز شوخ تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں اسے اس طرح دیکھ کر کافی حیران تھا۔ پتا نہیں یہ اس کی برائی تھی یا خوبی۔

"ماضی میں رہنے والے آنکھیں کھول کر حال میں نہیں دیکھتے اور آنکھیں نہ کھولنے والے کو راستے دکھائی نہیں دیتے اور راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے مستقبل کی طرف سفر نہیں ہو پاتا۔ مجھ میں تو ایک خوبی ہے' میں گزرا لرزتے ہوئے لمحے کو بھول کر آنے والے پل پر نگاہیں جما دیتا ہوں پھر مجھے سب کچھ صاف نظر آنے لگتا ہے۔" وہ بولے جا رہا تھا اور اب بھی اگر میں اسے نہ ٹوکتا تو وہ جانے کب تک بولتا رہتا۔

"ہمیں سنہرے بابا کے پاس جانا ہے۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں اور اسی لیے تمھاری طرف

آرہا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ خورشید چاچا کی جانب متوجہ ہوا۔ "سب ٹھیک ہے نا خورشید چاچا؟"

"ہاں۔۔۔ یوں تو سب ٹھیک ہے۔ ویسے میں اسی سادھو کی طرف گیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ سابق مالک مکان کی طرف۔"

ان کی بات سن کر میں اور شرف الدین دونوں چونک اٹھے۔ "کیوں؟۔۔۔ پھر کیا ہوا؟" میں نے ایک دم ہی دو سوال کر لیے۔

"اس کا کہنا ہے کہ وقار الحسن اس سے جا کر ملے۔"

"آپ نے اس سے کیا کہہ دیا خورشید چاچا؟" شرف الدین گھبرا گیا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ تم اسے پریشان کر رہے ہو۔ رحیمو والی بات نہیں بتائی اسے۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔

میں نے اور شرف الدین نے یہ سن کر گہرا سانس لیا۔ "اوہ خورشید چاچا! آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ خدا کے واسطے آپ کوئی بات کسی سے بھی نہ کریں۔ آپ سب کچھ بھول جائیں ہم اسے خود سنبھال لیں گے۔"

"میاں کیا میں صورت سے بہت زیادہ بوڑم نظر آتا ہوں۔؟" انھوں نے میری طرف چہرہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ ان کے چہرے پر بے پناہ سنجیدہ استفہام دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔

"خورشید چاچا! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم تینوں کو کسی بھی بات پر ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر کچھ نہیں کہنا اور کرنا چاہیے' ایسا نہ ہو کہ کچھ گڑ بڑ ہو جائے۔" شرف الدین نے جلدی سے کہا وہ شرمندہ تھا۔

خورشید چاچا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے پھر پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "اب میاں میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں بری طرح شرمندہ ہو گیا۔ وہ ابھی تک ناراض تھے۔ "چاچا۔ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ اس نے کہا تو ہے کہ۔۔۔"

"خیر خیر۔!" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میری بات کا جواب دو۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ آرام کریں۔ بہت تھک گئے ہوں گے۔" مجھ سے پہلے ہی شرف الدین بول اٹھا۔ "ہم سنہرے بابا کے حجرے تک جا کر واپس آتے ہیں۔"

اتنا سنتے ہی خورشید چاچا پلٹ گئے۔ میرا دل برا ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ناراض ہیں مگر شرف الدین نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بڑھ گیا۔

"ایسا کرنا ضروری تھا' کیا پتا کس ترنگ میں کس سے کہہ بیٹھیں۔ انھیں کیا ضرورت تھی اس کے پاس جانے کی۔" وہ سر جھٹک کر بولا پھر چونک کر میری طرف دیکھا۔ "ویسے وہ کیا بتا رہے تھے۔۔۔ اس سادھو نے کیا کہا؟"

"اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یوں کہہ لو کہ مجھے پیغام بھیجا ہے کہ میں اس سے ملوں۔ شرف الدین۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اس سادھو کا اس خونی ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کردار ضرور ہے۔ بظاہر وہ گرفت میں نہیں آتا مگر۔۔۔ مگر شرف الدین۔۔۔ کچھ اس نے مجھ سے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کروایا ہے۔"

"میں خود بھی سارا دن یہی سوچتا رہا ہوں وقار الحسن! بات اس جگہ آ کر رک جاتی ہے کہ آخر اسے تم سے یہ سب کچھ کروانے کا کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ دوسری بات یہ کہ کیا وہ روحوں اور جنوں سے زیادہ طاقت رکھتا ہے؟ کیا اس کے پاس اتنی شکتی ہے کہ وہ کہیں دور بیٹھ کر کسی شخص کے ہاتھوں قتل کروا دے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں ہزاروں لوگ ہیں جو زندگی تیاگ کر ایسی شکتیاں حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں مگر پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ سب کروانے کی کیا ضرورت تھی! وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"ممکن ہے کہ وہ۔۔۔ وہ پرکاش کا کوئی روپ ہو؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"تم بھول رہے ہو کہ پرکاش اس سے قبل بھی بلکہ ہمیں مل چکا ہے اور اس نے ہمیں کسی بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ شاید تمھیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ اس سادھو نے جو کچھ تم سے کروایا ہے وہ کتنا بڑا ہے' اتنا بڑا نقصان کہ پرکاش نے شکنتلا کی خودکشی اپنے قتل کا بھی مرزا صولت بیگ سے ایسا انتقام نہیں لیا۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا وقار الحسن! تم تو اب تک کے ساتھ ہو۔ تم اس کی اذیت کے ازالے کے لیے کچھ کر چکے ہو۔ نہیں۔۔۔ وہ پرکاش نہیں ہو سکتا' نہ اس کا کوئی ہاتھ ہے' صرف ایک ہی بات ہو سکتی ہے مگر تم اس بات پر یقین نہیں کرو گے۔" وہ منہ بنا کر رہ گیا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارا رخ سنہرے بابا کے حجرے کی طرف تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"برا نہ مانو تو کہوں!" اس نے یوں کہا جیسے جان کی امان مانگ رہا ہو۔

"ہاں ہاں کہو نا۔" میں الجھ گیا۔

"یہ حرکت تمھارے چچا کی بھی ہو سکتی ہے۔"

"کیا۔۔۔!" میں اچھل پڑا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھا۔۔۔ چونکے لگ گئے ناں تمھیں!" وہ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن وقار! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس امکان پر سوچنا ضرور۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"بولو تو۔۔۔" میں چڑ گیا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ چچا اپنی سالی کی بیماری کا بہانہ کر کے اس سادھو کے پاس گئے ہوں۔ اسے ہر طرح کی شکتی حاصل ہے' یہ بات ان کے علم میں بھی ہو گی۔ انھوں نے دیکھا کہ اب تک ان کا ہر حربہ ناکام ہوا ہے۔ اس سادھو کی مدد سے تمھیں عمر قید یا پھانسی کی سزا دلوا کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور انھوں نے ایسا کر دکھایا' گویا وہ تو اپنی طرف سے کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ تو ہم لوگوں کی چالاکی تھی اور کچھ ہماری قسمت کہ وہ رحیمو ہمارے ہاتھ لگ گیا اور وہ بھی ایسا جس کا کردار خود اس کے ماں باپ کی نگاہوں میں بھی خاصا مشکوک ہے تو اس کی گمشدگی مسئلہ نہیں بنے گی۔ سوچو اگر اس کی جگہ میں یا خورشید چاچا ہوتے تو کیا یہ بات اتنی آسانی سے چھپ سکتی تھی؟ میرا تو خیال ہے کہ تم خود ہی اب تک پولیس کے پاس پہنچ کر اعتراف جرم کر چکے ہوتے۔"

"مگر۔۔۔ یہ تو۔۔۔" میں نے کہنا چاہا کہ یہ ممکن نہیں ہے مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

"ٹھہرو۔۔۔ میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ ایک دوسرا امکان بھی ہے۔۔۔ سنہرے بابا۔۔۔ ممکن ہے کہ یہ سنہرے بابا کا کوئی شعبدہ ہو۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ تمھارا یہ آخری امکان قطعی فضول ہے۔" میں نے اسے جھڑک دیا البتہ اس کی چچا کے بارے میں سنائی ہوئی کہانی کچھ کچھ دل کو لگتی تھی۔

"پھر۔۔۔ وہ پہلے والا امکان۔۔۔!" وہ بولا۔

"ہاں۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "اس پر سوچا جا سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس قدر گر سکتے ہیں' صرف دولت کے لیے؟"

"کیوں۔۔۔ تمھیں قتل کرواتے وقت کیا وہ عظمت کی بلندیوں پر لٹکے ہوئے تھے؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔"

"جو بھی مطلب ہے' بے وقوفی کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب معاملہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اسے' یعنی اس راز کو طشت از بام ہو جانا چاہیے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کون سا راز؟" میں حیران ہو گیا۔

"وہی تمھارے قتل والے ڈرامے کا راز۔ تمھیں چاہیے کہ تم اپنے تایا کو اعتماد میں لے کر سب معاملات ان کے سامنے رکھ دو۔"

"شرف الدین! اب۔ اتنے عرصے بعد کیا وہ یقین کر لیں گے کہ وہ ڈراما چچا کا کھیلا ہوا تھا؟ پھر میرے پاس اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے کیا ہے؟ نہ کوئی گواہ نہ ثبوت۔ نہیں شرف الدین۔۔۔ وہ یقین نہیں کریں گے۔ اور یہ۔۔۔ یہ کل رات والا معاملہ۔۔۔ اس میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو مجھے بے گناہ ثابت کر سکے' ہاں میرا مجرم ہونا ضرور ثابت ہو جائے گا۔ ہمیں کسی اور انداز میں سوچنا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ سنہرے بابا ہی میری مدد کا واحد ذریعہ ہیں۔"

"چلو۔ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں اگر ان کے بارے میں کچھ پتا چل گیا تو۔!" اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلاتے ہوئے کہا۔

اب ہم حجرے کے کافی قریب پہنچ گئے تھے۔ سامنے ہی وہ ہوٹل نظر آ رہا تھا جہاں ہر وقت گراموفون بجتا رہتا تھا اور سہگل کے گائے ہوئے گیت گونجتے رہتے تھے۔ اس ہوٹل کے سامنے سے گزر کر ہم سبز گنبد والی مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ عشا کا وقت ہو چکا تھا۔ نمازی صفیں باندھ چکے تھے۔ کچھ لوگ جلدی جلدی مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ میں جماعت کھڑی ہوتے دیکھ کر رک گیا۔

"آؤ شرف الدین! نماز پڑھ لیں۔" میں نے جوتے سیڑھیوں کے ایک طرف اتارتے ہوئے کہا۔ شرف الدین نے بھی جوتے اتارے اور ہم دونوں مسجد میں داخل ہو گئے۔ میں نے اور شرف الدین نے جلدی جلدی وضو کیا اور لپک کر جماعت کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

جماعت میں کھڑے ہو کر مجھے اتنا سرور ملا' ایسا سکون سا دل و دماغ میں محسوس ہوا جو اب سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں تنہا خدا کے حضور میں کھڑا ہوں۔ میرے اردگرد کوئی بھی نہیں ہے۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب کسی نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ شرف الدین تھا۔

"او بھائی۔ نماز ختم ہوئے زمانہ ہو گیا۔ اب تک تو سارے نمازی گھروں میں بستروں پر جا لیٹے ہوں گے' اور تم تھوڑی دیر ہوش میں نہ آتے تو میں بھی جا رہا تھا۔ صبح فجر کی نماز پر یہیں ملاقات کرتا مگر۔ میں نے سوچا کہ ابھی سنہرے بابا کی طرف بھی جانا ہے اور پھر تمہاری اماں کو بھی منہ دکھانا ہے۔"

"اوہ۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ "تم نے اس وقت مجھے جگا کر اچھا نہیں کیا شریف الدین۔"

"ارے تم کیا سو گئے تھے؟" اس نے ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھا۔

"نہیں۔ خیر چھوڑو۔" میں نے اسے ٹال دیا' اب اسے کیا بتاتا۔ ابھی ہم سیڑھیوں تک ہی پہنچے تھے کہ وہی فقیر ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گیا جو مجھے پہلی بار انھی سیڑھیوں پر ملا تھا۔

وہ اچانک میرے سامنے آگیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ناک سکیڑ لی اور بولا۔ "اونہہ۔ بہت بدبو ہے۔ خون کی بدبو۔" اتنا کہہ کر اس نے ناک چٹکی سے پکڑ لی اور بھاگ کر ہم سے دور چلا گیا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ شرف الدین بھی سفید پڑ گیا۔ ہم دونوں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ اسے اتفاق کہہ لیں کہ تمام نمازی جا چکے تھے' جو کچھ لوگ تھے' وہ قضا نماز ادا کر رہے تھے اور کسی کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔ شرف الدین لپک کر اس فقیر کے قریب پہنچ گیا۔ میں وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ میری ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میں بھی اس کے قریب جاؤں۔ میں اس وقت کافی دہشت زدہ تھا۔ شرف الدین کے اس کے پاس جانے پر بھی میں کافی گھبرا گیا تھا۔ وہ عجیب و غریب قسم کا فقیر تھا جسے ہر بات کا پتا ہوتا تھا لیکن وہ کچھ پاگل سا تھا' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بیچ بازار میں میرا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ میرے خیال میں شرف الدین نے ابھی

کے پاس جا کر بے وقوفی کی تھی۔ ہمیں تو چاہیے تھا کہ اس سے منہ چھپا کر گزر جاتے' میری آنکھیں اور کان طرف لگے ہوئے تھے۔ وہ فقیر ایک درخت کی طرف کیے کھڑا تھا۔ شرف الدین غالباً" اسے منانے کی کوشش رہا تھا۔ وہ اب بھی سیدھے ہاتھ سے ناک دبائے ہوئے پھر وہ اسی جانب رخ کیے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس ساتھ ہی شرف الدین بھی بیٹھ گیا۔ میں دم بخود کھڑا تو اچانک شرف الدین نے مجھے اپنے قریب آنے کا ا کیا۔ میں لرزتے قدموں سے ان کے قریب چلا گیا۔

"معافی مانگو بابا سے۔" شریف الدین نے مجھے جھڑک کر کہا۔

"ہیں۔؟" میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں وقار الحسن! میں۔ میں بھی معافی مانگ رہا ہوں میرے دل کے کسی گوشے میں جو بے اعتباری موجود تھی میری کم علمی تھی اور تم۔ تم نے سنہرے بابا کا حکم نہ مان انھیں تکلیف پہنچائی ہے۔ اس میں قصور میرا بھی تھا نے ہی تمہیں مجبور کیا تھا لیکن میں خوش قسمت ہوں مجھے معاف کر چکے ہیں' تم بھی معافی مانگو۔"

پہلے تو مجھے لگا جیسے وہ ڈراما کر رہا ہے مگر اس کی آ میں چمکتی ہوئی پانی کی لکیر' اور اس کے چہرے پر چھائی نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ وہ بدگمانی کی حد تک بے اعتبار تھا اور اب اسے احساس تھا کہ وہ غلطی پر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں او فقیر بابا میں کیا گفتگو ہوئی ہے لیکن میں تو سنہرے بابا کا دل سے قائل تھا اور آج ان کا حکم نہ ماننے افسوس بھی ہو رہا تھا' سو میں نے لپک کر اپنے دونوں فقیر بابا کے سامنے جوڑ دیے۔

"بابا مجھے معاف کر دیں۔ میں سخت عذاب میں میں سنہرے بابا سے ملنے آیا ہوں۔ ان سے معافی ما ہوں۔ بابا جی! میرا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ مجھے قوتوں نے گھیر لیا ہے۔ میں بے بس ہو گیا ہوں با میری مدد کریں' خدا کے لیے۔"

"بس۔" اس کی آواز میں ایسی گرج تھی کہ کانپ اٹھا۔ "نادان ہے تو۔ بڑا نادان ہے۔ خدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سنہرے بابا کو حکم دیا تھا کہ کرو مگر کتنا بدقسمت ہے کہ تو نے ٹھکرا دی غیبی مدد کو

تجھے آخرت کا کچھ احساس نہیں۔ تجھے دولت سے پیار ہے' دنیا داری سے پیار ہے' اور۔ اور عورت سے پیار ہے مگر خود سے پیار نہیں۔ تو کیسا مسلمان ہے جو شیطان کا آلہ کار بن گیا۔ وہ بڑا شیطان ہے' وہ تجھ پر قابو پانا چاہتا ہے۔ تیری مخفی قوتوں کو ہتھیانا چاہتا ہے۔ تو طاقت ور ہے' بہت طاقت ور ہے اور یہی بات وہ جان گیا ہے۔ اس کے نیر اسے بتا دیتے ہیں۔ تو جب یہاں آیا تھا' جب یہاں کی ہوا کا پہلا جھونکا تجھے چھو کر گزرا تھا تبھی اسے سب کچھ پتا چل گیا تھا۔" وہ بولے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی اور میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"بابا! یہ شرمندہ ہے۔ اسے معاف کر دیں۔ اسے اس شیطان سے بچا لیں۔ بچا لیں بابا۔" شرف الدین نے ان کے ننگے گھٹنوں کو چھوا۔ ان کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ پاجامہ نام کی چند دھجیاں تھیں جو ان کی پتلی پتلی ٹانگوں پر جھول رہی تھیں۔ ان کے بدن پر کرتا تھا' ململ کا باریک کرتا جس پر انھوں نے ایک بہت پرانی سی' جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔

وہ شرف الدین کو گھور رہے تھے۔ شرف الدین گڑگڑایا۔ "بابا۔ یہ سنہرے بابا سے معافی مانگنے آیا ہے۔ ان سے مدد مانگنے آیا ہے۔"

تبھی انھوں نے درخت کی جڑ میں رکھے ہوئے کچھ پتھروں کو ہٹایا۔ میں وہاں بادام رکھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ پتھروں کے نیچے مٹھی بھر بادام رکھے تھے۔ انھوں نے سات بادام چنے اور میری طرف بڑھا دیے۔ "لے یہ کھا لے۔" انھوں نے بادام میری طرف بڑھا دیے۔

میں نے جلدی سے بادام مٹھی میں لے لیے۔

"جا۔ چلا جا۔ اٹھ۔ چلا جا۔" وہ ایک دم کھڑے ہو کر چیخنے لگے۔ میں اور شرف الدین گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"جا۔" اس بار وہ اتنی زور سے چیخے کہ میں اور شرف الدین سہم کر پلٹ گئے۔ ان کے چیخنے پر بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ہمیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں جلدی سے نگاہیں چرا کر آگے بڑھ گیا۔ میرے پیچھے ہی شرف الدین بھی تھا۔ ہم اتنی تیزی سے آگے بڑھے کہ چند ہی لمحوں میں مسجد دور رہ گئی۔

"ارے۔" شرف الدین ٹھٹک کر رک گیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"ہم تو سنہرے بابا سے ملنے آئے تھے۔" اس نے ... دیکھا۔ میری نگاہوں نے بھی اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ فقیر بابا کہیں نہیں تھا۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر میری بھی ہمت ہوئی۔

"ہاں۔ چلو واپس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں اس بار محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہمیں ان کے ملنے کا یقین نہیں تھا مگر ایک مبہم سی امید تھی۔ دیکھنے میں کیا حرج تھا سو ہم آگے بڑھتے رہے۔ مسجد عبور کر کے ہم جونہی حجرے کی طرف بڑھے' وہی فقیر اچانک جانے کہاں سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ میں اور شرف الدین یوں ٹھٹک کر رک گئے جیسے انھوں نے ہمیں چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ وہ خاموش کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شرف الدین نے ہی ہمت کی اور بولا۔

"بابا ہم سنہرے بابا سے ملنے جا رہے تھے۔"

"وہ نہیں ہیں۔ چلا جا۔ تجھے بادام دیے ہیں نا۔ تو کھا لینا اسے۔ آج ہی' ابھی ورنہ پھر ادھر نہ آنا۔ سمجھا؟" آخری جملہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا' گویا بادام مجھے کھانا تھے۔ یہ سن کر میں تو فوراً ہی پلٹ گیا اور یہ دیکھے بغیر کہ شرف الدین میرے پیچھے آیا یا نہیں' تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ سڑک عبور کر گیا۔ میں فقیر بابا سے اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ شرف الدین کے انتظار میں بھی نہ رکا۔

"او بھائی۔ او میاں۔" شرف الدین کی آواز سن کر میں نے رکے بغیر پلٹ کر دیکھا' وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ فقیر بابا کہیں دکھائی نہ دیے تو میں ٹھہر گیا' بادام میری مٹھی میں دبے ہوئے تھے اور میرا ہاتھ بھیج گیا تھا۔ میں نے انھیں جیب میں ڈال لیا۔

"یار بڑے ڈرپوک ہو۔" اس نے پھولی ہوئی سانس کے دوران کہا۔

"اور تم بہت بہادر ہو! تمہارے چہرے کا رنگ دیکھا تھا میں نے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"ویسے یار' عجیب بات ہے' مشہور تو سنہرے بابا ہیں اور مجھے دہشت انھیں دیکھ کر ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ یہ بھی سب کچھ جانتے ہیں۔"

"ہاں! اور اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہاری باتوں میں آکر سنہرے بابا کے حکم سے سرتابی کیوں کی۔"

"اس میں تمہارے تایا اور اماں کا بھی ہاتھ ہے' یہ تم بھول گئے کیا؟"

ہم دونوں اب اس ہوٹل کو بھی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ جہاں ہر وقت گراموفون پر سہگل' ثریا اور کانن بالا کے گانے بجتے رہتے تھے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"کیا کہوں! میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔ اب تو بادام کھا کر سو جاؤں گا۔ اللہ مالک ہے مگر شرف الدین! سنہرے بابا سے ملنا تو اب ناممکن ہی لگ رہا ہے۔ اب تو ان باداموں پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔"

"یہ ضرور پڑھے ہوئے بادام ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہوں گے۔ ممکن ہے اس شیطان سے نجات ہی مل جائے۔ ویسے بائی دا وے' تمہارے چچا کب آرہے ہیں؟"

"شاید کل پرسوں تک آجائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ان کے آنے سے پہلے ہی نئے مکان میں منتقل ہو جاتے تو اچھا تھا۔"

"یہ ممکن نہیں ہے' اور ہاں۔ اماں امروہہ جانا چاہتی ہیں۔ وہاں سے سامان لانا ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں بھی چلوں گا' ابا کو قرار آجائے گا کیونکہ امروہہ پہنچتے ہی انھیں پتا چل جائے گا کہ تم وہاں نہیں ہو اور بس انھیں تو پنکھے لگ جائیں گے۔ میں ان سے مل کر پھر تم لوگوں کے ساتھ چلا آؤں گا۔"

"لیکن شرف الدین! وہ اس مکان کو چھوڑتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے' اگر پیچھے کچھ ہو گیا تو؟"

"کچھ نہیں ہوتا یار! اور جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ کون سا رک جاتا ہے۔ ہم ہوں یا نہ ہوں' جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔ میں بھی سوچنے لگا کہ میرے پریشان ہونے سے آنے والی آفت ٹل تو نہیں جائے گی پھر پریشان ہونے سے فائدہ؟

اب ہم گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ تایا گھر سے باہر کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ شرف الدین کو میرے ساتھ دیکھ کر کھل اٹھے۔ "آؤ بھئی آؤ۔ تم نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔"

"خیریت تایا! کیا ہوا؟"

"ارے بھئی ہونا کیا تھا! کچھ دیر پہلے ایک سسرالی رشتے دار آئے تھے۔ ان سے اطلاع ملی کہ تمہاری تائی آرہی ہیں۔ بس' جی گھبرانے لگا۔ سوچا ذرا ٹہل لوں تو دل ٹھہر جائے' باہر نکلا تو سوچا اس طرف کو چہل قدمی شروع کر دوں پھر خیال آیا کہ یہی راستہ تو اسٹیشن سے گھر کی طرف آتا ہے۔ راستے ہی میں مٹھ بھیڑ ہو گئی تو کیا ہو گا؟ پھر سوچا دوسری طرف کو چل پڑوں۔ بس یہی سوچ رہا تھا مگر اب تم لوگ آگئے ہو تو اختلاج ہونے کا خدشہ کم ہو گیا ہے۔ آؤ اندر چلے آؤ۔" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

شرف الدین تایا کے پلنگ کے پاس پڑے مونڈھے پر جا بیٹھا' میں اماں والے کمرے میں چلا آیا۔ اماں ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے سر ہلا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ ان کی کھوجتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا پھر کمرے میں واپس چلا آیا۔ اب اماں فارغ تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے انھیں بتایا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ پھر میں نے بادام نکال کر دکھائے۔

"کھاؤ۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

میں نے بادام نکال کر کھانا شروع کر دیے۔ اماں کھانے کا انتظام کرنے باہر چلی گئیں۔ میں تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کیوں میں بادام کھاتے ہی خود کو بہت چاق و چوبند اور صحت مند محسوس کر رہا تھا۔ ایک حوصلہ سا پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اب واقعی وہ شیطان میرے قریب پھٹکنے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے' یہ ابھی تک میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ فقیر بابا نے تو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ میں سنہرے بابا سے بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر اب تو یہ امکان بھی نہیں تھا کہ اس سلسلے میں جلد ہی کچھ معلوم ہو سکے گا' یوں تو اس سادھو نے بھی مجھے بلایا تھا مگر شرف الدین نے اس سے ملنے کو منع کیا تھا۔ شرف الدین کا وہ بیان بھی بعید از قیاس نہیں تھا جو اس نے چچا کے بارے میں دیا تھا۔ اصولاً مجھے ہر پہلو' ہر امکان پر غور کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اس سلسلے میں اماں سے بات کروں مگر مسئلہ یہ تھا کہ ان سے یہ کہنا ہی ممکن نہ تھا کہ وہ سادھو مجھ سے کیا کہوا چکا ہے اور جب تک یہ نہ بتایا جاتا' وہ معاملے کی سنگینی کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھیں' گویا اس سلسلے میں کم از کم اماں سے مشورہ لینا بیکار ہی تھا۔ اب تو اس معاملے کو مجھے تنہا ہی دیکھنا تھا۔ یہ بھی بڑی بات تھی کہ شرف الدین اور خورشید چاچا میرا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ اگر یہ دونوں ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں پھٹ پڑتا' ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا دیتا کہ میں قاتل ہوں اور پھر جو کچھ ہوتا اس کا اندازہ تو آپ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ معاملہ کنارے لگتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ اپنی امروہہ والی حویلی کے بعد اب میں جس مکان میں منتقل ہونے والا تھا' اس میں بھی حویلی ہی کی طرح ایک شخص کی لاش دبی ہوئی تھی۔ کیا پتا اس نوجوان کی بھی کوئی محبوبہ ہو' وہ بھی اس کے غم میں خودکشی کر لے اور پھر میری آل اولاد کے ساتھ بھی یہی چکر شروع ہو جائے جو میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اب سے پہلے یہ خیال مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ اب میں جوں جوں اس بارے میں سوچ رہا تھا' ویسے ویسے گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ مرزا صولت بیگ کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہو سکتا تھا! کیا پتا کچھ ایسا چکر ان کے ساتھ بھی چلا ہو۔ کیا خبر وہ بھی میری طرح بے قصور ہوں اور پھر۔ رمضو چاچا۔ شرف الدین۔ اف' دونوں کا کردار میرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگا۔ کیا رمضو چاچا نے ایسے ہی مرزا صولت بیگ کی مدد کی تھی؟ کیا وہ بھی خورشید چاچا کی طرح بے وجہ ہی اس معاملے میں ملوث ہو چکے تھے۔ کیا انھیں اسی پاداش میں قتل کیا گیا تھا؟ ہزاروں سوالوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔

"نہیں وقار الحسن!" ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ "مرزا صولت بیگ تمہاری طرح بے قصور نہیں تھے۔ کسی شیطان صفت سادھو کے آلۂ کار نہیں تھے' انھیں ان کی عیاشی کی پاداش میں سزا دی گئی تھی۔ وہ عیاش نواب زادے تھے۔ انھوں نے شکنتلا کو۔ پھر عصمت جہاں کو۔"

میرا سر بری طرح چکرا گیا۔ میں تو ان چکروں میں الجھ کر پوری دنیا سے کٹ چکا تھا پھر بھی گتھی سلجھنے کی بجائے الجھتی ہی جا رہی تھی۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا کہ پھوپی نے مجھے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ تایا اور شرف الدین ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ اماں ہمارے ساتھ ہی کھانا کھانے بیٹھ گئیں۔ شرف الدین میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ وہ شاید سمجھ گیا کہ میں اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اماں البتہ بار بار مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ تایا اماں کے یہاں کھانا کھانے پر کافی جزبز تھے' بقول ان کے اماں حسِ مزاح سے عاری تھیں۔

"دلھن! بچیاں تنہا کھانا کھاتے ہوئے ڈرتی ہوں گی؟"

"نہیں تو۔ اس میں بھلا ڈرنے کی کیا بات ہے!" وہ کب چوکنے والی تھیں۔ جانتی تھیں کہ تایا کیا چاہتے ہیں۔ اماں کا خیال تھا کہ تایا بچوں کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے لحاظ نہیں کرتے۔

"میں نے سوچا شاید ڈرتی ہوں۔ خیر ہم تو نہیں ڈرتے۔" انھوں نے یہ کہہ کر نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ اماں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں اور شرف الدین چپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔

"تمہارے اماں باوا چلے گئے امروہہ؟" تایا نے سر اٹھا کر شرف الدین سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے مختصر سا جواب دے کر سر جھکا لیا۔ اماں کے سامنے اس کی وہی حالت ہوتی تھی جو میری اس کے ابا کے سامنے ہوتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا کہ تمہاری اماں بڑی دبنگ خاتون دکھائی دیتی ہیں' آدمی خواہ مخواہ مرعوب ہو جاتا ہے' لیکن اس کے ابا کے سلسلے میں میرا خیال ذرا مختلف تھا۔ وہ دبنگ نظر آنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں ان کے نتھنے ہمیشہ پھولے رہتے تھے' لگتا تھا جیسے انگارے چبا رہے ہوں۔ غصہ ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا کا ہر آدمی غلط ہے' آوارہ اور بد قماش ہے' ان کا بس چلتا تو وہ شرف الدین کو لے کر کسی جنگل میں جا بستے یا کسی تہ خانے میں قید کر دیتے۔ گو شرف الدین ان سے زیادہ مرعوب نہیں ہوتا تھا پھر بھی ان کے آگے کچھ بولنے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ غالباً وہ تایا سے اس لیے اتنا خوش رہتا تھا کہ وہ بزرگ ہونے کے باوجود بے جا رعب نہیں جھاڑتے تھے' بلا تکلف گفتگو کرتے تھے' غور سے سنتے تھے اور باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

کھانا خاموشی سے کھا لیا گیا۔ اماں جونہی برتن لے کر اٹھیں' تایا نے گہری سانس لے کر ہم دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ شرف الدین کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔

"سوچا تھا کہ یہ آخری آزاد کھانا ہو گا' خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ خوب باتیں کریں گے مگر... اللہ کی شان۔"

"آزاد کھانا؟ کیا مطلب؟" شرف الدین نے انھیں چھیڑنے کے لیے کہا۔

"اور کیا۔ اب کل سے دیکھنا' دسترخوان پر ایسے ایسے منہ ہوں گے کہ گڑ بھی کونین لگے گا۔ ویسے یہاں ایک بات ہے' مزہ اسی وقت آتا ہے کھانے کا جب کریلا' تریاں لگنے لگے اور تریاں کریلا۔" یہ کہہ کر تایا اٹھے اور کچے آنگن میں رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھو کر واپس آ گئے۔

"تایا! اتنے دنوں بعد تائی آئیں گی اور آپ ان کے بارے میں ایسا سوچ رہے ہیں۔" شرف الدین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کتنے دن میں؟" انھوں نے بھنویں اچکا کر کہا۔ "بھئی ہمیں تو ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔ دراصل اب تک ہم نے زیادہ لمبی جدائی تو نہیں کاٹی ہے' بس یہی کوئی دو چار روز ہی مشکل سے گزر پائے ہیں اور وہی دن اتنے سرور انگیز تھے' بھئی میرا مطلب ہے کہ جدائی کا بھی تو اپنا مزہ ہوتا ہے نا' اب آدمی جدا ہو کر جدائی کا مزہ بھی نہ لے پائے کہ پھر ملن کی گھڑی آ پہنچے تو۔ سوچو کیسا بیزار ہوتا ہو گا آدمی۔" وہ خلال سے دانتوں کو کریدنے لگے۔ میں اور شرف الدین بے ساختہ ہنس پڑے۔

اس لمحے اماں آ گئیں۔ ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ میں نے لپک کر ٹرے ان کے ہاتھ سے لے لی۔ "مجھے کہہ دیتیں اماں! میں لے آتا۔" میں نے کہا۔

"ہاں دلھن! اتنے فرمانبردار بیٹے کے ہوتے ہوئے تم زحمت نہ کیا کرو۔ آواز دے لیا کرو۔"

"بھائی صاحب! دیر بہت ہو گئی ہے۔ بس چائے پی کر سو جائیں۔ ایک تو آپ آرام بالکل نہیں کرتے۔ اس عمر میں جس قدر ضرورت آرام کی ہوتی ہے اور کسی چیز کی نہیں ہوتی۔" اماں برداشت نہ کر سکیں۔

"دیکھو دلھن! ہماری عمر کو کچھ مت کہنا۔ اس معاملے میں ہم بہت جذباتی ہیں اور رہی آرام والی بات' بس آج کے آج آرام اور کر لیں پھر تو حکیم صاحب سے سونے کی دوا لے آئیں گے' پھر ہم ہوں گے اور بستر ہو گا۔"

وہ کچھ بولیں نہیں پلٹ گئیں مگر میں ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ چکا تھا۔

"لیجیے صاحب!" تایا شرف الدین کی طرف پلٹے۔ "وہ ان کو دروغہ بنا گئی ہیں۔"

"تایا! یہ چچا کس قسم کے آدمی ہیں؟" اچانک شرف الدین نے سوال کیا۔ میں فق ہو گیا۔

"اپنی قسم کے ایک ہی ہیں۔" انھوں نے برجستہ جواب دیا۔

شرف الدین زور سے ہنس پڑا۔ "ہاں وہ تو ہے۔"

اس وقت میں نے اسے کہنی ماری۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے خدشے کا اظہار تایا سے کرے مگر اس نے میرے اشارے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بچپن ہی سے ان کا مزاج دیکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سنجیدگی سے ان کے مزاج اور کردار کے بارے میں بتائیے۔"

"میاں! یہ اچانک بیٹھے بیٹھے تمھیں ان کے مزاج اور کردار میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی؟" انھوں نے شرف الدین کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ میں شرف الدین کی اس عادت سے بہت نالاں تھا کہ اس کی ذہنی رو کسی بھی وقت اچانک بھٹک جاتی تھی اور وہ ایسی باتیں کرنے لگتا تھا جن کا اظہار مشکلات بھی پیدا کر سکتا تھا۔

"تایا! اگر آپ اس موضوع پر سنجیدگی سے بات کریں گے تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا کہ میری اس دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟" شرف الدین کافی سنجیدہ تھا۔ میرا تو جی چاہا کہ اٹھ کر چلا جاؤں۔ مجھے شرف الدین پر بے پناہ غصہ تھا۔

"ہوں!" انھوں نے ایک لمبا ہنکارا بھرا کچھ دیر وہ مجھے اور شرف الدین کو دیکھتے رہے۔ "اس کے مزاج میں کچھ بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں' پہلے وہ ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے' مگر مزاجاً وہ بچپن ہی سے ہم باقی بھائیوں سے الگ تھا۔ کچھ مطلبی' خود غرض اور انتہا پسند قسم کا آدمی تھا۔" وہ لمحہ بھر کو چپ ہو کر کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ "پھر اللہ نے دو ہنسوں کا جوڑا ملا دیا تو گویا کریلا نیم چڑھ گیا۔ شادی کے بعد تو وہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ مجھے اس کے طور طریقے تو [illegible] ناپسند تھے۔ وہ اپنے جاہل سسرال سے کافی مرعوب ہیں اور

سسرال والے ان سے۔ پتا نہیں اندھوں میں راجہ کون ہے؟" وہ پھر چپ ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ "تمھاری تشفی ہو گئی یا نہیں؟" انھوں نے شرف الدین سے پوچھا۔

"یہ بتائیے کیا چچا دولت سے بہت پیار کرتے ہیں؟" شرف الدین نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال کر دیا۔

"ہوں۔" وہ کچھ سوچنے لگے۔ "میرا خیال ہے کہ اس کے نزدیک دنیا کی اہم ترین چیز دولت ہے' ہمارے خاندان میں اب وہ نوابی تو نہیں رہی مگر ان کے مزاج میں وہی کروفر ہے۔ وہ اب بھی مجروں' کبوتر بازیوں پر جان دیتے ہیں۔ ایک دن تو میں نے انھیں مرغے لڑاتے بھی دیکھا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ دولت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں!"

"ہاں! جو ان کے بس میں ہو گا وہ ضرور کر گزریں گے۔" انھوں نے جواب دیا پھر بولے۔ "میاں تم اگر بات ذرا کھل کر کر سکو تو میرے لیے کافی آسانی ہو جائے گی۔"

میرا تو دم ہی نکل گیا۔ میں فوراً اٹھ گیا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ شرف الدین! تم جاؤ گے یا ٹھہرو گے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"اماں باوا تو چلے گئے۔ یہ خورشید چچا کے پاس بیٹھک میں سو جائیں گے۔ تم بھی اپنا بستر وہیں ڈال لو۔" تایا نے کہا۔ میری نگاہیں شرف الدین پر جمی ہوئی تھیں۔ جونہی اس کی نگاہ میری جانب اٹھی' میں نے اسے گھور دیا۔ اس نے شاید میرے چہرے ہی سے میرے غصے کا اندازہ لگا لیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں تایا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ دراصل میں ان پر ریسرچ کر رہا ہوں' اس لیے پوچھ رہا تھا۔"

"کیوں! کیا ایٹم بم بنانے کا پروگرام ہے؟" وہ مسکرائے۔

میں اور شرف الدین ہنس پڑے۔

"بھئی ہے کام کی چیز' اگر ایٹم بم بن جائے تو آدھی سے زیادہ دنیا تہس نہس ہو سکتی ہے۔ ویسے اگر تم ان کی زوجہ کو بھی ان میں ملا کر ریسرچ کرو تو پوری دنیا کی تباہی کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔"

ہم دونوں زور سے ہنس پڑے۔ اماں تک ہماری آواز پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے مجھے آواز دی۔

"تو میاں۔ ہمارے یہاں تو تمھیں ہر چیز 'ردی' ملے گی۔ کچھ نہ بنے تو پٹاخوں میں ہی کام آ جائیں۔" وہ تکیے کو درست کرتے ہوئے بولے۔ میں جلدی سے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جی اماں!"

"بس وقار الحسن! جا کر سو۔" اماں نے گھور کر دیکھا۔

"جی اماں' بس جا رہا ہوں۔" میں جلدی سے نکل آیا۔ ورنہ اماں ابھی اور کچھ سناتیں۔

تایا لیٹ چکے تھے۔ شرف الدین ان کے قریب کھڑا تھا۔ خورشید چچا اب تک نظر نہیں آئے تھے۔ میں نے تایا سے ان کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ جلدی آنے کا کہہ کر گئے تھے مگر ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

یہ سن کر میں اور شرف الدین تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ اس وقت ان کی غیر موجودگی ہمارے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ ہم نے سنہرے بابا کے پاس جاتے ہوئے راستے میں ان سے کہا تھا کہ وہ جا کر آرام کریں'

مگر پھر... پھر وہ کہاں چلے گئے؟ یہ سوال میرے دماغ میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں دل ہی دل میں خدا سے خیر کی دعا مانگنے لگا۔ میں اور شرف الدین بیٹھک میں چلے آئے۔ اماں ہم دونوں کا بستر لگا چکی تھیں۔ خورشید چچا دیوان پر سوتے تھے۔ رات کے تقریباً دس بج چکے تھے گویا کافی رات ہو چکی تھی' انھیں اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔

"شرف الدین۔ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔" میرا خوف الفاظ بن کر زبان پر آ گیا۔

"تم پریشان مت ہو' انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا۔" وہ تکیے کو بغل میں لے کر' ترچھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اب سے پہلے مجھے واقعی نیند آ رہی تھی مگر خورشید چچا کی غیر موجودگی کا سنتے ہی نیند اچٹ گئی۔ میں بھی بستر پر لیٹ گیا۔ اسی وقت مجھے شرف الدین کی باتوں کا خیال آ گیا اور میں اٹھ بیٹھا۔ "یہ تم تایا سے کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"کیسی باتیں؟" وہ انجان بن گیا۔

"چچا کے بارے میں جو باتیں کر رہے تھے' مقصد کیا تھا تمھارا؟"

"اچھا وہ۔ وہ تو ایسے ہی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ مجھے جنرل نالج سے کتنی دلچسپی ہے' ویسے یار تایا کی بات بھی ٹھیک ہے' اگر چچا اور چچی پر ریسرچ کی جائے تو ہم دنیا کو انگشت بدنداں کرسکتے ہیں۔"

"اچھا بکواس مت کرو اور کان کھول کر سن لو کہ تم نے اگر وہ والی بات کی تو۔ تو میں صاف مکر جاؤں گا۔ سمجھے!"

"سمجھ گیا۔" وہ سرہلا کر بولا۔ "لیکن یار یہ خورشید چاچا کہاں رہ گئے؟"

اس نے پھر مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں خورشید چاچا کے بارے میں سوچنے لگا۔

"ارے ہاں۔ وہ تم نے بادام کھالیے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"بڑے کنجوس ہو' اکیلے اکیلے کھالیے۔ دو چار مجھے بھی دے دیتے۔"

"انھوں نے سات بادام گن کر دیے تھے اور مجھ سے کہا تھا کہ کھالینا۔ جو کام میں کرچکا ہوں وہ اگر تم نے کیا ہوتا تو بادام تمہیں ملتے۔" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جس شخص نے صرف ایک دن پہلے کی رات اتنی خوفناک گزاری ہو' جس نے نادانستگی میں ایک قتل کردیا ہو وہ اس قدر پرسکون کیسے ہو سکتا ہے کہ ہنس بھی رہا ہے اور باتیں بھی کر رہا ہے' اسے کوئی خوف نہیں' وہ بالکل نارمل ہے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ میں خوفزدہ تھا' میری کیفیت وہ نہیں تھی جو ایک نارمل انسان کی ہوتی ہے مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں دو کشتیوں کا سوار تھا۔ مجھے لامحالہ خود پر قابو پائے رکھنا تھا جس میں' میں کسی حد تک کامیاب بھی تھا۔ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی کیفیت بتانے بیٹھ گیا تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں گے' یہاں تو واقعات لکھنا مقصود ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ خورشید چاچا کی غیر موجودگی نے میرا دماغ سن کردیا تھا۔ اتنی رات کو بلا جواز باہر رہنا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ نیند اڑ چکی تھی بلکہ اب تو اختلاج سا ہونے لگا تھا۔

باہر گہرے سناٹے میں کبھی کبھی تایا کے حقے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تو میں اور شرف الدین دونوں یہ سوچ کر چونک پڑتے تھے کہ شاید یہ ان کے آنے کی آہٹ ہے۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا جارہا تھا۔ میں اور شرف الدین دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے کان باہر کی آہٹ پر لگے تھے۔ اسی وقت پہلے کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی' پھر چند ہی لمحوں بعد دروازے کا کنڈا بجا۔ میں اور شرف الدین دونوں اچھل کر دروازے کی طرف لپکے۔ ادھر تایا بھی اٹھ چکے تھے۔

"تم لوگ تائی کا اتنی شدت سے انتظار کر رہے ہو؟" وہ ہمیں دیکھ کر پھر لیٹ گئے۔

"نہیں تایا۔" شرف الدین وہیں رک گیا۔ "ہم تو خورشید چاچا کے لیے پریشان تھے۔ انھوں نے بہت دیر کر دی اور ہاں۔ تائی اتنی رات کو کیسے آسکتی ہیں' اس وقت تو کوئی ٹرین نہیں آتی۔"

"ضروری نہیں کہ قیامت کسی ٹرین ہی سے آئے۔" انھوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ اتنی دیر میں' میں دروازہ کھول چکا تھا۔ سامنے خورشید چاچا کھڑے تھے مگر ایسی حالت میں کہ میں چونک اٹھا۔

ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ چہرے پر بلا کی وحشت تھی اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی سے انھیں راستہ دیا۔ یہاں ان سے کچھ پوچھنا غلط تھا کیونکہ تایا زیادہ دور نہیں تھے پھر ان کی توجہ بھی اسی جانب تھی۔ خورشید چاچا خاموشی سے بیٹھک کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تایا کے پاس سے گزرے تو تایا حسب عادت بول اٹھے۔

"خورشید چاچا! تیراکی کا شوق اس عمر میں جان لیوا ہو سکتا ہے۔ سانس کسی بھی وقت اکھڑ سکتا ہے۔"

خورشید چاچا نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے بیٹھک میں داخل ہوگئے۔ میں اور شرف الدین بھی اس وقت تایا کے جملے سے محفوظ ہونے والی پوزیشن میں نہیں تھے۔ خورشید چاچا کی حالت نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ شرف الدین بھی ان کی حالت دیکھ کر حیران تھا۔ ہم دونوں ان کے پیچھے بیٹھک میں داخل ہوگئے تبھی تایا کی آواز سنائی دی۔ "بھئی کھانا کھلا دینا انھیں۔"

مگر ہمیں اتنا ہوش کہاں تھا کہ ہم کھانے کے بارے میں پوچھتے۔ اندر داخل ہوتے ہی شرف الدین نے دروازہ بند کردیا۔ میں نے دیکھا کہ خورشید چاچا دیوان پر بکھرے ہوئے سے پڑے تھے۔

"خورشید چاچا! آپ کہاں چلے گئے تھے؟" میں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

انھوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری مگر کچھ بول نہیں سکے بلکہ ہاتھ کے اشارے سے صبر کرنے کو کہا۔ میں نے شرف الدین سے کہا کہ وہ پانی لے آئے۔ شرف الدین سرہلا کر باہر چلا گیا۔ میں خورشید چاچا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ان کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا' لگتا تھا جیسے وہ کہیں بہت دور سے بھاگتے ہوئے آئے ہوں۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا خورشید چاچا؟" میں نے اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا۔

انھوں نے پلکیں جھپک کر مجھے اطمینان دلایا پھر بولے۔ "ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔" وہ بہ مشکل یہ جملہ ادا کرپائے تھے۔

اتنی دیر میں شرف الدین پانی کا کٹورا لے آیا۔ انھوں نے ایک ہی گھونٹ میں پانی پی لیا پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ "جو کچھ میں دیکھ آیا ہوں وہ اگر تم لوگ دیکھ لیتے تو۔"

"کک۔ کیا ہوا؟" میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"تم لوگ جب چلے گئے تو۔ میری نگاہ سڑک پر پڑی۔ اسی مکان کی چابیاں نیچے سڑک پر گری ہوئی تھیں۔"

"کون سے مکان کی؟" میں بول اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ اپنی جیب پر پڑا۔ جیب خالی تھی۔

"یہ لو۔" یہ کہہ کر خورشید چاچا نے چابیاں اپنی جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ میں نے جھپٹ کر چابیاں لے لیں۔

"اوہ۔ شکر ہے' مگر۔ آپ کہاں رہ گئے تھے؟" شرف الدین بول اٹھا۔

"وہی بتا رہا ہوں۔" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "چابیوں پر نگاہ پڑتے ہی میں انھیں اٹھانے کو جھکا اور اسی دوران میں' میں نے سر اٹھا کر تم لوگوں کو روکنا چاہا بس میاں چوک ہوگئی' ایک کالا بڑا سا کتا اچانک وہ چابیاں لے کر بھاگ پڑا۔ پتا نہیں وہ کتا کہاں سے آگیا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئے تو میں اور شرف الدین انھیں حیرت سے دیکھنے لگے' مجھے لگا جیسے وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہیں' پھر بھی میں کچھ اور ان کے قریب سرک آیا۔ شرف الدین بھی فرش سے اٹھ کر دیوان پر آبیٹھا۔

"پھر۔؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"پھر میں اس کے پیچھے بھاگا اور جانتے ہو کتا کہاں گیا؟" انھوں نے چپ ہو کر میرے اور شرف الدین کی طرف دیکھا۔

میرا جی چاہا کہ چیخ پڑوں اور کہوں کہ زیادہ سسپنس پیدا نہ کریں مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ خود ہی بول اٹھے۔ "اسے میں نے اسی گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ جہاں وہ مکان ہے میں بوڑھا آدمی' ان سے پیچھے رہ گیا مگر اتنا میں جان چکا تھا کہ وہ اسی کوٹھی کی طرف گئے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی کے سدھائے ہوئے کتے ہیں بہرحال جب میں کوٹھی کے قریب پہنچا تو کوٹھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ اس چھوٹے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے جس میں ہم نے رحیمو کی لاش۔"

میں نے جھپٹ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آہستہ چاچا۔ آہستہ۔"

انھیں فوراً ہی احساس ہوگیا کہ ان کی آواز کچھ بلند تھی۔ میں نے ہاتھ ہٹایا تو وہ آہستہ سے بولے۔ "اچھا اچھا۔ ہاں تو وہ کمرا کھلا ہوا تھا۔ اندر سے عجیب عجیب سی آوازیں آرہی تھیں جیسے کچھ کھرچا جارہا ہو۔ میں نے باہر پڑا بیلچا اٹھایا اور کمرے میں گھس گیا۔ وقار میاں! وہاں کا سین دیکھ کر تو میں۔ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ وہ۔ وہاں چار خونخوار کتے تھے۔ کالے کالے' گدھوں جتنے اوہ۔ اور ان کی آنکھیں۔ اف۔ وہ انگاروں جیسی آنکھیں تھیں۔ ان چاروں نے جونہی مجھے اندر داخل ہوتے دیکھا' وہ سب میری طرف جھپٹے۔ میں نے بیلچے سے ان پر حملہ کردیا۔ مگر۔ میں کچھ بھی نہ کرسکا' ایک آدھ بیلچا ان پر پڑا ضرور مگر۔ میں اکیلا تھا اوہ۔ بس مجھے نہیں پتا کہ کیا ہوا۔ میں ان چاروں کے درمیان میں گھر گیا' انھوں نے ایک ساتھ ہی مجھ پر حملہ کیا اور بیلچا میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ میاں بس سمجھو کہ آخری وقت تھا۔ میں نے تو کلمہ پڑھ لیا تھا۔ میں فرش پر گر چکا تھا۔ وہاں جہاں رحیمو کو دفن کیا گیا تھا۔ وہ حصہ ادھڑا ہوا تھا۔ ان کتوں نے اسے کھودنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا تھا تو وہ چاروں اسی جگہ سے فرش کو کھود رہے تھے' ان کے جبڑوں سے رال بہہ رہی تھی۔ غراہٹ کی آواز بہت خوفناک تھی۔ بس کیا بتاؤں' مجھے تو یقین ہوگیا تھا کہ اب یہ کتے میری اور رحیمو کی لاش ہی ادھیڑ ڈالیں گے۔ ہاں تو۔ میں نے بتایا تھا ناں کہ انھوں نے مجھ پر حملہ کردیا' میں فرش پر گر پڑا۔ وہ چاروں میری طرف جھپٹے' اور عین اسی لمحے

روشن دان سے میں نے ایک سفید براق بلی کو کمرے میں چھلانگ لگاتے دیکھا' پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ اتنا یاد ہے کہ میرا بازو۔ نہیں یہ کلائی۔ ہاں یہ کلائی ایک کتے کے منہ میں تھی اور پھر بس۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ یہ۔ یہ دیکھو۔" اتنا کہہ کر انھوں نے آستین الٹ دی مگر ان کی کلائی پر خراش تک نہ تھی۔ انھوں نے ہونقوں کی طرح پہلے کلائی کو پھر مجھے اور شرف الدین کو دیکھا۔

"ارے۔ ہاں۔ یہ کلائی اس نے جکڑ لی تھی۔" انھوں نے پر زور انداز میں کہا۔

میں نے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ شک کے سائے اس کی آنکھوں میں بھی لہرا رہے تھے۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں وقار!" وہ شاید ہمارے چہروں پر چھائی بے یقینی کو دیکھ چکے تھے۔ "خدا کی قسم میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" ان کی آواز تیز ہوئی تو میں اور شرف الدین دونوں ہی چونک اٹھے۔

"ہاں خورشید چاچا! مجھے یقین ہے۔" میں نے پر یقین انداز سے کہا۔ "جو کچھ اس روز میرے ساتھ ہوا' اگر آپ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے' نہ دیکھا ہوتا تو آپ بھی لحہ بھر کو یقین نہ کرتے' مگر اب تو ساری بے سروپا باتیں یقین کی حد میں داخل ہو چکی ہیں۔ آپ بتائیے پھر کیا ہوا؟" میں نے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ شک اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکا تھا۔

"پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ کیا ہوا تھا۔ اب سے کچھ دیر پہلے مجھے ہوش آیا۔ میں وہیں فرش پر پڑا تھا۔ چابیاں میرے قریب پڑی ہوئی تھیں' وہ ادھڑا ہوا فرش بھی برابر تھا وقار میاں اور۔ اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے۔ بہت خوف محسوس ہوا۔ میں۔ میں زندگی میں پہلی بار ڈرا ہوں۔ میں وہاں جنگل میں اکیلا رہتا ہوں مگر کبھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ لیکن۔ لیکن آج میری حالت بہت خراب تھی۔ پتا نہیں میں کس طرح وہ کمرا اور کوٹھی بند کر کے' تالا ڈال کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ سارے راستے یوں لگتا رہا جیسے وہ کتے میرا پیچھا کر رہے ہوں اور کسی بھی وقت وہ سب مجھ پر حملہ کر دیں گے' مجھے دبوچ لیں گے' میاں وہ۔ وہ کوٹھی تو بہت خطرناک ہو چکی ہے۔ میری مانو تو وہاں منتقل ہونے کا خیال ذہن سے نکال دو۔ اسے بیچ دو۔"

"نہیں۔ ایسی حماقت نہیں کرنا۔ یوں تو راز فاش بھی ہو سکتا ہے۔ اس قتل کے الزام سے بچنا ہے تو۔ تو تمہیں ساری عمر اس جگہ کی رکھوالی کرنا پڑے گی۔" شرف الدین ایک دم بول اٹھا۔

"خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ چاچا آپ لیٹ جایئے۔" میں نے ان کی کلائی پکڑ کر انھیں لٹانا چاہا اسی وقت مجھے اپنے ہاتھ پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر اپنا ہاتھ دیکھا۔ وہاں خون تھا۔ میں اچھل پڑا۔ میں نے خورشید چاچا کی کلائی دیکھی' آستین پر کہیں کہیں خون چھلک آیا تھا۔ شرف الدین بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر خورشید چاچا کی آستین پلٹ دی۔ وہاں دو جگہ گہرا زخم تھا۔ میں اور شرف الدین ہی نہیں خود چاچا خورشید بھی اچھل پڑے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ خوف کی ایک تیز لہر نے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں لے لیا۔ شرف الدین کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ خورشید چاچا تو یوں آنکھیں چمکا کر دیکھ رہے تھے جیسے انھیں تکلیف سے کوئی سروکار نہ ہو' ان کے لیے یہ کافی تھا کہ ان کی باتوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔

"یہ۔ یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔" شرف الدین نے زخم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں اب یقین آگیا تمہیں؟" وہ دوسرا ہاتھ اٹھا کر بولے' اور سسکاری لے کر رہ گئے۔

"خورشید چاچا آپ لیٹ جایئے۔ میں دوا لاتا ہوں۔" میں باہر کی طرف لپکا۔

"نہیں وقار الحسن! گھر کی دوائی سے کام نہیں بنے گا۔ انھیں اسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

"مگر۔ اس وقت۔!"

"ہاں' اس وقت۔ بلکہ ابھی۔" اس کے چہرے پر تشویش تھی۔

"چلیں خورشید چاچا!" میں نے ایک بازو ان کی گردن میں ڈال دیا۔

اسی لمحے دروازہ ایک ہلکی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ میری اور شرف الدین کی اس طرف پشت تھی۔ خورشید چاچا کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھی تھیں۔ "یہ۔ یہی ہے۔ یہی ہے وہ۔" وہ بری طرح چیخ پڑے۔

میں اور شرف الدین اچھل کر مڑے۔۔ ہماری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی اور پھر ہم دونوں ہی ساکت رہ گئے۔

کھلے ہوئے دروازے سے سفید براق بلی ہم تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں اور شرف الدین مبہوت ہو کر رہ گئے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوب صورت بلی آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھیں سمندروں ایسی نیلی تھیں اور ان میں عجیب سا تاثر تھا۔ یوں جیسے وہ ہمیں تسلی دے رہی ہو' ہماری ڈھارس بندھا رہی ہو۔ وہ اپنی جگہ بڑی بے اعتمادی سے کھڑی تھی۔ ایک عجیب سا وقار تھا اس میں۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اس بلی اور اس کی آنکھوں کے تاثر کے سوا کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ۔ وہی ہے وقار میاں۔" خورشید چاچا کے گھگھیانے کی آواز نے کمرے میں چھایا گہرا سکوت یوں توڑ دیا جیسے گلاس اچانک فرش پر گر کر ٹوٹ گیا ہو۔ خاموشی کی کرچیاں ہو گئیں۔

ان کے گھگھیانے کے باوجود ہم دونوں ساکت کھڑے رہے۔ نہ ہی بلی میں کوئی حرکت ہوئی۔

"ارے۔ بھگاؤ اسے۔" خورشید چاچا اپنی جگہ کسمسائے۔

"نہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"بی بی!" اچانک شرف الدین ایک قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بلی سے مخاطب تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی بلی سر گھما کے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میری کمر میں نمی کی ایک لکیر سی رینگ گئی۔ "ہا۔ ہم نے کچھ نہیں کہا۔ انھوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ وہ تو کتے۔" نہ معلوم شرف الدین سنجیدہ تھا یا اس کی ذہنی رو بہک چکی تھی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

"میاں باؤلے ہو گئے ہو کیا۔؟" خورشید چاچا نے جھلا کر کہا۔

میں ان لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا' سمجھ رہا تھا مگر میری نگاہیں اس خوب صورت اور پروقار بلی پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ خورشید چاچا کے بولنے پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی' لحہ بھر کو انھیں دیکھتی رہی پھر اس نے کمرے میں طائرانہ نگاہ ڈالی اور جس طرح خاموشی سے آئی تھی اسی طرح پلٹ کر چلی گئی۔ میں چونکا اس وقت جب اس

کے جاتے ہی دروازہ ایک ہلکی چرچراہٹ کے بعد ٹھک کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

اس لمحے یوں لگا جیسے بند ہوتے دروازے میں سے تیز خوشبو کا ایک لطیف سا جھونکا بھی اندر آیا ہو۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ خورشید چاچا بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ "یہ۔ یہ کیا ہوا؟" ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کے ساتھ ہی میں اور شرف الدین ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"خورشید چاچا۔ کیا یہی بلی تھی؟"

"ہاں۔ یہی تھی۔ مگر تم لوگ تو بلی سے ڈر گئے اور میں۔ میں دیکھو چار کتوں سے مقابلہ کر کے آ رہا ہوں۔" وہ کسی مرغ کی طرح پھول کر بولے۔

"خورشید چاچا۔ یہ بلی ان چار کتوں پر بھاری تھی۔ بھول گئے آپ؟" شرف الدین کی بات پر میں چونک اٹھا۔

"شرف الدین۔ یہ۔ یہ تو۔" میں اب بھی کسی سحر میں تھا۔

"میں اسے نہیں جانتا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "میری اس سے یہ پہلی ملاقات ہے۔"

"ارے یہ تو دیکھو۔ یہ کیا ہوا؟ خورشید چاچا کی آواز نے پھر متوجہ کر لیا۔

"کیا ہوا چاچا؟" میں نے پوچھا اور پھر میں اور شرف الدین دونوں ہی حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کی کلائی پر نہ کوئی زخم تھا نہ خون' بلکہ ہلکی سی خراش کا بھی کوئی نشان نہ تھا۔

"لگتا ہے خورشید چاچا نظر بندی کے ماہر ہیں۔" شرف الدین نے ان کی کلائی کو پھر انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے سیانے۔!" خورشید چاچا نے انگلی اٹھا کر شرف الدین سے کہا۔ "میں تمھیں زیادہ نہیں جانتا مگر جتنا جانتا ہوں اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم معقول نظر آتے آتے اچانک نامعقول دکھائی دینے لگتے ہو۔"

میں ان کے ریمارکس پر بے ساختہ ہنس پڑا۔ شرف الدین منہ بنائے کھڑا تھا۔ "میرے ابا کے ساتھ تو اٹھنا بیٹھنا نہیں ہے ان کا' جملہ' لہجہ اور انداز بالکل ویسا ہی ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ یہ بلی۔" میں پھر الجھ گیا۔

"بہت خوبصورت بلی تھی' اور ہمارے لیے قابل احترام بھی' اس کی وجہ سے رحمو والا راز فاش ہونے سے بچ گیا ورنہ وہ کتے واقعی اس کی لاش کو ادھیڑتے ہوئے سڑک پر

ساتھ ہوا تھا گو وہ اب میرے یا شرف الدین کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر پھر بھی مجھے یہ پریشانی ضرور تھی کہ وہ زخم پھر نہ ابھر آئے' یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زخم غائب کیسے ہوا تھا اور پھر کس طرح ابھر آیا تھا اور پھر غائب ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر خورشید چاچا کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہے تھے۔ ان کی کلائی سے آستین اٹھی ہوئی تھی اور وہاں کوئی زخم نہ تھا' بس ایک سفید سا دھبا ضرور نظر آ رہا تھا۔

"شرف الدین! تمہارے پاس ہر بات کا جواز موجود رہا ہے' حیرت ہے کہ تم نے اس زخم کے بارے میں کوئی جواز پیش نہیں کیا۔" میں نے شرف الدین کو کریدا جو فرش پر سینے کے نیچے تکیہ رکھے اوندھا لیٹا کسی گہری سوچ میں تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں اب بھی گہری سوچ پھیلی ہوئی تھی پھر وہ اٹھ بیٹھا۔ "وقارالحسن! یہ اس قسم کا شعبدہ ہے جیسا ہم اسکولوں میں دیکھ چکے ہیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار ہمارے اسکول میں ایک بازیگر آیا تھا۔ وہ لوہے کے بڑے بڑے گولے نگل گیا تھا۔ اس نے ہمارے ٹیچر کی انگلی سے انگوٹھی بھی اتروالی تھی اور پھر وہ انگوٹھی اس نے اسکول کے آنگن میں لگے گھنے پیڑ کی ایک بلند شاخ پر بنے گھونسلے میں سے نکال کر دکھائی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ گھونسلا اس نے نہیں اتارا تھا بلکہ اسکول کے تیز اور پھرتیلے بچوں سے اتروایا تھا۔"

"ہاں یاد ہے مگر اتنی لمبی چوڑی تقریر کا مطلب کیا ہے؟"

"وہ سادھو ہمیں پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم اس کے آگے بچے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ ہم ان باتوں سے گھبرا کر اس سے پناہ مانگنے جائیں گے۔ ویسے وقارالحسن! کیا تم خود میں ایسی کوئی کیفیت پاتے ہو جو منفرد ہو؟"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ اپنی اس مخفی قوت سے میں خود قطعی طور پر لاعلم ہوں۔"

"اسے اپنے علم میں لانے کے لیے تمہیں سادھو سے مل لینا چاہیے۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"کیا۔ یہ۔ یہ تم کہہ رہے ہو؟ تم۔ اور تم ہی نے مجھے اس سے ملنے سے منع کیا تھا۔"

"ہاں۔ سنہرے بابا ہوتے تو بات دوسری تھی۔ ہم ان سے پوچھ سکتے تھے مگر ایک نامعلوم مدت تک اندھیرے میں رہنا تمہارے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں علم

لے آئے۔" شرف الدین سنجیدہ ہو گیا پھر وہ اچانک اٹھا۔ "وقارالحسن! کیا تم نے کبھی اپنی حویلی میں ایک دیکھی تھی؟"

"نن۔ نہیں تو۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں ذہنی سنبھل نہیں سکا تھا۔ ویسے بھی آج کی رات کا خوف کانٹوں کی طرح کھب کر رہ گیا تھا۔

"یہ۔ شگفتہ بھی ہو سکتی ہے۔ اصولاً" اسے مدد کو آنا چاہیے۔"

"ہاں۔ یہ۔ ممکن ہے کہ یہ وہی ہو۔" ایک نہ اطمینان تھا جو ایک ٹھنڈی سی لہر بن کر میرے مضطرب میں دور تک پھیلتا چلا گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شگفتہ میری مدد چاہتی تھی تو اسے یہاں آکر میری مدد چاہیے تھی۔ یہ بات تو میں بھی جان چکا تھا کہ اسے مدد کی شدید ضرورت ہے' وہ میرے بغیر پرکاش کی حاصل نہیں کر سکتی تھی' اگر ایسا کر سکتی تو اب تک ہوتی۔

میں اس معمے کو نہ سمجھنے کے باوجود اتنا جان چکا میرے اندر کوئی ایسی طاقت ہے جو میرے علم میں نہ اس طاقت سے بڑے سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ میں نے اب تک کے حالات سے جان لی تھی۔ سب پہلے مجھے شرف الدین نے جب اپنا خواب سنایا تھا جو وہ جوگندر ناتھ سوامی جی سے ملا تھا تو اس نے یہی کہا جوگندر ناتھ کہتے ہیں کہ وقارالحسن میں وہ طاقت ہے کی بیٹی کو سکھ مل سکتا ہے' پھر یہی بات یہاں آکر سنہرے سے سنی۔ ایسی ہی بات اس فقیر بابا نے بھی کہی بلکہ اس تو یہاں تک کہا کہ یہ سادھو میری اس طاقت کو ہتھیانے لیے مجھے اپنے حصار میں باندھ رہا ہے۔ گویا دنیا بھر مجھ پڑی تھی اور میں ایسا جاہل اور کم علم کہ اب تک اپنی مخفی قوت کو سمجھنے سے قاصر تھا' نہ میں نے اپنے اندر کوئی طاقت یا غیر معمولی بات محسوس کی تھی۔ الٹا میں کسی قدر کمزور پاتا تھا۔ ان واقعات نے میرے دل دھڑکنیں اتنی تیز کر دی تھیں کہ شاید میری پیدائش اب تک یہ دل جتنی بار دھڑکا ہو گا' اتنی ہی بار والد انتقال والی رات سے آج تک دھڑک چکا تھا۔

میں نے اپنی سوچ کی ساری گتھیاں اس کے سامنے دیں۔ ہم دونوں چاچا خورشید کو نظرانداز کر چکے تھے وقت مجھے خیال آیا کہ ان کی کلائی دیکھوں' جو شعبدہ ان

ہونا چاہیے کہ وہ سادھو تم سے کیا چاہتا ہے' اگر تم میں ایسی کوئی قوت ہے تو تم اسے اپنے مفاد میں استعمال کرو نہ کہ ان لوگوں کے لیے کھلونا بن جاؤ۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جو لوگ تمہارے قوت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ تمہیں مٹی کے مادھو کی طرح جس طرح چاہتے ہیں استعمال کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں سب باتیں چھوڑ کر اپنے مستقبل کے بارے میں خود ہی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ تم جس سمت جانا چاہتے ہو' وہ لوگ تمہیں اس سمت جانے نہیں دے رہے' وہ تمہارا رخ موڑنا چاہتے ہیں۔ تم خود کو اس کھینچا تانی میں ضائع کر رہے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود ہی اس سمت کا تعین کر لو اور اپنے تمام ارادوں اور تمام سمجھ بوجھ کے ساتھ اس راستے پر قدم رکھو تاکہ تمہیں مزید کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"مگر شرف الدین۔ ! مم۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔ تم خود سوچو کہ جو شخص اتنی دور رہتے ہوئے میرے ہاتھوں قتل کروا دے' وہ اپنے حصار میں لینے کے بعد میرے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے۔"

"تم اب بھی اس کی پہنچ سے دور نہیں ہو۔ یہ سب اس نے محض تمہیں اپنے جال میں پھنسانے کے لیے ہی کیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ تم بھاگے بھاگے اس کے پاس جاؤ گے۔ جا کر تو دیکھو' یہی ہو گا ناں کہ وہ بظاہر تمہارے سر پر ہاتھ رکھ دے گا۔ تمہیں اس جنجال سے نکالنے کا وعدہ کر کے تمہیں زیر بار کرے گا پھر اپنے مطلب پر آ جائے گا اور میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ایک بار اس قوت کی نشاندہی کر دے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے شرف الدین! مجھے یقین ہے کہ میرے اندر ایسی کوئی طاقت نہیں ہے' اگر ہوتی تو کیا میں اب تک محسوس نہیں کر لیتا؟" میں جھنجلا گیا۔

"پھر ان سب لوگوں کے لیے تم اتنے اہم کیوں بن گئے ہو؟ وہ شگفتہ جو تمہاری پشتوں سے بدلے لیتی رہی۔ جس نے تمہارے باپ جیسے شریف آدمی کو بھی نہیں بخشا' وہ تم پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ جس نے تمہاری پھوپی اور اس کے شوہر کو مار دیا' وہ تم سے مدد کی بھیک کیوں مانگ رہی ہے۔ رمضو بابا جو بہرحال تمہارے خاندان کے فرد نہیں تھے' محض اس لیے قتل کر دیے گئے کہ وہ مرزا صولت بیگ کے رازدار تھے نگران کی بیوی۔ انھوں نے کیا کیا تھا جو انھیں بھی مار دیا گیا؟ سوچو وقار! یہ سب باتیں سوچو۔ کچھ

ہے' کوئی ایسا سبب ہے جو بہت اہم ہے' جو اب تک ہماری نظر سے ضرور اوجھل ہے' مگر ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا ہر لفظ میرے دماغ میں کھڑکیاں سی کھولتا چلا گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا' بلکہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ چودھویں کی کسی بھی شب ایک سنہرا سانپ میری گردن میں لپٹ کر مرزا صولت بیگ کے خاندان کے اس آخری فرد کو ختم کر دیتا جس کی وجہ سے حویلی آباد تھی۔ میرے بعد اماں اور بہنیں لامحالہ حویلی خالی کر دیتیں اور پھر شگفتہ اس حویلی میں ساری زندگی قبضہ کیے رہتی مگر اس کے برعکس اس نے میری زندگی بچائی تھی۔ وہ روح جو سب کچھ کرنے پر قادر تھی کیا اپنے محبوب کی لاش نہیں ڈھونڈھ سکتی تھی؟ وہ روح جو سانپ بن کر انسانوں کو ڈس رہی تھی' جس روح نے رمضو بابا کو ذبح کر دیا تھا' وہ روح جس کی پوری حویلی پر حکمرانی تھی وہ اپنے ہی محبوب کی لاش حاصل کرنے کے لیے میری مرہون منت تھی۔ ! بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں اور کچھ دیر اس موضوع پر سوچتا رہا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"لیٹ جاؤ۔ زیادہ زور مت ڈالو۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اور ایک بات ذہن میں بٹھا لو وقارالحسن! کہ تم بہت طاقت ور ہو' ان لوگوں کی شعبدے بازی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی' یہ سب لوگ تمہاری توجہ چاہتے ہیں' تمہارے مرہون منت ہیں۔ خود میں اعتماد پیدا کرو اور خود کو ان لوگوں سے زیادہ طاقت ور سمجھو۔ جس دن تم نے یہ بات ذہن میں بٹھا لی اس روز تم جیت جاؤ گے۔"

وہ کہہ رہا تھا مگر میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ میری حالت بہت خراب تھی۔ کل رات جو کچھ ہو چکا تھا پھر جس کیفیت میں دن کٹا تھا اور اب بھی رات کافی گزر چکی تھی مجھے گہری اور پرسکون نیند کی ضرورت تھی مگر میں مسلسل جاگ رہا تھا۔ دن میں کچھ دیر کو سویا بھی تو یوں جیسے ذہن جاگ رہا ہو۔ شرف الدین نے ہلکے ہاتھ سے میری کنپٹیوں کو دبانا شروع کر دیا۔ مجھے بے حد آرام ملا اور میں نہ معلوم کس وقت بے خبر ہو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو اذان ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ کل فجر کی نماز میں نہیں پڑھ سکا تھا جس کا مجھے بہت قلق تھا۔ اماں اور بہنیں وغیرہ بھی اٹھ چکی تھیں۔ مجھے اٹھا دیکھ کر اماں نے طبیعت پوچھی۔ میں نے بتایا کہ سر میں درد ہے۔ گو درد کل رات کی نسبت کچھ کم تھا مگر ختم نہیں ہوا تھا۔ نماز کے بعد اماں نے مجھے حکیم جی کی دوا دی۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں سو رہا ہوں' مجھے جگائیے گا نہیں۔ میں کمرے میں واپس آیا تو خورشید چاچا اور شرف الدین دونوں ہی اٹھ چکے تھے۔ خورشید چاچا تو نماز مسجد میں پڑھتے تھے اس لیے فوراً ہی چلے گئے۔ شرف الدین نے وہیں نماز ادا کی۔ اس کی بھی تھکن سے بری حالت تھی۔ میں اور وہ چائے کا ایک کپ پی کر پھر سو گئے۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ شرف الدین بے خبر سو رہا تھا۔ تایا نے مجھے دیکھا تو پہلی اطلاع یہی دی کہ چچا' چچی اور تائی واپس آگئے۔ میں چچا اور چچی کے پاس اوپر کی منزل میں گیا۔ آج خلاف توقع وہ دونوں ہی بڑے اخلاق سے ملے۔

"بھابی دلھن بتا رہی تھیں کہ تم بیمار ہو۔" چچا نے ربڑی کا پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی چچا! بس سر میں درد ہوا تھا' پھر بخار آگیا۔ اب تو بہتر ہوں۔" میں نے چمچے سے تھوڑی سی ربڑی لے کر کھائی۔

"یہ ربڑی دہلی سے لایا ہوں۔ یہ جامع مسجد کے پاس ایک بڑی مشہور دکان کی ہے۔ اچھی ہے ناں؟ اور لو۔"

"جی بس شکریہ' میں میٹھا کم لیتا ہوں۔"

"میٹھا کھانے سے طاقت آتی ہے۔ تمھارے لیے تو میٹھا بہت ضروری ہے۔" چچی نے بھی کچھ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

میں نے ان سے ان کی بہن کی طبیعت پوچھی اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر نیچے آگیا۔ بڑے برآمدے میں تایا اور شرف الدین چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی تایا نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر شرف الدین کو دیکھا۔

"منہ میٹھا کرنے کی شدید طلب ہو رہی ہوگی؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں ہنس دیا۔ "نہیں تایا آج تو منہ میٹھا کر کے آرہا ہوں۔"

"ہاں بھئی! ایک نظر میں تبدیلی تو مجھے بھی محسوس ہوئی تھی۔ گویا یہ سفر ہمارے لیے بڑا مبارک رہا' اگر یقین ہو جائے کہ دہلی تک سفر طبیعت کی تلون مزاجی کے لیے اکسیر ہے تو ہر ماہ کے سفر اور خوراک کا ارچا خرچا میں اپنے ذمے لینے کو تیار ہوں۔" وہ حقے کی چلم کریدتے ہوئے بولے۔

میں اور شرف الدین مسکرا کر رہ گئے۔ "تایا! یہ آپ تائی کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے؟" شرف الدین کو ان کے تیر کی طرح کھبتے جملوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"اس طرف دیکھنے تک کی ہمت نہیں ہوئی ہے' اس لیے دعا سلام کے بعد میں سوتا بن گیا تھا۔" انھوں نے جھک کر سرگوشی کی۔ "خدا کی قسم اگر دہلی کی آب و ہوا نے یہ اثر ان پر بھی ڈالا ہو گا تو مستقل دہلی بھیج دوں گا۔"

"بھیج دوں گا کیا مطلب؟ آپ خود بھی وہیں منتقل ہو جائیے گا' پھر تو زندگی خوشگوار ہو جائے گی ناں؟" شرف الدین کب چوکنے والا تھا۔

"ہاں مگر اتنا بڑا رسک لینے کی اب عمر نہیں ہے۔" وہ ٹال گئے۔ "اور ہاں میاں وہ تمھاری اماں امروہہ جانے کو پر تول رہی ہیں۔" انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔

"جی تایا! وہ پہلے ہی کہہ چکی ہیں کہ تائی وغیرہ کے آنے کے بعد امروہہ جائیں گی۔ وہاں سے ضروری سامان لانا ہے۔ آپ بھی ساتھ چلیے گا۔" مجھے اچانک یاد آگیا کہ اماں نے تایا کو ساتھ لے جانے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ شگفتہ کے بارے میں میرے لیے بات کر سکیں۔ گو میں اپنی طرف سے اس معاملے کو لپیٹ چکا تھا مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ ویسے میں صاف دل سے سوچ چکا تھا کہ شرف الدین انکار کر سکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہو گا' نہ ہی شرف الدین کی دوستی پہ حرف آنے دوں گا۔

"ہاں وہ کہہ گئی ہیں کہ آپ بھی تیاری کر لیں۔ چلو' چلے چلیں گے۔" انھوں نے حقے کی نے منہ میں دباتے ہوئے کہا۔

"وقار الحسن! میں چلتا ہوں۔ مجھے پروگرام بتا دو تاکہ میں بھی تیاری کر لوں۔" شرف الدین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میاں کھانا کھانے کے بعد جانا' بس اب لگنے ہی والا ہے۔" تایا نے کہا۔

"نہیں تایا۔ کھانا میں گھر جا کر کھاؤں گا' آج وہاں کڑھی پکی ہے اور کڑھی کے لیے میں بادشاہت بھی چھوڑ دوں۔" اتنا کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ امروہہ کا پروگرام فائنل ہوتے ہی میں خود اس کے پاس آؤں گا۔ وہ میری طرف سے جانے کے لیے تیار رہے۔ وہ جاتے جاتے رکا اور اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی دی۔ "وقار الحسن! گھبرانا نہیں۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

اس کا یہ چھوٹا سا جملہ میرے لیے ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ میں جانتا تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیمی سال بس شروع ہونے ہی والا ہے۔ اسے ہر حال میں واپس جانا تھا مگر گویا اپنی تعلیم کا باب بند کر چکا تھا۔ اب اس نے مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور اس کی یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہیں تھی۔ میرا دل تشکر کے جذبات سے بھر گیا۔

"شکریہ شرف الدین۔ تم واقعی میرے ساتھ ہو اور تمھارا وجود میرے لیے کتنا مضبوط سہارا ہے' یہ میں بتا نہیں سکتا۔" میں نے جواباً اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لرزی اور وہ خدا حافظ کہہ کر پلٹ گیا۔ میں واپس آیا تو بڑے برآمدے میں چاندنی بچھا کر دسترخوان لگا دیا گیا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد یہاں اتنا بڑا دسترخوان لگا تھا۔ اماں نے کھانے پر کافی اہتمام کیا ہوا تھا۔ شنو آپا اور جہانی آپا بھاگ بھاگ کر دسترخوان پر رکابیاں اور سالن کے ڈونگے رکھ رہی تھیں۔ کوثر بڑے برآمدے میں بید کی آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھی۔ تایا اماں کے جانے کے بعد سے اب تک کوثر اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ میں نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ کوثر کو کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ تایا نے یہاں اس کے لیے ایک ٹیوٹر کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ بلا کی ذہین تھی۔ اس نے بہت جلد سب کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ مختلف موضوعات پر کتابیں منگوا کر پڑھتی رہتی تھی۔ کتابیں لانے کا کام اکثر تایا خود انجام دیا کرتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ میں بھی اس کے لیے کچھ کتابیں لایا تھا مگر وہ سب ایسے خشک موضوع پر لکھی گئی کتابیں تھیں کہ مجھے حیرت ہوئی تھی' وہ فلسفے اور نفسیات کے علاوہ علم نجوم' علم روحانیات اور مخفی علوم کی کتابیں تھیں۔ تائی کے جانے کے بعد سے وہ اب تک گویا انھی کتابوں میں گم تھی۔ اس نے تایا کو بھی کتابوں کی ایک لمبی چوڑی لسٹ دی تھی کہ یہ کتابیں وہ دہلی سے لیتے آئیں۔ اس وقت بھی وہ نیم کرسی پر نیم دراز تھی اور کتابوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"یہ سب تمھاری سمجھ میں آجاتا ہے کوثر؟" میں نے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جب آدمی کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو' بس وہ چھت کو تکتا رہے اور سوچتا رہے تو بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور پاس رکھی کتابوں میں سے ایک اور کتاب اٹھالی۔ اس کتاب کے نیچے رکھی کتاب دیکھ کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ اس کتاب کا عنوان تھا۔ "مخفی قوتوں کا علم" یہ انگریزی کی کسی کتاب کا ترجمہ تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ کتاب میرے لیے منگائی گئی ہو۔

میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر وہ کتاب اٹھالی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کھولتا' اس کتاب کے نیچے رکھی ہوئی کتاب نے مجھے ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ کتاب کالے علم' سفلی علم' جادو ٹونے اور اس قسم کے دوسرے علوم پر مشتمل تھی۔

"چلو میاں! تم ان کتابوں کے چکر میں مت پڑنا ورنہ تم بھی کوثر کی طرح سارا سارا دن کمرے میں پڑے دیواروں پر دائرے بنا کر تک رہے ہوں گے۔" تایا کی بات پر میں چونک اٹھا۔ میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا کہ کوثر ان علوم میں دلچسپی رکھتی ہے۔ کھانا لگ چکا تھا۔ چچا' چچی اور تائی بھی آگئے تھے۔ گھر کے افراد خوش تھے' بڑی رونق اور گہما گہمی تھی۔ میں حسرت سے سب کے کھلے ہوئے چہرے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ خدا بڑا کارساز ہے' اس نے ذہنوں میں جھانکنے کی صلاحیت عطا نہ کر کے انسان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے' اگر ایسا ہوتا تو یہاں کیسی قیامت مچی ہوتی۔

دسترخوان پر سبھی خوش گپیوں میں مصروف تھے' حال احوال پوچھا جا رہا تھا۔ اماں امروہہ جانے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ شنو آپا اور جہانی آپا نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں' بس میں خاموش تھا۔ گو میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ ویسے بھی اب سوچنے کو رہ ہی کیا گیا تھا مگر پھر بھی میرا ذہن کسی انجانے خدشے میں گھرا ہوا تھا۔ ایک ایسی الجھن تھی جو میرے ذہن کو جکڑے ہوئے تھی۔

تایا بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی اماں بھی میری طرف دیکھ لیتی تھیں' میں ان دونوں کی نگاہوں کی زد سے

بچنا چاہتا تھا۔ میں ان کے کسی سوال کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے جلدی جلدی الٹا سیدھا کھانا کھایا اور کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ کافی دیر بعد اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

"وقار الحسن! کس الجھن میں ہو؟" انھوں نے میرے قریب ہی مسہری پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں اماں! کسی الجھن میں تو نہیں ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تم نے بادام تو کھا لیے تھے ناں۔ خوف کچھ کم ہوتا محسوس ہوا یا نہیں؟"

"جی اماں! کچھ توانائی تو محسوس کر رہا ہوں' اور رات بھی خیریت سے گزری ہے۔" آخری جملہ بے ساختہ ہی میرے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھیں۔

"میں۔ میرا مطلب ہے کہ پرسوں رات میں نے بہت بھیانک خواب دیکھا تھا ناں اماں۔ آج میں ڈر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے بات بنا دی۔

"خدا خیر کرے گا وقار! تم ذرا مت کرو۔ ویسے بھی کلکتہ تو وہیں رہ گئی۔ تمھارے تایا ٹھیک کہتے ہیں کہ حویلی چھوڑ دو' ان لوگوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب دیکھ لو ہمیں یہاں آئے اتنا عرصہ ہو گیا اور۔۔۔"

"اماں!" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ بھول گئیں کہ ابھی چند ہی روز پہلے جب میں بیمار تھا تو وہ ناقابل برداشت قسم کی بدبو۔۔۔"

"ہاں۔ میں بھولی نہیں' مجھے سب کچھ یاد ہے اور اب جب کہ فقیر بابا نے تمھیں بادام دے دیے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد ان چکروں سے چھٹکارا پالیں گے۔ سنہرے بابا آجائیں' تو میں بھی ان سے ملوں گی۔"

ایسا کہتے ہوئے اماں کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ ایک یقین تھا جس سے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ ان کا یہ یقین' یہ اطمینان جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ مجھے خود پر اتنا بھروسا نہیں تھا کہ میں زیادہ عرصے تک خود پر قابو پا سکوں گا۔ مجھے حیرت تھی کہ سب کے سب میرے اندر نہ جانے کون سی طاقت تلاش کر رہے تھے۔ مجھ میں تو اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ کسی واقعے کے ہو جانے کے بعد اپنے چہرے کے تاثرات پر ہی قابو پا سکوں یا اپنی لڑکھڑاتی ہوئی زبان روک سکوں' یا حلق میں دھڑکنے والے دل کو قابو کر سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر حا
نارمل ہوئے' اور ایسا ہی کوئی دوسرا واقعہ پیش آگیا تو
میں اماں کے سامنے پھٹ پڑوں۔

"وقار الحسن! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نئے
میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ میں چھوٹی دلہن کے تیور
برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمیں امروہہ بھی جانا ہے' و
چار دن لگ جائیں گے۔ بس زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو
میں' میں وہاں منتقل ہو جانا چاہتی ہوں۔" اماں نے
نماز کا مڑا ہوا کونا ٹھیک کرتے ہوئے کہا پھر ململ کے
سے دوپٹے کو ماتھے سے لپیٹتے ہوئے بولیں۔ "تم کل
ٹکٹ لے لو۔"

"جی اماں۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔

اماں نماز پڑھنے لگیں اور میں سوچوں کے اس خو
بھنور میں ڈوبنے لگا جو شاید اب میرا مقدر بن چکا تھا۔
گھنٹا بھر یونہی لیٹا رہا۔ اماں نماز پڑھ کر باہر جا چکی تھ
میں سوچ رہا تھا کہ شام کو شرف الدین کے ساتھ ہی ا
جا کر کل کے لیے ٹکٹ لے لوں گا۔ ہم اگر سویرے
گاڑی سے نکلتے ہیں تو دوپہر تک امروہہ پہنچ جائیں
مجھے اگر فکر تھی تو صرف اس مکان کی۔ اماں کہہ رہی
کہ خورشید چاچا کو بھی ساتھ لے لوں تاکہ وہاں سے
لانے میں دشواری نہ ہو۔ تایا اور شرف الدین بھی ہما
ساتھ ہی جا رہے تھے۔ یوں اگر ہم سب ہی چلے جاتے
مکان کی رکھوالی کون کرتا۔ میرا اپنا خیال تھا کہ ہم خو
چاچا کو یہاں چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ وہ یہاں ہوتے تو
ڈھارس رہتی۔ بہرحال ابھی تک خورشید چاچا سے
ملاقات نہیں ہوئی تھی کہ میں ان سے بھی اس موضو
مشورہ لے لیتا۔ اب سورج کی کرنوں میں ٹھنڈک
ہو چکی تھی۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نہا دھو کر شر
الدین کے گھر جانے کو تیار ہو گیا۔ اماں کو میں نے بتا
میں شرف الدین کے ساتھ جا کر ٹکٹ بھی لے آؤں گا
امروہہ جانے پر تیار تھے۔ میں شام ہونے سے قبل
شرف الدین سے مل لینا چاہتا تھا۔ نہ معلوم کیوں میں
چاہتا تھا کہ رات کے وقت' یعنی اندھیرا ہونے کے بعد
سے باہر رہوں۔ میں تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ابھی
شرف الدین کی گلی میں مڑنے ہی والا تھا کہ اچانک ا
چار پانچ برس کا بچہ میرے عین سامنے آکر رک گیا
نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر آگے نکلنا چاہا مگر

کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے سر پر انگلیوں سے بالوں کو بکھیر دیا اور آگے نکلتا چلا گیا۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ ایڑیوں کے بل پورے زور میں گھوم گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر گھما دیا ہو۔ سامنے ہی وہ بچہ کھڑا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس بچے کو دیکھ رہا تھا' وہ بچہ جس کے نرم گھنگھریالے بالوں کو میں نے لمحہ بھر پہلے ہی چھوا تھا وہ بالکل گنجا تھا۔ اس کے چھوٹے سے چہرے پر بڑی بڑی اور خوفناک قسم کی آنکھیں تھیں۔ موٹے بھدے' سیاہ ہونٹ اور موٹی گول سی ناک اس کے چہرے کی تمام معصومیت کو نگل چکی تھی۔ وہ بہ مشکل تین ساڑھے تین فٹ کا ہوگا مگر اس کے مختصر جسم پر جو چہرہ تھا وہ کسی ادھیڑ عمر کے آدمی کا سا تھا اور اس وقت اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار تھے۔ دھیرے دھیرے' بالکل غیر محسوس انداز میں وہ مجھ سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ میرے بدن کی جان نکلتی جا رہی تھی' دونوں گھٹنوں کے اندر ٹیسیں سی اٹھنے لگیں اور مجھے لگا جیسے میں ابھی گر جاؤں گا۔ اتنی دیر میں وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا اور سر اٹھائے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تمھیں سنہرے بابا نے بلایا ہے۔" اس کے حلق سے عجیب و غریب قسم کی آواز نکلی۔ ایسی آواز کہ بے اختیار میں انگلی کان میں ڈال کر کھجانے لگا۔

"سنہرے بابا نے؟" میرے منہ سے نکلا اور اس کے ساتھ ہی میں نے خود میں توانائی کی لہریں دوڑتی محسوس کیں۔ "کہاں ہیں سنہرے بابا؟"

"وہ بالیکا مندر کے پیچھے تمھارا انتظار کریں گے۔ رات کو سورج ڈوبنے کے دو گھنٹے کے بعد وہاں آجانا۔"

وہ بالکل ایسے بول رہا تھا جیسے اس کے حلق میں کوئی مشین فٹ ہو' ایسی مشین جس میں سے آواز کے ساتھ ہی ایک باریک سیٹی کی سی آواز بھی نکلتی ہو جو سماعت کو ناگوار گزرتی تھی اور حلق تک میں خراش سی پڑ جاتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے خاموش کرا دوں' اسے بولنے سے منع کر دوں۔

"بالیکا مندر!" میں نے زیر لب دہرایا۔ اسی لمحے مجھے اپنی پشت سے شرف الدین کی آواز آئی۔ میں پلٹا۔ وہ شرف الدین ہی تھا اور ہنستا ہوا میری جانب آرہا تھا۔

"شرف الدین۔۔۔ تم ہنس کیوں رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے ہنس رہا ہوں کہ آج کل میرا دوست کتوں سے بھی حال احوال پوچھنے لگا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" میں نے تیزی سے کہا اور فوراً پلٹا کہ کہیں اس پیامبر نے تو اس کی بات نہیں سن لی' یہ دیکھ کر میں خود بھی حیران رہ گیا کہ وہاں کوئی بھی نہ تھا البتہ کچھ دور ایک کتا لنگڑاتا ہوا اور زمین کو سونگھتا ہوا جا رہا تھا۔ "یہ۔ وہ کہاں گیا؟" میں بوکھلا گیا۔

"وہ جا رہا ہے۔" شرف الدین نے دور جاتے ہوئے کتے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ۔ وہ بچہ تھا۔ نہیں نہیں' آدمی تھا شرف الدین! ابھی یہیں تھا۔ میں اس سے بات کر رہا تھا۔"

"شکر ہے کہ تمھیں کتا آدمی' یا بچہ نظر آیا' اگر آدمی یا بچہ کتا نظر آنے لگتا تو بھی کوئی تمھارا کیا کر لیتا۔ ویسے میرے بارے میں تو تمھیں یقین ہے ناں کہ میں آدمی ہوں۔" وہ غیر سنجیدہ تھا۔

"شرف الدین! میں جھوٹ نہیں کہہ رہا اور نہ تم سے مذاق کر رہا ہوں۔ وہ تین ساڑھے تین فٹ کا ایک آدمی تھا۔ اس نے مجھے سنہرے بابا کا پیغام دیا ہے۔ وہ بالیکا مندر کے پیچھے رات کو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اب شرف الدین سنجیدہ ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمھیں میری بات کا یقین نہیں؟" میں نے اسے یوں غور سے دیکھتے پا کر کہا۔

"مجھے تمھاری بات کا یقین ہے وقار الحسن! لیکن مشکل یہ ہے کہ میں خود کو بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ میں گزشتہ دس منٹ سے اپنے دروازے کے باہر' دہلیز پر کھڑا تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ تم گلی میں مڑتے مڑتے اچانک ٹھٹک کر رک گئے تھے پھر تم پلٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں جو تمھیں آتا دیکھ کر رک گیا تھا' چند لمحے تو تمھیں دیکھتا رہا پھر میں نے دیکھا کہ تمھارے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ تم بڑی توجہ سے ایک ہی جگہ دیکھے جا رہے ہو تب میں دبے قدموں تمھاری طرف بڑھا۔ ذرا قریب آکر پتا چلا کہ تم ایک کتے سے محو گفتگو ہو جو وہاں دہلیز پر سے مجھے نظر نہیں آرہا تھا اور ذرا آگے آنے پر نظر آگیا اور وہ جو کتا ابھی ابھی گیا ہے' وہی سر اٹھائے تمھیں دیکھ رہا تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ تین ساڑھے تین فٹ کا آدمی تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔"

"پھر۔ تم مان کیوں نہیں رہے کہ وہ کتا نہیں آدمی تھا

اور سنہرے بابا کا پیغام لایا تھا۔" میں جھنجلا گیا۔

"سنہرے بابا کا پیغام؟" اس بار شرف الدین چونک اٹھا۔ "یہی کہا ہے ناں تم نے؟"

"ہاں۔ یہی کہا ہے اور دوبار کہا ہے، تمہیں اپنے آگے کسی کی بات سنائی کب دیتی ہے۔ وہ بالیکا مندر کے پیچھے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بالیکا مندر کے پیچھے۔؟" وہ اب حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ۔ گھر میں چلو۔ وہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

اس نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے اس میں کچھ اضطراب سا محسوس ہوا مگر میں کچھ نہیں بولا۔ ہم شرف الدین کے چچا کے گھر پہنچ گئے۔ اس کے چچا نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ گھر کے دوسرے افراد غالباً" کہیں گئے ہوئے تھے کیوں کہ وہ ہمیں اندرونی حصے سے اندر لے گئے تھے جب کہ بیٹھک میں جانے کا بیرونی دروازہ مقفل تھا۔

"بیٹھو۔" شرف الدین نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں تخت پر بیٹھ گیا تو وہ خود مونڈھا اٹھا کر میرے بالکل قریب آ گیا۔ "ہاں۔ اب شروع سے بتاؤ۔" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

تب میں نے اسے بتایا کہ میں امروہہ جانے کے لیے ٹکٹ لینا چاہتا تھا اور کیونکہ اسے بھی پروگرام بتانا تھا اس لیے اس کے گھر آ رہا تھا کہ وہ مجھے مل گیا۔ شرف الدین میری بات بڑی توجہ سے سنتا رہا۔

"وقار الحسن! یہ کوئی چکر لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی سادھو اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ سنہرے بابا یہاں نہیں ہیں، دوسری بات یہ کہ اگر وہ واپس آچکے ہیں تب بھی وہ اپنے ٹھکانے پر بلاتے، تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ بالیکا مندر کے پیچھے دو سو سال پرانے قلعے کے کھنڈرات ہیں اور اس طرف جانے کی کوئی دن میں بھی ہمت نہیں کر سکتا پھر سنہرے بابا تمہیں رات کو وہاں کیوں بلا رہے ہیں؟ وہ بالیکا مندر کی طرف تو جا ہی نہیں سکتے۔ وہاں عجیب و غریب قسم کی پوجا پاٹ ہوتی ہے اس مندر کی دیوداسیاں بہت مشہور ہیں جو برائے نام لباس پہنتی ہیں اور وہاں جانے والی تمام عورتیں بہت مہین کپڑے کا لباس پہن کر جاتی ہیں۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ سنہرے بابا اس طرف جائیں گے اور پھر تمہیں بھی وہاں بلوائیں گے۔ وقار الحسن! ان کھنڈرات کے بارے میں ہزاروں باتیں مشہور ہیں۔ وہ ایک ایسا قلعہ ہے جو وقت بھی تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے۔ شہر کی سائیں رو مندر کے کی طرف جانے والے راستہ تک ہی ہے راستے کے فوراً بعد ویرانی اور خوف کا سفر شروع ہے۔" وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں بول اٹھا۔

"کیا تم۔ تم وہاں گئے ہو؟"

"اندر نہیں گیا۔ اندر جانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ بالیکا مندر کے احاطے سے جھانک کر اس طرف تھا۔ جہاں مندر کا احاطہ ختم ہوتا ہے، وہاں ایک ناہموار اور سرکنڈوں کی جھاڑیوں سے اٹا ہوا راستہ قلعے کی طرف جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں لوگ طاقت کو بڑھانے کے لیے دان دیتے ہیں۔ وہ مندر لوگوں کا مسکن ہے جو محبت حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقہ استعمال کرتے ہیں اور جب یہ طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ اپنے بھینٹ، اور خون کی یہ بھینٹ انھی کھنڈرات میں جاتی ہے۔ کیسے۔؟ یہ میں نہیں جانتا۔"

"لیکن شرف الدین۔ فرض کرو اگر سنہرے بابا واقعی بلایا ہو اور ہم نہ جائیں تو۔!"

"وقار الحسن! کیا تم یہ یقین کر سکتے ہو کہ سنہرے بابا ہیبت ناک بچے یا آدمی کے ذریعے تمہیں پیغام بھیج جو مجھے کتا نظر آ رہا تھا۔"

اس کی بات پر میں اچھل پڑا۔ مجھے خورشید چا واقعہ یاد آ گیا۔ انھوں نے بھی تو چار کتوں کا ذکر کیا رحیمو کی لاش کو کھود کر نکالنا چاہتے تھے۔ "ہاں یہ سادھو ہی ہو سکتا ہے۔ مگر۔ وہ مجھے وہاں کیوں بلا رہا خوف کی تیز لہر ٹھنڈی سلاخ کی طرح میری کمر میں اتر

"وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے شرف الدین؟"

"یہی بات تو اب تک سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ وہ سے کیا چاہتا ہے۔ کاش ہم نے اس روز سنہرے بابا کی با مان لی ہوتی۔" وہ سیدھا ہو کر مونڈھے کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گیا۔

"اب۔ اب کیا کریں؟ اماں سویرے والی ریل۔ امروہہ جانا چاہتی ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ٹکٹ بن، تایا بھی جانے کو تیار ہیں۔ اماں کا کہنا ہے کہ خر چاچا کو بھی ساتھ لے لیا جائے پھر یہاں کا کیا ہوگا۔؟ مطلب ہے کہ اس مکان کا۔ میں چاہتا ہوں کہ خو چاچا یہیں رہیں تاکہ۔ اور یہ، سادھو۔ ہم۔ میں اکیلا وہاں نہیں جاؤں گا شرف الدین۔" میں گھگیا رہا تھا۔

"میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے اور وہ کون سی قوتیں ہیں جنہیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وقار الحسن! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم طاقت ور ہو۔ بہت طاقت ور۔"

"ایسا کرتے ہیں کہ۔ فقیر بابا کے پاس چلتے ہیں۔" میں خوف زدہ تھا۔ میں نے شرف الدین کی بات کاٹ دی۔

"چلنا چاہتے ہو تو ضرور چلو، میں انکار نہیں کروں گا مگر وقار الحسن! ایک بار اس سے ملنے میں کیا حرج ہے؟ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ حالات تمہیں اسی جانب کھینچ کر لے جانا چاہتے ہیں تو تم خود ہی اسی سمت قدم بڑھا دو۔ خود قدم بڑھاؤ گے تو اس سفر پر پُراعتماد رہو گے اور اگر یوں شعبدے باز تمہیں لے گئے تو یونہی تمام عمر خوف کی بھیانک وادیوں میں گھٹ گھٹ کر سفر کرتے رہو گے۔ میں تمھاری جگہ ہوتا فیصلہ کرنے میں اتنا وقت نہ لیتا۔ میں تمہیں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلا چکا ہوں وقار الحسن! ہمت کرو۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ ان دیکھی قوتیں مجھے اور میری قسمت کو مسخ کر چکی تھیں۔ میں گویا ہواؤں میں معلق تھا اور یہ کوئی بہتر صورت حال نہیں تھی۔ مجھے واقعی جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ ہر وقت عورتوں کی طرح ڈرتے رہنے سے میں ایک ان دیکھے جال میں پھنستا جا رہا تھا۔ خوف کی کیفیت تو گویا میری نس نس میں لہو بن کر دوڑنے لگی تھی۔ تبھی میں نے فیصلہ کر لیا۔ ـ ـ ـ کر لیا کہ میں حالات کو موڑ دوں گا۔ آنے والے وقت کی ڈور کو اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ اب جو بھی ہو سو ہو مگر یوں گھٹ گھٹ کر زندہ نہیں رہوں گا، زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا ناں کہ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں، تو ٹھیک ہے، اگر خدا نے میری موت اسی طرح لکھی ہے تو میری مدافعت بھی کام نہیں آئے گی۔

"کیا سوچنے لگے وقار الحسن!" شرف الدین نے مجھے پکارا۔

"ہوں۔" میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی کھوجتی ہوئی آنکھوں میں تجسس بھرا تھا۔ وہ میرے فیصلے کا منتظر تھا۔ میں اس کی دوستی پر فخر کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے میرے ساتھ تھا اور آئندہ بھی میرے ساتھ رہنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ میں مسکرا اٹھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ

دیکھتے ہی اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ بے قراری سے میرے قریب سرک آیا۔

"وقار الحسن! یہ ان دیکھی دنیا ہمارے لیے بڑی پرکشش ہو گی، کاش تمھاری جگہ میں ہوتا۔"

"اب بھی خود کو میری جگہ ہی محسوس کرو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "شرف الدین! تم ٹھیک کہتے ہو۔ جس راستے پر سفر کرنے کے لیے مجھے مجبور کیا جا رہا ہے، اسی راہ پر میں خود ہی قدم رکھ دوں تو وہی میرے لیے بہتر ہو گا۔ چلو! آج رات یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"زبردست۔" اس نے نعرہ مارا۔ "کس وقت بلایا ہے اس نے؟"

"سورج ڈوبنے کے دو گھنٹے بعد۔"

"دیکھو وقار الحسن! اب چند باتوں کو ذہن نشین کر لو۔ ایک تو خود کو اس کے سامنے کمزور ظاہر مت کرنا۔ بڑے دبنگ لہجے میں بات کرنا، اور یوں ظاہر کرنا جیسے تمہیں اپنی قوتوں کا پورا ادراک ہے۔ یہ تو تم جان ہی چکے ہو کہ تم میں ایسی کوئی قوت ہے جو اس میں نہیں، اور وہی وہ حاصل کرنا چاہتا ہے گویا تم اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ یقین کرو کہ یہ احساس ہوتے ہی کہ تم اس سے اور اس کی چالوں سے قطعی خوفزدہ نہیں ہو وہ دب جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، آج یا تو آر یا پھر پار۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے اندر غیر معمولی تبدیلی آ گئی ہو، جیسے میں اپنے قد سے بڑھ گیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو زیادہ پُراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ اس تبدیلی نے مجھے اس گھٹن کی کیفیت سے بھی نکال لیا جو جانے کب سے میرے وجود پر طاری تھی۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر شرف الدین نے پوچھا۔

"پھر۔ کیا پروگرام ہے؟" اس کی اضطرابی کیفیت مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"چلو۔ پہلے گھر جائیں گے۔ کل کے ٹکٹ بھی لے لیں گے تاکہ اماں مطمئن ہو جائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ٹکٹ کل ہی لیں۔" وہ جھجک کر بولا۔

میں چونک اٹھا۔ "کیوں۔؟ کیا تمہیں گمان ہے کہ ہم کل نہیں جا سکیں گے؟"

"یہ بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ہمیں ٹکٹ

آسانی سے مل جائے گا۔ ریل کا وقت مقرر ہے جو ذہن پر بار گزرے گا' ریل نکل بھی گئی تو ہم بس سے جاسکتے ہیں۔"

اس کی بات معقول تھی۔ ریل کی نسبت بس جلدی پہنچا دیتی تھی اس لیے میں بھی خاموش ہوگیا۔ "ٹھیک ہے' گھر تو چلو۔"

وہ سرہلا کر اندر چلا گیا۔ غالباً" وہ اپنے چچا زاد کو بتانے گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس آگیا۔ اس کے کھلے گریبان سے جھانکتا ہوا کالا دھاگا مجھے حیران کرگیا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے اس دھاگے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"موم جامے میں آیت الکرسی ہے' یہ اماں نے مجھے کافی عرصہ پہلے دیا تھا مگر میں۔۔۔" اس نے گریبان سے تعویذ نکال کر مجھے دکھایا۔

اس میں اتنی بڑی تبدیلی نے مجھے واقعی حیرت زدہ کردیا۔ مجھے وہ شرف الدین یاد آگیا جو پہلی رات میرے ساتھ حویلی میں رہا تھا تو اس نے ہزار تاویلیں اور دلائل دیئے تھے کہ یہ سب باتیں جہالت ہیں' آدمی کی نفسیات کا کھیل ہے۔ وہ جو چاہے سوچ سکتا ہے' جو چاہے دیکھ سکتا ہے' اسے روحوں' جنوں' بھوتوں پر یقین ہی نہیں تھا اس لیے وہ تعویذ اور گنڈوں کو بھی قطعی نہیں مانتا تھا۔ اس نے بارہا میرے گلے میں پڑے ہوئے تعویذ' جسے ابا نے اسم اعظم بتایا تھا' کا کئی بار مذاق اڑایا تھا اور نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ میں اسے چھپا کر پہنا کرتا تھا۔ آج وہی شرف الدین آیت الکرسی کو موم جامے میں لپیٹ کر گلے میں ڈال چکا تھا۔ بہرحال یہ تبدیلی میرے لیے خوش آیند تھی' میری دلی خواہش تھی کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

"اچھا کیا شرف الدین! اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر خجالت کے آثار دیکھ کر کہا۔ شاید ماضی کا شرف الدین اسے بھی یاد آگیا تھا۔

ہم دونوں وہاں سے نکل کر گھر کی طرف چل پڑے۔ سورج کا رنگ نارنجی ہوگیا تھا۔ آسمان کا مشرقی کنارہ سرمئی ہوچکا تھا۔ سورج ڈوبنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ ابھی ہم راستے میں تھے کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔ میں اور شرف الدین غیرارادی طور پر سبز گنبد والی مسجد کی طرف مڑ گئے۔ میں وہاں نماز ادا کرنا چاہتا تھا' غالباً" ایسا ہی شرف الدین نے بھی چاہا تھا۔ ہم دونوں کے ذہن گویا اس لمحے ایک ہی سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ میں اور شرف الدین یہ محسوس کرتے ہی مسکرا اٹھے۔ ہم نے رفتار تیز کردی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سبز گنبد والی مسجد پہنچ گئے۔ میں نے اور شرف الدین نے وضو کیا اور جماعت میں کھڑے ہوگئے۔ میں صف میں کھڑا تھا۔ میرے دائیں طرف کوئی بھی نہ تھا۔ ... نے جونہی نیت باندھ کر تکبیر پڑھی' مجھے لگا جیسے دائیں جانب کوئی آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ وہ مجھے نظر نہیں ... تھا مگر اس کی موجودگی کا احساس بڑا پختہ تھا۔ مجھے اس آنے والے کی مدھم سانسیں صاف سنائی دے رہی ... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میرے دائیں بازو کی ... کے کپڑوں سے مس ہوئی ہے اور سب سے بڑی بات ... اس کے آتے ہی میرے نتھنوں میں ایک مخصوص ... گھس گئی تھی۔ یہ خوشبو مانوس سی تھی۔ پہلے تو ... کچھ الجھا مگر بہت جلد میں نے خود پر قابو پالیا اور اپنا ... نماز کی طرف مبذول کرلیا۔ نماز ختم کرکے میں ... پھیرا تو برابر میں کھڑی شخصیت کا احساس شدت ... ہوا' آنکھوں میں تراوٹ سی اترتی محسوس ہوئی۔ سلام پھیرنے کے لیے منہ دوسری جانب کیا اور ... لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ میں خدا سے اپنی کامیابی کی ... مانگ رہا تھا' میں شیطان سے پناہ کی دعا کر رہا ... عذابوں اور شیطانی کاموں سے پناہ مانگ رہا تھا ... دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے' آنکھیں بند تھیں ... جانب وہی مانوس سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

نماز ختم ہوتے ہی میں پھر اسی جانب متوجہ ہو ... نگاہیں جونہی چٹائی پر پڑیں' میں دم بخود رہ گیا۔ وہاں ... کی ایک انگوٹھی رکھی تھی۔ میں ابھی دیکھ ہی ... اچانک یوں لگا جیسے کوئی مجھے وہ انگوٹھی اٹھا لینے ... دے رہا ہو۔ میں جھک کر انگوٹھی اٹھا کر سیدھا ہو ... عین سامنے وہی براق' خوبصورت اور پروقار ... تھی جو پلک جھپکتے ہی غائب ہوگئی۔

"وقار الحسن! چلیں؟" یہ شرف الدین تھا ... جلدی سے وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی او ... سیڑھیوں کی جانب چل پڑا۔

راستے بھر میرا ذہن اسی انگوٹھی اور ریلی میں ... اچانک مجھے یاد آگیا کہ وہ خوشبو جو مجھے مانوس ... تھی' وہی خوشبو کل رات اس وقت بھی میرے ... گھس گئی تھی جب خورشید چاچا کی کلائی کا زخم ... اور ہم انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے اور ... اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے جاتے ہی کمرا ... سے بھر گیا تھا۔ یہ یاد آتے ہی میرے اندر اطمینا ... گیا۔ اب میں خود کو زیادہ پراعتماد محسوس کر رہا ...

... آچکا تھا کہ کوئی ان دیکھی طاقت میرے ساتھ ہے' ... اسے علم ہوچکا تھا کہ آج میں اسی سادھو سے ملنے کا ... کرچکا ہوں۔ شرف الدین نامعلوم کن سوچوں میں تھا۔ ... اسی خاموشی میں گھر تک کا فاصلہ کٹ گیا۔ اب ... ڈوب چکا تھا۔ اس کی ٹھنڈی کرنیں پورے علاقے کو ... لپیٹ میں لیے ہوئے تھیں اور ان کی نارنجی روشنی ... آہستہ معدوم ہوتی جارہی تھی۔ گویا اب ہمارے ... صرف دو گھنٹے تھے۔

-٭-٭-٭-

ہم گھر پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر متوقع بات ... بیرونی دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو وہ ... کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ... ہوا۔ اماں' تائی' پھوپی' چچی اور دونوں بہنیں ہونقوں کی ... بیچ آنگن میں کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اماں میری ... طرف لپکیں۔

"کیا ہوا اماں؟" میں بھی گھبرا کر آگے بڑھا۔

"وہ۔۔۔ خورشید چاچا۔۔۔ ان کی حالت بہت خراب ہے' ... تمہارے تایا چچا انھیں لے کر سرکاری اسپتال گئے ... ہیں۔"

"کیا ہوا انھیں؟" یہ شرف الدین تھا جو عام حالات میں ... کبھی اس بے تکلفی سے اندر نہیں آیا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔ ان کا بازو بہت زخمی تھا۔ وہ آتے ہی بے ... ہوش ہوگئے تھے۔ ان کا رنگ سفید ہوچکا تھا اور۔۔۔ تم جاؤ' ... بلوا نہیں۔" اماں ایک دم ہی چیخ پڑیں۔

میں اور شرف الدین پلٹ کر باہر کی سمت بھاگے۔ "اماں دروازہ بند کرلیں۔" باہر نکلتے نکلتے میں نے چیخ کر کہا۔ سرکاری اسپتال یہاں سے کافی دور تھا۔ باہر نکلتے ہی میں ... نے ایک تانگا روک لیا۔ شرف الدین نے تانگے والے کو ... سرکاری اسپتال چلنے کو کہا اور تاکید کردی کہ وہ جس قدر ... تیزی سے چل سکتا ہے چلے۔ اس نے فوراً ہی چابک گھمایا' ... ہوا میں اس کی ایک تیز آواز گونجی اور گھوڑا بدک کر بھاگ ... پڑا۔

"وقار الحسن! یہ وہی زخم ہوسکتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہم نے غلطی کی۔۔۔ ہمیں اسپتال لے جانا ... چاہیے تھا' اسی وقت۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ۔۔۔"

"مگر زخم ختم ہوجانے کے بعد بھلا لے جاتے تو ... جاتے؟ میرا خیال ہے صبح تک وہ ٹھیک تھے؟"

"ہاں' میں اٹھا تھا تو وہ جاچکے تھے' اور گھر میں کسی سے پتا نہیں چلا تھا کہ انھیں کوئی تکلیف ہے۔ غالباً" صبح وہ ٹھیک ہی تھے۔ خدا خیر کرے۔" میرا دل کچھ گھبرا رہا تھا۔ حیرت یہ ہورہی تھی کہ کل رات غائب ہوجانے والا زخم کب اور کیسے ابھر آیا اور اس شدت سے کہ ان کی حالت غیر ہوگئی۔

اسپتال کے سامنے تانگا پہنچتے ہی میں نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور پھر میں اور شرف الدین تقریباً" بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ ایک لمبی راہ داری سے گزرتے ہوئے میں دونوں جانب بنے ہوئے کمروں میں جھانکتا جارہا تھا۔ ڈاکٹر کا کمرا کچھ آگے تھا۔ وہیں باہر ہمیں چچا مل گئے۔ وہ کافی پریشان تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ہماری جانب لپکے۔

"چچا خورشید چاچا کہاں ہیں؟" میں نے انھیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"وہاں ہیں۔۔۔ ان کی حالت خطرے میں ہے۔ مجھے تو بچتے نظر نہیں آتے۔" انھوں نے دائیں جانب بنے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایمرجنسی وارڈ لکھا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر تایا سفید چہرہ لیے کھڑے تھے۔ شرف الدین میرے پیچھے تھا۔ خورشید چاچا سامنے ہی ایک اونچی اور لمبی ٹیبل پر بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی کلائی پر ڈاکٹر پٹی باندھ رہا تھا۔ واقعی ان کے چہرے پر ہلکی سی نیلاہٹ تھی جب کہ وہ بازو جس میں زخم تھا پورا کا پورا نیلا ہوچکا تھا اور بری طرح سوجا ہوا تھا۔

"آپ لوگ باہر بیٹھیں۔" ڈاکٹر نے مجھے اور شرف الدین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تایا آپ اور شرف الدین باہر چلے جائیں۔" میں نے تایا سے کہا اور خود خورشید چاچا کے قریب ہی کھڑا رہا۔ ان کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ غالباً" وہ بے ہوش تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

"آپ لوگ مریضوں کو اسی وقت لے کر آتے ہیں جب اس کا مرض انتہا پر پہنچ جاتا ہے پھر وہ مرجائے تو ڈاکٹروں پر یہ الزام رکھ دیتے ہیں کہ انھوں نے ماردیا' ٹھیک سے علاج نہیں کیا۔ یہ زخم تین دن پرانا ہے' کتے کا کاٹا ہوا تو ویسے بھی خطرناک ہوتا ہے اور یہ تو۔۔۔ بہت گہرا زخم ہے' گوشت کا پورا ٹکڑا غائب ہے۔ زہر پھیل چکا ہے۔ آپ کو پہلے روز

ہی بلکہ اُس وقت لانا چاہئے تھا۔"

"ڈاکٹر! آپ بتائیے کہ اب کیا پوزیشن ہے؟" میں نے اس کی باتوں کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہم انھیں کیوں نہیں لائے۔

"صورت حال ٹھیک نہیں ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں، باقی خدا پر چھوڑ دیں۔ میں نے انھیں انجکشن دیا ہے، ہمارے سینئر ڈاکٹر آنے ہی والے ہوں گے، وہی یہ کیس ڈیل کریں گے۔"

اس کا لہجہ سپاٹ ہونے کے باوجود میں نے اس میں گہری مایوسی کو محسوس کر لیا تھا۔ خود مجھے بھی ان کی حالت ٹھیک نہیں لگتی تھی۔ پورا بازو نیلا ہو کر سوج چکا تھا۔ انگلیاں پھول کر بدہیئت ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر کو آستین کاٹنا پڑی تھی، بازو کی سوجن آہستہ آہستہ گردن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہ گئی، پھر ڈاکٹر بھی مجھے باہر جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سینئر ڈاکٹر آنے والے ہیں اور وہ مجھے یہاں دیکھ کر بہت ناراض ہوں گے۔ اسی لیے میں باہر آ گیا۔

"میاں وقار الحسن! بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ زخم تین دن پرانا ہے اور وہ تو سویرے بالکل ٹھیک ٹھاک گھر سے نکلے تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا تو وہ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔"

"تایا! ڈاکٹر خورشید چاچا کی طرف سے زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ وہ گھر کب آئے تھے۔ کیا ہوا تھا کچھ بتائیں تو۔"

"بھئی تم نکلے ہو اور یہ آئے ہیں۔ دروازہ میں نے ہی کھولا تھا۔ یہ پسینے سے شرابور، گھبرائے ہوئے سے تھے۔ ہاتھ پر بلکہ پورے بازو پر انھوں نے ایک کپڑا سا لپیٹا ہوا تھا۔ چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر انھیں سنبھالا۔ ان سے چلا نہیں جا رہا تھا، پتا نہیں گھر تک کیسے پہنچے ہوں گے۔ آتے ہی انھوں نے تمھارے بارے میں پوچھا۔ میں انھیں لیے ہوئے اندر آ گیا اور میں نے انھیں بتایا کہ تم شرف الدین کی طرف گئے ہو، پھر میں نے ان سے پوچھا کہ انھیں کیا ہوا ہے، اتنا سن کر انھوں نے اپنے بازو پر لپٹا کپڑا اتار دیا۔ وقار الحسن! میں ـــ میں دیکھ نہیں سکا۔ منہ پھیر لیا تھا میں نے۔ ان کا زخم سڑ چکا تھا۔ اس میں پیپ پڑی ہوئی تھی اور اس زخم سے بڑی ناگوار بو اٹھ رہی تھی پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکھڑائے، انھوں نے بہ مشکل یہ بتایا کہ انھیں ... نے کاٹ لیا تھا، پھر وہ بے ہوش ہو گئے۔ میں اور تمھارے چچا انھیں اٹھا کر بھاگے... تب تک بے ہوش پڑے ہیں۔ ڈاکٹر نے صاف کر کے پٹی تو باندھ دی ہے مگر لگتا ہے کہ زہر پورے بدن میں پھیل چکا ہے۔" بات کرتے کرتے تایا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں بھی آنکھوں میں آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خورشید چاچا ہمارے بزرگ کی سی حیثیت تھے۔ دادا کے زمانے سے انھوں نے زمینوں کا سارا... سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بابا کو بالکل اپنے بچوں کی طرح چاہتے حالانکہ وہ بابا سے صرف سال دو سال ہی بڑے ہوں... بابا کے بعد انھوں نے مجھے کبھی کسی پریشانی کا احساس ... ہونے دیا۔ وہ جس قدر دیانت داری سے زمینوں کا ... سنبھالے ہوئے تھے اس سے بہتر طریقے سے کوئی ... سنبھال ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھ پر تو انھوں نے کوئی ذمہ داری ڈالی ہی نہیں تھی حالانکہ اماں نے ان سے کئی بار ... کہ اب آپ وقار الحسن کو رفتہ رفتہ کام سمجھا دیں تا... کسی قابل ہو سکے مگر ہمیشہ انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ... ہے، "ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ تم اگر ... میرے ہاتھ سے لینا چاہتی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ ... اتنی بڑی ذمے داری سونپنا ابھی بہتر نہیں ہے۔

اگر خورشید چاچا کو کچھ ہو جاتا تو میں جانتا تھا کہ یہ خلا پر
کرنا ہمارے بس میں نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ دکھ مجھے اس
ات کا تھا کہ وہ میری وجہ سے اس افتاد سے دوچار ہوئے
تھے' انھیں کچھ ہو جاتا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہ
کر پاتا۔ میں نے شرف الدین کو ان کی کیفیت سے آگاہ کیا
ور ہم دونوں پریشان ہو کر کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکنے
لگے جہاں دو تین ڈاکٹرز خورشید چاچا کی میز کو گھیرے کھڑے
تھے۔ اچانک میں نے ڈاکٹرز کو باہر آتے دیکھا۔ میں اور
رف الدین جلدی سے دروازے کی طرف بڑھے۔

"آپ ان کے ساتھ ہیں؟" ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی
پوچھا۔ وہ سینئر ڈاکٹر وسیم الرحمان تھے۔

"جی!" میں نے فوراً کہا۔

"ہمیں ان کا بازو کاٹنا پڑے گا۔ زہر ابھی بدن میں پوری
طرح نہیں پھیلا ہے البتہ بازو میں زہر پوری طرح سرایت
کر چکا ہے۔ ہمیں ان کے بچنے کی امید کم ہے لیکن بازو کاٹ
کر ہم ایک کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔" یہ سنتے ہی میرے
ن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ شرف الدین کے علاوہ
تایا بھی فق ہو گئے تھے۔ "آیئے آپ کو فارم پر دستخط کرنا

ہیں' یہ آپ کے کون ہیں؟"

"چچا ہیں میرے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "یہ
میرے تایا ہیں۔" میں نے تایا کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر آپ آیئے۔" انھوں نے تایا سے کہا۔
تایا اور ڈاکٹر اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی تایا واپس
آگئے۔ خورشید چاچا کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر لے جایا
گیا۔

سورج ڈوبے ہوئے گھنٹا بھر ہو چکا تھا۔ میرے ذہن سے
وہ سارا پروگرام نکل چکا تھا۔ اتنا ہوش ہی کسے تھا کہ اس
بارے میں سوچتا۔ مجھے خورشید چاچا کی فکر تھی۔ میں ان کی
زندگی کی دعائیں کر رہا تھا۔ تایا نے چچا کو گھر بھیج دیا تھا تاکہ
اماں وغیرہ کو حالت بتا سکیں۔ ویسے بھی گھر میں صرف
خواتین رہ گئی تھیں۔ چچا کے چلے جانے پر میں بھی مطمئن
ہو گیا۔ مجھے گھر کی بھی فکر تھی۔ شرف الدین بھی خاموش
اور گم صم تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ خورشید
چاچا کو آپریشن تھیٹر گئے ابھی بہ مشکل آدھا ہی گھنٹا ہوا تھا
کہ ان کی موت کی اطلاع مل گئی۔ ایک گہرا سناٹا سا تھا جو
ہم سب کے اندر اترتا چلا گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ زہر بہت
تیزی سے بدن میں پھیلا ہے۔ بازو کاٹنے سے پہلے ہی وہ ختم
ہو چکے تھے۔ ان کی موت کی خبر نے جو سناٹا مجھ میں پھیلایا تھا
وہ بہت جلد ٹوٹ گیا' غیظ و غضب میرے وجود میں بے پناہ
شور پیدا کر رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر اس سادھو
تک پہنچ جاؤں اور اس کے ٹکڑے اڑا دوں۔ میں نے خود
میں طوفان سے اٹھتے محسوس کیے۔ میں نہیں جانتا کہ میں
کس طرح خورشید چاچا کی میت لے کر گھر پہنچا۔ میت گھر
پہنچتے ہی گویا کہرام مچ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے ہی گھر
کا کوئی اہم فرد ہم سے بچھڑ گیا ہو۔ وہ واقعی ہمارے گھر کے
فرد کی طرح تھے۔ ان کی تمام زندگی ہماری حویلی یا زمین پر
گزری تھی۔ ان کا دنیا میں صرف ایک بھائی اور بھتیجا تھا۔
وہ بھائی ہماری زمین پر بنے اس مکان میں ہی رہتے تھے جہاں
خورشید چاچا ہوتے تھے۔ بھتیجا تو امروہہ میں رہتا تھا کیونکہ
اس کی بیوی اور بچے وہاں تھے۔ خورشید چاچا نے شادی
نہیں کی تھی اور بھائی کی بیوی زمانہ پہلے مر چکی تھی۔ چاچا
کے بھائی اور بھتیجے کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ میں نے شرف
الدین کو زمینوں پر بھیج دیا۔ میں جانتا تھا کہ اسے جانے اور
واپس آنے میں کم از کم چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ ڈاکٹر
نے کہا تھا کہ انھیں جلد از جلد دفنا دیا جائے مگر تایا اس کے

حق میں نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھائی اور بھتیجا آجائے تو دفنایا جائے۔ وہ رات پھر ہم پر عذاب بن کر آئی تھی۔ ان کے غسل دکفن کا انتظام کرنے کے بعد میں عشاء کی نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔ تب ہی مجھے یاد آیا کہ ہمیں سورج ڈوبنے کے دو گھنٹے بعد بالیکا مندر کے پیچھے بلوایا گیا تھا مگر اب تو سورج ڈوبے بہت دیر ہوچکی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ابھی اور اسی وقت وہاں پہنچ جاؤں مگر خورشید چاچا کو دفنائے بغیر میرا غائب ہونا ٹھیک نہیں تھا۔ میں گھر والوں کو کیا کہتا کہ کہاں جارہا ہوں۔

میں نے نماز پڑھی' اپنی طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور خدا سے دعا کی کہ مجھے طاقت عطا کر' یا اگر میرے اندر کوئی ایسی طاقت ہے تو مجھے اس سے آگاہی دے تاکہ میں ان شیطانی چکروں سے نکل سکوں۔ ان حالات میں خورشید چاچا کی موت میرے لیے بڑا نقصان تھا جسے برداشت کرنا بے حد مشکل تھا۔ میں کافی دیر تک جائے نماز پر بیٹھا روتا رہا۔ مجھے خورشید چاچا کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ ان کی محبت' شفقت اور خلوص بھول نہیں سکتا تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ جب تک میں اس دنیا میں ہوں خورشید چاچا میرے ساتھ ہیں' وہ ہر مشکل وقت پر میرے کام آئے تھے اور ہمیشہ کام آتے رہیں گے' میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی بھیانک موت انھیں مجھ سے جدا کروے گی' یہ احساس زیادہ شدید تھا کہ وہ میری وجہ سے اس موت کا شکار ہوئے ہیں۔

رات کا پچھلا پہر تھا خورشید چاچا کے بھائی اور بھتیجا جو ان دنوں زمین پر ہی تھے۔ دونوں آگئے۔ اس سے قبل گھر میں جو موت کا سناٹا طاری ہوچکا تھا۔ اس میں جیسے دراڑیں سی پڑگئیں۔ ایک دبا دبا طوفان اٹھا۔ تایا جو تھک کر ذرا کمر ٹکنے کو لیٹ گئے تھے۔ وہ پھر اٹھ بیٹھے۔ بہنیں' پھوپی اور گھر کی دوسری عورتیں جو کلام پاک کی تلاوت کررہی تھیں لمحہ بھر کو چپ ہوکر بھائی اور بھتیجے کی آہ و زاریاں سننے لگیں۔

میں تھوڑی دیر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر شرف الدین کے پاس چلا آیا جو بیٹھک میں اوندھا پڑا تھا۔ اس قدر لمبا سفر وہ بھی کسی وقفے کے بغیر کافی تھکا دینے والا تھا پھر اس کی ذہنی حالت بھی کچھ مجھ سے مختلف نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ خورشید چاچا کی موت نے اسے بھی دھچکا پہنچایا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر شرف الدین اٹھ بیٹھا۔ "وقار ا[illegible] اب تمہارا میدان میں آنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ کیا تم [illegible] ہو کہ ہم سب ایک ایک کرکے موت کے منہ میں جائیں؟"

"میں فیصلہ کرچکا ہوں شرف الدین' اگر مجھ میں کو[illegible] معمولی طاقت نہیں ہے تو بھی مرد تو ہوں ناں' میرے مضبوط بازوؤں میں اتنی طاقت تو ہے کہ میں اس سا[illegible] گردن مروڑ دوں۔ اس کے چہرے پر اتنے گھونسے بر[illegible] کہ اس کا چہرہ بگڑ جائے۔ وہ ان شعبدوں سے زیاد[illegible] زیادہ مجھے مار ہی تو دے گا' اگر میں نے اسے نقصان [illegible] تو پھر مجھے مرنے میں بھی قباحت نہیں۔ ایسی خوفناک [illegible]سے موت بہتر ہے' یوں روز روز مرنے کی اذیت [illegible] سکوں گا ناں۔" میں سخت غصے میں تھا اور فیصلہ کرچکا [illegible] میں اب خود چل کر اس کے پاس جاؤں گا اور اسے [illegible] دوں گا کہ وہ ساری شعبدہ بازی بھول جائے گا۔

میرے تیور دیکھ کر شرف الدین کھل اٹھا۔ [illegible] تمہارے ساتھ ہوں وقار الحسن بدی کی طاقت کے لڑتے ہوئے موت کے منہ میں کود جانا جہاد ہے اور شرف ضرور حاصل کروں گا۔ اب یہی میرا نصب [illegible] ہے۔"

ہم دونوں فیصلہ کرچکے تھے۔ مجھے تو اپنے اند[illegible] آتش فشاں سا ابلتا محسوس ہورہا تھا۔ میں اس آتش[illegible] کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ آج کی رات تو گزر چکی تھی[illegible] بس تھے مگر میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں کل ہی رات [illegible] جاؤں گا۔ میں نے سوچ لیا کہ اماں کو امروہہ جا[illegible] روک دوں گا' اگر انھوں نے بہت ضروری جانا تو [illegible] ساتھ روانہ کردوں گا مگر میں معذرت کرلوں گا۔

صبح اذانوں کے فوراً بعد ہم خورشید چاچا کی میت [illegible] مسجد میں لے گئے۔ نماز جنازہ کے فوراً بعد ہم نے [illegible] دیا۔ میں نے خورشید چاچا کی لحد پر قسم کھائی کہ میں [illegible] ناگہانی موت کا بدلہ ضرور لوں گا۔ گھر بھر تھکا ہ[illegible] خورشید چاچا کے بھائی اور بھتیجے سویرے ہی واپس [illegible] وہ سوئم اپنے گھر کرنا چاہتے تھے گو تایا نے کہا کہ وہ [illegible] یہاں سوئم کرکے واپس جائیں۔ وہ تمام دن سب [illegible] رہے یا سوتے رہے۔ تایا تو بے چارے بہت ہی تھ[illegible]

[illegible] اسپتال لے کر جانے سے دفن کرنے تک وہ مسلسل [illegible] رہے تھے۔ اماں نے اسی روز امروہہ جانے کا ارادہ [illegible] کردیا تھا۔ میں نے بھی اس پر زور دیا کہ ہمیں سوئم کے [illegible] امروہہ جانا چاہیے۔ وہ مان گئی تھیں۔ اب میں اور [illegible] الدین اس رات سادھو کے پاس جانے کا فیصلہ کرچکے

[illegible] شاید میں آپ کو بتاچکا ہوں کہ مغرب کی نماز ادا کرتے [illegible] مجھے فیروزے کی انگوٹھی ملی تھی جسے میں پہن چکا تھا۔ [illegible] یقین کریں کہ اس انگوٹھی کو پہننے کے بعد نہ معلوم [illegible] میں خود میں حیرت انگیز تبدیلی پارہا تھا۔ مجھے اپنا قد [illegible] لگ رہا تھا یعنی میں اپنی اس لجلجی سی کیفیت یا شخصیت [illegible] باہر آچکا تھا جو اب سے پہلے محسوس ہوتی تھی۔ آپ [illegible] میرے گزشتہ حالات سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں بہت [illegible]ک' بزدل' شرمیلا اور احساس کمتری کا شکار لڑکا تھا۔ [illegible]ی ذرا سی بات پر خوف سے پیلا پڑ جاتا' اماں کے [illegible]وں پر سر رکھ کر سب باتیں بتادیتا یا شرف الدین کا [illegible] لیتا' ہر آہٹ پر سہم جاتا' یہ سب میری مسخ شخصیت کا [illegible] ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں خود فیصلہ کرنے کی' [illegible] کی اور عمل کرنے کی جرات کرسکتا ہوں۔ مطلب یہ [illegible] نے خود میں ایک بچہ تو پایا تھا مگر بھرپور مرد' جو اپنا [illegible] اکیلا برداشت کرتا ہے' اپنی رائے' اپنی سوچ اور [illegible] طریقہ کار سے مطمئن رہتا ہے' مجھ میں نہیں تھا لیکن [illegible] نگوٹھی کو پہننے کے بعد میں نے اپنی شخصیت میں جو [illegible] اپنی رائے میں جو استحکام اور اپنی سوچ میں جو [illegible] محسوس کی تھی وہ حیرت انگیز تھی۔ مجھے یوں لگا تھا [illegible] اپنے اندر گہرا ہوگیا ہوں۔ سوچنے' سمجھنے' پرکھنے [illegible] کرنے میں انفرادیت کا حامل ہوچکا ہوں۔

[illegible] بھی شخص کے لیے یہ تبدیلی معمولی نہیں ہوتی' جس [illegible] تبدیلی آتی ہے اسے یوں لگتا ہے جیسے اس نے زمین پر [illegible] پہلی بار جما کر رکھا ہو' جیسے بہت سے دھندلے نظر [illegible] والے مناظر' صاف اور واضح نظر آنے لگے ہوں۔ [illegible] چیز اور ہر بات کی گہرائی ایک خاص نقطہ نظر اختیار [illegible] تھا لیکن" یہ اسی تبدیلی کا ردعمل تھا کہ میں نے ایک [illegible] تنہا کرلیا اور اس فیصلے کے بعد میں نے کوئی خوف' [illegible] کمزوری محسوس نہیں کی۔ یہ تبدیلی خوش آیند تھی' [illegible] تبدیلی نے آگے چل کر میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔

آفات جس قدر شدت سے آئیں اسے میں نے اسی قدر شدت سے برداشت بھی کرلیا۔ آج میں سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ اگر اس وقت بھی میں وہی کمزور اور ہر بات پر گھگیانے والا وقار الحسن ہوتا تو کیا اب تک زندہ ہوتا؟ کیسے کیسے دل خراش مناظر تھے جنھوں نے میری آنکھوں میں خوف بھردیا تھا مگر میں پھر آنکھیں پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

معاف کیجیے گا شاید میں زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔ یہ کیفیت بھی کبھی کبھی ہی مجھ پر طاری ہوتی ہے ورنہ اگر آپ مجھے گلیشیئر سمجھ لیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں برف کے ایک بڑے تودے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ ایک ایسا برفانی تودا جس نے بڑے بڑے طوفانوں کا سامنا کیا تھا۔ ہاں تو آپ نے میرے بھٹک جانے پر مجھے معاف کردیا ناں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ آگے کے واقعات جاننے کے لیے کتنے بے چین ہوں گے۔

میں بتا رہا تھا کہ میں نے اور شرف الدین نے رات کو بالیکا مندر کے پیچھے اس شخص سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ وہاں سنہرے بابا نے مجھے بلوایا ہے اور شرف الدین کا خیال تھا کہ وہ سنہرے بابا نہیں ہوسکتے۔ اس کی بات میں وزن تھا سو ہم یہ یقین کرچکے تھے کہ وہ سادھو ہے جو مجھے دھوکے سے وہاں بلا رہا ہے۔

بہرحال ہمیں رات کا انتظار تھا۔ خورشید چاچا کی موت نے میرے فیصلے کو زیادہ پختگی دی تھی۔ میں اسے تہس نہس کر دینے کا ارادہ لے کر جارہا تھا۔ شرف الدین کافی جذباتی تھا' اس میں تو مجھ سے بھی زیادہ بڑی تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ گویا ایک منکر مسلمان ہوچکا تھا۔ ہم نے دن میں خوب آرام کرلیا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ رات ہم پہ کیا گزرے گی۔ میں نے دن میں کئی بار خود کو ٹٹول کر دیکھا مگر اپنے دل و دماغ کے کسی گوشے میں کسی کمزوری یا خوف کو محسوس نہیں کرسکا۔ اس پر مجھ میں بے پناہ خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ تایا اس روز بہت آزردہ تھے۔ میں اور شرف الدین شام کو بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے۔ ان پر مسلسل یاسیت طاری تھی' انھیں اس پر حیرت تھی کہ موت کتنی جلدی آجاتی ہے۔ صرف ایک روز پہلے' ہنستا بولتا اور چلتا پھرتا آدمی لمحوں میں مٹی بن جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نسیان انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے' وہ لمحہ بھر کو اگر موت جیسی ٹھوس اور مسلم حقیقت سے آشنا ہوکر فانی دنیا

سے بے زار ہو بھی جائے تو بس چند ہی لمحوں میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ بات پورے ماحول پر طاری تھی۔ اماں کو بے پناہ دکھ تھا۔ خورشید چاچا نے بابا کے بعد جس طرح ہماری زمینوں کا کام سنبھالا تھا وہ لائق تحسین تھا۔ شاید اماں اس لیے بھی فکر مند تھیں کہ اب ان جیسے دیانت دار شخص کا ملنا بہت مشکل تھا۔ میں ان کاموں سے بالکل ناواقف تھا۔ گو خورشید چاچا کے بھائی بھی اتنے ہی دیانت دار تھے اور خورشید چاچا ان پر بڑا بھروسا کرتے تھے بہرحال ان کا تعلق براہ راست ہم سے نہیں تھا۔ ہم ذاتی طور پر ان سے واقف بھی نہیں تھے نہ یہ جانتے تھے کہ وہ واقعی خورشید چاچا کی جگہ لے سکتے ہیں یا نہیں مگر جاتے جاتے انھوں نے اماں کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ انھیں خورشید چاچا کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ ان کی شخصیت بڑی شفیق تھی، مجھے یقین تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ کر دکھائیں گے۔ مجھے تو ان چکروں سے فرصت نہ تھی کہ میں اس کام میں کچھ سمجھ بوجھ پیدا کرتا۔ اب ان پر اور خدا پر بھروسا کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

دن جیسے تیسے گزر گیا۔ میں شام سے ہی بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ شرف الدین تو نہا دھو کر کپڑے بدل کر یوں تیار تھا جیسے کسی شادی میں جا رہا ہو۔ وہ اب بھی آیت الکرسی والا تعویذ پہنے ہوئے تھا۔ میں اسم اعظم پہنے ہوئے تھا جو مجھے بابا نے مرنے سے پہلے دیا تھا۔ انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔ خدا پر پورا یقین اور بھروسا تھا کہ وہ بدی کی طاقت کے خلاف میری مدد کرے گا۔ میں آج سورج ڈوبنے کے دو گھنٹے کے بعد وہاں جانا چاہتا تھا۔ شرف الدین نے بتایا تھا کہ بالیکا مندر شہر سے کافی دور ہے۔ ہم سورج ڈوبتے ہی گھر سے نکل جانا چاہتے تھے۔ جوں جوں سورج مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں لیکن ایسا خوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ ہم نے مغرب کی نماز قریبی مسجد میں پڑھی۔ میں اماں سے کہہ آیا تھا کہ ہم سنہرے بابا سے ملنے جا رہے ہیں کیونکہ ہمیں کسی نے اطلاع دی ہے کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ جھوٹ نہیں تھا، یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس بات پر یقین نہیں تھا۔

نماز کے بعد ہی ہم بالیکا مندر جانے کے لیے تانگا اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ بالیکا مندر کو جانے والی سڑک کافی پررونق تھی۔ میں پہلی مرتبہ بالیکا مندر کی طرف جا ر[ہا تھا۔] شرف الدین نے بتایا تھا کہ اس مندر میں جانے والی ز[یادہ تر] خواتین ہوتی ہیں۔ اس لمبی سڑک پر آتے ہی مجھے ا[س] بات کی صداقت کا احساس ہو گیا۔ اس سڑک پر ہ[مارے] آگے پیچھے کئی تانگے جا رہے تھے جن میں زیادہ تر [خواتین] تھیں، سورج ڈوب چکا تھا اب اس کی بچی کھچی کرنیں [سڑک] پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ یہاں آبادی برائے نام تھی [جو آگے] چل کر وہ بھی ختم ہو گئی۔ سڑک کے دونوں جانب ا[...] درخت تھے، دائیں بائیں سرکنڈوں کا جنگل سا تھ[ا۔] سڑک پر بجلی کے کھمبے بہت دور دور تھے جن میں لگے [بلبوں کی] روشنی اپنے نیچے ایک دائرے تک محدود تھی۔ مجھے [محسوس] ہوا کہ رات کی تاریکی میں یہ سڑک کافی پرہول لگتی [ہوگی۔] حد نگاہ تک کوئی عمارت یا کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہ[اں] آبادی کا گمان ہو۔ اگر ہمارے آگے پیچھے دوسرے ت[انگے نہ] ہوتے تو ماحول کی وحشت بڑھ جاتی ہے۔ نارنجی اور [...] رنگ کی ملی جلی روشنی میں بھی کسی خوف کا احسا[س نہیں] ہو رہا تھا مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ واپسی کا [سفر] تکلیف دہ ہوگا۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے یونہی چلتے رہے۔ شرف الد[ین نے] تانگے والے سے بات کر لی تھی کہ وہ ہماری واپسی تک [وہیں] ٹھہرے۔ اس نے کافی پیسے مانگے تھے جو بہرحال ہم[یں ادا] کرنا تھے ورنہ واپسی کا سفر دشوار ہو جاتا، آدھے گھنٹے کے بعد ہی ہمیں دور سے وہ عمارت نظر آ گئی۔ یہ ایک [...] سا موڑ مڑتے ہی اچانک ہمارے سامنے آ گئی تھی۔ [میں اس] عمارت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سیاہ پتھر سے بنی یہ [عمارت] شاید کئی سو برس پرانی تھی۔ پوری عمارت پر [...] مستطیل مینار تھے جس کے برج پر پیتل کا پتر چڑھا [ہوا تھا۔] ڈوبتے سورج کی کرنیں پیتل کے کلس سے ٹکرا ک[ر منعکس] ہو رہی تھیں۔ کالے پتھروں پر بڑے بڑے [...] ڈھلاؤں چھت تھی جس نے سامنے کے چبوترے [کو ڈھانپ] رکھا تھا۔ اس برآمدے میں جوگیا ساڑھی پہنے عور[تیں بیٹھی] تھیں یقیناً وہ مندر کی داسیاں ہوں گی کیوں کہ [...] دائرے میں بیٹھی تھیں۔ اس طرح بیٹھ کر صرف [...] کہا جا سکتا ہے۔ سڑک پر سے صاف دکھائی نہیں [دے رہا تھا] پھر بھی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ "آرادھنا" کر ر[ہی تھیں۔] فضا میں عجیب سی پراسراریت پھیلی ہوئی [تھی۔]

ستونوں پر آویزاں مشعلوں کی یرقان زدہ روشنی شام کے دھندلکے کی ہیبت کو مزید بڑھا رہی تھی۔

میں نے "دالان" کے سامنے تانگا رکوا لیا جبکہ دوسرے تانگے عمارت کے انتہائی بائیں جانب بنے ایک چھوٹے سے میدان میں کھڑے تھے۔ شاید یہاں آنے والے تانگے والوں کو روک لیتے تھے تاکہ اس میں جا سکیں کیونکہ اس طرف ٹریفک نہیں تھا۔ نہ آبادی تھی کہ دوسرے تانگے یا بس وغیرہ مل جاتیں۔ میں نے دیکھا کہ تانگے سے اترنے والی عورتیں ہاتھوں میں گیندے کے پھول، اور کچے مٹی کے پیالے لیے اندر جا رہی تھیں ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہر عورت نے گیروی رنگ کی ساری باندھ رکھی تھی۔ لمبے بالوں میں گیندے کے پھولوں کی لمبی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ وہ سب ننگے پاؤں تھیں۔ پیروں میں پڑی پائل کی جھنکار عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ ان کے خوب صورت چمک دار چہروں پر عجیب دبا دبا جوش تھا کچھ پا لینے کی للک تھی پیشانیوں پر سیندور سے بنی گہرے سرخ رنگ کی بندیا اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں ان لڑکیوں کے متناسب جسم، خوب صورت لباس اور چمکتے چہرے بہت خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ سب عورتیں پیلے دروازے سے اندر چلی گئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جو منظر لمحہ بھر پہلے میری آنکھوں میں تھا وہ ایک دلکش خواب تھا کیونکہ اب وہاں پرہول سناٹا تھا۔ مشعلوں کی تھرتھراتی ہوئی روشنی زمین پر پڑ کر عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ اس عمارت کے پیچھے ڈوبتے سورج کی گہری نارنجی روشنی تھی جس میں یہ سیاہ عمارت مزید سیاہ لگ رہی تھی۔

یہ ایک بہت حسین اور دل فریب منظر تھا جو آج تک میری نگاہوں میں رہ گیا۔ میں نے تانگے سے اتر کر قدم اسی دروازے کی طرف بڑھائے۔

"اے میاں۔ اس طرف کہاں چل دیے؟" شرف الدین نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں۔۔۔؟ اور کہاں جانا ہے؟ یہ بالیکا مندر ہے نا۔۔۔؟"

"جی ہاں، یہ بالیکا مندر ہے، مگر ہمیں اس مندر میں، اس کے پیچھے بنے کھنڈرات میں جانا ہے۔"

"اوہ" مجھے اچانک یاد آ گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

میں رک گیا۔ اس وقت تانگے والے نے ہمیں آواز دے لی۔

"بابو صاب! آپ کتنی دیر میں واپس آ رہے ہو! ہم لوگ یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔"

"ہم لوگ!" میں نے چونک کر کہا کیونکہ تانگے والا تو تنہا تھا۔

"ہاں ہاں یعنی ہم اور ہمارا گھوڑا۔ ہم دونوں سویرے ہی سو جاتے ہیں اور پھر سویرے ہی اٹھ جاتے ہیں۔ ویسے بھی یہاں زیادہ دیر کوئی نہیں ٹھہرتا مگر لگتا ہے آپ چھوکرا لوگ سب کو بھیج کر ہی جائیں گے۔ انی پتیاں جو ساتھ نہیں ہیں۔" اس نے دائیں آنکھ بند کر کے بڑے کمینے انداز میں کہا۔ میں غصے میں آگے بڑھا مگر شرف الدین نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ "ہمارا بھاڑا دے دیجے۔ کیا جانے آپ لوگ کب لوٹیں۔ ویسے ہم انتظار کریں گے مگر۔۔۔"

"ہمارا تمھارا کتنا بھاڑا طے ہوا ہے؟" شرف الدین نے اس سے سوال کیا۔

"ڈھائی آنے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"ہم تمہیں پانچ آنے دیں گے۔"

یہ سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "پانچ آنے؟ ٹھیک ہے، ہم انتظار کریں گے مگر یہ پیسا آپ کو پہلے دینا ہوگا۔"

میں نے جیب سے پانچ آنے نکال کر اس کے حوالے کر دیے جنھیں جیب میں ڈالتے ہی اس نے سر پر بندھا پگڑی نما چوخانے کا کپڑا کھول کر اسے جھاڑا اور تانگے کی پچھلی سیٹ پر بچھا دیا۔ "بس اب ہم سو رہے ہیں۔ آپ جب آؤ گے تو اٹھا دینا۔"

شرف الدین اس کی بات سن کر مسکرایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر پلٹ گیا۔ اس مندر کے چاروں طرف تین فٹ اونچا احاطہ بنا ہوا تھا۔ احاطے کی یہ دیوار بھی کالے پتھر کی تھی۔ اس کا گیٹ یا بیرونی دروازہ باقاعدہ نہیں بنا تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے ایک حصے کی دیوار توڑ کر راستہ بنایا گیا ہے۔ ہم دونوں اس احاطے میں داخل ہو گئے مگر ہم اصل عمارت میں جانے کی بجائے اس عمارت کے دائیں جانب چل پڑے۔ اب نارنجی روشنی گہری سرمئی ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اندھیرا بڑھ گیا تھا اور اس طرف تو یوں بھی اندھیرا زیادہ گہرا تھا کہ اس طرف عمارت کی کھڑکیاں روشن نہیں

ھی۔ عمارت کی دیوار اور احاطے کی دیوار کے درمیان شاید تین چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جہاں دیوار ختم ہوتی تھی وہاں کا ایک حصہ ملبے کی صورت میں گرا ہوا تھا اور اسی طرف راستہ سا بنایا گیا تھا۔

"ہمیں اس ٹوٹے ہوئے حصے سے اندر جانا ہے۔ ان کھنڈرات اور اس مندر کا اصل راستہ پچھلی طرف سے تھا مگر وہاں ڈھلان ہے۔ زمانوں پہلے پانی جمع ہوجانے کی وجہ سے دلدل سی بن گئی ہے اس لیے لوگوں نے پچھلے حصے سے راستہ بنالیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مندر ہزار برس پہلے لونا چماری نام کی داسی نے بنایا تھا۔ وہ کم کھیا دیوی جسے کام روپ بھی کہتے ہیں کی داسی تھی پھر کئی سو برس پہلے یہ مندر پانی میں ڈوب گیا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کام روپ دیوی کا اصل مندر آسام میں ہے' مگر یہ غلط ہے کام روپ یا کم کھیا دیوی کا اصل مندر یہی ہے' یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ پانی جب مندر کو خالی کرگیا تو یہ کافی عرصے غیر آباد رہا پھر تقریباً سو برس پہلے اسے رادھا نام کی عورت نے آباد کیا' وہ کام روپ کی داسی بن گئی تھی وہ مردوں کے عتاب کا شکار ایک ایسی عورت تھی جس میں نفرت اور انتقام کے جذبوں نے بھٹی سلگادی تھی۔ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی اور کئی مردوں کو اس نے اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد سے اس مندر کی داسی عورت ہی رہی ہے۔ چڑھتے چاند کی تاریخوں میں یہ مندر ویران نظر آتا ہے۔ مگر جوں جوں اماوس کی راتیں قریب آتی ہیں یہاں گیندے کی خوشبو' پائل کی جھنکار اور خوب صورت عورتوں کی ہنسی آباد ہوجاتی ہے۔" وہ بتارہا تھا اور میں حیرت سے سن رہا تھا گو جس ملک میں' میں رہ رہا تھا وہ ہندو کلچر کا عکاس تھا مگر پھر بھی امروہہ کا کلچر کافی مختلف تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی میری معلومات اتنی نہیں تھیں کہ میں امروہہ سے باہر نہیں رہا پھر میرا مطالعہ بھی ایسا نہیں تھا۔ شرف الدین کی باتیں سن کر یوں لگتا تھا کہ اس نے اس بارے میں باقاعدہ علم حاصل کیا ہے۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس قدر معلومات دیکھ کر میرا حیران ہونا لازمی تھا۔

"یہاں۔۔۔ کیا اندر مرد نہیں جاسکتے؟" میں نے پوچھا۔ ہم بہت آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اس لیے کہ ہمیں ابھی جلدی نہیں تھی۔ ابھی سورج کو ڈوبے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔

"کیوں نہیں جاسکتے۔ مگر اماوس کی راتوں میں نہیں جاسکتے' کیوں کہ ان راتوں میں یہاں کام روپ کی پوجا ہوتی ہے اور یہاں کی داسیاں کسی مرد کا سایہ تک یہاں برداشت نہیں کرسکتیں۔"

"یہ اماوس کی رات ہے اور آج یہ عورتیں غالباً" پوجا کے لیے ہی آئی ہیں۔ مجھے اپنے مرد ہونے پر بھی شبہ نہیں' تمہیں ہو تو ہو' پھر آج انھوں نے ہمیں برداشت کیسے کرلیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہم اندر نہیں جاسکتے' باہر تو تانگے والے بھی کھڑے ہیں بلکہ بعض عورتوں کے ساتھ بھی مرد آتے ہیں جو باہر ہی انتظار کرتے ہیں۔"

"اچھا۔ گویا چڑھتے چاند کی راتوں میں' میں یہ مندر دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے اپنے اشتیاق کو حتی الامکان دباتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چڑھتے چاند کی راتیں خوب صورت ہوتی ہیں۔ سیاح انھیں راتوں میں یہاں آتے ہیں' میں تمہیں مندر کا نظارہ ضرور کراؤں گا۔ میں نے اتنی خوب صورتی' اتنے وحشت ناک ماحول میں کبھی نہیں دیکھی۔ کام روپ سیکس کی دیوی ہے' سفید چمک دار پتھر سے بنائی گئی یہ مورتی بالکل برہنہ ہے' اس کے لمبے بال اس کے پیروں سے نیچے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے چرنوں میں اور اس کے گلے میں پڑے گیندے کے پھولوں کے ہار ایک عجیب سی سحر انگیز کیفیت میں مبتلا کردیتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوب صورت مورتی نہیں دیکھی۔ اس سیاہ عمارت میں اس سفید مورتی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے اس کے خوب صورت بدن سے شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔"

شرف الدین سے یہ سب سن کر میرا اشتیاق مزید بڑھ گیا۔ اب ہم اس ٹوٹے ہوئے حصے تک پہنچ چکے تھے۔ اس حصے سے اندر کی طرف مڑتے ہی مجھے سرکنڈوں کا جنگل سائیں سائیں کرتا نظر آیا۔ ہوا سے ہلتے ہوئے سرکنڈے بھوت پریت لگ رہے تھے۔ یہاں آگے جانے کا کوئی راستہ کم از کم مجھے تو نظر نہیں آرہا تھا۔

"یہاں۔۔۔ یہاں تو کوئی کھنڈر نہیں ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ وہاں حد نگاہ تک صرف سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھی جن کی سرسراہٹ گہرے اندھیرے میں اچھے بھلے انسان کو بوکھلانے کے لیے کافی تھی۔ اب مجھے افسوس ہورہا تھا کہ میں نے ٹارچ کیوں نہ لی۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپسی پر کیا ہوگا' یقیناً اس وقت تک اندھیرا مزید گہرا ہوچکا ہوگا۔

"کچھ دور تک ہمیں انھی سرکنڈوں میں سفر کرنا پڑے گا پھر تمہیں وہ کھنڈرات نظر آجائیں گے۔ اب سمجھ میں آیا کہ میں نے کیوں کہا تھا کہ یہ سنہرے بابا نہیں ہوسکتے۔ وہ بھلا ایسی جگہ کیوں بلاتے جہاں تک پہنچتے پہنچتے ہی آدمی ہلکان ہوجاتا ہے۔"

"ہاں! وہ یہاں نہیں بلاسکتے۔" میں نے سرہلایا۔ "یہ تو بتاؤ شرف الدین کہ میں تو اس جگہ کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا جبکہ تمہاری باتوں اور تمہارے یہاں تک آنے سے پتا چلتا ہے کہ تم اس جگہ کے بارے میں خوب جانتے تھے پھر تم نے ٹارچ کیوں نہیں لی؟ اس اندھیرے میں' ان جھاڑیوں سے گزرنا دشوار نہیں ہوگا؟"

"میں بے وقوف نہیں ہوں وقار الحسن۔" اس نے ہنس کر کہا اور اپنے پاجامے کی لمبی جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال لی۔ اسے روشن کیا تو روشنی کا چھوٹا سا دائرہ ہمارے آگے حرکت کرنے لگا۔ ایک بات واضح کردوں کہ اس زمانے میں لوگ اپنے پاجامے میں لمبی جیب رکھا کرتے تھے' اب تو پاجامے میں جیب کا فیشن ہی نہیں ہے بلکہ اب پاجامہ ہی نہیں رہا' بہرحال وہ ٹارچ دیکھ کر میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہوا۔ میں نے ایسی نازک ٹارچ پہلی بار دیکھی تھی ورنہ اس زمانے میں کافی موٹی موٹی اور بھدی قسم کی ٹارچ ہوا کرتی تھی۔ شرف الدین نے بتایا کہ یہ ٹارچ اس کا چچا زاد ولایت سے لایا تھا اور اس نے شرف الدین کو "تحفتاً" دی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں تو روشنی کا یہ چھوٹا سا دائرہ بھی بڑا غنیمت تھا۔

ہم نے آگے بڑھنے کے لیے وہ حصہ منتخب کیا جہاں جھاڑیاں نسبتاً" کم تھیں۔ ہمارے چلنے سے اور جھاڑیوں کے جسم سے ٹکرانے سے ایک عجیب سی آواز نکل رہی تھی جو شروع شروع میں بہت خوفناک لگی' کانوں کو بری لگنے والی یہ آواز دور تک گونج جاتی تھی۔ دور سے ہوا کے دوش پر جھولتے سرکنڈوں اور سرسراہٹ کی آواز لمحہ بھر کے لیے خوف زدہ کردیتی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں پلٹ کر واپس بھاگ جاتا مگر یقین کیجئے کہ ماحول کی وحشتناکی نے مجھ پر کوئی اثر نہیں [illegible] ایک الجھن تھی کہ مجھے اب تک وہ کھنڈرات نظر نہیں آئے تھے جو بقول شرف الدین کے اس جانب تھے۔

اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا تھا' اس کے ساتھ ساتھ جھینگر اور اس قسم کے دوسرے کیڑوں کی آوازیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ کبھی کبھی یہ آوازیں اچانک بند ہوجاتیں اور اگر اس لمحے ہم بھی راستہ تلاش کرنے کی غرض سے رکے ہوتے تو ایک دم خوفزدہ کردینے کا ہولناک سناٹا طاری ہوجاتا اور دل دھڑک اٹھتا تھا۔ مجھے حیرت تو اس بات پر تھی کہ اس سادھو نے یہ کیسے جان لیا کہ ہم اس خوفناک اور پر ہول راستے کو عبور کرکے اس تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ ایک ہی بات ہوسکتی کہ وہ اس طرح ہمارا امتحان لینا چاہتا تھا۔ یہ جاننا چاہتا تھا کہ قتل جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے کے بعد بھی مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ یہ ہولناکی برداشت کرسکوں یا نہیں۔ میں تو شکر کررہا تھا کہ شرف الدین میرے ساتھ تھا ورنہ اگر میں واقعی لمحے میں آکر اسے لیے بغیر تنہا یہاں آجاتا تو شاید آگے جانے کی ہمت دم توڑ دیتی۔ اب اندھیرا اتنا گہرا ہوچکا تھا کہ مجھے شرف الدین کے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آرہے تھے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ بھی خوفزدہ نہیں ہے' وہ بہرحال مجھ سے زیادہ مضبوط آدمی تھا۔

اب ہم کافی دور آگئے تھے میں نے پلٹ کر بالیکا مندر کی طرف دیکھا۔ اس کی عمارت اب اور زیادہ ہولناک نظر آرہی تھی۔ ہمارے پیچھے ہلتے ہوئے سرکنڈے یوں لگ رہے تھے جیسے بہت سے بھوت ایک ہی انداز میں جھوم رہے ہوں۔ ہمارے پیچھے اور آگے دور دور تک کوئی آدم زاد نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تو میرا جی چاہا کہ واپس جانے کے بارے میں کہوں مگر یہ سوچ کر چپ ہوگیا کہ شرف الدین میرا مذاق اڑائے گا۔ ویسے بھی ہم نے کافی فاصلہ عبور کرلیا تھا۔ ہم راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک یوں لگا جیسے کوئی چیز میرے پیر پر رینگ رہی ہے۔ میں بے اختیار اچھل پڑا۔ میں نے زور زور سے پیر جھٹکا' پھر دو تین بار اچھلا تاکہ وہ جو کچھ ہے ہم سے دور ہوجائے میرا جی چاہا کہ میں بھاگ پڑوں۔ میرے اچھلنے اور بے ہنگم سی آواز حلق سے نکلنے سے شرف الدین بھی اچھل پڑا تھا۔

"کیا ہوا۔ کیا ہے؟"

"بسپ۔ پتا نہیں۔" میری زبان لڑکھڑا گئی۔ "کوئی کیڑا تھا شاید۔" میں نے الجھی ہوئی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ تم نے تو ڈرا ہی دیا' لیکن تم کافی بے وقوف ہو' وہ کوئی سانپ بھی ہو سکتا تھا' ایسا محسوس کرتے ہی تمہیں ساکت ہو جانا چاہیے تھا۔ اب خیال رکھنا۔"

"شرف الدین! کیا آگے جانے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے؟ تم کہہ رہے تھے کہ لوگ وہاں بھینٹ چڑھاتے ہیں' اب تک تو لوگوں کے آنے جانے سے راستہ بن جانا چاہیے تھا۔"

"ممکن ہے کہ کوئی راستہ ہو مگر میرے علم میں نہیں ہے۔ وہ دیکھو آگے یہ جھاڑیاں کم ہیں۔ اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ۔۔۔ سامنے دیکھو' وہ عمارت۔۔۔ نظر آرہی ہے ناں؟"

اور میں نے غور کیا تو واقعی مجھے دور ایک عمارت کا ہیولا سا نظر آنے لگا۔ "ٹھیک ہے مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے اگر سانپ نکل آیا تو؟ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ تم نے خواہ مخواہ یاد دلا دیا۔ میں چھوٹا موٹا کیڑا سمجھتا رہتا تو باقی راستہ بھی آرام سے کٹ جاتا۔ ایسا کرو۔۔۔ دوڑ لگا دیتے ہیں۔ اس طرح جلدی بھی پہنچ جائیں گے اور کیڑوں' سانپوں سے بھی بچ جائیں گے۔ ہمارے بھاگنے سے وہ بوکھلا کر ہمارے راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

"جی' کسی سانپ کی دم پر پاؤں پڑ گیا تو پتا چلے گا' تمہارے خیال میں سانپ کو بھاگنا نہیں آتا؟"

"یہ سادھو یقیناً ہمارا امتحان لے رہا ہے۔" اب مجھے سارا غصہ اس سادھو پر آرہا تھا جو بلاوجہ ہی میرا دشمن بن گیا تھا۔

"اور جب وہ کچھ ہی دیر بعد تمہیں اپنے سر پر کھڑا دیکھے گا تو حیرت سے گنگ رہ جائے گا۔ ویسے سچی بات کہوں وقارالحسن!"

"ہاں کہو۔"

"اس وقت تو مجھے تمہاری بہادری پر رشک آرہا ہے' اور درمیان میں کئی بار میرا جی چاہا تھا کہ حیرت کے مارے گر کر مر جاؤں۔"

"یعنی؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا حالانکہ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ ڈرا سہما' اور پیلا پڑ جانے والا وقارالحسن' خورشید چاچا اپنے ساتھ ہی لے گئے ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ یہ سچ ہے شرف الدین! یہ بات تم ہی نہیں' میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں۔ یہ تبدیلی میرے لیے حیرت انگیز ہے۔"

"یہ زندگی کو پرکھنے کا صحیح طریقہ ہے وقارالحسن! ڈرتے رہنے سے آدمی زندگی صحیح طور پر نہیں گزار پاتا۔ اس کی ایسی کیفیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ واقعات لمحات اور مناظر کو ذہن میں رکھ سکے۔ گویا وہ اپنی زندگی کے چند قیمتی لمحے خود ہی اپنی زندگی سے نکال دیتا ہے۔ ہر آنے والا لمحہ آدمی کو نیا شعور دیتا ہے' اگر چند لمحے زندگی سے نکل جائیں تو گویا وہ شعور کی منازل طے نہیں کر پاتا اور یہ کوئی چھوٹا نقصان نہیں ہے۔"

شرف الدین میرے لیے ایک بڑا استاد ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی صحبت نے مجھ پر شعور کے کئی در کھولے تھے۔ زندگی کے فلسفے کا ادراک دیا تھا۔ وہ یقیناً "میرا وہ محسن تھا جو مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھا رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے دل میں اس کا احترام ہر پل بڑھا دیتی تھیں۔ کہتے تو یہ ہیں کہ آدمی زیادہ عرصہ کسی کے ساتھ رہے تو اس کی برائیاں آہستہ آہستہ اس پر آشکار ہونے لگتی ہیں اور وہ بہت جلد اس سے بیزار ہو جاتا ہے۔ یہ بات ٹھیک بھی ہے مگر شرف الدین کی خوبیاں ہی اب تک آشکار ہو سکی تھیں۔ میں نے اس کی ایک برائی بھی محسوس نہیں کی تھی' وہ بڑا کلچرڈ' بہادر' تہذیب یافتہ اور ہر لحاظ سے مکمل انسان تھا۔

اس وقت بھی اس کی باتوں نے راستے کا خوف کم کر دیا تھا اور ہم نے وہ راستہ بڑی آسانی سے عبور کر لیا۔ اب وہ کھنڈرات ہمارے بالکل سامنے تھے۔ اندر باہر گہری تاریکی اور غضب کا سناٹا تھا۔ اتنا لمبا راستہ پیدل عبور کرتے کرتے ہم بری طرح تھک چکے تھے۔ وہاں ایک پتھر پڑا تھا۔ ہم سے تقریباً بیس پچیس قدم کے فاصلے پر اس کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں تھیں مگر میری اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ان سیڑھیوں تک جا کر بیٹھ جاتا اس لیے میں اس بڑے پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنا سانس درست کرنے لگا۔ شرف الدین بھی اس پتھر پر ٹک گیا۔ مجھ پر تھکن ضرور طاری تھی لیکن خوف نام کی کسی چیز کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ذرا سا وقت ملا تو میں نے اس کھنڈرات کو غور سے دیکھا۔ اندر گہرا سناٹا اور

گہرا اندھیرا تھا۔ کسی کی موجودگی کے آثار نہ تھے۔ یکایک میرے ذہن میں آیا کہ یہاں ہمیں کل بلوایا گیا تھا' ہم آج آگئے ہیں' یقیناً آج یہاں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ یہ موٹی سی بات میرے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی' خواہ مخواہ اتنی کوفت اور تھکن اٹھائی۔ میں نے شرف الدین سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج اتنا کافی ہے۔ اندر جانا بیکار ہے کیونکہ اندر کوئی نہیں ہوگا۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کسی کی موجودگی کا پتا تو نہیں چل رہا۔"

"ثابت ہوا کہ ہم دونوں بے وقوف ہیں۔"

"میرے بارے میں یہ پہلا ثبوت ہے۔" اس نے شوخی سے کہا۔ "ویسے اب تو یہاں تک آگئے ہیں تو اندر بھی جھانک لیتے ہیں تاکہ آئندہ آئیں تو ماحول اجنبی نہ لگے۔"

"جی شکریہ مجھے ایسے ماحول سے اپنائیت کی کوئی خواہش نہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"یاد رکھو ایسے کھنڈرات کو ایسی تاریکی اور ایسے حالات میں دیکھنے کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔" شرف الدین نے قائل کرنا چاہا' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں تفریح کرنے آیا ہے پھر میں بھی یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ جہاں اتنی خواری اٹھائی ہے وہاں یہ اور سہی۔ ذرا سانس درست کرنے کے بعد میں اور شرف الدین اٹھ کھڑے ہوئے۔ آگے سرکنڈوں کی جھاڑیاں نہیں تھیں لیکن بڑے بڑے گھنے برگد کے بہت پرانے پیڑ تھے جن کی جٹیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ نیچے سوکھے پتے بکھرے ہوئے تھے جو پیروں تلے آکر چرمراتے تو عجیب سی آواز آتی۔ یہ کھنڈر بھی سیاہ پتھر سے بنی کسی عمارت کے تھے۔ اس کھنڈر کا ایک حصہ تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا جب کہ دوسرا حصہ سلامت تھا۔ یہاں ایک عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ شرف الدین نے اپنی ٹارچ روشن کر لی تھی اور ہم اس کے محدود دائرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ سیڑھیوں کے فوراً بعد ایک تکونی شکل کا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ شیشم کی سیاہ لکڑی کا بنا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ پیتل کے گولے سے نکلے ہوئے تھے۔ دائیں جانب پیتل کی ایک موٹی زنجیر تھی جس کے نچلے سرے پر بھی ایک موٹا سا گولا بنا ہوا تھا۔ یہ زنجیر غالباً "کنڈے کے طور پر استعمال کی جاتی ہوگی یا شاید یہ کبھی عدل کی زنجیر سمجھی جاتی ہو۔ اندر ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا' یہاں داخل ہوتے ہی سلین کی تیز بو نے لمحہ بھر کو چکرا کر رکھ دیا۔ یہ کمرا بالکل خالی تھا۔ [illegible] تھی البتہ ایک طرف دیوار میں کافی اونچائی پر ایک چھوٹی سی گیلری بنی ہوئی تھی اور ایک دروازہ تھا۔ غالباً" اس دروازے کے پیچھے کوئی کمرا ہوگا۔ یہ بالکل اسی طرح کا دروازہ اور گیلری تھی جیسی بادشاہوں کے محل میں ہوا کرتی تھی جہاں بادشاہ دربار عام لگایا کرتے تھے۔ دیواروں میں چاروں طرف طاقچے بنے ہوئے تھے۔ ان میں پیتل کی مشعل دان لگے ہوئے تھے۔ ہم یہاں کی ایک ایک چیز ٹارچ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے دبے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے سامنے کی دیوار میں تین دروازے تھے جو بند تھے۔ یہ دروازے نسبتاً" چھوٹے تھے مگر ان کی بھی وہی لکڑی تھی جو بیرونی دروازے کی تھی اور پیتل کے گولے بھی بنے ہوئے تھے۔ میں اور شرف الدین پہلے تینوں دروازوں کو دیکھتے رہے پھر ایک دروازے کو شرف الدین نے دھکا دیا مگر شاید وہ بند تھا۔ دھکا دینے بلکہ زور لگانے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا پھر اس نے دائیں جانب والے دروازے کو چھوا وہ بھی بند تھا۔ میں درمیان والے دروازے کے قریب تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس دروازے پر زور ڈالا' ایک خوفناک چرچراہٹ کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور میں اپنے ہی زور میں لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ کھلتے ہی یوں لگا جیسے گھپ اندھیرے میں اچانک ہی سورج طلوع ہو گیا ہو۔ میری آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں۔ میں نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی اور ساتھ ہی شرف الدین اچھل کر میری طرف بھاگا۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک خوفناک آواز نے ہمیں اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔

وہ ایسی آواز تھی جیسے کسی نے کرتال پر چوٹ ماری ہو۔ آواز اتنی تیز تھی کہ مجھے لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ آواز کا ارتعاش بہت دیر تک پورے بدن میں تھرتھری بن کر دوڑتا رہا۔ آنکھیں بے پناہ روشنی کی وجہ سے بند تھیں اور ہاتھ بے اختیار کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ بند آنکھوں میں گہرا سرخ رنگ لہریں سی لے رہا تھا۔ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ اگر تیز روشنی کی سمت منہ کر کے آنکھیں بند کر لی جائیں تو گہرا سرخ رنگ سامنے پھیلا

ہوا نظر آنے لگتا ہے' بند پپوٹوں سے گزرنے والی تیز شعاعیں ہمارے ہی خون کو منعکس کرتی ہیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہزاروں واٹ کا بلب جلا کر میرے چہرے کے آگے کردیا ہو۔ میں نے کئی بار آنکھیں کھولنا چاہیں مگر میں ایسا نہیں کرسکا۔

"ش۔ شرف الدین!" میں نے دھیرے سے شرف الدین کو پکارا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اب بھی میرے پاس ہے یا نہیں۔

"وقارالحسن! آنکھیں مت کھولنا۔" میری آواز سنتے ہی اس نے چیخ کر کہا۔

کرتال پر پڑنے والی چوٹ کا ارتعاش اب معدوم ہورہا تھا۔ میں نے کانوں پر سے ہاتھ ہٹالیے اور کوئی اور آواز سننے کا انتظار کرنے لگا۔ یہاں یقیناً کوئی تھا۔ اتنی تیز روشنی پھر کرتال پر پڑنے والی چوٹ یہاں کسی کی موجودگی کا بین ثبوت تھی مگر اب تک ہم نے کسی کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ نہ کوئی آواز تھی اور نہ ہی کوئی آہٹ' آواز کا ارتعاش معدوم ہوچکا تھا۔ اب چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ اتنا گہرا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو گونجدار آواز پیدا ہوتی پھر اچانک یوں لگا جیسے وہ تیز روشنی بجھ گئی ہو۔ اتنا گہرا اندھیرا چھایا کہ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سنہرے اور لال دھبے سے ناچنے لگے۔ میں نے بے آواز قدموں سے پیچھے کی طرف سرکنا شروع کردیا۔ اچانک میں کسی سے ٹکرا گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے چیخ نکلی' ساتھ ہی شرف الدین کی چیخ کی آواز بھی سنائی دی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ میں نے شرف الدین کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"باہر نکلو۔ پیچھے۔ پیچھے سرکو۔" میں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے پیچھے سرکنے لگے۔ یہ مجھے یقین تھا کہ جب میں کمرے میں لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا تھا تو شاید تین یا چار قدم ہی آگے بڑھا تھا۔ اس حساب سے میں پیچھے سرک کر دروازے تک پہنچنا چاہتا تھا مگر ہم الٹے قدموں کافی دور تک آگئے پر نہ دروازہ ملا نہ دیوار۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی لمبی تنگ اور اندھیری سرنگ میں چلے جارہے ہیں۔

"وقارالحسن! ہم شاید غلط آگئے ہیں۔ اس طرف چلو۔ ٹکرانے کی وجہ سے شاید ہمارے رخ تبدیل ہوگئے ہیں۔ دروازہ تو بالکل پیچھے تھا۔" شرف الدین کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ شاید وہ خوفزدہ تھا۔

"شرف الدین تمہارے پاس ٹارچ تھی ناں؟"

"ہاں۔ آں۔ تھی تو۔ کہاں گئی؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ شاید وہ ٹارچ کو جیب میں تلاش کررہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا تھا۔ میں چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔

"مل گئی؟" میں نے پوچھا۔

"نن نہیں۔ جیب میں تو نہیں ہے مگر۔ جیب میں تو نہیں رکھی تھی۔ وہ تو میرے ہاتھ میں تھی۔" اس کی آواز آئی۔

"گر تو نہیں گئی؟"

"ممکن ہے جب تم چیخے تھے اس وقت میں اچھل پڑا تھا اور تمہاری طرف لپکا تھا شاید اس وقت۔"

"دروازہ کہاں ہے؟" میں نے اندھیرے میں چاروں طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے ہم غلط سمت میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ وقارالحسن! تم کہاں ہو۔ میرا ہاتھ پکڑلو۔"

شرف الدین شاید میرے قریب آگیا تھا' اس کی آواز میرے قریب سے آرہی تھی۔ میں نے چاروں جانب ہاتھ بڑھائے' اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا چاروں طرف شرف الدین کو ڈھونڈتا رہا۔ ہم دونوں باتیں کرتے جارہے تھے تاکہ آواز ہی کی وجہ سے سمت کا اندازہ لگا سکیں مگر اس وقت میں نے بڑی عجیب سی بات محسوس کی۔ جب میں نے ہاتھ پاؤں چلانے کے بعد آواز سے سمت کا اندازہ لگانا چاہا تو یوں لگا جیسے شرف الدین کی آواز کہیں اوپر سے آرہی ہے اور چاروں طرف پھیل رہی ہے لمحہ بھر کو میں خوفزدہ ہوگیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی گہرے کنویں میں ہوں گہرے اور تنگ کنویں میں۔ میں کافی دیر تک کچھ نہ بولا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شرف الدین میرے لہجے سے کسی قسم کا خوف محسوس کرے البتہ وہ مسلسل بول رہا تھا شاید اس طرح وہ خوف کی جکڑ لینے والی کیفیت سے بچنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میں اب بہتر ہوں تب میں بولا۔ "شرف الدین! کیا اس سے پہلے تم یہاں آئے ہو؟"

"ہاں مگر۔ یہاں' اندر نہیں آیا تھا۔ یار' کسی طرح

یہاں سے نکلنے کی سبیل کرو۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے میں یہاں سے جاتے ہی اماں کے ہاں چلا جاؤں گا۔ ابا کے پہلو میں بیٹھا رہنا یہاں کی خوفناک صورتحال سے کہیں بہتر ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہیں گے میں وہی کروں گا۔ میں تمہیں بھول جانے کی ... ہمیشہ بھول جاتے ہیں سمجھوں گا کہ میں اب ... نہیں ..."

"نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ "یعنی تم مجھے ان حالات میں تنہا چھوڑ دو گے؟"

"ہاں یار! اب میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ تم تو جہاں جاتے ہو اپنے پیچھے روحوں اور بھوتوں کو لگالیتے ہو۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے؟"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مگر تم ہو کہاں یار۔ اور۔ اور تم ہنس کیسے رہے ہو؟" وہ کچھ حیران ہوکر بولا تھا۔

"اس لیے کہ ہم صرف اندھیرے کمرے میں بند ہوگئے ہیں اور ہمیں دروازہ ضرور مل جائے گا' نہ ملا تو یہی ہوگا ناں کہ ہم رات بھر یہاں بھٹکتے رہیں گے مگر صبح ہوتے ہی ہمیں دروازہ بھی نظر آجائے گا اور باہر بھی نکل سکیں گے۔"

"اس چکر میں مت رہنا۔" مجھے یقین تھا کہ ایسا کہتے ہوئے اس نے عورتوں کی طرح ہاتھ ضرور نچایا ہوگا۔ "ہم۔ ہم اس کمرے سے باہر تھے تو یہاں کی تیز روشنی کسی بھی جھری سے باہر دکھائی نہیں دی تھی حالانکہ یہاں کس قدر تیز روشنی تھی۔ یاد ہے کچھ؟"

اس کی بات سن کر میں بے ساختہ چونک اٹھا۔ واقعی وہ جینیس تھا۔ بڑی باریک باتیں بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہوجاتی تھیں۔ اس بات پر میں نے سوچا کہ ہم اس کمرے کے باہر' شرف الدین کی ٹارچ کی روشنی میں گھوم رہے تھے ورنہ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باہر کی روشنی بھی اندر نہیں پہنچ پائے گی' شاید اس کمرے میں کوئی روزن' کوئی کھڑکی یا کوئی جھری ایسی نہ تھی جہاں سے روشنی یا ہوا کا گزر ہوتا۔ میری کنپٹیوں سے پسینے کی لکیر سی بہہ کر ٹھوڑی تک آگئی۔

"شرف الدین۔! ہمیں فرش پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو تلاش کرنا چاہیے۔ تم میری آواز سے سمت کا اندازہ لگا کر میرے قریب آنے کی کوشش کرو۔" یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے باتیں کرنا شروع کردیں۔ میں کہہ رہا تھا۔ "وہ جو بھی ہے ہمیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا' اگر اس کا ایسا کوئی مقصد ہوتا تو اب تک ہم سلامت نہ ہوتے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ہمیں یہاں آئے ... تو گزری ہوں گے ناں! اور یہاں کوئی ہے ضرور۔"

"وقارالحسن! کیا تم سیڑھیاں بھی اترے ہو؟ تمہاری آواز کہیں نیچے سے آرہی ہے۔ یار اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ممکن ہے وہ جو بھی ہے ہمیں نقصان نہ پہنچائے مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میں دکھائی نہ دینے والی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا پہنچوں اور اپنی ہڈی پسلی تڑوا بیٹھوں۔" وہ روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا۔

اس کی بات سن کر میں پھر دہشت زدہ ہوگیا۔ مجھے بھی اس کی آواز اوپر سے آتی ہوئی لگ رہی تھی جب کہ میں نے اب تک ایک سیڑھی بھی عبور نہیں کی تھی۔ میں اب تک سپاٹ فرش پر ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ میرے ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔

"شرف الدین۔ میں کسی سیڑھی سے نیچے نہیں اترا۔ اور۔ اور مجھے تمہاری آواز اوپر سے آرہی ہے۔" میرے لہجے میں شاید خوف کا عنصر موجود تھا جس نے شرف الدین کو گم صم کردیا۔ وہ کافی دیر تک چپ رہا۔ مجھے اس اندھیرے میں' سناٹے سے دحشت ہونے لگی۔ "شرف الدین! با آواز بلند سورۃ الناس پڑھو۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور میں نے اور شرف الدین نے سورۃ الناس با آواز بلند پڑھنا شروع کردی۔ نہ معلوم اس بات کا خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا تھا بلکہ اب بھی یوں لگا تھا جیسے یہ میں نہ بولا ہوں بلکہ میرے اندر سے کوئی اور بولا ہو۔

شرف الدین کی آواز میں کپکپاہٹ تھی مگر میں پاٹ دار آواز میں آیت پڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر تھے۔ اچانک شرف الدین کی آواز آئی۔ "وقار!۔ یہ۔ یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں کھلتے ہی روشنی کی چند باریک کرنیں نظر آئیں۔ یوں لگا جیسے کوئی چھوٹی سی چیز چمک رہی ہے۔ یہ چیز میرے بالکل قریب تھی۔ میں نے جونہی ہاتھ ہلایا وہ چمکدار چیز بھی ہل گئی' اس وقت مجھے پتا چلا کہ چمکنے والی چیز دراصل میری اس انگوٹھی کا فیروزہ ہے۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو مجھے سبز گنبد والی مسجد سے

ملی تھی۔ میں حیران ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ فیروزے کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر آنکھوں سے قریب کرلیا۔ اب اس کی ہلکی نیلی روشنی میں مجھے اپنا ہاتھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں فرط جذبات سے کھڑا ہو گیا۔

"شرف الدین۔۔۔ شرف الدین یہ میری انگوٹھی کا نگینہ ہے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ یہ انگوٹھی مجھے کہاں سے اور کن حالات میں ملی تھی۔ وہ میرے قریب آگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سے قبل جو اس کی آواز دور اور اوپر سے آتی محسوس ہو رہی تھی، وہ کیفیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ وہ میرے روبرو تھا اور اب روشنی اتنی بڑھ چکی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ گو چہرے کے نقوش اب بھی واضح نہیں ہوئے تھے، مگر وہ مجھے ہیولے کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔

"دکھانا یہ انگوٹھی۔" اچانک اس نے کہا اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اس ہلکی نیلی روشنی میں، میں اس کا ہاتھ دیکھ کر لرز اٹھا۔ وہ کسی بھی طرح شرف الدین کا ہاتھ نہیں تھا۔ وہ کسی جوان آدمی کا ہاتھ نہیں بلکہ کسی انتہائی بوڑھے اور فاقہ زدہ شخص کا تھا۔ لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیاں جن پر ہزاروں جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ انگلیوں کے جوڑ عجیب پھیلے ہوئے اور چپٹے چپٹے تھے۔ بڑھے ہوئے ناخنوں میں میل بھرا ہوا تھا جو اتنی کم روشنی میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں نے بے ساختہ اپنے ہاتھ کو دیکھا، پھر دوسرا ہاتھ انگوٹھی کے قریب کر کے اسے دیکھا۔ میرے ہاتھ بالکل ٹھیک تھے۔

"دو ناں انگوٹھی۔۔۔ دکھاؤ۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟" شرف الدین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس بار مجھے اس کی آواز پھر کہیں دور اور اوپر سے آتی سنائی دی جب کہ وہ میرے قریب ہی تھا۔

"شرف الدین!" میری سرسراتی ہوئی سی سرگوشی گونجی، اور پھر میں نے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ اچانک اس کے چہرے کے قریب کر دیا۔ ایک بے ساختہ قسم کی چیخ میرے حلق سے خارج ہو کر پورے کمرے میں پھیل گئی۔ وہ شرف الدین نہیں تھا۔۔۔ وہی سادھو تھا۔ میں ہڑبڑا کر اس سے دور ہو گیا۔

ساتھ ہی میں نے شرف الدین کو بے تحاشہ آوازیں دینا شروع کر دیں۔ میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ میں خاموش ہو جانا چاہتا تھا مگر میری چیخیں بے ساختہ نکل رہی تھیں۔

"بہت چالاک ہو تم؟" یہ اجنبی آواز تھی، پھنسی پھنسی مگر باریک چبھتی ہوئی سی، کچھ کھرکھراتی ہوئی سی، اسے سنتے ہی جیسے میرے کانوں سے لے کر حلق تک میں خراشیں سی پڑتی محسوس ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی پورا کمرا جگمگا اٹھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ اب میں خاموش ہو چکا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف دیواروں پر بنے شمع دانوں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ سیاہ دیواروں پر عجیب اور ہیبت ناک تصویریں اور مجسمے کندے ہوئے تھے۔ میرے بالکل قریب، ایک ڈھانچہ نما شخص پیشانی پر چندن کا کشقہ لگائے بیٹھا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ شرف الدین کہیں نہیں تھا۔ وہ ڈھانچہ نما شخص سادھو تھا، وہی سادھو جس سے میں نے مکان خریدا تھا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس شخص کا چہرہ تو وہی ہے مگر باقی بدن کسی اور کا ہے۔ وہ اتنا دبلا پتلا نہ تھا بلکہ اچھا بھلا فربہ جسم کا آدمی تھا۔ آواز کیونکہ میں پہلی بار سن رہا تھا اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں، اس کی پتلی پتلی لمبی ٹانگیں اور چوڑے چپٹے گھٹنے دیکھ کر میرے بدن کی سنسناہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ویسی ہی ذہن میں چپک جانے والی تھیں جو اس وقت مجھ پر گڑی تھیں۔ نہ معلوم کیوں میرا جی چاہا کہ وہ پلک نہ جھپکے، شاید اس لیے کہ میں اس کے پلک جھپکنے کی ایسی کیفیت کا شکار رہ چکا تھا جو میرے لیے بے پناہ تکلیف دہ تھی۔ وہ پلک جھپکتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنے ناخنوں سے پکے فرش کو کھرچ رہا ہے اور یہ خوفناک آواز میں اپنے دماغ، کانوں اور جبڑوں میں محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ جو ایک آواز ہوتی ہے دانتوں میں لگنے والی بالکل وہی آواز تھی۔

"اس انگوٹھی کو اتار دو وقار الحسن! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس بار اس کی آواز میں کھرکھراہٹ اور چبھن کچھ کم تھی۔ وہ اب تک بغیر پلکیں جھپکے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم بہت طاقت ور ہو وقار الحسن!" شرف الدین کا کہا ہوا جملہ میرے دماغ میں گونج اٹھا اور میں نے اس لمحے میں اپنی خود اعتمادی کو بحال ہوتے محسوس کیا۔ میں نے اس سادھو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ کمرا روشن ہو جانے کے باوجود فیروزے سے نکلتی ہوئی نیلی شعاعوں کی روشنی میں کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ نیلی کرنیں میری نسوں میں داخل ہو رہی ہیں۔ میں نے ان کرنوں کو اپنی انگلیوں سے اپنی کلائی کی طرف بڑھتے محسوس کیا۔ یوں جیسے یہ کرنیں میرے لہو میں شامل ہو کر نسوں کے ذریعے دھیرے دھیرے بدن میں سفر کر رہی ہوں۔

"میں سن رہا ہوں۔۔۔ تم بات کرو۔" میں بولا تو مجھے اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی، بھاری اور پر اعتماد سی۔

"اس انگوٹھی کی موجودگی میں تم سے بات کرنا ممکن نہیں، اسے اتار دو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھا کہہ رہا تھا۔ اب اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چوڑے اور چپٹے گھٹنوں پر رکھ لیے تھے۔ اس کے نوکیلے کندھے آگے کی جانب یوں جھکے ہوئے تھے جیسے اس نے کمر پر کوئی بوجھ لاد رکھا ہو۔ اس کی لمبی پتلی گردن کسی سارس کی گردن لگ رہی تھی۔ اس کے بدصورت ہاتھ لمبی لمبی، ڈنڈی جیسے بازوؤں کے مقابلے میں بہت بڑے اور چوڑے چوڑے لگ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں کا رنگ سیاہی مائل نیلا تھا اور اس کی باچھوں میں سفید جھاگ سا بھرا ہوا تھا۔ مجھے اس کے وجود سے سخت کراہیت محسوس ہوئی۔ میں نے اتنی غلیظ شخصیت اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے اندر کو خم کھائے ہوئے پیٹ پر کھال کی کئی بٹیں لٹک رہی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں کہہ دوں "میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" مگر میں ایسا نہیں کہہ سکا۔ میں نے اتنی اذیت صرف اس لیے اٹھائی تھی کہ میں اس سے مل کر اپنی اس پراسرار قوت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ محض یہی بات تھی کہ میں اسے برداشت کر رہا تھا۔ اسے، جس نے مجھ سے رمیمو کو قتل کروایا تھا، جس کی وجہ سے خورشید چاچا موت کی وادی میں اتر گئے تھے، اس لیے میں چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "تم جس قدر نقصان مجھے پہنچا سکتے تھے تم نے پہنچا لیا۔ اب میری باری ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں بے چینی سی پھیلتی محسوس کی۔ اس کی آنکھوں کی یہ بے چینی اور پلکوں کی ہلکی سی جنبش نے پھر میرے دماغ میں کھرونچے سے ڈالنے شروع

کر دیئے۔ میرے اعصاب بری طرح اکڑ گئے، میں پھر اسی تکلیف دہ کیفیت میں مبتلا ہو گیا لیکن میں نے اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے خود کو نارمل ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

"میں تم سے کوئی دشمنی نہیں چاہتا بلکہ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں۔" اس کی کھرکھراتی ہوئی آواز بہت ناگوار تھی۔

"تمہارا رویہ میرے ساتھ دشمنوں والا رہا ہے۔ میرا دوست شرف الدین کہاں ہے؟" میں نے دبنگ لہجے میں پوچھا۔

"وہ محفوظ ہے۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میرے ہوتے ہوئے تم اسے کوئی نقصان پہنچا بھی نہیں سکتے۔ وہ ہے کہاں؟" میرے لہجے میں بلا کا اعتماد اور گرج تھی جس نے خود مجھے بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔ بہرحال میں اسے جس غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا اس میں کامیاب رہا تھا۔ وہ مجھ سے مرعوب ہو چکا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ شاید میں اپنے اندر کی تمام تر قوتوں پر قادر ہوں اور ان کا پورا پورا ادراک رکھتا ہوں۔

"ابھی میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، تنہائی میں۔۔۔"

"لیکن میں اس کی موجودگی کو تمہاری بات سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں، اگر تم کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو اس کے سامنے بھی کر سکتے ہو۔" میں نے اسی کرخت لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ عین اسی لمحے دیواروں پر روشن موم بتیاں اچانک گل ہو گئیں۔ گھور اندھیرا چھا گیا۔ میں بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ احساس زیادہ شدت سے ہوا کہ میں اکیلا ہوں۔

"بیٹھ جاؤ وقار الحسن!" اس سادھو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں آنکھیں پھاڑے گہرے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا حالانکہ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ اندھیرا کیوں ہو گیا یا شرف الدین کہاں ہے مگر اندھیرا ہوتے ہی جن سوچوں نے میرے دماغ میں چکرانا شروع کر دیا تھا ان کی وجہ سے میں کچھ بول کر اپنا خوف ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں پریشان تھا کہ شرف الدین کہاں گیا، اسے اگر کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا! میں یہاں سے تنہا کیسے نکل سکوں گا۔ میرے اور شرف الدین کے علاوہ تو کسی کو یہ پتا ہی نہیں تھا کہ ہم یہاں آئے ہیں۔ تانگے والے کے بارے میں مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کب کا واپس

جا چکا ہوگا۔ اب اگر اس سادھو کو ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ میں یونہی رعب ڈال رہا تھا اور میں اپنی کسی پوشیدہ طاقت سے واقف نہیں ہوں تو وہ یقیناً مجھے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ ان سوچوں نے میرے اعصاب جھنجھنا کر رکھ دیئے تھے۔ میں اگر کچھ بولتا تو وہ میری کیفیت کا اندازہ لگا لیتا اس لیے میں نے کمال ضبط سے کام لیا اور اس اندھیرے میں وحشت زدہ خدا سے مدد مانگتا رہا۔ میں نے سورۃ الناس پھر پڑھنا شروع کردی تھی۔ ابھی مجھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دھیرے دھیرے کمرا روشن ہونا شروع ہوگیا۔ یوں جیسے کوئی آہستہ آہستہ موم بتیوں کی لو بڑھا رہا ہو۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ مت کرو۔۔۔ مت پڑھو۔" میں نے سادھو کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنی۔

میں نے مزید تیز رفتاری سے پڑھنا شروع کردیا۔ اب میری آواز بھی بلند ہوگئی تھی۔ اس لمحے میں نے انگوٹھی کے فیروزے کو بھی چمکتے محسوس کیا۔ ابھی کمرے میں روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی کہ یوں لگا جیسے میرے پیچھے کوئی بھاری بھرکم چیز آگری ہو۔ سادھو پیچھے کی طرف سرک رہا تھا۔ اس کے نوکیلے کندھے کچھ اور جھک گئے تھے۔ اس کے سیاہ ہونٹوں کے کناروں سے نکلتا ہوا جھاگ زیادہ ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، آنکھیں وحشت ناک انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ میں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اپنی پشت سے شرف الدین کی آواز سن کر اچھل پڑا۔

"ہائے۔ ہائے دیکھا ناں۔۔۔ گرا دیا مجھے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنی کمر تھامے، آنکھیں میچے عجیب بکھرے ہوئے سے انداز میں فرش پر پڑا تھا۔ "شرف الدین!" میں نے اسے آواز دی۔

"ارے تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے سادھو پر نگاہ پڑتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔"

میں اب بھی سورۃ الناس پڑھ رہا تھا۔ میں نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے اشارہ کیا کہ وہ بھی پڑھے۔ وہ میرا اشارہ فوراً ہی سمجھ گیا، میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ اب اس کے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ وہ حیرت سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا، میں اسی پوزیشن میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی جلدی سے میرے قریب اس

پوزیشن میں آبیٹھا۔ شاید وہ سمجھ رہا ہو کہ اس طرح ضروری ہے۔

سادھو ایک انجانی سی اذیت میں مبتلا نظر آرہا اچانک وہ کچھ اور جھک گیا۔ اب وہ گھٹنوں کے بل ہاتھ زمین پر جمائے جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کے آثار بڑھ گئے تھے۔ اس کا بدشکل چہرہ ہیبت ناک تک بدشکل ہو چکا تھا۔ اب کمرا پوری طرح روشن تھا اور شرف الدین اس کے بالکل سامنے بیٹھے تھے اور جھکتا چلا جا رہا تھا جیسے کوئی اس کی کمر پر بوجھ لاد رہا ہو اسے بڑھاتا چلا جا رہا ہو۔ اس کی سانس بری طرح پھول تھی۔ میں اور شرف الدین اسے حیرت سے دیکھ رہے اچانک اس نے اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا اور چلایا "نہیں۔۔۔ نہیں کرو۔۔۔ بس کرو۔" یوں لگا جیسے اس گھٹ رہا ہو۔ عین اسی لمحے اس کی گدی پر خون کی با لکیریں سی بہتی نظر آئیں۔ خون کے قطرے زمین پر گر یوں چھن کی سی آواز آتی جیسے کسی نے جلتے توے پر پا بوندیں ٹپکا دی ہوں۔ میں اور شرف الدین آنکھیں پھا اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تو مجھے یوں لگا میں خوف سے چیخ اٹھوں گا۔ وہ سین میں زندگی بھر نہیں سکتا۔ میں نے اتنا خوفناک بچھو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ قسم کے بچھو کے بارے میں کبھی کچھ پڑھا یا سنا تھا۔ ایک بہت بڑا، ہاتھ بھر جتنا سیاہ بچھو تھا۔ اس کی گول آنکھیں ہم پر جمی ہوئی تھیں، وہ سادھو کی گردن میں گد چمٹا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس بچھو کسی کیکڑے کی طرح سادھو کی گدی میں اپنے پاؤں گا ہوئے تھے۔ خون کی باریک لکیریں انھی جگہوں سے بہ تھیں جہاں اس نے پاؤں گاڑ رکھے تھے۔ اس کا خوفناک ڈنک اوپر کو مڑا ہوا تھا اور وہ ہر پل سادھو کی گ میں ڈنک مار رہا تھا۔ اب میں سمجھ گیا کہ سادھو کس اذ میں مبتلا ہے۔ شرف الدین گم صم کسی بت کی طرح بیٹھا شاید وہ سورۃ الناس پڑھنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باند سادھو کو زمین پر جھکتے دیکھ رہا تھا۔

"شرف الدین! پڑھتے رہو۔" میں نے چلا کر کہا۔ ا لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میرا پورا بدن پسینے سے شرابور شرف الدین کو یہ کہتے ہی میں نے پھر سورہ پڑھنا شرو کردی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر دروازہ تلا

کرنا چاہا مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں کسی دیوار میں کوئی دروازہ یا کھڑکی نہیں تھی۔ اب شرف الدین بھی باآواز بلند سورۃ الناس پڑھ رہا تھا، اور غیر محسوس انداز میں پیچھے سرکتا جا رہا تھا۔

"تم اس اذیت سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔" اچانک میں نے کہا۔ میں خود اس منظر سے دہشت زدہ ہو چکا تھا۔ میں نے خود پر بہ مشکل قابو پا کر، اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر کہا تھا۔

اچانک دیوار کا کچھ حصہ جیسے ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ وہاں اتنا خلا ہوگیا تھا ہم باآسانی اس قید خانے سے نکل سکتے تھے۔ شرف الدین بڑی تیزی سے اس کھلے ہوئے حصے کی طرف بڑھا۔ میں سادھو پر نگاہیں گاڑے، آہستہ آہستہ دروازے کی جانب سرکنے لگا۔

"اور غور سے سن لو! تم نے اب اگر مجھے نقصان پہنچانے کی غلطی کی تو اس سے زیادہ اذیت میں بھی مبتلا ہوسکتے ہو۔ رحیمو کو تم نے جن حالات میں میرے ہاتھوں قتل کروایا۔ اب وہ حالات نہیں ہیں۔ تم نے اندھیرے میں مجھ پر وار کیا تھا۔" میں نے کڑک کر کہا۔ "مگر اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ اب میں تمہارے ہر وار کو روکنے کی طاقت رکھتا ہوں۔"

وہ انکار میں سر ہلاتا رہا مگر جھاگ بھرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکال سکا۔ میں نے اتنا ہی غنیمت جانا اور دروازے کی جانب سرکنے کی رفتار تیز کردی۔ شرف الدین دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ نہ معلوم کہ میرے دماغ میں کیا آیا۔ میں نے ایک دم آیت الکرسی پڑھنا شروع کردی اور پھر خود پر اور شرف الدین پر پھونک مار کر باہر نکل گیا۔ جس وقت میں باہر نکل رہا تھا اس وقت وہ سادھو اذیت سے چیخنے لگا تھا۔

اس کے منہ میں بھرا جھاگ اب زمین پر گر رہا تھا۔ اس کی خوفناک آنکھیں ابلتی جا رہی تھیں، رنگ نیلا پڑ چکا تھا۔ اچانک وہ زور دار چیخ مار کر اوندھے منہ گر پڑا۔ یہ وہی تھا جب میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی باہر نکلے تھے، قدم زمین پر رکھتے ہی میں اور شرف الدین دونوں ہی لڑکھڑا گئے۔ یوں لگا جیسے ہم نے کہیں اوپر سے چھلانگ لگائی ہے۔ یہ کھنڈر کے انتہائی دائیں جانب والا حصہ تھا۔ ہم کھنڈر کی بیرونی دیوار سے باہر کھڑے

تھے۔ ہماری بائیں جانب کیچڑ اور پانی سے دلدل سی بنی ہوئی تھی اور اس کیچڑ میں بلبلے سے پھوٹ رہے تھے۔ دروازے نما وہ خلا ختم ہو چکا تھا۔ دیوار اور اس دلدل کے درمیان صرف اتنی جگہ تھی کہ اگر ہم ذرا سی بے احتیاطی برتتے تو سیدھے دلدل میں جا گرتے۔ کھنڈر کی سیاہ دیوار بالکل سپاٹ تھی۔ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جسے پکڑ کر ہم سہارا لیتے، بہرحال جس مصیبت سے ہم نکل آئے تھے اس کے مقابلے میں یہ صورت حال لاکھ درجے بہتر تھی۔ اندھیرا تو یہاں بھی تھا مگر ایسا نہ تھا کہ ہم دیکھ نہ پاتے۔ میں نے شرف الدین سے کہا کہ وہ بہت احتیاط سے دیوار پر ہاتھ جما کر دائیں جانب بڑھے۔ اس طرف کچھ دور جا کر دلدل دیوار سے دور ہوگئی تھی۔ وہاں ہم باآسانی چل سکتے تھے، پھر ہم دونوں نے دیوار کی جانب منہ کرکے، ہاتھوں کو دیوار پر جما کے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ یہ تھوڑا سا فاصلہ عبور کرنے میں ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ ہر لمحہ یوں لگتا تھا جیسے ہمارے پاؤں پیچھے کی جانب پھسل رہے ہوں۔

قدرے کھلے حصے میں آکر میں بے دم سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا پھر میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ سرکنڈوں کی جھاڑیوں کی شکل میں ابھی ایک اور عذاب ہمارے سامنے تھا۔ اس راستے کے سوا ہمیں دوسرے راستے کا علم ہی نہیں تھا۔ نہ میں کسی اور راستے پر جا کر مزید رسک لینا چاہتا تھا سو ہم نے پھر اس جنگل سے گزرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ دیر سانس لینے کے بعد ہم نے ان سرکنڈوں کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں نہیں جانتا کہ ہم کیسے اور کب ان سرکنڈوں کے جنگل سے نکلے۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے اور ہماری تمام تر توجہ اس مندر کی طرف تھی جس کے احاطے کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہم اس طرف آئے تھے۔ کافی دیر بعد جب ہم اس احاطے کی دیوار کے قریب پہنچ گئے،

تب میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے رب کا لاکھ شکر ادا کیا۔ ہم جب سے اس کھنڈر سے نکلے تھے ہم نے پلٹ کر اس جانب نہیں دیکھا تھا۔ اب میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا تو درمیان میں سرکنڈوں کا گھنا جنگل حائل تھا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ بہرحال ہم نے دوسرے ہی لمحے وہ احاطہ بھی عبور کرلیا۔ اب ہم پھر مندر اور اس سیاہ دیوار کے درمیان سے گزرتے ہوئے مندر کے سامنے والے حصے

کی طرف آگئے۔

اچانک ہنسی اور پائل کی آوازیں ہمارے چاروں طرف پھیل گئیں۔ میں اور شرف الدین بھونچکے ہوکر مندر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں سے وہی عورتیں باہر آرہی تھیں جنھیں ہم نے رات مندر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی موم بتیاں تھیں جن کی روشنی میں ان سب کے چہرے، چاند کی طرح چمک رہے تھے۔

"یہ۔ یہ سب ابھی تک یہیں تھیں؟" میں نے شرف الدین سے پوچھا۔ "کیا رات بھر۔ یہاں۔"

"نہیں۔ یہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مندر رات دس بجے سے پہلے ہی ویران ہوجاتا ہے کیونکہ کہتے ہیں کہ اس مندر کی دیوی رات دس بجے کے بعد اپنی بھینٹ قبول کرتی ہے۔ جس عورت یا لڑکی کی دی ہوئی بھینٹ قبول ہوجاتی ہے' اس کے ڈالے ہوئے گیندے کے پھول کھلے رہتے ہیں اور جس کی بھینٹ قبول نہیں ہوتی اس کے پھول مرجھا جاتے ہیں۔ یہ لڑکیاں صبح اپنی بھینٹ کے بارے میں جاننے کے لیے آتی ہیں' لیکن سورج نکلنے کے بعد ہی وہ یہاں آتی ہیں۔"

"اگر ایسا ضروری ہوتا تو وہ سورج نکلنے کے بعد ہی آتیں۔ ابھی تو سورج نہیں نکلا۔" میں نے حیرت سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ شرف الدین بھونچکا کھڑا ایک جانب دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو میں خود بھی حیران ہوگیا۔ ایک جانب تانگے کھڑے تھے جن کی طرف وہ لڑکیاں جارہی تھیں۔ ان لڑکیوں نے روشن موم بتیوں کی تھالیاں مندر کے دروازے میں رکھ دی تھیں اور اب انھی کی روشنی میں آگے بڑھ رہی تھیں اور دوسری جانب ہمارا تانگے والا ابھی ابھی تک کھڑا تھا۔

شرف الدین تیزی سے اس جانب لپکا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ تانگے والا اب بھی پچھلی سیٹ پر سینے پر ہاتھ باندھے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اب تک ہمارا انتظار کررہا تھا' ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ اب یہاں سے گھر تک پیدل سفر کرنا پڑے گا۔

"ارے بھائی صاحب!" شرف الدین نے اس کا کاندھا ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"آں۔ ہاں۔ کیا ہے۔ اوہ۔ آپ لوگاں؟" اس نے جلدی سے اترتے ہوئے اور اپنا چوخانے والا کپڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اتی جلدی کائے کو آگئے؟ ہم تو سمجھے تھے رات بھر سے زیادہ ہی لگے گا۔" اس نے چوخانے والے کپڑے کو سر پر باندھتے ہوئے کہا پھر ہنسی کی آواز پر لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اچھا تو یوں آگئے تم لوگ جلدی' ورنہ تو۔"

میں اور شرف الدین حیرت کے سمندر میں گویا ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ جس قسم کی باتیں وہ کررہا تھا اس سے لگتا کہ ہم نے جانے اور واپس آنے میں دیر نہیں کی ہے' ہمارا خیال تھا کہ ہم تقریباً ساری رات گزار کر آرہے ہیں۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا تو ہمیں سرکنڈوں کا جنگل عبور کرنے میں لگ گیا تھا پھر ان کھنڈرات میں بھی کافی سے زیادہ وقت اذیت سے دوچار رہے تھے۔ واپسی پر بھی اتنا ہی وقت لگا جتنا جانے میں لگا تھا۔

"ہم نے تو سوچا تھا چلو نیند کا ایک جھونکا لے لیں گے۔" وہ اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔ "سویرے نکلتے ہیں ناں اس لیے تھک جاتے ہیں۔ یوں دوپہر میں قیلولہ کرلیتے ہیں پر اب ہڈیاں دھوپ میں پھر پھر کر گل گئی ہیں ناں' جلدی لیٹیں تو صبح جوڑ جگہ پر بیٹھتے ہی نہیں' کڑ کڑا جاتی ہیں ہڈیاں۔"

"بابو! ہمیں کتنی دیر ہوئی ہوگی؟" شرف الدین نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ گھڑی تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ بس ہم نے لی تھی۔ مشکل سے آدھا گھنٹا لگالو۔ چند گھڑی ادھر ادھر ہوگی بس۔" یہ کہہ کر اس نے چابک گھمایا اور منہ سے ٹخ ٹخ کی آوازیں نکالنے لگا۔ اس کا جواب سن کر میں اور شرف الدین دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اس نے جھپکی نہ لی ہوگی نیند بھر کر سویا ہوگا' ہم کیونکہ جلد آنے کا کہہ گئے تھے اس لیے اسے یہ خیال ہوا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے شرف الدین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ تانگے والا بہت باتونی تھا۔ مسلسل کچھ نہ کچھ بولے جارہا تھا جب کہ میں خاموشی چاہتا تھا۔ آخر تھک کر مجھے کہنا پڑا کہ وہ کچھ دیر کو خاموش ہوجائے۔ میری بات سن کر اس

"جی تایا۔ ہم انھی سے ملنے گئے تھے لیکن۔" میری بجائے شرف الدین نے جواب دیا۔ وہ جانے آگے کیا کہنے والا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ دبادیا۔ اس سے تو ڈر ہی لگتا تھا کہ جانے کب اس کی ذہنی رو بہک جائے۔ تایا سے کچھ چھپانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ انھیں شروع سے لے کر آخر تک کی کہانی سنانا پڑے گی اور پھر ان پر پریشانی کا ایک اور در کھل جائے گا ورنہ انھیں بتانے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

"بڑی جلدی لوٹ آئے۔" اماں شاید ہماری آواز سن کر کمرے سے نکلی تھیں۔

میں اور شریف الدین پھر چونک اٹھے "ہاں اماں۔ ہمیں کتنی دیر ہوئی ہوگی یہاں سے گئے؟"

"گھنٹا بھر۔ یا شاید ڈیڑھ گھنٹا ہوا ہوگا۔ کیوں۔ کیا ہوا؟" اماں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہ شرف الدین مجھے بولائے دے رہا تھا کہ بہت دیر ہوگئی ہے' اماں ڈانٹیں گی۔ میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ ہمیں زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ اس نے میری بات کی تائید میں سر ہلایا۔

"سنہرے بابا ملے؟" اماں نے دوسرا سوال کیا۔

"نہیں اماں! ہم نے کافی انتظار کیا مگر۔ لگتا ہے کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔" میں نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا اور ٹنکی کی طرف بڑھ گیا' یہ ٹنکی غسل خانے کے باہر سیمنٹ کے چبوترے پر رکھی تھی۔ میں نے کہنیوں تک ہاتھ دھوئے منہ دھویا' دونوں پیر مٹی میں اٹے ہوئے تھے' وہ دھوئے پھر وضو کرکے کھڑا ہوگیا۔ میرے ہٹتے ہی شرف الدین بھی آستین اوپر کرتا ہوا چلا آیا۔

ہم دونوں نے عشاء کی نماز پڑھی اور تایا کے قریب ہی جا بیٹھے۔ تایا کافی افسردہ تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے مگر دکھ ان کے چہرے پر جم سا گیا تھا۔ خورشید چاچا کی موت کا سب سے زیادہ گہرا اثر تایا نے لیا تھا۔

"تایا! کل امروہہ چل رہے ہیں ناں؟" شرف الدین نے کھنکار کر انھیں مخاطب کیا۔

"ہیں؟ دیکھو۔ کل اگر آئی تو سوچیں گے۔" انھوں نے دھیمے سے کہا۔

"تایا! آپ تو کچھ زیادہ ہی افسردہ ہوگئے۔" میں نے ان کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔

"اس کا چہرہ نگاہوں سے ہٹتا ہی نہیں اور ہاں میاں وقار! وہ آیا تھا۔ کیا نام ہے۔؟ ارے وہ رمضو بابا کا بیٹا۔ کیا نام تھا اس کا!"

"لڈن؟" میں چونک اٹھا۔

"ہاں بھئی وہی۔ عجیب بات کی اس نے۔" تایا خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔

"کیا۔ کیا بات؟" میرا دل دھڑک اٹھا۔ مجھے لگا جیسے وہ ساری داستانیں سنا چکا ہے تایا کو۔

"تم سنو گے تو۔ شاید یقین ہی نہ کرو۔ یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا مگر اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ ویسے دیکھنے میں تو کافی بدھو سا ہے' اور یوں بھی بھلا اسے ہم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" تایا خوامخواہ کی تمہید باندھ رہے تھے اور میری الجھن بڑھتی جارہی تھی۔

"تایا وہ کہاں ہے۔ اور کیا بات کہی اس نے؟" میں زیادہ دیر ضبط نہ کرسکا۔

"تمھیں پوچھ رہا تھا' تمھاری اماں سے بھی ملا تھا۔ ہم نے بتایا کہ تم کہیں گئے ہو' ابھی آجاؤ گے۔ وہ انتظار کرے مگر وہ بیٹھا ہی نہیں' کہنے لگا خورشید چاچا کے کام سے جارہا ہوں۔ لوٹ آؤں گا۔"

"خورشید چاچا کے کام سے۔ کیسا کام؟" میں اور شرف الدین ایک ساتھ بول اٹھے۔

"یہ تو نہیں بتایا' میں تو اس کی بات سن کر ہی اتنا گڑبڑا گیا تھا کہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ کہتا ہے کہ کل رات خورشید چاچا نے اسے تمھارا پیغام دیا کہ وہ فوراً یہاں آجائے۔ سنا تم نے؟" وہ مجھے ہونقوں کی طرح بیٹھا دیکھ کر بولے۔ "کل رات اسے خورشید چاچا نے امروہہ میں یہ پیغام دیا تھا۔ یعنی جس وقت وہ یہاں اسپتال میں موت اور زندگی کے بیچ ٹنگے ہوئے تھے' اس وقت وہ امروہہ میں اسے پیغام دے رہے تھے۔ لاحول ولا۔ کیا خرافات ہے۔ بالکل بے وقوفی کی بات۔ وہ موت سے لڑ رہے تھے' پھر اسی لڑائی میں ہار گئے اور آج سویرے ہم نے انھیں دفن بھی کردیا مگر وہ انھی کے کسی کام سے گیا ہے' کہتا تھا کہ آج کام نہ کیا تو خورشید چاچا بہت ڈانٹیں گے' میں نے یہ سب سن کر ابھی اسے خورشید چاچا کی موت کے بارے میں کچھ

منہ بن گیا مگر وہ خاموش ہوگیا۔ ہمارے آگے ان عورتوں کے تانگے جارہے تھے جو پراتھنا کرکے لوٹ رہی تھیں۔ ان کی ہنسی، چوڑیوں کی کھنک اور پائل کی چھنک کے ساتھ ہی سنسان لمبی سیاہ سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز عجیب سا منظر تھا۔ سحر آگئیں سا۔ آسمان بالکل سیاہ تھا، شہر کی روشنیوں کی جھلک دور سے اوپر پھیلی ہوئی تھی اور جہاں یہ روشنیاں تھیں وہاں آسمان ہلکا روشن نظر آرہا تھا۔ جس سڑک پر ہم جارہے تھے وہاں دور دور بجلی کے کھمبے تھے جن پر کہیں بلب تھے اور کہیں نہیں تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ میں نے اس جانب نگاہ کی جہاں سے ہم آرہے تھے۔ مندر کی سیاہ عمارت کسی دیو کی طرح نظر آرہی تھی جس کے چاروں طرف ایک ہولناک سکوت طاری تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ہولناک سکوت کے پیچھے ہم نے کتنا اذیت ناک وقت گزارا ہے۔ اس سادھو کی کھرکھراتی آواز، اس کی دماغ کو کھرچتی آنکھیں اور اس کا نیلا پڑتا ہوا چہرہ اب بھی میری نگاہوں میں تھا۔ جس وقت ہم نکلے ہیں اس وقت میں نے اسی کی اتنی کرب انگیز چیخ سنی تھی کہ لگ رہا تھا وہ اب تک مرچکا ہوگا۔ مجھے شدید حیرت اس بچھو پر تھی، وہ یقیناً بچھو تھا مگر اس کی ٹانگیں کسی کیکڑے کی طرح سادھو کے بدن میں گھسی ہوئی تھیں اور ویسے بھی میں نے اتنا بڑا بچھو پہلی بار دیکھا تھا۔

شاہ ولائیت کے مزار پر میں بچھوؤں کو بہت غور سے دیکھ چکا تھا۔ وہاں بڑے بچھو بھی تھے مگر یہ بچھو تو چھوٹے کچھوے کی برابر کا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں کپکپا کر رہ گیا۔ شرف الدین شاید میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ "کیا بات ہے وقار الحسن!"

"ہوں۔۔ کچھ نہیں۔۔ میں گزرنے ہوئے لمحوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"یہ سب سوچنے کو بڑا وقت پڑا ہے۔" اس نے میرے ہاتھ کو تھپکا۔

میں بھی خاموش ہوگیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب ہمارے پاس سوچنے کو ان باتوں کے سوا رہ ہی کیا گیا تھا۔ شہر کی روشنیاں قریب آگئی تھیں۔ سڑکوں کی چہل پہل دیکھ کر مجھے اور شاید شریف الدین کو بھی اس تانگے والے کی باتوں کا اعتبار آگیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم یہاں سے گزرتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ میں نے پیٹرول پمپ کے قریب لاری اڈے کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیرت ز گیا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک اٹھارہ برس کے لڑکے کو ایک لاری دھوتے ہوئے دیکھا تھا لاری تو دھوچکا تھا مگر اب ٹائر دھو رہا تھا۔ گویا یہ درس کہ ہم گھنٹا آدھا گھنٹا ہی گزار کر واپس آگئے تھے۔ ہ والا البتہ اپنی بینچیں اور چارپائیاں اٹھا رہا تھا۔ بالٹیاں بڑے بڑے بھگونے دھلے ہوئے، الٹے رکھے تھے۔ وہ ہوٹل بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ سب دیکھنے کے میں نے شرف الدین کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بھی اطراف پر تھیں اور چہرے پر الجھن کے ساتھ ساتھ سوچ کے سائے تھے۔

کچھ دیر بعد ہم گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ کرایہ پہلے ہی دے چکے تھے پھر بھی میں نے اتر کر ایک اٹھنی تانگے والے کے ہاتھ پر رکھ دی تو اس کی باچھیں کھل گئیں، بگڑا ہوا موڈ ایک دم خوشگوار ہوگیا اور وہ لہک بولا "بابو! ہم لال پھاٹک کے قریب والی گلی میں رہتے ہیں سویرے سے نکل کر لاری اڈے چلے جاتے ہیں اگر کبھی ضرورت پڑے ناں تو ہمیں ہی کہنا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہمارا نام تو خیر بہت لمبا ہے، پر سارے جاننے وا چھوٹے میاں کہتے ہیں، کسی سے بھی پوچھ لینا کہ چھو میاں تانگے والے کہاں ہیں بس ہم پلک جھپکتے میں جائیں گے۔"

اس دوران میں، میں دروازہ کھٹکھٹا چکا تھا۔ اس کی با ختم ہوتے ہی بولا۔ "ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔"

وہ ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سلام کرکے آگے بڑھ اس کے ساتھ ہی اس نے تان لگائی۔ "رام وتا دیا۔۔ رامپا وتا دیا، میں نے دل تجھ کو دیا، میں نے دل کو دیا رامپا وما دیا۔" وہ بے پناہ خوش تھا۔ شاید اسے بار ایسی سواری ملی تھی۔ میں اسے جاتا دیکھ کر مسکرا رہا کہ دروازہ کھل گیا۔ سامنے تایا کھڑے تھے۔ ان کا مرجھایا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ اب تک یاسیت کے حصار سے نکل نہیں پائے۔ میں نے اور شرف الدین انھیں سلام کیا، وہ جواب دیتے ہوئے پلٹ گئے اور بولے

"تمھاری اماں بتارہی تھیں کہ تم سنہرے بابا سے گئے ہو۔"

نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے وقار الحسن کہ وہ اماں باوا کی موت کی وجہ سے کچھ باؤلا ہوگیا ہے۔ تم بھی اسے نہ بتانا جب تک اسے بہتر محسوس نہ کرو۔"

تایا تو ان باتوں کو جھوٹ سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ماں باپ کی موت نے لڈن کو پاگل کردیا ہے مگر میں۔۔؟ میرے اندر تو طوفان سے اٹھ رہے تھے یہ سچ تھا، میں نے خورشید چاچا سے کہا تھا کہ وہ جب امروہہ جائیں تو لڈن سے کہیں کہ وہ فوراً مجھ سے ملے۔ لڈن کی ماں کے مرنے کی خبر مجھے خورشید چاچا ہی نے دی تھی۔ میں نے تبھی ان سے کہہ دیا تھا اس لیے کہ خورشید چاچا اپنے بھتیجے کے پاس امروہہ جانا چاہتے تھے پھر مکان کی خریداری کی وجہ سے وہ رک گئے، پھر اماں نے اس مکان کی جھاڑ پونچھ کے لیے انھیں روک لیا، پھر رحمو کے قتل کی وجہ سے وہ نہ جاسکے اور اماں انھیں اب اپنے ساتھ امروہہ لے جانا چاہتی تھیں مگر اس بار موت ان کے آڑے آگئی تھی۔ وہ امروہہ جا ہی نہیں سکے تھے مگر انھوں نے لڈن کو میرا پیغام پہنچادیا تھا۔ کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ تایا کا کہنا تھا کہ لڈن کل رات کی بات کررہا ہے جب چچا موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل شام کو سیدھے امروہہ ہی سے آرہے ہوں۔ ممکن ہے وہ امروہہ گئے ہوں اور واپس آتے پر ان کی حالت خراب ہوئی ہو، وقت کی غلط فہمی ہورہی ہو اور بس، مگر اصل بات تو لڈن سے ملاقات کے بعد ہی سامنے آتی۔

"کیا سوچنے لگے؟"

تایا کی آواز پر میں چونک اٹھا۔ "کچھ نہیں تایا۔ وہ لڈن یسے بھی کچھ بے وقوف سا ہے مگر۔۔ ممکن ہے خورشید چاچا شام کو امروہہ چلے گئے ہوں اور وہیں سے آکر ان کی حالت بگڑی ہو۔" میں نے کہا۔

"میاں وہ یہاں مغرب کے وقت آئے تھے، جب تم ‌ نوں نماز کے لیے گئے ہوئے تھے۔ نہیں بلکہ تم شرف دین کے پاس گئے تھے ناں امروہہ جانے کا پروگرام نے؟"

"نہ۔۔ جی ہاں پھر ہم نماز پڑھ کر ہی واپس آئے تھے۔" رف الدین بے قراری سے بولا۔

"ہاں تو بس، جب تم لوگ واپس آئے ہو تو میں انھیں تال سے جاچکا تھا۔ یاد ہے ناں؟"

"جی۔۔!" میں نے سرہلایا۔

"اور وہ کہتا ہے کہ میں گھر کے آنگن میں بیٹھا لالٹین میں تیل ڈال رہا تھا پھر میں نے لالٹین جلا کر کنڈے میں ٹانگی تھی، اس وقت خورشید چاچا آگئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اذان ہوچکی تھی۔ اب سوچو تو امروہہ سے مراد آباد تک ہوائی جہاز تو نہیں چل رہے۔ تیز سے تیز لاری بھی عشا کے بعد ہی پہنچا پاتی پھر۔ میاں باؤلا ہے وہ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ دن میں گئے ہوں، عصر کے وقت سوار ہوکر مغرب تک یہاں پہنچ گئے ہوں۔"

"وہ کس کام سے گیا ہے، یہ نہیں بتایا اس نے؟" شرف الدین کافی بے چین ہوگیا تھا۔

"نہیں۔۔ وہ سنتا کم ہے، بولتا اور بوکھلاتا زیادہ ہے۔ ویسے پیلا پڑچکا ہے بے چارہ، اچھا خاصا بنا کٹا تھا۔ تم بتا رہے تھے کہ اس کے باوا کو کسی نے قتل کردیا تھا!"

"جی تایا۔۔" میں ان کے بولنے سے الجھ چکا تھا۔

"تو پتا چلا کہ یہ کس کا کام تھا، ویسے جس نے بھی قتل کیا، تھا بڑا بے صبرا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ خود ہی مرجاتے، ہمارے باوا کی عمر کے ہوں گے۔"

ان کی بات ختم ہوتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اماں بھی عین اسی وقت آگئیں۔ ان سے پتا چلا کہ لڈن سویرے آنے کا کہہ کر گیا ہے۔ اماں کھانے کی ٹرے ساتھ لائی تھیں۔ باقی سب شاید کھاچکے تھے۔ تایا البتہ میرا انتظار کررہے تھے۔ ہم تینوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ میں ذہنی طور پر ہی کیا جسمانی طور پر بھی کافی تھکا ہوا تھا۔ اتنا لمبا سفر، ایسی خواری، اس پر جو لمحات اس سادھو کے ساتھ گزرے تھے انھوں نے تو جیسے پورے بدن کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صرف ایک بات میرے حق میں رہی تھی جس کی وجہ سے میں خود میں بڑا گہرا اطمینان محسوس کررہا تھا کہ اس تمام عرصے میں، میں خوف کا شکار نہیں ہوا تھا اور اس سے میری کافی بچت ہوگئی تھی ورنہ شاید میں قدم اٹھانے کے قابل ہی نہ رہتا یا پھر اس کھنڈر تک ہی نہ پہنچا ہوتا۔ اب میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ میری اکھڑی ہوئی طبیعت نے شاید تایا کو بھی اس بات کا احساس دلادیا تھا۔

"جاؤ تم لوگ آرام کرو۔" وہ اتنا کہہ کر تکیہ ٹھیک کرنے لگے۔ میں نے غنیمت جانا اور شرف الدین کو لیے ہوئے بیٹھک میں چلا آیا۔ وہاں پہنچتے ہی میں لیٹ گیا، شرف الدین

نے بھی دیوان پر اپنے مخصوص انداز میں تکیہ سینے کے نیچے رکھا اور اس پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ میری جانب تھا۔

"وقار الحسن! ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔"

اور اسی لمحے میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔

"کک۔۔۔ کیا ہو گیا یار!" اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"شرف الدین! تمہیں یاد ہے کہ اس کھنڈر میں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میری آواز تمہیں کہیں نیچے سے آ رہی ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ایسا لگا تھا جیسے تم کسی تنگ سی سرنگ میں سے بول رہے ہو، کافی نیچے اتر گئے ہو۔ میں آواز کی سمت کا اندازہ لگا کر تمہارے قریب آنا چاہ رہا تھا مگر۔۔۔"

"پھر تم مجھ سے باتیں کرتے رہے تھے مگر۔۔۔ جب میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سورۃ الناس پڑھ رہا تھا اور میں نے تم سے بھی کہا تھا کہ تم بھی پڑھو، اس وقت میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، پھر شاید تم ہی نے کہا تھا ناں کہ یہ کیا چیز چمک رہی ہے، میری انگوٹھی کا فیروزہ چمکنے لگا تھا۔"

"نہیں۔۔۔ پتا نہیں۔ میں تو بس آنکھیں بند کیے پڑھتا ہی رہا تھا۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"تم نے کہا تھا۔۔۔ مجھے تمہاری آواز ہی نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا، پھر میں نے دیکھا کہ یہ انگوٹھی کا فیروزہ تھا۔ اس کی ملگجی روشنی میں، میں نے تمہیں ہیولے کی طرح دیکھا پھر تم نے کہا۔ "دکھانا ذرا۔" اور تم نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ تمہارا نہیں تھا۔" پھر میں نے اسے تمام باتیں بتائیں، وہ حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

"پھر جب میں نے سادھو سے کہا کہ شرف الدین کہاں ہے اسے بلاؤ تو تم اچانک میری پشت پر کہیں سے آ گرے تھے۔۔۔ تم کہاں تھے؟ کیا تم ہم دونوں کی باتیں سن رہے تھے، تم کیا محسوس کر رہے تھے؟"

"ارے نہیں یار۔۔۔ میں تو کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ نہ مجھے تمہارے اور سادھو کی آواز سنائی دی تھی۔ میں تو بس آنکھیں بند کیے سورۃ الناس پڑھ رہا تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ مجھے سب کچھ بھول گیا۔ میں کوشش کے باوجود قل ... کرتا رہ گیا، آگے کا سب کچھ بھول گیا لیکن میں گیا تو کہ ... بھی نہیں۔۔۔ ہاں اچانک مجھے یہ لگا تھا جیسے کسی نے مجھے ... کی طرف دھکا دیا ہے، تبھی میں کہیں نیچے جا گرا تھا۔ کر ... کی ہڈی سن ہو گئی تھی یار مگر۔۔۔ جو کچھ وہاں نظر آیا ا... نے تکلیف کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔۔۔ اور وہ بچھو ... اف بہت خوفناک تھا وہ۔ اب تک تو وہ سالا سادھو ... کر پگھل گیا ہوگا۔ ویسے وقار الحسن! مان گئے یار، ... بابا اور اس فقیر بابا نے سچ ہی کہا تھا۔ تم نے اس جیسے ... جادوگر کو ختم کر دیا۔ اب ڈٹے رہنا۔ یہ راستہ تو صاف ہ... اب جلدی سے امروہہ چلو اور اس شکنتلا کا معاملہ بھی ... دو۔ یار پرکاش کی لاش ڈھونڈ کر اسے دے دلا کر معاملہ ... کرو، پھر عصمت جہاں ہی رہ جائیں گی، میرا تو خیال ہے ... شریف خاتون ہیں، پردہ دار بھی ہیں، حویلی میں رونے ... کا بھی شوق نہیں ہے انہیں۔۔۔ ان کا معاملہ صاف ... ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا اور میں خود میں عجیب اطمینان اترتا محسوس کر رہا تھا، واقعی ساری کہانی یوں چٹکی بجا... ختم ہو گئی تھی۔ شکنتلا بیچاری تو بالکل بے ضرر تھی ... نے بھی سوچ لیا کہ اب امروہہ جا کر اس کا مسئلہ بھی دیکھ... گا۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کے ... میں مجھے کیا کرنا ہے مگر بہرحال مجھے خدا سے امید تھی کہ ... جلد ہی اس معاملے کو بھی نمٹا سکوں گا۔ ذہن میں جو ... کانٹا سا چبھ رہا تھا کہ میری اور سادھو کی بات چیت ... دوران شرف الدین کہاں تھا، وہ بھی نکل چکا تھا۔ سادھو ... شاید نظر بندی کر کے اسے میری اور ہمیں اس کی نگا... سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو بہت خو... محسوس کر رہا تھا، فتح مندی کا احساس مجھے سرشار کیے ہ... تھا، جس سادھو کے نام سے ہی میری جان نکلی جا رہی ... اسے میں اتنی آسانی سے انجام تک پہنچا آیا تھا۔ یہ کا... مجھے مغرور کرنے کے لیے کافی تھی۔

جس وقت میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا، اس وقت ... میں تراوٹ سی اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب میں ... بات پر بھی مطمئن تھا کہ رحیمو کے قتل کا راز بھی ... نہیں ہو سکے گا۔ جس کی ذات سے یہ راز فاش ہونے کا ... تھا وہ اپنی ہی پیٹھ پر سوار بچھو کے زہر سے مر چکا تھا۔ خو...

...ا اس قتل سے واقف تھے، وہ بھی مر چکے تھے۔ ان کی ... اداری پر تو مجھے شک نہیں تھا مگر ان کی معصومیت سے ... رور ڈر لگتا تھا۔ اب میں اور شرف الدین رہ گئے تھے، ... ہر ہے کہ میں اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی بھلا کیسے مارتا اور ... رف الدین کی دوستی پر مجھے اندھا اعتماد تھا۔

"کس سوچ میں پڑے ہو وقار؟" شرف الدین کی آواز ... کر میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ... لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں چمک اٹھنے والی حیرت نے ... مجھے چونکا دیا۔ "جو کچھ ہو چکا ہے اس پر سوچ رہا ہوں۔ ... مانی میری توقع سے بہت پہلے ختم ہو گئی۔" میرے لہجے میں ... ٹھہراؤ اور بھاری پن تھا۔

"وقار الحسن! تم۔۔۔ تم حیرت انگیز طور پر بدل گئے ہو۔ ...ں لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے میں تمہیں بڑا عرصہ گزرنے کے ...ر دیکھ رہا ہوں۔ اس عرصے میں تم ہزاروں تجربات سے ... لزر کر بہت سنجیدہ، پروقار اور۔۔۔ اور بس، تم بہت بدل گئے ...۔" اس کے انداز میں بلا کا اچنبھا تھا۔ اس کی آنکھوں ... حیرت کے ساتھ ساتھ الجھن بھی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے تھے شرف الدین! خوف ایک ایسی کیفیت ...ہے جو انسان کے جسم پر ہی نہیں روح پر بھی بہت گہرا اثر ...لتی ہے۔ واقعی خوف کی کیفیت میں گزرنے والے لمحے ...لویا انسان اپنی زندگی سے خود ہی خارج کر دیتا ہے اور ...لے۔ یوں اس کی قیمتی زندگی کے قیمتی ترین لمحات جیسے ہوا ...ں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ تمہاری اس بات نے میرے ...ندر بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میں خود کو بھی بڑا مختلف لگ رہا ...دل۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید یہی وہ مخفی طاقت ہے جسے ہر کوئی مجھ ...سے چھین لینا چاہتا ہے۔ ہر چیز سے ٹکرا جانے والی طاقت، ...سب کچھ تہس نہس کر دینے والی کیفیت ہی وہ طاقت ہے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں وقار الحسن! یہ طاقت تو مجھ میں بھی ہے، ...ہ میں نے کبھی کوئی لمحہ خوف کی نذر نہیں کیا، میں انسان کی ...خفی قوتوں کا اتنا ادراک ضرور رکھتا ہوں کہ وہ ہر چیز سے ...ٹکرانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ انسانی ...نفسیات بہت بڑا جن ہوتی ہے، آدمی جو چاہے کر سکتا ہے۔ ...و سننا چاہے سن سکتا ہے اور جو دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے ...مگر۔۔۔ مگر وقار الحسن! یہ کوئی اور چیز ہے۔ تم نہیں جانتے، ...کس وقت تم سادھو سے بات کر رہے تھے۔ جب تم اس کے ...چہرے پر نگاہیں گاڑے سورۃ الناس اور آیتہ الکرسی پڑھ رہے تھے اس وقت تمہارے چہرے پر کیا تھا۔ تمہاری آواز میں کیسا جادو تھا، تمہارے اکڑے اور پھیلے ہوئے شانوں میں کیسا طمطراق تھا، تمہاری آنکھیں۔۔۔ جانتے ہو میں نے ان آنکھوں میں کیا دیکھا تھا؟" وہ چپ ہو کر لمحہ بھر مجھے دیکھتا رہا۔

اپنی تعریف سن کر خود نمائی کا احساس مجھے شدت سے ہوا تھا اور میں نے اپنے ہونٹوں پر پراسرار قسم کی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی، پھر آنکھوں کو نیم وا کر کے بڑے انداز سے اسے دیکھا۔ "کیا دیکھا تم نے؟" میں نے یوں پوچھا جیسے کوئی باپ اپنے بچے کی معصوم سی کہانی سن کر حیرت زدہ ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

"چنگاریاں سی اڑتی دیکھی تھیں۔ بالکل ننھی ننھی سی چنگاریاں، جو اس سادھو کی گدی پر بیٹھے بچھو پر گر رہی تھیں اور شاید انہی کی تپش کی وجہ سے وہ اپنی کیکڑے جیسی ٹانگیں اس کے گوشت میں پیوست کرتا جا رہا تھا۔"

اپنی اداکاری کو میں زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکا۔ مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ شرف الدین اب مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ میں زور سے ہنس پڑا۔ "بس کرو شرف الدین! اتنے اونچے بانس پر مت چڑھاؤ کہ چھلانگ لگانا مشکل ہو جائے۔"

"یہ مذاق نہیں ہے وقار الحسن! یہ مذاق نہیں ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ شاید یہ اس فیروزے کی انگوٹھی کا کمال ہو یا۔۔۔ یا ان باداموں کا جو فقیر بابا نے تمہیں دیئے تھے۔ تم بالکل بدل چکے ہو وقار الحسن! اسے مان لو۔" وہ واقعی بہت سنجیدہ تھا۔ اس کا انداز، اس کا لہجہ اس کی سچائی کا ثبوت تھا۔

"مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ کیسی طاقت اور قوت ہے جس کو میں محسوس نہیں کر رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ سادھو اور اس کے جنتر منتر بیکار ہو گئے مگر اس کی وجہ میری کوئی مخفی قوت نہیں بلکہ یہ فیروزے کی انگوٹھی، آیتہ الکرسی اور سورۃ الناس کا کمال تھا۔"

"وقار الحسن! ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو دن بھر ہزاروں آیتیں پڑھتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں مگر۔۔۔ ان کی پڑھی ہوئی آیتوں کا اثر اتنا طاقت ور نہیں ہوتا، ان کی دعائیں پوری ہوتی ہیں مگر بتدریج، آہستہ آہستہ مگر میں نے کسی آیت کو یوں جادو اثر ہوتے نہیں دیکھا۔"

"شرف الدین!۔۔۔ تم غلط باتیں کر رہے ہو۔" میرا لہجہ کافی سخت تھا، مجھے اس کی باتوں سے تکلیف پہنچی تھی۔ "خدا کے کلام کی طاقت کا تمہیں اندازہ نہیں ہے شاید یا پھر تمہارا ایمان پختہ نہیں ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں یہی بات۔۔۔ یہی میں کہنا چاہ رہا تھا۔ اب تم نے کہا ہے تو مجھے الفاظ مل گئے ہیں۔ میرا مطلب یہی تھا کہ شاید ان لوگوں کا ایمان اتنا پختہ نہیں ہوتا کہ کوئی آیت پڑھیں اور پڑھتے ہی اس کا اثر ہو جائے۔ تمہارے ایمان کی پختگی ہی وہ اصل طاقت ہے۔ یہی ہے وقار الحسن!" وہ جذباتی ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔ یہی طاقت ہو۔ اس سے بڑی کوئی طاقت دنیا میں ہے ہی نہیں۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا پھر مجھے لڈن کا خیال آگیا۔ "یار شرف الدین! یہ لڈن والی کہانی کیا ہے؟"

"ہاں وقار الحسن! یہ نئی کہانی شروع ہو گئی۔ تم نے میرے سامنے ہی خورشید چاچا سے کہا تھا کہ وہ امروہہ جائیں تو لڈن کو یہاں بھیج دیں۔ اب وہ آئے گا تو اس سے پتا چلے گا۔" اتنا کہہ کر شرف الدین تکیہ ٹھیک کر کے لیٹ گیا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ اب سونا چاہتا ہے۔ اسے نیند نہ آرہی ہوتی تھی تو وہ ساری رات اس طرح تکیہ سینے کے نیچے رکھے اوندھا لیٹا رہتا تھا۔ جہاں اس نے تکیہ ٹھیک سے سر کے نیچے رکھا، سمجھو وہ سویا۔ تھکن مجھے بھی بے پناہ تھی۔ میں نے بھی سیدھے لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں بھی سونا چاہتا تھا۔ کل کی رات میں نے تقریباً جاگتے گزاری تھی کیونکہ گھر میں خورشید چاچا کی میت رکھی تھی، پھر سویرے انھیں دفنانے کے بعد میں سویا تو تھا مگر چند گھنٹوں کی نیند رات بھر کی نیند کا نعم البدل نہیں ہو سکتی سو نیند سے بدن میں اینٹھن سی تھی جو اس لمبے اور حیرت زدہ سے سفر نے دو چند کر دی تھی۔ میرے پٹھے اکڑے ہوئے تھے، پنڈلیوں میں تو بہت ہی زیادہ اینٹھن تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ کوئی مالش کر کے پٹھوں کو نرم کر دیتا۔ سر میں تیل ڈال کر کچھ سر کی مالش بھی کر دیتا تو مزے کی نیند آجاتی مگر اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ اماں کے کمرے میں جا کر جہانی آپا یا شنو آپا سے سر ہی میں تیل ڈلوا لیتا۔ اماں پنڈلیوں پر دوپٹا کس کے باندھ دیا کرتی تھیں جس سے بڑی جلدی آرام آجاتا تھا، میں یہ باتیں سوچتا رہا مگر اٹھا نہیں۔ کچھ دیر ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

صبح اٹھا تو اذانیں ہو رہی تھیں۔ شرف الدین سو رہا تھا۔ میں نے اسے ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا [illegible] نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ [illegible] سرخی کے ساتھ وحشت بھی بھری تھی۔ وہ پھٹی پھٹی [illegible] سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"او بھائی۔۔۔ اے میاں، میرے سر پر اب [illegible] نکل آئے ہیں کیا؟"

"اوہ۔۔" اس نے چونک کر اپنے چہرے پر [illegible] پھیرا، پھر دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کی طرف [illegible] ہوئے وہ دیوان پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کا [illegible] اس کے ہاتھوں میں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اب [illegible] میں نہیں ہے۔ وہ بار بار اپنے سر کو جھٹکے دے رہا [illegible]

"کیا بات ہے شرف الدین؟" میں اس کے [illegible] گیا۔

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ شاید۔۔۔ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ بچھو۔۔۔ وہ ہمارا پیچھا کر رہا [illegible] نے یہاں تک کا سفر تانگے کے پہیے پر بیٹھ کر کیا [illegible] الحسن! وہ۔۔۔ وہ یہاں موجود ہے، یہیں کہیں۔۔۔"

شرف الدین کی حالت اس وقت کافی خراب [illegible] چہرے پر یوں پھونٹ رہا تھا جیسے وہ سخت ورزش [illegible] آگ کے قریب بیٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں [illegible] تھی اور نچلا ہونٹ لرز رہا تھا۔

"شرف الدین۔۔۔ خود کو سنبھالو۔ تم نے خود کہا [illegible] بھیانک خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک خواب [illegible] کیفیت بہت شدید تھی، اس کا ذہن پر تادیر عالم [illegible] از قیاس نہیں لیکن اسے حقیقت سمجھ لینا نری [illegible] ہے۔ اٹھو، نہا لو تاکہ طبیعت کا بھاری پن ختم [illegible] اذان ہو چکی ہے۔ نماز پڑھ کر ٹہلنے چلیں گے۔ [illegible]

وہ سر اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے [illegible] میں وزن تلاش کر رہا ہو۔ وہ بہت جلد خود پر قابو [illegible] کامیاب ہو گیا۔ شاید اسے یقین آگیا تھا کہ وہ ایک خواب تھا اور بس۔۔۔ وہ اٹھا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا [illegible] خانہ خالی ہے یا نہیں، ابھی صرف اماں ہی اٹھی [illegible] جانتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں پھوپی اور بھنیر [illegible] جائیں گی۔ میں نے شرف الدین کو تولیہ اور صابن [illegible]

[illegible] کہا کہ وہ جلدی سے فارغ ہو جائے۔ شرف الدین نے [illegible] نے میں دیر نہیں لگائی۔ اماں اس دوران میں نماز پڑھ کر [illegible] کا پانی رکھ چکی تھیں۔ شرف الدین کے بعد میں نہا کر [illegible] آیا۔ اس وقت تک اماں ناشتا تیار کر چکی تھیں۔ تایا [illegible] کی چٹنی اور باسی روٹی بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ [illegible] زمانے میں ناشتے میں انڈے ڈبل روٹی کا فیشن نہیں [illegible] ہم سب رات کا سالن عموماً باسی روٹی سے کھاتے تھے، [illegible] بھی اماں مکھن لگی روٹی بھی بنا دیا کرتی تھیں۔ اس [illegible] انھوں نے مکھن لگی روٹی، رات کا سالن اور پیالے [illegible] شہد ہمارے سامنے رکھ دیا۔ تایا بھی نماز سے فارغ ہو کر [illegible] میں اور شرف الدین بھی نماز سے فارغ ہو کر ناشتے [illegible] لیے بیٹھ چکے تھے۔

"وقار الحسن! کیا تم امروہہ جانے سے گریزاں ہو؟" [illegible] نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو اماں! یہ آپ نے کیسے جانا؟" میں نے کہا۔

"تم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی جب کہ میں [illegible] کافی عرصے سے کہہ رہی ہوں کہ میں جلد از جلد اپنے [illegible] میں منتقل ہونا چاہتی ہوں، اگر تم امروہہ جانے سے [illegible] ب برت رہے ہو تو میں لڈن کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ [illegible] سا شروع ہو رہی ہیں اور ہمارے پاس گرم کپڑے یا [illegible] ہاں نہیں ہیں۔ یہ سامان امروہہ سے لانا ضروری [illegible]" اماں کے لہجے میں طنز تھا۔ شاید وہ مجھے بزدلی کا طعنہ [illegible] رہی تھیں۔ ممکن ہے وہ سمجھ رہی ہوں کہ کلکتہ کی [illegible] سے چھٹکارا مل جانے کی وجہ سے اب میں دوبارہ وہاں [illegible] جانا چاہتا۔

[illegible] میں آپ سے بات کرتا لیکن تھکن [illegible] کل نہیں بڑا پیدل چلنا پڑا تھا۔ اب آپ [illegible] میں چلنے کو تیار ہوں۔"

"[illegible] کیا یہاں تم بہت تکلیف میں ہو؟" تایا جواب [illegible] خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے، بول اٹھے۔

"[illegible] بھائی صاحب! تکلیف کی بات نہیں ہے۔ آپ [illegible] بہت خیال رکھا ہے مگر جب گھر خرید لیا گیا ہے تو کیا [illegible] ہی خالی پڑا رہنے دیا جائے گا! دوسری بات یہ ہے [illegible] کے رشتے کی بات چیت چلی ہے۔ میں چاہتی ہوں [illegible] کچھ بھی ہو اپنے ہی گھر میں ہو۔ بچی کا معاملہ ہے، [illegible] زبان کی خراب ہیں اور اپنے رویے سے ہر آئے گئے پر برا اثر ہی ڈالتی ہیں۔ انھیں مہمانوں کے سامنے آنے سے روکا بھی نہیں جا سکتا، اور سچی بات ہے کہ میرے دل کو ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے۔"

"اس قسم کے کھٹکے تو خیر یہاں سبھی کو لگے رہتے ہیں مگر وہ اتنی حد تک آگے نہیں بڑھ سکتیں، ویسے بھی ہماری بچی میں بھلا کون سی ایسی برائی ہے جو وہ لوگ انکار کر دیں گے!"

"بات برائی کی نہیں ہے، میں نے تو اپنی جان لگا کر ان بچوں کی تربیت کی ہے۔ صدیقہ بوا جو یہ رشتہ لے کر آئی تھیں، کچھ دیر کو چھوٹی دلھن کے ساتھ بیٹھی ہوں گی، میں چائے بنانے کے لیے کہنے گئی تھی۔ واپس آئی تو چھوٹی دلھن چلی گئیں مگر صدیقہ بوا بڑی رازداری سے پوچھ رہی تھیں کہ جہانی پر کیا آسیب رہ چکا ہے؟ اور وہ حویلی والا اور بھن اور اس کے میاں کے سانپ کے ڈسنے کا قصہ بھی پوچھ رہی تھیں کہ کیا ہوا تھا۔" اماں سخت غصے میں تھیں۔ اتنی دیر میں تائی بھی چلی آئیں۔

"بھئی دلھن! اس میں تمھارے گھبرانے کی بھلا کیا بات ہے۔ بھئی اگر حویلی میں آسیب ہے یا بھن اور اس کے شوہر کو سانپ نے ڈس لیا تھا تو اس سے جہانی کا کیا تعلق ہے؟"

"افوہ، جو بات آپ کو سمجھانے کی کوشش کی جائے صرف اسے سمجھنے پر زور دیا کریں۔" تائی نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"بیگم اگر ہم اس بات پر زور دے رہے ہوتے جسے پہلے روز سے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو اب تک اس دار فانی سے کوسوں دور نکل گئے ہوتے۔ ویسے سمجھانا کیا چاہتی ہو؟" آخری جملہ انھوں نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمھارے خیال میں ایسی باتوں سے جہانی کا رشتہ نہیں ہو گا؟"

"نہیں۔۔۔ اس کا رشتہ تو جہاں لکھا گیا ہے ہو جائے گا مگر چھوٹی دلھن کی زبان زہر ضرور گھول دے گی۔" تائی اماں نے تنتنا کر جواب دیا۔

"اس میں تو ماشاء اللہ ہمارے خاندان کی ہر زبان ماہر ہے، یہ تو ہمارے خاندان کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔" تایا پر سے یاسیت کا خول اتر رہا تھا۔

"بھائی صاحب! بات مذاق میں نہ ٹالیں۔ میں بہت زچ ہو چکی ہوں۔" اماں نے بیزار سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہمارے حوصلے کو داد دو، بھڑوں کے چھتے میں رہ رہے

ہیں۔" تایا اب بھی سنجیدہ نہیں ہوئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ وہ اس موضوع پر کبھی سنجیدہ نہیں ہوں گے۔ انھوں نے واقعی اس غیر سنجیدگی کی بنا پر ہی چچا چچی کے ساتھ اتنا عرصہ گزار لیا تھا۔ میرا تو خیر ان دونوں سے مکالمہ کم ہی ہوتا تھا مگر میرے اندازے غلط نہیں تھے۔ ان دونوں کا اکھڑا ہوا مزاج اور تیوریوں کے بل اس کا ثبوت تھے کہ اماں جو کہہ رہی تھیں' وہ ٹھیک ہے لیکن میں جانتا تھا کہ محض اس پر تایا گھر کا شیرازہ نہیں بکھرنے دیں گے۔ اس سے قبل کہ کوئی اور بات ہوتی' سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' چچا چچی دونوں آرہے تھے۔ اماں سر جھکا کر ناشتے میں مصروف ہو گئیں' تائی اماں نے گھور کر تایا کو دیکھا اور جھٹکے سے منہ پھیر لیا۔ تایا کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ گو ماحول میں تناؤ بڑھ گیا تھا مگر میں تایا کے خوش گوار موڈ کو دیکھ کر خوش تھا ورنہ ان پر طاری یاسیت نے مجھے بہت بد دل کر دیا تھا۔ چچا چچی سلام کر کے ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔ چچی نے شرف الدین کو دیکھ کر بڑا برا سا منہ بنایا اور سر پر دوپٹا جما کر کچھ پہلو بدل کر بیٹھ گئیں۔ تایا نے ان کی حرکت کو نوٹ کر لیا تھا۔ شرف الدین کچھ خجل سا ہو گیا۔ شاید وہ اٹھنے کی سوچ رہا تھا کہ تایا بول پڑے۔ "ہاں تو میاں شرف الدین! تمھارے بادا سے مل کر پہلا گمان تو یہی ہوا تھا کہ وہ اس مخلوق میں سے ہیں جسے خدا نے آگ سے بنایا ہے' لیکن کیونکہ انھیں ہم خاک سے بنے ہوئے لوگوں میں اتار دیا اس لیے اُن سے ان کا تعلق صرف چبانے کی حد تک ہی رہ گیا۔ چلو گزارے لائق ہیں۔ اب امروہہ جائیں گے تو ان سے بھی ملیں گے' میاں شادی کی تقریب میں تو وہ ہمیں اس طرح دیکھتے رہے تھے جیسے ہمارے نقوش پسند نہ آئے ہوں۔ حالانکہ یہ نقوش تو ہماری بیگم کو بھی پسند نہیں ہیں مگر ان میں برداشت کا مادہ بہت ہے۔"

"چپ رہا کریں آپ۔ جو منہ میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔" تائی پھر بھنا گئیں۔

"بیگم تم ہماری زبان گویا ہمارے بولنے کو مت ٹوکا کرو۔ اس سلسلے میں ہمیں پوری آزادی ہے اور ہم جب چاہیں اپنے اس ہتھیار کا جائز یا ناجائز استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ جرم دست اندازیٔ پولیس نہیں۔" تایا نے بڑا نازک طنز کیا تھا مگر شاید وہ چچی کے سر پر سے گزر گیا۔ وہ ویسے ہی سر جھکائے کھانے میں مصروف رہیں البتہ چچا نے مرغ کی طرح اونچی کر کے کچھ سمجھنے کی کوشش ضرور کی تھی' سب چہروں کے تاثرات سے بھی اندازہ لگانا چاہا تھا پھر انداز میں ناشتا کرنے لگے۔

بات جہاں تھی' وہیں رہ گئی۔ شرف الدین پہلے ہی کے چکر میں تھا۔ وہ چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا اور بیٹھک میں چلا گیا۔ مجھے چچی کا یہ انداز برا لگا تھا۔ الدین سے گھر کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ابھی آپا شنو آپا یا پھوپی محض لحاظ میں اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ تائی اماں اور اماں تو اسے اپنے بچوں ہی کی سمجھتی تھیں۔ چچی بھی یوں کئی بار اس کے سامنے تھیں ہاں کھانے یا ناشتے پر اس طرح سامنا نہیں ہوا میں نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ اس معاملے میں احتیاط گا۔

"تم نے بتایا نہیں اپنا پروگرام!" اماں پھر بول اٹھیں۔

"آپ جیسا بھی کہیں اماں۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"آج تو میں خورشید چاچا کے لیے قرآن خوانی گی۔ سوئم کا کھانا ہوگا۔ کل کے لیے ٹکٹ لے لو میں کوئی ردوبدل نہ کرنا۔" اماں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"تایا آپ بھی چلیں گے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میاں ہم بھی چلیں گے۔ ذرا آب و ہوا ہو جائے گی' کچھ سکون بھی نصیب ہوگا۔"

"پھر تو آپ وہیں رہ جایئے گا۔ سکون ہی سکون تائی اماں بری طرح جل گئیں۔ اب تک شاید الدین کے لحاظ میں کچھ نرم لہجہ اختیار کیے تھیں۔

"بیگم بھلا ہماری زندگی میں سکون کہاں؟ آپ وہاں بھی چکراتی پھر رہی ہے۔" انھوں نے ٹھنڈا رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا پھر کراہ کر سیدھے کھڑے ہو

"اے ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" تائی چونک اٹھیں۔ "اے دلھن اس حویلی میں تو"

"کچھ نہیں بھابی دلھن!" اماں نے ان کی بات دی۔ "وہ بیچاری اتنا نقصان نہیں پہنچا وہاں آباد ہونے جا رہے ہیں' سامان لے کر وہاں گے۔ اب تو چھوٹ ہی گئی حویلی۔ لیکن' میں

ہوں۔ لڑکیوں کا ٹھکانے ہو جائے تو وہیں رہوں گی

"

اماں نے بڑی حسرت سے حویلی کا ذکر کیا تھا۔ میرے دل ہوک سی اٹھی۔ اماں کی زندگی میں اب رہا ہی کیا تھا۔ موت نے انھیں جس صدمے سے دوچار کیا تھا اس ت کا اندازہ تو ہم لگا ہی سکتے تھے۔ ان کے دل میں ارمان تھے بھی کہاں جنھیں پورا کرنے کی آرزو مند ں' لے دے کے یہ حویلی تھی جس میں بسے رہنے کی ش نے انھیں کتنے ہی صدموں سے دوچار کر دیا تھا۔ نے اس لمحے ان کی آنکھوں میں ہزاروں کرچیاں سی ں۔ جیسے ان کے بہت سے خواب ٹوٹ کر بکھرے ے ہوں۔ اسی لمحے میں نے سوچ لیا کہ اس بار میں تلا سے صاف صاف بات کروں گا اگر اس کا مقصد پرکاش کی لاش حاصل کرنا ہے تو اسے خود لاش ں کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ دوسری صورت میں حویلی کو خالی کر دینا چاہیے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں میرے اندر آنے والی تبدیلی نے اب میرے سوچنے نداز کو بھی بدل دیا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا شکنتلا ہمیں بلیک میل کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا اس میں ہم میں سے کسی کا ہاتھ نہیں تھا اس اس کا رویہ ہمارے ساتھ قطعی مختلف ہونا چاہیے۔ مجھے ابا کی موت اور دادی کی اذیت ناک موت کا بھی ید دکھ ہو رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کے قصوروار نہیں

"ٹھیک ہے اماں! میں کل کے ٹکٹ لے لیتا ہوں۔ ل سویرے ہی نکل جائیں گے۔" میں نے فیصلہ کن زمیں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

یں ابھی بیٹھک کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک ا آواز نے میرے قدم تھام لیے۔ وہ تایا سے مخاطب

بھائی صاحب! میں سوچ رہا ہوں کہ اب زمین کے ں کی خود دیکھ بھال کروں۔ خورشید چاچا اللہ بخشے بہت زار اور دیانت دار آدمی تھے مگر اب۔۔۔ اگر وقار الحسن ں کو نہیں سنبھالیں گے تو بڑی دشواری ہو جائے گی۔ یسے بھی بیکار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں اور سچی بات تو خورشید چاچا کے بھائی مجھے بس یونہی سے لگے' بلکہ اندازہ یہ ہے کہ ان کا بھتیجا کچھ زیادہ ہی چلتر قسم کا ہے

ہمیں اس پر تو بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"میاں تم اپنے اندازوں کو تو ایک طرف ہی رکھو' زندگی میں آج تک تو تمھارا کوئی اندازہ درست ہوا ہی نہیں ہے۔ تم تو کبوتر تک خریدتے ہو تو وہ باتونی ہوتا ہے' کام دھیلے کا نہیں کرتا۔ شادی شدہ زندگی میں تم نے کئی قسم کے کام کرنے کی کوشش کی ہے جس سے کبھی فائدہ ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ تمھیں ہم کسی سے اپنی دشمنی چکانے کے لیے ہتھیار کے طور پر تو آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں مگر دوستی۔ یا کاروبار میں فائدہ اٹھانا۔"

"بس انھی باتوں نے میری زندگی برباد کر رکھی ہے۔" چچا تلملا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا لہجہ انتہائی گستاخانہ تھا۔ میں تایا سے انھیں اس طرح بات کرتے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

"اگر غور کرو تو تمھاری زندگی کی بربادی کی چند اور وجوہ بھی ہیں۔" تایا نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں ہاں میں جانتی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" چچی بھنا کر بولیں۔

"اتنی سمجھ دار کب سے ہو گئیں؟" تایا ان کے جانب پلٹے۔

"میں ہی ہوں نا ان کی بربادی کی ذمے دار۔؟ یا آپ لوگوں نے تو ہمیں محتاج بنا کر رکھ لیا ہے۔ دھیلے دھیلے کو ہمیں آپ لوگوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی نادان بچے نہیں ہیں۔ اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔ پہلے بڑے بھائی جان نے سب کچھ اپنے بس میں کر رکھا تھا تو چلو ہم چپ تھے۔ اب۔۔۔ اب ہم چھوٹوں کے دست نگر بن کر رہیں گے کیا۔؟" چچی کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ اونچی آواز میں بات کر رہی تھیں' اماں تو اسی وقت اٹھ کر چلی گئیں۔ تائی اماں وہیں بیٹھی نتھنے پھلا کر انھیں دیکھ رہی تھیں۔

"دشمن میاں! انھیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز کیا تم نے اب تک نہیں سکھائی؟" تایا نے سخت لہجے میں چچا سے کہا۔

"یعنی اگر کوئی سچ کہے' اپنا حق مانگے تو وہ بدتمیز ہے؟؟" چچا حد سے تجاوز کر گئے۔ ان کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

"اے میں تو پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ ان کا حصہ دے دلا کر الگ کرو۔ گلے میں گھنٹا گھر باندھ رکھا ہے ہمارے۔ چوبیس گھنٹے بجتا ہی رہتا ہے۔" تائی اماں پھنکاریں۔

"ہاں تو اتار پھینکیے ناں یہ گھنٹا گھر کیوں لٹکا رکھا ہے آپ نے۔۔۔ لو بھئی زندگی نہ ہوئی کٹھ پتلی کا تماشا ہو گئی۔ کہاں گئی' کیا کھایا' کیا پہنا' کیا کہا۔ ہر وقت' ہر بات کی جاسوسی' ہر آئے گئے کے سامنے بے عزتی۔" چچی نے تنک کر جواب دیا۔

"بس چھوٹی دلھن! زیادہ منہ نہ لگو ہمارے۔ ہر آئے گئے کے سامنے بے عزتی تو تم کرواتی ہو۔ صدیقہ بوا سے اتنی باتیں کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ آئے یتیم بچیوں کی دشمن بنی ہوئی ہو۔ اللہ ماری ذرا خوف خدا نہیں تمھیں؟" تائی اماں دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

چچا بڑے جارحانہ انداز میں کھڑے سب کو دیکھ رہے تھے۔ پھوپی' جہانی آپا شنو آپا دور اماں کے دروازے سے جھانک رہی تھیں۔ تایا کے چہرے پر گہرا دکھ پھیل چکا تھا۔ اب میری مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی ورنہ عموماً میں عورتوں والے معاملات میں بولتا نہیں تھا۔ چچا کے تیور اچھے نہیں تھے اس لیے میں ان کے قریب پہنچ گیا۔

"چچا! ایک ہی گھر کے افراد میں اتنی نفرتیں۔۔۔؟ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ بیٹھ جایئے۔۔۔ جو آپ کا حق ہے اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کر سکتا مگر حق مانگنے کا یہ طریقہ غلط ہے۔"

"بس بس میاں۔۔۔! یہ بڑے ہی نصیحتیں کرنے کو کافی ہیں' تم ابھی زمین سے ابھرے نہیں ہو اور۔۔۔۔" انھوں نے میرا وہ ہاتھ غصے اور نفرت سے جھٹک دیا جو میں نے بڑے پیار اور احترام سے ان کے کاندھے پر رکھا تھا۔ لمحہ بھر کو میں غصے میں بھنا کر رہ گیا۔

"بیٹھ جاؤ شمن! مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمھیں۔۔۔"

"عاق کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں تو سن لیجیے کہ یہ اختیار آپ کو نہیں ہے۔" چچا نے تایا کی پوری بات سنے بغیر ہی چلا کر جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ تم۔۔۔!" تایا کا چہرہ دکھ اور غصے سے تمتما اٹھا۔

"تایا!" میں نے جلدی سے ان کے قریب جا کر کہا۔ "یہ جو کچھ چاہتے ہیں انھیں دے دیں۔"

تایا نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ میں نے پلکیں جھپک کر اپنی بات کی تائید کی۔

"تم نہیں جانتے وقار الحسن کہ یہ شخص نوٹوں کی گڈیوں کو کبوتروں میں تبدیل کر دے گا۔ اس کا جن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے انھیں جانتا ہوں میں۔ یہ ہندو بنیوں کے ساتھ جوا کھیلتا ہے۔"

"میرا جو جی چاہے گا میں کروں گا۔ بڑی دولت ہے ناں مجھے کہ میں جوا کھیلتا ہوں۔ ارے پیسے پیسے کو ترس رہا ہوں۔ قرض دار ہوں لوگوں کا' بنچ سے بنچ ذات کا۔ میری ہنسی اڑاتا ہے کہ وہ جا رہا ہے نواب گھرانے کا بھکاری۔"

"اس میں تمھاری عادت و اطوار کو زیادہ دخل ہے۔" تایا پھر بول اٹھے۔

"ٹھیک ہے جی! ہمارے عادات و اطوار بگڑی ہوئی ہیں۔ کل کلاں برا وقت آیا تو آپ کے دروازے پر نہیں آئیں گے' ہمیں ہمارا حصہ دیں اور بس۔ لو بھیا! ہمارے پاس ایک چھپر بھی نہیں' ایک وہ بھابی دلھن ہیں کہ ا۔۔۔ حویلی پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں اور اب یہاں بھی ا۔۔۔ کوٹھی خرید لی۔ یہ انصاف ہے آپ کا؟" چچی بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھیں۔

صدمے سے تایا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ میں ان کی ۔۔۔ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ تائی اماں غصے سے چیخ اٹھیں۔ "۔۔۔ دیں گے بہن تمھارا حصہ بھی' جان دینے سے تو ۔۔۔ ہے۔" اتنا کہہ کر تائی اماں لپک کر پانی کا کٹورا لے ۔۔۔ میں نے تایا کو پانی پلایا۔

"شمن! اپنی زوجہ کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ رات کو تم سے بات کروں گا۔" تایا نے ضبط سے کام لیتے ہوئے دبے لہجے میں کہا۔

تائی اماں کے چیخنے سے اماں بھی دوڑی چلی آئی تھیں۔

"کیا ہوا۔۔۔ بھابی دلھن! کیا بات ہے؟"

"جائیداد کا حصہ حلق کی ہڈی بن گیا ہے ہماری۔ ۔۔۔ دے دلا کر مصیبت ختم کیوں نہیں کرتے!"

ان کی بات سن کر اماں نے ایک نظر چچا اور چچی کو ۔۔۔ پھر تایا کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "بھائی صاحب آج ہی یہ مسئلہ نمٹا دوں گی۔ آپ وکیل کو بلالیں۔"

تایا نے دکھ سے ان کی طرف دیکھا۔ اماں نچلا ہونٹ کاٹتی ہوئی پلٹ گئیں۔ چچا اور چچی بھی بھنائے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ اس دوران میں جہانی ۔۔۔ شنو آپا وغیرہ کھانے کے برتن اٹھا چکی تھیں۔ میں نے ۔۔۔ چارپائی پر لٹا دیا۔ تائی اماں اٹھ کر کوٹھڑ کے کمرے ۔۔۔

۔۔۔ ہیں۔ کوٹھڑ چچا اور چچی کی جھک جھک کی وجہ ہی سے کھانا ۔۔۔ کمرے میں کھایا کرتی تھیں۔

اچھا خاصا خوش گوار ماحول خراب ہو چکا تھا۔ مجھے چچا ۔۔۔ چچی پر بہت غصہ تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ ان کا ۔۔۔ انھیں دے کر الگ کر دوں۔ ویسے بھی جائیداد کا بٹوارا ۔۔۔ ضروری ہو گیا تھا۔ میں جن چکروں میں پڑ چکا تھا ان ۔۔۔ چھٹکارا آسان لگ رہا تھا مگر چچا اور چچی کی حد سے بڑھی ۔۔۔ نفرت سے کوئی بہت بڑا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ نہ ۔۔۔ لوم اس لمحے یہ بات میرے ذہن میں کیوں اور کیسے آگئی ۔۔۔ یہ دونوں اماں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ اس خیال ۔۔۔ میرے فیصلے کو مزید مستحکم کر دیا اور میں تایا سے کہہ کر کہ ۔۔۔ واقعی شام میں وکیل کو بلا کر چچا کا حصہ دینے کا انتظام ۔۔۔ یں' شرف الدین کے پاس آگیا۔ میں اس سے سخت ۔۔۔ ندہ تھا کہ یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا' پھر چچی کے ۔۔۔ یے سے بھی یقیناً اسے دکھ پہنچا ہوگا۔ میں اندر گیا تو وہ پھر ۔۔۔ مخصوص انداز میں بیٹھا تھا۔

"معاف کرنا شرف الدین! یہ لوگ ذرا۔۔۔"

"بس۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "۔۔۔ جانتا ہوں اور جائیداد کے بٹوارے والی بات میں نے ۔۔۔ سے بہت پہلے کہی تھی۔ حیرت ہے' اتنا بڑا واقعہ ہو جانے ۔۔۔ بعد بھی تم نے اس بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا ۔۔۔"

"ہاں بس غلطی ہو گئی مگر اب میں وہ غلطی دہراؤں گا ۔۔۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شرف ۔۔۔ ن تم چچا کو نہیں جانتے' وہ دنوں میں ساری جائیداد ملیا ۔۔۔ کر دیں گے۔"

"تمھیں اس سے کیا' وہ جو بھی کریں اس کی ذمے داری ۔۔۔ لوں پر عائد نہیں کر سکیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا موڈ بہت خراب ہو چکا ۔۔۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے پھر میں نے اسے کہا کہ ہم کل ۔۔۔ ہہ چل رہے ہیں۔ وہ اپنی تیاری کر لے۔ یہ سن کر وہ ۔۔۔ بیٹھا۔ اس نے جانے میں دیر نہیں کی۔ اس کے جانے ۔۔۔ بعد میں اماں کے پاس گیا۔ اماں' میں' تائی اور تایا بڑی ۔۔۔ لیٹے باتیں کرتے رہے۔ موضوع چچا اور چچی کا رویہ تھا۔ ۔۔۔ اب بھی مصر تھے کہ اس بے وقوف کی باتوں پر کان نہ ۔۔۔ جائے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ بہت جلد سب کچھ ضائع

کر کے کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائیں گے۔ یہ ان کی محبت تھی کہ وہ انھیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے' مگر اماں بہت غصے میں تھیں۔ انھیں دکھ تھا کہ ہمیشہ اتنا خیال رکھنے کے باوجود دونوں میاں بیوی انھیں مورد الزام ٹھہراتے تھے اور ان سے حسد کرتے تھے۔ انھوں نے تایا سے کہہ دیا۔

"بھائی صاحب! میں تو اب ان کا حصہ اپنے ہاتھ میں رکھوں گی نہیں' نہ ان کی زمینوں کی دیکھ بھال ہی کی ذمے داری میری ہوگی' میں آج ہی یہ معاملہ نمٹا دوں گی' آپ چاہیں تو اس بکھیڑے میں پڑے رہیں۔ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔"

"اے تو ٹھیک تو کہہ رہی ہیں دلھن! اس گھنٹا گھر کو کیا اب میرے گلے میں باندھیں گے!" تائی اماں تایا کا مقصد جان کر بول اٹھیں۔

تایا' اماں اور تائی کو دیکھتے ہی رہ گئے مگر یہ سچ تھا کہ ان دونوں ہی نے اپنی حرکتوں سے ان کا دل اتنا کھٹا کر دیا تھا کہ وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھیں۔ تایا چپ ہو گئے۔ اس شام میں اور شرف الدین جا کر امروہہ کے ٹکٹ لے آئے۔ لڈن کا کہیں پتا نہیں تھا۔ مجھے صبح سے اس کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔

اماں نے بتایا تھا کہ وہ سویرے آنے کا کہہ کر گیا ہے اور اب شام ہو چکی تھی۔ ایک بے چینی سی تھی جو مجھے پریشان کیے ہوئے تھی۔ کچھ اتا پتا بھی نہیں تھا کہ میں اس کے بارے میں معلوم کرتا۔ تایا نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ خورشید چاچا کے کسی کام سے گیا ہے۔ وہ کیا کام تھا بھلا خورشید چاچا کا مرنے کے بعد کیا کام ضروری تھا جو ہم نہیں کر سکتے تھے' یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی اس بات کی بے چینی تھی کہ میں اس سے پتا کروں کہ اس کی اماں کیسے مریں اور اب یہ دوسری بے کلی تھی جس نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔ ہم امروہہ کے ٹکٹ لے آئے تھے۔ اماں نے جانے کی تیاری کر لی۔ تایا بھی چلنے کو تیار تھے۔ شام ہی کو وکیل صاحب بھی آ گئے۔ اماں اور تایا نے ان سے ضروری کاغذات تیار کرنے کو کہا جس پر انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہفتہ بھر میں کاغذات تیار کر دیں گے۔ اماں نے سکھ کا سانس لیا کہ وہ یہ ہفتہ امروہہ میں گزاریں گی۔ تائی اماں البتہ تنتناتی پھرتی رہیں۔ بہرحال ہم اگلے روز امروہہ جانے کے لیے تیار تھے۔ اب تک اتنی مرتبہ

پروگرام بنا اور بگڑا تھا کہ اب لڈن کی واپسی کا بہانہ بناتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ اماں ناراض ہوں گی' پھر لڈن ایسا کوئی اہم آدمی بھی نہیں تھا کہ میں محض اپنی بے چینی دور کرنے کے لیے ایک بار پھر پروگرام ملتوی کر دیتا۔

شرف الدین ٹکٹ لینے کے بعد اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ہمارا پروگرام دس گیارہ بجے نکلنے کا تھا تاکہ ہم سہ پہر تک وہاں پہنچ جائیں۔ میں نے شرف الدین سے کہا تھا کہ وہ اگر رات کو آجائے تو ہم دونوں سنہرے بابا کی طرف چلیں گے۔ مجھے یقین تو نہیں تھا کہ ان سے ملاقات ہو سکے گی مگر یہ امید ضرور تھی کہ ہم کم از کم اس فقیر بابا سے مل سکیں گے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سادھو کے ہتھکنڈوں کے سامنے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ ساری کرامات اس انگوٹھی کی تھیں۔ انھوں نے مجھے ایک بڑی مشکل سے نکال لیا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ وہ شکنتلا کے معاملے میں بھی میری مدد کریں۔ میں اس حویلی کو جلد از جلد پاک کرنا چاہتا تھا۔ شرف الدین نے وعدہ کیا کہ وہ مغرب تک پہنچ جائے گا۔ میں وکیل صاحب کے جانے کے بعد اس ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ جہانی آپا اور شنو آپا دبے دبے انداز میں مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ میں اماں کو حویلی جانے سے باز رکھوں۔ ان کا خیال تھا کہ اماں دوبارہ وہاں گئیں تو پھر دہیں بسنے کی خواہش پھر سر اٹھانے لگے گی۔ وہ دونوں ہی وہاں جانے سے خوفزدہ تھیں۔ میں نے انھیں تسلی دی تھی پھر انھوں نے مجھ سے ضد کی کہ میں رات کو انھیں ٹہلانے کے بہانے وہ مکان ہی دکھالاؤں جو میں نے خریدا ہے اور جہاں جلد ہی ہمیں منتقل ہونا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں رات کو کسی نہ کسی بہانے سے انھیں وہاں لے چلوں گا۔ اس دوران میں شرف الدین آ گیا۔ میں اماں سے جلد آنے کا کہہ کر شرف الدین کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

"کیا رہا؟" شرف الدین نے پوچھا۔

"چچا چچی والے معاملے میں؟"

"ہاں۔"

"وکیل صاحب آ گئے تھے' اماں نے کاغذات تیار کروائے ہیں۔ سمجھو نمٹ ہی گیا۔"

"اچھا کیا۔۔۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جو حفظ ماتقدم کے طور پر اقدامات کر لیتے ہیں۔ ان میں مروت یا محبت نام کو نہیں۔"

"اس کا درست اندازہ تو مجھے آج ہوا ہے۔ یہ شخص ہیں جو مجھے ہر وقت کاندھوں پر بٹھائے پھ تے' بے پناہ پیار کرتے تھے اور اب۔۔۔ اب دیکھا تم میری طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "ارے ہاں۔۔۔ وہ لڈن آیا؟"

تب میں نے اسے بتایا کہ میں خود بھی صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ اس دوران میں ہم سبز گنبد والی طرف جا رہے تھے۔ راستے بھر ہم لڈن کے بارے میں کرتے رہے۔ مسجد تک پہنچ کر ہم نے اسی فقیر بابا کو کیا مگر وہ ہمیں کہیں نہ دکھائی دیے۔ سنہرے بابا کے میں بھی تالا پڑا تھا۔ وہ بزرگ بھی کہیں نہ ملے جنھوں پہلی بار ہمیں سنہرے بابا کا پیغام پہنچایا تھا۔ عشاء کی ہونے تک ہم وہیں پھرتے رہے۔ عشا کی نماز ہم نے پڑھی۔ ایک بار پھر سنہرے بابا کے حجرے کا چکر لگایا او بار بھی ناکام رہے تو ہم گھر کی طرف چل پڑے۔

میں جہانی آپا وغیرہ سے مکان دکھانے کا وعدہ تو کر اب سوچ رہا تھا کہ میرا ان کو تنہا وہاں لے جانا ٹھیک ہے یا نہیں؟ جہاں تک گلی کے کونے تک ٹہلنے کا تعلق اماں اس کی اجازت تو دے دیتیں مگر مکان دکھا اجازت کبھی بھی نہ ملتی۔ اس کے لیے ہمیں کوئی بہا پڑتا مگر نہ جانے کیوں دل میں ایک دھڑکا سا تھا۔ کوئی اندر بیٹھا سرگوشی کر رہا تھا کہ ادھر تنہا نہ جانا۔ م شرف الدین سے ذکر کیا تو اس نے بھی تنہا جانے کیا۔ جہانی آپا وغیرہ کے لحاظ کی وجہ سے وہ یہ بھی تھا کہ میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں نے ہی کہا اگر ہمارے ساتھ چلے تو اچھا ہے۔ اس نے میری ماننے میں کوئی پس و پیش نہ کی۔ گھر پہنچ کر وہ گھر ٹھہرا رہا۔ میں اندر چلا گیا۔ جہانی آپا اور شنو آپا میری تھیں۔

"تم نے تو آتی دیر کر دی۔" جہانی آپا نے آہستہ

"اب کیا اماں جانے دیں گی؟"

"کوشش کرتا ہوں۔" میں نے بھی آہستہ دیا۔ میں اماں کے پاس گیا' خیال تھا کہ چچا کی جائیداد چکر میں ان کا موڈ خراب ہو گا مگر خلاف توقع وہ تھیں۔

"آ گئے تم؟" انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ان

چہرے پر خوشی تھی۔ پتا نہیں یہ جائیداد دے کر ہلکے پھلکے ہو جانے کی کیفیت تھی یا امروہہ جانے کی خوشی۔

"جی اماں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ لڈن نہیں آیا کیا؟" اچانک مجھے یاد آ گیا۔

"تمھیں لڈن کا اتنی بے چینی سے انتظار کیوں ہے؟"

انھوں نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اماں! آپ تو جانتی ہیں کہ اس کے بابا کی موت کس طرح ہوئی تھی۔ اب سنا تھا کہ اماں بھی خوف سے مری ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیسے مریں' وہ کیسا خوف تھا جس نے انھیں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ ممکن ہے وہ جانتا ہو۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگر وہ یہاں ہے تو میں چاہتا تھا کہ اسے بھی ساتھ ہی امروہہ لے چلیں' واپسی پر ہمارے ساتھ ہی آجائے گا۔ اس طرح میری بھی مدد ہو جائے گی اور سے بھی سہارا رہے گا۔ اماں میں نے سوچا ہے کہ اسے اپنے ساتھ ہی رکھوں۔ آخر اس کے ماں باپ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" اماں نے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ پتا نہیں اس کا کوئی رشتے دار ہے یہاں یا۔۔۔ کہیں نہ کہیں تو گیا ہو گا تاں تبھی تو دیر کر دی۔"

پھر میں نے اماں سے جہانی آپا اور شنو آپا کے لیے اجازت لے لی۔ انھوں نے تھوڑی سی پس و پیش کی تھی مگر میں نے یہ کہہ کر انھیں راضی کر لیا کہ میں ان دونوں کو ٹہلانے کا وعدہ کر چکا تھا اور دیر میری وجہ سے ہوئی ہے۔ اماں نے ہمیشہ ہمیں وعدہ وفا کرنے کی تربیت دی تھی اس لیے چپ ہو گئیں مگر اتنا ضرور کہہ دیا کہ میں انھیں زیادہ دور تک نہ لے کر جاؤں اور دیر بھی نہ کروں۔

ان سے اجازت مل جانے کی اطلاع سنتے ہی جہانی آپا اور شنو آپا خوش ہو گئیں۔ پھوپی کے سر میں بہت درد تھا ورنہ وہ بھی چلنا چاہتی تھیں' انھیں یہ علم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ دونوں بہنوں نے برقعہ پہن لیا اور تایا کی نگاہوں سے بچتی ہوئی باہر آ گئیں۔ انھیں ڈر تھا کہ تایا اتنی رات میں باہر جانے پر ڈانٹیں گے۔ تایا اس وقت تائی اور کوثر سے باتیں کر رہے تھے اس لیے ان کا دھیان بھی ہماری طرف نہیں تھا۔ ہم تینوں باہر آئے تو میں شرف الدین کے پاس لڈن کو کھڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"ہم۔۔۔ تم کہاں تھے۔۔۔ تمھیں تو صبح آنا تھا۔"

"وہ۔۔۔ بس چھوٹے مرزا۔۔۔ ایک کام میں پھنس گیا تھا۔"

وہ جہانی آپا اور شنو آپا کو ساتھ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم اندر جاؤ۔ تایا سے مل لو اور ہاں اماں سے بھی مل لینا' اور جانا کہیں نہیں۔ میں واپس آ کر بات کرتا ہوں۔" کوئی دوسرا وقت ہوتا تو میں اپنا ہر پروگرام ملتوی کر دیتا مگر میں جانتا تھا کہ جہانی آپا اور شنو آپا کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگتیں' نہ کسی کام کو کہتی ہیں۔ یہ ان دونوں کی معصوم سی خواہش تھی جو بقول ان کے بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد پوری ہوئی ہے۔ ان دونوں نے بتایا تھا کہ وہ کئی بار اماں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکی ہیں مگر ہر بار اماں نے صاف منع کر دیا تھا۔ اب بھی وہ کافی جذباتی ہو رہی تھیں اس لیے میں نے لڈن کو انتظار کرنے کا کہہ دیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ لڈن کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ بار بار اپنے چہرے سے پسینا پونچھ رہا تھا۔ میں نے سوچا' جانے کس کام سے کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہو گا۔ کچھ آرام کرے گا تو حالت سنبھل جائے گی' اتنی دیر میں' میں بھی لوٹ آؤں گا۔ وہ فوراً گھر کی طرف چل دیا تھا۔ میں جہانی آپا وغیرہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

میں اور شرف الدین دونوں دو قدم آگے چل رہے تھے' جہانی آپا اور شنو آپا ہمارے پیچھے تھیں۔ باہر آنے سے پہلے ہی میں اس مکان کی چابیاں اپنی جیب میں ڈال چکا تھا جو بیٹھک میں دیوار پر لگی کیل میں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ہم چاروں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی تھی۔ ابھی ہم نے اپنی گلی عبور بھی نہ کی تھی کہ مجھے پیچھے سے کسی کے پکارنے کی آواز آئی۔ میں نے اور شرف الدین نے پلٹ کر دیکھا۔ تایا ہانپتے کانپتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں آوازیں دے رہے تھے۔ جہانی آپا اور شنو آپا بھی پلٹ گئیں تھیں۔

"اللہ' انھیں پتا چل گیا۔ اب دیکھنا جانے بھی نہیں دیں گے۔" شنو آپا کی آواز آئی۔

"نہیں۔۔۔ بات کچھ اور ہے۔" میں نے فوراً کہا پھر تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ شرف الدین میرے ساتھ ساتھ تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر تایا کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹھہر گئے تھے۔ جہانی آپا اور شنو آپا بھی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ ہم جونہی تایا کے قریب پہنچے' میں ان کا چہرہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کے چہرے پر بلا کی وحشت تھی۔ "کیا ہوا۔۔۔ کیا بات ہے تایا؟"

"وہ۔۔۔ لڈن۔۔۔ لڈن کو کچھ ہو گیا ہے۔"

اتنا سنتے ہی میں اور شرف الدین گھر کی جانب دوڑ پڑے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بڑے برآمدے کی محرابوں میں ٹنگی لالٹینوں کی روشنی میں، میں نے لڈن کو بیچ صحن میں تڑپتے دیکھا۔ اماں تائی اور چچا، چچی اس کے گرد کھڑے تھے۔ اماں اس پر جھکی ہوئی کچھ پوچھ رہی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچ کر بیٹھ گیا۔ "کیا ہوا۔۔۔ لڈن کیا ہو گیا؟" میں نے اس کے ماتھے پر چپکے بال پیچھے کرتے ہوئے پوچھا اور پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے دہانے کے دائیں کونے میں سے سفید سفید سا جھاگ باہر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اماں سے چیخ کر لالٹین لانے کو کہا۔ وہ لپک کر لالٹین اتار لائیں۔ لالٹین کی روشنی میں اسے دیکھتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر لرز اٹھا تھا۔ اتنی دیر میں شرف الدین اور تایا بھی قریب آ گئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اماں وغیرہ کو وہاں سے چلے جانے کو کہا پھر لڈن کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بیٹھک کی طرف دوڑ لگا دی۔ اماں مغرب کے وقت ہی وہاں لیمپ روشن کر چکی تھیں۔ شرف الدین لالٹین بھی لے آیا۔ تایا ہمارے ساتھ ہی بیٹھک میں آ گئے۔ باقی سب لوگ میرے روکنے پر باہر ہی رک گئے تھے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ میں نے پلٹ کر لڈن کی طرف دیکھا تو بے ساختہ قسم کی ایک چیخ میرے ہونٹوں تک آ کر رہ گئی۔ میں نے اپنی چیخ کو حلق ہی میں گھونٹ لیا ورنہ اماں اور بہنوں کی جانے کیا حالت ہوتی۔ وہ منظر تھا ہی اتنا ہولناک کہ میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گیا تھا۔ شرف الدین کسی بت کی طرح ساکت کھڑا لڈن کو تک رہا تھا۔ تایا حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اسی کھنڈر کے تاریک کمرے میں ہوں اور وہی سادھو دونوں گھٹنوں کے بل، ہاتھ زمین پر ٹکائے جھکتا ہی چلا جا رہا ہے۔ یوں جیسے اس کی کمر پر کوئی ان دیکھی طاقت بوجھ لادتی جا رہی ہو۔ اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل کر زمین پر گر رہا تھا۔ اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا، آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ سادھو نہیں تھا بلکہ لڈن تھا۔ اس کے بدن پر کپڑے تھے۔ اس کا جسم فربہ تھا۔ میری نگاہیں بے ساختہ اس کی گردن کی طرف اٹھ گئیں۔ باریک خون کی لکیریں مجھے اتنی کم روشنی میں بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔

"ارے اسے اسپتال لے جاؤ۔ کیا ہو گیا ہے ا[...]" تایا ایک دم چیخ اٹھے۔

"نن۔۔۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔" اس نے بالکل سادھو[...] انداز میں ایک ہاتھ ہلاتے ہوئے پھولی ہوئی سانس [...] دوران کہا۔ "چھوٹے مرزا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ یہیں ہے۔ کہیں۔" وہ نہ معلوم کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا [...] سورۃ الناس یا آیت الکرسی پڑھوں مگر پھر اچانک [...] سہم گیا۔ مجھے اس سادھو کا انجام یاد آ گیا۔ یہ خوف [...] اگر میں کچھ پڑھوں گا تو وہ بچھو جو یقیناً اس وقت لڈ[...] گدی پر سوار ہے، اسے لہولہان کر دے گا اور پھر [...] بھی سادھو کی طرح۔۔۔

"ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں وقار۔۔۔ اسے اسپتال [...] کر جاؤ۔" تایا پھر چیخے مگر اب اس کے قریب جا[...] میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جانے میں اسے صحن [...] کیسے اٹھا لایا تھا، اس وقت میں نے اس کی ایسی کیفیت دیکھی تھی ورنہ شاید میں اس کے قریب بھی نہ جاتا۔ ڈر تھا کہ موقع پاتے ہی وہ بچھو میری گدی پر سوار ہو گا۔ میں ٹس سے مس نہ ہوا اور آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ تایا مجھے بت بنا دیکھ کر اس کی طرف لپکے تو [...] نے چیخ کر انھیں منع کیا اور ان کے سامنے اپنا [...] پھیلا دیا۔ "نہیں تایا۔ آگے مت جائیے گا۔"

"وقار الحسن، تم پاگل ہو گئے ہو۔ دیکھ رہے ہو کہ [...] اذیت میں ہے۔ میں کہتا ہوں اسے اسپتال لے جاؤ [...] مر جائے گا۔"

"تایا۔!" میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز [...] "آگے مت جائیے گا تایا۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ آپ بھی۔۔۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب تمہارا؟" تایا بوکھلا گئے۔

اب انھیں کچھ بتانا ناگزیر ہو چکا تھا۔ میں نے [...] سے لڈن کی طرف دیکھا جو شدید اذیت سے دوچار تھا۔ [...] کی آنکھوں سے اب پانی بہنے لگا تھا۔ جھاگ زیادہ ہو [...] اور گردن سے نکلنے والی خون کی باریک لکیروں سے خون کے قطرے زمین پر ٹپکنے لگے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ خو۔۔۔ خور۔۔۔ شی۔۔۔ شید چاچا۔۔۔ نے تھی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔"

اتنا کچھ اس نے شدید اذیت کے عالم میں کہا تھا۔ [...] ابھی کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس نے وہ ا[...]

اب تک وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا، اٹھایا اور ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چابی پھسلتی ہوئی میرے پیروں کے قریب آ کر رک گئی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور حیرت سے تکتا رہ گیا۔ وہ اس مکان کے اس کمرے کی چابی تھی جہاں رحمو کو دفن کیا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا جو جلنے سے قبل اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ ویسی ہی ایک چابی گچھے میں بھی موجود تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ہر دروازے کی ایک ایک ہی چابی تھی جو اس گچھے میں موجود تھی۔ یہ فالتو چابی کہاں تھی؟ خورشید چاچا کے پاس کہاں سے آئی۔ خورشید چاچا نے اسے کب اور کہاں دی، اسے خورشید چاچا نے میرا پیغام کب پہنچایا اور وہ خورشید چاچا کے کس کام سے گیا تھا میرے پاس ان تمام سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت لڈن کی ایسی حالت تھی کہ وہ میرے کسی سوال کا جواب دے پاتا۔ میں نے وہ چابی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔

"میاں یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟! ارے تم سنتے کیوں نہیں ہو؟" تایا پھر چلائے اور اتنا کہہ کر وہ میری پشت سے ہوتے ہوئے شرف الدین تک پہنچ گئے جو اب بھی ساکت کھڑا آنکھیں پھاڑے لڈن کو دیکھ رہا تھا۔ "میں کہتا ہوں یہ مر جائے گا۔ اسے لے چلو ورنہ۔۔۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" آخری جملہ انھوں نے چیخ کر کہا اور مجھے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس لمحے کسی نے دروازے کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ تایا ایک دم پلٹ کر دھاڑے۔ "کون ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔" پھر انھوں نے شرف الدین کو جھنجوڑ دیا۔ "چٹخنی کھولو دروازے کی۔ میں اسے اسپتال لے کر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر لڈن کی طرف لپکے۔ میں نے اگر انھیں لپک کر نہ پکڑ لیا ہوتا تو شاید وہ اس تک پہنچ گئے ہوتے۔ میرے ہاتھ میں ان کا کرتا آیا تھا۔ وہ جھٹکا کھا کر رکے، پھر میرے اوپر دھاڑنے لگے۔ "وقار الحسن۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے۔" اس لمحے باہر اماں اور تائی کے چیخنے کی آوازوں نے تو مجھے بری طرح بوکھلا دیا۔ وہ لوگ جانے کیا سمجھ رہی تھیں۔ ادھر تایا میرے ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔ میں نے جھپٹ کر اپنے دونوں بازو ان کے گرد لپیٹ کے انھیں جکڑ لیا۔

"تایا۔۔۔" میں غصے اور گھبراہٹ میں چیخ پڑا۔ "قریب مت جائیے گا۔ میری بات سنیے۔ بات سنیے۔" میرے چیخنے پر وہ ایک دم چپ ہو گئے۔ میری نگاہ لڈن کی طرف اٹھ گئی۔ وہ پورا کا پورا نیلا پڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔ آدھا چہرہ منہ سے نکلنے والے جھاگ میں چھپ چکا تھا۔ عین اسی لمحے کمرے میں روشن لیمپ اور شرف الدین کے پاس رکھی لالٹین بجھ گئی۔ کمرے میں ایک ساتھ بہت سی چیخیں گونجیں اور مجھے لگا جیسے میں موت کے کنویں میں لڑھکتا چلا جا رہا ہوں۔ اس لمحے شرف الدین کی آواز گونجی، وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "دیوان پر چڑھ جائیں۔ دیوان پر تایا۔ وقار الحسن۔ دیوان پر۔" اور میں تایا کو اپنے بازوؤں میں جکڑے دیوان کی طرف بڑھ گیا جو میرے انتہائی دائیں جانب تھا۔

"چھوڑو مجھے۔ چھوڑو مجھے۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔" تایا پھر مچلے اور میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکل گئے۔ اسی لمحے عجیب کھرکھراتی سی آواز آئی پھر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پکے فرش کو اپنے ناخن سے کھرچ رہا ہو۔ میں تایا کو آوازیں دینے لگا۔ میں دیوان پر چڑھ چکا تھا۔ شرف الدین بھی شاید میرے قریب تھا۔ تایا کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ باہر سے اماں، تائی اور بہنوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے میں کسی طوفان بلا خیز میں گھر ہوا ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیروں پر کھردرا سا لمس محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا۔ سوکھی سوکھی اور پتلی پتلی سی انگلیوں والے ہاتھ نے میری دونوں ٹانگوں کو ٹخنوں کے اوپر سے جکڑ لیا۔

ایک بے ساختہ قسم کی طویل چیخ میرے ہونٹوں سے نکلی اور جیسے قیامت سی آ گئی۔ شرف الدین نے مجھے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہاتھ مجھے کھینچ رہے ہیں، اگر شرف الدین نے مجھے نہ پکڑا ہوتا تو میں یقیناً گر چکا ہوتا۔ میں یہاں عذاب کا شکار تھا اور باہر سے اماں، جہاں آپا، شنو آپا غرض پورا گھر بری طرح چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اماں دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھیں۔ انھیں کیا پتا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تایا کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں ان کی وجہ سے بھی سخت پریشان تھا مگر میرے پیروں کی تکلیف اس قدر بڑھ گئی تھی کہ لگ رہا تھا کہ اب گرا کہ تب گرا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دونوں پیروں کو لوہے کے شکنجے میں جکڑ دیا ہو اور وہ بڑی آہستگی سے اس شکنجے کو تنگ، مزید تنگ کرتا جا رہا ہو۔ اگر یہی کیفیت رہتی تو میں

اپنے دونوں پیروں سے جلد ہی محروم ہو جاتا۔ تکلیف سے میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اچانک مجھے جھٹکا لگا اور میں بری طرح لڑکھڑا کر گرا' شرف الدین اگرچہ مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر شدید اذیت نے میرا کھڑا رہنا دوبھر کر دیا تھا۔ ان سوکھی اور پتلی انگلیوں کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اسی لیے میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ بے ہوش ہوتے ہوتے میں نے اپنے بالکل قریب بلی کی آواز سنی تھی' اس کی غراہٹ اتنی خوفناک تھی کہ ساری چیخ پکار پر حاوی محسوس ہوئی پھر میرا ذہن اندھیرے میں ڈوب گیا۔

میں نہیں جانتا کہ مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ لیکن ہوش آنے کے بعد پہلا احساس پیروں میں شدید تکلیف کا تھا۔ آنکھوں میں سرخ دھبے سے ناچ رہے تھے۔ دماغ بالکل سن تھا۔ ایسے میں کچھ عجیب و غریب قسم کی آوازوں کی بھنبھناہٹ کانوں میں پڑ رہی تھی جو ایک ناگوار سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن پر دھند سی جمی محسوس ہو رہی تھی پھر اچانک ہی جیسے دھند چھٹ گئی۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا' وہ اسپتال کا کمرا تھا۔ یقیناً وہ اسپتال ہی کا کمرا تھا۔ سفید پردے میرے چاروں طرف پڑے تھے۔ میں جس لوہے کے پلنگ پر لیٹا تھا اس کا رنگ بھی سفید تھا۔ میرے داہنے جانب لوہے کا نعمت خانہ رکھا تھا۔ لوہے کے اسٹینڈ سے ایک بوتل لٹکی ہوئی تھی جس سے نکلنے والی نلکی میرے بازو میں پیوست سوئی تک آ رہی تھی۔ میرے اچھل پڑنے سے غالباً" سوئی اپنی جگہ سے ہل گئی تھی اور اس کی چبھن میں اپنی نس میں محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا جس پر مجھے شدید حیرت تھی۔ مجھے سب کچھ یاد آ چکا تھا۔ بیٹھک کا وہ دہشت ناک سین یاد آتے ہی میری نگاہ اپنے پیروں پر پڑی۔ میرے دونوں پیروں سے کچھ اوپر پٹیاں بندھی ہوئی تھی۔ لوہے کی ایک راڈ سی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ میں اپنے پیروں کو اوپر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ راڈ دونوں طرف سے ان کنڈوں میں پھنسی ہوئی تھی جو پلنگ کی دونوں طرف کی پٹیوں پر لگے تھے۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کہاں ہوں' اگر یہ اسپتال ہے تو گھر کا کوئی فرد میرے پاس کیوں نہیں ہے؟ شرف الدین بھی وہاں نہیں تھا۔ دور دور تک گمبھیر سناٹا تھا جو میرے اندر بے پناہ بے کلی کا باعث تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہاں بیٹھک میں کیا ہوا؟ تایا کہاں ہیں؟ اماں کی کیا حالت ہے؟ لڑائی کا کیا ہوا؟ میں یہ سب جان لینا چاہتا تھا مگر میرے قریب کوئی نہ تھا جو مجھے یہ سب بتاتا۔ میں نے بازو میں لگی سوئی نکال دی۔ وہ گلوکوز تھا۔ میں نے اوپر سے چھوٹا سا پہیا گھما کر اس کے اخراج کو بند کر دیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اپنے داہنے جانب کا پردہ ہٹایا تو پتا چلا کہ میں واقعی اسپتال میں ہوں۔ یہ ایک سا مستطیل نما ہال تھا۔ جس میں مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک اور لوہے کا پلنگ تھا جس پر کوئی سر سے پاؤں تک خود کو ڈھانپے غالباً" سو رہا تھا۔ اس کے گرد بھی سفید پردے پڑے تھے' میری جانب سے کچھ پردہ ہٹا ہوا تھا۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی لیکن میں اتنا جان چکا تھا کہ یہ جنرل وارڈ ہے۔ میرے پیروں کو یوں لوہے کی سلاخ میں نہ پھنسایا ہوا ہوتا تو میں تکلیف کی پروا کیے بغیر اٹھ جاتا۔ مگر اس وقت میں قطعی بے بس تھا۔ مجھے شدید حیرت تھی کہ میں یہاں اکیلا کیسے ہوں۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ کم از کم شرف الدین کو ہی میرے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ گہرے سناٹے میں جھینگروں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ یہ رات کا کوئی پہر ہے۔ پھر بھی کسی نرس یا ڈاکٹر کو ڈیوٹی پر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اخلاق کو بالائے طاق رکھ زور کی آواز دی۔ "ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔۔۔"

میرا ہاتھ سے پردہ پکڑے ہوئے تھا۔ یہاں سے مجھے دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میرے کان آہٹ یا آواز پر لگے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے میری آواز بازگشت گھوم پھر کر لوٹ آئی ہو۔ مجھے کمرے میں بھی حرکت کا احساس نہیں ہوا۔ میری نگاہیں اپنے برابر والے بستر پر جمی ہوئی تھیں جس پر کوئی منہ لپیٹے پڑا تھا۔ اس میں بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں میں کوئی مردہ پڑا ہو۔ میں نے پھر آواز دی۔ اس بار میری آواز کافی بلند تھی۔ اس بار بھی کسی حرکت یا آہٹ کا احساس نہیں ہوا' برابر والا یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑ گئیں۔ دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ آنکھیں دھندلانے لگیں' اعصاب بری طرح شل ہو گئے اور میں اندرونی گھبراہٹ کا شکار ہو کر پھٹ پڑا۔ اس بار میں نے حلق کے بل چیخ چیخ کر آوازیں دیں۔ میں ڈاکٹر کے علاوہ تایا اور شرف الدین کو آوازیں دے رہا تھا۔ میری ہی آواز گونجدار بازگشت بن کر میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے دونوں پیر اس لوہے کی سلاخ کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی ناقابل برداشت قسم کی ٹیسوں نے میرے پورے وجود کو گھیر لیا۔ شدید تکلیف کی وجہ سے میرا دماغ چکرا گیا اور میں کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔ مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر بھی میں آنکھیں پھاڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے برابر والے پلنگ پر لیٹا آدمی جاگ جائے۔ لگتا تھا کہ اس کمرے میں اس کے اور میرے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔

"اے۔ اے بھیا۔ سنو۔ سنو ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ڈاکٹر کو بلا دو۔ اٹھو۔ اٹھو مجھے تکلیف ہے۔ میں مر رہا ہوں۔" میں بری طرح چیخنے لگا۔ خشک حلق سے چیخنے کی وجہ سے مجھے پھندا لگ گیا۔ میرے سینے میں گولا سا پھنسا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسی وقت میں نے اس سفید چادر میں حرکت محسوس کی۔ میں اپنی تمام تکلیف بھول کر خوش ہو گیا۔ شاید وہ جاگ گیا تھا یا شاید نیند میں کسمسا رہا تھا۔ اس کی نیند ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے پھر اسے پکارنا چاہا مگر اس بار میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ حرکت اب بہت واضح ہو چکی تھی۔ میں پرامید نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ دل ہی دل میں' میں اس کے جاگ جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس شخص نے چادر کے اندر ہی اندر کروٹ لے لی تھی۔ اس بار اس نے پشت دوسری طرف کر لی تھی۔ اب اس نے غالباً" اپنا رخ میری طرف کر لیا تھا۔

"اے۔ اے۔ سنو۔۔۔ سنو۔" میں نے اسے پکارنے کی کوشش کی تو عجیب بے تکی سی آواز میرے منہ سے خارج ہوئی' مجھے لگا جیسے اب میں نے کوئی آواز نکالنے کی کوشش کی تو کھانسی کا شدید دورہ پڑ جائے گا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ آواز اس تک پہنچ جائے۔ وہ سر سے چادر اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتا تو میں اسے اشارے سے بتا سکتا تھا کہ میں تکلیف میں ہوں۔ پھر خدا نے میری دعا سن لی۔ چادر اس کے سر سے سرکنے لگی۔ میں آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ باہر آنے کا منتظر تھا۔

چادر سرکنے کی وجہ سے اب اس کی پیشانی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی پیشانی پر سفید سی چھوٹی چھوٹی سی کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ جو کچھ مجھے نظر

آ رہا تھا میں اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ سفید رنگ کے باریک اور چھوٹے چھوٹے چاول کے برابر کے کیڑے تھے جو اس کی پیشانی پر کلبلا رہے تھے۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ پتا نہیں اسے کیا بیماری تھی اور جانے ڈاکٹرز نے مجھے ایسی خطرناک بیماری والے مریض کے ساتھ کیوں رکھا تھا۔ میری عجیب سی حالت تھی پھر بھی میں امید و بیم کی کیفیت میں اسے تکے جا رہا تھا۔

اچانک۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرا سر چھت سے جا ٹکرایا ہو۔ اس شخص کے چہرے سے چادر ہٹ چکی تھی۔ اس کے پورے چہرے پر' آنکھوں میں' ناک کے نتھنوں میں اور منہ میں' ہزاروں سفید رنگ کے کیڑے کلبلا رہے تھے اور وہ۔۔۔ وہ رحیمو تھا۔ ہاں وہی رحیمو جسے میں قتل کر کے اپنے نئے مکان کے کمرے میں دفن کر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گڑھے بنے ہوئے تھے' ان گڑھوں میں وہ چاول جتنے سفید کیڑے کلبلا رہے تھے۔ چہرہ جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ شاید انہی کیڑوں نے کھایا ہوا تھا۔ مجھے بے پناہ خوف نے منجمد کر دیا تھا۔ وہ مردہ تھا۔ اس کے جسم پر' چہرے پر ہزاروں کیڑے کلبلا رہے تھے لیکن چند لمحوں پہلے ہی اس نے میری جانب کروٹ بدلی تھی۔ وہ لمحوں پہلے زندہ تھا۔ پھر۔ پھر یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں یخ ہو چکے تھے۔ وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ اسے تو میرے کمرے میں دفن ہوئے بھی کئی روز ہو چکے تھے۔ اس کا جسم سلامت کیسے تھا؟ اسے کون لایا۔۔۔ وہ یہاں تک کیسے آیا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں قسم کے سوال سفید کیڑوں ہی کی طرح میرے دماغ میں کلبلانے لگے ہوں۔ خوف اور دہشت کے مارے میری ایسی حالت تھی کہ میں مر بھی سکتا تھا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ مجھے خون اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا' میں نے چیخنا چاہا۔ حلق پھاڑ کر چیخنا چاہا مگر میری آواز نہ نکلی۔ اٹھنا چاہا تو لوہے کی موٹی سلاخوں نے میرے پیروں کو جکڑ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے' مجھے محسوس ہوا جیسے وہی سفید سفید کیڑے میرے چہرے پر بھی رینگنے لگے ہیں۔ میرے نتھنوں میں گھس رہے ہیں۔۔۔ میری آنکھوں میں کلبلا رہے ہیں۔۔۔ بے بسی کی عجیب و غریب کیفیت' خوف' دہشت اور لہو منجمد کر دینے والی یخ لہروں نے میرے پورے وجود کو

پکڑ لیا تھا۔ میں حلق کے بل پر زور لگا رہا تھا تاکہ چیخ سکوں۔ کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار سکوں۔ میری نگاہیں اب بھی رحیمو کے مردہ چہرے پر رینگتے اور اس کا گوشت کھاتے کیڑوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے اس کے پپوٹوں میں حرکت محسوس ہوئی' یوں لگا جیسے اس کے پپوٹے لرز رہے ہوں۔ جیسے وہ آنکھیں کھولنے والا ہو' پھر خیال آیا کہ ایسا مجھے کیڑوں کی حرکت کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہے مگر پھر ایک دم ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ حلق میں دبی۔ سینے میں گھٹی ایک طویل چیخ جانے کیسے آزاد ہوئی اور میں پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں زور کے دھماکے ہوئے اور میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ میں شاید پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا یقین کیجیے کہ اگر ایسا آپ نے دیکھا یا محسوس کیا ہوتا تو آپ کے دل کی دھڑکنیں بند ہو چکی ہوتیں۔ میں خدانخواستہ آپ کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا' نہ اسے بد دعا سمجھیے گا۔ لوگ عموماً "موت کی بات سن کر برا مان جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی موت کا ذکر گویا اس کے لیے بد دعا ہے' نہیں بلکہ میں آپ کو شاید بتا نہیں پا رہا کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی' شاید اس کیفیت کی شدت کا احساس دلانے ہی کے لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو اب تک مر چکے ہوتے۔ میں پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا' نہ معلوم مجھ میں ایسی کیا تبدیلی رونما ہوئی تھی کہ مجھ ایسا ڈرپوک اور بزدل آدمی جو خوف دہشت کی انتہا کو محسوس کرنے کے باوجود نہ صرف زندہ رہا بلکہ اور بہت سے عذاب سہتا رہا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ دماغ میں شدید دھماکے ہونے کے بعد میں پھر اندھیروں میں ڈوب گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب میری آنکھ کبھی نہیں کھلے گی۔ شاید منکر نکیر کی آواز ہی مجھے دوبارہ جگا سکے۔ کاش میں مر ہی گیا ہوتا۔ کاش دہشت زدہ کرنے دینے والا وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہوتا مگر پھر وہی بات کہ خدا نے مقدر کو لکھتے وقت دنیا بھر کے بچے کھچے عذاب میرے کھاتے میں لکھ دیے تھے۔ انھیں پورا ہونا تھا کہ میں پھر ہوش میں آ گیا' مگر اس بار ہوش میں آتے ہی مجھے بدن میں حرارت کا جاں افزا احساس ہوا۔ میرے بدن میں لہو گرم تھا۔ ایک عجیب قسم کے سکون اور قرار کا احساس تھا۔ چند لمحے آنکھیں بند کیے یہی سوچتا رہا کہ میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں؟ میں آنکھیں کھول کر اپنی اس پرسکون کیفیت کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس حرارت نے مجھ میں جو توانائی پیدا کی تھی وہ مجھے زندگی کا احساس دلا رہی تھی اور میں چاہتے ہوئے بھی موت کو محسوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یونہی آنکھیں بند کیے ہوئے سوچا' جو کچھ اب سے قبل مجھ پر بیت چکا تھا وہ ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ خوف و وحشت کی وہ کیفیت نہ ہونے کے باوجود میں گزری ہوئی اس کیفیت کی شدت کو محسوس کر رہا تھا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ لڈن کے ساتھ کیا ہوا؟ تایا کیسے ہیں؟ رحیمو یہاں تک کیسے پہنچا! اس کی لاش اگر نکال لی گئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اب سبھی کو میرے جرم کے بارے میں پتا چل گیا ہو گا' ممکن ہے شرف الدین پکڑا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں آنکھیں کھولوں تو پولیس میرے کمرے کے باہر یا میرے سر پر کھڑی ہو۔ اماں نے سنا ہو گا کہ ان کا وہ معصوم' شریف اور ڈرپوک بچہ جس کی شرافت اور اعلیٰ کردار کی قسمیں کھایا کرتی تھیں وہ قاتل ہے۔ ایک بے گناہ شخص کو قتل کر کے زمین میں دفنا چکا ہے تو ان کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ بہنوں کی کیا حالت ہوئی ہو گی؟ چچا چچی نے کتنے طعنے دیے ہوں گے اماں کو اور تایا کو۔ تایا تو مر ہی چکے ہوں گے بدنامی کے خوف سے۔ میں یہ سب سوچ رہا تھا اور اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ اگر پولیس نے وہ لاش دریافت بھی کر لی تھی تو اسے یہاں اسپتال میں یوں لا کر ڈالنا۔ اور۔۔۔ اور پھر اس نے خوف۔ میرے سامنے' میری آنکھوں کے سامنے کروٹ بدلی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی سادھو کا چہرہ اور اس کے مکروہ ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ' اس کی وحشت ناک آنکھیں مجھے یاد آ گئیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"وقار الحسن۔۔۔ کو ہوش آ گیا۔" مجھے یوں لگا جیسے تایا کی آواز میرے بہت قریب ہی سے آئی ہو۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ چھت میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ تایا مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے گردن کو موڑنا چاہا تب مجھے پتا چلا کہ میں ایسا کرنے سے معذور ہوں۔ میں باوجود کوشش کے اپنی گردن کو یا اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکا۔ وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی' نہ میں لب کھول سکا۔ بس آنکھوں کی پتلیاں تھیں جو اپنی حد تک حرکت کر رہی تھیں۔

"اے اللہ۔ اے رب کریم تیرا شکر ہے۔" اماں کی

بھرائی اور لرزتی ہوئی آواز نے مجھے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلا دیا۔ "آپ ڈاکٹر کو تو بلائیں۔ میں نفل ادا کر لوں۔" اماں کی آواز اب واضح اور صاف سنائی دی جیسے وہ میرے قریب ہی ہوں' پھر میری نگاہوں کے سامنے اماں کا شفیق چہرہ آ گیا۔ وہ میرے چہرے پر جھکیں' ان کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ انھوں نے میری پیشانی کو چوما تو شدت جذبات سے میرے آنسو بہہ نکلے۔ میں اپنی اذیت بھول گیا اور اماں کی تکلیف کے احساس نے مجھے آبدیدہ کر دیا۔ وہ رو رہی تھیں۔ بری طرح رو رہی تھیں۔ ان کے نرم گرم رخسار میرے رخساروں پر تھے اور میرے آنسو ان رخساروں سے ٹکرا کر کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان سے لپٹ کر روؤں مگر نہ معلوم کیوں میں ساکت پڑا تھا۔ یوں جیسے مجھے کسی نے رسیوں سے جکڑ رکھا ہو۔

"شرف الدین!" تایا کی آواز پھر آئی۔ ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔ شاید وہ بھی رو رہے تھے۔ "تم ڈاکٹر غنی کو بلا لاؤ۔ نوافل تو میں نے بھی مان رکھی تھیں اور سنو! ڈاکٹر کو لے آؤ گے تبھی میں نوافل ادا کرنے جاؤں گا۔ تم اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑنا۔ خیال رکھنا اس کا۔"

گویا شرف الدین بھی خیریت سے ہے۔ اس خیال نے مجھے قدرے مطمئن کر دیا۔ میں نے اپنے پیروں کی تکلیف کو محسوس کرنا چاہا۔ اس بار مجھے تکلیف میں کچھ افاقہ محسوس ہوا' ذہن پر گزشتہ واقعات کبھی کبھی دھند کی طرح چھا جاتے اور کبھی اندھیرا ابھر جاتا۔ رحیمو کا چہرہ یاد آتا تو اپنے چہرے پر سفید کیڑوں کی کلبلاہٹ محسوس ہوتی' میں اندر سے لرز جاتا اور پھر اچانک جیسے روشنی سی پھیل جاتی۔ زندگی بیدار ہو جاتی تایا اور اماں کی آوازیں' مختلف قسم کی آہٹیں' کسی کے چلنے کی آواز' خوشی سے لرزتی یا فرط غم سے بھیگی ہوئی سرگوشی' مجھے ایک نئے احساس سے دوچار کر دیتی۔ میں کمرے میں مختلف آہٹوں کو محسوس کر رہا تھا' پھر میں نے اپنے چہرے پر تایا کو جھکے پایا۔ ان کا ہاتھ میری پیشانی پر تھا۔ ان کی آنکھوں کے کونے میں بنی جھریوں میں آنسو لکیروں کی صورت میں جمع تھے۔ ہونٹ لرز رہے تھے' مگر ان کے ہونٹوں پر ہنسی تھی۔ وہ کبھی مسکراتے اور کبھی ان کے ہونٹ کپکپا کر ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے جیسے وہ اپنی سسکیاں روک رہے ہوں۔ میں انھیں تسلی دینا چاہتا تھا۔ میں ان کے آنسو صاف کرنا چاہتا تھا۔ ان کے لرزتے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر مسکرانا چاہتا تھا مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ صرف اتنا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں سے گرم گرم پانی کے دو قطرے نکل کر میری کنپٹیوں پر گیلی سی لکیر بنا کر کانوں کی لو پر ٹھہر گئے ہوں۔

"نہ بیٹا۔ روتے نہیں ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ڈاکٹر آ جائے گا ناں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تجھے اسپتال میں نہیں رہنے دوں گا۔ اپنے سینے سے لگا کر گھر لے جاؤں گا۔ دیگیں چڑھواؤں گا صدقے کی۔ قوالی کراؤں گا۔ نظام الدین اولیا کے مزار پر تیرے ہاتھوں سے چادر چڑھواؤں گا۔ اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا ہے۔ بڑا احسان کیا ہے ہم پر' ہمارے گھر کو اندھیروں سے بچا لیا۔ اب نہیں رونا۔ رونے کا وقت گزر گیا۔ ٹھیک ہے ناں ہم سب رو رہے ہیں وقار الحسن' اب تو رونے کا بھی یارا نہیں۔ ہمت نہیں ہے اندر سے ترخ کر رہ گئے ہیں بھلا اور آنسو کہاں سے لائیں گے؟"

تایا کبھی روتے اور کبھی مسکرانے لگتے تھے۔ میں بے بسی سے انھیں تکتا رہا اور پتھر کی طرح پڑا رہا۔ اسی لمحے ان کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب ایک اجنبی شخص کا پرشفیق چہرہ میرے قریب۔ میرے سامنے تھا۔

"کیسے ہو وقار الحسن! اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟" اس نے ٹھہرے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر میں اپنے ہونٹوں کو حرکت نہیں دے سکا۔ میرے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ میں پوری کوشش کے باوجود انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو' اور اب فکر نہ کرنا۔ اب تو تم بالکل ٹھیک ہو چکے ہو۔ میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔ تم سونے کی کوشش کرو۔" اس نے غالباً" میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ تبھی مجھے لگا جیسے میرا سارا جسم سن ہو چکا ہے۔ لمس کا احساس ضرور ہوا تھا مگر کچھ عجیب سا' جیسے سن ہونے والا پاؤں زمین پر رکھیں تو عجیب سا احساس ہوتا ہے وہی احساس اس کے کندھا چھوتے ہی ہوا اور باریک باریک سی سوئیاں چبھ گئیں۔ اچھا ہوا کہ اس نے جلد ہی اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ورنہ میں جانے کب تک ان سوئیوں کی چبھن برداشت کرتا۔ اس کے بعد شاید اس نے مجھے انجکشن لگا دیا تھا۔ میں جاگنا چاہتا تھا۔

اماں کو' تایا کو اور شرف الدین کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے پیروں میں تو اب اتنی تکلیف نہیں تھی پھر میرا بدن سن کیوں ہے' میرے ساتھ کیا ہوا تھا مگر اب میری آنکھیں بوجھل ہوتی جارہی تھیں۔ میرے دماغ میں عجیب سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں سو رہا ہوں' مجھ پر غشی طاری ہو رہی ہے۔ پھر شاید میں سو گیا۔

○

میری آنکھ چڑیوں کی زندگی سے بھرپور چہچہاہٹ کی وجہ سے کھلی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی ڈھیروں روشنی آنکھوں میں بھر گئی۔ غالباً" کمرے کی کوئی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جہاں سے آنے والی روشنی اور چڑیوں کی چہچہاہٹ نے مجھ میں توانائی بھر دی تھی۔ میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ گردن کو جنبش دی تو یہ دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گیا کہ میں گردن گھما سکتا تھا۔ اب میں پتھریلے پن کے اس جان لیوا احساس سے چھٹکارا پا چکا تھا جو اب سے پہلے مجھے بے بس کیے ہوئے تھا۔ میں نے جلدی سے داہنی جانب دیکھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک لکڑی کی بنچ پڑی تھی جس پر شرف الدین سکڑا ہوا پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ لوہے کے اس پلنگ کے برابر' دوسری جانب ایک بید کی کرسی رکھی تھی جس پر اماں پاؤں اٹھائے ہوئے' کلائی میں تسبیح پہنے۔ ہاتھ میں پنج سورہ تھامے شاید پڑھتے پڑھتے ہی نیند کی وادی میں اتر گئی تھیں۔ ان کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ وہ مقدس کتاب گھٹنوں پر دھری تھی۔ چہرے پر شدید تھکاوٹ کے آثار تھے۔ مجھے ان پر پیار اور رحم آیا۔ کاش میں ان کے لیے عذابوں کا سبب نہ بنا ہوتا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے ان دونوں کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ جانے وہ کب کے جاگ رہے ہوں گے' ان دونوں کو دیکھنے کے بعد میں نے گردن گھما کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں' میں نے رنمو کو دیکھا تھا۔ یہ تو ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک میرے پلنگ کے علاوہ صرف وہی بنچ اور کرسی تھی جس پر شرف الدین اور اماں موجود تھے۔ سامنے دروازہ تھا جو بند تھا۔ میرے سرہانے ایک بڑی کھڑکی تھی جس پر گہرے نیلے رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے جو شاید کسی نے ہٹا کر ایک طرف کر دیے تھے۔ سورج کی روشنی اسی کھڑکی سے کمرے میں آرہی تھی۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ اماں کی کرسی کے ہتھے پر جائے نماز تہ کی ہوئی رکھی تھی۔ اماں شاید فجر کی نماز پڑھ کر ہی دعا پڑھتے پڑھتے سو گئی تھیں۔

مجھے اماں اور شرف الدین پر بہت پیار آیا۔ خاص طور پر شرف الدین کے رویے نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ پہلے روز سے میرے ساتھ تھا۔ قاعدے سے اسے اب تک علی گڑھ یونیورسٹی چلے جانا چاہیے تھا۔ اس کی تعلیم کا حرج ہو رہا تھا۔ میری تو جایداد تھی مگر ان لوگوں کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی جسے جایداد کہتے۔ لے دے کے ایک تین چار کمروں والا مکان تھا۔ اس کے گھر کے افراد کی تمام خوشیاں اس کے روشن مستقبل سے وابستہ تھیں۔ اسے بہرحال تعلیم حاصل کر کے کچھ بننا تھا' کچھ کرنا تھا۔ لیکن وہ اپنا قیمتی وقت میرے مسائل کے حل میں برباد کر رہا تھا جبکہ میرے مسائل حل ہونے والے بھی نہیں لگتے تھے۔ آج مجھے اپنی خود غرضی کا شدت سے احساس ہوا۔ میرے گھر کی دال روٹی چل رہی تھی تو میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے گھر کے مسائل کون حل کرے گا۔ اس کا بوڑھا باپ کب تک کما کر کھلاتا رہے گا۔ شاید اس کی یہی بے پروائی تھی جس نے انھیں اس قدر چڑچڑا بنا دیا تھا۔ میرے معاملات سلجھنے کی بجائے الجھ رہے تھے۔ میں اپنے ساتھ اس کی زندگی داؤ پر لگا تا تو مجھ سے بڑا کمینہ اور خود غرض کوئی بھی نہ ہوتا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب اسے صاف صاف کہہ دوں گا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے یونیورسٹی جوائن کر لینا چاہیے یا امروہہ جا کر اپنے ابا کا ہاتھ بٹھانا چاہیے۔ میں یہ سب باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک شگفتہ کا معصوم سراپا نگاہوں کے سامنے چمکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی تھا۔ میرا جی چاہا کہ ان آنکھوں کو چوم لوں۔ اس وقت تو دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ نہ اعتراض کرنے والا تھا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر کے اس کے چہرے کو جیسے اپنی آنکھوں میں قید کر لیا اور اس کی کنواری سی آنکھوں کو چوم لیا۔ خدا کی قسم' وہ ایک انوکھی حلاوت تھی جو میرے رگ و پے میں سنسناتی ہوئی اتر گئی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنی نسوں میں ستارے سے ٹوٹتے محسوس ہو رہے تھے' یوں جیسے کہکشاں میرے وجود میں تیر رہی ہو۔ میں زندگی کی سب سے بڑی نعمت سے محروم تھا۔ میرے لبوں نے اب تک اس معصوم سی لڑکی کی سماعت میں کوئی سرگوشی نہیں اتاری تھی۔ میں نے ایک طوفان بلا خیز کو اپنے سینے میں بل کھاتا محسوس کیا اور فیصلہ کر لیا کہ ان تمام مسائل سے ہٹ کر میں اسے اپنے پیار کا یقین ضرور دلاؤں گا۔ اس سے کہوں گا کہ تم میری ہو' میں نے تمہاری ان کنواری سی آنکھوں کو چوم کر تمہارے نام پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی ہے۔ میں دنیا بھر کے عذابوں سے صرف اور صرف تمہارے لیے مقابلہ کروں گا اور ایک روز تمہیں حاصل کر لوں گا۔ میں نے حویلی کی سیڑھیوں سے ملنے والی چاندی کی پائل آج تک شگفتہ کے لیے چھپا کر رکھی ہوئی تھی' وہ میں اسے دینا چاہتا تھا۔ اپنے پیار کی بیڑی بنا کر اس کے نرم و نازک پیروں میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار کا پیغام تو میں نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر اب میں اس کی آواز کی تمام شیرینی اپنی سماعت کے ذریعے اپنے وجود میں گھول لینا چاہتا تھا۔ میں نے اب سے پہلے اپنے جذبے میں اس قدر شدت محسوس نہیں کی تھی۔ میں بے چین ہو گیا' سب کچھ بھول گیا۔ صرف شگفتہ یاد رہ گئی۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ ان حالات اور ایسی حالت میں مجھ پر عشق کا بھوت سوار ہو رہا تھا مگر ایمانداری سے بتائیے کہ میری زندگی میں کتنے لمحے ایسے آئے تھے جنھیں فطری احساسات کے اظہار کا موقع ملا ہو؟ میں انسان تھا' نوجوان تھا' شگفتہ مجھے پسند آئی تھی' میں اسے پانا اور چاہنا چاہتا تھا پھر ایسی کیا بات تھی کہ میں اپنے جذبات کا گلا گھونٹ لیتا' ہاں اتنا تھا کہ میری زندگی پراسراریت کا شکار ہو چکی تھی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں کھل کر اپنے محسوسات کا ادراک اور پھر اس کا اظہار کر پاتا' مگر جب بھی موقع ملتا تھا ذہن میں رنگوں کا امتزاج شگفتہ کی شبیہ بنا لیا کرتا تھا اور شاید یہ میرا حق تھا۔ پہلے مجھے شکست اور پرکاش نے جکڑ رکھا تھا۔ وہ ایسی عمر تھی جب آدمی اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتا تو ہے مگر انھیں کوئی نام نہیں دے پاتا اور جب نام نہیں دے پاتا تو ہزار قسم کی کجی کا شکار ہو جاتا ہے' وہ عمر جو سکون سے چاندنی میں لیٹ کر اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کے رنگین دھاگوں سے مختلف چیزیں بنانے کی ہوتی ہے وہ خوف اور خاندان پر بیتنے والے حادثوں کی نذر ہو گئی۔ جذبے بھنور بن کر سر اٹھانے لگے تو سادھو کی غلیظ شخصیت نے طبیعت میں تعفن بھر دیا' اس درمیان میں جو لمحوں کی لطافت محسوس کی تھی اسے لب اظہار تک نہ لا سکا اور اب۔ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کا مرد سارے جذبوں کی مضبوطی کا قائل ہو کر اپنے لیے مستقبل کی راہ متعین کرنا چاہتا ہو۔ اپنے ہر جذبے کو اس کی اپنی جگہ پروان چڑھانا چاہتا ہو' شاید اسی وجہ سے میں اپنے لطیف جذبوں میں بھی استحکام محسوس کر کے شدت پسندی کا شکار ہو گیا تھا۔ اب شاید آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے اور آپ نے میرے حق کو بھی تسلیم کر لیا ہو گا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ شگفتہ سے اظہار محبت کو دل مچل اٹھا تھا اور میں اپنی تمام تکلیف بھی بھول چکا تھا۔ میں شاید پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے پیروں کی تکلیف کم تھی۔ توانائیاں مجھ میں بھرپور احساس کو جگا چکی تھیں۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ معلق ہو جانے والی کیفیت ختم ہو چکی تھی مگر ہزاروں سوال تھے جو میرے اندر گھٹن بن کر پھیلے ہوئے تھے۔ میں شرف الدین کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ اماں سے پہلے جاگ جائے' میں اماں کے سامنے سوالات کر کے انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس وقت مجھے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ چاپ قریب ہوتی جارہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسرے ہی لمحے کسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دستک کی آواز نے اماں کو چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ اس کے ساتھ ہی شرف الدین بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خجالت تھی' آنکھ کھلتے ہی اماں اور شرف الدین دونوں نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سفید لباس میں ایک نازک سی' خوب صورت سی نرس ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی تھی۔ اس کے بعد ہی ان دونوں کی نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔ میں انھی دونوں کو دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ مجھے جاگتا دیکھ کر دونوں ہی کھل اٹھیں گے۔ وہی ہوا بھی۔۔۔ وہ دونوں ہی مجھے یوں جاگا دیکھ کر میری طرف لپکے۔

"بیٹا۔ بیٹا کیسا ہے تو؟" اماں نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔ ان کی آنکھیں ایک دم ہی بھیگ گئی تھیں۔

"سر! اب آپ کیسے ہیں؟" شرف الدین نے بڑے مودبانہ انداز میں تعظیم دیتے ہوئے پوچھا جیسے میں اس کا دوست نہیں استاد ہوں۔

"پلیز! آپ لوگ زیادہ باتیں نہ کریں۔" نرس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"جی جی۔ میں نے اسی لیے صرف پانچ حرفی جملہ کہا ہے' اور ایسا آپ ہی کے احترام میں کیا ہے۔" شرف الدین نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ میں ایک دم ہی اس کی شرارت کو سمجھ گیا۔

اماں جلدی سے چھوٹا سا بگونا اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ نرس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "وقار صاحب! آپ بڑی ہمتوں والے ہیں۔ آپ نے اتنی جلدی خود کو سنبھالا ہے کہ سبھی حیران ہیں۔ ایسے مریض عموماً نفسیاتی سے فورمین ڈیز لیتے ہیں۔ ویسے اب آپ کیسے ہیں؟ ... سچویکنیس تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

"ویسے وقار صاحب اس وقت کافی فریش لگ رہے ہیں۔" شرف الدین نے بڑے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔" اس نے ناگواری سے جواب دیا اور پھر اپنی ٹرے میں رکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی ڈبیوں سے گولیاں نکالنے لگی۔ شرف الدین نے فوراً پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے شکریہ کہہ کر لے لیا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پانی پی لیا۔ وہ ایک ہاتھ میرے سر کے نیچے سے نکال کر مجھے سہارا دیے ہوئے تھی۔

"آہ۔" اچانک شرف الدین نے آہ کھینچی۔ "کاش وقار صاحب پر آئی مجھے آئی ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" نرس نے پلٹ کر پوچھا اور پھر مجھے سہارا دے کر لٹانے لگی۔

"اب میں ان کی ساری بلائیں اپنے نام کرنے کو تیار ہوں۔ میں انھیں بیمار نہیں دیکھ سکتا نرس! آخر کب تک برداشت کروں گا؟" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"آپ ان کے کون ہیں؟" وہ شاید شرف الدین کی باتوں سے متاثر ہو گئی تھی' ممکن ہے وہ سوچ رہی ہو کہ یہ کتنا بہترین دوست ہے جو اپنے دوست کی تکلیف خود پر لینے کو تیار ہے۔

"میں۔ میں ان کا دوست ہوں مگر یہ۔ یہ میرے۔" پھر اتنا کہہ کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ وہ ان حالات میں بھی اپنی ظرافت سے باز نہیں آیا تھا۔ نرس نے حیرت سے اسے' پھر مجھے دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ بھی مسکرا دی۔

پھر شرف الدین کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ شرف الدین بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھائے اسے جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ چہرے سے نہیں ہٹائے تھے۔ اس کے کمرے سے باہر جاتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ اب وہ سنجیدہ تھا۔

"وقار الحسن! اماں آنے والی ہیں۔ صرف اتنا سن لو کہ ان کے سامنے بیٹھک میں ہونے والے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کرنا۔ تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا۔"

"مگر۔ وہاں ہوا کیا تھا؟" میں بے چینی سے بولا۔ "لڈن کہاں ہے۔ اور تایا۔ وہ کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا مگر اماں کے سامنے بات نہ کرنا۔" اس نے جلدی جلدی کہا اور پھر اماں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ لوہے کی اس الماری پر جھک گیا جہاں گلاس رکھا تھا۔ اس الماری کے بالکل ساتھ ہی چھوٹی سے صراحی رکھی تھی۔ وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ اماں دوپٹے کے پلو سے چھوٹے بگونے کو تھامے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ شاید وہ بگونا گرم تھا۔ تسبیح اب بھی ان کی کلائی میں جھول رہی تھی۔ انھوں نے لکڑی کی بنچ پر بگونا رکھ دیا اور میرے قریب چلی آئیں۔

"وقار الحسن! چائے پیو گے؟"

"جی اماں!" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ مجھے بولتا دیکھ کر کھل اٹھیں' پھر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔ "تمہاری آواز سننے کو تو کان ترس گئے تھے وقار الحسن! خدا جانے ہمارے یہ عذاب کب ختم ہوں گے تمہاری بہنوں کی کیا حالت ہے یہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اور وہ۔"

"وقار الحسن! تم چینی کتنی پیو گے؟ اور اماں آپ۔ آپ بیٹھ جایئے۔" شرف الدین نے اماں کی بات کاٹی تو مجھے کچھ چونکنا ہو گیا۔ وہ اتنا بد تہذیب نہیں تھا کہ بڑے کی بات کاٹ دیتا۔ مجھے لگا جیسے اماں کچھ کہنے والی تھیں اور شرف الدین نے انھیں روکا ہے۔ میں نے پہلے اماں کو پھر شرف الدین کو دیکھا۔ دونوں نے نگاہیں چرا لیں۔ اماں آنکھیں رگڑ کر تسبیح کے دانے چلانے لگیں اور شرف الدین پیالوں میں چائے نکالنے لگا۔

"کیا بات ہے اماں! آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "جہانی آپا اور شنو آپا تو ٹھیک ہیں ناں! اور تایا۔ کیسے ہیں وہ؟ آئے کیوں نہیں؟" اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہاں تایا کھڑے تھے۔

"لو بھئی۔ ہم یہاں زندگی سے بیزار ہیں۔ وہاں تم ہماری عمر بڑھائے چلے جا رہے ہو۔" اتنا کہہ کر وہ لپک کر میرے قریب آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ٹوکری تھی جو انھوں نے اماں کی طرف بڑھا دی پھر جھک کر میری پیشانی کو چوما۔ "کیسے ہو بیٹا! تمہارے بغیر تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ اللہ نے کرم کیا کہ وہ۔"

"تایا آپ کھانا لائے ہیں؟" شرف الدین نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ پلٹے۔ "ہاں! میں جانتا تھا بیٹا کہ تم بہت بھوکے ہو گے۔ تمہاری تائی نے بیسنی پراٹھے بھیجے ہیں۔ اتنے روز بعد ہمارے گھر چولھا جلا تھا۔" وہ آبدیدہ ہو گئے پھر اماں کی طرف رخ کر کے بولے۔ "دلھن تم بھی کھا لو۔"

مجھے اس بار شرف الدین پر غصہ آ گیا۔ مجھے لگا جیسے اس نے پھر اس نے تایا کو بھی کچھ کہنے سے روک دیا ہو کیوں کہ تایا عجیب نگاہوں سے شرف الدین کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ اماں نے ٹوکری سے ٹفن کیریر نکال لیا اور بیسنی پراٹھے نکالنے لگیں۔ تایا ایک طرف بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ وہ ایک ہی دن میں برسوں کے مریض اور بہت بوڑھے لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پڑی جھریاں گہری ہو چکی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔

شرف الدین نے دو تین تکیے رکھ کر مجھے تقریباً بٹھا دیا۔ میرے پیروں میں تکلیف کے علاوہ کوئی تکلیف نہ تھی البتہ میں بے پناہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ "تایا میں گھر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے تایا سے کہا۔

"ہاں بیٹا! میں آج ڈاکٹر سے بات کرنے آیا ہوں۔ اب بہت روز ہو گئے ہیں۔ تمہارے بغیر گھر بالکل سونا ہو گیا ہے۔ تمہاری بہنیں پریشان ہیں' تائی تو ہر وقت روتی رہتی ہیں۔ میں آج ہی بات کروں گا۔"

وہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے مگر میرا ذہن تو ایک ہی جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا کہ بہت روز ہو گئے ہیں۔

"تایا! کیا۔ کیا مجھے یہاں آئے بہت روز ہو گئے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلے تم کھانا کھا لو پھر بات کریں گے۔" شرف الدین نے پلیٹ میں بیسنی روٹی رکھتے ہوئے کہا۔

"تم چپ ہو جاؤ۔" میں چیخ اٹھا۔ "تم۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ تم نے اماں اور تایا کو بات کرتے کرتے ٹوک دیا' شرف الدین۔ شاید تم مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہو۔ مجھے صاف صاف اور کھل کر بتاؤ کہ کیا ہوا تھا ورنہ۔"

"نہ بیٹا نہ۔ ہم تجھ سے کچھ کیسے چھپائیں گے؟" اماں ایک دم میرے قریب آ گئیں۔

"پھر اماں! تایا مجھے بتایئے کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ لڈن کیسا ہے؟ کیا وہ۔ وہ مر گیا؟"

میرے اس جملے کے بعد کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ اماں' تایا اور شرف الدین چپ ہو کر میری صورت دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر بے بسی تھی۔ لبوں پر خاموشی کی مہر لگی تھی اور آنکھیں بے چین ہو گئی تھیں۔

"کیا بات ہے اماں؟" میرا دل ہولنے لگا تھا۔

"بیٹا۔ تم پہلے کھانا۔"

"نہیں۔ مجھے نہیں کھانا کھانا۔ پہلے مجھے بتایئے کہ کیا ہوا ہے؟"

"اچھا اچھا۔ تم خود کو ہلکان تو نہ کرو۔" اماں نے آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے کے پلو سے میری پیشانی صاف کی۔

"بتایئے ناں اماں!" میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"وقار الحسن! میں چاہتا تھا کہ ہم یہ باتیں گھر چل کر کریں۔ ابھی کچھ دیر میں ڈاکٹر آ جائے گا۔ یہاں یہ باتیں کرنا مناسب نہیں ہیں۔" تایا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

بات تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنی بے چینی کو بڑی مشکل سے دبایا۔ اماں مجھے اپنے ہاتھوں سے نوالے کھلانے لگیں۔ شرف الدین خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ اماں کے چہرے پر شدید دکھ کے آثار تھے۔ میں شرف الدین کو رحیمو والی بات بتانا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں اب سے پہلے کون سے کمرے میں تھا جہاں میں نے رحیمو کی لاش کو حرکت کرتے دیکھا تھا مگر یہ باتیں اماں کے سامنے کرنے والی نہیں تھیں اس لیے مجھے اس وقت خاموش ہی رہنا تھا۔ اچانک مجھے اس فیروزے والی انگوٹھی کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا' وہ انگوٹھی اب بھی میرے

ہاتھوں میں تھی۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ "شرف الدین! سنہرے بابا آئے؟" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"نہیں ۔۔ میں گیا تھا وہاں، مجھے فقیر بابا ملے تھے۔ وہ ناراض تھے کہ ہم ۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے چونک کر تایا اور اماں کو دیکھا۔

"کیوں ناراض تھے؟" اماں نے فوراً پوچھا۔

"وہ ۔۔ انھوں نے ہمیں بلایا تھا ناں اماں ۔۔ لیکن ہم وقار الحسن کی وجہ سے جا ہی نہیں سکے تھے اس لیے ناراض تھے۔" شرف الدین نے گڑبڑا کر کہا۔ غالباً وہ بات بدل چکا تھا۔

"بزرگوں کی ناراضگی عتاب بن کر ٹوٹتی ہے بیٹا! انھیں ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ ہم وقار الحسن کے پاس تھے، تمہیں ان سے مل لینا چاہئے تھا بلکہ اچھا تھا کہ تم ان سے مل کر وقار الحسن کی حالت کے بارے میں بھی بتا دیتے۔" اماں نے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

میرے جبڑے تھک چکے تھے حالانکہ میں نے بہ مشکل چند نوالے لیے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چبانا دشوار ہو گیا ہو۔ اس تھکن کے باوجود کھانا کھا کر میں خود میں کافی توانائی محسوس کر رہا تھا۔

"بس اماں ۔۔ پریشانی میں گیا ہی نہیں۔" شرف الدین نے یہ کہہ کر گویا بات ختم کر دی۔

تایا جن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے ان میں تاسف تھا۔ میرے متوجہ ہوتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ "میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ اتنے میں چکنے فرش پر بوٹوں اور ایڑیوں کی آوازیں ابھریں۔ شاید کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ ہم سب کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ڈاکٹر اور نرس تھی۔

"ہاں جناب ۔۔ اب کیسے ہیں آپ؟" ڈاکٹر مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ "اوہ مبارک ہو، آج تو غالباً آپ نے کھانا بھی کھا لیا۔" اس نے اماں کو پلیٹیں سمیٹتے دیکھ کر کہا۔

"جی ڈاکٹر! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ گھر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے فوراً اپنا مدعا بیان کر دیا۔ وہ میرے پیروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نرس پٹی بدلنے کی تیاری کرنے لگی۔

"جی جی ۔۔ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے، لیکن ابھی آپ کے زخم نہیں بھرے ۔۔ ویسے میں دیکھ لیتا ہوں کہ کنڈیشن کیا ہے۔ اچھا آپ ویکنس تو محسوس نہیں کر رہے؟"

"کچھ کمزوری ہے تو مگر ایسی بھی نہیں کہ میں ۔۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی پھر [illegible] طرف متوجہ ہو گیا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ گھر [illegible] ہیں؟"

"جی ڈاکٹر! اگر زخم بہتر ہوں تو میں یہی چاہوں گا [illegible] لے جاؤں۔"

"پھر آپ کو ہر دوسرے روز آنا پڑے گا۔ ان [illegible] تبدیل کروانا ہو گی۔" ڈاکٹر ہسٹری شیٹ پڑھتے ہوئے [illegible] "ویسے یہ کافی بہتر ہیں۔" اس نے ہسٹری شیٹ پر [illegible] ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں نرس پٹی باندھنے کا انتظام کر چکی تھی [illegible] نے اماں کو باہر جانے کے لیے کہا۔ اماں دوپٹے کا پلو [illegible] رکھے باہر چلی گئیں۔ تایا ان کے ساتھ ہی تھے البتہ [illegible] الدین میری پائنتی کھڑا رہا۔ نرس نے پٹی کھولنا شروع [illegible] میری نگاہیں اپنے پیروں کے اوپر ٹخنوں پر جمی ہوئی تھیں [illegible] پٹی کھلی تو میں دنگ رہ گیا۔ میرے ٹخنوں پر ایسا زخم تھا [illegible] کسی نے میرے پیروں میں لوہے کے باریک تار ڈال کر [illegible] دیئے ہوں یا لوہے کی بیڑیاں پہنا کر چھوڑ دیا ہو جو [illegible] آہستہ تنگ ہو کر گوشت میں دھنس گئی ہوں۔ زخم [illegible] دائرے کی شکل میں پوری ٹانگ پر تھا۔ جس میں شاید [illegible] چکی تھی۔ گو زخم بہت بہتر تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا [illegible] اب سے پہلے وہ کافی بگڑ چکا تھا۔ میں حیرت سے سوچ [illegible] کہ وہ تو انگلیاں تھیں۔ میں نے صاف طور پر محسوس [illegible] کہ سوکھے سوکھے ہاتھوں نے میرے پیروں بلکہ ٹخنوں [illegible] پاس سے دونوں ٹانگوں کو جکڑ لیا ہے۔ میں نے اپنی ٹانگوں [illegible] پانچوں انگلیوں کو محسوس کیا تھا جبکہ اب جو نشان تھا وہ [illegible] کسی کڑے کے دھنس جانے جیسا تھا۔ میں نے [illegible] بھری نگاہیں اٹھائیں تو شرف الدین میرے سامنے کھڑا [illegible] اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ [illegible] غالباً اسے خدشہ تھا کہ مارے حیرت کے میں کچھ بول اٹھوں۔ میں اس کا اشارہ سمجھ کر چپ رہا۔

"یہ عجیب و غریب شوق آپ کی جان بھی لے سکتا تھا" ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"جی ۔۔!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کون سا شوق [illegible]"

"بس ڈاکٹر شوق کیا ۔۔ بے وقوفی کہہ لیں۔ میں تو [illegible] پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یوں لوہے کے کڑے پہننا بھلا کیا ہے؟ کسی جاہل نے کہہ دیا تھا کہ یہ کڑے پہن لو گے تو حافظہ تیز ہو جائے گا اور امتحانوں کے لیے رات رات بھر جاگ کر نہیں پڑھنا پڑے گا۔ انھوں نے امتحانوں سے چھ ماہ پہلے کڑے پہن لیے۔ پہلے تو یہ بڑے لاغر ہوتے تھے [illegible] ان کی خوراک اتنی بڑھ گئی کہ یہ کڑے ۔۔ تنگ ہو گئے اور پھر کسی طرح ہاتھ میں ہی نہیں آتے تھے کہ کاٹے جاتے۔" شرف الدین میرے بولنے سے پہلے ہی بولنے لگا۔ میں بڑی توجہ سے سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا تو میں چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا کر کے دھیرے سے مسکرا دیا۔

"شکر کریں کہ آپ وقت پر آ گئے ورنہ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ لوہے میں زنگ ہوتا ہے، ڈاکٹر رام ناتھ نے بڑی مہارت دکھائی ورنہ ۔۔" وہ مسکرا کر بتا رہا تھا۔ وہ کافی خوش اخلاق ڈاکٹر تھا۔ نرس اس دوران میں میری پٹی بدل چکی تھی۔ زخم کی صفائی کے دوران میں کچھ تکلیف ہوئی تھی مگر اب سکون تھا۔

تایا نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ ہر دوسرے روز مجھے لے آئیں گے۔ اس کے بعد اس نے کچھ دوائیں لکھ دیں تھیں اور پابندی سے استعمال کی ہدایت کی تھی۔ اماں یہ سنتے ہی کہ میری اسپتال سے چھٹی ہو رہی ہے، جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگیں۔ میں بھی خوش تھا۔ ہم ضروری کارروائی نمٹا کر اسپتال سے نکلے تو سہ پہر کا وقت تھا۔ مجھے پہیوں والی کرسی پر برآمدے تک لایا گیا۔ شرف الدین تانگا اسپتال کے اندر ہی لے آیا تھا۔ مجھے تایا اور شرف الدین نے سہارا دے کر تانگے میں سوار کرایا۔ میں نے پیر زمین پر رکھتے ہوئے محسوس کیا کہ شاید میں ابھی کچھ روز اور چلنے کے قابل نہ ہو سکوں۔

گھر کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ میرے برابر ہی بیٹھی تھیں۔

"اماں! اب کیوں روتی ہیں؟ میں ٹھیک تو ہو گیا ہوں۔" میں نے برقعے سے جھانکتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"دلھن! خود پر قابو رکھو۔" تایا کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

"تایا! کیا میں بہت دنوں بعد گھر آیا ہوں۔" میں اماں اور تایا کو آبدیدہ محسوس کر کے بولا۔

"ہاں بیٹا! آج چالیسواں روز ہے۔"

ان کا جملہ میرے پورے وجود میں دھماکا بن کر گونج اٹھا۔ "کیا ۔۔؟" میں چیخ اٹھا۔ "چالیس روز ۔۔ تایا آپ ۔۔ آپ ۔۔ اماں!" میں ایک دم اماں کی طرف مڑا۔

شرف الدین نے جو میری دوسری طرف بیٹھا تھا میرے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اماں نقاب میں رو رہی تھیں۔ میں نے حیرت اور خوف سے شرف الدین کو دیکھا۔ "شرف الدین! اتنے روز ۔۔؟ م ۔۔ مجھے ایسا کیا ہو گیا تھا ۔؟"

"وقار الحسن! تم موت کا مزہ چکھ کر لوٹے ہو ۔۔۔ تم سترہ روز کے بعد صرف ایک دن ہوش میں آئے تھے، پھر بے ہوش ہو گئے تھے، پھر شاید ہفتہ بھر بعد ہوش میں آئے اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ شاید آج ہی تم صحیح معنوں میں اپنے حواسوں میں ہو۔ سترہ روز تک تو ڈاکٹرز بھی کچھ کہنے کے قابل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمہیں بچانا صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہم سب کی دعائیں یا تمھاری نیکیاں تھیں جو تم ۔۔؟" وہ کہہ رہا تھا اور میں حیرت سے سن رہا تھا۔ اس دوران میں تایا اندر جا کر بید والی کرسی اٹھا لائے تھے۔ اماں ٹوکریاں لے کر گھر میں چلی گئی تھیں، جہانی آپا، شنو آپا، تائی، چچا، چچی سب دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ پھر چچا، تایا اور شرف الدین نے مجھے سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ تانگے والے کو فارغ کر کے ان لوگوں نے مجھے کرسی سمیت اٹھا کر اندر پہنچایا۔ جہانی آپا اور شنو آپا بری طرح رو رہی تھیں۔ تائی بھی بار بار اپنی ناک صاف کر رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر خوشی اور غم کا امتزاج تھا۔ تایا کے برابر ایک اور پلنگ ڈال دیا گیا تھا۔ چند مونڈھے بھی وہیں رکھے تھے۔ دوسری جانب نماز کا تخت بچھا تھا، ایک طرف دیوان رکھا تھا جو بیٹھک میں رکھا ہوتا تھا۔ گویا، بیٹھک کا تمام سامان باہر تھا۔ مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ جہانی آپا نے آگے بڑھ کر میری پیشانی چوم لی۔ وہ اب بھی بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ شنو آپا میرے سرہانے دوسری جانب کھڑی رو رہی تھیں۔

"آپ لوگ اب کیوں رو رہے ہیں بھئی ۔۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" میں ان سب کے رونے سے بیزار ہو گیا۔ ان سب کو تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ اب تو مجھے ایسی تکلیف بھی نہ تھی کہ اتنا رویا جاتا۔

"ارے بھئی کیا ہے یہ سب؟" ایک دم تایا چیخ اٹھے۔ "جاؤ اپنا کام کرو سب۔ خواہ مخواہ بچے کو ہلکان کیے دے رہے ہو۔ تبن تم کوثر کو باہر لے آؤ۔ وہ بہت بے چین ہوگی۔" تایا نے چچا سے کہا اور چچا لپک کر تائی کے کمرے میں چلے گئے۔

جہانی آپا' شنو آپا اور چچی ایک طرف کو چلی گئیں۔ اماں برقعہ اتار کر میرے قریب آبیٹھیں۔ ان کی آنکھوں کے نیچے جھریوں میں پانی کی قطرے چمک رہے تھے۔ گھر والوں کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا۔ ایک عجیب قسم کی بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ شرف الدین بیٹھک کی طرف چلا گیا تھا۔ میری نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا تو میں یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اس بیٹھک کے باہر کئی جوتوں کی جوڑیاں رکھی تھیں' یوں جیسے اندر اماں نے سامان نکال کر سفید چاندنیاں بچھوا دیں ہوں۔ بیٹھک میں دن کی سی روشنی بکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ یہ روشنی صرف اسی وقت ہوتی تھی جب بیٹھک کا دوسری طرف والا دروازہ کھلا ہوتا تھا ورنہ اس رخ پر کھڑکیاں بھی نہیں تھیں' اس طرف برآمدے کی وجہ سے اتنی روشنی نہیں پہنچ پاتی تھی۔ اس کا صاف مطلب تو یہ تھا کہ بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اچانک مجھے اگربتی اور لوبان کی خوشبو نے گھیر لیا۔ مجھے اس خوشبو سے چڑ سی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ خوشبو موت کے سانحے سے منسوب ہو چکی ہو۔ دادی کی موت تو میرے کچے ذہن میں اس بری طرح بیٹھ چکی تھی کہ مجھے اس خوشبو ہی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر ابا کی موت' گنگوا کی موت' خورشید چاچا کی موت' ان تمام اموات میں جیسے اہم چیز یہی خوشبو تھی۔ میں نے اماں کو بلانے کے لیے نگاہ چاروں طرف دوڑائی' تایا میرے پلنگ کے قریب پڑے تخت پر مصلّے پر بیٹھ چکے تھے اور انھوں نے نیت بھی باندھ لی تھی ورنہ میں ان سے ہی کچھ پوچھتا۔ شرف الدین بیٹھک میں چلا گیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا جبکہ اسے تو مجھے تفصیل سے سب کچھ بتانا چاہئے تھا۔ جہانی آپا' شنو آپا اور چچی پہلے ہی تایا کے ڈانٹنے پر جا چکی تھیں۔ اماں بھی یقیناً نماز ہی کے لیے گئی ہوں گی۔

اچانک مجھے چھوٹی پھوپی کا خیال آیا۔ وہ اب تک نظر نہیں آئی تھیں۔ چچا اوپر چلے گئے تھے۔ میں پریشان لیٹا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک چچا سیڑھیاں اتر[illegible] دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں خاص دان تھا جس میں [illegible] کے بیڑے' الائچی' سونف اور کتری ہوئی چھالیہ تھی[illegible] کافی تعداد میں تھے۔ وہ اس طرف آنے کی بجائے سید[illegible] بیٹھک کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ [illegible] کیا اتنے مہمان آئے ہوئے ہیں؟ اب ان باتوں نے [illegible] سخت مضطرب کر دیا تھا۔ میں بے ساختہ جہانی آپا [illegible] بیٹھا۔ وہ باورچی خانے میں تھیں' میری آواز سنتے ہی دو[illegible] کے پلو سے ہاتھ رگڑتی ہوئی دوڑی چلی آئیں۔

"جہانی آپا! کیا۔۔۔ کیا مہمان آئے ہوئے ہیں؟"

جہانی آپا نے مجھے دیکھا۔ پھر ان کی نگاہ تایا کی طرف گئی۔ وہ سلام پھیر چکے تھے اور جہانی آپا ہی کی طرف [illegible] رہے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے اور ہاتھ میں پکڑ[illegible] تسبیح کے دانے ہلکی آواز سے گرتے جا رہے تھے۔

"وہ۔۔۔ وہ بھیا جی! وہ۔۔۔ کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ۔۔۔"

ابھی انھوں نے جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ دروازے [illegible] دستک ہوئی۔ جہانی آپا بات ادھوری چھوڑ کر دروازے [illegible] چلی گئیں۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھلا تو کئی خواتین برقعوں میں لپٹی اندر داخل ہوئیں۔

"آیئے۔۔۔ آیئے۔۔۔ ادھر آجایئے۔" جہانی آپا انھیں لیے اماں والے کمرے کی طرف بڑھیں۔ وہ تمام خواتین چپ چاپ اسی طرف چلی گئیں پھر وہ سب دروازے سے باہر جوتے اتار کر اندر چلی گئیں۔ اب میری وحشت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ گویا اس کمرے میں بھی چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔

"تایا۔۔۔!" میں بے ساختہ پکار اٹھا۔ میری آواز وحشت سے پھٹی پڑ رہی تھی۔ "کیا ہے یہ سب؟ یہاں کیا ہو رہا ہے تایا؟"

وہ جلدی سے میرے قریب چلے آئے۔ "وقار الحسن! خود کو سنبھالو بیٹا! ہمارے بوڑھے سینے میں اتنے چھید ہو چکے ہیں کہ اب ذرا سی تیز آواز بھی سنائی دے تو لگتا ہے جھکڑ چلنے لگے ہوں اور اس جھکڑوں میں زندگی کاغذ کی طرح اڑ جائے گی۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ اس قدر صدمات بھی اٹھانے ہوں گے۔ گزرنے کی عمر تو ہماری تھی مگر۔۔۔" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ کرتے کی آستین سے آنکھیں صاف کرنے لگے۔

"تایا۔۔۔ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا' اب۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا لڈن مر گیا؟"

تایا نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر رونے لگے۔ میں نے ایک طویل سانس لی جیسے سینے میں بھری گھٹن کو نکالنا چاہتا ہوں۔ پھر سر دیوار سے ٹیک دیا۔ تایا نے آگے بڑھ کر تکیہ اونچا کر کے میرا سر تکیے سے ٹکا دیا۔

"تایا! ان ماں باپ اور بیٹے کو کس گناہ کی سزا ملی ہے؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"وقار الحسن! اسی لیے کہتے ہیں کہ ماں باپ کا کیا اولاد کے سامنے آتا ہے' ثمن نے کیا کیا تھا۔۔۔؟ وہ معصوم تو جب تک حویلی میں رہی خوف و دہشت کا شکار رہی' اور۔۔۔ اور جب شادی ہوگئی تو بھی اسے خوشی کے چند لمحے بھی میسر نہ آسکے۔۔۔ پھر اس کے شوہر کا بھلا کیا قصور تھا' صرف یہ کہ اس نے ثمن کو اس عذاب نگری سے نکال لیا تھا۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شکنتلا کی روح نے مجھے اور ثمن کو کیسے بخش دیا مگر اب۔۔۔ اب شاید ہماری باری ہو' کاش وہ ان معصوم لڑکیوں کو بخش دیتی' ان کی آئی ہم پر آجاتی مگر۔۔۔ انھیں تو زندگی کی بہاریں دیکھنا نصیب ہو جاتیں۔" وہ جانے کن بچیوں کی بات کر رہے تھے' ابھی تو انھوں نے مجھے لڈن کے مرنے کی اطلاع دی تھی پھر یہ بچیاں کہاں سے آگئیں؟ کون بچیاں؟ شکنتلا نے کن بچیوں کو نقصان پہنچایا تھا؟ میرے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ تایا کا بدن ہچکولے لے رہا تھا' وہ رومال چہرے پر رکھے سر جھکائے سو رہے تھے۔

اب میری قوت برداشت بالکل جواب دے چکی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ابھی بلاسٹ ہو جاؤں گا۔ میرے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ گھر میں مہمان خواتین کی موجودگی نے میرے حلق میں گولے سے اٹکا دیئے تھے ورنہ شاید میں اتنی زور سے چیختا کہ پورا گھر ہل جاتا۔ میں نے تڑپ کر تایا کو آواز دی۔ "تایا۔۔۔! خدا کے واسطے مجھے بتایئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! آپ کن بچیوں کی بات کر رہے ہیں تایا جی۔ مجھے تفصیل بتایئے کہ آخر اس روز ہوا کیا تھا؟ میں کتنے روز اور کیوں اسپتال میں رہا۔ لڈن کے ساتھ کیا ہوا' خدا کے لیے تایا مجھے بتایئے ورنہ۔۔۔ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔"

میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ تایا ایک دم کھڑے ہوگئے۔

"ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو بیٹا! آہستہ بولو۔ بہت لوگ ہیں گھر میں۔۔۔ بہت لوگ ہیں۔ میں اندر جاتا ہوں' شرف الدین کو بھیجوں گا۔ تم ثمن کے کمرے میں اوپر چلے جاؤ۔ وہ تمہیں لے جائے گا پھر وہ تفصیل سے تمہیں بتا دے گا۔ وقار الحسن! مگر ایک بات یاد رکھنا۔ زندگی سختیاں جھیلنے ہی کا نام ہے' تم یہ نہ بھولنا کہ تم مرد ہو اور مرد بڑا مضبوط ہوتا ہے' میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں بکھر چکا ہوں مگر تم۔۔۔ تمہیں ابھی زندگی کا بڑا طویل سفر طے کرنا ہے۔ یہ مقدر ہے وقار الحسن! اس میں دخل دینا نہ کسی کے بس کی بات ہے' نہ کوئی مقدر بدلنے کی کوشش کرنے کے بارے میں کچھ سوچ ہی سکتا ہے۔ جو کچھ ہوگیا وہ ہمارا مقدر تھا۔ یہاں جو جس قدر سانسیں لے کر آتا ہے اسے اتنی ہی زندگی ملتی ہے۔ موت برحق ہے اور آنسو کا ایک قطرہ بھی مردے پر چٹان جتنا بھاری ہوتا ہے۔"

وہ بول رہے تھے' اور میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اب مجھے شبہ ہونے لگا کہ تایا اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ لڈن کی موت بڑی خوفناک ہوئی ہوگی' اس کی جو حالت میں نے دیکھی تھی اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنے سامنے خورشید چچا کو مرتے دیکھ چکے تھے' شاید ان دو اموات نے انھیں پاگل کر دیا تھا۔ خورشید چاچا کی موت بھی کئی روز تک انھیں بے چین کیے رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے خود کو نارمل کر لیا۔ گو ایسا کرنے میں مجھے شدید ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تایا نے میرا کندھا تھپتھپایا اور بیٹھک کی طرف بڑھ گئے۔ چند ہی لمحوں بعد شرف الدین میرے پاس چلا آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھیں نیند پوری نہ ہونے کے سبب سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ رویا بھی ہو۔ اسے مجھ سے کتنی محبت' کتنی انسیت تھی اس کا مزید احساس مجھے اسپتال میں اس وقت شدت سے ہوا تھا جب وہ لکڑی کی تنگ بنچ پر سکڑا ہوا پڑا تھا۔

"وقار الحسن! میں جانتا ہوں کہ تم کس اذیت سے دوچار ہو مگر تم مرد ہو' یہ بھی جانتا ہوں اور جو حیرت انگیز تبدیلی تم میں آچکی ہے' اسے دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ

تم اس سانحے کو بھی مردانہ وار سہہ جاؤ گے۔" وہ میری گردن اور گھٹنوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

"شرف الدین! تایا تو شاید ذہنی توازن کھو چکے ہیں مگر تم ـــ یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ رمضو چاچا کے بعد ان کی بے قصور اور بوڑھی بیوہ کی موت کے بعد مجھے یہ گمان ہو گیا تھا کہ لڈن بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ افسوس تو مجھے صرف یہ ہے کہ میں اس سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ خورشید چاچا اسے کب اور کیسے ملے تھے؟ وہ چابی اس کے پاس کہاں سے آگئی تھی۔ اس کی پشت پر یقیناً وہی سادھو والا بچھو سوار تھا مگر وہ کہاں سے آیا؟ وہ کہاں گیا تھا؟ کیا کر کے آیا تھا ـــ میں یہ سب اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بھی بڑا دکھ ہے مگر میرا خیال ہے کہ میں خود کو بے قابو کر دینے کی حد تک غمزدہ نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں خورشید چاچا کی موت پر ہی پاگل ہو جاتا۔ انھوں نے مجھے پالا تھا۔ پل پل میرا خیال رکھا تھا۔ اس وقت پاگل نہیں ہوا تو بھلا اب ـــ لڈن کی موت پر ـــ" میں نے اتنی بات ہی کی تھی کہ شرف الدین کے اٹھانے سے میرے پیروں میں اٹھنے والی ٹیس نے مجھے سسکاری لینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے مجھے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔ میرے پیر لٹک گئے تھے جس کی وجہ سے پوری ٹانگوں میں ٹپک سی ہونے لگی تھی۔ میں نے ہونٹوں کو دانتوں تلے داب لیا۔

اب وہ مجھے سیڑھیوں کی جانب لے چلا تھا۔ بقول تایا گھر میں مہمان تھے۔ میرا خیال تھا کہ لڈن کے لاوارث ہونے کی وجہ سے اماں نے آج اس کے چالیسویں کا اہتمام کیا تھا۔ اس کا نہ باپ رہا تھا' نہ ماں پھر تایا نے مجھے بتایا تھا کہ میں پورے چالیس روز اسپتال میں رہا ہوں۔ اس حساب سے اس کا چالیسواں ہی ہونا تھا۔ میرے اندر کا ہیجان کچھ کم ہو گیا تھا۔ شرف الدین مجھے اوپر اس لیے لے جا رہا تھا کہ میں تفصیل جان سکوں۔ اس نے چچا کے کمرے میں' ان کے پلنگ پر لٹا دیا۔ میں نے لیٹتے ہی پوچھا۔ "ہاں شرف الدین! مجھے بتاؤ اس روز کیا ہوا تھا؟؟"

"تم شاید گر گئے تھے۔ میں نے تمھارا بازو پکڑا ہوا تھا پھر بھی یوں لگا تھا جیسے کسی نے تمھاری ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیا ہو۔ بیٹھک میں گھپ اندھیرا تھا۔ تایا کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' باہر سے اماں اور دوسرے لوگ شور کر رہے تھے پھر بھی لڈن کے ہانپنے کی آواز تمام آوازوں پر حاوی تھی۔ تمھارے گرتے ہی میں ... سے چیخا۔ اس وقت شاید چچا نے بیٹھک کا دروازہ توڑ ... اماں کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ روشنی اندر آتے ہی یوں ... تھا جیسے طوفان سا تھم گیا ہو حالانکہ آنے والوں کی چیخ ... جاری تھی۔ ہم نے دیکھا کہ تم دیوان سے نیچے پڑے ... فرش پر لڈن اوندھے منہ پڑا تھا۔ تایا دروازے کے قر... بے ہوش پڑے تھے۔ چچا اور ہم سب پہلے تمھاری طر... متوجہ ہوئے۔ میں نے چیخ کر چچا سے کہا کہ وہ تمھیں اٹھا... باہر لے جائیں۔ مجھے ڈر تھا کہ لڈن کی گردن پر سوار ... کسی اور کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ گو وہ نظر نہیں آ... مگر اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس بچھو نے اپنا تمام ... لڈن کے بدن میں اتار دیا ہے۔ وہ بالکل نیلا ہو چکا تھا۔ تمھیں اٹھا کر باہر بھاگے پھر تایا کو اٹھا کر لے گئے۔ ... وغیرہ لڈن کو اس حالت میں دیکھ کر خوف سے بری طرح ... لگی تھیں۔ چچا نے اس روز بڑی ہمت سے کام لیا۔ وہ ... خواتین کو باہر لے گئے۔ اماں تمھیں دیکھنے لگیں۔ ... بھی تمھارے گرد جمع ہو گئیں مگر پھوپی ـــ وہ تایا کے قر... بیٹھ گئی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ تائی بھی ... تھیں اور باہر کے کمرے سے کوثر کے پکارنے کی آوا... آ رہی تھیں۔ ایک طوفان تھا وقار الحسن جو مجھے حوا... سے بیگانہ کیے دیتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے ... دیکھوں؟ کسے چپ کراؤں' تمھارے بارے میں بھی ... چاہتا تھا کہ تمھیں کیا ہوا ہے؟ تایا کے بارے میں تش... تھی اور لڈن کو دیکھنا بھی ضروری تھا۔ پھر میں نے گھ... دوسرے لوگوں کو تایا اور تمھاری طرف متوجہ دیکھ کر ... فیصلہ کیا کہ مجھے لڈن کی خبر لینا چاہیے۔ اس کی حالت کا ... کچھ کچھ اندازہ تھا۔ میں نے لالٹین لے کر اس کا جائ... اور قمیص کے نیچے دیکھا تو وہاں بچھو تو نہیں تھا مگر خو... باریک لکیریں' گدی پر گہرا نیلا چھوٹا سا زخم اور منہ سے ... کر زمین پر دور تک پھیلے ہوئے جھاگ اس بات کا ثب... تھے کہ وہ اسی بچھو کا شکار ہوا ہے۔ وہ مر چکا تھا وقار الح... اور ایک عجیب و غریب بات یہ تھا کہ اس کا جسم بلبلا... تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن کا گوشت پانی بنتا ... ہو۔ اس کو چھونے سے لگا تھا جیسے میں ربڑ کے کسی ... تھیلے کو چھو رہا ہوں جس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ میں نے پہلے اچھی طرح اس بچھو کی تلاش کی' جب وہ مجھے نظر نہ آیا تو میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ایسا نہیں رہا کہ میں اسے اٹھا سکوں' وہ آہستہ آہستہ مائع میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے چیخ کے پھوپی کو باہر جانے کے لیے کہا۔ تایا ابھی تک وہیں پڑے تھے۔ چچا تمھیں باہر چھوڑ کر آئے تو میں نے انھیں کہا کہ وہ فوراً تایا کو باہر لے جائیں اور تمام لوگوں کو دور کہیں لے جائیں۔ چچا نے آگے بڑھ کر لڈن کی حالت دیکھی تو وہ بھی تھر تھر کانپنے لگے۔ بہرحال بیٹھک خالی ہو گئی تھی اور میں ـــ میں بے بسی سے قریب کھڑا لڈن کو پانی بنتے دیکھ رہا تھا۔ وقار الحسن! وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ اتنا دہشت ناک کہ ـــ کہ میں اب تک رات کو سو نہیں سکا ہوں۔ میں اس وقت تھوڑی دیر کو جھپکی لے لیتا ہوں جب کوئی میرے قریب ہی بیٹھا ہو اور دن کا وقت ہو۔ لڈن کا پورا بدن میرے دیکھتے ہی دیکھتے پانی بن کر کمرے میں پھیل گیا۔ وہ پانی بھی نہیں تھا بلکہ لیس دار سا کوئی مائع تھا۔ میری حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ میں برداشت نہ کر سکا اور قے کر بیٹھا۔ میرا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کے بدن کے غائب ہوتے ہی مجھے اس بچھو کی فکر ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسی بیٹھک میں کہیں ہوگا۔ میں نے اپنی بگڑتی ہوئی حالت کو سنبھال کر اس بچھو کو بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں تھا۔"

شرف الدین اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور نظریں ادھر ادھر دوڑانے لگا۔

"پھر ـــ پھر کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔" اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے اسے بتایا کہ سیدھے ہاتھ پر گھڑونچی رکھی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کا چہرہ کچھ پرسکون تھا۔ مگر تپتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا تھا مگر اسے سن کر ہی اس لمحے کی دہشت کو محسوس کر رہا تھا۔ مجھے تو اس وقت ہی ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بپھرے ہوئے سمندر پر تیرتے لکڑی کے ایک چھوٹے سے تختے پر کھڑا ہوں اور اونچی اونچی لہریں مجھے ہچکولے دے رہی ہیں۔ سب کی چیخ پکار نے طوفان کی سی کیفیت اختیار کی ہوئی تھی اور دہشت سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت کے بعد کے تمام واقعات بھگتنے والا تو شرف الدین تھا۔ اگر اس کی یہ حالت تھی تو عجب کیا تھا!

وہ بہت مضطرب تھا جبکہ اس چھوٹے سے وقفے میں' میں خود کو کسی حد تک سنبھال چکا تھا۔ اس نے میرے سامنے کے مونڈھے پر بیٹھ کر مونڈھا میرے قریب سرکا لیا۔ اس کی گہری چبھتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ قریب آیا تو مجھے لگا جیسے وہ پانی پینے کے بہانے رو آیا ہے۔

"پھر شرف الدین؟" میری سرگوشی گونجی۔

"میں بیٹھک سے باہر آ گیا۔" اس نے نگاہیں میرے چہرے سے ہٹا کر سامنے کی دیوار پر جما دیں مگر اب بھی وہ میرا ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ "تم اور تایا دونوں بے ہوش تھے۔ تایا کی حالت تو کافی بہتر تھی۔ وہ شاید دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے مگر تمھارے ٹخنوں سے خون رس رہا تھا۔ چچا اور اماں وغیرہ لیمپ کی روشنی میں تمھارے زخم دیکھ رہے تھے۔ وقار الحسن! تمھاری اماں بڑے حوصلے والی خاتون ہیں۔ وہ ماں ہونے کے باوجود اپنے حواسوں میں تھیں اور تمھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے تمھارے زخم دیکھے تو حیرت زدہ رہ گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے لوہے کے شکنجوں میں ڈال کر کس دیے ہوں۔ گو وہاں نہ شکنجہ تھا نہ کوئی تار وغیرہ ہی تھا۔ میں نے چیخ کر کہا کہ تمھیں فوراً اسپتال لے جایا جائے۔ چچا یہ سنتے ہی باہر کو دوڑے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تانگے میں ڈال کر تمھیں اسپتال لے گئے۔ اماں نے تمھارے ساتھ جانے کی کوشش کی مگر ہم نے انھیں منع کر دیا اور کہا کہ وہ تایا کو دیکھیں۔ انھوں نے پھر کسی خود غرضی کا مظاہرہ نہ کیا اور تائی وغیرہ کے ساتھ تایا کو ہوش میں لانے کی کوشش میں لگ گئیں۔ میں تایا کو ہوش میں آتا دیکھ کر پرسکون ہو گیا ورنہ مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ ـــ وہ بھی ہوش میں نہ آئیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ چکر آ جانے کی وجہ سے گرے تھے۔ شاید دیوار سے سر ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں ... اور ـــ انھوں نے تمھارے بارے میں پوچھا اور ... اس گمبھیر خاموشی سے ہی کھڑے ہو گئے۔ میں اور تایا ... تمھاری حالت سخت خراب ہے ...

لالے پڑ گئے تھے۔ تمام ڈاکٹرز مایوس تھے مگر۔ شاید خدا نے تمھاری عمر طویل لکھی تھی کہ تمھارا سانس بحال ہو گیا' ورنہ تو اتنا مدہم سانس تھا کہ لگتا تھا کسی بھی وقت چپکے سے یہ زیرو بم بھی معدوم ہو جائے گا۔ البتہ تمھارا زخم خطرناک حد تک خراب ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز نے بڑی کوششوں کے بعد یہ اطلاع دی کہ اب تمھاری حالت خطرے سے باہر ہے مگر تم ہوش میں نہیں آئے تھے۔ کبھی کبھی تمھارے جسم میں حرکت پیدا ہوتی تھی' یا کبھی تمھارے لب ہلتے بھی محسوس ہوئے تھے مگر ایسا تم بے ہوشی کی حالت میں کرتے تھے۔ وہ تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ میں اور تایا دونوں اسپتال میں ہی تھے۔ ابھی صبح کے آثار بھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ چچا آ گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر میں اور تایا دونوں فق ہو گئے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونے لگے تھے۔ میں تو بری طرح سہم گیا تھا۔ ہم دونوں نے بڑی مشکل سے انھیں سنبھالا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئے تو ــ تو انھوں نے جو کچھ بتایا اس نے ــ اس نے گویا قیامت مچا دی ـــــــ وقار الحسن ــ دیکھو وقار الحسن! میں' میں یہ سب تمھیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم خود پر قابو رکھو گے۔ وہ بات کرتے کرتے جھجکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نامعلوم سا خوف امنڈ آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہا۔

"شرف الدین! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بلا جھجک بتاؤ۔ اب تو میں خوف و دہشت کے اس دور سے گزر چکا ہوں جو مجھے خود سے بیگانہ کر دے۔ میں بڑے تحمل سے تمھاری باتیں سن رہا ہوں۔ بتاؤ کیا ہوا ــ چچا کون سی خبر لائے تھے۔ ویسے مجھے اندازہ ہے کہ اسی سادھو نے اب اپنا رخ میرے گھر والوں کی طرف موڑ لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس طرح مجھے قابو میں کر لے گا۔ یہ تیسرا شخص تھا جو اس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور میں ان تینوں کی موت کا بدلہ ایسا خوفناک لوں گا کہ وہ ساری عمر کی تپسیا بھول جائے گا۔ اس کی تمام جادوگری دھری کی دھری رہ جائے گی۔" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"وہ تمھاری ساری ہمت ــ" شرف الدین کی سرگوشی بڑی بے قلی سی تھی۔ "تم شاید گر گئے کی سرگوشی میں ایسا کیا تھا کہ میرے پھر بھی یوں لگا تھا ہے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھ لیا: آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ چہرے پر شدید اذیت کے آثار تھے۔

"کک ـــ کیا بات ہے ـــ کیا ہوا!" میں بوکھلا گیا۔

"وقار الحسن! چچا وہاں سادھو کی وجہ سے ہونے والی چوتھی موت کی خبر لے کر آئے تھے۔"

"کک ـــ کیا ـــ کون ـــ کس کی خبر؟" لمحہ بھر میں میرے گھر کے سارے لوگوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"وہ ـــ وقار' چھوٹی پھوپی ـــ۔"

اور مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں ایک ساتھ کئی بم پھٹ گئے ہوں۔ دھماکوں کی آوازیں معدوم ہوئیں تو ہر سو سناٹا سا پھیل گیا۔ جان لیوا سا سناٹا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے شرف الدین کو تک رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں تک آ گئے تھے۔ میرے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ میرے بدن کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ اب تایا کے جملے کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ان معصوم بچیوں کی زندگی بخش دیتی' تو میں سوچ رہا تھا کہ شاید ان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کن بچیوں کی بات کر رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب شکنتلا نے کیا ہے۔ پھوپی مسکراتی میری نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔

"مگر کیسے شرف الدین؟ وہ ـــ وہ تو بالکل ٹھیک تھیں۔ ابھی تم نے بتایا تھا کہ تایا بے ہوش ہوئے تو وہ انھیں دیکھنے لگی تھیں ـــ یہی کہا تھا نا تم نے؟" میں نے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

"ہاں ـــ وقار الحسن! وہ ٹھیک تھیں' وہ تایا کو دیکھنے کے لیے زمین پر ان کے سرہانے بیٹھ گئی تھیں اور شاید یہیں موت رینگتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔ چچا انھیں اسپتال لے گئے تھے' تایا کے ہوش میں آتے ہی میں اور تایا بھی اسپتال پہنچ گئے۔ ہم نے چچا کو گھر بھیج دیا تھا تاکہ خواتین اکیلی نہ رہیں اور یہی بات تو یہ تھی وقار الحسن کہ نہ معلوم کیوں میرا ذہن اس بچھو میں الجھا ہوا تھا۔ ایک خوف سا تھا کہ وہ وہیں کہیں موجود ہے۔ جو کچھ چچا نے بتایا وہ یوں تھا کہ چچا پہنچے تو باہر سے انھیں اماں وغیرہ کی چیخ پکار سنائی دی۔ پتا چلا کہ چھوٹی پھوپو کو بچھو نے ڈس لیا ہے۔ یہ بچھو ان کی پنڈلی پر ڈس کر شلوار کے پائنچے سے چمٹ گیا تھا۔ جب دیکھا گیا وہ فرش پر گرا اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے مارتا وہ غائب ہو گیا۔ پھوپی اسپتال لائے جانے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گئیں۔ چچا یہ ہولناک خبر لائے تو ہم سکتے میں رہ گئے۔ ایک طرف تم موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے اور دوسری طرف گھر پر یہ سانحہ گزر چکا تھا۔ میں نے تایا کو گھر بھیج دیا اور خود تمھارے پاس رہ گیا۔ اماں تمھیں دیکھنے اور تمھاری حالت جاننے کو تڑپ رہی تھیں ادھر ان کی بٹو جان دے چکی تھی۔ وقار الحسن! اتنے اندوہناک سانحے گزر جانے کے باوجود تمھاری اماں میں بڑا حوصلہ ہے۔ پھوپی کے سوئم کے بعد ہی اماں تایا اور چچا کے منع کرنے کے باوجود اسپتال آ گئیں تھیں اور آج ـــ تمھارے ساتھ گھر لوٹی ہیں۔" شرف الدین نے اپنی بھیگی آنکھوں پر ہتھیلیاں رگڑ کر کہا۔

"اف ـــ" میں نے اپنی دونوں کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبایا' درد کی ایک شدید لہر آہستہ آہستہ پورے سر میں پھیلتی جا رہی تھی۔ سادھو کی مکروہ شکل سامنے آ گئی تھی۔ میرے جبڑے بھنچ گئے۔ پھر اچانک میں چونک اٹھا۔ "شرف الدین ـــ وہ چابی کہاں ہے جو لڈن نے دی تھی۔"

"میرے پاس ہے۔ اور میری سمجھ میں بھی ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ وہ چابی کہاں سے آئی' اسے کس نے دی اور وہ بچھو اس کی گردن پر کیسے پہنچا؟ اور سنو! اس مکان کی چابیوں کے گچھے میں جو چابی تھی وہ غائب ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی چابی ہے۔ ممکن ہے خورشید چاچا نے اسے نکال لیا ہو۔ ممکن ہے وہ امروہہ گئے ہوں اور وہیں انھوں نے اس چابی کو لڈن کے حوالے کیا ہو ـــ شاید وہ وہاں سے رحیمو کی لاش ہٹانا چاہتے ہوں اور لڈن سے یہ کام کرانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔"

اس کی بات سن کر مجھے وہ لمحہ یاد آ گیا جب میں نے اسپتال میں رحیمو کو دیکھا تھا۔ میں نے اسے سب کچھ بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے اس نے خود ہی میری جانب کروٹ لی تھی اور اس کے چہرے پر سفید کیڑے کلبلا رہے تھے۔

"یہ سب اسی سادھو کی کارستانی ہے۔ وقار الحسن! بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی ہے اور تم اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستے چلے جا رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آیا کہ شکنتلا اس حویلی میں محبوس کیوں ہے؟ وہ تمھاری مدد کیوں نہیں کرتی' ایک بار اس نے

تمھاری مدد کو یوں میں آئی' لے دے کے ایک میرے بابا کا دم تھا وہ بھی میری بے وقوفی کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب کیا ہو گا؟ یوں تو زندگی بیتی چلی جائے گی۔"

"ہاں وقار الحسن! میری سمجھ میں تو یہ نہیں آیا کہ یہ سادھو مجھ سے چاہتا کیا ہے' اس نے اپنا مدعا بیان کیے بغیر مجھے اپنے جال میں پھانس لیا ہے' کیا وہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھ پر دباؤ ڈال کر مجھے اپنے قابو میں کر لے گا؟"

"سوال یہ ہے کہ وہ تمھیں قابو میں کر کے کیا کرنا چاہتا ہے؟" شرف الدین کے لہجے میں تشویش تھی۔ "وہ بات کھل کر کیوں نہیں کرتا۔ اس دن کھنڈر میں وہ شاید بات کرنا چاہتا تھا مگر ـــ"

"اس نے اس انگوٹھی کو اتارنے کا مطالبہ کیا تھا۔ میں اسے اتارنا خطرے سے خالی نہیں سمجھتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم جب سورۃ الناس اور آیت الکرسی پڑھ رہے تھے تو اس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ وہ ہمیں پڑھنے سے روک رہا تھا۔ لیکن وہاں جو کچھ ہوا وہ ایسا نہیں تھا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا۔ مجھے اس کا ٹھکانا نہیں معلوم ورنہ میں اس سے دوٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھ سے پہلے رحیمو کا قتل کروایا' خورشید چاچا کو چھین لیا اور اب ـــ اب اس نے پھوپی کو نشانہ بنایا ہے۔ یہ سلسلہ بڑھ بھی سکتا ہے شرف الدین ـــ میں اب کسی کا نقصان برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس سے بات کرنا ہو گی۔"

میں واقعی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب میں خود کو بھینٹ چڑھا کر بھی اماں اور بہنوں کی زندگیوں کا سودا کر لوں گا۔ اب تک کے حالات نے میری ہی ذات کو متنازعہ ثابت کیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں خودکشی کر لوں مگر اس طرح بغیر کچھ جانے اور بغیر کچھ کیے ایسا کرنا میں مردانگی کے خلاف سمجھتا تھا۔ یہ حرام موت قبول کرنا میرے لیے بڑا عذاب تھا گویا یوں میں آخرت میں بھی عذابوں کا مستحق ٹھہرایا جاتا۔ اب میں بہت سنجیدگی سے اس معاملے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے عذابوں سے شرف الدین کو آزاد کر کے ہر کام تن تنہا کرنا چاہتا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" شرف الدین اس گمبھیر خاموشی سے گھبرا گیا۔

"کچھ نہیں۔۔ صرف اتنا سوچ رہا تھا کہ میرے زخم کب اور کیسے جلد از جلد ٹھیک ہو سکتے ہیں۔"

"اللہ پر بھروسا رکھو۔ زخم پہلے کی نسبت بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہے ہیں۔ تم بہت جلد چلنے پھرنے کے قابل ہو سکو گے۔"

وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ غالباً" میری جانب سے اتنی بڑی اور اندوہناک خبر کے بعد بھی اس سکون اور خاموشی پر حیران تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خبر سن کر بھی میں پاگل نہیں ہوا۔ پھوپی کی یہ ناگہانی موت میرے دل کو چھید گئی تھی۔ میں ایک پیار کرنے والی ہستی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ہمیں تو بچپن ہی سے اماں نے کم اور دونوں پھوپیوں نے زیادہ پیار دیا تھا۔ چھوٹی پھوپی تو ہر وقت مجھے گود میں لیے امروہہ کی گلیوں میں پھرا کرتی تھیں۔ آموں کے باغ میں پھوپی ہی جھولا ڈال کر دیا کرتی تھیں۔ انھوں نے اکثر ہماری شرارتوں کو اپنے ذمے لے کر ڈانٹ کھائی تھی۔ اکثر اوقات جب ابا کسی شرارت کی وجہ سے ہمارا کھانا بند کر دیا کرتے تھے تو وہ پھوپی ہی تھیں جو اپنے حصے کے کھانے میں سے کھلا دیا کرتی تھیں اور ہمیں یوں گھومتے پھرتے دیکھ کر اماں حیران ہوا کرتی تھیں کہ ہم نے سارا دن بغیر کھائے کیسے گزار لیا۔ ان کی موت نے دل پر گہرے گھاؤ لگائے تھے مگر اب حالات کا رخ اور اس کی رفتار نے مجھے چوکنا کرنے کے ساتھ ساتھ سنبھالا بھی دیا تھا' جو ہو گیا تھا اس پر کڑھنے کی بجائے میں مزید کچھ ہونے سے خوفزدہ تھا۔ تایا نے کہا تھا کہ اب شاید ہماری باری ہے' یہ سچ بھی ہو سکتا تھا۔ سادھو مجھے دنیا میں تنہا اور بے بس کر دینا چاہتا تھا۔ میں چھت کو تک رہا تھا' یہ سب سوچ رہا تھا اور شرف الدین خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری گہری خاموشی اسے بے چین کر رہی تھی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں حواس کھو چکا ہوں۔ پھوپی کی موت کی خبر نے مجھے پتھرا دیا ہے اس لیے تو اچانک اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔

"وقار الحسن! رو لو۔ آنسوؤں کا سمندر اگر بہے نہیں تو سینے میں منجمد ہو جاتا ہے۔ تایا اور اماں وغیرہ تمھاری چیخوں کے منتظر ہوں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ تمھیں یہاں لا کر حالات سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ تمھاری یہ گمبھیر خاموشی انھیں چھلنی کر دے گی۔"

"میں جانتا ہوں شرف الدین کہ آنسو بہیں نہیں تو ...

بن کر سینے میں جم جاتے ہیں مگر میرے سینے میں اتنی تپش' اتنی حدت ہے کہ وہ آنسو بہنے سے پہلے ہی خشک ہو چکے ہیں۔ میں۔۔ میں سادھو کی ایک ایک نس سے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لوں گا۔ اس زہریلے لہو کا قطرہ جس نے اسے اتنا سفاک اور ایسا بے غیرت بنا دیا ہے۔ اس کے نزدیک موت اور زندگی کے درمیان کھنچی ہوئی لکیر کی کوئی اہمیت نہیں رہی' انسان کو وہ حشرات الارض سمجھتا ہے کہ جب جی چاہا پاؤں سے مسل کر پھینک دیا۔ میں اسے ایسا سبق دوں گا کہ وہ یاد کرے گا۔ چاہے ایسا کرنے کے لیے مجھے ہمالیہ کی چوٹی پر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔"

"میں۔۔ میں تمھارے ساتھ ہوں وقار الحسن! تم سے میں اس قدر محبت کرتا ہوں اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب تم موت اور زندگی کے درمیان معلق تھے۔ میں تمھیں ان حالات میں ایک پل کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں زندگی میں کچھ نہ کر سکا تو حق دوستی ضرور ادا کر جاؤں گا۔"

"تم امروہہ نہیں گئے؟"

"نہیں۔۔ تم سنبھل ہی نہیں سکے تو میں کیسے چلا جاتا؟"

"تمھیں جانا چاہیے تھا شرف الدین! تم پر مجھ سے زیادہ تمھارے ماں باپ اور بہن کا حق ہے۔ اور۔۔ اور شگفتہ تو تمھارے بنا بہت اداس رہتی ہے۔ مجھے گنہگار نہ کرو۔ چلے جاؤ۔"

"نہیں وقار الحسن! تم ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم ساتھ ہی چلیں گے۔"

اس کا لہجہ حتمی تھا۔ میں نے جانا کہ اس وقت اس سے اس موضوع پر بحث بیکار ہے' مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسے ضرور قائل کر لوں گا۔

"چلیں وقار الحسن! نیچے سب منتظر ہوں گے۔ آج۔ آج چالیسواں ہے' لڈن کا اور۔۔ پھوپی کا۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی کسی ہیجان خیز رد عمل کا منتظر تھا۔

"ہاں چلو۔ کاش میں پھوپی کا آخری دیدار کر سکتا۔" دل سے ایک ہوک سی اٹھی اور لبوں پر آہ بن کر ٹھہر گئی۔ شرف الدین حیران تھا اور اس نے پھر مجھے اٹھایا اور نیچے اتر آیا۔ تایا جو بیٹھک میں جانے کو مڑے تھے ہمیں نیچے آتا دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر جم [illegible] تھیں۔ میرے سینے میں تل سے پڑنے لگے۔ ان کی

سرخ تھیں' شاید وہ ابھی رو کر آ رہے تھے۔ شرف نے مجھے آہستگی سے بستر پر لٹا دیا۔ وہ آہستہ اور تھکے [illegible]وں سے میرے قریب آ گئے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ [illegible]ے لپٹ جاؤں۔ مجھ سے زیادہ دکھی تو وہ تھے جن کی اکلوتی بہن ان سے چھن گئی تھی۔

"میری لرزتی ہوئی آواز نے اماں کو بھی چونکا دیا [illegible]کی ٹرے اٹھائے باورچی خانے سے نکل رہی [illegible] آپا بھی پائیں۔ وہ اماں کے قریب ہی تھیں۔ [illegible] جلدی سے ٹرے انھیں تھما دی اور خود لپک کر [illegible]یب آ گئیں۔ تایا اب میرے بالکل قریب آ چکے [illegible] کے چہرے پر پڑی جھریاں لرز رہی تھیں' ہونٹ [illegible]ے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئی [illegible]وہ چند لمحے یونہی ساکت کھڑے رہے پھر اچانک مجھ [illegible] مجھ سے لپٹ گئے۔

[illegible]ار الحسن! وہ بھی چلی گئی۔ چلی گئی وہ بھی اور۔۔ اور [illegible]دیکھتے رہ گئے۔ ارے ہمارے سامنے ہی سب کچھ ہو [illegible] ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔" ان کی آواز پھٹ گئی۔ ان [illegible]کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں نے میری [illegible]لی کر دی' میں اپنی چیخیں حلق میں گھونٹے رہا۔ [illegible] سینے میں جیسے بگولا سا چکرا رہا تھا۔ میں چیخ چیخ کر رونا [illegible] مگر گھر میں لوگوں کی موجودگی مجھے اپنے دکھ کا اظہار [illegible]ے روک رہی تھی۔ شرف الدین نے بڑی مشکل [illegible]یا کو سنبھالا۔ پھر اماں مجھ سے لپٹ گئیں' ان کی [illegible]ں میں بھی حیرت تھی۔ وہ میری خشک آنکھوں کو خوف [illegible]رت سے تک رہی تھیں۔ سارے گھر میں ایک [illegible]ر خاموشی چھا گئی تھی۔ ہر شخص ساکت کھڑا مجھے تک [illegible] کسی طوفان کا منتظر تھا۔ میرے سارے آنسو دل پر [illegible]کی بوند بن کر گر رہے تھے۔ میں جو اذیت برداشت کر [illegible]وہ آنسو بہانے کی اذیت سے کہیں زیادہ تکلیف دہ [illegible]

[illegible]وقار الحسن! تم۔۔ تم ٹھیک ہو ناں!" اماں نے جلد ہی [illegible] آنسو خشک کر لیے۔

"اماں! جس اذیت سے دوچار ہوں اسے بیان کرنا [illegible] ہے۔ وہ۔۔ وہ تو میری زندگی تھیں۔ اب ان کے بنا یہ [illegible] گئی بوجھل ہو جائیں گی۔"

[illegible] بیٹا' قدرت بڑی آزمائشوں میں ڈالتی ہے۔" اماں

اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ تھوڑی دیر بعد چچا نے آکر بتایا کہ وہ دیگیں لے آئے ہیں۔ اماں اور تایا مجھے تسلی دیتے ہوئے چلے گئے۔ اب مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ گھر کے سبھی لوگ کھانا لگوانے میں مصروف ہو گئے۔ شرف الدین پتھر کا بت بنا میرے قریب بیٹھا رہ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چلا جائے تاکہ میں تکیے میں منہ چھپا کر اپنے سینے کی گھٹن کم کر سکوں' ان آنسوؤں کو بہا سکوں جو میرے وجود میں آتش فشاں سے نکلے لاوے کی طرح بہہ رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا صبر' میری برداشت' تحمل سب کچھ اس لاوے میں بہہ جائے گا۔

"شرف الدین! جاؤ' تایا کا ہاتھ بٹاؤ۔" آخر میں نے کہہ دیا۔

"مگر تم۔۔ یہاں اکیلے رہ جاؤ گے۔"

"میرے اکیلے پن کی فکر نہ کرو۔ میں تو اکیلا ہو ہی گیا ہوں۔ تم نہیں جانتے کہ پھوپی میرے لیے کیا تھیں؟"

"ہاں۔۔ میں جانتا ہوں۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"جاؤ۔۔ وہ بھی اکیلے ہیں۔" میں نے نڈھال ہو کر سر تکیے پر رکھ دیا۔

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔

مہمان کھانا کھانے کے بعد چلے گئے۔ گھر بھر میں سناٹا چھا گیا۔ شرف الدین نے بتایا تھا کہ بیٹھک کے اندر لڈن کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں اماں وغیرہ کو نہیں بتایا گیا۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔ یہ سن کر کہ اس کی لاش پانی بن کر کچے فرش میں جذب ہو چکی ہے' سارا گھر خوفزدہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو میری اور تایا کی حالت دیکھ کر اس وقت کسی کو لڈن کا خیال نہیں آیا تھا اور جب یاد آیا تو تایا اور شرف الدین فیصلہ کر چکے تھے کہ انھیں اس کے بارے میں کیا کہنا ہے۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ اسے بیٹھک کے دوسرے دروازے سے اسپتال لے جا چکے ہیں' وہ بھی مر گیا اور اس کا ایک رشتے دار جو یہاں رہتا تھا اس کی لاش لے گیا ہے۔ انھیں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ بھی بچھو کے کاٹنے سے مرا ہے' اگر میری حالت خراب نہ ہوئی ہوتی تو شاید اماں کو اس کی کرید ہوتی پھر پھوپی کی موت نے ویسے ہی سب کے حواس گم کر دیے تھے سو بات دب گئی۔ ہم سب بہت دیر بیٹھے

پھوپی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک اماں چونک اٹھیں۔ "وقارالحسن! بوٗ کے ایک جملے نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ وہ غشی کی حالت میں باربار کہہ رہی تھی کہ وقار کو سنہرے بابا نے بلایا تھا۔ وہ کیوں نہیں گیا۔ پھر وہ کہنے لگی کہ اسے بالیکا کے پیچھے بلایا ہے' وہ جاتا کیوں نہیں۔ میں نے بہت پوچھنے کی کوشش کی کہ کس نے بلایا ہے۔ کس نے بتایا مگر۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ اسے کیا پتا کہ تم کس حالت میں ہو۔"

اماں کی بات سن کر میں اور شرف الدین ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ "یہ بالیکا کیا چیز ہے وقارالحسن؟" اماں نے پوچھا۔

"ایک مندر ہے اماں! وہ اس روز میں نے کہا تھا ناں کہ ہمیں سنہرے بابا نے وہاں بلایا تھا۔" میں نے جھوٹ بولنے کی کوشش کے باوجود جھوٹ نہیں بول سکا۔ شرف الدین غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تو تمہیں جانا چاہیے تھا ناں۔ میں نے کہا تھا کہ اس معاملے کو کسی بھی طرح ختم کرو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جب امروہہ جانے کا کہتی ہوں' کوئی نہ کوئی عذاب آجاتا ہے۔ "وقارالحسن! یہ شکنتلا تو حویلی پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی ہے۔ وہی یہ سب کچھ کر رہی ہے تاکہ ہم وہاں نہ جا سکیں۔" اتنا کہہ کر وہ شرف الدین کی طرف مڑیں اور بولیں۔ "شرف الدین تم مجھے لے کر چلو۔ میں خود ملوں گی سنہرے بابا سے۔"

"نہیں اماں!" میں جلدی سے بول اٹھا۔ "میں خود جاؤں گا۔ آپ نہ جایئے گا۔"

"کیوں۔ کیوں نہ جاؤں! تم تو چلنے سے مجبور ہو۔ جب تک ٹھیک ہوں گے جانے کیا ہو جائے گا۔"

"نہیں اماں کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"وقارالحسن ٹھیک کہہ رہا ہے دلھن! تمہارا وہاں تک جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ لڑکے خود ہی مل لیں گے' تم اللہ سے بہتری کی امید رکھو۔" تایا نے دکھی لہجے میں کہا۔

ایک بات میں نوٹ کر رہا ہوں کہ تایا اب مجھے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری آنکھوں میں' میرے چہرے پر کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ مجھے ان کی نگاہوں کی چبھن بعض اوقات بری طرح کھلنے لگتی تھی۔

"اماں آپ ایک کام کریں۔" اچانک شرف الدین
اٹھا۔ میں' تایا اور اماں تینوں ہی چونک اٹھے۔

"کیا؟"

"آپ آیت کریمہ کا ختم کروائیں' بیٹھک بند
کریں' اور اماں آپ روز مغرب کے وقت آیۃ
پڑھ کر گھر کے چاروں طرف حصار باندھ دیا کریں۔"
شرف الدین کہہ رہا تھا اور میں حیران تھا کہ
اس بات کا خیال کیوں نہ آیا۔ میں نے سورۃ
آیتہ الکرسی کا کرشمہ دیکھا تھا پھر میں نے وہاں
ہی ایسا کیوں نہ کر لیا' مجھے پہلے ہی ایسا کر لینا چاہیے
از کم اس وقت ایسا کر لیتا جب شرف الدین نے
اس نے خواب دیکھا ہے کہ بچھو تانگے کے پیچھے
یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ حالات ایسے نہیں رہے
چھوٹی سے چھوٹی کسی بات کو بھی نظرانداز کروں
سنجیدگی سے نہیں لیا تھا ورنہ میں اس عذاب سے
رہ سکتا تھا۔

"بیٹا یوں تو میں کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں
آیتہ کریمہ کا وظیفہ مجھے کر ہی لینا چاہیے۔" اما
کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "تم لوگ اب سو
الدین تم چاہو تو بیٹھک میں سو جاؤ۔" اماں نے
الدین کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر چلا گیا۔ ہلکا
احساس اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔

"نہیں اماں! یہ میرے ساتھ سو جائے گا۔
کہا۔

"لیکن تمہارے زخم۔"

"اب ٹھیک ہیں اماں۔ یوں تو تکلیف اتنی
ہوتی مگر میں پاؤں زمین پر رکھنے کی کوشش کر
تکلیف ہوتی ہے۔ ہم یہاں سو جائیں گے۔"

"اماں آپ فکر نہ کریں' میں رات کر
سکتا ہوں۔" شرف الدین نے خوش دلی سے کہا۔

"ارے باؤلے ہوئے ہو کیا؟" ایک دم اما
گئیں۔ "میں دیوان یہاں ڈلوائے دیتی ہوں
کہتی ہوئی اٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد شرف الدین اور چچا دیوان ا
میرے برابر میں ڈال دیا۔ اماں نے جانے سے
میں بڑی چٹخنیں کھول دیں تمہیں اس لیے کہ

تھی۔ تایا نے اماں سے کہا کہ وہ سو جائیں' کافی تھک
گئی ہوں گی۔ چچا بھی اوپر چلے گئے۔ تایا سے پتا چلا کہ کوثر کو
اس لیے تائی اس کے پاس ہیں اور وہ مجھ سے ملنے
آسکی۔ جہانی آپا اور شبنو آپا بھی اماں والے کمرے میں
جا چکی تھیں۔ اماں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتی
تھیں۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنتے ہی تایا نے اپنا پلنگ
میرے پلنگ کے قریب کر لیا اور بولے۔

"وقارالحسن! مجھے یہ معاملہ کافی پراسرار لگ رہا ہے۔
میں تم سے اور شرف الدین سے اصل بات سننا چاہتا
ہوں۔" تایا کے لہجے میں تحکم اور بلا کی سنجیدگی تھی۔

"جی! تایا وہ۔"

"کچھ نہیں۔ کل رات تمہاری اماں کو میں نے
زبردستی گھر بھجوا دیا تھا اور خود رات کو اسپتال میں رہا تھا۔
شرف الدین بھی اپنے چچا کے گھر کپڑے بدلنے گیا ہوا تھا۔
وہاں تمہارے کمرے میں' جہاں تم بے ہوش پڑے تھے
میں نے ایک سفید بلی کی پراسرار حرکتیں دیکھی تھیں۔ مجھے
کچھ اونگھ آگئی تھی۔ آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا
کہ تمہارے پیروں کے زخم پر پٹی نہیں تھی اور ان زخموں
کو وہ سفید بلی چاٹ رہی تھی۔ میں نے ہش ہش کر کے
بھگایا اور دروازے تک اس کے پیچھے آیا' پھر نرس کو آواز
دی کہ وہ آکر دیکھے اور پٹی باندھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
کہ شام کو نرس نے نئی پٹی بدلی تھی۔ اسے کس نے کھولا یہ
بات سمجھ میں نہیں آئی پھر ایک بلی زخم کیسے چاٹ سکتی
ہے۔ میں نے نرس کو بتایا کہ تمہارے زخموں کی پٹی کھلی
ہوئی ہے۔ میں اسے لے کر واپس کمرے میں آیا تو پٹی جوں
کی توں بندھی ہوئی تھی۔ نرس نے مجھے یوں دیکھا تھا جیسے
میں پاگل ہو گیا ہوں۔ وہ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر
چلی گئی۔ وقارالحسن! بیٹھک میں بے ہوش ہونے سے قبل
بھی میں نے کسی بلی ہی کی غراہٹ سنی تھی۔"

تایا کے یاد دلانے پر مجھے بھی یاد آیا کہ میں نے بھی بے ہوش ہونے سے قبل یہی غراہٹ سنی تھی۔ اب تایا کی زبانی یہ سب سن کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہا۔ میں حیرت سے تایا کا منہ تک رہا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔

"اور مانو تو تمہارے زخم اسی کے چاٹنے سے حیرت انگیز حد تک سوکھ گئے۔ تمہاری حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔" تایا ذرا دیر چپ رہنے کے بعد پھر بولے۔ "جانتے ہو اس وقت جب وہ تمہارے زخموں کو چاٹ رہی تھی میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ پھر پراسرار قسم کی خاموشی اختیار کر گئے۔

"کک۔ کیا تایا؟"

"وہ زخم چاٹ رہی تھی اور۔ اور تمہارے زخموں میں سے چاول کے برابر سفید سفید کیڑے ٹپک کر زمین پر گر رہے تھے۔ بلی کو بھگاتے وقت میں نے انھیں زمین پر رینگتے دیکھا تھا مگر جب میں نرس کو لے کر واپس آیا تو نہ کیڑے تھے اور نہ ہی تمہارے زخموں کی پٹی کھلی ہوئی تھی۔ نرس تو مجھے آرام کا مشورہ دے کر چلی گئی تھی مگر میں حد درجہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں تمہارے زخموں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا' اسے ساری صورت حال بتائی' اس نے بھی مجھے یوں دیکھا جیسے میں واقعی پاگل ہوں پھر میرے بہت سمجھانے پر وہ میرے ساتھ چلا آیا اور نرس نے تمہارے زخموں کی پٹی کھول کر مجھے دکھائی' وہ بالکل صاف تھے۔ وہاں کوئی کیڑا نہ تھا نہ اب اس میں پیپ پڑی ہوئی تھی بلکہ وہ حیرت انگیز حد تک ٹھیک ہو چکے تھے۔"

تایا یہ سب بتا رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہی سفید سفید کیڑے میرے سر کے اندر' کھال کے نیچے اور زخموں میں کلبلانے لگے ہوں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ شرف الدین حیرت سے مجھے اور کبھی تایا کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے رحیمو والا واقعہ سنا چکا تھا۔ اب رہ رہ کر میری آنکھوں کے آگے رحیمو کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ ساری دنیا تایا کو پاگل سمجھ سکتی تھی مگر میں اور شرف الدین جان گئے تھے کہ وہ جو کچھ بتا رہے ہیں وہ سو فی صد بلکہ دو سو فی صد درست ہے۔

"وقارالحسن! اب تک حویلی میں بھی ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا پھر شکنتلا یہاں یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہے؟ خورشید چاچا کی حیرت انگیز موت' لڈن کی حالت اور اس کے بدن کا پانی بن کر زمین میں جذب ہو جانا' اس کا تمہیں ایک چابی دینا' اس روز نظر کی مرچیں جلانے پر گھر بھر میں سڑاند کا پھیلنا' سنہرے بابا کا پیغام بھجوانا' یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تم دونوں مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ اصولاً تمہیں مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہوئے سب کچھ بتانا چاہیے تھا۔ کیا تم اپنے ان زخموں کا کوئی جواز دے سکتے ہو؟ اس دن تمہارے پیروں

میں لوہے کے شکنجے کسنے والا کون تھا؟ کیا لڈن؟ اگر ہاں تو کیوں؟ اس کی یہ حالت بنانے والا کون تھا؟ کچھ دیر پہلے جب وہ داخل ہوا تھا تو بالکل ٹھیک تھا۔ یکایک اس کی حالت خراب کیسے ہو گئی۔ خورشید چاچا بھی جب آئے تھے' یا گھر سے گئے تھے تو بالکل ٹھیک تھے پھر۔ ان کے ساتھ بھی بالکل اسی طرح' اچانک یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ وقار الحسن! اگر حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے تو۔ آج بو گئی ہے کل میری باری بھی ہو سکتی ہے۔"

"مگر تایا! پھوپی کو تو۔" میں نے کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔

"بچھو نے کاٹا ہے۔ یہی ناں؟"

"جی۔" میں نے اس لیے کہا تھا کہ میں اندازہ کر سکوں کہ تایا نے لڈن کی گردن پر سوار بچھو دیکھا تھا یا نہیں۔ "تایا دبے دبے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ سر گھما کر اماں کے کمرے یا تائی کے کمرے کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ میں اور شرف الدین ہونقوں کی طرح بیٹھے تھے۔ شاید میری ہی طرح شرف الدین بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اب جھوٹ بولنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

"ہم تو سمجھتے تھے کہ ہمارا خاندان چاند کا قیدی ہو کر رہ گیا ہے۔ جب سے تم لوگ آئے ہو چاند کی چودھویں رات کی دہشت سے محفوظ ہیں مگر اب تو یہاں کتے' بلی اور بچھوؤں کا کھیل شروع ہو گیا ہے۔ وقار الحسن! مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟" تایا کا لہجہ تھکن سے نڈھال تھا۔

"تایا! یہ سب چکرو ہی شکنتلا والا ہی ہے۔ یہاں آکر واقعات کی نوعیت کچھ تبدیل ضرور ہو گئی ہے مگر۔ سچی بات یہ ہے کہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی میں ٹھیک ہوتے ہی سب سے پہلے امروہہ جاؤں گا۔ میں اس معاملے کو نمٹانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب میری نرمی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ اگر اماں مجھے سنہرے بابا کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتیں تو شاید آج حالات یہ نہ ہوتے مگر اب میں حالات کو مزید بگڑنے نہیں دوں گا۔ میں سنہرے بابا کو تلاش کروں گا۔ شکنتلا سے بات کروں گا۔ میں سب ٹھیک کرا لوں گا تایا! آپ۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" میں نے ان کا لرزتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں اب بھی انھیں اصل بات بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سب کچھ سن کر ان کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔

"تم۔! تم کیا کر لو گے؟ تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ میں [illegible] تھا کہ تم لوگوں کے حویلی چھوڑ دینے سے اب امن [illegible] گا مگر۔"

"آپ پریشان نہ ہوں تایا۔ اب۔ اب کچھ [illegible] گا۔ کچھ بھی نہیں۔" میں نے بڑے مضبوط لہجے میں [illegible] شرف الدین حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ بہرحال ام[illegible] سے پہلے ہم حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار [illegible] گے۔ اس کے بعد کچھ اور سوچا جائے گا۔"

"بیٹا شرف الدین!" انھوں نے تکیہ سیدھا [illegible] ہوئے شرف الدین کو مخاطب کیا۔

"جی تایا۔" وہ چونک اٹھا۔

"سو جاؤ بیٹا۔"

"شرف الدین! تم اماں کو لے کر امروہہ کیوں جاتے۔ میرا خیال ہے کہ تمھیں امروہہ جانا [illegible] تمھاری ماں بہن اور والد۔ تمھارا انتظار کر[illegible] گے۔" میں نے کہا۔

"مگر وقار۔ یہاں تم۔"

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "[illegible] ٹھیک ہوں۔ تم اماں کو امروہہ لے جاؤ۔ ٹھنڈ بڑھ[illegible] مسئلہ ہو جائے گا۔ پھر میں بھی جلد از جلد اپنے [illegible] منتقل ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کچھ اس انداز سے [illegible] چپ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ اماں سے پتا کر لو کہ وہ کب جا[illegible] ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور لیٹ گیا۔

تایا بھی لیٹے چھت کو تک رہے تھے۔ اب واقع[illegible] سے اونچا ہو گیا تھا۔ میری کیفیت بڑی ہیجانی تھی۔ [illegible] بتائی ہوئی بات ذہن میں اٹک کر رہ گئی تھی کہ پھوپی [illegible] کے عالم میں کہا تھا کہ مجھے بالیکا مندر کے پیچھے جانا [illegible] کیوں نہیں گیا۔ حالانکہ مجھے بالیکا مندر یا ان کھنڈ[illegible] نہیں جانا تھا' نہ میرا کوئی پروگرام تھا' نہ اس سادھ[illegible] مجھے ایسی کوئی بات کہی تھی۔ اس کی تو حالت ہی ایس[illegible] کہ وہ کچھ کہتا۔ اماں سے پھوپی والی بات سن کر [illegible] یہی آیا کہ سادھو نے ان کے ذریعے مجھے پیغام بھیج[illegible] میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ میں وہاں

ضرور جاؤں گا۔ اس بار میں انگوٹھی بھی اتار دوں گا اور کوئی آیت بھی نہیں پڑھوں گا۔ پہلی بار تو میں خود اتنا بوکھلا گیا تھا کہ اس سے بات نہ کر سکا حالانکہ وہ موقع ایسا تھا کہ میں اسے بلیک میل کر کے' مزید اذیت سے دوچار کرنے کی دھمکی دے کے بھی اصل بات اگلوا سکتا تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ کبھی کبھی خالی الذہن ہو کر آنکھیں بند کرتا تو [illegible] کا کٹا ہوا چہرہ آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتا۔ یہ سب سادھو کے کرشمے تھے یہ میں جانتا تھا پھر بھی خوفزدہ ہو جاتا تھا۔

تایا اور شرف الدین سو چکے تھے اور میں اب بھی جاگ رہا تھا۔ اماں میرے پیروں پر رضائی ڈال گئی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے کندھوں تک اوڑھ لیا۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ میں سونا چاہتا تھا' اس لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ پھر شاید کسی وقت تھک ہار کر نیند آ ہی گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو شرف الدین جا چکا تھا۔ تایا بھی اپنے پلنگ پر نہیں تھے۔ اماں میرے جاگنے کی منتظر تھیں۔ آج میں بہت دنوں بعد گھر کا ناشتا کر رہا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوا تو چچا کوثر کی کرسی اٹھا کر باہر لے آئے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جہانی آپا اور شنو آپا بھی بہت دیر میرے پاس بیٹھی رہیں۔ میں نے ان دونوں کے چہروں پر بھی دھواں سا چھایا دیکھا۔ وہ خوف کی اس لہر کو محسوس کرتے ہی بجھ کر رہ گئی تھیں۔ انھوں نے تو یہاں آکر سکھ کا سانس لیا تھا اور یہاں یہ نیا چکر چل پڑا تھا۔ میں نے حویلی چھوڑ کر یہاں رہنے کا فیصلہ صرف اس لیے کیا تھا کہ میں ان کے چہروں پر سکھ اور سکون دیکھنا چاہتا تھا' اگر وہ یہاں آکر بھی بے سکون تھیں تو بھلا کیا فائدہ! ان دونوں کی آنکھوں میں التجا تھی۔ میں بار بار نگاہ اٹھا کر جھکا لیا کرتا تھا۔ میری ہمت نہیں تھی کہ میں ان سے نگاہیں ملا سکتا۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک میرے قریب بیٹھی رہیں مگر پھر اماں نے انھیں آواز دے لی۔ اب میرے پاس کوثر تھی۔ اس کے زرد چہرے پر چمکتی ہوئی ذہین آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیسی ہو کوثر! شاید تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے گمبھیر خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

"ہوں!" وہ چونک اٹھی پھر بہت دھیرے سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی نمی سی تیر گئی۔ "میں ٹھیک ہوں وقار! البتہ تم۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔"

یہ بات اس نے اس انداز سے کہا تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بڑا پراسرار انداز تھا۔ گہرا لہجہ اور ٹھہرے ہوئے چبھتے ہوئے الفاظ' یوں جیسے وہ میرے ذہن کے اندر جھانک کر میری کیفیت جان چکی ہو۔

"نہیں۔" میں نے جلدی سے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔ "میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں ابھی میرے پاؤں میرا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں بہت جلد چلنے پھرنے لگوں گا۔"

"میں نے تمھارے پیروں کے زخموں کے بارے میں نہیں کہا ہے۔ میں اس سادھو کی بات کر رہی ہوں۔"

اس کے جملے نے میرے دماغ میں کئی دھماکے کر دیے۔ "کک۔ کیا۔ کون۔ کون سادھو؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"وہی جو تمھارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ "وقار تم فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جو کچھ تمھاری قسمت میں ہے اسے قبول کرنا تمھاری مجبوری ہے۔ تمھیں ہر حال میں وہ سب کچھ قبول کرنا ہو گا وقار! اگر تم اس میں کوئی پس و پیش کرو گے تو۔ تو تمھیں ایک اور بہت بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

اس کی باتیں خوفناک تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں بیچ بھنور میں چکر کھا رہا ہوں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اتنا کچھ کیسے جانتی ہے۔ وہ تو کمرے ہی سے شاذ و نادر نکلا کرتی تھی۔ "میں۔ میں کچھ سمجھا نہیں کوثر!" میں نے اپنے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم سب کچھ سمجھ چکے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ یوں ہر ایک سے سب کچھ چھپا کر تم حالات کو اپنے قابو میں کر لو گے؟ نہیں وقار! حالات رفتہ رفتہ تمھارے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ بس ایک ہی طریقہ ہے کہ سب کچھ اپنی ذات پر جھیل کر تم باقی سب کو بچا سکتے ہو۔"

"کس طرح؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور یوں گویا میں نے کوثر کے سامنے ہر بات اور اپنی بے بسی کا اقرار کر لیا۔

"تمھیں سادھو نے بالیکا کے پیچھے بلایا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ تم ابھی چلنے کے قابل نہیں ہو۔ مگر وہ یہ بھی جانتا ہے

کہ سنہرے بابا کی شفقت اور محبت تمہیں جلد ہی کھڑا کر دے گی بس دو راتیں اور۔۔۔ ان دو راتوں کے بعد جو دن نکلے گا وہ تمھارے لیے روشن ہو گا وقار! مگر اس روشن دن میں تمہیں ایک بڑا فیصلہ کرنا ہو گا۔ تمھارے سامنے دو راستے ہوں گے اور تمہیں ان میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا ہو گا۔ ایک راستہ تمہیں فوری طور پر بے پناہ قوت بخش دے گا مگر تمہیں اس قوت کو پانے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں گی۔ دوسرا راستہ تمھارے لیے اذیت تو لائے گا مگر تم اپنے پیاروں سے جدا نہیں کیے جاؤ گے۔ تمہیں ایک طویل اور پرخار راستے پر سفر کرنا ہے وقار، مگر یہ اذیت ناک راستہ بھی تمہیں بعد میں بے پناہ قوت کا مالک بنا دے گا یعنی بالآخر تم قوت کا سرچشمہ بن جاؤ گے مگر راستے کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا' ورنہ زیادہ نقصان تمھارا ہو گا اس کا نہیں۔"

وہ یوں بول رہی تھی جیسے معمول بولا کرتے ہیں۔ کوثر بڑی گہری باتیں کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں میری پیشانی پر گڑی تھیں۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی سامنے لکھا ہوا کچھ پڑھ رہا ہو۔ وہ بہت سیدھی سادی لڑکی تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ اسے پراسرار علوم میں بہت دلچسپی ہے۔ میں نے اس سے قبل اسے ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتے بھی پایا تھا مگر وہ اس حد تک ان علوم پر دسترس حاصل کر چکی ہے اس کا نہ مجھے ادراک تھا نہ اندازہ۔ آج اسے دیکھ کر اور اس سے یہ باتیں سن کر واضح ہو چکا تھا کہ وہ مکمل ہو چکی ہے۔ اگر ایسا تھا تو وہ میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ مجھے اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں اس سے پہلے ہی بات کر لیتا۔ جہاں میں اسے جان کر حیرت زدہ ہوا' وہاں مجھے اطمینان کا بھی گہرا احساس ہوا تھا۔

"کوثر!" میں نے سرگوشی کی۔ وہ خاموش بت بنی اب بھی میری پیشانی کو تک رہی تھی۔ "کوثر! تم کس حد تک جانتی ہو؟ کیا تم میرے ساتھ ہونے والے تمام حادثوں سے واقف ہو؟"

"ہاں! میں تمھارا سایہ بن رہی ہوں وقار! تم نے شاید پہلے مجھے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں ہے مگر میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں تو صرف اور صرف تمھارے لیے زندہ ہوں۔ میں نے تمہیں ایک لمحہ بھی تنہا نہیں چھوڑا ہے۔ جب سے تم امروہہ سے یہاں آئے ہو' میں تمھارے پل پل سے واقف ہوں اور میں تمھاری طرف بڑھتے خوفناک حالات کے قدم چاپ سن رہی ہوں وقار! تمہیں ایک طویل عرصے سب سے جدا ہونا پڑے گا مگر میں۔۔۔ میں سایہ تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تمھاری حفاظت کی کوشش کروں گی مگر تم۔۔۔ تم سن لو۔ شکنتلا کا وہ چاندی کا توڑا تمہیں کسی بھی حال میں سادھو کے نہیں کرنا ہے۔ شکنتلا معصوم ہے وقار! تم اس سے چکے ہو۔ تمہیں یہ وعدہ وفا کرنا ہو گا ورنہ اس کی روح تمھاری رگوں سے زندگی کا ایک ایک قطرہ گی۔ سادھو تم سے وہ کڑا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کو سنبھال کر رکھنا وقار۔" وہ اب بھی یوں بول رہی جیسے اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ جیسے کوئی اس کے اس سے یہ سب کچھ کہلوا رہا ہو۔ کوثر کا یہ روپ انگیز تھا۔ شاید گھر کے کسی فرد کو بھی یہ اندازہ نہ تاریک کمرے کے ایک کونے میں پڑی یہ معذور لڑ حیرت انگیز خوبیوں اور پراسرار قوتوں کی مالک بن چکی میں عجیب و غریب کتب کے مطالعے کے شوق کو جان تو ضرور تھا مگر میں نے اسے اتنی اہمیت نہیں دی اپنے مسائل اس سے ڈسکس کرتا۔ واقعی میں نے نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا اور وہ یہ اعتراف کر بیٹھی وہ صرف میرے لیے زندہ ہے۔ پتا نہیں یہ اس کی انداز تھا یا اس رشتے داری سے انسیت کا اظہار۔ کر رہ گیا تھا اس لیے کہ ایسا کہتے ہوئے نہ تو اس کی میں کوئی تاثر تھا نہ چہرے پر کسی قسم کے احساس رنگ۔ اس حالت میں کہی ہوئی باتوں کو کس حد تک لینا چاہیے' یہ الجھن مجھے بے کل کیے ہوئے تھی چاہتا تھا کہ کسی کے آنے سے پہلے ہی میں اس سے سی باتوں کے بارے میں پوچھ لوں۔ اماں ابھی تک با خانے میں تھیں۔ شاید وہ دوپہر کے کھانے کے انت میں مصروف تھیں۔ شنو آپا اور جہانی آپا بھی ان کے مصروف تھیں۔ تایا شاید گھر پر نہیں تھے۔ تائی آنگ دری پر بیٹھی لحاف میں ٹانکے ڈال رہی تھیں۔ چچی کے قریب بیٹھی ساگ کاٹ رہی تھیں۔ میں جانتا تھا دیر میں یہ سب کام ختم ہو جائیں گے' پھر میں اور کو نہیں رہیں گے۔ اسی لیے میں نے پوچھا۔

"وہ کڑے کو حاصل کرنا چاہتا ہے مگر کیوں۔ اب تک ایسی کوئی بات مجھ سے نہیں کی۔ پھر۔۔۔ وہ خورشید بابا چا' رحیمو' لڈن اور پھولی کی جان لینے سے پہلے بھی اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا۔"

"ہاں مگر وہ جانتا تھا کہ تم کسی دباؤ میں آئے بغیر کڑا اس کے حوالے نہیں کرو گے۔ وہ حویلی جا کر شکنتلا پر قابو پانا چاہتا ہے مگر اس کڑے کے بغیر اس علاقے میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔"

"بے وقوف ہے وہ۔ اگر اسے کڑا چاہیے تھا تو وہ یہ سب کرنے کی بجائے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا' تب شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔" میں نے غصے میں کر کہا۔ "اب اگر وہ میری جان بھی لے لے تو وہ کڑا حاصل نہیں کر سکتا۔"

"وہ واقعی بے وقوف ہے وقار! مگر کہتے ہیں ناں کہ اگر کسی کا زوال شروع ہونا ہوتا ہے تو وہ عقل سے اندھا ہو جاتا ہے۔ سادھو نے اپنے تمام کام انھی اوچھے ہتھکنڈوں سے نکالے ہیں' اس نے تمھارے ساتھ بھی وہی چال چلنے کی کوشش کی ہے مگر یہی کوشش اس کے زوال پر ختم ہو گی۔ وہ تمھارے لیے تر نوالہ تو ثابت نہ ہو گا تمہیں بڑی محنت کرنا پڑے گی مگر بالآخر تم اسے چیونٹی کی طرح مسل دو گے' لیکن وقار! دو باتیں یاد رکھنا۔ تمھارا یہ فیصلہ کہ تم انگوٹھی اتار کر اس سے ملو گے اور کوئی آیت بھی نہیں پڑھو گے' تمھارے لیے بے پناہ خطرناک ہو گا۔ انگوٹھی سنہرے بابا کا وہ حصار ہے جس میں وہ قدم نہیں رکھ سکتا۔ اسے اتار کر تم اس کے رحم و کرم پر جا پڑو گے اور وہ بڑی آسانی سے اپنا مقصد پورا کر لے گا۔ آیت پڑھنا اس کے ہر حربے کو ناکام بنا دینے والا ہتھیار ہے۔ اسے خود سے جدا کرنے کا سوچنا بھی تمھارے لیے خطرناک ہو گا۔" وہ لمحہ بھر کو رکی تو میں بول اٹھا۔

"پھر میں یہ کیسے جان پاؤں گا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

"میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ تم سے کڑا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شکنتلا کا کڑا۔"

"مگر وہ حاصل کر کے اسے کیا ملے گا؟"

"وہ شکنتلا کی روح کو قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ وہ سوامی جوگندر ناتھ کی بیٹی تھی۔ وہ جوگندر ناتھ کے سینے میں دفن تمام علوم کی وارث ہے۔ وہ اس کے اندر جذب تمام قوتوں

کو اپنی مٹھی میں دبا لینا چاہتا ہے۔ وہ ان پراسرار قوتوں سے غلط کام لینا چاہتا ہے وقار! وہ دوسروں کے لیے عتاب بن کر رہنا چاہتا ہے۔ وہ شکنتلا کے ذریعے پرکاش کی روح کو بھی قابو کر لے گا۔ اسے اپنا آلہ کار بنا لے گا۔ شکنتلا کی روح کو معلق کر دے گا۔ تم ایک لمحہ بھی سکھ کا سانس نہیں لے پاؤ گے۔"

اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ اور پوچھتا' اماں تھال میں چاول لے کر آ گئیں۔ ان کے قریب آنے پر میں اور کوثر دونوں چونک اٹھے۔ اماں کوثر سے کہہ رہی تھیں۔

"کوثر! چندا یہ چاول بین دو۔ میں ساگ چڑھا دوں۔"

میں نے دیکھا کہ کوثر چونکی تو تھی مگر وہ خالی الذہن سے انھیں تکے جا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ نہ انھیں پہچانتی ہو اور نہ ہی ان کی بات سمجھی ہو۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "اماں! کوثر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لائیے میں بین دوں۔"

"باؤلے ہو گئے ہو کیا!" پھر وہ کوثر کی جانب پلٹیں۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر تھوڑا سا جھکیں۔ "کوثر! بیٹا کیا ہوا؟" اتنا کہہ کر انھوں نے ہاتھ کی پشت اس کی پیشانی سے چھوئی اور پھر یوں اچھل پڑیں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "اے ہے یہ تو بخار سے تپ رہی ہے۔ ارے بھابی دلھن!" انھوں نے پلٹ کر تائی کو آواز دی۔ "جلدی سے آیئے۔" انھوں نے تائی کو اپنی جانب دیکھتے پا کر کہا۔

میں پریشان ہو گیا۔ میں نے کوثر کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبا دیا۔ نہ معلوم کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی۔ مجھے جلد ہی اس کا ہاتھ چھوڑنا پڑا کیونکہ وہ کسی انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ تائی آ چکی تھیں۔ وہ بھی کوثر کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ اب اس کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے اثرات پیدا ہوئے تھے۔ اس کی پتلیاں متحرک ہوئیں تو حیرانگی کا تاثر پھیل گیا۔ اس نے باری باری ہم سب کو دیکھا پھر بولی۔

"کیا ہوا۔۔۔ سب ٹھیک ہے ناں؟"

"ارے تمھاری حالت بہت خراب ہے۔ تمہیں باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ اتنا تیز بخار ہے اور تم۔ ٹھنڈ میں یہاں آ گئیں۔" تائی نے تایا کے پلنگ کے پائنتی کو تہ کی ہوئی رضائی اٹھا کر اس کے سکڑے ہوئے وجود پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کا موسم موا

ویسے ہی منحوس ہوتا ہے۔"

"ارے دوا تو دے دیں۔" اماں نے تائی سے کہا۔

"کھاتی کب ہے! شمن کو بلاؤں وہ اندر لٹا آئے۔" اتنا کہہ کر وہ منہ اوپر کی طرف کر کے چچا کو آوازیں دینے لگیں۔ چچا شاید اوپر تھے۔

"اماں! میں ٹھیک ہوں۔" اچانک کوثر نے آواز دے لی۔

"تم ٹھیک نہیں ہو کوثر!" میں نے دھیرے سے کہا۔ "تمھیں بہت تیز بخار ہے۔"

"نہیں تو۔ کس نے کہا تم سے؟" وہ اب بالکل نارمل لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی پیلاہٹ ختم ہو چکی تھی، چہرے پر چھایا سکوت ناپید تھا اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک کے ساتھ ساتھ زندگی بھی چمک رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی میری طرف بڑھا دی۔ "دیکھو تو۔ ٹھیک ہوں میں۔"

میں نے اس کی کلائی تھامی اور بھونچکا رہ گیا۔ وہ واقعی ٹھیک تھی۔ انگارے کی طرح دہکتا ہوا ہاتھ اس وقت بالکل نارمل تھا۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

"تم کیسے ہو؟ تمھارے پیروں کے زخم ابا بتا رہے تھے کہ حیرت انگیز حد تک ٹھیک ہو چلے ہیں۔"

"ہاں! میں ٹھیک ہوں۔" میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ کوثر اگر کسی خاص کیفیت کے زیر اثر بولتی رہی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پھر تاریکی میں تھا۔ جانے اس پر یہ کیفیت دوبارہ کب طاری ہوتی اور کب میں مزید کچھ باتیں جان پاتا۔ بہرحال بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ چچا نیچے آگئے مگر کوثر نے کمرے میں جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔ تائی نے بولا کر اس کی پیشانی چھوئی تو خود بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اس کی ضد نے انھیں چپ کر دیا اور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر پھر آنگن میں جا بیٹھیں۔ اب جہانی آپا چاول کا تھال لے کر چاول بننے بیٹھ گئیں۔

کوثر کے اس روپ نے میرے ہیجان کو بڑھا دیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک اہم ہستی بن گئی تھی۔ وہ بہت کچھ جانتی تھی، یہ سب کچھ وہ کیسے جان گئی یہی میں معلوم کرنا چاہتا تھا مگر اس معذوری نے بے بسی کا شدت سے احساس دلایا۔ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو خود اس تک چلا جاتا اور سکون سے سب کچھ پوچھتا۔ اب تو سارا مسئلہ اس سے ملاقات [illegible] تھا۔ وہ ناشتے کے بعد کبھی کبھی باہر آجاتی تھی اور یہ وہ وقت [illegible] ہوتا تھا جب سبھی برآمدے میں جمع ہوتے تھے۔ میں بڑ[illegible] دیر تک اسے دیکھ دیکھ کر سوچتا رہا۔ وہ جہانی آپا سے سو[illegible] کے نمونے پوچھتی رہی۔ اس کے چہرے کے تاثرات [illegible] حد تک تبدیل ہو چکے تھے کہ مجھے یہ بھی سوچنا پڑا کہ [illegible] میں کچھ دیر پہلے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ تایا [illegible] تھے۔ اماں نے اطلاع دی کہ وہ کل شرف الدین کے [illegible] امروہہ جا رہی ہیں۔ تایا بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔ [illegible] میرے لیے شگفتہ کے والد سے بھی بات کرنا چاہتے [illegible] میں یہ سن کر بے چین ہو گیا۔ اب تو حالات کا تایا کو [illegible] اندازہ تھا اور اماں کو بھی، ان کا یہ فیصلہ بے وقت تھا۔ [illegible] نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر اماں کا کہنا تھا کہ [illegible] حالات سے ڈرنے والی نہیں ہیں بلکہ پچھلے پچیس برس [illegible] اسی قسم کے حالات میں زندگی گزار رہی ہیں، اگر شگفتہ [illegible] قسمت میں بھی یہی حالات ہوں گے تو کوئی اسے روک [illegible] سکتا۔ میرا کہنا سننا بیکار ہو چکا تھا۔ شرف الدین کا [illegible] میرے لیے جان لیوا تھا۔ میں کوثر کے بارے میں سب [illegible] بتا کر اس سے مشورہ کرنا لینا چاہتا تھا۔

وہ سارا دن انتظار کی کیفیت کی نذر ہو گیا۔ کوثر [illegible] معمول شام تک نیچے رہی، سبھی وہاں جمع رہے۔ [illegible] اسپتال لے جانے کی بجائے کمپاؤنڈر کو کر لے آئے [illegible] اس نے میری پٹی کھول کر زخم، جو اب کھرنڈ بنتے [illegible] تھے، صاف کر کے دوبارہ پٹی باندھ دی تھی۔ آج [illegible] مجھے کچھ دیر چلایا بھی اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ر[illegible] تکلیف کل کے مقابلے میں بہت زیادہ کم تھی۔ یہ [illegible] میں خوش ہو گیا۔ شام کو شرف الدین آگیا۔ وہ پوری [illegible] سے آیا تھا۔ چھوٹا سا چمڑے کا بیگ اس کے ساتھ تھا [illegible] اور تایا بھی تیاری کر چکے تھے۔ تایا نے کافی رات [illegible] مختلف قسم کی نصیحتیں کیں۔ اپنا خیال رکھنے کو کہا [illegible] چچا کے سر میری دیکھ بھال کی ذمے داری ڈال دی او[illegible] کہہ دیا کہ وہ ایک روز چھوڑ کر میری پٹی بھی تبد[illegible] دیں۔

اب میں غسل خانے تک آرام سے چلا جاتا [illegible] نے رات کو شرف الدین کو کوثر کے بارے میں [illegible] ہونقوں کی طرح سنتا رہا پھر بولا کہ وہ ہمارے لیے [illegible] در یہ نہ ہیں اس دوران میں اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لوں۔ اس کے سونے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا۔ مجھے اپنے کیے ہوئے فیصلے پر نظرثانی کرنا تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے سادھو کے پاس تنہا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ شرف الدین امروہہ چلا جائے۔ میں اسے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا اور اپنی جان کے عذاب خود اپنی ہی ذات پر جھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی رات سوچ لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اگلے روز صبح کی [illegible] سے شرف الدین اور اماں، تایا چلے جاتے۔ شمن چچا کو چکما دینا مشکل نہ تھا۔ وہ کبوتر بازی کے شوقین تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب سادھو سے بات کیے بنا میں کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔

اگلے روز اماں اور تایا مجھے ہزاروں نصیحتیں کرتے امروہہ چلے گئے۔ شرف الدین مطمئن تھا کہ میں ابھی بالکل تندرست نہیں ہوں اس لیے اتنے روز گھر پر ہی آرام کروں گا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے اچھے ہونے تک وہ لوٹ آئے گا تب مل کر آگے کے بارے میں سوچیں گے۔ ان لوگوں کے روانہ ہونے کے بعد میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ سب سے پہلے میں نے وہ چابی دیکھی جو لڈن نے دی تھی۔ یہ اس کمرے کی چابی تھی جس میں، میں نے رحیمو کو رلایا تھا۔ میں سب سے پہلے اسی کمرے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ رحیمو کی لاش نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔ اس کا اسپتال میں ہونا، کروٹ لینا اور یوں ہیبت ناک صورت میں نظر آنا، کبھی کبھی تو مجھے خواب لگتا تھا مگر کبھی کبھی ایک نامعلوم سا خوف مجھے اس کے حقیقت ہونے کا احساس بھی دلاتا تھا۔ پھر اس چابی کا لڈن کے پاس سے نکلنا، اس کا کہنا کہ یہ خورشید چاچا نے دی ہے، یہ سب میرے لیے بڑا الجھا ہوا اور پریشان کیے دینے والا معاملہ لگ رہا تھا۔ میں اپنے ذہن کو ان الجھاوں سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ پھر میرا ارادہ سادھو سے ملنے کا تھا۔ میں کوثر سے چند معاملات کی وضاحت بھی چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تائی شام کو کسی میلاد میں جانے کا ذکر کر رہی تھیں۔ انھیں اور جہانی آپا کو میلاد میں جانا تھا۔ گھر میں صرف شنو آپا، میں اور کوثر رہ جاتے، چچا اور بچا تو ویسے بھی زیادہ تر اوپر ہی رہتے تھے۔

میں شام کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت یوں گزر رہا تھا جیسے مجھے زچ کر دینا چاہتا ہو۔ آنگن میں بھری دھوپ غیر محسوس انداز میں دیوار کی طرف سرک رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ دھوپ کو کھینچ تان کر دیوار سے اس طرح لڑھکا دوں مگر یہ قطعی بے وقوفی کی سوچ تھی۔ تائی اماں میرے قریب ہی بیٹھی، اپنی طرف سے میری دل جوئی کرنے کو مسلسل بولے چلے جا رہی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ انھیں چپ کرا دوں۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر خاموشی کو ترس رہا تھا۔

جیسے تیسے شام ہوئی۔ تائی اماں نے جانے کی تیاری شروع کی تو میری کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ میں دن میں کئی بار، اور کافی دیر تک چل کر اپنا اطمینان کر چکا تھا کہ اب مجھے چلنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ تائی کے جاتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شنو آپا اس وقت کپڑے دھو رہی تھیں۔ حسب توقع چچی چچا کو لے کر اوپر کمرے میں جا چکی تھیں۔ انھیں ہر وقت ان کاغذات کی فکر تھی جو ہمارا وکیل ابھی تک نہیں لایا تھا۔ اماں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ امروہہ سے واپس آکر ہی اسے بلوائیں گی۔ انھیں غالباً" چچا کے کان بھرنا تھے اور یہ ان کے لیے بہترین موقع تھا۔ میں ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا کوثر کے کمرے میں داخل ہوا۔ کوثر اپنے چھوٹے سے پلنگ پر لیٹی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایک تمتماہٹ سی تھی جیسے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں۔ میں بے آواز چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ کمرے میں باہر کی نسبت کافی اندھیرا تھا۔ وہ کھڑکیاں اور روشن دان بند کیے رکھنے کی عادی تھی۔ صرف ایک لیمپ تھا جو اس کے سرہانے جل رہا تھا اور اس کی روشنی اس کے چہرے، تکیے اور کتاب پر پڑ رہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کتاب کا نام پڑھنے کی کوشش کی تبھی میری نگاہ اس کے تکیے کے کونے پر پڑی اور میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔

میری چیخ باہر تک گئی تھی مگر کوثر حیرت انگیز حد تک بے خبر رہی اور مطالعے میں غرق رہی۔ میں جس چیز کو دیکھ کر چیخا تھا وہ بچھو تھا۔ تکیے کے نیچے سے نکل کر آہستہ آہستہ اوپر آرہا تھا۔ مجھے خوف ہوا کہ یہ کوثر کو ڈنک مارے گا۔ میں نے لپک کر کوثر کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود کھڑی نہیں ہو سکتی اس لیے اپنے بچاؤ کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ چند ثانیوں میں میرا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میرے اسے یوں اٹھا لینے پر وہ چونک کر

چیخ اٹھی۔ "کیا۔ کیا ہے؟ کون ہے۔" پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ پُرسکون ہو گئی۔ "کیا بات ہے وقار؟"

"شش۔" میں نے یوں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرا دیا جیسے بچھو ہماری گفتگو سن کر ہماری طرف لپک پڑے گا۔ میری نگاہیں اب بھی بچھو پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس پر سے نگاہ ہٹائے بغیر کوثر کو بید کی آرام کرسی پر لٹایا اور خود اس کرسی پر رکھا کشن لے کر آہستہ آہستہ، دبے پاؤں اس کے بستر کی طرف بڑھا۔ میں اس خطرناک اور قاتل بچھو کو کشن کے نیچے دبا کر پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اس دوران میں شاید کوثر بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ ایک دم چیخ اٹھی۔

"وقار! اسے پکڑنا نہیں۔ مارنا نہیں۔" اس کی آواز میں بے پناہ وحشت تھی۔

میں نے جھٹکے سے سر موڑ کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟ اسے۔ یوں ہی چھوڑ دوں۔ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تم!" اتنا کہہ کر میں پھر اسی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بچھو میری نگاہوں سے اوجھل ہو۔

"وقار۔ میری بات سنو۔" وہ پھر چیخی۔

"بولو میں سن رہا ہوں۔" میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"یہ میرے پلنگ کے برابر رکھی میز پر بلیڈ پڑا ہے وقار! اس سے اپنی اس انگلی پر چیرا لگاؤ جس میں تم نے انگوٹھی پہنی ہوئی ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں ساکت رہ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "خون کے تین قطرے اس بچھو پر ٹپکا دو۔ میری بات مانو وقار!" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ چند لمحے میں ساکت رہ کر سوچتا رہا کہ اس کے کہنے پر عمل کروں یا کشن سے اس بچھو کو دبا کر اسے قابو کرنے اور پھر مارنے کی کوشش کروں۔

"وقار! اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو۔ تو اس بچھو کے مرتے ہی تین اور بچھو اسی کمرے میں پیدا ہو جائیں گے۔ تم نے انھیں بھی مار دیا تو تم اپنے سامنے نو بچھو پاؤ گے۔ وقار۔ خدا کے واسطے وہی کرو جو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" وہ مجھے شش و پنج میں دیکھ کر رو پڑی تھی۔ شاید اسے خوف تھا کہ میں اس کی بات کو اہمیت نہیں دوں گا۔

پتا نہیں کیوں میں نے کشن اپنے ہاتھ سے پھینک دیا۔ میں نے لمحہ بھر کو پلنگ کے برابر رکھی میز پر نگاہ ڈالی، وہاں بلیڈ لیمپ کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر بلیڈ اٹھا لیا۔ میری نگاہیں اب بھی اس بچھو پر تھیں جو ٹھہرا ہوا تھا جیسے پر آ گیا تھا اور نہ معلوم کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے ہی دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ ایک چھوٹا سا بچھو تھا جیسا عام طور پر ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں ممکن ہے دن کے اجالے میں اور دھوپ میں ان لوگوں کو نظر آ جاتی ہوں جن کی نگاہ اچھی ہو مگر مجھے تو نہ اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں نہ یہاں اتنی تیز روشنی تھی، بس ایک احساس تھا جیسے وہ مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے اپنی گدی پر پسینے کو سرسراتے محسوس کیا تو لمحہ بھر کو خوف زدہ ہو کر اچھل پڑا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کو گدی پر رکھ کر یوں جھٹکا جیسے وہاں موجود بچھو کو جھٹک رہا ہوں مگر گیلی انگلیوں نے احساس دلایا کہ وہاں بچھو نہیں پسینا تھا۔

"خود پر قابو رکھو وقار! جلدی کرو۔ انگلی درمیانی پور سے، ہتھیلی کے اندر کی جانب کاٹنا۔ جلدی کرو۔" کوثر کی آواز نے جیسے میرے اندر بجلی سی بھر دی۔ میں نے بلیڈ کی نوک اس انگلی کی درمیانی پور پر رکھ دی جس میں فیروزے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے پور پر خون کا قطرہ چمک اٹھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے بڑی تیزی سے بلیڈ کی نوک کھینچ لی۔ ایک چیرا سا لگا اور خون آنسو بن کر بہہ گیا۔ میں نے خون ٹپکنے سے پہلے ہی انگلی بچھو کے اوپر کر لی۔ جونہی خون کے قطرے بچھو پر ٹپکے، دھواں سا اٹھا جیسے میں نے اس پر جلتا ہوا تیل ڈال دیا۔ وہ تڑپا اور اچانک ساکت ہو گیا۔ کافی دیر تک اس میں سے دھواں اٹھتا رہا۔ میں پتھر کے بت کی طرح کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے کوئی احساس نہ تھا کہ میں یہاں تنہا ہوں یا کوثر بھی یہاں ہے۔ میری نگاہیں اب بھی بچھو پر لگی تھیں ایک انجانا سا خوف تھا کہ وہ پھر زندہ ہو سکتا ہے اور پتا نہیں اس کا کیا ہو؟ میں حیران پریشان کھڑا تھا کہ اچانک اپنے کندھے پر لمس محسوس کر کے اچھل پڑا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، کوثر تھی۔ اس کی آنکھیں بے پناہ سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر عجیب پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"وقار! کیا تم اس بچھو کو اپنانا چاہتے ہو؟" وہ یوں بولی جیسے وہ کوثر نہ ہو۔ کوئی اور ہو۔ اس کی آواز میں ایک سنسناہٹ سی تھی۔

"کک۔ کیا۔ کوثر۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں حیرت سے اچھل پڑا اور نہ معلوم کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوثر اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ میں نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ لیا۔ "کوثر!" میں نے اسے ہلکے سے جھنجوڑا۔

"اوں۔ ہاں۔!"

"تم۔ تم ٹھیک تو ہو ناں کوثر!" میں اب بھی اسے ہلاتے ہوئے تھا۔ پھر اچانک ہی میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔ اس بات نے مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ وہ۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ "کوثر۔ تم۔ تم ٹھیک ہو۔ تم کھڑی ہوئی ہو۔" میں چیختا چلا گیا۔ فرط جذبات میں، میں اس بچھو کو بھی بھول گیا جو اب بھی تکیے پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اپنی اس انگلی کو بھی جس میں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں چیختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں گھر کے دوسرے لوگوں کو یہ خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ کوثر ٹھیک ہو گئی ہے۔ وہ جو پیدائشی معذور تھی، وہ جس کے علاج پر تایا ابا نے پیسا پانی کی طرح بہایا تھا، وہ جسے ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، وہ اس وقت اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ چند لمحے پہلے ہی تو میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اس کے پلنگ سے اٹھایا تھا۔

میری چیخ پکار سن کر جہانی آپا اور شنو آپا کمرے میں بھاگتی ہوئی داخل ہوئیں پھر وہ دونوں ہی آنکھیں پھاڑ کر کوثر کو دیکھنے لگیں۔ میں نے باہر نکل کر زور زور سے چچا کو آوازیں دیں، چچی کو پکارا۔ وہ دونوں ہی حواس باختہ سی سیڑھیاں پھلانگتے نیچے پہنچ گئے۔ ان دونوں کے رنگ سفید ہو چکے تھے۔

"کیا ہے۔ وقار۔ کیا ہے؟" چچا نے آتے ہی مجھے پکڑ لیا۔ چچی روہانسی ہو رہی تھیں اور خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ دونوں سمجھے تھے کہ گھر کوئی نئی قیامت برپا ہو گئی۔

"چچا۔ گھبرائیں نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ چچا۔" میں نے ان کی حالت کے پیش نظر انھیں کندھوں سے پکڑ لیا۔

"پھر کیا یہاں نوٹنکی کا تماشا ہو رہا ہے جو اس بری طرح چلا رہے ہو؟" وہ ایک دم ہی غصے میں آ گئے۔

"نوٹنکی کا نہیں چچا، قدرت کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ اللہ کا کرم دیکھ رہا ہوں چچا۔ آیئے۔ آیئے دیکھیے کہ قدرت کیا کیا کر سکتی ہے۔" میں نے انھیں کوثر کے کمرے کی طرف کھینچا۔

وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اب بھی کچھ نہیں سمجھے ہیں۔ ان کے چہرے پر اچانک پھیل جانے والی گھبراہٹ تو اب نہ تھی البتہ تیوریوں پر بل ضرور پڑ گئے تھے۔ چچی اب بھی حواس باختہ تھیں اور میرے اور چچا کے پیچھے کسی معمول کی طرح چلی آ رہی تھیں۔ میں انھیں لیے ہوئے کوثر کے کمرے میں داخل ہوا تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ وہ بے سدھ سی اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ جہانی آپا اور شنو آپا اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ میں چچا کو چھوڑ کر کوثر کی طرف لپکا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ شاید بے ہوش تھی۔ میرے قریب پہنچتے ہی جہانی آپا اس کے تلوے اور شنو آپا اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگیں۔

"کیا۔ کیا ہوا اسے۔؟" چچا بھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ "یہ تماشا دکھانے کے لیے لائے تھے تم۔؟" وہ اس پریشانی میں بھی غصہ کرنے سے باز نہ آئے اور میری طرف پلٹ پڑے۔

"چچی پانی لائیں۔" میں نے ان کی باتوں کو نظر انداز کر کے کہا۔

چچی الٹے قدموں لوٹ پڑیں۔ چند ہی لمحوں بعد وہ پانی کا کٹورا لیے واپس آ گئیں۔ میں نے پانی کے چھینٹے کوثر کے چہرے پر مارے، اس کے بند ہونٹوں سے کٹورا لگا کر کچھ پانی منہ میں انڈیلنے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا تھا؟" اس دوران میں، میں نے پلٹ کر جہانی آپا سے پوچھا۔

"شاید۔ خوشی سے بے ہوش ہو گئی۔ تمھارے چیخ کر باہر جانے پر ہم لوگ یہاں داخل ہوئے تو یہ حیران پریشان ساکت کھڑی تھی۔ اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ میں آ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ تبھی میں نے محسوس کیا کہ وہ لہرا کر گرنے والی ہے۔ میں اسے پلنگ تک گھسیٹ لائی اور پھر اسے لٹا دیا۔ اور بس۔ یہ ایسے ہی پڑی ہے۔" جہانی آپا نے بتایا تو میری پریشانی ایک دم ہی ختم ہو گئی۔ میں مسکرانے لگا۔ وہ یقیناً خوشی سے اور حیرت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ ایسی حالت میں تو آدمی خوشی سے مر بھی سکتا ہے۔ چمک دار آنکھوں والی یہ معذور لڑکی دوسروں کو دیکھ

کرتی حسرت کرتی ہوگی کہ کاش وہ بھی انھی کی طرح چل پھر سکتی۔ سالوں علاج ہونے کے بعد تو شاید اسے بھی صبر آگیا ہوگا۔ اس نے اسی معذوری کو اپنا مقدر سمجھ لیا ہوگا پھر ایسے میں اچانک ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی بے ساختہ، غیر ارادی طور پر۔ تو بات سمجھ میں آنے پر اگر ایسا نہ ہوتا تو بھلا کیا ہوتا؟

"ارے کیا ہے یہ سب... تم... تم وقار الحسن! تم مسکرا رہے ہو۔ خوش ہو رہے ہو۔ اسے دیکھو یہ مر نہ جائے۔" چچا جھنجلا کر بولے۔ ان کا جھنجلانا بے سبب نہ تھا۔ وہ اب تک کچھ بھی سمجھ نہیں پائے تھے اور نہ ہی ہمیں کچھ بتانے کا موقع ملا تھا۔ میں تو انھیں کچھ بتائے بغیر یہاں اس لیے لایا تھا کہ وہ کوثر کو اپنی آنکھوں سے کھڑا ہوا دیکھیں گے تو یہ ان کے لیے سرپرائز ہوگا مگر یہاں آکر معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ اب میں اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ خدانخواستہ اس کی موت کا ڈر بھی نہیں تھا اسی لیے کہ وہ ماشاء اللہ بالکل ٹھیک تھی۔ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ چہرے کی سفیدی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ یقیناً کچھ دیر کے بعد اٹھ بیٹھتی۔

"خدا نہ کرے چچا! کیوں ایسی بدفال منہ سے نکالتے ہیں۔" مجھے چچا کا اس طرح کہنا بہت برا لگا تھا مگر میں اس خوشی کے موقع پر کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے مسکرا کر بولا۔ "اب تو اسے صحیح معنوں میں زندگی ملی ہے۔ چچا آپ بیٹھ جائیں۔ کوثر بالکل ٹھیک ہے۔" پھر میں نے انھیں بتایا کہ کس طرح اچانک وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ بچھو کا ذکر سن کر وہ بے چین ہو گئے تھے۔ چچی اور بہنوں کے چہرے پر بھی بے کلی چھا گئی تھی۔

"پھر... پھر وہ... وہ کہاں ہے... بچھو۔" چچا نے فوراً ہی پوچھ لیا تب میں بھی اچھل پڑا۔ میں کوثر کی حالت دیکھ کر اسے بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔

"وہ... وہ یہاں تھا۔" میں نے کوثر کے سر کے نیچے رکھے تکیے کی طرف اشارہ کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے کوثر کو ایک بار پھر دونوں بازوؤں میں بھر کر بستر سے اٹھا لیا۔ دونوں بہنیں اور چچی چیخ کر کمرے سے باہر دوڑیں۔ بچھو کا خوف صرف میرے ہی نہیں باقی گھر والوں کے دلوں میں بھی بیٹھ چکا تھا۔ چچا کا رنگ بھی سفید پڑ گیا تھا۔ وہ اپنے پیروں کو جھٹک کر فرش پر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"چچا... تکیہ اٹھا کر دیکھیں۔" میں چلایا۔

چچا نے لپک کر تکیہ اٹھایا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا البتہ میری انگلی سے نکلے ہوئے خون کے چند قطرے اس میں جذب ہو کر اپنا نشان چھوڑ گئے تھے۔

"خ... خون... کوثر کو دیکھو۔ اسے بچھو نے ڈنک مارا ہے۔" چچا بدحواسوں کی طرح چیخ اٹھے۔

"چچا... یہ خون میرا ہے۔" میں نے زور سے چیخ کر کہا۔ ان کی بوکھلاہٹ نے مجھے حد درجہ نروس کر دیا تھا۔ میں اب بھی کوثر کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے کھڑا تھا۔

"تم... تمھارا؟" وہ بونقوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں ہاں... میری انگلی کٹ گئی تھی۔ آپ بچھو کو تلاش کریں۔" اور چچا بڑی شدومد کے ساتھ بچھو کو تلاش کرنے لگے۔ کافی دیر بعد بھی کہیں اس کا اتا پتا نہ ملا تو میں نے جہانی آپا کو آواز دی۔ ان کے آنے پر ان سے کہا کہ وہ یہ کی کرسی پر پڑا گدا جھاڑیں۔ انھوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ گدا جھاڑا پھر دوبارہ بچھا دیا تو میں نے کوثر کو اس پر لٹا دیا۔ اب جہانی آپا اور شنو آپا کے علاوہ چچی بھی کچھ پرسکون ہو گئی تھیں مگر ان تینوں کی نگاہیں اب بھی یہاں وہاں کچھ کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میں کوثر کو پھر آرام کرسی پر لٹا کر اس کے پلنگ کے پاس آگیا۔ میں نے اور چچا نے بڑی احتیاط سے اس کے بستر کی چادر، گدا اور تکیہ جھاڑ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے احتیاطاً پلنگ پر بھی زور زور سے ہاتھ مارے کہ کہیں بان میں چپک کر نہ بیٹھا ہو مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ بے حس و حرکت ہو جانے والا بچھو اس پراسرار انداز سے غائب ہو گیا تھا۔ بہرحال یہاں کون سی بات تھی جو پراسراریت سے مبرا ہو، ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ میں نے کھوکھلے لہجے میں بہنوں اور چچا چچی کو اطمینان دلا دیا کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں مگر میرا دل اندر سے لرز رہا تھا۔ خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ ہم پر رحم کرے۔

ہم سب اب کوثر کو پلنگ پر لٹا کر اس کے گرد آ بیٹھے تھے۔ جہانی آپا اور شنو آپا پھر اس کے تلوے اور ہتھیلیاں سہلانے لگی تھیں۔ میں نے جھک کر کوثر کو کئی آوازیں دیں مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت گہری نیند سو رہی ہو۔ میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس بار اس کی لمبی لمبی پلکیں لرزا ٹھیں اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی چمک دار آنکھوں میں بے پناہ [illegible] بلا کی حیرت تھی۔ اس نے ہم سب کو باری باری دیکھا پھر اچانک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ چچا اور چچی اچھل پڑے۔ اس بیچاری کو تو کروٹ دلانا پڑتی تھی۔ [illegible] کر بٹھانا پڑتا تھا۔

"[illegible] کوثر... ہائے میں صدقے۔" چچی لپک کر اس [illegible] تھیں۔ چچا کی بھی باچھیں پھیل گئیں۔

[illegible] کوثر کی بھی حالت دیدنی تھی۔ وہ بھی اپنے آپ کو [illegible] ہم سب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے [illegible] جذبات سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ [illegible] اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ پھوٹ [illegible] کر رونے لگی اور چھت کی طرف دیکھ دیکھ کر خدا کا [illegible] ادا کرنے لگی۔ ہم سبھی کی حالت عجیب سی ہو رہی [illegible] کاش تایا اور اماں بھی یہاں ہوتے۔ یہ خیال آتے ہی [illegible] ائی کا خیال آیا۔ اور میں چونک اٹھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ [illegible] جہانی آپا تو میلاد میں گئی تھیں۔

"جہانی آپا! تائی کہاں ہیں؟"

"وہ چنے چچا میاں کے گھر چلی گئی تھیں۔ مجھے یہاں [illegible] نے پر چھوڑ گئی تھیں۔"

[illegible] ن کر کوثر چیخ اٹھی۔ "جہانی آپا انھیں بلا لاؤ۔"

[illegible] یں تیزی سے باہر لپکا۔ جاتے جاتے بھی میں نے چچا سے [illegible] کہ آپ لوگ اس کمرے سے نکل جائیں اور دروازہ [illegible] طرح بند کر دیں۔ پتا نہیں میں نے ایسا کیوں کہا تھا [illegible] لیے کہ وہ کوئی کتا بلی تو نہیں تھا کہ بند دروازے سے نہ [illegible] سکتا، اسے تو نکلنے کے لیے ایک جھری ہی کافی تھی۔ [illegible] یہ سب میں نے اس وقت نہیں کافی بعد میں سوچا تھا [illegible] اب یہ واقعات لکھتے ہوئے یہ سب سوچ رہا ہوں۔ اس [illegible] تو ایسی باتوں کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ میں گلی میں تیز [illegible] م اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ چنے چچا میاں کا گھر پچھلی دو [illegible] چھوڑ کر تھا۔ ابھی میں نے اپنی گلی عبور بھی نہ کی تھی [illegible] یک بیک ٹھٹک گیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ میں تائی سے کیا [illegible] گا، اور بتا بھی دوں گا تو اول تو وہ یقین ہی نہیں کریں [illegible] بات یہ کہ اگر یقین کر بھی لیں گی تو کیا خوشی اور [illegible] سے مر نہ جائیں گی۔ وہ ماں تھیں، ایک ایسی لڑکی کی [illegible] پیدائش معذور تھی۔ جانے ان کے دل میں کیسی [illegible] ہوک اٹھتی ہوگی۔ کیسے کیسے ارمان ہوں گے جو کرب [illegible] بوجھ تلے دبے سسک رہے ہوں گے۔ اب تو انھیں صبر [illegible] چکا ہوگا، اب انھیں یہ نوید سنانے کا مطلب یہ ہوگا جیسے کسی کی موت کے برسوں بعد یہ پتا چلے کہ وہ زندہ ہے، جیسے منوں مٹی تلے دبا مردہ اچانک حیات پا جائے۔ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا لوٹ آیا۔ گھر میں خوشی کی عجیب و غریب لہر ہچکولے لے رہی تھی۔ درودیوار جیسے چمک رہے تھے۔ نہ معلوم کیسی سرشاری تھی جو گھر کے افراد کے چہروں کے علاوہ درودیوار پر بھی طاری تھی۔ میری آہٹ پاتے ہی سب چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سب کوثر کے کمرے سے باہر آگئے تھے۔ کوثر تایا کے پلنگ پر بیٹھی تھی اور باقی سب اس کے اردگرد جمع تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر سب میری پشت پر دیکھنے لگے، شاید وہ سمجھے ہوں کہ تائی میرے پیچھے ہیں مگر مجھے اکیلا پا کر ان کے چہروں پر حیرت پھیل گئی۔

"بھائی صاحب کہاں ہیں؟" چچا اور چچی بیک وقت بول اٹھے۔

"چچا! میں انھیں لیے بغیر واپس آگیا۔" میں نے وہیں برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں... خیریت تو ہے ناں؟" کوثر بول اٹھی۔

"ہاں کوثر! ڈرتا ہوں کہ تائی خوشی سے پاگل نہ ہو جائیں۔ ہم سب کو نارمل رہنا چاہیے۔ تم بھی یونہی لیٹی رہنا۔ دیکھو ایسے موقعوں پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اچانک ایسی کوئی بات نہیں کرنا ہے جو انھیں شاک پہنچائے۔ شاک صرف تکلیف سے ہی نہیں خوشی سے بھی پہنچ سکتا بلکہ شاید تائی اور تایا اب تکلیفوں کو برداشت کرنے کا بڑا حوصلہ رکھتے ہیں مگر خوشی اور وہ بھی اتنی بڑی اور حیرت انگیز خوشی انھیں ہلا کر رکھ دے گی۔ انھیں اپنے آپ ہی آنے دو۔ تم بھی ایک دم کچھ ظاہر نہ کرنا۔ آہستہ آہستہ پتا چلے گا تو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" کوثر نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں بات تو عقل کی ہے۔ اب لگنے لگا ہے کہ تم بھی بڑے ہو گئے ہو۔" چچی اس موقع پر بھی طنز کرنے سے باز نہیں آئیں۔ "مگر اتنے بڑے بھی نہیں ہوئے ہو کہ تائے کو مات دے دو۔ یہی بات تمھارے چچا کے دماغ میں بھی آئی تھی۔ وہ کہہ دیتے مگر تمھاری اماں نے تمھیں اتنا بڑا علامہ بنا کر پیش کیا ہے کہ میں نے کہا چھوڑو۔ جو کر رہا ہے کرتا رہے۔"

چچا جو اب تک نارمل تھے، فوراً تیوریاں چڑھا کر پھل

گئے۔ آنکھیں سکڑ گئیں اور چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ غالباً" انھیں یاد آگیا کہ ان کا ہم سے جائیداد کا جھگڑا ہے اور جب تک یہ جھگڑا نمٹ نہ جائے انھیں ہم لوگوں کو زیادہ منہ نہیں لگانا ہے۔ میں اس خوشی کے موقع پر کسی بدمزگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے بے وجہ مسکرا دیا یوں جیسے چچی نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

"بس یوں سمجھیں کہ ادھر چچا کے ذہن میں یہ بات آئی اور ادھر کسی نے میرے قدم جکڑ لیے اور کہا کہ واپس چلو۔ تمھارے چچا ایسا نہیں چاہتے۔ میں بھلا یہ بات کیسے ٹال سکتا تھا سو لوٹ آیا۔" میں نے چچا کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کا ماتھا فوراً کشادہ ہو گیا۔ سلوٹیں صاف ہوئیں تو چہرے کی کرختگی بھی کم ہو گئی۔

"چچی! آپ کے ہاتھ کی چائے پیوں گی' زمانہ ہو گیا۔ عجیب لطف ہوتا ہے اس چائے کا۔" کوثر نے اٹھلا کر کہا۔ وہ بھی شاید ماحول کی تلخی کو محسوس کر رہی تھی ایسا کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مگر چہرے پر افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر کو یہ بھول گئی تھی کہ چچی بہت جھگڑالو عورت ہیں' پھر سب کچھ یاد آگیا تھا۔ اس کی افسردگی بجا تھی' اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ ایسے موقع پر بھی وہ ماحول میں تلخی گھول سکتی ہیں۔ اس موقع پر میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ چچا بذات خود معصوم آدمی ہیں۔ وہ ہم سے بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں۔ جس طرح وہ میرے چیخنے پر حواس باختہ سے نیچے آئے تھے اور پھر جس طرح انھوں نے ہم سب کو دیکھا بھالا تھا اس سے احساس ہوتا تھا کہ ہما... تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں اور جب انھیں کوثر کے بارے میں پتا چلا تھا تو جیسے سارے بدن کا خون کھنچ کر ان کے چہرے پر آگیا تھا۔ وہ خوشی سے بے حال ہو گئے تھے۔ ان کی باچھیں کانوں سے جا لگی تھیں۔ یہ چچی ہی تھیں جنھوں نے انھیں چابی کا کھلونا بنا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ انھیں اپنے لہجے سے کنٹرول کرتی ہوں۔ وہ جس لہجے میں بات کرتیں ان کے چہرے پر وہی لہجہ تاثر بن کر پھیل جاتا۔

چچی فوراً باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ چچا پھر نارمل ہو گئے۔ وہ کوثر کے سرہانے مونڈھا رکھے بیٹھے تھے اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیر رہے تھے۔ جہانی آپا اور شنو آپا تو بالکل کوثر سے چپکی بیٹھی تھیں۔ جب تک چچی چائے لے کر آئیں ہم طے کر چکے تھے کہ تائی اماں کے آتے ہی سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جائیں گے۔ یہ ذمہ میں نے اپنے

سر لے لیا تھا کہ میں آہستہ آہستہ انھیں اس خوش... کے لیے تیار کر لوں گا۔ یہ سب فیصلہ ہونے کے... ہمارا اضطراب کم نہ ہوا تھا' ہر فرد اپنی جگہ بے چین... شدت سے تائی کا منتظر بھی' چچی سب کے لیے چا... لائی تھیں۔ میں خود بھی بڑے زمانوں بعد ان کے... چائے پی رہا تھا۔ وہ کام کو کم ہی ہاتھ لگاتی تھیں۔... کرنے کا ذکر بھی کر دے تو وہ ایسی خطرناک قسم کی... بیماریاں بتاتی تھیں کہ میں حیران رہ جاتا تھا اور اکثر... کہ اس سے تو اچھا ہے کہ آدمی مر ہی جائے۔ وہ... سنسناہٹ بتاتی تھیں' ہاتھ پاؤں تو کام کا ذکر آتے... جاتے تھے۔ جوڑوں میں درد بیٹھ جاتا تھا۔ چکر آ... تھے۔ کئی بار تو مختلف تقاریب کے موقعے پر وہ باقاعدہ... گر بھی چکی تھیں۔ ایسا کرنے سے ایک تو اس روز... بچ جاتی تھیں بلکہ کئی روز تک چچا کی ہتھیلی کا چھالا... تھیں کیونکہ اکثر اس رخ پر گرنے سے کولھے کی... جاتی تھی۔ کہنی کی ہڈی سوج جاتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے... کی ہڈیوں میں سے کئی قسم کی آوازیں آنے لگتی... آوازیں تنہائی میں اتنی زور سے آتی تھیں کہ بقو... وہ اچھل پڑتی تھیں۔ بہرحال یہ تمام بیان انھی کا... شخص سننے اور اثبات میں سر ہلانے پر مجبور تھا۔... جانے ان کے دل میں کیا آیا تھا یا شاید اس د... بیماریاں بھول گئی ہوں۔ اتنی بہت سی بیماریا... ہوتیں تو میں بھی ان میں سے کئی بھول چکا ہوتا... تب بتانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ چچی کے کرا... سکوں اور آپ کو بتا سکوں کہ چچا اچھے' بہت... اگر انھیں چچی جیسی عورت نہ ملی ہوتی۔ ہما... میں فساد کو ہوا دینے والی یہی چچی تھیں ورنہ خاندان کا شیرازہ یوں نہ بکھرا ہوتا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ چچی چائے لے آئیں... کے ہاتھ میں تھی' اس ٹرے پر پانچ پیالے رکھے... دروازہ کھلا اور تائی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی... ہوئیں۔ چہرے پر ناگواری پھیلی ہوئی تھی۔ ا... ہوتے ہی انھوں نے برقعے کے بند کھولنا شروع... بڑبڑاتی ہوئی برآمدے میں آگئیں۔ سبھی کی توجہ... جانب تھی۔ قریب آئیں تو ان کے منہ سے نکلے... سمجھ میں آنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "اے لو... کے قصے پلیا پر سنے جانے لگے۔ گلی بھر کو خبر ہو گئی...

...تھی انسان کی ورنہ۔۔۔" ابھی ان کے منہ سے جملہ ...نہ ...وا تھا کہ قدم برآمدے کے اندر پڑا اور نظر ہیں چچی ...پر جو ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی تھیں تائی کا منہ کھلا ...وہ ہکا بکا کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ ہم سب ہی اپنا ...ے انھیں دیکھ رہے تھے۔

...ہوا تائی اماں؟" میں نے سکوت توڑا۔ میں نے ...ان کی نگاہیں اب بھی چچی پر جمی ہوئی تھیں۔ ...ے میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ بھلا پتھر کو جونک کیسے لگ ...انھوں نے ... ایک انگلی ہونٹوں پر رکھ کر پوچھا اور ...ر مونڈھے کی پشت پر ڈال دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ...ی طرح چچی کو جا کر لگے گا اور پھر لمحوں میں گھمسان ...ر جائے گا۔ چچی پہلو بدل کر رہ گئیں۔ جہانی آپا کی ...جھٹکے سے ٹرے بڑھائی تو چائے پیالوں سے چھلک کر ...ں پھیل گئی۔ میں جلدی سے آگے بڑھا تاکہ کوئی ...ے تائی اماں کی توجہ ہٹا سکوں مگر وہ فوراً بول

...ے تم نے بنائی تھی دلھن؟"

...جواب دیے بغیر' نتھنے پھلائے دور پڑی چارپائی پر جا

...صاحب! اب یہی باتیں تو ہیں ناں جو۔۔۔" چچا نے ...لڑکے اور گردن ذرا سی گھما کر کہنا چاہا کہ کوثر نے ...کاٹ دی۔

...چچی۔ میری خاطر۔ خدا کے عطا کیے ہوئے ا... ...کی خاطر کہ وہ آج' اس لمحے اس گھر پر مہربان

...یا اول فول بکنے لگیں؟" تائی نے اس مونڈھے پر ...ے کہا جس پر سے ابھی میں اٹھا تھا۔ "اور یہ بتاؤ ...ماں کون لایا؟ ارے کیوں ہماری جان کو مصیبت ...آئی طبیعت خراب تھی اور اچھا خاصا ٹھنڈا ہے ..." اتنا کہہ کر وہ میری جانب متوجہ ہو کر بولی۔ "کون ...ے؟"

...رائی ہے۔" میں نے اچانک کہہ دیا۔ ...ے بھجورے مذاق مت کیا کرو مجھ سے۔۔۔ جو قدرت ...ر کیا تو۔۔۔" ان کی آواز رندھ گئی تھی یا شاید مجھے ...لہ کوثر اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی

...فوز کرے' قدرت کو بھلا کیوں برا لگے گا۔ اتنے برسوں بعد تو قدرت مہربان ہوئی ہے۔" جہانی آپا بے اختیار کہہ بیٹھیں۔

"ہاں بی بی قدرت کی مہربانی تو میں نے آج گھر میں گھستے ہی دیکھ لی۔ لو بھو کے ہزار موچیں آئی ہوں گی کلائیوں میں۔ تم جوان جہان لڑکیاں کیا بھاڑ جھونک رہی تھیں کہ چچی صاحبہ کو چائے بنانے بھیج دیا۔"

"اماں بس کریں۔۔۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ۔۔۔" کوثر ساری خوشی بھول چکی تھی۔ ہم سب کا سارا جوش و خروش بھی انجانے خوف میں تبدیل ہو گیا تھا۔ چچا چچی کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ چچی کو دیکھ کر تو لگتا تھا جیسے غبارے میں ہوا بھرتی جا رہی ہے اور یہ غبارہ کسی دم بھی دھماکے کے ساتھ پھٹنے والا ہے۔ چچا کی نگاہیں چچی کے چہرے پر اور کان تائی اماں کی باتوں پر لگے تھے۔

"چچا۔۔۔ چچی پلیز! اس خوشی کو آپ تو محسوس کر سکتی ہیں ناں جو میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اماں کو کچھ نہیں پتا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ لوگ ہیں۔۔۔" کوثر کی آواز بھیگ گئی تھی۔

چچا اسی لمحے چچی کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ چچی کو زبردستی گھسیٹ رہے ہوں۔ تائی اماں آنکھیں پھاڑے کوثر کو دیکھ رہی تھیں۔ "اے بی تمھیں کیا ہوا؟" وہ پاندان اپنے قریب سرکاتے ہوئے بولیں۔ "اگر تم چنے بھائی کے یہاں جاتیں اور وہاں بھانت بھانت کے قصے سنتیں جو تمھاری ان لاڈلی چچی نے۔۔۔"

"اماں خدا کے واسطے۔" کوثر چیخ اٹھی۔

تبھی میں نے کوثر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ منہ پھیر کر آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگی۔

"تو یہ کب سے ہمدرد ہو گئیں ان کی؟" تائی پلٹ کر پہلے مجھے پھر جہانی آپا اور شنو آپا کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ دانت نکلے ہوئے تھے اور وہ انھی باتوں پر کھلی جا رہی تھیں جن کی بھنک بھی انھیں سمیٹ سمٹا کر کسی کونے کھدرے میں چھپ جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

"کون سا انقلاب آگیا یہ ذرا کی ذرا میں؟" تائی نے حیران ہو کر سب کو دیکھا۔

کوثر جو چند لمحے پہلے رو رہی تھی اب اس کی آنکھیں مسکراہٹ سے بھری تھیں۔

"ایں۔۔" تائی نے کہتے میں سنی انگلیاں بالوں میں

پھیرتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "اے بھیا وقار الحسن! جب سے تمھارے پائے مبارک اس گھر میں داخل ہوئے ہیں تب سے مولا روز تماشے دکھا رہا ہے۔" انھوں نے جھنجلا کر کہا اور برقعہ موڑ کر گٹھڑی کی شکل میں تبدیل کر کے، اس گٹھڑی کو سر کے نیچے رکھ کر، برابر والے پلنگ پر لیٹ گئیں۔

ان کے چپ ہوتے ہی ایک دم گہرا سناٹا سا چھا گیا۔ جسے ہم سب کے علاوہ خود انھوں نے بھی شاید شدت سے محسوس کیا اور پھر سر اٹھا کر سب کو دیکھا۔ میں ان کے پائنتی کو جا بیٹھا۔

"تائی اماں! آج میں بہت خوش ہوں۔" میں نے ان کے گھٹنے دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اماں جو سر پر نہیں ہیں۔ حلوے مانڈے کھانے کو جی چاہ رہا ہوگا؟"

"آپ کا جی نہیں چاہ رہا؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "تایا بھی نہیں ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو آپ کا جی حلوے مانڈے کو چاہ رہا ہوگا۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑیں مگر آنکھوں میں لمحہ بھر کو اداسی اور ویرانی چمک کر بجھ گئی۔ "اے لو تمھارے تایا کیا حلوے مانڈے سے روک سکتے ہیں بھلا!"

"اچھا تائی اب سنجیدگی سے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "حلوہ پوری بنانے کا وعدہ کریں تو ایک خوش خبری سناؤں۔"

"لو گھر میں سناٹا پڑا ہے اور میں حلوہ پوری بناؤں گی، اے ہٹو جاؤ۔"

"دیکھا۔" میں نے کوثر اور بھنوں کو دیکھ کر کہا۔ "تایا کے جانے سے انھیں سناٹا لگ رہا ہے۔ میں تایا کو بتاؤں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ میں خواہ مخواہ وقت گزار رہا تھا اور میری سمجھ میں قطعی یہ نہیں آرہا تھا کہ میں انھیں اتنی بڑی خوش خبری کیسے سنا دوں۔ گزرتا وقت میرے ہی دل پر نہیں غالباً" بلکہ یقیناً کوثر اور بھنوں کے دلوں پر بھی گراں گزر رہا تھا۔

"بھائی اب بتا دو نا۔" بے چینی نے شنو آپا کو زچ کر دیا تھا۔ وہ بے اختیار بول اٹھیں۔ "ہم سے تو برداشت نہیں ہو رہا۔"

تائی نے چونک کر مجھے دیکھا تب میں نے ہلکے سے انھیں بتا دیا۔ دھیمے اور ٹھہرے انداز میں انھیں خوشی خبری بھی یوں سنائی جیسے ڈاکٹر بچے کو انجکشن لگانے سے پہلے اور انجکشن لگانے کے دوران میں بہلاتا اور باتوں لگائے رکھتا ہے کہ وہ سوئی کی چبھن کو محسوس نہ تائی پہلے تو یوں سنتی رہیں جیسے یہ حصہ ان سے ہو مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑیں۔ انھیں نہ آیا، جب کوثر ان کے سامنے اپنے آپ اٹھ بیٹھی ٹانگ پلنگ سے لٹکا کر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو تائی تو آنکھیں پھاڑے اس کی ٹانگوں اور پیروں کو دیکھ پھر لہرا کر پلنگ پر گر گئیں۔ ایک بار گھر میں ہڑبونگ چچا چچی شاید انھی آوازوں کے منتظر تھے۔ دونوں تیزی سے سیڑھیاں اترتے نیچے آ گئے۔

یہ ہنگامہ بہ مشکل دس منٹ رہا پھر تائی اماں اٹھ بیٹھیں۔ انھوں نے کوثر سے لے کر چچی تک کو ڈالا، وہ رو بھی رہی تھیں اور ہنس بھی رہی تھیں۔ قصے کو لمبا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کہیں آپ بور نہ ہو لیکن یقین کیجیے میری زندگی کا یہ وہ پہلا خوش گوار جو ہمارے خاندان میں ہوا تھا اور اس واقعے سے نہیں خاندان کا خاندان خوشی سے پھولے نہیں جی تو چاہتا ہے کہ ایک ایک لمحے کو بیان کروں، ہر تاثرات بتاؤں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ بور ہو جا لیکن ایک تمنا ہے کہ آپ کو اپنے دکھ میں شریک اپنی خوشی میں بھی شریک کروں۔

مختصر کہ کوثر کی صحت یابی نے دنیا بھر کو انگشت بد دیا تھا۔ لوگ قدرت کی مہربانی دیکھنے آرہے تھے اور شکر ادا کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے بھی ام مغرب کی نماز میں سجدہ شکر ادا کیا تو گھنٹوں ساکت میں پڑا رہا اور دعائیں کرتا رہا کہ اے پروردگار ساری مصیبتیں یوں ہی اپنی قدرت سے ختم کر دے رات کسی کا دل سونے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ چاند آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آنگن میں ٹھنڈی پھیلی ہوئی تھی۔ کوثر بچوں کی طرح چہلیں کرتی تھیں۔ گھر زعفران، الائچی اور کیوڑے کی خوشبو رہا تھا۔ چچا ہم سب کے ساتھ کھلے آنگن میں بیٹھے چچی تائی اماں کے ساتھ باورچی خانے میں حلوہ پوری تھیں۔

چاند پر نگاہ پڑی تو میں نے ٹھنڈی سانس لی چاندنی راتوں کی تو میں تمنا کیا کرتا تھا جس کی کرنیں گرد بیٹھے لوگوں کے چہروں کو جگمگائیں تو ان کے مسکراہٹیں ہوں۔ آنکھوں میں تارے چمک رہے ہوں۔ آواز میں پائل کی چھنک اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور پھر میں سراپا لرز اٹھا۔ آج چودھویں کی رات تھی۔ ایک سنسناہٹ سی میرے پورے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔ آج چودھویں کی رات تھی اور اماں، تایا امروہہ کی حویلی میں تھے۔ "یا اللہ خیر!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ بھنوں، کوثر اور چچا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میری نگاہیں چاند پر تھیں اور تب جیسے سبھی کو سانپ سونگھ گیا۔ سب کو یاد آگیا کہ آج چودھویں کی رات ہے۔ گہرا سناٹا جیسے ہمارے اندر سے ابل ابل کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ صرف باورچی خانے سے تائی اماں کی چہکتی ہوئی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔

"بھائی۔۔۔ اماں۔" شنو آپا کی بھرائی ہوئی آواز نے سناٹے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "گھبرائیں مت۔ جس خدا نے آج ہی کی رات کو اتنی خوشیاں عطا کردیں وہی ان دونوں کی حفاظت بھی کرے گا۔"

"انشاء اللہ!" کوثر کی آواز میں بھی ہلکی سی لرزش تھی۔ پھر اچانک ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب اسے دیکھنے لگے۔ وہ اپنے کمرے ہی کی طرف جانے لگی۔ کسی میں ہمت ہی نہ تھی کہ اسے روکتا یا اس سے پوچھتا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سب گم صم سے بیٹھے رہ گئے اچانک کوثر نے مجھے آواز دی۔ میں قریب گیا تو اس نے عجیب و غریب فرمائش کر دی۔ وہ کالے اور سفید رنگ کا کبوتر مانگ رہی تھی۔

"مگر۔۔۔ اس وقت میں یہ کبوتر کہاں سے لاؤں گا۔۔۔ اور۔۔۔ تم کیا کرو گی اس وقت کبوتر کا۔۔۔؟"

"وقار الحسن! چاند کے عکس کو کنویں کے پانی میں اترنے سے روکوں گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کھن چچی یا ابا چاند کے قیدی بن جائیں گے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

میں چونک اٹھا۔ جان گیا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر لے گی۔ وہ ایسی ہی پراسرار شخصیت بن چکی تھی۔

"وقار الحسن! چچا کے پاس ایسا کبوتر ہے مگر وہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ تم جان پر کھیل کر بھی اسے حاصل کر لو۔" اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ہکا بکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میں ہر حال میں وہ کبوتر حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے واپس آنے میں دیر نہیں لگائی۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ چچا چپ چاپ مجھے دیکھتے رہے۔ میرا دل چاہا کہ انھیں بتا دوں کہ مجھے سفید اور کالے کبوتر کی ضرورت ہے مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ ایسا کرنے کے بعد مجھے تفصیل بھی بتانا پڑے گی اور یہ بھی بتانا پڑے گا کہ کوثر کوئی عمل کرنا چاہتی ہے۔ پتا نہیں اس پر وہ یقین کریں گے بھی کہ نہیں اور یہ بات پھیل گئی تو کوثر کیا سے کیا بن جائے گی۔ اس آگہی کے نتائج کیا ہوں گے۔ میں نے لمحوں میں یہ سب سوچ کر فیصلہ کر لیا کہ مجھے کوئی بات بھی کسی کو نہیں بتانی۔ جب تک معاملہ خاموشی سے چل رہا ہے اسے یونہی چلتے رہنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے موڈ کو خوشگوار بنا لیا۔

"ارے کیا بات ہے بھئی۔ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا؟"

"بھائی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" شنو آپا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں؟ آپ کا ایمان کمزور ہو گیا ہے کیا؟" میں نے ناگواری سے کہا۔ "ایسی باتیں نہیں سوچا کریں، اور آج تو ویسے بھی یہ سب نہ سوچیں، نماز پڑھ کر دعا کریں۔ تائی اماں کی خوشی کا خیال کریں۔"

اتنا سنتے ہی جمالی آپا اور شنو آپا اٹھ گئیں اور نماز کی تیاری کرنے لگیں۔ عشا کی اذان ہو چکی تھی۔ چچا بھی اٹھ کر اوپر چلے گئے۔ غالباً" وہ بھی نماز پڑھنے گئے تھے۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔ جب اوپر سے پانی گرنے کی آواز معدوم ہو گئی اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ اب وہ نماز میں مصروف ہو گئے ہوں گے تب چپکے چپکے ننگے پاؤں سیڑھیاں عبور کر کے اوپر پہنچ گیا۔ یہاں کھلے حصے میں دائیں جانب کبوتروں کا کابک بنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ چچا کے چہیتے کبوتر کس کابک میں ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کبوتر بھی اس کابک میں ہوگا۔ میں نے قریب جا کر، جالی سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ وہ کبوتر آنکھیں بند کیے گردن میں سر گھسائے سو رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے کابک کی کنڈی کھولی اور جھپٹ کر اس کبوتر کو دبوچ لیا پھر اسی آہستگی سے کنڈی لگائی اور دبے پاؤں لوٹ آیا۔ آنگن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دور باورچی خانے میں پلیٹوں کی آوازوں کے ساتھ ہی تائی اماں کی آواز بھی آرہی تھی۔ بڑے زمانوں بعد میں نے انھیں چچی سے اس قدر گھل مل کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں چپل پہن

کر تیزی سے کوثر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ننگے فرش پر لیمپ رکھے' کوئی موٹی سی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک چمک دار خنجر' ایک چینی کا پیالہ' کالے رنگ کا دھاگا' تین موم بتیاں' دیا سلائی' ایک مٹی کے تیل کا ڈبیا نما' دیا۔ لال اور کالے رنگ کا کپڑا۔ دو بڑے بڑے کانٹے۔ پتا نہیں یہ کون سے کانٹے تھے جو آگے سے نوک دار مگر پیچھے سے کافی موٹے تھے۔ ان کا اگلا حصہ سیفد اور پچھلا حصہ کالا تھا۔ میں نے حیرت سے ان تمام چیزوں کو دیکھا۔ وہ میری آہٹ پا کر پلٹی۔ "لے آئے؟" اس نے سرگوشی کی۔

میں نے سر اثبات میں ہلا کر کبوتر اس کے حوالے کر دیا۔ کبوتر بے پناہ بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے غٹرغوں کی گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کوثر نے جلدی سے اسے دبوچ لیا پھر میری مدد سے اس کی چونچ پر سیاہ دھاگا لپیٹ دیا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا عجیب اور پراسرار لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے چہرے پر بھبھوت مل رکھا ہو۔ کبوتر کی چونچ پر دھاگا لپیٹ کر اس نے کبوتر کو لال کپڑے میں لپیٹ دیا' اس طرح کہ اس کا چہرہ باہر تھا۔ اس لال کپڑے کا ایک کونا اس نے اس کے پیروں پر لپیٹ کر گرہ لگا دی۔ اب وہ پھڑپھڑانے کی کوشش تو کر رہا تھا مگر چل نہیں سکتا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جاؤ۔" وہ ایک دم پلٹ کر بولی۔ "کنڈی باہر سے لگا دو اور کسی کو میرے کمرے میں نہ آنے دینا۔"

نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے وہ بولی نہ ہو بلکہ کراہی ہو۔ جیسے اسے تکلیف ہے' کہیں درد ہو رہا ہے۔ "کوثر۔ تم۔ تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"جاؤ۔ یہاں کوئی نہ آئے۔"

مجھے اس کی آواز بالکل بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس بار کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی اور نہ ہی میں یہ پوچھ سکا کہ میں تائی اماں کو یہاں آنے سے کیسے روکوں گا اور کب تک روک سکوں گا۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ میں نے باہر آ کر کنڈی لگا دی۔ جہانی آپا اور شنو آپا نماز سے فارغ ہو کر تسبیح لیے برآمدے میں' گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو بتایا کہ کوثر کوئی وظیفہ پڑھ رہی ہے اس لیے اسے یکسو ہو کر وظیفہ کرنے دیا جائے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ تائی اماں کو کچھ بتائے بغیر جتنی دیر بھی روک سکیں' یہیں روکیں۔

ان دونوں نے پہلے حیرت سے مجھے دیکھا پھر جانماز سے اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی وہاں پہنچ گیا۔ تائی نے حلوہ کونڈے میں نکال لیا تھا۔ پوریاں بھی چھلنی میں رکھ لی تھیں شاید دسترخوان لگوانے ہی والی تھیں۔

"اچھا ہوا تم لوگ آ گئے۔ چلو یہ پلیٹیں اور دسترخوان لے چلو۔" چچی نے پلیٹیں اور دسترخوان جہانی آپا کی طرف بڑھایا۔

"انہونہہ۔" انھوں نے ہنکارا بھر کر تسبیح والا ہاتھ آگے کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ابھی ٹھہر جائیں' وہ تسبیح پڑھ لیں۔

"لو شنو تم لے جاؤ۔"

"تائی اماں! ابھی دسترخوان کیوں لگا رہی ہیں' آپ کی لاڈلی چہیتی تو جا کر سو بھی گئیں۔ مجھ سے کہہ دیا کہ کنڈی باہر سے لگا لو۔ میں اٹھوں گی تو کھٹکھٹا لوں گی۔" میں نے وہیں اکڑوں بیٹھ کر پوری کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اے لو۔ یہ کون سا وقت ہوا ہے سونے کا۔ اٹھاؤ چلو اسے' لو گرم گرم پوریاں کیا میں نے اپنے لیے بنائی ہیں۔"

"ارے سونے دیں تائی! وہ بے چاری تو حیرت اور خوشی سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ ایسے میں اعصاب اکڑ جاتے ہیں اور بدن میں بے پناہ درد ہونے لگتا ہے۔ بہت تھک گئی ہو گی اور پھر اس کا بھی تو دل چاہ رہا ہو گا کہ آج زندگی کی پہلی پرسکون نیند لے لے۔ جانے اب تک اسے جی بھر کر نیند آئی بھی ہو گی کہ نہیں۔" میں انھیں اٹھا کر' ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے آنگن میں لے آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جہانی آپا چچی کو بھی کسی طرح مطمئن کر دیں گی۔ تائی حیرانی سے میری باتیں سنتی ہوئی وہاں بچھے پلنگ تک پہنچ گئیں پھر میں ہی جانتا ہوں کہ تائی کو میں نے گھنٹا بھر کس طرح روکے رکھا اوپر سے چچا بھی بھوک بھوک کی گردان کرتے آ گئے تھے۔ تائی نے چچی کو اپنا کھانا بنانے سے روک جو دیا تھا۔

"اے بھئی اب اٹھا دو میری لال کو۔" تائی میری داستان گوئی سے تنگ آ کر کھڑی ہو گئیں۔ "اب تو بہت بھوک لگ رہی ہے اور اس نے تو دوپہر کو صرف یخنی پی تھی۔ پتا نہیں دوپہر کو نواب زادی کھانا کیوں نہیں کھاتیں۔" تائی نے بڑے لاڈ اور دلار سے اسے نواب زادی کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ انھیں اس وقت اس پر کتنا پیار آ رہا ہو گا۔ صرف دو تین گھنٹوں میں تائی گلاب کی طرح کھل اٹھی تھیں۔ "چلو جہانی اب دسترخوان لگا کر پلیٹیں رکھ دو۔ پوریاں تو پھر کھولتے تیل میں ڈالیں گی تو گرم ہوں گی۔"

میں خود بھی اس طویل انتظار سے زچ ہو گیا تھا پھر دل میں ایک انجانا سا خوف بھی تھا کہ جانے بند کمرے میں کیا ہوا ہو گا۔ میں نے سنا تھا کہ عمل ذرا سا بھی غلط ہو جائے تو عامل کی کم بختی آ جاتی ہے۔ میں بھی بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تائی کو باورچی خانے میں جاتا دیکھ کر جہانی آپا اور شنو آپا بے چین ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطمینان کا اشارہ کیا۔

"جہانی' کوثر کو اٹھا دو۔" تائی باورچی خانے سے چلائیں۔

شنو آپا نے دسترخوان لگا کر پلیٹیں رکھ دیں۔ چچا جھٹ دسترخوان کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں بھی ہاتھ دھو کر ان کے سامنے جا بیٹھا' میں بے حد مضطرب تھا جہانی آپا ہونقوں کی طرح دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے کوثر کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ میری نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک آہٹ ہوئی۔ کوثر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ جہانی آپا نے جھٹ کنڈی کھول دی اور دروازے پر کوثر کو کھڑا دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر کے گہرا اطمینان کا سانس لیا کہ بات بگڑنے سے پہلے ہی سنبھل گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر میں بھی مطمئن ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی ہم سب حلوہ پوری اور آلو کی بھجیا کھا رہے تھے۔ تائی اماں یوں سب کو بڑھ بڑھ کر کھلا رہی تھیں جیسے ہم سب ان کے گھر مہمان آئے ہوں۔ "آج تمہارے تایا بھی ہوتے اور اماں بھی تو۔ تو کتنا مزہ آتا۔" انھوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں کوثر پر نثار ہوتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھا تائی اماں آپ نے کہ جب سے میرے قدم ہائے مبارک یہاں پڑے ہیں مولا کیسے کیسے تماشے دکھا رہا ہے؟" میں نے تائی کا جملہ الٹ دیا۔

"ہائے میں صدقے۔ بچی' تم لوگوں نے گھر کو رونق سے بھر دیا۔ اے خواہ مخواہ دوسرا مکان لے لیا۔ میری مانو تو اسے بیچ باچ دو' یہیں رہ لیں گے سب مل کے۔"

"آدھی قیمت میں' میں خرید لوں گا۔" تائی کی بات ختم ہوتے ہی چچا بول اٹھے۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ کوثر نے جھٹکے سے سر اٹھا کر چچا کو دیکھا۔

"اے لو یہ کوئی کباڑ ہے کہ آدھی قیمت میں لے لو گے۔ جب بولنا چھپر پھاڑ کر ہی بولنا۔ ذرا صبر کرو' جو قسمت میں ہو گا وہ مل جائے گا سمجھے تم؟"

"قسمت میں تو خیر بہت کچھ ہے مگر ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ میں کہے دیتی ہوں بھائی صاحب! اب آپ اپنی خوشی کے صدقے میں ہمارا تو فیصلہ کرا کے ہی دم لیجیے گا۔"

اپنی خوشی کا ذکر آتے ہی تائی اماں کے چہرے پر پھر گلاب کھل اٹھے۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ چلو میں نے سوچ لیا۔ دلھن آ جائیں تو سب کا معاملہ ہنسی خوشی نمٹا دوں گی مگر ایک شرط ہے میری۔" انھوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اور آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"کیا شرط ہے؟" چچا نے جلدی سے نوالہ نگل کر پوچھا۔

"بھائی بھاوج کی طرف سے دل میلا کیے بنا ہی جھگڑا نمٹا لینا۔ جو بھی فیصلہ ہو اسے چپ چاپ سن لینا۔ اول تو دلھن کبھی ناانصافی نہیں کرے گی اور جو اونچ نیچ ہوئی بھی تو میں سنبھال لوں گی۔" تائی نے بڑی فراخدلی سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

چچی اور چچا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "بس ٹھیک ہے۔ اب تو ہم آپ ہی کی بات رکھیں گے۔" چچی نے مسکا لگایا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ یہ سب باتیں میرے سامنے کر رہے تھے اور ایسے موقع پر کر رہے تھے جب ایسی باتوں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک طرف تو کوثر کی خوشی تھی اور دوسری طرف اماں تایا امروہہ والی حویلی میں تھے اور چودھویں کی رات تھی۔ چچی اور تائی کو تو شاید اس بات کا احساس نہ تھا۔ ممکن ہے وہ بھول گئی ہوں مگر چچا تو جانتے تھے ناں بلکہ انھیں پتا تھا کہ ہم سب ہی یہ سوچ کر پریشان ہو چکے ہیں۔ بہرحال اس لمحے میں ان کی زبانی یہ باتیں سن کر میں نے دل میں یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ اماں کے آتے ہی' ان کا حصہ انھیں فوراً دلوا دوں گا۔

کھانے کے بعد کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ تائی اماں کوثر کا سر گود میں رکھے بیٹھی رہیں۔ وہ کھٹولا نما پلنگ جس پر کوثر اکثر دھوپ میں یا برآمدے میں بیٹھا کرتی تھی' وہ تائی نے اسی وقت چھجے پر ڈلوا دیا تھا۔ میں کوثر سے پوچھنا چاہتا تھا کہ

کیا ہوا‘ اس نے کون سا عمل کیا۔ اسے پیسے یقین ہے کہ اماں اور تایا محفوظ ہوں گے۔ وہ اتنے اطمینان سے ہنس کیوں رہی ہے مگر یہ موقع ہی نہیں تھا کچھ پوچھنے کا۔ میری بے چینی اور اضطراب کو محسوس کر کے اس نے کئی بار مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطمینان دلا دیا تھا مگر میں پھر بھی اس کی زبانی اس سے سننا چاہتا تھا۔

رات بیتتی جا رہی تھی۔ چچا اور چچی تو اوپر جا چکے تھے مگر ہم سب برآمدے میں ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔ ہمیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ آج تو لگتا تھا کہ تائی بھی تمام رات جاگ کر گزاریں گی وہ کوثر سے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ چلو اب کمرے میں چل کر لیٹو۔ ایک بار تو بے خیالی میں انھوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں کوثر کو کمرے میں پہنچا دوں پھر دوسرے ہی لمحے وہ کان پکڑ کر توبہ کر رہی تھیں۔ کوثر نے کہہ دیا تھا کہ آج اسے نیند نہیں آ رہی اور یہ کہ کوئی کسی کمرے میں نہیں جائے گا بلکہ سب یہیں برآمدے میں سوئیں گے۔ میں اپنے کمرے سے جہانی آپا وغیرہ کا گدا لحاف لے کر وہیں چاندنی پر بچھا کر لیٹ چکا تھا۔ تائی اور کوثر‘ تایا کے پلنگ پر اور جہانی آپا اور شنو آپا میرے پلنگ پر لیٹ گئیں۔

پتا نہیں کتنی رات گزر چکی تھی۔ اچانک تائی کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بے خبر سو چکی تھیں۔ کوثر انھیں سوتا پا کر جلدی سے نیچے اتر آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کوثر میرے قریب آتے ہی بولی۔

"وقار الحسن! فجر کی نماز سے پہلے‘ صبح کاذب کے وقت سنہرے بابا سے مل لینا۔" میں اچھل پڑا۔

"سنہرے بابا آ گئے؟"

"ہاں۔ اور انھوں نے تمہیں بلوایا ہے۔ میں سوؤں گی نہیں۔ جاتے وقت ایک چیز دوں گی اسے سنہرے بابا کو دے دینا۔" اس کی سرگوشی میرے اندر ایک نیا اضطراب جگا گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تم۔ کوثر تم۔ کیا ہو؟" پہلی بار میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

وہ مسکرائی مگر اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

"اب کچھ دیر آرام کر لو۔" کچھ دیر بعد وہ بولی اور واپس پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ جہانی آپا اور شنو آپا کو بھی شاید جھپکی آ گئی تھی۔

میں لیٹ کر سوچوں میں گھر گیا۔ کوثر کا یہ روپ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ جس مقام پر تھی وہ میرے لیے اچنبھا تھا مگر بلا کا اطمینان بھی مجھے مضبوط بنا گیا تھا۔ اس کا وجود میرے لیے بڑا سہارا بن گیا تھا ورنہ شرف الدین کے بعد تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔ وہی تھا جس سے میں سب اچھا برا کہہ لیا کرتا تھا۔ گو میں نے اب تک کی داستان کوثر کو نہیں بتائی تھی مگر جانے کیوں مجھے یہ احساس اپنی پوری شدت کے ساتھ تھا کہ وہ میرے پل پل سے واقف ہے۔ اس کا رویہ میرے اس خیال کو تقویت پہنچاتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے میرا دھیان اماں اور تائی اماں کی طرف ہو گیا۔ مجھے شکنتلا سے یوں تو کوئی خوف نہیں تھا اور یہ یقین بھی تھا کہ وہ اماں اور تایا کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی مگر بار بار یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ وہ میری اتنی لمبی غیر حاضری سے الجھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھی ہو کہ میں بھی ابا کی طرح وعدہ وفا کرنے میں ناکام رہا ہوں‘ یا ایفائے عہد سے پھر گیا ہوں۔

پتا نہیں میں کیا کیا سوچتا رہا۔ سنہرے بابا سے ملنے کی خوشی بھی تھی اور اماں کی طرف سے فکر بھی اس لیے سوچیں کٹی پتنگ کی طرح یہاں وہاں ڈولتی رہیں اور وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا۔ نیند تو نہیں تھی مگر تھکن پورے بدن میں بیٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں اوندھا لیٹ گیا۔ پھر شاید مجھے جھپکی آ گئی تھی کہ اچانک کسی نے میرا کندھا ہلا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کوثر تھی اور مجھے اٹھ جانے کو کہہ رہی تھی۔ میں تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ میں غسل خانے سے واپس آیا تو وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

اس وقت اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ میں نے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی واسکٹ پہن لی۔ اتنی دیر میں کوثر واپس آ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پیکٹ تھا۔ اس نے وہ پیکٹ میری جیب میں ڈالتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اسے سنہرے بابا کو دے دینا وقار الحسن!"

"کیا ہے؟" میں نے کنگھا کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم جلدی چلے جاؤ۔ یہاں سے کافی فاصلہ ہے‘ وہاں پہنچنے میں دیر ہو جائے گی‘ اور سنو! تمہیں سیدھے سنہرے بابا کے پاس جانا ہے‘ کہیں بھی رکے بغیر۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ خواہ تمہیں کوئی ہی روکے وقار مگر تم نہ ڈرو گے اور نہ رکو گے۔ سمجھے تم؟"

اس کی آواز اور اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا مطلب ہے؟" میں نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"سادھو اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے وقار الحسن! یہ بات ذہن میں رکھنا۔ تمہارے پاس تمہارے ابا کا دیا ہوا تعویز ہے نا۔ یہ انگوٹھی بھی ہے۔ یہ چیزیں تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھیں گی اگر تم نے خوفزدہ یا جذباتی ہو کر اپنا رخ تبدیل نہ کیا تو۔ دوسرے صورت میں ہر بات کے ذمے دار تم ہو گے۔"

"کوثر! تم مجھے ہولائے دے رہی ہو۔ صاف صاف کہو کہ کیا بات ہے؟" میں جھنجلا گیا۔

"تمہیں کہیں نہیں جانا سوائے سنہرے بابا کے حجرے کے۔ یہی صاف صاف بات ہے اور بس۔ تفصیل تمہیں اس لیے نہیں بتا سکتی کہ وقت نہیں ہے۔ مجھے بھی اب سے چند لمحوں پہلے یہ سب پتا چلا ہے ورنہ میں پہلے سے بتا دیتی۔ تم جاؤ۔ دیر ہو جائے گی۔" اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا۔

وقت واقعی کم تھا۔ ذرا دیر میں صبح صادق کا وقت ہو جاتا اور کوثر کے مطابق مجھے صبح کاذب ہی کے وقت تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آسمان پر روشنی کی پہلی لکیر‘ پہلی جھلک مجھے بابا کے پاس پہنچ کر دیکھنا تھی۔ میرے ذہن میں ہزاروں سوال تھے جو کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ اضطراب ہلکی کپکپی بن کر میرے بدن میں دوڑ رہا تھا۔ میں اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

گلی سنسان پڑی تھی۔ نماز کو جانے والے بھی ابھی نہیں نکلے تھے ظاہر ہے کہ اذان میں ابھی دیر تھی۔ میں نے گلی سے نکلتے ہی اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گلی میں میرے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔ گنبد والی مسجد یہاں سے کافی دور تھی۔ تانگا مل جاتا تو میں جلدی پہنچ سکتا تھا مگر اس وقت تانگا ملنا مشکل تھا اس لیے میں رکے بغیر چلتا رہا۔ میں جونہی بڑی سڑک پر آیا‘ سنسان سڑک اور گہرے سناٹے میں مجھے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے رکے بغیر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ واقعی تانگا تھا۔ میں خوش ہو گیا۔ میں نے رک کر اس طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ تانگے والا بہت آہستہ آ رہا تھا۔ میں زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا تاکہ وہ جلدی سے آ جائے۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا تبھی کوثر کی سرگوشی کہیں قریب ہی گونج اٹھی۔ "تم نہ ڈرو گے اور نہ رکو گے۔ دیر ہو جائے گی۔" میں بے ساختہ چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ اگر تانگے والا اسی رفتار سے آتا رہا تو کچھ آگے تک پہنچ کر میرے برابر آ جائے گا۔ مجھے رکنا نہیں چاہیے ورنہ واقعی دیر ہو جائے گی۔ اس بار نہ چاہتے ہوئے بھی میری رفتار کچھ کم تھی شاید میں لاشعوری طور پر تانگے کے قریب آنے کا منتظر تھا۔ اب میرے کان گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پر لگے تھے۔ میں چلتا رہا‘ چلتا رہا آخر جھنجلا گیا تانگا اب تک میرے قریب نہیں پہنچا تھا گو ٹاپوں کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے گھوڑا کافی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ پھر اچانک میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اب بھی مجھ سے اتنی ہی دور تھا جتنا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میری رفتار اس قدر تیز نہیں تھی کہ میں گھوڑے کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا بلکہ میں تو پہلے کی نسبت آہستہ چل رہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز اب بھی اتنی ہی دور سے آ رہی تھی جبکہ اب اسے قریب آ جانا چاہیے تھا۔ یہ سب احساس ہوتے ہی میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ مجھے یاد آ گیا کہ کوثر نے کہا تھا سادھو اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے‘ اور یہ حقیقت تھی۔ جس کا سب سے بڑا گواہ میں خود تھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ مجھے روکنے کی ترکیب ہے‘ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بھاگنا شروع کر دیا تاکہ گزرے لمحوں کو پیچھے دھکیل سکوں۔

اسی لمحے میں نے کسی عورت کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی سنی۔ پہلے تو آواز دور سے سنائی دی تھی پھر وہ آواز اس تیزی سے قریب آتی محسوس ہوئی جیسے ہنسنے والی وہ عورت بھاگتی ہوئی میرے قریب آ رہی ہو۔ میں صرف لمحہ بھر کو ٹھٹکا ضرور تھا مگر میں نے اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا۔ اب میں تقریباً آدھا راستہ عبور کر چکا تھا۔ میرے دائیں بائیں چھوٹی سڑکیں اور گلیاں تھیں جو سبھی سنسان تھیں۔ میری نگاہ سڑک پر تھی اور میں اب بھی بھاگ رہا تھا۔ میری کنپٹیوں سے پسینا بہنے لگا تھا۔ پنڈلیوں میں اینٹھن ہونے لگی تھی۔ میں اس سے بھی تیز بھاگنا چاہتا تھا مگر میرے ٹخنوں میں درد ہونے لگا تھا۔ مجھے خوف ہوا کہ ٹخنوں کا پرانا زخم کھل نہ جائے۔ مگر مجھے رکنا نہیں تھا۔ بھاگتے رہنا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے سر اٹھا کر آسمان پر دیکھا۔ سیاہ آسمان پر ہیبت لگ رہا تھا۔ گو کہیں کہیں ستارے بھی جھلملا رہے تھے مگر

تاریکی نگاہوں میں کھب کر رہ گئی تھی۔ ہنستی ہوئی عورت اب تک مجھے نظر نہیں آئی تھی مگر اس کی ہنسی کی آواز اب بھی آ رہی تھی یوں جیسے وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی ہو۔ میری ہی رفتار سے بھاگ رہی ہو۔ اس کی ہنسی کی آواز گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز مجھے ہولائے دے رہی تھی۔ میرے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا' میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تو میں بھاگتے بھاگتے بھی اچھل کر رک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے ہنسی کی آواز میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آئی ہو۔ جیسے دونوں ہتھیلیاں اس ہنسی اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے بھری ہوئی ہوں۔ میں نے بے اختیار ہاتھ جھٹکے' ایک بے ساختہ قسم کی گھٹی گھٹی سی چیخ بھی میرے منہ سے نکلی تھی مگر میں دوسرے ہی لمحے پھریدک کر بھاگ پڑا۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ دور دور تک گہرا سناٹا چھا گیا ہے۔ اب نہ ہنسی کی آواز ہے اور نہ ہی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز۔ صرف جھینگروں کے بولنے کی آواز تھی یا میرے بھاگتے قدموں کی آواز۔ میں ذرا دیر میں ہی پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اب میری رفتار پہلے سے بھی تیز ہو گئی تھی۔ شاید یہ خوف تھا جو مجھے جلد از جلد سنہرے بابا تک لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں وہاں پہنچ کر محفوظ ہو جاؤں گا۔

اب راستہ مزید سمٹ گیا تھا۔ دور سے مجھے سبز گنبد والی مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ گنبد پر لگا سنہرا کلس بھی دور سے چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور میں رکے بغیر بھاگتا چلا گیا۔

اچانک۔ بالکل اچانک مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا میرا بدن ٹھہرا تو میں نے سر اٹھا کر بیچ سڑک پر پڑی اس چیز کو دیکھا جس سے ٹکرا کر میں گرا تھا۔ ابھی میں سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ وہ چیز حرکت کرنے لگی پھر میں نے دیکھا کہ وہ کوئی آدمی تھا جو دونوں ہاتھوں کو سڑک پر ٹیک کر اٹھ رہا تھا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ کوئی آوارہ بندہ ہو گا جو شراب کے نشے میں یہاں پڑا ہو گا اور میری ٹھوکر لگنے سے اسے ہوش آ گیا ہے۔ میں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص جھومتا جھامتا میری ہی جانب آ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ پھر بھاگ پڑوں مگر اس خیال سے باز رہا کہ بری بات ہے۔ میں اس سے معذرت کروں پھر چل دوں گا ویسے بھی اب فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں کھڑے کھڑے گہری سانسیں لینے لگا اتنی دیر اور اتنی تیزی سے بھاگتے ہوئے میری سانس بے قابو ہو رہی تھی۔ یوں کچھ دیر آرام بھی مل جاتا اور سانس بھی بحال ہو جاتی۔ ذرا ہی دیر میں وہی شخص میرے قریب آ گیا۔ میری پشت پر کچھ فاصلے پر پول تھا جہاں ایک مدقوق سا بلب بھی روشن تھا گو اس بلب کی روشنی تیز نہیں تھی مگر قریب آنے والے کے چہرے کے نقوش آہستہ آہستہ واضح ہونے لگے اور میں۔ میں اسے دیکھ کر اچھل پڑا۔ حواس باختہ سا ہو گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں شرف الدین کہتا ہوا اس کی طرف لپکا۔

جی ہاں! وہ شرف الدین تھا۔ اس کے کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں بدن سے جھول رہے تھے۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ چہرے پر خون جما ہوا تھا۔ وہ پورا مٹی میں لت پت تھا' اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا' دونوں ہاتھ یوں جھول رہے تھے جیسے ان میں جان ہی نہ رہی ہو۔ میں اس کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ خود کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھا۔ "شرف الدین تم۔ تم یہاں؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے بائیں ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ یوں جیسے اچانک میری انگلی کو کرنٹ لگا ہو اور پورے ہاتھ میں درد ہو۔ میں نے بے اختیار اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ فیروزہ انگوٹھی کا نگینہ' یعنی فیروزہ ہلکی نیلی شعاعیں خارج کر رہا تھا۔

"وقار۔ وقارا۔ لحسن۔ مجھے۔ بچاؤ۔" شرف الدین کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ آواز غرغراہٹ کی طرح تھی وہ میرے کچھ اور قریب آ چکا تھا جبکہ میں ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ میری نگاہ اس کی گردن پر پڑی۔ اس کا زخم ایسا تھا۔ جیسے کسی نے اس کی گردن پر تیز چھرا پھیر دیا ہو۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگوں۔ شرف الدین رو رہا تھا۔ تاریک رات میں سنسان سڑک پر وہ میرے سامنے ایسے کھڑا تھا جیسے ابھی گر پڑے گا۔ اس کی کمر آہستہ آہستہ خم کھا رہی تھی۔ وہ زمین کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ میں نے چیخ کر دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے اور لپک کر اسے پکڑنا چاہا تب میں خوف اور حیرت کے ساکت رہ گیا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ ان دیکھی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ میرا پیر چوٹ لگنے سے زخمی ہو گیا۔ میں نے جھٹکے سے سر جھٹک کر دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے پھر قدم اٹھایا' وہ پھر کسی ان دیکھی ٹھوس چیز سے ٹکرا گیا۔ میں دھیرے دھیرے بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو وہ بھی کسی چیز سے ٹکرا کر رک گئے۔ پھر یہ حیرت انگیز اور خوف ناک انکشاف ہوا کہ میں کسی نظر نہ آنے والے حصار میں قید ہو گیا ہوں۔ میں آگے بڑھنا اور شرف الدین کو سنبھالنا چاہتا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں کسی چیز سے ٹکرا رہے تھے۔ شرف الدین ایک ہاتھ میری جانب بڑھائے تڑپ رہا تھا۔ گرتا جا رہا تھا' کراہ رہا تھا اور میں گویا شیشے کی دیوار کے پیچھے قید اسے مرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ تب میں نے چیخنا چاہا۔ ارد گرد کے لوگوں کو جگانا چاہا تو ایک سرگوشی سی میرے منہ سے نکل کر رہ گئی۔ میری آواز میرے حلق سے نکل نہیں سکی تھی۔ وہ گر چکا تھا۔ خون اس کے چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ وہ اندھوں کی طرح ہاتھ پیر چلا کر مجھے مدد کے لیے بلا رہا تھا۔ میں رو پڑا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور عین اسی لمحے کوثر کی وہی پراسرار سرگوشی پھر گونج اٹھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "وقار الحسن۔ تم نہ رکو گے' نہ رکو گے۔ دیر ہو جائے گی۔ جاؤ۔ دیر ہو جائے گی۔ جاؤ۔ دیر ہو جائے گی۔"

تب مجھے یوں لگا جیسے یہ سرگوشی وہ منتر تھا جس نے میرے حواس بحال کر دیے۔ میرے گرد کھڑی ان دیکھی دیوار گرا دی' میرے بے جان جسم میں روح پھونک دی کیونکہ سرگوشی کے ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے پلٹ کر دوڑ لگا دی۔ اس بار نہ تو کسی نظر نہ آنے والی دیوار نے مجھے روکا اور نہ ہی شرف الدین کی کراہیں مجھ روک سکیں۔ بھاگتے ہی پہلا خیال یہ آیا تھا کہ شاید۔ بلکہ یقیناً یہ سادھو کی شعبدہ بازی ہے۔ اس کا مقصد مجھے وہاں جانے سے روکنا ہے۔ اب تک تو جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ پتا نہیں کہ صبح صادق سے پہلے وہاں پہنچ بھی پاتا یا نہیں۔ شرف الدین کی آواز' اس کی کراہیں' اس عورت کی ہنسی کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھیں' گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کی طرح سنسان سڑک پر گونج رہی تھیں مگر میں بھاگ رہا تھا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ شرف الدین ہی ہے۔ وہ مر رہا ہے' مجھے پکار رہا ہے اور میں۔ میں اپنے اس دوست کو مرتا ہوا چھوڑ کر جا رہا ہوں جس نے اپنی زندگی میری خاطر داؤ پر لگا دی ہے۔

جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ حقیقت بھی تو ہو سکتی تھی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ واقعی مر رہا ہو۔ جس طرح لڈن کی گدی پر سوار بچھو کوئی مفروضہ نہیں تھا' جس طرح اس کا پانی بن کر بہتا اور زمین میں جذب ہوتا جسم کوئی شعبدہ نہیں تھا اسی طرح یہ سب کچھ بھی حقیقت ہو سکتا تھا۔ اس بھیانک خیال کے آتے ہی میں پھر ٹھٹکا مگر اب میں سبز گنبد والی مسجد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' شرف الدین اب بھی گٹھڑی کی مانند بیچ سڑک پر پڑا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کو سوچا پھر گویا موت کا فیصلہ کر لیا۔ میں پلٹا اور شرف الدین کی طرف دوڑ پڑا۔ ابھی میں اس سے کچھ فاصلے ہی پر تھا اور وحشت ناک آواز میں اسے آوازیں دے رہا تھا کہ اچانک کہیں سے چار خونخوار کتے نکل آئے۔ وہ چاروں شرف الدین کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ میں نے لپک کر سڑک کے کنارے سے پتھر اٹھا لیا۔ میں نے کتوں کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے میری پشت سے ہاتھ پکڑ لیا۔ میں گھبرا کر پلٹا اور اپنے سامنے سنہرے بابا کا روشن چہرہ دیکھ کر ساکت رہ گیا پھر چونک اٹھا اور رو پڑا۔ بری طرح رو پڑا۔ "بابا۔ بابا وہ۔ وہ شرف الدین وہ بابا۔ اسے بچا لیں۔ اسے بچا لیں بابا خدا کے واسطے۔" مارے ہچکیوں اور وحشت کے مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"وقار الحسن! شرف الدین تو امروہہ گیا ہے ناں۔" ان کی دل میں اترنے والی آواز نے جیسے زور زور سے دھڑکتے دل کو قابو میں کر لیا۔

"نہیں۔ ہاں۔ نہیں بابا! وہ دیکھیں۔ ۔ وہ شرف الدین۔" میں نے پلٹ کر اس طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جہاں شرف الدین گٹھڑی کی طرح پڑا تھا۔

"وہ۔!" بابا نے مسکرا کر کہا۔ "آؤ۔ دیکھتے ہیں۔" وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ہم اسی طرف چل پڑے۔ ذرا دیر بعد ہی ہم اس گٹھڑی کے پاس پہنچ گئے۔ ہمیں قریب آتا دیکھ کر چاروں کتے بدک کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں بھاگتا دیکھ کر بابا نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے ہتھیلیوں سے اپنے آنسو صاف کیے۔ شرف الدین اس طرح پڑا تھا کہ لگتا تھا وہاں کوئی انسان نہ ہو بلکہ کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہو۔ اس کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بابا نے جھک کر ہاتھ بڑھایا اور چٹکی میں وہ کپڑا اٹھا لیا۔ وہ کپڑا خون آلود تھا' میں سمجھا کہ شاید یہ چادر یا شال ہے جسے

شرف الدین اپنے جسم پر لپیٹے تھا مگر اس وقت میں حیرت زدہ رہ گیا جب بابا کا ہاتھ اونچا' بہت اونچا ہوتا چلا گیا اور وہ کپڑا اٹھتا چلا گیا۔ سارا کپڑا سڑک سے اٹھ چکا تھا' اور وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ صرف اس کپڑے سے خون کے قطرے سیاہ سڑک پر ٹپک رہے تھے۔ وہ کپڑا غالباً" کوئی بہت بڑا کھیس یا چاندنی کے برابر کا تھا۔ جیسے بہت بڑی چادر ہوتی ہے۔ میں حیرت اور خوف سے خالی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"کہاں ہے شرف الدین؟" بابا کی آواز مجھے دور سے آتی محسوس ہوئی۔ میں ساکت جامد کھڑا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہمارے قریب سے نکل کر بھاگا ہو۔ میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر سنسان سڑک پر' اس گہرے سناٹے میں اس کے بھاگتے قدموں کی آواز بڑی واضح تھی۔

"یہ۔ یہ۔" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہنا چاہا۔

"وقارالحسن! تمھارا سارا دھیان فضول باتوں پر ہوتا ہے۔" بابا نے میری بات کاٹ دی پھر جھٹکے سے وہ چادر اپنے ہاتھ سے پھینک دی۔ کچھ پڑھ کر اس چادر پر پھونکا تو یک بیک اس میں شعلے بھڑک اٹھے۔ شعلوں کی نارنجی روشنی دور تک پھیل گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے اس چادر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چادر راکھ میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر بابا کی طرف دیکھنا چاہا اور تبھی میں اچھل پڑا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ خوف کی ایک تیز لہر تھی جس نے گویا میرے جسم پر اپنے بل کس دیئے۔ میں خوف میں جکڑ گیا۔ میرے قدم جم کر رہ گئے اور مجھ سے ہلا بھی نہ گیا جبکہ میرے ذہن میں ایک سرگوشی گونج رہی تھی کہ وقارالحسن بھاگو۔ میں کوشش کے باوجود اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکا۔ تبھی مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی عورت سورہ الناس پڑھ رہی ہو۔ آواز بہت مدھم تھی مگر صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی بے اختیار میرے دل کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ میرے ہونٹ ہلنے لگے اور رفتہ رفتہ میرے منہ سے آواز بھی نکلنے لگی۔ اب میں بھی سورہ الناس پڑھ رہا تھا۔ پھر ہم دونوں کی آواز تیز ہو گئی آواز تیز ہوتے ہی میں قطعی طور پر نارمل ہو گیا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ آواز کوثر کی ہے۔ اب میں نے پلٹ کر سبز گنبد والی مسجد کی طرف بھاگنا شروع

کر دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے بہت دیر ہو چکی ہے مگر حیرت انگیز طور پر سیاہ تھا۔ صبح صادق کے آثار نہ تھے کسی نے وقت کو تھام رکھا ہو۔ میں نے رفتار تیز کر کوثر کی آواز میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی با آواز بلند سورہ الناس کا ورد کر رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سبز گنبد والی مسجد کے صحن کی سیڑھیوں کے قریب یہاں سے مجھے سنہرے بابا کے حجرے کی طرف جانا تھا گو سنسان پڑی تھی مگر اندر کوئی تلاوت کر رہا تھا آواز بے حد خوب صورت اور دل میں اتر جانے والی میں نے خود میں ایک روشنی سی پھیلتی محسوس کی۔ اب حجرے کی طرف چل پڑا۔ یہاں تک آ کر کوثر کی آواز ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو چکی تھی مگر میں نے اپنی کم نہیں کی تھی۔ حجرے کے عین سامنے وہ فقیر بابا جھکائے بیٹھا تھا جس نے مجھے بادام دیئے تھے اور جیسے روز پہلے یہاں ڈھونڈ کر گئے تھے۔ اس کی آنکھیں تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں ہتھیلی سے لے کر کہنیوں مختلف رنگوں کی کئی تسبیحاں جھول رہی تھیں۔ گلے موٹے موٹے دانوں والی تسبیحاں پڑی تھیں۔ وہ جھوم تھا اور اس کا سر اتنی تیزی سے ہل رہا تھا کہ اس پر چند نظر جما کر دیکھنے سے مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور حجرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

"آؤ وقارالحسن!" اندر سے سنہرے بابا کی میٹھی فرحت انگیز آواز سنائی دی۔

میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر کی جانب دھکیلا اور عین اسی لمحے مجھے لگا جیسے سورج کی پہلی کرن دروازے میں' مجھ سے پہلے قدم رکھ دیا ہو۔ بے اختیار نے پلٹ کر آسمان کی سمت نگاہ کی۔ اس کی شرقی چاندی سی بکھر چکی تھی۔ گویا میں بالکل ٹھیک وقت پر پہنچا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ راستے میں اتنا کچھ ہونے' وقت ضائع ہونے کے باوجود میں صحیح وقت پر یہاں تک پہنچ گیا۔ مجھے تو لگ رہا تھا جیسے مجھے گھر سے نکلے کئی روز گزر گئے ہوں۔

"آؤ۔ بسم اللہ۔" سنہرے بابا کی آواز کے ساتھ میں نے بسم اللہ پڑھ کر قدم حجرے میں رکھ دیا۔ سامنے سنہرے بابا بیٹھے تھے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی میں بری طرح چونک اٹھا۔ میرے چونکنے کی وجہ سنہرے بابا نہیں بلکہ

براق بلی تھی جو ان کی گود میں بیٹھی تھی۔ یہ وہی بلی تھی جسے میں نے سب سے پہلے اس روز دیکھا تھا جب ہم میں اور شرف الدین خورشید چاچا کے ساتھ بیٹھک میں خورشید چاچا نے بتایا تھا کہ کتے رحیمو کی لاش نکالنا تھے اور خورشید چاچا نے انھیں مارنے کی کوشش کی تب وہ خورشید چاچا پر جھپٹ پڑے تھے' انھیں زخمی تھا تو ایک سفید براق بلی کہیں سے آ گئی تھی۔ اور انھوں نے یہ قصہ ختم کیا تھا تو اچانک بیٹھک کا دروازہ اور اس بلی نے یوں اندر جھانکا تھا کہ ہم سب اچھل پڑے تھے۔ پھر اس بلی کی آواز میں نے اس وقت سنی تھی بیٹھک میں لڈن کی گدی پر بچھو سوار تھا اور میں دیوان چڑھ گیا تھا۔ کسی نے میرے ٹخنوں کو اپنے سوکھے ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا اور میں بے ہوش ہونے لگا تھا تب میں نے بلی کی غراہٹ سنی تھی پھر تایا نے بتایا تھا کہ ایک سفید براق بلی نے میرے ٹخنوں کے زخم چاٹے تھے اور اس کے بعد وہ زخم حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہو گئے تھے۔ میں اکثر اس پراسرار بلی کے بارے میں سوچتا تھا مگر سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ کون ہے۔ اور اس کا ان تمام واقعات سے کیا واسطہ ہے۔ اب اسے سنہرے بابا کی گود میں بیٹھا دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ فقیر بابا نے سچ کہا تھا اور ان بزرگ نے بھی جو مجھ سنہرے بابا کا پیغام لائے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ سنہرے بابا چلے گئے ہیں مگر وہ کسی کو مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جاتے۔

گویا بابا نے جاتے جاتے بھی اس بلی کو میری مدد کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ اس بلی نے اسی وقت میری مدد کی جب میں مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سنہرے بابا کو سلام کیا۔ وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے مسکرا رہے تھے۔ غالباً" انھوں نے میرے چہرے پر وحشت بھی دیکھ لی تھی۔

"بیٹھو وقارالحسن!" انھوں نے مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے کہا اور بلی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

"میں تمھارے حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ یہ مجھے پل پل کی خبر دیتی تھی۔" انھوں نے بلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بے وقوف کی حرکتوں سے لوگ بہت پریشان ہوئے۔ اسے اگر طاقت مل گئی ہے تو اتنا ظرف اس کے پاس ہونا چاہیے تھا کہ اسے سنبھال کر رکھ سکے۔ میں نے پہلے اسے تنبیہہ کی تھی کہ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال نہیں کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے مگر تم دیکھ ہی چکے ہو کہ وہ اپنی شکتی کہاں استعمال کر رہا ہے۔"

بابا نے بات پوری کی تو میں سمجھا کہ وہ اس سادھو کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ "اس نے اپنے گرو سے کیے ہوئے وعدے کا بھی پاس نہیں کیا۔ وہ یقیناً نقصان اٹھائے گا۔"

"مگر بابا۔ میں۔ میں نے کیا کیا ہے۔؟ اس کا کیا بگاڑا ہے بابا۔ وہ میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ آج میں ان سے سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ میں ذہن میں وہ تمام سوالات دہرانے لگا جن کا جواب اب میرے لیے بہت ضروری ہو چکا تھا۔

"وقارالحسن! ابھی وقت نہیں آیا کہ تمام پردے ہٹا دیئے جائیں۔ بس تم اتنا جان لو کہ وہ تم سے شکتلا کا وہ کڑا حاصل کرنا چاہتا ہے جو تمھارے دادا کو دو چھتی سے ملا تھا۔ ایک کڑا اس کے پاس ہے جسے اس نے کنویں کے قریب سے پایا تھا۔" بابا میرے سر کے اوپر کی دیوار پر نگاہ جما کر دھیرے سے بولے۔

"بابا خدا کے واسطے مجھے اتنا ضرور بتا دیجیے کہ میں کچھ نہ کچھ جان سکوں' اندھیرے میں رہتے ہوئے مجھ سے ایسی فاش غلطی بھی تو ہو سکتی ہے جو میرے اور میرے خاندان کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔" میں نے ان سے التجا کی اور کچھ آگے کی طرف جھک آیا۔

"ہاں! آج میں نے تمھیں اسی لیے یہاں بلوایا ہے۔ مجھے پھر واپس جانا ہے۔ اب میں تمھیں ایک ایسا راستہ بتا کر جانا چاہتا ہوں جسے تم میری غیر موجودگی میں عبور کر سکو۔ اس راستے سے بھٹکنے کا مطلب تباہی اور صرف تباہی ہو گا۔ میری باتوں کو ذہن نشین کر لینا وقارالحسن دوسری صورت میں حالات کی ذمے داری اور تمام لوگوں کی تباہی تمھارے کھاتے میں جائے گی۔" انھوں نے گہرے لہجے میں جواب دیا۔

"میں کوشش کروں گا بابا مگر وہ انہونی باتیں جو مجھے حیرت سے گنگ کر دیتی ہیں۔ وہ ہزاروں سوالات جنھوں نے میرے وجود کو زخمی کر ڈالا ہے' جن کا زہر دھیرے دھیرے میرے حوصلوں کو' میری ہمت اور استقامت کو ڈس رہا ہے اسے ختم کر دیجیے بابا۔"

"آؤ۔ میرے قریب آجاؤ۔" انھوں نے میری جانب ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "آج میں تمھیں ایک ایسا عطا دے جاؤں گا جو تمھیں دنیا کا طاقت ور ترین انسان بنا دے گا۔ مگر یاد رکھو وقار الحسن! ایسے شخص کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک معمولی سی غلطی اسے زمین پر رینگنے والے کیڑے سے بھی زیادہ حقیر بنا دیتی ہے۔"

"میں متوجہ ہوں بابا اور پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی ہدایات پر عمل کروں۔"

"تمھیں کوشش نہیں کرنی وقار الحسن! ویسا ہی جیسا میں کہوں گا۔" انھوں نے ذرا برہم اور سخت لہجے تمھیں کہا۔ "تمھیں وعدہ کرنا ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے۔"

"میں۔ میں وعدہ کرتا ہوں بابا۔" میں نے حتی الامکان لہجے میں مضبوطی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بابا نے چند لمحے بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ "ہندوؤں کے مذہب میں شکتی حاصل کرنا گویا کھیل بن کر رہ گیا' ہر دوسرا شخص ہر قسم کی شکتی پا لینا چاہتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ اسے حاصل کر لینا کتنا مشکل اور حاصل کر لینے کے بعد اس کے اصولوں پر کاربند رہنا کتنا ناممکن ہے۔ یہ نہیں کہ تمام لوگ ان شکتیوں کو ناجائز استعمال کے لیے حاصل کرتے ہیں' ایسے سادھو سنت بھی ہیں جنھوں نے اپنے نام اور کام پر آنچ نہ آنے دی۔ وہ انسانیت کی نمود اور اس کی فلاح کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال لیتے ہیں مگر شیطان ہر جگہ موجود ہے' ایسے ہی کچھ ہندوؤں نے جن کے اندر شیطان سرایت کر گیا ہے انھوں نے ایسی شکتیاں حاصل کر لی ہیں جنھیں وہ اپنے عیش' اپنے آرام اور انسانیت کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سادھو بھی انھی شیطانوں میں سے ایک ہے۔ اس نے جس گرو سے یہ سب سیکھا تھا اسی کی ایک داسی کی عزت لوٹ کر اور اس ڈر سے کہ اس کے گرو کو پتا نہ چل جائے اسے مار کر دفنا دیا تھا۔ یہ اس کی خام خیالی تھی کہ اسے کچھ پتا نہیں چلے گا۔ اس نے اپنی طاقت سے یہ معلوم کر لیا کہ اس کی داسی کے ساتھ کیا ہوا ہے مگر اس سادھو نے اس داسی کی روح تو اپنے شیطانی عمل سے قید کر دیا تھا اور وہ سادھو کے گرو تک نہیں پہنچ سکتی تھی کہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بارے میں بتا سکتی مگر یہ بات گرو سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس وقت تک جب تک اسے اس بات کا علم ہوتا یہ سادھو جو کچھ انت ہے' سب کچھ سیکھ چکا تھا۔ ایک آخری عمل جس کے بعد اس کے گرد کھینچا گیا حصار ٹوٹ جاتا اور وہ آزاد ہو کر اپنی من مانی کرتا اور بے پناہ طاقت کا غلط استعمال کرتا۔ یہی اس کے حق میں برا ہوا اور گرو نے اس کے اندر اس کی ایک ایک طاقت کو توڑ دیا۔ جس کے بعد وہ عورت سے' اس کی کشش سے اور اسے حاصل کرنے کی شکتی سے محروم ہو گیا۔ وہ بہت چیخا' چلایا اور بڑی منت کی مگر گرو نے اس کے عہد سے خلاف ورزی کی سزا یہ دی کہ اب وہ چاہنے کے باوجود کسی عورت کی قربت کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا۔ پھر اس نے اسے آزاد کر دیا۔ ہاتھ اس کے سر سے اٹھا لیا۔ سادھو جو فطرتاً "عیاش" تھا اندر ہی اندر بل کھاتا رہا۔ اس نے جگہ جگہ جا کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی' اس طاقت کو اپنے قابو کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ سری لنکا کے ایک مندر میں ڈھائی سو سال پرانی ایک کتاب ہاتھ لگی جس سے اسے لگا کہ اگر وہ کسی ایسی لڑکی کی روح کو اپنے قابو میں کر لے جو کنواری' پاکیزہ اور دوشیزہ رہی ہو' اس کی موت طبعی یا حادثاتی کا نتیجہ بھی نہ ہو بلکہ اس نے اپنے ارادے سے خود کو موت کے حوالے کیا ہو اور مرنے کے بعد وہ واپس اسی دنیا میں لوٹ آئی ہو تب وہ اس کی روح کو قابو میں کر کے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔" بابا اتنا کہہ کر لمحہ بھر کو رکے۔ انھوں نے قریب رکھا چاندی کا گلاس اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا اور چند گھونٹ پانی پی کر پھر گویا ہوئے۔

"جب تم امروہہ سے مراد آباد آئے تو وہ حصار کھینچ کر جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسی لڑکی کی روح کہاں ہے جسے وہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تمھاری بدقسمتی تھی کہ وہ کڑا بھی اپنے سامان میں لیتے آئے تھے جو شکنتلا کا تھا اور تمھارے باپ نے تمھیں دیا تھا تاکہ تم جوگندر ناتھ کو وہ دے کر اس سے اپنے دادا کی غلطی کا اعتراف کر سکو۔ اس کڑے کی تمھارے سامان میں موجودگی نے اسے تمھارے بارے میں اور پھر تمھاری وساطت سے شکنتلا کے بارے میں معلوم کر لیا۔ وہ ذہنوں کو پڑھ لینے کی طاقت حاصل کر چکا ہے اور اسے اس پر پورا پورا عبور حاصل ہے۔"

بابا کی بات سن کر میرا روں رواں لرز گیا۔ میں نے پہلی بار اس سے کچہری میں ملاقات کے بعد محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں میرے دماغ میں چھوڑ گیا ہو اور ایسا ایک دفعہ نہیں کئی بار ہوا تھا۔ میں یہ سوچ کر پھر بابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"اس کڑے اور شکنتلا کے بارے میں تمام کچھ جان کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اسے اپنی منزل قریب محسوس ہونے لگی۔ اپنے علم سے اسے اتنا بھی معلوم ہو گیا تھا کہ دوسرا کڑا کہاں ہے۔ ان کے علم کے مطابق اگر وہ شکنتلا کے جسم پر موجود دو چوڑیاں' کڑے' یا اس کے کپڑے حاصل کر لیتا تو اسے وہ شکتی حاصل ہو جاتی جو شکنتلا کی روح کو اس کا قابو بنا دیتی گو اس میں اسے کافی وقت لگتا۔ سخت تپسیا کرنا پڑتی' دور دور کا سفر کرنا پڑتا مگر وہ بہرحال حاصل کر لیتا اور اسی بنا پر اس نے امروہہ کا سفر کیا۔ اپنی طاقت سے معلوم کر چکا تھا کہ اس کے پیر کا دوسرا کڑا کنویں کے اندر ایک لوہے کے کنڈا میں اٹکا رہ گیا ہے' اگر شکنتلا کے ساتھ ڈوب جاتا تو سادھو کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی قسمت نے یاوری کی اور وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اسے دوسرا کڑا چاہیے ہے جو تم نے بڑی بے پروائی سے اپنے سامان میں ڈال رکھا ہے۔ وہ مجسمہ جس سے شکنتلا نے تمھارا پردادے کو زخمی کیا تھا وہ بھی اس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے مگر تم نے میری بات نہ مان کر اسے اپنے پیچھے لگا لیا۔ اب وہ تمھیں زچ کر کے یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہے گا۔ شاید وہ اپنے علم سے ان چیزوں کے بارے میں بھی جان لیتا مگر میں نے یہ جانتے ہی ان چیزوں کے گرد حصار کھینچ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا وقار الحسن کہ معصوم دوشیزائیں اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ یہ بھی انھی چیزوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اسے تمھاری نگرانی پر بھی مامور کیا تھا مگر صرف اس وقت جب تمھیں کوئی شدید خطرہ ہو۔ اس نے رشید چاچا کو بچانے کی کوشش کی تھی مگر سادھو اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ اگر میں یہاں ہوتا تو وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تمھاری حفاظت پر میں ہوں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک بے حد ضروری کام سے گیا ہوں۔ وہ میرے آنے سے پہلے پہلے تمھیں پریشان کر کے وہ دونوں چیزیں حاصل کر لینا چاہتا تھا اور اس میں اس نے بہت جلدی کی۔ لڈن اور خورشید کو اسی لیے راستے سے ہٹا دیا تھا کہ وہ دونوں تمھارے لیے جان تک دے دینے والے لوگ تھے۔ وہ شرف الدین کے پیچھے بھی ہے مگر فی الوقت وہ اس سے اپنے مفاد میں کام لینا چاہتا ہے۔" بابا سب بتا رہے تھے اور میں حیرت سے منہ پھاڑے سن رہا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سادھو کے خبیث دماغ میں کون سا کھیل ناچ رہا ہے۔ اچانک میں چونک اٹھا۔

"بابا! سادھو کا مقصد تو آپ نے بتا دیا مگر شکنتلا۔ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ اور۔ اور آپ نے کہا تھا کہ مجھ میں کوئی ایسی طاقت ہے۔"

"ہاں۔" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ "میں بتا رہا ہوں۔ بیٹا شکنتلا وہ معصوم اور مظلوم عورت تھی جس پر مرزا صولت بیگ نے سفاکانہ حد تک ظلم کیا تھا۔ انھوں نے اسے برباد کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس بچی نے اپنی جان دے دی۔ اس کے محبوب پرکاش کی لاش اسی حویلی میں موجود ہے اور تم جانتے ہو کہ ہندوؤں کی رسم کے مطابق اس کی لاشوں کو جلایا جاتا ہے۔ جب تک پرکاش کی لاش جلائی نہیں جائے گی' شکنتلا یوں ہی بھٹکتی رہے گی۔"

"اور بابا۔ خود اس کی لاش بھی تو کنویں میں سے کوئی نہیں نکال سکا تھا۔" میں نے فوراً کہا۔

"جس روز پرکاش کی لاش جلے گی اسی روز اس کی لاش بھی کنویں کے پانی کی سطح پر آجائے گی۔"

"مگر بابا! پرکاش کی لاش کہاں ہے۔؟"

"مجھے بھی علم نہیں ہے۔" انھوں نے کہا تو میں حیران رہ گیا' وہ جو میرے پردادا تک کے بارے میں جانتے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ وہ اس بات سے لاعلم ہیں کہ لاش کہاں ہے۔

"حیران مت ہو وقار الحسن! کم از کم اس بات پر دھیان مت دو۔ بلکہ اس بات پر حیران ہو کہ شکنتلا کے باپ سوامی جوگندر ناتھ نے شکنتلا کی روپوشی یا اغوا سے دو دن پہلے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ انھوں نے جس نیک بندے کے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ مرزا صولت بیگ کے اس قبیح فعل پر اس لیے زیادہ طیش میں آگئے تھے کہ سوامی جوگندر ناتھ نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا مسلمان ایسے ہوتے ہیں؟ سوچو کہ جو شخص اپنے مذہب کا عالم ہو وہ اسلام قبول کر لے اور پھر

اسے ایک ایسی بات کا پتا چلے جس سے اس کے دل میں اسلام کے خلاف کوئی خیال سر اٹھائے تو یہ اس مذہب پر کیسی چوٹ ہو گی؟ تبھی ان نیک بزرگ نے اپنی طاقت سے یہ معلوم کرلی کہ شکنتلا کا محبوب بھی جو اسے بچانے گیا تھا اور پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ مرزا صولت بیگ کی قید میں ہے۔ انھوں نے اسے محفوظ رکھنے کے لیے حصار کھینچا مگر صرف چند ثانیوں کی دیر کی وجہ سے یہ حصار اس کی لاش کے گرد کھنچ گیا' اس لیے کہ مرزا صولت بیگ اسے زندہ جلا چکے تھے۔ وہ لاش سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس سے قبل ہی شکنتلا کنویں میں کود کر اپنی جان دے چکی تھی۔ جوگندر ناتھ جن کا نام ان بزرگ نے عبداللہ رکھا تھا' وہ یہ سن کر ہی اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ وہ علاقہ ہی چھوڑ گئے۔ ان بزرگ نے یہ حالات دیکھ کر اس حصار کو قائم رکھا تھا کہ مرزا صولت بیگ اس عذاب کا شکار ہو جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ شکنتلا کی روح انھیں چین نہیں لینے دے گی۔ انھوں نے مرزا صولت بیگ کو خود کوئی سزا دینے کی بجائے ایک ایسے عذاب میں گھرا چھوڑ دیا جو ان سے ان کے گناہوں کا حساب لینے کے علاوہ انھیں اس علاقے میں جہاں وہ بہت مہذب اور معزز بنے ہوئے تھے' بے عزتی کی آخری حدوں تک لے جا سکتا تھا اور پھر وہی ہوا۔ پھر وہ بزرگ وہاں سے کہیں چلے گئے۔ ان کے کھینچے ہوئے حصار کو توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے مگر وقارالحسن! تم یہ کام کر سکتے ہو۔ یہ کام کرنے کی طاقت تمھارے اندر ہے مگر اس کے لیے تمھیں دنیا داری چھوڑ کر کچھ وظیفے اور چلے کرنا پڑیں گے۔ وہ اسم اعظم جو تمھارے پاس ہے وہ انھی بزرگ کا دیا ہوا ہے۔ اگر تم اس کی حفاظت ہمیشہ کرتے رہے اور تمام کٹھنائیوں کے باوجود بھی تم نے اسے خود سے جدا نہ کیا تو تم ایک نہ ایک روز ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ یاد رکھو وقارالحسن! اگر تم ان باتوں کا خیال نہ رکھا تو پھر تمھیں گہرے عذابوں کے بے پناہ گہرے سمندر میں گرنے سے کوئی بھی نہ روک سکے گا۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ سادھو تمھیں عورت' حسن اور جنسی بد۔۔۔ کی طرف راغب کرے گا۔ تم اس کا مقا۔۔۔ قوت ارادی سے کرو گے اگر تم اس میں ناکام ہوئے تو انگاروں بھرا راستہ تمھارا نصیب ہو گا۔ تاوقتیکہ خدا تم پر اپنا فضل و کرم کرے اور تمھیں معاف کر دے۔"

میں ساکت بیٹھا سن رہا تھا۔ بابا نے گویا مجھ پر دروازے بند کر دیے تھے۔

"ہاں۔ تم پر تمام دروازے اس وقت تک بند ر تک تم پر کاش کی لاش کے گرد کھینچا وہ حصار توڑ کر لاش جلا نہیں دیتے' پھر تمھیں شکنتلا کی لاش کو بھی جلانا ہو گا۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔ یہ سادھو اذیتیں دیتا رہے گا مگر مجھے یقین ہے کہ خدا کے طاقت تمھیں اتنا طاقت ور بنا دے گی کہ تم سب جاؤ گے۔ وقارالحسن! خاندانی مفاد سے باہر نکل کے مفاد کے لیے خود کو وقف کر دو۔ یہی تمھاری زند اور یہی زندگی کا مقصد۔ خدا چند لوگوں کو چند کامو لیے چن لیتا ہے۔ تم انھی چند لوگوں میں سے وظائف اور چلے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ورنہ ہر ایک یہ طاقت حاصل کر لیتا۔ میں اب بھی کے لیے وقت ضرور دوں گا مگر یہ بھی کہوں گا کہ تم کدے میں قدم رکھ چکے ہو۔ تمھاری مرضی کہ تکلیفیں اٹھا کر یونھی پڑے پڑے جان دے دو یا دو بچانے کے لیے تگ و دو کر کے اپنی جان بھی بچا لو اور ان نیک لوگوں میں شامل کر لو جو کسی کی خاطر تکلیفیں اور بالآخر سرخرو ہو جاتے ہیں۔"

"بابا۔۔۔ میں۔۔۔ میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔" نے عزم مصمم سے کہا۔

"شاباش وقارالحسن! تمھاری انھی خوبیوں نے پہلے ہی روز جب تم مراد آباد کے علاقے میں داخل تھے تمھاری مدد کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ ہمیں یقین تھا اس طاقت کو حاصل کر کے اسے مثبت انداز میں اس کرو گے۔"

"انشااللہ بابا۔۔۔ میں۔۔۔" میں نے کہنا چاہا مگر بابا نے اٹھا کر میری بات کو کاٹ دیا۔

"وقارالحسن! یاد رکھنا کہ سادھو ہر طرح سے تمھیں راہ سے بھٹکانے کی کوشش کرے گا۔ خود تمھارا تمھیں دھوکا دے گا۔ شیطان تمھارے گرد اپنا جال کرنے کی کوشش کرے گا۔ خوفناک مناظر' ویسے ہی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے سڑک پر دیکھ کر آئے ہو تمھیں اس سے کھینچ کر پستی کی طرف لانے کی کوشش کریں گے۔ سب اس سادھو کے ہتھکنڈے ہیں جہاں وہ تمھارے قو

ارادی کو کمزور کر کے ضرب لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بات یاد رکھو' لڈن کی موت کو تم نہیں روک سکتے تھے' تم خورشید چاچا کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتے تھے اور اسی طرح تم شرف الدین یا کسی کو بھی موت سے نہیں بچا سکتے اسی لیے ایسے مناظر دیکھ کر خوفزدہ ہونا یا عورتوں کی طرح رونا چھوڑ دو۔"

"تو۔ تو کیا شرف الدین۔۔۔" میں باوجود ضبط کرنے کے جی جان سے لرز اٹھا۔

"نہیں۔ وہ ٹھیک ہے مگر میں ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم اگر کسی وقت بھی ایسا کچھ دیکھو تو یہ سوچ کر اسے دل میں نہ بٹھاؤ کہ تم اسے بچا لو گے' اگر اس کی موت آنی ہو گی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مگر بابا' آپ شرف الدین کے بارے میں جانتے' وہ بڑا مخلص دوست ہے' اس کا نقصان میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔"

"اور سادھو تمھارے مخلصوں کی تعداد کم کر کے تمھیں گھیرنا چاہتا ہے۔ وہ تمھارے گرد گھیرا تنگ کرتا جا رہا ہے۔ تمھیں جلد از جلد فیصلہ کر لینا چاہیے۔ مجھے واپس جانا ہے اگر تم تیار ہو تو میں برابر والے حجرے کو کھول دیتا ہوں۔ تم وہیں رہو اور وظائف کرو جو میں تمھیں بتاؤں گا۔۔۔ وہ کڑا اور مجسمہ تمھیں یہیں لے آنا چاہیے۔"

"میں لے آؤں گا بابا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرائے۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہے وقارالحسن! گھر سے یہاں تک راستہ پل صراط بن جائے گا۔ موت چاروں طرف سے تمھیں گھیر لے گی۔ تم ایسے ایسے مناظر دیکھو گے کہ پاگل ہو جاؤ گے۔ مگر وقارالحسن! غور سے سنو! تمھیں آج کی رات ایک وظیفہ کرنا ہے۔ مغرب کے بعد تم جاء نماز پر بیٹھو گے تو صبح صادق کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ وظیفہ ختم کرو گے۔ اس دوران میں چاہے کچھ ہو جائے تم نہ آنکھیں کھولو گے۔ نہ ہاتھ پاؤں ہلاؤ گے اور نہ اپنی جگہ سے ہٹو گے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اس وظیفے کے بعد ہی تم میں اتنی طاقت آ سکے گی کہ تم ان دونوں چیزوں کو لے کر یہاں تک پہنچ سکو۔ مگر وہاں سے یہاں تک کا راستہ چیلوں اور سادھو کے اوچھے ہتھکنڈوں سے پٹا ہوا ہو گا۔ میں تمھیں جو آیت لکھ کر دوں گا تمھیں اس کا ورد جاری رکھنا ہو گا۔ ایک لمحے ایک ثانیے کے لیے بھی تم اس ورد میں وقفہ نہیں دو گے۔ کڑا اور مجسمہ تم یہاں تک لانے میں کامیاب ہو گئے تو سوچ لینا کہ تم سادھو کو ایک نہ ایک روز شکست ضرور دو گے اور اگر تم اس میں ناکام رہے تو۔ تو تم ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاؤ گے جو جہنم سے بدتر ہو گی اور نکلنا چاہو گے بھی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ ایسی صورت میں تم سادھو کے پیچھے دم ہلاتے کتے کی سی حیثیت اختیار کر لو گے۔ وہ تمھارے ایک ایک ساتھی' سنگی اور رشتے دار کو اذیتیں دے کر مارے گا اور تم کچھ نہ کر سکو گے۔ میرے دونوں وظائف کو اگر تم نے یاد رکھا تو شاید۔ شاید کبھی یہ تمھاری آزادی کا سبب بن سکیں مگر وہ وظائف یاد رکھنا آسان نہیں ہے۔۔۔ چلو اب نماز فجر ادا کرو اور خدا سے عہد کرو کہ تمھیں صراط مستقیم پر چلنے کا حوصلہ عطا کرے۔ نماز کے بعد میں تمھیں دونوں وظائف دوں گا اور اس سے متعلق ہدایات بھی سمجھا دوں گا۔" اتنا کہہ کر بابا کھڑے ہو گئے۔ وہ سفید براق بلی اپنی چمک دار فیروزی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس کی آنکھوں سے مجھے ویسی ہی روشنی نکلتی محسوس ہوئی جیسی اس فیروزے کی انگوٹھی کے نگینے سے نکلتی تھی۔ میں نے چونک کر بابا سے اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ انھوں نے اسی بلی کے ہاتھ مجھے بھیجی تھی تب مجھے یاد آیا کہ جس روز میں نے نماز کے بعد میں اپنے سامنے یہ انگوٹھی رکھی دیکھی تھی اس روز میں نے بلی کو نہیں دیکھا تھا بلکہ میں نے اپنے پہلو میں کسی کو کھڑا ہوا محسوس کیا تھا جو میرے ساتھ ہی ساتھ نماز بھی ادا کر رہا تھا' مگر پہلو میں موجود شخص مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ گو میں نے اس کی موجودگی بھی محسوس کی تھی بلکہ مجھے یوں لگا تھا جیسے اس کے کپڑے میرے کپڑوں سے مس ہو رہے ہیں مگر میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ میرے پوچھنے پر بابا کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ "یہ میرے دوست جن ہیں۔" اس کے علاوہ انھوں نے کچھ نہ کہا اور میں سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ اگر وہ مجھے نہ چونکاتے تو میں جانے کب تک یونہی کھڑا اس بلی کو دیکھتا رہتا جو اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔۔۔ اور مجھے لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں گہری مسکراہٹ بھری ہوئی ہے۔

"چلو وقارالحسن! اذان ہونے والی ہے۔" انھوں نے

کہا، میں چونکا اور اسی لمحے اللہ اکبر کی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اللہ اکبر کی میٹھی آواز میری روح میں سکون مگر میرے کپڑوں میں ہلچل سی مچا گئی۔ میں چونک اٹھا۔ میرے ساتھ ہی سنہرے بابا بھی چونک اٹھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری واسکوٹ کی دائیں جیب میں کوئی زندہ کیڑا یا وجود مچل رہا ہے۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ کوثر نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا تھا کہ اسے سنہرے بابا کو دے دوں۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ میں نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکال لیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہلچل اسی لفافے میں تھی۔

"کیا ہے یہ؟" سنہرے بابا نے برہم لہجے میں پوچھا۔

"یہ۔ بابا پتا نہیں۔" میں نے گھبرا کر وہ لفافہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اس لفافے کو رینگتا دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ "یہ مجھے کوثر نے دیا تھا کہ آپ کو دے دوں۔" میں دو قدم پیچھے ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ سنہرے بابا نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ سفید بلی چونکنے انداز میں اس لفافے کے گرد ناچنے لگی۔

دفعتاً بابا نے آنکھیں کھولیں اور میں سرتاپا لرز اٹھا۔ ان آنکھوں میں بلا کی سرخی تھی۔ جیسے کہیں سے خون اتر آیا ہو۔ ان کا چہرہ غصے سے تمتا گیا۔ انھوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا پاؤں اس لفافے پر رکھ دیا اور بولے تو یوں لگا جیسے بادل خوفناک آواز سے گونجنے لگے ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "کوثر سے کہنا کہ ہم نے اس کی صحت مندی کے لیے دعا اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ ہمیں اپنی شعبدے بازی سے مرعوب کرے۔ اسے کہنا کہ جادو برحق ہے مگر اسے کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ کالا علم اسے شیطانوں کی صف میں کھڑا کر دے گا اور پھر تباہی اس کا مقدر ہو گی۔"

ان کا لہجہ اتنا غضب ناک تھا کہ میں لرزنے لگا۔

"بابا۔ وہ تو۔"

"ہم جانتے ہیں وقارالحسن! کچھ بتانے کی ضرورت نہیں مگر اس سے کہہ دینا کہ تم جادو اور شعبدے بازی سے شیطانوں کا مقابلہ تو کر سکتی ہو مگر شیطان ہی کے روپ میں اور یہ روپ خود اسے تباہ و برباد کر دے گا۔ وہ چاہتی تو کلام اللہ سے بھی مدد کر سکتی تھی۔ اس میں سمجھنے اور عمل کرنے کی وہی قوت ہے جو تم میں بھی موجود ہے مگر وہ اپنی قوت کو غلط راستے پر ڈال رہی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت میری نگا کے اسی پاؤں پر تھی جس کے نیچے وہ لفافہ تھا۔ میں ان پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں اس لفا میں کیا ہے کہ اچانک چونکنی کھڑی بلی نے اپنا پنجہ مارا لفافہ پھٹ گیا۔ اس لفافے سے جو چیز رینگ کر باہر آئی اسے دیکھ کر ایک بے ساختہ قسم کی چیخ میرے حلق سے نکل پڑی۔

وہ وہی بچھو تھا جو کوثر کے کمرے سے پراسرار انداز غائب ہو گیا تھا۔ وہ جونہی لفافے سے باہر آیا بلی نے اپنے پنجوں سے دبوچ لیا۔ میں تھرتھر کانپ رہا تھا۔ بابا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔ اچانک انھوں نے کہا۔ "وقارالحسن اس کٹورے کا پانی اس بچھو پر انڈیل دو۔"

میں چونکا پھر خوف زدہ انداز میں الٹے قدموں اس طرف گیا جہاں وہ چاندی کا کٹورا رکھا تھا جس میں سے کچھ دیر پہلے سنہرے بابا نے پانی کے چند گھونٹ لیے تھے۔ میری نگاہیں اس بچھو پر جمائے رہا اور میں نے جھک کر کٹورا اٹھا لیا۔ اسی لمحے اس بلی نے اسے چھوڑ دیا اور وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔ میں نے گھبرا کر پانی اس پر انڈیل دیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچھو تڑپا، پھر گہرے زرد رنگ کے مائع میں تبدیل ہوتا ہوا غائب ہو گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اب وہ بلی بڑے اطمینان سے ایک کونے میں جا بیٹھی تھی۔ پانی اور وہ زرد مائع کچی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ میری نگاہیں اس گیلے دھبے پر جمی ہوئی تھیں کہ اپنے کندھے پر لمس محسوس کر کے اچھل پڑا پھر فوراً جھینپ گیا کیونکہ وہ سنہری بابا تھے۔

"چلو وقارالحسن! جماعت کھڑی ہو چکی ہے۔"

میں جلدی سے ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ باہر بلا کا رش تھا۔ نمازی مسجد کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ میں گھر سے وضو کر کے چلا تھا اس لیے بابا کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا اور ان کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ ہم کافی پیچھے کی صف میں کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ہم سے پہلے کافی لوگ آ کر نیت باندھ چکے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے نیت باندھی اور تکبیر پڑھتے ہوئے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر ساتھ ہی آنکھیں

کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ میں اور بابا پہلی صف میں کھڑے تھے۔ سنہرے بابا میرے برابر میں کھڑے تھے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک گہرے سنہرے رنگ کا ہالہ ہے جو انھیں گھیرے ہوئے ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یوں تو نماز پڑھ رہا تھا مگر میرا دھیان سنہرے بابا کی طرف تھا۔ پھر میں اس وقت چونک اٹھا جب میں نے محسوس کیا کہ میرے دائیں جانب کھڑے لوگ غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف سرک رہے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ان کے پیروں تلے کی زمین پیچھے کی طرف سرک رہی ہو۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میرا دھیان سنہرے بابا کی طرف سے ہٹ کر اپنی دائیں جانب ہو گیا تھا بلکہ میں اب کن انکھیوں سے اس طرف دیکھ بھی رہا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے کہ میں بہ ظاہر نماز میں کھڑا تھا اور کسی روبوٹ کی طرح رکن اور سجدے میں بھی جا رہا تھا۔ آیتیں بھی پڑھ رہا تھا مگر ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھا پھر ایک بار میرا دل اس وقت زور زور سے دھڑکنے لگا کہ جب میں نے اپنے دائیں جانب کی خالی جگہ پہ کسی کی موجودگی کو محسوس کیا۔ اس بار پھر مجھے بالکل وہی احساس ہوا تھا جیسا کبھی میں نے اس وقت محسوس کیا تھا جب سجدے کے بعد فیروزے کی انگوٹھی پائی تھی۔ یعنی یہ کہ میرے دائیں جانب کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ میرے ساتھ ہی رکوع اور سجدے میں جا رہا ہے مگر وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کی موجودگی اور گلاب کے عطر کی مہک پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ تمام نماز اسی خوف اور حیرت کی کیفیت میں پوری ہوئی۔ سلام پھیرتے ہوئے میں نے اس جانب غور سے دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر میں نے بائیں جانب سلام پھیرا، سنہرے بابا کھڑے تھے اور جب میں نے نماز ختم کر کے سر اٹھایا تو پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ دائیں جانب وہی لوگ کھڑے تھے جو پہلے ہی موجود تھے، یعنی وہ لوگ جنھیں میں نے پیچھے کی طرف سرکتے محسوس کیا تھا۔

"تمھیں اپنا دھیان نماز کی طرف رکھنا چاہیے۔" بابا نے میرا ہاتھ پکڑ کر حجرے کی طرف جاتے ہوئے کہا تو میں شرمندہ ہو گیا۔ "جو لوگ نماز پڑھتے ہوئے خود کو خدا کے

حضور محسوس نہیں کرتے وہ بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

"وہ بابا۔ میری دائیں جانب۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہنا چاہا۔

"جن تھے۔" بابا نے دھیرے سے کہا اور میں اچھل پڑا۔

"جج۔ جن۔؟"

"ہاں میرے وہ ساتھی جو میری پر خلوص مدد کرتے ہیں۔ جو انسانیت کی بقا کے لیے میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔" ان کی بات سن کر میرے ذہن میں شرف الدین کی باتیں گونجنے لگیں جس کا کہنا تھا کہ جن ون کچھ نہیں ہوتے۔ یہ پیروں فقیروں کی نفسیاتی ٹرک ہوتی ہے۔

"نہیں وقارالحسن! شرف الدین بچہ ہے۔" سنہرے بابا کی بات سن کر میں سخت شرمندگی کا شکار ہو گیا۔ میں بار بار بھول جاتا تھا کہ بابا ذہن پڑھ لینے پر قادر ہیں۔ "جن تو خدا کی وہ مخلوق ہے جس کے بارے میں قران شہادت دیتا ہے اور نعوذباللہ کیا تم قرآن کی نفی کر سکتے ہو؟"

"نن۔ نہیں بابا۔ خدا نہ کرے، میں ایسا سوچوں تو۔ وہ تو شرف الدین۔" میں بوکھلا گیا تھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا وہ بھی۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ روح کوئی چیز نہیں۔ اسی نے پہلے تمھاری باتوں پر کب اعتبار کیا تھا۔ پھر وہ شکنتلا کا قائل کیسے ہو گیا؟ دیکھو وقارالحسن! یہ معاملہ بڑا گمبھیر ہے، اس پر بڑی ریسرچ اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن، بھوت، چڑیل، بدروح یہ سب کیا ہے، تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ جادو شعبدے بازی، کالا علم یہ سب کیا ہے؟ معجزے کیا ہوتے ہیں یہ سب جاننے کے لیے اور ان میں تفریق کو واضح کرنے کے لیے تمھیں ابھی بڑا وقت چاہیے۔ جلدی نہ کرو، تمھیں سب معلوم ہو جائے گا۔" وہ کہہ رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ ہم دونوں اب حجرے تک آ گئے تھے۔ وہاں ہم نے فقیر بابا کو دیکھا۔ وہ اب پھر سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

"جانتے ہو یہ کون ہیں؟" بابا نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں ان سے آپ کی غیر موجودگی میں ملا تھا۔ انھوں نے ہمیں بادام دیئے تھے۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"یہ وہی ہیں جنھیں تم نے اپنے برابر محسوس کیا تھا' اور جب تم آئے تو یہ ہماری گود میں بیٹھے تھے۔"

"جی۔!" میں بابا کی بات سن کر سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔

سنہرے بابا مسکرائے۔ "ہاں وقار الحسن! وہ سفید براق بلی۔ انھیں ہی تو ہم نے تمھاری نگرانی پر مامور کیا تھا۔ یہ جن ہیں۔ ہمارے سب سے اچھے دوست۔"

سنہرے بابا کی بات سن کر میں آنکھیں پھاڑ کر فقیر بابا کو دیکھنے لگا۔ یہ کتنی تعجب خیز بات تھی کہ ہم جن سے باتیں کرتے رہے' بلا خوف ان کے قریب چلے گئے تھے وہ انسان نہیں جن تھے۔ یہ بات اگر ہمیں پہلے پتا ہوتی تو شاید ہمارا حوصلہ اس طرف آنے تک کا نہ ہوتا۔ کجا ان سے بات کرنا؟ اس وقت بابا کی باتوں پر حیران ہونا یا تعجب محسوس کرنا بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ کسی ایسی جگہ چلا گیا ہو جہاں کی ہر چیز نرالی ہو' حیرت انگیز' کبھی خوفزدہ کر دینے والی اور کبھی خوش کر دینے والی۔ ان تمام کیفیات کے باوجود میں خود کو بڑا مضبوط اور حوصلہ مند محسوس کر رہا تھا۔ بات کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ بہت سے معاملات اور الجھنیں سلجھ چکی تھیں۔ ذہن پر پڑے کئی پردے ہٹ چکے تھے۔ اب کم از کم میرے سامنے ایک راستہ تھا' میری ایک منزل تھی' میں جانتا تھا کہ مجھے کس راہ پر چل کر کہاں تک پہنچنا ہے۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے وہی کچھ کرنا ہے جو سنہرے بابا کہیں گے' میرا دنیا داری کرنا اس سے بہتر ہرگز نہ تھا کہ میں ہی نہ رہتا یا میرے لیے دنیا ہی نہ رہتی' میرے گھر والے نہ رہتے۔ مجھے ایسی دنیا داری کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ جب سے ہوش سنبھالا تھا ایک نہ ختم ہونے والے عذابوں کا سیل رواں تھا جس نے ویسے ہی دنیا سے بیگانہ کیے رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اماں بھی نہ روکیں گی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اماں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو پھر مجھے بہر صورت تمام حقیقت انھیں بتانا پڑے گی۔ میں بابا کے ساتھ حجرے میں داخل ہوا۔ میں وہاں فرش پر دوزانو بیٹھ گیا تھا۔ بابا نے دیوار پر ایک جانب پڑا پردہ ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ وہاں دیوار میں طاقچے سے بنے تھے۔ ان طاقچوں سے کچھ نیچے دیوار ہی میں الماری سی بنی تھی۔ اس

ایک بہت موٹی اور انتہائی قدیم کتاب نکال لی۔ کچھ دیر ا[illegible] کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر انھوں نے وظیفے لکھے [illegible] مجھے بتانا شروع کیا۔ میں حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ [illegible] کی باتوں کو ذہن نشین کر لوں۔ میں نے وہ وظائف بھی یاد [illegible] لیے۔ ان سے متعلق ہدایات بھی ذہن نشین کر لیں۔ پھر [illegible] کافی دیر تک مجھے سمجھاتے رہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اس بار پھر وہ فقیر بابا جن کو میری نگرانی پر مامور کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے حجرے کی چابی مجھے دے کر ساری تیار[illegible] کے بارے میں سمجھا دیا۔ فقیر بابا کو بھی بتا دیا کہ جب [illegible] حجرے میں بٹھا دیا جاؤں۔ انھوں نے وظائف سے قبل [illegible] مسائل کو دیکھنے اور حجرے کی صفائی ستھرائی کے لیے [illegible] انھی جن بابا کو ہدایات دے دیں اور پھر میں ان [illegible] رخصت ہو کر گھر کی طرف چل پڑا۔

○ ○

اب سورج سر پر آ چکا تھا۔ میں جس سنسان سڑک [illegible] سبز گنبد والی مسجد تک پہنچا تھا وہ اب لوگوں سے بھری [illegible] تھی۔ جگہ جگہ ٹھیلے والے کھڑے تھے۔ کاریں' تانگے [illegible] بسیں گزر رہی تھیں۔ میں پیدل ہی گھر کی طرف چلا جا [illegible] تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نگاہیں سڑک پر کچھ تلاش [illegible] رہی تھیں۔ شاید میں ان خون کے قطروں کو جما ہوا [illegible] چاہتا تھا جو آج سویرے شرف الدین کے بدن سے ٹپک رہے تھے۔ گو بابا' نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے مگر بابا نے تو بھی کہا تھا کہ تم اس معاملے میں نہ پڑو۔ تم کسی کی موت روک نہیں سکتے۔ ان کی ذو معنی باتوں نے مجھے الجھن [illegible] ڈالا ہوا تھا۔ اچانک میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نگاہیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق را[illegible] جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ یہیں دیکھا تھا اور وہاں خون [illegible] قطرے جم گئے تھے۔ میں تیز قدموں سے وہاں تک پہنچا [illegible] جھک کر ان سیاہ پڑے خون کے قطروں کو دیکھنے لگا۔

"کیا ہے بھائی جان۔ کیا بات ہے بھیا؟" ایک ٹھیلے والا مجھے یوں جھکا دیکھ کر بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں بوکھلا گیا۔ "یہ۔ یہ کیا ہے؟" میں نے سڑک پر جمے خون کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ارے میاں زندگی کی ارزانی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لو یہ ہے زندگی۔" وہ کوئی بہت باتونی قسم کے صاحب تھے فورا

ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔

"رات بیچارا اچھا بھلا اپنے پیروں سے چلتا ہوا یہاں تک آیا ہو گا اور صبح۔ اسپتال کی مردہ گاڑی اٹھا کر لے گئی ہے۔"

"مہیں۔ مردہ گاڑی۔" میرے تو چھکے چھوٹ گئے۔

"ہاں جانے بے چارے کو کس اندھے کی گاڑی کچلتی ہوئی نکل گئی۔ ذرا کی ذرا میں مارا گیا۔ لاش صبح تک پڑی رہی' کتے جھنجھوڑتے رہے اور پھر صبح جب کسی نے۔"

وہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور میرے دماغ میں آندھیاں چلتی رہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ رات یہاں زخمی ہو کر مدد کے لیے پکارنے والا کوئی اور نہیں شرف الدین ہی تھا۔ میں سرپٹ گھر کی طرف دوڑ پڑا۔۔۔۔ مجھے حیرت تھی کہ پھر جب سنہرے بابا نے وہ خون آلود کپڑا اٹھایا تھا تو وہ خالی کیوں تھا۔ اس میں تو اس وقت کوئی بھی نہ تھا پھر۔ یہ۔ یہ کون تھا جس کی لاش اسپتال والے لے گئے تھے۔

میں تقریباً بھاگتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ وہی راستہ جو رات صدیوں جتنا طویل ہو گیا تھا۔ وہ پتا نہیں کب کٹ گیا تھا۔ میں نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب کسی نے بھی دروازہ نہ کھولا۔ میں حیرت زدہ ہوتا رہا پھر میں نے کچھ زور سے دروازے پر ہاتھ مارا' پیتل کا بنا کنڈا بجایا۔ آخر اپنی پوری قوت سے اس پر ہتھیلیوں کی بارش کر دی۔ محلے کے کھڑکی دروازے کھلنے لگے۔ چھجوں سے لوگ جھانکنے لگے۔ بچے گلی میں نکل کر منہ اٹھا کے مجھے دیکھنے لگے اس وقت میں خوف اور دہشت سے دیوانہ ہو گیا۔ میں نے پوری قوت سے کندھے کا زور ڈالا اور پھر جانے کیا ہوا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا بڑھا اور آگے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ دروازہ اچانک کھل گیا تھا۔ یوں جیسے وہ پہلے ہی سے کھلا ہوا ہو۔ میں نے نگاہ اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور خوف و دہشت سے میری آنکھیں پھیل کر رہ گئیں۔

پھر یوں لگا تھا جیسے میں نے کسی ویران کھنڈر میں قدم رکھ دیا ہو۔ ایک ایسا کھنڈر جو ہزاروں سال پرانا ہو۔ گھر وہی تھا مگر برآمدے کی جعفری پر کئی کئی گز لمبے مکڑی کے جالے جھول رہے تھے۔ برآمدے کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اندر خوفناک قسم کی چمگادڑیں اڑتی پھر رہی تھیں۔ اوپر جانے والی سیڑھیوں پر کیا ہوا پلستر ادھڑا ہوا تھا اور منوں مٹی تھی جو آنگن میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس مٹی پر سوکھے پتے تیز ہوا سے چکراتے پھر رہے تھے۔ میں بولائے ہوؤں کی طرح پہلے تو کھڑا سر اٹھائے چاروں طرف دیکھتا رہا پھر چیختا ہوا باہر بھاگا۔ میں خود پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ بے ساختہ قسم کی تیز چیخوں نے مجھے بے دم کیا ہوا تھا۔ میں گلی میں کھڑا زور زور سے چیخ رہا تھا۔ گلی کے لوگ گھبرا گھبرا کر باہر نکل آئے۔ سب نے مجھے سنبھالنا چاہا' چپ کرانا چاہا مگر مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میرے حلق میں کوئی اور بیٹھا چیخ رہا ہو۔ میں چپ ہو جانے کی شعوری کوشش کے باوجود بے بس تھا۔

لوگ مجھے پکڑ رہے تھے۔ مجھ سے چیخنے کی وجہ معلوم کر رہے تھے مگر میں کچھ بھی نہیں بتا پا رہا تھا۔ میری چیخیں تھمتیں تو کچھ بتاتا۔ میری پشت میرے گھر کے دروازے کی طرف تھی۔ اچانک کسی نے مجھے پشت سے تھام لیا۔ میں نے سنا' مجھے تھامنے والا چیخ رہا تھا۔ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔

"وقار الحسن۔۔ وقار۔۔ وقار کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" نہ معلوم اس آواز میں کیا تھا کہ میری چیخیں بے ساختہ رک گئیں۔ میں لہرا کر زمین پر گرنے لگا اور گرتے گرتے میں نے جس چہرے کو خود پر جھکتے پایا۔ وہ چچا کا چہرہ تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر میری آنکھوں میں بلا کا اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ کانوں میں تیز سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور میرے جسم سے جان جیسے نکلتی جا رہی تھی۔ پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ جانے کب میں نے محسوس کیا جیسے میرا بدن تیز بارش میں بھیگ رہا ہو۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے چہرے پر ٹھنڈے پانی کی بوندیں برس رہی تھیں۔ چاروں طرف کچھ لوگ جمع تھے۔ ان کی آوازیں بھنبھناہٹ بن کر میرے وجود میں اترتی جا رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی ایسے شیشے کے پیچھے کھڑا ہوں جہاں سے پار کھڑے لوگوں کے چہرے صاف اور واضح طور پر نظر نہیں آ رہے اور نہ ہی ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں بس ایک بھنبھناہٹ سی تھی جو مجھے احساس دلا رہی تھی کہ کچھ لوگ بول رہے ہیں۔ مجھے ہر چیز دھندلی بلکہ مسخ ہو کر نظر آ رہی تھی۔ عجیب ٹیڑھی میڑھی سی۔ میں نے سر جھٹکا۔ آنکھیں ملیں' آنکھیں بند ہوئیں تو

میرے سامنے سرخ دھبے سے ناچنے لگے اور آنکھیں کھولیں تو تیز دودھیا روشنی نے آنکھیں چندھیا دیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے ہنڈولے میں بٹھا دیا ہے جو کبھی تیزی سے اوپر کی جانب جاتا ہے اور کبھی اسی تیزی سے نیچے کی طرف جانے لگتا ہے۔ میری حالت بہت خراب تھی۔ لگتا تھا جیسے آنتیں حلق سے باہر آجائیں گی۔ ایسی حالت میں میں نے اپنے بازو میں سوئی کی چبھن محسوس کی تو پہلا خیال یہی آیا کہ کسی نے مجھے انجکشن لگایا ہے۔ اس کے فوراً بعد میں پھر بے ہوش ہوگیا یا شاید گہری نیند میں چلا گیا۔

اس بار میں نے آنکھ کھولی تو خود کو بستر پایا۔ میں آنکھیں کھولے چند لمحے تو یونہی بے حس و حرکت لیٹا رہا پھر اچانک ہی مکڑی کے سیاہ اور موٹے موٹے جالے میری نگاہوں میں لہرا گئے۔ چمگادڑوں کے پھڑپھڑانے کی آواز گویا مجھے اپنے حواسوں میں لے آئی اور میں ایک چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے کیا دیکھا تھا۔

"وقار الحسن!" اچانک چچا نے مجھے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔

میں آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر بے بسی، افسردگی مگر آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ شفقت تھی۔ "چچا!۔۔" ایک سرسراتی ہوئی اجنبی سی سرگوشی میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"کیا ہوگیا تھا بیٹا؟" ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

تب میں نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے چاروں طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے میں پھر بے ہوش ہونے والا ہوں۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ میں برآمدے میں بچھے تایا کے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ برابر پڑے موڑھے پر چچا بیٹھے تھے۔ کچھ فاصلے پر تائی جائے نماز پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے مجھے اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان گرتے ہوئے دانوں کی گونج میں اپنے وجود میں محسوس کر رہا تھا۔ جہانی آپا اور شنو آپا مجھے بیٹھا دیکھ کر میری طرف لپک رہی تھیں۔ چچی شاید باورچی خانے میں تھیں کیونکہ ان کے باتیں کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوثر کہیں نظر نہ آئی۔ میں ایک ایک کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ گھر کے در و دیوار کو گھور رہا تھا اور چچا حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے جھنجوڑا۔

"وقار الحسن! بولو۔ بات کرو۔ کیا ہوا تھا تمھیں؟"

"مم۔ میں۔ مجھے چچا۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اب میرا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ مجھے ایک خیال نے بولنے سے باز رکھا کہ کسی کو بھی کچھ بتانا بیکار ہے۔ میں جان چکا تھا کہ سادھو کے پاس ان اوچھے ہتھکنڈوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ لیٹ گیا۔ چچا نے مجھے سہارا دیا ہوا تھا۔ میں بالکل ٹھیک تھا لیکن ایک کمزوری سی تھی جو مجھے نڈھال کیے ہوئے تھی۔ میں سونا چاہتا تھا مگر چچا مجسم سوال بنے میرے سامنے موجود تھے۔ جہانی آپا اور شنو آپا بھی میرے سرہانے پہنچ چکی تھیں اور پیار سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"بھائی۔ تم ٹھیک ہو ناں!" جہانی آپا کی کانپتی آواز نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ میری بدحالی نے انھیں ہولا دیا ہوگا۔ میں مسکرایا۔

"جہانی آپا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نے چچا کو دیکھا جو اب جھکے ہوئے میرے دونوں ہاتھ تھامے میرے چہرے پر کچھ تلاش کر رہے تھے۔ "میں ٹھیک ہوں چچا! ڈر گیا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو۔ تو مجھے لگا جیسے میری ٹانگ پر بچھو رینگ رہا ہے۔ بس ایک دم خوف سے اٹھا۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ اب تو لوگوں سے جھوٹ بولنا بلکہ مسلسل جھوٹ بولنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

"اب تو تم ٹھیک ہو ناں!" انھوں نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی ہیں جنھوں نے امروہہ میں مجھے گنگوا سے مروانے کی کوشش کی تھی۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد جو نفرت میرے دل میں بھر چکی تھی وہ اب ختم ہوتی جا رہی تھی اور میں حیرت و تعجب سے یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ شخص جس نے مجھے مروانے کی کوشش کی تھی وہ کیا واقعی یہی شخص تھا جس کی آنکھوں میں اس وقت بے پناہ وحشت تھی۔ جس کی بے چین نگاہیں میرے جسم پر تکلیف کے اسباب تلاش کر رہی تھیں۔

"میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں چائے پی لو۔ تم نے تو ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ اتنے سویرے کہاں چلے گئے تھے تم!" وہ اپنی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولے۔

"نیند نہیں آرہی تھی چچا! اماں اور تایا کی فکر نے مجھے بہت بے چین کر دیا تھا۔ میں نے سوچا چلو فجر کی اذان ہونے والی ہے۔ مسجد جا کر کچھ نوافل پڑھ لوں گا پھر فجر کی نماز کے بعد لوٹ آؤں گا۔ یہاں پہنچا تو۔۔۔۔"

"تم بے پروا بہت ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ تمھاری یوں پراسرار گمشدگی گھر والوں کو پریشان کر دے گی۔ جہانی غسل خانے کے لیے اٹھی تو اس نے تمھیں نہ دیکھ کر مجھے جگا دیا تھا، تبھی سے میں پریشان تھا۔ فجر کے وقت مسجد گیا تو تم وہاں بھی نہیں تھے۔" چچا نے کہا۔

"جی چچا! میں سبز گنبد والی مسجد میں گیا تھا۔"

"ہائے۔ کیا ضرورت تھی اتنی دور جانے کی؟" وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر انھوں نے جہانی آپا سے کہا کہ وہ مجھے ناشتا کرائیں۔ جہانی آپا سر ہلا کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ شاید ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ میں کوثر کو تلاش کر رہا تھا مگر وہ باہر نہیں تھی۔ شاید اپنے کمرے میں تھی۔ تائی بھی شاید نماز پڑھ کر اٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آئیں، اور کچھ لمحوں کے بعد انھوں نے ایک زور کی پھونک میرے بدن پر ماری اور پاس ہی آبیٹھیں۔

"اے بوا! اپنی اماں کو آلینے دو، یہ حرکتیں نہ کرو۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے اے بھیا تمھیں کچھ ہوگیا تو تمھاری اماں تو میرا ٹینٹوا ہی دبا دیں گی۔"

"ارے نہیں تائی! مجھے ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ ویسے اماں نے بہت دیر کر دی۔ انھیں گئے آج کئی روز ہوگئے۔ اب تک تو انھیں آجانا چاہیے تھا۔" میں نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا۔

"ہاں آتو جانا چاہیے تھا۔" انھوں نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "اے میں تو سوچ رہی ہوں کہ انھیں پتا چلے گا کہ کوثر ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہوگئی تو۔ تو کتنا خوش ہوں گے اور تمھاری اماں تو نہال ہی ہو جائیں گی۔ رب کی شان ہے وقار الحسن! ورنہ بھلا ہم نے کون سی کسر چھوڑی تھی؟"

"ہاں تائی! میں بھی اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ لوگ فوراً آجائیں۔ تایا سے منہ بھر کر مٹھائی کھاؤں گا۔" میں ان کی خوشی میں شریک ہوگیا حالانکہ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں اس کڑے اور مجسمے کو دیکھنا اور کسی محفوظ جگہ پر رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دونوں چیزیں اماں کو دے دی تھیں، مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ انھوں نے وہ چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ پھر کوثر سے مل کر اسے سنہرے بابا کا پیغام بھی دینا تھا۔ جو کچھ سنہرے بابا نے مجھے بتایا تھا وہ سن کر تو خود میرا دل بھی دہل گیا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ سنہرے بابا کی خصوصی دعاؤں سے ٹھیک ہوئی ہے۔ اسے یہ شیطانی چکر نہیں چلانے چاہییں۔ پھر میں اس پڑیا کو سنہرے بابا کے پاس بھیجنے پر بھی حیران تھا۔ پتا نہیں کیوں کوثر نے اس بچھو کو سنہرے بابا کے پاس بھیجا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ ساکت و جامد بچھو جو اتنی دیر تک میری جیب میں بے حس و حرکت رہا اچانک زندہ کیسے ہوگیا تھا۔

"تو مٹھائی کیسی۔ ارے میں تو دیگیں چڑھاؤں گی دیگیں۔ بس آلینے دو۔ اے پروردگار آج یہ لوگ آجائیں۔" آخری جملہ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر اور دوپٹا پھیلا کر کہا تھا۔ ان کی یہ دعا اس قدر تیزی سے قبول ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ ابھی انھوں نے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے ہی تھے کہ اچانک دروازے پر دستک کی آواز ہوئی۔ شانو آپا جو صحن میں جھاڑو دے رہی تھیں، دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ دروازہ کھلا تو میں اماں اور تایا کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔ کتنے پریشان تھے ہم سب ان لوگوں کے لیے۔ جہانی آپا، شنو آپا اور تائی بھی دروازے کی طرف لپکیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور پلنگ سے اتر کر اماں کی طرف بڑھ گیا۔ اماں نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی اور بولیں۔ "جاؤ! تانگے سے سامان اتروالو۔"

میں باہر کی طرف بڑھ گیا۔ باہر تانگے پر کافی سامان لدا ہوا تھا۔ میں نے باہر نکلتے نکلتے اماں کی آنکھوں میں عجیب سی بات محسوس کی تھی۔ ان کی نگاہوں میں ایک چبھن سی تھی جس۔۔ نہ معلوم کیوں مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں [illegible] کے ساتھ مل کر سامان اتروایا۔ اتنی دیر میں چچا بھی میری مدد کو آگئے۔ سامان لے کر ہم اندر داخل ہوئے تو گھر میں گویا خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ تائی اماں نے کوثر کے بارے میں بتانے میں لمحہ بھر کی دیر بھی نہ لگائی۔ اماں اور تایا، باقی سب لوگوں کے ساتھ کوثر کے کمرے میں تھے۔ اس کے دروازے پر کھڑی جہانی آپا نے مجھے وہیں بلا لیا۔ میں اور چچا اندر داخل ہوئے تو تایا کو [illegible]

سے لپٹے رو رہے تھے۔ گھر کے سارے ہی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ خود کوثر بھی بہت رو رہی تھی۔ میں بھی خود پر قابو نہ پا سکا اور مارے خوشی کے رو پڑا۔ اس بار اماں نے میری طرف دیکھا تو ان کی نگاہوں میں سوائے خوشی کے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ کیفیت بڑی مشکل سے ختم ہوئی۔ جب تائی اماں نے اماں اور تایا سے کہا کہ آپ لوگ نہا لیں تاکہ کھانا نکال لیا جائے۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ کوثر تنہا رہ گئی اور میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنہرے بابا کا پیغام سنایا تو اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ وہ کچھ دیر کو گم صم ہو گئی مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور بولی۔ "خدانخواستہ میرا مطلب سنہرے بابا کو چیلنج کرنا نہیں تھا۔ میں تو انھیں صرف اتنا بتا دینا چاہتی تھی کہ میں سادھو کے اوچھے ہتھکنڈوں کو روکنے کی طاقت حاصل کر چکی ہوں۔ بچھو میں نے اس لیے بھیجا تھا کہ سنہرے بابا چاہیں تو اسے اپنے قابو میں کر سکتے ہیں۔ یہ بچھو اس سادھو کی آدھی قوت کو ختم کر سکتا ہے۔ اس نے اسے قابو میں کر کے اپنی شکتی کو جو رخ دیا ہے وہ دوسروں کے لیے تباہ کن ہے۔"

"مگر سنہرے بابا سخت ناراض تھے۔" میں نے اسے بتایا۔

"انھوں نے بچھو کا کیا کیا۔" اس نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ اسے سنہرے بابا نے ختم کر دیا۔ وہ یہ بات سن کر خوش ہو گئی۔

"یہ بہت اچھا ہوا۔ اب اس کی طاقت آدھی رہ جائے گی۔ تم خیریت سے پہنچ گئے تھے ناں۔! وقت پر۔"

تب میں نے اسے راستے میں پیش آنے والے خوفناک واقعات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں شرف الدین کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ جو کچھ سویرے سڑک پر موجود قبیلے والوں نے بتایا اس نے مجھے اس کی طرف سے فکرمند کر دیا ہے اور اب اماں اور تایا کے ساتھ اسے نہ دیکھ کر تو میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تو اماں سے شرف الدین کے بارے میں پوچھ سکتا تھا مگر شاید میرا خوف مجھے یہ پوچھنے سے باز رکھے ہوئے تھا۔

"تم فکر نہ کرو وقارالحسن! اگر شرف الدین کی زندگی کے لمحے ختم ہو چکے تھے تو وہی ہو گا اور اگر۔۔۔" کوثر کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا جس نے مجھے بھنا کر رکھ دیا۔

"یعنی تمھارے لیے یہ واقعہ اتنا اہم ہی نہیں کہ تم فکر کرو۔ تم جانتی ہو شرف الدین میرے لیے کیا ہے؟"

"بات یہ نہیں وقارالحسن! بات یہ ہے کہ میرے پاس ایسی کوئی شکتی یا کوئی جادو نہیں کہ میں اس واقعے کی سچائی کے بارے میں جان سکوں۔"

"نہیں چاہیے مجھے تمھارا جادو یا شکتی۔ سنہرے بابا ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ راستہ تمھیں اس جگہ لے جائے گا جس جگہ سادھو پہنچ چکا ہے۔" میں پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اماں نہا کر نکل آئی تھیں اور جہانی آپا وغیرہ دسترخوان لگا چکی تھیں۔

"اماں!" میں تیزی سے ان کے قریب پہنچ گیا۔ "اماں وہاں۔ سب خیریت تھی ناں!"

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا پھر دھیرے سے بولیں۔ "ہاں۔ خیریت تھی۔ تم۔ تم تو ٹھیک ہو ناں؟" ان کی نگاہوں کی وہ چبھن ایک بار پھر مجھے بے چین کر گئی۔

"جی اماں! آپ کھانا کھا لیں۔ کچھ آرام کر لیں پھر میں آپ سے اور تایا سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتایئے کہ شرف الدین کہاں ہے؟"

"وہ۔ اسے اس کے ابا نے کسی کام سے ڈیرہ دون بھیجا ہے۔ ایک دو روز میں وہ یہاں آ جائے گا۔ وہ تمھاری طرف سے بہت فکرمند تھا اور ڈیرہ دون جانے کو بھی تیار نہ تھا۔"

اماں نے یہ بات بتا کر مجھے اور بے چین کر دیا۔ اب میرے پاس ایسی کوئی دلیل نہ تھی جس سے میں خود کو مطمئن کر سکتا۔ رات بلکہ علی الصبح سڑک پر زخمی ہو کر مرنے والا شرف الدین ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ مجھے اس کا انتظار کرنا تھا یا پھر اس زخمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اسپتال جانا چاہیے تھا تاکہ اسے شناخت کر سکوں۔ بے چینی حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے سوچ لیا کہ میں اسپتال جا کر اپنا اطمینان کروں گا۔ وہاں جانے کے لیے بس آج ہی کا دن تھا۔ آج کے دن مجھے بہت سے کام نمٹانا تھے۔ سب سے پہلے تو اماں اور تایا کو حالات بتا کر سنہرے بابا کے حجرے میں جانے کی اجازت لینا تھی۔ اب لمحے لمحے کے بارے میں انھیں سب کچھ بتانا اشد ضروری ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جو وظائف سنہرے بابا نے مجھے بتائیں ہیں وہ کتنے روز میں ختم ہوں گے۔ بابا نے صرف اتنا کہا تھا کہ نقیر بابا مجھے بتا دیں گے کہ ان وظائف کو کب تک کرنا ہے اور کب اس سے فراغت ہو گی۔ پھر بابا میرے لیے ایک کتاب بھی رکھ گئے تھے جسے پڑھ کر بھی مجھے علم ہو سکتا تھا۔ باقی میری وظائف کرنے کی رفتار پر منحصر تھا۔ گویا اماں اور تایا کو اب حالات سے آگاہ ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ جب تک میں انھیں حالات کی سنگینی کے بارے میں نہیں بتاتا وہ مجھے اجازت بھی نہیں دیتے۔

"کیا سوچنے لگے تم؟" اماں نے اپنے گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں۔ یہ بتایئے وہاں شکنتلا یا۔۔۔"

"نہیں۔ کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جس سے ہمیں کوئی نقصان پہنچتا مگر وقارالحسن! کل ہم تمام رات شکنتلا کی کرب انگیز سسکیاں سنتے رہے۔ وہ بہت تکلیف میں تھی۔ تمام رات میرا دل بیٹھتا رہا۔ پل بھر کو بھی نیند نہیں آئی۔ جی چاہتا تھا کہ جا کر اسے گلے لگا لوں۔ میں نے تسلی دینے کے لیے اسے تمام حویلی میں تلاش کیا مگر۔ وہ مجھے کہیں نہ ملی مگر اس کی سسکیاں ہر جگہ میرے تعاقب میں رہیں۔ بڑے برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر میں نے اسے بتا دیا کہ وقارالحسن تمھاری پریشانی اور تکلیف کو دور کرنے کی کوشش میں ہے۔ اسے بدعہد نہ سمجھ لینا۔ اور میں نے یہ بھی کہا کہ جو تم سے بدعہدی نہیں کر رہا اسے پریشان کیوں کر رہی ہو۔ خورشید چاچا کی موت یا لڈن کی موت نے تمھیں کون سا سکھ دیا ہے کہ تم نے انھیں یوں بے قصور مار دیا۔ بٹن نے تمھارا کیا بگاڑا تھا کہ تم نے بھری جوانی میں اسے موت سے ہمکنار کر دیا۔ وقارالحسن تو تمھاری تکلیف کی خاطر مشکلات کا سامنا کر رہا ہے اور تم اسے ادھ موا کیے دے رہی ہو۔"

اماں بتا رہی تھیں اور میں منہ پھاڑے سن رہا تھا۔ انھوں نے سادھو سے متعلق تمام واقعات کو شکنتلا کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا، میں نے انھیں سادھو کے بارے میں کچھ بتایا ہی کب تھا۔ میں تڑپ کر بول اٹھا۔ "پھر اماں!۔۔ اس نے کچھ کہا؟"

"نہیں۔" اماں نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "اس نے کچھ بھی نہیں کہا مگر میں نے اس کی سسکیوں میں شدت محسوس کی، یوں جیسے دھیمے دھیمے روتے ہوئے وہ اچانک بلک بلک کر رو پڑی ہو۔"

اس سے پہلے کہ میں اماں کو کوئی جواب دیتا تایا کوثر کو لیے دسترخوان پر چلے آئے۔ وہ تو کوثر کے سوا سب کچھ بھول چکے تھے۔ تایا، تائی اور کوثر کے چہروں پر ہزاروں گلاب کھل رہے تھے۔ ان لوگوں کے آتے ہی میں چپ ہو گیا۔ اب اماں بھی کوثر کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ چچا اور چچی بھی نیچے آ چکے تھے۔ اس وقت ان دونوں کا موڈ کافی بہتر تھا۔ شاید انھیں بھی احساس تھا کہ یہ وقت کسی بدمزگی کا نہیں ہے۔ سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ تایا نے مجھ سے تفصیل پوچھی کہ آخر کوثر کس طرح ٹھیک ہوئی اور کیا ہوا تھا۔ تب میں نے انھیں تفصیل سے بتایا اور آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ آج میں سنہرے بابا سے ملا تھا انھوں نے بتایا کہ انھوں نے کوثر کے لیے خصوصی دعائیں کی تھیں۔ فرطِ جذبات سے تایا کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار کوثر کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ آج ہی پیدا ہوئی ہو، بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ اب تک اس کے وجود کا شمار زندوں میں تھا ہی کب؟ تائی نے اسی وقت اعلان کر دیا کہ اگلے جمعے کو وہ دیگیں چڑھوائیں گی۔ تمام رشتے داروں اور جاننے والوں کو بلائیں گی اور دو دیگیں مسجد میں بھی بھیجیں گی۔ تایا نے فوراً ہامی بھر لی۔ جمعے کو ظہر کے بعد قرآن خوانی کا پروگرام طے ہو گیا۔ دو روز بعد جمعہ تھا۔ سبھی خوش تھے۔ کھانا ہنسی خوشی کھایا گیا۔ کھانے کے بعد میں نے اماں کو کچھ دیر آرام کا مشورہ دیا اور ان سے پوچھا کہ میرا لایا ہوا کڑا اور مجسمہ کہاں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ان کے بڑے بکس میں رکھا ہے۔ یہ بکس ان کے کمرے میں دروازے پر بنی دو چھتی میں رکھا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ رات کو اسے نکال لوں گا۔ مجھے اگلے روز علی الصبح سنہرے بابا کے حجرے میں پہنچنا تھا۔ اماں نے اصرار کیا کہ میں جو بات کرنا چاہتا تھا پہلے وہ کر لوں مگر کیونکہ تایا کوثر کے پاس تھے اور میں چاہتا تھا کہ ساری بات تایا کی موجودگی میں ہو تاکہ اگر اماں میرے فیصلے سے انحراف کریں تو وہ اپنی سمجھ بوجھ استعمال کرتے ہوئے انھیں سمجھا سکیں۔ وہ میری بات کو اماں سے بہتر سمجھ سکتے تھے۔ پھر ان میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو اماں کو بہت زیادہ جذباتی اور پریشان کر سکتی تھیں اس لیے ان کی موجودگی ضروری تھی۔ اماں یہ سن کر چپ ہو گئیں۔ میں اس دوران میں اسپتال جا کر، اس آدمی کو دیکھ کر اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اماں سونے کے لیے لیٹ گئیں تو میں نے ان سے دو گھنٹے کی اجازت لی اور پھر اسی سڑک کی طرف چل پڑا۔

وہاں کے لوگوں یعنی ٹھیلے والوں اور دکان داروں نے بتایا کہ اس کچلے جانے والے شخص کو سرکاری اسپتال کی ایمبولینس لے گئی تھی۔ میں سیدھا سرکاری اسپتال پہنچا۔ وہاں میں نے جھوٹ بولا کہ میرا چھوٹا بھائی جو رات کسی رشتے دار کے پاس گیا تھا واپس نہیں لوٹا اور وہاں بھی نہیں ہے لہٰذا میں لاش کو شناخت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے لاش تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ مردہ خانے میں قدم رکھتے ہی مجھے اسپتال کا وہ سین یاد آگیا جب میں نے ہوش میں آکر اپنے برابر رحیمو کو زندہ دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں اور چہرے پر سفید کیڑے رینگ رہے تھے۔ میری ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگیں۔

"اے ہو بھیا' ہیاں آؤ" مردہ خانے کے انچارج نے مجھے ٹھیٹ پوربی زبان میں آواز دی تو مجھے احساس ہوا کہ میں بے اختیار ایک جانب چل پڑا تھا۔ یہاں ایک لکڑی کے تختے پر کوئی شخص پڑا تھا اس کے بدن پر پڑی چادر خون میں لت پت تھی۔ میرے بدن میں خوف سے جھرجھری سی دوڑ گئی۔ پاؤں من من بھر کے ہو گئے اور میں پلٹ کر مردہ خانے کے انچارج کی طرف بڑھ گیا۔ یہ کمرا بے حد سرد تھا اور بدن میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں سی اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے آگے آگے جانے والا شخص پوربی زبان کا گیت گنگنا رہا تھا۔ مجھے اس کی ہمت اور رویے پر حیرت ہوئی۔ اتنے بہت سے مُردوں کے درمیان وہ کس اطمینان اور بے خوفی سے گنگنا رہا تھا۔ یہاں دیوار میں خانے سے بنے تھے۔ وہ اچانک ایک خانے کے پاس رک گیا۔ اس خانے پر لوہے کا پٹ سا بنا ہوا تھا۔ اس نے اس لوہے کے پٹ پر بنے کنڈے کو کھینچا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے اندر ایک دراز ہے۔ ایک تختہ سا ایک دم باہر آگیا تھا اور میں اچھل کر پیچھے ہو گیا تھا ورنہ وہ تختہ میرے سینے سے ٹکرا جاتا۔

"دیکھو لو بھیا۔ بھلی بھانتی دیکھ لو۔ معاملہ لاس کا ہے' جو اپنا لگے تو دعویٰ کرنا ورنہ بے چارے حک دار اسے کبر میں بھی نہ اتار سکیں گے۔" مردہ خانے کے انچارج نے پوربی ملی اردو میں کہا اور ذرا سا ٹیڑھا ہو کر اپنی پنڈلی کھجانے لگا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ میں آگے بڑھ کر لاش کے چہرے پر پڑا کپڑا اٹھاتا۔ میں جھجک رہا تھا کہ انچارج نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے کپڑا لاش کے چہرے سے ہٹا دیا۔ نہ معلوم کیا ہوا' میں لمحہ بھر کو لڑکھڑا کر رہ گیا۔ آنکھوں میں دھند سی بھر گئی۔ کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ یوں لگا جیسے سامنے تختے پر لیٹا شخص رحیمو ہو۔ پتا نہیں یہ خیال کیسے اور کیوں آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں داخل ہوتے ہی مجھے رحیمو کا خیال آگیا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے ذہن سے رحیمو کے خیال کو جھٹکا اور غور سے اس شخص کی طرف دیکھا جو کل تک بلکہ آج علی الصبح تک سانس لے رہا تھا اور اب چند گھنٹوں بعد ہی اس تختے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بدن پر موجود کپڑے خون کی وجہ سے بدرنگ ہو چکے تھے اور اس کے بدن پر چپکے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ہیبت ناک حد تک مسخ ہو چکا تھا۔ کچلا تو نہیں گیا تھا مگر سر پر لگنے والی چوٹ سے اس کا ماتھا پھٹ گیا تھا اور وہاں سے رسنے والا خون آنکھوں کے گڑھوں میں بھرا ہوا تھا۔ آدھا چہرہ کسی شدید ضرب کی وجہ سے نیلا ہو چکا تھا۔ پورا چہرہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ ناک کے نتھنے آدھے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اگر میں نے اس کے چہرے کو چھو لیا تو وہ پھٹ جائے گا۔ میں باوجود کوشش کے اسے کسی طرح نہ پہچان سکا۔

"بابو کپڑے نام کی چیز تو اس کے بدن پر سلامت ہے نہ پہچان کے قابل' البتہ یہ کچھ چیزیں ہیں۔ ایک انگوٹھی۔ دائیں پیر میں انگوٹھے پر یہ کالی ڈوری بندھی تھی اور یہ۔ کاغذ تھا اس کی جیب میں۔ کیا تھا' یہ تو پتا ہی نہیں چل رہا۔ سب خون میں لت پت ہے۔" مردہ خانے کا انچارج اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ میری نگاہیں چاندی کی اس انگوٹھی پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ انگوٹھی میری دیکھی بھالی لگ رہی تھی مگر یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے میں نے کہاں اور کس کی انگلی میں دیکھا تھا۔ میرے دماغ کی نسیں پھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ایک انجانے سے خوف نے مجھے منجمد کر دیا۔ میں نے بے اختیار اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"چلو بھیا! باہر نکلو۔ تم تو بہوت کمجور لگت ہو' چوہے ایسا دل ہے۔" مردہ خانے کا انچارج میری حالت دیکھ کر طنزیہ انداز میں بولا۔ "لگت ہے تنک او پہچان میں نہیں آیا۔"

"نہیں۔ اسے میں نہیں جانتا۔" نہ معلوم کون تھا میرے اندر جس نے بے ساختہ کہہ ڈالا۔

"تو تو پھر کاہے کو کھالی پیلی ٹیم کالا کر رہے ہو۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

میں لرزتے قدموں سے کمرے سے باہر آگیا۔ باہر کی تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے اب سے پہلے میں کسی گہرے کنویں میں تھا۔ یا شاید قبر میں اتار دیا گیا تھا۔

مردہ خانے کا انچارج اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی طرف دھیان دیے بغیر میں نے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ جی ہاں! میری رفتار دوڑنے کی حد تک تیز تھی۔ میں وہاں ایک پل بھی نہیں رکنا چاہتا تھا۔ وہ انگوٹھی جیسے میرے دماغ میں اڑ کر رہ گئی تھی مگر وہ شرف الدین کی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کبھی کوئی انگوٹھی نہیں پہنی پھر بھی میں یہ بات یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسری طرف مجھے یہ فکر بھی تھی کہ اگر یہ شرف الدین نہیں ہے تو کون ہے اور یہ انگوٹھی مجھے جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے۔ رحیمو کو تو میں نے نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا کہ ایسی کوئی انگوٹھی بھی یاد رکھتا پھر رحیمو کا یوں سڑک پر کسی گاڑی سے کچلا جانا بھی ناقابل یقین تھا۔ اسے تو میں نے مارا تھا اور کمرے میں دفنا دیا تھا۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ یہ ساری فکریں ایک طرف تھیں مگر مجھے سب سے زیادہ پریشانی شرف الدین کی طرف سے تھی۔ میرے دماغ میں کہیں دور یہ بات سر ابھار رہی تھی کہ رات سڑک پر مجھے نظر آنے اور مر جانے والا شرف الدین بھی تو ہو سکتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس کے بارے میں کس طرح معلوم کروں۔ اگر وہ اماں اور تایا کے ساتھ آجاتا تو میری کتنی بڑی مشکل حل ہو چکی ہوتی۔

میں انھی پریشان کن سوچوں میں گھرا گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ سرکاری اسپتال ہمارے گھر سے بہت زیادہ دور تھا۔ میں نے بس پکڑی اور ایک سیٹ پر کھڑکی کی طرف ہو کر' دبک کر بیٹھ گیا۔ میں بہ ظاہر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ اچانک ایک نسوانی ہنسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے بیٹھی کوئی لڑکی ہنس رہی تھی اور مجھے یوں لگا جیسے یہ ہنسی میں سن چکا ہوں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کا چہرہ دیکھا مگر وہ لڑکی میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔ اس کی ہنسی کی آواز البتہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور میں خود کو بے حد بے کل اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ جب بھی ہنستی میرے اندر بھنور سے پڑنے لگتے۔ بے چینی کی ایک لہر سی اٹھتی اور اس کی ہنسی دیر تک ذہن میں گونجتی رہتی۔ پھر ایک اسٹاپ پر بس رک گئی۔ عین اسی لمحے بس کے برابر سے ایک تانگا گزرا۔ پکی سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کچھ اس طرح سے گونجی جیسے ان آوازوں کے سوا کوئی دوسری آواز نہ ہو اور جب عین اسی لمحے وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی تو میں اچھل گیا۔ علی الصبح والا سین میری نگاہوں میں جم گیا۔ یہی۔ ایسی ہی ہنسی' اور بالکل اسی طرح گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ میرے تعاقب میں آرہی تھی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میں بس میں بیٹھا تھا۔ میرے چاروں طرف بیٹھے لوگ باتوں میں معروف تھے۔ وہ لڑکی اب جھکی ہوئی دوسری لڑکی سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا اور بے اختیار بس سے اتر گیا۔ میری ذہنی حالت کافی خراب تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں سارا دخل اور ساری شعبدہ بازی میری نفسیات کی تھی۔ جو کچھ میں بھگت چکا تھا وہ میرے ذہن میں ویسا کا ویسا موجود تھا اور بار بار مجھے پریشان کر رہا تھا۔

بس اسٹاپ پر اتر کر میں نے چاروں جانب نگاہ کی۔ اب گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا حالانکہ دھوپ بہت تیز تھی مگر مجھے کچھ احساس نہ تھا۔ میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ اماں تایا کو ساری بات بتا کر انھیں قائل بھی کرنا تھا' ویسے میرا خیال تھا کہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر اماں اور تایا مجھے سنہرے بابا کے حجرے میں جانے سے نہیں روکیں گے اور پھر یہ وظائف اتنے لمبے بھی نہ تھے کہ میرا دنیا سے رابطہ ہی کٹ جاتا۔ کچھ ہی عرصے بعد میں فارغ ہو جاتا اور یقیناً کسی نہ کسی نقصان سے بچ جاتا۔

شاید پندرہ منٹ بعد ہی میں گھر پہنچ گیا۔ اماں شاید بہت تھکی ہوئی تھیں۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ تایا کی تو خیر نیند ہی اڑ چکی تھی۔ وہ اور تائی اب بھی کوثر کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ تینوں کے چہروں پر گلاب کھلے تھے۔ جہانی آپا اور شنو آپا امروہہ سے لایا ہوا سامان دیکھ رہی تھیں اور اسے سنبھال کر رکھ رہی تھیں۔

اماں نے سامان کھولنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کا ارادہ جلد ہی اپنے نئے مکان میں منتقل ہونے کا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان لوگوں کو کیسے روکوں۔ ویسے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ساری باتیں اماں اور تایا کو بتانے کے باوجود رحیمو کو مارنے اور اسے اسی مکان کے کمرے میں دفن کر دینے والا واقعہ نہیں بتاؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا بتا دینے کی صورت میں کتنی پریشانیاں کھڑی ہو جائیں گی۔

نہیں جا کر برآمدے میں پڑے پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں بے پناہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نے جہانی آپا سے چائے کے لیے کہا اور خود پھر سوچوں میں غرق ہو گیا۔ کوثر تایا اور تائی سے باتیں کر رہی تھی ورنہ میں اپنی پریشانی اسے بتا کر ہی کچھ ہلکا ہو جاتا۔ جہانی آپا چائے لے کر آئیں تو تایا بھی کوثر کے کمرے سے باہر آ گئے۔

"بھئی چائے کی خوشبو مجھے سارے عطروں سے زیادہ مرغوب ہے۔" انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور جہانی آپا ہنستی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ "اور میاں وقارالحسن! بڑی بے چینی ہے یہاں کے حالات جاننے کی' بھئی تمھارے چچا چچی کی وجہ سے زندگی میں جو رنگینی ہے اس کا احساس تو ان لوگوں سے دور ہو کر ہوا۔ تم لوگوں کے عیش رہے ہوں گے۔ نہ میں تھا نہ تمھاری اماں' خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا ہوگا انھیں تو۔" تایا نے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر خالی حقے کو حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تایا!" میں ہنس پڑا۔ "ہم اس نعمت سے محروم رہے ہیں۔ ایک دو روز تو خاصی خاموشی رہی۔ پھر کوثر کی خوشی نے سبھی کے موڈ کو تبدیل کر دیا۔ ویسے تایا! ایک بات کا مجھے شدت سے احساس ہوا کہ چچا بذات خود بڑے سیدھے اور معصوم آدمی ہیں۔"

"ہاں میاں وہ جلیبی کی طرح سیدھے اور لومڑی کی طرح معصوم ہیں۔"

"نہیں تایا یہاں جو حالات رہے ان میں' میں نے انھیں بہت غور سے اسٹڈی کیا ہے۔ یہ سارا مسئلہ پیدا کرنے والی چچی ہیں۔ وہ انھیں اپنے لہجے سے کنٹرول کرتی ہیں ورنہ وہ جس طرح میرے چینخنے پر پریشان ہوئے اور جس طرح کوثر کی خوشی پر نہال ہوئے ان سے ان کی محبت کا اندازہ ہوتا تھا۔"

"میاں ابھی بچے ہو۔ آدمی کی نفسیات بڑی ٹیڑھی چیز ہے اور پھر کسی ٹیڑھے آدمی کی نفسیات کیسی ہوگی ذرا سوچو تو۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں ان کی بات کا جواب دیتا' جہانی آپا چائے لے آئیں۔ تایا نے تائی کو آواز دے کر حقہ تازہ کرنے کا آرڈر دیا۔ وہ تائی جو پہلے حقے کے نام سے تلملا جاتی تھیں لپک کر آئیں اور اس کی چلم اتار کر لے گئیں۔

"اللہ نے بڑا کرم کیا ہے وقارالحسن! ورنہ بیٹی خود کیا کم بوجھ ہوتی ہے تاکہ ایک معذور بیٹی۔ اور سنو میں نے اس سے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دینا ہے۔ اب تو تمھاری تائی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم کوثر کو وہاں لے کر جائیں گے۔ آج۔۔ آج میری بیٹی بھی اس قابل ہو گئی ہے کہ دنیا دیکھ سکے ورنہ اس کی دنیا تو اس کمرے کی تاریک فضا سے شروع ہو کر اس برآمدے پر ختم ہو جاتی تھی۔ ابھی وہ کہہ رہی تھی کہ میں اسے خوب گھومنے پھرنے کی آزادی دوں۔ میں نے ہامی بھر لی ہے۔ اب تم اپنی بہنوں اور کوثر کو خوب گھماؤ پھراؤ۔ اب تو تمھاری اماں کی پابندیاں بھی دھری رہ جائیں گی۔ انھوں نے اچھی بھلی بچیوں کو چوچو کا مربہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ تم ایسا کرو آج ہی ان لڑکیوں کو گھما لاؤ۔" تایا بولے جا رہے تھے اور میں دل میں سخت شرمندہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں اماں کے جاگ جانے کا منتظر تھا۔

"ارے میاں وہ شرف الدین کے باوا تو اچھی خاصی دیکھنے اور سننے کی چیز ہیں۔" تایا کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ اماں نے میرے رشتے کے لیے وہاں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"کیوں تایا؟" اس بار میرا دل شگفتہ کے لیے دھڑکا تھا۔ "آپ لوگ گئے تھے کیا؟"

"ہاں میاں گئے تھے اور باقاعدہ لڈو لے کر گئے تھے۔ سارا وقت وہ تو بھنائے پھرتے رہے' البتہ شرف الدین اور اس کی اماں خوش تھیں۔ تمھارا یہ دوست خاصا معقول آدمی ہے۔ بڑی مدلل باتیں کرتا ہے۔ جب انھوں نے تمھارا نام سنتے ہی دادے کا نام لے کر قصیدے کہنے شروع کیے تب وہ آڑے آ گیا اور ثابت کرنے لگا کہ مرزا صولت بیگ کے افعال سے وقارالحسن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی بحث میں وہ اپنے دادے کا نام بھی گھسیٹ لایا۔ پہلی بار پتا چلا کہ ان کے دادے دلی کے بدمعاش تھے۔ امروہہ سے باپ نے نکال دیا تھا اس لیے دلی جا بسے اور وہاں لن ترانیاں شروع کر دیں۔ جلد ہی وہاں کے بدمعاش مشہور ہو گئے۔ اولاد یعنی شرف الدین کے باوا اور ان کی بیٹی امروہہ ہی میں رہی۔ مرتے وقت انھیں امروہہ لایا گیا تھا اور چپ چپاتے دفنا دیا گیا۔ بھئی بڑا جی دار لڑکا ہے یوں اپنے دادا کے کرتوت کھول دینا اور وہ بھی رشتے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے۔ خاصا دل گردے کا کام ہے۔ وہ تو کہو کہ تمھاری اماں کے کانوں تک بھنک نہیں پہنچی ورنہ وہ تو ٹکا سا جواب دے آتیں۔"

تایا کی صرف ایک بات نے میرا دل ہلکا کر دیا تھا کہ شرف الدین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ خوش ہے حالانکہ مجھے سارا خطرہ اسی کی طرف سے تھا۔ خیال یہی تھا کہ میرے حالات سے واقفیت اسے اس معاملے میں انتہائی سنجیدہ بنا دے گی اور یہی سنجیدگی اس رشتے میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔ وہ کبھی بھی ایسے کسی شخص کو اپنی چہیتی بہن نہیں سونپے گا جس کی زندگی ہر لمحہ داؤ پر لگی ہوئی ہو۔ مجھے یہ بات سن کر بہت ڈھارس ہوئی کہ شگفتہ کی اماں بھی اس رشتے پر تیار ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ شرف الدین کسی نہ کسی طور اپنے ابا کو بھی راضی کر لے گا۔

"پھر۔" میں نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"پھر کیا؟" تایا نے حقے کی چلم کو کریدتے ہوئے کہا۔ "لڈو چھوڑ آئے۔ رات تک میں منتظر رہا کہ کب لڈوؤں کا ٹوکرا دروازے پر آ کر دھم سے گرے مگر۔۔ میرا خیال ہے کہ شرف الدین سمجھ دار آدمی ہے۔ کسی نہ کسی طرح بات بنا لے گا۔ ویسے میاں میں نے اور تمھاری اماں نے یہی طے کیا ہے کہ جواب ملتے ہی ہم تمھاری شادی میں دیر نہیں کریں گے۔ ماشاءاللہ بٹیا بہت اچھی' خوش اخلاق اور سلیقہ شعار ہے۔ تمھاری اماں کو پسند آ گئی تو سمجھو بڑی خوبیاں ہوں گی شگفتہ میں ورنہ وہ تو۔۔ اکلوتے بیٹے کے لیے چراغ

"میں اماں اور آپ کے' دونوں کے سامنے سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ گزشتہ حالات کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو آپ کے اور اماں کے علم میں نہیں ہیں۔ میں نے نہیں چاہا کہ خواہ مخواہ آپ لوگوں کو پریشان کروں لیکن میرے پل پل کے حالات سے شرف الدین اور خورشید چاچا کو پوری آگاہی تھی۔ خورشید چاچا دنیا میں نہیں رہے اور۔۔ اور شاید شرف الدین۔۔" میں آگے کچھ کہتے کہتے جھجک گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میرے آخری جملے کا مطلب تایا سمجھے نہیں ورنہ جانے کیا سوچتے۔ میں تو فیصلہ کر چکا تھا کہ شروع سے لے کر اب تک کے مکمل حالات بتا دوں گا۔ ظاہر ہے کہ مجھے شرف الدین کے بارے میں سب کچھ بتانا تھا مگر ابھی نہیں۔ اماں کے سامنے۔

"تو یہاں! کیا قباحت ہے؟" ان کے انداز میں بے پناہ بے چینی تھی۔ آنکھوں میں گھبراہٹ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جہاندیدہ آدمی تھے شاید اتنا ہی سن کر آئندہ کے بارے میں جان چکے تھے۔

"اماں جاگ جائیں تایا تب۔۔ خود میرے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"جہانی! دیکھو تو تمھاری اماں اٹھ گئیں؟" تایا نے میری بات پوری ہوتے ہی جہانی آپا کو آواز دے کر کہا۔

اماں اٹھ چکی تھیں اور عصر کی نماز میں مصروف تھیں۔ میں اور تایا بھی نماز کے لیے اٹھ گئے۔ تائی سارے گھر میں چہکتی پھر رہی تھیں۔ چچا چچی کا منہ پھر پھول چکا تھا جس سے مجھے خوب اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ لوگ بٹوارے کی بات کرنے کے لیے گراؤنڈ بنا رہے ہیں۔ اماں سے ابھی تک میری اس موضوع پر بھی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ میں تو سوچے بیٹھا تھا کہ اگر اماں سے بات ہوئی تو انھیں مشورہ دوں گا کہ اتنی پریشانیوں میں مزید پریشانی پیدا کرنے کی بجائے چچا کا حصہ انھیں دے کر الگ کریں۔ بہت سے معاملات تھے جو مجھے کل صبح سے پہلے نمٹانے تھے۔ میں نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو تایا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اماں کوثر کے کمرے میں تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ باہر آئیں تو میں نے تایا سے کہا کہ ہم یہاں بیٹھ کر گفتگو نہیں کریں گے۔ میں اماں کے کمرے میں بات کرنا چاہتا تھا تاکہ اس دوران میں ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے اور نہ ہی ہماری اس گفتگو سے واقف ہو سکے۔ کوثر کے غسل کی تیاری ہو رہی تھی۔ تائی لے کر نکلنے والی لگ رہی تھیں۔"

"تایا اتنے روز میں انھوں نے جواب نہیں دیا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"نہیں میاں! آنے سے دو روز پہلے تو فرصت ملی تھی۔ پہلے روز ہی خورشید چاچا کا بھتیجا اور بھائی آ گئے۔ سارا دن حساب کتاب چلتا رہا۔ پھر محلے کے لوگ آنے لگے۔ رات کو سامان نکالتے اور باندھتے رہے۔ دو راتیں تو خیر سکون سے گزریں پھر شگفتہ کو شاید خبر ہو گئی کہ تمھاری اماں آئی ہوئی ہیں' اس کے بین شروع ہو گئے تو بہت زیادہ ذہنی کوفت ہوئی۔ آخری دو دن میں دن کے وقت اتنا ہوا کہ کچھ فرصت ملی تو چلے گئے۔ کل کی رات چودھویں کی رات تھی۔ میرا تو دل دہلا رہا۔ سب کی صورتیں آنکھوں میں پھرتی رہیں کہ شاید آخری رات ہو' ذرا نیند آئی تھی تو خواب میں پردادے سے لے کر تمھارے باوا تک چلے آئے' لگتا تھا ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ گھبرا کر آنکھ کھل گئی تو پتا چلا کہ تمھاری اماں اور شگفتہ میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ باقاعدہ مکالمے ہو رہے ہیں۔ تمھاری اماں نے تو خوب دل

کی بھڑاس نکالی' ہاتھ نچا نچا کر لڑیں مگر وہ اللہ کی بندی۔ بلکہ روح کچھ بھی نہ بولی' ایک شریف بہو کی طرح آنسو بہاتی رہی۔ مجھے تو صرف اس کے رونے کی آوازیں آرہی تھی۔ ڈر لگ رہا تھا اس لیے بیچ بچاؤ کے لیے بھی کمرے سے نہ نکلا۔ ویسے ساری رات اسی خوف میں گزر گئی کہ جانے کب کوئی سنہرا سانپ کہیں سے نکل آئے اور گلا گھونٹ دے۔ بھیا رات گزری تو سجدہ شکر بجالایا اور عہد بھی کرلیا کہ اب کبھی اس طرف پھٹکوں گا بھی نہیں۔" تایا اپنے مخصوص انداز میں ساری کہانی سناتے رہے' میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ واقعی وہاں بیتنے والی داستان سنا رہے ہیں یا محض اپنی طرف سے گھڑ رہے ہیں۔ ویسے میرا خیال تھا کہ یہی کچھ ہوا ہوگا۔

"تو تایا انھوں نے جواب نہیں دیا۔ آپ نے بھی جواب نہیں مانگا اور یونہی چلے آئے؟" میرے لہجے میں شکوہ تھا۔ جسے انھوں نے محسوس کرلیا اور میری جانب دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"بھلا ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ میں تو اس کے باوا کے حلق کی ہڈی بن گیا تھا۔ وہ مرزا صولت بیگ کے کارناموں سے کافی متاثر ہیں اور پل بھر کو بھی انھیں یا ان کے کارناموں کو بھولنے کے لیے تیار نہیں مگر شرف الدین نے کہا تھا کہ وہ دیرہ دون سے سیدھا مراد آباد پہنچے گا اور خوشی خبری سنائے گا۔ اب تم اس وقت تک سولی پر لٹکے رہو۔"

انھوں نے حقے کی نے منہ میں لیتے ہوئے کہا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میری اندر کہیں سے سرگوشی ابھری کہ اگر سڑک پر کچلا جانے والا شرف الدین ہوا تو میری زندگی ایک نہیں دو محرومیوں کا اضافہ ہو جائے گا' ایک بہترین دوست سے محرومی اور دوسری۔ دوسری گویا اپنی زندگی' اپنی زندگی کی لطافت سے محرومی۔ شگفتہ میری زندگی کا حسین ترین پہلو تھی' ایسی بھیانک اور بدہیت زندگی میں یہ حسین پہلو کس قدر اطمینان بخش تھا شاید اس کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا۔ میرے تمام تر لطیف جذبے اس کے وجود میں مجسم ہو کر رہ گئے تھے۔ میرے پاس اگر مسکرانے یا خوش ہونے کا کوئی جواز تھا تو وہ صرف اور صرف شگفتہ تھی۔ محبت اور پیار کا اگر کوئی جذبہ میرے پاس تھا تو اس کا محور شگفتہ ہی تو تھی۔ اس کے چھٹ جانے کا مطلب یہ تھا کہ میری زندگی کا جواز ہی ختم ہوگیا ہو۔

"کیا بات۔۔۔ وقار الحسن! تم اتنے دل برداشتہ کیوں ہو گئے؟" حقے کی گڑگڑاہٹ تھمی تو تایا کی فکر مند آواز گونج اٹھی۔

"تایا۔ یہاں کے حالات اتنے سنگین ہیں کہ میں انھیں آپ کے انداز میں بیان کرنا چاہوں تو شاید میرا دم ہی نکل جائے۔" میرے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے تایا کو ایک دم مضطرب کردیا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ میرا تو خیال ہے کہ یہاں۔۔۔ یہاں اگر جس خوشی کی خبر ملی ہے وہ تمام سنگینیوں کو بھلا دینے کو کافی ہے۔"

"جی تایا! یہ خوشی بڑی ہے۔ میں نے خود بھی اس خوشی کو اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح آپ کرسکتے ہیں مگر میں اس دوران میں جن حالات کا شکار رہا ہوں وہ میں نے آپ کو نہ پہلے بتائے تھے اور نہ اب بتا کر آپ لوگوں کی خوشیوں کو معدوم کرنا چاہتا تھا مگر اب ایسا کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ مجھے آج ہی کچھ ایسے فیصلے کرنے ہیں جو میں تنہا نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی اور اماں کی اجازت کا خواہاں ہوں۔ اس کے بنا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"وقار الحسن! کھل کر بات کرو۔" تایا اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اماں آج آیت کریمہ کا ختم کروانا چاہتی تھیں۔ اسے خود کوثر کو شروع کرنا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد اسی مسئلے میں الجھے ہوئے تھے۔ رات کھانے پر تائی نے خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ عجب افراتفری سی پھیلی محسوس ہو رہی تھی اس لیے بھی میں یہاں برآمدے میں نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ اماں کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ مجھے ضروری باتیں کرنا ہیں۔ تایا مجھے اور اماں کو لیے اماں والے کمرے میں آگئے۔ انھوں نے تائی سے کہہ دیا کہ وہ کچھ اہم مسئلوں پر مشورے کر رہے ہیں اس لیے اس طرف کوئی نہ آئے۔ تائی کو تو یہ سب سننے کی فرصت بھی نہیں تھی۔

"ہاں وقار الحسن! بات شروع کرنے سے پہلے میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔" تایا نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے برابر میں حقہ جما کر بولے۔

"کیسا وعدہ تایا!" میں پریشان ہوگیا۔

"یہی کہ اب داستان سناتے ہوئے نہ تو تم ہم سے کچھ چھپاؤ گے اور نہ جھوٹ بولو گے۔" انھوں نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

"تایا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟" میں یہ دعا

کر۔۔۔ سے بچ رہا تھا اس لیے کہ اب بھی کچھ باتیں ایسی تھیں جنھیں بتانا غیر ضروری طور پر سب کو پریشان کرنے کے مترادف تھا۔

"یہ بے اعتباری خود تمھی نے پیدا کی ہے۔ تم اب تک ہم سے جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ ایسا میں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے ہوتے ہوئے تم تنہا پریشان ہوتے رہے۔"

"نہیں تایا! میں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ آپ لوگوں کو بتا دوں مگر۔۔۔"

"خیر۔ مسئلہ کیا ہے تم وہ تو بتاؤ۔" اماں تایا کی بحث سے الجھ کر بول اٹھیں۔

میں نے یہ لمحہ غنیمت جانا اور فوراً شروع ہوگیا۔ اب میں نے بلاکم کاست وہ تمام باتیں جو اماں اور تایا کے علم میں نہیں تھیں بتانا شروع کردیں۔ اس پوری داستان میں میں نے جو باتیں چھپائی تھیں وہ ایک تو رحیمو کا قتل اس مکان میں ہونا اور اسے وہیں دفنا دینا تھا۔ میں نے رحیمو کے قتل کو سادھو کا کرشمہ بتایا تھا' یہ بھی اعتراف کیا کہ سادھو نے وہ قتل میرے ہاتھوں کروایا لیکن یہ بھی بتا دیا کہ رحیمو مرا نہیں تھا بلکہ وہ دیرہ دون میں موجود ہے۔ وہ اسی رات اس مکان سے بھاگ گیا تھا۔ بعد میں اسے شرف الدین نے نہ صرف یہ کہ زندہ دیکھا بلکہ اس سے پوچھا بھی کہ وہ کیوں بھاگ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ باپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ وہ جھوٹ تھا جو مجھے بولنا پڑا۔ اماں یہ تو برداشت کر سکتی تھیں کہ سادھو نے مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے ایسا کیا ہے مگر یہ برداشت کرنا ان کے لیے محال ہوتا کہ میں واقعی قاتل ہوں۔ دوسری بات میں کوثر سے متعلق ہر واقعہ چھپا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تایا کی خوشی خاک میں مل جائے۔ کوثر ان کے لیے شروع سے پریشانی کا باعث تھی۔ اب اس کی ذات سے متعلق جو خوشی انھیں میسر ہوئی تھی میں اس کا خون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوثر سے متعلق کسی بھی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ ان دو باتوں کے سوا میں نے انھیں من و عن تمام داستان کہہ سنائی تھی۔ میں نے کل علی الصبح ہونے والا سارا واقعہ بھی بیان کردیا تھا صرف یہ نہیں بتایا کہ سنہرے بابا کا پیغام مجھے کوثر کے ذریعے ملا تھا اور کوثر نے میرے اتوا تکیں بچھو بھیجا تھا۔

یہ تمام داستان سننے کے دوران میں اماں کئی بار غش کھانے لگی تھیں۔ کئی بار میں نے انھیں پانی پلایا' انھیں تسلی دی۔ یقین دلایا کہ میں صحیح سلامت ہوں۔ خدا میرا محافظ ہے۔ سنہرے بابا کا دست شفقت میرے سر پر ہے۔ وہ پل پل میری مدد کر رہے ہیں۔ میں نے تایا کو اس بلی جن کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ یہ سن کر اچھل پڑے تھے کہ اس تمام داستان میں کم از کم ایک جن کو دیکھنے کا اعزاز انھیں بھی حاصل ہوگیا تھا۔ خود تایا بھی یہ واقعات سن کر کئی بار سفید ہوئے تھے۔ ساری داستان سنا کر میں نے اماں اور تایا سے پوچھا کہ اب بتائیے مجھے سنہرے بابا کے پاس چلا جانا چاہیے یا پھر یہاں بیٹھ کر کسی کی موت کا انتظار کرنا چاہیے۔ اماں نے تو فوراً اجازت دے دی۔ تایا بھی سر جھکا کر رہ گئے۔

"وقار الحسن! شرف الدین کے بارے میں بتا کر تم نے ہمیں سخت مضطرب کردیا ہے۔ کچھ یاد کرو۔ کوشش کرو کہ یاد آجائے' وہ لاش جو تم دیکھ آئے ہو اس کی انگوٹھی اب سے پہلے تم نے کہاں دیکھی تھی؟"

"میں خود بے حد پریشان ہوں تایا! لگتا ہے انگوٹھی ذہن میں آتے ہی ایک دھند سی پھیل جاتی ہے۔ ایک ایسی دھند جو کسی طرح صاف نہیں ہوتی۔ میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے' کان سنسنانے لگتے ہیں اور۔۔۔ اور میں خود کو کسی اندھے کنویں میں گرتا محسوس کرتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔ تم کچھ یاد نہ کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اور سنہرے بابا کے بتائے ہوئے وظائف کرلو۔ سب کچھ خدا پر چھوڑ دو۔ وہ کڑا اور مجسمہ محفوظ ہے۔" اتنا کہہ کر اماں نے تایا کی طرف دیکھا۔ "آپ فجر کے وقت اسے خود سنہرے بابا کے حجرے تک چھوڑنے جائیے گا ورنہ میرا دل دہلتا رہے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" تایا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں بھی آنے والے لمحوں کی آہٹ میں تاثر تلاش کر رہا تھا۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ اماں الگ کسی سوچ میں غرق تھیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان بالکل نہ تھا بلکہ ایک اضطرابی سی کیفیت تھی۔ ظاہر ہے میں زندگی میں پہلی بار ان سے نامعلوم عرصے تک کے لیے جدا ہو رہا تھا۔ انھوں نے میری جدائی کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرلیا تھا۔ ظاہر ہے میرے تعاقب میں آنے والی موت کی آہٹ انھیں بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔ انھوں نے تو حویلی کی جس پراسراریت میں زندگی گزاری

تھی اس نے انھیں خاصا سمجھ دار اور حالات سے سمجھوتا کرنے والا بنا دیا تھا۔

وہ لوگ بھی یہ بات سن کر حیران رہ گئے تھے کہ سوامی جوگندر ناتھ مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ بات اس وقت علاقے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور یہ کتنے دکھ کی بات تھی کہ مسلمان ہو کر وہ ابھی اعلان بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک مسلمان نے ان پر ظلم ڈھا دیا۔ پھر اماں نے بتایا کہ شگفتہ بہت کرب میں تھی۔ شاید وہ ان تمام حالات سے واقف بھی ہو۔ شاید وہ جانتی ہو کہ سادھو اس پر قبضہ جمانے کے لیے کیسی گھناؤنی سازشیں کر رہا ہے۔ بہرحال ہم تینوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے پوچھتے اور مشورہ کرتے رہے۔ تایا شرف الدین کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ اماں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ سنہرے بابا کے پاس سے وظائف مکمل کر کے آتے ہی وہ شگفتہ سے میری شادی کر دیں گی۔ انھیں یقین تھا کہ شرف الدین اور اس کی اماں شگفتہ کے ابا کو منا لیں گے۔ میری محبت، میری زندگی اور میرا انتخاب اماں کو بھی پسند آیا تھا۔ ان کے فیصلے نے میرے اندر خوشیاں بھر دی تھیں۔ اب گویا میرے اور شگفتہ کے درمیان صرف اتنے دنوں کا فاصلہ تھا جتنا میں وظائف مکمل کرنے میں لگاتا۔ اس بات نے میرے اندر بلا کا جوش و خروش بھر ڈالا اور میں نے سوچ لیا کہ میں جس قدر جلد ہو سکے گا وظائف مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمیں اس تمام گفتگو میں اتنی دیر ہو گئی کہ جب ہم کمرے سے باہر نکلے تو پتا چلا کہ آیت کریمہ کا ورد ختم ہو چکا ہے اور اب ناشتے کی تیاری ہو رہی ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ صرف زنانہ محفل تھی۔

اس لیے بیٹھک میں بھی محلے کی عورتیں تھیں۔ ناشتے کا انتظام تھا۔ جہانی آپا وغیرہ بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ ہمیں باہر آتا دیکھ کر شنو آپا نے مجھے اور تایا کو اوپر چلے جانے کو کہا۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ اماں سے چچا کے حصے کی بات بھی کرنا ہے۔ میں نے اماں سے کہا کہ وہ پہلا کام یہی کریں اور وکیل کو بلوا لیں۔ چچا یہ کام منٹوں میں کر دیتے۔ اماں نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ چچا کی مرضی کے مطابق فیصلہ کر دیں گی، میں پریشان نہ ہوں اور یکسو ہو کر وظائف کروں۔ وہ رات کو ہی وکیل کو بلا بھیجیں گی یا ان سے کہلوا دیں گی کہ سویرے کاغذات لے کر آجائیں تاکہ کچہری کے کام بھی نمٹا لیں۔ اماں کے اس فیصلے نے مجھے بہت ہلکا پھلکا کر دیا اور میں تایا کو لے کر اوپر چلا آیا۔ چچی نیچے تھیں۔ چچا اپنے محبوب مشغلے میں یعنی کبوتروں کے چونچلے اٹھانے میں مصروف تھے۔ سیڑھیوں پر آہٹ سن کر پلٹے اور ہمیں دیکھ کر جھینپ گئے۔ تایا اس وقت کسی گہری سوچ میں تھے ورنہ ایک آدھ طنز کرنے سے باز نہ آتے۔ وہ ہمیں لیے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تایا کو گاؤ تکیہ دیا اور یوں پذیرائی کی جیسے کہیں دور سے مہمان آئے ہوں۔ تایا شاید پہلی بار اوپر آئے تھے۔ چچا کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ ان کی اس خوشی کو تایا نے بھی محسوس کر لیا۔ "بھئی آؤ میرے پاس بیٹھو۔" تایا نے بڑے ہی حلیم لہجے میں کہا۔ وہ فوراً قریب آبیٹھے۔ تایا بہت دیر تک ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر غیر محسوس انداز میں مطلب کی بات پر آگئے۔ وہ انھیں بڑی دیر تک سمجھاتے رہے کہ حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ وہ ان معاملات سے خود کو علیحدہ کیوں سمجھ رہے ہیں اور یہ کہ ان کے الگ ہونے سے پریشانی بڑھ تو سکتی ہے کم نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک جائیداد کے حصے کا تعلق ہے وہ لے لیں اور ان پیسوں کا جو جی چاہے کریں۔ انھیں یا کسی کو بھی اعتراض نہ ہوگا مگر فی الوقت الگ رہنے پر زور نہ دیں۔ انھوں نے چچا کو بتا دیا کہ سنہرے بابا نے مجھے بلا لیا ہے اور میں جانے کب لوٹوں۔ ایسے میں گھر کی خواتین کے پاس صرف وہی دونوں رہ جاتے ہیں، ایک کی غیر موجودگی میں دوسرا عورتوں کے لیے کافی ڈھارس کا باعث ہوگا۔ خدانخواستہ کچھ ہوتا ہے تو بھی اکیلے تایا بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ تایا کا انداز اور لہجہ اتنا پراثر تھا، دلائل اتنے ٹھوس تھے کہ چچا قائل ہو گئے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ یہیں رہیں گے اور چچی کو بھی سمجھا دیں گے۔

ان سے یہ گفتگو حالات کا تقاضا تھی۔ یہ بڑا غنیمت تھا کہ چچا نے ان مسائل کو بہت جلد سمجھ لیا جو ہم سب کے لیے پریشانی کا باعث تھے۔ تایا بڑے جہاں دیدہ آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں دل پر کوئی بوجھ لے کر گیا تو یکسوئی حاصل نہ کر سکوں گا شاید اسی لیے انھوں نے یہ قصہ بھی چھیڑ دیا تھا۔ یہ میرے لیے خوش آیند بات تھی کہ چچا کا رویہ بڑا مثبت تھا۔ ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ تایا نے چچا کو بتا دیا کہ میں حالات سے پریشان ہو کر سنہرے بابا کے پاس جا کر وظائف کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ حالات کی سنگینی کے بارے میں انھیں بھی کچھ نہ کچھ بتانا ضروری ہو گیا تھا کہ وہ

تبدیلی سے کوئی فیصلہ کر سکیں ورنہ خیال تھا کہ چچی اپنی زبان اور لہجے کا ہتھیار استعمال کر کے ان کے ارادوں کو متزلزل کر سکتی ہیں۔ میں نے انھیں مختصراً وہ باتیں بھی بتا دیں جو ان کے علم میں نہیں تھیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ سادھو صرف میرے ہی نہیں میرے خاندان والوں اور میرے قلعوں کے پیچھے بھی پڑا ہوا ہے۔ چچا نے اس بار کافی سمجھ داری کا ثبوت دیا، اپنے عہد کی تجدید کی بلکہ اپنی خدمات بھی پیش کیں کہ اگر وہ کچھ کر سکیں تو تیار ہیں۔ میرے لیے ان کی یہ پیشکش ہی بہت تھی سو میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے بعد گھر والوں کا خیال رکھیں۔ زمین جائیداد کا معاملہ آپس کا معاملہ ہے، اگر اس سلسلے میں وہ اماں کے فیصلے سے انحراف بھی کریں تو ان سے کچھ کہنے اور مزید پریشان کن حالات پیدا کرنے کی بجائے میرا انتظار کریں۔ انھوں نے مجھے تسلی دی کہ میں اس طرف سے خود کو بری الذمہ سمجھوں۔

شاید آپ کو احساس ہو کہ چچا کے رویے نے مجھ میں کس قدر خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ اب کم از کم میں گھر کی طرف سے قطعی مطمئن تھا۔ چچا نیچے سے ہمارے ناشتے کے لیے چیزیں اور چائے لے آئے۔ میں نے پہلی بار تایا کو چچا سے اتنے خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔ خود چچا کو بھی اس کا پورا احساس تھا کہ ان کے رویے نے ماحول پر بہت خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ وہ بھی ان فاصلوں کو مٹتے دیکھ رہے تھے جو جانے کب سے تایا اور ان کے درمیان حائل تھے۔

تقریباً گھنٹا بھر میں ہی اماں کا بلاوا آگیا۔ ہم نیچے گئے تو مہمان جا چکے تھے۔ کوثر ہلکے گلابی سوٹ میں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اس نے ڈھنگ کے کپڑے پہنے تھے یا یہ کہ وہ آج اپنے پورے لباس میں چلتی پھرتی، چہلیں کرتی نظر آرہی تھی اس لیے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ روشنی اور زندگی تھی۔ مسکراہٹ تو جیسے اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھی۔ تائی کھلی پڑ رہی تھیں اور بار بار ذکر کر رہی تھیں کہ فلاں کی بیگم، فلاں کی بہن یا فلاں کی دادی کوثر کو بڑے چاؤ سے دیکھ رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ کس انداز سے سوچ رہی ہیں، یہ ان کا بنیادی حق بھی تھا۔ ایک جوان بیٹی کی ماں ہونے کے ناتے ان کی نگاہیں لوگوں کی آنکھوں میں اپنی بچی کے لیے پسندیدگی کی متلاشی ہونا ہی چاہیے تھیں۔ باقی گھر کے لوگ بھی بے حد خوش تھے۔ میں اور تایا برآمدے میں اپنی مخصوص جگہوں پر جا بیٹھے۔ اماں اور تائی وغیرہ بھی جلد ہی کاموں سے فارغ ہو کر ہمارے پاس چلی آئیں۔ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح کوثر سے تنہائی میں بات ہو تو میں اسے اس لاش کے بارے میں بتاؤں جس کی انگلی سے ملنے والی انگوٹھی اب تک میرے لیے الجھن بنی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کر لے گی۔ میں بابا کے پاس جانے سے پہلے اس آخری اور سب سے بڑی الجھن سے بھی نجات پانا چاہتا تھا ورنہ شرف الدین کا خیال مجھے مسلسل کرب میں مبتلا کیے رکھتا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر دیرہ دون چلا جاؤں اور اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں لیکن نہ تو میرے پاس وقت تھا نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ وہ دیرہ دون کیوں اور کہاں گیا ہے۔ ویسے میرا خیال تھا کہ اس کے کچھ رشتے دار دیرہ دون میں ہیں پھر اچانک ہی ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوندا اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کک۔۔ کیا ہوا۔۔؟" اماں ایک دم چونک اٹھیں۔

"اماں میں شرف الدین کے چچا کے گھر جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر کیوں۔۔ شرف الدین تو وہاں نہیں ہے۔۔؟" تایا بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"جی تایا! میں چاہتا ہوں کہ فرقان کو دیرہ دون بھیج کر اس کی خیریت معلوم کروا لوں۔"

"فرقان کون؟" اماں نے پوچھا۔

"اس کا چچا زاد ہے۔"

"اچھا مگر یہ تو سوچو کہ وہ گیا اور خیریت لایا بھی تو کون سا ابھی ابھی تمھیں خیریت پتا چل جائے گی۔ جانے آنے میں اسے کم سے کم دو روز تو لگیں گے۔ کوئی ہوائی جہاز تو ہے نہیں اس کے پاس کہ ابھی اترے گا اور ابھی خیریت لا دے گا۔" اماں نے مجھے نرمی سے سمجھایا۔ "تمھیں سنہرے بابا پر اعتماد نہیں ہے کیا؟ جب انھوں نے تمھیں اس آفت سے بچایا اور بتا دیا کہ وہ شرف الدین نہیں ہے تو پھر۔ تم یہ سب کچھ کیوں سوچ رہے ہو۔ تم اللہ پر بھروسا کر کے جاؤ۔ دو تین روز میں تو شرف الدین نے خود ہی یہاں پہنچنے کو کہا تھا۔ جب تک فرقان جائے گا اور لوٹے گا اس اثنا میں وہ خود ہی یہاں آجائے گا۔" اماں اتنے وثوق سے کہہ رہی تھیں کہ

میرا دل ایک دم ہلکا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے میرے ذہن میں خرافات نے ڈیرا جما لیا تھا۔

اس رات میں نے اماں سے وہ کڑا اور مجسمہ نکلوا لیا۔ وہ ایک سبز رنگ کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کپڑے کو دیکھ کر اماں حیران رہ گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے ان دونوں چیزوں کو ایک خاکی تھیلے میں ڈال کر رکھا تھا۔ ایک کنارے سے وہ کڑا اور مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ اماں نے سبز کپڑا اتارنا چاہا تو ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہو گئیں تبھی مجھے یاد آیا کہ سنہرے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے ان دونوں چیزوں کے گرد حصار قائم کر دیا ہے تاکہ سادھو ان چیزوں کو حاصل نہ کر سکے۔

"یہ۔ یہ جھٹکا کیوں لگا تھا؟" اماں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائیں۔

"میں نے بتایا تھا ناں اماں کہ سنہرے بابا نے ان چیزوں کے گرد حصار کھینچ دیا ہے۔ ممکن ہے یہ سبز کپڑا وہی حصار ہو۔" میں نے بڑے حوصلے سے اس سبز کپڑے میں لپٹی دونوں چیزوں کو اٹھا لیا۔ مجھے کوئی جھٹکا نہ لگا۔

"ہاں۔ ممکن ہے۔" اماں کی آنکھیں اسی لپٹے ہوئے کپڑے پر تھیں۔ پھر یوں لگا جیسے اماں چونک اٹھی ہوں۔ "تم۔ تم اسے ابھی یہیں رکھا رہنے دو۔ تمھیں کب جانا ہے؟"

"علی الصبح۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"پھر اسے صبح ہی نکالنا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ میں نے اسے واپس بکس میں رکھ دیا۔ بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے لیے کپڑوں کے چند جوڑے' مسواک اور ضرورت کی۔ اہم ضرورت کی چند چیزیں لے کر پہنچوں۔ میں اماں کو بتا چکا تھا۔ اماں نے میرے دو جوڑے اور میری ضرورت کی چند چیزیں ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں رکھ دیں۔ اسم اعظم کا تعویذ اب بھی میرے بازو پر بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھو کر اپنا اطمینان کیا۔ فیروزے کی انگوٹھی دیکھی۔ اماں نے ایک تسبیح' جو اماں کے چچا مدینے سے لائے تھے' وہ بھی رکھ دی اور مجھے بتایا کہ یہ تسبیح وہ مسجد نبوی میں منبر سے چھو کر لائے تھے اس لیے میں تسبیح پر پڑھنے والی تمام چیزیں اسی تسبیح پر پڑھوں۔ میں نے اس تسبیح کو آنکھوں سے لگا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ کوثر ہمارے پاس چلی آئی۔ ہم لوگوں کی گفتگو کا رخ دوسری ہلکی پھلکی باتوں کی طرف ہو گیا۔ اماں کھانے کی تیاری کے لیے اٹھ گئیں۔ مجھے کوثر سے بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے مختصر الفاظ میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس لاش اور انگوٹھی کے بارے میں سن کر اس کی آنکھوں میں سوچ کے گہرے سائے منڈلانے لگے۔ وہ کچھ بولی نہیں بلکہ کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔ اس کی نگاہیں میری پشت پر دیوار کو گھور رہی تھیں۔ چہرے کا رنگ دھیرے دھیرے متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھیں خود بہ خود بند ہونے لگیں' یوں لگا جیسے اس پر گہری نیند طاری ہو رہی ہو۔ میں اس کی کیفیت سے ہراساں ہو گیا۔ میں نے دھیرے سے اسے آواز دی مگر لگتا تھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی ہے۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور یہ خوف بھی پریشان کر گیا کہ اگر کوئی آ گیا تو کیا ہو گا؟ خواہ مخواہ کی بھنگ دڑ مچ جائے گی۔ میں چپکے سے وہاں سے اٹھ گیا اور باہر چلا آیا۔ تایا اپنے پلنگ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ تائی ان کے سامنے بیٹھی پان بنا رہی تھیں اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر خوشی جم کر رہ گئی تھی۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان لوگوں کے قریب آ گیا۔

"آؤ میاں وقار الحسن! تمھاری تیاری مکمل ہو گئی!"

"جی تایا!" میں نے مختصراً جواب دیا

"سویرے میں تمھیں ساتھ لے چلوں گا ورنہ تمھاری اماں تمھاری غیر موجودگی میں ہولا ہولا کر ضائع ہو جائیں گی۔"

"تایا! اماں کو میرے آنے سے پہلے نئے مکان میں منتقل نہ ہونے دیجیے گا۔"

"ارے باؤلے ہو گئے ہو۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ تمھارے آنے کے بعد بھی وہاں منتقل نہ ہونے والا بھئی یہ اتنا بڑا گھر آخر کس لیے ہے۔ تمھارے چچا اگر چلے گئے تو ٹھیک ہے ورنہ تو میں' تمھاری تائی اور کوثر اکیلے رہ جائیں گے۔ ویسے خیال تو یہی ہے کہ تمھاری چچی یہاں رہنے پر آمادہ نہ ہوں گی۔ ان پر تو الگ کوٹھی میں رہنے کا بھوت سوار ہے۔"

"نہیں تایا! میرا خیال ہے کہ جائیداد کی تقسیم کے بعد کچھ عرصہ ضرور یہاں رہنے پر تیار ہو جائیں گی۔" میں نے کہا۔

"خدا عقل دے تمھیں ناں!" تائی نے پان کا بیڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا اور انگلیوں کو سر سے پونچھ کر پاندان ایک طرف سرکا دیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتوں میں حکمرانی کا شوق کب سے پیدا ہوا۔ تاریخ میں تو ایسی کوئی بات نہیں ملتی کہ فلاں سن میں عورتوں میں یہ شوق پیدا ہوا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا گیا' یا فلاں فلاں مفکر خواتین نے اس شوق کو ہوا دی اور پھر فلاں سن میں اس تحریک کو عروج حاصل ہوا۔" تایا نے حقے کی نے کو دانتوں سے ہٹا کر کہا۔

میں ہنس دیا۔ "تایا یہ شوق انھیں ورثے میں ملا ہے۔"

"میاں کس کا ورثہ تھا یہ۔ یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔"

وہ موڈ میں تھے اور میرا ذہن کوثر میں الجھا ہوا تھا۔ اب پریشانی بھی ہو رہی تھی کہ میں ایسی حالت میں اسے تنہا چھوڑ آیا ہوں۔ خدانخواستہ کوئی الٹی سیدھی بات ہو گئی تو کیا ہو گا۔

"اچھا تمھاری چچی کو گمان غالب ہے کہ جب وہ کوٹھی خرید لیں گی تو اس میں ان کا حکم چلے گا۔ وہ ملکہ کی طرح وہاں احکامات دیا کریں گی مگر ان کی سمجھ میں اب تک یہ نہ آیا کہ ان کے احکامات پورے کرنے والا وہاں ہو گا کون۔ بھئی میاں تو اب بھی ان کے غلام ہیں اور حتی المقدور ان کے احکامات بھی بجا لاتے ہیں۔"

"اے بس چپکے رہیں' آپ کو کیا ہے' وہ در و دیوار پر حکم چلائیں گی۔ کرنے دیں من مانی' اکیلی رہیں گی تو میاں کے سامنے چھوٹیں گے۔ یہاں تو انھیں لڑنے کو ہزار باتیں مل جاتی ہیں' جب یہ نہ ملیں تو آپس میں پھوٹ پڑے گی۔ الگ ہونے کے بعد آپ لکھ لیں میری بات کہ بتن میاں کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔" تائی کا لہجہ کوثر کے ٹھیک ہونے کے بعد کافی میٹھا ہو گیا تھا۔ بات کیسی بھی ہو لہجے کی مٹھاس کم نہ ہوتی تھی۔

اب میں بہت بے چین ہو گیا تھا۔ بظاہر تو میں ان کی باتیں سن رہا تھا مگر میرا سارا دھیان کوثر کی طرف تھا۔ وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئی تھی اور یہی بات مجھے پریشان کر رہی تھی۔ "میں ابھی آیا تایا۔" آخر میں بے قرار ہو کر اٹھ گیا۔

اماں کے کمرے میں داخل ہوا تو کوثر اسی حالت میں ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں بے پناہ سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے کے عضلات کھنچے ہوئے تھے اور اس پر

عجیب سی کرختگی چھائی ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔ اچانک اس نے اپنی بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔ میں چونک اٹھا بلکہ اچھل پڑا۔ اس کی ہتھیلی پر وہی انگوٹھی رکھی تھی۔

"یہ۔ یہ۔ کہاں سے آئی؟" میں ہکلا گیا۔

اس نے جواب دیے بغیر چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ آہستہ آہستہ انگلیاں موڑ کر مٹھی بھی بند کر لی پھر اس کے لب ہولے ہولے ہلنے لگے۔ میں مبہوت سا بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ کوثر اس حد تک عبور حاصل کر چکی ہے کہ اس نے مردہ خانے کے انچارج کے پاس جمع شدہ سامان سے وہ انگوٹھی یہاں بیٹھے بیٹھے حاصل کر لی؟ اس کی طاقت نے مجھے دم بہ خود کر دیا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ لڑکی جو چند روز پہلے تک معذور تھی' خود کروٹ بھی نہیں لے سکتی تھی وہ پراسرار علوم پر اتنی دسترس کیسے حاصل کر گئی۔ اسے یہاں بیٹھے شاید پندرہ منٹ سے بھی کم عرصہ ہوا تھا اور اس نے وہ انگوٹھی۔ میں اس سے آگے نہ سوچ سکا اور چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی پھر مجھے لگا جیسے وہ گرنے والی ہو۔ ہوش کھوتی جا رہی ہو۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جونہی میں نے اسے تھامنے کی کوشش کی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں انگارے سے بھرے محسوس ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے تپش کا احساس ہوا اور میں اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اب مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس ہاتھ کی طرف دیکھا جس میں چند لمحے پہلے انگوٹھی دبی تھی مگر وہ ہاتھ بھی نظر نہیں آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔

"کوثر!" میں نے اسے ہولے سے آواز دی۔

"ہوں۔"

"تم ٹھیک تو ہو ناں!" میں نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ پھر آہستگی سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اب وہ کسی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں ٹھیک ہوں۔ وہ شرف الدین نہیں تھا۔ وہ انگوٹھی۔ خورشید چاچا کی تھی۔"

یہ بات سن کر میں اچھل پڑا۔ "ہاں۔ ہاں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ وہ انگوٹھی

میں نے خورشید چاچا کی انگلی میں دیکھی تھی۔

"مگر۔ مگر وہ انگوٹھی۔ یہ لاش۔"

"سادھو کی طاقت ٹوٹ رہی ہے وقار ورنہ یہ لاش شرف الدین کی بھی ہو سکتی تھی۔"

اس کی بات سن کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ "کوثر! پھر یہ لاش کس کی ہے اور خورشید چاچا کی انگوٹھی اس کے پاس کیسے پہنچی؟"

"یہ میں معلوم نہیں کر سکی۔ میں شرف الدین کی طرف سے پریشان تھی صرف اس لیے میں نے اتنا عمل کیا تھا کہ معلوم کر سکوں کہ وہ شرف الدین تو نہیں۔ یہ بات معلوم کرنے کے لیے یا تو میرا اس لاش تک جانا ضروری تھا یا اس کے بدن کی کوئی چیز یعنی 'کپڑا' جوتا یا یہ انگوٹھی۔ تمہیں ویسے بھی اس انگوٹھی کے بارے میں تشویش تھی اس لیے میں نے اسے یہاں منگوا لیا۔"

ویسے یہ حیرت کی بات تھی کہ سادھو نے یہ انگوٹھی کیسے حاصل کی تھی۔ یہ انگوٹھی خورشید چاچا کی موت کے بعد ان کے سامان کے ساتھ ان کے بھائی کو دے دی گئی تھی۔ ان کے بھائی سے اماں اور تایا امروہہ میں مل کر آ رہے تھے اس لیے یہ سوچنا بھی غلط تھا کہ یہ لاش خدانخواستہ ان کی ہو گی۔

"وہ انگوٹھی کہاں گئی؟" اچانک میں نے پوچھا۔

"واپس اپنی جگہ پر۔" کوثر نے خوابناک سے لہجے میں جواب دیا پھر بے دم ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

"ٹھیک ہے' تم آرام کرو۔" میں نے کہا پھر چلتے چلتے اسے بتا دیا کہ کل سے میں سنہرے بابا کے حجرے میں بیٹھوں گا۔ وہ یہ بات سن کر بے چین ہو گئی تھی۔

"وقار میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

اس کی بات کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ میں سنہرے بابا کے پاس نہ جاؤں۔ وہ شاید سنہرے بابا کی تنبیہہ کو بھلا چکی تھی یا اسے اپنی توہین سمجھ بیٹھی تھی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ۔ جو کچھ تم وہاں جا کر حاصل کرو گے' وہ میں تمہیں دوسرے طریقوں سے یہاں بھی سکھا سکتی ہوں۔ میں سادھو کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں اسے کتے کی طرح تمہارے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کر [illegible] طریقوں کی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کم سے کم وقت میں' کم سے کم نقصان اٹھا کر کچھ حاصل کر لیتا [illegible] عیب کی بات نہیں۔"

"کوثر! سنہرے بابا نے کہا تھا کہ تم جو طریقے اپنا [illegible] وہ شیطانی راستہ ہے اور شیطانی راستہ تمہیں تباہی کی [illegible] لے جائے گا۔" میں نے ناگوار لہجے میں اسے جواب [illegible]

"اپنا اپنا نظریہ ہے وقار! ویسے۔ ایک بات کہوں [illegible] کچھ کہتے کہتے جھجک گئی۔

"کہو۔" میرا موڈ اب بھی خراب تھا۔

"مجھے ان راستوں پر لے جانے والے تم ہو۔" [illegible] میرے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا۔

"کیا مطلب۔؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں! تمہاری ذات میں دلچسپی نے مجھے پہلے تم [illegible] وجود سے آگاہی پر اکسایا' میں نے تمہیں جان لینے [illegible] جو کچھ سیکھا اور اس آگہی نے جو خوف ناک انکشاف [illegible] وہی مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کر گئے۔ میں نے تم [illegible] پل پل کی خبر رکھنا شروع کی تو سادھو کی کارستانیو [illegible] میرے دماغ میں بھی آگ بھر دی۔ گو شگفتہ کے [illegible] انکشاف نے بھی مجھے دہلا دیا تھا مگر وہ میرے سام [illegible] حیثیت نہیں رکھتی' میں تو تمہیں سادھو کے ہتھکنڈوں [illegible] بچانا چاہتی تھی۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ سنہرے بابا میر [illegible] ضرور کریں گے۔ میں نے ان سے التجا کی تھی کہ وہ مج [illegible] لیے نارمل زندگی گزارنے کی دعا کریں۔" وہ لمحہ بھر کو ر [illegible] میں بول اٹھا۔

"کیسے۔ تم کب گئیں ان کے پاس۔ جھوٹ بولتی [illegible]

"اتنی طاقت تھی میرے اندر کہ میں اپنے کمر [illegible] پڑے پڑے بھی کسی سے ذہنی رابطہ بحال کر سکوں۔" [illegible] کے ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ بکھر گئی۔ "اب [illegible] دعاؤں نے مجھے شگفتہ کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی [illegible] تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکے گی وقار! جبکہ میں قدم [illegible] تمہاری حفاظت کروں گی۔"

میں اس سے یہ سن کر ساکت رہ گیا۔ یہ میرے [illegible] انکشاف تھا۔ وہ میرے بارے میں اس انداز سے [illegible] ہے' یہ مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا تھا۔ اس انکشاف [illegible] میرے پرسکون ذہن کو ایک بار پھر بے چینیوں میں جک [illegible]

"کوثر! تم میرے بارے میں غلط سوچ رہی ہو۔ م [illegible]

نہیں بس..."

"آگے کچھ مت کہنا وقار!" وہ بپھر کر بولی۔

"کوثر!"

"چلے جاؤ وقار!" اس نے دھیرے سے کہا۔ "فی الوقت اس موضوع پر گفتگو بیکار ہے۔ تم جاؤ۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ میں تو یہی چاہتی ہوں وقار کہ میں اور تم مل کر ایسی طاقت بن جائیں کہ ساری دنیا ہمارے قدموں میں ہو۔ ویسے میں اب بھی یہی کہوں گی کہ وہاں جانے کی بجائے یہ سب تم یہاں مجھ سے بھی سیکھ سکتے ہو۔"

"شکریہ کوثر! مجھے تمہارے خیالات جان کر دکھ ہوا۔ میں دنیا کو اپنے قدموں میں گرانے کا کوئی شوق نہیں رکھتا۔ میں تو شیطانی قوتوں کو توڑنا چاہتا ہوں۔ انسانیت پر ضرب لگانے والوں کو تباہ کرنے کا خواہشمند ہوں۔ سادھو صرف اس لیے میرا دشمن نہیں کہ مجھے ڈراتا رہتا ہے بلکہ میں اس لیے اسے دشمن تصور کرتا ہوں کہ اس نے رحیمو جیسے معصوم اور بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس نے خورشید چاچا اور لڈن کو محض اس لیے مار ڈالا کہ وہ میرے مخلص تھے۔ وہ شگفتہ کی معصوم اور مظلوم روح کو اپنے قبضے میں کر کے شیطانی کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ اگر اس نے شگفتہ کو قابو کر لیا کوثر تو۔ تو وہ جانے کتنی معصوم دوشیزاؤں کے لیے تباہی کا طوفان بن کر ابھرے گا۔"

"میں کب اسے چھوڑنا چاہتی ہوں۔ میری بھی خواہش یہی ہے، بس فرق ہے تو صرف اتنا کہ مجھے تم سے دلچسپی ہے اور میں تمہاری طرف بڑھنے والا ہر وہ قدم روک دینا چاہتی ہوں جو تمہیں کسی بھی قسم کا نقصان پہنچائے۔ جانتے ہو میں نے تمہیں سنہرے بابا کے پاس جانے کا کہا تھا تو یہ بات میرے علم میں تھی کہ سادھو راستے میں تمہیں پریشان کرے گا، میں چاہتی تو تمہیں بتا دیتی مگر وقت کم تھا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ سب کرنے کے باوجود تمہاری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ یہ بات سنہرے بابا بھی جانتے تھے اسی لیے انھوں نے مجھ تک یہ پیغام پہنچایا تھا۔ وہ جب چاہیں مجھ تک کوئی بھی پیغام پہنچا سکتے ہیں۔"

وہ شاید ابھی اور بھی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر جہانی آپا نے آ کر ہماری گفتگو کو روک دیا۔ اماں مجھے بلا رہی تھیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر جہانی آپا کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ میں کوثر کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے خیالات اس قسم کے ہوں گے اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔ نہ معلوم کیوں میں ایک عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا جس میں خوف اور اندیشہ شامل تھا۔ آنے والے لمحوں کی آہٹ کسی دھمک کی طرح محسوس ہوئی تھی۔

وہ رات میں جانتا ہوں کہ میں نے کیسے گزاری۔ رات کے کھانے پر جو گفتگو ہوتی رہی وہ میرے ذرا بھی پلے نہ پڑی بلکہ میرا ذہن کوثر کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی ایک تیز چبھن اور پراسراریت میں الجھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کبھی مجھے اپنے لیے تضحیک محسوس ہوتی، کبھی چیلنج اور کبھی پیار، میں جتنی دیر وہاں بیٹھا، بے چین رہا۔ حتیٰ کہ چچا، چچی تایا اور اماں میں جائیداد کے بٹوارے کے سلسلے میں بھی بات ہوئی، میں کوشش کے باوجود ان کی باتوں پر دھیان نہ دے سکا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ آج کی گفتگو خاصے پرامن ماحول میں ہوئی ہے۔

کاش کوثر نے مجھ سے ایسی باتیں نہ کی ہوتیں، تو میں اس وقت کتنا پرسکون ہوتا، نہ معلوم مجھے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب میرا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ اب مجھے سادھو ہی کا نہیں کوثر کا بھی مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے اس خیال کو بار بار ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ رات کو سونے سے قبل میں نے اماں کی دی ہوئی تسبیح لی اور پھر رات گئے تک اس پر اسم اللہ کا ورد کرتا رہا۔ رہ رہ کر کوثر کی آنکھیں میرے ذہن کے پردے پر چمکنے لگتی تھیں پھر شگفتہ کی معصوم مگر سہمی ہوئی صورت نگاہوں میں گھوم جاتی تو بے چینی اپنی حدوں کو چھونے لگتی۔ ایک اطمینان البتہ میرے لیے بڑا جانفزا تھا کہ وہ لاش شرف الدین کی نہیں تھی گویا شرف الدین محفوظ تھا۔ میں ساری باتوں کو ذہن سے جھٹک کر اس کی خیریت کی دعائیں کرنے لگا۔

وہ رات میری زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ کوثر نے کہا تھا کہ سادھو کی طاقت ٹوٹ رہی ہے۔ اس کی اس بات نے مجھے کافی حوصلہ دیا تھا۔ دوسری طرف سنہرے بابا کا دست شفقت میرے لیے یقینی اطمینان کا باعث تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے باوجود سادھو مجھے گمراہ کرنے کے لیے پریشان ضرور کرے گا۔ میں ہر قسم کی انہونی کے لیے تیار تھا اور اس بار فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کے ہتھکنڈوں کے آگے ہمت نہیں ہاروں گا۔ ایسے ہی عہد کرتے کرتے میں جانے کب سو گیا۔

وہ ایک بھیانک خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی

گھنے جنگل میں تنہا سفر کر رہا ہوں۔ ہیبت ناک خاموشی میرے رگ و پے میں اترتی جا رہی ہے۔ فضا میں بے پناہ حبس ہے اور ذرا سی آواز بھی دھماکے سے کم محسوس نہیں ہو رہی' ایسے میں اچانک ہی مجھے بھاری قدموں کی آہٹ یوں سنائی دیتی ہے جیسے میرے قریب ہی کہیں بم پھٹ رہے ہوں۔ میں اس خوفناک آواز سے ڈر کر بھاگنے لگتا ہوں مگر یہ آواز اسی تسلسل سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ اچانک میں ایک بہت بڑے درخت کے پاس پہنچ کر رک جاتا ہوں۔ اس درخت کی کھوہ میں سے گاڑھا دھواں نکل رہا ہے۔ میں حیرت سے دیکھتا ہوں اور پھر یہ گاڑھا دھواں دھیرے دھیرے چھٹنے لگتا ہے۔ میرے تعاقب میں آنے والے قدموں کی آہٹ بھی اچانک تھم جاتی ہے۔ میری نگاہ کھوہ کے اندر بیٹھی کوثر پر پڑتی ہے۔ پہلی نگاہ میں' میں اسے پہچان نہیں پاتا اس لیے کہ اس کے جسم پر جوگیا رنگ کا ایک کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس نے چہرے پر بھبھوت ملا ہوا ہے اور اس کے ہونٹوں کے کناروں سے لہو کے قطرے ٹپک کر اس کی گود میں رکھے ایک پیالے میں گر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور لب تیزی سے ہل رہے ہیں۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہی ہے۔ میں اسے آوازیں دیتا ہوں مگر وہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتی۔ البتہ اس کے لب اور زیادہ تیزی سے ہلنے لگتے ہیں۔ میں اسے چھو کر' جھنجوڑ کر ہوش میں لانا چاہتا ہوں اس لیے اس کے قریب جاتا ہوں اور تبھی میری نگاہ ایک کونے میں پڑتی ہے جو دور سے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں وہاں شگفتہ کو الٹا لٹکا ہوا دیکھتا ہوں اور بری طرح چیخنے لگتا ہوں۔ شگفتہ شاید بے ہوش ہے' وہ میری آواز نہیں سنتی۔ میں کوثر کو جھنجوڑ دیتا ہوں۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی کوثر کا جسم شعلوں میں گھر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی پورے درخت میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں شگفتہ کی کرب ناک چیخیں سن کر اسے بچانے کی کوشش کرتا ہوں مگر یوں لگتا ہے جیسے میرے پیروں کو کسی نے رسیوں سے جکڑ دیا ہے۔ میں اپنے پیروں کی طرف دیکھتا ہوں تو خوف سے بری طرح چیخنے لگتا ہوں اس لیے کہ کئی سیاہ ناگ میرے پیروں سے لپٹے ہوتے ہیں۔

عین اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ بدن اس ٹھنڈ میں بھی پسینے میں شرابور تھا' سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میرا بدن دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو یوں لگا جیسے واقعی میرے پیروں کو کسی نے جکڑ رکھا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا میرے پیر آزاد تھے مگر میں انھیں حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے پاجامے کے پائنچے اوپر کیے تو پنڈلیوں پر رسی کے بل دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب سے پہلے واقعی کسی نے میری پنڈلیوں پر رسی کو کس کر لپیٹا ہوا تھا۔ میری دونوں ٹانگیں سن تھیں۔ میرے قریب ہی تایا سوئے ہوئے تھے۔ حلق خشک ہو جانے کی وجہ سے مجھے عجیب سی کھانسی آ رہی تھی۔ ابکائیاں آ رہی تھیں۔ شاید میری آواز سن کر ہی ان کی نیند خراب ہوئی تھی۔ وہ کروٹ بدل رہے تھے تبھی میں نے بڑی مشکل سے انھیں آواز دی۔ وہ میری ہلکی سی آواز سن کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا ہوا وقار الحسن!"

"پا۔۔۔ پانی۔۔۔ تا۔۔۔ یا۔۔۔" میں کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا اپنا حلق پکڑے لیٹا رہا۔

تایا گھبرا کر اٹھے۔ پہلے وہ میری طرف لپکے پھر بھاگ کر صراحی کے قریب پہنچ گئے۔ چند ہی لمحوں بعد میں چاندی کا کٹورہ منہ سے لگائے پانی پی رہا تھا۔ بھرا ہوا کٹورہ لمحہ بھر میں خالی کر کے بھی میری پیاس کی شدت میں کمی نہ ہوئی۔ میں نے اور پانی منگوایا۔ تایا اس دوران میں میری پیٹھ سہلا رہے تھے۔ میں نے دوسرا کٹورہ بھی ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا اور بے دم سا ہو کر بستر پر گر گیا۔

"کیا بات ہے وقار الحسن! تم ٹھیک ہو ناں؟" وہ بہت پریشان تھے۔ "تمھاری اماں کو اٹھاؤں؟" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ اماں پریشان ہوں۔ جو کچھ مجھ پر بیتا تھا ایک خواب تھا۔ "میں ٹھیک ہوں تایا! میں نے بڑا بھیانک خواب دیکھا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ خود کو سنبھالو۔ خواب ہی تھا ناں۔" تایا اب کافی مطمئن ہو گئے تھے ورنہ تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ "ویسے خواب کیا تھا؟" انھوں نے اپنے پلنگ کی چادر کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

میں انھیں خواب سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کوثر کے متعلق ہر بات ان سے چھپا چکا تھا' اب کیسے بتاتا کہ میں نے خواب میں کوثر کو ایسی حالت میں دیکھا ہے۔

"کچھ نہیں تایا۔ بس دیکھا تھا کہ جنگل میں جا رہا ہوں کہ اچانک سانپ پیروں سے لپٹ گئے۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"ہوں۔ سانپ دیکھنا دشمن دیکھنے کے مترادف ہے۔ وہ تمھارے پیروں سے لپٹ گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جس سفر پر جا رہے ہو' تمھارا دشمن تمھیں روکنے کی کوشش کرے گا۔ وقار الحسن! تم جو کچھ بتا چکے ہو اس سے ثابت یہی ہوتا ہے کہ سادھو تمھارا تو بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کا بس تمھارے سوا جس پر بھی چلتا ہے وہ اسے ضرور نقصان پہنچاتا ہے۔ تم اس سلسلے میں قطعی تردد نہ کرو۔ ہمارا اللہ والی ہے۔ تم ایک نیک اور وسیع تر مفاد میں یہ کام کرنے جا رہے ہو' ایسے کاموں میں چھوٹے موٹے نقصان کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔ ہندوؤں کے کچھ بھی عقائد ہوں' ہمارا ایمان تو یہی ہے کہ جس کی بھی موت آتی ہے اللہ کے حکم کے مطابق آتی ہے اور جس طرح کی موت لکھی گئی ہے ویسی ہی آتی ہے۔ لڈن اور خورشید چاچا کی موت ایسے ہی لکھی تھی سو آ گئی۔ حوصلہ کرو بڑا اور خدا سے لو لگائے رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔"

تایا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ نہ معلوم یہ کیا خوف تھا جو خواب بن کر میری نیند پر مسلط ہو گیا تھا۔ کوثر یا کوئی بھی اگر چاہے بھی تو میرا یا شگفتہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں جانتا تھا کہ میرا دماغ اپنے اندر چکرانے والے وسوسوں اور اندیشوں کو خواب بنا کر مجھے خوفزدہ کر رہا ہے مگر پھر اچانک مجھے اپنی پنڈلیوں کا خیال آ گیا جن پر رسی کے بل بھی اب کے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو حرکت دی۔ اب وہ ٹھیک تھیں اس لیے پھر یہ خیال غالب ہو گیا کہ شاید یہ بھی میرے اپنے دماغ کا کرشمہ تھا۔ میں یہ بات جان چکا تھا کہ کسی بھی دباؤ سے متاثر دماغ آدمی کے کنٹرول سے باہر ہوتا ہے اور اسی دباؤ کے تحت کام کرتا ہے۔

صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی اس لیے میں اٹھ بیٹھا۔ اس خواب نے میرے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ میں نہا کر خود کو پرسکون کرنا چاہتا تھا۔ تایا کی بھی شاید نیند اڑ چکی تھی۔ انھیں ویسے بھی میرے ساتھ جانا تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے بھی سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور حقے کی چلم لے کر اسے تازہ کرنے چل پڑے۔ میں تولیہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔ پانچ منٹ تک ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے رہنے کے بعد میں نے خود کو کافی پرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسی دوران میں مجھے خیال آیا کہ مجھے کوثر کو

چیک تو کرنا چاہیے تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور باہر چلا آیا۔

تایا چلم تازہ کر چکے تھے۔ میں سر پونچھتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ "تایا' فجر میں کتنی دیر ہے؟"

"ابھی تو کافی وقت پڑا ہے۔" انھوں نے چلم حقے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم فجر کی نماز وہیں جا کر پڑھیں گے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر اپنی اماں کو اٹھا دو۔" انھوں نے حقے کا کش لے کر کہا۔

اماں اٹھ چکی تھیں۔ میں ان کے کمرے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ کمرے سے باہر آ گئیں۔ میں نے ان سے ناشتے کے لیے کہا۔ وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ تایا کسی گہری سوچ میں تھے۔ میں موقع غنیمت جان کر کوثر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کا بستر خالی تھا۔ ایک نگاہ میں وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ کمرے میں تنہا رہتی تھی۔ اس وقت بھی جب وہ معذور تھی' اس نے کبھی تایا تائی کے ساتھ سونے کو پسند نہیں کیا تھا' دوسری بات یہ کہ وہ ہمیشہ اندھیرا کر کے سوتی تھی جبکہ اس وقت اس کے کمرے میں لالٹین کی دھیمی لو کمرے میں ملگجی روشنی کا باعث تھی۔ روشنی کم ہونے کے باوجود پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔

میں چند قدم آگے بڑھا اور اسے نیچے فرش پر دوزانو بیٹھا دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ بالکل اسی انداز میں بیٹھی تھی جس طرح میں نے کچھ دیر پہلے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ میرا دل کسی نہ معلوم خدشے سے دھڑکنے لگا۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اس کے عین سامنے ایک سفید کپڑے پر تام چینی کا ایک پیالہ رکھا تھا۔ اس پیالے میں سرسوں کا تیل تھا۔ ایک کٹورے میں پانی رکھا تھا۔ اسے شاید اب تک میری موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا اس لیے کہ وہ بڑے انہماک سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر کٹورے کا پانی سرسوں کے تیل میں ملا دیا پھر جانے کہاں سے ایک چاقو نکال کر اس چاقو سے تیل اور پانی کو ہلانے لگی۔ اس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ [illegible] چھوٹے سے برتن میں کانچ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پڑے

تھے۔ اسی برتن میں، میں نے سبز رنگ کی چوڑی کے ٹکڑے بھی دیکھے۔

اچانک اس کی آواز ذرا سی بلند ہو گئی اور مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں بہت سی مکھیاں گھس آئی ہوں۔ ان کے بھنبھنانے کی سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ جی چاہا کہ اسے جھنجوڑ کر ہوش میں لے آؤں۔ یہ خواہش اس قدر تیزی کے ساتھ ابھری کہ میں آگے بڑھ آیا۔ تبھی میری نگاہ اس پیالے پر پڑی جس میں وہ ہاتھ ہلا رہی تھی اور یہ دیکھ کر میں اچھل پڑا، جس پیالے میں لمحہ بھر پہلے میں نے سرسوں کا تیل دیکھا تھا وہ اب سرخ سرخ خون سے لبریز تھا۔ کوثر اب بھی میری موجودگی سے بے خبر تھی۔ اس نے چاقو بڑھا کر خون سے بھرا پیالہ اٹھا لیا اور غالباً وہ اسے دوسرے برتن میں ڈالنے ہی والی تھی کہ میرا ہاتھ بے ساختہ اس کے کاندھے پر پہنچ گیا پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا ہاتھ نہ ہو یعنی میرے اختیار میں نہ ہو کیونکہ میں نے اسے بری طرح جھنجوڑ دیا تھا۔ پیالے میں بھرا خون سفید کپڑے پر چھلک گیا اور دوسرے ہی لمحے پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زور کی آواز پیدا کرتا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

گہری خاموشی میں کئی طرح کی آوازیں گڈمڈ ہو گئیں۔ ایک عجیب سا شور تھا جس نے لمحہ بھر کو دل دہلا کر رکھ دیا۔ پیالے کے گرنے کی آواز کے ساتھ ہی کوثر کے منہ سے بڑی کربناک قسم کی آہ نکلی تھی۔ دوسرا برتن بھی لڑھک گیا تھا اور اس برتن میں پڑے کانچ کے ٹکڑے بھی برتن لڑھک جانے سے فرش پر گر گئے تھے۔ میں گھبرا کر ایک دم ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ ان بہت سے آوازوں کے ختم ہوتے ہی کوثر میری طرف جھپٹی۔ "وقار الحسن!" اس کی آواز کسی گدھ کی تیز اور چبھتی ہوئی آواز کی مانند محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اس کے چہرے پر بھبھوت ملا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھیانک نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں پھیلی سرخی میں شعلے سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔ غصے کے مارے اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا تھا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ میں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ تایا اور اماں تک اس کی چیخ و پکار پہنچ گئی ہو گی اور وہ لوگ اب آتے ہی ہوں گے۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے جھٹکے دینے لگی۔ اس میں اس وقت بے پناہ طاقت تھی۔ اس کے جھٹکے دینے کی وجہ سے میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے تھے۔ وہ مجھے برابر جھٹکے دے رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کے اندر ایک طوفان آیا ہوا ہے۔ جیسے کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ رہی ہو۔ میرے کرتے کا گلا میری گردن میں پھندا بن گیا ہو۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں بالکل بے بس ہو گیا، میرے ہاتھ پیروں میں بالکل جان نہ رہی۔ اچانک اس نے مجھے زور سے دھکا دیا اور اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جا گرا مگر میں نے اٹھ جانے میں بھی دیر نہ لگائی، میں حیرت سے کوثر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نازک اندام سی لڑکی بے پناہ قوت کی مالک تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ مجھ جیسے لڑکے کو اتنی دور پھینکنے والی یہ نازک سی لڑکی تھی۔ حیرت اور خوف سے میری زبان گنگ تھی۔ مجھے یہ بھی حیرت تھی کہ اب تک اماں یا تایا کیوں نہیں آئے۔ وہ بڑی زور سے چیخی تھی۔

اچانک اس کی سسکیاں گونجنے لگیں اور وہ بستر پر گر کر رونے لگی۔ "یہ کیا کیا تم نے۔ میری رات بھر کی محنت پر پانی پھیر دیا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ میں آہستہ قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اسے بتانا چاہا کہ میں نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیوں ایسا ہو گیا۔ وہ مجھے اپنے قریب پا کر پھر چیخ اٹھی اور اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ "مت میرے قریب۔ مت آنا۔"

"کوثر!"

"جاؤ چلے جاؤ۔ جاؤ۔" وہ پھر زور سے چیخی۔

"آہستہ بولو۔ تایا اور اماں جاگ رہے ہیں۔"

"ان کے فرشتوں تک بھی میری آواز نہیں پہنچ سکتی۔" وہ پھر ہذیانی انداز میں چیخی۔ "اور۔ اور تم نے بہت برا کیا ہے وقار۔ تم نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لی ہے مگر۔ میں اس خوشی سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ تمہیں مجھ سے اب کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

اس کے آخری جملے نے میرے ہوش اڑا دیے۔ میں جان گیا کہ شاید وہ مجھے قابو کرنے کے لیے کوئی عمل کر رہی تھی یا وہ واقعی شگفتہ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتی تھی گویا خوف زدہ کر دینے والا خواب سچا تھا۔

"میں۔ میں شگفتہ کو۔۔۔"

"کوثر!" وہ جانے کیا کہنے والی تھی کہ میں چیخ اٹھا۔ "تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ کچھ بھی نہیں۔" اس کی باتوں نے میرا خدشہ درست ثابت کر دیا تھا۔

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ اور پھر ہنستی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف تیز ہواؤں کے جھکڑ سے چلنے لگے ہوں۔ میں وحشت زدہ ہو کر کبھی اسے اور کبھی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے بستر پر گر گئی۔ میں دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس سفید کپڑے میں آگ لگ گئی جس پر پیالے میں بھرا خون گرا تھا۔ آگ کے شعلے اور دھواں دیکھ کر اس کی ہنسی کو اچانک بریک لگ گیا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں اس کپڑے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا اور میں الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں کوثر کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا مگر میری ہمت نہ ہوئی کہ میں وہاں کھڑا رہتا یا اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا۔

میں جونہی برآمدے میں آیا اماں چائے اور پراٹھے لے آئیں۔ ان کے چہرے سے بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا کہ انھیں گھر میں کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا ہو یا انھوں نے کوثر کی چیخوں کی آواز سنی ہو۔ وہ بالکل نارمل تھیں۔ "چلو ناشتا کرو۔" انھوں نے میری جانب دیکھے بغیر کہا اور ناشتا لیے ہوئے تایا کی طرف بڑھ گئیں۔

میں ان کے پیچھے چلتا ہوا تایا کے قریب جا بیٹھا۔ وہ اب تک کسی گہری سوچ میں غرق تھے، ہمارے قریب پہنچنے پر چونک کر اٹھ بیٹھے۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کوثر کی آواز یا میری آواز ان لوگوں تک کیوں نہیں پہنچ سکی۔ بہرحال وقت کم تھا، مجھے ہر حال میں جانا تھا اس لیے میں ناشتا کرنے لگا۔ گو حلق سے نوالے نہیں اتر رہے تھے۔ ذہن کوثر کی طرف سے پریشان تھا مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور ناشتا نہ کرتا تو اماں اور تایا مجھ سے ناشتا نہ کرنے کی وجہ پوچھتے اور کچھ ہی دیر پہلے تو میں نے اماں سے ناشتے کے لیے کہا تھا۔ ویسے میں بھی نہیں جانتا تھا کہ وہاں حجرے میں میرے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہو گا اس لیے میں نے کسی نہ کسی طرح چند نوالے کھا کر چائے پی لی۔

ناشتا کرتے ہی ہم جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اماں نے کپڑے میں لپٹا ہوا کڑا اور مجسمہ میرے حوالے کر دیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس جس میں میری ضرورت کی چیزیں تھیں مجھے تھما دیا پھر کچھ پڑھ کر میرے اور تایا کے اوپر پھونکا اور افسردہ چہرے سے مجھے رخصت کر دیا۔ ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں ان کی کیفیت سے واقف تھا اس لیے انھیں تسلی دی کہ میرے بارے میں قطعی تردد نہ کریں۔ یہاں سے میں تایا کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ یقیناً آ کر میری خیریت کی اطلاع دیں گے اور وہاں حجرے میں، میں تنہا نہیں ہوں گا۔ سنہرے بابا چلے بھی گئے تو جن بابا میرے پاس ہوں گے خواہ وہ بلی کی شکل میں ہوں یا فقیر بابا کی شکل میں۔ میری تسلیاں سن کر اماں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم انھیں خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل گئے۔

گلی سنسان تھی۔ کسی سواری کے ملنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ میں اور تایا خاموشی سے چل پڑے۔ سنسان گلی کے سناٹے میں ہمارے قدموں کی آوازیں عجیب پراسرار سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ ابھی شاید صبح ہونے میں کافی دیر تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم غالباً پون گھنٹے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے تایا کے اتنی دور پیدل چلنے پر تشویش تھی اس لیے میں ہلکی رفتار سے چل رہا تھا۔

"تایا! اس وقت کوئی سواری نہیں مل سکے گی۔ کیا آپ اتنی دور پیدل چل سکیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میاں چل لیں گے بھلا نہ چلیں گے تو کیا کریں گے۔ ٹانگوں میں تو کافی جان ہے مگر زیادہ نہ چلنے کی وجہ سے عادت نہیں رہی ورنہ زمینوں پر تو میں میلوں پیدل چلا کرتا تھا۔"

"واپسی پر تانگا لے لیجیے گا۔"

"ہاں۔ دیکھیں گے۔" انھوں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی سوچ میں ہیں۔ ان کا ذہن کسی بات میں الجھا ہوا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں تایا؟" میں نے محض اس لیے پوچھ لیا کہ خاموش سفر کافی طویل اور تھکا دینے والا ہوتا ہے۔

"میاں وقار الحسن! میں کچھ روز سے بہت الجھن میں ہوں۔"

"کیسی الجھن تایا!"

"کوثر کی طرف سے کافی تشویش ہے۔ میں اس میں بڑی

واضح تبدیلیاں بھی محسوس کر رہا ہوں۔"

ان کی بات سن کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ "کیسی تبدیلیاں تایا!۔ مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔" میں نے ہنسنے کی کوشش کر کے ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنا چاہا۔

انھوں نے سر گھما کر مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ "شاید تم نے محسوس نہیں کی ہوں۔" انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مگر میں ان تبدیلیوں کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں۔ اسے اب کچھ ایسی چیزوں کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے جن کے استعمال کے بارے میں بات کچھ واضح نہیں ہوتی۔ پھر اس کا رویہ' اس کی آنکھوں کی بے چینی۔۔ اس کا گھنٹوں تنہا اور اندھیرے کمرے میں پڑے رہنا' پہلے تو مجبوری تھی مگر اب۔۔ اب اسے کوئی مجبوری نہیں ہے۔ خدا نے اسے جس نعمت سے نوازا ہے اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ہواؤں میں اڑتی پھرتی مگر وہ۔ اس کا رویہ ناقابل فہم ہے۔"

"آپ کا وہم ہے تایا۔۔ اس کی تنہائی میں پڑے رہنے' مستقل کچھ نہ کچھ سوچنے اور پڑھنے کی عادات پختہ ہو چکی ہیں۔ یہ ایک دم نہیں جا سکتیں۔" میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"نہیں وقارالحسن! اس کا رویہ فطرت کے خلاف ہے۔ اسے تو گھومنا پھرنا چاہیے تھا۔ وہ تم سے باہر لے جانے کی ضد کرتی' گھومنے پھرنے کے لیے خاندانی روایات یا طور طریقوں کو بھی پس پشت ڈال دیتی۔ روتی' چیختی' چلاتی تو میں مطمئن ہوتا کہ وہ عین انسانی فطرت کے مطابق ایسا کرتی مگر۔۔ خیر چھوڑو۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ نارمل نہیں رہی۔"

میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں مزید سوچ سوچ کر پریشان ہوں۔ ویسے یہ اندازہ مجھے تھا کہ کوثر کی پراسراریت بہت جلد سب پر عیاں ہو جائے گی۔ وہ جو راہ اختیار کر چکی تھی وہ واقعی انتہائی خطرناک تھی۔ کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں اس کا بھانڈا پھوٹ ہی جاتا تھا۔ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ اب ہم اپنی گلی عبور کر آئے تھے۔ چند قدم کے بعد ہی پکی سڑک تھی۔ اس سڑک پر کافی روشنی تھی' کم از کم اس گلی سے زیادہ روشنی تھی۔ جونہی میں نے سڑک پر قدم رکھا دور سے آتی ٹاپوں کی آواز سن کر پورے بدن میں سنسناہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ یہ آواز بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں کل صبح سن چکا تھا۔ میں مضطرب ہو گیا۔ تایا کو میں سب کچھ بتا چکا تھا اس لیے ان آوازوں کو سن کر وہ بھی چونک اٹھے۔

"یہ۔ یہ آواز۔" انھوں نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر چپ ہو گئے۔

میں خود کو آنے والے خوفناک لمحات کے بارے میں تیار کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ سادھو آج زیادہ جذباتی ہو گا۔ آج میرے پاس شگفتہ کا وہ کڑا اور مجسمہ موجود تھا جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے اتنا لمبا چوڑا کھڑاگ پھیلایا تھا۔ جو کچھ میرے ساتھ کل ہو چکا تھا' وہی اتنا خوفناک تھا پھر آج تو جو بھی ہوتا وہ کم تھا۔ میں نے اس کڑے اور مجسمے کو جلدی سے اٹیچی کیس میں رکھ لیا اور اٹیچی کیس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گھوڑا بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہا ہو۔ تایا نے پلٹ کر دیکھا۔ میں اب تک پیچھے دیکھنے کی جرات نہیں کر سکا تھا۔

"تانگا ہے۔" تایا نے سرگوشی کی۔

"تایا اس طرف آ جائیں۔" میں نے کنارے ہوتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں کچے حصے پر اتر کر بالکل کنارے کنارے چلنے لگے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔ میرا ساتھ دیتے دیتے تایا کی سانس پھول گئی۔

تانگا بہت قریب آ چکا تھا۔ میں اس کی ٹاپوں کی آواز سے دہلا جا رہا تھا۔ میری ٹانگیں ابھی سے کپکپانے لگی تھیں۔ میں خوفزدہ نہیں تھا مگر پھر بھی بدن قابو میں نہیں تھا۔ اچانک میں نے گھوڑے کی رفتار کو مزید تیز ہوتے محسوس کیا اور پھر چشم زدن میں تانگا ہمارے برابر پہنچ گیا اور رکے بغیر بہت تیز رفتاری سے آگے بھی بڑھ گیا۔ تیز رفتار تانگے میں بیٹھے ہوئے جن لوگوں کی جھلک مجھے نظر آئی تھی انھیں دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ تانگے بان کے برابر بیٹھے صاحب شرف الدین کے بادا اور پیچھے بیٹھی خواتین جو سیاہ برقعوں میں ملبوس تھیں یقیناً شگفتہ اور اس کی اماں تھیں۔

"یہ۔۔ یہ لوگ۔۔ یہاں۔۔ اس وقت؟" شاید تایا بھی انھیں دیکھ چکے تھے ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ مجھے ہی وہم ہوا ہے۔

"تایا! یہ لوگ کون تھے؟" میں نے اپنے شبے کو یقین میں بدلنے کے لیے پوچھا۔

"ارے میاں تانگے والے کے برابر میں یقیناً شرف الدین کے بادا تھے۔ خواتین۔۔ ممکن ہے شرف الدین کی اماں اور شگفتہ ہوں مگر یہ لوگ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟" تایا بول رہے تھے اور میں حیرت سے دور جاتے تانگے کو دیکھ رہا تھا۔

"یا اللہ خیر کرنا۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"اللہ خیر کرے گا۔ تم خود کو پرسکون رکھو۔" تایا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

تانگا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے قریب سے ایک طوفان گزر کر گیا ہو۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ٹوٹ جانے والا سناٹا دوبارہ پھیلا تو بہت گہرا اور ہیبت ناک تھا۔ میں اور تایا خاموش تھے۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ اس وقت یہاں کیسے پہنچے۔ رات کو کوئی گاڑی یا بس امروہہ سے یہاں نہیں آتی تھی۔ ہزاروں سوال میرے دماغ میں ڈنک مارنے لگے کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں۔۔ کیا ہو گیا۔ ان کے ساتھ شرف الدین کیوں نہیں تھا۔ کہیں شرف الدین کو تو۔ اس سے آگے سوچتے ہوئے مجھے جھرجھری سی آنے لگی۔ وقت ایسا نہ تھا کہ میں فرقان کے گھر جا کر معلوم کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ فرقان کے گھر ہی گئے ہوں گے۔ میں نے تایا سے کہہ دیا کہ وہ واپسی پر فرقان کے گھر ضرور ہو لیں۔ تایا فرقان کی بہن کی شادی میں وہاں جا چکے تھے۔ گھر جانتے تھے۔ انھوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ واپسی پر ضرور وہاں جائیں گے۔ اس یقین دہانی کے باوجود میں سوچ رہا تھا کہ سنہرے بابا یا فقیر بابا سے ذرا دیر کی اجازت ضرور لینے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر اجازت مل گئی تو فرقان کے گھر جا کر معلوم کروں گا کہ کیا ہوا' ان لوگوں کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کل دیکھا تھا وہ حقیقت تھی۔ میں سخت مضطرب تھا اور تایا کی بے چینی کو محسوس کر رہا تھا لیکن ہم نے اپنی رفتار کم نہیں کی۔

ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ اچانک گہرا سناٹا پھر دور سے آتی ٹاپوں کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ اس بار میں نے بھی چونک کر پیچھے دیکھا۔ تایا بھی پلٹ پڑے تھے۔

"تایا! ممکن ہے یہ۔۔"

"تم فکر نہ کرو۔" تایا شاید میری بات سمجھ گئے تھے۔

اب تک صرف ٹاپوں کی آواز ہی آ رہی تھی۔ سڑک اب بھی سنسان تھی۔ تانگا نگاہوں سے اوجھل تھا مگر جلد ہی میں نے دیکھا کہ دور سے تانگا آ رہا ہے۔ آنے والے تانگے کی رفتار بھی کافی تیز تھی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ سناٹا پرشور آوازوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس بار ٹاپوں کی آوازوں کے ساتھ ہی گھنگروں کے بجنے کی آواز بھی کافی تیز تھی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے گھوڑوں کے پیروں میں باندھے گئے گھنگروؤں کی آواز ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ تانگا قریب آ چکا تھا۔ میں اور تایا بے اختیار رک گئے اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تانگا ہمارے برابر سے گزر گیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہی بے پناہ دھول سی اڑی اور ہمارے سامنے دھند کی طرح پھیل گئی۔ تایا پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر چہرے کے سامنے اڑتی دھول کو ہٹانا چاہا اور دوسرے ہی لمحے سامنے کا منظر شیشے کی طرح صاف ہو گیا۔ تانگے میں پیچھے بیٹھی' سیاہ برقعوں میں لپٹی دو خواتین مجھے صاف دکھائی دینے لگیں۔ وہ یقیناً شگفتہ اور اس کی اماں تھیں اسی لیے کہ اس بار ان کے چہروں سے نقاب ہٹی ہوئی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ "تایا۔۔ تایا۔" میں بے اختیار چیخ اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ تایا بھی حیرت سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ اب دھول کا نام و نشان نہ تھا اور دوسرے ہی لمحے میں پھر چونک اٹھا۔ پکی سڑک پر دھول اور گرد کا اٹھنا۔ یوں میرے سامنے پھیل جانا اور پھر اچانک ہاتھ ہلاتے ہی فضا کا شیشے کی طرح صاف ہو جانا۔۔ پھر۔۔ دوسرے تانگے میں بھی شگفتہ اور اس کے اماں بادا کا ہونا۔۔ یہ ساری باتیں دماغ میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"یہ۔۔ تایا یہ سادھو کی کارستانی ہے۔" اس بار میں بہت پرسکون تھا۔ ثابت ہو چکا تھا کہ میرا شرف الدین کے لیے پریشان ہونا بیکار ہے۔

"ہاں۔۔ تم گھبراؤ نہیں۔۔ اب کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟" تایا کی آواز میں اضطراب تھا۔

"ابھی تو کافی فاصلہ ہے تایا۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دور جاتے تانگے سے آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ شگفتہ اور اس کے اماں بادا کی کرب ناک چیخیں گونج

انھیں۔ ان چیخوں کو سنتے ہی میں اور تایا بے اختیار بھاگ پڑے۔ تانگا بیچ سڑک پر آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ گھوڑوں کے اچھلنے، کودنے اور خود کو آزاد کرانے کے لیے چیخنے کی آوازوں نے دل دہلا کر رکھ دیا۔ گھوڑے گھبرا کر بھاگ پڑے تھے پھر تانگا سڑک پر گول دائرے کی شکل میں گھومنے لگا۔

ہم دونوں تیزی سے بھاگ رہے تھے کہ اچانک مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ اٹیچی کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا، میں منہ کے بل سڑک پر گرا اور گرتے گرتے میں نے تایا کو بھی بالکل اسی طرح جھٹکا کھا کر منہ کے بل گرتا دیکھا۔ پھر جیسے زمین نے ہم دونوں کو جکڑ لیا۔ میں نے دور پڑے اٹیچی کیس تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھنا چاہا اور چیخ کر رہ گیا۔ دو سوکھے ہاتھوں کی لمبی اور کھردری انگلیاں میرے ٹخنوں کو جکڑ چکی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے گھر کی بیٹھک میں ایک بار سوکھے سوکھے ہاتھوں نے میرے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے اپنے پیروں کو تن سے جدا ہوتے محسوس کیا اور میری آنکھوں میں اندھیرا پھیلنے لگا۔

"وقارالحسن!" اچانک تایا کی چیخ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے شدید تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے بڑی مشکل سے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کوئی شخص میرے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ پھر میں نے اپنے سامنے کھڑے سائے کو خود پر جھکتے محسوس کیا۔ اس کا چہرہ دھیرے دھیرے میرے قریب آ رہا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور جب اس کا چہرہ میرے بالکل قریب آگیا تو میرا سانس رک گیا۔۔۔ لگا جیسے میرا سر بھک سے اڑ جائے گا۔ میرے اوپر جھکنے والا سوفی صد رحمو تھا۔ میں جو ٹخنوں کی تکلیف سے بے ہوش ہونے لگا تھا۔ سب کچھ بھول بھال گیا۔ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ پہلا خیال تو مجھے یہی آیا کہ یہ بھی سادھو کی شرارت ہے مگر جب میں نے اس کے ساتھ ہی تایا کو بھی خود پر جھکے پایا تو بھونچکا رہ گیا۔

"وقارالحسن! کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" تایا یوں پوچھ رہے تھے جیسے میں یونہی چلتے چلتے گر پڑا ہوں۔ ان کے لہجے یا چہرے پر کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ وہ بالکل نارمل انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہنا چاہا کہ میرے ٹخنوں کو کسی نے جکڑ رکھا ہے مگر میں کہہ نہ سکا اس لیے نہیں کہ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا بلکہ اس لیے کہ میں نے اپنے ٹخنوں کو آزاد محسوس کیا تھا۔ نہ کسی نے انھیں جکڑ رکھا تھا اور نہ ہی اب میرے پیروں میں کوئی تکلیف تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنا اٹیچی کیس قابو میں کیا پھر اس شخص کی طرف پلٹا جسے میں رحمو سمجھ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں تایا!" میں نے مثبت انداز میں جواب دیا۔ میری آنکھیں رحمو کے چہرے پر جمی تھیں۔ "تم۔۔۔ تم کون ہو؟" میں نے اس سے پوچھا حالانکہ یہاں جتنی روشنی تھی اس میں مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور اب مجھے پوری طرح یقین آچکا تھا کہ وہ رحمو ہی ہے۔ میں نے اسے زندگی میں تو غور سے نہیں دیکھا تھا مگر مرنے کے بعد میں اسے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت سے اب تک اگر کچھ فرق تھا تو صرف یہ کہ وہ رحمو کلف صاف ستھرا تھا جب کہ میرے سامنے کھڑے شخص کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ بال بے ترتیب اور بدن لاغر محسوس ہو رہا تھا۔

"میں جی۔ عبدالرب ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ میں شرف الدین کے باوا کے پاس ملازم تھا۔" اس نے دھیمے سے کہا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"تت۔۔۔ تم رحمو ہو۔۔۔ عبدالرب نہیں ہو۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"وہ میرا بھائی ہے۔ میں اسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا مگر بھیا شرف الدین یہاں نہیں ملے۔"

"وقت نہیں ہے وقارالحسن!" تایا اتنا کہہ کر عبدالرب کی طرف پلٹے۔ "ٹھیک ہے میاں! ہمیں بھی ا[illegible]

نہیں تم شرف الدین کے باوا سے پوچھو۔" تایا کی زبانی شرف الدین کے باوا کا ذکر سنتے ہی میں تقریباً اچھل پڑا۔ مجھے یاد آیا کہ میں کب اور کیوں بھاگا تھا اور کیسے گرا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس جگہ دیکھا جہاں میں نے کچھ دیر قبل تانگے سے شعلے نکلتے دیکھے تھے۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ شاید اس وجہ سے میں اس طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا پھر رحمو کے مشکل نے ویسے ہی میرے حواس گم کر دیے تھے۔

"تایا! وہ۔۔۔ وہ تانگا!"

"وہ لوگ شاید فرقان کے گھر گئے ہیں۔" تایا نے سرسری انداز میں کہا پھر عبدالرب سے مخاطب ہوئے۔ "تم نے فرقان کا گھر دیکھا ہے ناں!"

"ہاں میاں جی! میں وہیں سے تو آ رہا تھا۔ مجھے دلی کے لیے ریل پکڑنی ہے۔"

"تو شرف الدین کے باوا ابھی ابھی وہیں گئے ہیں، ان سے جا کر پوچھو اور ہماری جان چھوڑ دو۔ ہم ذرا جلدی میں ہیں۔" تایا بہت زیادہ جھنجلائے ہوئے تھے۔ اتنا کہہ کر انھوں نے میرا ہاتھ تھاما اور تیزی سے سبز گنبد والی مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چند لحوں پہلے ہونے والا واقعہ گویا ہوا نہیں تھا۔ قدم بڑھاتے ہوئے میرا سارا دھیان اپنے پیروں کی طرف تھا جن پر ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے سوکھے سوکھے ہاتھوں کی تپلی اور آہنی قسم کی انگلیوں کی گرفت محسوس کی تھی۔ میں بالکل ٹھیک تھا۔ نہ ٹخنوں میں تکلیف تھی نہ پیروں میں۔ عبدالرب ہونقوں کی طرح ہمیں دیکھتا ہی رہ گیا اور ہم تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئے۔

"تایا! یہ۔۔۔ یہ جو کچھ ہوا تھا۔۔۔ وہ دیکھا آپ نے؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن تم بہت بے وقوف ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی بے وقوفی سے اپنے لیے زیادہ پریشانیاں مول لی ہیں۔ بھئی جب تمھیں پتا ہے کہ سادھو صرف تماشے کرتا ہے اور آج تو ویسے بھی یہ سب متوقع تھا کہ تم یہ مجسمہ اور کڑا سنہرے بابا کو دینے جا رہے ہو، وہ ان سب چیزوں کو ہی حاصل کرنے کے لیے اتنا کھڑاگ پھیلائے ہوئے ہے اور یہ بھی سن لو کہ آگے کا راستہ مختصر ضرور ہے مگر کٹھن بھی ہو سکتا ہے۔ تم کوشش کرو کہ فاصلہ جلد از جلد گھٹ جائے اگر وہ بلی نہ آئی ہوتی تو۔۔۔"

"بلی۔۔۔ کہاں ہے؟" میں خوش ہو گیا۔ جان گیا کہ بعض بابا پہلے ہی کی طرح میری حفاظت پر مامور ہیں انھیں یقیناً سنہرے بابا نے بھیجا ہو گا۔

"بس لمحہ بھر کو وہ سڑک پر بھاگتی نظر آئی تھی اور سڑک پر جلتا ہوا تانگا یوں ہوا ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ پھر میں نے اسے تمھارے پیروں کے پاس دیکھا اور تبھی اندھیرے سے یہ شخص نکل کر تمھاری طرف بڑھا۔ یہ رحمو کون ہے؟ وہی تو نہیں جس کے بارے میں تم بتلا رہے تھے کہ سادھو نے اسے تمھارے ہاتھوں قتل کرایا تھا۔"

"جی تایا۔۔۔ لیکن وہ تو چلا گیا تھا۔" میں بری طرح بوکھلا گیا۔

شاید تایا نے میری بوکھلاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ انھوں نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ میں چہرہ سیدھا رکھے تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ پسینے کی باریک سی لکیر میرے بالوں سے نکل کر کنپٹی کی طرف رینگ آئی تھی۔

"ہوں۔۔۔" انھوں نے یہ سوچ کر ہنکارا بھرا۔ "بہرحال۔ وقارالحسن! میرا خیال ہے کہ سنہرے بابا کے پاس سے آجانے کے بعد تم زیادہ مضبوط ہو جاؤ گے۔ اب فکر نہ کرو۔ خاموش رہو اور آیۃ الکرسی پڑھتے رہو۔ ہمیں روشنی کی پہلی کرن سے پہلے ہی وہاں تک پہنچنا ہے۔ کیوں۔۔۔؟ یہی کہا تھا ناں تم نے؟"

"جج۔۔۔ جی تایا!" وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ان باتوں نے میرے پرسکون اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں خود میں ایک عجیب و غریب قسم کا ہیجان محسوس کر رہا تھا جو آنے والے لحوں میں میرے لیے کمزوری کا باعث بن سکتا تھا۔ یہ بات اماں اور تایا نے گھر سے چلتے ہوئے بھی مجھے سمجھائی تھی کہ جب میں جانتا ہوں کہ سادھو میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا رہے گا تو خود کو پرسکون رکھ کر، دماغ کو حاضر رکھ کر اس کا مقابلہ کروں، اس یقین کامل کے ساتھ کہ مجھے وہ کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ سنہرے بابا نے تاکید کی تھی کہ میرے قدم حجرے کے دروازے پر ہوں تب سورج کی پہلی کرن نکلنی چاہیے۔ میں نے مشرقی سمت آسمان پر نگاہ ڈالی۔ ایک باریک سی چاندی کی پٹی کھڑی جہاں سے وہاں تک چلی گئی تھی۔ گویا صبح کاذب کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ مجھے تو تایا پر حیرت تھی کہ وہ اس وقت جس رفتار سے چل

رہے تھے اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ اب ہم سبز گنبد والی مسجد کی گلی کے کونے تک پہنچ چکے تھے۔ قبل کہ ہم اس گلی کی طرف مڑتے ایک بد ہیت شخص اچانک ہی ہمارے راستے میں آگیا۔ میں اور تایا بے ساختہ ٹھٹک گئے۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے پر بھبھوت ملا ہوا تھا۔ کپڑوں سے عجیب سی ناگوار اور تیز بو نکل کر ہمارے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ سادھو تھا۔ وہی اور اس حلیے کا سادھو جو میں نے اور شرف الدین نے کھنڈر میں دیکھا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ باچھوں میں سفید جھاگ سا بھرا تھا۔ اسے دیکھ کر خوف کی بجائے مجھے کراہیت محسوس ہوئی۔ تایا اسے دیکھ کر بوکھلا گئے تھے اور فقیر قسم کی کوئی چیز سمجھ رہے تھے۔ میری گرفت اٹیچی پر مضبوط ہو گئی' میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"چلو' چلو بابا معاف کرو۔" تایا نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"وقار الحسن! یہ۔ یہ مجھے دے دو۔" اس نے ان کی طرف دھیان دیے بغیر کہا اور ہاتھ اٹیچی کی طرف بڑھایا۔

"اس۔ ارے بھیا باؤلے ہوئے ہو کیا؟ مانگنا ہے تو دھیلا مانگو۔ یہ پورا کا پورا اٹیچی کیس تمہیں دے دیں؟ اتنے بڑے رئیس نہیں ہیں ہم' ویسے اگر ہوتے بھی تو نہ دیتے۔"

تایا نے جھنجلا کر کہا اور اسے پرے دھکیلنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں ایک دم چیخ اٹھا۔ "اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ یہ پلید ہے۔ وہی سادھو ہے یہ۔"

"اوہو۔ تو وہ تم ہو!" تایا نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ "بابا! اتی عمر میں بچوں کو ڈراتے شرم نہیں آتی تمہیں؟ تم مسلمانوں سے لڑ رہے ہو۔ تمہارے یہ ڈھول تماشے ہمیں نہیں ڈرا سکتے۔ یہ تو بچہ ہے؟"

اس نے شرربار نگاہوں سے تایا کی طرف دیکھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ تایا شاید اس کی موجودگی کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے جب کہ میں سخت خوفزدہ تھا۔ کسی شعبدے کی نمائش کی بجائے اس کا خود چلے آنا خالی از علت نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب سخت قسم کا معرکہ بھی ہو سکتا ہے۔

"اجاڑ دوا ، گا تجھے۔ کھنڈر بنا دوں گا آبادیوں کو۔" مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی ہوں۔

"اسے جاؤ ایسا ہی دم خم ہوتا تو بچوں کو ڈراتے نہ پھرتے۔" تایا نے ہاتھ نچا کر کہا۔

میری نگاہیں سادھو پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو جنبش کرتے دیکھا اور پھر جیسے بجلی سی کوندی۔ شائیں کی آواز کے ساتھ ہی تایا کی بے ساختہ چیخ نے میرے حواس گم کر دیے۔ تایا بڑی دور جا کر گرے تھے' یوں لگا تھا جیسے سادھو نے ان پر کوڑے سے وار کیا ہو۔ میں اچھل کر پیچھے ہو گیا تھا۔ اب وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔ میں تایا کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھا بلکہ میرا سارا دھیان اس پر تھا۔ اس نے پھر ہاتھ میری طرف بڑھایا اور تیز سیٹی جیسی آواز میں بولا۔ "وقار الحسن! میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس یہ مجسمہ اور کڑا مجھے دے دو۔ تمہاری حویلی خالی ہو جائے گی۔"

"تم شکنتلا کو اپنے قابو میں کر لو گے۔ یہی ناں! مگر تمہیں اس سے کیا حاصل ہو گا۔ کسی معصوم روح کو قید کر لینا تو تمہارے مذہب میں بھی جائز نہیں ہے۔ میں اسے یہاں کی قید سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ یاد رکھو سادھو! روح دوسری دنیا میں جاتی ہے' یہ اس کی دنیا نہیں ہے۔ جن بندشوں کی وجہ سے وہ یہاں بھٹک رہی ہے' وہ اس کے لیے بڑا عذاب ہوں گی اور تم اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔" جانے مجھ میں اتنی قوت کہاں سے آگئی تھی کہ میں اس کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

"یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے وقار الحسن! میں اپنی جو شکتی کھو چکا ہوں اسے واپس دلانے کے لیے اسے قابو کرنا ضروری ہے۔ اس کا تعلق میرے مذہب سے ہے' تمہارے مذہب سے نہیں کہ تم اس کی روح کو آزاد کرانے کے چکر میں پھر رہے ہو۔ تم اپنی حویلی خالی کراؤ اور بس۔ ورنہ۔"

"ورنہ تم کیا کر لو گے؟" اس سے ہونے والی اس گفتگو نے مجھے ڈھارس بندھائی اور میں بپھر گیا۔

"میں بھی اب تک تمہیں بچہ ہی سمجھ رہا ہوں وقار الحسن!" اس کے ہونٹوں پر اٹک جانے والی رال اس کی ٹھوڑی سے بہہ کر ایک تار کی شکل میں لٹکنے لگی تھی۔ مجھے ابکائی آنے لگی۔ میں نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔ "ورنہ رحیمو کی وہ لاش اب بھی تازہ لاش کی طرح پولیس کو مل سکتی ہے۔ آلۂ قتل سمیت۔ میں تمہیں زندگی بھر کے لیے جیل بھجوا سکتا ہوں۔ تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔ تمہیں میری شکتی کا اندازہ نہیں ہے۔ اس سنہرے بڈھے کے چکر میں آکر تم اچھا نہیں کر رہے ہو' لاؤ یہ چیزیں مجھے دے دو۔"

اس نے پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں پھر دو قدم پیچھے ہو گیا۔ اس دوران میں' میں نے تایا کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ سڑک پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے' میں انھیں اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ سادھو نے میری پریشانی کا اندازہ شاید میرے چہرے ہی سے لگا لیا۔ بڑے نرم لہجے میں بولا۔ "دیکھو وقار الحسن! میں تمہیں ایک ایسی شکتی پردان کروں گا کہ اس دنیا کا کوئی شخص تمہارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ میں تمہیں دنیا بھر کی دولت سے مالا مال کر دوں گا سندر سندر مینکا ایسی حسین عورتوں کو تمہارے قدموں میں لا ڈالوں گا جن کا تم کبھی کلپنا بھی نہیں کر سکتے۔"

میں نے حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "حسین عورت اور دولت تمہارے لیے پرکشش ہو گی۔ مجھے ان دونوں چیزوں سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ تم اس لالچ سے میرے ارادوں کو متزلزل کر سکتے ہو۔"

"مورکھ ہو تم۔ ابھی بچے ہو۔ سندر عورت کے بدن میں لذتوں کے خزانے ہوتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ میں ان خزانوں کے کنارے کھڑا ہوں' ایک سے ایک حسین عورت میری مٹھی میں ہے مگر میں ان لذتوں سے محروم ہوں۔ میں کتنے کشٹ میں ہوں اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ میں اس کشٹ سے مکتی چاہتا ہوں وقار الحسن! اور اس کی میں کوئی بھی قیمت دینے کو تیار ہوں۔ میں تمہیں تمہارے بھگوان کا واسطہ دیتا ہوں۔ ان دونوں چیزوں کو اس بڈھے کے حجرے میں نہ لے جاؤ۔" وہ گھگھیا رہا تھا۔

"میرا خدا مجھے اس گھناؤنے عمل کی کبھی اجازت نہیں دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم لذتوں کے خزانے کہاں سے لوٹو گے' کتنی عورتوں کو برباد کرو گے' کتنی معصوم لڑکیوں کو گناہوں کی بھٹی میں جھونکو گے' میں تمہارے اس خبیث کھیل میں شریک ہو کر اپنے لیے جہنم کا انتخاب نہیں کروں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میری بات مکمل ہوتے ہی وہ سانپ کی طرح بل کھا کر میری سمت بڑھا' اور اس نے اپنے بدن پر پہنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کو زور سے جھٹکا' یوں جیسے گرد جھاڑ رہا ہو اور پھر مجھے اچھل کر پیچھے کی سمت بھاگنا پڑا۔ اس کے جسم سے ڈھول ہی کی طرح چھوٹے بڑے ہزاروں بچھو جھڑنے لگے تھے جو زمین پر گرتے ہی میری طرف لپکے تھے۔ میں بھاگ کر تایا کے بے سدھ جسم تک پہنچ گیا۔ میں انھیں زمین پر رینگتے ہوئے ان بچھوؤں سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے انھیں جھنجوڑ دیا۔ اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ تو بالکل بے حس و حرکت رہے۔ یوں جیسے ان کے بدن میں روح ہی نہ رہی ہو۔ میں نے انھیں اٹھا کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ ان کے بدن کا بوجھ اٹھا کر بھاگنا کتنا تکلیف دہ تھا مگر میں سبز گنبد والی مسجد کی سڑک پر بھاگ اٹھا۔ میرا رخ مسجد کی طرف تھا۔ میرے پیچھے ہزاروں بچھو لپک رہے تھے۔ میں بار بار پلٹ کر دیکھتا اور گہری سانس لے کر پھر بھاگنے لگتا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں وہ اٹیچی تھی جس میں مجسمہ اور کڑا تھا۔ ایک کندھے پر تایا کا بھاری بدن تھا۔ کانپتی لرزتی ٹانگوں سے میں سرپٹ بھاگ رہا تھا کہ اچانک سادھو کے قہقہے نے میرے حواس گم کر دیے۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ کیوں قہقہے لگا رہا ہے۔ میں جس مسجد کی طرف بھاگ رہا تھا اور اپنے خیال میں کافی فاصلہ طے کر آیا تھا' وہ اپنی جگہ ویسے ہی اور اتنی ہی دور تھی گویا میں بھاگا ضرور تھا مگر فاصلہ کم نہیں ہوا تھا۔ میں بالکل اسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے تایا کو اٹھایا تھا۔

"وقار الحسن! تم جیون کی اور نہیں ایک ایسی مرتیو کی اور جا رہے ہو جو تمہیں آسانی سے نہیں آئے گی۔" سادھو کی کھرکھراتی ہوئی آواز دور تک گونج اٹھی۔

"خبیث آدمی! میں تمہاری چالوں میں کبھی نہیں آؤں گا۔" میں نے دانت کچکچا کر کہا۔

"میں تمہیں تباہ و برباد کر دوں گا۔" وہ آگ بگولہ ہو گیا۔

"خدا میری مدد کرے گا پلید!" یہ کہہ کر میں نے آیت الکرسی با آواز بلند پڑھنا شروع کر دی۔ وہ اچانک فق ہو گیا اس کا جوش و خروش دم توڑ گیا۔ اس کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا ہو گیا۔ زمین پر رینگنے والے بچھوؤں کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ ایک بڑا سا سیاہ بچھو تو میرے پیروں کے قریب آکر یوں ساکت ہو گیا تھا جیسے وہ پتھر کا ہو گیا ہو۔

"وقار الحسن! تم اچھا نہیں کر رہے۔ بند کرو یہ جادو۔ ورنہ۔"

اب قہقہہ لگانے کی میری باری تھی۔ میں نے آیت مکمل کر کے قہقہہ لگایا۔ "ورنہ تم کیا کر لو گے خبیث بڈھے!"

"اب میں۔۔۔ میں تمھیں دکھاؤں گا وقار الحسن! تم میری شکتی سے واقف نہیں ہو۔ تم۔۔۔ تم پاگل ہو، تم نہیں جانتے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم بہت پچھتاؤ گے بالک۔ میں اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ وہ سنہرا بڈھا تمھیں مجھ سے بچا نہیں سکے گا۔" وہ کہتا جا رہا تھا اور پیچھے کی طرف سرکتا جا رہا تھا۔ اسی لمحے میری نگاہ زمین پر پڑی اور میں حیران رہ گیا۔ جس جگہ بچھو رینگ رہے تھے وہاں اب چھوٹی بڑی کنکریاں پڑی تھیں۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے سادھو یوں غائب ہو گیا جیسے دھوئیں کی کسی دبیز دیوار کے پیچھے چلا گیا ہو۔ اس کے غائب ہوتے ہی میں نے تایا کو ایک طرف لٹایا۔ ان کا سانس اب بھی بہت مدھم چل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہوں۔ میں نے انھیں ہلایا تو یوں چونک کر اٹھ بیٹھے جیسے واقعی نیند سے اچانک بیدار ہوئے ہوں۔

"کک۔۔۔ کیا بات ہے؟" پہلے انھوں نے سرسری انداز میں پوچھا پھر شاید انھیں سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھے۔ سر گھما کر چاروں طرف دیکھا اور بولے۔ "کیا ہوا وقار الحسن! وہ۔۔۔ وہ خبیث کہاں گیا؟"

میں نے انھیں تفصیل سے سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ اب دیر نہ کی جائے۔ صبح ہونے میں بس چند ہی ساعتیں باقی تھیں۔ ہم نے تیز رفتاری سے مسجد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ہم چند ہی لمحوں بعد مسجد تک پہنچ گئے۔ مسجد کی سیڑھیوں پر ایک کونے میں سفید براق بلی بیٹھی اپنی چمک دار آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا۔ تایا نے شاید اس بلی کو نہیں دیکھا یا ممکن ہے وہ یہ بات بھول گئے ہوں کہ وہ اصل میں بلی نہیں بلکہ جن بابا ہیں میرے سلام کرنے پر تایا نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

"میں کسے سلام۔۔۔!" ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ان کی نگاہ اس بلی پر پڑ چکی تھی۔ وہ دم بخود رہ گئے تھے۔ اسی اثنا میں کچھ نمازی آ گئے جو ہمارے اور اس بلی یعنی جن بابا کے درمیان سے گزر کر مسجد کے آنگن میں چلے گئے۔ وہ سامنے سے ہٹے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

"چلیے تایا! اب وقت نہیں ہے۔ ہمیں پہلی کرن کے ساتھ ہی مسجد کے دروازے تک پہنچنا ہے۔" میں نے تایا کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں وقار الحسن! یہ۔۔۔ یہ وہی بلی تھی۔ اسی نے تمھارے پیروں کے زخم چاٹ کر ٹھیک کر دیے تھے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔

"یہ تو جن بابا ہیں تایا۔" میں نے انھیں یاد دلایا۔ تایا کو چپ سی لگ گئی۔ ہم سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی حجرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے ہولے سے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ وقار الحسن!" سنہرے بابا کی آواز سن کر میں اندر داخل ہو گیا۔ سنہرے بابا کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی۔

میں نے انھیں ادب سے سلام کیا۔ تایا ابھی تک باہر کھڑے تھے۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ سنہرے بابا کی اجازت کے بغیر اندر آئیں۔

"نہیں۔۔۔ بلا لو انھیں۔" سنہرے بابا نے یوں کہا جیسے یہ بات میں نے سوچی نہ ہو بلکہ ان سے کہی ہو۔

اتنا سنتے ہی میں نے چونک کر تایا سے اندر آنے کو کہا۔ اندر آتے ہی تایا مؤدب ہو گئے۔ سلام کے بعد ہم سنہرے بابا کے کہنے پر وہیں دری پر بیٹھ گئے، پھر سنہرے بابا نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اپنی مخصوص جائے نماز پر بیٹھے تھے، اسی لمحے اذان کی پرکیف آواز نے ایک وجد سا طاری کر دیا۔ میں نماز باجماعت پڑھنے کا متمنی ہوا۔ یقیناً سنہرے بابا جان گئے۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے صبر کرنے کو کہا۔ وہ شاید کچھ پڑھ رہے تھے۔ اسی لمحے فقیر بابا اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا جسے انھوں نے سنہرے بابا کے عین سامنے الٹ دیا۔ اس تھیلے میں سے چھوٹے بڑے پتھر نکل کر ڈھیر کی صورت میں جمع ہو گئے۔ تایا آنکھیں پھاڑے فقیر بابا کو دیکھ رہے تھے میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ چند ہی لمحوں بعد سنہرے بابا نے آنکھیں کھول دیں۔ اذان اسی وقت ختم ہو گئی۔

"چلو نماز پڑھ آئیں۔" سنہرے بابا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر شہادت کی انگلی سے انھوں نے پتھروں کے اس ڈھیر کے گرد گولائی میں انگلی سے نشان بنا دیا۔

ہم تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے مسجد پہنچ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم پھر حجرے میں آ گئے اور تب میں اور تایا پتھروں کے اس ڈھیر کو بچھوؤں میں تبدیل ہوتے دیکھ کر اچھل پڑے۔ اس ڈھیر کے گرد جو سفید لکیر کھنچی ہوئی تھی بچھو اس لکیر سے ٹکرا کر یوں رک جاتے تھے جیسے ان کے چاروں طرف کوئی دیوار ہے جسے عبور کرنا ان کے بس میں نہیں۔

سنہرے بابا اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھے۔ میں اور تایا ان سے کچھ فاصلے پر دو زانو بیٹھ گئے۔

"وقار الحسن! مجھے خوشی ہوئی کہ تم میں وہ ہمت و حوصلہ پیدا ہو گیا ہے جو میں چاہتا تھا۔ جو کچھ تم نے سادھو کے ساتھ کیا تمھیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تم کمزور پڑتے جا رہے ہو۔ میں چاہتا تو انھیں وہیں محصور کر سکتا تھا لیکن تمھارا حوصلہ دیکھنا مقصود تھا۔" انھوں نے بچھوؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس وظیفے کے لیے کافی ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی خوفناک واقعات اس وظیفے کے دوران میں بھی متوقع ہیں۔ دراصل اس وظیفے کو کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان خدا کے سوا ہر چیز کو بھول جائے' وہ اس یقین کامل کے ساتھ وظیفہ کرے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے' وہ اس وقت تک دھوئیں کے سوا کچھ نہیں ہے جب تک خدا چاہے۔ جادو ٹونے' ٹوٹکے' شعبدہ بازی یہ سب شیطانی کھیل ہیں جو انسان کو وقتی طور پر متاثر کرتے ہیں مگر ان کے اندر ایک ایسی کمزوری پیدا کر دیتے ہیں جو اس کے عقائد کی راہ میں مضبوط دیوار بن جاتی ہے۔ تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے ہو مگر وظیفہ کرنے سے پہلے ایک بار خود کو پھر ٹٹول لینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پھر کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ۔ ایسی صورت میں' میں تمھاری مدد کرنے سے قاصر ہوں گا۔" وہ دھیمے لہجے میں بول رہے تھے۔

ان کا میٹھا اور دھیما لہجہ میرے اندر اترتا جا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئے تو میں پہلو بدل کر بول اٹھا۔ "مجھے کامل یقین ہے سنہرے بابا کہ آپ کی بتائی ہوئی راہ' میرے لیے راہ نجات ہو گی۔ میں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں اس امتحان میں بھی پورا اتروں گا۔"

"ان شاء اللہ کہا کرو۔" انھوں نے فوراً ٹوکا۔

میں نے جھینپ کر کہا۔ "ان شاء اللہ۔"

"آپ ان کی جانب سے فکرمند نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو وقار الحسن اس معاملے کو بہ حسن و خوبی حل کر لیں گے۔" سنہرے بابا تایا سے مخاطب ہوئے۔

"مجھے قوی امید ہے سنہرے بابا!" تایا گویا ہوئے۔ "آپ کا دست شفقت رہا اور خدا کی رحمت بھی تو یقیناً ہم اس خوفناک چکر سے نکل آئیں گے۔"

"یقیناً مگر دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ سادھو سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ آپ محتاط رہیے گا۔"

"بابا! اگر آپ گھر کی حفاظت کے لیے دعا کریں تو۔" تایا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں دعا کروں گا لیکن تھوڑی سی احتیاط آپ کو بھی کرنا ہو گی۔"

"حکم دیجیے۔"

"کوشش کیجیے کہ گھر میں لوبان نہ سلگائی جائے۔ نہ ہی گھر کے لوگ کسی ایسی جگہ جائیں جہاں لوبان کا دھواں ان کی سانس میں شامل ہو کر بدن میں داخل ہو۔" سنہرے بابا نے تایا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سنہرے بابا! میں آج ہی سب کو بتا دوں گا۔" یہ کہہ کر تایا نے ان سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ سنہرے بابا نے اجازت دے دی۔ میں بھی ان سے ذرا دیر کی اجازت لے کر حجرے سے باہر آ گیا۔ میں نے تایا کو تاکید کی کہ گھر میں موجود لوبان فوراً ہٹا دیں۔ یہاں سے واپسی پر فرقان کے گھر ہوتے ہوئے جائیں۔ شرف الدین آ جائے تو اسے کہیں کہ وہ میرے آنے تک یہاں سے کہیں نہ جائے۔ اماں کو تسلی دیں اور میرے لیے دعا کریں۔ اتنی بہت سی باتیں میں نے جلدی جلدی کہیں اور انھیں خدا حافظ کہہ کر حجرے میں واپس چلا آیا۔

سنہرے بابا ایک موٹی سی بے حد پرانی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور پھر دھیرے دھیرے مجھے سمجھاتے رہے کہ مجھے کیا کرنا ہے' کیسے کرنا ہے' کن چیزوں کی احتیاط اور کن باتوں پر صبر کرنا ہے۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ تفصیلات سن کر مجھے وحشت ہونے لگی۔ خوف آنے لگا کہ شاید میں اس وظیفے کو نہ کر سکوں مگر سنہرے بابا نے مجھے بتایا کہ اگر میں نے وظیفہ نہ کیا تو مجھے ان سے زیادہ کٹھنائیوں سے گزرنا پڑے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پھر میری تمام زندگی ہی کٹھنائیوں کی نذر ہو جائے۔ مجھے تین دن تک لگاتار وظیفہ پڑھنا تھا۔

وظیفے کے دوران میں مجھے نہ سنہرے بابا کی مدد حاصل رہنا تھی اور نہ ہی فقیر بابا میری کوئی مدد کر سکتے تھے۔ اس وظیفے کے دوران میں ہونے والی تکالیف یا خوفناک واقعات کا مجھے تن تنہا مقابلہ کرنا تھا۔ بابا مجھے بتا چکے تھے کہ موکل آسانی سے قابو میں نہیں آتے۔ وہ وظیفہ کرنے والے کو خوفزدہ کرتے ہیں تاکہ اس سے کوئی بھول چوک ہو جائے اور وہ ان پر دسترس حاصل نہ کر سکے۔ دوسری طرف سادھو

بیٹھنے والا نہیں تھا۔ بابا نے وہ مجسمہ اور کپڑا سامنے ایک چھوٹی سی کارنس پر رکھ دیا۔ اس کے گرد حصار بھی مجھے ہی باندھنا تھا۔ حصار باندھنے کے جو طریقے بابا نے مجھے بتائے تھے' وہ کافی سخت اور مشکل تھے اور مجھے ہر حال میں وہ حصار باندھنا تھا' دوسری صورت میں سادھو ان دونوں چیزوں کو حاصل بھی کر سکتا تھا۔ سادھو کا ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کا مطلب بہت خطرناک تھا۔ بابا نے سب سے پہلے مجھے مراقبہ کرنے کو کہا۔ اس مراقبے میں مجھے خود کو دنیا کے ہر خیال' ہر چیز اور تمام محسوسات سے علیحدہ کرنا تھا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا مگر پہلا مرحلہ بھی یہی تھا۔

سنہرے بابا نے مجھے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں نے اگر ہمت و استقلال سے کام لیا تو میں اس وظیفے میں یقیناً کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہ ان کی ڈھارس تھی جس نے بہت جلد مجھے مضبوطی کا احساس دلایا اور کچھ دیر پہلے طاری ہو جانے والی گھبراہٹ کافی حد تک کم ہو گئی۔ اسی حجرے میں ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھا تھا۔ چھوٹی بڑی موم بتیاں تھیں۔ ایک تھیلے میں تھوڑی تھوڑی سی مختلف سبزیاں رکھی تھیں۔ مجھے تین وقت یہ سبزیاں خود ہی ابال کر کھانا تھیں۔ ایک صراحی میں پانی تھا۔ مجھے اسی پانی اور سبزیوں پر گزارا کرنا تھا۔ وظیفے کے دوران میں مجھے حجرے سے قدم بھی نکالنے کی اجازت نہ تھی خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ نہ ہی کوئی باہر سے حجرے میں آسکتا تھا۔

ساری تفصیلات بتا کر جب سنہرے بابا نے کہا کہ وہ اب نیپال جا رہے ہیں اور پندرہ بیس روز سے پہلے واپس نہ آسکیں گے تو میں نے خود کو بے حد کمزور محسوس کیا۔ یوں جیسے میں بھری دنیا میں ایک دم تنہا رہ گیا ہوں۔ گھر والوں سے تو میں رابطہ ختم کر ہی آیا تھا۔ یہاں فقیر بابا اور سنہرے بابا سے رابطہ سو وہ بھی ختم ہو گیا۔ فقیر بابا کو یہیں رہنا تھا مگر وہ اس تمام عرصے میں نہ مجھ سے کسی قسم کا رابطہ رکھ سکتے تھے اور نہ ہی میری مدد کر سکتے تھے۔

بابا کی تسلیوں نے کچھ سنبھالا دیا اور میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ یہ سب نہ کرتا تو میں بھی سادھو کی کسی خطرناک چال کا شکار ہو جاتا۔ یوں کم از کم یہ تو صبر رہتا کہ میں کچھ کر رہا ہوں' جو اگر کامیاب ہو گیا تو اس خوفناک جنگ و جدل والی زندگی سے نجات کا سبب بن سکتا ہے۔ مجھے ظہر کے بعد حجرے میں بیٹھنا تھا۔ پہلے مجسمے اور کپڑے پر حصار باندھنا تھا پھر اپنے دو پہر وظائف میں مصروف ہو جانا تھا۔ ابھی ظہر میں کافی دیر تھا۔ میں نے بابا کی ہدایت کے مطابق چولہا جلا کر سبزی ابالی۔ میں نے اور سنہرے بابا نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ اس بدمزہ' صرف نمکین سبزی کو کھانا میرے لیے سخت کوفت کا باعث تھا۔

کھانے کے بعد میں نے اور بابا نے ظہر کی نماز پڑھی۔ ہمارے ساتھ فقیر بابا بھی تھے۔ جن کی موجودگی اور پراسرار خاموشی میرے بدن میں سنسنی پیدا کرتی رہی۔ میں ان سے بات کرنے اور ان کی زبانی یہ سننے کا متمنی تھا کہ وہ جن ہیں مگر ہمت نہ ہوئی کہ ان سے کسی بھی قسم کی گفتگو کرتا۔ نماز کے بعد ہم حجرے میں چلے آئے۔ سنہرے بابا نے کچھ ہدایت دوبارہ دہرائیں۔ سختی سے تاکید کی کہ میں نے اگر خوف زدہ ہو کر وظیفے کو درمیان میں چھوڑا تو پھر آنے والے حالات کی تمام تر ذمے داری مجھ پر عائد ہو گی۔ میں نے انھیں تسلی دی اور خود کو ٹٹولا تو خاصا مضبوط پایا۔

کچھ دیر بعد بابا نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ انھیں جاتا دیکھ کر میرا دل بے وجہ ہی خوف کا شکار ہو گیا۔ میں نے اپنے دل پر دباؤ محسوس کیا۔ بابا نے بتایا کہ فقیر بابا یہاں موجود ہوں گے مگر حجرے کے باہر تک محدود رہیں گے۔ مجھے وظیفے کے اختتام سے پہلے باہر نہیں نکلنا ہے۔ بعد میں یعنی وظائف کے ختم ہونے کے بعد میں چاہوں تو کسی بھی سلسلے میں فقیر بابا کی مدد حاصل کر سکتا ہوں۔ میں نے تمام باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ بابا سے رخصت ہو کر میں حجرے کے اس کونے میں بیٹھ گیا جہاں کے بارے میں بابا نے بتایا تھا۔ میرے عین سامنے وہ مجسمہ اور کپڑا رکھا تھا۔ میں نے اپنے گرد ایک سفید لکیر کھینچی' بابا کی بتائی ہوئی آیتیں پڑھیں اور گویا اپنے گرد حصار باندھ لیا۔ اب مجسمے اور کپڑے کے گرد حصار باندھنا تھا اور پھر اس طرف سے مطمئن ہو کر ہی بتائے گئے وظائف کرنا تھے۔

بابا کے جانے کے بعد میں حجرے میں تنہا رہ گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر پتھروں کا وہ ڈھیر موجود تھا جسے فقیر بابا نے لا کر سنہرے بابا کو دیا تھا۔ یہ پتھر دراصل وہ بچھو تھے جو راستے میں سادھو نے اپنے لباس سے جھاڑ کر میری طرف چھوڑ دیے تھے۔ یہ بچھو کنکروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کے گرد سفید لکیر بھی کھینچی ہوئی تھی مگر جانے کیوں اس پر نگاہ پڑتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے بڑا [illegible] اس طرف سے ہٹانے کے لیے خود کو ادھر ادھر کی باتوں میں لگا لیا۔

عصر کی اذان کا منتظر تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کر ہی میں وظائف شروع کرتا تھا۔ اذان میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ وظائف شروع کرنے کے بعد لیٹنے کے لیے مجھے اس حصار سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ بابا نے اتنی رعایت دی تھی کہ میں ایک وظیفہ ختم کر کے کچھ دیر آرام کر سکتا ہوں پھر دوسرا وظیفہ شروع کروں۔ میں آنکھیں موندے انھی سوچوں سے پریشان تھا کہ اچانک ایک عجیب قسم کی سرسراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کچھ ایسی آواز تھی جیسے تیز ہوا سے سوکھے پتے اڑتے پھر رہے ہوں۔ میں سمجھا باہر آندھی آئی ہے۔ میں نے پھر آنکھیں بند کرنا چاہیں تبھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حجرے کا دروازہ اور دونوں کھڑکیاں اچانک کھل گئی ہوں۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ میں ہل کر رہ گیا۔ ہوا کے ساتھ ہی بے پناہ دھول تھی جس نے مجھے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی میں نے کسی نہ کسی طرح یہ دیکھ لیا کہ دونوں کھڑکیاں اور دروازہ اسی طرح بند تھا۔ چھت پر بھی کوئی ایسی روزن یا روشن دان نہ تھا جہاں سے تیز ہوا کا اندر گزر ہو سکے۔ بات حیران کن تھی۔ میں بازو چہرے پر رکھے چہرے کو دھول اور تیز ہوا کے تھپیڑوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

معلوم نہیں یہ چھوٹا سا حجرہ کتنی دیر تک ان طوفانی ہواؤں کی زد پر رہا۔ ہواؤں کا زور ٹوٹا تو میرے بدن میں خوف کی لہریں بجلی کے کوندوں کی طرح لپکنے لگیں۔ حصار کے اندر پڑے وہ تمام پتھر اور کنکریاں غائب تھیں جو دراصل بچھو تھے۔ گویا سادھو اس حجرے کے اندر بھی اپنا زور رکھتا [illegible] اس خیال نے مجھے ہولا کر رکھ دیا۔ اب مجھے بہت زیادہ [illegible] کر اپنا کام کرنا تھا۔ ان کنکریوں کو غائب دیکھ کر مجھے پہلا خیال اس مجسمے اور کپڑے کا آیا۔ میں نے فوراً اس جگہ نگاہ ڈالی اور ان دونوں چیزوں کو اپنی جگہ پا کر مطمئن ہو گیا۔

اب میں کافی بے چین ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اذان جلد از جلد ہو جائے تاکہ میں کم از کم ان دونوں چیزوں کو محفوظ کر سکوں۔ اب میرا وہ پہلے والا اطمینان ختم ہو چکا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ میرا کام اب آسان نہیں رہا۔ سادھو یہ کر سکتا ہے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے ان دونوں چیزوں کے گرد حصار باندھنے سے روکنے کی بھرپور کوشش بھی کر سکتا تھا۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ وہ حجرے کے اندر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر اب یہ خیال خام نکلا تھا۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ محتاط رہنا تھا۔

میں آرام کرنے کا ارادہ ترک کر کے' دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں اس مجسمے اور کپڑے پر مرکوز تھیں۔ دل خدا سے مدد طلب کر رہا تھا۔ جیسے تیسے وقت بیتا اور عصر کی اذان کی پرکیف آواز نے مجھ پر وجد سا طاری کر دیا۔ میں نے مسجد میں جانے کی بجائے وہیں عصر کی نماز ادا کی اور فوراً ہی وظائف کے لیے بیٹھ گیا۔ میں سادھو کو کوئی نیا حربہ آزمانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ بچھو وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ ان کے گرد کھینچی ہوئی لکیر اب بھی موجود تھی۔ میں نے وہاں بیٹھنے سے قبل ضرورت کی تمام چیزیں اپنے قریب رکھ لیں جن میں موم بتی' وظائف کی کتاب' دیا سلائی' تسبیح' عطر گلاب' کافور اور کٹورا بھر پانی تھا۔ اس گول دائرے میں بیٹھ کر میں نے بسم اللہ کی۔ اور وظیفہ شروع کر دیا۔

مجھے وظیفہ بہت ٹھہر ٹھہر کر کرنا تھا۔ بابا نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اگر میں نے جلدی کرنے کے چکر میں کوئی بھی حرف یا اس کی ادائیگی غلط کر دی تو میں ایک نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنا پورا دھیان اور توجہ وظیفے پر مرکوز رکھنا تھی۔ میں نے بابا کا بتایا ہوا وظیفہ شروع کر دیا۔ یہ تین دن کا چلہ تھا جس میں مجھے بے حد احتیاط کرنا تھی۔ ان تینوں دن مجھے حصار کے اندر محصور رہنا تھا۔ میں ضروری حاجت کے لیے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے خود پر' اپنے جسمانی نظام پر مکمل کنٹرول رکھنا تھا۔ دوسرا چلہ سات روز کا تیسرا نو روز کا اور یوں مدت بڑھتے بڑھتے چالیس روز کے چلے تک پہنچنا تھی۔ اس کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

میں پوری توجہ کے ساتھ' آنکھیں موندے چلے میں مشغول تھا کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں جس مصلے پر بیٹھا ہوں' وہ دھیرے دھیرے زمین سے اٹھ رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں مگر مجھے خود پر اتنا قابو ضرور تھا کہ میں اسی رفتار سے بتایا ہوا وظیفہ کرتا رہا۔ میری زبان نہیں رکی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میرے عین سامنے ایک بہت خوب صورت لڑکی جوگیا رنگ کی مہین ساری باندھے دوزانو بیٹھی تھی۔ مہین ساری میں اس کا کندن سا بدن چھلک رہا تھا۔ اس کے

ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں ستارے سے بھرے محسوس ہو رہے تھے۔ میری نگاہوں سے اس کی نگاہیں ٹکراتے ہی یوں لگا تھا جیسے کوئی مقناطیسی قوت مجھے اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آنکھیں بند کرنا چاہیں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ زندگی میں پہلی بار میں کسی حسین عورت کو اس روپ میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم کی مقناطیسیت مجھے ایک عجیب و غریب قسم کے ہیجان میں مبتلا کر رہی تھی۔ میں باوجود کوشش کے آنکھیں بند نہیں کر سکا اور اس کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ اچانک مجھے پھر محسوس ہوا کہ میں جس مصلے پر بیٹھا ہوں وہ سمندر کی لہروں پر تیر رہا ہے۔ میں ہچکولے لے رہا تھا۔ واقعی' یہ صرف میرا خیال نہیں تھا بلکہ میں باقاعدہ ہچکولے لے رہا تھا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا مگر اس لڑکی کا بدن یوں روشن تھا جیسے اس کے کندن بدن کے اندر ڈھیر سارے چراغ روشن ہوں۔ اس کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کی ساری کا پلو بار بار کندھے سے ڈھلک رہا تھا اور مجھ پر گویا بجلیاں سی گر رہی تھیں۔

ان تمام محسوسات کے باوجود میں پوری طرح اپنے قابو میں تھا' میری زبان وظیفے میں مصروف تھی۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ سنہرے بابا نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں چاہے کچھ بھی دیکھوں' خود کو وظیفے میں مصروف رکھوں اگر میں اس پہلے مرحلے ہی میں کامیاب نہ ہو سکا تو عذابوں کے لامتناہی سلسلے میں گم ہو کر رہ جاؤں گا۔ اس خیال نے مجھے قابو سے باہر ہونے سے بچا لیا اور میں نے پھر سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔ ایسا کرنے کا میرا مقصد یہی تھا کہ میں اس کافرادا کی ہوش ربا شخصیت کے سحر سے نکل جاؤں۔

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اپنے اندر کے ہیجان کو بتدریج کم ہوتے محسوس کیا۔ گو ہچکولوں کی زد پر میں اب بھی تھا مگر اب میں اپنے وظیفے کی طرف پورا دھیان دے سکتا تھا جبکہ وہ حسین عورت میرے حواسوں پر طاری ہو کر مجھے پہلے مرحلے ہی میں ناکام کر سکتی تھی۔ میں بہت دیر تک خود کو بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں پر ڈولتا محسوس کرتا رہا۔ میں نے مصلے کو دونوں جانب سے یوں تھام رکھا تھا جیسے اسے چھوڑ دیا تو اس پر سے سمندر میں لڑھک جاؤں گا۔

بیان سے باہر ہے کہ اس وظیفے کے دوران میں' میں کس قدر خوف و ہراس میں مبتلا رہا مگر میں نے ایک ثانیے کا بھی وقفہ نہ دیا اور تین گھنٹے کا وظیفہ مکمل کر لیا۔ مکمل کرتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وظیفہ شروع کرنے سے پہلے مجھے اسی حصار کے اندر نماز ادا کرنا تھی' موم بتی جلانا تھی اور پاس رکھے کٹورے سے انگلیاں بھگو کر اپنے ہونٹ تر کرنا تھے۔ پہلے وظیفے کے دوران میں مجھے پانی پینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی میں نے کمرے میں گھپ اندھیرا پایا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر موم بتی اٹھالی۔ دیا سلائی کی میرے بدن میں سناٹے سے گزر گئے۔ میرے ہاتھ اور دیا سلائی یوں بجھ گئی جیسے کسی نے پھونک مار دی ہو۔ اندھیرا ہوتے ہی میں بے پناہ خوفزدہ ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس خیال نے مجھے سہارا دیا کہ میں اس حصار سے نکلا تو سادھو مجھ پر کوئی نیا حربہ آزما کر نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں اسی حصار میں رہ کر اس کے حربوں سے محفوظ تھا۔ اس خیال سے میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے دوبارہ دیا سلائی جلائی اور کسی نہ کسی طرح موم بتی جلا دی۔ موم بتی کی روشنی میری توقع سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ موم بتی حصار کے اندر رکھی تھی فوراً جل گئی اور اس کی لو بالکل سیدھی اور کافی بڑی تھی۔ موم بتی جلتے ہی میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ میرا جی چاہا کہ میں دوڑتا ہوا حجرے سے باہر چلا جاؤں۔ دائرے سے باہر ہزاروں سیاہ بچھو گھوم رہے تھے۔ ان سے قبل تیز آندھی میں سادھو اپنے سارے بچھو لے گیا تھا جس کے گرد سنہرے بابا نے حصار کھینچا تھا۔ کمرے میں وہی سیاہ بڑے بڑے بچھو دیواروں پر بھی چھپکلیوں کی طرح چپٹے ہوئے تھے۔ میرے چاروں طرف رینگ رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی ٹانگیں لوہے کے باریک تاروں سے بنی ہوں جن کی حرکت سے ایک ناگوار آواز نکل رہی تھی۔ اگر ذرا سی بھی جگہ ہوتی تو شاید میں یہ بھول چکا ہوتا کہ سنہرے بابا نے مجھے حصار سے باہر نہ نکلنے کی تاکید کی تھی اور میں حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ یہ تو غنیمت جانیے کہ فرش پر پاؤں دھرنے کی جگہ ہی نہ تھی کہ میں باہر نکلتا ورنہ شاید آج یہ کہانی سنانے کو میں زندہ ہی نہ ہوتا۔

بہرحال یہ حصار ہی اس وقت میری زندگی کی ضمانت تھا سو میں دوبارہ دل مضبوط کر کے اور یہ دیکھ کر بیٹھ گیا کہ چاروں طرف لکیر سے چپٹے ہونے کے باوجود اندر آنے سے قاصر ہیں۔ اب یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ چکی تھی کہ

کسی بھی حال میں تین دن کا وظیفہ مکمل کیے بغیر اس حصار سے باہر نہیں نکلنا ہے۔ دوسرا وظیفہ شروع کرنے میں' میں نے دیر نہیں لگائی۔ البتہ وظیفہ شروع کرنے سے پہلے میں نے کٹورے میں انگلیاں بھگو کر ہونٹ تر کر لیے تھے۔ گو میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں پورا کٹورا اٹھا کر سارا پانی حلق سے نیچے اتار لوں۔ میرا حلق خشک تھا اور زبان پر کانٹے سے اگے ہوئے تھے لیکن کٹورے بھر کا پانی مجھے تین روز تک چلانا تھا جیسے بھی سنہرے بابا مجھے سمجھا چکے تھے کہ یہ چلہ خود پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اسی دوران میں نے مجسمے اور کڑے کے گرد حصار بھی کھینچا تھا۔ اس حصار کو کھینچنے سے قبل مجھے دو چلے اور کرنا تھے جو سنہرے بابا کے کہنے کے مطابق رات کے آخری پہر ختم ہوتے تب حصار کھینچا جاتا۔

بہرحال میں آپ کو بتا رہا تھا کہ پورے کمرے میں بچھو تھے۔ فرش پر چیونٹوں کی طرح رینگتے ہوئے' دیواروں پر چھپکلیوں کی طرح چپکے ہوئے اور عجیب کھرکھراہٹ کی سی آوازیں نکالتے ہوئے بچھو میرے اعصاب کو چٹخائے دے رہے تھے۔ موم بتی کی تیز روشنی نے مجھے بڑا سہارا دیا تھا۔ میں نے مجسمے اور کڑے پر نگاہ ڈالی تو میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ وہ کارنس بچھوؤں کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو چکی تھی مگر یہ حیرت انگیز بات تھی کہ مجسمہ اور کڑا ویسے ہی نہ صرف یہ کہ موجود تھا بلکہ اس پر بچھو بھی نہیں تھے ورنہ شاید وہ دونوں چیزیں مجھے نظر ہی نہ آتیں۔ لیکن اس امکان کو نظرانداز کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ جب بچھو کارنس پر چڑھ گئے ہیں تو وہ سادھو انہی بچھوؤں کے ذریعے یہ دونوں چیزیں بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اس خیال نے مجھے پسینے میں شرابور کر دیا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا کہ ان کے گرد حصار باندھنے میں ابھی وقت پڑا تھا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے چاروں طرف پھونک ماری۔ آیت الکرسی پڑھنے کے دوران میں' میں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ سات مرتبہ آیت الکرسی پڑھنے کے بعد اور پھونک مارنے کے بعد جب میں نے دھڑکتے دل سے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا تو خوشی اور اطمینان سے نہال ہو گیا۔ حجرہ بالکل صاف تھا۔ وہاں کوئی بچھو تو کیا ننھی سی کوئی چیونٹی بھی نہ تھی۔

اگلا چلہ کھینچنے میں' میں نے دیر نہ لگائی۔ اس بار مجھے اپنے گرد کھنچے حصار کے باہر عطر گلاب چھڑکنا تھا' اس طرح کہ عطر گلاب کی ایک لکیر سی اس سفید لکیر کے باہر بنتی چلی جاتی۔ مجھے دوسری لکیر کافور کے ذریعے کھینچنا تھی۔ یوں میرے گرد تین لکیریں بن جاتیں۔ یہ چلہ مکمل ہونے کے بعد میرے گرد حصار' مزید مضبوط ہو جاتا' اور آئندہ کیے جانے والے سخت قسم کے چلوں میں میرا مددگار ہوتا۔ میں نے عطر گلاب کی شیشی اٹھائی اور جونہی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا' انگلیاں جھلس کر سیاہ ہو گئیں اور میں تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ میں نے جھٹکے سے ہاتھ اندر کر لیا تھا مگر اتنی دیر ہی میں میری انگلیوں کی پہلی پوریں جل چکی تھیں۔ ناخنوں کے نیچے سے چربی نکل آئی تھی۔ شدید تکلیف کی وجہ سے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ میں اپنے ہاتھ کو تھامے بری طرح پھونکیں مار رہا تھا' اصل میں ہوا یہ تھا کہ میں نے ہاتھ کو اپنے گرد کھنچے حصار سے باہر نکال دیا تھا۔ میں بھول چکا تھا کہ سنہرے بابا نے ایسا کرتے ہوئے احتیاط کو مدنظر رکھنے کی تلقین کی تھی۔ میں اگر شیشی کو پیندے کی طرف سے اسے پکڑتا اور اس احتیاط کے ساتھ لکیر بناتا کہ میرا ہاتھ باہر نہ نکلے تو شاید یہ نہ ہوتا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ سنہرے بابا نے مجھے تین دن کے چلے سے پہلے حصار سے قدم باہر نکالنے کو کیوں منع کیا تھا۔ مجھے حیرت تو اس بات پر تھی کہ باہر کچھ بھی نہ تھا' نہ آگ نظر آئی تھی اور نہ ہی تپش محسوس ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ کیسی آگ تھی جس نے میری انگلیوں کو بھسم کر کے رکھ دیا تھا۔

اس تکلیف کی شدت نے میرا برا حال کر دیا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ عطر گلاب اور کافور کی لکیر مجھے ہرحال میں دائیں ہاتھ ہی سے کھینچنا تھی۔ چلہ ہرحال میں مکمل کرنا تھا سو اس قدر تکلیف کے باوجود میں نے شیشی کو جلی ہوئی انگلیوں کی مدد سے تھام لیا۔ میرے ہاتھ میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں تھیں مگر مجھے یہ سب برداشت کرنا تھا۔ میں نے دانت پر دانت جما لیے' تاکہ تکلیف کی شدت کو برداشت کر سکوں پھر بڑی ہی احتیاط سے آہستہ آہستہ گھوم کر اس سفید لکیر سے ایک انچ کے فاصلے پر عطر گلاب کی لکیر سی کھینچ دی۔ میں ہی جانتا ہوں کہ یہ میں نے کس طرح کیا' کئی بار تکلیف سے بے ساختہ قسم کی چیخ بھی نکلی' آنسو تو پہلے ہی بہہ رہے تھے۔ اگلی لکیر کافور سے کھینچنا تھی۔ وہ بھی میں نے کسی نہ کسی طرح کھینچ لی۔ اس بار میرا ہاتھ جلا تو نہیں البتہ جلتے جلتے رہ گیا۔ تپش سے انگلیوں کی جلن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں بڑی دیر تک دہرا ہوا بیٹھا رہا اور وقت بیتا جا رہا

تھا۔ مجھے ہر حال میں رات کے آخری پہر میں ان دونوں چیزوں کے گرد حصار باندھنا تھا ورنہ سادھو اپنی کسی چال میں کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔

تکلیف کی بے پناہ شدت کے باوجود میں نے دوسرا چلہ شروع کر دیا۔ اس چلے کے دوران میں مجھے آنکھوں کو قطعی طور پر بند رکھنا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے وظیفے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر ہاتھ کی تکلیف کا احساس غالب رہا مگر بہت جلد میں اس احساس سے چھٹکارا پا چکا تھا۔

مجھے وظیفہ کرتے ہوئے ابھی شاید چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہے۔ بے ساختہ جی چاہا کہ آنکھیں کھول کر آنے والے کو دیکھوں مگر غنیمت تھا کہ میں وظیفہ شروع کرنے سے لے کر اب تک یہ بات بھی دل میں دہراتا رہا تھا کہ مجھے کسی حال میں بھی آنکھیں نہیں کھولنا ہے۔ آہٹ محسوس ہوتے ہی میرے دماغ نے مجھے آنکھیں نہ کھولنے کی تلقین کی اور میں نے زیادہ مضبوطی سے آنکھیں میچ لیں۔ کسی کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آہٹ میرے قریب آکر رک گئی۔ میں دم سادھے وظیفے میں مصروف رہا۔ ایک بات کا مجھے یقین ہو چکا تھا کہ سادھو کا کوئی حربہ اس دائرے یعنی حصار کے اندر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس دائرے کے باہر تک ہی محدود رہے گا۔

"وقار الحسن۔۔۔ وقار، میری مدد کرو۔"

آواز سو فی صد شرف الدین کی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میرا جی چاہا کہ میں آنکھیں کھول کر اسے دیکھوں، شاید میں آنکھیں کھول بھی دیتا کہ اچانک ہی میرے اندر سے ایک تیز سرگوشی گونج کر پورے حجرے میں پھیل گئی کہ خبردار، تمہیں آنکھیں نہیں کھولنا ہیں۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں نے خود پر کس طرح قابو پایا۔ مجھے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی گود میں یوں رکھنا تھا کہ دایاں ہاتھ اوپر اور بایاں نیچے ہو۔ مجھے ہاتھ بھی نہیں ہلانا تھے ورنہ شاید میں اپنے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیتا کیونکہ شرف الدین کی کرب انگیز سسکیاں میری روح تک کو لرزائے دے رہی تھیں۔ وہ مسلسل مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ مجھ سے مدد مانگ رہا تھا۔ مجھے میری دوستی اور اپنی قربانیوں کے واسطے دے رہا تھا۔ میرے آنسو نمک کے بڑے بڑے گولوں کی طرح میرے حلق میں پھنسے ہوئے تھے۔ میری زبان بڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ میں مسلسل وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ وظیفہ جلد از جلد ختم ہو جائے تاکہ میں آنکھیں کھول سکوں۔ دیکھ سکوں کہ میرے دوست کو کیا ہو گیا ہے، وہ کس تکلیف میں مبتلا ہے۔ وقت گویا ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ ہر چیز ساکت محسوس ہو رہی تھی۔ فضا پر گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی جس میں شرف الدین کی سسکیاں اور ٹوٹے پھوٹے جملے ایک عجیب سی گونج کے ساتھ مجھ میں اترتے جا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ وظیفہ ختم ہوا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ حلق بری طرح خشک ہو چکا تھا۔ زبان سوکھ کر بالکل خشک ہو گئی تھی۔ حلق میں پیاس کے پھندے لگ رہے تھے۔ آخری الفاظ ادا کر کے میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شرف الدین میرے سامنے زخمی حالت میں بے سدھ پڑا ہے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے حواس معطل ہو گئے، میں سناٹے میں رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زندہ ہی نہ ہو۔ یہ کیسی بے بسی تھی کہ میرا سب سے پیارا دوست شرف الدین مجھ سے چند بالشت کے فاصلے پر زخمی پڑا ہوا تھا اور میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے بے ساختہ اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ حواس معطل ہو جانے کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں حصار سے باہر نہیں نکلا۔ میری کئی آوازوں کے بعد اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے وہ خالی خالی آنکھوں سے چھت کو تکتا رہا پھر اس کے سپاٹ چہرے پر شدید تکلیف کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اس نے کراہتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی ابھری۔ "وقار الحسن!" اس نے رخ میری طرف کیا تو اس کی دائیں کنپٹی پر لگا زخم صاف دکھائی دینے لگا۔

"شرف الدین! تم۔۔۔ تم کہاں تھے؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں ڈیرہ دون سے رات پہنچ گیا تھا۔ مجھے اسٹیشن سے ایک تانگا لینا تھا۔ وہیں۔۔۔ وہیں سے مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں۔۔۔ میں تانگے میں بیٹھا تھا پھر۔۔۔ پتا نہیں کیا ہوا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔

اس کی نگاہیں بار بار اس کٹورے کی طرف اٹھ رہی تھیں جو حصار کے اندر، میرے قریب ہی رکھا تھا اور جس میں صرف آدھا کٹورا پانی تھا۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ میں کٹورا اس کی طرف بڑھا دوں مگر انگلیوں کی جلن [ابھی کم نہیں] ہوئی تھی، بلکہ اب تو ان پر آبلے بھی پڑ گئے تھے۔ جلی [ہوئی] انگلیوں کا خیال آتے ہی میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا [اور] شرف الدین کو مخاطب کیا۔

"شرف الدین! تھوڑی سی ہمت کرو۔ تمہارے پیچھے [کچھ] فاصلے پر صراحی رکھی ہے۔ وہاں سے پانی لے لو۔"

"میں ہل نہیں سکتا وقار الحسن! میں مر رہا ہوں۔ میرا [حلق سوکھ رہا ہے]۔ پانی۔۔۔ پانی دے دو۔"

میرا دل رو پڑا۔ اس کی آواز میں جتنا درد تھا وہ میں نے [آج] تک کہیں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں اس حصار میں [نہ] ہوتا تو اپنا کلیجہ نکال کر اسے دے دیتا مگر اس وقت [میں] کس قدر مجبور تھا! وہ حسرت سے کبھی مجھے اور کبھی اس [کٹور]ے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح [کوند]ا اور میں نے کہا۔ "شرف الدین! تم سرک تو سکتے ہو [،] زیادہ نہیں، ذرا سا۔ بس میرے کچھ اور قریب [آجاؤ]۔"

"[ل]یکن۔ کیوں۔۔۔؟" اس نے بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی [کھو]لتے ہوئے پوچھا۔

"شرف الدین! میں حصار باندھ کر بیٹھا ہوں۔ میرا ایک [چلہ ا]بھی باقی ہے۔ میں وہ چلہ مکمل کیے بنا باہر نہیں آسکتا۔ [دیک]ھو۔ یہ میرا ہاتھ۔" میں نے جلی ہوئی انگلیاں اسے [دکھا]تے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے حصار سے باہر نکالا تھا۔ [دیکھ]و کس بری طرح جلا ہے۔"

"مگر۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" شرف الدین نے [کہا]۔

"ممکن ہے تمہارے لیے وہاں کچھ نہ ہو مگر۔ میں بہت [مجبور] ہوں، شرف الدین۔ تم اگر میرے قریب آجاؤ گے تو [میں] اس کٹورے کا پانی تمہارے چہرے کی طرف ایسے [اچھا]لوں گا کہ میرا ہاتھ اس لکیر سے باہر نہ جا سکے۔ اس [طرح] کچھ نہ کچھ قطرے تمہارے منہ میں ضرور چلے جائیں [گے]۔ شرف الدین! میری اس مجبوری کو سمجھ رہے ہو [نا]!"

میرے انداز میں بے بسی پا کر اس نے آنکھیں موند [لیں]۔ چند لمحے وہ یونہی آنکھیں بند کیے گہری گہری سانسیں [لیتا] رہا پھر دھیمے سے بولا۔ "ٹھیک ہے دوست۔۔۔! شاید میری [قسم]ت اسی طرح لکھی ہے۔ میں اس میں بھی خوش ہوں [وقار] الحسن! کم از کم مرتے ہوئے تم قریب تو ہو نا۔۔۔ مجھے [بت]ا تو دے سکو گے۔ میرے گھر والوں کو میری موت کی اطلاع تو پہنچا سکو گے۔ وہ۔۔۔ وہ لوگ فرقان کے گھر ہیں، وقار الحسن! شگفتہ۔۔۔ شگفتہ جل گئی تھی نا۔۔۔ اس کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ مجھے اباجی کا تار ملا تھا اس لیے۔۔۔ اس لیے میں یہاں پہنچا تھا مگر۔۔۔ شاید اسے دیکھنا میری قسمت میں نہیں تھا۔"

وہ بول رہا تھا اور میں دم بخود سن رہا تھا۔ یہ سن کر کہ شگفتہ جل گئی ہے، میری آنکھوں کے آگے وہ سین گھوم گیا جب اس سنسان سڑک پر اچانک تانگے میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ مجھے یاد آگیا کہ میں اس طرف لپکا تھا مگر پھر۔۔۔ اور تبھی دوسرے خیال نے مجھے چونکا دیا۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ جب مجھے ہوش آیا تھا تو سڑک سنسان تھی۔ نہ وہاں کوئی تانگا تھا۔ نہ اس میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ سب سادھو کا کرشمہ تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے غور سے شرف الدین کو دیکھا۔ وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں وہ بے پناہ کرب نہیں تھا جو میں نے اب سے پہلے دیکھا تھا بلکہ نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں ہوشیاری کی چمک ہے۔ ایک عجب سا تاثر۔ پھر جیسے میرے اندر ہی سے کسی نے مجھے ٹوکا دیا کہ میں اس کی طرف دھیان دینے کی بجائے اپنا وظیفہ شروع کروں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کافی وقت ضائع کر چکا ہوں۔ ضروری نہیں کہ یہ واقعی شرف الدین ہو بلکہ یقیناً یہ بھی سادھو کا کارنامہ ہو گا ورنہ مرتا ہوا آدمی سرک کر پانی کی صراحی تک پہنچنا گویا زندگی کی نوید سمجھتا۔ وہ شرف الدین ہوتا تو ضرور وہاں سے پانی حاصل کر لیتا۔ جب وہ اپنے پیروں سے چل کر یہاں تک پہنچا تھا تو لیٹے لیٹے چند قدم دور رکھی صراحی تک پہنچنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ مجھے واقعی وظیفہ شروع کر دینا چاہیے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، ایک نگاہ سامنے کارنس پر رکھے مجسمے اور کڑے پر ڈالی اور پھر اگلے وظیفے کی تیاری شروع کر دی۔ مجھے اس بار دو موم بتیاں مزید روشن کرنا تھیں، عطر گلاب کی پھریریاں کانوں کی لو میں رکھنا تھیں۔ عطر کو خود پر چھڑکنا تھا اور کٹورے کے پانی سے اپنے خشک ہونٹ اور سوکھی زبان کو تر کرنا تھا۔ میں نے گلاب کے عطر کی پھریریاں کان کی لوؤں میں رکھیں، عطر گلاب کو خود پر چھڑکا۔ موم بتیاں بھی جلا دیں لیکن کٹورے کے پانی سے ہونٹ اور زبان کو تر کرنا میرے بس میں نہ رہا کہ میرے عین سامنے پڑا شرف الدین للچائی ہوئی نگاہوں سے اس کٹورے کو تک رہا تھا۔ میری

ہمت نہ ہوئی کہ اس کے سامنے اپنے ہونٹ اور زبان تر کرتا۔

میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور چلّہ شروع کردیا۔ چلّہ شروع کرتے ہی میں نے شرف الدین کے رونے کی آواز سنی۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس کی آواز بتدریج تیز ہوتی جارہی تھی۔ میرے اندر طوفان سے اٹھنے لگے تھے۔ تبھی مجھے اپنی ایک غلطی کا احساس ہوگیا۔ مجھے چلہ شروع کرنے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ لینا چاہیے تھی۔ اس طرح اگر شرف الدین واقعی شرف الدین ہوتا تو بھی پتا چل جاتا اور اگر یہ سادھو کی کوئی نئی چال تھی تو میں اس کے طلسم سے نکل آتا۔

اب اس کی آواز میرے اندر ہل سے ڈال رہی تھی۔ میں اٹک اٹک کر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ ہیجان بڑھا تو شاید مجھ سے گڑبڑ ہوجائے' اگر ایسا ہوگیا تو غضب ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر میں نے پوری قوت سے تمام تر توجہ وظیفے پر مرکوز کردی۔ شاید آپ کو بھی اندازہ ہو کہ ایسے وقت میں ذہن کو کسی ایک نکتے پر مرکوز رکھنا کتنا مشکل ہو سکتا ہے جبکہ ایک طوفان بلاخیز آپ کے اندر تباہی مچا رہا ہو۔

میں جوں جوں وظیفہ کر رہا تھا' شرف الدین میرے حواسوں پر سوار ہوتا جارہا تھا۔ بند آنکھوں میں بھی اس کا سراپا مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا' مر رہا تھا اور میں بے پناہ مجبور تھا۔ کاش وہ کچھ دیر کے بعد آتا۔ یہ میرا آخری چلہ تھا جس کے بعد مجھے کچھ دیر آرام کرنے کی' ضروریات سے فارغ ہونے کی اور کمر سیدھی کرنے کی اجازت تھی۔ اول تو میں اس سے قبل حصار سے نکل ہی نہیں سکتا تھا اور اگر نکل بھی جاتا تو وہ حصار ٹوٹ جاتا۔ اسی لیے بابا نے مجھے خوب سمجھا دیا تھا کہ چلے کے دوران میں ضرورت پڑنے والی تمام چیزیں یاد کرکے پہلے ہی رکھ دوں۔ انتہائی ضروریات سے فارغ ہولوں تاکہ کسی بھی غلطی کا امکان نہ رہے۔

میرا خیال تھا کہ ابھی مجھے مزید آدھے گھنٹے تک اس لکیر کے اندر محصور رہنا ہے۔ اس آدھے گھنٹے میں شرف الدین' اگر وہ واقعی شرف الدین تھا تو مر بھی سکتا تھا۔ میرا ذہن سوچوں سے آزاد نہیں ہو رہا تھا اور مجھے وظیفے میں بڑی دقت ہو رہی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ہر احساس سے عاری ہو جاتا تاکہ بغیر کسی غلطی کے سکون اور پوری تن دہی کے ساتھ وظیفہ مکمل کرسکوں' میں اپنی بھرپور کوشش بھی کر رہا تھا مگر فی الوقت اس میں کامیابی مشکوک ہوگئی تھی۔

"وقار الحسن! تم کیسے دوست ہو وقار! میں نے تو تمہاری خاطر خود کو تباہ کرلیا اور میں مر رہا ہوں مگر تم۔۔۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

کاش میں اسے اپنا دل چیر کر دکھا سکتا۔ اسے دکھا سکتا کہ میں اس کی حالت پر خون کے آنسو رو رہا ہوں مگر یہ یقین دلانا ممکن نہ تھا۔ شاید چند منٹ کے بعد ہی میں نے اپنے اندر بے پناہ سکون اور باہر بلا کا سکوت محسوس کیا۔ شرف الدین یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا پھر۔۔۔ یا پھر۔۔۔ آگے سوچنے کی بھی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اب میں نے یکسوئی سے وظیفہ شروع کردیا۔ اسی وظیفے کے آخر میں مجھے مجسمے اور کڑے کے گرد حصار کھینچنا تھا۔ ایک آیت کے دوران مجھے ایک جگہ پر ٹھہرنا تھا اور آنکھیں کھول کر' نگاہوں ہی نگاہوں میں ان دونوں چیزوں کے گرد ایک ان دیکھی لکیر کھینچنا تھی۔ وہ لمحہ قریب آتا جارہا تھا۔ میرے اندر پھر ایک نامعلوم سا' ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ اس بار یہ ہیجان آج طویل چلے کو ختم کرنے کی خوشی کا تھا۔ کامیابی میرے قریب تھی۔ ان دونوں چیزوں کو محصور کرنا گویا سادھو کو اس اس عظیم مشن میں ناکام کرنا تھا جس کی خاطر اس نے پیچھا پکڑا تھا۔

میں دھیرے دھیرے کامیابی کی سمت بڑھ رہا تھا۔ میرے گرد پھیلا ہوا سکوت ہنوز قائم تھا۔ میری زبان میں بے جلدی سے لکنت پیدا ہو رہی تھی' اب صرف چند لمحے تھے اور مجھے ان چند الفاظ کی ادائیگی کے بعد ٹھہرنا تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا' شل ہوتے ہوئے اعصاب کو قابو کرنے کے لیے' بدن کے کھنچاؤ سے نجات پانے کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں وظیفہ لگا۔ ابھی وہ الفاظ' آیت کا وہ حصہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ پوری جان سے لرز اٹھا۔ حجرے کا دروازہ زور کی آواز کے ساتھ کھلا تھا اور اماں کی دہاڑ سن کر میں نے چونک کر اچھل کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ چند ثانئے۔ صرف ثانئے پہلے۔ اماں دروازے میں ایسی حالت میں تھیں کہ میں سکتے میں رہ گیا۔ ان کے بدن پر کپڑے چیتھڑوں کی مانند لٹک رہے تھے۔ سر پر نہ برقعہ تھا نہ چادر۔ ان کے ماتھے سے بہنے والے لہو نے ان کے چہرے کو ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

"وقار الحسن! ہم برباد ہوگئے۔ تباہ ہوگئے وقار الحسن! جمالی کو وہ سادھو اٹھا کرلے گیا۔"

یہ جملہ کیا تھا بم تھا۔ جس نے میرے وجود کے ٹکڑے فضاؤں میں بکھیر دیئے۔ وہ دروازے کی چوکھٹ کو پکڑے زمین پر گرتی جارہی تھیں۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ کچھ یاد نہ رہا۔ میں چلا میں لگاتا ہوا اماں تک پہنچ گیا۔ میں نے جونہی اماں کی طرف ہاتھ بڑھایا' مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا لگنے کی وجہ وہ ہیبت ناک ہنسی تھی جو میں نے اپنی پشت پر سنی تھی۔ ہلکی اور دبی دبی ہنسی۔ جو دھیرے دھیرے تیز ہوتی جارہی تھی۔ ہنسی کی یہ آواز شرف الدین کی تھی۔ اس شرف الدین کی جو چند منٹ پہلے زخمی حالت میں بے سدھ پڑا تھا جسے میں مردہ سمجھ رہا تھا یا بے ہوش۔

میں ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ کھڑا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں مجسمہ اور دوسرے ہاتھ میں چاندی کا کڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھری تھی۔

میں اس کی طرف لپکا۔ "شرف الدین! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ مجھے دے دو۔" میں چیخا۔

"جس کے لیے میں نے اتنے کشٹ اٹھائے۔ اتنی کٹھنائیاں سہیں وہ میں واپس کردوں؟ نہیں وقار الحسن! ان چیزوں نے مجھے میری وہ زندگی واپس دلا دی ہے جو سندر سے سندر' حسین ترین ہوگی۔" شرف الدین بول رہا تھا مگر آواز اس کی نہیں تھی۔ "میں نے تم سے کہا تھا' کہ مجھے یہ دونوں چیزیں دے دو۔ اتنی چھتی اٹھا کر' اتنا نقصان اٹھا کر بھی تم مجھے ان چیزوں کو حاصل کرنے سے نہیں روک سکے۔" اس نے منہ اٹھا کر وحشت ناک قسم کا قہقہہ لگایا۔

مجھے یقین تھا کہ میرا چہرہ سفید ہو چکا ہوگا۔ مجھے اگر سنہرے بابا تفصیل سے یہ نہ بتا چکے ہوتے کہ ان چیزوں کو حاصل کرکے سادھو کیا کرے گا تو شاید میری یہ کیفیت نہ ہوتی۔ لیکن اب تو اس نے دونوں چیزیں حاصل کرلی تھیں۔ میں کتنا بے وقوف تھا کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف چند ثانئے میری کامیابی کے ضامن تھے اور میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اماں کو اس حالت میں دیکھ کر خود پر قابو رکھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ اماں کا خیال آتے ہی میں پلٹا تاکہ انہیں سنبھال سکوں مگر یہاں مجھے حیرت اور دکھ کا ایک اور زبردست جھٹکا لگا۔ دروازے کی چوکھٹ بالکل خالی تھی بلکہ حجرے کا دروازہ ویسے ہی اندر سے بند تھا جیسا میں نے چلّہ شروع کرنے سے پہلے بند کیا تھا۔

"وقار الحسن! جو شکتی تم حاصل کر چکے ہو' وہ تو تمہیں حاصل ہوگئی مگر اب ایسی کوئی بھی چستانہ کرنا۔ میں تمہیں سکھ کے آکاش پر پہنچادوں گا۔ تمہارے دھرم میں ساری شکتیاں مانس کو شانتی اور سکھی جیون سے دور کرتی ہیں لیکن میں تمہیں ایک ایسے سکھی جیون میں لے جاؤں گا جہاں کی سندرتا تمہارے من کو در کھایو شانتی دے گی ابدی سکون دے گا۔ یہ شکتیاں تمہیں جن کٹھنائیوں سے گزر کر جیون سے دور کرتی ہیں اس سے بھی کم کشٹ اٹھا کر تم امر ہو سکتے ہو۔ نرم و ملائم جذبوں اور بدن کی لذتوں سے لطف اندوز ہو کر جیون کی وہ خوشی حاصل کرسکتے ہو جو کئی جنم تک تمہاری آتما کو شانت رکھے گی۔"

"او خبیث شیطان! تو اگر ان چیزوں کو حاصل کرکے یہ سمجھتا ہے کہ تو مجھے شکست دے دے گا تو یہ تیری بھول ہے۔" میں دانت کچکچاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب وہ مکمل طور پر شرف الدین کی شکل میں نہیں تھا بلکہ نقوش غیر محسوس انداز میں تبدیل ہو رہے تھے۔

پہلے ہی مرحلے میں ناکامی نے مجھے آپے سے باہر کردیا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کس قدر جلد اور آسانی سے کامیاب ہوگیا تھا اس کا مجھے بے پناہ قلق تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سے ٹکرا کر خود کو فنا کرلوں۔ اس کا کوئی شعبدہ' کوئی جادو یا کوئی بھی چال میری زندگی کا خاتمہ کردے تاکہ میں سنہرے بابا کے سامنے شرمندہ ہونے کے لیے زندہ ہی نہ رہوں۔ اماں اور تایا کو یہ بتانے کے لیے بھی زندہ نہ رہوں کہ جس چلے کی خاطر میں ان سے جدا ہوا' اس میں پہلے ہی روز ناکام ہوگیا ہوں۔

"نہیں بالک! اب تم مجھ سے یہ دونوں چیزیں حاصل کر نہیں سکتے۔ میں نے اپنا پورا جیون تیاگ کر جو شکتیاں حاصل کی ہیں' انہیں ایک تجھ جیسے چھوکرے کی بھڑکیاں مجھ سے چھین نہیں سکتیں۔ ویسے میں تیرا آبھاری ہوں' شکر گزار ہوں کہ تیرے من کی کمزوری نے ہی مجھے سپھل کیا

ہے۔ میں جارہا ہوں‘ بے وقوف بالک لیکن یہ بتا کر جارہا ہوں کہ میرا در ہمیشہ تیرے لیے کھلا ہے۔ میں تم جیسے بالکوں کا اور کھاص طور پر تیرا انتجار کروں گا۔ تو جان لے مورکھ کہ تجھ میں بڑی شکتی پانے کی جھمتا ہے۔ ایسی شکتی جو مانس کے دل پر وجے پاسکتی ہے۔ جو جانوروں کو رام کر سکتی ہے۔ تیری اس گپت شکتی سے وہ سنہرا بڈھا بھی جانکاری نہیں رکھتا۔ یہ میں جانتا ہوں‘ صرف میں۔ میں ایسی سندر کنیاؤں کو تیرے شریر کا رسیا بنادوں گا جن کا سپرش تیرے شریر میں کئی شتابدی تک میٹھی لہریں سی دوڑاتا رہے گا۔ تو چاند کی اوشاؤں کو اپنی آتما میں سموتا محسوس کرے گا۔ کیا تیرے ذھرم میں کوئی ایسی شکتی ہے جس سے تو اتنے بہت سے سوادا تنی بہت سی لذتیں پاسکے؟“

”مجھے تیری ان خبیث شکتیوں کی ضرورت نہیں ہے شیطان! میں آج قسم کھاتا ہوں کہ ہر راہ پر تیرا مقابلہ کروں گا۔ ہر موڑ پر تجھے شکست دوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ میں تجھ سے تیری یہ زندگی ہی چھین لوں گا جو تجھے رنگینوں کے خواب دکھا رہی ہے۔ جو جانے کتنی معصوم دوشیزاؤں کی موت بن کر دنیا پر چھا جانے کو بے چین ہے۔“ میں بے قابو ہوتا جارہا تھا۔

”مورکھ! تو مجھے کوئی بھی چھتی نہیں پہنچا سکتا۔ اب مجھ تک پہنچنے کے لیے تجھے جانے کتنی شتابدی سے گزرنا پڑے گا۔ وہی تو ایک تھا جو تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کر سکتا تھا۔ اسے کھوجنے کے لیے تجھے اپنا پورا جیون تیاگنا پڑے گا اور ابھی تجھ میں اتنا دم نہیں ہے۔“ اس نے گھمنڈی انداز میں کہا۔ میں جان نہیں سکا کہ وہ کس شخص کے بارے میں کہہ رہا ہے لیکن اس کی گفتگو سے اتنا پتا چل چکا تھا کہ کوئی ہے جو مجھے اس کے مقابلے کی طاقت دے سکتا ہے۔

اس کی چمک دار آنکھوں میں فتح مندی کا غرور تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی جو مجھے اندر سے بجھائے دے رہی تھی۔ میرے اندر اندھیرا بڑھتا جارہا تھا پھر وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ یوں جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں یا اگر تھا تو صرف اور صرف میرا تصور تھا جو پلک جھپکتے ہی غائب ہو چکا تھا۔ پہلا خیال تو مجھے یہی آیا کہ یہ سب کچھ ایک بھیانک حقیقت تھا۔ ایک ایسی حقیقت جسے جھٹلانا میرے کیا‘ کسی کے بھی بس میں نہیں۔ میں اس قدر دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ بار بار خیال آرہا تھا کہ آخری چلہ مکمل ہونے میں صرف چند ہی لمحے تو رہ گئے تھے‘ اگر میں نے خود پر قابو رکھا ہوتا تو کیا حرج تھا مگر جو ہو چکا تھا‘ اور جو کچھ میں کھو چکا تھا اسے واپس لانا میرے بس میں نہیں تھا۔

جانے اس لمحے مجھے کیا خیال آیا کہ میں حصار میں بیٹھا اور وظیفہ اسی جگہ سے شروع کر دیا جہاں سے ٹھہرا تھا کے بعد اور ان دونوں چیزوں پر حصار کھینچنے کے بعد وظیفہ شروع کرنا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے بڑے انہماک سے وظیفہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں فارغ ہو گیا۔ مجھے کوئی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ اب جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کا کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا کچھ فائدہ پہنچ جاتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں محض وقت برباد کر کے لوٹ جاتا۔ بس میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ اس تھوڑے سے وقفے میں ہونے والے واقعات کو بھول کر میں اپنے وظائف جاری رکھوں۔ یہ تمام وظائف چالیس روز کے تھے۔ چالیس روز بہت ہوتے ہیں جبکہ میں تو ایک ہی روز میں گویا نچڑ کر رہ گیا تھا۔ بہرحال میں نے دل کی بات مانتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ میں چالیس روز کا چلہ مکمل کر کے ہی جاؤں گا۔ پہلے جاتا بھی تو کیا کرتا؟! اماں اور تایا کو اپنی شکست کا احوال سنا کر پریشان کرنے کے سوا کیا حاصل کر لیتا جب کہ چالیس روز کا چلہ کرنے کے بعد کم از کم میں یہاں سے جانے سے قبل سنہرے بابا سے تو مل لیتا۔ انھوں نے چالیسویں روز ہی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ چالیس روز سے قبل حجرے سے باہر قدم نکالنے سے منع کر رکھا تھا سو میں نے یہ دن یہیں گزارنے کا فیصلہ کر کے اس پر عمل شروع کر دیا۔ سب سے پہلے عشا قضا اور تہجد کی نماز پڑھی۔ سبزیاں نمک ڈال کر ابالیں۔ کٹورا بھر کر پانی لیا۔ یہ وہ کٹورا نہیں تھا جو حصار کے اندر رکھا تھا۔ اسے تو چالیس روز تک استعمال کرنا تھا۔ ابلی ہوئی سبزیاں کھا کر میں کچھ منٹ کے لیے لیٹ گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے پھر چلہ شروع کر دیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں کب تک اور کس طرح وظیفہ کرتا رہا۔ جب تھکن اور نیند کے غلبے نے جسم کو بھر بھری ریت جیسا کر دیا تو میں وہیں ڈھے گیا۔ اسی حصار کے اندر میں ٹانگیں سمیٹ کر لیٹا رہا اور کچھ دیر کو سو گیا۔ پہلی رات کچھ دیر کے لیے سونے کی اجازت مجھے پہلے ہی مل چکی تھی

مجھے قطعی نہیں سونا تھا۔ یہ نیند مجھے زیادہ دیر تک بے سدھ نہیں رکھ سکی۔ میں بہت جلد ترو تازہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔ یہ رات کا کون سا پہر تھا اور مجھے مزید کب تک یونہی ...نا تھا‘ میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو بس ایک ہی دھن تھی فائدہ ہو یا نقصان‘ مجھے ہر حال میں چالیس روز کا چلہ ...ل کرنا ہے۔ میں سنہرے بابا سے ملے بغیر یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔

دھیرے دھیرے وقت گزرتا چلا گیا۔ میں ایک کے بعد ...چلہ کرتا رہا۔ اسی ترتیب اور اسی انہماک سے جس کی ...ن مجھے سنہرے بابا نے کی تھی۔ میری غذا روز بہ روز کم ...ی چلی گئی۔ پیاس کی شدت میرے بدن میں رچ بس گئی ...میں عادی ہوتا چلا گیا۔ اب تو ضروری حاجت کا بھی مجھے ...کم احساس ہوتا تھا۔ سیدھا بیٹھے رہنے سے اور گہرے ...ں لیتے رہنے سے میں اتنے روز مسلسل وظیفہ کرنے کے ...بھی خود میں بڑی مضبوطی پاتا تھا۔ نہ مجھ میں نقاہت رہی ...اور نہ تھکن کا کوئی احساس بلکہ اس کے برعکس میں خود ...ایک عجیب و غریب قسم کی روشنی اور طاقت محسوس کر ...تا تھا۔ اس احساس کی وجہ سے مجھے اور اک ہوا کہ ...یوگا کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں یا اولیاء کرام مختلف ...ئف کے بعد بھی اس قدر ترو تازہ کیسے رہتے ہیں۔ بابا ...مجھے آخری وظیفے کے دوران میں نیلے رنگ کی روشنی کا ...رکیے رہنے کو بھی کہا تھا۔ شاید اسی مراقبے کی وجہ سے ...ایک ایسی تبدیلی محسوس کر رہا تھا جو مجھ میں بے پناہ ...ت‘ خوشی اور سکون بن کر دوڑ رہی تھی۔

...میں دنیا سے بالکل کٹ گیا تھا۔ دنیا سے قطع تعلق تو پہلے ...روز ہو گیا تھا مگر تصوراتی طور پر میرا جو رابطہ شروع ...ع دنیا سے‘ اپنے گھر والوں یا پچھلے واقعات کے حوالے ...رہا تھا‘ اب وہ بھی ختم ہو چکا تھا بلکہ کچھ عجیب و غریب ...کے خیال اور کیفیت نے مجھ پر تسلط جما لیا تھا۔ کبھی کبھی ...خود کو ایک وسیع سمندر کی شکل میں محسوس کرتا تھا‘ ...پانی کی سطح پر پراسرار قسم کی خاموشی مگر بے پناہ تلاطم ...تھا۔ ایسے میں‘ میں اپنے اندر اٹھتی ہوئی لہروں کو نہ صرف ...وس کرتا تھا بلکہ ان شوریدہ سر لہروں کے اچھلنے اور کبھی ...ی ساحل سے ٹکرانے کی آواز بھی سنا کرتا تھا اور کبھی ...خود کو ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کی شکل میں پاتا جس ...اندر لاوا ابل رہا ہو۔ اس پکتے ہوئے لاوے کو میں یوں دیکھتا اور محسوس کرتا تھا جیسے میری آنکھیں اس لاوے میں بہہ رہی ہوں۔ اس کی تپش‘ اس لاوے کے پکنے سے پیدا ہونے والی کھدبد کی آواز‘ اس میں اٹھتے شعلے اور کبھی کبھی نکلنے والا گاڑھا دھواں بھی میں بہت واضح طور پر محسوس کرتا تھا۔ اس کیفیت کے ختم ہونے کے بعد میں کچھ دیر تک نڈھال سا پڑا رہتا تھا‘ یوں جیسے میلوں کا سفر پیدل طے کر کے آیا ہوں۔

شاید یہ سب اس لیے تھا کہ میرا ذہن باقی تمام تصورات سے پاک ہو چکا تھا۔ حیرت تو مجھے اس روز ہوئی تھی جب چالیس روز ختم ہونے اور وظیفے کے مکمل ہونے میں صرف دو روز باقی رہ گئے تھے۔ میں نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کے لیے حصار سے باہر آیا تھا۔ کھانا کھا کر اور نماز پڑھ کر میں کچھ دیر کے لیے چٹائی پر سیدھا لیٹ گیا۔ میں خوش تھا کہ اب صرف دو روز بعد میں یہاں سے گھر جاؤں گا۔ گھر کا خیال آتے ہی میں نے اپنے گھر کا تصور باندھنے کی کوشش کی تو ذہن میں لق و دق صحرا کے سوا کوئی دوسرا تصور نہ ابھرا۔ میں نے اماں کے بارے میں سوچنا چاہا تو کوئی چہرہ‘ کوئی وجود‘ کوئی نام میرے ذہن میں نہ آسکا اور تبھی مجھ پر یہ روح فرسا حقیقت آشکار ہوئی کہ میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔ نہ مجھے اپنا گھر یاد تھا نہ اماں کا چہرہ۔ میں لفظ گھر یا لفظ اماں تو کہہ سکتا تھا‘ سوچ سکتا تھا مگر ان الفاظ کے ساتھ ہی جو تصور میرے ذہن میں آنا چاہیے تھا وہ نہ تھا۔ پھر تو میں نے دیوانہ وار ایک ایک کا نام لے کر اسے تصور میں دیکھنے یا اس سے متعلق کسی کیفیت کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر ذہن کا پردہ بالکل صاف تھا۔ سفید کپڑے کی طرح بے داغ‘ کوئی تصویر‘ کوئی خیال‘ کوئی چہرہ یا کوئی بھی کیفیت نہ تھی۔

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں شاید سو رہا تھا‘ یا شاید اس لمحے مجھے کچھ ہو گیا ہے‘ میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔ یہ مسلسل بیٹھ کر وظیفے کرنے کا نتیجہ بھی ہو سکتا تھا۔ چالیس روز کم نہیں ہوتے اور وہ بھی ایسی کیفیت میں جب مجھے اپنے ذہن کو ہر چیز اور ہر احساس سے قطع کر کے صرف اور صرف وظیفے پر توجہ دینا تھی۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید میرا ذہن چالیس روز تک بالکل صاف رہنے کی وجہ سے عادی ہو گیا ہے اور یقیناً چلے کے اختتام کے بعد میں نارمل ہو جاؤں مگر پھر جب میں نے

عجیب و غریب کیفیت کے دوران میں خود کو کبھی سمندر اور کبھی آتش فشاں پہاڑ کی صورت محسوس کیا تو یہ احساس ہوا کہ سمندر اور پہاڑ کا تصور اس قدر طاقت دیتا ہے کہ میں خود کو گہرے سمندر میں اس کی لہروں یا پہاڑ کے اجزا اس کے ایک ایک ذرے میں محسوس کرتا۔ پورے سمندر کا تصور اپنی جذبات کے ساتھ ذہن پر ابھر آتا یا آتش فشاں پہاڑ کا تصور اتنا طاقت ور ہوتا کہ میں خود میں لاوا اُبلنے اور بہنے کا شور صرف محسوس ہی نہیں کرتا تھا بلکہ دیکھتا بھی تھا۔ اسی عجیب و غریب قسم کی کیفیت نے مجھے بے پناہ پریشان کر دیا تھا۔ بے چینی، بے سکونی اور ہیجان نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ لیکن میں نے بہت جلد خود پر قابو پالیا اور باقی دو روز بھی بڑے انہماک اور توجہ سے مراقبے اور چلے میں کاٹ دیے۔

چالیسواں روز تھا۔ میں فجر کی اذان سے قبل ہی آخری چلہ کاٹ کر فارغ ہوا تھا۔ ان چالیس دنوں کے دوران میں، میں بالکل بدل چکا تھا۔ نہ معلوم کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں اب وہ وقارالحسن نہیں رہا جو چالیس روز پہلے اس حجرے میں داخل ہوا تھا۔ چلے سے فارغ ہو کر میں نے غسل کیا۔ اپنے اٹیچی کیس میں رکھے کپڑے نکال کر تبدیل کیے اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانے کی تیاری کرنے لگا۔ حصار کو توڑا۔ حصار توڑنے کا طریقہ مجھے سنہرے بابا بتا چکے تھے۔ میں نے ابھی حجرے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا کہ دروازے پر بڑی مدھم سی دستک سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی سنہرے بابا کا روشن اور مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی لیکن نہ معلوم کیوں مجھے احساس ہوا تھا جیسے وہ ناراض ہیں۔ شاید ان کی آنکھوں میں ناگواری کا تاثر تھا۔ میں نے ادب سے انھیں اندر آنے کا راستہ دیا پھر لپک کر ان کا مصلا جھاڑ کر دوبارہ بچھا دیا۔ ان کے ہاتھ سے ٹین کا وہ چھوٹا سا بکس لے کر اسی جگہ رکھ دیا جہاں میں پہلے اسے رکھا ہوا دیکھ چکا تھا۔ بابا میرے سلام کا جواب دے کر اس کاٹھ کی طرف بڑھ گئے جہاں انھوں نے مجسمہ اور کٹورا رکھا تھا۔ میں دم بہ خود کھڑا رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ مجھ سے دونوں چیزوں کی غیر موجودگی کے بارے میں استفسار کریں گے۔ ممکن ہے میری بے پروائی پر ناراضگی کا اظہار بھی کریں۔ میں ان کے حکم سے سرتابی کا سزاوار تھا سو سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں وقارالحسن! میں ناراض نہیں ہوں۔" سنہرے بابا نے اچانک پلٹ کر کہا۔ اس بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے تشویش تھی۔ "مگر مجھے اس بات سے دکھ پہنچا کہ تم نے میرے کہے پر اعتماد نہیں کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ کسی بھی حال میں تمھیں حصار سے باہر نہیں آنا ہے، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ گو تم نے باقی چلے مکمل کر کے خود کو بہت سے عذابوں سے بچا لیا مگر تم شکنتلا سے وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے ہو۔ تم نے اسے سکون دینے کی بجائے ایک ایسے اندھے کنویں میں اتار دیا ہے جہاں وہ ہمیشہ دکھوں کی صلیب پر لٹکی رہے گی۔ صرف وہی نہیں اب جانے کتنی دوشیزائیں اس خبیث کی ہوس کے بھینٹ چڑھ جائیں گی۔" سنہرے بابا کے لہجے میں بے پناہ کرب تھا۔

"بابا! کیا میں کسی بھی طرح اس کا تدارک نہیں کر سکتا!"

"تم نے ایک آسان راستہ چھوڑ کر مشکل راستے کا انتخاب کر لیا ہے۔ تمھارے اندر سب کچھ کرنے کی طاقت ہے، خدا تمھاری حفاظت کرے گا مگر یہ راستہ بہت پرخار اور تکلیف دہ ہے۔ تمھیں اپنی پوری زندگی تیاگنا پڑے گی تب کہیں جا کر تم سادھو کو فنا کر سکو گے۔ یہ ہمارے لیے خوش خبری ہے وقارالحسن! کہ اس خبیث کی موت تمھارے ہی ہاتھوں ہو گی۔ لیکن۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو کر پرسوچ انداز میں میری طرف دیکھنے لگے۔

"لیکن کیا سنہرے بابا! میں قسم کھا چکا ہوں بابا کہ اس خبیث شیطان کو چین نہیں لینے دوں گا۔ میں سب کچھ کروں گا۔ بابا آپ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ میں واقعی بہت مضطرب تھا۔

"تمھیں۔۔۔ تین وظائف کھلے آسمان تلے کرنا ہوں گے وقارالحسن، کسی ایسی جگہ جہاں پر سایہ ہو، نہ درخت اور نہ ہی پہاڑ یا چٹانیں۔ کسی کھلی جگہ پر، کسی میدان یا کسی ایسے صحرا میں جہاں دور دور تک کوئی نہ ہو۔ ان وظائف کے دوران میں تم حصار بھی نہیں باندھ سکتے، تمھیں ان وظائف کے دوران میں بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑیں گی۔ بڑی تکلیفیں برداشت کرنا ہوں گی وقارالحسن! اگر تم میں حوصلہ ہوا اور تم کامیاب ہو گئے تو تم سادھو پر حاوی ہو جاؤ گے ورنہ، ورنہ شاید۔۔۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ سادھو کو اس کی خباثت سے روکنا ہی اب میرا مقصد حیات تھا۔ میں نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اس لیے کچھ بھی مزید جانے بغیر میں نے ان سے وظائف کی تفصیل معلوم کی۔ سنہرے بابا نے ایک بہت ہی بوسیدہ سا کتابچہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور تاکید کی کہ میں اس کتابچے میں لکھی ایک ایک بات کو ذہن نشین کر لوں۔ جب تک مجھے سو فی صد یقین نہ ہو جائے کہ میں اس کتابچے کی کلی جزیات کو ذہن نشین کر چکا ہوں، ان وظائف کو کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہ لاؤں۔ میں نے جھٹ وہ کتاب اپنے اٹیچی میں رکھ لی۔

"اب تم جا سکتے ہو وقارالحسن! تم میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو طاقت تمھیں حاصل ہوئی ہے اس سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے۔" سنہرے بابا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ طاقت تمھارے پاس امانت ہے بیٹا! خدا کی امانت، اسے صرف نیکی کے کاموں میں استعمال کرنا، جب محسوس کرو کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تو اسے لوٹا دینا۔"

"میں۔۔۔ میں سمجھا نہیں بابا۔ کون سی طاقت؟ اور۔۔۔ امانت آدمی کیسے لوٹا سکتا ہے؟" میں الجھ کر بولا۔

"امانت لوٹانا تمھیں نہیں آتا کیا؟" انھوں نے حیرت اور دکھ سے پوچھا۔

میں شرمندہ ہو گیا مگر کچھ نہ سمجھنے کی وجہ سے دوبارہ بول اٹھا۔ "بابا! کوئی مادی چیز ہو اور اس کا مالک بھی سامنے ہو تب تو چیز لوٹائی جاتی ہے مگر۔۔۔"

"تمھارے خیال میں ہمارا مالک ہمارے سامنے نہیں ہوتا؟" اس بار ان کے لہجے میں درشتگی تھی۔

میں بوکھلا گیا۔ "نہیں بابا۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔!"

"سنو نادان لڑکے! جب ضرورت نہ رہے تو نماز پڑھنے کے بعد خدا سے مکالمہ کرنا اور کہنا کہ تم نے اس کی دی ہوئی طاقت سے جس قدر کام لے سکتے لے لیے، اب اسے لوٹا رہے ہو۔ اور بس۔"

میں نے سر جھکا دیا۔

"یہ فیروزے کی انگوٹھی اور اسم اعظم تمھارے لیے کافی ہو گا۔ تمھیں پہلے تو پرکاش کی لاش کے گرد کھینچا گیا حصار توڑنا تھا تاکہ شکنتلا کی روح سکون پا سکے مگر اب یہ ناممکن ہے۔ تم اگر پرکاش کی لاش ڈھونڈ کر اسے ان کے مذہب کے پیروکاروں کے حوالے کر بھی دو اور وہ اپنی رسومات کے مطابق اسے جلا بھی دیں تب بھی شکنتلا پرسکون نہیں ہو سکتی۔ اسے سادھو اپنا آلۂ کار بنا چکا ہو گا۔ اب وہ اس سے ایسے ایسے قبیح فعل کروائے گا کہ جسے برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اتنا طاقت ور ہو چکا ہو گا کہ اس کے سامنے بڑے بڑے ٹک ہی نہیں سکیں گے۔"

"بابا! کیا آپ۔۔۔!" میں جھجک کر خاموش ہو گیا۔ یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ کیا وہ بھی اس کے سامنے بے بس ہوں گے۔

"نہیں وقارالحسن میں جس کام میں لگا ہوں اسے ادھورا چھوڑنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں اس معاملے کی طرف دھیان دینے سے قاصر ہوں۔ حتی الوسع تمھاری مدد کر سکتا ہوں مگر کلی طور پر اس طرف توجہ دینا فی الوقت میرے لیے مشکل ہے۔ تم جاؤ۔ خدا تمھاری مدد کرے گا۔ وہ نیتوں کو جاننے والا اور بڑا کارساز ہے۔"

بابا کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اب وہ مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ وہ یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے۔ جانے کہاں کا سفر کر کے آرہے تھے۔ انھیں آرام کرنا چاہیے تھا اور میں خود غرضوں کی طرح انھیں سوال جواب میں الجھائے ہوئے تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہاں سے چلا گیا تو تنہا رہ جاؤں گا۔ پھر بھی مجھے یہاں سے جانا تو تھا ہی۔ میں نے اپنا اٹیچی کیس اٹھا لیا پھر اچانک ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔

بابا نے استفہامیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ اگر تم تنہا ہونے سے ڈرتے ہو تو پھر ان چکروں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نہ بھی ہوں گا تو کوئی نہ کوئی تمھیں ایسا ضرور مل جائے گا وقارالحسن جو صحیح سمت کی طرف تمھاری رہنمائی کر سکے۔۔۔ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں، تمھیں اندازہ نہیں کہ اب تم کیا ہو۔ جاؤ۔"

"بابا! میں گھر اور گھر والوں کو شاید بھول چکا ہوں۔" میں نے کہا پھر انھیں تفصیل سے بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ انھوں نے بڑی توجہ سے میری بات سنی۔ خود کو سمندر اور پھر پہاڑ محسوس کرنے والی بات کے تذکرے پر ان کی آنکھیں چمکنے سی لگی تھیں یا شاید میں نے محسوس کیا تھا۔ پوری بات سن کر انھوں نے میری کمر تھپتھپائی اور

مسکراتے ہوئے بولے۔

"جب تم اس حجرے سے باہر نکلو گے تو۔۔۔ کچھ جان جاؤ گے۔ سب کو پہچان لو گے لیکن وقارالحسن' خود پر قابو پانا۔ غم کو روگ نہ بنا لینا۔ دکھوں اور مصیبتوں سے مقابلہ کرنا ہی مردانگی ہے' ورنہ مرد کس کام کا۔ زندگی کے اچھے برے حالات سبھی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تم آرام کی زندگی کی خواہش نہ کرنا۔ مادی چیزوں کو اہمیت نہ دینا۔ حقوق العباد کا بہت خیال رکھنا۔ اب مجھے یقین ہے کہ تم بڑے سے بڑا کام بھی آسانی کے ساتھ کر سکو گے۔" ایسا کہتے ہوئے میں نے ان کے چہرے پر بے پناہ خوشی محسوس کی تھی۔

بہرحال اُن کی تسلی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ وہ جو حجرے سے نکل کر بھٹک جانے کا خوف تھا وہ زائل ہو گیا اور میں ان کا شکریہ ادا کر کے' ان کے نرم و ملائم ہاتھوں کو بوسہ دے کر حجرے سے باہر نکل آیا۔ سورج کی کچی کرنیں کسی سنہرے سیال کی طرح میرے وجود میں سرایت کر گئیں' اس میں کوئی غلط بیانی یا مبالغہ نہیں کہ میں نے ان کچی' نرم اور ٹھنڈی کرنوں کو اپنی آنکھوں اور سانسوں کے ذریعے خود میں داخل ہوتا اور پھر خون میں مل کر سانسوں میں بہتے صاف' بالکل واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ یوں جیسے ڈاکٹر انجکشن لگاتا ہے تو دوا ایک عجیب سی تکلیف کے ساتھ بدن میں پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں مجھے تکلیف کی بجائے ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی۔ یہ ٹھنڈک میں نے باقاعدہ نسوں میں آگے بڑھتی اور پھر بتدریج بدن کی ہر نس میں جاتی محسوس کی تھی۔ اس دوران میں' میں جم کر رہ گیا تھا یعنی بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا تھا۔ یہ کیفیت صرف چند لمحوں کی تھی پھر میں نے خود کو نارمل محسوس کیا۔ سنبھلتے ہی میں نے گھر کا تصور باندھا اور اس بار گھر ہی نہیں بلکہ اس طرف جانے والا راستہ' راہ میں پڑنے والی عمارات یا مکان اور اپنے گھر کے دروازے کے ایک کونے میں بنا دیمک کا گھر تک صاف دکھائی دے گیا۔ پھر گھر کے ایک ایک فرد کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ ان چہروں میں اماں اور تایا کا چہرہ فق تھا۔ ہر چہرے پر پراسرار خاموشی جمی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ سب کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ تمام لب بھنچے ہوئے تھے۔ مجھ پر ایک نامعلوم سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ ابھی مجھے مسجد میں نماز بھی پڑھنا تھی۔

میں مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ وہیں سیڑھیوں کے قریب میں نے جن فقیر بابا کو دیکھا جو سر جھکائے' آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے میرے قریب پہنچنے پر چونک کر سر اٹھایا اور پھر مجھے دیکھ کر جھٹکے سے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں مضطرب ہو کر رک گیا۔

"فقیر بابا! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی؟ آپ کیا مجھ سے ناراض ہیں؟"

"تیری وجہ سے وہ منحوس قدم اندر آسکا تھا۔ یہ دیکھ۔" اتنا کہہ کر انھوں نے اپنا دایاں شانہ کھول کر دکھایا اور میں اسے دیکھ کر لرز اٹھا۔ ان کے شانے پر ایک گہرا زخم تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"جا بابا۔ اپنا کام کر۔" انھوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جماعت کھڑی ہو گئی تھی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر میرا ذہن فقیر بابا میں الجھا رہا پھر میں نماز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے گھر کا رخ کیا۔ گھر دور ہونے کے باوجود میں نے پیدل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اتنے دن کمرے میں بیٹھے بیٹھے جو تھکن تھی وہ میں یوں دور کرنا چاہتا تھا۔ ویسے مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ حجرے میں اتنے روز بند رہ کر باہر آنے پر سورج کی شعاعوں کے لمس اور تازہ ہوا نے کوئی ایسی تبدیلی نہیں پیدا کی جو میرے لیے ناقابل قبول ہوتی یا واضح طور پر محسوس ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اگر آدمی چند روز بھی بلکہ چند گھنٹے بھی کسی بند کمرے میں گزار کر باہر آئے تو سورج کی شعاعیں اور تازہ ہوا اسے کبھی کبھی بہت خوشگوار اور کبھی بوجھل سی تبدیلی ضرور محسوس کرتی ہے۔ اسی لیے میں نے پیدل جانے کا فیصلہ کیا تھا کہ اتنے روز نہ چلنے سے اگر ٹانگوں کے پٹھے ناکارہ ہو گئے ہوں تو ان کا دوران خون بڑھ جائے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں زیادہ دور نہیں چل پاؤں گا مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس میں نے اپنے بدن میں بلا کی پھرتی' طاقت اور رفتار میں تیزی محسوس کی۔ اس قدر چلنے کے باوجود نہ میں نے تھکن محسوس کی اور نہ ہی میرا سانس پھولا۔

یہ تبدیلی میرے لیے خوشی کا باعث تھی۔ اسی خوشی میں میں نے اور تیز۔ اور تیز چلنا شروع کر دیا اور اس وقت میں حیران رہ گیا جب میں نے محسوس کیا کہ جو بس یعنی سائزلائن میرے سامنے بس اسٹاپ سے چلی تھی وہ پیچھے رہ گئی تھی اور میں کافی آگے نکل چکا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک سنسنی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے ٹھہر کر اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھا' میرا خیال تھا کہ لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔ میرے چاروں طرف بہت سے افراد آ جا رہے تھے مگر میں نے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ یہ میری کوئی اندرونی کیفیت ہی ہو گی جو میں ایسا محسوس کر رہا ہوں۔ اب میں نے درمیانی رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ پیچھے رہ جانے والی وہ سائزلائن میرے برابر سے گزر گئی۔

وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہوا مگر یہ احساس ضرور رہا کہ میں بہت جلدی گھر تک پہنچ گیا ہوں۔ یہاں کے لوگ ٹوپیاں پہنے یا آستینیں اوپر کرتے ہوئے محلے کی مسجد کی طرف رواں دواں تھے۔ گویا یہاں ابھی تک جماعت بھی کھڑی نہیں ہوئی تھی' اگر ایسا ہی تھا تو میں اتنے فاصلے کو صرف منٹوں میں بلکہ چند ثانیوں میں طے کر آیا تھا۔

گلی میں داخل ہو کر میں نے اپنے گھر کے دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ بند تھا۔ اس پر پڑنے والی نگاہ لوٹ کر آئی تو میں نے خود میں ایک غمگین سی کیفیت کو پیدا ہوتے محسوس کیا۔ وجہ یہی خیال آیا کہ میں غمزدہ ہوں۔ میں اپنی تیزی سے بدلتی کیفیات کی وجہ سے الجھن بھی محسوس کر رہا تھا۔ میرا ذہن کسی ایسی ریل کی طرح لگ رہا تھا جو تیزی سے گزر رہی ہو اور اس میں بیٹھنے والے کو کھڑکی سے بہت سے مناظر نظر آ رہے ہوں' اور تیزی سے تبدیل ہو رہے ہوں۔ ابھی ایک منظر پر نگاہ ڈال بھی نہ پاتا تھا کہ وہ منظر تبدیل ہو جاتا تھا' بالکل وہی کیفیت تھی۔

چند لمحوں میں دروازے تک پہنچ گیا۔ غم کی کیفیت یہاں آتے آتے مزید گہری ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کا کنڈا بجایا۔ مجھے یقین تھا کہ گھر کے تمام ہی افراد جاگ چکے ہوں گے۔ اماں اذان کی آواز پر ہی اٹھ بیٹھتی تھیں اور باری باری سب کو اٹھا دیتی تھیں۔ تایا تو مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے بہت کم جاتے' زیادہ تر گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کرتے تھے جس پر اماں اکثر نالاں بھی رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان

کے اخلاق کے بگڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا معقول لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا بہت کم رہ گیا ہے۔ تمام دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے کنویں کا مینڈک بن کر رہ گئے ہیں۔ تایا کی اس بات کو یاد کر کے میں بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ اسی وقت کسی نے دروازہ کھول دیا۔ سورج کی روشنی اس وقت مشرقی کنارے ہی تک محدود تھی اس لیے آنگن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے والا کوئی مرد تھا' اتنا میں جان چکا تھا۔

"کون ہے؟" دروازہ کھولنے والے نے پوچھا اور اس آواز نے گویا میرے اندر طوفان سے مچا دیے۔ میں خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ وہ سو فی صد شرف الدین تھا۔ میں لپک کر اس کے گلے لگ گیا۔ وہ بھی مجھے اپنے سامنے پا کر حیران اور خوش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو میرے گرد لپیٹ دیے اور بڑی زور سے بھینچ کر بولا۔ "وقارالحسن! تم۔ تم کیسے ہو؟ سب ٹھیک ہے ناں۔؟"

میں بڑی دیر تک کچھ نہ بول پایا۔ میری آواز میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی' کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ بس میں بھی اسے بھینچے گیا اور وہ منظر میری نگاہوں میں گھوم گیا جب میں نے اسے زخمی حالت میں سڑک پر پڑا دیکھا تھا۔

"میاں! کون ہے! بتایا نہیں تم نے۔" یہ آواز تایا کی تھی۔ وہ لالٹین لیے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لالٹین کی روشنی کا دائرہ ان کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ میں اس زرد روشنی میں ان کا چہرہ دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گیا۔ اگر آواز ان کی نہ ہوتی تو میں انھیں کبھی بھی نہیں پہچان پاتا۔ وہ اس قدر کمزور اور لاغر ہو چکے تھے کہ پہچاننا مشکل تھا۔ میں شرف الدین کو پرے کرتا ہوا ان کی طرف لپکا۔

"تایا۔ میں ہوں۔ وقارالحسن۔"

"اوہ۔ تم۔ تم۔" وہ لالٹین زمین پر رکھ کر مجھ سے لپٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا ہے پھر ان کے بدن کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ وہ رو رہے تھے۔ ہاں' وہ واقعی رو رہے تھے۔ اب مجھے ان کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

"تایا۔! تایا روئیں نہیں تایا۔" میں نے انھیں بھینچ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اتنے بہت سے دنوں کی جدائی شاید ان کے لیے جاں لیوا رہی ہو۔ مجھے بھی تو رونا

آرہا تھا۔

"چا۔ چالیس روز ہو گئے؟ اور پتا ہی نہیں چلا۔" انھوں نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

مجھے ان کا یہ جملہ سن کر حیرت ہوئی۔ جدائی اگر جاں لیوا ہو تو اس کا لمحہ لمحہ بھاری گزرتا ہے۔ صدیوں جتنا طویل اور حبس زدہ موسم جیسا بوجھل، مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ اتنے بہت سے دن گزر گئے اور پتا ہی نہ چلا۔ گویا میری جدائی کا طویل دورانیہ ان کے لیے اتنا مختصر تھا جیسے صرف چند لمحے گزرے ہوں۔ ان کے اس جملے نے مجھے چپ لگا دی تھی جسے شاید شرف الدین نے محسوس کر لیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا اور ایک ہاتھ سے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

"تایا! آپ۔ آپ تو بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ کیا آپ بیمار تھے؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے لڑکھڑاتے اور ایک دوسرے میں الجھتے قدموں نے مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہم برآمدے تک پہنچ گئے۔

"نہیں میاں! اچھے بھلے تو ہیں۔" ان کا لہجہ اجنبی اجنبی سا تھا۔ "تم کہو، تم تو ٹھیک ہو ناں؟" اس جملے میں بھی وہ جوش و خروش نہ تھا جس کی مجھے توقع تھی۔

"میں ٹھیک ہوں تایا! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"اب تم آگئے ہو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ہم ذرا نماز پڑھ لیں۔"

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنے پلنگ کے برابر رکھے موڑھے سے جائے نماز اٹھا کر بچھائی اور اس پر بیٹھ گئے۔ جائے نماز بچھانے ہی سے ان کا سانس پھول چکا تھا۔ یہاں لالٹین کے علاوہ کارنس پر رکھے لیمپ کی روشنی بھی تھی۔ اتنی تیز روشنی میں تایا کا چہرہ دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر بدصورت لگ رہی تھیں۔ کندھے کانوں کے قریب محسوس ہو رہے تھے اور سرخ و سفید رنگ زردے کے رنگ کا سا ہو رہا تھا۔ انھیں بیٹھ کر نماز پڑھتا دیکھ کر میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ شرف الدین گہری چپ لیے بیٹھا تھا۔ میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی صحت پر کوئی خاص اثر نہ تھا بلکہ وہ مجھے پہلے سے کچھ فربہ لگ رہا تھا مگر چہرے پر تاثرات عجیب و غریب تھے۔ آنکھیں ساکت اور بھیگی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

"شرف الدین!" میں نے سرگوشی کی۔

"ہوں۔" وہ یوں چونکا جیسے کسی گہری سوچ سے [illegible] ہو۔

"کیا بات ہے شرف الدین! سب۔ سب خیریت تو ہے ناں؟" میرا دل بری طرح گھبرانے لگا تھا۔

"آں۔ ہاں! ہاں ہاں۔ سب خیریت ہے۔" [illegible] مجھے ایسے جواب دیا جیسے میں نے اس سے وقت پوچھا [illegible] اور اس نے بے تاثر لہجے میں مجھے بتایا ہو کہ کیا بجا ہے۔

"اماں۔ جہانی آپا۔ اور شنو آپا کہاں ہیں؟" میرا [illegible] ہوا اٹھ کر اماں کے کمرے کی طرف لپکا۔ مجھے یقین [illegible] آرہا تھا کہ سب خیریت ہے۔ اماں جائے نماز پر بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ مجھے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر [illegible] پڑیں اور پھر لپک کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

"وقار۔ وقار الحسن! تم آگئے، میرے بچے۔ [illegible] لعل۔" اماں مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے وہ بے حد کمزور [illegible] بیمار محسوس ہوئیں۔

"اماں! اماں سب خیریت تو ہے نا!" میں نے بے [illegible] سے چاروں طرف دیکھا، جہانی آپا اور شنو آپا کہیں [illegible] تھیں۔ "آپ کو کیا ہو گیا اماں! آپ تو بہت کمزور [illegible] ہیں۔" میں نے انھیں کندھوں سے پکڑ کر سر سے پاؤں [illegible] دیکھا۔ وہ بہتے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو سے [illegible] کر رہی تھیں۔ ان کا رنگ سفید اور آنکھیں ویران سی تھیں۔

"نہیں۔ ہاں۔ ہاں بیٹا، اللہ کا کرم ہے۔ یہ [illegible] کرم ہے بیٹا کہ تو خیریت سے واپس آگیا۔" یہ [illegible] اماں پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔

"اماں۔ خدا کے واسطے مجھے بتایئے کہ سب [illegible] ناں! کچھ چھپایئے نہیں اماں۔ میں نے اتنے [illegible] سے جدائی اس لیے تو نہیں سہی ہے کہ آپ یوں بیمار ہو جائیں۔ آپ تو بہت بیمار دکھائی دے رہی [illegible]"

"نہیں بیٹا بس، بڑھاپا ایک دم ہی چھا گیا [illegible] ہمت تھی، سب ختم ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ [illegible] بچیوں کی طرف سے بھی بہت فکر ہے۔ خدا [illegible] آسان کرے۔ تم تو ٹھیک تھے ناں! کیا ہوا [illegible] ہوئے ناں! کیا کہا سنہرے بابا نے۔ ہمارے [illegible]

[illegible] یا نہیں۔!"

[illegible] نے ایک دم ہی اتنے سارے سوال کر دیئے کہ میں [illegible] مگر مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ بات [illegible] میں کہ [illegible] ہوں۔ اماں کے چہرے پر بہت زیادہ پریشانی چھائی ہوئی [illegible] میرا دل کہہ رہا تھا کہ گھر میں خیریت نہیں ہے۔ کچھ یقیناً کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے تایا اور اماں [illegible] لوگوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

[illegible] ٹھیک ہو جائے گا اماں! میں اب وہ طاقت حاصل [illegible] ہوں کہ سادھو جیسے شعبدے بازوں کو سبق دے [illegible]" کہنے کو تو میں نے ایسا کہہ دیا تھا مگر اندر سے خود کو کھوکھلا محسوس کر رہا تھا۔ بات تو جب تھی جب میں [illegible] اور مجسمے کو بھی محفوظ کر چکا ہوتا۔ تب میرا سینہ پھلا [illegible] کہنا بجا تھا۔ بہرحال فی الوقت انھیں تفصیل سے [illegible] ممکن نہ تھا۔ ویسے بھی مجھے بے چینی تھی کہ گھر کی [illegible] بوجھل پن کا سبب معلوم کر سکوں اس لیے بولا۔

"اماں آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ شنو آپا [illegible] جہانی آپا تو خیریت سے ہیں ناں اور چچا چچی۔ تائی۔ اور [illegible] سب ٹھیک ہیں ناں! کوئی بات تو نہیں ہوئی؟"

"[illegible] دم لے لو بیٹا! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آؤ باہر چلتے [illegible] میں کھانا لگوا دوں یا چائے پیو گے؟"

"کھانا کھاؤں گا اماں! اتنے روز سے بھوکا ہوں، صرف [illegible] ہی تھوڑی سی سبزیوں پر گزارا کیا ہے اتنے روز۔"

"اچھا!" اماں نے حیرت سے مجھے سر سے پاؤں تک [illegible]

ان کی حیرت کی وجہ جانتا تھا۔ میری صحت پر ذرہ برابر [illegible] نہیں پڑا تھا بلکہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ [illegible] پہلے سے زیادہ صحت مند، چاق و چوبند اور طاقت [illegible] محسوس کر رہا تھا۔

"[illegible] پھر کھانا کھا لیں۔ باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔" [illegible] کہتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ میری بے چین [illegible] بہنوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ باہر آتے ہی میری [illegible] آپا اور جہانی آپا پر پڑی، وہ دونوں ہی تیز تیز [illegible] رہی تھیں۔ دونوں مجھ سے لپٹ کر رو دیں۔ میں [illegible] تسلی دی۔ میرا خیال تھا کہ اتنے روز کی جدائی [illegible] محبت ان کے دلوں میں بڑھا دی ہوگی، جانے [illegible] کیسے کیسے وسوسوں میں گھری رہی ہوں گی اس لیے مجھے یوں صحیح سلامت پا کر رو رہی ہیں مگر ان کا رونا، یوں بلک بلک کر رونا ثابت کر رہا تھا کہ بات کوئی اور ہے۔ تایا اور اماں کے بعد ان دونوں کا رویہ بھی ان کے بوجھل پن کے کسی انجانے سبب کو ثابت کر رہا تھا۔ میں تایا اور اماں سے پوچھ چکا تھا کہ کیا ہوا ہے، دونوں ہی نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب ان دونوں سے پوچھنا بیکار تھا۔ میں نے خود ہی سبب جاننے کا ارادہ کیا۔ ان دونوں کی خیریت کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اماں سے جلد آنے کا کہہ کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

تایا اور شرف الدین برآمدے میں کسی بت کی طرح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ تائی شاید اپنے کمرے میں تھیں اور کوثر تو یقیناً کسی کتاب کے مطالعے میں غرق ہوگی۔ شاید اس تک ابھی میرے آنے کی خبر نہیں پہنچی تھی ورنہ تو وہ بھی دوڑی دوڑی باہر آتی۔ اب تو وہ اس قابل تھی کہ دوڑ سکے۔ اماں جہانی آپا سے کھانا نکالنے کا کہہ رہی تھیں، میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ سامنے ہی چچا کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے پھر لپک کر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"چچا کیسے ہیں آپ۔ اور چچی۔ کہاں ہیں وہ؟" میں نے ان کے سینے سے لگے لگے پوچھا۔

"اپنے بھانجے بھانجیوں کے پاس گئی ہیں دلی۔ تم تو ٹھیک ہو ناں! تمھاری طرف سے سبھی پریشان تھے۔" انھوں نے آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیجیے۔ اچھا بھلا ہوں۔" میں نے دو قدم پیچھے ہو کر کہا۔

"ہاں۔ تم تو اچھے بھلے ہو۔ لیکن۔" وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئے۔

"لیکن کیا؟" میں آگے بڑھا لیکن اسی لمحے اماں نے آواز دے لی۔ وہ چچا کو بھی کھانے پر بلا رہی تھیں۔

"چلو۔" چچا نے بات ٹال دی۔

"چچا! مجھے بتایئے تو کہ کیا ہو گیا ہے۔ ورنہ۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں شدید جذباتی دباؤ کا شکار ہو گیا۔

"تمھاری اماں نیچے انتظار کر رہی ہیں۔ دیر سویر تمھیں سب پتا چل جائے گا۔ ویسے تو سب خیریت ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔" انھوں نے گول مول بات کی۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ برآمدے میں

ایک پراسرار وجود کی تہلکہ خیز سرگزشت

ایک بے مثال خود نوشت

طار نوش

"ہمزاد" جیسی بے شمار سلسلے وار کہانیوں کے خالق

شمیم نوید کے ساحرانہ اور قلم سے

کھانا لگ چکا تھا۔ تایا' اماں' شرف الدین دستر خوان پر موجود تھے مگر یوں جیسے کسی نے پتھر کے بت بٹھا دیے ہوں۔ میں اور چچا ہاتھ دھو کر بیٹھ گئے۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ تائی نہیں ہیں۔ کوثر' جہانی آپا اور شنو آپا تو ویسے بھی شرف الدین کی موجودگی میں ساتھ کھانا نہیں کھاتی تھیں مگر تائی کو تو دستر خوان پر ہونا چاہیے تھا۔

"اماں! تائی۔ تائی کہاں ہیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ گو میرے اس سوال سے پہلے بھی پورے گھر میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی مگر مجھے یوں لگا جیسے یہ سناٹا ایک دم بہت ہی گہرا ہو گیا ہو۔ جیسے سوال سن کر ان سب نے سانس تک روک لیے ہوں۔

میں نے باری باری سب کی طرف دیکھا جو پھیلی ہوئی ویران آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے اندر طوفان سے اٹھنے لگے۔

"تائی کہاں ہیں؟" میں نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا جیسے اندر اٹھتے طوفان میرے ہونٹوں تک آ گئے ہوں۔

"اپنے۔ اپنے کمرے میں ہیں وقار۔" جواب دینے والے تایا تھے اور جواب دیتے دیتے یوں بلک پڑے تھے جیسے کوئی بچہ غم سنبھال نہ سکا ہو اور دھاڑیں مار کر رو پڑا ہو۔

"تایا!" میں گھبرا کر' چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہو گیا تایا۔ آپ سب بولتے کیوں نہیں۔ بتاتے کیوں نہیں کہ کیا ہوا ہے۔؟" میں بری طرح چیخ پڑا تھا۔

اسی وقت مجھے اپنی پشت پر سے ہنسی کی آواز آئی۔ دہشت بھری ہنسی۔ ایک ایسی ہنسی جس میں غموں اور دکھوں کے گہرے احساس کے ساتھ ہی ایک عجیب سا کھوکھلا پن تھا کہ وہ ہنسی ہونے کے باوجود بھی ہنسی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرے سامنے بیٹھے تمام لوگوں کی خوفزدہ نگاہیں میری پشت کی طرف اٹھ گئیں اور میں ایک جھٹکے سے مڑا۔

نکالے ہمیں دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ وہ قطعی اپنے حواسوں میں نہیں تھیں۔ میں انھیں اس حال میں دیکھ کر لپک کر ان کی طرف بڑھا۔

"تائی۔ تائی۔"

وہ مجھے قریب آتا دیکھ کر ہنستی ہوئی دور بھاگ گئیں اور بولیں۔ "پکڑ لو مجھے۔ کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا۔ کوثر کو دلہن بنا دیا ہے میں نے۔ پالکی منگا لو۔ اے۔ شور نہ کرو۔ وہ اٹھ گئی تو۔ ناراض ہو جائے گی۔ بھاگ جائے گی بہت دور۔"

جونہی میری نگاہ سامنے کھڑی ہستی پر پڑی میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ تائی تھیں۔ ہاں۔ یقیناً وہ تائی تھیں مگر اس وقت وہ جس حالت میں کھڑی تھیں اسے دیکھ کر میرے تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کے بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ بدن پر میل کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں جمی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں بھری دہشت دیکھنے والے کے جسم میں سناٹے سے بھر رہی تھی۔ ان کے کپڑے بے حد میلے تھے مگر وہ سرخ گوٹا لگا دوپٹا سر پر ڈالے' دانتوں میں انگلی دبائے' چھوٹا سا گھونگٹ

میں حیرت اور دکھ سے بت بن چکا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اچانک میں نے سسکیوں کی آواز سنی۔ یہ سسکیاں جہانی آپا' شنو آپا اور اماں کی تھیں۔ اماں میرے پیچھے دستر خوان پر بیٹھی رو رہی تھیں جبکہ جہانی آپا اور شنو آپا اماں کے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی تھیں۔

"یہ۔ یہ کیا ہے۔ کیا ہوا انھیں۔" میں پھٹی پھٹی آواز میں چیخ اٹھا تھا۔ میری نگاہیں اب بھی تائی پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی وقت پیچھے سے کسی نے میرے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ میں پلٹا۔ وہ شرف الدین تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"وقار الحسن! تائی پاگل ہو گئی ہیں۔"

اس نے سرگوشی کی تھی مگر مجھے یوں لگا جیسے اس ایک جملے نے میرے وجود میں چھپے کسی ایٹم بم کو چھو لیا ہو۔ ایک طوفان سا تھا' ایک بے پناہ شور جس نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں بت کی طرح ساکت کھڑا اپنے اندر اٹھتے طوفانوں کا شور سن رہا تھا۔ "پاگل۔ ہو گئیں۔ مگر۔ کیوں۔ کیسے؟" یہ جملہ

میرے منہ سے نکلا تھا مگر یوں لگا تھا جیسے گھر کے سارے درودیوار گونج رہے ہوں۔ جیسے یہ سوال میں نہیں گھر کے درودیوار نے پوچھا ہو۔

"تم۔ آؤ پہلے کھانا کھالو۔"

شرف الدین شاید مجھے اس طوفان سے نکالنا چاہتا تھا۔ بے وقوف تھا وہ۔ یہ واقعہ میرے لیے کسی المیے، کسی سانحے سے کم نہ تھا۔ میرا دل پھٹا جارہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ کھانا کھالو۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پلٹ کر اماں کے قریب پہنچ گیا۔ ان کے چہرے پر بلا کی وحشت اور دردو غم کی سی کیفیت طاری تھی اور تایا تو بالکل سفید ہو چکے تھے۔ "اماں۔ تائی کو کیا ہو گیا۔ کیسے ہوا یہ سب کچھ۔ خدا کے واسطے مجھے بتایئے۔ اور۔ اور کوثر۔ وہ کیسی ہے؟ اس کی حالت تو بہت خراب ہوگی۔"

دسترخوان پر کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کسی کا ہاتھ بھی کھانے کی طرف نہیں بڑھا تھا، سب بت بنے بیٹھے تھے۔ میں یوں سب کو ساکت دیکھ کر کوثر کے کمرے کی طرف جانے لگا مگر اسی لمحے تایا نے مجھے آواز دی۔

"وقارالحسن! کوثر۔ یہاں نہیں ہے۔" ان کے لہجے میں، ان کی آواز میں ہزاروں کانچ کے ٹکڑوں کی سی چبھن تھی۔

"کک۔ کیا مطلب؟" میں ٹھٹک گیا۔ "کہاں ہے وہ۔ آپ نے اسے کہیں جانے کیوں دیا۔"

"کاش میں اسے روک سکتا۔"

"تایا!" میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ انھوں نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی اس سے اصل بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ "وہ تو اچھی بھلی تھی۔ تایا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"شاید وہ پاگل ہو گئی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا وقار۔ وہ۔ وہ کوثر بالکل نہیں تھی جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا تھا۔ وہ بدل گئی تھی۔ عجیب سی خونخواری آگئی تھی اس میں، لیکن ہمیں یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ وہ یوں ہم بوڑھوں کو چھوڑ جائے گی جیسے ہمارا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جس معصوم سی، معذور بچی کی آنکھوں میں ہم بچپن سے اپنے لیے بے پناہ محبت اور اپنائیت دیکھتے آئے تھے۔ وہ جس کی ہر سانس ہمارے لیے زندگی کی نوید تھی۔ جس کا اچانک کسی معجزے کی طرح صحت یاب ہو جانا ہمیں پھر سے جوان کر گیا تھا وہ۔ وہ ہمیں بے موت مار گئی وقار۔ وہ یہ خط تمھارے لیے چھوڑ گئی ہے۔" اتنا کہہ کر تایا نے اپنے سرہانے رکھا ہوا ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

کوثر کے بارے میں یہ سن کر میں شدید صدمے سے دوچار تھا اور سوچ رہا تھا کہ تائی ٹھیک ہی تو پاگل ہو گئیں۔ جس معذور بچی کو انھوں نے اتنے برسوں سینے سے لگائے رکھا وہ صحت یاب ہونے کے بعد اچانک مر جائے تو انھیں پاگل پن کا ہی دورہ پڑنا چاہیے تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کوثر کا خط کھولا۔ میں یہ سوچ سوچ کر بھی حیران ہو رہا تھا کہ اس نے مرنے سے پہلے مجھے خط کیسے اور کیوں لکھا۔ کیا وہ اپنی موت کے بارے میں جانتی تھی یا اس نے خودکشی کر لی پھر جوں جوں میں اس کا خط پڑھتا گیا میرا صدمہ شدید غصے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اس کے اس خط سے جو انکشاف مجھ پر ہوا تھا وہ حیران کن ہونے کے ساتھ ہی گہرے دکھ کا باعث بھی تھا۔ جسے میں مردہ سمجھ رہا تھا وہ زندہ تھی۔ اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے اپنا گھر اور اپنے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو کر بھاگ گئی ہوتی تو شاید میں اسے معاف کر دیتا مگر یہ جان کر میرا روم روم غصے اور دکھ سے سلگنے لگا تھا کہ وہ اپنی گھناؤنی خواہشوں کی تکمیل کی خاطر گھر چھوڑ گئی۔ وہ ان پراسرار علوم پر مکمل دسترس حاصل کرنے کی خواہش اور پوری دنیا کو اپنے قابو میں کرنے کی شدید خواہش کی تکمیل کرنا چاہتی تھی۔ گویا وہ سادھو کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش مند تھی۔ پراسرار علوم کی دلدل میں وہ اس حد تک اتر چکی تھی، یہ جان کر میں حیران تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے اپنے ان بوڑھے والدین کا خیال بھی نہ آیا جو زندگی بھر اس کے غم میں گھلتے رہے تھے اور اب اسے صحت مند پا کر اس سے ہزاروں امیدیں وابستہ کر بیٹھے تھے۔ اتنے برسوں میں پہلی بار ہی تو انھوں نے اولاد کی خوشیاں دیکھی تھیں ورنہ اب سے پہلے تو وہ گوشت کا وہ بے جان ٹکڑا تھی جس کے چہرے پر آنکھیں تو تھیں مگر ان میں روشنی نہ تھی۔ اس کا بدن تو تھا مگر اس میں جان نہ تھی۔ تائی نے اس سے وابستہ جانے کتنے خواب چند ہی دنوں میں آنکھوں میں بسا لیے تھے۔ کتنے خوش تھے وہ اور تایا مگر کوثر نے ان کی اپنی اولاد ہو کر بھی ان سے دشمنوں سا سلوک کیا تھا۔ اس نے خاندانی عزت، وقار کی بھی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ کون تھا جو یہ یقین کرتا کہ وہ اپنی دیوانی خواہشات کی بنا پر گھر چھوڑ گئی۔ ہر شخص سوچ رہا ہو گا کہ آوارہ تھی، معذور رہ کر اپنی آوارگی سے فائدہ نہیں اٹھا سکی تھی مگر ٹانگیں ملتے ہی اس نے اپنے پر نکال لیے۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے بوڑھے والدین اور اس کے متعلقین لوگوں کی باتوں کو کیسے سنیں گے؟ کیسے لوگوں کے طعنے سہیں گے۔

کوثر کا یہ روپ میرے اندر بے پناہ نفرت پھیلا گیا۔ اس نے خط میں لکھا تھا۔ وقار، میں جانتی ہوں کہ میرے گھر سے چلے جانے کو لوگ کیا رنگ دیں گے مگر تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں دنیا کی تمام طاقتوں کو مسخر کر لوں گی۔ یہ میری خوش قسمتی اور تم لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ خدا نے مجھے صحت دی ورنہ میں تو اس بند کمرے میں بھی تمام قوتیں حاصل کر لیتی۔ ایک بات یاد رکھنا وقار کہ میں اپنی منزل ضرور حاصل کروں گی، شاید مجھے تمھاری وجہ سے ایک بار گھر آنا پڑے۔ میں جہاں جارہی ہوں وہاں تم جیسے کمزوروں کے قدم نہیں پڑ سکتے پھر بھی اگر تم سادھو سے ٹکر لینے کے لیے میری مدد چاہو تو میں حاضر ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں میرے بتائے ہوئے طریقوں پر چلانا ہو گا۔ سادھو تمھارا دشمن صحیح مگر ایک بات سچ کہتا ہے کہ ہمارا مذہب دنیا کی لذتوں سے محروم کر دینے والا مذہب ہے جبکہ ان کی عطا کی ہوئی شکتیاں انسان کو لذت کے لامحدود اور لامتناہی سمندر میں غرق کر دیتی ہیں۔ تم ان مذاہب کے چکر میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے۔ تم ایک نوجوان اور بھرپور مرد ہو۔ تمھاری عمر چلّے کاٹنے والی نہیں ہے۔ تمہیں گناہ اور ثواب کے چکر سے نکل کر دنیا کی طاقتیں حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا چاہیے۔ تم میں ان شکتیاں پانے کی طاقت ہے۔ میں سادھو سے ملی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ تمھارا مخالف ہے، حریف ہے، میں اس سے بے پناہ متاثر ہوئی ہوں۔ اس کی پیشانی قوتوں کا نشان ہے۔ اس کا ٹیڑھا میڑھا بدن، خوفناک آنکھیں اور لکڑے جیسے ہاتھ اپنے اندر بے پناہ قوتیں، طاقتیں اور شکتیاں سمیٹے ہیں۔ اس کا تمھارا کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ تو تم سے صرف اس لیے الجھا تھا کہ مجسمہ اور کڑا حاصل کر سکے۔ یہ چیزیں تمھارے لیے بیکار تھیں۔ تم ایک بے وقعت زندگی کے چکر میں اپنی زندگی گنوا رہے ہو۔ شکنتلا تمھاری کوئی بھی نہیں ہے، اسے سکھ دینا یا نہ دینا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمھارا مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ تمھاری حویلی خالی کر دے، تاکہ تم اپنی ماں کی خواہش کے مطابق اسی جدی پشتی حویلی میں اپنی زندگی گزار سکو۔ سو وہ خالی ہو گئی۔ تم چاہو تو اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر وہاں جا سکتے ہو۔ اب تمہیں چاند کا قیدی بن کر نہیں رہنا ہو گا۔ اب اس چاند کی قیدی وہ حسین عورتیں ہوں گی جو سادھو کی پیاس بجھائیں گی۔ ممکن ہے اس معاملے کو تم کوئی گھناؤنا عمل سمجھتے ہوں مگر ذرا سی عقل سے سوچ لو تو معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اس دنیا میں صرف سادھو ہی نہیں ہر شخص لذتوں کا متمنی ہے۔ اگر وہ یہ لذتیں جائز یا ناجائز طریقے سے حاصل کر رہا ہے تو یہ بھی تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ اب تم یقیناً ہر پریشانی سے آزاد ہو گے، امروہہ جا کر اپنی زندگی اسی طرح گزارو جیسے تمھارے باپ دادے نے گزاری تھی مگر صرف ایک بات یاد رکھنا کہ میں اپنی منزل پائے بغیر چین سے نہیں رہوں گی اور تم جانتے ہو کہ میری منزل کیا ہے؟ میں اس بارے میں تم سے پہلے بات کر چکی ہوں۔ امید ہے اس سے زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لہٰذا تم یہ کبھی نہ بھولنا کہ اس دنیا میں کوثر نام کی ایک ایسی لڑکی بھی ہے جو تم سے میلوں دور رہ کر بھی تمام حالات سے واقف ہو گی۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم اتنے عرصے بعد اپنی پرسکون زندگی میں کسی تلاطم کو آواز نہیں دو گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم اب سادھو کا پیچھا چھوڑ کر اپنی بہنوں کو بیاہنے کے بارے میں سوچو تاکہ جب تمھاری زندگی شروع ہو تو کوئی الجھن تمہیں پریشان نہ کر سکے۔ یہی ہم دونوں کی بہترین زندگی ہو گی۔ اماں اور ابا کو تسلی دے دینا کہ ان کی بیٹی لوٹ آئے گی، اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دے گی اور لوٹ آنے کے بعد وہ سب کے درمیان زندگی گزارے گی۔ صرف اتنا بتا دینا کہ اس کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ اپنی بیٹی سے ضرور پوچھ لیں۔ ماں باپ کے سامنے زبان سے کہنے کی جرات تو شاید میں نہیں کر پاتی اس لیے یہاں لکھ رہی ہوں کہ تم میری پہلی اور آخری خواہش ہو۔ وہ آنے والے لمحوں کے فریم میں مجھے تمھارے ساتھ دیکھا کریں۔ میں کچھ عرصے کے لیے جارہی ہوں کہ یہاں رہ کر وہ شکتی حاصل کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ اجازت کس سے لیتی کہ مجھے کوئی بھی اجازت نہ دیتا۔ اس لیے بغیر اجازت

جارہی ہوں۔ اسے میری نافرمانی سمجھا جائے گا وقارالحسن! لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نہ نافرمان ہوں' نہ ماں باپ کے دکھ سے ناواقف مگر جس راستے پر میری تنہائی' احساس کمتری اور ذہنی اذیت مجھے لے گئی تھی' وہاں سے منزل پائے بغیر لوٹ آنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میری پائی ہوئی شکتیاں ہمیشہ تمھاری حفاظت کریں گی۔ کڑے وقت میں تم مجھے خود سے قریب تر پاؤ گے۔ میں تمھاری راہ میں آنے والے ہر طوفان سے ٹکرا جاؤں گی اس لیے شگفتہ کو طوفان بنانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتی۔ میرا انتظار کرنا۔ ہمیشہ سے ہمیشہ تک تمھاری کوثر۔۔۔"

یہ تحریر ایک ایسی تلوار بن کر میرے وجود میں اتری کہ میں نے خود کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا محسوس کیا۔ اس کا یوں گھر چھوڑ کر جانا ہی تایا اور تائی کے لیے قیامت سے کم نہ تھا کہ اس کی یہ بے باک تحریر بھی انھیں زمین میں گاڑ گئی۔ ہمارے خاندان میں لڑکیاں ایسے معاملات پر نگاہ بھی نہیں اٹھا پاتی تھیں جن پر کوثر نے بڑی بیباکی سے گفتگو کی تھی۔ اس نے مجھے گویا دھمکی دی تھی کہ میں شگفتہ کا خیال ذہن سے نکال دوں ورنہ وہ اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ میں تو پہلی پھوار کی سی محبتوں کا متمنی تھا مگر کوثر کی محبت تو ایک طوفان بلاخیز بن چکی تھی۔ اگر اس کی محبت کا یہ انداز نہ ہوتا تو شاید میں خود کو شگفتہ کے تصور سے نکال لیتا مگر اب نہ اس کی محبت کا یہ انداز' اس کی یہ حرکت میرے دل میں بھالے کی طرح اتر چکی تھی۔ مجھے اس لمحے اس سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔ وہ جو اپنے بوڑھے ماں باپ کو دکھوں اور غموں کی گہری خندقوں میں اتار گئی تھی بھلا محبت جیسے الوہی جذبے کی امین کیسے ہو سکتی تھی۔

فضا میں گہرا سکوت طاری تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا کاغذ ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا اور دور اوپر جاتی سیڑھیوں کے پاس بیٹھی تائی پتا نہیں فرش کرید کرید کر کیا تلاش کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی تھی۔ تایا کی بھیگی اور لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر دکھوں کی تہ کے نیچے گہری شرمندگی جھلک رہی تھی۔ اماں اور شرف الدین سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں۔ کس سے نیا لوں۔ تایا کو کس طرح شرمندگی سے نکالوں اور تسلی کے لیے کون سے الفاظ ادا کروں۔ جانے شرف الدین خط کی اس تحریر سے واقف تھا یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تایا نے اسے خط دکھایا ہوگا اور نہ ہی اس کا پورا متن بتایا ہوگا ورنہ کوثر سے متعلق باتیں جانے اس پر کیا اثر کرتیں۔

کوثر نے انتہا کر دی تھی۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ بند کمرے میں پڑے پڑے مطالعہ کرنے کا نتیجہ اتنا خوفناک بھی نکل سکتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ تایا اس کے اصرار پر سے کتابیں منگوایا کرتے تھے اور کبھی خود اسے کتابیں خرید کر دیا کرتے تھے۔ ان کی یہ محبت' یہ چاہت انھیں زندہ درگور کر گئی تھی۔ انھیں بھی کب علم ہوگا کہ وہ اپنی معذور بچی کی جس بے ضرر سی خواہش کو پورا کر رہے ہیں وہی ان کے اور ان کی بیوی کے لیے سوہان روح بن جائے گی۔ نہیں یہ بات انھیں اندر سے کیسی کیسی اذیتیں دیتی ہوگی کہ انھوں نے خود اسے پراسرار علوم کی کتابیں لا لا کر دی تھیں۔

کوثر نے خط میں میرے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے پڑھ کر میں اس وقت خود کو سب کے سامنے مجرم سمجھ رہا تھا حالانکہ میں نہ ان چکروں میں تھا' نہ ہی میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی مگر جانے یہ سب پڑھ کر تایا نے اور اماں نے کیا تاثر لیا ہو۔ تائی تو خیر ہوش و حواس ہی کھو چکی تھیں۔ میں گم صم بیٹھا تھا کہ تایا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"وقار میاں! اس نے ہمیں بڑا دکھ دیا ہے مگر سانس کی یہ ڈوری تو تبھی ٹوٹے گی ناں جب ہماری قسمت میں ہوگا۔ چلو۔ ہم سمجھیں گے کہ ہم نے جس معذور بیٹی کو جنم دیا تھا وہ۔ وہ مرگئی۔ ہم تو سوگ منا چکے ہیں میاں' تم بھی رو لو۔ بس اب یہ پگلی ہماری جان کو آئی رہے گی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہوش کھو بیٹھی ورنہ اس کا غم سنبھالنا بڑا عذاب ہو جاتا۔ اب اپنے خیالوں کی دنیا میں مست تو رہے گی ناں۔"

تایا کے جملے کیا تھے دو دھاری تلوار تھے' ان کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ اور آنکھوں میں جو گہرا اندھیرا تھا اس نے سب کچھ دھندلا کر رکھ دیا۔ میں جانتا تھا کہ کوثر جس راستے پر چل نکلی ہے وہاں سے لوٹ کر آنا ناممکن ہے پھر بھی کہہ اٹھا۔ "تایا۔ وہ۔ وہ بہت بے وقوف ہے آجائے گی۔۔۔ آپ خود کو سنبھالے رہیں تایا۔ میں لاؤں گا اسے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ۔ وہ ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ سادھو ہی اسے ورغلا کر لے گیا ہے۔ میں نے سنہرے بابا کے حکم کے مطابق گھر سے لوبان ہٹانے کی کوشش کی تھی تو وہ بکھر گئی تھی۔ اس نے اپنے کمرے سے کوئی بھی چیز ہٹانے کو منع کر دیا تھا۔ وقارالحسن! اس وقت اس کا لب و لہجہ بلا کی اجنبیت لیے ہوئے تھا۔ بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ۔ یہ میری وہی بچی ہے جسے دیکھ دیکھ کر میں جیتا رہا ہوں۔"

"آپ تردد نہ کریں تایا۔ تائی کا علاج ممکن ہے۔ آپ انھیں اسپتال لے جائیں۔ کوثر کے معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں وقارالحسن! جو بدنامی ہم اٹھا چکے ہیں اسے دوبارہ اٹھانے کی طاقت نہیں ہے ہم میں۔ کوثر ہمارے لیے مر چکی ہے۔ اب اسے اس گھر کی دہلیز سے اندر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم اسے رو چکے ہیں۔ اس کی اس حرکت نے جو گھاؤ ہماری روح پر لگائے ہیں ان کی اذیت ہم نے بڑی مشکل سے سہی ہے۔ تم بھی اسے بھول جاؤ۔ یہ سب کچھ ہماری قسمت میں تھا اور قسمت کو بدلنا انسان کے بس میں نہیں۔ تمھاری تائی تو شادمانی کے بھائی سے اس کی نسبت بھی طے کر چکی تھیں' اگر وہ تمہیں۔ تم سے۔ چھوڑو بیٹا۔ چھوڑ دو اس معاملے کو۔" وہ یوں گھبرا کر چپ ہو گئے جیسے سینے میں ان کا دم گھٹنے لگا ہو۔

کھانا ابھی تک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کسی نے بھی کھانے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ میں نے سب سے کہا کہ وہ کھانا کھائیں۔ میں خود بھی کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کی اذیت تو کم ہونے سے رہی پھر سب کا بھوکا رہنا کون سا اس اذیت سے نجات دلا دیتا۔ گو میری بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے باقی لوگ بھی بھوکے رہ جائیں۔ میرا ذہن کوثر کی ذات میں الجھا ہوا تھا مگر میں خود کو اس طرح مصروف کیے ہوئے تھا جیسے میری ساری توجہ کھانے پر ہو۔ مجھے خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ دیکھ کر دوسرے لوگ بھی کھانے میں مصروف ہو گئے' سب کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ سب ہی نہایت بے دلی سے کھانا کھا رہے ہیں۔ شرف الدین پر گہری چپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار اسے دیکھا' میں اسے بہت سی باتوں کے بارے میں بتانا اور اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ مجھے شگفتہ کے بارے میں بھی

تشویش تھی۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ شرف الدین اتنے روز کہاں رہا' کیا کرتا رہا' مگر اس وقت موقع تھا نہ وقت۔

گھر کی فضا میں بے پناہ بوجھل پن تھا جو ذہن پر گہرا اثر ڈال رہا تھا۔ اب مجھے آگے بڑھنے کے لیے راہ متعین کرنا تھی۔ ہر اونچ نیچ کے بارے میں سوچنا تھا۔ حالات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا تھا۔ اب سب باتوں کے لیے جس یک سوئی کی ضرورت تھی وہ حالات کی وجہ سے خاصی ناممکن نظر آرہی تھی۔ میں شگفتہ کے بارے میں بھی تشویش میں مبتلا تھا گو سنہرے بابا صاف الفاظ میں کہہ چکے تھے کہ اب وہ سادھو کی دسترس میں پہنچ چکی ہوگی' مگر میں پھر بھی امروہہ جا کر دیکھنا چاہتا تھا' اور متمنی تھا کہ کاش وہ سادھو کی دسترس سے بچ گئی ہو۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ اس پر دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو تباہیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلے گا۔ کوثر نے اس معاملے کو جس طرح لکھا تھا اس سے تایا کے اس شبے کو تقویت ملتی تھی کہ اسے ورغلانے والا سادھو ہی ہو سکتا ہے اور میں یہ بھی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی بھی حال میں سادھو کے ہتھے چڑھے۔ اب میرا کام بڑھ گیا تھا۔ ایک طرف تو میں شگفتہ کو سادھو کے شکنجے سے رہائی دلانا چاہتا تھا دوسری طرف کوثر کو واپس لانا بھی میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے میں نے اپنے وجود میں بلا کی تھکن محسوس کی حالانکہ اب سے پہلے میں خود کو بڑا مطمئن' بڑا چاق و چوبند اور طاقتور محسوس کر رہا تھا۔ میں انھی سوچوں میں الجھا آہستہ آہستہ نوالے چبا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم سب کھانے سے فارغ ہو گئے۔ جہاں آپا سے چائے کا کہہ کر میں تایا کے پلنگ کے پاس پڑے مونڈھوں پر بیٹھ گیا۔ شرف الدین بھی وہیں بیٹھ گیا۔ تایا کو میں نے سہارا دے کر تکیے سیدھے کر کے پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ انھیں چھونے پر مجھے جھرجھری سی آگئی تھی۔ ان کے بازو کی وہ مچھلیاں جو پہلے سخت محسوس ہوتی تھیں اب روئی کے گالے کی طرح نرم ہو چکی تھیں۔ بازو پر کھال اور پلپلے گوشت کے سوا ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ چوڑے چکلے شانے سکڑ کر رہ گئے تھے۔ دسترخوان سے اٹھ کر پلنگ تک آنے میں ہی ان کی سانس پھول گئی تھی۔ میں کچھ دیر انھیں تاسف سے دیکھتا رہا۔ اماں پلیٹ میں کھانا لے کر تائی کے پاس جا بیٹھی تھیں جو اب بھی سیڑھیوں پر بیٹھی' دیوار کی

طرب ۔۔ کیے کسی ان دیکھی ہستی سے بڑے انہماک سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی آواز دھیمی تھی اس نے سنائی نہیں دے رہی تھی مگر ان کی حرکات میرے دل کو جیسے مٹھی میں لیے ہوئے تھیں۔ ہمارے درمیان کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر گفتگو کی ابتدا تایا نے کی ورنہ ان کی حالت دیکھ کر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں کسی موضوع کو شروع کرتا یا اب یہ سب کچھ جاننے کے بعد حالات کے بارے میں استفسار کرتا۔

"تم بتاؤ وقارالحسن! کیا حالات رہے؟ تمھارے وضائف پورے ہوگئے یا نہیں؟"

میں نے شروع سے لے کر آخر تک کی تمام داستان سنا ڈالی' میں اب ان سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ جان کر کہ سادھو وہ کڑا اور مجسمہ حاصل کر چکا ہے' تایا کچھ پریشان سے ہوگئے تھے کیونکہ میں اب سے پہلے انھیں بتا چکا تھا کہ وہ ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کے بعد کون سے عزائم رکھتا ہے۔ ان کی پریشانی یوں بھی بجا تھی کہ وہ کوثر کے سلسلے میں اس پر اپنے شبے کا اظہار کر چکے تھے۔

"نہیں تایا۔" میں نے ان کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دیکھ کر فوراً کہا۔ "آپ کوثر کے سلسلے میں قطعی پریشان نہ ہوں۔ وہ بچی نہیں ہے تایا۔ اس نے جس راہ پر قدم رکھا ہے' بلا سوچے سمجھے نہیں رکھا ہوگا۔ وہ سادھو سے بھی اچھی طرح واقف تھی اور اب سے بہت پہلے بڑی طاقت حاصل کر چکی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا اس سمت میں آگے بڑھنے کا کیا مقصد تھا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اس کی معذوری اور تنہائی نے اسے اس سمت میں آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔" اتنا کہہ کر میں نے کوثر کے بارے میں وہ سب کچھ بھی تایا کو بتا دیا جو میں اب تک ان سے چھپائے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہ جان کر کہ میں اس بارے میں پہلے سے بہت کچھ جانتا تھا' ناراض بھی ہو سکتے تھے مگر یہ سب کچھ بتانے سے فی الوقت میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے بہت معصوم اور ناسمجھ جان کر مزید اندیشوں میں مبتلا نہیں رہیں۔ میں انھیں باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کرنے کی پوزیشن میں ہے اور سادھو کے لیے تر نوالہ کسی بھی صورت میں ثابت نہیں ہوگی۔ تمام باتیں جان کر ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ وہ بے پناہ مضطرب ہوگئے۔

"تم نے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا؟" انھوں نے برہم ہو کر پوچھا۔

"یہ سب کچھ مجھے اس وقت پتا چلا تھا جب وہ سمجھنے اور سمجھانے کی حدود پار کر چکی تھی۔ آپ کو بتا بھی دیتا تو کوئی فائدہ نہ تھا' سوائے اس کے کہ آپ پریشان ہو جاتے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

شرف الدین بھی یہ تمام باتیں جان کر خاصا حیران تھا۔ تایا میری بات سن کر خاموش ہوگئے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے اور میں ان کے چہرے پر اس سوچ کا ردعمل دیکھ رہا۔ کچھ دیر بعد وہ گہری سانس لے کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ "اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں سادھو کو ختم کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ میں اسے من مانی نہیں کرنے دوں گا۔ اسے اس کے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تمھیں ان چکروں سے نکل جانا چاہیے۔ تم اس کے پیچھے پڑ کر اپنی زندگی بھی حرام کر لو گے۔" تایا نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ اب وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

"تایا! سادھو نے اب تک جو کچھ ہمارے ساتھ کیا ہے وہ کم تو نہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے' پھر جو کچھ وہ اب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ ظلم کی انتہا ہوگا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے درگزر کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنا جہاد ہے' اگر میں یہ سب کچھ نہ جانتا ہوتا تب تو ٹھیک تھا مگر ان حالات میں میرا خاموش ہو جانا گویا اس کی اعانت کرنے کے مترادف ہوگا۔"

"تم کیا کر لو گے وقارالحسن! اب تک تم بھلا پریشان رہنے اور نقصان اٹھانے کے سوا کیا کر سکے ہو؟" شرف الدین بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔

"پہلے اور اب میں بہت فرق ہے شرف الدین۔ اب میں اتنی طاقت رکھتا ہوں کہ اسے ظلم کرنے سے روک سکوں۔ میں نے یہ وظائف بے وجہ تو نہیں کیے' میں نے جو نقصانات اٹھائے ہیں ان کا ازالہ کرنا میرا حق ہے۔"

"تم تنہا نہیں ہو وقارالحسن! تمھارے متعلقین کا بھی تم پر حق ہے۔ تمھاری اماں اور بہنیں بالکل یک و تنہا رہ گئی ہیں۔ ان کی صورتوں پر چھائی مردنی تمھیں نظر نہیں آتی کیا؟ ان معصوم بچیوں کا کیا قصور ہے کہ تم نے انھیں یوں

...وں کی خندقوں میں اتار دیا ہے۔ میرے خیال میں تو اب ...نہیں ان کے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہیے اور اپنی اماں کی دلجوئی کرنا بھی تمھارا فرض ہے۔ جو ہو چکا ہے ...ے بھول جاؤ۔" تایا خاصے مایوس تھے۔ "پہلے تو ہم میں اتنا دم تھا کہ اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کے غم بھی سہار لیتے تھے مگر اب تو۔۔"

"میں جانتا ہوں تایا۔" میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ ...یا۔ ان کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ...وا کہ اب تایا میں واقعی بالکل دم نہیں رہا۔ "آپ فکر مند ...ہوں تایا! میں اب جو بھی قدم اٹھاؤں گا آپ لوگوں کی ...رضی اور اجازت کے بعد ہی اٹھاؤں گا۔" میں نے انھیں ...لی دی۔ "آپ خود کو سنبھالیں اور سوچیں کہ اب ہمیں ...یا کرنا ہے۔ میں اگر سادھو سے ٹکر لینے کا ارادہ ترک بھی ...کردوں تو مجھے ہر حال میں کوثر کو واپس لانا ہے۔ میں اس کی ...رف سے قطعی غافل نہیں ہو سکتا۔ اس نے بے وقوفی میں ...قدم اٹھایا ہے اس پر اسے چھوڑ دینا قطعی مناسب نہیں ...گا۔ وہ ہماری عزت ہے' اسے یوں تنہا چھوڑ دینا بھی تو ...یک نہیں ہے ناں۔ رہی بہنوں کی بابت فرائض کی بات تو ...ں بھی ان باتوں کو سمجھتا ہوں۔ میں تمام معاملات نمٹا کر ...کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سادھو اگر میری ...رف سے بے پروا ہو گیا ہے تو یہ بات میرے حق میں ضرور ...ی ہے مگر میں ابا سے جو وعدہ کر چکا ہوں۔ شکنتلا سے جو ...دہ کر چکا ہوں کیا مجھے ان سے مکر جانا چاہیے؟"

میری بات سن کر تایا لاجواب ہوگئے۔ میں نہیں جانتا کہ ...کیا سوچ رہے تھے' اتنے بڑے واقعے کے بعد ان کی ...چوں میں کوئی بڑی تبدیلی ناگزیر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں ...یں بالآخر قائل کر لوں گا۔ اماں کا مقصد البتہ پورا ہو چکا ...۔ ان کی زندگی کا خواب ہی یہ تھا کہ وہ اپنی آبائی حویلی میں ...ٹ جائیں۔ حویلی اب خالی ہو چکی ہوگی' میں جانتا تھا لیکن ...اس بات سے بھی ناواقف نہیں تھا کہ پرکاش کی ہڈیاں ...بھی اسی حویلی میں کہیں دفن ہیں۔ اب وہاں یقیناً ...شکنتلا کی سسکیاں سنائی نہیں دیں گی مگر کیا ہم میں سے کوئی ...اس حقیقت کو فراموش کر سکتا ہے کہ وہ حویلی بے ...ہوں کا مدفن ہے۔ کم از کم میں تو اس بات ...ٹلنے کا ...ئی نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں کسی بھی رات پرسکون نیند ...ل سو سکتا تھا۔ اور مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اماں اس

بات کو فراموش کر دیں گی کہ وہاں پرواہ ... کے گناہوں کی ... ردپڑ چکی ہوگی۔ شگفتہ کے ساتھ زندگی کا حسین سفر شروع کرنے کی شدید خواہش کے باوجود میں ان باتوں کو دانستہ فراموش کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بہرحال اس سلسلے میں اماں کا عندیہ جاننا نہایت ضروری تھا۔ لیکن میں آج اس قصے کو چھیڑنے کے حق میں نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان چکروں کی وجہ سے میں اپنی اماں اور بہنوں سے بہت دور ہو چکا ہوں۔ گھر کے معاملات سے میرا تعلق منقطع ہو کر رہ گیا ہے۔ میں چند روز ان سب کے درمیان ایک بھائی اور بیٹا بن کر رہنا چاہتا تھا۔ ہم انھی باتوں میں مصروف تھے کہ جہانی آپا چائے لے آئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جہانی آپا شرف الدین سے پردہ کیے بغیر اس کے سامنے آئی تھیں ورنہ وہ ایسے موقعوں پر شنو آپا کو بھیج دیا کرتی تھیں۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ جب وہ چائے کی پیالیاں سب کی طرف بڑھا رہی تھیں میری نگاہ شرف الدین کے چہرے پر پڑی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی جھلملاہٹ تھی' لگاوٹ تھی' اس نے پل بھر کو جہانی آپا کے چہرے پر نگاہ ڈال کر یوں جھکا لی تھی جیسے وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا ہو۔ چائے کی پیالی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کی انگلیوں کا ہلکا سا ارتعاش مجھ پر بہت سے ان کہے اور ان دیکھے راز منکشف کر گیا۔ معاً مجھے وہ دن یاد آگیا جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا اور شگفتہ کے چہرے پر پھیلی روشنی نے دوسرے ہی پل میری نگاہیں جھکا دی تھیں۔ میری انگلیاں بھی اس سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے یونہی' بالکل اسی طرح کانپ اٹھی تھیں۔

میں نے دوسری نگاہ جہانی آپا پر ڈالی۔ وہ کچھ بوکھلائی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ یوں جیسے انھیں کسی نے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ ممکن ہے یہ سب دیکھ کر آپ سوچ رہے ہوں کہ میرا خون کھول اٹھا ہوگا۔ میں شرف الدین سے نفرت کرنے لگا ہوں گا کہ اس نے میری عزت پر میلی نگاہ ڈالی ہے۔ میرے پیچھے میری بہن کے عشق میں مبتلا ہو کر مجھے زک پہنچانے کی کوشش کی ہے' اس لیے کہ عام طور پر لوگ اپنے معاملے میں بہت زیادہ فراغ دل مگر دوسرے کے معاملے میں تنگ نظر ہوتے ہیں مگر شرف الدین کا تمام کردار میرے سامنے تھا۔ مجھے یہ سب کچھ جان کر قطعی دکھ یا غصہ محسوس نہیں ہوا بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ شرف الدین جیسا

شخص میرا بہنوئی بن جائے۔ ان حالات میں جب کہ لوگ ہم سے گریزاں تھے، بہنوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے کا معاملہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ امروہہ میں تو خیر پے در پے ہونے والے واقعات نے لوگوں کو ہم سے خوفزدہ کر ہی دیا تھا مگر یہاں میں اماں سے سن چکا تھا کہ چچی نے بہت سی باتیں پھیلا کر ہماری عزت کو نقصان پہنچایا تھا۔ مجھے بھی یاد تھا کہ اماں نے کہیں بات طے کرنے کا قصد بھی ظاہر کیا تھا مگر چچی پہلے ہی وہاں ایسی باتیں پہنچا چکی تھیں کہ لوگ پلٹ کر نہ آئے تھے۔

پھر شرف الدین میرا دوست تھا جس نے میری خاطر بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ وہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ بلند کردار کا مالک تھا۔ میں ان کے خاندان سے واقف بھی تھا اور اماں اس کی بہن کو بہو بنانے کا ارادہ بھی کر چکی تھیں، گویا ان کا خاندان صرف میرے ہی لیے نہیں بلکہ اماں اور تایا کے لیے بھی قابل قبول تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے خوشی کا باعث تھا مگر یہاں صرف ایک مسئلہ تھا۔ پہل بہرحال شرف الدین کو کرنا چاہیے تھی ورنہ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار کروں۔ میں جانتا تھا کہ شرف الدین کی سوچ مثبت انداز رکھتی ہے، مجھے یقین بھی تھا کہ وہ قطعی شریفانہ انداز اختیار کرے گا۔ بہرحال مجھے اس طرف سے ذہنی سکون سا محسوس ہوا۔ جہانی آپا کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد شنو آپا کے لیے بھی بند در کھل سکتے تھے۔

میں چائے پینے کے دوران میں یہی کچھ سوچتا رہا۔ شرف الدین اب نارمل ہو چکا تھا۔ وہ بھی کسی گہری سوچ میں تھا اور کبھی کبھی گہری نگاہوں سے مجھے اور تایا کو دیکھنے لگتا تھا۔ میں کچھ وقت اماں کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے ذہن میں بھی ہزاروں سوال کلبلا رہے ہوں گے۔ بہت سی پریشانیاں ہوں گی جن کا مجھ سے تذکرہ کرنا وہ ضروری سمجھتی ہوں گی۔ کوثر کے اس طرح چلے جانے سے شنو آپا اور جہانی آپا کی عزت پر بھی زد پڑی تھی۔ میں ان کی اس پریشانی کو بھی خوب سمجھ رہا تھا۔ جو کسر چچی کی خاموشی نے چھوڑ دی ہوگی وہ کوثر پوری کر گئی تھی۔ مجھے کوثر پر بے پناہ غصہ بھی تھا۔ وہ اس معاملے میں اس قدر آگے بڑھ جائے گی یہ گمان بھی نہ تھا، پھر اس نے میرے سلسلے میں جس بے شرمی کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی مجھے کچوکے دے رہی

تھی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری واپسی سے پہلے اس کے چلے جانے پر یہ خط کوئی بھی پڑھ سکتا ہے اور اس کی بے شرمی سے واقف ہو سکتا ہے۔

چائے ختم ہوتے ہی شرف الدین اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اب چلوں گا۔ تم آرام کرو۔" اس نے جواب دیا۔

"اماں، ابا اور شگفتہ سب خیریت سے ہیں ناں!" میں نے پوچھا۔

"ہاں! الحمدللہ۔"

"کہاں ہیں؟"

"امروہہ میں۔"

"وہ لوگ... مراد آباد نہیں آئے تھے؟"

"نہیں، میں تایا سے ساری بات سن چکا ہوں۔ وہ سب کچھ سادھو کی کارستانی تھی۔ نہ میں یہاں تھا اور نہ وہ لوگ یہاں آئے تھے لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ وہ تمہارے سارے معاملات اور تعلقات سے آگاہ تھا۔"

"ہاں... تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں شرف الدین۔ تم کب آؤ گے؟" میں اس کے ساتھ ہی آگے بڑھا۔ میرے سوال کا جواب دینے سے قبل اس نے تایا سے مصافحہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں اماں اور بہنوں کو کچھ وقت دینا چاہیے وقارالحسن! میں فرقان کے گھر ہوں۔ تم جب بھی فراغت محسوس کرو وہاں چلے آنا۔"

میں نے اس سے جلد ملاقات کا وعدہ کیا اور دروازے سے اسے رخصت کر کے واپس چلا آیا۔ اماں تائی کو کھانا کھلا چکی تھیں اور غالباً اس وقت اپنے کمرے میں تھیں۔ تائی بھی مجھے وہاں نظر نہ آئیں۔ شاید اماں انھیں ان کے کمرے میں لے گئی تھیں۔ میں برآمدے تک آیا۔ تایا اونگھ رہے تھے۔ میری آہٹ پر وہ چونکے تو میں انھیں سو جانے کا کہہ کر خود اماں کے کمرے میں چلا آیا، جہانی آپا اور شنو آپا جو پلنگ پر لیٹ چکی تھیں اٹھ بیٹھیں۔ اماں البتہ لیٹی رہیں۔ اماں واقعی بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ میں ان کے پائنتی بیٹھ گیا۔ اماں نے جہانی آپا سے کہہ کر ان کا پلنگ اپنے برابر میں ڈلوا لیا۔ جہانی آپا اور شنو آپا دوسرے پلنگ پر جا بیٹھیں۔ میں ان کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اماں نے میرے اضطراب کو محسوس کر لیا، میں واقعی اماں سے باتیں کرنے کے لیے مضطرب تھا۔

"وقارالحسن! تم سو جاؤ۔ شام کو باتیں کر لینا۔ میں بھی بہت تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔" اماں نے کمزور آواز میں کہا۔ میں جان گیا کہ وہ بہنوں کے سامنے بات کرنے سے گریز کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے اب تک نیند محسوس تو نہیں کی تھی پھر بھی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ جہانی آپا نے کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔ کمرے میں اندھیرا سا پھیل گیا۔ ٹھنڈک کے احساس نے میری پلکیں بوجھل کر دیں اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بے حد تھکا ہوا ہوں۔ مجھے ایک گہری اور پرسکون نیند کی اشد ضرورت ہے۔ خاموشی، ٹھنڈک اور اندھیرے نے بہت جلد مجھے گہری نیند میں پہنچا دیا۔

شام کو میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میں تولیہ اٹھا کر سیدھا غسل خانے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نہا دھو کر باہر آیا تو کافی فریش تھا۔ طبیعت کا بوجھل پن بھی غائب ہو چکا تھا۔ تایا عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ تائی ان کے قریب ہی کچھ کتابیں لیے بیٹھی تھیں، انھیں بار بار تلے اوپر رکھتیں اور سر جھٹک کر گرا دیتیں پھر ان کی ترتیب بدل کر اوپر تلے رکھنے لگتی تھیں۔ سرخ گوٹے لگا دوپٹا اب بھی ان کے شانوں پر تھا۔ البتہ اس وقت وہ صاف ستھرے کپڑوں میں تھیں۔ بال اسی طرح کھلے ہوئے اور خشک تھے۔ پتا نہیں کتنے روز سے انھوں نے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔ میرا دل انھیں دیکھ کر بھر آیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے نماز عصر ادا کی پھر تائی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکیں پھر سامنے پڑی کتابوں کو جلدی سے دوپٹے سے ڈھانک دیا اور مجھے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

"کیا کر رہی ہیں تائی؟" میں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے پوچھا ورنہ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں رو دوں گا۔

"کچھ نہیں کر رہی... تمہیں کیا ہے...؟ پیچھے ہٹو...." وہ اب پوری کتابوں پر جھک گئی تھیں۔ یوں لگا تھا جیسے انھیں خوف ہو کہ میں وہ کتابیں ان سے چھین لوں گا۔ "ان کتابوں کا آپ کیا کریں گی تائی؟" میں نے بہت پیار سے پوچھا۔

اب وہ کچھ ٹھیک ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اب خوف کی جگہ بے چینی پھیل گئی تھی۔ "ٹھیک سے رکھ رہی ہوں۔" وہ پھر انھیں ترتیب سے رکھنے لگیں پھر اچانک میری طرف مڑ کر رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ "اسے پڑھتی ہے ناں... اندھیرے میں آتی ہے۔ کل کہہ ہی تھی کہ ان کتابوں کو چھپا دینا۔" کوثر کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں عجیب و غریب قسم کی چمک ابھر آئی تھی۔ "وہ بچھو ان کتابوں کو کھا جائیں گے۔ اس لیے میں ان کتابوں کو چھجے پر رکھوں گی۔ کلام پاک کے پاس۔" بچھوؤں کے ذکر پر میں چوکنا ہو گیا۔

"وہ... وہ بچھو کہاں ہیں تائی۔ مجھے بتائیے۔ میں انھیں مار دوں گا۔ انھیں کوثر کے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس کی دوسری چیزوں کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔" میری باتوں سے شاید ان کا اعتماد مجھ پر بحال ہو گیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کتابیں انھوں نے وہیں چھوڑ دی تھیں۔

"آؤ میں دکھاؤں۔ ابھی ابھی تو میں نے انھیں دودھ دیا ہے۔ وہ دودھ پیتے ہیں۔" انھوں نے اس کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں کھڑا ہوا تو تایا کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ ان کی پرتاسف نگاہیں مجھ پر پھر تائی پر جم گئیں۔ میں نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور تائی کے پیچھے چلتا ہوا کوثر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ تائی کے چلنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب اس اندھیرے کی عادی ہو چکی ہیں اور شاید انھیں سب کچھ صاف نظر آ رہا ہے۔ میں ٹھٹک کر دروازے ہی میں رک گیا تھا۔

"یہ دیکھو... یہ سو رہے ہیں۔" ان کی آواز کسی اندھیرے گوشے سے آئی تھی۔

"تائی یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔ آپ نے لیمپ نہیں جلایا۔" میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"نہیں... اس نے کہا تھا کہ لیمپ نہیں جلانا... یہ اندھے ہو جاتے ہیں۔" وہ شاید بچھوؤں کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔ ممکن ہے یہ خیالی بچھو ہوں مگر میں بہرحال تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہوں۔ ایسی صورت میں بچھوؤں کی یہاں موجودگی خطرناک ہو سکتی تھی۔

"کوئی بات نہیں تائی۔ میں انھیں دیکھنے کے بعد لیمپ بجھا دوں گا۔ ویسے بھی انھیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ

کوثر کی کتابیں ضائع کردیں گے تو وہ کیا پڑھے گی' یہ کتابیں تو اسے بہت پسند تھیں ناں تائی' وہ آپ سے ناراض ہو جائے گی۔" میں کسی نہ کسی طرح انھیں بہلا پھسلا کر یہاں روشنی کرانا چاہتا تھا۔

وہ لپک کر میرے پاس چلی آئیں۔ "ہاں۔ وہ تو بہت ناراض ہوگی بھیا۔" وہ تشویش سے بولیں۔

"تو پھر آپ جایئے۔ آپ اس کی کتابوں کو سنبھالیے میں انھیں دیکھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں پلٹا۔ میں باہر سے لالٹین لانا چاہتا تھا۔ تائی نے میری بات فوراً مان لی اور باہر جا کر پھر برآمدے میں جا بیٹھیں۔ باہر تایا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اماں بھی حیرانگی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں باورچی خانے کی طرف بڑھا تاکہ وہاں سے لالٹین لے سکوں۔ اماں میرے پیچھے چلی آئیں۔

"کوثر کے جانے کے بعد سے تمھاری تائی نے پہلی بار کسی کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت دی ہے۔ ہم تو اگر اس کمرے کے پاس سے بھی گزریں تو وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔" اماں نے آہستہ آہستہ بتایا۔ "ان کا خیال ہے کہ ہم اس کی چیزوں پر قبضہ کرلیں گے۔ وہ اکثر بتاتی ہیں کہ وہ رات کو آکر ان سے باتیں کرتی ہے۔ روز ایک نیا قصہ لے کر لڑتی ہیں کہ رات کوثر نے انھیں بتایا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں اماں۔ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ صدمہ ان کے لیے جان لیوا تھا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ وہ زندہ ہیں ورنہ تو۔"

"تم احتیاط کرنا وقار۔ مجھے تو اس کے کمرے ہی سے خوف آنے لگا ہے۔ منحوس کہیں کی' پیدا ہوئی تو ماں باپ اور سارے خاندان کو اذیت میں مبتلا کردیا اور جب تک یہاں رہی سب کو عذاب میں مبتلا رکھا۔ خدا نے صحت دی' اتنا بڑا معجزہ کر دکھایا اور وہ ناشکری بجائے اس کے کہ ہر وقت خدا کی حمد و ثنا کرتی' جادو ٹونے میں پڑ گئی اور آخر منہ پر کالک مل کر گھر سے بھاگ گئی۔ خبردار جو تم اس کی تلاش میں مارے مارے پھرے تو۔ ہم پہلے ہی کم عذاب اٹھا چکے ہیں جو اب اس نئے چکر میں پڑ جائیں۔" اماں کے انداز اور لب و لہجے سے بے پناہ نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ بھی ہو' وہ بھی اس خاندان کی بیٹی تھیں جہاں عزت کو سینے سے لگا کر رکھا جاتا ہے' جان دینا آسان مگر عزت دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو آج تک مرزا صولت بیگ کے گناہوں کو دھونے اور خاندان کے نام پر ان کی وجہ سے لگ جانے والے بٹے کو ہی صاف کرنے میں لگی تھیں۔ پہلا تمام زندگی اس حویلی کی شان و شوکت اور وقار بلند کرنے میں گنوا چکی تھیں جو مرزا صولت بیگ کی وجہ سے تمام بدنام ہو چکی تھی۔ انھوں نے تو اس سلسلے میں اپنی جان پر ہزاروں عذاب سہے تھے پھر بھی اس حویلی سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھیں۔ اب بھی ان کی یہی خواہش تھی کہ پورے امروہہ میں اس حویلی کا وقار بلند ہو جائے۔ مرزا صولت بیگ کی سگی اولاد وہ حویلی چھوڑ گئی تھی مگر انھوں نے وہاں سے نکلنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور کوثر تو لڑکی تھی کنواری لڑکی! اس کی اس حرکت نے اور بے عزتی کے شدید احساس نے انھیں ادھ موا کر کے بیمار ڈال دیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ کوثر کے جانے سے' تایا اور تائی کے دکھ سے نڈھال ہیں مگر وہ تو بے عزتی کے صدمے سے دوچار تھیں۔

میرا اس وقت کچھ کہنا قطعی بیکار تھا۔ میں چپ رہا اور جہانی آپا سے لالٹین جلانے کو کہا۔ اماں غصے میں کھڑی رہیں پھر بول اٹھیں۔ "اب واپس امروہہ چلنے کی کرو میاں۔ اب میں یہاں رہ کر اپنی بچیوں پر انگلیاں نہیں اٹھواؤں گی۔" ان کی آواز قدرے اونچی تھی۔ میں نے گھبرا کر' پلٹ کر تایا کی طرف دیکھا۔ وہ اس جانب پیٹھ کیے بیٹھے تھے اس لیے میں جان نہیں سکا کہ آواز ان تک پہنچی کہ نہیں۔

"اماں!" میں نے سرگوشی میں احتجاج کیا۔ "چپ ہو جایئے۔ تایا نے سن لیا تو کیا سوچیں گے کہ خود پر مصیبت پڑی تھی تو یہاں آگئے اور اب اگر ان پر مصیبت پڑی ہے تو۔"

"ہمیں کیا پتا تھا کہ ان کی اولاد یہ گل کھلائے گی! انھیں کیا پتا لوگ کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔"

"لوگوں کو کیا پتا۔؟" میں چڑ گیا۔ مجھے اماں کے خیالات سے دکھ پہنچا تھا۔

"کیوں تمھاری چچی کی زبان کو روکنے والا بھلا پیدا ہوا ہے کوئی؟" انھوں نے جل کر کہا۔

"اچھا تو اس میں بھلا تایا اور تائی کا کیا قصور ہے؟" میں جھنجلا گیا۔

"کیوں۔ تو کیا ہمارا قصور ہے؟" وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر' میرا راستہ روک کر کھڑی تھیں۔ "لڑکیوں کی تربیت ایسے ہوتی ہے بھلا؟ کیا ضرورت تھی اپنی لاڈلی کے ایسے شوق پورے کرنے کی' لو بھلا لڑکیوں کو ایسے' بلا سوچے سمجھے کتابیں لا کر دی جاتی ہیں۔ بجائے یہ کہ اسے قرآن پاک پڑھواتے' الم غلم کتابیں لا کر دیں اور اتنی آزادی تھی کہ سارا دن ساری رات کمرا بند کیے پڑھتی رہتی تھی۔ لڑکیوں کو تو بند کمروں میں بھی نہیں رہنے دیا جاتا۔ ہماری لڑکیاں اگر منٹوں کو بھی آنکھ سے اوجھل ہوں تو ہم جان کو آجائیں ان کی۔"

"اماں' اماں پلیز۔ آپ ایسی باتیں تو نہ کریں۔ وہ معذور تھی' اس کے کہیں جانے کا تھوڑی کوئی سوال تھا جو اس پر ایسی پابندیاں لگائی جاتیں' پھر وہ کتابیں ایسی بھی نہ تھیں کہ۔"

"رہنے دو اپنا فلسفہ۔" وہ جل کر بولیں۔ "بہرحال بحث کرنے کی بجائے ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اس کے معاملات میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔ جسے خود اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا۔ ان کے بڑھاپے پر ترس نہ آیا اسے تمھیں منا کر لانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہاں آئی تو میں کبھی بھول کر بھی یہاں قدم نہ رکھوں گی۔ اور یہ اس نے تمھارے بارے میں کیا کچھ لکھا ہے۔؟" آخری سوال کرتے ہوئے تو وہ بے حد غصے میں تھیں۔

"اماں' اس کی سوچ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ نہ ہی میں ایسی کسی اوچھی حرکت کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ میں تو اسے بہنوں کی طرح چاہتا تھا۔"

"رہنے دو' اپنی بہنوں سے قطعی نہ ملاؤ اسے۔ خدا نہ کرے کہ۔"

"اچھا اماں' ہم اس موضوع پر بعد میں بھی گفتگو کرسکتے ہیں۔" میں الجھ گیا تھا۔ تائی وہیں برآمدے میں بیٹھی بڑے انہماک سے کتابوں کی ترتیب الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ تایا پتا نہیں کس سوچ میں تھے۔ میں جلد از جلد کوثر کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ تائی کی بات میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ ممکن تھا کہ انھوں نے واقعی وہاں بچھو دیکھے ہوں۔ جہانی آپا اور شنو آپا بھی ہماری گفتگو سر جھکائے سن رہی تھیں۔ میں ان دونوں کی موجودگی میں بچھوؤں کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اماں بھی اس ذکر سے بوکھلا سکتی تھیں

ایک بار میں نے اس کے کہنے پر اپنی انگلی کاٹ کر تکیے کے نیچے رینگتے ہوئے بچھو پر اپنے خون کے قطرے ٹپکائے تھے۔ وہ بلیڈ اس وقت بھی سرخ ہو رہا تھا اور مجھے جانے کیوں یہ احساس ہوا کہ اس پر لگا خون پرانا نہیں بلکہ تازہ ہے۔ میں نے انگلی کی پور سے چھو کر دیکھا۔ وہ چپچپا سا خون میری پور پر لگ گیا۔ ایک جھرجھری سی بدن میں دوڑی اور معدوم ہو گئی۔ میں آگے بڑھنے سے قبل زمین کا جائزہ لے لیتا تھا۔ مجھے سارا خوف بچھوؤں کا تھا۔ میری چھٹی حس خبردار کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ تائی کی بات غلط نہیں ہے۔ کوثر کی مسہری کے انتہائی بائیں جانب ایک گول میز تھی۔ اس میز پر کئی پرانی پرانی کتابیں رکھی تھیں۔ یہ کتابیں اتنی پرانی تھیں کہ ان کی حالت بہت خستہ تھی' کاغذ پیلے ہو چکے تھے اکثر کتابوں کے کور کو کیڑا کھا چکا تھا۔ میں ان کتابوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا اور حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ وہ کتابیں زیادہ تر خالص سنسکرت زبان کی تھیں۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ کوثر کو سنسکرت آتی ہو گی۔ وہ تو کبھی کسی اسکول یا کالج میں نہیں گئی تھی۔ ایسی کوئی بات بھی میں نے نہیں سنی تھی کہ اسے کوئی پڑھاتا رہا ہو۔ ایک ماسٹر صاحب کو تایا نے کبھی رکھا ضرور تھا مگر میں انھیں جانتا تھا۔ بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ اردو ادب سے گہرا تعلق تھا۔ اردو انگریزی پر عبور تھا۔ ان کے بارے میں بھی یہ بات کبھی سننے میں نہیں آئی تھی کہ وہ سنسکرت پر بھی عبور رکھتے ہیں' دوسری اہم بات یہ تھی کہ بڑے مذہبی آدمی تھے' صوم و صلواۃ کے پابند تھے۔ ان کے بارے میں یہ گمان خام ہی تھا کہ وہ ایسی جادو ٹونے کی کتابوں سے دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ بہرحال بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر پھر بھی میں نے سوچ لیا کہ ان سب کتابوں کو محفوظ کرلوں گا' سنسکرت سیکھنا پڑی تو سیکھوں گا اور ممکن ہوا تو ان سب کتابوں کا مطالعہ بھی کروں گا۔

میں ابھی کتابوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے سر کے پچھلے حصے میں' کہیں اندر ایک اس لیے میں تصدیق کیے بنا بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جلی ہوئی لالٹین اٹھائی اور اماں سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کریں' وہ میرے اس کمرے میں جانے پر بھی برہم تھیں۔ میں نے انھیں کہا کہ میں وہاں کیوں جا رہا ہوں' یہ بات میں واپس آکر بتاؤں گا۔ میرے انداز گفتگو سے شاید انھوں نے میری ضد کو محسوس کرلیا تھا۔ اماں میں یہ خاص بات تھی کہ اگر وہ کسی کے انداز سے ضد یا سامنے والے کے ارادے کی مضبوطی کو محسوس

کرتی تھیں تو اپنا لحاظ ختم ہونے سے پہلے ہی خاموشی اختیار کر لیتی تھیں' اس سے ٹکرانے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ میرے ساتھ بھی انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

میں لالٹین لے کر کوثر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان بچھوؤں کے بارے میں تصدیق کرنے کے علاوہ بھی میں وہاں کوئی ایسی چیز تلاش کرنا چاہتا تھا جس سے کوثر کا کچھ اتا پتا چل سکے۔ میں جان سکوں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اس کی تحریر سے تو قطعی کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں اور کیوں گئی ہے۔ جو کچھ وہ یہاں گھر میں رہ کر حاصل کر چکی تھی وہ بھی کافی تھا' پھر اسے گھر سے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کون سی ایسی شکتی تھی جسے حاصل کرنے کے لیے اس کا گھر چھوڑ کر جانا ضروری تھا۔

میں ان تمام باتوں کو جان لینا چاہتا تھا تاکہ اس کے سلسلے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤں۔ میں لالٹین لیے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے یکایک یخ بستگی کا احساس ہوا۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہ دن یاد آگیا جب میں حویلی میں شکنتلا کی سسکیاں سن کر بڑے برآمدے کو عبور کرنے لگا تھا تو برآمدہ یخ ہو رہا تھا یوں لگا تھا جیسے میں کسی سرد خانے میں داخل ہو گیا ہوں۔ ٹھنڈی اور کپکپا دینے والی ہوائیں چلتی محسوس ہوئی تھیں۔ ویسی ہی ٹھنڈک یہاں بھی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ کوثر کا پلنگ خالی تھا۔ اس پر تکیے اس انداز سے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ پڑھتے ہوئے مسہری کے سرہانے سے ٹکا لیتی تھی۔ ایک تکیہ اس کے پیروں کے پاس رکھا تھا یعنی پائنتی کو جن پر پیر رکھ کر لیٹنے کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ برابر کی میز پر موم بتیاں' سرخ رنگ کا ایک کچی مٹی کا پیالہ جس پر تازہ تازہ گیروی رنگ کیا ہوا تھا۔ لوبان' اگر بتیاں دو تین کتابیں اور وہی باریک اور لمبا سا بلیڈ رکھا تھا جس سے ہوتی ہے۔ میں اچھل کر پلٹا۔ روشنی زیادہ نہ ہونے کے باوجود میں نے فرش پر رینگتے ہوئے بچھوؤں کو دیکھ لیا۔ آیت الکرسی میری آزمائی ہوئی تھی۔ میں نے بے ساختہ آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ میری طرف بڑھتے ہوئے بچھو اچانک ساکت ہو گئے۔ وہ تین تھے' سیاہ خوفناک اور عجیب سی سرسراہٹ ہوئی۔ یہ اسی قسم کی سرسراہٹ تھی جو میں نے حجرے میں اس وقت محسوس کی تھی جب میں نے پورے حجرے میں بچھوؤں کو رینگتے دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے ان بچھو کے چلنے سے ایسی آواز پیدا ہو رہی ہے جیسی لوہے کے باریک تاروں کے فرش پر رگڑنے سے دہشت زدہ کر دینے والے۔ ان کے ڈنک خم کھا کر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساکت ہوتے ہی میں آگے بڑھا۔ لالٹین کو ان کے قریب کر کے انھیں دیکھا۔ وہ چھوٹے بچے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر میں نے ایک کٹوری رکھی دیکھی جس میں دودھ تھا۔ تائی کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ مجھے حیرت تو اس بات پر تھی کہ بچھو دودھ کیسے پی سکتے ہیں۔ ہاں اگر سانپ کو دودھ پلانے کی بات ہوتی تو سمجھ میں آجاتی۔ بہرحال یہ بھی میں جانتا تھا کہ یہاں عقل سے غیر ہر بات متوقع تھی۔

اب سارا مسئلہ ان بچھوؤں کو یہاں سے ہٹانے کا تھا۔ ان کا یہاں سے ہٹایا جانا بے حد ضروری تھا۔ تائی کی باتوں سے تو یوں لگتا تھا جیسے کوثر انھیں جان بوجھ کر یہاں چھوڑ گئی ہے۔ اس نے انھیں دودھ پلانے کی ہدایت بھی کی ہے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ انھوں نے تائی کو نقصان کیوں نہیں پہنچایا۔ یہ میں ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ بچھو قطعی بے ضرر ہیں' یا ہو سکتے ہیں۔ میں اس کمرے سے لوبان اور بچھو دونوں ہٹانا ضروری سمجھتا تھا لہٰذا میں نے ان ساکت بچھوؤں کو جوتے کی نوک سے چھو کر دیکھا۔ وہ کسی پلاسٹک کے کھلونے کی طرح بے جان اور سخت تھے۔ اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں نے ایک کاغذ میں ان بچھوؤں اور لوبان کو لپیٹا' آیت الکرسی کا ورد جاری رکھا اور انھیں لے کر باہر آگیا۔ میرا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا کہ میں انھیں کس طرح ضائع کر سکتا ہوں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں حصار کھینچنا جان گیا تھا۔ سو میں انھیں لیے ہوئے گھر سے باہر آگیا۔ ہمارے گھر کے انتہائی بائیں جانب ایک قطعہ تھا جو خودرو جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ شاید کوئی خالی پلاٹ تھا۔ فی الوقت میرے ذہن میں اور کوئی جگہ نہ آئی اور میں نے یہ سوچ کر کہ میں بعد میں انھیں نکال کر کسی اور جگہ دفنا دوں گا' انھیں لے کر اس خالی قطعے پر گہرا گڑھا کھودا۔ کاغذ میں لپٹے ہوئے بچھو اور لوبان کو اس گڑھے میں رکھا' اوپر سے مٹی ڈال کر برابر کر دیا اور بعد میں ان کے گرد حصار کھینچنے کا عمل شروع کیا۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ میں اذان سے پہلے ہی اپنے عمل سے فارغ ہو گیا۔ میں نے انگلی کی مدد سے اس گڑھے کے چاروں طرف حصار کھینچ دیا۔

اب میں اس طرف سے مطمئن تھا۔ گھر آکر نہایا' خود کو پاک کیا اور نماز کے لیے مسجد چلا گیا۔ نماز کے دوران ہی میں نے اس سفید براق بلی کو اپنے گرد ناچتے دیکھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی میں اس بلی کی طرف متوجہ ہوا جو اب میرے قریب ہی دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ میں نے زیر لب سلام کیا۔ وہ سونی صد جن بابا تھے۔ میرے سلام کرتے ہی وہ بلی ہلکے قدموں اور دھیمی رفتار سے دروازے کی طرف بڑھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہہ رہی ہے۔ میں اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ میرے ہاتھ میں فیروزے کی تسبیح تھی جو سنہرے بابا نے وظائف سے فارغ ہونے کے بعد مجھے دی تھی اور بقول ان کے وہ یہ تسبیح بالخصوص میرے لیے نیپال سے لائے تھے۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے عین اسی جگہ پہنچ گئے جہاں میں نے ان بچھوؤں کو دفنایا تھا۔ وہاں جا کر بلی کے رک جانے پر میں چونک اٹھا۔ وہ منہ اٹھائے مجھے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے میں اسے دیکھتا رہا پھر میں نے اپنے ذہن میں ایک آواز کی گونج سنی۔ وہ آواز سونی صد جن بابا کی تھی۔ وہ مجھ سے گڑھا کھودنے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی زمین پر بیٹھ کر پاس پڑی ہوئی ایک لکڑی سے گڑھے کو کھودنا شروع کر دیا۔ کیونکہ یہ گڑھا بھرے مجھے دیر نہیں گزری تھی اس لیے میں نے باآسانی اس گڑھے کو دوبارہ کھود لیا اندر کاغذ میں لپٹی لوبان اور بچھوؤں کے توں موجود تھے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی سفید بلی اس گڑھے میں کود گئی۔ میرے قدم خود بہ خود واپسی کے لیے اٹھ گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سفید بلی منہ میں وہ لپٹا ہوا کاغذ اٹھائے اندھیرے میں دور جاتی نظر آئی۔

"شاید میری قسمت میں یہی لکھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میاں اپنی حرکتوں کو قسمت کا نام مت دو۔ ایک شکنتلا ہی پشتوں سے ہماری جان کھانے کو کافی نہیں تھی جو اب تم نے اس خبیث کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اب تو شکنتلا کی طرح سے بھی جان چھوٹ گئی' اب تمھیں کیا پریشانی ہے۔ اس چکر سے نکل آؤ۔ اپنی ماں بہنوں کا سوچو اور سیدھی سادی زندگی گزارو۔" تایا جھنجلائے ہوئے تھے۔

"گویا میں سادھو کو معصوم عورتوں پر ظلم کرنے کے لیے چھوڑ دوں؟" میں ضدی انداز میں بولا۔

"عورتوں کو مظالم سے بچانے کی کوشش بے سود ہوگی میاں وقار الحسن! انسانی تہذیب کے ارتقا کا مطالعہ کرو تو تمھیں پتا چلے گا کہ زمانوں بلکہ صدیوں پہلے جب سے مادر سری نظام کا خاتمہ ہوا اور یہ پدر سری نظام نافذ کیا گیا تب سے عورت ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہی ہے' تمھارے خیال میں کیا اتنی صدیوں میں ایک بھی ایسا مسیحا نہ ہوا ہوگا جو انھیں ظلم سے نجات دلانا چاہتا ہوگا؟ نہیں میاں۔ تم ایسے بہت سے لوگوں نے بھرپور کوشش کیں ہیں مگر کبھی کامیاب نہ ہوئے بلکہ معتوب کیے گئے۔ عورت کو ہمیشہ لذتوں کو بہم پہنچانے' جادو ٹونوں پر عبور حاصل کرنے' دیوتاؤں کو خوش کرنے اور ایسے ہی دوسرے معاملات میں استعمال کرنے کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی رہی ہے۔"

"جو کام ہمیشہ غلط کیا جاتا رہا ہے اسے کیا ہمیشہ غلط ہی ہوتے رہنا چاہیے؟" میں تایا کے خیالات جان کر حیران تھا۔

"میاں میرا مطلب تم سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے میں سوائے دھکے کھانے کے کچھ اور نہیں کر سکو گے۔" وہ بری طرح جھنجلا گئے تھے۔

"تایا! میں جانتا ہوں کہ آپ میری وجہ سے پریشان ہیں۔ میں اگر یہ بات نہ جانتا کہ سادھو وہ چیزیں حاصل کرنے کے بعد کیا کرے گا تو شاید اب میں خود کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوتا مگر اب میں شکنتلا جیسی معصوم دوشیزاؤں کو شیطانی خواہشات کی بھینٹ چڑھتا نہیں دیکھ سکتا۔ شاید میں کچھ معصوم لڑکیوں کو اس خبیث کے چنگل میں جانے سے بچا کر پردادے کے گناہوں کا کفارہ ادا

اطمینان کا گہرا سانس لے کر میں گھر کی طرف چل پڑا۔ بے پناہ اطمینان کا احساس یوں ہوا تھا کہ سنہرے بابا مجھ سے غافل نہیں تھے۔ وہ ہر طرح میری مدد کر رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ آئندہ بھی میری مدد کرتے رہیں گے۔

میں گھر پہنچا تو شرف الدین کو اپنا منتظر پایا۔ وہ تایا کے پاس بیٹھا تھا۔ تایا دن کی نسبت بہت بہتر محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے سر اٹھایا۔ ان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے خاصی تقویت ہوئی ورنہ ان کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے شرف الدین سے پوچھا کہ خیریت تو ہے؟ اس

نے آنے کا وعدہ نہیں کیا تھا بلکہ کہہ گیا تھا کہ میں فارغ ہوں تو فرقان کے گھر آجاؤں مگر اس وقت وہ موجود تھا۔ شرف الدین نے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔ دل گھبرا رہا تھا اس لیے میرے پاس چلا آیا۔ میں نے اس سے رحمو کے بھائی کے بارے میں پوچھا جو مجھے اور تایا کو حجرے کی طرف جاتے ہوئے ملا تھا اور رحیمو کا ہمشکل تھا۔ اس کے بارے میں سن کر اس نے حیرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ایک بہن تھی جو شادی شدہ تھی اور بچے کی پیدائش کے موقع کر مرگئی تھی اور اس کا باپ امروہہ میں ہے تب میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اس روز کیا ہوا تھا اور یہ بھی بتایا کہ میں نے اس دوران دو بار اسے کس حالت میں دیکھا تھا۔ حجرے میں میرے ساتھ کیا کیا ہوا۔ سادھو نے اس کا روپ بھر کر مجھے کس طرح دھوکا دیا۔ کس طرح وہ مجسمہ اور کڑا لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ آخری بات سن کر تایا اور شرف الدین دونوں پریشان ہوگئے۔

"یہاں اتنا گھڑاک اس نے پھیلایا ہی مجسمے اور کڑے کے لیے تھا اور وہی تم نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے بعد بھی اس کے حوالے کردیا۔ اب کیا ہوگا؟" تایا پریشان ہوکر بولے۔

"تایا' اماں کو سامنے دیکھ کر میں برداشت نہیں کرسکا تھا۔ میں قطعی بھول گیا تھا کہ یہ شیطان یہ بھی کرسکتا ہے۔ بس وہیں مجھ سے چوک ہوگئی۔ میں ناکام ضرور ہوگیا ہوں تایا' مگر میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اسے بخشوں گا نہیں۔"

"گویا تم یہ مصیبت ہمیشہ پیچھے لگائے رہو گے؟" اس بار شرف الدین بولا۔

کرسکوں۔"

"ایک تو میاں تم عجیب عجیب عقائد کے قائل ہو۔ کوئی کسی کا کفارہ ادا نہیں کرسکتا۔ کفارہ وہی ادا کرسکتا ہے جو گناہ کا مرتکب ہوا ہو۔ دنیا سے جانے والا انسان جو کچھ اپنے ساتھ لے جاتا ہے بس وہی اس کا اپنا ہوتا ہے' گناہ بھی اور ثواب بھی' کفارہ بھی اور توبہ بھی۔ تم دادے کا کفارہ ادا کرکے انھیں ان گناہوں کے عذاب سے نہیں بچاسکتے۔ ہاں اسے یوں کہہ لو کہ تم ایسا کرکے اپنے ضمیر کے آگے سرخرو ہونا چاہتے ہو۔ یہ ایک اچھی بات ہے اگر ایسا کرنے کے دوران میں تمھارے ضمیر پر دوسری طرف سے کوئی اور بوجھ نہ ہو تو۔ تمھاری اماں اور بہنیں تمھارے فرائض میں شامل ہیں' ان کی خبرگیری تم پر فرض ہے اور ایک فرض سے غافل ہو کر تم اپنے ضمیر کو قطعی مطمئ نہیں کرسکتے۔"

"تایا ٹھیک کہتے ہیں وقارالحسن۔"

شرف الدین نے دھیمی آواز میں ان کی تائید کی۔ نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا ساتھ دیتے دیتے تھک گیا ہو۔ "میں جانتا ہوں شرف الدین۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا مجھے کوثر کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے؟ تم چاہتے ہو یا تایا چاہیں گے کہ کوثر سادھو اور اس جیسے دوسرے شیطانوں کے زیر اثر رہ کر مزید غلاظت میں گھرتی چلی جائے؟"

میری بات سن کر تایا چونک اٹھے۔ "تمھارا مطلب ہے کہ اسے سادھو نے۔" انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑدیا۔ وہ بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرا یقین نہیں تایا مگر شبہ ضرور ہے۔ وہ جن علوم کے چکر میں پڑگئی ہے وہ اسے سادھو والے راستے ہی پر لے جائیں گے۔ ممکن ہے وہ سادھو سے مدد لینے کی بھی سوچے یا سادھو اس کے اس شوق اور طاقت سے واقف ہوچکا ہو۔ وہ سب خبر رکھتا تھا تو یہ بھی جانتا ہوگا۔ کوثر نے کئی بار اس کے بچھوؤں کو ضائع کیا تھا۔ وہ بہت کچھ جان گئی تھی تایا۔ مجھے بس اتنا خوف ہے کہ کہیں وہ اپنی بے توقی اور معصومیت کی وجہ سے اس کے شیطانی ارادوں کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

کچھ میرے لہجے کی قطعیت اور کچھ میری باتوں نے انھیں چپ لگادی۔ کوثر کے ذکر پر تایا کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ سی چھاگئی تھی اور ان کا اضطراب آنکھوں کی بے چین پتلیوں سے ظاہر ہورہا تھا۔

"اپنی اماں کو کیا جواب دوگے؟"

تایا نے یوں شکستہ انداز میں پوچھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ احساس ہوا جیسے وہ میری اور اماں کی گفتگو سن چکے ہوں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں انھیں کیا جواب دوں۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر لہجے کی لڑکھڑاہٹ کے خوف سے نکل کر' خوب جم کر بولا۔ "ایک وعدہ میں نے ابا سے کیا تایا' اور ایک وعدہ خود سے کرچکا ہوں۔ ایک ناکامی کے باوجود میں اب تک اپنے اس وعدے سے پھرا نہیں ہوں جو میں نے ابا سے کیا تھا۔ نہ میں خود سے مکرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔ زندگی کے جس انداز کو میں قبول کرچکا ہوں وہ میرے لیے اب نہ مشکل ہے اور نہ ہی ناگوار' اب تو میں اپنے وعدوں کو نبھانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں۔ میری خواہش ہوگی کہ مجھے بے وجہ اور جبراً نہ روکا جائے۔ رہا اماں اور بہنوں کے فرائض کا سوال تو میں حتی المقدور کوشش کروں گا کہ وہ فرائض پورے کرتا رہوں۔ میرے فرائض پورے کرنے کا اگر یہ مطلب ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر گھر میں بیٹھ جاؤں تو میں معذرت چاہوں گا۔

سیدھی سادی زندگی میں بھی گزارنا چاہتا ہوں اور ضرور گزاروں گا مگر وعدے وفا کرنے کے بعد' میں نہ خورشید چاچا کی موت کو بھولا ہوں اور نہ ہی لڈن کی موت کو۔۔۔ نہ بڑی پھوپی اور پھوپا کی موت میرے ذہن سے محو ہوئی ہے اور نہ میں چھوٹی پھوپی کی اذیت ناک موت کو فراموش کرسکتا ہوں۔" مسلسل بولنے سے میرا حلق خشک ہوگیا تھا شاید اس لیے بھی کہ میں بہت جذباتی ہوگیا تھا۔ تایا کے سامنے شرمندگی محسوس کررہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تایا اماں کی باتیں سن چکے ہیں۔ میں شاید غیرارادی طور پر ان کے دل کا بوجھ کم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے بے تکان بولے چلا گیا۔

تایا اور شرف الدین بالکل خاموش تھے۔ میں کچھ دیر چپ رہا۔ تایا کے چہرے کے تاثرات سے ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگاتا رہا پھر بولا۔ "تایا! کوثر کا چلے جانا' تائی کا پاگل ہوجانا' اس گھر کا ویران ہوجانا' کیا یہ سب کچھ ایسا ہے کہ میں اسے فراموش کردوں؟۔ نہیں تایا۔ میں اتنا خود غرض نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہوسکوں گا۔ میرے بارے میں فیصلے اب تک دوسرے کرتے رہے مگر اب۔ اب میں فیصلے کرنے کے قابل ہوں۔ میں آپ لوگوں سے مشورے ضرور لوں گا لیکن۔"

آگے کچھ کہنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ تایا نڈھال سے ہوکر لیٹ گئے۔ عشا کی اذان ہوچکی تھی۔ اماں نے کہلوادیا کہ نماز پڑھ لو تاکہ رات کا کھانا نکالا جائے میں اور شرف الدین تایا سے اجازت لے کر مسجد کی طرف چل پڑے۔ شرف الدین خاموش تھا۔ میں اس کے ساتھ کچھ دیر کو اکیلا ہوا تو میں نے شدت سے ایک بات نوٹ کی۔ وہ یہ کہ شرف الدین یا تو بہت پریشان ہے یا کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پارہا۔ زبان اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہی۔ ورنہ وہ نہ کبھی اتنا کم گو تھا نہ اتنا ریزرو۔ ہم مسجد تک خاموش رہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد میں اسے لے کر وہیں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"کیوں۔ یہاں کیوں؟" وہ حیران ہوگیا۔

"کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو پوچھو۔" اس نے مختصراً کہا اور استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم اتنے خاموش کیوں ہو شرف الدین؟" میری الجھن زبان تک آگئی۔

"نہیں تو۔" وہ کچھ گھبرا گیا۔

"شرف الدین! کاش میں تمھیں نہ جانتا ہوتا تاکہ تمھارا جھوٹ نبھ جاتا۔ تم مجھ سے اجنبیت برت رہے ہو' وجہ کیا ہے؟ کھل کر بتاؤ شرف الدین۔"

وہ کچھ دیر گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ تھی' الجھن تھی' تذبذب تھا۔ میں بھی خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اندر ہونے والی جنگ کا خود ہی فیصلہ کرے۔

میرا خیال تھا کہ وہ موجودہ حالات اور میرے ارادوں سے واقف ہوجانے کے بعد میرے اور شگفتہ کے رشتے کے بارے میں تذبذب کا شکار ہے۔ یہ اس کا حق بھی تھا۔ میں خود یہی چاہتا تھا کہ میں اس معاملے میں جذباتیت سے مغلوب ہوکر کوئی فیصلہ نہ کروں۔ شگفتہ میری محبت تھی اور اپنی محبت کو میں کسی ایسے عذاب سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا جو مجھ سے منسوب ہو۔"

"وقارالحسن! میں شگفتہ کی طرف سے پریشان ہوں۔ ابا اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں' اماں بھی ان کی ہم خیال ہیں۔ میں نے اور اماں نے بہ مشکل تمام انھیں اس رشتے پر راضی کیا ہے کہ شگفتہ کی مرضی بھی اس میں ہے مگر تم۔ تم جن چکروں میں پڑے ہو۔" وہ خاموش ہوگیا۔ آگے اسے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرا اندیشہ درست تھا۔

"شرف الدین! میں خود بھی اس سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میرے حالات تمھارے سامنے ہیں' تم خود سوچ سکتے ہو کہ میں ان حالات میں اپنا گھر بسا کر کیسے بیٹھ سکتا ہوں جب کہ کوثر کی غیرموجودگی نے تایا کی کمر توڑ دی ہے۔ تائی ہوش و خرد سے بیگانہ ہوچکی ہیں' تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ لیکن میں تمھیں کسی الجھن میں نہیں رہنے دوں گا۔ تم چاہو تو اس کا کہیں بھی رشتہ طے کرسکتے ہو۔ میں سوچوں گا کہ دنیا کی دوسری نعمتوں کی طرح میں اس

نعمت سے بھی محروم رہ گیا۔ تمہارے خاندان کا فرد بننا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا مگر اب قسمت کو کیا کیا جائے۔ میں تم سے طویل انتظار کرنے کا کہہ کر تمہیں پریشانیوں میں بھی مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی بھی اس پر یا تم پر انگلی اٹھائے۔ اب سب کچھ تمہارے اوپر ہے' تم جو چاہو کرو۔ میں کبھی گلہ نہیں کروں گا۔" کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وقار الحسن اتنے سنگدل نہ بنو' یہ فیصلہ تمہیں تمہاری زندگی سے دور' بہت دور لے جائے گا۔

"بات گلہ کرنے کی نہیں ہے وقار الحسن! میں۔۔ میں شگفتہ کو بھی دکھ نہیں دینا چاہتا۔"

اس نے بڑے نپے تلے الفاظ میں' بڑے محتاط انداز میں مجھ تک شگفتہ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ یہ اس کی محبت کا مکمل اظہار تھا۔ میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ قارئین! اس زمانے کی محبت آج کی محبت کی طرح نہیں ہوا کرتی تھی۔ آج محبت صرف اور صرف خوب صورت الفاظ کا مرقع بن کر رہ گئی ہے' برملا اظہار کی محتاج ہے جب کہ اس زمانے کی محبت کم گو تھی' نگاہوں سے جذبات کی شدت کا اظہار بڑا بھرپور ہوتا تھا۔ پہلے محبت محسوس کرنے کی چیز تھی مگر آج' معذرت کے ساتھ' آج یہ سننے' اور چھونے کی حد تک آچکی ہے۔ اس زمانے میں چلمن پر لہراتا سایہ ایک پوری زندگی بلکہ پوری ایک صدی گزارنے کو کافی تھا۔ ہونٹوں کے کناروں پر مسکراہٹ' نیچی نگاہوں میں ٹوٹتے ستاروں کی سی جگمگاہٹ اور ہونٹوں پر بھیگی بھیگی سی لرزش محبتوں کی انتہا تھی۔ شرف الدین نے جن الفاظ میں اس کا مدعا مجھ تک پہنچایا تھا اس نے مجھے بڑا حوصلہ' بڑی تقویت اور بے پناہ مسرت بخشی تھی۔ ایسے حالات اور ایسی مایوسی میں شگفتہ کا اقرار محبت' ایک جگمگاتی ہوئی کرن بن کر دور تک پھیل گیا۔

"بولو وقار الحسن!" وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔ میں خیالات سے چونک اٹھا۔

"شرف الدین! میں تو ایسا صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی دکھ نہ ہو' ورنہ میں خود کو مجرم محسوس کروں گا۔"

"وہ بڑی باہمت ہے وقار الحسن! اس کا ساتھ کبھی کسی پریشانی کا سبب نہیں بنے گا۔"

شرف الدین کی بات سن کر میں نے گہرے اطمینان کا سانس لیا۔ "ٹھیک ہے شرف الدین! میں اماں اور بہنوں کو لے کر امروہہ جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی پریشانی ان حالات میں انھیں مایوس یا دل برداشتہ نہیں کرے گی تو۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھن رفع ہو چکی ہے۔ مجھے خوشی کا بے پایاں احساس ہوا۔ شگفتہ کو پانے کی مسرت مجھ سے سنبھل نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور کھڑا ہو گیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑے۔ میں راستے بھر وہ الفاظ ڈھونڈتا رہا جن کا سہارا لے کر شرف الدین اور جہانی آپا کے چہرے کے تاثرات کے بارے میں اپنا فیصلہ سنا سکوں مگر میں ناکام رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس طرح یقین دلاؤں کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ وہ ہمت کرتا اور کچھ کہتا تو میں دل وجان سے اسے قبول کرنے کا یقین دلا دیتا۔

میں سوچتا رہا' وہ بھی سوچتا رہا اور ہم گھر پہنچ گئے۔ اماں کھانے پر ہماری منتظر تھیں۔ تایا پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں ہی نہیں شرف الدین بھی بجھ گیا۔ وہ تو تایا کی بذلہ سنجی سے بہت محظوظ ہوتا تھا اور ان کی گفتگو کو پسند کرتا تھا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ اماں کا موڈ اب تک آف تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اماں سے آج دو ٹوک بات کروں گا تاکہ وہ تایا کے لیے مزید دکھوں کا سبب نہ بنیں۔ شرف الدین نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھا رہا۔ تایا سے مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے انھیں ان کے خول سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ تائی حسب معمول اپنے کمرے میں تھیں۔ جہانی آپا اور شنو آپا انہیں کھانا کھلا رہی تھیں اور ان سے گفتگو بھی کرتی جا رہی تھیں۔ ان لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز بہت دھیمی تھی مگر تائی با آواز بلند بول رہی تھیں۔

جاتے ہوئے میں نے شرف الدین سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد اماں سے بات کر کے اسے جواب دوں گا۔ وہ چلا گیا تو میں اماں کے کمرے میں چلا آیا۔ تایا کو ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائی کھلا کر اور دودھ پلا کر جہانی آپا وغیرہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔

اماں نے شاید میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو میں نے شگفتہ کے سلسلے میں بات کی' میری بات سن کر وہ چونک کر بولیں۔ "تم اپنی تایا زاد کو ڈھونڈو گے یا شادی کرو گے؟ اور جو وہ مل گئی تو شادی بھی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں!" میں جھنجلا گیا۔ مجھے گمان نہ تھا کہ اماں سے بات کرنا اتنی مشکل ہو گی۔ تلاش کرنے اور شادی کرنے میں کوئی مماثلت ہے۔"

تم سمجھ رہے ہو ورنہ وہ تو صاف صاف لکھ چکی ہیں تم ہی ان کی منزل ہو۔" اماں بے پناہ غصے میں تھیں مگر انھوں نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ "دیکھو وقار الحسن! ہمارا یہ فیصلہ دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب تم شادی کر کے اپنا گھر بساؤ پھر بہنوں کی فکر کرو۔ وہ خود گئی ہے' خود ہی واپس آجائے گی۔"

"اماں وہ واپس آجائے گی' مجھے بھی پتا ہے مگر وہ جن راہوں پر چلنے کی کوشش میں گھر سے نکلی ہے وہ راہیں بڑی مشکل ہیں۔ معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔ میں اسے اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو۔ آپ کو بھی تایا اور تائی کا ہمدرد ہونا چاہیے۔ وہ آپ کی تکلیف میں آپ کے ساتھ تھے تو آپ کو بھی ان کے دکھوں میں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہم اس معاملے کو دوسری طرح بھی سنبھال سکتے ہیں۔ لوگ کیا کہتے ہیں' اس پر نہ جائیے۔ لوگ تو بھلے کی بھی کبھی تعریف نہیں کرتے۔ اس پر انگلیاں اٹھانے سے باز ہی نہیں آتے۔ یہ بتائیے آپ کو شگفتہ یا عصمت جہاں سے ہمدردی کیوں تھی؟ وہ لوگ بھی تو گھر سے نکل چکی تھیں۔ ماں باپ کی عزت کا جنازہ تو ان کے گھر سے باہر نکلتے ہی اٹھ گیا ہو گا۔ اسے چھوڑ دیجیے کہ انھیں اٹھا لیا گیا یا اغوا کر لیا گیا۔ عزتوں کو بٹا تو لگ ہی گیا ناں پھر۔" عصمت جہاں بھی عزت لٹا بیٹھیں اور شگفتہ نے بھی بدنامی کے ڈر سے خودکشی کر لی۔ اگر ان دونوں کو مرزا ولایت بیگ نے نہ اٹھایا ہوتا۔ آپ نے ان کی مظلومیت دیکھی ہوتی تب آپ کا ردعمل یقیناً اب سے مختلف ہوتا۔ آپ کوثر کو بھی اسی طرح دیکھیں اماں۔ وہ خدانخواستہ کسی کے ساتھ نہیں بھاگی' بس اپنی بے وقوفی اور اپنے جنونی شوق کے چکر میں اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھی ہے۔ اسے کسی بھی اندوہناک حادثے اور سانحے سے بچانا میرا فرض ہے۔ پھر تایا اور تائی نے تو ہمیشہ آپ کا ساتھ دیا ہے یہ کوئی بہت پرانی بات تو نہیں اماں کہ آپ اسے فراموش کر دیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میری گفتگو اماں کو نرم کر رہی ہے۔ ان کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آنکھوں میں شرمندگی کے ساتھ ہی بے چینی بھی پھیل گئی تھی۔ میں نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔ "خدا نہ کرے اگر ایسا آپ کی دونوں بیٹیوں میں سے کسی نے کیا ہوتا تو۔۔ وہ بھی تو معصومیت اور بے وقوفی میں ایسا کوئی قدم اٹھا سکتی تھیں۔۔ پھر۔۔ پھر آپ کیا کرتیں اماں؟"

"وقار۔۔ بیٹا میں احسان فراموش نہیں ہوں مگر۔۔ خیر اب جو تمہارا جی چاہے کرو مگر اپنی شادی کا فوری فیصلہ کر لو۔ شگفتہ کے بابا اگر مان گئے ہیں تو اسے بڑا غنیمت سمجھو' بیٹی کا بوجھ ڈھونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں تمہاری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شادمانی سے جہانی کی بات بھی کرنا چاہتی ہوں۔ ان کا بھائی انجینئر ہے۔ اچھے قد کاٹھ کے علاوہ شریف لڑکا ہے۔ کچھ عمر زیادہ ہے مگر۔۔"

"نہیں اماں!" میں نے اماں کی بات کاٹ دی۔ "میں کسی بے جوڑ رشتے کو قبول نہیں کروں گا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں' بہت زیادہ ہے۔ آپ کو شرف الدین کیسا لگتا ہے؟" میں نے یہ سوال اچانک کیا تھا۔

"آں۔۔۔ کون۔۔ یہ شرف الدین۔"

"جی۔ میرے خیال میں یہ جہانی آپا کے لیے بہت اچھا رہے گا۔"

"مگر میاں۔۔ یہ تو ہمارے پلے کے۔۔ بھئی لڑکی کا معاملہ ہے۔ تمہاری دلہن کی بات دوسری ہے' ہمارے پاس ماشاء اللہ بہت کچھ ہے۔ وہ راج کرے گی مگر جہانی۔۔"

"اماں' اماں آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ زر اور زمین سے زندگی کے سکھ کا کوئی تعلق نہیں' قسمت میں سکھ ہوتا ہے تو وہ ہر جگہ مل جاتا ہے۔ شرف الدین بڑا سلجھا ہوا' پڑھا لکھا اور قابل لڑکا ہے۔ وہ اپنی زندگی خود بنا لینے کا فن جانتا ہے۔ وہ جہانی آپا کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔ میں آپ سے یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر رشتہ آئے تو آپ سوچیے گا ضرور۔"

"خیر یہ تو بعد کی بات ہے' تم اپنے بارے میں پروگرام بتاؤ۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب امروہہ چلے چلو۔ اپنے تایا اور تائی کو بھی لے لو۔ وہیں ساتھ رہیں گے۔ تمہاری چچی تو خیر حصہ الگ ہو جانے پر پھولے نہیں سما رہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ یہاں بھی نہ رہنے کیں۔ دہلی کا سودا سما گیا ہے سر میں۔ اتنی پریشانی میں بھی بہن کے پاس جا پہنچیں۔ تم تایا کو

تیار کرلو۔ ویسے بھی جب تک کوثر نہیں آجاتی ان کا یہاں تنہا رہنا' بیماری اور پریشانی تنہا کاٹنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں حکیم علی احمد سے علاج بھی ہوجائے گا اور ساتھ بھی رہیں گے۔ تم تو پتا نہیں کیا سوچے بیٹھے ہو۔ یہاں الگ مکان خرید لیا اور اب وہ خواہ مخواہ خالی پڑا ہے۔ بیچ باچ کے الگ کرو۔ میں حویلی نہیں چھوڑ سکتی۔"

اماں بغیر رکے بولے چلی گئیں۔ ویسے وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ میں بھی اس طرح کانی جھمٹوں سے بچ جاتا۔ میں نے سوچ لیا کہ تایا سے ضرور بات کروں گا۔ پھر ہم نے یہ فیصلہ کرلیا کہ تایا سے بات کرنے کے بعد امروہہ چلیں گے۔ اگر تایا وہاں اماں کے ساتھ رہتے تو یہ میرے لیے بہت بہتر تھا۔ گو میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے مگر بہرحال مجھے یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ جانا تھا۔ اس مکان کا بھی عجیب قصہ تھا جو آتے ہی اتنی بھاگ دوڑ کے بعد خرید اگیا اور آج تک یونہی خالی پڑا تھا۔ اسے بیچنا تو خیر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ جب تک وہاں رحیمو کی لاش تھی' اس کی ہڈیاں بھی باقی تھیں' میں اسے بیچنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ میں لیٹا یہی باتیں سوچتا رہا۔ جہانی آپا اور شنو آپا شاید سوچکی تھیں۔ اماں خاموش لیٹی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ مجھے نیند نہیں تھی بلکہ تھکن تھی۔ عجیب و غریب۔ قسم کی تھکن' یوں جیسے بیکار بیٹھے بیٹھے بدن میں تھکن اتر آتی ہے یا آرام کرتے کرتے آدمی تھک جاتا ہے۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ گھر میں گہرا سناٹا چھاچکا تھا۔ برآمدے میں دیوار پر لگی لوہے کی سلاخ میں لالٹین لٹکی ہوئی تھی' جس کی لو بہت نیچی ہونے کے باوجود روشنی پھیلا رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے سے جھونکے پر بھی لائن جھولنے لگتی تھی اور روشنی کے سائے فرش پر مست ہاتھی کی طرح جھومتے محسوس ہوتے تھے۔

میں آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ اچانک کوثر کا سراپا میرے ذہن میں لہرانے لگا مگر یوں جیسے کوئی دھوئیں کی بنی ہوئی شبیہہ ہو۔ اس پورے سراپے میں دھواں کہیں گاڑھا اور کہیں ہلکا تھا۔ میں پوری طرح اس سراپے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تب اچانک میری کیفیت بدلنے لگی۔ یہ احساس بہت شدت کے ساتھ ہوا جیسے میں ہوا کے دوش پر سوار کسی خاص سمت میں بے حد تیزی کے ساتھ سفر کررہا ہوں۔ مراد آباد کی گلیوں کی فوراً ہی بعد بالیکا مندر مجھے

صاف نظر آنے لگا مگر یہ منظر چند ہی ثانیوں میں پیچھے ... اب میں اپنے آپ کو بہت تیزی سے آگے بڑھتا ... کررہا تھا۔ میری یہ کیفیت بالکل وہی تھی جیسے ... حجرے سے گھر واپسی پر محسوس کی تھی۔ جب میں ... لگا تھا اور میں نے اپنے اردگرد کے مناظر اور ... بہت جلد پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ میں ہوا کے تیز جھونکے ... ایک طرف بڑھتا جارہا تھا۔ بالیکا مندر کے بعد وہ ... تیزی سے گزر گئے جہاں میں اور شرف الدین ... بلانے پر گئے تھے اور ہم نے پہلی بار سادھو کی گدی ... بچھو دیکھا تھا۔ اس کھنڈر سے آگے ہم نہیں گئے ... وقت آگے کے تمام مناظر میرے سامنے تھے۔

یہ ایک گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل کے سارے ... سیاہ رنگ کے تھے۔ پتوں کا رنگ زرد' ہلکا ہرا یا ... سا تھا۔ سارے ہی درخت صدیوں پرانے لگ رہے ... میں بے پناہ رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ درختوں ... چھوڑتا' ٹیڑھے سیدھے راستوں پر بل کھاتا آگے ... بڑھ رہا تھا کہ اچانک میں ایک بڑے درخت کے سامنے ... رک گیا۔ اس درخت کا تنا کھوکھلا تھا۔ اس میں ... طرف اتنا بڑا سوراخ بنا ہوا تھا کہ ایک آدمی آسانی ... اندر جاسکتا تھا۔ میں ہوا کے کسی نرم جھونکے کی طرح ... کھوہ میں داخل ہوگیا۔ یہ سب کچھ میں غیرارادی ... کررہا تھا۔ یوں سمجھئے کہ جیسے میرے سامنے کی اسکرین ... کوئی فلم چل رہی تھی جسے میں دیکھ سکتا تھا' ... کرسکتا تھا مگر کسی سین کو بدلنے یا روک دینے پر قادر ...

درخت کی کھوہ میں داخل ہوتے ہی مجھے پہلے ... اندھیرے اور حبس کا سا احساس ہوا مگر کافی نیچے ... بعد میں نے روشنی کو صاف طور پر محسوس کیا۔ یہ ... اتنی تھی کہ میں ہرچیز کو باسانی دیکھ سکتا تھا۔ سب ... جس چیز کو دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا تھا وہ ایک انسانی کھوپڑی ... اس انسانی کھوپڑی کے اوپر ایک بڑی موم بتی رکھی ... اسی کے قریب ایک عجیب و غریب سیاہ دھات سے ... سا برتن رکھا تھا۔ اسی برتن کی بناوٹ بھی کھوپڑی سے ... تھی مگر یہ اوپر سے پیالے کی مانند گہرا تھا۔ اس میں ... سیال تھا جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یوں ... برتن آگ پر دھرا ہو مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ برتن ایک ... سیاہ پتھر پر رکھا تھا۔ کھوہ کے اندر کا یہ حصہ کسی غار کی ... تھا۔ ایک جانب چبوترے نما بڑے سے پتھر پر چاروں ...

چھوٹی بڑی انسانی کھوپڑیاں ترتیب سے یوں رکھی تھیں کہ ایک بڑا گول دائرہ بن گیا تھا۔ اس گول دائرے کے اندر کسی جانور کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ دفعتاً" مجھے ایک بہت ناگوار قسم کی بو محسوس ہوئی' ایسی سڑاند جیسے کہیں گوشت سڑ رہا ہو۔ بدبو کے بھبکے اوپر سے آتے محسوس ہورہے تھے پھر یہ ناگوار بو تیز جھونکے کی طرح میرے قریب سے گزر گئی۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہوا جیسے کوئی میرے بہت قریب سے گزر گیا ہے۔ وہ کون تھا اور کہاں گیا ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ذہن میں ایک گہری دھند سی چھائی محسوس ہورہی تھی پھر میں نے خود پر غنودگی سی طاری ہوتے محسوس کی' اسی غنودگی میں ایک آواز نے مجھے چونکا کر الرٹ کردیا۔ کوئی بہت آہستہ سروں میں کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔ کسی اجنبی زبان میں جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے آواز کے مخرج کے بارے میں جاننے کی کوشش کی مگر مجھے وہ آواز چاروں جانب سے آتی محسوس ہوئی۔ نہ ہی گیت کے بول میری سمجھ میں آرہے تھے البتہ اتنا میں جان چکا تھا کہ گنگنانے والی کوئی عورت ہے۔

وہ جو کوئی بھی تھی' جو کچھ بھی گا رہی تھی وہ بڑا خطرناک تھا۔ کیوں اور کیسے؟ یہ میں نہیں سمجھ رہا تھا۔ نہ میں اس وقت کی کیفیت کو پوری طرح بیان کرنے کے قابل ہوں بس مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر آہستہ آہستہ آگ سی جلنے لگی ہے۔ دھیمی دھیمی سی آنچ تھی جو رفتہ رفتہ میری پورے وجود میں پھیلتی جارہی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہی آگ گیت کے سروں پر بڑھتی جارہی ہے۔ گیت کی لے تیز ہوتی جارہی تھی۔ میرے اندر کی تپش بڑھتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ میرا پورا بدن شعلوں میں گھر گیا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی' دور دور تک صرف شعلے تھے جن کی خوفناک زبانیں میرے وجود کو چاٹ رہی تھیں لیکن ایک بات بتادوں' یہ آگ مجھے وہ اذیت نہیں دے رہی تھی جو جلنے سے ہوتی ہے بلکہ میں ایک ایسی میٹھی میٹھی تپش کی زد پر تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میرے ذہن سے ہرچیز محو ہوچکی تھی سوائے اس عورت کے جس کے ہونٹوں سے یہ ہولناک گیت ابل رہا تھا۔ پھر دو گدرائے ہوئے' نرم اور بھیگے ہونٹ میرے ذہن میں چھا گئے۔ گلابی گلابی' گدگدا دینے والے ہونٹ جیسے مجھے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ مل رہے تھے' گیت بول ادا کررہے تھے اور میرے بدن

میں انگڑائیاں سی ٹوٹ رہی تھیں۔ جن باتوں کے بارے میں' میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا تھا اس وقت میرے دماغ میں چکرا رہی تھی۔ وہ کیفیت جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی میرے وجود کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ میرے بازو کسی نرم اور گدرائے ہوئے وجود کو سمیٹ لینے کے لیے بے تاب ہوگئے تھے۔ میرا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ ان دو ہونٹوں کی قربت' گیت کے ان بولوں کا ہیجان مجھے بکھیرے دے رہا تھا۔ میرا حلق خشک ہوچکا تھا۔ سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ گو میں نے اب تک خود کو وہاں مجسم نہیں دیکھا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میں کسی غیرمرئی وجود میں تبدیل ہوچکا ہوں' نظر نہ آنے والی چیز ہیں' مگر میں وہاں ہوں۔ سو فیصد موجود ہوں۔ میں اپنی تمام کیفیت محسوس کررہا تھا۔ خوب سمجھ رہا تھا مگر میں وہاں سے نکل جانے پر' کہیں بھاگ جانے پر قادر نہ تھا۔ نہ میں اپنے ہاتھوں کو کانوں پر رکھ کر خود کو ان گیت کے سروں سے آزاد کرسکتا تھا۔ میں کسی انتہائی بے بس وجود کی طرح ہوا میں چکرانے والی ساری کیفیات' ساری تپش اور ساری ہولناکیوں کی زد پر تھا۔

میں نے بولنا چاہا۔ اس نظر نہ آنے والی عورت کو گیت گانے سے روکنا چاہا تو آواز میرے حلق سے نہیں نکلی۔ یہ تمام تر کیفیت میں زندگی میں پہلی بار محسوس کررہا تھا۔ زندگی کے بالکل ایک نئے روپ' ایک نئی کیفیت اور نئے تجربے کا ادراک ہو رہا تھا جو انتہائی کیف آگیں تھا۔ مسرور اور بے خود کردینے والا تجربہ' جو مٹھاس اور بدن میں جو سرسراہٹ اور گدگدی میں نے پہلی بار شگفتہ کو دیکھ کر محسوس کی تھی وہ تو اس کیفیت کا عشرعشیر بھی نہ تھی۔ میں پور پور اس پر کیف اور مدہوش کردینے والی کیفیت میں ڈوب چکا تھا۔ وہ ہونٹ اب بھی میرے سامنے تھرتھرا رہے تھے۔ اچانک مجھ میں ایک عجیب سا انتشار پھیل گیا۔ میں بے ساختہ ان ہونٹوں کو چھونے کے لیے لپکا۔ میں پورے غار میں چکرا رہا تھا مگر ان ہونٹوں کا لمس محسوس نہیں کرسکا۔ وہ میرے قریب تھے' میں بھی تھا مگر یوں جیسے ہمارے درمیان دور تک خلا پھیلا ہوا ہو۔ میں نڈھال ہوگیا۔ تھک گیا' میرے اعصاب چٹخنے لگے اور پھر اچانک... بالکل اچانک میں نے دو نرم و ملائم ہاتھوں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ تپتے ہوئے' لرزتے ہوئے دو ہاتھ۔ لمحہ بھر کو میں سناٹے میں رہ گیا۔ جیسے اچانک ساری دنیا تھم گئی ہو۔ یا ختم ہوگئی ہو۔

ان ہاتھوں کی حدت چہرے کے مساموں میں گھستی ہوئی میرے سینے میں پہنچ گئی تھی۔ آگ اور تپش کا ایک سمندر سا موجیں مارنے لگا تھا۔ میں جیسے زمین پر گرتا چلا گیا۔ میں نے خود کو کسی گہرے پاتال میں گرتا محسوس کیا۔ لذت آمیز بوجھل پن نے میری آنکھیں موند دیں' تمام مناظر گہرے اندھیرے میں ڈوب گئے اور ـــــ اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

———○———

"وقار ـــــ وقار الحسن ـــــ وقار ـــــ وقار" ایک آواز تھی جو کہیں دور سے آرہی تھی۔ بہت دور سے۔ کس کی آواز تھی؟ کون پکار رہا تھا' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید میں گہری نیند میں تھا یا ـــــ یا شاید میں اب بھی اسی گہرے پاتال میں تھا جہاں کی ٹھنڈک مجھے بے دم کیے ہوئے تھی۔ ٹھنڈی اور فرحت انگیز ہوا کے جھونکے مجھے گہری نیند میں لیے جارہے تھے۔ میں کچھ سننا یا سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

"وقار الحسن! آنکھیں کھولو۔" کوئی بہت قریب آگیا تھا۔ اچانک ہی یہ احساس ہوا تھا کہ وہی دور گدرائے ہوئے ہونٹ مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔ میں نے ان ہونٹوں کو پانے کی شدید خواہش محسوس کی اور آنکھیں کھولنا چاہئیں مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی نے میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی ہے۔ میں باوجود کوشش کے آنکھیں کھولنے میں ناکام تھا۔ دھیرے دھیرے میرا بدن ہچکولے لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کہیں ڈھول پیٹنے کی سی آواز ابھری' ڈھول پیٹنے کی آواز نہایت ناگوار اور بے ہنگم تھی۔ اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ میرا بدن اسی ناگوار آواز پر رقص کرنے لگا ہے۔ مجھے پکارنے والی آواز دھیرے دھیرے پھر دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ میں خود کو کشاں کشاں اس مدھم پڑتی آواز کی جانب لیے جارہا تھا۔ ڈھول پیٹنے کی آواز قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ اس آواز سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ مجھے پکارنے والی نسوانی آواز سسکیوں میں تبدیل ہوچکی تھی۔ وہ جو بھی تھی مجھے پکار پکار کر رو رہی تھی۔ میں نے خود کو بے حد مضطرب محسوس کیا۔ ڈھول کی آواز نے میرے اندر عجیب وحشیانہ سا ہیجان پیدا کر دیا تھا۔

پھر اچانک میرے سامنے کے مناظر روشن ہو گئے۔ جلتے بجھتے گئے اور میں نے اپنا دم گھٹتا سا محسوس کیا۔ سامنے درخت کی اسی کھوہ والا منظر تھا۔ انسانی کھوپڑی کے اوپر موم بتی جل رہی تھی۔ سیاہ دھات کے بنے ہوئے انسانی کھوپڑی والی شکل کے برتن میں کوئی سیال ابل رہا تھا۔ چبوترے نما اس بڑے پتھر پر کھوپڑیوں کے گول دائرے میں کسی جانور کی کھال پر سادھو بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں جو لڑکی تھی وہ بلاشبہ دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ سانولے رنگ کی اس لڑکی میں بلا کی کشش تھی۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں موتی بھرے تھے۔ گدرائے ہوئے گلابی گلابی' بھیگے بھیگے ہونٹ جواب سے پہلے مجھے بڑی لذت آمیز کیفیت سے دوچار کر چکے تھے اس کے چہرے پر موتیوں کی طرح جڑے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ریشمی جالی دار لبادے میں اس کا مرمریں جسم سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ اتنا حسین سراپا سامنے پاکر میں سادھو کی کریہہ صورت کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے اسی لڑکی کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک کھڑکھڑاتی ہوئی' کانوں کے پردوں کو چٹخاتی ہوئی اور حلق میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"وقار الحسن! آؤ ـــــ میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تم خود میری پاس آؤ گے۔"

وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت کراہیت آئی' ہڈیوں کا وہ پنجر ایک سرخ رنگ کی لنگوٹی باندھے' سیاہ لمبی ٹوپی اوڑھے' گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا ڈالے یوں بیٹھا تھا جیسے ساری دنیا کا مطلق العنان بادشاہ ہو۔ اس کا سوکھا' لمبا اور صرف ہڈیوں اور کھال پر مشتمل ہاتھ اس حسین لڑکی کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ لڑکی سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے مجبوراً وہاں بیٹھی ہو۔

"یہ دیکھو ـــــ" اس نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھا کر اس لڑکی کے شانوں پر پھیلے سیاہ بال ہٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ کامنی ہے۔ من موہنی سی کامنی' جس میں لذتوں کے دریا بہتے ہیں۔ میں اس میں بہتے دریا کا قطرہ قطرہ چکھنا چاہتا ہوں اور اس قطرے قطرے پر تمہارا مقروض ہوں۔ یہ لذتوں کا بیکراں سمندر' اس میں ٹھاٹھیں مارتا جذبوں کا طوفان' سب تمہاری ہی وجہ سے مجھے حاصل ہوا ہے۔ میری برسوں کی پہلی اچھیا تمہارے ہی دم سے پوری ہو رہی ہے۔ اسے حاصل کرنے میں مجھے بڑی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ شکتی کو تیار کرنے کے لیے مجھے تمہاری ضرورت تھی' تمہارا لہو پلانا ضروری ہو گیا تھا ورنہ اس کی آتما کا ... ان میں کشش پیدا کر رہا تھا۔ اس کا اجلا پن ... رہا تھا۔ اب وہ پالتو کتیا کی طرح میرے تلوے ... ہے یہ کامنی۔ یہ من موہنی سی کامنی اپنی لذتوں ... میرے بدن کی تمام بیت ناکیاں ختم کر دے گی۔ اب ... بھی تمہاری طرح توانا اور جوان ہو جاؤں گا۔"

وہ بول رہا تھا اور میرے وجود میں ہزاروں کیڑے سے ... رہے تھے۔ کوئی میرے دماغ کو لوہے کے شکنجے میں کستا جا رہا تھا۔ اس لڑکی نے دھیرے سے سر موڑ کر میری طرف کر لیا تھا۔ میں نے دل پر تیزاب کی بوندیں سی گرتی ... کی تھیں۔ میں نے بے ساختہ آگے بڑھنا چاہا' ایک ... سا اٹھا تھا میرے اندر جو سادھو کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ... نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا مگر میں کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا کر رک گیا۔ میں نے بولنا چاہا تو حلق میں گولے سے ... محسوس ہوئے۔

"نہیں مورکھ ـــــ نہیں' جب تک وہ کالے کپڑے میں جادو کا پتھر تیرے گلے میں ہے' تو مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ جب تک تیری انگلی میں پڑی یہ انگوٹھی تیرے پاس ہے ... اسی طرح دیواریں کھڑی کرتا رہوں گا۔ ہاں اگر تو یہ ... باہر اتار کر آئے گا تب میں تیرا سواگت کروں گا۔ ... بھی لذتوں کے دریا سے سیراب کرنے کا موقع دوں گا ... کہ تجھے بھی پتا چل سکے کہ جیون کیسا ہوتا ہے؟ کیسے بتایا ... ہے یہ جیون' شریر میں مدھ بھری لہریں کیسے جنم لیتی ... وقار الحسن! تو تو ناکارہ ہو کر رہ گیا ہے' تیرا یہ توانا جسم ... کام کا ہے جب تجھے ایسی توانائی کا ادراک ہی نہیں۔ ... ہاتھ تھام لے۔ شکتی نے تجھے اور تیری پریوار کو ... دکھ دیے ہیں' اپنے انتقام کی آگ میں جلایا ہے تجھے' ... ناں ـــــ اب تو چاہے تو میں اس سے گن گن کر بدلے ... سکتا ہوں۔ اب یہ تیری انگلیوں پر ناچ سکتی ہے۔ ... وں کا ساتھ تجھے کندن بنا سکتا ہے۔ ایسی ایسی دس ... ہاں تیرے بنجر جسم کو سیراب کر کے ان میں لذتوں کے ... ل کھلا سکتی ہیں۔"

... اس ان دیکھی دیوار کے پیچھے کسی بے بس قیدی کی ... بے چین تھا۔ اس کامنی سی لڑکی کی آنکھوں میں چمکتے ... اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ آنکھوں کی ... ہوئی پتلیوں پر خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ نہ معلوم ... مجھے اس لمحے گنگوا کے سینے پر بیٹھا وہ چاندی جیسا ... آگیا جس نے اپنا پھن دھرتی گنگوا کی گردن میں لپیٹا ہوا تھا۔ ... میں ٹھاٹھیں مارتا طوفان' بے پناہ شور اور ... انتشار میرے ٹکڑے کیے دے رہا تھا کہ اچانک ـــــ بالکل اچانک مجھے آیت الکرسی یاد آگئی۔ گو میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی' یا شاید میری زبان ہی نہیں تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے میرا جسم ہی نہ ہو مگر میرا دماغ میرے غیر مرئی وجود کے ساتھ تھا' میں سن رہا تھا' محسوس کر رہا تھا' سوچ رہا تھا اس لیے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دماغ میرے ساتھ تھا۔ میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ پوری آیت الکرسی جیسے میرے سامنے لکھی رکھی تھی۔ میری نگاہیں الفاظ پر پھسل رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ میں خود میں سکون اترتا محسوس کر رہا تھا۔ طوفان تھمنے لگا تھا' انتشار سکوت میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ اس لمحے میں نے سادھو کے حلق سے نکلنے والی غراہٹ سنی۔ وہ خونخوار نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر سفید جھاگ سا جمع ہونے لگا تھا۔ اچانک وہ اسی سانولی سلونی لڑکی کو دھکا دے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا' مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور میں لڑکھڑاتا ہوا شاید کسی گہرے کنویں میں گرنے لگا۔

———○———

وہ زبردست دھماکے کی آواز تھی جس نے میرے حواس گم کر دیے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرا سر کسی پتھریلی چیز سے ٹکرایا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولنا چاہئیں تو میری نگاہوں کے سامنے رنگین ستارے ناچنے لگے۔ شدید تکلیف اور درد کی ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوئی' میں نے گھبرا کر پلکیں موندلیں پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ سیاہ درختوں کا گھنا جنگل میرے سامنے تھا۔ میں مجسم وہاں موجود تھا۔ میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں نے پھر بھی اپنی انگلی دانتوں میں دبالی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔

"وقار ـــــ وقار ـــــ" دور سے آتی آواز نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس گھنے جنگل میں یہ آواز سن کر میں ساکت رہ گیا۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ آواز سامنے والے درخت کی کھوہ سے آئی ہے' میں اس جانب لپکا۔

میں نے جوں ہی کھوہ میں جھانکا میرے لبوں سے ایک دلخراش چیخ نکل کر سارے جنگل میں پھیل گئی۔

ِنوں پہلے دیکھا ہوا ایک خواب تعبیر بن کر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ ایک بھیانک خواب تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ میں کسی گھنے جنگل میں تنہا سفر کر رہا ہوں۔ ہیبت ناک خاموشی میرے رگ و پے میں اترتی جارہی ہے۔ فضا میں بے پناہ حبس ہے اور ذرا سی آواز بھی دھماکے سے کم محسوس نہیں ہو رہی۔ ایسے میں اچانک ہی مجھے بھاری قدموں کی آہٹ یوں سنائی دیتی ہے جیسے میرے قریب ہی کہیں بم پھٹ رہے ہوں۔ میں اس خوفناک آواز سے ڈر کر بھاگنے لگتا ہوں مگر یہ آواز اسی تسلسل سے میرا تعاقب کر رہی ہے پھر مجھے کسی کی آواز سنائی دیتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ اچانک میں ایک بہت بڑے درخت کے پاس پہنچ کر رک جاتا ہوں۔ اس درخت کی کھوہ میں سے گاڑھا اور سیاہ دھواں نکل رہا ہے۔ میں حیرت سے دیکھتا ہوں اور پھر یہ گاڑھا دھواں دھیرے دھیرے چھٹنے لگتا ہے۔ میرے تعاقب میں آنے والے قدموں کی آواز بھی اچانک تھم جاتی ہے۔ میری نگاہ کھوہ میں بیٹھی کوثر پر پڑتی ہے' پہلی نگاہ میں' میں اسے پہچان نہیں پاتا' اس لیے کہ اس کے جسم پر جوگیا رنگ کا ایک کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر بھبوت ملا ہوا ہے اور اس کے ہونٹوں کے کناروں سے لہو کے قطرے ٹپک کر اسی کی گود میں رکھے ہوئے ایک پیالے میں گر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور لب تیزی سے ہل رہے ہیں۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا ہے۔ میں اسے آوازیں دیتا ہوں مگر وہ اپنے آنکھیں نہیں کھولتی البتہ اس کے لب تیزی سے ہلنے لگتے ہیں۔ میں اسے چھو کر' جھنجوڑ کر ہوش میں لانا چاہتا ہوں اس لیے اس کے قریب جاتا ہوں اور تبھی میری نگاہ ایک کونے میں پڑتی ہے جو دور سے مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ میں وہاں شگفتہ کو الٹا لٹکا ہوا دیکھتا ہوں اور بری طرح چیخنے لگتا ہوں۔ شگفتہ شاید بے ہوش ہے۔ وہ میری آواز نہیں سنتی' میں کوثر کو جھنجوڑ دیتا ہوں۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی کوثر کا بدن شعلوں میں گھر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی پورے درخت میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں شگفتہ کی کرب ناک چیخیں سن کر اسے بچانے کی کوشش کرتا ہوں مگر یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرے پیروں کو مضبوط رسیوں سے جکڑ دیا ہے۔ میں اپنے پیروں کی طرف دیکھتا ہوں تو خوف سے بری طرح چیخنے لگتا ہوں اس

لیے کہ کئی سیاہ ناگ میرے پیروں سے لپٹے ہوئے ہیں۔ دنوں پہلے دیکھا ہوا خواب کسی فلم کی تیز چلتی ریل کی طرح میرے دماغ سے گزر گیا۔ جزئیات یاد آ... میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اس لیے کہ کوثر کا ہیولا درخت کی کھوہ سے نکلتے ہوئے گاڑھے دھوئیں میں سے دھیرے دھیرے واضح ہو رہا تھا۔ وہ بالکل اسی خواب کی طرح آنکھیں موندے' جوگیا کپڑا بدن پر لپیٹے' چہرے پر بھبوت ملے بیٹھی تھی۔ اس کی باچھوں سے خون کی ایک پتلی دھار بہہ کر ٹھوڑی تک آگئی تھی اور وہاں سے خون کے قطرے ٹپک کر اس کی گود میں رکھے پیالے میں گر رہے تھے... کے لب ہل رہے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میرے پورے وجود میں سنسنی پھیل رہی تھی۔ مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ اب آگے کے تمام مناظر بھی اسی خواب کی تعبیر کی طرح میرے سامنے آجائیں گے۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں آگے بڑھ کر کھوہ میں جھانکنے کی کوشش کروں اس لیے کہ جو آواز میں نے سنی تھی وہ سو فی صد شگفتہ کی آواز تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں یہاں وہی ہولناک منظر دیکھوں گا جو خواب میں دیکھ چکا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد سے گو مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی تھی مگر میرا روم روم کانپ رہا تھا۔ میرا یوں کھڑے رہنا بھی بے سود تھا۔ میں نے ہمت کی اور حلق کے زور سے کوثر کو پکارا مگر میں یہ دیکھ کر اور محسوس کرکے حیران رہ گیا کہ میرے حلق میں سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ کوثر اسی طرح آنکھیں موندے بے خبر بیٹھی تھی۔ اب آہستہ آہستہ اس کا بدن جھوم رہا تھا۔ اس کے لمبے بال بھی آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا' تبھی میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی ہے۔ شاید آہٹ ہوئی تھی یا شاید یہ میرا وہم تھا' میں نے پلٹ کر دیکھا' وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود یہ احساس شدت اختیار کرگیا کہ... ہے۔ اس احساس کے شدید ہوتے ہی میں نے خود میں بجلیاں سی کوندتی محسوس کیں۔ بدن میں بے پناہ قوت کا احساس ہوا' اب سے چند لمحے پہلے والی کیفیت ختم ہو گئی اور مجھ میں ایک عجیب سے ہیجان نے کروٹ لی۔ میں ارادہ و بے اختیار آگے بڑھا۔ اب میں کوثر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ اس کونے میں پڑی جہاں شگفتہ کی موجودگی متوقع تھی مگر وہاں بکری کے ایک

بچے کو الٹا لٹکا دیکھ کر مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ کوثر کی گود میں رکھا ہوا پیالہ جس میں اس کی باچھوں سے ٹپکنے والا خون بھر رہا تھا' اب بھی آدھا خالی تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس پیالے پر ایک زوردار لات ماری اور اس کے ساتھ ہی مجھے لگا جیسے پورے جنگل میں بھونچال آگیا ہے۔ جیسے درندے اور چرند ایک دم چنگھاڑنے لگے ہوں۔ بہت تیز ہوائیں چلنے لگی ہوں اور بہت سی عورتیں بین کر رہی ہوں۔ بین کرنے والی ان آوازوں میں کوثر کی آواز واضح اور بلند تھی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان پھر گاڑھا دھواں پھیل گیا تھا۔ وہ اس بری طرح چیخ رہی تھی جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہو۔ میں گاڑھے دھوئیں کی دبیز چادر کو چیرتا ہوا اس کھوہ میں داخل ہوگیا۔ وہ بکرا جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے جونہی اسے ہاتھ لگایا' بے ساختہ چیخ اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کسی تپتے ہوئے انگارے کو چھولیا ہو۔ میں اچھل کر پیچھے ہوگیا تھا اور پھر میری آنکھوں میں دھواں بھر گیا۔ دھواں آنکھوں میں بھرتے ہی میں نے چاروں جانب اور اپنے اندر بھی گہرا سکون محسوس کیا۔ ایک عجیب سا سناٹا' حبس اور گھٹن تھی جو گہری ہوتی جارہی تھی۔

○

"وقارالحسن!" اماں کی سرگوشی قریب ہی گونجی تھی۔ میں نے جھٹ آنکھیں کھول دیں اور پھر اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اماں میرے چہرے پر جھکی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں جھٹکے سے اٹھتے دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ "وقارالحسن! کیا بات ہے؟" انھوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

مگر میں ان کی بات ان سنی کرکے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں گھر میں تھا۔ اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر پہلے تو میں حیرت زدہ رہ گیا مگر جلد ہی مجھے یاد آگیا کہ میں ابھی یہاں لیٹا تھا۔ میں سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا جب اچانک کوثر کا سراپا میری نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ گویا اب تک جو کچھ میں نے دیکھا وہ خواب تھا یا میرے طاقتور تصور کا شاخسانہ تھا۔ اماں اب بھی حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں اماں! سب ٹھیک ہے۔" اتنا بولتے ہوئے میرا حلق خشک ہوگیا۔ محسوس ہوا جیسے میری زبان موٹی ہو کر کھردری ہوگئی ہے۔ میں نے اماں سے اشارے سے پانی مانگا۔ اماں لپک کر کٹورا بھر لائیں۔ پانی پی کر مجھے کچھ سکون ہوا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔

"اماں کیا بجا ہوگا؟" میں نے آستین سے ہونٹوں پر لگا پانی صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"تیسرا پہر ہے۔ میں تہجد پڑھ کر اٹھی ہوں۔ تم کراہ رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ۔۔۔"

"شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!" وہ میری پائنتی کو بیٹھ گئیں۔

"جی اماں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"بیٹا وقار۔ میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ حالات پتا نہیں کیا رخ اختیار کرتے جارہے ہیں۔ میری مانو تو یہاں سے کوچ کرو۔ یہاں آکر تو ہم ایک نئے مسئلے میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ بچیوں کا ساتھ ہے' ڈر لگتا ہے کہ کچھ الٹا سیدھا نہ ہو جائے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں۔۔۔ ہم جلد از جلد امروہہ چلے جائیں گے۔ میں صبح تایا سے بات کرلوں گا۔"

میری بات سن کر اماں کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ مجھے اس لمحے ان پر بہت پیار آیا۔ شدت سے احساس ہوا کہ اماں محض میری وجہ سے خود پر جبر کیے ہوئے تھیں۔ وہ شاید باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں مگر میں گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ جاننا چاہتا تھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا تھا' وہ خواب تھا یا حقیقت؟ میں تھکا تھکا لیٹ گیا۔ مجھے یوں نڈھال دیکھ کر اماں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی مسہری پر جا بیٹھیں۔

جو کچھ میں دیکھ چکا تھا وہ کچھ بھی ہو مگر میری پریشانی دوچند کر چکا تھا۔ مجھے شگفتہ کی طرف سے بے پناہ پریشانی ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ کوثر' شگفتہ کو میری راہ سے ہٹانے کے لیے اپنا کام شروع کر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کو تسخیر کرنے کا ارادہ تو اس کا نہ ہوگا۔ وہ عورت تھی' سب سے پہلے اپنی خواہشات کی تکمیل چاہے گی' بہرحال سادھو اور اس کی خواہشات یا مقصد حیات میں فرق تھا۔ میں شگفتہ کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت معصوم ہے۔ شرف الدین کو کچھ بتانے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی پریشانی میں اضافہ کردیا جائے۔ جو کسی طور مناسب

نہیں تھا۔ کم از کم میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بات ان لوگوں تک پہنچے بھی نہیں اور کام بھی بن جائے۔

امروہہ پہنچ کر فوراً ہی شگفتہ سے نکاح کر کے گھر لے آنا بھی کوئی آسان بات نہ تھی۔ میں ایسا کرنے کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کچھ بتا دینا گویا شرف الدین کے باوا کو خبردار کرنا ہوتا کہ وہ شادی ہی سے انکار کر دیتے۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ میں امروہہ جا کر کسی بھی طرح شگفتہ سے ملوں۔ اسے تمام صورتحال بتا دوں اور پھر اس کا ردعمل دیکھنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں۔ یہی بات معقول محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں صبح ہی تایا سے بات کروں گا۔ اس فیصلے نے گویا مجھے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا مگر میرا دل اب بھی اس کی جانب سے پریشان تھا۔ میں خدا سے اس کے لیے دعا مانگنے لگا پھر اچانک ہی میرے دل میں ایک خیال آیا کہ میں اسے محفوظ کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہوئے بھی تو کوشش کر سکتا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے وضو کیا اور مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تہجد کی نماز ادا کی، خدا سے رحم اور رحمت کی اپیل کی پھر میں نے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ کر شگفتہ کا تصور باندھا۔ اس لمحے یوں لگ رہا تھا جیسے میں یہ سب کچھ غیر ارادی طور پہ کر رہا ہوں۔ کوئی ایسی قوت تھی جو مجھ سے یہ سب کچھ کروا رہی تھی۔ شگفتہ کا تصور بھی بڑا طاقت ور تھا۔ میں نے اسے پلنگ پر بے سدھ سوتے ہوئے دیکھا۔

اس کے کھلے ہوئے لمبے بال، پلنگ کے سرہانے پر پھیل کر نیچے تک لٹک رہے تھے۔ چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اس کا سر دائیں جانب ہلکا سا خم کھایا ہوا تھا۔ خوب صورت سنہرے رنگ کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس کے گدرائے ہوئے ہونٹ نم تھے، میری حالت عجیب سی ہونے لگی۔ اس کا تصور طاقت ور ہونے کے باوجود بار بار میری نگاہوں میں وہ ہونٹ لرز رہے تھے جنھیں میں اب سے قبل دیکھ چکا تھا۔ میں شگفتہ کے سراپے کو بار بار ذہن میں لاتا اور ان زہریلے ہونٹوں کے تصور سے جان چھڑانے کے لیے سر کو جھٹکے دے رہا تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے وہ وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا جو سنہرے بابا نے حصار باندھنے کے لیے بتایا تھا۔ میں نے شگفتہ کے گرد حصار باندھنا شروع کر دیا تھا۔

جوں جوں میں وظیفہ کرتا جا رہا تھا، شگفتہ کا سراپا میرے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں میں نے اسے بے چینی سے کروٹیں لیتے ہوئے دیکھا۔ کئی بار وہ نیند میں کراہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے شدید تکلیف ہو۔ میرا دل لرزنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا، مجھے یقین تھا کہ میرے حصار باندھنے پر اسے تکلیف نہیں ہو سکتی۔ گمان تھا کہ شاید کوثر اسے تکلیف پہنچا رہی ہو۔ وہ قطعی نہیں چاہے گی کہ میں اس کے عمل میں مداخلت کروں۔ وہ اس سے غافل ہو گی نہ مجھ سے، اسے یقیناً علم ہو چکا ہو گا کہ میں یا کوئی اور شگفتہ کو اس کی دسترس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے وظیفہ پڑھنے کا عمل تیز کر دیا۔ میں جلد از جلد اسے تکلیف سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ وہ وظیفہ طویل نہ تھا۔ شاید بیس منٹ بعد ہی میں اختتام کے قریب پہنچ گیا، چند لمحوں بعد میرا عمل پورا ہونے والا تھا، پھر جو ہی میں نے وظیفہ ختم کیا، شگفتہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ الٹے ہاتھ میں جکڑ لیا تھا اور وحشت ناک نگاہوں سے انگلیوں کو دیکھ رہی تھی، پھر میں اس کی زخمی انگلی دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس کی ایک انگلی سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، پھر بھی ایک اطمینان تھا جس نے مجھے ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے گرد ہلکی سی روشنی کا ہالہ دیکھا تھا۔ وہ محفوظ ہو گئی تھی۔ اس کی انگلی زخمی ضرور ہو گئی تھی مگر اب وہ محفوظ تھی۔ وہ اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے انگلی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ستارہ سی آنکھوں میں خوف بھی اتنا خوب صورت لگ رہا تھا کہ میں پلکیں جھپکے بغیر اسے تکتا رہا۔ اس کی حالت دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ چونک گئی ہو۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ یوں جیسے اس نے میری ہنسی کی آواز سن لی ہو۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ اپنے بستر سے اتر کر اماں کے پلنگ کے قریب پہنچ گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر اور جان کر شدید حیرت ہوئی کہ میں نہ صرف ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا بلکہ ان کی آوازیں بھی سن رہا تھا جبھی تو اس کی کانپتی ہوئی آواز سن کر اچھل پڑا۔

"اماں۔ اماں جان ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے [illegible] لرزتے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز کا ارتعاش میرے پورے وجود میں سنسناہٹ سی بھر گیا تھا۔ "کوئی۔ کوئی ہے اماں، یہاں پر کوئی ہے۔" اب اس نے اپنی اماں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"شگو۔ شگو۔ باؤلی ہوئی ہو کیا۔؟ بھلا بند کمرے میں کون ہو سکتا ہے؟ کوئی خواب دیکھا ہو گا تم نے۔ آؤ ہمارے پاس آ جاؤ۔" وہ ایک طرف سرکتی ہوئی بولیں۔

"نہیں اماں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ یہ دیکھئے ہمارا ہاتھ۔ انگلی زخمی ہو گئی ہے ہماری۔" اس نے انتہائی معصومیت سے اپنا دایاں ہاتھ ان کے سامنے کر دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔

"ارے۔ ہائیں یہ کیا ہوا؟ یہ تو لگتا ہے کہیں چھلی گئی ہے۔ شگفتہ تم کیا کر رہی تھیں۔ دیکھو سچ بتاؤ۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔"

"جی اماں ہم جھوٹ کیوں بولیں گے بھلا آپ سے؟ ہم سو رہے تھے۔ پتا نہیں کیا ہوا ایک دم لگا جیسے کسی نے انگلی دانتوں میں داب کر کچل دی۔"

"اے ہے لڑکی! تم نے تو ہمیں ہولا ہی دیا ہے۔" وہ اپنا ململ کا دوپٹا گھسیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے گھبرا کر اچھا مارا تھا۔ اس کمرے میں شرف الدین کے باوا نہیں تھے۔ دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ شگفتہ اب بھی سکڑی ہوئی اپنی اماں سے پلنگ پر بیٹھی انھیں سارے کمرے میں چکراتے دیکھ رہی تھی۔

میں خود بھی جاننا چاہتا تھا کہ آخر شگفتہ کی انگلی زخمی کیسے ہو گئی اسی لیے اس تصور کو توڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ میری نگاہیں شگفتہ کی اماں کے ساتھ ساتھ پورے کمرے میں چکرا رہی تھیں۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" اماں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"اماں کوئی ہنسا تھا۔ ہم نے خود سنا تھا۔ ایمان سے اماں۔" وہ اپنی معصوم، خوب صورت اور حیران حیران سی آنکھیں پھاڑے اپنی بات پر اصرار کر رہی تھی۔

"ہمارا تو دل ہول رہا ہے۔ پروردگار رحم کرے۔ ٹھہرو وضو کر لیں۔" وہ یہ کہتی ہوئی باہر جانے لگیں۔

"اماں ہم بھی چلیں۔ یہاں تو ڈر لگے گا۔" شگفتہ گھبرائی لہ[illegible]

"ہاں آ جاؤ۔"

اتنا کہہ کر وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ میری نگاہیں اب بھی ان کے تعاقب میں تھیں۔ گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ شرف الدین کے باوا باہر والے کمرے کے دروازے کے قریب پلنگ ڈالے سو رہے تھے۔ دونوں ماں بیٹی نے وضو کیا پھر دونوں واپس کمرے میں چلی آئیں۔ اب تک کوئی ایسی انہونی بات میرے سامنے نہیں آئی تھی جس سے میں کوئی اندازہ لگا سکتا۔ اس کے باوجود نہ معلوم کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ حرکت کوثر ہی کی ہو سکتی ہے۔ سادھو سے مجھے ایسی کسی حرکت کی توقع نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب لذتیں کشید کرنے میں اپنا وقت برباد کر رہا ہو گا۔ اسے واقعی مجھ سے کوئی دشمنی تو تھی نہیں، جس چیز کی خاطر اس نے میرا پیچھا پکڑا تھا وہ انھیں حاصل کر چکا تھا۔ میں نے اب تک اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ جنگ شروع ہوتی اسی لیے اس سے بھی مجھے فی الحال کسی ایسی حرکت کی توقع نہ تھی۔

دونوں ماں بیٹی مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئیں تو میں نے ان سے رابطہ منقطع کرنے کا ارادہ کیا، اور اس ارادے کا خیال آتے ہی میرا ان سے رابطہ ختم ہو گیا۔

میں چند لمحوں تک جیسے خلا میں معلق رہا پھر پورے ہوش و حواس میں آ گیا۔ میں نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ میں اپنے بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ ایک عجیب و غریب بات جو میں نے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ ایسی کسی بھی کیفیت کے بعد میرا سانس یوں پھول جاتا تھا جیسے میں ایک طویل مسافت طے کر کے واپس آیا ہوں۔ بہرحال بلا ارادہ کوئی تصور باندھنے اور پھر اس ارادے کے بعد عمل کرنے سے ایک بات مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی کہ میں واقعی حیرت انگیز قوتوں کا مالک بن چکا ہوں۔ یہ قوتیں اگر مجھ میں پہلے سے موجود تھیں تو میں ان کی موجودگی سے اب تک ناواقف تھا، اور اگر یہ قوتیں وظائف کے بعد حاصل ہوئی تھیں تو مجھے سنہرے بابا کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال یہ جان کر میں کس قدر حیرت زدہ اور کس حد تک خوش تھا اس کا اندازہ آپ یقیناً لگا سکتے ہوں گے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ میں صرف ارادہ باندھنے کے بعد میلوں دور بیٹھے لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ میں جان سکتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت تھی جس کا مثبت استعمال مجھے کہیں

سے کہیں پہنچا سکتا تھا اور اسی قوت کا منفی پہلو بہت خوفناک اور ہولناک تھا۔ میں چاہتا تو اس قوت کو غلط طریقے سے بھی استعمال کر سکتا تھا اور اس بات کا قوی امکان بھی تھا اس لیے کہ میں جس عمر میں لمحے گزار رہا تھا وہ تجسس سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس عمر میں آدمی وہ بہت سی باتیں جاننا پرکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے جنھیں شعور آنے سے پہلے دیکھا یا سنا ہو مگر سمجھا نہ ہو۔ پل میں بہک جانے والی عمر بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اس وقت میں نے جس طرح بے دھڑک شگفتہ کا تصور باندھا تھا' وہ قطعی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ رات کا وقت تھا' وہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی جو سر پر دوپٹا ڈالے بغیر کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی' اسے میں نے بے خبر اور بے نیاز بکھرا ہوا دیکھا تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اس وقت تو خیر مجبوری تھی۔ مجھے کوثر کی طرف سے شدید رد عمل کا خطرہ تھا اس لیے ایسا ہو گیا مگر آیندہ میں احتیاط کروں گا۔

یہ سب کچھ بتانے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں اپنے آپ کو بڑا نیک' بڑا با اخلاق اور شریف آدمی بنا کر پیش کرنا چاہتا ہوں' نہیں۔ ایسا نہیں تھا اس لیے کہ آگے بڑھنے والی کہانی میں آپ جان جائیں گے کہ مجھ سے کیسے کیسے گناہ سرزد ہوئے' میرے بھٹکے قدم مجھے کس طرح میری منزل سے دور کر گئے تھے۔ یہ سب بتانے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اس عمر میں واقعی بڑا شریف تھا یا آپ مجھے بدھو ہونے کی حد تک سیدھا کہہ سکتے ہیں۔ اسے آپ لوگ اماں ابا کی تربیت کا ثمر کہہ لیں۔ مجھے اخلاقیات کا جو سبق پڑھایا گیا اور سکھایا بلکہ رٹایا گیا تھا اس کی جڑیں میرے لاشعور میں بہت گہری تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اب تک باہر کی دنیا میں قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ حویلی ہی میں ان چکروں میں پھنس گیا تھا اور اب تک پھنسا ہوا تھا۔ شگفتہ نے جو میرے بنجر وجود میں نمی پیدا کی تھی تو وہ بھی ایک خاص عمر میں جنس مخالف کی طرف قدرتی بلکہ فطری جھکاؤ کی بنا پر تھا۔ یہ باتیں آج میری سمجھ میں خوب اچھی طرح آچکی ہیں۔ شگفتہ کی صورت میں جو کشش مجھے مقناطیس بنا گئی تھی وہی جذبوں کی شدت کی وجہ سے اسے بے پناہ محبت میں بدل گئی تھی۔

———○———

ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ شگفتہ کی طرف سے مطمئن ہو کر میں ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ تھکا دینے والی اس کیفیت کی بنا پر مجھے جلد ہی گہری نیند آگئی۔ ایک ہی رات میں دو مختلف سمتوں کے اس ذہنی سفر نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا تھا اس لیے میں سویا تو دھوپ چڑھے ہی آنکھ کھلی۔ اماں نے مجھے فجر کے وقت بھی نہیں اٹھایا جب میں نے اس سلسلے میں اماں سے استفسار کیا تو انھوں نے بتایا کہ گھر کے سبھی افراد نے کوشش کی تھی مگر تم اس قدر بے ہوش تھے کہ کروٹ بھی نہ لی پھر تایا کے منع کرنے پر اماں نے مجھے سوتا چھوڑ دیا۔

میں نے اٹھ کر' نہا دھو کر پہلے فجر کی قضا نماز ادا کی' ناشتا کیا پھر تایا کے پاس جا بیٹھا۔ اماں تائی کو بہلا پھسلا کر نہانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جہانی آپا کچے صحن میں پلنگ بچھا کر' بالٹی میں پانی' صابن کی ٹکیا اور ڈونگا لیے بیٹھی تھیں اور اماں سے کہہ رہی تھیں۔

"اماں چھوڑیں آپ۔ اگر تائی نہانے کو تیار نہیں تو آپ کسی بہانے یہاں لے آیئے۔ میں یہیں ان کا سر دھلا دیتی ہوں۔ بالوں کا حشر تو دیکھیں' لٹیں بن گئی ہیں میل سے چکٹی ہوئی۔"

میں تائی کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب سی چمک محسوس ہوتی تھی۔ وہ بار بار اماں کو جھڑک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں اب بھی چند کتابیں تھیں جنھیں وہ غالباً" کوثر کے کمرے سے اٹھا لائی تھیں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں اٹھ کر تائی کے قریب چلا آیا۔ "تائی! یہ کتابیں کوثر کی ہیں؟"

"اچھا بس بس۔ رہنے دو تم۔ پتا ہے مجھے۔" انھوں نے ناگواری سے جواب دیا۔

"تائی! ان کتابوں میں بہت اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ لایئے میں آپ کو سناؤں۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میرا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھتے ہی تائی نے کتابیں دونوں ہاتھوں سے چھپا لیں۔ چند لمحے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں کہ وہ اچانک خوش ہو گئیں اور بولیں۔ "اس میں لکھا ہے ناں کہ کوثر کہاں ہے۔"

"ہاں۔ لایئے میں آپ کو پڑھ کر سناؤں۔"

اس بار انھوں نے جلدی سے ساری کتابیں میری جانب

...کا دیں اور خود ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"چلیں وہاں پلنگ پر لیٹ جائیں۔ میں سناتا ہوں۔"

میں نے بہانے بہانے سے انھیں پلنگ پر لٹا دیا۔ جہانی آپا نے ...ی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ تمام باتوں سے بے خبر ...ی طرف متوجہ تھیں۔ میں نے ایک کتاب کھولی اور خود ...کہانی بنا کر سناتا چلا گیا۔ اس میں' میں نے کچھ ایسی باتیں ...ڑ سے منسوب کر دیں کہ وہ انھیں سن کر خوش ہوتی ...یں۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں ان کے لاشعور میں بیٹھا ...ف نکال دوں کہ کوثر کسی پریشانی میں ہے یا انھیں چھوڑ کر ...گئی ہے بلکہ میں نے یہ بتایا کہ وہ گھر میں موجود ہے بھلا ...نے ماں باپ کو چھوڑ کر کہیں بھی کیسے جا سکتی ہے۔ بس ...سرار علوم کی وجہ سے وہ کچھ دنوں کے لیے ہم سب کی ...ہوں سے پوشیدہ ہو گئی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتی اور سنتی ...ہے۔ بہت باحیا اور شریف لڑکی ہے اور ایسی ہی بہت سی ...یں میں انھیں یوں سناتا چلا گیا جیسے یہ سب کچھ کتاب میں ...ا ہے۔

میں جوں جوں یہ سب بتاتا جا رہا تھا' ان کے چہرے پر بے پناہ خوشی اور اطمینان کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ...تھے۔ اس دوران میں جہانی آپا نے ان کا سر دھلا دیا' پھر ...ان انھیں ناشتا کرانے لگیں۔ ان سے کوئی بات منوانا ہو' ...میں سلانا ہو' کھلانا یا پلانا ہو کوثر کا حوالہ دینا ضروری ہو ...یا تھا ورنہ وہ کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہ ہوتی تھیں۔ یہ ...کر کہ کوثر نے کہا ہے کہ جلدی سے ناشتا کر کے بستر پر ...ٹ جائیں' وہ جلدی جلدی ناشتا کر کے لیٹ جاتی تھیں۔ ...انے بتایا تھا کہ حکیم صاحب نے انھیں زیادہ سے زیادہ ...رام کرنے اور سونے کو کہا ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ ان ...کے منتشر ذہن کو مکمل آرام کی ضرورت تھی۔

اماں کو ان کے ساتھ مصروف دیکھ کر میں وہ تمام کتابیں ...لے تایا کے پاس آبیٹھا۔

"بڑی بھاگوان ہے یہ عورت۔" تایا میرے بیٹھتے ہی ...گہری سانس لے کر بولے۔ "خوشی تو ساری سمیٹ لی ...کہ غم پڑا ہے تو دنیا سے ہی بیگانہ ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا ...سب کچھ برداشت کرنے کو۔" ان کے لہجے میں بے پناہ ...درد تھا کہ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

"تایا! ہمارے ہوتے ہوئے بھی آپ خود کو اکیلا محسوس ...کرتے ہیں؟" میں نے شکوہ کیا۔

"آدمی کے ساتھ ایک یہی تو بڑا المیہ ہے وقار الحسن! وہ بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی بہت اکیلا ہوتا ہے۔ اتنا بے بس' ایسا لاچار کہ۔۔۔"

"تایا! آپ تو بڑی ہمت والے تھے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" میں نے اپنے حلق میں گھلتے ہوئے نمک کو نگلتے ہوئے کہا۔

"ارے بؤا۔" انھوں نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "اولاد نہ ہو تو بھی دکھ دیتی ہے اور ہو تو بھی۔ نہ ہونے کے دکھ بھی اتنے ہی شدید ہوتے ہیں جس قدر اس کے ہونے کے دکھ ہو سکتے ہیں۔"

"تایا۔ آپ تو جانتے ہیں ناں کہ وہ کیوں چلی گئی ہے پھر۔"

"یہ کتنی بے بسی کی بات ہے وقار الحسن!" انھوں نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "کہ ایک باپ' جس کی بیٹی معذور تھی' رو رو کر خدا سے اس کی صحت یابی کی دعا کرتا رہا' اس سے خوشیوں کی بھیک مانگتا رہا اور اب۔ جبکہ اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا تو۔ تو آج پھر وہی بدنصیب شخص خدا سے معافیاں مانگ رہا ہے کہ کاش۔ تو نے میری دعا قبول نہ کی ہوتی۔ میری بیٹی تمام عمر معذور ہی رہتی۔ سچ ہے وقار الحسن کہ خدا بقدر برداشت ہی دکھ دیتا ہے۔ یہ تو بندہ ہی ناشکرا ہے کہ اپنی دعاؤں کی قبولیت سے سروکار رکھتا ہے' یہ جانے بغیر کہ خدا نے دعا قبول کر لی تو کیا ہو گا۔ آگے کا حال تو وہی جانتا ہے ناں۔ اسی لیے تو انسان کے بھلے کو دکھ سکھ دیتا ہے مگر۔۔۔"

اور اس وقت مجھے اپنے کورس کی کتاب میں لکھی وہ کہانی یاد آگئی جس میں لوگ روتے چیختے رہتے ہیں کہ ہمیں یہ دکھ' یہ بیماری یا یہ پریشانی کیوں دے دی خدا نے' تب خدا سب کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیتا ہے۔ سب لوگ ایک میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک کو درد قولنج کی تکلیف ہے تو دوسرا کبڑا ہے اور ہر دو اپنی اس مصیبت سے نجات پانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دوسری کوئی تکلیف دے دے مگر یہ ہم سے لے لے۔ خدا ان کی دعائیں قبول کر لیتا ہے اور ان کی مصیبتوں کو ایک دوسرے میں بانٹ دیتا ہے۔ کبڑے کو درد قولنج دے دیتا ہے کہ وہ سوچتا تھا۔ "مجھ سے اچھا تو یہ ہے۔ کم از کم لوگ اسے کبڑا تو نہیں کہتے اور درد قولنج والا اپنے درد سے نجات پانے کو کبڑا پن

برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ جب یہ ساری مصیبتیں خدا دوسری مصیبتوں سے بدل دیتا ہے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ پھر رونے چیخنے لگتے ہیں کہ خدایا ہم باز آئے۔ ہماری وہی مصیبتیں ٹھیک تھیں کہ قابل برداشت تو تھیں۔ تب خدا کہتا ہے کہ میں جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس وقت تایا کی وہی کیفیت تھی۔ انھوں نے یقیناً اپنی بیٹی کی معذوری سے نجات کی دعائیں مانگی ہوں گی مگر اب وہ صحت مند ہوئی تو ایسا گھاؤ لگا گئی جو ناقابل برداشت تھا۔

"تایا! آپ کا حوصلہ' آپ کی قوت برداشت تو ہمارے لیے مشعل راہ تھی۔ میں تنہا جن عذابوں سے گزر گیا اس کا حوصلہ بھی تو آپ ہی نے دیا تھا پھر ویسے بھی تقدیر کے لکھے میں ردوبدل انسان کے بس میں کہاں ہے۔ جو دکھ خدا نے اب دیا ہے' اس کا حوصلہ بھی تو عطا کیا ہوگا تایا۔ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ کوثر کو واپس لاؤں گا۔ آپ مجھ پر بھروسا اور خدا کی ذات سے امید رکھیں تایا۔"

"ہاں بیٹا! اب اور کچھ دل میں رکھنے کو رہا ہی کہاں ہے۔ خدا تمھیں ہمت دے۔" تایا نے دم توڑتی آواز میں کہا۔

میں نوٹ کر رہا تھا کہ جہاں تایا اس سانحے کے بعد دوسری بہت سی باتوں سے گریزاں رہنے لگے تھے وہاں انھوں نے حقہ پینا بھی کم کر دیا تھا۔ پتا نہیں اس کی کیا وجہ تھی؟ بہرحال میں اس خیال کے تحت کھڑا ہو گیا۔

"تایا! چلم بھر دوں' حقہ پئیں گے آپ؟"

انھوں نے خالی خالی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"آں۔ ہاں۔ وقار الحسن! جو چلم تمھاری تائی بھر کے دیتی تھیں ان میں انگاروں کے سوا ان کے لہجے کی تپش بھی ہوتی تھی۔ اسی لہجے کی تپش سے تو نشہ آتا تھا۔ جھنجلا جھنجلا کر' بڑبڑاتے ہوئے چلم میں انگارے بھرنے کا انداز' چنگاریاں سی اڑا دیتا تھا۔ میرے خیال میں اب کبھی حقے میں وہ مزہ نہیں آئے گا جو پہلے آتا تھا۔"

"تایا! کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ خود کو نارمل کریں۔ تائی سے فرمائش کر کے تو دیکھیں' شاید۔ شاید اسی طرح وہ لوٹ آئیں۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے ذہن پر چھائی دھند صاف کر دیں۔"

میری بات سن کر تایا چونک اٹھے تھے۔ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر انھوں نے گردن موڑ کر تا[ئی کی] طرف دیکھا جو اب بھی پلنگ پر خاموش لیٹی تھیں اور [شنو] آپا ان کے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ تایا کی [نگاہیں] تائی کے بالوں میں اٹکی رہ گئیں۔ میں نے تایا کی آنکھوں میں اس لمحے چنگاریاں سی بکھرتے دیکھی تھیں یا شاید [آنکھوں] سے ستارے ٹوٹ گئے تھے۔ تائی کے بال اس عمر میں [بھی] بہت گھنے اور لمبے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بات [تایا کو] گدگدا دیا کرتے ہوں گے۔ عمر کے میٹھے دور میں ان [کے] سیاہ لمبے بالوں میں دل اٹکا رہ گیا ہوگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید وہ لوٹ آئے' ورنہ جانے [کتنا] عرصہ یوں بے بسی میں اور اکیلے پن میں کاٹنا پڑے گا۔" [وہ] خود کلامی کے انداز میں بولے۔

میں اٹھ کر تائی کے قریب چلا گیا۔ میں نے انھیں [بتایا] کہ تایا بلا رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بات سن کر سر جھکا[کر] منہ پھیر لیا۔ تایا ہماری ہی طرف متوجہ تھے۔ تائی کا رد[عمل] دیکھ لینے کے بعد میری ہمت نہ ہوئی کہ میں تایا کے پا[س] جاتا۔ خود میرے دل میں کانٹا سا چبھ کر رہ گیا تھا' ان [کے] سارے زخم ہی رسنے لگے ہوں گے۔ میں کتابیں کوثر [کے] کمرے میں رکھنے کے بہانے وہاں سے ہٹ گیا۔

کوثر کا کمرا ویران تھا۔ اس کمرے میں ایک پلنگ پر [پڑی] معذور لڑکی اس کمرے کی رونق تھی۔ یہ کتنی عجیب سی با[ت] تھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ کوثر کی ان باتوں کا پتا چلنے [پر] میں نے اسے روکا کیوں نہیں' بلکہ الٹا اسے اپنی مدد [پر] اکسایا۔ کاش میں اس وقت آنے والے لمحوں کی سنگینی محسوس کر لیتا لیکن مجھے بھی تو ایسا گمان نہ تھا کہ کوثر جیسی لڑکی کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ مجھے تایا سے امرو[ہہ] جانے کی بات کرنا تھی مگر میں ہمت نہ کر سکا تو شام کو با[ت] کرنے کا فیصلہ کر کے' اماں سے شرف الدین کے گھر جانے کی اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ میں اسے امروہہ [کے] پروگرام سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ [تایا] سے بات کرتے ہوئے وہ بھی میرے ساتھ ہو۔ وہ میری حمایت کرے گا تو تایا کو قائل کرنا مشکل نہ ہوگا ورنہ میرا خیال تھا کہ وہ ان حالات میں یہاں سے کہیں جانے کو تیار نہ ہوں گے۔ میں فرقان کے گھر پہنچا تو شرف الدین وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا مگر وہ بہت مرجھایا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا کیا ارادہ ہے تو اس [کے چہرے] پر بشاشت پھیل گئی۔ وہ فوراً تایا سے بات کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

○

اسی شام میں نے تایا کو اپنے پروگرام کے بارے میں [بتا]یا۔ وہ خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے' پھر دھیمے سے [بو]لے "وقار الحسن! وہ یہاں نہیں ہے مگر لوٹ کر یہیں [آئے گ]ی۔ ہر رات کی صبح یہی سوچ کر اٹھتے ہیں کہ شاید اسے [ہم]اری محبت کا خیال آ جائے۔ شاید وہ باہر کے ہنگاموں سے [گھ]برا کر لوٹ آئے۔ کسی بھی وقت اسے اپنی بوڑھی ماں کا [خی]ال آ جائے۔ اب تو یہی ہمارے جینے کی آس ہے وقار [الح]سن! یہاں سے چلے گئے تو جینے کی یہ آخری آس بھی ختم [ہو] جائے گی۔"

"تایا! وہ جس ارادے سے گئی ہے اسے پورا کیے بغیر [اس]ں کی واپسی ممکن نہیں ہے۔ میں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ [کہ]اں ہے اور کیا کر رہی ہے۔"

میری بات سن کر تایا اچھل پڑے۔ "کک۔ کیا۔ تم [جا]نتے ہو اور تم نے۔"

"نہیں تایا' میں نے قصداً" یہ بات آپ سے نہیں [چھ]پائی۔ میرے جاننے کا وہ مطلب نہیں جو آپ لے رہے [ہی]ں۔" پھر میں نے انھیں آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ میں [نے اس]ے کہاں' کب اور کیسے دیکھ چکا ہوں۔ میری تمام بات سن [ک]ر تایا کے علاوہ شرف الدین کا بھی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ [دو]نوں پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہے تھے۔

"بیٹا۔ بیٹا مجھے لے چلو اس کے پاس۔ اسے اس کی ماں [کا] واسطہ دے کر لے آؤں گا میں۔" وہ ہولے ہولے [لر]زنے لگے تھے۔

"تایا! یہ کام مجھے کر لینے دیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ [میر]ے ساتھ امروہہ چلے چلیں۔ آپ لوگوں کی طرف سے [بے] فکر ہوں گا تو اس کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ ابھی تو [مجھ]ے وہ جنگل تلاش کرنا ہے۔ درخت کی وہ کھوہ تلاش کرنا [ہ]ے۔ اس کے دل پر پھیلی سیاہی ہٹا کر اسے اتنی جلدی [وا]پس آنے پر آمادہ کرنا آسان نہیں ہے تایا۔"

میں نے ان کی منت کی۔ ایک بات یہاں واضح کر دوں [ک]ہ میں نے جو کچھ ان دونوں کو بتایا تھا اس میں شگفتہ کا ذکر [نہیں] کیا تھا۔ نہ ہی انھیں یہ بتایا تھا کہ وہ سب سے پہلے [مجھ]ے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہے۔

اس طرح جہاں تایا کو اس کا ذہنی گھٹیا پن دیکھ کر افسوس ہوتا وہاں وہ اپنی بیٹی کی اس بیباکی کی وجہ سے میرے سامنے شرمندہ بھی ہوتے۔ دوسری طرف شرف الدین کی غیرت کو بھی دھچکا لگتا اسی لیے یہ سب بتانا قطعی مناسب نہ تھا۔

پھر میں نے اور شرف الدین نے کسی نہ کسی طرح تایا کو قائل کر لیا۔ میں نے انھیں بتا دیا کہ ان کی امروہہ میں موجودگی میرے لیے ڈھارس ہوگی اور میں پوری یکسوئی کے ساتھ ان عذابوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کروں گا۔ تایا نے مجھے تنبیہہ کی تھی کہ میں اب سادھو کو چھیڑنے کی حماقت نہ کروں۔ ان کے خیال میں' میں نے شگفتہ کے لیے صدق دل سے کام کیا تھا مگر اس کی قسمت میں جو لکھا تھا وہ ہو گیا۔ اب اس سلسلے میں بے وجہ سادھو سے الجھنا خود کو اور اپنے خاندان کو مزید مصیبتوں سے دوچار کرنا تھا۔

میں خاموشی سے تایا کی باتیں سنتا رہا مگر میں ان پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ آنے والے لمحوں کا وہ سارا زہر جس نے مجھے زہریلا انسان بنا دیا تھا' میری اس بے وقوفی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بہرحال تایا کا امروہہ کے لیے تیار ہو جانا میرے اور شرف الدین کے علاوہ اماں اور بہنوں کے لیے بھی خوشی کا باعث تھا۔ تائی تو ہر معاملے سے بے نیاز تھیں مگر میں جہانی آپا اور شنو آپا' کو خوش دیکھ کر دکھی ہو گیا' یہ وہی لڑکیاں تھیں جو امروہہ کی حویلی سے نکلنے کے لیے بے چین رہا کرتی تھیں۔ خوف جن کی آنکھوں کی پتلیوں پر جم کر رہ گیا تھا۔ جو یہاں آ کر بے پناہ خوش تھیں' وہ یہاں کے حالات سے اب اس قدر دل برداشتہ ہو چکی تھیں کہ آج امروہہ جانے پر کھل اٹھی تھیں۔ وہ یہاں آئی تھیں تو ان کے ہمراہ بڑی رونقیں تھیں۔ چھوٹی پھوپی ان کے لیے سہیلی ایسی تھیں' ان کی رازدار' ان کی ہر بات مان لینے والی۔ اماں سے ان کی بات منوانے اور ان کی شرارتوں یا غلطیوں کو اپنے سر لے کر انھیں بچانے والی تھیں۔ انھیں مراد آباد کی یہ کوٹھی نگل چکی تھی۔ خورشید چاچا تھے' تایا کی مزے دار باتیں تھیں' تائی کے عجیب و غریب محاورے تھے جن پر دونوں بہنیں منہ دبا کر ہنس پڑتی تھیں' اب کچھ بھی نہ تھا۔ نہ تایا کی کھلکھلا دینے والی باتیں تھیں' نہ تائی کے ہنسا دینے والے فقرے۔ نہ کوثر کی بولتی بلکہ گونجتی ہوئی خاموشی تھی۔ نہ چھوٹی پھوپی کے راز و نیاز۔ بس خاموش اور تھکے

تھکے سے تایا تھے' پریشان سی اماں تھیں اور دنیا سے بے خبر وبے نیاز تائی۔ میں جانتا تھا کہ وہاں جا کر انھیں کیا کچھ یاد آئے گا مگر جانے پر مجبور تھا۔

یہ فیصلہ سنتے ہی جہاں وہ سب بہت خوش ہو گئے تھے' وہاں ان کی آنکھوں میں تاسف کا گہرا تاثر بھی ابھر آیا تھا۔ یہاں آکر بہت کچھ کھو دینے کا تاسف' جو میرے بھی دل میں موجود تھا۔ یہاں آنا ہمیں عذابوں سے نجات دلانے کی بجائے انھیں سوا کر گیا تھا۔ میرے لیے تو لڈن کی موت بھی کم سانحہ نہ تھی' منصور چاچا' ان کی بیوی اور لڈن تینوں کی موت کا تعلق سو فی صد ہم سے تھا۔ ان کی اس طرح جدائی کو فراموش کر دینا میرے بس میں نہ تھا۔ ہم یہاں بہت سی چیزیں کھو کر جا رہے تھے لیکن بہرحال اب ہمیں جانا ہی تھا۔

○

چچی اپنی بہن کے یہاں سے اسی شام واپس آگئیں۔ ہمارے فیصلے نے انھیں بڑی تقویت پہنچائی تھی۔ ہمارے بہت سے دکھوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی انھیں رنجیدہ ہونا پڑتا تھا۔ بھرپورے گھر پر حکمرانی کا خواب بھی اس طرح پورا ہونے والا تھا حالانکہ اب بھی پورے گھر میں صرف چچا ہی ہوتے جو پہلے ہی ان کے محکوم تھے۔ بہرحال عورتوں کی نفسیات میرے لیے ہمیشہ کافی مشکل رہی ہے۔ میں ان کی کیفیات کا صحیح سبب جاننے میں ہمیشہ بدھو رہا ہوں۔

امروہہ جانے کا فیصلہ ہو گیا۔ شرف الدین بھی ہمارے ساتھ ہی امروہہ جانے کو تیار تھا۔ تایا نے فی الحال ضروری چیزیں لے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ چچا اور چچی سے ہم نے مروتاً "ساتھ چلنے کو کہا حالانکہ ہم ان کے جواب سے خوب واقف تھے۔ چچا نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ کاروبار کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں اس لیے وہاں جانا ان کے لیے مشکل ہے۔ چچی اپنے بقول اب بھی شگفتہ کی روح سے خوفزدہ تھیں اور مرزا صولت بیگ کے کرتوتوں کو اپنے گلے کا پھندا بنانا انھیں پسند نہ تھا۔ قبل اس کے کہ وہ ان کی شان میں زیادہ گستاخی کرتیں' میں نے گھر کی تمام چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ گھر کے دو کمرے تایا نے مقفل کر دیے۔ ایک کوثر کا کمرا تھا دوسرا تائی کا۔ اس میں اپنا ضروری سامان رکھوا دیا۔

جہانی آپا اور شنو آپا نے بھاگ بھاگ کر تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ رات سے قبل ہی تمام کام نمٹ گئے۔ ہم صبح یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ میں تو خود ب[illegible] چاہتا تھا کہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹ جائے۔ اس رات [illegible] نے حویلی کو اپنے تصور میں لانا چاہا مگر ناکام رہا۔ حیرت [illegible] کہ جو قوت اچانک سامنے آئی تھی وہ چاہنے پر جانے کہا[illegible] کھو گئی۔ اتنا میں جان چکا تھا کہ یہ قوت مجھ میں سا چکی [illegible] ممکن ہے یہ وہی پراسرار شکتی ہو جس کی پیش گوئیاں [illegible] دوسرے لوگ کر چکے تھے۔ اس وقت میں کیوں ناکام رہا [illegible] بات میں نہ جان سکا۔ اپنی اس کوشش سے جلد ہی اکتا [illegible] اور دوسری باتوں میں الجھ گیا۔

شرف الدین کے چہرے کی بشاشت نے مجھے جانکار[illegible] دی تھی کہ وہ شاید اس لیے خوش ہو گیا ہے کہ وہاں وہ جہ[illegible] آپا کے رشتے کی بات کر سکتا ہے ورنہ اپنے باوا کو محض ا[illegible] لیے اتنی دور لانا اس کے لیے ناممکن ہو گا۔ وہ کافی کا[illegible] آدمی تھے پھر یہ بھی ضروری تھا کہ میرے رشتے کی طرح اس بار بھی شرف الدین یا اپنی منکوحہ کے دباؤ میں آجائیں۔ بہرحال یہ فیصلہ میرا تھا کہ میں رشتہ آتے ہی [illegible] کر دوں گا بلکہ شادی میں غیر ضروری تعطل کو بھی موقوف دوں گا۔ میں شگفتہ کو اتنی جلدی نہ بھی پا سکا تو جہانی آپا [illegible] فرض سے سبکدوش ہو ہی جاؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ اما[illegible] میرے فیصلے سے اتفاق کریں گی۔ انھیں قائل تو میں کر چکا تھا۔

○

اس رات مجھے نیند نہ آئی بلکہ میں بہت سی بے [illegible] باتوں میں الجھا رہا۔ یہ بڑا غنیمت تھا کہ اب پے در[illegible] ہونے والے پراسرار واقعات سے ہم سب کی جان چھو[illegible] چکی تھی۔ ہم سب سکون سے تھے شاید اسی سکون کی [illegible] سے تایا نے مجھے سادھو سے نہ الجھنے کی تلقین کی تھی۔ [illegible] رات یونہی گزر گئی۔ مجھے نہ تمام رات جاگنے کی تھکن [illegible] نہ آنکھوں میں نیند کی جلن۔ اماں تہجد کے لیے اٹھیں تو [illegible] تہجد ادا کر چکا تھا۔ فجر کے وقت میں تلاوت کلام پاک کر [illegible] تھا' جب اماں نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھا۔ پھر وضو کر [illegible] نماز میں مصروف ہو گئیں۔

جانے کی خوشی نے جہانی آپا اور شنو آپا کو بھی بڑا بشاش کر دیا تھا۔ آج فجر کے وقت اٹھتے ہوئے ان کے چہروں [illegible] کسلمندی کے آثار نہ تھے۔ چچا اور چچی بھی نماز کے بعد [illegible] نیچے اتر آئے تھے۔ چچی کھانے پینے کی مختلف چیزیں ٹوکر[illegible]

[illegible] رہی تھیں۔ تایا نہا کر کپڑے بدل چکے تھے اور اب [illegible] بیٹھے حسرت سے در و دیوار کو تک رہے تھے۔ وہ [illegible] کر کوثر کے کمرے کے دروازے پر پڑے قفل کو [illegible] میرا کلیجہ کٹنے لگتا۔ کوثر کی نفرت دل میں آبلے سے [illegible] تی اور میں غصے سے دانت پیس کر رہ جاتا۔

[illegible] ں نے تائی کو تیار کر کے برقعہ پہنایا تو وہ بدک کر [illegible] ں چھ گئیں۔ "اے ہے کمبخت گھر سے نکال رہی [illegible] میں کہیں نہ جانے کی۔" وہ چیخ اٹھیں تھیں۔ پھر [illegible] سامنے پا کر وہ جلدی سے ان کے قریب آگئیں۔ [illegible] دن کو لائے تھے مجھے؟" وہ آتے ہی ان پر چڑھ [illegible]

[illegible] کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ مگر انھوں نے جلد ہی خود کو [illegible] لیا۔ "ہاں طیبہ! شاید اسی دن کو لائے تھے ہم [illegible] پر کیا کریں بیوی' اتنے مجبور اور بے بس تو ہم کبھی [illegible] نہیں۔ ہمیں یاد نہیں کہ تمہیں جان بوجھ کر کوئی دکھ [illegible] اگر دیا بھی ہو تو اب معافی کس سے مانگیں؟"

[illegible] ایا۔ خدا کے لیے!" میں نے روہانسی آواز میں کہا۔ [illegible] دم چپ سے ہو گئے۔ تائی ہونٹوں پر انگلی رکھے [illegible] اتھ دائیں کولھے پر ٹکائے' ایک پہلو پر جھکی انھیں [illegible] دیکھ رہی تھیں۔

[illegible] رے ہاں۔ وہ طیبہ!" اچانک تایا نے تائی کو مخاطب [illegible]

[illegible] ان رہی ہوں میں سب کچھ۔ یہ ڈر تو ہمیشہ سے لگا رہتا [illegible] پ ایک نہ ایک دن ضرور یہ کرو گے۔ اور میں کہے [illegible] میاں صاحب کہ جب تک کوثر کا بیاہ نہیں کر لوں [illegible] انہ جاؤں گی۔ نادر حسن رضوی کا بیٹا بالکل میری [illegible] جوڑ ہے۔ ولایت سے ہو کر آیا ہے اور لگتا ہی نہیں [illegible] ر ولایت گیا بھی تھا۔ اب بھی کرتا پاجامہ اور دو پلی [illegible] ے رکھتا ہے۔ ایک تمہارے چچیرے بھائی کا سالا [illegible] دونوں کو باہر کیا رہ آیا پورا انگریز بنا پھرتا ہے۔" وہ [illegible] اندر کی توڑ پھوڑ سے بے خبر بولے چلی جا رہی [illegible]

[illegible] رے باؤلی! اسے بیاہے بغیر تو ہم بھی کہیں نہیں [illegible] گے۔" تایا نے دھیرے سے کہا پھر آواز قدرے [illegible] رکے بولے۔ "طیبہ! کوثر کے رشتے کے لیے نادر [illegible] ضوی کے پاس ہی تو جا رہے ہیں۔ تم چلو گی نہیں کیا؟"

"آئے ہائے۔ تو اتے سارے لوگ جائیں گے کیا؟" انھوں نے سب کو چاروں طرف کھڑے دیکھ کر کہا۔ سبھی کی توجہ ان کی طرف تھی۔ چچا تانگا لینے جا چکے تھے اور وہ جانے کو تیار ہی نہ تھیں۔ "اور یہ اتا سامان؟" انھوں نے صحن میں رکھے بکسوں اور ٹوکریوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے ہماری بیٹی شہزادی ہے شہزادی۔ اس کی شادی میں تو پورا شہر شریک ہو گا پھر کیا رشتے کو گھر والے بھی نہ جائیں؟" تایا کی آواز درد سے پھٹنے لگی تھی۔ آنکھوں کے کناروں میں جیسے سمندر سما گئے تھے مگر مجال ہے کہ ایک قطرہ بھی رخسار پر ٹپکا ہو۔ میں ایک بار پھر ان کی قوت برداشت کا معترف ہو گیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے سے تایا اب بھی سارے دکھوں کے آگے سینہ سپر تھے۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ چلو پھر میں بھی چلی چلتی ہوں۔ اے جہانی' ذرا عطر کی پھریری تو لانا۔" وہ پلٹ کر شنو آپا سے بولیں پھر عجلت میں تایا کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔ "اتے دن ہو گئے کم از کم آج تو موتیاں منگا دیتے۔ ایسے سر جھاڑ منہ پھاڑ جاؤں گی سمندھیانے میں؟ چاندی کی دریوں میں موتیا ہی پرو لیتی۔ کان بج جاتے۔"

"ہاں بس بھول ہو گئی۔ ارے میں تو تمہیں موتیا میں تول دوں گا بیوی' بچی کا رشتہ تو ہو جانے دو۔" اتنا کہہ کر تایا لڑکھڑا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا رخ غسل خانے کی طرف تھا۔ میرے پاس سے گزرے تو ان کے رخساروں پر بہتی پانی کی چمکتی ہوئی لکیریں جی الٹ پلٹ کر گئیں۔ شرف الدین نے آواز نہ دے لی ہوتی تو میں رو پڑتا۔ اگر اس وقت کوثر میرے ہاتھ لگ جاتی تو شاید میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ میں آنکھوں کو رگڑتا اس کے پاس چلا گیا۔ وہ تانگا لانے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ چچا تانگا لینے جا چکے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ دو تانگے لائیں۔ ایک میں سب کا آنا اور سامان سما جانا مشکل ہی تھا۔

جہانی آپا اور شنو آپا دوسری طرف منہ کیے باقاعدہ رو رہی تھیں۔ اماں کی ناک سرخ ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں گلابی پن بھیگ چکا تھا۔ وہ جلدی سے تائی کا بازو پکڑ کر دوسری طرف لے گئیں۔ شاید انھوں نے بھی تایا کو روتے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ بھی جان گئی تھیں کہ اس بوڑھے وجود

میں ٹھاٹھیں مارتا طوفان اور کچھ دیر چھپا رہا تو پورا گھر اس کی زد میں آجائے گا۔ تائی ان سے بازو چھڑا کر دروازے کی طرف لپکنے لگیں۔ وہ اب جانے کو بے چین ہو گئی تھیں۔ تانگا آنے تک بڑی مشکل سے انھیں قابو میں رکھا گیا۔

کچھ ہی دیر میں چچا تانگے لے آئے۔ ہمیں رخصت کرتے ہوئے چچا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چچی کی آنکھوں میں فتح مندی کی چمک۔

"دلھن! یہ گھر تمھارے پاس امانت چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں نہ لوٹا تو ایک نہ ایک دن میری کوثر ضرور لوٹ آئے گی۔ تم اپنے ارمان نکال کر تھک جاؤ تو میری امانت اسے لوٹا دینا۔ مجھے اور اپنی بھابی دلھن کا معاف کر دینا۔ ہم نے کبھی زک پہنچانے یا تکلیف دینے کی دانستہ کوشش نہیں کی۔ اب اکیلی ہوں گی تو ہماری ان باتوں پر غور ضرور کرنا جسے سن کر تم آگ بگولا ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ ساری باتیں تمھارے حق میں بہتر ثابت ہوں گی۔ میاں نبن کو بے جا چھوٹ مت دینا۔ وہ بہت بے پروا رہے ہیں۔ ذمے داری کا احساس آدمی کو بڑا پر اعتماد بنا دیتا ہے۔ یہ بھی تم جان لو گی۔ بس کہا سنا معاف کر دینا۔" تایا چچی کے سر پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ آج ان کی آواز میں پر خلوص لوچ تھا اور چچی کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

"بھائی صاحب! ایسی باتیں نہ کریں۔ خدا آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ ہمارا آپ کے سوا اب ہے ہی کون؟ ہم کبھی خیانت کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ ہمیں بھی معاف کر دیجیے گا۔ یہ دل کی بہت صاف ہیں بس ذرا زبان کی۔" آگے کچھ کہنے کی شاید چچا کو جرات نہ ہوئی۔ وہ جھجک کر چپ ہو گئے۔

"نبن میاں! اپنی بہو کو تمھاری ذمے داری پر چھوڑے جا رہا ہوں۔ اسے ذرا سی بھی تکلیف ہوئی تو میں تمھیں معاف نہیں کروں گا۔ اب تمھیں کبوتروں سے زیادہ اس کا دھیان رکھنا ہے۔ کبوتر تو لوٹ پوٹ کر زندگی گزار ہی لیتے ہیں مگر اس کی تمام ذمے داری تم پر ہے۔"

تایا کے آخری جملے سن کر چچا کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ تمام بھیگی آنکھوں والے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر ہم سب تانگوں پر سوار ہو گئے۔ سبھی نے چچا اور چچی سے اجازت لی۔ انھیں امروہہ آنے کی دعوت دی اور ان سے رخصت ہو گئے۔

○

شرف الدین نے ریل کا پورا ڈبا بک کرا لیا تھا۔ ڈبے میں ہم سب بڑی سہولت سے تھے۔ نہ کسی کے دھڑکا تھا، نہ بے پردگی کے سلسلے میں کچھ پریشانی تھی۔ میں شرف الدین کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مجھے وہ آگیا جس میں میرے ساتھ شگفتہ بھی تھی۔ شگفتہ سفر کا خیال آتے ہی میں چونک اٹھا۔ پرکاش کو تو میں طور پر فراموش کر بیٹھا تھا۔ یہ بھول ہی گیا تھا کہ سادھو کی قیدی بن گئی مگر پرکاش کی روح تو اب بھی رہی ہو گی۔ یقیناً وہ شکنتلا پر بیتے عذابوں سے بھی واقف گا۔ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔ میں تو ان دونوں کو کے حالوں پر چھوڑ آیا تھا۔ وہاں جا کر سادھو کے چکروں ایسا الجھا کہ پرکاش کا خیال ہی نہ آیا۔ شکنتلا تو پرکاش کے لیے بے چین تھی۔ جانے اب وہ کیا کر رہی ہو گی جانے اس پر کیا بیتی ہو گی، پرکاش کس حال میں ہو گا۔ کی روح اب بھی حویلی میں قید ہو گی یا۔ اس سے آگے سوچنے کا یارا ہی نہ تھا۔ بس ایک خیال تھا کہ کہیں شکنتلا کے چلے جانے کے بعد پرکاش کی روح نہ بھٹک ہو۔ اب تک ہم نے حویلی میں اس کی روح کو نہ کبھی تھا نہ ہی اس کی وجہ سے کسی کو پریشانی ہوئی تھی۔ سبھی شکنتلا کی روح سے منسوب رہا تھا مگر اب حالات دوسرے تھے۔ میں تو صرف اتنی دعا کر رہا تھا کہ اماں اور بہنوں اب کوئی پریشانی نہ ہو جائے۔

میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بار اگر مجھے حویلی کی کھدائی کرنا پڑی تو میں وہ بھی کر گزروں گا۔ بولا شکنتلا کے سادھو کی قید میں جانے کا ذمے دار بھی میں تھا۔ اسے وہاں سے آزاد کرانا بھی میرا ہی فرض تھا۔ امروہہ میں رہتے ہوئے میں پرکاش کا جسد خاکی ڈھونڈ اسے کچھ تو سکون پہنچا ہی سکتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اماں سے پوری سنجیدگی سے بات کروں گا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" شرف الدین نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے اسے اپنے اندیشوں سے آگاہ کیا اور اپنے کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"اچھا ہوتا اگر تم اب سے پہلے تنہا جا کر یہ سب کچھ لیتے۔ اب ان لوگوں کی موجودگی سے کچھ نہ کچھ پریشانی تو

ہی ناں!"

"ہوں، ہونا تو یہی چاہیے تھا، بس پہلے خیال ہی نہ آیا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ یہ مجھ پر ایک قرض ہے۔ ابا سے ہوا وعدہ گلے میں طوق بن کر پڑا ہے۔ اسے نبھانے میں از کم اماں میری مدد ضرور کریں گی۔" میں مطمئن تھا۔

○

تائی بے حد خوش تھیں۔ اماں اور جہانی آپا وغیرہ بھی ہوئی تھیں۔ میں نے صدق دل سے دعا مانگی کہ خدا کے چہروں پر اس خوشی اور بشاشت کو قائم رکھے۔ ہم سب تک امروہہ پہنچ گئے۔ تانگا جونہی حویلی کے دروازے پر آس پڑوس کی کھڑکیاں اور دروازے کھلنا شروع ہو سبھی ہمیں حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ ہم ماہ بعد لوٹے تھے۔ اتنے عرصے میں ویرانی دروازے پہنچ چکی تھی۔ بڑا گیٹ مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ گو اس بھی اس کی صفائی کرنے والا کوئی نہ تھا پھر بھی ازے کھلنے اور بند ہونے سے کچھ نہ کچھ دھول تو جھڑ ہی تھی۔ اماں نے تانگے سے اترتے ہی حویلی کے ازے کی چابیاں میری طرف بڑھا دی تھیں۔ میں نے کو سہارا دے کر اتارا اور چابی ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"تایا آپ بسم اللہ کیجیے۔"

تایا نے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر دروازے کی طرف بڑھ۔ انھوں نے چھوٹا دروازہ اور بڑا دروازہ، دونوں کھول یے۔ دھول یوں جھڑی جیسے آسمان سے ایک دم ہی مینہ نے لگے۔ اماں کھانستی ہوئی پیچھے ہو گئیں۔ شرف الدین نگے سے سامان اتارنے لگا تھا۔ اماں تائی کا بازو پکڑے ڑی تھیں۔ جہانی آپا اور شنو آپا ہاتھوں میں ٹوکریاں ے سر اٹھائے حویلی کو تک رہی تھیں۔ میں نے اور رف الدین نے بڑے دروازے کو بڑی مشکل سے دھکیل رکھولا۔ چھوٹا دروازہ آسانی سے کھل گیا تھا مگر بڑے گیٹ ے قبضوں پر شاید زنگ لگ چکا تھا۔ ایسی خوفناک چراہٹ ہوئی تھی کہ ایک دم دل دھڑک اٹھے تھے۔

سامنے والے پان کے کھوکھے کے بڑے میاں کا منجھلا بالک کر آگیا۔ اس نے شرف الدین کی اور میری مدد کی۔ ب سامان اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ کہنے کو تو ہم نے رف چار ماہ ہی یہاں سے دور گزارے تھے مگر یوں لگ رہا جیسے چار صدیاں گزرنے کے بعد لوٹے ہوں۔ اماں کی آنکھوں میں بے پناہ تشکر کے ساتھ ساتھ اس قدر خوشی بھری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ تو ایسے خوفناک حالات میں بھی یہاں سے جانے کو تیار نہ تھیں ان کا اتنے روز باہر رہنا بڑی بات تھی۔ حالانکہ وہ درمیان میں ایک بار آ چکی تھیں پھر بھی تشکر کے سجدے ان کی آنکھوں سے ادا ہو رہے تھے۔

○

شرف الدین سامان وغیرہ اتار کر گھر چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے اماں سے اور تایا سے کہا کہ وہ وقت نکال کر ضرور آئیں۔

"ہاں بیٹا ذرا سنبھل لیں پھر ضرور آئیں گے۔ تم اپنے اماں باوا کو ہمارا سلام کہہ دینا۔" اماں نے کہا۔

شرف الدین سب سے اجازت لے کر چلا گیا۔ جس وقت وہ جا رہا تھا، میری نگاہیں بے ساختہ جہانی آپا کی طرف اٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر پھیلی بے پایاں خوشی نے گویا میرے فیصلے پر تصدیق کی مہر لگا دی۔ شرف الدین نے بھی گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کن انکھیوں سے انھیں دیکھا تھا پھر جلدی سے نگاہیں جھکا کر باہر نکل گیا۔ ان جذبوں نے ان دونوں کے دلوں میں کب جنم لیا، میں اس لمحے کو نہ جان سکا۔ شاید یہ ان دنوں ہوا جب میں سنہرے بابا کے حجرے میں تھا۔ انھی دنوں شاید میری دونوں بہنوں نے شرف الدین سے پردہ کرنا چھوڑا تھا۔ باقاعدہ پردہ تو وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھیں مگر بے وجہ سامنے آنے سے بھی گریزاں تھیں۔ میری غیر موجودگی نے شاید مجبوری بن کر یہ دیوار گرا دی تھی۔ بہرحال یہ بہت سی باتوں سے بہتر تھا۔

شرف الدین کے جاتے ہی دونوں بہنیں گھر کی صفائی میں لگ گئیں۔ اماں نے تایا اور تائی کے لیے بیچ کا وہ کمرا کھول دیا جو زائد تھا اور اکثر بند ہی رہتا تھا۔ اس کے برابر میں وہ کمرا تھا جس میں جہانی آپا اور شنو آپا کے پلنگ بچھے تھے۔ میرا کمرا ابا کے کمرے سے ملحق تھا اور میرے کمرے کے دائیں طرف والا کمرا اماں کا تھا۔ میں نے مراد آباد جانے سے قبل مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ جی کی وہ تصویریں جو میں پردادے کے کمرے سے اٹھا کر لایا تھا' بیچ کے اسی کمرے میں رکھ دی تھیں جو اماں نے تایا کے لیے کھلوایا تھا۔ ان تصویروں پر دھول جمی تھی اس لیے اماں نہ جان سکیں کہ یہ کیا ہے اور کس کی تصویریں ہیں ورنہ وہ ضرور باز پرس کرتیں۔ میں نے غنیمت جانا اور موقع ملتے ہی ان تصویروں کو اپنے کمرے میں منتقل کر دیا۔ میں نے انھیں لوہے کے بڑے بکس کے پیچھے رکھ دیا تھا۔

دادی کے زمانے میں جب ہم سب ساتھ رہا کرتے تھے اس وقت تایا اور تائی بیچ کی منزل پر رہتے تھے۔ سب سے اوپری منزل پر دادے کی تھی جسے بعد میں بند کر دیا گیا تھا جبکہ وغیرہ دوسری منزل پر رہتے تھے۔ اسی منزل پر چچا کے دو کمرے بھی مخصوص تھے جہاں ان کی دلھن بیاہ کر آئی تھیں مگر دادی کے انتقال سے قبل ہی یہاں ہونے والے پے در پے واقعات نے تائی اور چچی کے ہوش گم کر دیے۔ وہ اتنی خوفزدہ ہو گئیں کہ اپنے شوہروں کو لے کر اپنے میکے جا بیٹھیں۔ بعد میں ابا نے ان کی سہولت کے لیے وہیں مراد آباد میں وہ کوٹھی خرید دی جو تایا کے نام تھی۔

اب اتنے برس بعد تایا تائی کو لے کر یہاں آئے تو تائی تمام قسم کے خوف و ہراس سے بیگانہ تھیں' وہ ہوش میں ہوتیں تو کبھی بھی یہاں نہ آتیں۔ انھیں تو اس حویلی کے نام ہی سے چڑ تھی مگر اس وقت وہ اس قدر خوش تھیں کہ بیان سے باہر ہے۔ یہاں آکر ذرا نکتے ہی انھوں نے تایا سے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ کوثر کا سسرال کہاں ہے۔ رشتہ لے کر کہاں جانا ہے۔ تایا نے کسی نہ کسی طرح انھیں ٹال دیا تھا۔ ہمارے امروہہ پہنچنے کی اطلاع ذرا ہی دیر میں سارے امروہہ میں پھیل گئی۔ محلہ ملانا اور محلہ قریشاں میں ہمارے بہت سے رشتے دار رہتے تھے۔ شام ہوتے ہوتے کافی لوگ ملنے اور خیریت پوچھنے چلے آئے۔ مطلوب چچا وہ

پہلے شخص تھے جو سب سے پہلے اپنی بیوی سمیت پہ
ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ آتے
سے لپٹ گئے اور گلوگیر آواز میں بولے۔ "بھائی
بھابی دلھن کے بارے میں اطلاع نے تو کلیجہ ہی
دیا۔"

ان کے منہ سے یہ بات سن کر ہم سب فق رہ
خیال تو ہمیں آیا ہی نہیں تھا کہ یہاں پہنچتے ہی ہم
داروں کے چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا ہو گیا
چچا نے بڑی رواداری نبھائی کہ کوثر کے بارے
سوال کر کے تکلیف پہنچانے سے باز رہے مگر تائی
پن کا سوال بھی تو اسی حوالے سے تھا۔ تایا تو بالکل
گئے۔ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ یہ بات ڈوب مر
تک بدنامی کا باعث تھی۔ کوثر کی سی حرکت اس زما
کسی لڑکی سے سرزد ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔
زمانہ تھا جب لڑکیاں بڑوں کے فیصلے کو اپنی زندگی وا
قبول کر لیتی تھیں۔ کبھی کسی لڑکی میں اتنی ہمت نہ
بڑوں کے کسی فیصلے سے انحراف بھی کر دے۔ ار
میں تو شادیاں بھی ایسی ہوتی تھیں کہ دلھن دولھا
بھی دیکھ نہیں پاتی تھی بلکہ اکثر و بیشتر تو شادی کے
گھونگھٹ سالوں چہرے پر پڑا رہتا تھا اور دلھن آ
اپنے دولھا کو دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر پاتی تھی۔ وہ
لنگڑا ہو یا لولا' اس کے ہونٹوں پر گلہ آتا نہ شکو
زندگی وہ اسی شخص کی خدمت کرتے گزار دیتی تو
کوثر کا گھر چھوڑ دینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کا
عصمت جہاں کے والدین اپنی بچیوں کا قصور نہ
ہوئے بھی اپنے آبائی گھر تک چھوڑ گئے تھے۔ بہر حال
جو کچھ ہو چکا تھا اسے ہر حال میں برداشت کرنا تھا
سوالوں کا کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔ مجھے ما
تایا کی تھی۔ ان کے لیے بیٹی کی جدائی کا غم ہی کم
یہاں بدنامی منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ تایا کے بولنے
ہی میں بول اٹھا۔

"تائی اچھی ہو جائیں گی مطلوب چچا۔ جس طر
کی زندگیوں میں حادثے اور سانحے جنم لیتے ہیں
ایک سانحہ ہمارے ساتھ بھی ہو گیا۔ کوثر کا جانا اس
مرضی سے نہیں تھا۔ وہ ان پر اسرار حالات کا شکا
جس کی شروعات یہاں حویلی سے مرزا صولت بیگ

ئی تھی اور اس سلسلے میں ہم سب کتنے بے بس ہیں۔ یہ تو
پ سے پوشیدہ نہیں۔ دعا کریں کہ وہ خیریت سے ہو اور
اسے دوبارہ ہم میں آجانے کا کوئی راستہ نکال دے۔"

"او۔ تو یہ معاملہ ہے؟" مطلوب چچا کی بیوی' صدیقہ
ذرا قریب سرک آئیں۔ "اے اچھن کی بہو بتا رہی
کہ ٹانگیں اچھی ہوتے ہی وہ۔۔۔"

"آپ چپ رہیے۔ اچھن کی بہو نے اس سے پہلے کبھی
بولا ہے جو اب بولیں گی۔" مطلوب چچا نے انھیں
میان میں ہی ٹوک دیا مگر ان کی آنکھوں میں بھی بے یقینی
ف نظر آ رہی تھی۔ وہ کھوجنے والے انداز میں ایک
ب کو دیکھ رہے تھے۔

"کہاں ہیں بھابی دلھن' ذرا حال تو دیکھوں۔" صدیقہ
نے اپنا برقعہ سمیٹ کر پلنگ کی پائنتی کو رکھتے ہوئے
ا۔

"سو رہی ہیں۔" اماں جھٹ بولیں۔ "بڑی مشکل سے
یا ہے' پھر کبھی مل لیجیے گا۔ ویسے ان کی حالت ایسی نہیں
انھیں زیادہ پریشان کیا جائے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام بتایا
ہے۔" اماں کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"اے لو دلھن! میں کیا انھیں پریشان کرتی؟ یہی تو بات
ہاں کہ تم لوگ خاندان والوں کو اپنا ہی نہ سمجھو ہو۔
سے وہ میری جٹھانی بعد میں اور سہیلی پہلے تھیں۔ ساتھ
ینا بتایا ہے ہم نے۔ چلو خیر' سو رہی ہیں تو پھر مل لیں
۔ ہائے میرے تو کلیجے میں بھالے اتر گئے تھے جب پتا چلا
کوثر بھاگ گئی اور دلھن بھابی پاگل ہو گئیں۔ بھیا اولاد
کھ پاگل کر دینے والا ہی ہوتا ہے اور پھر بیٹی کا معاملہ۔
رے خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے۔" وہ بولے چلی
ئیں پھر تایا کی طرف پلٹ کر بولیں۔ "ویسے بھائی صاحب
پ نے بھابی دلھن کے کہنے میں آکر امروہہ چھوڑ کر اچھا
ں کیا۔ اب دیکھ لیں کیا سامنے آگیا۔ بھرے خاندان میں
ادریں جکڑی رہتی ہیں۔ آخر کو سیدہ بھی تو رہ رہی تھیں۔
کی بچیاں بھی تو اسی حویلی میں پلی بڑھی ہیں۔ اب سیدہ
گی میں کون سے جن تھے کہ وہ خوفزدہ نہ تھیں' پھر اولاد
لیے یہ سب کچھ تو سہنا ہی پڑتا ہے۔ میں تو سیدہ کا بھی
آباد جانے کا سن کر ہول گئی تھی پر اللہ کا شکر ہے کہ یہ
ساتھ سلامت کے لے آئیں۔"

صدیقہ چچی کی آواز کانوں میں سیسہ انڈیل رہی تھی۔

اماں کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا اور تایا کا سر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مطلوب چچا دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے اب بھی کھوجتی ہوئی نگاہوں سے سب کے چہروں کو تک رہے تھے جیسے ابھی ساری اسٹوری کھینچ کھانچ کر نکال لیں گے۔ اماں نے جہانی آپا اور شنو آپا کو چلے جانے کا اشارہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا تھا۔ خون تو میرا بھی کھول اٹھا تھا مگر صدیقہ چچی اور اچھن پھوپا کی بہو پورے خاندان میں مشہور تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ان دونوں کی باتوں پر لوگ کم ہی یقین کرتے ہیں پھر بھی جس قسم کی باتیں یہ دونوں کرتی تھیں ان کا اثر کافی عرصے تک برقرار رہتا تھا۔ اب بھی وہ سن گن لینے ہی آئی تھیں تاکہ یہاں سے نکلیں تو پورے خاندان کا چکر لگا کر اصل کہانی کو سنانے کا شرف حاصل کر لیں۔ لوگ ان کی جاسوس فطرت سے کافی متاثر تھے۔ ہر قسم کی کہانی لانے کو اکثر وہی بھیجی جاتی تھیں۔ ان کو اسی موقع پر تنبیہہ کرنا مناسب تھا ورنہ بات بہت زیادہ پھیل بھی سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ذرا سا بھی لحاظ نہ کیا اور بولا۔ "صدیقہ چچی! آپ اگر اس لیے آئی ہیں کہ یہاں کی باتیں سارے خاندان میں سنائیں تو پھر سن لیجیے کہ ہم اور ہمارا خاندان اب بھی روحوں کے پراسرار بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ پہلے ہم اور پھر آپ لوگ بھی اس کی زد پر ہیں۔ ایسا کوئی انہونا واقعہ کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ شکنتلا کی روح جب بڑے پھوپا کو بھی پراسرار انداز میں مار سکتی ہے تو پھر آپ تو ہمارے ہی خاندان کی ہیں' آپ تک پہنچنا بھلا ان کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ کوثر انھی حالات کی پراسراریت کا شکار ہوئی ہے پھر بھی ہم نے بڑے بڑے پہنچے ہوئے لوگوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت جلد کوثر واپس آجائے گی۔ کوئی اس کا بال بھی بیکار نہیں کر سکے گا۔ انھی بزرگ کی وجہ سے یہاں روح کا سایہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے ہم لوگ لوٹ آئے ہیں۔ یہ اطلاع جس نے بھی دی ہے کہ کوثر بھاگ گئی' اس نے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے اگر کسی کے منہ سے آئندہ اپنے خاندان کے کسی فرد کے بارے میں کوئی بات سنی تو۔۔۔"

"اے لو عجیب سرپھرا لڑکا ہے۔ میں نے کیا کہہ دیا؟ جو سنا تھا اس کی تصدیق ہی تو کروائی ہے۔ اب یہ تو تم کہہ رہے ہو کہ روحوں کا چکر ہے۔ ہمیں کیا پتا۔ اور مجھے تو دھمکی دینا مت۔ میں تو یوں بھی بس کسی کے معاملے میں نہیں پڑتی۔

اول فول بکنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔" صدیقہ چچی چراغ پا ہو کر بولیں۔

"نہیں بیٹا وقار' ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ بزرگ ہیں تمہارے۔" تایا بولے تو یوں لگا تھا جیسے ان میں بولنے کی ہمت ہی نہ ہو۔

"مگر تایا بزرگ ہیں تو انھیں کچھ خیال بھی تو کرنا چاہیے ناں! اس طرح آکر الٹی سیدھی باتیں کرنا۔۔۔"

"میاں خیر خیریت پوچھنے آئے تھے۔ اپنے دل سے مجبور ہو کر آئے تھے ورنہ اگر ہوا بھی لگی ہوتی کہ مرزا جی کی اولاد کھڑے کھڑے آدمی کو ذلیل کردیتی ہے تو اپنے دل پر پتھر رکھ لیتے۔ اب اس دل کا کیا کریں۔ طیبہ سے اتنی محبت ہے کہ۔" صدیقہ چچی جو بے پناہ غصے میں ترخ کر بولی تھیں آخری جملہ کہتے کہتے ناک سڑکنے لگیں۔ بے وجہ ہی آنکھوں پر دوپٹے کا پلو رکھ لیا اور یوں اچھلنے لگیں جیسے بدن کو جھٹکے لگ رہے ہوں۔

"ارے صدیقہ! باؤلی ہوئی ہو تم۔ بچہ ہے' کم عمر ہے' پریشان ہے' تم برا نہ مانو۔ بڑے تو بچوں سے درگزر کرتے ہیں۔" تایا نے بے حد نرمی سے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "بیٹا اخلاق کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جنھیں برداشت کرنا ہی ہوتا ہے۔ اتنے غصے میں آکر بے قابو ہو جانا آدمی کے کم ظرف ہونے کی نشانی ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میں ظرف کی کچھ کمی نہیں۔ معافی مانگو اپنی چچی سے۔"

میں جانتا تھا کہ چچی نے مجھ سے زیادہ تایا کا دل دکھایا ہے مگر وہ پھر بھی سب کچھ سہہ گئے۔ میں نے سر جھکا دیا۔ ذرا دیر کو سوچا پھر نگاہ اوپر اٹھائی تو صدیقہ چچی یوں تیار بیٹھیں تھیں جیسے میرے منہ سے بات نکلتے ہی فوراً بول پڑیں گی کیا بولیں گی یہ اندازہ لگانا مشکل تھا مگر ان کے نتھنے کبھی پھول رہے تھے کبھی پچک رہے تھے۔ میں نے دھیمے سے ان سے معذرت چاہی۔

میں چاہتا تھا کہ میں تایا کے حکم کی تعمیل بھی کرلوں اور یہ لوگ بھی جلدی چلے جائیں مگر میرے معذرت طلب کرتے ہی صدیقہ چچی نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ "اے میں صدقے' کتنا فرمانبردار بچہ ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ پریشان ہے۔ پر بوا میں غیر تھوڑا ہی ہوں۔ وہ تو اچھن کی بہو ہے جو الٹی سیدھی باتیں پھیلاتی ہے' اب دیکھنا کیسے لتے لیتی ہوں اس کے۔"

"رہنے دیں صدیقہ آپا' ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ جس کا جی چاہے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرے' سب کو دعائیں ہی دیں گے۔ یہ ہمارا وتیرہ ہے' اسے جانے نہ دیں گے۔ بھائی صاحب اور بھابی ہی صدمے سے دوچار ہیں' یہ باتیں کرکے لوگ ثواب نہیں کمائیں گے ناں!" اماں نے کچھ ناگواری اور دل گرفتگی سے کہا۔

ان باتوں نے ماحول کو اپنی کھردری اور سخت گرفت میں لے لیا تھا۔ ابھی ہمیں آئے دیر نہ ہوئی تھی کہ یہ لوگ آئے۔ حویلی کے اس حصے کی صفائی کوئی معمولی بات تھی۔ پہلے تو لڈن اور اس کی اماں آجاتی تھیں' اب کوئی ذہن میں نہیں آرہا تھا جسے اپنی مدد کے لیے بلایا جائے۔ گھر کے لوگ بھی صفائی پر لگتے تو صبح سے شام ہو جاتی۔ پر صفائی تو ہو ہی جاتا تھی مگر ان لوگوں کی آمد اور باتوں نے ذہنوں کو مفلوج کرکے رکھ دیا تھا۔ میں تو فوراً اٹھ گیا۔ جہانی آپا اور شنو آپا پہلے ہی جا کر کام میں لگ گئی تھیں۔ ان کے لیے پہلے باورچی خانے کی صفائی ضروری تھی کہ رات کا کھانا بنا سکیں۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کی ہر چیز گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ اسی کمرے میں روز گنگوا پراسرار انداز میں مارا گیا تھا۔ اس روز کے بعد سے آج میں پہلی بار اس میں رہنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کی موت کے بعد تو اماں نے مجھے اس کمرے میں آنے ہی نہیں دیا تھا۔ جتنا عرصہ بھی رہا اماں ہی کے کمرے میں رہا تھا۔

میں آہستہ آہستہ کمرے کو سمیٹنے میں لگ گیا۔ جہانی آپا اور شنو آپا کے لیے اس کمرے کی صفائی بہت مشکل تھی پھر میں پردادا مرزا صولت بیگ اور جوگندر ناتھ کی خونی تصویر کی وجہ سے بھی یہاں کی صفائی خود ہی کرنا چاہتا تھا تاکہ ان تصاویر پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ اماں تو خاص طور پر میری جان کو آجاتیں۔ مجھے نہیں معلوم ہوا کہ مطلوب اور صدیقہ چچی کب گئے۔ میں نے شاید گھنٹا بھر بعد باہر قدم رکھا تو اماں رات کے کھانے کے لیے کچنار کی کلیاں چن رہی تھیں' تایا نے حسب عادت کچے صحن میں چھڑکاؤ کر کے پلنگ ڈلوا دیے تھے۔ جہانی آپا اماں کا کمرا صاف کر رہی تھیں اور شنو آپا تایا کے کمرے سے جھاڑ نکال رہی

تھیں۔ تائی ابھی تک برقع کا نچلا حصہ پہنے بیٹھی تھیں۔ برقعے کا اوپر کا حصہ ان کی گود میں رکھا تھا۔ لگتا تھا ابھی ابھی کہیں سے آئی ہیں یا کہیں جا رہی ہیں۔

میں ان کے قریب جا بیٹھا۔ "تائی برقع اتار دیں۔"

"کیوں۔۔۔؟" وہ تنک کر بولیں۔ "ابھی کوثر کے سسرال جانا ہے' پھر پہننا پڑے گا۔"

"تو برقع پہننے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ آپ کپڑے نہیں بدلیں گی کیا۔ یہ کپڑے تو میلے ہو گئے ہیں' سسرال جانا ہے تو کپڑے بھی شاندار ہونے چاہئیں۔" میں نے انھیں بہلایا مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ غالباً اماں وغیرہ نے بھی بہت کوشش کی ہوگی اور انھوں نے ایک نہ سنی ہوگی۔

"چھوڑ دو بیٹا۔ اسے اس کے حالوں پر چھوڑ دو۔" تایا نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ کرب ان کے بوڑھے چہرے کی جھریوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ میں دانت پیس کر اٹھ گیا۔ کوثر سے نفرت لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اماں کے چہرے پر دکھ کے ساتھ ناگواری بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کوثر کی وجہ سے انھیں بھی بڑی شرمندگی اور بدنامی کا سامنا ہے۔ ان کا یہ کہنا درست تھا کہ اس کی اس حرکت سے جہانی آپا اور شنو آپا کی شہرت کو بھی شدید نقصان پہنچے گا۔ میں جانتا تھا کہ صدیقہ چچی اور اچھن پھوپا کی بہو تو دن رات ایک کردیں گی۔ ایسی ایسی کہانیاں سنائی جائیں گی کہ توبہ الاماں۔ مگر وہی بات کہ عزت دینے والا بھی خدا ہے اور بے عزت کردینے والا بھی۔ جانے وہ کون سے گناہ تھے جن کی سزا ہمیں یوں بھگتنا پڑ رہی تھی اور جانے کب تک بھگتنا پڑے گی۔

○

امروہہ کی حویلی میں پہلا دن اور پہلی رات خاصی پرسکون گزری۔ مجھے تمام تجسس پرکاش کا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شکنتلا کے چلے جانے کے بعد اس کی روح بے چین ہو کر منڈلاتی پھر رہی ہوگی مگر ایسی کوئی بھی انہونی بات نہ ہوئی جو میرے ذہن میں اندیشوں کو جنم دیتی۔ اماں نے جہانی آپا اور شنو آپا کو اپنے ہی کمرے میں سلایا تھا حالانکہ وہ اب خوفزدہ نہ تھیں یا شاید ان حالات کی عادی ہو چکی تھیں۔ شرف الدین رات کو حویلی نہیں آیا۔ میں بھی جہانی آپا اور اماں کے ساتھ صفائیوں ستھرائیوں میں لگا رہا اس لیے وہاں نہ جا سکا' ورنہ امروہہ میں داخل ہوتے ہی مجھے شگفتہ کا خیال آیا تھا۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ حویلی سے مراد آباد جانے سے قبل جب میں' لڈن اور شرف الدین' مرزا صولت بیگ کے کمرے میں جا رہے تھے تو سیڑھیوں کے پاس پڑی ہوئی چاندی کی ایک پائل مجھے ملی تھی۔ جسے میں نے بہت سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ یہ بات اچانک ہی میرے دماغ میں آئی تھی کہ میں وہ پائل شگفتہ کو "تحفتاً" دے دوں۔ حالانکہ وہ ایک ہی پائل تھی مگر اتنی حسن اور خوب صورت تھی کہ اس پر سے نگاہ نہیں ہٹتی تھی۔ وہ اب سے شاید پچاس پچپن سال پہلے کا ڈیزائن تھا اور اس قدر نفیس کام تھا جو اب ہونا مشکل تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے سامان میں اسے تلاش کیا تو وہ مل گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب بھی شرف الدین کے گھر گیا وہ لے جاؤں گا اور موقع ملتے ہی اسے شگفتہ کو دے دوں گا۔ اماں تو پہلے ہی ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ یہاں پہنچتے ہی شگون کی رسم پوری کردیں گی۔ ہمارے خاندان میں منگنیاں راس نہیں آتی تھیں۔ اس سے قبل خاندان بھر میں جس کی بھی منگنی کی گئی تھی وہ ٹوٹ چکی تھی اس لیے برسوں پہلے ہی یہ رسم موقوف کردی گئی تھی۔ اب شگون کا دوپٹا یا جوڑا اور پھول پہنا دیے جاتے تھے اور اسی روز تاریخ پکی کر کے مٹھائی کھلا دی جاتی تھی۔

اماں یہ ضد تھیں کہ تاریخ لے لیں مگر میں ان حالات میں خاص طور پر تایا اور تائی کے غم کی وجہ سے ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں یہ تایا وغیرہ کے ساتھ زیادتی ہوتی مگر اماں کوثر کی وجہ سے پریشان تھیں۔ پتا نہیں کیوں انھیں گمان تھا کہ کوثر یہ شادی نہیں ہونے دے گی۔ شاید اسی لیے وہ کوثر کی غیر موجودگی میں ہی میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے انھیں ہر طرح یقین دلایا کہ کوثر ایسا کبھی نہیں کر سکے گی مگر ایک دھڑکا تھا جو انھیں لگا ہی رہا۔ میں اس پر تیار ہو گیا کہ آپ شگون کی رسم کردیں۔ اس رسم کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی پرائی ہو گئی ہے اس طرح رشتے لانے والے لوگ جان جاتے تھے اور یہ بات پکی ہو جاتی تھی کہ فلاں لڑکی اب فلاں کے گھر کی بہو ہے۔ یہ رسم کر دینے سے شگفتہ کے باوا کی باتیں یا فیصلہ بدل جانے کا اندیشہ بھی ختم ہو جاتا اور مجھے بھی اطمینان ہو جاتا۔ میں اس سلسلے میں تایا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ تایا کی دل آزاری نہ کرنے کے لیے میں جھوٹ بول دوں گا کہ شگفتہ

کے باوا جلدی کر رہے ہیں۔ یوں تایا یہ نہیں سوچیں گے کہ مجھ پر غموں پر پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے اور ہم شادی کر رہے ہیں۔ یہ تمام باتیں میں سوچ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ شرف الدین کا رشتہ آجائے تو جہانی آپا کا شگون بھی ہو جائے۔ یوں اماں ایک بڑے بوجھ سے چھٹکارا پالیتیں۔

اگلے تمام دن میں مصروف رہا۔ سویرے ہی میں نے خورشید چاچا کے بھتیجے اور بھائی سے رابطہ کیا۔ وہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہو گئے کہ ہم لوگ امروہہ آگئے ہیں۔ خورشید چاچا کے بھائی رشید چاچا نے فوراً ہی اپنی بہو کو حویلی بھیج دیا تاکہ وہ اماں اور بہنوں کا ہاتھ بٹا سکے۔ رشید چاچا نے بھتیجے کو اناج حویلی پہنچانے کا کہہ دیا اور میرے ساتھ خود حویلی میں چلے آئے۔ انھوں نے اماں کو تمام حساب کتاب دیا۔ گودام میں ضرورت کی چیزیں پہنچائیں۔ اس زمانے میں انگیٹھی میں بنولے کا برادہ جلایا جاتا تھا۔ وہ بھی کافی تعداد میں حویلی پہنچا دیا۔ ہر ضرورت کی چیز حویلی میں فراہم کرنے کے بعد میں شام کو نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ میرا ارادہ شرف الدین کے گھر جانے کا تھا۔ رشید چاچا رات تک حویلی میں رہے اور تایا سے باتیں کرتے رہے۔ ان کی بہو حویلی کے کام کاج نمٹاتی رہی اور بھتیجا تایا اور تائی کا کمرا صاف کرتا رہا۔ رشید چاچا کو بھی تائی کے بارے میں سن گن مل چکی تھی۔ غریب اور جاہل آدمی ہونے کے باوجود انھوں نے کسی قسم کی دل آزاری کی بات نہیں کی بلکہ دبے دبے لہجے میں صرف تائی کو بڑے حکیم صاحب کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ بہو کو ان کا خیال رکھنے کی تلقین کی اور بہو نے فوراً ہی ان کے تمام کام اپنے ذمے لے لیے۔ جانے اس نے تائی پر کیا جادو کر دیا کہ وہ بے چون وچرا اس کی باتیں مانتی چلی گئیں۔

ان لوگوں کے آنے سے اماں کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ اماں نے رشید چاچا سے کہہ دیا کہ وہ بہو اور بھتیجے سمیت حویلی چلے آئیں۔ حویلی بہت بڑی تھی، دوسری طرف کے دو تین کمرے وہ اپنے رہنے کے لیے ٹھیک ٹھاک کر سکتے تھے۔ رشید چاچا نے فوراً ہامی بھری اور اگلے ہی روز چلے آنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ میں شرف الدین کے گھر جانے کو نکلا تو کافی ہلکا پھلکا تھا۔ راستے میں پان والے چاچا کے علاوہ محلے کے دوسرے لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ سبھی خوش تھے کہ حویلی آباد ہو گئی ورنہ وہ لوگ اس کی ویرانی سے کافی خوفزدہ تھے۔

میں شرف الدین کے دروازے پر پہنچا تو میرا دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل دھڑکنے کا ایک سبب تو شگفتہ کی ذات تھی اور دوسرا سبب شرف الدین کے باوا تھے۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کافی نالاں تھے۔ ان کے نزدیک میں ایک آوارہ، بدچلن اور فضول قسم کا انسان تھا، طرہ یہ کہ مرزا صولت بیگ کا پڑپوتا تھا اور ان کے خیال میں شرف الدین کی آوارہ گردی کا سب سے بڑا سبب بھی تھا۔ پتا نہیں یہ رائے انھوں نے کب اور کیوں بنالی تھی مگر یہ اطلاع بھی مجھے مل چکی تھی کہ انھوں نے بڑی شد و مد کے بعد شگفتہ کے لیے میرا رشتہ قبول کیا تھا۔ یہ رشتہ انھوں نے شرف الدین اور اپنی بیوی کے دباؤ کی وجہ سے قبول کیا تھا۔ اب جانے ان کا کیا رد عمل ہو۔ یہی بات میرے دل کے دھڑکنے کا ایک سبب تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے یہاں دیکھ کر بھڑک اٹھیں، ممکن ہے اتنے روز میں انھوں نے سوچ بچار کے بعد اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے دیکھ کر خوش ہو جائیں اور مجھے وہی روایتی عزت دیں جو ہونے والے دامادوں کو دی جاتی ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ہی میرے تصور میں شگفتہ کی حیا بار آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ میرا رشتہ دیے جانے کے بعد میں پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے سامنا ہوا تو میں کیسا محسوس کروں گا۔ وہ کیا کرے گی، کیا میرے سامنے آئے گی یا کہیں سے چھپ چھپ کر مجھے دیکھے گی۔ میں ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور دروازہ کھٹکھٹانے کی مجھے ذرا بھی ہمت نہ ہوئی۔ یہی سوچ کر دم نکلتا رہا کہ دروازہ کھولنے والے شگفتہ کے باوا ہوئے تو کیا ہو گا۔

میں اسی شش و پنج میں تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرا دل گویا حلق میں دھڑکنے لگا۔ دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے کانوں میں جلترنگ سے بج اٹھے۔ آواز شگفتہ کی تھی۔

"بھائی جی! رات کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گی میں۔ یہ سوچ لیجیے گا، ورنہ کسی قسم کا کوئی تعاون نہ کروں گی اور آپ کو پتا ہے ناں کہ ابا میری بات کتنی مانتے ہیں۔"

"اچھا تو اب تم مجھے دھمکیاں دو گی؟" یہ شرف الدین تھا۔ وہ گھر سے باہر آگیا تھا مگر اس کی پشت میری طرف تھی۔ میری نگاہیں شگفتہ [illegible]

وہ زور سے ہنسی تو میری نگاہوں میں بجلیاں سی کوند گئیں۔ اس کے موتی سے دانت تباہی مچا گئے۔ عین اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ سکتے کی سی حالت میں رہ گئی۔

"کیوں بولتی بند ہو گئی ناں! میں نے بھی اگر ابا یا دادا دیا کہ وہ مرزا صولت بیگ کا پڑپوتا ہے تو جانتی ہو کیا ہو گا۔ وہ تو موقع کی تاک میں ہیں۔ اللہ واسطے کا بیر ہے انھیں اس خاندان سے۔" وہ مجھ سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ شگفتہ اسے نہیں کسی اور کو دیکھ رہی ہے اور اسی لمحے شگفتہ ہوش میں آگئی۔ وہ جھپٹ کر اندر بھاگی اور شرف الدین پلٹا۔ "ارے۔ تم۔ کب آئے؟" وہ کچھ جھینپ گیا۔

"آں۔ ہاں۔ بس۔ وہ ابھی آیا تھا۔" میں خود بھی گھبرا گیا تھا۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی کیفیت کو سمجھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ لمحے بھر کی گہری خاموشی کو شرف الدین نے توڑا۔ "آؤ۔ اندر آؤ۔ میں بھی تمھاری ہی طرف جانے کو نکلا تھا۔"

"تو پھر چلو۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اب تم آگئے ہو تو اندر چلو۔" اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازے کا پٹ کھول دیا۔

"شرف الدین۔ وہ تمھارے باوا۔"

"اندر ہیں۔ تم اندر تو چلو۔ ویسے آج کل کافی ٹھنڈے ہیں۔ ابھی شگفتہ بتا رہی تھی کہ پچھلے ہفتے اماں سے جھڑپ ہوئی تھی۔ اماں مہینے دو مہینے میں ایک بار گرم ہوتی ہیں اور ایسی گرم ہوتی ہیں کہ ابا کم از کم چھے ماہ تک بالکل ٹھنڈے رہتے ہیں۔" وہ یہ سب بتاتا ہوا مجھے لیے ہوئے بیٹھک میں چلا آیا۔ "تم بیٹھو! میں شگفتہ سے چائے کے لیے کہہ دوں۔" شرف الدین اندر جانے لگا۔

"کسی تکلف میں نہ پڑو۔" میں نے منع کیا مگر وہ ان سنی کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا تو اس کی اماں اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئیں۔ میں آداب کر کے کھڑا ہو گیا۔

"کیسے ہو بیٹا!" وہ سر پر ہاتھ پھیر کر بیٹھ گئیں۔ پھر انھوں نے اماں اور بہنوں کے بارے میں پوچھا۔ گھر آنے کو کہا اور اندر چلی گئیں۔ ان کے چہرے پر مجھے دیکھ کر بڑی محبت امنڈ آئی تھی جس نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ ذرا دیر بعد اندرونی دروازے پر ہلکی سی، مدھم سی دستک ہوئی۔ یوں لگا جیسے یہ دستک کسی نے میرے دل پر دی ہو۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اس دستک میں شرمیلا پن محسوس کر گیا تھا۔ وہ سو فی صد شگفتہ کی نرم و نازک انگلیوں کی دستک تھی۔

"بھائی جی!" ایک دبی دبی سی آواز آئی۔ میں خواہ مخواہ دوسری جانب دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ شرف الدین جھپٹ کر دروازے پر جائے گا مگر وہ بیٹھا رہا۔

دستک پھر ہوئی۔ میں نے چونک کر شرف الدین کو دیکھا۔ وہ سامنے کی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"ارے کیا ہے بھئی۔ چل چل کر تھک چکا ہوں میں۔ تمھیں اندر آنے سے کسی نے منع کیا ہے کیا؟" شرف الدین نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"چائے لے لیں بھائی۔" دبی دبی آواز پھر سنائی دی۔ اس آواز میں جانے کیا تھا کہ میرے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"چائے اندر لے آؤ بہن۔" شرف الدین نے اسی لہجے میں کہا۔ مجھے اس کے اس انداز پر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی کہ وہ یہاں۔ اس کردار میں بڑا منفرد تھا۔ وہ حقیقتاً "بہت سلجھا ہوا آدمی تھا۔ اس کی سوچ میں منفی نہیں مثبت پہلو نمایاں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ سخت پہرہ اور دوسری گھٹیا قسم کی پابندیوں کو نافذ کر دیتا مگر شرف الدین حقیقت پسند، اور سلجھی ہوئی سوچ کا مالک تھا۔

شگفتہ غالباً" اندر آنے کو تیار نہ تھی۔ میں کہنے پر مجبور ہو گیا کہ شرف الدین اٹھ کر چائے لے لے۔

"ارے تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس نے پردہ کیوں کر لیا ہے۔ کیا اس سے پہلے یہ تمھارے سامنے نہیں آئی؟ اب کون سی نئی بات ہو گئی ہے؟ رشتے استوار ہو جائیں تو مضبوط ہو جاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ شگفتہ جھجکتی ہوئی، شرماتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور چہرہ شرم سے تپ رہا تھا۔

"شاباش! زندگی کو سیدھے سادے طریقے سے رکھنا چاہیے۔ ٹھیک ہے کہ ہمارا خاندان بہت دقیانوسی ہے۔ بالخصوص پابندیوں میں مگر میں ذرا خاندان سے مختلف ہوں۔ وقار الحسن میرا بہت اچھا دوست ہے، "قابل اعتبار" قابل اعتماد اور شریف آدمی۔ تم بے وجہ جھجک محسوس نہ کیا کرو۔

زندگی اب اس نہج پر نہیں ہے۔ یہ صرف اموبہ ہی میں اس قدر گھٹ کر رہ گئی ہے ورنہ دنیا جان چکی ہے کہ ہر معاملہ افہام و تفہیم اور میل ملاپ سے سلجھ جاتا ہے۔ اچھا اب تم چائے نکالو' میں اماں سے سوہن حلوہ لے کر آتا ہوں۔" وہ اتنا کہتے ہی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

میں اور شگفتہ دونوں ہی گھبرا گئے۔ مجھے تو ان کے باوا کا خوف تھا۔ پتا نہیں شگفتہ کی گھبراہٹ کا سبب میں تھا یا وہی ان کے باوا۔ بہرحال وقت کم تھا۔ میں اسے دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ باتیں بھی کرنا چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر اسے پائل کا تحفہ بھی دینا چاہتا تھا پھر میں نے جلدی سے جیب سے پائل نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے صرف لمحے بھر کو میری طرف دیکھا پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"یہ۔ یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔ بہت دنوں سے رکھی تھی پر۔" میں اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ وہیں جمی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے نمایاں آثار تھے۔ مجھے شرف الدین کے آنے کا دھڑکا تھا۔ "پلیز۔ لے لیں ورنہ میں بہت بے چین رہوں گا۔ یہ تحفہ قبول کریں گی تو آپ کے دل کا حال جان جاؤں گا ورنہ یک طرفہ فیصلہ سمجھ کر زندگی بھر بے کل رہوں گا۔"

اور اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر جیسے اس کے دل کا سارا حال کندہ تھا۔ جی تو چاہا کہ وہ نرم نازک سی' سنہری ہتھیلی تھام کر اس سے سب کچھ کہہ ڈالوں مگر کڑے پہروں' دیوار و در کی بصارتوں اور سماعتوں نے مجھے روک دیا۔ پائل اس کی ہتھیلی پر ہولے سے گری تو پتا نہیں چلا کہ گھونگھروں کی چھنک ہتھیلی سے ابھری تھی یا پائل سے۔ مجھے تو اس کا انگ انگ چھنکتا محسوس ہو رہا تھا۔ پائل اس نے مٹھی میں بھینچ لی۔ حیران' چمکتی اور ہنستی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں سے ٹکرائیں' مجھے خود کو سنبھالنا محال ہو گیا۔

"شکریہ' آپ کا یہ تحفہ ہم جان سے عزیز تر رکھیں گے۔"

یہ جملہ کیا تھا ایک مکمل اور ضخیم کتاب تھی۔ ساری تشنگی جاتی رہی۔ میں نے دنیا زیادہ روشن' موسم بہت خوشگوار اور گھٹے ہوئے کمرے کو بہت زیادہ کشادہ محسوس کیا۔ شاید محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ جلدی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔ میں موڑھے پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اماں کا جملہ ذہن میں گردش کرتا رہا کہ جس قدر جلد ہو نکاح کر کے شگفتہ کو گھر لے آؤ۔ اس لمحے میں سب اگلے پچھلے' اچھے برے حالات بھول گیا اور سوچنے لگا کہ اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ اتنی بڑی حویلی میں گھٹن کا احساس بڑھنے سے پہلے ہی مجھے ایسا کر لینا چاہیے۔ اس لمحے میں قطعی خود غرض اور اپنی ذات میں مکمل انسان بن چکا تھا۔ اپنی ذات میں مکمل انسان بننے سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی ساری دنیا خود ہی بن گیا تھا یوں جیسے نہ مجھے کسی اور کے غم سے سروکار ہو نہ کسی کی خوشی سے تعلق۔ میں صرف میں تھا' میری خواہشیں تھیں' تمنائیں تھیں اور سامنے وہ سائبان تھا جس کی چھاؤں مجھے ایسی فرحت اور ٹھنڈک پہنچا رہی تھی کہ میں دھوپ کی تمازت اور اس کی شدت کا احساس تک کھو بیٹھا تھا۔

ذرا دیر بعد ہی شرف الدین آ گیا۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک تھی۔ وہ آتے ہی میرے برابر میں بیٹھ گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے خود سا ہو کر بولا۔ "وقار الحسن! آدمی کبھی کبھی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے جیسے اس کے سوا دنیا میں کچھ اور ہو ہی نہیں۔"

میں بری طرح اچھل پڑا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ میں خوفزدہ ہو گیا کہ شاید ایک پراسرار قوت کی طرح اسے بھی میری ہی طرح کی وہ پراسرار قوت حاصل ہو گئی ہے جو ذہنوں کو پڑھ لیتی ہے۔ شگفتہ بھی چونک کر شرف الدین کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے وہ ہاتھ دوپٹے کے پلو میں لپیٹ لیا جس میں اب بھی پائل گویا میرا دل بند تھا۔

"کک۔ کیا ہو گیا؟" میں کچھ گھبرا کر بولا۔

"بس یار' کچھ جذبے آدمی سے بہت عرصے تک پوشیدہ رہتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنی ہی ذات کے کچھ پہلوؤں سے ناواقف ہوتا ہے اور ایک روز اچانک اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کیسے خزینے سمیٹے ہوئے تھا۔" وہ جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا البتہ اتنا میں جان گیا تھا کہ جو کچھ بھی تھا میری ذات سے متعلق نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر جس انجانی خوشی کی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی اس نے مجھے قدرے اطمینان بخشا تھا۔

اس دوران میں شگفتہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی اس کی جانب بڑھائی۔ "بھیا جی!"

"ہوں!" وہ چونک اٹھا۔ "ہاں چائے۔ ٹھیک ہے گڑیا رانی۔ جلدی جلدی خدمت کر لو پھر تو۔۔۔"

وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ شگفتہ اور میں دونوں سمجھ گئے۔ شگفتہ جلدی سے میری چائے تپائی پر رکھ کر پلٹ گئی اور جھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔ میں خاموش بیٹھا اپنے اندر اٹھتے جذبات کے بھنور میں چکر کھاتا رہا۔

"وقار الحسن! شگفتہ میری جان ہے۔ میری اس بہن کو کانٹا بھی چبھے تو میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ اسے کوئی دکھ نہیں دینا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو شرف الدین۔ لیکن۔ میں اس وجہ سے کہہ رہا تھا کہ ان حالات میں۔۔۔"

"نہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "میں حالات کی بات نہیں کر رہا۔ تمہاری بات کر رہا ہوں۔ حالات کی سنگلاخی سہنے کو وہ چٹان ہے مگر تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ یا لہجے کی ہلکی سی تلخی بھی اس کے وجود میں دراڑیں ڈال دے گی۔"

"اس بارے میں تم ذرا فکر نہ کرو شرف الدین۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ حالات بھی اس پر اثرانداز نہ ہو سکیں۔" میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے۔ میں اس دوران میں خود کو ہمت دلاتا رہا کہ بات آگے بڑھا کر اسے ہمت دوں سو میں نے کہا۔ "اماں شگون کا کہہ رہی تھیں۔ وہ تو جلد از جلد یہ معاملہ نمٹانا چاہتی ہیں۔ میں بھی ان حالات میں زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کوثر کو یوں بے یارومددگار چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔ مجھے بہرحال جانا ہو گا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شگون کی رسم ہو جائے تاکہ میں اطمینان سے یکسو ہو کر اپنا کام کر سکوں گا مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"مگر اس میں بھی ایک قباحت ہے۔" میں نے اتنا کہہ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور چہرے پر بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ "میں چاہتا تھا کہ کم از کم جہانی آپا کی کہیں بات طے ہو جائے تو دونوں شگون ایک ساتھ کر دوں۔ وہ مجھ سے بڑی ہیں' میری شادی یا شگون سے پہلے ان کا حق تھا۔" میں نے دل کی بات زبان پر لا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اچانک ہی اطمینان پھیل چکا تھا۔

"وقار الحسن!" اس نے دھیرے سے مجھے مخاطب کیا پھر پیر کے انگوٹھے سے زمین پر بچھی دری کو کریدنے لگا۔ "پتا نہیں تم میری بات کا کیا مطلب لو گے' میرے بارے میں کیا سوچو گے مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھ پر اعتماد ضرور کرو گے۔ میں۔ چاہتا ہوں کہ یہ دونوں شگون ایک ساتھ ہوں۔ میں بھی اگر تم۔ مجھے قبول کرو تو۔"

اس کے اتنا کہتے ہی میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"شرف الدین تمہیں یہ سب کہنے میں آخر کیا قباحت تھی؟ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں تھا کیا؟" میں نے شکوہ کیا۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک مجھ سے چمٹ گیا۔ "شکریہ۔ شکریہ دوست۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

○

شرف الدین کے منہ سے یہ سن کر گویا بات صاف ہو گئی تھی' پھر اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی اماں کو راضی کر لیا ہے۔ باوا نے حسب عادت ناک بھنویں چڑھائی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شرف الدین پر بھی ارواح کا اثر ہو گیا ہے جو اسے بھی اس حویلی میں گھسیٹ لے جانا چاہتی ہیں۔ وہ سخت برہم تھے کہ ایک کے بعد دوسرا رشتہ بھی اسی گھرانے میں کیا جا رہا ہے۔ شرف الدین کو وہ اپنی بھانجی سے بیاہنا چاہتے تھے۔ یوں تو اپنے طور پر انھوں نے شگفتہ کے لیے بھی رشتہ ڈھونڈ رکھا تھا۔ ان کے بھائی کا بیٹا انجینئرنگ کر رہا تھا۔ ان کے خیال میں اس کے لیے اس سے اچھا بر نہیں تھا۔ بھائی بھاوج بھی شگفتہ کو پسند کرتے تھے مگر شگفتہ کی اماں جب سے بیاہ کر ان کے گھر گئی تھیں تب ہی سے انھیں ان دونوں میاں بیوی سے اللہ واسطے کا بیر تھا جو بالکل انگریزوں کی طرح رہتے تھے اور خود کو انگریز ہی سمجھتے تھے۔ روزے نماز کا ان کے یہاں کوئی تصور نہ تھا۔ فیشن کرنا اور انگریزی میں باتیں کرنا ان لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اماں کا کہنا تھا کہ میں نے بچی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت دی ہے۔ کیوں میرے گلے میں ان کا اعمال نامہ ڈلوانے کا سوچ رہے ہیں۔ میں اپنی مسلمان بچی کو انگریز بنتے نہیں دیکھ سکتی۔ شرف الدین بھی ان لوگوں سے بدکا رہتا تھا۔ اس نے بھی جی کھول کر اس رشتے کی مخالفت کی تھی اور میرے لیے حمایت کرتے کرتے وہ حد سے گزر گیا تھا۔ اس نے کسی سہیلی ہی کی طرح شگفتہ کا عندیہ لے کر باوا تک پہنچایا تھا جس پر وہ کئی روز دالان ہی تک محدود رہے۔ کمروں میں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ کھانا پینا بھی باہر سے کرتے رہے تھے۔ شرف الدین تو ان کی اس حرکت سے پریشان ہو گیا تھا مگر

اس کی اماں نے اسے تسلی دلا دی تھی کہ یہ ان کی بچپن کی عادت ہے۔ چار روز بعد پیٹ کے درد سے پریشان ہو کر گھر کا کھانا منگوا لیتے ہیں اور آٹھویں روز اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے ہیں۔

وہی ہوا بھی، کچھ روز پھولے رہنے کے بعد وہ ٹھیک ہو گئے تھے مگر ہر بات پر مرزا صولت بیگ کی عیاشیوں کی مثال دینا نہیں بھولتے تھے۔ شگفتہ تو ان کے سامنے آتے بھی گھبراتی تھی۔ اماں ان کی بڑبڑاہٹ پر کان ہی نہ دھرتی تھیں اور جب شرف الدین نے جہانی آپا کے لیے بات کی تو انھیں پتنگے ہی لگ گئے تھے۔ کئی دن گھر میں ہنگامہ کیے رہے۔ بھائی بھاوج کے پاس جانے کی دھمکیاں بھی دیں۔ اماں نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ جوان بیٹا ہے، زبردستی کر کے اپنا لحاظ ختم نہیں کروں گی۔ شرف الدین نے صاف کہہ دیا کہ زندگی مجھے گزارنا ہے۔ آپ کی بھانجی کی ناک آپ کے بہنوئی پر گئی ہے اور وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ انھیں اپنی دولت پر گھمنڈ ہے، میں دولت کو ہاتھ کا میل سمجھتا ہوں۔ وہ دولت کی دھاک بٹھا کر مجھے زیر کرنا چاہتے ہیں، ان کی ہر بات پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہوتی ہے۔ اپنی بیٹی کے پھوہڑپن کو بھی دولت کی فراوانی میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تین آدمیوں کے گھر میں چار نوکر ہیں۔ پرائیویسی بالکل نہیں ہے، میں وہاں شادی نہیں کر سکتا۔ وہ بل کھا کر رہ گئے تھے۔ سارا الزام پہلے اپنی بیوی پر پھر مجھ پر رکھ دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ شرف الدین پر میں نے جادو کر دیا ہے۔ خیر ایسی ہزاروں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئیں جو شرف الدین مجھے وقتاً فوقتاً بتاتا رہا۔ ہم رات گئے تک ساتھ گھومتے رہے۔ ہم منصور چاچا کے گھر کی طرف بھی گئے مگر اس کچے مکان کی ویرانی نے دل ہولا دیا۔ کبھی یہاں جلنے والی لالٹین کی روشنی گلی تک کو منور رکھا کرتی تھی اور لڈن باہر بیٹھا بیڑی پیتا رہتا تھا۔ اس گلی سے گزرتے ہوئے مجھ پر اور شرف الدین پر افسردگی چھائی رہی۔ رات کا وقت تھا۔ گلی سنسان تھی ورنہ کسی پڑوسی سے واردات کے بارے میں پوچھتے۔ ہمارا رخ حویلی کی طرف تھا۔ میں نے شرف الدین سے کہا بھی کہ میں چلا جاؤں گا، وہ لوٹ جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے حویلی تک چھوڑنا چاہتا تھا۔

"تایا کیسے ہیں؟" اچانک اس نے گمبھیر خاموشی کو توڑا۔

"ان کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے شرف الدین۔ اس غیر متوقع اور عظیم غم نے انھیں گھلا کر رکھ دیا ہے۔ صرف کوثر کا دکھ ہوتا تو شاید دونوں میاں بیوی مل کر جھیل لیتے مگر تائی کی حالت نے انھیں اور نڈھال کر دیا ہے۔"

"مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ کس قدر خوش مزاج تھے۔" اس نے سرد آہ بھر کر کہا پھر چونک کر بولا۔ "کوثر نے یہ سب کچھ کیسے کر لیا وقار الحسن! کسی کو کچھ پتا ہی نہ چلا۔"

تب میں نے اسے ساری بات بتائی۔

"تمہیں اسی وقت اس پر سختی کرنا چاہیے تھی۔"

"میں نہیں جانتا تھا کہ وہ یہ انتہائی قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اسے سادھو نے ورغلایا ہو گا۔" اس نے یقین سے کہا۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح شکست دینا چاہتا تھا۔"

"شگفتہ کا کیا ہو گا؟ وہ کس حال میں ہو گی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا شرف الدین چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔" میں نے پر عزم لہجے میں جواب دیا۔

"اس مکان کا کیا ہو گا؟"

"ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ کچھ سکون ملے تو سوچوں۔"

"ان لوگوں کو یہیں چھوڑ کر جانے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ہاں۔ ان کا یہاں رہنا زیادہ مناسب ہے۔ میں مطمئن رہوں گا۔"

ہم باتیں کرتے کرتے حویلی تک پہنچ گئے۔ رخصت ہوتے ہوئے شرف الدین نے بتایا کہ وہ کل اماں کو لے کر آئے گا کہ وہ باقاعدہ رشتہ دے سکیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ انھیں، مایوسی نہیں ہو گی۔ میں اماں سے بات کر لوں گا۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ میں نے حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خورشید چاچا کا بھتیجا میرے ہی انتظار میں گیٹ کے برابر پڑے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ اس نے پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ اماں میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ جہانی آپا اور شنو آپا بھی ان کے پلنگ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے اماں کو سلام کر کے تایا کے بارے میں پوچھا۔ پتا چلا کہ تایا اپنے کمرے میں ہیں اور تائی ان سے لڑ رہی ہیں۔

یہ سنتے ہی میں ان کے کمرے میں گیا۔ تائی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ تایا کے سامنے پڑی مسہری پر ابھی تک برقع اوڑھے بیٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ "کوثر کے سسرال کے لیے مٹھائی کے ٹوکرے منگوا کر دیں۔"

میں نے اندر داخل ہو کر تایا کو سلام کیا اور تائی کے برابر جا بیٹھا۔ "تائی! میں مٹھائی کے ٹوکروں کا آرڈر دے آیا ہوں۔ اتنی بہت سی مٹھائی تیار ہونے میں بہت وقت لگے گا لیکن اس نے وعدہ کیا ہے کہ جیسے ہی مٹھائی تیار ہو گئی وہ اطلاع کر دے گا۔ آپ برقع اتار کر اطمینان سے سو جائیں۔ اطلاع ملتے ہی میں اٹھا دوں گا۔"

"تو بھیا بار بار میں برقع ہی اتارے جاؤں۔" وہ ہاتھ جھٹک کر بولیں اور منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔

"یہ ہماری جان لے لے گی۔" تایا نے لیٹے لیٹے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں تایا۔ میں سویرے حکیم صاحب کو لے آؤں گا۔" میں خجل سا ہو گیا تھا۔ اصولاً مجھے پہلا کام یہاں آتے ہی یہ کرنا چاہیے تھا کہ میں حکیم علی احمد صاحب کو لے کر آتا اور تائی کو دکھاتا۔

"مگر علاج تو ہوتے ہوتے ہی ہو گا ناں۔ یہ پگلی تو۔۔۔"

پھر وہ اچانک چپ ہو کر کچھ سننے لگے۔ پہلے تو میں نے دھیان نہیں دیا پھر اچانک ہی مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے اوپر کوئی بکس گھسیٹ رہا ہو۔ آواز یقیناً اوپری منزل سے آئی تھی۔ میں باہر کی طرف لپکا۔

"اوپر مت جانا وقار۔" پشت سے تایا کی آواز سنائی دی۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو اماں، جہانی آپا اور شنو آپا بھی ہونقوں کی طرح باہر کھڑی اوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اماں مجھے دیکھ کر میری طرف لپک آئیں۔ "وقار الحسن! یہ آوازیں۔۔۔"

"آپ ان لوگوں کو لے کر اندر کمرے میں جائیں۔" میں نے اماں سے کہا اور خود حویلی کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں رشید چاچا اپنی بہو اور بھتیجے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ میرے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگ بھی کمروں سے باہر نکل آئے۔ اب آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اوپر کوئی شخص کچھ تلاش کر رہا ہے۔ چیزوں کے ادھر ادھر پھینکے جانے کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ذرا سی دیر میں ایک طوفان بدتمیزی مچ گیا۔ اماں وغیرہ اندر جانے کی بجائے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھیں۔ دونوں بہنوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ تایا ہانپتے کانپتے باہر آ چکے تھے۔ میں اور میرے پیچھے رشید چاچا، ان کا بھتیجا اور ان کی بہو بھی تھی۔ ہم سب صحن میں کھڑے اوپری منزل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں اوپر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر ان سب کو دیکھ کر چپ تھا۔ میں جانتا تھا کہ اماں، تایا کبھی بھی مجھے اوپر نہیں جانے دیں گے۔

"آج کیا تاریخ ہے؟" شنو آپا کی لرزتی کانپتی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ بے اختیار میری نگاہ آسمان کے مشرقی کونے کی طرف اٹھ گئی۔ چاند کا زرد گولا آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔

"آج سولہ تاریخ ہے۔" یہ آواز رشید چاچا کی تھی۔ پتا نہیں وہ اس حویلی کے بارے میں کیا جانتے تھے۔ ممکن ہے خورشید چاچا نے انھیں کچھ بتایا ہو جبھی تو وہ وہیں کھڑے اوپر تک رہے تھے ورنہ ممکن ہے کہ اوپر جانے کی کوشش کرتے۔

"چھوٹے مرزا! میں دیکھوں جا کر؟" ان کے بھتیجے نے زور سے کہا۔ اب اوپر اٹھا پٹخ کی آوازیں اتنی بلند ہو چکی تھیں کہ کان پھٹے جا رہے تھے۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ سے اسے روک دیا۔

"مجھے چاچا نے بتایا تھا۔ پر میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا چھوٹے مرزا۔ اللہ کے بعد کوئی نہیں ہے۔ جس گھر میں اللہ رسولؐ کا نام لیا جاتا ہو وہاں کوئی بد روح نہیں آ سکتی۔" وہ تمام کہانی سے بے خبر اپنے نظریے کا اظہار کر رہا تھا۔ اماں نے فوراً ہی اونچی آواز میں آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ بہنیں بھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگیں۔

"یہ شگفتہ ہو گی ناں! مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ اسے سادھو نے قید کر لیا ہے۔ وہ یہاں آ نہیں سکتی۔ حویلی خالی ہو چکی ہے۔" تایا نے میرے قریب آ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں تایا۔ لیکن ممکن ہے وہ۔ آپ اماں کو اندر لے جائیں۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں۔ میاں۔ اب دم نہیں ہے۔ اگر یہ سلسلہ اب پھر جاری ہو گیا تو یہاں رہنا محال ہو جائے گا۔"

"میں یہ سلسلہ جاری نہیں رہنے دوں گا۔" میں نے عزم سے کہا پھر اچانک ہی مجھے لگا جیسے مجھے کچھ ہونے لگا ہو۔ اوپر کا حال جاننا چاہتا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ مجھ پر ہلکی سی غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے رشید چاچا سے مونڈھا لانے

لو تا۔ وہ لپک کر گیٹ کے پاس رکھا ہوا موڑھا اٹھا لائے۔ میں وہاں بیٹھنا چاہتا تھا کہ اماں نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ "اندر چلو۔ وقار الحسن۔ اندر چلو۔"

مجھے پتا نہیں چلا اور میں کسی معمول کی طرح چلتا ہوا اندر چلا آیا۔ انھوں نے مجھے مسہری پر بٹھا دیا۔ میں خالی خالی آنکھوں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ "تم۔ ٹھیک تو ہو ناں؟" اماں پریشان ہو گئی تھیں۔

"جی اماں۔ میں لیٹنا چاہتا ہوں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے حتی الامکان نارمل ہو کر کہا۔

"یہیں لیٹ جاؤ۔" انھوں نے مجھے لٹا دیا اور خود زور زور سے آیتہ الکرسی پڑھنے لگیں۔ جہانی آپا فوراً میرے سرہانے بیٹھ گئیں۔ میں ذہن جھٹک جھٹک کر اپنی اس کیفیت سے نجات پانا چاہتا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں بعد اوپر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ تایا اسی کمرے میں چلے آئے۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی دھماکا بن کر گونجتی۔ سب پر خاموشی طاری تھی۔ سب کی سماعتیں آنگن میں لگی تھیں۔ اماں آیتہ الکرسی ختم کر چکی تھیں یا شاید آواز ختم ہوتے ہی وہ بے اختیار منہ ہی منہ میں پڑھنے لگی تھیں۔ آنگن میں اچانک آہٹیں گونجیں تو سب پھر چونک اٹھے مگر بہت جلدی جان گئے کہ یہ آوازیں رشید چاچا وغیرہ کی تھیں جو اب اماں کے دروازے پر کھڑے تھے۔

"بڑا میں اوپر جا کر دیکھ آتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کوئی چور وور ہو گا۔ اسے پتا نہیں ہو گا کہ ہم لوگ آ چکے ہیں۔" رشید چاچا بولے تو گہرا سناٹا ٹوٹ گیا۔

"نہیں رشید چاچا۔ آپ لوگ اپنے کمرے میں جائیں۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔" اماں نے فوراً کہا۔ وہ لوگ دو منٹ کھڑے سب کو دیکھتے رہے پھر تایا نے سر کے اشارے سے انھیں جانے کو کہا تو وہ لوگ چلے گئے۔

"تائی کہاں ہیں؟" میں نے تایا سے پوچھا۔

"سو گئی ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"آپ بھی سو جائیں تایا۔"

"تم ٹھیک تو ہو ناں؟" انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

"جی تایا۔ شاید تھکن کی وجہ سے نڈھال ہوں۔"

"ٹھیک ہے اب آرام کرو۔ اللہ مالک ہے۔" انھوں نے کہا اور باقی سب کو بھی اطمینان سے سونے کا کہہ کر باہر چلے گئے۔

اماں نے جہانی آپا اور شنو آپا کو لیٹ جانے کو کہا تو وہ لیٹ گئیں۔ اماں میری پائنتی کو بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ ان کے ہونٹ ہلنے لگے۔ میں نے پھر خود کو عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا محسوس کیا۔ میں بہت ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ یوں جیسے بے وزنی کی کیفیت کا شکار ہو گیا ہوں۔ آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ پپوٹے بھاری ہونے لگے تھے۔ میں نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے لگا جیسے میں ہواؤں میں اڑنے لگا ہوں۔ میں کسی غیر مرئی وجود کی طرح کمرے سے باہر نکلا۔ بڑا برآمدہ پار کر کے میں اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔ میں اپنے اردگرد کی تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں سیڑھی پر قدم بہ قدم چڑھنے لگا مگر میرے پیروں تلے کچھ بھی نہ تھا یوں جیسے میں زمین سے کچھ اوپر چل رہا ہوں۔ اوپری منزل پر پہنچ کر میں رک گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کو دو چھتی بنی تھی۔ وہی دو چھتی جس کے کواڑ پر گیندے کے تازہ پھولوں کا ہار لٹکا ہوا تھا۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں بلا کسی دقت کے دو چھتی تک پہنچ گیا۔ اس کا دوسرا پٹ بے آواز کھلتا چلا گیا تھا۔ میں پہلی بار اس دو چھتی میں داخل ہو رہا تھا۔ اندر لالٹین یا لیمپ نہ ہونے کے باوجود ایک ایک چیز اور دیوار پر پڑا ایک ایک دھبا مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اندر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ یہاں چونے کے خالی ڈبے، لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا سامان، لوہے کے دو بڑے بکس، کچھ پرانی چٹائیاں اور چند تانبے کے بڑے بڑے بگونے اور تھالیاں یوں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں جیسے یہاں ابھی طوفان آ کر گیا ہے۔ گویا آوازیں اسی دو چھتی سے آ رہی تھیں۔ اندر ایک طرف ایک لوہے کا بکس رکھا تھا جس پر پیتل کے دو بڑے پیالے رکھے تھے۔ وہیں قریب ہی مٹی کے تیل کا ایک کنستر پڑا تھا جو بالکل سیاہ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر دھواں لگا ہوا ہے۔ اچانک مجھے گوشت کے جلنے کی بو نے چونکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی عجیب خوفناک قسم کی چرچراہٹ بھی سنائی دی۔ چربی جلنے کی بو اتنی تیزی سے چاروں طرف پھیلی تھی کہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا، نہیں بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ میں نے خود کو پیچھے کی طرف اڑتا ہوا محسوس کیا۔ ابھی میں دو چھتی کے دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ہلکی ہلکی کراہوں نے مجھے ساکت کر دیا۔ کوئی تڑپ رہا تھا۔ کراہ رہا تھا۔

"پرکاش۔" میرے اندر ایک تیز سرگوشی گونجی۔ یقیناً یہ کراہوں کی آواز پرکاش کی تھی۔ میں تو پرکاش کو فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔ وہ پرکاش جس کی تلاش میں شگفتہ کی روح برسوں سے یہاں بھٹک رہی تھی۔ میں اس خیال کے آتے ہی آگے بڑھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ یہیں کہیں ہے اسی دو چھتی پر۔ اس خیال کے آتے ہی کونے میں رکھا بکس کھل گیا۔ اس پر رکھے پیتل کے پیالے اور دوسری چیزیں ایک تیز آواز کے ساتھ لڑھک کر فرش پر جا پڑیں۔ ایک شور ہوا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں ہواؤں میں تیرتا ہوا گویا آگے بڑھا اور جونہی میں نے بکس کے اندر نگاہ ڈالی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کسی کی اکڑی ہوئی لاش اس میں پڑی تھی۔ گوشت کھال یا چربی نام کی کوئی چیز اس پر نہ تھی۔ کوئلہ بنی ہڈیوں کا پنجر تھا جس نے مجھے تھرتھرا کر رکھ دیا۔ یہ یقیناً پرکاش کا ڈھانچہ تھا۔ میں کچھ دیر ساکت کھڑا رہا پھر یوں لگا جیسے میں واپس نکل رہا ہوں۔ یہ سب کچھ خود بہ خود ہو رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ مجھ پر طاری ہونے والی کیفیت مجھے غیر مرئی بنا کر مجھے وہاں تک لے گئی تھی۔ یہ تیسری بار ہوا تھا۔ پہلی بار کوثر کے بارے میں جان کر کہ وہ گھر چھوڑ گئی ہے۔ میں نے پوری شدت سے اس کے بارے میں جاننا چاہا تھا پھر اسی روز شگفتہ کے بارے میں پریشان ہو کر اس کے بارے میں۔ حساس ہو گیا تو اسے بھی دیکھ لیا اور اب میں اوپر کی ان آوازوں کا راز جاننا چاہتا تھا تو جان گیا۔

"وقار الحسن پانی پی لو۔" اماں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یوں لگا تھا جیسے میں خواب سے چونکا ہوں۔ اماں ہاتھ میں پانی سے بھرا کٹورا لیے کھڑی تھیں۔

"کیوں اماں؟" میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"تم پانی مانگ رہے تھے۔" اماں کا جواب سن کر میں نے کٹورا ہاتھ میں لے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سب پانی پی گیا۔ پانی پی کر میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ جہانی آپا اور شنو آپا دوسرے پلنگ پر پیر سکیڑے لیٹی تھیں اور بے خبر سو رہی تھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔

"اماں آپ سو جائیے۔ میں اپنے کمرے میں سو جاؤں گا۔"

"مگر بیٹا۔"

"نہیں اماں۔ آپ کب تک جاگیں گی۔ ویسے بھی اب اوپر خاموشی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت بھی نہ ر اماں میرے نزدیک۔ سسر ہے بابا مجھے وہ قوتیں عطا کر چکے ہیں اللہ کی مدد سے کہ اب کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔" میرے لہجے کی مضبوطی نے اماں کو چپ کرا دیا۔

میں ان سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ جاتے جاتے میں نے تایا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ لالٹین کی نیچی لو میں بے خبر سوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ تائی بھی غافل سو رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرا صاف ستھرا کیا جا چکا تھا۔ میں مسہری پر لیٹ گیا اور آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں خوش تھا کہ پرکاش کی لاش کے بارے میں جان چکا تھا۔ کاش میں اب سے پہلے ہی جان گیا ہوتا تو شگفتہ پر سکون ہو چکی ہوتی۔ اب میں یہ ہڈیوں کا پنجر وہاں سے نکالنا چاہتا تھا مگر پریشانی یہ تھی کہ میں اسے کہاں سے لے کر جاؤں، کسے دوں، اسے نکالنا اور کہیں لے جانا میرے لیے پریشانی کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ برسوں پہلے کا قتل میرے گلے کا پھندا بھی بن سکتا تھا۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا پھر کچھ سمجھ میں نہ آنے پر اتنا فیصلہ ضرور کر لیا کہ ایک مرتبہ پھر اپنا اطمینان ضرور کر لوں کہ وہاں واقعی پنجر ہے یا یہ کوئی خواب تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں آئے کافی دیر گزر چکی تو میں دبے پاؤں اٹھا اور برآمدہ عبور کر کے سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں گھپ اندھیرا نہیں تھا کیونکہ چاند اب کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس کی چاندنی سامنے کی دیوار پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے سیڑھیاں بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں بڑی آسانی سے پہلی منزل تک پہنچ گیا۔ ایک لمبا برآمدہ جیسا تھا جس کے دائیں طرف دو چھتی بنی تھی اور بائیں طرف اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں جن پر دروازہ لگا ہوا تھا۔ یہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ دادی نے تیسری منزل کو مکمل طور پر مقفل کر دیا تھا۔ اسی دروازے کو ہم ایک بار کھول چکے تھے مگر پھر اسے بند بھی کر دیا تھا۔ میں جونہی دو چھتی کی طرف بڑھا دو چھتی کا بھڑا ہوا پٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اچک کر اس دروازے کو کھولنا چاہا جب میرا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا تو میں پلٹا تاکہ نیچے سے کوئی اسٹول اٹھا لاؤں۔ میں جونہی پلٹا کسی سے ٹکرا کر سیڑھیوں پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس اچانک ٹکراؤ اور گرنے کی وجہ سے بے ساختہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں پلٹا اور اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

وہ سادھو تھا۔ اس بار پھر اس کی ہیت بدلی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے' بالوں کی لٹیں بل کھائی ہوئی اس کے شانوں پر بکھری تھیں۔ اس کا زرد رنگ گلابی ہو رہا تھا۔ تیز چبھتی ہوئی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ چہرے پر خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس بار اس کا بدن فربہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے شانے چوڑے اور سیدھے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کے چہرے پر پھیلی خباثت میں کئی گناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کی باچھوں میں بھرا جھاگ مجھے کراہیت دلا رہا تھا۔

"تت۔۔ تم۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمھاری جرات کیسے ہوئے یہاں آنے کی؟" میں نے حتی الامکان آواز کو دباتے ہوئے کہا مگر میرا لہجہ بڑا درشت تھا۔

"تم سے ایک کام تھا وکارالحسن!" اس نے اپنی کھڑکھڑاتی اور سماعت میں سیسہ انڈیلتی آواز میں یوں کہا جیسے وہ میرا پرانا دوست ہے اور میرے پاس ضروری کام سے آیا ہے۔

"تمہیں مجھ سے جو کام تھا وہ تو تم کر چکے ہو' اب میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جسے تم حاصل کرنا چاہتے ہو۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"وکارالحسن! تمھارے اندر شکتی کے کھزانے ہیں۔ یہ بات تو اب تم پر بھی کھل چکی ہوگی۔ میں تمہیں نکسان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں تمھارا چیلا بننا چاہتا ہوں اور۔۔ اور شکنتلا کی پائل چاہتا ہوں۔"

پائل کی بات اس کی زبان سے سن کر میں اچنبھے میں رہ گیا۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ وہ معمولی سی پائل کے لیے اتنی دور تک میرا پیچھا کرے گا۔ "کیسی پائل؟" میں بالکل انجان بن گیا۔

"اس کی ایک پائل تھی وکارالحسن! اس کی کوئی بھی چیز یہاں رہی تو میرے لیے پریشانی بنی رہے گی۔ وہ یہیں حویلی میں کہیں ہے' اسے پانا میرے لیے صرف اس لیے اس کدر ضروری ہے کہ میں اس کا سمبندھ اس حویلی سے مکمل طور پر کھتم کر دوں۔ وہ میرے پاس ہے مگر اس کی آتما اس حویلی اور میرے بیچ بھٹک رہی ہے۔ میں اتنا ہی معلوم کر پایا ہوں کہ ایک پائل یہاں رہ گئی ہے۔ یہ وہی پائل تھی جو وہ پہنے ہوئی تھی اور یہاں کہیں گر گئی تھی۔ میرا کھیال ہے کہ اگر وہ پائل نہیں ملی تو۔۔"

"دیکھو سادھو! اب یہاں اس کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آج تو یہاں آ گئے ہو اگر دوبارہ اس طرف آنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" میں نے اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی نہ آنے دی۔ میں اسے یہاں دیکھ کر واقعی [illegible] تھا۔ میں ایک بار پھر اس چکر میں نہیں آنا چاہتا [illegible] مجھے ہی نہیں میرے خاندان کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ [illegible] سے میں اپنے گھر سے دور ہی نمٹنا چاہتا تھا۔

"ناراج کیوں ہوتے ہو؟ ہم تو بس ایک کام سے آئے تھے۔"

"اور ہاں سنو۔ اگر [illegible] تو اس [illegible] ترذمے داری تم پر ہوگی۔"

"اوہ' وہ کنیا۔!" وہ زور سے ہنسا۔ "مورکھ ہے وہ۔ شکتیاں پا لینا اتنا آسان نہیں ہے وکارالحسن جتنا اس نے سمجھ لیا ہے۔ ہم نے پورا جیون تیاگ کر جو کچھ پایا ہے اسے وہ دنوں میں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے پیروں کی دھول ہے وہ۔۔ اس کے کاموں سے ہمارا کوئی سمبندھ نہیں۔ ہماری طرف سے چنتا نہ کرو۔ ہاں اگر تم اسے واپس لانے کے لیے ہم سے کوئی مدد چاہتے ہو تو بلا روک ٹوک چلے آنا۔ مگر شرط وہی ہے کہ وہ پائل لیتے آنا۔"

وہ جس انداز میں بات کر رہا تھا اس سے تو یہی لگتا تھا جیسے واقعی اس کا کوثر کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہی پائل کی بات تو وہ میں شگفتہ کو دے چکا تھا۔ اسے واپس مانگنا قطعی نامعقول بات تھی۔ اس لیے میں نے سادھو کو صاف منع کر دیا کہ نہ یہاں ایسی کوئی پائل ہے اور نہ ہی میں بے وقوف ہوں کہ اسے تلاش کر کے اس تک پہنچاؤں گا۔ ایک بات کا اندازہ میں لگا چکا تھا کہ وہ اپنی بھرپور شکتیوں کے باوجود یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ پائل شگفتہ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ نہ ہی اس نے پرکاش کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔ پائل کے سلسلے میں اس کا انداز ملتجانہ تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ میری طاقت سے واقف ہو چکا ہے۔ میں نے اس وقت تو اسے جانے کو کہہ دیا مگر میں اسے اتنی آسانی سے بخشنے والا نہیں تھا۔ وہ میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔ جب تک وہ طاقت ور تھا اس نے مجھے زبردست نقصان پہنچایا' چھوٹی پھوپی کی موت کا ذمے دار وہی تھا' لڈن' رحیمو اور خورشید چاچا کی موت اسی کے ہتھکنڈوں سے ہوئی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے

[illegible] فراموش کر دینا میرے بس میں نہ تھا۔ میرے دماغ میں [illegible] لاوا ایک رہا تھا۔ وہ اب بھی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس [illegible] آنکھیں میری آنکھوں [illegible] گڑی تھیں۔ [illegible] میں نے [illegible] دماغ میں ایک عجیب سی سنسناہٹ [illegible] کی۔ [illegible] کی جھپکتی ہوئی پلکوں کی کھرکھراہٹ نے لمحہ بھر کو مجھے [illegible] کلا دیا مگر دوسری ہی لمحے اسے زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں اپنے دماغ کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ پہلے وہ میرے دماغ میں اپنی آنکھیں چھوڑ جایا کرتا تھا مگر آج وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس لمحے مجھے اپنی دوسری طاقت کا اندازہ ہوا۔ یعنی اب میرا ذہن پڑھ لینا اس کے بس میں نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چینی پھیل گئی۔ وہ جھینپے جھینپے انداز میں مسکرایا۔ "وکارالحسن! تم شکتی پا چکے ہو۔ مگر اب بھی کچھ چیزیں ہیں جن تک پہنچنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو میرے چیلے بن جاؤ میں تمہیں کہیں کا کہیں پہنچا دوں گا۔"

اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے جملوں میں اس کی شکست پنہاں تھی۔ میں فتح مندی سے ہنس دیا۔ "جو شکتیاں میں نے پائی ہیں وہ تمھاری مرہون منت نہیں' اسی طرح میں دوسری شکتیاں بھی پا لوں گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا سادھو! مجھ سے ٹکرائے تو نہ تم بچو گے نہ تمھاری شکتیاں۔"

"اس لیے کہتا ہوں کہ ہمیں دوستوں کی طرح رہنا چاہیے۔"

"تم میرے دوست نہ پہلے تھے نہ آئندہ ہو سکو گے' میرے اور تمھارے راستے الگ ہیں۔"

"میں بنتی کر رہا ہوں وکارالحسن' ہم دونوں مل کر دنیا پر حکومت کر سکتے ہیں۔"

"مجھے دنیا پر حکومت کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ یہاں قدم رکھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

اس نے پل بھر کو مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی بے بسی تھی۔ مجھے اوپر آئے بہت دیر گزر چکی تھی۔ میں تو پرکاش کی لاش دیکھنے آیا تھا۔ اپنے تصور کی تصدیق چاہتا تھا مگر یہاں سادھو کی موجودگی نے سارا کام خراب کر دیا۔ دو چھتی کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ پرکاش سادھو کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا اور پسند کر بھی کیسے سکتا تھا۔ اس نے شکنتلا کو قابو میں کر کے سب سے زیادہ تکلیف تو پرکاش ہی کو پہنچائی تھی۔ مجھے اماں اور تایا وغیرہ کی فکر بھی تھی۔ اماں تہجد کے وقت اٹھ جاتیں تو عادت کے مطابق میرے کمرے میں ضرور جھانکتیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری طرف سے پریشان ہوں۔ نہ ہی اپنی پراسرار سرگرمیوں کو افشا کرنا چاہتا تھا۔ میرے رویے نے سادھو کو خاصا مایوس کیا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا' میں نے پھر کہا۔ "تم نے سنا نہیں؟"

"جاتا ہوں وکارالحسن' لیکن اتنا سن لو کہ تمہیں کبھی نہ کبھی میری مدد کی ضرورت ضرور پڑے گی۔"

"یہ تمھارا خیال ہے۔ میں ایک بار پھر تنبیہہ کر رہا ہوں کہ میرے راستے کی دیوار بننے کی کوشش نہ کرنا۔" میں نے غصے میں کہا اور سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا' پھر یہ دیکھ کر ساکت رہ گیا کہ اس کا وجود دھیرے دھیرے گاڑھے دھوئیں میں تبدیل ہونے لگا۔ دھواں جیسے زمین میں سے نکل رہا تھا اور اس کے وجود کو نگلتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اچانک ہی انتہائی خبیث قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں شدید الجھن کا شکار ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ فتح مند ہو کر جا رہا ہے۔ اس کا وجود غائب ہوا تو ایک جھنجھناتا ہوا قہقہہ جیسے پوری حویلی میں گونج اٹھا۔ میں ہل کر رہ گیا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اماں اور تایا وغیرہ تک اس کا کریہہ قہقہہ ضرور پہنچا ہوگا مگر جب کافی دیر تک کوئی آہٹ نہ ہوئی تو میں مطمئن ہو گیا۔

میں نے وقت دیکھا' پونے تین بجے تھے۔ اماں اٹھنے والی تھیں۔ تہجد کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے دو چھتی میں بکس دیکھنے کا پروگرام کل پر ٹال دیا اور خود وضو کے لیے اٹھ گیا۔ میں تہجد ادا کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ اماں نے کمرے میں جھانکا۔

"وقارالحسن! سب خیریت ہے ناں؟"

"جی اماں۔ سب خیریت ہے۔۔ آپ بے وجہ پریشان نہ ہوا کریں۔" میں نے تسبیح کو چوم کر تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

اماں نے کھوجتی ہوئی آنکھوں سے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ گردن اونچی کر کے کمرے میں کچھ پھونکا۔ پھر تسبیح پڑھتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے نیند

بالکل نہیں تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اماں اب نہیں سوئیں گی۔ فجر کی اذان تک باقی گھر والے بھی اٹھ جائیں گے۔ اوپر جانا اب بیکار تھا۔ ذہن خالی خالی سا تھا، کوئی تصور یا کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر سوچتا حالانکہ میں پرکاش سے رابطے کے بارے میں بے چین تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ شکنتلا کی قید کے بعد اس کا ردعمل کیا ہے۔ وہ اب کیا کرے گا؟ کیا وہ بھی شکنتلا کی روح کو قید سے آزاد کرانا چاہے گا یا نہیں، بہرحال بہت سی الجھنیں تھیں جن کا حل فی الوقت ذہن میں نہیں تھا۔ میں بڑی تھکاوٹ سی محسوس کر رہا تھا گو نیند بالکل نہیں تھی مگر میں آرام تو کر ہی سکتا تھا اس لیے میں نے کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔

O+O

اگلے روز سورج کی کرنوں نے حویلی کو روشن کیا تو گھر کا ہر فرد مصروف تھا۔ تائی کو دیکھ کر تو میرا کلیجہ ہی کٹ رہا تھا۔ وہ اب بھی برقعہ پہنے برآمدے میں چارپائی پر لیٹی تھیں۔ تایا گم صم سے پاس بیٹھے تھے۔ اماں محلے کی کچھ خواتین کے ساتھ اپنے کمرے میں تھیں۔ رشید چاچا زمین پر جا چکے تھے، ان کی بہو جہانی آپا وغیرہ کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میں ناشتا کرتے ہی حکیم علی احمد صاحب کی طرف چل دیا۔ وہ بڑے حلیم اور بڑے نیک آدمی تھے۔ پورے امروہہ میں وہی ایک حکیم تھے جن کا چرچا تھا۔ وہ ابا کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے۔ تایا سے بھی خوب دوستی تھی۔ وضع دار آدمی تھے۔ میرے ساتھ ہی چلے آئے۔ تایا کے پاس بیٹھے رہے۔ تائی کا مکمل معائنہ کیا۔ ان سے باتیں کرتے رہے پھر مجھے شام کو دواخانے آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

دوپہر سے پہلے ہی شرف الدین آ گیا۔ میں نے اسے رات کا واقعہ سنایا۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ ”وقارالحسن! اس کا یہاں پہنچ جانا خطرے کی گھنٹی نہیں ہے؟“

”نہیں شرف الدین، میرا خیال نہیں ہے کہ وہ اب مجھے کوئی نقصان پہنچا سکے گا۔ پہلے کی بات اور تھی۔“ اتنا کہہ کر میں نے اسے بتایا کہ آج وہ میرے ذہن میں گھس جانے کی کوشش میں ناکام رہا ہے۔ یہ دوسری بڑی طاقت تھی جو مجھ پر آشکارا ہوئی ہے۔ وہ اس بارے میں متجسس تھا۔ کرید کرید کر معلوم کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ جب میں حجرے سے نکلا تھا تو کس طرح میں نے تیز چلنے کی اور جلدی پہنچنے کی کوشش کی تھی اور میں کس برق رفتاری سے چل پڑا تھا۔ وہ یہ سب باتیں حیران ہو کر سنتا رہا۔ جب میں نے اسے اپنے طاقتور تصور کے بارے میں بتایا تو اس نے ایک بات کی کہ میں اچھل پڑا۔ اس نے کہا۔

”وقارالحسن! تم چاہو تو اپنے نئے مکان کے اس کمرے میں گڑی لاش کے بارے میں معلوم کر سکتے ہو کہ رحیمو وہاں ہے یا یہ کوئی شعبدہ تھا۔ اگر وہاں رحیمو کی لاش نہیں ہے تو تم اس مکان سے چھٹکارا پا سکتے ہو۔“

اس کی بات نے مجھے نئی راہ سجھا دی۔ سادھو شرف الدین کے بارے میں بھی یہی شعبدہ دکھا چکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ واقعی یہ شعبدہ ہو اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ واقعی اس نے میرے ہاتھ رحیمو کے خون سے رنگ دیے ہوں۔ ”ہاں شرف الدین۔ یہ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”تم کوشش کرو تو سب حال جان سکتے ہو۔“ شرف الدین خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں ایسا ضرور کروں گا۔ ابھی میں اس بات پر قادر نہیں تھا کہ جب چاہوں تصور باندھ لوں اور منٹوں میں سب کچھ پتا کر لوں۔ شرف الدین نے مجھ سے پوچھا کہ اب پرکاش کے سلسلے میں کیا قدم اٹھاؤں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں رات کو دو چھتی پر جا کر تصدیق کروں گا۔ ایک بڑا مسئلہ میرے سامنے تھا کہ میں اس کی لاش کا کیا کروں۔ میں نے وہ مسئلہ شرف الدین کے سامنے رکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ذہین آدمی ہے کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا۔ ہم بہت دیر تک اس موضوع پر بات چیت کرتے رہے۔ شرف الدین کا کہنا یہ تھا کہ اس معاملے کو ابھی نہ چھیڑا جائے۔ پتا نہیں شکنتلا کیا چاہتی ہے پھر لاش نکال کر اسے کس کے حوالے کیا جائے، کس طرح اس کی روح کو اذیت سے بچایا جائے یہ تمام باتیں مخفی تھیں۔ کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ پرکاش سے کس طرح رابطہ کیا جائے کہ شاید وہی کچھ بتا دے۔ بہرحال ہم دیر تک اسی سوچ میں غلطاں رہے پھر تھک ہار کر معاملے کو جوں کا توں چھوڑ دینے پر قائل ہو گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ آنے والا وقت ضرور کچھ نہ کچھ واضح کر دے گا۔

میں سادھو کی وجہ سے پریشان تھا۔ شرف الدین کو میں نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ شکنتلا کی پائل لینے آیا تھا مگر اسے میں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ پائل بھی شگفتہ کو دے چکا ہوں۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ جانے کہاں چلی گئی اور کافی تلاش کے باوجود بھی نہیں ملی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ پائل مل بھی گئی تو میں اسے سادھو کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ بات میرے لیے تقویت کا باعث تھی کہ ابھی ایک چیز میرے پاس ہے جس سے شکنتلا پورے طور پر سادھو کی دسترس میں آنے سے محفوظ ہے۔ اسے پائل کیوں چاہیے تھی۔ اس کے نہ ملنے سے اس کے کس کام میں رخنہ پڑ رہا تھا، یہ میں ابھی نہیں جان سکتا تھا مگر ایک اطمینان تھا کہ شاید اب میں شکنتلا کے لیے کچھ کر سکوں۔ شرف الدین نے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ میں کسی بھی طرح وہ پائل تلاش کروں اور اسے چھپا کر رکھوں۔ میں اس سلسلے واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شگفتہ سے کیا کہوں۔ جو چیز میں نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر دی تھی اسے کیسے واپس لے لوں۔ بہرحال اس الجھن نے مجھے چپ لگا دی۔ شرف الدین تھوڑی ہی دیر میں میرے موڈ کو سمجھ گیا اور پھر ملاقات کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں حکیم علی احمد کے دواخانے سے تائی کے لیے دوا لے آیا۔ انھوں نے ہدایت کی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ سلایا جائے۔ جس قدر ان کے ذہن کو آرام ملے گا، اسی قدر جلد وہ ٹھیک ہوں گی۔ مجھے تو ان کی تندرستی سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ وہ ٹھیک ہوتیں تو انہیں کوثر کے بارے میں مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوثر کی آمد سے پہلے وہ ٹھیک ہوں یہ میری خود غرضی نہیں تھی بلکہ میں تائی کے لیے متفکر تھا۔ شام کی پہلی خوراک کے بعد ہی تائی پر غنودگی چھا گئی۔ اماں نے ان کا برقعہ اتار دیا۔ وہ اگر غنودگی میں نہ ہوتیں تو برقعہ نہ اتارنے دیتیں۔

تایا چپ چاپ دیکھتے رہے۔ میں ان سے آئندہ کے بارے میں بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ پرکاش کے سلسلے میں انھیں تفصیل سے بتانا ضروری تھا۔ میرے یہاں سے جانے کے بعد انھیں ہی حالات سے نمٹنا تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ان کو بھی بتا دوں۔ وہ کافی حوصلہ مند خاتون تھیں۔ اماں کا حوصلہ جہانی آپا اور شنو آپا کو خوف سے نجات دلا سکتا تھا۔ تائی کے سو جانے کے بعد اماں گھر کے مختلف کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ تایا حقہ پی رہے تھے۔ اب شاید انھیں کچھ کچھ صبر آ گیا تھا۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا۔

میں نے اماں کو بتایا کہ میں ان سے اور تایا سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اماں جلد ہی کاموں سے فراغت پا کر آ بیٹھیں۔ میں نے انھیں تفصیل سے ساری بات بتا دی۔ میری پراسرار طاقت کے بارے میں تایا تو جان چکے تھے مگر اماں کو پہلی بار پتا چلا۔ وہ کچھ خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ انھوں نے مجھے ہزاروں نصیحتیں کر ڈالیں کہ میں اپنی ان پراسرار قوتوں کو منفی کاموں کے سلسلے میں قطعی استعمال نہ کروں۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ مجھے صاف طور پر بتانا پڑا کہ میں چند روز بعد کوثر کے لیے سفر اختیار کروں گا۔ میری بات سن کر یقیناً اماں کو برا لگا ہو گا مگر انھوں نے تایا کے سامنے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ پرکاش کے بارے میں سن کر وہ البتہ پریشان ہو گئی تھیں۔ انھوں نے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا کہ میرے بعد انھیں پریشانی ہو سکتی ہے مگر میں نے اس سلسلے میں انھیں اطمینان دلا دیا کہ میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔ دوسرے مجھے یقین تھا کہ پرکاش اس بات سے واقف ہو گا کہ میں شکنتلا کے لیے کیا کر رہا ہوں۔ وہ یقیناً میری مدد کرے گا۔ میں تو اماں اور تایا کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا کہ وہ یہاں کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار رہیں۔

تایا نے دبے دبے انداز میں مجھے کہا بھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤں، کوثر نے جو قدم اٹھایا ہے اس کی ذمے داری خود اس پر عائد ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ہی اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالوں۔ شاید وہ یہ بات اماں کی وجہ سے کہہ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بلا کا کرب پھیلا ہوا تھا اور آواز میں لرزش تھی۔

”نہیں تایا! اگر اس نے بے وقوفی میں کوئی قدم اٹھایا ہے تو ہم اسے یوں اذیتوں میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ میں چاہتا تھا کہ اماں بھی اس بات کو خوب سمجھ لیں کہ وہ ہمارے خاندان کی فرد ہے اور ہم اسے یوں بیچ منجدھار میں نہیں چھوڑ سکتے۔ خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے اسے واپس لانا میرا اہم ترین فرض تھا۔ میں اس پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان حالات کی وجہ سے اس راستے پر آگے بڑھی تھی اس کا ذمہ دار بھی میں ہی تو تھا۔ اب رہا اس کے دماغ کا خناس تو اسے یہاں لا کر دور کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال میں نے تایا اور اماں کو سمجھا دیا کہ انھیں اس طرح سے یہاں رہنا ہے کہ بہنوں کو خوف محسوس نہ ہو۔ تائی کے علاج پر بھرپور توجہ دینا ہے اور

کسی بھی حال میں اس حویلی کو نہیں چھوڑنا ہے۔

میں نے اماں اور تایا سے شرف الدین اور جہانی آپا کے رشتے کے سلسلے میں بھی بات کرلی۔ انھیں بتا دیا کہ شرف الدین مجھ سے بات کرچکا ہے۔ اب باضابطہ رشتہ لانے کی بات رہ گئی ہے' وہ بھی کچھ دنوں میں ہو جائے گی۔

اماں کو میں نے بتایا دیا کہ آپ اپنی خواہش کے مطابق میرا اور شرف الدین' یعنی جہانی آپا کا شگون کرسکتی ہیں۔ اماں اتنا سن کر ہی خوش ہو گئی تھیں۔ اسی شام شرف الدین یہ پیغام لے آیا کہ اس کے اماں باوا اگلے روز رشتے کے لیے آرہے ہیں۔ گھر میں مہمانداری کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جہانی آپا کے چہرے پر ہالہ سا بن گیا۔ شنو آپا چہکنے لگیں۔ اماں نے رات ہی کو ساری تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا۔ خورشید چاچا کی بہو اور بھتیجا تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ بازار سے سامان لانے کی ذمے داری رشید چاچا کے بھتیجے ذکاءاللہ کے حوالے کردی گئی۔ تایا کرب میں ہونے کے باوجود خوشی کا اظہار کررہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جلتے بجھتے دیے سے محسوس ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹی کے باپ ہونے کے ناتے کن عذابوں کے بھنور میں چکرا رہے ہوں گے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میرا عزم مصمم ہوتا جارہا تھا۔ میں خدا سے دعا کررہا تھا کہ وہ مجھے میرے ارادوں میں کامیاب کرے' تاکہ میں تایا کی آنکھوں میں وہی روشنی' ان کی باتوں میں وہی بے ساختگی اور ان کے چہرے پر وہی خوشی دیکھ سکوں جو میں ہمیشہ دیکھتا چلا آیا تھا۔

میں کافی دیر تک اگلے دن کے انتظامات میں لگا رہا۔ جہانی آپا سب سے چھپی چھپی پھر رہی تھیں' میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو نہیں تھا مگر میں تصور کرسکتا تھا کہ ان کے چہرے پر کون کون سے رنگ کھل اٹھے ہوں گے۔ رات گئے تک اماں شگون کی تاریخ کے بارے میں طے کرتی رہیں۔ وہ جلد از جلد شگون کی تاریخ دینا چاہتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس جلد بازی کی وجہ کیا ہے' اس سے قطع نظر میں خود بھی شرف الدین کے باوا کی طرف سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھا۔ مجھے اب بھی دھڑکا تھا کہ عین موقع پر کوئی نیا شوشہ نہ چھوڑ دیں۔

تائی کئی گھنٹے کے بعد سو کر اٹھیں تو جسم پر برقعہ نہ دیکھ کر سب کی جان کھا گئیں۔ میں حیران اس لیے تھا کہ بہت سی باتیں یاد نہ ہونے پر بھی انھیں برقعہ کیوں اور کیسے یاد رہ گیا تھا۔ انھیں بڑی مشکل سے چپ کرایا گیا۔ چپ کرانے کی ترکیب بھی رشید چاچا کی بہو کے دماغ میں آئی تھی۔ اس نے جھٹ وہ برقعہ بالٹی میں ڈال دیا اور انھیں لے جاکر دکھایا کہ گندا تھا۔ بدبو آرہی تھی اس لیے دھونے کے لیے ڈالا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ خاموش ہو گئیں اور پھر ذرا دیر بعد وہ برقعے کو بالکل بھول گئیں۔

اس رات میں جلدی بستر پر چلا گیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ مجھے نیند تھی حالانکہ میں کل تمام رات جاگا تھا مگر نیند ابھی نہ تھی۔ میں تو پرکاش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ بھی تہیہ کرچکا تھا کہ آج رات میں ضرور اوپر جاؤں گا۔ کچھ نہ کرسکا تب بھی اپنے خیال کی تصدیق تو کر ہی لوں گا۔ میں گھر والوں کے سونے کا منتظر تھا۔ اماں دوبارہ میرے کمرے میں آکر جاچکی تھیں۔ وہ پریشان تھیں کہ میں اتنی جلدی کیوں لیٹ گیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔ وہ میری بات سن کر کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے انداز میں دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔ تایا بھی لیٹ چکے تھے۔ پتا نہیں کہ انھیں نیند آتی بھی تھی یا نہیں۔

O+O

میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا اور پرکاش کے معاملے کو نمٹانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی چلی گئی۔ سناٹا گہرا ہوتا چلا گیا۔ چاند کی زرد روشنی دھیرے دھیرے آنگن میں اتری تو میری کھڑکی سے میرے کمرے میں داخل ہونے لگی۔ اس روشنی نے مجھے چونکا دیا۔ نہ معلوم کیوں میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک انجانا سا خوف مجھے بڑھتی ہوئی چاندنی کے ساتھ ساتھ اپنی گرفت میں لینے لگا۔ فضا میں ایسی بلا کی سوگواری تھی کہ دل بیٹھا جارہا تھا۔ میں بے دھیانی میں اپنی انگلی میں پڑی فیروزے کی انگوٹھی کو گھما رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا یوں جیسے کرنٹ لگا ہو۔ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی مگر میں بے ساختہ اٹھ بیٹھا۔ میں نے یہاں لیٹنے سے قبل اپنے کمرے کے دروازے بھیڑ دیے تھے۔ اس وقت میری نگاہ پڑی تو دونوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ گمان یہی ہوا کہ شاید اماں کھلا چھوڑ گئی ہوں۔ میں دروازے بند کرنے کے لیے اٹھا تو نگاہیں بے ساختہ باہر بڑے برآمدے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں کوئی تھا۔ کوئی بیچ برآمدے میں ساکت کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کیونکہ وہاں روشنی کم تھی۔ اماں کے کمرے کے سامنے جلا ہوا بلب اپنی روشنی کا

...بڑھانے میں ناکام تھا۔ کچھ ہلکی سی روشنی تھی جس میں ...نظر آنے والا سایہ اپنی پہچان کرانے میں ناکام تھا۔ چاندنی ...بھی کیونکہ ابھی اتنا زیادہ نہ تھی اس لیے میں نہیں جان پایا کہ وہاں کون ہے۔ بہنوں سے یا اماں سے تو یہ امید ہی نہ ...تھی کہ اتنی رات گئے اتنی ہمت کرسکیں گے۔ تایا بھی یوں ...سیدھا کھڑا ہونے کا دم ہی نہ تھا۔ میں اب بھی وہاں کھڑے ...شخص کو یہیں سے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا مگر ناکام تھا۔

میں نے وہاں تک جانے کا فیصلہ کیا اور دبے پاؤں آگے ...بڑھا۔ میں نے چپل نہیں پہنے اور دیوار کے اندھیرے ...سائے تلے رینگتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی میں ...برآمدے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ ایک آواز پوری ...رات سے گونج اٹھی۔ "وکارالحسن!"

میں تقریباً اچھل پڑا۔ یوں لگا تھا جیسے یہ آواز حویلی کی ...ساری دیواروں سے بیک وقت گونجی ہو۔ میں خوفزدہ ہو گیا ...کہ یہ آواز گھر کے دوسرے افراد تک بھی گئی ہوگی۔ سب ...اٹھ گئے تو بڑا برا ہوگا۔ میں ایسے وقت میں گھر کے اندر ...خوف و ہراس نہیں پھیلانا چاہتا تھا مگر میرے چاہنے یا نہ ...چاہنے سے کیا ہوتا تھا۔ آواز دوبارہ آئی۔ اب بھی آواز ...بہت بلند تھی اور چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی ...تھی۔ کوئی مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ آواز مردانی تھی' ...بھرائی ہوئی تھی۔ اس بار میں نے غور کیا تو وہ آواز مجھے ...قطعی اجنبی لگی۔ نہ تو وہ آواز سادھو کی تھی نہ تایا کی اور نہ ...ہی شرف الدین یا رشید چاچا اور ان کے بھتیجے کی۔

"میں... میں پرکاش ہوں وکارالحسن!" اس بار میں بری ...طرح گھبرا گیا۔ مجھے ساری گھبراہٹ یہ تھی کہ اماں وغیرہ نہ ...اٹھ جائیں۔ میں جان گیا تھا کہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ...کھڑا' سیاہی میں لپٹا ہیولا پرکاش کا ہے۔ میں نے پلٹ کر ...اماں وغیرہ کے کمرے کی طرف دیکھا' وہاں کوئی ہلچل نہ ...تھی۔ میں حیران ہوا کیونکہ اماں کی نیند بہت کچی تھی' وہ ...معمولی سی آہٹ پر بھی اٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس قدر بلند ...آواز بھی ان کی نیند نہیں توڑ سکی تھی۔ میری گھبراہٹ بجا ...تھی مگر اس لمحے میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پرکاش مجھ ...سے مخاطب تھا۔ مجھے ہر حال میں اس سے بات کرنا تھی۔

"شکنتلا تکلیف میں ہے وکارالحسن! وہ تمہیں یاد کر ...رہی ہے۔" اس بار اس کی آواز اتنی بلند نہ تھی مگر صاف ...اور قطعی واضح تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میں خود بھی پریشان ہوں مگر تم یہاں ہم سب کے لیے پریشانی پیدا کررہے ہو۔" میں نے ہمت کرکے جواب دیا۔ "ایسی صورت میں' میں شکنتلا کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔" میں نے دبے دبے لہجے میں جواب دیا۔

"وہ پریشانی میں نے پیدا نہیں کی تھی وکارالحسن! میں تمہیں پریشان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ سادھو وہ پائل حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ شکنتلا کو پوری طرح اپنے قابو میں کرسکے۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ تمہیں متوجہ کرسکوں تاکہ تم میری لاش کو یہاں سے نکال کر کہیں اور چھپا سکو۔ تم ایسا کرلوگے تو میں تمہارے مدد کے قابل ہوسکوں گا۔ دوسری صورت میں اگر وہ پائل کا دھیان چھوڑ کر میری لاش حاصل کرنے کے چکر میں پڑ گیا تو بہت برا ہوگا۔"

یہ سن کر میں نے اس سے پوچھا کہ میں اسے وہاں سے نکال کر کہاں لے جاؤں' دوسری بات یہ کہ میں اسے کس کے حوالے کرسکوں گا کہ جو اسے اپنی رسم کے مطابق جلا کر اس کی آتما کو سکون دے سکے۔ اس نے فی الحال اس موضوع کو ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اسے جلا دیا گیا تو اس کی آتما آکاش پہ چلی جائے گی اور وہ شکنتلا کے بغیر کہیں نہیں جانا چاہتا۔ گویا اب سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ پہلے شکنتلا اس کی تلاش میں بھٹک رہی تھی اور اب پرکاش کو اس کی تلاش میں بھٹکنا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری بھرپور مدد کرے گا' میرے ساتھ شکنتلا کی تلاش میں جائے گا۔ حویلی کے بارے میں اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مصر تھا کہ اس کی لاش کو دو چھتی کے اس بکس سے نکال کر بڑے برآمدے کے باہر لگے برگد کے درخت تلے گاڑ دیا جائے۔ یہاں وہ اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک شکنتلا کو آزاد نہیں کرا لیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس برگد کے درخت کے نیچے

جوگندر ناتھ سوامی کی کرپا سے وہ محفوظ رہ سکے گا۔ سادھو یہاں تک آنے کی جرأت نہیں کرسکے گا کیونکہ وہ اسی جگہ بیٹھ کر جاپ کیا کرتے تھے۔ میں نے تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ وہاں کیسے محفوظ رہ سکے گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں سے وہاں سے نکال لوں گا مگر وہ بضد رہا تھا کہ یہ کام آج ہی کردیا جائے۔ مجھے اور کوئی فکر نہ تھی بس یہ گمان تھا کہ اماں تک اس کی آواز گئی ہوگی تو وہ اٹھ چکی ہوں گی۔ میرے ذہن میں یہ خیال آتے ہی مجھے پرکاش کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ آواز کسی تک نہیں

پہنچ سکتی وکار الحسن! اسے صرف اور صرف تم سن سکتے ہو۔"

یہ سن کر میں خوش ہو گیا۔ میں نے اسی وقت اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پرکاش میرے ساتھ تھا۔ میں اس کا ہیولا دیکھ سکتا تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ روشنی میں آجانے کے باوجود وہ مجھے ایک سیاہ ہیولے ہی کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہم بغیر کسی پریشانی کے دو چھتی تک پہنچ گئے۔ وہاں رکھے ایک ٹین کے ڈبے کی مدد سے میں دو چھتی میں داخل ہو گیا۔ پرکاش کی روح باہر ہی رہی۔ میں نے وہاں سے وہ بکس سرکا کر دو چھتی کے دروازے کے قریب کر دیا پھر نیچے آکر میں نے بکس اٹھا لیا۔ وہ اچھا خاصا بھاری بکس تھا مگر مجھے وہ اس وقت بڑا ہلکا پھلکا لگا۔ میں اور پرکاش اسے لے کر برگد کے درخت تک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک قبر نما گڑھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے لاش کو بکس سمیت اسی گڑھے میں اتار کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ یہ کام اس قدر آسانی سے اور اتنی جلدی ہو گیا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

میں مٹی برابر کر کے پلٹا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے وہاں پرکاش کو تلاش کرنے کی کوشش کی، دبی دبی آواز میں اسے آوازیں بھی دیں مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں اب سے پہلے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ ابھی میں پرکاش سے بہت سی باتیں جاننا چاہتا تھا مگر وہ کہیں نہ تھا۔ میں الجھا الجھا سا واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ میرے ہاتھوں پر لگی مٹی ثابت کر رہی تھی کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ میں واقعی پرکاش کی لاش کو برگد تلے دبا کر آیا ہوں۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ کچھ دیر تک بستر پر لیٹا پرکاش کے بارے میں سوچتا رہا پھر مجھے نیند آگئی۔

○+○

اگلی صبح فجر کے وقت اماں نے مجھے اٹھا دیا۔ میں نماز سے فارغ ہو کر اماں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ تایا بھی اٹھ چکے تھے۔ تائی اس وقت بالکل چپ چاپ لیٹی تھیں۔ میں تایا کے پاس جا بیٹھا۔ اماں شرف الدین وغیرہ کے گھر والوں کی مہمانداری کی تیاریوں میں لگی تھیں۔ میں نے تایا کے ساتھ ناشتا کیا۔ تائی نے ناشتا کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں بیٹھا تایا سے باتیں کرتا رہا۔ وہ گم صم سے میری باتوں پر سر ہلاتے رہے۔ بہنیں اور اماں صفائی ستھرائی میں لگی تھیں۔ شرف الدین نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ کس

وقت آئیں گے اس لیے انتظار تکلیف دے رہا تھا۔ میں شرف الدین کو بتانا چاہتا تھا کہ کل رات کیا ہوا ہے۔ دوسرا خیال مجھے یہ بھی تھا کہ شاید آج شگفتہ بھی آئے مگر ان کے باوا سے مجھے اس فراخ دلی کی توقع نہیں تھی مگر پھر بھی گمان تھا کہ شاید شرف الدین اسے ضد کر کے لے ہی آئے۔

ساڑھے نو دس بجے ہی میں تیار ہو گیا۔ تایا بھی نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر بیٹھ گئے تھے۔ تائی کو یہ کہہ کر تیار کرایا گیا تھا کہ کوثر کے سسرال والے آرہے ہیں، تایا نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ تم کوئی بات نہ کرنا۔ ہم لڑکی والے ہیں اس لیے ہمیں خاموش ہی رہنا ہے۔ انھوں نے سر تو ایسے [illegible] تھا جیسے ساری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ نہا دھو کر آنکھوں میں کاجل کی سلائیاں پھیر کر انھوں نے موتیا کے چند پھول کانوں میں بھی اٹکا لیے تھے۔

تقریباً بارہ بجے کے قریب رشید چاچا کے بھتیجے ذکاءاللہ نے اطلاع دی کہ مہمان آگئے ہیں۔ میں اور تایا اٹھ کر بڑے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ جہانی آپا چھپاک سے اماں کے کمرے میں جا گھسیں۔ ہم نے اماں کے کمرے کے برابر والا کمرا مہمان خانہ بنا لیا تھا جہاں سفید چاندنیاں اور مخمل کے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ چاندی کے پاندان، اگالدان، سلفچی، خاص دان اور خشک میوے کے لیے تانبے کی ڈشیں رکھی تھیں۔ ایک طرف مرزا صولت بیگ کا وہ حقہ رکھا تھا جس کی چلم اور پیچ دان چاندی کا تھا۔ یہ ایک نادر اور خوب صورت حقہ تھا۔ اماں نے بتایا کہ یہ حقہ ہمارے پردادا کو پانی پت کے ایک راجہ نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ شاید یہ واحد چیز تھی جو وہ کبھی اوپر نہیں لے گئے تھے بلکہ یہ ہمیشہ دادی کے کمرے میں رکھا رہا تھا۔ بہرحال اس کمرے کو جہانی آپا اور شنو آپا نے ایسے سنوارا تھا کہ میں خود بھی اش اش کر اٹھا۔ اگربتی کی خوشبو نے سارا کمرا مہکا دیا تھا۔ سفید جالی دار پردوں نے کمرے کا حسن بڑھا دیا تھا۔

میں گیٹ پر پہنچا تو تانگے سے شرف الدین کے باوا اتر رہے تھے۔ سفید چوڑی دار پاجامہ، بسکٹی رنگ کی شیروانی اور اسی رنگ کی ٹوپی سر پر جمائے وہ اس وقت خاصے سنجیدہ اور معقول آدمی لگ رہے تھے۔ شرف الدین سائیکل رکشا والے کو کرایہ ادا کر رہا تھا اور اسے کہہ رہا تھا کہ وہ دو گھنٹے بعد لینے بھی آجائے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ان کے ساتھ شگفتہ بھی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے قناویز کے غرارے میں ملبوس، سیاہ برقع میں لپٹی، اس کا آسمانی جارجٹ

[illegible]ستاروں والے کام کا پلو برقعے میں سے لٹک رہا تھا اور [illegible]سارے ستارے جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر میری آنکھوں میں [illegible]نے جا رہے تھے۔ کوندے سے تھے جو اپنے مجھے چاروں [illegible] لپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر شرف الدین کے باوا کو آداب کیا۔ [illegible]نے جیتے رہو بھی اس انداز میں کہا جیسے مجھے مرجانے [illegible]وں بددعا دے رہے ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ پارہ ہائی ہے۔ [illegible]ف الدین نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بائیں آنکھ دبا دی۔ شگفتہ کی وجہ سے اماں کے نزدیک نہ گیا وہیں سے [illegible]اب بجا لایا۔ اتنی دیر میں تایا نے آگے بڑھ کر شرف [illegible]ین کے باوا سے ہاتھ ملایا اور ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ [illegible]ر خیریت دریافت کرنے لگے۔ شرف الدین کی اماں اور [illegible]تہ آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ اماں نے دروازے [illegible]ے مہمان خانے کی طرف رہنمائی کی۔ تایا شرف الدین [illegible]ے باوا کو لے کر مردان خانے میں آگئے۔ شرف الدین [illegible]اصا چوکنا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے باوا پر گڑی ہوئی تھیں [illegible]کسی لڑاکا مرغ کی طرح پھولے بیٹھے تھے۔

"بھائی صاحب آرام سے بیٹھیے۔" تایا نے بھی ان کے [illegible]زاز کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ واقعی ایسے بیٹھے تھے جیسے ابھی [illegible]ٹھ کر بھاگ پڑیں گے۔ نتھنے یوں پھول پھول کر پچک رہے تھے جیسے گھر سے یہاں تک دوڑ لگا کر آئے ہوں۔

"میں ٹھیک ہوں صاحب! ویسے آپ مجھ سے عمر میں [illegible]افی بڑے ہیں۔" انھوں نے شاید بھائی صاحب کہنے کا برا [illegible]انا تھا۔

"الحمداللہ مجھے گمان تھا کہ چھوٹا سمجھوں گا تو برا مانیں گے بے وجہ ہی احترام کے بوجھ تلے دبا رہتا۔" تایا نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

"وہ روحوں کا سلسلہ ختم ہوا کہ نہیں؟" شرف الدین کے باوا یوں چاروں طرف دیکھ کر بولے جیسے خود روحوں کو دیکھ کر اندازہ لگانا چاہتے ہوں چاہتے ہوں۔

"کہاں صاحب۔؟" تایا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

شرف الدین نے گھبرا کر تایا کی طرف دیکھا پھر اپنے باوا کو تکنے لگا۔

"ماشاءاللہ اس وقت حویلی میں گیارہ بارہ ذی روح موجود ہیں۔"

"کیا۔ گیارہ بارہ؟" وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"کیوں خیریت۔؟" تایا نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"میاں سن لیا تم نے۔؟" وہ شرف الدین سے مخاطب ہوئے۔ "ایک نہ دو پوری بارہ روحیں موجود ہیں، فیکٹری بن گئی ہے روحوں کی۔"

"ابا۔ انھوں نے ذی روح کہا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب لوگ اور۔ اور ہم۔" شرف الدین نے دبے دبے انداز میں جواب دیا۔ ویسے اس کے چہرے سے شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"آپ بے وجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ سب خیریت ہے۔" اس بار تایا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یعنی کہ حویلی میں روحوں کی پوری کھیپ موجود ہے اور کوئی پریشان بھی نہ ہو؟" انھوں نے نتھنے پھلائے۔

"وہ جو روحیں تھیں وہ تو رات تک کے لیے سیر سپاٹے کو گئی ہیں۔ انھیں بھنک مل گئی تھی کہ آپ لوگ آرہے ہیں۔ اس وقت آپ بے خوف و خطر آرام سے بیٹھیے۔"

"بھائی صاحب لڑکی لے جانے کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہاں تک تو میں تیار ہوں مگر یہ شگفتہ والی بات۔ اسے میں بھلا کیسے بھیج دوں۔ ایک ہی تو بچی ہے میری۔" وہ ایک دم ہی اصل موضوع پر آگئے۔

لمحہ بھر کو میں اور تایا دونوں بھونچکے رہ گئے۔ توقع نہیں تھی وہ یوں اچانک یہ موضوع اس انداز میں چھیڑ دیں گے۔

"بیٹا تو ہمارا بھی اکلوتا ہے۔ ویسے روحیں خواتین سے بہت خوش ہیں، انھیں کچھ نہیں کہتیں۔ ماشاءاللہ ہماری بچیاں بھی یہیں رہتی ہیں۔" تایا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بھائی صاحب! آپ کی اولاد تو ڈھیٹ ہو چکی ہے۔" وہ پہلو بدل کر بولے۔

"آنے والی بھی ڈھیٹ ہو جائے گی، آپ پروا نہ کریں۔" تایا نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، شرف الدین نے انھیں کہنی ماری اور تایا سے ان کی خیریت پوچھنے لگا۔ وہ سمجھ گئے کہ شرف الدین اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تایا سے باتیں کر رہا تھا اور اس کے باوا مجھے گھور رہے تھے۔ میں خاصا کنفیوز تھا۔

"میاں تمھارے لچھن سدھرے کہ نہیں؟" انھوں نے اس بار مجھ پر حملہ کیا۔

"جی۔ جی۔ ہاں۔ جی۔" میں بوکھلا گیا۔ اب انھیں کیا جواب دیتا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا شرف الدین کے باوا ہی کچھ اور پوچھتے' شرف الدین بول اٹھا۔ "ابا! آپ چپ نہیں رہ سکتے؟"

"تو اور میں کیا کر رہا ہوں؟" انھوں نے غصے میں بھنا کر جواب دیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ تلخی بڑھنے والی ہے۔ یہ بات تایا نے بھی محسوس کرلی تھی اس لیے میں تو جلدی سے اٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ تایا بات کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیں گے۔ میں کمرے سے باہر آیا تو میری نگاہ باورچی خانے کے دروازے پر پڑی۔ وہاں شگفتہ کھڑی تھی۔ ایک کہکشاں سی تھی جو اس کے وجود کو خود میں سمیٹے ہوئے تھی۔ میں اس طرف جانے کی بجائے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جہانی آپا اور شنو آپا دونوں ہی شاید باورچی خانے میں تھیں۔ اماں اور شرف الدین کی اماں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر شرف الدین کی اماں مسکرا اٹھیں اور بولیں۔ "مبارک ہو بٹوا۔ اللہ نے ہماری سن لی۔ عزت سے نیا پار لگی' تم مٹھائی نکالو اور گھر بھر کا منہ میٹھا کراؤ۔"

اماں کے چہرے پر روشنی سی بکھر رہی تھی۔ مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں میں دبی ہوئی تھی' آنکھوں میں تشکر تھا۔ میں جانتا تھا کہ آج ان کے دل پر رکھی ایک بھاری سل ہٹ گئی تھی۔ اماں نے فوراً مٹھائی کا ٹوکرا کھول کر رشید چاچا کی بہو کو آواز دے لی اور اسے محلے بھر میں لڈو بانٹنے کی ہدایت دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ انھوں نے تایا' شرف الدین اور اس کے باوا کو لڈو بھجوائے۔ پیچھے پیچھے خود بھی وہیں چلی آئیں۔ پرانے زمانے میں پردے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا مگر اب چونکہ شرف الدین کے باوا ان کے سمدھی بن چکے تھے اس لیے انھوں نے سامنے آنے میں حرج محسوس نہیں کیا۔ شرف الدین کی اماں بھی تایا کو آداب کرنے چلی آئیں گو انھوں نے سر پر پڑا دوپٹا مزید ماتھے پر جھکا لیا تھا مگر شرف الدین کے باوا پھر بھی کسی لڑاکا مرغے کی طرح پھول گئے۔ شرف الدین اور تایا اماں کے ہاتھ میں چاندی کی سینی میں لڈو دیکھ کر کھل اٹھے تھے' جو اس بات کا ثبوت تھے کہ جہانی آپا کا رشتہ طے پا گیا۔

"مبارک ہو بھائی صاحب!" اماں نے دوپٹے کی اوٹ سے شرف الدین کے باوا کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔" انھوں نے زور سے ہنکارا بھرا۔ اماں کر گئیں' وہ ان کے مزاج سے اور ان کے خیالات سے ناواقف تھیں۔

"اے میاں! یہ ہوں کی کیا بات تھی؟" شرف الدین کی اماں' میاں کا ہنکارا سن کر گھونگھٹ ہی الٹ بیٹھیں۔ "ایسے موقعوں پر خیر مبارک کہتے ہیں۔"

"ہاں ہاں خیر مبارک۔" انھوں نے اس انداز میں جواب دیا جس انداز میں ہنکارا بھرا تھا۔

"اے آپا جان برا نہ مانیے گا۔" شرف الدین کی اماں نے اماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنی پیدائش پر بھی سخت برہم ہوتے ہیں۔"

"ارے نہیں بہن۔ بھلا باپ کو بیٹے کی خوشی بری لگتی ہے کیا؟" اماں ان کے انداز پر جھینپ گئیں۔

پھر پتا نہیں ان میں کیا باتیں ہوئیں' میں اور شرف الدین ایک دوسرے کو اشارہ کر کے باہر آ گئے۔ شگفتہ کی حویلی میں موجودگی نے حویلی کو بہت روشن روشن سا کر دیا تھا' گو وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود سے کرنیں منعکس ہو کر میرے وجود سے ٹکرا رہی ہیں۔ زمانوں بعد اس حویلی کے در و دیوار خوشی دیکھ رہے تھے۔ میں بڑا مسرور تھا۔ خود شرف الدین کی کیفیت بھی یقیناً مجھ سے مختلف نہ ہو گی' اور جہانی آپا کے بارے میں تو خود آپ کو بھی اندازہ ہو گا۔ وہ وقت یوں گزرا کہ احساس ہی نہ ہوا۔ خیال اس وقت آیا جب شرف الدین کے باوا شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے باہر نکلے اور شرف الدین سے کہا کہ وہ تانگا دیکھے' اگر آ گیا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ سائیکل رکشا لے لے۔

وہ لوگ چلے گئے۔ حویلی گویا اندھیروں میں ڈوب گئی۔ سر پر چمکتا سورج جیسے گہنا گیا۔ میں شرف الدین کو پرکاش کے بارے میں بتانا بالکل بھول گیا۔ بعد میں افسوس ہوا کہ اسے بتا دیتا پھر سوچا کہ شام ڈھلے اس کے گھر جاؤں گا تو اسے بتا دوں گا۔

بڑی دیر بعد مجھے تائی کا خیال آیا۔ میں نے اماں سے پوچھا تو پتا چلا کہ انھیں کسی بہانے سے رشید کی بہو اپنے کمرے میں لے گئی تھی ورنہ وہ بڑا فضیتا کر رہی تھیں۔ انھوں نے شرف الدین کی اماں کا دماغ کھا لیا تھا کوثر کی تعریفیں کر کر کے' لہٰذا اماں نے یہ سوچ کر کہ کہیں انھیں بات کھل جائے' وہ جان نہ لیں کہ رشتہ کوثر کا نہیں جہانی آپا کا ہو رہا ہے' انھیں فخر النساء یعنی رشید چاچا کی بہو کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اس نے سر میں تیل ڈال کر ایسی مالش کی کہ بے سدھ ہو گئیں۔

محلے بھر میں مٹھائی بٹ گئی۔ شام کو اماں نے بڑے صندوق کھلوا کر جانے کب کا جمع کیا ہوا اسباب نکلوا لیا۔ میں ... گیا تھا۔ میرے لیے یہ دوسری رات تھی جو زیادہ تر جاگتے گزری تھی۔ جو خوشیاں میسر آئی تھیں انھوں نے سارے دکھوں کا احساس ہی مٹا دیا تھا۔ پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ... کیف آگیں لہر سی بدن میں ہچکولے لے رہی تھی۔ ہر قسم کے وسوسے' اندیشے اور الجھنیں مٹ گئی تھیں۔ میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی رات بھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی کہ مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا' اور پتا نہیں میری آنکھ کیوں اور کیسے کھل گئی تھی۔ میں کچھ دیر تو یونہی گم صم اپنے بستر پر پڑا رہا۔ باہر جھینگر بول رہے تھے۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ چاند بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ میں چند لمحے لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایک عجیب قسم کی بے چینی تھی جو مجھے باہر جانے پر اکسا رہی تھی۔ میں نے کان باہر کی آوازوں پر لگا دیے۔ خواہ مخواہ یہ احساس ہونے لگا جیسے میں خود نہیں اٹھا بلکہ اٹھایا گیا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر گہرے سناٹے میں تیز ہواؤں کا یا جھینگروں کا شور تھا۔ میں چند لمحے دروازے ہی پر کھڑا رہا پھر پلٹ کر کمرے میں واپس جانے لگا تھا کہ اچانک جیسے کسی نے میری قدم تھام لیے۔ یا اللہ۔ وہ سسکیاں تھیں' ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی سسکیاں' کبھی قریب اور کبھی دور ہوتی ہوئی سسکیاں۔ میں یوں جھٹکے سے مڑا جیسے کرنٹ لگا ہو۔ حیرت نے مجھے ساکت کر دیا تھا۔ ایک ہی خیال آیا کہ یہ سسکیاں جہانی آپا یا شنو آپا کی ہیں۔

میں تیزی سے اماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دونوں بہنیں انھی کے ساتھ سوتی تھیں۔ اماں کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اندر لالٹین کی نیچی لو اپنی زرد روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں نے چپکے سے کمرے میں جھانکا۔ جہانی آپا اور شنو آپا بے خبر سو رہی تھیں۔ اماں کروٹ لیے لیٹی تھیں۔ خیال ہوا کہ شاید اماں رو رہی ہیں۔ ممکن ہے اس خوشی کے موقع پر ابا کو یاد کر رہی ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اماں بڑے ضبط والی عورت تھیں۔ ان کا یوں سسکیاں لے لے کر رونا ممکن نہ تھا اور سسکیاں بھی ایسی کہ میرے کمرے تک پہنچ گئیں۔ ان کے برابر ہی ان کی بیٹیاں سو رہی تھیں' وہ کبھی بھی ایسی کمزوری ظاہر نہ ہونے دیتی تھیں۔ اس خیال کے باوجود میں نے اپنی تسلی کرنا ضروری سمجھا اور دبے پاؤں دوسری طرف آ کر اماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے سدھ سو رہی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی میں پلٹ کر باہر نکل آیا۔ چند لمحے کان لگائے کھڑا رہا کہ آواز دوبارہ آئے تو سمت کا اندازہ لگاؤں۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہوا کے تیز جھونکے پر ہلکورے لیتی ہوئی دبی دبی سسکی میرے اندر گھاؤ سے ڈال گئی۔ میں آواز کو پہچان نہیں سکا' بس بے چینی کی ایک تیز لہر تھی جس سے میں پریشان ہو گیا۔ میرا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا پہلے تایا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہاں میں نے تائی پر نگاہ ڈالی۔ وہ بھی بے سدھ سوئی ہوئی تھیں۔ دل کی گھبراہٹ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں چند لمحے اس گھبراہٹ کا سبب سوچتا رہا۔ میں نے حجت تمام کرنے کے رشید چاچا کے حصے کی طرف جانا بھی مناسب سمجھا۔ سسکیوں کی آواز یقیناً کسی عورت کی تھی اور ایک عورت رشید چاچا کی بہو بھی تھی۔

رشید چاچا کے پاس چار کمرے تھے۔ جس میں سے ایک کو انھوں نے باورچی خانے میں تبدیل کر لیا تھا۔ دو کمرے سونے کے لیے مخصوص کر لیے تھے۔ ایک میں رشید چاچا تھے اور دوسرے میں ان کا بیٹا اور بہو۔ میں نے پہلے جس کمرے میں جھانکا وہاں رشید چاچا اوندھے پڑے سو رہے تھے۔ لالٹین دروازے سے باہر اس طرح رکھی تھی کہ یہ حصہ دور تک روشن ہو رہا تھا۔ میں اس وقت اپنے سائے سے بھی خوفزدہ تھا۔ دبے پاؤں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ یہاں بھی دونوں میاں بیوی بے خبر سو رہے تھے۔ اب میں نے وقت ضائع کرنا قطعی مناسب نہیں سمجھا۔ میں جلد از جلد معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ یہ آواز گھر کے کسی فرد کی نہیں ہے۔ میں اب تک سمت کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ ہوا کے دوش پر آنے والی آواز مجھے چاروں جانب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس بار میں نے اپنی تمام توجہ آواز کی جانب کر دی۔ میری

تھا۔ حسیں، حس سماعت میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ دبی دبی سسکیوں کی آواز اب بھی آرہی تھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز اوپر سے آرہی ہے۔ میں تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ ابھی میں سیڑھیوں سے کچھ دور ہی تھا کہ میں نے وہاں ایک سایہ سا لرزتا دیکھا۔

"کون ہے وہاں۔؟" میں نے دبے انداز میں پکارا۔ لمحہ بھر کو ٹھہرا پھر جواب نہ پاکر آگے بڑھ گیا۔

وہ کوئی عورت تھی جس نے سیاہ لبادہ سا پہنا ہوا تھا۔ چہرے پر بالوں نے نقاب سا ڈال رکھا تھا۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ "کون ہو تم اور۔ یہاں تک کیسے پہنچیں؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

قارئین یہ بتاتا چلوں کہ اب میں ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا اور کچھ سنہرے بابا کے پاس وظیفے کرنے کے بعد سے پر اعتماد بھی ہو گیا تھا شاید اسی وجہ سے اب میں ان باتوں سے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی میں بڑی بہادری سے کھڑا تھا، مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ یہ انہونی بات ہے یا یہ بات میرے لیے کسی بھی طرح خطرے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سخت تجسس میں جکڑا ہوا تھا۔ میں اس عورت کی صورت دیکھنا چاہتا تھا، جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، یوں تو میں شکنتلا کے بارے میں سوچ سکتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ شکنتلا سب کچھ کر سکتی ہے مگر سادھو کی قید سے نہیں نکل سکتی۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس کے گرد کچا حصار بناتا۔ ایک خیال کوثر کا بھی تھا۔ ممکن ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ وہ لوٹ آئی ہو اور شرمندگی کے سبب کسی کے سامنے آنے سے گھبرا رہی ہو۔ گھر سے بھاگ جانے والی شرمناک حرکت پر آنسو بہا رہی ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں دو قدم آگے بڑھا۔ "کوثر۔؟" میرے منہ سے کوثر کا نام سنتے ہی اس عورت نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ بادلوں میں سے اچانک نکل آنے والے چاند کی روشنی نے جھماکا سا کر دیا اور میں اپنے سامنے شکنتلا کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس بار میں نے آواز نہیں نکالی بلکہ ذہن میں اسے پکارا، آپ کو یاد ہو گا کہ اس سے میری پہلے بھی اسی طرح گفتگو ہوئی تھی۔ شکنتلا اور پرکاش دونوں سے گفتگو کرنے میں مجھے بولنے یا سننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ ہماری گفتگو ایسے ہوتی تھی جیسے ٹیلی پیتھی کی جاتی ہے۔ ہم ذہن میں ہی سوال جواب کرتے تھے۔

"ہاں وقارالحسن!" اس کی آواز میرے دماغ میں لالا تک پھیل گئی۔ "میں اپنی پائل لینے آئی ہوں، وہ شکنتلا لے لو وقارالحسن! ورنہ۔ ورنہ وہ۔ میں ڈرتی ہوں کہ اس طرح سادھو پھر تم لوگوں کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اس پائل کے حصول تک وہ سکھ سے نہیں بیٹھے گا۔"

"مگر کیوں۔ وہ پائل کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے؟" میں الجھ گیا۔

"وہ پائل اس کی یوجنا (عزائم) میں بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے میری آتما کو مکمل طور پر قابو میں کرنا چاہتا ہے، اور پائل کی گیر موجودگی اس کے لیے کٹھنائیوں کا سبب ہے۔"

بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر اتنا میں جان گیا تھا کہ سادھو پائل حاصل کیے بنا واقعی چین سے نہیں بیٹھے گا۔ دوسری بات یہ کہ میں تو شکنتلا کو اس سے آزاد کرانا چاہتا تھا اور شکنتلا خود ہی مجھ سے پائل کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ خود اس سے آزاد ہونا نہیں چاہتی۔ گو وہ تکلیف میں تھی۔ اس کا رونا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ عذاب میں ہے۔ بہرحال فی الوقت اس سے بحث کرنا بیکار تھا۔ پرکاش کے بارے میں وہ جان چکی تھی کہ میں نے اسے دو چھتی سے نکال لیا ہے۔ اس نے میرا شکریہ بھی ادا کیا، اور وعدہ کیا کہ وہ جب بھی ممکن ہوا میری مدد کرے گی۔ تب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سادھو کی قید میں رہ کر میری مدد کیسے کر سکتی ہے اور کیا اسے آزادی نہیں چاہیے جس پر وہ پھر رونے لگی اور اس نے بتایا کہ جب تک وہ مورتی اور کڑا اس کے قبضے میں ہے میں اس کے حصار سے نہیں نکل سکتی۔ میں نے پوچھا کہ میں یہ چیزیں اس سے کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر اس کی آواز میں جوش پیدا ہو گیا اور وہ بولی۔ "وقارالحسن! یہ کام بڑا کٹھن ہے تم اسے انجام نہیں دے سکو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنی کٹھنائیوں میں پڑنے کے بعد اب تم اور زیادہ عذاب آتے دیکھو، مگر یہ بھی اپنی جگہ اٹل بات ہے کہ تم ہی اس کی موت ثابت ہو سکتے ہو۔ تم میں وہ شکتیاں موجود ہیں کہ وہ تم سے الجھتے ہوئے گھبرائے گا۔ تم اپنی ان شکتیوں کو اپنے قابو میں کر لو پھر تم ہر کٹھنائی سے گزر جاؤ گے۔"

میں نے جاننا چاہا کہ میں اپنی قوتوں کو اپنے تابع کیسے کر سکتا ہوں۔ اب تک تو میں ان قوتوں کے تابع تھا۔ وہ مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتی تھیں۔ میں چاہوں تو بھی اپنی مرضی سے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ان کیفیات کو طاری کرنے کے لیے کافی مشکل ہوتا تھا۔ ہر معاملے میں آدمی ان کی شدت پیدا نہیں کر سکتا نہ اپنی تمام حسوں کو یکجا کر کے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں جب بھی اور جس کے بھی بارے میں جاننا چاہوں جان لوں اور ایسا اس وقت تک ممکن تھا جب تک تمام قوتیں پوری طرح میرے قابو میں ہوتیں۔

جو کچھ شکنتلا نے بتایا وہ سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ کہنا تھا کہ اس سلسلے میں کوثر میری مدد کر سکتی ہے۔ بہرحال مجھے اسے تلاش کرنا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ وہ سادھو کے ہاتھ لگے مجھے اس کو تلاش کر کے لے آنا ہو گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سادھو اسے بڑی شد و مد سے تلاش کر رہا ہے تاکہ وہ میرے ہاتھ نہ لگ سکے اور میں اس کے بل پر طاقت حاصل نہ کر سکوں۔ اس نے دوبارہ پائل کے متعلق پوچھا تو میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اسے لا دوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ سوموار کو آئے گی اسی وقت آئے گی کیونکہ سوموار کو سادھو جاپ کرنے جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اسے حصار توڑنا پڑتا ہے۔ جب تک وہ مکمل طور پر اس کے قابو میں نہیں آئے گی اسے یہ خطرہ مول لینا پڑے گا اور اسی بات سے ڈرنے کی وجہ سے وہ پائل کا حصول چاہتا ہے۔ اس نے پائل حاصل کر لی تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے گا جبکہ وہ پائل اگر شکنتلا کے قبضے میں رہتی تو وہ کسی حد تک خود کو اس کے شر سے محفوظ کر سکتی تھی۔ بہرحال اس کی یہ منطق مجھ میں تو بالکل نہیں آئی بلکہ میں اس کے اس رویے پر حیران تھا کہ وہ اچانک ہی گہرے دھوئیں میں تحلیل ہونے لگی۔ جاتے جاتے اس نے کہا کہ مجھے پچھوے... ہے۔ صرف اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے یہاں سے جانے میں اس کی اپنی خواہش شامل نہ تھی اور کوئی دوسری طاقت تھی جو اسے زبردستی یہاں سے لے جا رہی تھی۔ اس کے آخری جملے نے میرے بدن میں چیونٹیاں سی بھر دیں۔

پتا نہیں یہ کہنے سے اس کا مقصد کیا تھا۔ کیا وہ یہ بتانا چاہتی تھی کہ یہاں، اس حویلی میں اس وقت کوئی بچھو موجود ہے جس سے مجھے بچنا چاہیے یا اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ بہرحال میری بے چینی بڑھ گئی تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت ہو گیا تھا مجھے یہاں کھڑے ہوئے۔ اس کے جاتے ہی میں نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں برآمدہ عبور کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک ایک آواز نے مجھے بت بنا دیا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" یہ اماں تھیں۔ وہ یقیناً تہجد کے وقت اٹھی ہوں گی اور انھوں نے حسب عادت و معمول مجھے جگانے کی کوشش بھی کی ہو گی۔ مجھے بستر پر نہ پا کر انھوں نے مجھے تلاش کیا ہو گا۔

"اماں۔ شکنتلا آئی تھی۔" میں نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"کیا۔ یعنی، یہ چکر ختم نہیں ہوا ابھی؟" اماں پریشان ہو گئیں۔

"نہیں اماں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آیئے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔" میں نے انھیں لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی۔ اماں کسی گہری سوچ میں ڈوبی سنتی رہیں پھر بولیں۔

"وقارالحسن! ہمیں خوشیاں راس نہیں آتیں۔"

"آپ دل چھوٹا نہ کریں اماں، ہمیں خوشیاں راس آتی ہیں اور انشاءاللہ راس آتی رہیں گی۔ آپ تو بڑے حوصلے سے جیتی رہی ہیں، اب حوصلہ ہاریں گی تو کیا ہو گا۔"

"میں حوصلہ نہیں ہاری بیٹا۔ بس تھک گئی ہوں۔"

"ایسا نہ کریں اماں۔ بس کچھ روز کی بات ہے۔ میں کوثر کو لے آیا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ سن کر اماں چونک اٹھیں۔ "تم اسے لے آؤ گے؟"

"جی اماں، یہ بہت ضروری ہے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا اس لیے کہ اب کوثر تک پہنچنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ پہلے تو میں صرف خاندان کی بدنامی دور کرنے اور تایا کو خوشیاں لوٹانے کے لیے ایسا کرنا چاہتا تھا مگر یہ جان کر کہ اس کی مدد کے بنا میں اپنی طاقت کو اپنے تابع نہیں کر سکوں گا، وہ میری شدید ضرورت بن گئی تھی۔ میں فیصلہ کر

چۃ تو آز. دو تین روز کے اندر اندر میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

وہ میری بات سن کر چپکی رہ گئیں۔ چند لمحے سوچتی رہیں پھر بولیں۔ "کب تک ارادہ ہے؟"

"جس قدر جلد ہو سکے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں آج ہی شرف الدین کے گھر شگون کی رسم کی تاریخ بھجوا دوں گی۔"

میں بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ انھیں ساری فکر میری تھی۔ وہ کوثر سے بے پناہ خائف ہو گئی تھیں۔ میں نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ جیسا چاہتی ہیں کریں' میں شگون کے بعد روانہ ہو جاؤں گا۔"

پھر میں نماز پڑھنے لگا۔ اماں کچھ دیر بعد اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نماز کے بعد بھی میں شگفتہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ بچھو کے بارے میں کہی گئی بات میرے دماغ میں بیٹھ کر رہ گئی تھی۔ پھر مجھے شگفتہ سے پائل بھی حاصل کرنا تھی۔ میں خود میں ہمت نہیں پا رہا تھا کہ اس سے پائل کی واپسی کا مطالبہ کروں۔ میں نے پہلی بار اسے تحفہ دیا تھا' آپ سمجھتے ہوں گے کہ کسی کو اپنے پیار کی نشانی دے کر بھلا آدمی اسے کیسے واپس مانگ سکتا ہے۔ ایک ہی بات میرے ذہن میں آئی کہ میں شرف الدین کو صاف صاف بتا دوں کہ میں کس الجھن میں ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری مدد ضرور کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں سو گیا۔

OO

اگلے روز اماں نے سویرے ہی سویرے خیرالنساء کو مٹھائی اور پھل دے کر شرف الدین کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ تین روز بعد کی تاریخ کی تصدیق کروا کر پھولوں کا زیور اور حلوہ لیے واپس آگئی۔ شگون کی تاریخ طے ہوتے ہی گھر میں جیسے چہل پہل شروع ہو گئی۔ اماں نے مٹھائی خاندان بھر میں بٹوا دی۔ مطلوب چچا اور چچی تو اسی شام گھر پہنچ گئے۔ انھیں ضرور جھٹکا لگا ہو گا۔ وہ تو اپنی طرف سے طے کر چکے تھے کہ ہمارا خاندان تباہی کی طرف پیش قدمی کر چکا ہے' اب یہاں سوگواری اور بدنامی کے سوا کچھ دیکھنے اور سننے کو نہ ملے گا۔ اس خوشی کی خبر نے پورے خاندان میں ہی تہلکا مچا دیا ہو گا مگر ان دونوں میں قوت برداشت کم تھی سو چلے آئے۔ میرے دل میں تو ان دونوں کے خلاف زہر بھر چکا تھا۔ میں ان دونوں ہی سے نفرت محسوس کر رہا تھا اس لیے

دعا سلام سے زیادہ بات ہی نہ کی۔ رات کو پتا چلا کر میاں بیوی نے ایسی بہت سی باتیں کیں جن سے تایا کو برا ہو۔ ان سے تعزیت کی گئی کہ جی ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹا ہیں اور سیدہ اور اس کی اولاد خوشیاں منا رہی ہے۔ اپنے پرائے کا یہی فرق ہوتا ہے' کوثر کا انھیں غم نہیں' ای اپنے گھر بسا رہے ہیں' ان کے اجڑے گھر اور اجڑے ہمیں قطعی احساس نہیں۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ نے ان دونوں کو منہ توڑ جواب دیا اور صاف صاف کہ کہ وہ زخموں پر نمک پاشی کرنے کا کام نہ کریں اور یہ تو خوشی پر خود انھوں نے اصرار کیا تھا۔

تایا کے رویے نے ان کے حوصلے پست کر دیے تو دونوں مبارک بادیں دینے لگے۔ شاید جان گئے کہ ان تِ میں تیل نہیں ہے۔ بہرحال یہ ساری داستان اماں بڑ مزے لے لے کر سنا رہی تھیں۔ اماں نے کافی بندوبست لیا تھا۔ امروہہ میں موجود تمام خاندان والوں کو دعوت جا چکی تھی۔ رشید چاچا کا بیٹا ذکاءاللہ' سائیکل رکشا پر اڑا پھر رہا تھا۔ اس کی بیوی گھر میں انتظامات کروا تھی۔ کھانے پینے کا تمام انتظام رشید چاچا نے اپنے میں لے لیا تھا۔ جہانی آپا کے چہرے پر دھنک پھیلی تھی۔

دو دن کیسے گزرے پتا بھی نہ چلا۔ شرف الدین میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ظاہر ہے ایک دن گھر دعوت کے بعد دوسرے روز ان کے گھر شگون کی تقریب تھی اس لیے وہ مصروف تھا۔ میں نے دوران میں وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ میں چاہتا تھا آئے تو اس سے بات کروں' ویسے بھی اگلے سوموا ابھی دن پڑے تھے سو میں مطمئن تھا۔

اگلے روز اماں نے بڑے چبوترے پر مردان خا۔ لیے قناتیں لگوا دیں۔ عورتوں کا انتظام بڑے برآمد۔ کیا گیا۔ بڑے چبوترے اور بڑے برآمدے کے درمیا قناتوں نے دونوں حصوں کو الگ تھلگ کر دیا تھا۔ زندگی میں یہ پہلی تقریب تھی جو اس قدر دھوم دھڑ۔ ہو رہی تھی۔ ایک تقریب بڑی پھوپی کے نکاح کی ایسے چپکے چپکے ہوئی تھی جیسے کوئی گناہ کیا جا رہا ہو۔ مجھ موقع پر چھوٹی پھوپی بہت یاد آئیں۔ وہ ہوتیں تو ان

تھا۔ یہ خوشیاں ان کے نام کی ہوتیں مگر قسمت پر۔ ہے؟ میں ابا' بڑی پھوپی' چھوٹی پھوپی اور دادی کو یا

شام سے پہلے ہی مہمان آنا شروع ہو گئے۔ شرف ن کے گھر والے بھی بڑے اہتمام سے آئے تھے۔ یہ ان گھر کی بھی پہلی خوشی تھی۔ ان لوگوں نے بھی ارمان نا تھے۔ اس تقریب میں اچھن چچا کی بہو اور مطلوب چچا مسلسل جڑی بیٹھی رہیں مگر مجھے اب کسی کی پروا نہ تھی۔ ویسے بھی میں کاموں میں مصروف تھا پھر شگون کی رسم ا ہی گئی۔ آج جہانی آپا کے شگون کی رسم ادا ہونا تھی۔ وہ لہن بن کر اس قدر پیاری لگ رہی تھیں کہ میں بتا نہیں تا۔ شرف الدین بڑا پروقار لگ رہا تھا۔ میں نے شرف الدین کو چاندی کی انگوٹھی پہنائی جس میں ہیرا جڑا تھا۔ ہمارے یہاں رسم تھی کہ ہم دادے پردادے کا عبا دولھا کو پہناتے تھے مگر شرف الدین کے بادا نے سختی سے منع کر دیا کہ مرزا صولت بیگ والا عبا وہ شرف الدین کو نہیں پہنانے دیں گے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اسے ابا کا عبا پہنایا جو ابا نے اپنی شادی کے موقع پر خاص طور پر بنوایا تھا۔ کناروں پر چاندی کے کام کا یہ ہلکے کریم کلر کا ریشمی عبا پہن کر شرف الدین بالکل شہزادہ لگ رہا تھا۔ شرف الدین اماں نے بھی جہانی آپا کو فیروزی ستاروں کے کام والا ا اور سونے کی انگوٹھی پہنا دی۔ آج شگفتہ نہیں آئی یہ دیکھ کر میرا دل بجھ گیا تھا مگر یہی مناسب بھی تھا۔ دلا" تو اسے رشتے کے وقت بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگلے روز شرف الدین کے گھر شگفتہ کا اور میرا شگون تھا۔

یہ دونوں تقریبات ساتھ خیریت کے ادا ہو گئیں۔ کوئی انہونی بات نہ ہوئی۔ مجھے کوثر کی طرف سے خطرہ تھا مگر کچھ ایسا نہ ہوا۔ سارے خاندان پر اوس پڑ گئی تھی۔ زیادہ تر عورتیں تائی کو گھیرے رہیں بلکہ بعض نے تو ان کا مذاق ہی اڑا لیا تھا۔ وہ بار بار کوثر کے بارے میں پوچھتی تھیں اور تائی انھیں بتاتی تھیں کہ وہ تیار ہو رہی ہے۔ پیروں میں مہندی لگائے بیٹھی ہے۔ دلھن بن رہی ہے۔ وہ شرف الدین کو بار بار چوم کر لوگوں کو بتا رہی تھی کہ یہ کوثر کا دولھا ہے۔ یہ سن کر کچھ عورتیں تاسف کا اظہار کر رہی تھیں اور ہونٹ دبا کر ہنس رہی تھیں۔ ایک بار تو اماں نے سب کو ڈانٹ کر چپ کرا دیا تھا۔ کچھ بدمزگی بھی پیدا ہوئی مگر خاندان کی چند باوقار خواتین نے معاملے کو سنبھال لیا۔

بہرحال ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے علاوہ دونوں تقریبات بخیر ہو گئیں۔ میں نے شرف الدین سے کہہ دیا کہ مجھے چند انتہائی ضروری باتیں کرنا ہیں اس لیے وہ پہلی فرصت میں

مجھ سے ملے۔ وہ اگلے ہی روز آگیا۔ میں نے بڑی صفائی سے بتا دیا کہ میں وہ سیڑھیوں کے نزدیک سے ملنے والی پائل شگفتہ کو تحفے کے طور پر دے چکا ہوں اور اب یہ مسئلہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے پائل واپس مانگتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں۔

یہ سن کر شرف الدین ہنس پڑا اور بولا کہ تم باؤلے ہو' ان باتوں سے نہ پوزیشن بنتی ہے نہ بگڑتی ہے' مجھے وہ پائل اس سے بلا جھجک مانگ لینا چاہیے تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں وہ واپس نہیں مانگنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اس کے علم میں آئے بغیر وہ پائل مجھے مل جائے۔ میں بالکل ویسی ہی دوسری پائل بنوا کر دوبارہ اسے دے دوں گا۔

"گویا مجھے وہ پائل چرانا پڑے گی؟" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"ہاں' یہ کام جس قدر جلد کر سکو کر لو۔ میں وہ پائل سنار کو دکھا کر ڈیزائن کرا لوں گا اور یہ کام ہر حال میں سوموار تک مکمل ہو جانا چاہیے۔"

شگفتہ کی بات سن کر وہ بھی میری ہی طرح حیران ہو گیا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے تو آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے تھی پھر وہ یہ مطالبہ کیوں کر رہی ہے۔ بچھو کی بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے حویلی کی اچھی طرح تلاشی لینا چاہیے۔ شگفتہ سے اگلی ملاقات تک مکمل طور پر احتیاط کرنا چاہیے اور اس سے ملاقات ہوتے ہی اس بارے میں تفصیل سے پوچھنا چاہیے۔

میں نے اسے تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ میں ایسا ہی کروں گا پھر میں نے اسے بتایا کہ میں اگلے سوموار کے بعد کسی بھی دن یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اسے میرے پیچھے میرے گھر والوں کا خیال رکھنا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ پردہ اور بے پردگی کے چکر میں نہ پڑے اور گھر کا ہر طرح خیال رکھے۔ یہی بات میں نے اماں سے بھی کی کہ وہ ان فرسودہ باتوں پر پڑنے کی بجائے اپنے اور گھر والوں کے تحفظ کو مدنظر رکھیں۔ تایا کو بھی بتا دیا کہ میں اب کوثر کو لینے جا رہا ہوں۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں پل بھر کو جگنو سے جھلملا گئے تھے۔ آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے مگر پھر انھوں نے مجھے خبردار کیا کہ میں اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالوں۔ میں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر میں کوثر کو نہ لا

سکا تو خود بھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ میری یہ بات سن کر اماں کے چہرے پر سائے سے لہرا گئے تھے' تایا بھی پریشان ہو گئے اور بولے۔ "وقارالحسن! یہ میرا حکم ہے بیٹا کہ اگر کوثر تمہارے سمجھانے سے نہ آئے تو اسے اس کے حالوں پر چھوڑ دینا۔ وہ تو اپنے کیے کی سزا بھگتے گی مگر ہمیں کس کے سہارے چھوڑ رہے ہو۔ ہم نے کون سے گناہ کیے ہیں بڑا جس کی تم اتنی بڑی سزا ہمیں دو گے۔"

"تایا میں حتی المقدور کوشش کروں گا کہ وہ سمجھانے پر چلی آئے مگر اسے اس کے حالوں پر چھوڑ کر نہیں آسکوں گا۔ وہ نہیں مانی تو میں زبردستی اسے لانے کی کوشش کروں گا۔" میرے لہجے کی پختگی انھیں سمجھا گئی کہ میں جو عزم لے کر جا رہا ہوں اسے پورا کیے بغیر نہیں مانوں گا۔

وہ چپ ہو گئے مگر اماں بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں۔ بعد میں اماں نے باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا کہ تم اس کلموہی کی خاطر اپنی ماں اور بہنوں کو بے آسرا چھوڑ کر جا رہے ہو۔ بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر چپ کرایا اور بتا دیا کہ میں آپ لوگوں کی طرف سے یکسر غافل نہیں ہوں گا' دوسرا یہ کہ میں اس حویلی کے گرد حصار بنا کر جاؤں گا تاکہ میرے پیچھے کوئی پریشانی نہ ہو باقی وہ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ خدا نے چاہا تو میں کامیاب لوٹوں گا۔ اس رات کافی دیر تک ہم سب جاگتے رہے۔ ایک سوگواری سی تھی جو گہری ہوتی چلی گئی۔ اماں بجھی بجھی سی تھیں۔ پتا نہیں رات بھر وہ سوئی بھی تھیں کہ جاگتی ہی رہیں۔ میں البتہ ہلکا پھلکا تھا اور تمام رات بڑے آرام سے سویا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی شرف الدین آگیا۔ وہ پائل لے آیا تھا۔ میں اور وہ دونوں ہی سنار کی طرف چلے گئے۔ سنار نے ایک رات پائل چھوڑنے کو کہا' میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر میں چھوڑ آیا۔ اگلی صبح ہی میں دکان پر پہنچ گیا۔ اس سے پائل لینے کے بعد ہی مجھے سکون ہوا۔ اس نے وعدہ کیا کہ سوموار کی صبح وہ دوسری پائل بنا کر مجھے دے دے گا۔ اگلا دوسرا روز سوموار تھا۔ شرف الدین وعدے کے مطابق میرے پاس چلا آیا۔ میں اسی کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ جا کر میں نے سنار سے پائل لی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے ہوبہو ویسی ہی پائل بنائی تھی۔ اصلی اور نقلی میں فرق کرنا مشکل ہو رہا تھا' بہرحال میں نے نقلی پائل شرف الدین کے حوالے کر دی۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا تھا کہ شگفتہ کو پائل کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔

اب اصل پائل میرے پاس تھی۔ ہم دونوں حویلی آگئے۔ وہیں ہم نے چائے پی۔ شرف الدین جانے کو تیار تھا' وہ کہتا تھا کہ وہ شکنتلا سے مل کر ہی جائے گا مگر میں نے اسے بتایا کہ وہ جانے رات کے کون سے پہر آئے گی اس لیے اسے گھر چلے جانا چاہیے۔ وہ رات کے کھانے کے بعد گھر جانے کو نکلا تو میں بھی اس کے ساتھ باہر چلا آیا۔ ہم کھڑے باتیں ہی کر رہے تھے کہ محلے بھر میں شور مچ گیا انوار حیدر کی دکان میں آگ لگ گئی۔

انوار حیدر وہی سنار تھا جس سے میں نے پائل بنوائی تھی۔ یہ سنتے ہی ہم دونوں بھاگ پڑے۔ دور ہی سے شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ہم جب تک وہاں پہنچے آگ پوری دکان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ انوار حیدر کو لوگوں نے دکان سے نکال لیا تھا مگر وہ اس بری طرح جل چکا تھا کہ اس کے بچنے کی امید بہت کم تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ گیا۔

اس زمانے میں امروہہ میں ایک ہی چھوٹا سا کلینک تھا جو سرکار نے بنوایا تھا۔ وہاں ایمبولینس وغیرہ کا بندوبست نہیں تھا۔ لوگوں نے سائیکل رکشا پکڑ لیا۔ میں نے اسے سائیکل رکشا میں ڈالا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کلینک روانہ ہو گیا۔ شرف الدین دوسرے سائیکل رکشا میں ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ انوار حیدر نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ میں نے اس سے آگ لگنے کا سبب پوچھا جواب اس نے بڑی مشکل سے بتایا اور جو بتایا اسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس نے بتایا کہ جوگیا رنگ کا کپڑا لپیٹے ہوئے' بال کھولے اور چہرے پر بھبھوت ملے ایک جوان لڑکی اچانک ہی اس کے پاس پہنچی اور اس نے دونوں پائل مانگیں جو میں اسے دے آیا تھا۔ جب اس نے بتایا کہ وہ پائل میں لے جا چکا ہوں تو اس نے غصے میں کچھ الٹی سیدھی باتیں اور سمجھ میں نہ آنے والے جملے بولنے شروع کر دیے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی دکان میں آگ لگ گئی۔ اس نے

تھا' اس سے پہلے اس کے باپ ہمارے خاندان کے زیورات بنایا کرتے تھے۔ چند ہی روز پہلے میں نے شرف الدین کے لیے انگوٹھی بھی انھی سے لی تھی۔ ان کی عورتوں کا بھی حویلی میں آنا جانا تھا۔ اماں یہ سن کر آبدیدہ ہو گئیں انھوں نے صبح تعزیت کے لیے جانے کا ارادہ کیا۔ میں نے کوثر والی بات انھیں نہیں بتائی تھی۔ نہ پائل والے

سے وہ آگاہ تھیں۔ پائل والا قصہ بتانے کے لیے انھیں یہ بھی بتانا پڑتا کہ وہ میں شگفتہ کو دے چکا ہوں اور یہ بات بھی نہ تھی۔ انھیں صرف اتنا پتا تھا کہ شکنتلا مجھے کوثر کو واپس لے آنے کا کہنے اور پرکاش کے بارے میں پتا کرنے آئی تھی۔

OO

رات میں جاگنے کی تیاری کیے ہوئے تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے گرماگرم چائے پی تھی اس لیے نیند آنے کا ویسے بھی کوئی سوال نہ تھا۔ اماں اور بہنیں اپنے کمرے میں تھیں۔ میں تایا کے پاس جا بیٹھا۔ وہ افسردہ تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں نے کوثر کا پتا چلا لیا ہے' ممکن ہے کہ میری آج اس سے ملاقات ہو جائے۔ وہ یہ سن کر بے چین ہو گئے اور اصرار کرنے لگے کہ میں انھیں بھی ساتھ لے لوں مگر میں نے کہہ دیا کہ آپ یہاں اماں اور تائی کے پاس رہیں' یہ کام مجھے کرنے دیں۔ مجھے نوے فیصد امید تھی کہ کوثر آج یہاں ضرور آئے گی۔ تائی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے گوتم بدھ بنی بیٹھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مراقبے میں بیٹھی ہوں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا جیسے نہ وہ کچھ دیکھ رہی ہوں اور نہ ہی کچھ سن رہی ہوں۔ ویسے میں نے تایا سے آہستہ لہجے میں بات کی تھی ورنہ ممکن تھا کہ کوثر کا نام سن کر وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔

میں کافی دیر تایا کے پاس بیٹھا رہا۔ میں نے یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ کوثر سے ملاقات والی بات حتمی نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگلے روز میں اس کی تلاش میں نکل جاؤں' بہرحال میری بات نے انھیں کافی مضطرب کر دیا تھا مگر اس کے باوجود ان کے چہرے پر خوشی بھی تھی۔ میں کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

نماز سے فراغت پانے کے بعد میں نے جیب میں پائل کی موجودگی کو محسوس کیا پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک ہی مجھ پر

آگ لگتے ہی وہاں سے نکلنا چاہا مگر وہ لڑکی اسے آگ میں دھکا دے کر چلی گئی۔ اتنی دیر میں محلے کے لوگ اور باقی دکان دار پہنچ گئے اور اسے وہاں سے نکال لائے۔ اتنی بات اس نے اسپتال پہنچتے پہنچتے ختم کی۔ میں نے اسے تو کچھ نہیں کہا حالانکہ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ پائل والی بات کسی کو نہ بتائے مگر اس طرح کہہ کر میں اس کی نظر میں مشکوک نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لڑکی کا جو حلیہ انوار حیدر نے بتایا تھا وہ ہوبہو کوثر کا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بات پھیلی تو پولیس مجھ تک ضرور آئے گی۔ پھر کیا ہو گا یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔ بہرحال اسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر جو اکثر مکھیاں مارا کرتا تھا فوراً چاق چوبند ہو گیا اور انوار حیدر کو اندر لے گیا۔ دو چار سرکاری ملازم وہاں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ان میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ شرف الدین بھی پہنچ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انوار حیدر کے رشتے دار بھی واویلا کرتے آن پہنچے۔ میں دل میں ڈر رہا تھا کہ انوار حیدر ڈاکٹر کو سب کچھ نہ بتا دے مگر تھوڑی ہی دیر بعد یہ خبر آگ ہی کی طرح پھیل گئی کہ انوار حیدر مر گیا۔

ہم رات گئے تک اس کے گھر بیٹھے رہے۔ پولیس بھی آئی' پوچھ گچھ بھی ہوئی لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی جس سے پتا چلتا کہ انوار حیدر پائل والی بات یا کوثر کے بارے میں کسی کو کچھ بتا گیا ہے۔ شرف الدین کو ساری بات میں بتا چکا تھا۔ وہ کافی سہما ہوا تھا۔ رات گئے ہم لوٹ آئے۔ شرف الدین کی جیب میں پائل موجود تھی جبکہ میں اصلی پائل اپنے کمرے میں رکھ آیا تھا۔ شرف الدین اگلے روز ملاقات کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔ میں نے گھر آنے کے بعد سب سے پہلے پائل چیک کی' وہ موجود تھی۔ میں نے احتیاطاً اسے اپنی جیب میں رکھ دیا۔ یہ خدشہ لاحق ہو چکا تھا کہ کوثر اس پائل کی تلاش میں یہاں تک آ پہنچی ہے' مجھے یقین تھا کہ وہ یہ جان کر میں پائل لے چکا ہوں' یہاں ضرور آئے گی۔ میں خوش بھی تھا کہ اس کی تلاش میں اب مجھے کہیں جانا نہیں پڑے گا۔ میں لاشعوری طور پر اس کا منتظر تھا۔ دوسری طرف مجھے شکنتلا کا بھی انتظار تھا۔ آج سوموار تھا اور اسے آج آنا تھا۔

میں نے اماں کو انوار حیدر کے بارے میں بتایا کہ اچانک آگ لگ جانے سے وہ مر گیا۔ وہ ہمارا خاندانی سنار

نیند طاری ہونے لگی۔ نیند کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میں سر جھٹک کر نیند بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اٹھ کر صراحی سے ٹھنڈا پانی نکال کر چہرے پر چھینٹے بھی مارے' کمرے میں ٹہلنے لگا تاکہ نیند نہ آئے مگر قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پلکیں بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ مجھے خطرہ قریب آتا محسوس ہونے لگا' میرا خیال تھا کہ سادھو یا کوثر کوئی شرارت کرنا چاہتے ہیں' وہ شرارت پائل حاصل کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی میں کمرے

کے فرش پر بیٹھ گیا اور میں نے حصار باندھنے والا وظیفہ کرنا شروع کر دیا۔ میں دھیرے دھیرے اپنے گرد لکیر بھی کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ جب میں گھومتا ہوا دوسری جانب مڑا تو لمحہ بھر کو مجھے شدید جھٹکا لگا جیسے مجھے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو' میری نگاہوں کے عین سامنے کیکڑے جتنا بڑا بچھو اپنا ڈنک اٹھائے کھڑا تھا۔ لمحہ بھر کو میرا ہاتھ لرز اٹھا اور قریب تھا کہ غیر ارادی طور پر میری وہ انگلی جو اپنے گرد حصار کھینچ رہی تھی' اٹھی جاتی کہ میں نے خود پر قابو پا لیا' با آواز بلند وظیفہ پڑھنے لگا۔ میں نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کرنے کے لیے آنکھیں موند لیں اور دھیرے دھیرے گھومتا ہوا واپس اسی پوزیشن میں آ گیا کہ اب وہ بچھو پھر میری پشت پر رہ گیا۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ بے وجہ ہی یہ خیال شدت اختیار کر رہا تھا کہ بچھو رینگتا ہوا میری جانب بڑھ رہا ہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چیخ کر کھڑا ہو جاؤں مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ کرنے کو تو میں نے یہ سب کچھ کر لیا مگر اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں اس دائرے میں کتنی دیر بیٹھ سکتا تھا؟ پتا نہیں شکنتلا کب آتی۔ بچھو کی موجودگی نے سادھو کی شرارت کا تو بھانڈا پھوڑ دیا تھا مگر کوثر کے بارے میں مجھے تشویش تھی۔

بہرحال یہ رات تو مجھے ویسے بھی جاگ کر گزارنا تھی اس لیے میں نے یونہی بیٹھے رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور سر گھما کر بچھو کو دیکھا۔ وہ اب بھی یونہی ساکت بیٹھا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ رینگتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ وہ میری کھینچی ہوئی لکیر سے فاصلہ رکھے ہوئے تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ اب میں اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ میں نے نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ ہم دونوں جانی دشمنوں کی طرح ایک دوسرے پر نگاہ جمائے جانے کب تک بیٹھے رہے۔ میں یہی سوچتا رہا کہ یوں کب تک بیٹھے رہنا ہو گا کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میری کیفیت بدلنے لگی ہے۔ مجھ پر پھر غنودگی کا حملہ ہوا' بدن نڈھال سا محسوس ہونے لگا۔ ایسے میں شکنتلا کا خیال شدت اختیار کر گیا۔ میں اس سے کیا ہوا وعدہ جلد از جلد پورا کرنا چاہتا تھا۔ پائل اس کی امانت تھی۔ وہ اس تک پہنچا کر ہی مجھے سکون ملتا اس لیے میں شکنتلا کی آمد کا منتظر تھا۔ میری آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی بند ہو گئیں اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں ہواؤں میں اڑتا ہوا' بڑی تیزی کے ساتھ ایک سمت میں چلا جا رہا ہوں۔ میرے چاروں اطراف درخت ہی درخت تھے پھر اچانک ہی میں ایک چوڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے مجھے لگا جیسے یہ رستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ چند ہی لمحوں بعد بالیکا مندر میرے سامنے تھا۔ اندھیرے میں بالیکا مندر کی عمارت بڑی خوفناک اور پراسرار لگ رہی تھی۔ میں بالیکا مندر کے پاس رکا نہیں بلکہ اس نیچی باؤنڈری وال کو کراس کر کے ان کھنڈرات کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک بار میں اور شرف الدین پہلے بھی جا چکے تھے۔ راہ میں ہوا سے جھومتی سرکنڈوں کی جھاڑیاں ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ پہلی بار ان سرکنڈوں کے درمیان چلتے ہوئے میں کس قدر خوفزدہ تھا مگر اس وقت میں ان سرکنڈوں کے اوپر سفر کر رہا تھا۔ جھینگروں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں' دور بہتے ہوئے پانی کا شور' ہوا کے جھکڑ چلنے کی آوازیں عجیب سی سنسنی پھیلا رہی تھیں۔

میں بغیر رکے کھنڈرات کے قریب پہنچ گیا۔ اونچے برآمدے میں داخل ہوتے ہی اندرونی عمارت کا بیرونی دروازہ جسے پہلی بار میں نے اور شرف الدین نے زور لگا کر کھولا تھا' وہ اس وقت بغیر ہاتھ لگائے ایک تیز چرچراہٹ کی آواز سے کھلتا چلا گیا۔ میں بے جھجک اندر داخل ہو گیا۔ اندر گھپ اندھیرا ہونے کے باوجود ہر چیز مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس حصے میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ دوسری جانب کھلے ہوئے حصے پر پڑی۔ وہاں الاؤ روشن تھا۔ چاروں طرف مشعلیں جل رہی تھیں۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔

"آؤ وقار الحسن!" ایک کھرکھراتی ہوئی آواز نے مجھے تھم جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ آواز سو فی صد سادھو کی تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنی جیب کی طرف رینگ گیا

"مجھے یقین تھا کہ شکنتلا کی کھوج تمہیں سکھ نہیں لینے دے گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنی کریہہ آواز میں اونچا قہقہہ لگایا۔ میری سماعت کے علاوہ حلق میں بھی خراشیں سی پڑنے لگیں۔ "دیکھو وہ ہے شکنتلا۔ میرے جیون کی سب سے بڑی آشا پوری کرنے والی آتما۔ میں نے اسے بڑے سکھ سے رکھا ہوا ہے۔ بڑی شانت ہے۔ وہ تم بالکل چنتا نہ کیا کرو۔"

وہ انتہائی خبیث لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ جس تخت نما چبوترے پر بیٹھا تھا' اس پر تین معصوم اور کم سن لڑکیاں سہمی ہوئی کونوں میں سمٹی بیٹھی تھیں۔ تینوں کی خوفزدہ نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم سوائے باریک جالی دار لبادے کے کوئی دوسرا لباس نہ تھا۔ ان تینوں کے لمبے لمبے بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور وہ خود کو سمیٹنے اور بدن چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔

میری نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔ سادھو ان تینوں کے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ پہلے کی طرح آج بھی اس کے سامنے ایک انسانی کھوپڑی سے بنا پیالہ رکھا تھا جس میں گاڑھا سا ایک مائع کھول رہا تھا۔ دوسری جانب' یعنی اس کے دائیں طرف ایک گول فٹ بال جیسا باریک کانچ کا برتن تھا۔ اس برتن میں ہلکے گلابی رنگ کا کوئی سیال تھا۔ شکنتلا ایک سیاہ مورتی کے قدموں میں بکھری سی پڑی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اس وقت قطعی انسانی روپ میں تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا یا مان سکتا تھا کہ وہ مر چکی ہے اور سامنے اس کی روح ہے۔ اسے اتنا مکمل انسانی روپ دینا ایک انہونی اور سخت اچنبھے کی بات تھی۔ اگر یہ کارنامہ سادھو کا تھا تو واقعی وہ بڑی شکتی والا تھا۔ کاش وہ اپنی طاقت کا استعمال ان چکروں میں نہ کرتا۔ وہ اپنی ان طاقتوں سے بڑے اچھے کام بھی کر سکتا تھا۔

"دیکھا تم نے۔ کتنی شانت ہے تمہاری شکنتلا؟" وہ مجھے خاموش دیکھ کر پھر گویا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک انتہائی خبیث مسکراہٹ تھی۔

"کوثر کہاں ہے؟" میں نے سخت اور تیز آواز میں سوال کیا۔

"اوہ وہ مورکھ کنیا؟" وہ ہنسا۔ "تمہیں کابو کرنے کے چکروں میں پڑی ہے۔ میں نے کہا ہے اس سے کہ وہ اگر تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہے تو میرے پاس چلی آئے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وکار الحسن کے بدن کا سارا شہد میں اسے پلا دوں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے اور وعدہ کھلافی کبھی نہیں کروں گا۔ دیکھو وکار الحسن! مجھے دیکھو' میں تمہیں جوان نہیں لگ رہا کیا؟"

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے یوں دونوں ہاتھ پھیلائے جیسے اپنے بدن کی نمائش کر رہا ہو۔ میں اس کا گٹھا ہوا بدن اور چہرے پر چمکتی ہوئی روشنی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ واقعی' وہ سادھو نہیں لگ رہا تھا جو میں اب سے پہلے دیکھتا رہا تھا۔ صرف اس کی آواز تھی جو اس کے سادھو ہونے کا ثبوت تھی ورنہ اس کے کریہہ چہرے پر اس وقت جوانی کا جوبن تھا اور بدن میں طاقت کا دریا سا بہتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اسے کہتے ہیں جیون وکار الحسن! میٹھا جیون! میں نے جو کچھ کھو دیا تھا اسے دوبارہ پا لیا ہے اور اس کے لیے میں تمہارا احسان مند ہوں۔ یہ جیون تم نے دیا ہے' اس جیون کی مٹھاس میں تمہیں بھی دان کرنا چاہتا ہوں۔ آؤ اور ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہے لے لو۔" اس نے ان تینوں معصوم اور کمسن لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ان تینوں کے چہروں پر خوف پھیل گیا۔ اسی لمحے میرے دماغ میں ایک آواز گونجی۔ "وقار الحسن بچو۔" یہ آواز شکنتلا کی تھی اور خاصی حواس باختہ تھی۔ میں بے اختیار اچھل پڑا اور میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ سادھو چلا اٹھا۔

"اوہ مورکھ۔" اتنا کہتے ہی سادھو نے اپنے سامنے رکھے پیالے میں بلا جھجک ہاتھ ڈال دیا اور بھاپ اگلتا پانی چلو میں لے کر شکنتلا کی طرف اچھالا۔ ایک تیز چھنچھناہٹ سی پھیل گئی اور شکنتلا کی کرب انگیز چیخوں سے پورا کھنڈر گونج اٹھا۔ میں بوکھلایا سا کھڑا تھا کہ اچانک مجھے اپنی گدی پر کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں بات کو سمجھ پاتا یا اپنی گدی پر موجود شے کو جھٹک پاتا' ایک سوئی سی میرے دونوں شانوں کے بیچوں بیچ بدن میں گھستی چلی گئی۔ میرا سر گھوم گیا۔ میں لڑکھڑایا اور پھر میں نے خود کو پاتال میں گرتا محسوس کیا' وہ کیا چیز تھی' میرے گرد کیا ہو رہا تھا مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ صرف شکنتلا کی کرب آمیز چیخیں تھیں جو میرے گھومتے ہوئے سر میں گونج رہی تھیں۔

اچانک مجھے جھٹکا لگا۔ میرا ماتھا کسی ٹھوس چیز سے یا شاید فرش سے ٹکرایا تھا۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور میں اپنے حواسوں میں آ گیا۔ میں اپنے کمرے میں' اپنے گرد باندھے حصار کے اندر تھا اور اس طرح کہ جیسے سجدے میں پڑا ہوں۔ میں نے جلدی سے سیدھا ہوتے ہوئے چاروں طرف دیکھا' اور یہ دیکھ کر سن رہ گیا کہ میرے گرد کوئی حصار نہ تھا۔ میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ وہاں موجود بچھو کا خیال آیا تو میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف دیکھا مگر بچھو کہیں نہ تھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ گدی کی طرف بڑھا

انگلیاں کسی چپچپی چیز میں لتھڑ گئیں۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ کو دیکھا تو انگلیوں پر لگا خون دیکھ کر خوف کی لہر سی پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے گھبرا کر قمیص اتار دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بچھو میری گدی پر موجود ہے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا البتہ قمیص کے کالر پر خون کی باریک سی لکیر بن گئی تھی۔

میں بھاگتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں میں نے سارے کپڑے اتار کر جھاڑے۔ بالٹیاں بھر بھر کر پانی خود پر انڈیلا مگر بچھو نہیں ملا۔ وہ میرے بدن پہ ہوتا تو پتا چل جاتا' کپڑوں میں ہوتا تو جھاڑنے پر فرش پر گر جاتا۔ وہ کہیں نہیں تھا مگر خون کی لکیر بتا رہی تھی کہ وہ اپنا زہر مجھ میں اتار چکا ہے۔ ویسے میں بالکل ٹھیک تھا۔ سوائے گدی پر ہلکی سی چبھن کے احساس کے' کوئی تکلیف نہیں تھی مگر موت کا خوف بڑا بے صبرا ہوتا ہے۔ مجھ پر بھی عجیب قسم کا خوف سوار تھا۔ میں جیسے تیسے غسل خانے سے نکلا اور سیدھا اماں کے کمرے میں چلا آیا۔ اماں میری آہٹ پر جاگی تھیں۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونک اٹھیں۔

"وقار الحسن۔ کیا بات ہے۔ کیا ہوا تمہیں؟" وہ تیزی سے میری طرف لپکیں۔ جہانی آپا نے مچی مچی آنکھیں کھول کر ہم دونوں کی طرف دیکھا اور پھر وہ بھی اٹھ بیٹھیں۔

میں لرزتا کانپتا ہوا اماں کے سہارے ان کے پلنگ تک آگیا۔ "کیا بات ہے بیٹا۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔ تم پیلے کیوں ہو رہے ہو۔" وہ گھبرائی ہوئی تھیں۔ انھوں نے جہانی آپا سے پانی لانے کو کہا۔ وہ جھٹ صراحی کی طرف بڑھ گئیں۔

میں کچھ بھی نہیں بول پایا اور یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا۔ موت کا خوف ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی گھٹ گیا۔ مجھے خیال آگیا کہ اگر میں نے اماں کو اور بہنوں کو کچھ بتا دیا تو کیا ہو گا؟ وہ لوگ برداشت کر پائیں گی کہ ان کا جوان بیٹا۔ بھائی موت کے منہ میں اتر رہا ہے اور وہ بے بس ہیں؟ ان پر تو قیامت ہی بیت جائے گی۔ موت آنی ہے اور آئے گی ہی' پھر پہلے سے انھیں عذاب میں مبتلا کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ میں اپنی سی کوشش کر سکتا تھا ورنہ موت کے آگے تو بڑے بڑے طرم خان بھی بے بس تھے۔ وہ تو فقیروں کے جھونپڑوں میں بھی اور بادشاہوں کے محلات میں بھی بے دھڑک گھس جاتی ہے۔ اسے بھلا کون روک سکتا ہے۔

"بولو وقار۔ بولو۔" اماں چیخ پڑیں۔

"کک۔ کچھ نہیں اماں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ آپ۔ آپ ذکااللہ سے کہیں حکیم علی احمد کو لے آئے۔" میں نے بہ مشکل کہا اور چہرے پر پسینے کے بہتے ہوئے قطروں کو آستین سے پونچھ لیا۔

اماں یہ سنتے ہی باہر بھاگ پڑیں۔ جہانی آپا اور شنو آپا میری حالت دیکھ کر باقاعدہ رونے لگی تھیں۔ جہانی آپا دوپٹے کے پلو سے میرا چہرہ صاف کر رہی تھیں۔ اماں مجھے پلنگ پر لٹا کر گئی تھیں۔ مجھے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی کیفیات پر غور کرنے لگا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا واقعی میں موت کے دروازے کی طرف بڑھ رہا ہوں یا نہیں۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی تکلیف' کسی قسم کی اذیت یا ایسی کوئی کیفیت نہیں ہے جو موت کی علامت ہو۔ ہاں پورے بدن سے پسینے کے قطرے امنڈے پڑ رہے تھے۔ ذرا دیر بعد ہی اماں بوکھلائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے تایا بھی تھے۔ وہ آتے ہی مجھ پر جھک گئے۔

"کیا ہوا بٹوا؟" وہ گھبرائے ہوئے تھے۔

"کچھ نہیں تایا۔ میں ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ان کی کھوجتی نگاہوں میں ہزاروں سوال تھے۔ میں انھیں بتا چکا تھا کہ شاید آج کوثر سے میری ملاقات ہو۔ ممکن ہے وہ یہی سمجھ رہے ہوں کہ کوثر سے ملاقات کے بعد میری یہ حالت ہوئی ہے۔ وہ میری پائنتی کو بیٹھ گئے۔ "ذکااللہ حکیم صاحب کے گھر گیا ہے' آتے ہوں گے۔" انھوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر اپنی بھیگی ہوئی ہتھیلی دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انھوں نے جہانی آپا سے تولیہ منگا لی اور میرا چہرہ صاف کرنے لگے۔

"دیکھیے تو۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف ہو رہے ہیں۔" اماں نے تایا سے کہا۔ وہ میرے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھیں۔

"بٹوا کیا تم کوئی تکلیف محسوس کر رہے ہو۔ کیا لگ رہا ہے' کہاں تکلیف ہے' درد ہے کیا؟" انھوں نے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔

میں نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ "کہیں بھی تکلیف نہیں ہے تایا' بس ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں۔"

اماں نے جہانی آپا اور شنو آپا سے کہا کہ وہ میرے تلوے رگڑیں پھر انھوں نے میری ہتھیلیاں رگڑنا شروع کر دیں۔ ذرا دیر بعد ہی حکیم صاحب آ گئے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی اماں نے گھونگھٹ سا نکال لیا اور جہانی آپا گھبرا باہر چلی گئیں۔ اماں اور تایا وہیں تھے اور میں چاہتا تھا کہ حکیم صاحب کو بتاؤں کہ مجھے بچھو نے کاٹا ہے مگر ان دونوں کے سامنے یہ ممکن نہ تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے تکلیف کے بارے میں پوچھا۔ میں نے جس انداز سے نہیں بتایا کہ مجھے کہیں تکلیف نہیں ہے اس سے شاید وہ سمجھ گئے کہ میں ان دونوں کے سامنے بتانے سے گریز کر رہا ہوں۔ وہ کوئی خفیہ قسم کی بیماری سمجھے ہوں گے اس لیے انھوں نے ان دونوں سے کہہ دیا کہ وہ لوگ باہر چلے جائیں۔ اماں تو سنتے ہی لپک کر باہر نکل گئیں مگر تایا باہر جاتے ہوئے جھجک رہے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں بڑے مرزا! یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ذرا تفصیل سے ان کا حال جاننا چاہتا ہوں۔ آپ باہر تشریف لے جائیں تو۔" اور تایا مجھے کھوجتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے باہر چلے گئے۔

"اب بولو میاں! مسئلہ کیا ہے' تمہیں جو بھی تکلیف ہے وہ بغیر کسی شرم و حیا اور جھجک کے بیان کرو۔ معالج اور وکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ شاباش بولو کیا ہوا تھا۔"

مجھے یہ جان کر شرم آئی کہ وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی انھیں بتایا کہ میں سویا ہوا تھا کہ میں نے اپنی گدی پر کسی چیز کو رینگتا محسوس کیا پھر اپنی گدی پر سوئی کی چبھن محسوس کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑے تو ایک اتنا بڑا بچھو نکل کر بھاگ گیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میری گدی پر ہلکی سی چبھن اور جلن کے علاوہ خون بھی نکلا تھا پھر میں نے انھیں قمیص کا وہ حصہ دکھایا جو اب تک اماں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا تھا اس لیے کہ میں اندر داخل ہوا تھا تو اماں نے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا تھا۔

حکیم صاحب نے میری تمام باتیں بڑی توجہ سے سنیں پھر مجھے پیٹ کے بل لیٹنے کو کہا۔ میری گدی کو بڑی دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر گہرا سانس لے کر سیدھے ہو گئے اور بولے۔ "بیٹا یہاں تو سوئی کے چبھنے جیسا بھی کوئی نشان نہیں ہے' اگر بچھو نے کاٹا ہوتا تو وہاں باریک سا سوراخ' خون کا قطرہ ہوتا اور اس کے ارد گرد کی کھال سرخ ہو چکی ہوتی۔ بعض خطرناک بچھوؤں کے کاٹنے سے کھال سیاہی مائل سرخ بھی ہو جاتی ہے مگر تمہاری گدی ہی نہیں شانوں کا پورا حصہ بالکل ٹھیک ہے۔ تمہیں شاید وہم ہوا ہو گا۔"

"وہم۔ وہم کیسا حکیم صاحب' آپ کو میں نے اپنا پچھلا کالر دکھایا ہے اس پر خون کی لکیر' قطروں کا نشان۔"

"قمیص اتارو۔" انھوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

میں حیران ہوا پھر میں نے قمیص اتار دی۔ "دیکھو۔ تم کون سے نشان کی بات کر رہے ہو؟"

پھر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ میری قمیص پر کوئی نشان اور کسی قسم کی لکیر نہیں تھی۔ خون کے قطرے کا نشان تو دور کی بات ہے ایک ذرہ بھی نہ تھا۔ میں نے سر اٹھا کر حکیم صاحب کو دیکھا۔ ان کے شفیق چہرے پر دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

"کوئی خواب دیکھا ہو گا تم نے اور یہ جو تمہاری کیفیت ہے نا' یہ صرف خوف کی وجہ سے ہے۔ میں طاقت کے لیے معجون بھیج دیتا ہوں۔ وہ کھا لینا اور اپنے دماغ سے خرافات کو نکال دو۔ وہم ایک بہت بڑی بیماری ہے جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کھڑے ہو گئے میں حیرت سے گنگ تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ وہ کب چلے گئے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ میرا وہم کیسے ہو سکتا ہے' سو فیصد حقیقت تھی۔ نہانے کے لیے جب میں نے قمیص اتاری تھی تو خون کا دھبا اس وقت بھی موجود تھا اور جب پہلی بار کمرے میں قمیص اتار کر جھٹکی تھی تو بھی۔ غسل خانے سے یہاں تک آنے میں وہ دھبا غائب کیسے ہو سکتا ہے۔ بہرحال میری یہ حیرت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی اس لیے کہ اب ایسے معاملات پر حیرت کا اظہار کرنا اور ایسی حرکتوں کا سبب ڈھونڈنا بیکار اور قطعی بے وقوفی تھا۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ موت کا وہ خوف جو لمحہ بھر پہلے تک مجھے جکڑے ہوئے تھا' ختم ہو گیا۔

اماں تایا اور بہنیں کمرے میں آ چکے تھے۔ حکیم صاحب بتا گئے تھے کہ وقار الحسن نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا اور کچھ نہیں ہے۔ میں انھیں پہلے ہی منع کر چکا تھا کہ وہ بچھو والی بات گھر کے دوسرے افراد کو نہ بتائیں ورنہ وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔

اماں کے چہرے کی گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ بہنیں بھی اب مطمئن تھیں۔ پتا نہیں کیا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے اماں سے چائے کی فرمائش کی۔ اماں خود چائے بنانے چلی گئیں۔ بہنیں اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔ میں تایا کے ساتھ برآمدے میں آ بیٹھا۔ ذکااللہ حکیم صاحب کے ساتھ

معجون لینے گیا تھا۔ مجھے پسینا اب بھی آ رہا تھا مگر اب وہ پہلے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ تایا' اماں کے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"وقار الحسن! مجھ سے نہیں چھپانا کہ کیا ہوا ہے۔ اور ــ وہ کوثر۔ کوثر نے تو تمہیں تکلیف نہیں دی ناں۔"

"نہیں تایا۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی' آج شکنتلا کو آنا تھا مگر وہ بھی نہیں آئی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں انشا اللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بیٹا مجھے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو ہم تو سب کے سب برباد ہی ہو جائیں گے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہو گا تایا۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"انشا اللہ' بس بیٹا یہ سوچ کر جانا کہ دو بوڑھے تمہارا انتظار کرنے کے لیے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہے ہوں گے خدا سے۔"

"آپ فکر نہ کریں تایا۔ بالکل فکر [illegible]" میں نے تسلی دی۔ اتنے میں اماں چائے لے کر آ گئیں۔ وہ مسلسل میرے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ چائے پی کر مجھ پر پھر غنودگی کا دورہ پڑنے لگا۔ اس بار سخت نیند محسوس ہوئی۔ میں اماں اور تایا سے سونے کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ابھی میں سویا بھی نہیں تھا کہ اماں ذکا اللہ کو لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ حکیم صاحب کی دوا کھلانے کے بعد انھوں نے ذکا اللہ کو یہیں لیٹ جانے اور میرا خیال رکھنے کو کہا اور چلی گئیں۔ مجھے سخت نیند آئی ہوئی تھی۔ اس لیے میں کروٹ لے کر سو گیا۔

○☆○

اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو میں بہت چاق و چوبند تھا۔ عجیب سرشاری کی سی کیفیت تھی۔ میں خود کو بہت بدلا بدلا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ میں ناشتا کر ہی رہا تھا کہ شرف الدین آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں آج جا رہا ہوں۔ وہ یہ سن کر اداس ہو گیا۔ میں نے اس سے گھر کا خیال رکھنے کو کہا۔ تائی کا علاج جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ اسے ہر طرح کا اختیار دے کر گویا حویلی کے تمام مکینوں کو اس کے سپرد کر دیا۔ وہ خاموشی سے میری ہدایت سنتا رہا پھر میرے چپ ہونے کے بعد بولا۔ "تم کب تک واپس آ جاؤ گے؟"

"میں جلد لوٹ آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے مختصراً کہا میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی ان نگاہوں سے الجھن سی ہونے لگی۔ "کیا دیکھ رہے ہو اس طرح؟"

"تم مجھے بہت بدلے بدلے لگ رہے ہو۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

اس کی اس بات نے مجھے بھی چونکا دیا۔ یہ بات میں نے صبح بستر سے اٹھتے ہی محسوس کی تھی۔ "کیا مطلب؟" پھر میں نے اس سے وضاحت چاہی۔

"پتا نہیں۔ میں وضاحت نہیں کر سکتا مگر ـــ مگر۔" وہ آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے بھی ہنس کر بات کاٹ دی۔

میں اسی دوپہر گھر والوں کو ہزاروں ہدایات دے کر نکل آیا۔ اماں اور بہنیں بہت بے چین تھیں۔ تایا کے چہرے پر بلا کا دکھ تھا۔ جہانی آپا اور شنو آپا تو رو رہی تھیں۔ اماں دل گرفتہ تھیں مگر انھوں نے آنسو نہیں بہائے۔ میں سب سے رخصت ہو کر شرف الدین کے ساتھ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹکٹ آسانی سے مل گئے۔ میں نے پورا ڈبا لینے کی کوشش کی تھی تاکہ سکون سے سفر کروں مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ میں جس ڈبے میں سوار ہوا تھا اس ڈبے میں دو برقعہ پوش خواتین سوار تھیں۔ ان کے ساتھ آٹھ برس کا بچہ بھی تھا اور کوئی ڈبے میں نہ تھا۔ میں چپ چاپ دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ریل نے وسل دی۔ شرف الدین مجھے سینے سے لگا کر بولا۔ "وقار الحسن! دیر نہیں کرنا جتنی جلدی ہو سکے لوٹ آنا۔"

میں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ جلد آنے کا وعدہ کیا اور وہ ڈبے سے اتر گیا۔ میں شام تک کا سفر پورا کرنے کے لیے تسبیح تلاش کرنے لگا۔ ایک چھوٹے سے چاندی کے بکس میں' میری تسبیح' میری فیروزے کی انگوٹھی' اور اسم اعظم والا ابا کا دیا ہوا تعویذ تھا۔ میں نے یہ چیزیں نہانے کے لیے جانے سے پہلے اس چاندی کے ڈبے میں ڈالی تھیں اور اماں کو تاکید کی تھی کہ اس ڈبے کو میرے اٹیچی کیس میں رکھ دیں۔ میرا خیال تھا کہ نہانے کے بعد میں تعویذ اور انگوٹھی پہن لوں گا اور تسبیح کو چاندی کے ڈبے میں پڑا رہنے دوں گا۔ شکنتلا کی پائل البتہ میں نے اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اس وقت وہ چاندی کا ڈبا ہی نہ ملا۔

ریل اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میں پریشان ہو ... انگوٹھی اور تعویذ بہت اہم تھا۔ اس کے بغیر میں خود کو ... محسوس کر رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ اچانک میرے بدن کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھیں ابل کر باہر کو آنے لگیں' ... جیسے چکرا کر رہ گیا اور ایک بے ساختہ قسم کی چیخ نے میرے پورے وجود میں ایک طوفان سا مچا دیا۔

میرے دونوں شانوں کے بیچ ایک تیز قسم کی چبھن تھی یوں جیسے کوئی میرے بدن میں خنجر کی نوک داخل کر رہا ہو۔ ایک مخصوص جگہ پر اس چبھن نے میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ تکلیف سے زیادہ خوف مجھے بے حال کر گیا تھا۔ میں خوب جان رہا تھا کہ میری گدی پر کیا ہے۔ بہت جلد میں نے بچھو کی بہت باریک باریک ٹانگوں کو اپنی گدی میں گھستے محسوس کیا۔ میری چیخوں نے میرے ڈبے میں موجود برقعہ پوش خواتین اور ایک بچے کو بری طرح سہما دیا۔ برقعہ پوش دونوں خواتین میری جانب لپکیں۔

"سنیں۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" ایک برقعہ پوش خاتون مجھ پر جھک آئی۔

مجھے اس کا چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھیں شدید اذیت کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔ میرے منہ میں کف بھر گیا تھا۔ میں بولنے سے قاصر تھا۔ میری زبان خشک ہو کر موٹی محسوس ہو رہی تھی کہ اسے ہلانا میرے بس میں نہ تھا۔ ایک عجیب و غریب قسم کی کیفیت تھی۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر بڑی مشکل سے انھیں بیٹھے رہنے کا' تسلی دینے کے سے انداز میں اشارہ کیا۔ دوسری خاتون بھی نقاب اٹھائے حیران اور پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے سات برس کے بچے کو خود سے لپٹایا ہوا تھا۔ میرے شانے جھک گئے تھے۔ میں نے ہاتھ سے گدی کو جھاڑنا چاہا لیکن یوں لگا جیسے میرے دونوں بازو بے جان ہو چکے ہیں۔ میں نے بہ مشکل اپنی قمیص اتار پایا۔ اس میں اس خاتون نے میری مدد کی مگر نہ تو قمیص میں کچھ تھا اور نہ ہی میری پشت پر۔ البتہ خون کی باریک لکیر سی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر رینگتی محسوس ہو رہی تھی۔

"شاید کسی کیڑے نے کاٹا ہے۔" ان خاتون نے میری پشت دیکھنے کے بعد میرے سامنے آتے ہوئے کہا۔ "خون بہہ رہا ہے۔"

ان خاتون کا جملہ ختم ہوتے ہی میرے اندر عجیب سا سکوت اور سکون چھا گیا۔ جیسا سکون ایڑی میں چبھا ہوا کانٹا نکل جانے پر محسوس ہوتا ہے۔ میں بڑی جلدی حیرت انگیز طور پر نارمل ہو گیا بلکہ ایک سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اپنی حالت پر نگاہ پڑتے ہی میں شرمندہ ہو گیا۔ میں ان دونوں خواتین کے سامنے عجیب حالت میں کھڑا تھا۔ میری قمیص اتری ہوئی نیچے پڑی تھی۔ میں پاجامے اور بنیان میں کھڑا تھا۔ کمربند لٹک رہا تھا۔ پیروں میں چپل بھی نہ تھے۔ میں اپنی حالت پر سخت شرمسار تھا۔ گھبرا کر اور جھپٹ کر میں نے قمیص اٹھا لی۔ جلدی سے پہنی اور معذرت خواہانہ انداز میں ان خواتین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہی میری حالت کا احساس کر چکی تھیں اور نگاہیں چرا رہی تھیں۔ میں لپک کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ آئینے میں اپنے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ میرے چہرے پر خباثت پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی اور ہونٹ نیلاہٹ لیے ہوئے تھے۔ یہ وہ چہرہ ہرگز نہیں تھا جو میں بچپن سے اب تک دیکھتا چلا آیا تھا۔ میرے چہرے پر خود میرے ہی لیے اجنبیت کا شدید احساس تھا۔ یوں جیسے میرا چہرہ نہ ہو کسی اور کا چہرہ ہو۔ یہ کیوں' کیسے اور کب ہوا میں نہیں جانتا۔ مجھے اپنے آپ سے کراہیت سی محسوس ہوئی۔ میری باچھوں میں سفید سفید جھاگ سا تھا۔ میں نے کلی کی' منہ دھویا۔ بال ٹھیک کیے پھر آئینے پر بھرپور نگاہ ڈالی تو خود کو کچھ بہتر محسوس کیا۔ ممکن ہے یہ میرا خیال ہو کیونکہ میں نے بچھو کو جب پہلی بار سادھو کی گدی پر سوار دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر غضب کی خباثت تھی۔

اپنا حلیہ ٹھیک کر کے میں واپس اپنے ڈبے میں آیا تو دونوں خواتین اب بھی نقاب اٹھائے بیٹھی تھیں۔ میں خجل سا اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی ایک خاتون نے مجھے چائے کا کپ پکڑا دیا۔

"تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی۔" انھی خاتون نے پوچھا۔ وہ چالیس بیالیس برس کی ایک پروقار سی خاتون تھیں۔ ان کے چہرے پر شفقت' آنکھوں میں نرمی اور لہجے میں اپنائیت تھی۔

"نہیں۔ شکریہ۔ شاید۔ کسی کیڑے نے ہی کاٹ لیا۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں۔ آداب کا خیال نہیں رکھ سکا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ویسے بڑا خطرناک کیڑا لگتا تھا۔ آپ کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ کیا اب تکلیف نہیں ہو

میرے لیے بے حد پرکشش ہو گئے تھے۔ میں خود میں ایک عجیب و غریب سا نشہ یا سرور محسوس کر رہا تھا۔ ریل کے ڈبے میں جس وقت میں برقع پوش لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا اس وقت میرے دل و دماغ میں نشے کی سی کیفیت بھر گئی تھی۔ اس کا ناک نقشہ' اس کے رخساروں پر پڑے گڑھے مجھے گدگدا گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی نگاہیں پھیری تھیں ورنہ کوئی مجھے بار بار اس کی جانب دیکھنے کو اکسا رہا تھا۔ اس کی موجودگی ہی میرے لیے سرور کا باعث بن رہی تھی۔ اس وقت میں نے خود پر قابو پالیا تھا۔

بہرحال چچا کے مشورہ دینے کے بعد میں نے بہت غور کیا۔ رونما ہونے والے واقعات کے علاوہ میں نے اپنی کیفیت پر بھی خاصا غور و خوص کیا اور یہی مناسب سمجھا کہ میں کوثر کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ایک بار سنہرے بابا سے ضرور مل لوں۔ وہ تمام دن میں نے مختلف باتوں کو سوچتے ہوئے گزار دیا۔ رات چچا اور چچی کے ساتھ باتیں ہوتی ہیں۔ چچی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے کوثر کی تلاش سے منع کیا مگر میں اپنی ضد کا پکا تھا اس لیے بھی ان کی فضول باتوں کو ٹال گیا۔ یوں تو میں اس معاملے میں خاصا پراعتماد تھا۔ مجھے یوں بھی اپنے خدا پر پورا بھروسا تھا پھر بھی انگوٹھی اور تعویذ کے بنا میں پریشان تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میں واپس امروہہ چلا جاؤں اور ان چیزوں کو لے کر ہی واپس آؤں مگر یہ خیال غالب آگیا کہ اگر خدا چاہے تو کوئی بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسی خیال نے دماغ میں جڑ پکڑ لی اور میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

فجر کے وقت ہی چچا نے مجھے جگا دیا۔ میں تمام رات بڑے سکون کی نیند سویا تھا۔ اٹھا تو بہت ہشاش بشاش تھا۔ نماز اور ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے چچا سے اجازت لی۔ چچا نے چند نصیحتیں کیں' مجھ سے اپنا خیال رکھنے کا وعدہ لیا اور مجھے رخصت کر دیا۔ میں گھر سے نکلتے ہوئے حیران سا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی چچا ہیں جنھوں نے آج سے کئی برس پہلے مجھے مروانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے تانگا لیا اور سبز گنبد والی مسجد کی طرف چل دیا۔ مسجد کے سامنے میں نے تانگا روکا اور پلٹ کر مسجد کی طرف دیکھا تو وہاں جن بابا کو دیکھ کر جلدی سے دونی تانگے والے کے ہاتھ پر رکھ کر ان کی طرف لپکا۔

"بابا۔۔!" میں نے قریب پہنچ کر انھیں مخاطب کیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کے بڑھے ہوئے بال ان کی پیشانی پر گرے ہوئے تھے' انھوں نے اب تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔

"کیوں آیا ہے تو اب یہاں؟" ان کا لہجہ غضب ناک تھا۔

"وہ بابا۔ سنہرے بابا سے۔۔"

"جا۔ چلا جا۔ ختم ہو گیا ان کا کام۔ تو آندھیوں کی زد پر ہے۔ تیز آندھیاں۔ جھکڑ چل رہے ہیں۔ چلا جا۔۔"

گو ان کے جملوں کا مفہوم میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا پھر بھی ان کا لہجہ مجھے بری طرح سہما گیا۔ یقیناً مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تھی مگر کیا کب اور کہاں؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہاں آکر سنہرے بابا سے ملے بغیر جانا میرے بس میں نہ تھا۔ میں ان سے ملنے کو بے چین تھا۔ جن بابا کچھ اور جھک گئے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اب بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر سنہرے بابا کے حجرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے دل پر ایک بوجھ سا آگیا تھا۔ میں جلد ہی بابا کے حجرے تک پہنچ گیا۔ حجرے کے کواڑ بھڑے ہوئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دستک دینا چاہی تھی کہ اندر سے سنہرے بابا کی شفیق آواز سنائی دی۔

"آجاؤ وقارالحسن!"

ان کی آواز کی شفقت نے میری پلکیں بھگو دیں۔ دل کا بوجھل پن ہوا بن کر اڑ گیا اور میں انھیں آداب کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ بابا میری ہی طرف متوجہ تھے۔

"میں جانتا تھا کہ تم آرہے ہو۔ غرور اور گھمنڈ آدمی کی صلاحیتیں ختم کر دیتا ہے وقارالحسن! جو قوتیں تمھیں عطا ہو گئی تھیں ان کا چرچا مناسب نہیں تھا۔ پھر جو کچھ تم کھو چکے ہو' اسے پانا آسان نہیں۔ ہم نے سادھو کے مقابلے پر تمھیں تیار کیا تھا۔ اس لیے کہ ایسے شعبدہ بازوں سے ٹکرانا ہمارا کام نہیں' ہمارے ذمے جو کام ہیں وہ بڑا وقت مانگتے ہیں۔ تم نے چرچا کر کے خود کو بہت کمزور کر لیا ہے۔"

"سنہرے بابا۔ آپ نے ہدایت نہیں کی تھی کہ مجھے چرچا نہیں کرنا۔ اور میں نے تو اماں اور تایا کے سوا۔۔۔"

"تم نے ان دو کے علاوہ اپنے دوست کو بھی بتا دیا۔ خیر۔ توبہ کرو۔ گھمنڈ وہ زہر ہے جو آدمی کے اندر کی تمام نیکیوں کو موت کی گھاٹ اتار دیتا ہے۔ تم جس کام کے لیے جا رہے ہو وہاں جانے کا حوصلہ پیدا کرو۔ کوثر لوٹ آئے گی وقارالحسن مگر تم۔ ان پرخار راستوں پر بھٹک جاؤ گے۔ وہ اپنا زہر تمھارے اندر اتار چکا ہے۔ صرف ایک چیز تمھیں

رہی؟" انھوں نے دوبارہ پوچھا۔ اس بار ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں تو۔" میں نے کہا اور غور کیا تو واقعی اب مجھے قطعی کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"حیرت ہے۔ کافی خون بہ گیا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے سوا گھونپ دیا ہو۔ میرے پاس ٹنکچر ہے۔ روئی وغیرہ بھی ہے اور اسپرٹ بھی۔ بچے کا ساتھ ہے ناں! ایسی چیزیں سفر میں اس کے ابا ہمیشہ یاد کر کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ آپ لیٹ جائیں میں زخم صاف کر کے ٹنکچر لگا دوں گی۔"

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ زخم گہرا ہے کیونکہ مجھے کسی قسم کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ "نہیں جی۔ بس شکریہ۔"

"تکلف نہ کرو۔ بعض مرتبہ فوری تکلیف نہیں ہوتی مگر پھر ناسور بن جاتا ہے۔" انھوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر دوسری برقعہ پوش خاتون کی طرف متوجہ ہو گئیں' وہ دوائیں نکالنے کا کہنے لگیں۔ اس بار میں نے اس دوسری خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد حسین اور نازک سی لڑکی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل سولہ سترہ برس کی ہو گی۔ دوسری خاتون سے مشابہت کی وجہ سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ انھی کی بیٹی ہے۔ وہ ماں کی بات سن کر لوہے کے ایک بکس کو کھولنے لگی جو سیٹ کے نیچے رکھا تھا۔

"یہ میری بیٹی ہے رقیہ' اور وہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا طلحہ۔ ہم دہلی جا رہے ہیں۔ ان بچوں کا ددھیال دہلی میں ہے۔"

"آپ امروہہ میں رہتی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ میں نے ان لوگوں کو ڈبے ہی میں دیکھا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آگے کہیں سے آرہے ہوں۔

"نہیں ہم جے پور میں رہتے ہیں۔" انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔

پھر انھوں نے میرا زخم صاف کیا۔ اس وقت بھی مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی مگر میں نے انھیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا۔ میں ان لوگوں کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس تمام واقعے نے ہم لوگوں کے درمیان تکلف کی دیوار گرا دی۔ وہ بچہ جو اب تک سہمی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا' اب مجھ سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ ان دونوں خواتین نے بھی پردے کا خیال نہ کیا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ وقت گزرتے دیر نہ لگی۔ میں اس سفر کے دوران میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ مراد آباد کے اسٹیشن پر اتر کر میں نے تانگا لیا اور چچا کے گھر کی طرف چل پڑا۔

دروازہ چچا نے کھولا اور مجھے سامنے دیکھ کر خوش ہوئے مگر جلد ہی ان کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ "خیریت تو ہے ناں؟"

"جی چچا' سب خیریت ہے۔ آپ لوگ کیسے ہیں؟"

"ہماری چھوڑو۔ بھائی صاحب اور بھابی دلھن تو خیریت سے ہیں ناں! اور بچیاں۔۔"

میں نے انھیں تسلی دی۔ سب کی خیریت بتائی اور ان سے امروہہ نہ آنے کی شکایت کی' اماں نے شگون پر ان دونوں کو بھی بلوایا تھا۔ یہ پیغام انھوں نے رشید چچا کی بہو کے بھائی سے بھجوایا تھا جو انھی دنوں دہلی آرہا تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور بتایا کہ چچی کی طبیعت خراب تھی۔

وہ میرے یوں اچانک چلے آنے پر خاصے پریشان تھے۔ ان کی کھوجتی ہوئی نگاہیں مسلسل میرے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ شاید انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ امروہہ میں سب خیریت ہے۔ چچی بھی مجھے دیکھ کر حیران ہوئیں مگر جلد ہی نارمل ہو گئیں۔ میں نے چچا کو بتایا کہ میں کوثر کی تلاش میں آیا ہوں۔ اگلے روز میں یہاں سے بالیکا مندر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ مجھے کوثر کا سراغ وہیں سے مل جائے گا۔ پچھلا سوموار گزر چکا تھا' شکنتلا مجھ سے پائل لینے بھی نہیں آئی تھی' وہ پائل بھی میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ سادھو نے شکنتلا کو نہیں آنے دیا ہو گا۔ مجھے وہ پائل بھی پہنچانا تھی۔

چچا میرا پروگرام سن کر کافی مضطرب ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے بڑی احتیاط کرنا چاہیے بلکہ انھوں نے مجھے مشورہ بھی دیا کہ میں اس کی تلاش میں نکلنے سے پہلے سنہرے بابا سے مل لوں' وہ یقیناً میری مدد کریں گے۔ خیال اچھا تھا۔ میں ان سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ انگوٹھی' تسبیح اور اسم اعظم کی غیر موجودگی میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں خود کو ان چیزوں کے بغیر کافی کمزور محسوس کر رہا تھا۔ پھر بچھو دوبار مجھے ڈنک مار چکا تھا جس سے بظاہر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا مگر میں خود میں جو ایک سب سے بڑی تبدیلی محسوس کر رہا تھا وہ میری طبیعت سے متعلق تھی۔ میری کیفیت بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تمام مناظر جو بہ ظاہر عام سے تھے اور تقریباً روز ہی میری نگاہ سے گزرتے تھے' وہ ایک دم ہی

بچا سکتی ہے اور وہ ہے تمھاری قوت ارادی۔ خود اعتمادی اور خدا پر مکمل انحصار' اس کی طاقت کا یقین اور دل میں پختہ ایمان تمھیں پرخار راستوں کے عذابوں سے بچا لے گا۔ میرے بچے! اپنی طاقتوں کا صحیح استعمال کرو گے تو جزا پاؤ گے ورنہ سزا تمھارا مقدر ہوگی۔"

"بابا۔ بابا میرے لیے دعا کیجئے۔ میری مدد کیجئے۔ میں خود کو بہت کمزور پاتا ہوں۔"

"مقدر کے لکھے کو مٹانا کسی کے بس میں نہیں ہے وقار الحسن! جو سختیاں تم نے خود اپنے نصیب میں لکھوالیں انھیں جھیلنا بھی تمھی کو ہے۔"

"مگر بابا مجھ سے غلطی کب اور کہاں ہوئی ہے؟" میرا دل ان کی باتیں سن کر بیٹھا جا رہا تھا۔

"تم نے ان قوتوں کا پرچار کیا' یہ تمھاری پہلی غلطی تھی۔ تم نے حصار باندھتے ہوئے آنکھیں کھول دی تھیں جس کی وجہ سے وہ بچھو تمھارے اندر اپنا زہر پھیلا گیا' یہ تمھاری دوسری غلطی تھی۔ تیسری غلطی تم نے جتے ہوئے کی کہ فیروزے کی انگوٹھی اور خاص طور پر اسم اعظم کے تعویذ کے سلسلے میں بے پروائی کی۔" سنہرے بابا کے لہجے میں اب کچھ ناگواری شامل ہو گئی تھی۔

"بابا وہ چیزیں میں بھول گیا بلکہ اماں ہی رکھنا بھول گئیں۔"

"نہیں۔ کسی کو دوش نہ دو۔ ان چیزوں کو خود سے جدا کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"میں۔ میں واپس چلا جاتا ہوں بابا۔ ان چیزوں کو لے کر ہی آؤں گا۔" میں نے گھگھیا کر کہا۔

"ان چیزوں کو پانا اب تمھارے لیے جوئے شیر لانا ہے۔ وہ۔ وہ چیزیں کوثر حاصل کر چکی ہے۔"

ان کا جملہ سماعت سے ٹکرایا تو یوں لگا جیسے میرے دماغ میں بم پھٹا ہو۔

"کک۔ کیسے بابا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہو چکا ہے وقار الحسن اور وہ۔ وہ نادان ہے۔ بہت نادان ہے۔ اس نے ان چیزوں کو ناگپا جادوگر کے پیش بند کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے تمھیں بڑی مشکلوں سے گزرنا ہوگا۔ ناگپا جادوگر کی تمام خباثت اس کے پیش بند میں موجود ہے' انسانی ہڈیوں اور انسانی کھوپڑیوں سے بنا یہ پیش بند حاصل کر کے نیست و نابود کیے بغیر اب تم اسم اعظم حاصل نہیں کر سکتے۔"

ان کی آواز میں دکھ تھا۔ تاسف تھا۔ میں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ جن باتوں کو میں اہمیت نہیں دے رہا تھا اب وہی باتیں مضبوط چٹانوں کی طرح میری راہ میں حائل ہو گئی تھیں۔

"دیکھو وقار الحسن! ایک بات یاد رکھو۔ تمھیں آگے ہی آگے جانا ہے۔ وہاں تک جہاں تمھاری منزل ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اب تمھاری منزل شگفتہ کا سکون نہیں' ان ہزاروں معصوم لڑکیوں کی عصمت کی حفاظت ہے جو سادھو کے ہاتھوں بے بس ہو کر لٹ رہی ہیں۔ تین لڑکیاں ابھی اس کی قید میں ہیں۔ وہ شگفتہ کو قید کرنے کے باوجود انھیں برباد کرنے سے قاصر ہے' اس کی وجہ ایک تو اس کی پائل حاصل نہ کرنے سے متعلق ہے اور دوسری اور اہم وجہ ناگپا جادوگر کا پیش بند ہے' وہ ابھی تک نہیں جان سکا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ اسے کوثر حاصل کر چکی ہے۔ کوثر میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں مگر کیونکہ وہ عورت ہے اس لیے بنیادی طور پر وہ کم عقل ہے' وہ اپنی صلاحیتوں اور وجدان کی شدت سے قطعی بے بہرہ ہے۔ سادھو اس پیش بند کے بارے میں جاننے کے لیے تپسیا کر رہا ہے۔ جلد یا بہ دیر اسے علم ہو جائے گا اور تب کوثر اس کی خباثتوں کے سامنے تنہا ہوگی۔ تمھیں جلد از جلد اس کی مدد کو پہنچنا ہے وقار الحسن! تمھاری کمزوری کوثر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے طاقت میں بدل سکتی ہے۔ تم دونوں مل کر اس کا مقابلہ کر سکتے ہو مگر چند باتوں کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو۔"

بابا سانس لینے کو رکے تو میں نے پاس رکھی صراحی سے پانی کا کٹورا بھر لیا۔ انھوں نے کٹورے میں سے چند گھونٹ لیے پھر باقی پانی پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور کہا۔ "اس پانی کے چند گھونٹ پی لو اور باقی پانی کو اپنے بدن اور کپڑوں پر مل لو۔"

میں نے ان کی ہدایت پر فوراً ہی عمل کر ڈالا۔ چند لمحوں بعد وہ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر بولے۔

"تم جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جاؤ' لباس نہ بدلنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ ناگپا جادوگر کے پیش بند کے علاوہ انگوٹھی اور اسم اعظم بھی سادھو تک نہیں پہنچنے چاہئیں۔ وہ ان دونوں چیزوں کو جلا ڈالے گا اور ناگپا جادوگر کے پیش بند کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرے گا۔ تمھیں اس کی ہر چال کو مات دینا ہے

وقار الحسن۔ اب میں اس سے زیادہ تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو۔ تو تمھیں عذابوں کے ایک طویل اور گہرے سمندر سے گزرنا پڑے گا۔"

اتنا کہنے کے بعد انھوں نے اپنے دائیں جانب رکھی ایک صندوقچی سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "اگر تم انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو اس پڑیا میں موجود سفوف کو اپنے سر کے اس انگوٹھی پر اچھی طرح رگڑ لینا۔ باقی بچے ہوئے سفوف کو بالوں کی جڑوں میں لگا کر اچھی طرح ملنے کی کوشش کرنا' مگر انگوٹھی پر ملنے سے پہلے بالوں پر ہرگز نہ لگانا۔ اب تم جاؤ۔"

بابا نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میرے پاس اٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ گو اپنے دل میں' میں وہ حوصلہ اور ولولہ نہیں پاتا تھا جو حویلی سے نکلتے ہوئے محسوس کر رہا تھا مگر پھر بھی مجھے بہرحال جانا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سنہرے بابا نہ صرف یہ کہ مجھے مل گئے تھے بلکہ انھوں نے جو باتیں مجھے بتائی تھیں وہ میری ہمت بندھانے کو کافی تھیں۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کوثر مجھے کہاں ملے گی مگر شاید اس سوال کو زبان پر لانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ بابا نے جاتے جاتے مجھے پکار لیا۔

"وقار الحسن! تمھارے اندر وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو تم یہاں سے حاصل کر کے گئے تھے۔ اپنے ذہن پر قابو پانے اور خود میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تم سب کچھ جان لو گے۔ بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر چلنا اچھی بات نہیں۔ تم مرد ہو۔ مردوں کی طرح آگے بڑھو۔"

نہ معلوم ان کے ان جملوں میں ایسا کون سا جادو تھا کہ میں ایک دم ہی پر اعتماد ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے کچھ عمل کرنا بتائے۔ کچھ آیتیں یاد کرائیں اور چند ایسے الفاظ بتائے جن کی ترتیب بدلنے سے مجھے کافی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل کر مسجد کی جانب چل پڑا۔ میں فقیر کے بھیس میں بیٹھے جن بابا سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ خیال مجھے حجرے سے نکل کر ہی آیا تھا۔ وہ اب بھی مسجد کی میڑھیوں کے پاس اسی کونے میں' بالکل اسی انداز میں بیٹھے تھے جیسا میں انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔

"بابا!" میں دھیرے سے ان کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"۔ جا۔ چلا جا یہاں سے۔" وہ شاید مجھ سے بہت ناراض تھے۔

"بابا میری خطا بتا دیں۔" میں نے پھر کہا۔

انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ان کی سرخ سرخ آنکھوں میں بلا کا غیض و غضب تھا۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور چہرے کی کھال یوں لرز رہی تھی جیسے ان کے اندر طوفان سا مچا ہوا ہو۔

"جا۔ کہتا ہوں ناں کہ چلا جا۔ خوش نصیب ہے تو کہ سنہرے بابا سے مل لیا۔ جا ان کی مہربانیوں کا شکر ادا کر۔ خدا سے معافی مانگ۔ تو گناہوں کی دلدل میں دھنسنے جا رہا ہے۔ جا چلا جا ورنہ۔"

ان کے انداز میں اتنی دہشت تھی کہ میں سرتاپا لرز اٹھا پھر مجھ سے وہاں لمحہ بھر کو بھی ٹھہرا نہ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور زبان سے کچھ نکالے بغیر پلٹ کر سڑک کی طرف چل دیا۔ میری ٹانگیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ چلنا دوبھر ہو رہا تھا مگر میں رکا نہیں' چلتا ہی چلا گیا۔ بازار والی سڑک پر پہنچتے ہی میں نے تانگا روکا اور تانگے والے کو گھر کا پتا بتا کر خود جن بابا کی باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کے ایک جملے نے مجھے الجھا دیا تھا' انھوں نے کہا تھا کہ تو گناہوں کی دلدل میں دھنسنے جا رہا ہے۔ سنہرے بابا نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا' البتہ احتیاط کی تلقین ضرور کی تھی۔ میں بابا کی ہدایت کو ایک بار پھر ذہن نشین کرنے لگا۔ ان کی دی ہوئی پڑیا میرے کرتے کی جیب میں تھی۔ میں نے اسے چھوا اور اس کی موجودگی محسوس کر کے مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد تانگے والے نے تایا کے گھر کے دروازے پر تانگا روک دیا۔ دن کے شاید دس ساڑھے دس بجے تھے۔ چچا اور چچی دونوں میرے منتظر تھے۔ میرے بیٹھتے ہی انھوں نے مجھ سے سنہرے بابا کے بارے میں پوچھا۔ میں نے تفصیل سے بتا دیا کہ کیا ہوا۔ جن بابا کی کہی ہوئی بات کو میں گول کر گیا۔

"وقار الحسن! تمھارا اکیلا جانا مناسب نہیں ہے۔ مجھے تو بھائی دلھن اور بھائی صاحب پر حیرت ہو رہی ہے کہ انھوں نے تمھیں اکیلا کیسے بھیج دیا۔ میں۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

"اور میں کیا یہاں بھاڑ جھونکوں گی؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی چچی نے تنتنا کر جواب دیا۔

"تم چپ رہو۔" چچا نے انھیں جھڑک دیا۔ "ہر بات

میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض مت سمجھا کرو۔"

"تو پورے خاندان کو جنوں بھوتوں اور روحوں سے اتنا لگاؤ تھا تو شادیاں کیوں کرلیں۔ ساری عمر جنگلوں میں گزارتے پھرتے' لانے والیوں کو کیوں عذاب میں ڈال رکھا ہے۔" انھوں نے فوراً محاذ کھول لیا۔

"اے۔ اے دیکھو۔ منہ بند رکھو۔ زبان کو لگام دے لو ورنہ۔" چچا پھول کر کھڑے ہو گئے۔

"چچا۔" میں نے لپک کر ان کا بازو پکڑ لیا۔

"ارے ہاں۔ نہیں تو۔ سر پر ہی چڑھ گئی ہیں۔ ساری باتیں ان کی مانتے جاؤ مگر چین نہیں آتا۔ اب کیا گلا گھونٹ کر خود کو ان کی بھینٹ چڑھا دوں۔" وہ بھی سخت غصے میں تھے۔

"میاں چین آگیا تمھیں؟" وہ ایک دم میری طرف پلٹ گئیں۔ "جانتی ہوں سب کچھ' کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ تمھیں جس مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے۔ وہ پورا ہونے کو ہے۔ لے جاؤ اپنے چچے کو بھی۔ کردو میرا گھر برباد۔ ان دونوں کے جگر میں تو ٹھنڈک پڑ جائے گی۔"

ان کا اشارہ غالباً تایا اور اماں کی طرف تھا۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اتنی جاہل عورت اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

"چچی! ان لوگوں کے خلاف کچھ نہ کہیے گا۔ نہ کسی نے کسی مقصد کے لیے مجھے یہاں بھیجا ہے اور نہ کسی کو آپ کا گھر برباد کر کے خوشی ہو گی۔ اپنا گھر آپ خود ہی برباد کریں گی۔ میں چچا کو کہیں نہیں لے جا رہا۔ یہ ان کی محبت ہے کہ میرے لیے پریشان ہو کر ایسا کہہ رہے ہیں مگر۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ سمجھیں آپ!"

غصے سے میری بری حالت تھی۔ چچا بھی میری صورت دیکھ کر سہم گئے اور خود چچی کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اتنا کہہ کر میں نے وہیں قریب رکھا اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور چچا سے بولا۔ "مجھے اجازت دیجیے چچا۔"

"ارے۔ ارے وقار۔ تم اس جاہل عورت کی باتوں کا برا نہ مانو۔ میں ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔ بیٹھو تم۔ کھانا کھاؤ' ضرورت کی چیزیں لے لو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جا رہے ہو' کیا ارادہ ہے' پھر جاؤ۔ یوں نہیں جانے دوں گا میں۔"

چچا بہت بھرے ہوئے تھے۔ چچی اپنی جہالت کے سبب بات کو مزید بگاڑ سکتی تھیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ بات مزید بگڑے اس لیے چچا کو لے کر نیچے آگیا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ان کا جانا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ہے۔ میں دو ایک دن ہی میں انھیں اپنی خیریت کی اطلاع دوں گا۔ ممکن ہے کہ میں جلد ہی واپس آجاؤں۔ بہرحال میں نے کسی نہ کسی طرح انھیں ٹھنڈا کر دیا۔ کچھ دیر بعد چچی بھی نیچے چلی آئیں۔

اب مجھے یہاں سے نکلنے کی تیاری کرنا تھی۔ میں نے اپنا اٹیچی کیس دیکھا۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو میں اپنے ساتھ لے کر جاتا۔ لباس بدلنے کو سنہرے بابا نے منع کر دیا تھا۔ تسبیح' انگوٹھی اور اسم اعظم تھا ہی نہیں۔ ایک کاغذ کی پڑیا تھی جو سنہرے بابا نے دی تھی سو وہ اور شکنتلا کی پائل میری جیب میں تھی۔ میں نے چچا سے ایک تسبیح مانگ لی۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ اٹیچی کیس چچا کے حوالے کر کے میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ جتنی دیر لیٹا رہا کوثر کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ گمان تھا بلکہ یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ وہ مجھے بالیکا مندر کے پیچھے بنے کھنڈر میں مل جائے گی حالانکہ اس سے قبل میں نے اسے کسی گھنے جنگل میں دیکھا تھا پھر کھنڈر تو سادھو کا مسکن تھا۔ وہاں اس کی موجودگی ممکن نہ تھی مگر کوئی مجھے اندر سے اکسا رہا تھا کہ مجھے اسی طرف جانا چاہیے۔ کھنڈر کے پیچھے کیا تھا' یہ میں نہیں جانتا تھا بہرحال مجھے اپنے سفر کا کہیں نہ کہیں سے تو آغاز کرنا ہی تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد میں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ چچا اس دوران میں میرے قریب ہی رہے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر چونک اٹھے۔ "ہاں۔!"

"میں اب چلوں گا چچا۔ ممکن ہو سکا تو جلد آنے کی کوشش کروں گا اور۔ اگر نہ آسکا تو۔ تو چچا آپ امروہہ جا کر اماں اور تایا کو۔ میرا مطلب ہے کہ آپ ان لوگوں کا خیال رکھیے گا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم۔؟" وہ ایک دم بپھر گئے۔ "میں کہتا ہوں لعنت بھیجو اس آوارہ لڑکی پہ۔ تم کیوں اپنی اور ہم سب کی زندگی برباد کرنے پر تلے ہو۔ اب تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ بھائی نے اسے اتنا سر چڑھایا کیوں تھا۔ بڑا عالم فاضل بنانا چاہتے تھے نا اپنی بیٹی کو۔ دنیا بھر کی جو کتاب اس نے مانگی' یہ دیکھے بغیر کہ کیسی کتاب ہے' اسے لا تھمائی۔ اب بھگت رہے ہیں۔ تم آخر کیوں نہیں سمجھتے کہ۔۔۔"

"چچا۔ بس کریں۔ اپنے خاندان کی عزت پر جان دینا کوئی اتنا بڑا کام نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ کیا وہ سادھو کے بہکاوے میں کیا۔ وہ اتنی بے وقوف تو نہیں تھی کہ یوں گھر چھوڑ کر چلی جاتی۔ میں اگر اپنے خاندان کی خاطر جان دے دوں گا تو کیا ہو گا۔ آپ سے صرف اتنی گزارش کر رہا ہوں کہ باقی سب کو حوصلہ دیجیے گا۔"

میرا جملہ سن کر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ پہلے تو چند لمحے مجھے دیکھتے رہے پھر ایک دم مجھ سے لپٹ گئے۔ آنسو میری آنکھوں میں بھی آگئے تھے۔ میں اماں اور تایا کے سامنے تو آنسو نہیں بہا سکا تھا' چچا پر بھی اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ان کے رویے نے مجھے رلا دیا لیکن میں نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ ان سے رخصت ہوتے ہوتے دن کے دو بج گئے۔ میں نے وہاں سے تانگا لے لیا۔ یہ سوموار کا دن تھا اور اس روز بالیکا مندر میں بہت رش ہوا کرتا تھا۔ یہ بات مجھے یاد نہیں تھی بلکہ تانگے والے نے مجھے یاد دلایا تھا۔ وہ مجھے تنہا بالیکا مندر جاتے دیکھ کر حیران تھا۔ میرے منہ سے بالیکا مندر کا نام سن کر وہ میرے بیٹھنے کے باوجود کھڑا رہا تو میں نے کہا۔ "چلو بابا۔"

"ہیں۔؟ چلیں؟ کوئی کھاتون نہیں جائیں گی وہاں؟"

"نہیں بابا۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔"

یہ سن کر اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ "ہوا! زندگی میں پہلی بار اکیلے مرد کو جاتے دیکھ رہا ہوں۔ وہاں تو زنانیاں جا رہی ہیں بھیا۔ تم کیا مراد آباد کے ناہیں ہو؟"

"ہم مراد آباد کے ہی ہیں بابا! اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہاں زنانیاں جاتی ہیں' ہمیں بالیکا مندر میں کوئی کام نہیں ہے۔ ہم تو۔" میں کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔"

"اچھا اچھا۔ سمجھ گئے' سمجھ گئے۔" پھر رازدارانہ انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "کھرے کنوارے ہو؟"

اس کی بات کا مطلب سمجھ کر میں جھینپ گیا۔ "نہیں بابا۔ ہم وہاں کسی کو لینے جا رہے ہیں۔ زنانیاں گئی ہوئی ہیں۔ انھیں واپس لانا ہے۔" میں نے بوکھلا کر جھوٹ بولا۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ فوراً ہی ختم ہو گئی۔

"اچھا۔ گویا وہاں ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔ واپس یہاں تک آنا ہو گا ناں!"

"نہیں۔ ہمیں چھوڑ دینا۔ پتا نہیں کتنی دیر لگے۔ واپسی پر ہم دوسرا تانگا کر لیں گے۔" میں اس کی باتوں سے تنگ آگیا تھا۔ اب تک اس نے تانگا ہلایا بھی نہیں تھا۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ "چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔"

تب اس نے چابک تھمایا اور گھوڑا مریل سی چال چلتا ہوا گلی کو عبور کر گیا۔ تیز دھوپ تھی حالانکہ موسم سردیوں کا تھا مگر تیز دھوپ کی وجہ سے خنکی کم تھی۔ میں نے چلتے چلتے ایک موٹا کمیس اور دوہری واسکوٹ رکھ لی تھی۔ بالیکا مندر پہنچتے پہنچتے بادل گھر آئے۔ تانگے والے نے بالیکا مندر کے سامنے تانگا روک دیا۔ ہم یہاں تک گھنٹا بھر میں پہنچے تھے۔ میں کرایہ ادا کر کے بالیکا مندر کے قریب پہنچ گیا۔ دور ہی سے مجھے عورتوں کا ہجوم نظر آگیا تھا۔ بادل گھر آنے کی وجہ سے یہ منظر بہت خوب صورت لگنے لگا تھا۔ جوگیا رنگ کی ساریوں میں ملبوس لڑکیاں گیندے کے پھول لگائے۔ پائلیں چھنکاتی ہوئی' ہاتھوں میں تھالیاں لیے بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک دو ننگ دھڑنگ ناگا صرف ایک چھوٹا سا جوگیا رنگ کا کپڑا بدن پر لپیٹے میرے سامنے آگئے۔

"او مورکھ۔ کدھر جاتا ہے؟"

"وہ میں۔" میں بوکھلا گیا۔ "میں کسی کی تلاش میں۔"

"وہاں بیٹھ جا۔" ایک نے دور بنی منڈیر کی طرف اشارہ کیا۔ "رات سے پہلے تو اس طرف نہیں جا پائے گا۔ وہاں پوجا پاٹ کے بعد ہی جا سکتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں واپس پلٹ گیا۔ بالیکا مندر سے تقریباً پچاس قدم دور ایک منڈیر بنی تھی جہاں دوسرے کچھ مرد بھی اپنی عورتوں کے منتظر تھے۔ میں بھی وہیں جا بیٹھا اور مندر میں جاتی اور مندر سے باہر آتی لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ میرے قریب ہی کچھ چھچھورے لڑکے بھی بیٹھے تھے جو باقاعدہ چٹخارے لے لے کر وہاں موجود لڑکیوں کے ناک نقشے سے لے کر ان کے شباب تک پر تبصرے کر رہے تھے۔ اب مجھے اتنی جلدی یہاں آنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ بات میں بھول ہی گیا تھا آج پوجا کا دن ہے اور رات گئے تک لڑکیاں یہاں پوجا کرتی ہیں۔ اب پتا نہیں مجھے کب تک انتظار کرنا تھا۔ بہرحال واپس جانا اور رات کو دوبارہ آنا بیکار ہی تھا۔ میں وہیں انتظار کا ارادہ کر کے بیٹھ گیا۔ یہاں خود کو مصروف رکھنے کے کئی بہانے موجود تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں حسن کی بہتات تھی۔ ایک

تو یہ کہ میں عمر کے اس حصے میں تھا جہاں رنگ آنکھوں سے ہو کر دل میں اترتے ہیں۔ گو میں اس سے قبل بھی یہاں آیا تھا‘ یہاں کے علاوہ بھی حسن کئی رنگ میں اور کئی روپ میں میرے سامنے آیا تھا مگر جو کیفیت اور اپنے اندر جو مدوجزر میں اس وقت پا رہا تھا وہ میرے لیے حیرت انگیز مگر سرور انگیز تھے۔ اب سے پہلے میں نے اپنی آنکھوں میں جو احترام اور شرم وحیا محسوس کی تھی وہ اس وقت قطعی نہیں تھی۔ ہر ہر لڑکی کا رنگ روپ‘ اس کے اٹھتے قدموں سے پیدا ہونے والی لچک‘ بدن میں اٹھتی ہلکی ہلکی لہریں‘ آنکھوں میں جگمگاتی روشنیاں اور بل کھاتی چوٹیوں سے پیدا ہونے والی مستی میں اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا۔ ایک میٹھی میٹھی سی کیفیت نے میرے وجود میں عجیب طرح کا نشہ بھر دیا تھا۔ میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ چکی تھیں۔ بدن میں اضطراب سا دوڑ رہا تھا اور ساری دنیا کو تلپٹ کر دینے کا خوفناک خیال مجھے جھنجھنائے دے رہا تھا۔ میں نے اپنی پسیجی ہوئی ہتھیلیاں منڈیر پر ٹکا دیں۔ جبڑے بھینچ لیے اور نگاہوں کا رخ بدلنے کی کوشش میں ذرا سا مڑ کر بیٹھ گیا تبھی مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ میرے سامنے کا سین ویسا ہی رہا۔ ہاں۔ وہ میرے سامنے تھی۔ وہ حسین وجمیل لڑکی جسے میں تمام عمر نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے پہلی بار اپنے تصور میں سادھو کے ساتھ دیکھا تھا۔ تب اس کے مرمریں بدن پر سفید ریشمی کپڑا پڑا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور وہ نیم وا آنکھیں لیے سادھو کے بدہیئت وجود کے قریب بکھری سی پڑی تھی۔ آج اسے جوگیا رنگ کی ساری لپیٹے‘ بالوں کی لمبی چوٹی پر گیندے کے پھولوں کو سجائے۔ مہندی لگے پیروں میں پائل چھنکاتے اپنے سامنے پا کر میں مبہوت رہ گیا تھا۔ اس کا قیامت خیز حسن اس وقت بھی میرے دل کی دنیا کو تہس نہس کیے دے رہا تھا۔ مگر اس وقت میرے اندر کی تمام جمالیاتی حسیں کافور ہو چکی تھیں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اگر یہ وہی لڑکی ہے تو یہاں کیوں اور کیسے دیکھی جا رہی ہے۔ سادھو کی قید سے رہا ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پھر اس کا وجود میرے لیے بڑا غنیمت تھا۔ میں اس سے بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے‘ دائیں کولھے پر کچی مٹی کا گھڑا لیے‘ ماتھے پر کالا تلک سجائے پائل چھنکاتی ہولے ہولے قدم اٹھاتی مندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

مجھے اپنے بالکل قریب پا کر اس نے پلکیں اٹھائیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آسمان پر یکایک کئی سورج ایک ساتھ طلوع ہو گئے ہوں۔ پھر وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کے عنابی ہونٹ میرے دماغ میں ہلچل سی مچا گئے۔ اس کی قربت کا احساس‘ اس کی آنکھوں میں پہچان کی کرنیں‘ بدن میں تپش کا شدید احساس بن کر مجھے دہکا گئیں۔ مجھے شدت سے اپنی طبیعت کی کمینگی کا احساس ہوا۔ میں نے نگاہیں چرانا چاہیں‘ ذہن سے اس بدمعاش کیفیت کو جھٹکنا چاہا اور چہرہ ذرا جھکا کر بولا۔ ”آپ۔۔۔ آپ وہی ہیں ناں!“

”کون جی!“ یوں لگا جیسے مندر کی تمام گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔

”وہ۔۔۔ وہ سادھو۔۔۔“ میں نے گھبرا کر نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی ہرنی سی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔

”کیا آپ نے مجھے۔۔۔ کبھی‘ کہیں دیکھا ہے؟“ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا۔ یہ خیال مجھے ایک دم ہی آیا تھا کہ کہیں میں دھوکا تو نہیں کھا گیا۔ تصور تو بہرحال تصور ہوتا ہے‘ اور اس تصور کو بھی بڑے دن گزر چکے تھے۔ اس لڑکی میں اس لڑکی کی مشابہت بھی تو ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس حسن نے مجھے مسحور کر دیا ہو اور میرے ذہن نے اس کے قریب آنے کا بہانہ تراشا ہو۔

”آپ سوامی جوگندر ناتھ کی بات کر رہے ہیں؟“ اس کے سوال نے مجھے گویا اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔

”سوامی جوگندر ناتھ؟“ میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ ”کون جوگندر ناتھ؟ وہ۔۔۔ وہ زندہ کیسے ہو سکتے ہیں؟“

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی۔ جیسے میرے چاروں اطراف گھنگرو سے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ”سوامی جی زندہ ہیں اور۔۔۔ لیکن آپ کون ہیں؟ آپ کو میں نے کبھی دیکھا تو نہیں۔“

وہ یقیناً جھوٹ بول رہی تھی۔ اتنے قریب آ کر میں نے اسے سو فیصد پہچان لیا تھا۔ یہی آنکھیں تھیں‘ آج ان میں چراغ جل رہے تھے مگر اس روز ان آنکھوں میں دور تک زرد تپتی ہوئی ریت سی بچھی محسوس ہو رہی تھی۔ بلا کا کرب تھا۔ اس خبیث کے چنگل سے بچا لینے کی التجا تھی۔ مگر وہ صاف مکر گئی تھی حالانکہ میں نے اس کی آنکھوں میں

پہچان کی کرنیں جگمگا کر پھر بجھتی دیکھ لی تھیں۔

”ہم کون سے جوگندر ناتھ سوامی کی بات کر رہی ہو؟“

”جے پور والے سوامی جی کی۔ وہ نیپال جا چکے ہیں مگر جلد ہی لوٹ آئیں گے۔“

میرا خیال تھا کہ وہ جس جوگندر ناتھ کی بات کر رہی ہے وہ کوئی اور ہوگا مگر جے پور کا نام سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ بات مجھے ابا اور اماں دونوں نے بتائی تھی کہ جوگندر ناتھ سوامی جی امروہہ چھوڑ کر جے پور چلے گئے تھے اسی لیے کہ ان کے خاندان کے بہت سے لوگ جے پور میں بستے تھے۔ اماں نے مجھے کہا تھا کہ میں اگر جے پور جا کر ان کا پتا کروں تو وہ یقیناً کچھ نہ کچھ جان لوں گا۔ یہ سن کر میرے دماغ میں بھرا تمام نشہ ہوا ہو گیا۔ میں متضاد کیفیات سے دوچار تھا۔ ایک طرف تو میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ سادھو کے چنگل سے کیسے نکلی اور دوسری طرف یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ جس سوامی جی کا ذکر کر رہی تھی وہ شکنتلا کے باپ تھے یا کوئی اور۔

شکنتلا کے باپ کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ زندہ ہوں گے مگر ایک بات جانے کیسے ذہن میں جڑ پکڑ چکی تھی کہ یہ لوگ سالوں زندہ رہ سکتے ہیں۔ میں نے کئی ایسی جوگیوں کو دیکھا تھا جن کی بھنویں تک سفید تھیں‘ بدن میں گوشت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ سو برس سے اوپر کی عمر کے تھے اور نہ صرف یہ کہ زندہ تھے بلکہ پوری طرح چاق وچوبند بھی تھے مگر پھر یہ بات بھی دماغ میں کھٹک رہی تھی کہ وہ مجھ سے یہ بات کیوں چھپا رہی ہے کہ وہ اس روز سادھو کے پاس تھی۔

میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میں اس روز پورے کمرے کی ہر چیز کو بہت صاف اور واضح دیکھ رہا تھا۔ میں نے تو دوسری جانب والی لڑکی کے دائیں کاندھے پر بڑا سا تل بھی دیکھا تھا۔ انسانی کھوپڑی سے بنے ہوئے پیالے کی ساخت اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ تھی پھر اس لڑکی کا مکرنا۔ مجھے دھوکا دینا مگر نگاہوں میں تمسخر اور پہچان۔ یہ سب کیا تھا؟ میں یہ تمام باتیں سوچتا رہا اور وہ دھیرے سے میرے سامنے سے ہٹ کر دائیں جانب سے ہوتی ہوئی مندر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے آگے بڑھ جانے سے میں چونک اٹھا۔ میں نے پلٹ کر جاتی ہوئی لڑکی کو دیکھا تبھی میری نگاہ اس کی پشت پر پڑی۔ اس کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ اس کی لمبی چوٹی کاندھے پر سے ہوتی ہوئی آگے پڑی تھی۔ ساری کا پلو کندھے سے سرک چکا تھا اور اس کے دونوں شانوں کے بیچوں بیچ گہرے نیلے‘ بلکہ سیاہی مائل رنگ سے گدا ہوا بچھو صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے‘ پسینا ایک دم ہی بدن سے پھوٹ پڑا۔ ابھی میں اس کی گدی سے کچھ نیچے گدے ہوئے بچھو کو نظر بھر کر دیکھ نہ پایا تھا کہ اس نے ایک ادا سے آگے پڑی چوٹی کو پیچھے کر لیا اور وہ نشان۔۔۔ وہ خوفناک نشان میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

○

وہ اب مندر کے دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہاں قریب ہی دو تین تانگے آ کر رکے تھے۔ حسن بے بہا کا ہجوم تھا جو تانگوں سے اترتا چلا آ رہا تھا۔ میں لپک کر اس کی جانب بڑھا مگر تانگوں سے اترنے والی لڑکیوں کے ہجوم میں گھر کر رہ گیا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ سب لڑکیاں ایک سے لباس اور حلیے میں تھیں۔ پائلوں کی جھنکار نے پوری فضا کا سکوت نگل لیا تھا۔ دبی دبی ہنسی اور جھنکار آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرتا رہا مگر ناکام ہو گیا۔ تمام لڑکیاں ایک ایک کر کے مندر کے دروازے میں داخل ہو کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئیں۔

ہوش اس وقت آیا جب مندر کا آبنوسی دروازہ تیز چرچراہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ فضا ایک دم ساکت ہو گئی پھر اس ساکت فضا کو تانگے والوں کی تخ تخ اور گھوڑوں کی ٹاپوں نے مجروح کر دیا۔ تمام تانگے واپس جا رہے تھے۔ میں وہاں تنہا کھڑا ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تمام تانگے دور ہی منڈیر کے باہر جا کر کھڑے ہو گئے۔ منڈیر پر بیٹھے لوگ سڑک پار کر کے اس چھوٹے سے کیبن کی طرف بڑھ گئے جو شاید نیا کھلا تھا۔ یہ ہوٹل غالباً صرف چائے اور بسکٹ وغیرہ کے لیے تھا۔ سامنے ہی مٹی کے چولھوں پر بڑی بڑی کیتلیاں چڑھی تھیں جن میں سے اٹھتی بھاپ چائے کی خوشبو سے معطر تھی۔

مندر کی سیاہ عمارت پر پڑنے والی دھوپ دھیمی ہو گئی تھی۔ آسمان پر جگہ جگہ بادل تیر رہے تھے۔ شام کا ملگجاپن دھوپ کی تیزی کو نگل چکا تھا۔ میں کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح منڈیر پر جا بیٹھا۔ ہوا میں خنکی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے تو یوں بھی رات کا انتظار کرنا تھا مگر اس لڑکی کو دیکھ لینے کے بعد میرے اضطراب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

تھا۔ اب مجھے رات کے علاوہ اس لڑکی کا بھی انتظار تھا۔ سرور انگیزی کی تمام تر کیفیت ختم ہو چکی تھی بلکہ اب مجھے کافی شرم بھی محسوس ہو رہی تھی' ممکن ہے آپ میری اس کیفیت کو میری جوانی اور اس کے عنایت کردہ احساسات کا شاخسانہ سمجھ رہے ہوں مگر میں اس سلسلے میں آپ سے اختلاف کروں گا۔ جوانی کی کیفیات یوں اچانک 'ایک دم حملہ آور نہیں ہوتیں۔ پل کے پل احساسات نہیں بدلتے بلکہ یہ تبدیلی بتدریج اور برسوں پر حاوی ہوتی ہے مگر جو کیفیات میں آج محسوس کر رہا تھا وہ عجیب و غریب تھیں۔ اس سے قبل بھی جو کچھ تھوڑی بہت تبدیلی میں نے خود میں محسوس کی تھی وہ دنیا کی رنگینی تو تھی مگر اس میں شوریدہ سر جذبات کا تعلق نہیں تھا جبکہ آج میں اپنے سرکش جذبوں کے آگے ہار چکا تھا۔ اپنے بدن میں اٹھتے طوفانوں کا شور میں اب تک فراموش نہیں کر سکا تھا۔

اس وقت باہر کا سکوت اندر تک ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس لڑکی کا سراپا اب بھی سنسنی بن کر میرے وجود میں دوڑ رہا تھا حالانکہ ذہن اس کی باتوں اور اس ابرار میں الجھا ہوا تھا کہ وہ کون ہے؟ کون سے سوامی جی کی بات کر رہی تھی۔ سادھو کی دسترس میں کیوں کر پہنچی اور کیسے اس کے چنگل سے نکل پائی پھر اس کی آنکھوں کا تمسخرانہ انداز یہ بھی سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ سادھو کی طرفدار ہے' مجھے اچنبھے میں دیکھ کر اسے خوشی ہو رہی تھی تو پھر۔ اس روز اس کی نگاہوں میں بھرا کرب۔ بچا لینے کی التجا کو کس خانے میں فٹ کروں۔

ان تمام باتوں نے میرے دماغ میں دھواں سا بھر دیا تھا۔ میں نے کئی بار ان سوالات سے چھٹکارا پانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں سوچنا چاہیں مگر لوٹ پھر اسی لڑکی کا سراپا نگاہوں میں جم جاتا۔ سب سے بڑی اور خوفناک بات یہ تھی کہ میں نے اس کی پشت پر بچھو کی تصویر چھپی دیکھی تھی۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ لڑکی کون تھی۔؟ میں تو کوثر کی تلاش میں نکلا تھا۔ یہاں آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پہلے کھنڈر کو چیک کروں۔

جس قسم کا جنگل میں نے تصور میں دیکھا تھا اس بارے میں مجھے کوئی جانکاری نہ تھی کہ یہ کہاں اور کس علاقے میں ہو گا بس ایک خیال تھا کہ شاید یہاں آکر میں کچھ جان سکوں۔ سنہرے بابا نے بھی مجھے کسی خاص سمت کے بارے میں نہیں بتایا تھا وہ یقیناً میرے خیالات سے آگاہ ہوں گے' اگر میرے ذہن میں غلط سمت ہوتی تو وہ ضرور تصحیح کرتے۔ میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا' بلکہ یوں کہیے کہ گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔

اب مجھے رات ہونے تک' صدیوں جتنے ڈھیر سارے پل گزارنا تھے۔ گزرتے لمحوں کے ساتھ ہی سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر کی نسبت بہت کھلا علاقہ تھا۔ مندر کی پچھلی سمت گندے پانی کا ایک بہت بڑا جوہڑ تھا۔ پچھلی طرف کی پہاڑیوں سے بارش کا پانی بہتا ہوا آکر یہیں جمع ہوتا تھا۔ اور دوسری جانب سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے۔ منڈیر کے ساتھ ساتھ خود رو جھاڑیوں نے مندر کو چاروں جانب سے گھیرا ہوا تھا۔ میں جس منڈیر پر بیٹھا تھا اس کے بالکل پیچھے جھاڑیاں تھیں اور وہاں سے ٹھنڈک میری کمر کو چھو رہی تھی۔

سورج ڈوبنے والا تھا۔ آسمان کا مغربی کنارا شفق سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ شفق دور اڑتے بادلوں پر منعکس ہو رہی تھی۔ سرخ روشنی میں مندر کی سیاہ عمارت مزید ہیبت ناک لگ رہی تھی۔ اونچے اونچے آبنوسی دروازے کے دونوں پٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اندر کی کوئی آواز باہر نہیں آ رہی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ شاید مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے صدیاں گزر گئی تھیں۔ سردی کب اتنی بڑھی کہ میں نے کھیس کو اپنے گرد لپیٹا' مجھے یاد نہیں۔ واسکوٹ میں پہلے ہی پہن چکا تھا۔ اب ٹھنڈک میری ٹھٹھرتی ہوئی کھال پر رینگ رہی تھی۔ میں منڈیر سے اتر کر فرش پر بیٹھ گیا۔ فرش ٹھنڈا تھا مگر یہاں میں ایک تو خود رو جھاڑیوں سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے محفوظ تھا۔ دوسری کھلی سمت سے آنے والی تیز ہواؤں کی زد سے بھی بچ گیا تھا۔ سناٹا ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ اکثر تانگے والے واپس جا چکے تھے اور بعض جو موجود تھے' وہ بھی موٹے کھیس لپیٹے اندر سیٹوں پر سکڑے پڑے تھے۔ چائے کا ہوٹل تقریباً ویران ہو چکا تھا۔ وہاں صرف دو آدمی موجود تھے جو چولھے کے گرد بیٹھے' جسم پر چادریں لپیٹے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ دونوں نے سروں پر کن ٹوپ پہن رکھے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ پوجا پاٹ کب ختم ہو گی' اب سردی سے میرے دانت بج رہے تھے۔

میں نے چائے کا ارادہ کیا اور کھیس کو اپنے گرد لپیٹتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ گرم گرم چائے کی طلب شدید ہو گئی تھی۔ بھوک کا البتہ قطعی احساس نہ تھا اور نہ ہی چچا کے گھر پہ خیال آیا تھا ورنہ میں ایسی چیز ضرور لے لیتا جس سے بھوک مٹ جاتی۔ بھوک اس وقت نہیں تھی مگر یقینی طور پر کچھ دیر بعد ضرور لگتی۔ میں لرزتا کانپتا ہوٹل پہنچ گیا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ دونوں چونک اٹھے تھے۔ قریب پہنچنے پر مجھے پتا چلا کہ ان میں سے ایک نوجوان لڑکا تھا جبکہ دوسرا ادھیڑ عمر کا بڑی ہڈیوں والا شخص تھا۔ اس کا رنگ بالکل سرخ تھا۔ آنکھیں سبز اور بال کچھ سنہرے سے تھے وہ شاید اس علاقے کا نہیں تھا۔

"آؤ بابو! ہم تمہارے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے۔" ادھیڑ عمر کا شخص چولھے کے قریب میرے لیے جگہ بناتے ہوئے ٹھیٹ اردو میں مخاطب ہوا تو مجھے حیرت ہوئی۔ لڑکا بھی ایک جانب سرک گیا۔ وہ دونوں وہاں ایک دری بچھائے بیٹھے تھے۔

"میرے بارے میں۔ کیوں۔ کیا باتیں کر رہے تھے؟" میں نے جلدی سے وہاں بیٹھتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھ کھیس میں سے نکال کر چولھے کے اوپر کر لیے چولھے میں انگارے موجود تھے۔ لڑکے نے لکڑی کے دو گٹکے چولھے میں ڈال کر لوہے کی سلاخ سے راکھ کریدی۔

"جو بابو لوگ یہاں بیٹھے تھے' انھوں نے تمہارا تذکرہ شروع کیا تھا۔ تم اکیلے وہاں رہ گئے تھے' اتنی ٹھنڈک میں بھی بغیر چادر کے بیٹھے تھے شاید اسی بات نے انھیں تمہاری طرف متوجہ کیا تھا۔ تم کسی کے انتظار میں ہو بابا؟"

"ہاں۔" میں نے مختصراً کہا۔ لڑکے نے میرے کچھ کہے بغیر گرم گرم چائے کا بڑا سا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اس ادھیڑ عمر شخص کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب پراسراری چمک تھی۔ چھوٹی چھوٹی سبز آنکھوں میں ذہانت کی چمک کے علاوہ بے پناہ بے چینی تھی۔ وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لڑکا مجھے چائے دے کر کونے میں رکھے برتن دھونے لگا۔

"تم ... ی خاص چکر میں ہو کیا؟" اس نے تھوڑا سا میری طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے؟" میں چوکنا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"مطلب یہ کہ۔ ہندوستان کی پراسراریت مجھے بس یہاں تک کھینچ لائی ہے' تم تو سو فی صد ہندوستانی ہو۔ تمہارا انداز بھی خاصا پراسرار ہے۔"

"تو کیا تم ہندوستانی نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میں برٹش ہوں۔ یہاں کے علوم میں خاصا انٹرسٹڈ ہوں۔ یہ مندر۔" اس نے انگلی اٹھا کر مندر کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ "اپنے اندر خاصی کشش رکھتا ہے۔ میں پچھلے پانچ برسوں سے ہندوستان میں مقیم ہوں۔ ہندوستان کا چپہ چپہ دیکھا ہے میں نے مگر ایسا مندر اور ایسی پراسراریت جو آدمی کو اندر سے بے چین کر دے' اس مندر کا خاصہ ہے۔"

اس کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ برٹش ہے' اور اسے اتنی صاف بلکہ ٹھیٹ اردو بولتے دیکھ کر میں اچنبھے میں رہ گیا تھا پھر اس نے بتایا کہ وہ مہینا بھر پہلے یہاں آیا تھا اور اس مندر کی پراسراریت سے متاثر ہو کر یہیں رہ گیا۔ اس نے یہ چھوٹا سا ہوٹل بھی اس لیے کھولا تھا کہ وہ دن رات اس مندر کے سامنے رہے۔

اس سے اس کا کیا مقصد تھا یہ نہ اس نے بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھا۔ گرما گرم چائے نے میرے حواس بحال کر دیے تھے۔ رات زمین پر اتر آئی تھی۔ کوئی دم میں مندر کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ میں چائے کے پیسے ادا کر کے اسے خدا حافظ کہہ کر پھر مندر کی منڈیر پر جا بیٹھا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے بہت دیر نہیں بیتی تھی کہ اچانک آوازوں کا طوفان امنڈ آیا۔ سیاہ مندر کے آبنوسی دروازے چرچراہٹ کے ساتھ کھلتے ہی کھنکھناتی ہنسی اور پائل کی چھنکار گونج اٹھی تھی۔ اندر سے آنے والی لڑکیاں ہاتھوں میں تھالیاں اٹھائے تھیں اور ان تھالیوں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ عجیب خوابناک سا ماحول تھا۔

آوازیں سن کر تانگے والے جلدی جلدی اٹھ کر سیٹ جھاڑتے ہوئے تانگے پر بیٹھ چکے تھے۔ کچھ تانگے والے مندر کے قریب چلے آئے۔ مندر کے باہر جلنے والی روشنی انتہائی زرد تھی اور اتنی تیز بھی نہ تھی کہ اس روشنی میں کسی کو پہچاننا آسان ہوتا اور وہ بھی ایسی صورت میں جب تمام ہی لڑکیاں تقریباً ایک ہی قد کاٹھ کی' ایک ہی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ میں بڑی بے قراری سے اس لڑکی کو ڈھونڈ رہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ رفتہ رفتہ وہاں رش کم ہونے لگا۔ تانگے ایک ایک کر کے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔

میں ہونقوں کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔ علاقہ سنسان ہو

گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس لڑکی کی تلاش میں کیوں ہراساں ہوں۔ مجھے تو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔

یہی سوچ کر میں چاروں طرف دیکھتا ہوا' دبے قدموں عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جو میں پہلے شرف الدین کے ساتھ اختیار کر چکا تھا۔ یوں بھی میں اسی ایک راستے سے واقف تھا۔ میں عمارت کے باہر نیچی سی دیوار کے ساتھ ساتھ مندر کے انتہائی دائیں جانب چل پڑا۔ آگے سے 'جہاں سے دیوار کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا' میں اندر داخل ہو گیا۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر سرکنڈوں کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ میں نے جنگل میں قدم رکھنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر آیت الکرسی پڑھی' ہتھیلیوں پر پھونک کر ہاتھ پورے بدن پر پھیرا اور ہمت کر کے آگے بڑھ گیا۔

یہاں جھینگروں کی تیز آوازوں نے میرا استقبال کیا۔ آسمان بالکل سیاہ تھا' بادل گہرے ہو گئے تھے۔ لگتا تھا جیسے کسی بھی دم بارش برسنے لگے گی۔ یہاں دور تک ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں میں بارش سے بچنے کے لیے پناہ لیتا۔ ہوا بند ہو گئی تھی۔ شاید اسی وجہ سے سرکنڈوں کی سرسراہٹ اتنی تیز نہ تھی۔ البتہ میرے چلنے سے اور بدن سے سرکنڈوں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ اتنی خوفناک نہ تھی۔

دور کھڑی عمارت کے کھنڈر یہاں سے ہیولے کی مانند نظر آ رہے تھے۔ میں بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے دل میں اس وقت وہ خوف نہ تھا جو پہلی بار محسوس ہوا تھا۔ میں مسلسل آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ جب میں آیت الکرسی پڑھنا شروع کرتا تھا تو جھینگر اچانک خاموش ہو جاتے تھے جیسے سہم کر چپ ہو گئے ہوں مگر آیت الکرسی ختم کرتے ہی وہ سب ایک ساتھ مل کر بولنے لگتے تھے۔

میں نے ابھی آدھا رستہ ہی عبور کیا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کوئی تھا۔ میں نے سرکنڈوں کے سرسرانے اور کسی کے چلنے کی واضح آواز سنی تھی۔ کسی اور کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی میں چپکے سے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اب میں مکمل طور پر سرکنڈوں میں چھپ چکا تھا۔ میری تمام تر توجہ آواز پر تھی۔ چند لمحے تک تو سناٹا رہا جیسے آنے والا بھی دبک کر بیٹھ گیا ہو مگر تھوڑی ہی دیر بعد میں نے سرکنڈوں کو ہلتے اور سرسراتے محسوس کیا۔ وہاں یقیناً کوئی تھا۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی تو میں صرف ایک سایہ دیکھ سکا جو دبے پاؤں اسی کھنڈر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کون ہے اور مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ یوں تو مجھے کسی سے چھپنے کی کوئی ضرورت نہ تھی بس اتنا خیال تھا کہ کوئی بات میری راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ آنے والا کون ہے؟ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سادھو ہو۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا پھر چونک کر اٹھا کیونکہ اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ جھاڑیوں کے سرسرانے کی اور نہ ہی کسی کے چلنے کی۔ میں کچھ دیر تک کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔ مجھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی بڑھنے کا بھی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ گو میں کھیس کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھا مگر سرکنڈوں کی ٹھنڈک میری ہڈیوں میں سرایت کر رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس جنگل کو عبور کر لینا چاہتا تھا۔ کسی کو نہ پا کر میں نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا' اگر وہاں کوئی ہوتا بھی تو میں اپنا سفر ملتوی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی رفتار بھی بڑھا دی۔ ابھی تو مجھے منزل پانے کے لیے جانے کون کون سی رکاوٹوں کو عبور کرنا تھا۔ اگر میں ابتدا میں ہی ان چکروں میں پڑ جاتا تو پھر اپنی منزل پا لینے کا سوال ہی نہ تھا۔

اب میں کسی کی بھی پروا کیے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔ سرکنڈوں کی تیز آوازیں' جھینگر کے بولنے کی ناگوار آوازیں' نہ میرے قدم روک رہی تھیں اور نہ ہی میں کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس جنگل کو عبور کرنے میں مجھے کتنی دیر لگی۔ جنگل ختم ہوتے ہی سردی کی شدت کا احساس کم ہو گیا۔ میری ٹانگیں باقاعدہ کانپ رہی تھیں۔ میں وہیں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر اپنی سانسیں بحال کرنے لگا۔

دور تک گہرا اندھیرا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھنڈر سیاہ ہیولے کی مانند نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں کھنڈر کی طرف چل دیا۔ یہاں سیلن کی تیز بدبو نے لو بھر کو مجھے چکرا دیا تھا۔ میں نے دیوار کو تھاما تو یہ دیکھ کر سنبھل گیا کہ دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ یقیناً فرش پر بھی کائی جمی ہو گی' یہ دیکھ کر میں سنبھل سنبھل کر' قدم جما کر چلتا ہوا دروازے کے قریب آ گیا۔ سیاہ لکڑی کا بھاری دروازہ بند

تھا۔ میں نے اس پر دباؤ ڈال کر دیکھا' مگر وہ ہلا بھی نہیں۔ پچھلی بار میں نے اور شرف الدین نے زور لگا کر اس دروازے کو کھولا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ آج میں اکیلا اسے کھول سکوں گا۔ میں چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر تھوڑی ہی دیر میں بری طرح ہانپ گیا۔ وہ تنہا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اب میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ میں اب اندھیرے میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا اس لیے بھی مجھے دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں گھوم کر تمام کھنڈر کا جائزہ لینے لگا۔ میں جس بڑے سے دالانڈے میں کھڑا تھا' اس میں محرابیں بنی ہوئی تھیں' اس کے سامنے سپاٹ دیوار تھی جس میں بیچوں بیچ یہ دروازہ نصب تھا۔ میں دیوار پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے دھیرے دھیرے دائیں جانب بڑھتا چلا گیا۔ میرے ہاتھ ہر ہر اینٹ کو محسوس کر رہے تھے۔ میں کسی ایسی جگہ یا ایسی درز کی تلاش میں تھا جہاں سے اندر جانے کی سبیل پیدا کر سکوں۔

میں ہر اینٹ پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈالتا تھا تاکہ اندازہ لگا سکوں کہ اسے اکھاڑ لینا ممکن ہے یا نہیں۔ میرے دونوں ہاتھ سیلن اور کائی کی وجہ سے پھسل رہے تھے۔ میں ٹٹولتا ہوا دیوار کے اختتام تک آ گیا مگر کوئی ایسی جگہ یا جھری نظر نہ آئی جس سے میرا کام آسان ہوتا۔ اب میں نے بائیں جانب بڑھنا شروع کیا۔ اس بار بھی سفر میں نے دروازے ہی سے شروع کیا تھا۔ یہاں بھی اختتام تک مضبوط دیوار تھی۔ میرے دونوں ہاتھ یخ ہو چکے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو ملا اور چادر کے نیچے چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد میرے ہاتھ گرم ہو گئے تو میں نے پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دروازہ میرے ہاتھوں کے ہلکے سے دباؤ پر کھلتا چلا گیا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ایسا ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی میں اور شرف الدین اپنا پورا زور لگا رہے تھے مگر پھر اچانک ہی دروازہ کھل گیا تھا اور ہم اپنے زور میں اندر دوڑتے چلے گئے تھے۔ پچھلی بار بھی سادھو نے ہمارا استقبال کیا تھا اور آج بھی مجھے یقین تھا کہ سادھو ہی میرا منتظر ہو گا۔

میں چند لمحے دروازے میں کھڑا اندر کا جائزہ لیتا رہا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس لمحے میری حس سماعت بہت حساس تھی اور میں نے وہاں کسی کی موجودگی کو سانسوں کے

سے برآمدے کے بعد دور تک کچا آنگن تھا اور اس کچے حصے میں بڑے پرانے درخت تھے جن میں اکثر کے تنے کھوکھلے تھے۔ ان درختوں میں بڑ کے درخت زیادہ تھے جن کی لمبی لمبی جھاڑیں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان درختوں سے کچھ فاصلے پر پھر پرانی عمارت کے کھنڈر تھے جن میں سے کچھ سالم تھے اور کچھ اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر ہو چکے تھے۔

میرے ہال سے باہر نکلتے اور بڑے چبوترے نما برآمدے میں قدم رکھتے ہی چند چمگادڑیں پھڑپھڑاتی ہوئی' میرے سر سے گزر کر دوسری طرف چلی گئیں۔ سناٹے میں جیسے ایک بھونچال سا آیا اور معدوم ہو گیا۔ لمحہ بھر کو میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ چند لمحوں بعد میں نے پھر قدم اٹھایا اور میں دور بنے اس کھنڈر کی طرف بڑھنے لگا جہاں میں اب سے پہلے نہیں جا سکا تھا۔

پچھلی بار جو کچھ ہوا تھا وہ اس بڑے ہال میں ہوا تھا۔ ہمیں اندر کی طرف آنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا بلکہ ہم وہیں سے باہر نکل گئے تھے۔ البتہ تصور میں' میں نے جس قسم کے درخت کی کھوہ میں کوثر کو جاپ کرتے دیکھا تھا وہ اسی طرح کے درخت تھے جو میرے سامنے تھے۔ میں اس کھنڈر کی طرف جاتے ہوئے ان درختوں سے قریب ہو گیا تاکہ اندر جھانک کر دیکھ سکوں۔

ایک گمان تھا کہ شاید کوثر مجھے یہیں مل جائے مگر وہ تمام درخت خالی تھے۔ ان کے کھوکھلے تنے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا تبھی میں پوری قوت سے اچھل پڑا۔ ایک زوردار دھماکے کی سی آواز آئی تھی۔ میں بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اب یہاں کچھ بھی نہ تھا مگر میری سماعت جیسے اب تک دھماکے کی آواز سے لرز رہی تھی۔ بہت غور کرنے پر معاً" یہ انکشاف ہوا کہ یہ آواز بڑے ہال کے دروازے کی تھی۔ غالباً" وہ دروازہ ہوا کے زور سے بند ہو گیا تھا یا ممکن ہے کہ بند کر دیا گیا ہو۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا اس ہال میں پہنچ گیا۔ میرا خدشہ درست تھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کبھی کوئی دروازہ رہا ہی نہ ہو بلکہ دیوار ہو جسے ہلانا میرے بس کی بات نہ ہو۔ بہت جلد میرا سانس پھول گیا۔

میں نے غور کیا تو خود کو خاصا چغد محسوس کیا۔ یہاں آ کر ان پراسرار حرکتوں کی توقع نہ رکھنا عبث تھا بلکہ بے وقوفی

زیرو بم سے محسوس کر لیا تھا۔ اس وقت مجھے اپنی بے وقوفی پر بے پناہ غصہ آیا۔ میں خالی ہاتھ چلا آیا تھا۔ نہ میرے پاس اپنے بچاؤ کے لیے ایسی کوئی چیز تھی جسے میں استعمال کر سکوں اور نہ ہی میں ٹارچ لایا تھا حالانکہ چچا نے مجھ سے کئی بار پوچھا تھا کہ تمہیں کن چیزوں کی ضرورت ہے مگر میں نے منع کر دیا۔ میں اس وقت اس موضوع پر سوچنے ہی کو تیار نہ تھا۔ مجھے بہت سی ایسی چیزوں کی ضرورت تھی جو میرے کام آسکتی تھیں مثلاً ٹارچ' لوہے کی سلاخ یا ہتھیار قسم کی کوئی چیز۔ کھانے پینے کی اشیا گو اس وقت مجھے قطعی بھوک نہ تھی مگر میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والا کتنا وقت مجھے یہاں کب تک یا کہیں اور گزارنا ہے۔ بغیر کچھ کھائے بیے میں کتنا عرصہ گزار سکتا تھا۔

میں اب بھی دروازے میں کھڑا تھا کہ اچانک مجھے اپنے قریب ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور میں نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ جو بھی تھا مجھے نظر نہیں آیا مگر میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

میں شاید آپ کو یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ سنہرے بابا نے چلتے چلتے مجھے چند آیتیں یاد کرنے کی تلقین کر دی تھی۔ مجھے تین چار ایسے الفاظ بھی بتائے تھے جن کی ترتیب کو الٹ پلٹ کرنے سے میں نہ صرف یہ کہ خود کو محفوظ کر سکتا تھا بلکہ مدمقابل کو ضرر بھی پہنچا سکتا تھا مگر بابا نے ہدایت کی تھی کہ میں صرف اپنے آپ کو محفوظ کرنے پر توجہ مرکوز رکھوں اور ضرر پہنچانے سے حتی الامکان گریز کروں اور اس وقت تک جب تک کہ ناگزیر نہ ہو جائے۔ میں نے ان سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اس وقت مجھے یاد آگیا اور میں نے ان جملوں کو بابا کی بتائی ہوئی ترتیب میں دہرانا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کسی کی موجودگی کا احساس ختم ہو گیا۔

کھنڈر کے اندر کا گہرا اندھیرا ملگجے پن میں تبدیل ہو گیا تھا یا میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت حاصل کر چکی تھیں بہرحال اجاڑ اور ویران بڑا سا ہال میرے سامنے تھا۔ اب میں نے قدم اندر رکھا اور آیت الکرسی پڑھ کر خود پر دم کیا۔ خود اعتمادی عود کر آئی تھی وجہ کچھ بھی رہی ہو' اس خود اعتمادی نے مجھے آگے بڑھنے میں مدد دی اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں شاید آپ کو پچھلی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ اس ہال کے دوسری جانب کھلا حصہ تھا۔ اونچے

تھی۔ مجھے تو شروع ہی میں سوچ لینا چاہیے تھا کہ مجھے واپس نہیں جانا ہے۔ میں واپس جانے کے لیے آیا ہی کب تھا۔ اس بات کا خیال آتے ہی میں پلٹ آیا۔ اب میں پھر اس کھنڈر کی طرف جا رہا تھا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر بنے تھے اچانک آسمان روشن ہو گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور بادل کے چند آوارہ ٹکڑوں کے درمیان سے چاند جھانک رہا تھا۔ دور دور تک پھیلی روشنی نے چاروں طرف کے مناظر واضح کر دیے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اس کھنڈر کے قریب پہنچتے ہی میں خوش ہو گیا کیونکہ چاروں طرف نظر آنے والی اونچی اونچی دیواریں اس کھنڈر کے پیچھے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ گویا یہاں سے باہر جانے کا راستہ کھلا تھا ورنہ یہ کھنڈر شاید کسی قلعے کا تھا جس کے اطراف اونچی اونچی دیواریں تھیں۔

میں کھنڈر کے اندر جانے کی بجائے گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے درخت خودرو جھاڑیاں اور دور تک دکھائی دینے والے جنگلی پودے میرے سامنے تھے۔ چاند کی روشنی کی وجہ سے یہاں بھی تاریکی کم تھی۔ اس گھنے جنگل میں قدم رکھتے ہوئے میں جھجک رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس تاریکی اور اتنے گھنے جنگل میں' میں کوثر کو کہاں اور کیسے تلاش کروں گا۔ پھر اچانک ہی مجھے اپنے تصور والی طاقت سے کام لینے کا خیال آیا۔ گو اب سے پہلے میں دانستہ کبھی ایسا نہیں کر سکا تھا مگر ایک کوشش کرنے میں کیا حرج تھا' یہی سوچ کر میں وہاں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھتے ہی ایک نسوانی ہنسی کی دبی دبی آواز سے پورا علاقہ جیسے جھنجھنا اٹھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کون۔ کون ہے؟" میں بے اختیار پکار بیٹھا۔ ہنسی کی آواز دوبارہ آئی اور یوں لگا جیسے کوئی لڑکی بھاگی ہو اور اس کی پائل چھنک اٹھی ہو۔ نہ معلوم کیوں میرے بدن سے پسینا پھوٹ پڑا۔ میں نے پھر آواز دی۔ "کون ہے۔ سامنے آؤ۔"

جواب میں گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ سناٹا اتنی دیر تک قائم رہا کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ صرف میرا وہم تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وہ لڑکی یاد آگئی جسے میں مندر میں جاتا دیکھ چکا تھا۔ میں نے کچھ دیر آواز کا انتظار کیا پھر میں

نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا' آنکھیں موند لیں اور کوثر کا چہرہ ذہن میں جما لیا۔ مگر میں اس بار بھی تصور کو قائم نہیں رکھ سکا۔ میرے پیر پر کوئی کیڑا سا چل رہا تھا۔ میں نے بے اختیار پاؤں جھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔ ساتھ ہی میری نگاہ زمین پر گئی جہاں میرے خیال میں کسی کیڑے کو ہونا چاہیے تھا۔

میرے بدن میں لرزا سا پیدا ہو گیا۔ کوشش کے باوجود میں اپنی بے ساختہ چیخ پر قابو نہیں پا سکا۔ جو کچھ مجھے وہاں نظر آ رہا تھا وہ میرے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میں چکرا کر گر پڑوں گا۔ وہاں۔ میرے پیروں کے قریب' چھوٹی سی ایک انسانی کھوپڑی پڑی تھی۔ بلکہ چل رہی تھی' رینگ رہی تھی۔ اس کھوپڑی پر آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ کسی زندہ انسان کا سر ہو۔ نہیں۔۔۔ مکمل طور پر کھوپڑی تھی۔ صرف اس پر زندہ آنکھیں متحرک تھیں جو چاند کی تیز روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ یہ کھوپڑی میرے پیر پر رینگتی ہوئی پنڈلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں اور اس نے دوبارہ میری طرف رینگنا شروع کر دیا۔

میں بے ساختہ پلٹ کر بھاگ اٹھا۔ میرا رخ اس بڑے ہال کی طرف تھا جہاں سے میں اس کھنڈر میں داخل ہوا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لگا جیسے کسی نے بہت سے بلب روشن کر دیے ہوں۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔

"آؤ وکار الحسن!" کھرکھراتی ہوئی تیز آواز نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا لیے۔ آواز سوفی صد سادھو کی تھی۔ "چتا نہ کرو۔ تم تو میرے میت ہو۔ تم (یقیناً) اوشے پائل لے کر آئے ہو گے۔"

وہ اپنی کریہہ شخصیت کے ساتھ وہاں براجمان تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مندر میں مجھے ملی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کے بدن پر نفیس مہین جالی دار کپڑا تھا جس سے اس کا شباب اُمڈا پڑ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بندیا تھی نہ بالوں میں گیندے کے پھول اور نہ ہی بدن پر جوگیا رنگ کی ساڑی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ چمک' وہ جگمگاہٹ بھی نہ تھی جو میں نے مندر میں دیکھی تھی بلکہ اس لمحے اس کی آنکھوں میں وہی

کرب تھا جسے میں تصور میں دیکھ چکا تھا۔ ویسی ہی ملتجی نگاہیں۔ میں دم بخود کھڑا اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی پشت دوسری جانب تھی ورنہ شاید میں اس کے دونوں کاندھوں کے بیچ' گدی سے کچھ نیچے بچھو بنا ہوا بھی دیکھ لیتا۔

"یہ چمپا ہے۔ میرے جیون کی ترخی ہوئی دھرتی پر لذتوں کی پہلی بوند۔ تم نے مدھ (شہد) دیکھا ہے ناں۔ کھایا بھی تو ہو گا ویسے ہی سنہرے رنگ والی' اتنی ہی میٹھی' اتنی ہی لذیذ اور اتنی ہی آتما کو شانتی دینے والی۔"

سادھو کی آواز میں اس کی شخصیت کا تمام گھناؤنا پن پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اپنی لمبی لمبی' پتلی اور ٹیکڑے ایسی انگلیوں والے کھردرے ہاتھ کو اس کے ریشم ایسے بدن پر پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میری نگاہیں اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرا کر ٹھہر گئیں۔ ان آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ اس کا نچلا ہونٹ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"ہاں تو وکار الحسن۔۔ لاؤ۔ وہ پائل مجھے دے دو۔" اس نے اپنا لمبا بازو میری طرف بڑھا دیا۔

میں بے اختیار پیچھے سرک گیا۔

"یہ شکنتلا بہت ضدی ہے۔ میرے من میں لذتوں کی آگ بھڑک رہی ہے۔ میں یہ آگ بجھانے کو بے کل ہوں۔ مگر اس کی پائل۔ لاؤ دے دو مجھے۔"

"میں کوئی پائل نہیں لایا۔ اور نہ ہی ایسی کوئی پائل مجھے ملی ہے۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا حالانکہ وہ پائل اس وقت بھی میری جیب میں موجود تھی۔

"پھر تو تم نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا وکار الحسن۔ وہ دیکھو۔ وہ۔ اپنے پیچھے۔"

اس نے اپنی لمبی انگلی اٹھا کر میری پشت پر اشارہ کیا مگر میں اسے اس کی کوئی چال سمجھ رہا تھا اس لیے ویسے ہی اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا' نہ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"دیکھو وکار الحسن! یہ میرے بچے ہیں۔ میرے چیلے ہیں اور میرے بازو ہیں۔ انہیں آدمی کا لہو بہت پسند ہے۔ اور پھر تمہارے ایسے مہان آدمی کا لہو تو ان کی عمر دوگنا کر دے گا۔ انہیں زندہ رہنے کے لیے لہو چاہیے ہوتا ہے۔ اگر ہر تیسرے روز انہیں لہو نہ ملے تو۔ تو یہ کسی کو بھی چٹ کر جائیں۔ یہ کتے نہیں ہیں جو مالک کا وفادار رہتا ہے۔ یہ کچھ

نہیں سوچتے۔ بہت بے وفا ہوتے ہیں' یہ ان کی وجہ سے اب تک بہت سے لوگ سورگ میں جا چکے ہیں۔ اور جب یہ لہو چاٹتے ہیں ناں' تو ایسی آوازیں آتی ہیں جو مجھے بے کل کر دیتی ہیں' مجھے کچھ ہونے لگتا ہے وکار الحسن! وہ آواز اگر تم سن لوگے وکار الحسن تو ابھی۔ ابھی بے کل ہو جاؤ گے۔"

وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کی تیز چبھتی ہوئی چیچپاتی ہوئی نگاہیں اب بھی میری پشت پر' زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی شفقت پھیل چکی تھی۔ چہرے کی کرختگی کچھ کم لگ رہی تھی۔ میں اب بھی اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اچانک میرے دائیں پیر پر سرسراہٹ ہوئی۔ پہلا خیال مجھے کسی سیاہ بچھو کا آیا۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور اپنے پیروں کے پاس اسی چھوٹی سی انسانی کھوپڑی کو رینگتا دیکھ کر میری جھرجھری چھوٹ گئی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ سر اٹھائے مجھی کو دیکھ رہی ہے۔ اتنی روشنی میں اسے دیکھ کر مجھ پر مزید دہشت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بالکل ایسی کھوپڑی تھی جیسی میں شرف الدین کے پاس ایک کتاب میں' ایک افریقی جنگلی کے گلے میں پڑی دیکھ چکا تھا اور جس کے بارے میں شرف الدین نے بتایا تھا کہ یہ قبائلی لوگ مرے ہوئے انسانوں کی کھوپڑیوں کو خاص طریقے سے سکھا کر چھوٹا کر لیتے ہیں مگر وہ صرف کھوپڑی تھی' کسی مردہ شخص کی کھوپڑی مگر جو کھوپڑی میرے سامنے تھی' وہ زندہ تھی۔ سو فیصد زندہ۔ پیلاہٹ مائل سفید اور سوکھی ہوئی ہڈیوں پر مشتمل وہ کھوپڑی یوں بے آواز رینگ رہی تھی جیسے کیچوا یا سانپ رینگتا ہے۔ اس کے حلقوں میں دو سیاہ پتلیاں گردش کر رہی تھیں۔ اس کے جبڑے ابھرے ہوئے تھے اور ان میں کوئی جنبش نہ تھی۔

میں مارے دہشت کے کانپ رہا تھا۔ تبھی مجھے سنہرے بابا کا بتایا ہوا عمل یاد آ گیا اور میں نے لرزتے کانپتے اسے مکمل کر لیا۔ عمل مکمل کرتے ہی میں نے خود میں تبدیلی محسوس کی۔ دہشت کا احساس ایک دم ختم ہو گیا اور نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اپنا دایاں پیر اٹھا کر اس کھوپڑی پر رکھ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی نرم اور لجلجی چیز پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ اس غیر متوقع حرکت پر خود میں بھی حیران رہ گیا تھا' سادھو کی صورت تو دیکھنے کے لائق ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ منہ کھلا رہ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ جھپٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے اس طرح کھڑے ہوتے سے اس کے بازو سمٹی ہوئی خوفزدہ چمپا ایک طرف لڑھک گئی اور اس کے لبوں سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔

"وکار الحسن! یہ۔ یہ نہ کرو۔ ایسا نہیں کرنا مورکھ۔" بے ساختہ چیخ اٹھا۔ پھر وہ اچانک بھاگتا ہوا میرے پیچھے گیا۔ زمین پر جھکا تو میری نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں وہ ایک کھوپڑی ہی نہ تھی بلکہ کئی اور بھی تھیں جن پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ سادھو نے وہ تمام کھوپڑیاں جو شاید تعداد میں چار تھیں اٹھا کر عالبا" اپنے جھولے نما لباس کی جیب میں رکھ لیں۔ وہ بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔

میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "خبیث بڈھے! تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں کمزور ہو کر بھی یہاں تک آ سکتا ہوں۔ کوئی اور شعبدہ بھی دکھانا چاہتا تو بے دکھا۔" میں نے آواز میں گھن گرج پیدا کر کے کہا۔

لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ "نہیں۔ تجھے شکتی ہیں کم جور کون سمجھتا ہے بالک۔ تو باکت ور ہے۔ بہت باکت ور ہے بہت شکتی سالی۔ میں تجھے کوئی نکسان کوئی چھتی نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میری ارادھنا میرا جاپ پورا ہو جائے۔ میں نکسان پہنچانا چاہتا تو اب تک تیرے پریوار کو دھونس کر چکا ہوتا وکار الحسن تیرا پورا کھاندان وناش ہو چکا ہوتا مگر نہیں۔ میں ایسا چاہتا ہی نہیں ہوں۔"

وہ پھر بولتا چلا گیا مگر' مگر اس بار مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے وہ مجھے باتوں میں لگا کر کچھ کرنا چاہتا ہو۔ میں چوکنا ہو گیا۔ میں نے اسے بائیں جانب دیوار کی طرف بڑھتے محسوس کیا۔ وہ اپنے تئیں بڑی ہوشیاری سے سرک رہا تھا۔ میرا پاؤں اب تک اسی کھوپڑی پر تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے پیر کے نیچے کسی بھی چیز کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اپنا پاؤں زمین پر رکھا ہوا ہے۔

میں نے کن انکھیوں سے بائیں جانب دیکھا۔ وہاں ایک بڑی سی طاق بنی ہوئی تھی۔ ایک موم بتی اس طاق میں روشن تھی اور اس طاق میں سیاہ رنگ کا انسانی کھوپڑی کی شکل کا بنا ہوا وہی پیالا رکھا تھا جسے میں تصور میں اس کے سامنے رکھا دیکھ چکا تھا' اسی پیالے کو میں نے کوثر کی گود میں رکھا ہوا بھی دیکھا تھا جس میں اس کی باچھوں سے نکلنے والے خون کے قطرے ٹپک کر جمع ہو رہے تھے۔ اس پیالے میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ سادھو نے اس پیالے میں کھولتے ہوئے سیال میں ہاتھ ڈبو کر مجھ پر جھٹکے تھے تو میں تو ہٹ گیا تھا مگر جہاں جہاں اس سیال کی بوندیں گری تھیں وہاں سے میں نے دھواں اٹھتا دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس وقت اسی پیالے کو اٹھانے کے لیے بڑھ رہا تھا۔

"نہیں سادھو۔" میں ایک دم چیخ اٹھا۔

وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف کے باوجود عیاری بھری تھی۔ "کک۔ کیا بات ہے بیٹا؟"

"نہیں۔ تم آگے نہیں بڑھو گے ورنہ۔" میں نے اسے دھمکی دینے کے لیے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

وہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ سمجھا ہو گا کہ میں جانے اب جیب سے کیا نکالنے والا ہوں پھر اس نے اپنے دونوں بازو اٹھا کر کہا۔ "وکار الحسن! میں تمہارا ہیسی ہوں' متر ہوں۔ اچھا ٹھہرو۔ میں اپنی دوستی کو ثابت کر دیتا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں ناں' نہیں جب میں تمہیں ثابت کر دوں گا کہ میں تمہارا نکسان نہیں لابھ پہنچانا چاہتا ہوں تب تو جان لوگے ناں؟ میں جانتا ہوں کہ تم کس کی تلاش میں آئے ہو۔ تمہیں کوثر چاہیے ناں!"

میں اس کا آخری جملہ سن کر چونک اٹھا۔ "کوثر۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ۔ میرے پاس ہے اور' نہیں۔" وہ شاید میرا چہرہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ واقعی یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا کہ کوثر اس کے پاس ہے۔

"نہیں وکار الحسن۔ وہ میرے پاس کھود آئی تھی۔" اتنا کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ میں نے اپنے ذہن میں کھرونچے سے پڑتے محسوس کیے۔ وہی پلکیں جھپکنے کا کریہہ انداز' وہی کچے فرش پر ناخن گھسنے کی سی ناگوار آواز' میرے جبڑے بھنچ گئے۔ سیکنڈ کے شاید ہزارویں حصے میں' میں سمجھ گیا کہ وہ میرا ذہن پڑھنا یا قابو کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تمام قوتیں صرف کر دیں کہ وہ میرا ذہن نہ پڑھ سکے اور تبھی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے لوہے کا پنجرہ میرے وجود کے گرد آ گرا ہو یا کسی نے مجھے لوہے کے جال میں بند کر دیا ہو۔ اس کی

آنکھوں کی ٹمٹماہٹ بڑھ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر تپنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہلکے ہلکے ہل رہے ہیں۔ وہ شاید کوئی منتر ونتر پڑھ رہا تھا۔

میں اب بھی اسی پوزیشن میں کھڑا تھا کہ بالکل اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں زمین سے بلند ہو گیا ہوں۔ میرا بدن دھیرے دھیرے اسی طاق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا کہ شاید یہ میرا وہم ہے مگر میں نے تھوڑی ہی دیر میں خود کو اس طاق کے قریب پایا۔ میں نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر طاق پر رکھا پیالا اٹھا لیا۔ وہ' جو عمل پڑھنے میں منہمک تھا ایک دم چیخ اٹھا۔

"وکار الحسن! ٹھہرو۔ ٹھہرو۔" وہ بوکھلا گیا تھا۔

میں ٹھہر گیا۔ وہ اب لرز رہا تھا۔ میں نے پیالے میں ابلتے ہوئے سیال کو دیکھا تو مجھے ابکائی سی آ گئی۔ وہ خون سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ میرے پیر اب بھی زمین سے اونچے تھے۔ عین اسی لمحے سادھو کی نگاہ بھی میرے پیروں پر پڑی اور وہ سراسیمہ ہو کر پلٹا۔ وہ زور زور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک ہی کمرے میں گاڑھا دھواں پھیلنے لگا۔ میری آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں سے بھر دیں۔ نتھنے اندر سے جلنے لگے۔ میں سادھو کا ارادہ بھانپ گیا اور چیخ کر بولا۔

"سادھو اگر تم نے اب کوئی شعبدہ دکھایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے پیالے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب گرم گرم پانی میری آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

"نہیں۔ وکار الحسن! میں کچھ نہیں کروں گا۔" گاڑھے دھویں کے اندر سے اس کی آواز آئی پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ میں آنکھیں کھولنے سے قاصر تھا حالانکہ میں نے کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دھویں کی وجہ سے مجھے سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ حلق تک میں شدید جلن ہو رہی تھی۔

یہ کیفیت شاید چند منٹ تک رہی پھر میں نے محسوس کیا کہ اب میں آسانی سے سانس لے رہا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں دھواں بھی نہ تھا۔ سادھو ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا اور میرے دائیں جانب کوثر کسی مجسمے کی طرح بیٹھی خلا میں تک رہی تھی۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ خون سے بھرا ہوا پیالا اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس

کے قریب پہنچ کر جب میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو میں لرز گیا۔ اس کے چہرے کی کھال جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے پر جگہ جگہ بلیڈ مارے گئے ہوں۔ ان زخموں پر خون جما ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ "کوثر۔ کوثر۔"

مگر اس کے ساکت جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ "کیا۔ کیا کیا ہے اس کے ساتھ۔ کیا ہوا ہے اسے؟" میں چیخ کر سادھو کی طرف جھپٹا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے وکارالحسن! میں نے تو اسے اس دلدل سے نکالنے کے لیے بڑے کشٹ اٹھائے ہیں۔ صرف اس لیے کہ تمہیں مجھ پر شک تھا۔ تم سمجھتے تھے کہ میں نے کوثر کو پت بھرشٹ کیا ہے ورغلایا ہے یا اسے اپنے پاس بندی بنا کر رکھا ہے۔ میں اسے اس کھوہ میں سے نکال کر لایا ہوں جہاں ناگ دیوتاؤں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کی گود میں کنڈلی مار کر بیٹھ گئے تھے۔ اس نے ناگپا جادوگر کا پیش بند حاصل کر لیا ہے وکارالحسن' اور اب ناگ دیوتا اس کی تلاش میں ہیں۔ میں تو اس کے کارن خود بڑی کٹھنائیوں میں پڑ گیا ہوں۔ اسے یہاں سے لے جاؤ وکارالحسن بس۔ بس مجھ پر ایک کرپا کر دو۔ شکنتلا کو بھول جاؤ۔ وہ تمہارے کسی کام کی نہیں ہے۔ وہ پائل میرا جیون بنا دے گی۔ تمہیں نہیں معلوم وکارالحسن کہ ایک پرش بنا ناری کے کیسے جیون بتا سکتا ہے۔ گنگا میا سامنے بہتی ہو اور آدمی پیاسا ہو تو بڑی دکھن ہوتی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے پلٹ کر کوثر کی طرف دیکھا پھر چیخ اٹھا۔

سادھو چپ ہو گیا۔ میں کوثر کی طرف بڑھ گیا۔ "کوثر! کوثر آنکھیں کھولو۔" میں دھیرے دھیرے اسے پکار رہا تھا۔

"وکارالحسن! یہ۔ یہ جو پیالے میں لہو ہے ناں۔ اسے انگلی کی پور پر لے کر اسے چٹا دو۔ یہ ہوش میں آجائے گی۔"

سادھو کی بات سن کر مجھے جھرجھری چھوٹ گئی۔ میں اتنا کراہیت آمیز کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اب بھی اسے ہلا کر، پکار کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بہت بری حالت تھی۔ اس کے کپڑے میلے چیکٹ ہو چکے تھے۔ بلاؤز میں سوراخ نظر آرہے تھے۔ اس کے بال میل اور دھول سے اٹ چکے تھے۔ چہرے پر بھی میل اور زخموں پر خون کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پکارا تو چونک اٹھا۔ اس کی ہتھیلی کی پشت زخمی تھی اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔

میری انگلیاں ان کے خون میں لتھڑ گئیں۔ میں بوکھلا گیا۔ پورا بازو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ پوری کی پوری زخموں سے چور تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس نے کیسی سفلی خواہش کو پالا تھا جس نے اسے اس حال کو پہنچا دیا۔ کاش وہ ہوش میں ہوتی اور یہاں کہیں قدم آدم آئینہ بھی ہوتا تو میں اسے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے پوچھتا کہ کیا یہی کچھ بننے کے لیے اس نے ایک پرسکون گھر کو آگ لگا دی۔ اپنے بوڑھے اور محبت کرنے والے ماں باپ کو دکھ دے گئی مگر وہ ہوش میں نہ تھی۔ سادھو نے پھر کہا کہ میں پیالے میں بھرا لہو اسے چٹا دوں مگر میں خود کو اس گھناؤنے فعل پر آمادہ نہ کر سکا۔

"تم۔ تم خود کرو یہ۔" میں نے مجبوراً کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی عیاری تھی مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں صرف کوثر کو ہوش میں لانا چاہتا تھا۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ سادھو اٹھ کر قریب آگیا۔ اس نے میرے قریب بیٹھ کر پیالے میں اپنی انگلی ڈبو کر نکال لی اور پھر اپنی انگلی کو کوثر کے ہونٹوں پر پھیرنے لگا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ ایک تو یہ عمل ہی بڑا کراہیت آمیز تھا اور دوسرا وہ جس انداز میں کوثر کے ہونٹوں پر اپنی انگلی پھیر رہا تھا اس نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی مگر میں مجبور تھا۔ سادھو کی قربت میرے لیے انتہائی تکلیف تھی لیکن میں وہاں بیٹھا رہا۔ میرا دایاں ہاتھ زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ میں کوثر کی طرف متوجہ تھا۔

اچانک ہی مجھے عجیب لذت آمیزسی آواز اور کیفیت نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ آواز کیسی تھی' یہ میں بیان نہیں کر سکتا' یہ بتا سکتا ہوں کہ میری آنکھیں چڑھنے لگی تھیں۔ میں اپنے سینے میں بل سے پڑتے محسوس کر رہا تھا اور یہ بل پڑتے یہ بل تکلیف دہ نہیں تھے بلکہ بڑے سرور انگیز تھے۔ مجھ سے یوں اکڑوں بیٹھا رہنا دوبھر ہو گیا۔ میں [illegible] پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں' میں نے زمین پر ٹکا ہوا ہاتھ اٹھایا تو اپنے ہاتھ پر تین چھوٹی چھوٹی کھوپڑیاں کو چمٹا دیکھا۔ اس وقت نہ میں خوفزدہ ہوا اور نہ ہی میں نے جھٹکنے کی کوشش کی بلکہ اچانک ہی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اس سرور انگیز کیفیت کا سبب یہی کھوپڑیاں ہیں۔

ان کے حلقوں میں چمک دار آنکھیں گردش کر رہی تھیں اور میری انگلی پر لگا وہ تمام خون جو کوثر کے زخم سے لگا تھا صاف ہو چکا تھا۔ اس وقت میں یہ دیکھ کر بھی حیران نہیں ہوا کہ وہ کھوپڑیاں صرف آنکھیں ہی نہیں زبان بھی رکھتی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سرخ زبانیں میری انگلیوں کو چاٹ رہی تھیں اور مجھ پر نشہ سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ لذت آمیز آواز جس نے مجھے بے قابو کر دیا تھا وہ میری انگلیوں سے لہو چاٹنے کی آوازیں تھیں۔ میں بے خود ہوتا جا رہا تھا۔ اب نہ مجھے کوثر یاد تھی اور نہ سادھو۔ میں تو خود سے بھی بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ پھر اسی طرح زمین پر ٹکا دیا۔ اب مجھے وہ خوفناک انسانی کھوپڑیاں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ میں انہیں ہاتھ سے جدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"یہ لو وکارالحسن۔ اور لو۔ اچھا لگ رہا ہے ناں۔ یہی جیون ہے۔ لذت ہے' اس کے بنا کچھ بھی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پیالے میں بھرا خون میرے ہاتھ پر انڈیل دیا۔ اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے گرد گھنگرو سے بجتے محسوس ہو رہے تھے۔ دبی دبی نسوانی ہنسی کی آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ ان دونوں آوازوں کے پیچھے کہیں دور سادھو کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میں خود کو کسی ایسے سمندر میں ڈوبتا محسوس کر رہا تھا جس میں سوائے لذت کے کچھ بھی نہ تھا۔

○

میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں' میں شاید گہری نیند سے اٹھا تھا۔ چند لمحے تو میں یونہی لیٹا چھت کو تکتا رہا پھر اچانک ہی اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میں جس کمرے میں تھا وہ کسی محل کا کمرا لگ رہا تھا۔ اس کی دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کے ریشمی پردے پڑے تھے۔ میں ایک خوب صورت چھپر کھٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس چھپر کھٹ پر نیلے رنگ کا ایک جالی دار کپڑا پڑا تھا۔ نرم گدا اور نرم پروں والے تکیے تھے۔ دیواروں پر خوب صورت عورتوں کی قد آدم تصویریں لٹک رہی تھیں جن کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ دیواروں پر پڑا نیلا جالی دار ریشمی پردہ ہی ان کے بدن کی عریانیت چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں شمع دان رکھے تھے جو سنگ مرمر کے تھے ان میں مشعلیں روشن تھیں۔ کوئی کھڑکی نہ ہونے کے باوجود پردا اور چھپر کھٹ پر پڑا جالی دار کپڑا اڑ رہا تھا جیسے ہوا اس کی زد پر ہو۔

میں پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا پھر اچانک ہی میری نگاہ اپنی پشت پر' بستر پر بکھرے جسم پر پڑی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے میں پہلے تصور میں سادھو کے ساتھ پھریالیکا مندر کے سامنے اور اب پھر سادھو کی بانہوں میں دیکھ چکا تھا۔

وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے لمبے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر وہی باریک کپڑے کا لبادہ تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ میں کچھ دیر پہلے اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ یہ جتنا عرصہ گزرا تھا میری یادداشت سے محو ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں یہاں کیسے اور کیوں کر پہنچا۔ میرے ساتھ کیا ہوا۔ وہ لڑکی یہاں کیسے آئی' اور۔ اور کوثر۔ کوثر کا خیال آتے ہی میں گڑبڑا گیا۔

مجھے یاد آگیا کہ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ سادھو اسے لہو چٹا رہا تھا اور وہ۔ وہ کھوپڑیاں۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ دیکھا۔ کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ میں نے گھوم کے کمرے میں دروازہ تلاش کرنا چاہا مگر وہاں دروازہ تو کیا کوئی کھڑکی یا روشن دان بھی نہ تھا۔ چمپا اب بھی بکھری ہوئی بستر پر پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا سکون تھا۔ اس کا مرمریں بدن اور ملکوتی حسن دیکھ کر میرا ایمان ڈول رہا تھا۔ ایسی پریشانی اور گھبراہٹ میں بھی جب میری نگاہ اس کے بکھرے ہوئے بدن پر پڑتی تو دماغ میں دھواں سا بھرتا محسوس ہونے لگتا۔ میں نگاہیں چرا لیتا مگر پھر یہاں قید ہو جانے کے احساس نے مجھے گھبرا دیا۔ اس بار میں نے چمپا کا پھیلا ہوا ہاتھ پکڑ کر ہلا دیا۔

پہلے تو اس نے بڑبڑا کر کروٹ لے لی پھر اچانک ہی چونک کر سر اٹھایا' میری طرف پلٹی اور پھر تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف بھر گیا۔ اس نے بستر کی چادر گھسیٹ کر اس سے اپنا بدن ڈھانپ لیا۔ وہ اس قدر سہمی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے میں کوئی گدھ ہوں اور موقع ملتے ہی اس پر جھپٹ پڑوں گا۔

میری پوزیشن بھی اس وقت کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں

ایک کمرے میں اس کے ساتھ قید تھا۔ شاید رات گزر چکی تھی اور کمرے میں ایک ہی بستر تھا۔ اس نے ایک۔ عرکو گھبرائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور دھیرے سے پیچھے سرک گئی۔

"چمپا!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میں۔ میں اور تم۔ یہاں کیسے اور کب آئے۔ ہمیں یہاں کون لایا اور۔۔" میں نے تیزی سے کہنا چاہا۔ شاید میں اس کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ "یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔" میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ میں اس کا خوف نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی سہمی ہوئی تھی۔ "کیا تم جانتی ہو کہ۔۔"

"نہیں۔۔" وہ گھبرا کر بول اٹھی۔ "میں۔ مجھے یہاں کون لایا تھا؟"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ "میں تو کوثر کو دیکھ رہا تھا پھر۔ پھر مجھے نہیں پتا چلا کہ مجھے کیا ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہوش آیا ہے۔ میں خود حیران ہوں۔ مجھے کوثر کی طرف سے بھی سخت پریشانی ہے اور۔۔"

معاً مجھے اس کا خیال آیا۔ میں تو اس کی طرف سے کافی پریشان تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ سادھو تک کیسے پہنچی یا۔ یا وہ کل بالیکا مندر میں کیا کر رہی تھی؟ میں اسے پہلے بھی سادھو کے پاس دیکھ چکا تھا، میں اس کی تصدیق بھی کرنا چاہتا تھا تبھی میں نے پوچھا۔

"تم کون ہو اور۔ یہاں کیسے پہنچی ہو؟"

"میرا سمندھ جے پور سے ہے۔ میں جوگندر ناتھ سوامی جی کی نواسی ہوں۔ میں تو اس روز نانی کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ شاید کہیں آگ لگی ہوئی تھی، مجھے ہوش نہیں رہا تھا پھر ہوش آیا تو۔ تو میں اس بدصورت اور بدہیت بڈھے کی بندی تھی۔ وہ مجھ سے میری موسی شکنتلا کے ماتھے کی پٹی مانگتا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے اس کے بدن سے چھوا ہوا کوئی زیور چاہیے۔ وہ تو بہت پہلے سورگ باشی ہو چکی تھیں۔ میں نے تو انھیں دیکھا بھی نہیں۔ ان کا کوئی زیور بھی نہیں ہے، پر وہ مجھے نہیں چھوڑتا۔"

وہ بڑی معصومیت سے بتا رہی تھی اور میں حیرت سے س۔۔ رہا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں اچانک ۔۔ دا اقات جوگندر ناتھ سوامی جی کے کسی رشتہ دار سے ہو جائے گی۔ مجھے سادھو کی خباثت پر بہت غصہ آیا۔ شکنتلا کو قابو کرنے کے لیے پاگل پن کی اس حد تک جائے گا' اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ وہ جے پور تک پہنچ گیا تھا۔

بہرحال میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ اب میں ابا سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کر سکتا تھا۔ ابا نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ میں سوامی جی کو یا سوامی جی کے کسی بھی رشتے دار کو ڈھونڈ کر اور مجسمہ دے کر مرزا صولت بیگ کے گناہوں کا بوجھ اور اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لوں مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ کڑا اور مجسمہ سادھو حاصل کر چکا تھا۔ سوامی جی کی نواسی مل بھی گئی تو ۔۔۔ میں۔

"سوامی جی کہاں ہیں؟" میں نے چھوٹتے ہی سوال کر لیا۔

"نانی کہتی ہیں کہ وہ کہیں چلے گئے تھے۔ کئی برس پہلے جب میں بہت چھوٹی سی تھی تب وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے پھر لوٹ کر نہیں آئے۔" اس نے چادر کو اپنے بدن پر لپیٹے ہوئے کہا۔

ایسا کرتے ہوئے اتفاقاً اس کی پشت میری جانب ہوئی اور میں نے اس کی پشت پر، دونوں کندھوں کے درمیان خدی سے ذرا نیچے گہرے نیلے رنگ میں خدا ہوا بچھو کا نقش دیکھ لیا۔

"یہ۔ یہ تمھاری پشت پر کیا ہے؟"

"کہاں۔۔؟"

اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ میں اسے بتا کر پریشان کروں گا تبھی میں نے بات پلٹ دی اور کہا۔ "نہیں کچھ نہیں۔ ایسا لگا تھا جیسے کچھ ہے۔"

"یہ۔ سادھو جادو کر رہے کیا؟ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔" یہ کہتے کہتے وہ ایک دم رو پڑی تھی۔

"کل مندر میں۔ بالیکا مندر میں تم ہی تھیں؟" میں نے اس کی بات کو نظرانداز کر کے کہا۔

"نہیں۔۔ میں تو بہت دنوں سے یہاں بندی ہوں۔"

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے مندر میں اسے بہت قریب سے دیکھا نہیں تھا بلکہ بات بھی کی تھی۔ سو یہ وہی تھی مگر میری بات سے انکار کرتے ہوئے اس کے ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں سچائی اور معصومیت تھی۔ ۔۔۔ خیال ہوا کہ ممکن ہے وہ بھی اسی طرح ۔۔ وا لے ۔۔۔ سے ناواقف ہو جیسے میں اس بات سے نا۔۔ تھا ۔۔ یہاں اس کمرے میں' اس کے پاس کیسے پہنچا۔

"۔۔ تم نے شکنتلا کو نہیں دیکھا تھا؟" میں نے پھر سوال ۔۔ اب میں بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

"نہیں۔ نانی ماں کے پاس ایک بہت پرانی تصویر ہے مگر ۔۔ دھندلی ہے۔ اس وقت موسی چھوٹی تھی' وہ دیکھی ۔۔ نے۔" اس نے پھر معصومیت سے جواب دیا۔

"دیکھو چمپا۔ میں بھی تمھاری طرح اس سادھو کی قید ۔۔ں۔ میں سوامی جی کو جانتا ہوں۔ میں تو ان کے پریوار ۔۔ش میں تھا۔ میں شکنتلا کو بھی جانتا ہوں۔ میں تمھیں ۔۔ سے نکال دوں گا مگر اس کے لیے تمھیں میرا ساتھ دینا ۔۔"

"میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تم سے بنتی ہوں کہ مجھے یہاں سے نکال دو۔ میری ماتا جی تو ۔۔ کر لیں گی۔ جے پور میں بڑی بدنامی ہو گی ہمارے ۔۔ کی۔"

پھر رو پڑی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے بہتے ۔۔ میرے دل پر تیزاب کی بوندوں کی طرح گرتے محسوس ۔۔

۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ اٹھا کر اس کے صبیح ۔۔دں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کے قطروں کو اپنی انگلیوں ۔۔دں پر تھام لیا۔ وہ اب مجھ سے مانوس ہو چکی تھی۔ ۔۔ نہ وہ سہمی اور نہ سمٹی بلکہ نگاہیں جھکائے بیٹھی رہی۔ ۔۔ لمحے اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھتا رہا۔ مجھے ۔۔ رہا تھا جیسے اس کا یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں بلکہ ۔۔ دیوں سے اس سے واقف ہوں۔ ممکن ہے اس میں ۔۔ کی شباہت ہو۔ اس وقت شکنتلا کا چہرہ مجھے یاد نہیں ۔۔

"یہ موسی کا زیور کیوں مانگتا ہے۔ یہ موسی کو کیسے جانتا ۔۔" وہ پھر سر اٹھا کر مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ تمھیں ابھی نہیں پتا چلے گا چمپا۔ میں تمھیں سب ۔۔ بتا دوں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی وقت نہیں آیا۔"

"اور۔ یہ کوثر۔ یہ کون ہے تمھاری؟"

۔۔ میں نے اسے کوثر کے بارے میں بتایا۔ وہ آنکھیں ۔۔ تی رہی پھر بولی۔ "اس نے یہ سب کچھ کیوں

۔۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی لیکن میں پھر کوثر کے بارے میں پریشان ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں دیواریں ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ تمام دیواریں سپاٹ تھیں۔ کہیں ایسی کوئی جگہ نہ تھی جسے میں کھڑکی یا دروازہ سمجھتا میں حیران تھا کہ کوئی روزن نہ ہونے کے باوجود ہوا کے فراٹے چل رہے تھے۔ سانس لینے میں بھی قطعی کوئی دشواری نہ تھی۔ چمپا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے پہلی بار ہوش آیا ہو' وہ اپنے بدن پر باریک لبادہ دیکھ کر خاصی شرمندہ تھی۔ اس نے بستر کی چادر کو ساری کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ وہ بھی چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھ رہی تھی۔

اچانک ہی کسی بڑے اور بھاری دروازے کے چرچرانے کی آواز گونجی۔ میں اور چمپا دونوں اچھل پڑے۔ ہماری پشت پر' دیوار میں لگا سیاہ دروازہ کھل گیا تھا۔ میں اور چمپا حیرت سے اس دروازے کو دیکھ رہے تھے' جواب سے پہلے ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ چند لمحے پہلے ہی تو میں اس دیوار کو ٹٹول چکا تھا۔ وہاں کوئی دروازہ تھا نہ کوئی جھری اور اب وہاں اتنا بڑا سیاہ دروازہ موجود تھا۔ میں آگے بڑھا۔ میرے پیچھے چمپا بھی تھی۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دروازے کے دوسری طرف گہرا اندھیرا تھا۔ چمپا کافی ڈری ہوئی تھی۔ وہ اب میرے بالکل پیچھے تھی۔

اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ میری پشت سے ٹکرا رہے تھے اور میرے بدن میں لہریں سی ہلکورے لے رہی تھیں۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے دور رہے مگر کہہ نہیں پایا' پھر میرا دھیان دروازے کی طرف بھی تھا۔ اچانک یوں لگا جیسے تیز چلتی ہوئی ہوا ایک دم رک گئی ہو۔

فضا بوجھل ہو گئی تھی حبس چھا گیا تھا اور گہرا سناٹا میرے وجود میں بے چینی سی بھرنے لگا تھا۔ یہی خوف شاید چمپا کے وجود میں بھی اتر چکا تھا۔ اب اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ہم دروازے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا۔ شاید اسی لمحے چمپا کی نگاہ بھی اس منظر کو دیکھ چکی تھی اس لیے کہ میرے ہونٹوں سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ میں اس کی دہشت زدہ کر دینے والی چیخ بھی شامل تھی۔ میں نے پیچھے کی طرف ہٹنا چاہا مگر چمپا میرے پیچھے ہونے کی وجہ سے میرے بدن سے ٹکرا کر دروازے کے بیچ گری اور میری سانسیں رکنے ۔۔ میں اتنا

وقت نہیں تھا کہ میں اسے اٹھاتا مگر اسے چھوڑ دیتا تو خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا اس لیے میں نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا تبھی مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ چمپا کا بدن اچھل کر دروازے کے باہر جا پڑا اور دہشت سے میری آنکھیں ابلنے لگیں۔

وہ منظر ایسا تھا کہ میرے حواس معطل ہو گئے۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ اگر آپ دیکھ لیتے تو شاید ہمیشہ کے لیے اپنے حواس کھو چکے ہوتے اس لیے کہ چمپا آج تک ٹھیک نہیں ہو سکی۔ ہوا یہ تھا کہ جونہی دروازہ نمودار ہوا میں نے آگے بڑھ کر باہر دیکھنا چاہا۔ میرے بالکل پیچھے چمپا بھی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا اور میدان کی زمین ان زندہ کھوپڑیوں سے پٹی پڑی تھی۔ رینگتی کلبلاتی ہزاروں کھوپڑیاں ایک انسانی جسم سے چمٹی ہوئی تھیں اور وہ جسم ــــــ وہ جسم اس برٹش آدمی کا تھا جس سے میں مندر کے باہر والے چائے کے ہوٹل کے مالک کی حیثیت سے مل چکا تھا۔ وہ منظر اس قدر ہیبت ناک تھا کہ میں پاگل سا ہو گیا تھا۔ ان کھوپڑیوں کی ننھی منی زبانیں اس شخص کے جسم کو چاٹتی تھیں تو کھال یوں اتر جاتی تھی جیسے وہ زبانیں نہ ہوں بلکہ بلیڈ ہوں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خون کے ذرے نمودار ہوتے اور پھر ان زبانوں کی حرکت تیز ہو جاتی۔ اس کا تمام بدن لہولہان تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، حلق سے چیخوں کی بجائے غرغراہٹ سی نکل رہی تھی کیونکہ کھوپڑیاں اس کی گردن سے بھی چمٹی ہوئی تھیں۔ وہ زندہ تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی وحشت، کرب اور حیرت جمی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر رینگتی کھوپڑیاں اسے دھیرے دھیرے ختم کر رہی تھیں۔

ایسی اذیت ناک موت کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں خوف زدہ ہو کر پلٹا تو چمپا مجھ سے ٹکرا کر گر گئی۔ میں نے بھاگنا چاہا تھا مگر میں اسے یوں چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر بھاگتا بھی کہاں۔ چمپا کی خوف ناک چیخوں سے سارا کمرا گونج رہا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا تب میرے بدن کو زبردست جھٹکا لگا اور نہ معلوم کیسے وہ اچھل کر باہر جا گری۔ کھوپڑیوں میں جیسے ہلچل سی مچ گئی۔ جن کھوپڑیوں کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں چمپا کے بدن سے ٹکرائیں۔ وہ اس کی جانب لپکنے لگیں۔ چمپا شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا بدن ساکت تھا۔

کھوپڑیوں کا ایک ہجوم تھا جو دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں ایک ہی چھلانگ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی تیزی سے ہمارے قریب پہنچ سکتی ہیں مگر کھوپڑیاں حیرت انگیز رفتار سے میرے قریب پہنچ گئیں۔ اپنے پیروں کے قریب ان کی سرسراہٹ سن کر میں نے دروازے کے اندر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چمپا سمیت فرش پر آ گرا۔ اس دوران میں آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میں بھول رہا ہوں۔ میں نے سنہرے بابا والا عمل پڑھنا چاہا تو وہ بھی نہ پڑھ سکا۔ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر میں اور حواس باختہ ہو گیا۔ اسی دوران میں میں نے چمپا کو اٹھا کر پلنگ پر ڈالا اور خود پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

کھوپڑیاں اندر نہیں آ سکی تھیں مگر دروازے کے قریب ٹھہری ہوئی اپنی سیاہ پتلیوں کو تیزی سے حلقوں میں گھما رہی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اندر کیوں نہیں آ رہی ہیں مگر یہ دیکھ کر میں مطمئن ضرور ہو گیا تھا۔ اب میں نے دروازے سے آگے بڑھ کر پھر اس برٹش کی طرف دیکھا جو اب لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا بدن یوں ادھڑا ہوا تھا جیسے اس پر گدھوں نے حملہ کر دیا ہو۔ کھوپڑیاں اب بھی اس کے [illegible] ہوئے بدن سے چمٹی ہوئی تھیں۔

اس کی ٹانگوں کا تمام گوشت اور خون صاف ہو چکا تھا۔ ہڈیاں بالکل خشک اور سفید لگ رہی تھیں۔ پیٹ پر اب بھی کچھ گوشت اور خون موجود تھا اور اب کھوپڑیاں اس کے بدن کے اس حصے پر چمٹی ہوئی تھیں جہاں گوشت اور خون نظر آ رہا تھا۔ ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ جب میں چمپا کو اٹھا رہا تھا اس وقت [illegible] لذت آمیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں بلکہ لذت آمیز آوازوں کا ایک طوفان تھا مگر جیسے ہی میں اسے لے کر کمرے میں داخل ہوا، آوازیں حیرت انگیز طور پر بند ہو گئیں اور اب بھی مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جبکہ خون اب بھی چاٹا جا رہا تھا۔

اس سے قبل جب میں نے کمرے سے باہر جھانک کر دیکھا تھا تب مجھے اس برٹش کے حلق سے نکلنے والی غرغراہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ گویا کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ بہرحال اس وقت تو ان چکروں میں پڑنے کا وقت [illegible]

یہ سب باتیں تو بعد میں سمجھ میں آئی تھیں۔ میں کھوپڑیوں کی طرف سے مطمئن ہو کر چمپا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

وہ بے ہوش تھی۔ اس کا چمپئی رنگ زرد بلکہ ہلدی ایسا ہو رہا تھا۔ وہ بستر پر ایسے بکھری پڑی تھی جیسے اس کے اعصاب ہی نہیں بدن بھی ٹوٹ پھوٹ چکا ہو۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے مجھے پانی کی ضرورت تھی۔ خود میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا ایک تپائی پر زردی مائل کوئی مشروب رکھا تھا۔ وہ کانچ کی خوب صورت صراحی میں تھا۔ اس کے قریب ہی کانچ کے پیالے بھی رکھے تھے۔ میں تیزی سے اس تپائی کی طرف بڑھا۔ صراحی کو انڈیل کر میں نے مشروب کو پیالے میں ڈالا تو مجھے ابکائیاں سی آنے لگیں، وہ جانے کیا چیز تھی۔ گاڑھا سا سیال تھا جس میں چاول کے برابر سفید رنگ کے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے پیالے کو زمین پر پٹخ دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سادھو کیا چاہتا ہے۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوال تھے جو جانے کب سے میرے دماغ میں پک رہے تھے۔ جب کسی سوال کا جواب مجھے ملتا۔ ایک نئی بات ایک نئے سوال کا سبب بن جاتی تھی۔ وہ پاگل چاہتا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا۔ وہ ناگپا جادوگر کا پیش بند چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے کٹھنائیوں میں پڑ کر کوثر کو قابو کر لیا تھا۔ وہ اس کی قیدی تھی۔ کچھ اور دوشیزائیں اس کی قید میں تھیں پھر اب آخر وہ کیا چاہتا تھا؟

اب کچھ سوچنے اور اس کا جواب حاصل کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں یہاں سے نکلنے کی سبیل کرنا چاہتا تھا۔ باہر نکلنے کا راستہ مل چکا تھا مگر اس طرف سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں اپنی آنکھوں سے اس کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ جس وقت میں کھنڈر میں داخل ہونے کے لیے سرکنڈوں کا جنگل عبور کر رہا تھا، اس وقت میں نے کسی کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ وہ یقیناً "یہی برٹش تھا" جسے تجسس اور پراسراریت سے لگاؤ نے اس کی جان لے لی تھی۔ ممکن ہے اس نے مجھے اندر جاتے دیکھا اور یہ سوچ کے لیے کہ میں اتنی رات کو اور اس قدر سردی میں کہاں جا رہا ہوں، میرا تعاقب کرنے کی کوشش کی ہو۔

بہرحال اس کی موت یوں لکھی تھی سو آ گئی۔ میرے مقدر میں بھی جو لکھا گیا تھا اسے پورا ہونا تھا مگر میں یہ سوچ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ چمپا ابھی تک بے ہوش تھی۔ اس کا ہوش میں آنا ضروری تھا۔ میں نے اس کے رخسار کو ہلکے ہلکے تھپتھپایا، اسے آوازیں دیں۔ اس کی قربت اور اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو مجھے مدہوش کیے دے رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اس کے مرمریں بدن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لہو چاٹنے کی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں جنھوں نے میرے وجود میں ایک طوفان سا کھڑا کر دیا۔ اس کے خوب صورت چہرے کے گرد بکھرے ہوئے سیاہ بال میرے بدن میں سنسناہٹ سی بھر گئے۔ اس کا لمس بجلی بن کر میری نس نس میں دوڑ گیا۔ اور پھر ــــــ پھر میں کسی شیطان میں تبدیل ہو گیا۔

میں نے وہ گناہ کیا جس کا میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے اندر رنگین دائروں کا رقص ہوتے دیکھا۔ ہزاروں ستارے اپنے دماغ میں ٹوٹتے اور لذتوں کے دریا کو اپنی نسوں میں بہتے محسوس کیا۔ یہ وہ کیفیت تھی جسے میں اب سے پہلے نہ سمجھ پایا تھا اور نہ بیان کر سکتا تھا۔ وہ موم کا پتلا بنی پڑی تھی اور میں بپھرے ہوئے طوفان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کتنا وقت گزرا ــــ میرے گرد کیا تھا؟ کون سا خوف میری گھات میں بیٹھا تھا۔ باہر پڑی لاش کا کیا حشر ہوا؟ وہ آدم خور کھوپڑیاں کہاں تھیں، کیا کر رہی تھیں، مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ مجھے تو بس یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی جادوئی قالین پر بیٹھا بادلوں میں سفر کر رہا ہوں۔ میرے دماغ کے افق پر قوس قزح بکھری ہوئی تھی، روح میں جلترنگ بج رہے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ بہتے ہوئے وقت کے کتنے دھارے تھے، جو مجھے کہاں سے کہاں لے آئے۔ میری دھندلائی ہوئی آنکھوں میں دھیرے دھیرے روشنی کی کرنیں واضح ہوئیں تو سامنے کے مناظر آنکھیں جھپکتے محسوس ہونے لگے۔ میں نے کئی بار سر کو جھٹکا۔ میں ہوش کی دنیا میں آنا چاہتا تھا مگر اس کا مخملی بدن، اس کا لمس، اس کی قربت کی لذت مجھے یوں اپنے اندر کھینچ رہی تھی جیسے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے والے شخص کو بھنور اپنے اندر کھینچتا ہے۔ میری تمام حسیں جیسے ایک نقطے پر مرکوز تھیں، وہ تھی حس لامسہ اور بس۔

"بدھائی ہو وکار الحسن ــــ بدھائی ہو۔"

کہا تھا کہ کوثر لوٹ آئے گی' اور یہ بھی کہ کوثر کی مدد میرے لیے مشکلات کو آسان کردے گی۔ کوثر کا خیال آتے ہی میں نے سر اٹھا کر سادھو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "سادھو۔ کوثر کہاں ہے؟" میں بولا تو لمحہ بھر کو خود ہی چونک اٹھا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی اور بولا ہو۔ ملتجی اور کھسیائی ہوئی آواز میں۔ یہ میرا لب و لہجہ قطعی نہیں تھا۔

"دھیرج رکھ بالک۔۔۔ وہ سکوشل ہے ٹھیک ہے۔ ابھی وہ اچیت ہے اس کا دماگ چکرایا ہوا ہے۔۔۔ ٹھیک نہیں ہوا ہے پرنتو وہ پہلے سے اچھی ہے۔۔۔ بہت اچھی۔"

پھر وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا جو سہمی ہوئی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ اچانک اسے جھنجھوڑنے لگا تھا۔ اس کے کاندھے پر بیٹھی کھوپڑیاں اس حرکت کی وجہ سے نیچے گر گئی تھیں۔ ایک کھوپڑی جو الٹی گری تھی وہ ویسے ہی ساکت رہ گئی تھی جبکہ دوسری کھوپڑیاں جو سیدھی گری تھیں' دھیرے دھیرے رینگنے لگی تھیں۔ اس بار بھی مجھے ان سے خوف محسوس نہیں ہوا بلکہ انھیں رینگتے دیکھ کر یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ کاش میرے بدن پر کہیں' یا کسی اور کے بدن پر خون لگا ہوتا۔ وہ اسے چاٹتیں اور۔۔۔ اور۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا تھا کہ سادھو کی تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بالک۔۔۔ تجھے بھوک نہیں لگی۔۔۔ تو کتنے دن کا بھوکا ہے۔"

"گھر سے چلتے ہوئے کھانا کھایا تھا۔" میرے منہ سے وہی نرم اور ملتجی سی اجنبی آواز نکلی۔

جواب میں نے اس نے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ہونقوں کی طرح سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تو۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو چار روز سے بھوکا ہے۔" اس نے ہنسی کے دوران میں کہا۔

"کیا۔ کیا۔۔۔ میں چار۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ بالک تجھے یہاں آئے چار روز ہو گئے۔"

یہ سن کر میں اچھل ہی پڑا تھا۔ میرے حساب سے تو ابھی صرف ایک ہی رات گزری تھی۔ کل ہی تو میں یہاں آیا تھا' اور۔۔۔ میرے تعاقب میں وہ برٹش بھی۔۔۔ جسے آج ان کھوپڑیوں نے نوچ ڈالا تھا۔ "نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ کل آیا

تھا میں۔ اور سنو' تم مجھے کمزور مت سمجھنا۔ کمزور نہیں میں۔ تمھاری یہ سب۔۔۔ یہ سارے ہتھکنڈے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے جو گناہ کیا ہے اسے ... میں۔۔۔ میں اس کے لیے۔۔۔" پتا نہیں میں کیا کہہ رہا تھا۔ میرے اندر کی کمزوری بہ ظاہر میرے سینے کو ... مجھے کچھ نہ کچھ کہہ دینے کو اکسا رہی تھی۔

"سن وکار الحسن۔۔۔ تجھے سوچنا چاہیے۔۔۔ یہ بدن' یہ چوڑے چکلے کاندھے۔ یہ مستی بھرا ... اتنا مضبوط بدن۔ تجھے نہیں پتا کہ ایک کنواری لڑکی کو ... کتنا اچھا لگتا ہے۔ کیا۔۔۔ کیا رکھا ہے اس ... سوکھی سڑی اور پیلی آنکھوں والی وہ مورکھ سی ... لڑکی۔ جس کے بدن پر ماس ہی نہیں۔ ہڈیوں کا پنجر ... تیرے ایسے جوان کے ساتھ رہی تو ایک ہفتے میں روگی بن جائے گی۔ چھوڑ دے اسے۔۔۔ بھول جا ... آغوش ہر رات ایک نئے کھرانے سے بھری ... وچن ہے میرا' لے یہ۔۔۔ بھی لے لے۔" اتنا کہہ ... اپنے پہلو میں سمٹی اس معصوم سی لڑکی کو میری ... دھکیلا۔ دیکھ۔ یہ۔۔۔ اس کا رنگ ہی نہیں' آنکھ ... سنہری ہیں' کندن ایسی اور خوشبو چندن ایسی۔" ... اپنے پہلو میں سمٹی معصوم اور حسین سی لڑکی کے ... کو پکڑ کر پھر میری طرف دھکیلا۔

لمحہ بھر کو میرا دل پھڑپھڑایا۔۔۔ جیسے کوئی پنچھی ... سے نکلنے کو بے چین ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں ... پر قابو پا لیا۔ میرے اندر کی لپک' اندر ہی گھٹ کر ... یوں لگا تھا جیسے میرے بدن میں سے ایک سایہ سا نکل ... لڑکی کی طرف لپکا ہو۔ مجھے اپنے آپ میں تبدیلی ... سے احساس ہو رہا تھا مگر میں شاید خود پر قادر نہیں ... میں سادھو کے سامنے کسی غلام کی طرح بیٹھا تھا ... تھا' کندھے چوڑے کرکے' آواز کو پہلے کی طرح کر ... کر بات کرنا چاہتا تھا مگر بے بس تھا۔

میرے پیچھے چمپا اب تک بے سدھ پڑی ... سانسیں لے رہی تھی۔ اب میں اسے ہوش میں لانا چاہتا تھا شاید میرے اندر کا مجرم مجھے ایسا کرنے ... رکھ رہا تھا۔ میں اس جانب سے نگاہیں چرائے ہو ... اس سے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا ... کی کشمکش سے نڈھال ہو چکا تھا۔ میرے اندر دو ...

... نرم و ملائم لمحوں میں سادھو کی کریہہ آواز نے ... میں جیسے دراڑیں سی ڈال دیں۔ مجھے لگا جیسے ... مجھے اچانک زمین پر پٹخ دیا ہو۔ یہ آواز سن کر ایک ... رہ گیا۔ اچانک احساس ہوا کہ میں جن لمحوں سے ... وہ صرف میرے جینے کا راز نہیں ہیں۔ دو ... آنکھیں بھی ان لمحوں کی گواہ ہو چکی ہیں۔ میں ... ہوش میں آ گیا' اور یہ دیکھ کر میرے بدن سے ... گئے کہ جس بند کمرے کو میں اپنا رازدار بنا بیٹھا ... کمرا نہیں بلکہ اسی بڑے ہال کا ایک کونا تھا جہاں ... سادھو' چمپا کی بجائے ایک اور معصوم سی لڑکی کو ... لیے سوکھے بازوؤں میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ دیواروں ... تصاویر' وہ ہلکے نیلے رنگ کی جالی دار پردے' ... اطراف کی دیواروں پر اب بھی سرسرا رہے ... اسی طرح چھپر کھٹ پر بے حس و حرکت بکھری سی ... میرے سامنے کی دیوار البتہ ہواؤں میں تحلیل ... اور اب پچاس قدم کے فاصلے پر سادھو اپنے ... انداز میں بیٹھا تھا۔

... سے بھرا ہوا پیالہ اب بھی اس کے سامنے رکھا ... میں سے اب تک بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے ... کاندھوں پر چار چھوٹی چھوٹی انسانی کھوپڑیاں یوں بیٹھی ... کوئی کبوتر کو بٹھا لیتا ہے۔

... جیون ہے۔۔۔ یہی۔۔۔ وہ آنند مئی چھن جو تم ... ہوئے ہو یہی جیون کا امرت ہے۔ یہی کچھ میں بھی ... چاہتا ہوں۔ میں بھی تو ایک جیتا جاگتا پرش ہوں' ... میرا بھی تو ادھیکار ہے' حق ہے۔ ایسا ہی بادلوں ... ہوا شریر اس کا بھی ہے' لذتوں کے جھرنے اس ... رہے ہیں وکار الحسن۔ میں اپنی چیز کسی کو دینے کا ... ہوں' پرنتو چمپا کو میں نے تجھے دان کیا ... ہے؟ جانتا ہے کیوں؟"

... کو ٹھہرا' اس نے سر گھما کر اپنے پہلو میں سمٹی ... کے چہرے کو اونچا کیا' پھر اپنے میلے' موٹے ... سیاہی مائل ہونٹوں کو اس کے نرم و ملائم ... پر رکھ دیا۔ میں نے اس لڑکی کی شفاف آنکھوں ... سی بل کھاتی محسوس کی اور میرا دل اسے ... آغوش سے کھینچ لینے کو چاہا۔

... مورکھ کہ تو جان لے۔۔۔ سب کچھ جان لے۔

یہ بھی جان لے کہ تیرے دھرم والے تجھے مٹی کا مادھو بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ کسی بے جان مورت کی طرح۔ اور تو جان لے کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ شکنتلا تو جان ہار چکی ہے۔ اس کا شریر تو پونم کی کرنوں میں پیلا ہو چکا ہے بالک۔۔۔! اس کے شریر کا سارا امرت کنویں کے گدلے پانی میں گھل چکا ہے' وہی امرت جو تیرے پر دادے نے اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا' چکھا بھی نہیں اور تو۔۔۔ تو جو گندر ناتھ سوامی کی نواسی کا سارا امرت پی چکا ہے۔ میرا ادھیکار مجھے دے دے مورکھ۔ مجھے دے دے۔ میں تیرے اوپر وہ سارے دوار کھول دوں گا جن پر تیرے دھرم والے تالے ڈال کر رکھتے ہیں۔ وہ سنہرا بڈھا۔"

"خبردار سادھو۔" میں سنہرے بابا کو اس انداز سے یاد کرنے پر سلگ اٹھا۔ اور تبھی مجھے لگا جیسے کسی نے میرے رخسار پر زوردار طمانچہ مار دیا ہو۔ میں پورا کا پورا گھوم گیا۔ مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ یوں لگا جیسے یہ طمانچہ خود سنہرے بابا نے مارا ہو۔

"بھول جا اب اسے۔۔۔ بھول جا۔ تیری دنیا بدل چکی ہے وکار الحسن!" اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آتی اور پھر دیواروں کی طرف لوٹتی محسوس ہوئی۔

میں نڈھال ہو گیا۔ پل بھر میں احساس گناہ نے مجھے جکڑ لیا۔ چمپا کی معصوم دوشیزگی' میرے حلق میں کانٹے کی طرح اٹک کر رہ گئی جسے میں تار تار کر چکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں سب کچھ ہار گیا۔ تباہ اور برباد ہو گیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں خالی ہاتھ' خالی دامن لیے کورے ذہن اور اپنی کوری آنکھوں کا کشکول لیے سادھو کے سامنے بیٹھا تھا۔ سادھو اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے خبیث چہرے پر پھیلا کراہیت آمیز تاثر کم ہو چکا تھا یا شاید میرے دیکھنے کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ مجھے اس وقت اتنا کریہہ نہیں لگ رہا تھا جتنا پہلے لگا کرتا تھا۔

"تو دلدل میں پھنسنے جا رہا ہے۔"

جن بابا کے تلخ لہجے کی کڑواہٹ میں نے اپنے حلق میں گھلتی محسوس کی۔ انھوں نے یہی کہا تھا۔ سنہرے بابا نے بھی کہا تھا مگر صرف اتنا کہ مقدر کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ تم مشکلات میں گھر سکتے ہو' اگر تم نے میری ہدایات کو نظر انداز کیا تو تم مشکلات میں پڑ جاؤ گے۔ انھوں نے یہ بھی

چاند کے قیدی

لڑ رہے تھے۔ ایک وہ جو کوثر کو رہائی دلانے کے لیے' اماں اور سنہرے بابا سے وعدہ کرکے آیا تھا اور ایک وہ جو چمپا کے بدن کا سارا امرت پی کر بھی اپنی تشنگی کو بڑھتا ہوا محسوس کررہا تھا اور سادھو کی خوب صورت باتوں کو اپنے لیے انتہائی اہم اور ضروری محسوس کررہا تھا۔ وہ محض سادھو کی ہر ہر بات پر کان دھرے تھا اور سوچ رہا تھا کہ واقعی شگفتہ میں ایسی کون سی بات ہے۔۔۔ اس کی آنکھوں میں سوائے شرم و حیا کے اور ہے ہی کیا۔ اس کے بدن پر تو صرف ایک ململ کا بڑا سا دوپٹا ہوتا ہے۔ چوٹیوں کی شکل میں گندھے ہوئے بالوں اور چمپا کے بکھرے ہوئے بالوں میں کس قدر فرق ہے' زمین آسمان جتنا۔

تبھی بے ساختہ میں نے نگاہ اٹھا کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے گھٹنوں تک آئے ہوئے لمبے سنہرے بال میرے سینے میں آگ سی دہکا گئے۔ اس کی لرزتی پلکوں پر ٹھہرے پانی کے قطرے شبنم کی طرح محسوس ہوئے اور یوں لگا جیسے سینے میں لگی آگ اور بھڑک اٹھنے کے باوجود مجھے ٹھنڈک پہنچا گئی ہو۔

"آؤ کار الحسن! بھوجن کرلو۔"

سادھو کسی شفیق بزرگ کا روپ دھار چکا تھا' یا مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چوکی پر دسترخوان بچھائے میرا منتظر تھا۔

"آجا کلپنا۔" اس نے لڑکی کو مخاطب کیا جو اب ایک طرف گردن ڈھلکائے بیٹھی تھی۔

"نہیں کھانا مجھے۔" جیسے ہزاروں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

میں بلا چوں و چرا اٹھ کر سادھو کے سامنے جا بیٹھا' یہ سن کر کہ میں چار روز سے بھوکا پیاسا تھا' میرے پیٹ میں بل سے پڑنے لگے تھے۔ میں نے اس لڑکی کلپنا کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ کھانا صرف ابلی ہوئی سبزیوں پر مشتمل تھا۔ بنا مسالے کی یہ ابلی ہوئی سبزیاں ایک عجیب سا مزہ دے رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں یہ نہ کھاتا مگر پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میری کوئی پسند ناپسند رہی تھی اور نہ میرے اندر کوئی تحریک تھی' کوئی خواہش' کوئی احساس۔۔۔ کچھ بھی نہ تھا۔ میں کسی روبوٹ کی طرح بیٹھا کھا رہا تھا۔ میرا ذہن کورے کاغذ کی طرح تھا۔ بالکل خالی' سادہ۔ مجھے تو یہ بھی خیال نہ آیا کہ وہاں بیٹھے بیٹھے یہ کھانا

کہاں سے آگیا' نہ سادھو وہاں سے ہلا تھا نہ کوئی ہال میں داخل ہوا تھا۔

کلپنا اب اوندھی پڑی رو رہی تھی۔ چمپا بے ہوش تھی یا۔۔۔ یا شاید مرگئی تھی۔ یہ خیال مجھے تھا مگر اس خیال پر میں نے اپنے اندر کوئی جذبہ م کیا تھا' نہ حیرت کا' نہ پریشانی کا۔۔۔ نہ یہ جان لینے تجسس ہی پیدا ہوا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی۔

میں یہ نہیں سمجھتا کہ سادھو نے مجھے قابو کر خیال یہ ہے کہ اس نے مجھ پر جو نفسیاتی حربہ است وہ غالباً "لوہا گرم ہونے کی وجہ سے کامیاب رہا تھا ہونے سے میری مراد میری عمر کے لحاظ سے خواہشات کا حملہ تھا جنھوں نے مجھے کمزور کردیا جس زمانے میں برائیوں کو تہس نہس کرنے کا ارا نکلا تھا' اس وقت میری عمر کی وجہ سے میرے ارا ہونے کا چانس کافی تھا۔ یہ فطرت انسانی ہے' خواہشات آدی کے اندر چھپے ہوئے شیطان کا سا کر اسے اندر سے کمزور کرتی ہیں۔ میرا دشمن میرے ہوتا تو میں اسے زیر کرلینے کا دعویٰ کرکے سرخرو جو دشمن میرے اندر چھپا ہوا تھا اس سے مقابلہ کر لیے مشکل ہوچکا تھا۔

سادھو نے بھی مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے میرے چھپے شیطان کو ابھار دیا تھا۔ اب میں لاشعوری طور چکا تھا کہ سادھو میرا دشمن نہیں ہے' کسی بھی لذتوں سے آشنا کرنے والا' اسے ایک ایسی رنگین لے جانے والا کبھی دشمن نہیں ہوسکتا' جو اس نے میں بھی نہ دیکھی ہوں۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ ا کے بعد مجھ سے کیا حاصل کرنے والا ہے۔ مجھ سے وجہ قطعی طور پر سامنے نہیں آرہی تھی۔

اس رات میں ہر طرح سے سیر ہوکر اسی چھپر سونے کے لیے لیٹا تو کچھ دیر کو یہ بھی سوچتا رہا کہ سا مجھ سے کیا چاہتا ہے' صرف پائل۔۔۔ جو میری نہیں شگفتہ کی ہے۔ اس شگفتہ کی جو مرچکی ہے۔ جس میرے پردادے' دادی اور ابا کو اپنے انتقام کا نشانہ وہ ناگیا جادوگر' کا پیش بند چاہتا ہے۔ جو نہ اب تک میں دیکھا تھا اور نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ اور کڑا حاصل کرچکا ہے' اسے میں واپس لینے کے

یں کھنائیوں میں پڑ رہا ہوں' اسے حاصل کرکے بھلا میں ا کرسکتا ہوں؟ کیا ضروری ہے کہ میں وہ چیزیں حاصل نے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں' پھر جو گندر سوامی جی کو تلاش کرنے کے لیے اپنی عمر کے قیمتی لمحے ائع کروں' ہزاروں تکلیفیں اٹھا کر وہ چیزیں صرف یہ کہنے ے لیے ان تک پہنچاؤں کہ ہاں جی۔۔۔ میرے پردادا آپ ے مجرم تھے۔ کیا ملے گا مجھے۔۔۔؟ شگفتہ حویلی چھوڑ چکی ے' پھر۔۔۔ اب کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟ میں کس لیے پاگلوں کی ح مارا مارا پھر رہا ہوں؟ صرف اس لیے کہ ابا نے مجھ ے وعدہ لیا تھا؟ میں کیا کروں ان سے کیے ہوئے وعدے کا' ہیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ اس راہ پر کون کون سی مشکلات را راستہ روکیں گی۔ انھیں کیا علم تھا کہ میں ان کا وعدہ ا کرنے کے چکر میں کئی عذابوں میں پھنس جاؤں گا۔

میں ہزاروں باتیں سوچتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یا کا سب سے چغد آدمی میں ہوں۔ کوثر اگر خود گھر سے ل کر ان چکروں میں پڑی تھی' خود اسے ہی جب اپنی اور اندان کی عزت کا کوئی احساس نہ تھا تو کیا ضروری تھا کہ ں اپنے جذبہ غیرت سے مغلوب ہوکر اپنی اچھی بھلی زندگی یہاں تاریک جنگلوں کی نذر کردوں۔

تایا اور تائی کی زندگی میں' ان کی قسمت میں بیٹی کی نامی اور جدائی لکھی تھی تو میں مقدر بدلنے والا کون ہوتا ں؟ اور تائی تو اپنے حواس میں ہی نہ تھیں ان کے لیے ب بیٹی کی بدنامی یا جدائی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ تایا ج نہیں تو کل صبر کرلیتے۔ کوثر کو آنا ہوتا تو آجاتی ورنہ ی غلطی کی سزا تو بہرحال اسے ملنا ہی تھی۔ ایسی ہی اروں باتیں تھیں جو میں صرف اور صرف اپنے آپ کو ل کرنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ اپنے احساس جرم کو ختم رنے کے لیے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ رنگین وادیوں نے مجھ میں ایک ور سا بنالیا تھا اور میں مسلسل اسی بھنور کی لپیٹ میں ا۔ میرے دماغ سے پونم کی رات کی تمام تباہ کاریاں مٹ ی تھیں۔ میں بھول چکا تھا کہ میں اور میرا خاندان چاند ے قیدی ہیں۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اب ایسی کوئی تباہ کن ات میرے گھرانا خاندان پر پھر اتر سکتی ہے۔ میں اس تباہ ن رات کو شگفتہ کے انتقام سے تعبیر کرتا تھا اس لیے ب اس کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی کیونکہ شگفتہ اب ادھوری قید میں تھی۔ اور میں کون سا اپنے زمانے کا ولی تھا

کہ دنیا بھر کی تکلیفیں دور کرتا پھرتا۔ ان باتوں کو سوچتے سوچتے مجھے نہ جانے کب گہری نیند آگئی۔ یہ میری زندگی کی بلکہ ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی گہری نیند تھی جس میں سرور بھی تھا اور اطمینان بھی' کسی بات کا خوف تھا نہ پریشانی۔ میں عرصے بعد ایسا ٹوٹ کر سویا تھا۔

ممکن ہے کہ آپ سوچیں' میں آپ کو یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں' سیدھی سادی کہانی سنادوں کہ پھر کیا ہوا' کوثر کیسے آزاد ہوئی؟ میں نے سادھو کا کیا حشر کیا' اس کے چنگار کو کیسے توڑا' آ کو کس طرح آزاد کروایا اور کس طرح امو بہ پہنچ کر شگفتہ سے شادی کی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سب اس کہانی کا اختتام جاننے کے لیے کس قدر بے چین ہیں مگر اپنی کہانی بیان کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ کو بتاسکوں کہ انسان کس طرح کمزور پڑتا ہے' کیسے اپنے اندر بیٹھے شیطان کے چنگل میں پھنستا ہے' کس طرح اس کے اندر پیدا ہونے والے جذبے اسے بے بس کردیتے ہیں اور پھر۔۔۔ پھر کس طرح وہ انھیں شکست دیتا ہے۔ پرہول راستوں پر قدم رکھ دینے کے بعد جو کٹھنائیاں جھیلتا ہے تو پھر واپس کس طرح لوٹتا ہے۔

میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ بڑے بڑے معرکے وہ اپنے ایمان سے کس طرح جیت لیتا ہے۔ خدا کی ذات پر یقین کیسے کیسے عذابوں سے رہائی کا سبب بنتا ہے اور وہ لوگ جو ایمان کی کمزوری کی وجہ سے خود کو برباد کرلیتے ہیں' ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ وہ جو چپکے چپکے وسوسہ ڈالنے والے شیطان کے بہکانے میں آجاتے ہیں' وہ کیسے راہ راست کو کھو دیتے ہیں۔

میں اس لمحے وہی تھا جو چپکے چپکے وسوسہ ڈالنے والے شیطان کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ شیطان کہیں باہر سے نہیں آتا' وہ انسان کے اندر چھپا بیٹھا رہتا ہے اور اس وقت اس پر حملہ کرتا ہے جب اسے کمزور پاتا ہے۔ میں کمزور پڑچکا تھا۔ ہار گیا تھا۔ خود سے لڑتے لڑتے نڈھال ہوچکا تھا سو اس نے موقعہ غنیمت جانا تھا اور مجھ پر مسلط ہوگیا تھا۔ اس نے میری فطری کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ عورت اور اس کی کشش ایک ایسی چیز ہے جس کے سامنے میری عمر کا لڑکا بہت جلدی ہار جاتا ہے۔ شاید اسی لیے اماں خوف زدہ تھیں۔ جلد از جلد میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ شاید بلکہ یقیناً" اس لیے آدمی میں ایک خاص عمر کو پہنچ کر جنس مخالف سے رغبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے

ماں باپ کے لیے جوان بیٹیاں بوجھ اور جوان بیٹا خطرہ بن جایا کرتا ہے۔

میری وہی عمر تھی' وہی جذبہ تھا جس نے شگفتہ ایسی عام سی لڑکی کو میری زندگی کا محور بنا دیا تھا۔ وہ میری سوچوں پر حاوی ہو گئی تھی۔ کاش میں چچا' اماں اور تایا کی بات مان کر' کوثر کو واپس لانے کے خیال سے باز رہتا اور شگفتہ سے شادی کر کے زندگی کو پرسکون انداز سے گزار رہا ہوتا۔

میرے پاس کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی۔ خوشیاں میری زندگی میں پہلے بھی موجود تھیں اور شگفتہ کو پانے کے بعد تو شاید میں دنیا جہان کی خوشیاں حاصل کر لیتا۔ میری تمنائیں تھیں ہی کتنی؟ اور نہ ان کے پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ میں تو تقریباً" اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں وہ خوش قسمت شخص تھا جس نے جو خواہش کی' وہ بلا حیل و حجت پوری ہونے والی تھی مگر قسمت ـــــ قسمت کا لکھا واقعی کوئی نہیں مٹا سکتا۔ آدمی اپنی لاعلمی کی وجہ سے خود ہی وہ راہ اختیار کر لیتا ہے جہاں قسمت میں لکھے عذاب اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اگر اسے علم ہو جائے کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو شاید ـــ وہ کبھی بھی ان راستوں قدم نہ دھرے مگر ـــ پھر خدا کے وجود سے منکر ہو جائے۔

میں اس کہانی میں آپ کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ ہونے والے ہر واقعہ کے گواہ ہیں۔ میں بلا کم و کاست خود پر بیتا ہوا ہر لمحہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں' یہ سوچے بغیر کہ آپ میرا مکروہ کردار دیکھ کر مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ یہ نفرت وقت کے دھارے میں بہہ کر آنے والی وہ شدت اور وہ جذبہ ہے جو کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو' مجھے اس کی سچائی کا بھی پورا یقین ہے۔ مجھے آپ کی نفرت محسوس کر کے دکھ نہیں ہو گا اس لیے کہ دکھ تو میں نے اس ہی لمحے اٹھا لیا تھا جب اپنے گھناؤنے اور مکروہ کردار کو اپنے سامنے دیکھ کر میں حیران اور ساکت رہ گیا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ میں ہوں تو میں کئی برس نگاہ اٹھا کر آئینے میں خود کو نہیں دیکھ سکا تھا کہ مجھے اپنے آپ سے نفرت اور گھن محسوس ہوتی تھی۔

میں اگلی صبح اٹھا تو مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ مجھ میں ایک ایسا شخص جنم لے چکا تھا جسے دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ دنیا میں موجود ہر آسائش' حسن' رعنائی اور ہر خوشی پر اپنا حق محسوس کرتا تھا۔ میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ میں سنہرے بابا کے حجرے میں وظائف کر کے جو قوتیں حاصل کر چکا ہوں وہ اب مجھ میں موجود ہیں مگر پوری طرح میری دسترس میں نہیں ہیں۔ مجھے یاد تھا کہ سنہرے بابا نے مجھے کہا تھا کہ اگر کوثر نے میری مدد کی تو میں ان قوتوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا ہوں۔ اب مجھے ساری فکر کوثر کی ہو گئی تھی۔ میں اسے ہوش میں لانا چاہتا تھا تاکہ وہ میری مدد کرے اور اس بات کو سادھو سے چھپانا بھی چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ حاصل کروں اسے سادھو نہ پا سکے۔

جس کمرے میں میری آنکھ کھلی وہ میرے حساب سے تو اس ہال نما کمرے کا ایک گوشہ ہونا چاہیے تھا' وہی گوشہ جس میں سادھو نے چمپا کے ساتھ مجھے قید کر دیا تھا۔ جہاں میں نے سارا وقت چمپا کے جہاں سوز و بلاخیز حسن کے سمندروں میں ابھرتے ڈوبتے ہوئے گزارا تھا۔ لیکن یہ وہ کمرا تھا نہ اس ہال کا گوشہ بلکہ اس وقت میں ایک چھوٹی سی سیلن زدہ کوٹھڑی میں' پتھر کی بنی ہوئی چوکی پر لیٹا تھا۔ اس چوکی کے چاروں جانب سفید چونے سے ایک لکیر سے کھینچی ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس لکیر کا مقصد کیا تھا۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید سادھو نے مجھے کسی حصار میں قید کر دیا ہے۔ میں اس سے نکلنے کی کوشش کروں گا تو شاید کسی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ اس خیال کے باوجود میں نے ہمت کر کے اس لکیر کو عبور کر لیا تب بھی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کیسی لکیر ہے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ میں نے ایک پتھر کی چوکی پر کس قدر آرام وہ رات گزاری تھی۔ یہاں نہ چمپا تھی نہ کلپنا' مگر دونوں کی خوشبو میں خود میں محسوس کر رہا تھا۔

اس کوٹھڑی کا دروازہ بڑا وزنی اور سیاہ لکڑی کا تھا جو اندر کی طرف سے بند تھا۔ پیتل کا ایک گول کنڈا سا تھا جو ایک پتری میں اڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ کنڈا میں نے کس وقت اٹکایا تھا' مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ میں تو اس بڑے ہال میں' سادھو کے قریب چھپر کھٹ پر ایک کونے میں سمٹ کر لیٹ گیا تھا' میں نے نہ کسی علیحدہ بستر کی طلب کی تھی' نہ سادھو نے مجھے کسی کمرے میں جا کر سونے کو کہا تھا۔

میں بہت بے خبر سویا تھا' شاید کسی نے مجھے سوتے ہی میں یہاں پہنچا دیا تھا' میں نے آگے بڑھ کر کنڈا ہٹایا تو دروازہ چرچراہٹ پیدا کرتا ہوا کھل گیا۔ صبح کی تازہ اور معطر ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو مجھے فرحت کا احساس ہوا۔ باہر نکل کر مجھے پتا چلا کہ یہ وہی حصہ تھا جو کچے دالان یا آنگن کے بعد بنا ہوا تھا۔ یعنی اس کچے آنگن کے دوسری طرف بڑا ہال اور بڑا برآمدہ تھا۔ درمیان میں پرانے برگد کے درخت اور کچا حصہ تھا اور کافی آگے جا کر کھنڈر کا حصہ تھا جہاں میں اس وقت موجود تھا۔ میں نے یہاں آنا چاہا تھا تبھی پہلی بار اس زندہ کھوپڑی نے میرے پیروں پر لپک کر مجھے خوف زدہ کر دیا تھا اور میں اس طرف آنے کی بجائے پلٹ کر ہال کی طرف بھاگ اٹھا تھا۔

یہ کھنڈر صرف اسی ایک کمرے پر مشتمل نہیں تھا۔ برے دائیں بائیں کئی راہداریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ تجسس نے مجھے اکسایا کہ میں اس کھنڈر کو اندر کی طرف سے دیکھوں۔ میں بائیں جانب والی راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ ٹوٹی ہوئی سیاہی مائل دیواریں اپنے اندر بے پناہ پراسراریت لیے ہوئے تھیں۔ سب سے حیرت انگیز چیز ہر بنت پر ابھری ہوئی دیوی دیوتاؤں کی وہ تصاویر تھیں جنھیں غور دیکھنے سے مجھے بدن میں جھرجھری سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس راہداری میں جگہ جگہ ملبہ پڑا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا مگر مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ میں اندر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ میں لوٹ جاؤں ورنہ اس گھپ اندھیرے میں' میں کسی مشکل میں بھی پھنس سکتا ہوں مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں اپنے خیال پر عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ جیسے میرا ارادہ ـــ میرے قدم' میرے ذہن کے تابع نہ ہوں کوئی اور طاقت تھی جو مجھے اندر کی طرف دھکیلے لیے جا رہی تھی۔ اندھیرا بہت گہرا ہو جانے کے باوجود میرے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے' ان راستوں سے واقف ہوں۔ درمیان میں جہاں کوئی رکاوٹ آتی یا ملبہ پڑا ہوا ملتا' میں نہ جانے کیسے اس سے بچ نکلتا' لیکن مجھے احساس ہو جاتا تھا کہ میرے قدم کسی چیز کو پھلانگ رہے ہیں۔ میں اپنی ہی اس کیفیت سے خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے خود کو روکے رکھنے کے لیے قوت استعمال کرنا چاہی تو میں گھسٹنے لگا' یوں جیسے کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ میری آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھیں' حتیٰ کہ اب مجھے راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا' کسی دوسرے وجود کی موجودگی بظاہر محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر وہاں میرے سوا بھی کوئی تھا۔ کوئی تھا جو مجھے کہیں لیے جا رہا تھا۔

اس اندرونی کشمکش نے میرے اعصاب شل کر دیے۔ میں نے بے اختیار چیخنا چاہا تھا کہ ایک سرگوشی نے مجھے ساکت کر دیا۔ "وکار الحسن!"

یہ سرگوشی دیواروں سے ابھرتی اور فضاؤں میں پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔ میں آواز پہچان نہیں سکا۔ منتظر رہا کہ آواز دوبارہ آئے مگر چند لمحے صدیاں بن کر خاموشی کے گہرے سمندر میں گزر گئے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔

"کک ـــ کون ہو تم؟" میں نے ہمت کی اور پکار اٹھا۔ میری آواز بھی بری طرح گونج اٹھی۔ آواز کی بازگشت سے پیدا ہونے والا ارتعاش مجھے فضا میں ٹھہرا ہوا محسوس ہوا۔ پتا نہیں یہ کیسی جگہ تھی۔

"وکار الحسن!" اس بار آواز یوں آئی جیسے کسی کی کراہ گونجی ہو۔ جیسے کسی نے سسکی بھری ہو۔ "وکار الحسن ـــ تم پر کسی کا وچن ادھار ہے۔" اس بار آواز قدرے صاف تھی۔ وہ نسوانی آواز تھی۔ مجھے کوثر اور شکنتلا' دونوں کا خیال بیک وقت آیا۔

"کوثر ـــ؟" میں بے ساختہ پکار اٹھا۔

جواب میں کسی کی سسکیاں گونج اٹھیں۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے آنکھیں پھاڑنے سے مجھے سب کچھ نظر آنے لگے گا۔ مگر وہاں تو روح میں اتر جانے والا گہرا اندھیرا تھا۔

"کوثر بھی تو عذاب میں ہے۔" وہ بولی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ یقیناً" شکنتلا ہے۔

"شکنتلا ـــ!!؟"

"ہاں ـــ تم ـــ تم پرکاش کو وچن دے کر آئے تھے وکار الحسن! تم نے ـــ اپنے باپ کو بھی وچن دیا تھا۔"

شکنتلا کو اپنے قریب پا کر اور اس کی باتیں سن کر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں شرمندہ ہو جاتا لیکن میں نے ایسی کوئی کیفیت خود میں محسوس نہ کی بلکہ میں الجھ سا گیا۔

"یہاں ـــ تم لائی ہو مجھے؟" میں نے الٹا اس سے سوال کر لیا۔ مجھے اس بات پر بھی کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ میں اس کی بھانجی چمپا کے بدن کی ساری چاندنی پی چکا تھا۔

"ہاں ـــ پرکاش آیا تھا ـــ میں آبھاری ہوں کہ تم نے پرکاش کو بندی گرہ سے' اس کید سے مکتی دلا دی۔ میں

صدیوں جتنے برس گزار کر اسے دیکھ پائی ہوں۔ پرنتو تم نے اسے وچن دیا تھا کہ ـــ وہ پائل مجھے دے دو وکار الحسن!" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ "اس پائل میں میرا سکھ چین بندھا ہے۔"

لمحہ بھر میں مجھے یہ خیال آیا کہ میں اگر اسے پائل دے دوں تو سادھو کچھ بھی نہیں پائے گا۔ کلپنا' چمپا' اور دوسری تمام حسینائیں میری بانہوں میں سمٹ آئیں گی۔ سادھو میرا غلام ہوجائے گا۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ خیال آتے ہی میں خوش ہوگیا۔ میری تمام الجھن رفع ہوگئی۔ میں چہک اٹھا۔ "ہاں ـــ وہ تو میرے پاس تمہاری امانت ہے شکنتلا۔ مگر ـــ مجھے اتنا بتادو کہ پائل مل جانے کے بعد تم کیا کروگی ـــ میرا مطلب ہے کہ تم اور پرکاش۔"

شکنتلا کی سسکیاں تھم گئیں۔ اس نے شفاف لہجے میں کہا۔ "تب وہ پاپی میرا کچھ بھی نہیں کرسکے گا وکار الحسن! وہ میرا تو کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میں جہاں اتنے برس بھٹک سکتی ہوں وہاں اور سہی' پرنتو اس کے ارادے خطرناک ہیں۔ اس کی لپیٹ میں کوثر بھی آسکتی ہے وکار الحسن ـــ اور کوثر تمہاری بہن ہے۔"

اس نے تالیا" میری غیرت کو للکارنے کے لیے کوثر کا نام لیا تھا۔ وہ شاید میرے اندر کی اس تبدیلی کو جان چکی تھی۔ اس کا لہجہ ملتجیانہ نہ تھا۔

"میں نے کچھ اور پوچھا تھا شکنتلا۔" میرا لہجہ سخت تھا۔ "وہ پائل لے کر کیا تم اور پرکاش اپنی آتماؤں کو سکھ دے سکو گے؟ کیا تم دوسرے جہاں میں چلے جاؤ گے؟ کیا تمہاری بھٹکتی آتما کو سکون مل سکے گا؟ صرف میری بات کا جواب دو۔"

"نہیں وکار الحسن! جب تک پرکاش کا شریر راکھ بن کر گنگا میں نہیں بہایا جاتا' وہ نہیں جاسکے گا اور جب وہ نہیں جائے گا تو ـــ تو میں بھلا کیسے جاؤں گی؟"

ان کے جواب سے میں جھنجلا اٹھا۔ "او تو ـــ؟ تو اب میں کیا کروں؟ کیا میں تمام زندگی صرف تم دونوں کی تمنائیں پوری کرنے میں گزار دوں؟ میری اپنی بھی تو کوئی زندگی ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ میں نے نہیں میرے پردادے نے کیا تھا۔ تم اس کی سزا ہمارے پورے خاندان کو دے چکی ہو۔ تم ہماری زندگیوں کو عذاب بنا چکی ہو' اب ـــ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"وکار الحسن! یہ ـــ یہ تم نہیں' سادھو کا تمہارے اندر اتارا ہوا وہ زہر بول رہا ہے جسے تم ـــ شاید تم دھرتی کی سب سے حسین چیز سمجھ رہے ہو۔ یاد رکھو وکار الحسن! ایسا کرنے سے تمہارے پریوار کے کھیت کم نہیں ہوں گے' بڑھ جائیں گے۔ تمہارے پریوار کو چاند کا قیدی میں نے نہیں' بھگوان نے بنایا ہے۔ جب تک جوگندر ناتھ سوامی جی جیوت ہیں' جندا ہیں' جب تک ان کا شریر اس دھرتی پر موجود ہے تم چاند کی قید سے نکلنا بھی چاہو تو نہیں نکل پاؤ گے وکار الحسن! وہ سزا میری دی ہوئی نہیں تھی' سوامی جی کی دی ہوئی تھی۔"

"بکواس بند کرو۔" میں غصے سے پاگل سا ہوگیا۔ جس قصے کو میں بھول چکا تھا وہ اسے پھر یاد دلا رہی تھی۔ وہ مجھے دھمکی دے رہی تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ میں حویلی سے اس کا سایہ ختم کرنے میں کامیاب ہوچکا ہوں۔ اپنے خاندان کو چاند کی قید سے نجات دلا چکا ہوں مگر اس کی باتوں نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ "میں خدا پر یقین رکھتا ہوں' بھگوان پر نہیں۔" میں نے چیخ کر جواب دیا۔

"کھدا بھگوان سے کچھ الگ تو نہیں ہے وکار الحسن! تم اسے کھدا کہتے ہو اور ہم بھگوان۔ پاپ' پاپ ہوتا ہے اور پن ـــ پن۔ اور پھر جو کچھ تم کررہے ہو اسے کیا تمہارا کھدا پسند کرتا ہے؟ کیا وہ پاپ اس کے نزدیک پاپ نہیں ہے؟"

ایک لرزا سا تھا جس نے میری روح کو تھرتھرا دیا۔ اس قدر اندھیرے کے باوجود شکنتلا کے سامنے نظر نہ آنے کے' باوجود میری نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ لمحہ بھر کو جیسے میں بیدار ہوگیا۔ مجھے اپنے بدن میں کیڑے سے کلبلاتے محسوس ہوئے۔ خود سے گھن آنے لگی۔ اماں' ابا' جہانی آپا' شنو آپا اور تایا' تائی کے چہرے نگاہوں میں گھومنے لگے۔ ان چہروں کی ساری آنکھیں گیلی تھیں۔ سب کے ہاتھ میرے لیے دعا کو اٹھے ہوئے تھے۔ کوثر کا زخمی بدن پورے کا پورا جیسے میرے سامنے آگرا۔ اس کے بدن پر جما خون ـــ اس کے بازو کا پھٹا ہوا گوشت ـــ میری آنکھوں میں نمی بھر گیا۔

"وکار الحسن! شگفتہ تمہاری راہ تک رہی ہے۔ اس کی معصوم آنکھوں میں تم دیوالی چھوڑ آئے ہو۔ وہ حویلی کی شمع ہے وکار الحسن! دھرتی پر بکھرے' فضاؤں میں چکر کھاتے اور آکاش کو بھگوتے رنگوں میں اس کا بھی تو حصہ ہے۔ وہ تو یہیں اندر دھنش سمجھتی ہے' اور تم ـــ تم یہاں ـــ اس سادھو کے متی بن بیٹھے ہو جس نے تمہارے پریوار کو خوف کی گھاٹیوں میں قید کردیا تھا۔ وہ جس نے تمہارے خورشید چاچا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جس نے تمہارے دوست لڈن اور سب سے بڑھ کر تمہاری بوا کو مار دیا۔ کیا تم ان کا پریم بھول گئے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ بوا تم سے کتنا پریم کرتی تھی؟"

"چپ رہو ـــ میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں شکنتلا ـــ چھوٹی پھوپی' لڈن اور خورشید چاچا ہی نہیں' بڑی پھوپی بھی مجھے یاد ہیں اور ان کے میاں بھی جنہیں تم نے سہاگ رات بھی نہ گزارنے دی تھی۔ پردادا تمہارے مجرم تھے مگر دادا نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اور ـــ اور میرے ابا ـــ وہ تو ـــ جتنا نقصان تم نے ہمیں پہنچایا ہے اتنا کسی نے نہیں پہنچایا تھا۔ وہ حویلی چھڑوانے والی' ہم سے ہمارا آبائی مقام چھیننے والی تو تم تھیں۔ تم نے میری بہنوں کے چہرے کی چمک ان کے دلوں کا سکون اور راتوں کی نیندیں چھینیں تھیں۔ صرف اس لیے کہ اس خاندان کے ایک شخص نے ـــ صرف ایک شخص نے تمہیں نقصان پہنچایا تھا۔ کیا تمہارے بھگوان کے نزدیک یہ سب پن تھا ـــ بولو ـــ" میں جوں جوں یہ سب کہتا جارہا تھا۔ میری آواز اونچی ہوتی جارہی تھی۔

وہاں صرف میری آواز تھی۔ اس کی بازگشت تھی اور جب میں چپ ہوا تو گہرے سناٹے مجھے نگلنے لگے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میری باتوں کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے شکنتلا کو آوازیں دیں۔ میری آواز پلٹ پلٹ کر مجھ سے ٹکراتی رہی' میں بپھرتا رہا' جیسے کئی طوفان مجھ میں بیک وقت اٹھنے لگے ہوں۔ ایک عجیب سا غم و غصہ تھا جو شکنتلا کے خلاف محسوس ہورہا تھا حالانکہ اب سے پہلے میں نے ہمیشہ اسے مظلوم سمجھا تھا۔

آج مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے میرے خاندان پر ظلم توڑے اور میں ـــ میں اس سے ہمدردی کرتا رہا۔ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا کہ وہ میری ہی اماں' ابا' دادا' اور بہنوں کی بھی مجرم ہے۔ اس نے ہمیشہ کے لیے ہمیں تنہا کردیا تھا۔ ہماری حویلی میں لوگوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ ہماری ہنستی عزت کو بٹا لگا دیا تھا اور ابھی وہ مجھے اپنے مظلوم ہونے کی داستانیں سنا سنا کر یہاں تک پہنچا گئی تھی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو شاید کوثر کبھی ان علوم میں دلچسپی نہ لیتی۔ میں حویلی چھوڑ کر مراد آباد نہ آتا۔ ہم سب گھر چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ہمیں دربدر کردیا تھا اس نے۔

نہ معلوم میرے اندر یہ لاوا ایک دم کیسے پکنے لگا تھا۔ میں پلٹنے لگا تھا۔ اس بار جگہ جگہ ٹکرایا۔ گرا اور کہیں لڑکھڑا کر سنبھل گیا مگر مجھے کسی نے روکا نہیں۔ میں نے پلٹنے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر ڈالا جبکہ یہاں آتے ہوئے میں کئی بار نہ آنے کا فیصلہ کرنے کے باوجود خود کو روک نہیں سکا تھا۔ اس تھوڑے سے سفر نے مجھے نڈھال کردیا۔ میں عجیب سی مضحکہ خیز حالت میں چل رہا تھا۔ کسی چیز سے ٹکرا کر گر جانے کے خوف سے میری پنڈلیاں اینٹھ گئی تھیں۔ کندھے جھکے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی سینے سے یوں لگا رکھی تھی جیسے میرا سر چھت سے ٹکرا جائے گا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اندھیرا بے پناہ تھا۔ میری آنکھوں کے آگے سرخ دھبے سے ناچ رہے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ شکنتلا نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا۔ وہ وہاں تھی یا وہاں سے غائب ہوچکی تھی اور میں یہ سب جاننے کا خواہش مند بھی نہ تھا۔ اس کے خلاف نفرت اس وقت مزید بڑھ گئی تھی جب مجھے اس نے صرف چھوٹی پھوپی' لڈن اور خورشید چاچا کی موت یاد دلائی تھی اور مجھے بڑی پھوپی' دادا' ابا اور دادی یاد آگئے تھے۔ بے چارے بڑے پھوپا کا تو کوئی بھی قصور نہ تھا۔ ان کا تعلق تو مرزا صولت بیگ کی نسل سے ہی نہ تھا ـــ وہ تو محض پھوپی سے بیاہ رچانے کے جرم میں مارے گئے تھے مجھ پر یہ انکشاف ہوچکا تھا کہ شکنتلا مجھے بے وقوف بناتی رہی ہے۔ مجھے اپنا آلہ کار بنا رکھا تھا اس نے اور اس میں وہ اس حد تک کامیاب رہی تھی کہ میں محض اس کی خاطر ایک دو نہیں' بہت سے محبت کرنے والے اپنے پیچھے تنہا چھوڑ آیا تھا۔

کیا ضرورت تھی مجھے ان چکروں میں پڑنے کی۔ چچا نے ایک بار مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں شنکر شاستری کے پاس چلا جاؤں۔ وہ ایک زمانے میں اجودھیہ سے گزر کر کسی طرف جارہے تھے۔ چند دنوں کے لیے امروہہ میں بھی ٹھہرے تھے تو لوگوں کے غول ان تک پہنچ گئے تھے۔ محلے کے چند بزرگوں نے مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ ان روحوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے ان سے مل لینا چاہیے۔

اس زمانے میں ہندو مسلمان میں اتنی تفریق نہیں تھی۔ اکثر ہندو عورتیں حضرت کرامت شاہ کے مزار پر منتیں مانگنے جایا کرتی تھیں اور بہت سے مسلمان بعض سادھوؤں اور پنڈتوں کو مانتے تھے۔ بالخصوص کالا جادو کا نام آتے ہی مسلمانوں کی سوچ کالا جادو کا توڑ کرنے کے لیے ہندوؤں کی طرف دوڑتی تھی۔ میں نے چچا کے مشورے کو کوئی اہمیت نہ دی۔

اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں یہی کرلیتا تو شاید گزرنے والے عذابوں سے بچا رہتا۔ بہرحال میرا دل شکنتلا کی طرف سے کھٹا ہوچکا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اب اس باب کو بند کردوں گا مگر وہ مجھے دھمکی دے چکی تھی۔ ممکن ہے وہ سچ کہتی ہو کہ یہ اس نے نہیں جوگندر ناتھ سوامی جی نے کیا ہو۔ اگر ایسا تھا تو میں نے سوچ لیا کہ میں اپنی قوتوں کو اپنے تابع کرنے کے بعد پہلا کام جوگندر ناتھ کو ٹھکانے لگانے کا کروں گا۔

میں بڑی دیر بعد پھر اسی روشن حصے میں پہنچ گیا جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر اس بڑے ہال کی طرف چل پڑا جہاں میرے خیال میں سادھو کو ہونا چاہیے تھا۔ اب میرا سارا دھیان کوثر کی طرف تھا۔ اپنی قوتوں کو پانے کے لیے مجھے کوثر کی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے راستے میں یہ بھی سوچا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح سادھو کو اپنے قابو میں کرلینا چاہیے تاکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور مجھے دوست پا کر کوثر کو بھی میرے حوالے کردے۔ وہ لمحے کا شاید ہزارواں حصہ تھا جس میں میں نے بڑا خطرناک فیصلہ کرلیا تھا۔ اس وقت تو مجھے اپنے اس فیصلے کی سنگینی کا قطعی احساس نہ تھا۔ اس فیصلے کو خطرناک ثابت کرنے میں وقت نے اہم کردار ادا کیا اور میں مدتوں اپنے اس فیصلے پر پچھتایا۔

وہ فیصلہ شکنتلا کی پائل سے متعلق تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ پائل میں اسے دے دوں گا۔ پائل لے لینے کے بعد وہ دیوانہ ہوجائے گا۔ اسے لذتوں کے اس سمندر میں ڈبو کر میں بھی اپنا مقصد حاصل کرتا رہوں گا۔ کیا ہوا اگر وہ بھی دوسرے ہزاروں عیاش لوگوں کی طرح کنواریوں کے بدن سے شہد کشید کرتا رہے تو۔ بلکہ اس طرح مجھے بھی شہد چننے کا موقع ملے گا اور میں بیٹھے بٹھائے ہی لذتیں حاصل کرتا رہوں گا۔ مجھے اس سلسلے میں بھاگ دوڑ کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں کون سا خدائی فوجدار رہوں کر دنیا بھر کی کنواریوں کی عزتیں بچاتا پھروں۔

میں یہ سب سوچتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ ایک بات نے مجھے بڑا مطمئن رکھا تھا کہ میں یہاں آنے سے قبل سنہرے بابا کے بتائے ہوئے وظائف سے اور انھی کے بتائے ہوئے کچھ الفاظ کی ترتیب کو بدل کر پڑھنے کے بعد اپنے گرد حصار کھینچ چکا تھا جس سے میں قطعی طور پر محفوظ تھا۔ پائل میری جیب میں تھی، میں کئی بار خود سے بیگانہ بھی ہوچکا تھا مگر سادھو وہ پائل میری جیب سے نکال نہیں سکا تھا۔ نہ اس میں میرے دماغ کو پڑھنے کی جرات تھی۔ اس وقت میں بڑی شدت سے اپنی ان قوتوں کو پانے کا متمنی تھا جنہیں میں نے وظائف کے بعد خود میں محسوس کیا تھا۔ اب تک مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ میں ان قوتوں سے کیا کیا کام لے سکتا ہوں۔

اسے آپ میری کم عمری اور ناتجربہ کاری کہہ لیں یا میرے ذہن کا سکڑا سمٹا کینوس مگر جن سوچوں نے اس لمحے مجھ پر حملہ کیا تھا وہ بڑی شدید تھیں۔

میں ہال میں داخل ہوچکا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہی اجاڑ ویران اور خاک میں اٹا ہوا ہال تھا جیسا میں نے پہلی بار اندر داخل ہو کر دیکھا تھا۔ نہ وہاں وہ کونا تھا جہاں میں نے چمپا کے ساتھ وقت گزارا تھا، نہ دیواروں پر عریاں تصاویر اور پردے تھے۔ نہ اس کے سامنے والے حصے میں سادھو کا وہ تخت تھا جہاں وہ کلپنا کو بانہوں میں لیے بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف پھرتا رہا۔ بڑے ہال سے گزر کر اس کے کچے حصے میں پہنچا، وہاں میں نے ان کھوپڑیوں کو تلاش کرنا چاہا مگر وہاں سوکھے، زرد اور ہواؤں میں اڑتے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے وہ جگہ تلاش کرنا چاہی جہاں اسی برٹش کو مرا ہوا دیکھا تھا مگر وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ لمحہ بھر کو تو مجھے یوں لگا جیسے اب تک کے سارے واقعات میرے کسی خواب پریشاں کا عکس ہوں۔ ممکن ہے میں رات میں یہاں داخل ہوا ہوں، تھکن نے مجھے ان کھنڈر میں نیند کی گہری وادی میں اتار دیا ہو اور اب میری آنکھ کھلی ہو۔ باہر کی ویرانی تو مجھے یقین دلا رہی تھی کہ ایسا ہی ہے مگر ایسا نہیں۔۔۔ میرا ذہن اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

○☆○

[illegible]س صورت حال نے مجھے کافی مایوس اور نڈھال کردیا
[illegible]میں بڑی شدت سے بھوک اور پیاس محسوس کررہا
[illegible] میرا حلق خشک ہوچکا تھا اور زبان سوکھ کر موٹی اور
[illegible]ری ہوگئی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ میں بہت زیادہ
[illegible]رہوں، اپنی بھوک اور پیاس تک پر قابو نہیں پاسکتا۔
[illegible]ے اعصاب بھی میرے کنٹرول میں نہیں ہیں۔ خوف
[illegible]ہو جانے والی کیفیت بھی اکثر مجھ پر حملہ آور ہوجاتی
[illegible]میں اتنے روز کی ساری ریاضت ضائع کرچکا ہوں۔
[illegible]ے بابا نے تو مجھے بھوک اور پیاس پر قابو پانے کے علاوہ
[illegible]اعصاب کو کنٹرول کرنے کے بھی کئی گر بتادیے تھے مگر
[illegible]نے وہ تمام عمل کسی ایسے کند ذہن بچے کی طرح کیے جو
[illegible]وقت تک پڑھایا جانے والا سبق یاد رکھتا ہے جب تک
[illegible]س میں موجود ہو۔ مجھے خود پر غصہ بھی آیا اور کافی سبکی
[illegible] محسوس ہوئی۔ مجھے یاد آگیا کہ میرا تصور کتنا قوی تھا۔
[illegible]ہو جاتا تھا دیکھ لیتا تھا جس ارتکاز اور توجہ کی ضرورت اس
[illegible]میں ہوتی ہے، وہ مجھ میں اس وقت موجود تھا مگر [illegible]
[illegible]میں نے اپنے ذہن کو منتشر ہونے دیا ویسے ویسے اس
[illegible]دیت سے محروم ہوتا رہا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ پہلے روز
[illegible]دن میں حجرے سے نکلا تھا، اس روز بجلی کی سی رفتار
[illegible] گھر پہنچ گیا تھا۔ صرف میں نے چاہا تھا کہ جلدی گھر
[illegible]ں اور ویسا ہی ہوگیا تھا مگر اس کے بعد نہ ہی میں نے
[illegible] اپنے اندر کی اس قوت کو پرکھنے کی کوشش کی، نہ عمل
[illegible]نے کا خیال ہی آیا۔

[illegible]سنہرے بابا مجھے خود کو محفوظ کرنے کے علاوہ دوسرے کو
[illegible]ود کرنے کا ہنر بھی سکھا چکے تھے مگر میں نے اسے اپلائی
[illegible]ں کیا، خود کو محفوظ کرنے کا عمل بھی سادھو کے حربوں
[illegible]ے خوف زدہ ہو کر کیا تھا۔ ان باتوں سے میرا ذہن کھلتا چلا
[illegible]یا۔ میں اسی ہال کے کونے میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ میں
[illegible]نے آنکھیں بند کرلیں اور آیندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنے
[illegible]۔ مجھے اپنے آپ کو ترتیب دینا تھا۔ مجھے طے کرنا تھا کہ
[illegible] کیا چاہتا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں آنکھیں بند
[illegible]رکے جیسے اپنے ہی سمندروں میں اتر گیا۔

شاید بڑے عرصے بعد میں نے کوئی معقول کام کیا تھا۔ مجھ
[illegible]جیسے ادراک کے در وا ہوتے چلے گئے۔ سب سے پہلا
[illegible]خیال یہی آیا کہ میں اپنی تمام قوتوں کو اپنے اندر ذخیرہ کروں،
[illegible]نھیں اپنی مرضی کا تابع کروں پھر سوچوں گا کہ مجھے آگے کیا
[illegible]کرنا ہے۔ پھر میں اس موضوع پر جس قدر سوچتا گیا، اسی قدر مجھ پر واضح ہوتا رہا کہ شکنتلا، سوامی جی اور سادھو کے ہتھکنڈوں سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بناؤں۔

اس کے لیے مجھے ان وظائف کو دوبارہ کرنے سے بھی عار نہ تھا۔ گو ان وظائف کو کیے مجھے بڑے دن بیت گئے تھے مگر مجھے وہ تمام وظائف یاد تھے بلکہ سنہرے بابا کی دی ہوئی ہدایات بھی خوب یاد تھیں۔ مجھے چند چیزوں کی ضرورت تھی جن میں موم بتی، اگر بتی کم از کم کٹورہ بھر پانی، خوشبویات اور مزید چند چیزیں مگر یہاں ان چیزوں کے ملنے کا کوئی آسرا نہ تھا۔ یہاں سے باہر جانے کو میرا دل قبول نہیں کررہا تھا۔

اپنے مقاصد کے حصول کی جو شدت اس وقت محسوس ہو رہی تھی وہ مجھے فی الفور کام شروع کردینے پر اکسا رہی تھی۔ [illegible] جانتا تھا [illegible] آگے کے حالات کیا رخ اختیار کرتے [illegible] اس [illegible] بڑے [illegible] کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بغیر ان چیزوں کے ہی میں وظائف پڑھ لوں گا۔ اس طرح اور کچھ ہویا نہ ہو، اپنے اعصاب پر تو پورے طور پر کنٹرول حاصل ہو ہی جائے گا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اسی لمحے وظائف کو شروع کرنے کے لیے اکسانے میں میری بے پناہ بھوک اور شدید پیاس کا زیادہ ہاتھ تھا۔ میں نے اپنی گرد لپٹی چادر سے فرش پر جمی دھول صاف کی۔ اس چادر کو بچھا کر میں سامنے کے رخ پر بیٹھ گیا۔ تمام احتیاطی تدابیر اور ہدایات کو ایک پھر میں نے ذہن میں دہرایا اور اللہ کا نام لے کر وظائف شروع کردیے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ سنہرے بابا کے حجرے میں میں پورے چودہ دن رہا تھا۔ انھوں نے مجھے ایک کتابچہ بھی دیا تھا جس پر مختلف وظائف لکھے ہوئے تھے۔ میں نے اسے پڑھا بھی تھا مگر اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ اس میں بہت سے وظائف تھے جو اگر مجھے یاد ہوتے تو ان حالات میں میرے بہت کام آتے۔ مجھے افسوس ہوا کہ یہاں آتے ہوئے اگر میں وہ کتابچہ بھی ساتھ لے آتا تو اچھا تھا لیکن بہرحال اس وقت کو افسوس میں گزارنے کی بجائے میں نے ذہنی یکسوئی سے وظائف کی طرف توجہ کی۔

بہت ہی کم عرصے میں، میں نے خود کو کھنڈر کی ان دیواروں سے آزاد محسوس کیا۔ بند آنکھوں میں جو منظر تھا اس میں، میں اپنے مقابل نظر آرہا تھا یوں جیسے میں۔۔۔ میں

نہ ہوں کوئی اور ہو' جو اپنے سامنے دور تک بچھی ہوئی ریت پر ایک چادر پر بیٹھے وقار الحسن کو دیکھ رہا ہو۔ میرے سامنے جو وقار الحسن تھا' اس کا حلیہ بہت دگرگوں تھا۔ چہرے پر اضمحلال' میلے کپڑے' بڑھا ہوا شیو' آنکھوں کے گرد پڑے حلقے' گڑھوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ میں سردی محسوس کر رہا تھا مگر وقار الحسن جیسے دنیا جہاں سے بیگانہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

یہ ایک صحرا تھا جہاں دور دور تک نہ کوئی دیوار تھی' نہ درخت۔ بیچ صحرا میں اکیلا وقار الحسن بیٹھا تھا اور بس۔ یہ منظر دیکھ لینے کے بعد ہی میں نے خود کو آنکھیں بند کیے وقار الحسن میں ضم ہوتا محسوس کیا اور یوں لگا جیسے میں کسی کھلے سرد علاقے سے کسی بند کمرے میں داخل ہو گیا ہوں۔ مجھے بڑا اطمینان محسوس ہوا۔ اپنے ٹھٹھرتے ہوئے بدن میں حرارت محسوس ہوئی مگر میں اس حرارت کو بہت دیر تک برداشت نہیں کر سکا اور تلملا کر باہر نکل آیا۔ اس وقت میں نے شدت سے محسوس کیا کہ وقار الحسن ایک کے بجائے دو ہو چکے ہیں۔ ایک میں اور ایک وہ جو آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا' جس نے مجھے اپنے اندر داخل ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا نہ باہر نکلتے۔ اس کیفیت کو محسوس کر کے مجھے بہت خوف آیا' خیال ہوا کہ شاید۔۔۔ شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے مگر جو کچھ ہو چکا تھا اسے درست کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں شدت کی بھوک اور پیاس محسوس کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں تو میرے سامنے بیٹھے وقار الحسن کے بھی جم چکی تھیں مگر وہ میری طرح مضطرب نہ تھا۔ وہ تو جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔

یہ ایک پراسراری کیفیت تھی۔ ایک خوف زدہ کر دینے والی حالت' جو مجھے خوف زدہ بھی کر رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں گھر چلا جاؤں۔ نرم گرم بستر پر لیٹ کر پرسکون نیند سو جاؤں۔ ساری دنیا کو بھاڑ میں جھونک دوں۔ کسی اچھے ہوٹل میں جا کر پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں۔ کچی مٹی کی صراحی کا پانی پیوں اور پھر سو جاؤں یا پھر سادھو وہی بدمزہ کھانا دے دے مگر چمپا کے بدن کی ساری حرارت بھی مجھے بخش دے۔ کھوپڑیاں سادھو کی طرح میری جیب میں بھی کلبلائیں' میں بھی برٹش آدمی کی طرح کسی کو مار کر ان کے سامنے پھینک دوں اور ان کی لہو چاٹنے والی پر کیف و سحر آفریں آوازوں میں ڈوب جاؤں۔ کوثر کا گلا گھونٹ دوں'

شکنتلا کو تہ تیغ کر دوں' شگفتہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دوں اور۔۔۔ اور کلپنا کے گھنے لمبے بالوں کو اوڑھ کر اس کی خوشبوؤں کی لپٹوں میں ڈولتا پھروں۔ چمپا کے پیروں میں بندھی پائل کی چھم چھم کو گلے میں ہار کے طرح پہن لوں۔ اس کے جوڑے پر بجے گیندے کے پھولوں کی پتیاں نوچ کر اپنے گرد بکھرا دوں اور سو جاؤں۔ پھر اس کے کندن بدن کا سہارا سونا پی جاؤں۔

عجیب و غریب کیفیت تھی۔ میں دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ مجھے اس بودم سے وقار الحسن پر غصہ آ رہا تھا جو کڑاکے کی سردی میں آنکھیں بند کیے وظائف میں مشغول تھا۔ نہ معلوم کیوں اسے یہاں وظائف کرنے کا خیال آیا تھا اور پتا نہیں کیسے۔۔۔۔ اور کیوں میں اسے اپنے سامنے پا رہا تھا۔ میں نے بغور اپنے گرد و پیش پر نگاہ کی۔ دن کا وقت تھا مگر آسمان پر کہیں سورج نہ تھا ہمارے سروں پر ایک دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑھے دھوئیں کی دبیز چادر سی تھی جو سورج کی کرنوں کو ہم تک پہنچنے کی راہ میں دیوار تھی۔ کرنیں یہاں تک پہنچتیں تو شاید سردی کم ہو جاتی۔

میں نے بھوک محسوس کی۔ وہاں سے اٹھنا چاہا تو یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ اس معاملے میں میں خود مختار ہوں' ورنہ پتا نہیں کیوں یہ گمان تھا کہ سامنے بیٹھا وقار الحسن اگر آنکھیں کھولے گا اور ڈپٹ کر مجھے دوبارہ بٹھا دے گا۔

میں ایک طرف کو بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اس دوران میں کئی بار مڑ کر وقار الحسن کو دیکھا اور اسے یونہی آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا پایا۔ ایک تعجب کی بات یہ بھی ہوئی کہ اس سے اس قدر دور آ جانے کے باوجود میں اسے اپنے بالکل قریب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے بڑھے ہوئے شیو کا ایک ایک بال صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہولے ہولے ہلتے پپڑی زدہ ہونٹ اس کا ٹھٹھرا ہوا چہرہ اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے حلقے اور پلکوں کی خفیف سی حرکت بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی مگر خوف محسوس نہ ہوا بلکہ ایک طرح سے یہ خوشی ہوئی کہ وہ مجھ سے اوجھل نہیں ہوا۔ اندر سے ایک احساس تھا کہ مجھے اسے تنہا نہیں چھوڑنا ہے اس کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے مگر ساتھ ہی پیٹ میں بل سے پڑنے لگے تھے۔ زبان پر کانٹوں کی کھرچن سی محسوس ہو رہی تھی اور کچھ کھا پی لینے کا خیال غالب آ گیا۔

میں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا اور پھر اسی جانب چل پڑا جس طرف رخ کیے ہوئے تھا۔ چلتے چلتے اچانک ہی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار میری راہ میں آ گئی۔ میں چونک اٹھا۔ یہ وہی دیوار تھی جس کے دوسری طرف بالیکا مندر تھا حالانکہ اب سے پہلے میں کسی صحرا میں سے گزر رہا تھا۔ اس دیوار کو پہچانتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا اور اپنے خیال کے مطابق اپنے پیچھے دور تک سرکنڈوں کے جنگل کے اس طرف کھنڈر کے ہیولے کو پایا۔ اب نہ وہاں صحرا تھا' نہ آنکھیں بند کیے بیٹھا وقار الحسن۔ میں چند لمحوں کے لیے گھبرایا' میں نے پل بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے کھولنا چاہیں اور اسی لمحے صحرا کا منظر نگاہوں میں جاگ کر اوجھل ہونے لگا۔ میں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس بار وہ صحرا اور اس پر چادر بچھائے وقار الحسن صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ گویا میں اسے اب بھی دیکھ سکتا تھا مگر کھلی آنکھوں نہیں بلکہ بند آنکھوں سے۔ اس بار میں نے اس راز کو سمجھنے کی نہ کوشش کی اور نہ سوچنے میں وقت ضائع کیا بلکہ تیزی سے اس ٹوٹی ہوئی دیوار کو عبور کر کے' اس پتلی سی راہداری کو پار کر کے بالیکا مندر کے احاطے سے باہر چلا آیا۔ میں اس بارے میں کچھ سوچنا یا سمجھنا چاہتا بھی تو یہ ممکن نہ تھا۔ بھوک اور شدت کی پیاس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

بالیکا مندر سنسان پڑا تھا اس کا آبنوسی دروازہ ایک دوسرے میں پیوست تھا۔ بند دروازے سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ باہر بھی کوئی نہ تھا' نہ تانگا' نہ آدمی نہ کاریں کچھ بھی نہیں تھا۔ میری نگاہ اس ہوٹل کی طرف اٹھ گئی جہاں میں۔۔۔ یعنی وقار الحسن نے اس رات چائے پی تھی۔ سردی سے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے تھے۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہی تھی۔ بھوک اور پیاس میری آنکھوں میں اندھیرے سے بھر رہی تھیں۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں برٹش کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا اکیلا بیٹھا برتن مانجھ رہا تھا۔ ہوٹل بھی سنسان تھا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ پتا نہیں اسے علم بھی ہے یا نہیں کہ اب وہ برٹش اس دنیا میں رہا یا نہیں رہا۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں گا کہ وہ برٹش آدمی کہاں ہے مگر سب سے پہلے تو مجھے اپنی بھوک پیاس کی فکر تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ یونہی سر جھکائے برتن دھونے میں لگا رہا۔

"السلام علیکم۔" میں نے با آواز بلند سلام کیا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور نہ ہی سلام کا جواب دیا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ سامنے دھوپ میں ایک بینچ پڑی تھی۔ میں آپ کو شاید بتانا بھول گیا کہ اس صحرا سے نکلتے ہی سورج کی تیز کرنوں نے مجھے خاصی حرارت پہنچائی تھی۔ میں اس بینچ پر بیٹھ گیا۔ "اے لڑکے۔۔۔ پانی' اور سنو! کھانے کی جو بھی چیز ہوٹل میں موجود ہے لے آؤ۔" میں نے اسے پھر زور سے آواز دی اور یہ دیکھ کر تلملا کر رہ گیا کہ اس بار بھی اس نے مجھے نہ کوئی جواب دیا اور نہ میری طرف پلٹ کر دیکھا بلکہ اب وہ ایک پوربی گیت بھی گانے لگا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ یہ لڑکا یقیناً "بہرا ہے" اس روز بھی نہ اس لڑکے نے برٹش اور وقار الحسن کی باتوں پر دھیان دیا تھا' نہ گفتگو میں کوئی حصہ لیا تھا۔۔۔ یقیناً "یہ بہرا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

اس بار بھی اس نے مجھے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میرا جی چاہا اس کی گردن مروڑ دوں۔ اب تو میں جان چکا تھا کہ وہ بہرا بالکل نہیں ہے بلکہ وہ مجھے کچھ اہمیت ہی نہیں دے رہا۔ وہ اندھا نہیں تھا' یہ میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔ چاہتا تھا کہ اس سے جھگڑا کروں مگر پیاس نے پہلے ہی نڈھال کیا ہوا تھا اس لیے سب سے پہلے میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر صراحی یا گھڑا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ایک طرف سائے میں گھڑونچی پر دو گھڑے رکھے تھے۔

میں اس طرف بڑھ گیا۔ ٹھنڈے پانی کا پہلا گھونٹ تو میرے معدے میں کسی بھالے کی طرح اتر گیا پھر میں نے ایک ہی گھونٹ میں سارا کٹورا خالی کر دیا۔ لمحہ بھر کو آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہوئیں۔ پیٹ میں بل سے پڑے۔ میں بے اختیار زمین پر بیٹھ گیا۔ سر بھی بری طرح چکرا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد حالت سنبھلی تو میں پھر اس لڑکے کی طرف متوجہ ہوا جو اب بھی اپنی بھونڈی آواز میں وہی پوربی گیت گا رہا تھا۔

مجھے شدید بھوک تھی۔ اس بھوک نے مجھے جھنجلا کر رکھ دیا۔ میں غصے میں بھرا اس لڑکے کی طرف بڑھا اور میں نے اس کے کندھے کو ہلا کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا کہ میرا ہاتھ اس کے بدن کے آر پار ہو گیا۔

چند لمحوں کے لیے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ جو کچھ ابھی میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے وہ سچ تھا یا نظر کا' احساس کا کوئی دھوکا تھا' لیکن پھر ہاتھ بڑھا کر اسے تھامنا چاہا اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ دھوکا نہیں تھا۔ سو فی صد حقیقت تھی میں اسے چھو نہیں سکا تھا۔

پھر بھی میں نے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے جا کر اسے زور سے آواز دی مگر وہ ویسے ہی جھوم جھوم کر گاتا اور برتن دھوتا رہا۔ جو کچھ میں نے محسوس کیا یا جو انکشاف اس وقت مجھ پر ہوا' وہ کسی بہت بڑے سانحے کی طرح مجھے ساکت اور بے حس و حرکت کر گیا۔ میں جانے کتنی دیر وہیں' اس کے سامنے زمین پر نڈھال سا بیٹھا رہا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے۔۔۔۔ جیسے وقار الحسن مرچکا ہے' اور یقیناً۔۔۔۔ میں اس کی روح ہوں' شاید اسی لیے وہ مجھے اپنے مقابل بیٹھا نظر آیا تھا۔ [illegible] مجھے [illegible] کاش میں اس بے حس و حرکت [illegible] دیکھ لیتا۔ تصدیق ہو جاتی کہ وہ زندہ ہے یا۔۔۔۔ مجھے [illegible] فلمیں یاد آگئیں جن میں کوئی کردار بیٹھے بیٹھے مر جاتا ہے اور اگر اسے چھوا جائے تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک جاتا ہے' گویا اس کی موت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

میں جوں جوں سوچتا رہا مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ وقار الحسن مرچکا ہے۔ میں صرف اس کی روح ہوں۔ دوسری دنیا کا حال کسے پتا ہے' ممکن ہے مرنے کے بعد بھی یہی سب کچھ ہوتا ہو۔ مرنے والا چیختا چلاتا رہتا ہو اور لوگ اپنی دھن میں مگن رہتے ہوں۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے چھوا۔ اپنا ہاتھ' اپنے چہرے پر پھیرا۔ میں موجود تھا۔ سو فی صد موجود تھا۔ میں خود کو محسوس کر رہا تھا۔ میرا بدن ویسا ہی ٹھوس تھا۔ پھر۔۔۔۔ پھر میں اسے دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟ اس کا بدن مجھے ٹھوس کیوں نہیں لگا؟ یوں جیسے میں نے ہوا کو چھونے کی کوشش کی ہو۔ میرا ذہن الجھ گیا۔ وہ میری آواز بھی نہیں سن پایا تھا۔۔۔۔ کیوں۔۔۔ آخر کیوں؟" میرا دماغ پورا کا پورا سوالیہ نشان بن گیا۔ میں نے اس لڑکے کی طرف دیکھا وہ برتن ایک چھابے میں رکھ کر چولھے کے پاس رکھی ایک لکڑی کی میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے بالکل سامنے سے گزرا تھا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا مگر اس کے چہرے سے بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کسی کی موجودگی سے واقف ہے۔

بہرحال یہ سوچیں میری بھوک کی شدت کو کم کرنے سے قاصر تھیں۔ اب اس لڑکے سے کچھ مانگنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں چپ چاپ اٹھا۔ لکڑی کی میز کی دوسری طرف دو دیگچیاں رکھی تھیں۔ دو چینی کے مرتبان بھی تھے جن میں کچھ بسکٹ رکھے تھے۔ میں نے ایک دیگچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں کوئی سبزی پکی ہوئی تھی۔ میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ وہ بدرنگ سالن بھی بڑا خوش رنگ اور اشتہا انگیز تھا۔ کچھ دیر ڈھونڈنے کے بعد مجھے وہاں روٹی کے چند ٹکڑے بھی مل گئے۔ سالن بھی تھوڑا ہی سا تھا۔ غالباً" یہ اس لڑکے نے اپنے لیے بنایا تھا۔

میں روٹی اور سالن لے کر وہیں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران میں نہ تو مجھے کسی بات کا خیال آیا اور نہ ہی میں نے سر اٹھا کر کسی طرف دیکھا۔ کھانا کھانے کے بعد مجھے ہوش آیا۔ وہ لڑکا سامنے بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا۔ سردی کافی تھی۔ ابھی صبح ہی کا وقت تھا۔ میں خالی پلیٹ میز پر رکھ کر ایک کونے میں بچھی دری پر جالیٹا۔ کھانا کھا کر میں نیم بے ہوشی کی سی حالت محسوس کر رہا تھا۔ نیند پپوٹے بھاری کر رہی تھی۔ وہاں وہی ایک لڑکا تھا اور وہ لڑکا نہ مجھے دیکھ رہا تھا' نہ محسوس کر رہا تھا۔ یہ بڑی تعجب خیز بات تھی۔ میں اس کا سبب جاننا اور سوچنا چاہتا تھا مگر پہلے بھوک اور پیاس نے پریشان کر رکھا تھا اور اب نیند نے بے خود کیا ہوا تھا۔ ذہن کسی قابل ہی نہیں رہا تھا سو میں نے بھی سب کچھ بھول کر آنکھیں موند لیں۔

پتا نہیں میں کتنی دیر سویا تھا۔ اٹھا تو ہوٹل کی بینچوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے۔ جن میں دو غیر ملکی بھی تھے۔ باقی مقامی لوگ تھے۔ لڑکا پھرتی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اس نوجوان لڑکے پر بڑا ترس آیا جو پھرکی بنا ہوا تھا اور بار بار گھبرائی گھبرائی نگاہوں سے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً" اسی برٹش آدمی کا منتظر ہوگا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ میں دری سے اٹھ کر کپڑے جھاڑتا ہوا ان بینچوں کے قریب پہنچ گیا۔ یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں بیٹھے لوگ مجھے دیکھتے ہی یا نہیں۔ میں ہر بینچ کے قریب سے گزرا' مگر کسی کا رد عمل ایسا نہ تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ انھوں نے میری موجودگی کو محسوس کیا ہے۔

"اے مسٹر۔۔۔!" ایک غیر ملکی نے ملازم لڑکے کو آواز دی۔ اس نے سنا نہیں یا شاید سمجھا نہیں۔

"اے تمھیں بلا رہے ہیں۔" میں نے بے ساختہ اپنے قریب سے گزرنے والے لڑکے کو مخاطب کیا۔ میں بھول گیا تھا کہ وہ مجھے بھی سن نہیں رہا ہے۔ وہ لڑکا اسی طرح اپنے کام میں منہمک تھا۔ وہ میرے پاس پڑی میز کو صاف کرنے لگا۔

"ڈیوڈ۔۔۔ ڈیوڈ؟۔۔ ہیئر از ڈیوڈ؟" اسی غیر ملکی نے آگے بڑھ کر اس لڑکے کا کاندھا ہلایا۔ "آئی وانٹ ٹو میٹ ہم۔"

اس لڑکے نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا مگر شاید وہ ڈیوڈ کے نام سے واقف تھا۔ اس نے ایک دم سر ہلایا اور پھر بالیکا مندر کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"وہ۔۔۔ ڈیوڈ۔۔۔ ادھر۔" وہ اس غیر ملکی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈیوڈ یقیناً" اسی برٹش کا نام ہے۔ وہ غالباً" اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈیوڈ اس طرف گیا ہے۔

"ہی ول کم بیک۔" دوسرے غیر ملکی نے پہلے شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مجھے دکھ ہوا۔ وہ لوگ اس برٹش کا انتظار کر رہے تھے جس کی اب تک تو شاید ہڈیاں بھی وہ زندہ کھوپڑیاں چٹ کر چکی ہوں گی۔ میں یہاں زیادہ دیر رکنے کی بجائے پھر بالیکا مندر کی طرف چل پڑا۔ اب۔۔۔۔ یعنی بھوک پیاس ختم ہو جانے اور نیند پوری ہو جانے کے بعد مجھے وقار الحسن کا خیال آرہا تھا۔ پھر میں اپنی موجودہ کیفیت بلکہ اپنی حقیقت کے بارے میں بھی جاننے کے لیے سخت مضطرب تھا۔ یہاں لوگ تھے۔ اس میں میں یکسوئی سے نہ سوچ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ میں انہی کھنڈر میں جانا چاہتا تھا۔

میں خاصی رفتار سے بالیکا مندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں کچھ ہی دیر بعد اسی نیچی سی دیوار کے قریب تھا جہاں سے گزر کر میں یہاں تک آیا تھا۔ میرے سامنے دور تک وہی سرکنڈوں کا جنگل سرسرا رہا تھا۔ میں آگے بڑھنے کی بجائے وہاں ٹھہر گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لیے اور وقار الحسن کو دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اپنی اس خواہش کو پانے میں فوراً" ہی کامیاب ہو گیا۔ وہ صحرا میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ وقار الحسن آنکھیں بند کیے ابھی تک ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اس کی پوزیشن میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر کو میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے یقین سا آنے لگا کہ وہ مرچکا ہے اور یقین نہ آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ سب سے بڑا ثبوت تو میں۔۔۔۔ خود تھا۔ میں یقیناً" وقار الحسن نہیں تھا۔ یعنی اس کا جسم نہیں تھا۔ میں اس کی روح ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا وہ جس انداز میں پھسکڑا مار کر بیٹھا تھا اسی طرح بیٹھا ہے۔ میں نے اس کے چہرے کو بہ غور دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھ سے بہت قریب تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی زردی صاف دیکھ لی تھی۔ اسی وقت مجھے عجیب سی آواز سنائی دی۔ سرسراہٹ کی تیز۔۔۔ بہت تیز آواز۔

میں نے چاہا کہ آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش نگاہ کروں مگر عین اسی لمحے جب میں آنکھیں کھولنے والا تھا کہ ایک کوندا سا لپکا۔ کوئی چمک دار' لمبی سی چیز لہراتی ہوئی وقار الحسن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ چیز وقار الحسن سے تقریباً" پچاس قدم کے فاصلے پر تھی۔ میری نگاہ جونہی اس پر پڑی وہ زیادہ بڑی اور واضح ہو کر میرے سامنے آگئی۔ میرے منہ سے بے ساختہ تیز چیخ نکل گئی۔ میں بے اختیار وقار الحسن کو ہوشیار کرنے کے لیے اسے پکار بیٹھا۔ وہ لمبی اور چمک دار چیز ایک چاندی ایسا سانپ تھا۔ پانچ چھے فٹ لمبا' کوندے کی طرح لپکنے والا۔ جس کے لپکنے سے ایک عجیب سی سیٹی کی سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

"وقار الحسن۔۔۔۔ بچو!" میں پھر چیخ اٹھا اور اس کی طرف بھاگ پڑا اچانک۔۔۔۔ بالکل اچانک وہ سانپ میرے چہرے کے قریب سے زن کر کے نکل گیا۔ وہ اڑ رہا تھا یا شاید چھلانگ لگاتا تھا۔ وہ زمین سے اچانک تیر کی طرح آگے بڑھتا تھا اور فضا میں آدھا دائرہ سا بناتا ہوا پھر زمین پر جا گرتا تھا بلکہ نہیں' گرتا کہاں تھا' زمین کو چھو کر پھر فضا میں بلند ہو جاتا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں تھیں اور چیخ چیخ کر سامنے بیٹھے وقار الحسن کو آوازیں دے رہا تھا تبھی اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں۔۔۔ وقار الحسن کے بالکل سامنے موجود ہوں۔ وہیں' جہاں میں نے خود کو وقار الحسن کے جسم سے نکل کر باہر آتے ہوئے محسوس کیا تھا جبکہ کچھ ہی دیر پہلے میں بالیکا مندر کے دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ میں تو آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر پھر میں نے سوچا تھا کہ وقار الحسن کے بارے میں جان سکوں' پتا نہیں میں وہاں سے لمحے بھر میں یہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔

وہ چمک دار سانپ اب وقار الحسن کے بالکل قریب پہنچنے والا تھا۔ میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے آگے بڑھ

کرو قارالحسن کو جھنجوڑ دیا۔ "دیکھو دے۔۔۔ وہ دیکھو۔ بچو۔"
میرے جھنجوڑنے پر وقارالحسن کے جسم میں جنبش تو ہوئی۔ اس کا بدن ہلا بھی مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ نہ اس کا سر میری توقع کے مطابق ایک جانب کو ڈھلکا۔ گویا وہ زندہ تھا۔

"وقارالحسن! پاگل ہوگئے ہو کیا؟ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔" میں نے پھر اسے چھونا چاہا مگر جونہی میری انگلیاں اس کے جسم سے مس ہوئیں۔ جھلس کر رہ گئیں۔ میں نے بلبلا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" میں حلق کے بل دھاڑا۔ مگر اسی لمحے میں نے جو منظر دیکھا۔ وہ مجھ سے میری جھلسی ہوئی انگلیوں کی تکلیف کا احساس تک چھین گیا۔ سانپ اس چھلانگ میں وقارالحسن کے جسم سے ٹکرایا اور پھر میں نے فضا میں شعلوں کو ایک لکیر کی صورت میں لپکتے دیکھا' وہ سانپ تھا۔ وقارالحسن کے جسم سے ٹکراتے ہی اس کا جسم شعلوں میں تبدیل ہوگیا تھا اور اس نے پھر فضا میں چھلانگ لگائی تھی۔ اس بار وہ جس جگہ زمین پر گرا' دوبارہ نہیں اٹھا اور شعلوں نے اس بل کھاتے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر وقارالحسن کو دیکھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح بیٹھا تھا۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔

اب دھوپ نرم ہوگئی تھی۔ سورج غالباً" مغرب کی جانب جھک گیا تھا۔ غالباً" میں نے اس لیے کہا ہے کہ گاڑھے دھوئیں ایسی چادر اب بھی ہمارے سروں پر تنی ہوئی تھی۔ ہوا میں عجیب سی چبھنے والی ٹھنڈک تھی۔ میں وقارالحسن کے سامنے ٹھنڈی ریت پر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں وقارالحسن کا کیا پروگرام تھا۔ وہ کب تک یونہی بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ وظائف کر رہا تھا' اتنا تو میں جانتا ہوں مگر وہ کتنی دیر وظائف کرے گا میں اس سے ناواقف تھا۔ جوں جوں اندھیرا پھیل رہا تھا' میں مضطرب ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان سے برستے اندھیرے کے ساتھ ہی ٹھنڈک بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں یخ ہوچکے تھے۔ حرارت کی خواہش بڑھی تو مجھے چمپا یاد آگئی۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی تھی یا نہیں' اس کے بدن کی گرمی میں کیسا سرور تھا۔ کتنا کیف تھا۔ اسے مسلسل بیان کرتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے ہی کسی بدن کی حرارت کی چاہ نے مجھے پھر مضطرب کردیا تھا۔ پھر مجھے کلپنا یاد آگئی۔ اس کے ریشمی بال' مرمریں' موم ایسا بدن اور آنکھوں کی مقناطیسی کشش جیسے میرے ہونٹوں کے قریب لپکنے لگی۔ مجھے سامنے پتھر بنے وقارالحسن

پر غصہ آگیا۔ اب تو اسے یوں مٹی کا مادھو بنے بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں تو اسے دیکھ چکا تھا مگر وہ اب تک میرے وجود سے ناواقف تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ لے تاکہ ہم یہ طے کرسکیں کہ یہ کیا ہوا؟ ہم واقعی دو حصوں میں تقسیم ہوگئے ہیں یا یہ بھی کسی قسم کا شعبدہ ہے۔ اس نے تو میرے چیخنے چلانے کے باوجود اور میرے جھنجوڑ دینے کے بعد بھی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ اسے تو سانپ کا خطرناک حملہ بھی ہوش میں نہیں لا سکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں' اسے کیسے متوجہ کروں پھر اچانک ہی میرے دماغ میں ایک خیال آیا اور میں نے آگے بڑھ کر اس میں داخل ہونا چاہا۔ یہ دیکھ کر میں خوش ہوگیا کہ اس بار پھر میں پہلی مرتبہ کی طرح اس میں ضم ہوچکا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے حرارت محسوس کی جو دھیرے دھیرے بڑھ کر تپش میں تبدیل ہوگئی۔ ایک بات اور میں نے محسوس کی کہ میں وقارالحسن کے اندر ضم ہوجانے کے باوجود اس سے الگ تھا۔ میں سوچ رہا تھا' سب کچھ محسوس بھی کر رہا تھا۔ میں نے وقارالحسن کے وجود کو' اس کے دماغ کو ایک ان دیکھے جال میں محبوس دیکھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے' کیا سوچ رہا ہے مگر میں اس کے دماغ میں گھسنے سے قاصر تھا۔ میں نے اسے پھر جگانے' ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ اس کے اندر کی تپش اب آنچ دے رہی تھی۔ مجھے اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں پھر گھبرا کر باہر نکل آیا۔ میں جیسے ہی اس کے مقابل ہوا' اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو شدید حیرت دیکھی مگر جلد ہی وہ پرسکون ہوگیا۔

"وقارالحسن۔۔۔ تم۔۔۔ دیکھو' مجھے دیکھو۔۔۔ میں کون ہوں؟ وقارالحسن یا۔۔۔ یا کوئی اور۔" میں اس کے قریب چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ سرخی اور وحشت سی تھی۔ اس نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

"تم وقارالحسن ہو۔ مگر وہ وقارالحسن' جو سادھو کی باتوں میں آکر بھٹک گیا تھا۔ وہ جو دنیا کی لذتوں میں راہ مستقیم کو ٹھکرا کر ایک ایسے راستے پر چل نکلا تھا جہاں تمام عذاب خوب صورت اور پرکشش شکلوں میں تمہارے منتظر

ہیں۔"

"تو کیا۔۔۔ تم۔۔۔ تم ان لذتوں سے منکر ہو جنھیں حاصل کرچکے ہو۔۔۔ اس شہد کو کڑوا گھونٹ کہنے والے ہو جسے چکھ چکے ہو؟"

"تم نے میٹھے زہر کا نام سنا ہے؟" اس نے الٹا سوال کردیا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن۔" میں الجھ گیا۔

"وہ زہر بھی انسان کو مار دیتا ہے۔" اس نے سرہلا کر' آنکھیں بند کرکے کسی بزرگ کی طرح جواب دیا۔

"وقارالحسن!" میں نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اسے پھر مخاطب کیا۔ "میں اور تم دو الگ شخصیتیں ہیں یا۔۔۔ ایک ہی۔"

"میں نے جو وظیفہ کیا تھا' وہ اپنے اندر سے نفسانی خواہشات کو فنا کرنے کا کیا تھا۔ یہ میرا ارادہ نہیں تھا۔ میں تو اپنی گمشدہ قوتوں کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ وظائف کرنا چاہتا تھا جو سنہرے بابا کے حجرے میں کرچکا تھا تبھی مجھے ان کی دی ہوئی کتاب میں لکھا ایک وظیفہ یاد آگیا۔ میں نے وہ بھی پڑھ لیا۔ میں کچھ بھول گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ وظیفہ حصار کھینچنے والا ہے مگر جب تک مجھے احساس ہوا' تم میرے وجود سے باہر نکل چکے تھے۔ بہرحال اس مجھے فخر ہے' کوئی شرمندگی نہیں ہے' بلکہ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ شاید خدا یہی چاہتا تھا۔ میں نے دو وظائف کرلیے ہیں۔ میں انشا اللہ اپنی گمشدہ قوتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا گو یہاں مجھے سادھو کا زیادہ خطرہ ہے مگر۔۔۔ مگر پھر بھی' میں خود میں ایک عزم اور ولولہ پاتا ہوں۔ تمہارے لیے میری یہ نصیحت ہے کہ مجھ سے دور ہی رہنا۔ مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ جو قوتیں میں حاصل کروں گا' وہ یقیناً" تم میں بھی پیدا ہوجائیں گی۔ تم اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہنا نیکی کرنا اور نفس پر پورا کنٹرول حاصل کرنا آدمی کی تمام راہیں روشن کردیتا ہے۔"

وہ کسی بوڑھے بزرگ کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ مجھے قطعی اچھا نہیں لگا۔ "آدمی اپنی عمر کے مطابق چلے تو اس کے لیے بہتر ہوتا ہے وقارالحسن۔۔۔ تم کب تک معرکے سر کرتے رہو گے۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہیں کوثر کو واپس لے کر جانا ہے۔ تمہیں اس سادھو نے تو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا شکنتلا نے۔ تم سوچ چکے تھے کہ دنیا جہان کو بھاڑ میں جھونک دوگے' کوثر کے لیے بھی صرف اتنا کرو کہ اسے

گہرے سائے لرز رہے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں یا ہونے والا ہوں۔

"وقارالحسن! زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے۔ اگر دوبارہ ملتی تو میں بھی پہلی زندگی لوگوں کی خدمت میں گزار دیتا۔ مرنے کے بعد ہماری کیا حیثیت ہوگی' کیا زندگی ہوگی؟ کچھ پتا نہیں ہے۔ کم از کم اس زندگی کو تو اپنی مرضی سے گزار لو۔ دوسروں کے مسائل حل کرنے میں وقت ضائع کروگے تو اپنے لیے ہزاروں مسائل کھڑے کرلوگے اور اس وقت انھیں حل کرنے والا کوئی تمہارے ایسا بے وقوف وقارالحسن آگے نہیں بڑھے گا۔"

"تم چپ نہیں رہ سکتے؟" وہ نہ جانے کیوں جھنجلا گیا۔

میں نے اس کے چہرے پر جس کشمکش کے آثار دیکھے تھے' وہ کسی حد تک امید افزا تھے۔ میں نے ایسے میں چپ ہوجانا ہی مناسب سمجھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ضمیر سے خود جنگ کرے اور خود ہی فتح حاصل کرلے۔ اس طرح میں قدم قدم پر اسے سمجھانے اور نصیحتیں کرنے سے بچ جاؤں گا۔ مجھے سو فیصد اپنی کامیابی کی امید تھی۔ میں نے قطعی طور پر نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس کے ذہن میں بات اس وقت ڈالی تھی جب اس کا ذہن کورے کاغذ کی طرح صاف ستھرا اور سادہ تھا۔ میں اپنی بات ذہن میں ڈال کر اس کے ذہن کے کواڑ بند کردینا چاہتا تھا تاکہ وہ کوئی تاویل نہ دے سکے' اس کی دی ہوئی کوئی بھی تاویل' کوئی بھی نصیحت اسے مضبوط کرسکتی تھی۔ میں نے اس کے سامنے سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ میں اسے یونہی سوچوں میں غرق چھوڑ کر اس کی پشت کی طرف چل دیا۔ یہاں بھی دور دور تک صحرا سا پھیلا ہوا تھا۔

مجھے پہلی بار پریشانی ہوئی کہ آخر یہ کیا ہوا ہے۔ وقارالحسن تو کھنڈر کے اس ہال میں مراقبے میں بیٹھا ہوا تھا پھر یہ ہال اچانک صحرا میں کیسے تبدیل ہوگیا۔ اگر یہ سادھو کی شعبدے بازی تھی تو اس میں اس کا کیا فائدہ تھا اور اگر یہ ان وظائف کا کمال تھا تو بھلا کیوں تھا اور اس کا مقصد کیا تھا۔ پھر مجھے وہ چمک دار سانپ یاد آگیا جس نے وقارالحسن پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کون تھا؟ کیا تھا اور کس نے اسے وقارالحسن پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ نہ

لگا ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کی لکیریں غائب ہوگئی تھیں۔ اب اس کے چہرے پر گہرا، سوچ اور فکر کر سادھو کی چنگل سے نکال کر گھر بھیج دو۔ شکنتلا شاید اب تمہارے پاس آئے گی ہی نہیں۔ وہ کلپنا اور چمپا۔۔۔ وہ ملائم بادلوں جیسے جسموں والی لڑکیاں۔۔۔ اور۔۔۔ اور وہ کھوپڑیاں وقارالحسن۔۔۔"

کلپنا اور چمپا اور کھوپڑیوں کے نام ہی سے مجھ پر نشہ سا طاری ہونے لگا تھا۔ میں نے وقارالحسن کے چہرے پر ناگواری صاف محسوس کرلی تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ میرے دل و دماغ کا وہ حصہ جہاں پر یہ سب تھا' مجھ سے الگ ہو کر مجسم ہوچکا ہے اور وہ۔۔۔ وہ تم ہو۔" اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

"وقارالحسن! تم بھوکے اور پیاسے ہو۔ جبکہ میں باہر سے جا کر پیٹ بھر آیا ہوں۔" میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ کچھ بھی تھا وہ بہرحال انسان تھا' بھوک اور پیاس اسے بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔

"ہاں۔۔۔ میں بھوکا ہوں اور۔۔۔ پیاسا بھی مگر اب مجھ میں اتنی قوت ہے کہ خود پر جبر کرسکوں۔" اس نے اس بار بھی بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"بے وجہ کا جبر کرنے سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے وقارالحسن۔ میری مانو تو یہ سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی پرسکون زندگی میں واپس چلو۔ تم شاید بھول گئے کہ تم یہ وظائف کرنے کے لیے کیوں بیٹھے تھے۔ سادھو سے یہ سب کچھ چھین لو وقارالحسن! اس کھنڈر پر قبضہ کرلو۔ یہ سب کچھ۔۔۔ یہ سارا کچھ تمہارا ہوجائے گا۔"

میں نے پھر اسے اکسایا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر ناگواری کی کئی لائن سی پڑ گئیں۔ میں بولتا رہا۔ اس نے جتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں سب اسے ایک ایک کر کے یاد دلائیں' اسے بتایا کہ ان چکروں نے' ان عذابوں نے اسے زندگی سے دور کردیا ہے۔ اسے کچھ نہیں پتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ آدمی عمر کے ساتھ ساتھ کن رنگین کیفیات سے گزرتا ہے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے اب تک دوسروں کے گناہوں کی سزا بھگتا رہا ہے۔

میں انتہائی دردناک لہجے میں اسے اس کے غم یاد دلا رہا تھا پھر میں نے محسوس کیا کہ اس پر میری باتوں کا اثر ہونے

معلوم کیوں مجھے وہ سانپ یاد آرہا تھا جس نے وقارالحسن کے باوا کا گلا گھونٹ کر انھیں مار دیا تھا۔ ایسے ہی ایک سانپ نے گنگوا کی بھی جان لی تھی۔ اسے تو میں نے کافی غور سے دیکھا تھا۔ یہ چاندی ایسا چمک دار سانپ تھا جو کنڈلی مارے گنگوا کے نیلے پڑتے بدن پر بیٹھا تھا۔

معا" میرے دماغ میں شکنتلا کی دھمکی گونج اٹھی۔ اس نے وقارالحسن سے کہا تھا کہ تم سمجھ رہے ہو کہ تمہارا خاندان چاند کی قید سے آزاد ہوگیا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ جس وقت وقارالحسن کے باوا جان دے رہے تھے' جب ان کی گلے میں لپٹا سانپ وقارالحسن نے دیکھ لیا تھا تب کھڑکی میں پہلے بار شکنتلا کا سایہ لہرایا تھا۔ یوں جیسے وہ باور کرانا چاہتی ہو کہ اس کا انتقام پورا ہوگیا۔ ممکن ہے یہ سانپ شکنتلا ہی کی مہربانی ہو۔ وقارالحسن کا اسے جواب دینا گویا اس کی مکمل شکست پر یقین کی مہر لگاتا تھا۔ وہ مایوس ہو کر کچھ بھی کرسکتی ہے۔ اگر وہ کسی قابل نہ ہوئی تو پر کاش کو بھی تو وقارالحسن میاں آزاد کرچکے تھے۔ یہ تو انھوں نے وہی کام کیا تھا کہ آبیل مجھے مار' اچھا بھلا صندوق میں بند تھا مگر وقارالحسن خدائی فوجدار بنے ہوئے تھے۔

میں یہ سب باتیں سوچتا ہوا بڑی دور نکل آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اتنے کم وقت میں' میں نے بڑا طویل فاصلہ طے کرلیا ہے۔ میں بے وجہ ہی چلتا چلا جا رہا تھا۔ صحرا کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ میرے سامنے دور تک درخت ہی درخت تھے۔ موٹے' بھدے اور بے حد پرانے درخت' برگد اور پیپل کے درخت' ساری زمین پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں لحہ بھر کو ٹھٹک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو حیرت سے اچھل پڑا۔

میرے سامنے وہی کھنڈر تھا۔ وہی کھنڈر جہاں کے ایک ہال نما کمرے میں وقارالحسن وظائف کرنے بیٹھا تھا۔ میں البتہ ان کھنڈر کو عبور کر آیا تھا۔ یہ جنگل یقیناً" کھنڈر کے پیچھے تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کون سی دیوار عبور کرکے یہاں پہنچا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے وقارالحسن کے بارے میں اطمینان کرنا چاہا۔ وقارالحسن اس بار مجھے اس ہال کے ایک کونے میں بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے عین [illegible] سادھو' کلپنا اور ایک بادلوں ایسی نرم ملائم لڑکی کو پہلو میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے خبیث چہرے پر بلا کا سکون تھا' مسرور تھا' چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کیف بھرا

وہ بدصورت اور بدہیئت بوڑھا ان دونوں حسیناؤں کے درمیان میں راجہ اندر کی طرح بیٹھا تھا اور ان دونوں کو پالینے کی فتح کے احساس نے اس کے مکروہ چہرے پر بھی خوب صورتی بکھیر دی تھی۔

مجھے شدت سے احساس ہوا کہ جوان آدمی کتنا ہی بد صورت ہو اس پر خوب صورتی چھا جاتی ہے۔ اس کی وجہ یقیناً" مخالف جنس میں کشش ہی ہوسکتی ہے۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی پراسرار اور پرکیف سے جذبے ہی اسے خوب صورت بناتے ہیں۔ جبھی تو کہا جاتا ہے کہ جوانی میں گدھی بھی خوب صورت لگتی ہے' اسی جنسی کشش نے سادھو کے مکروہ چہرے کو ایک عجیب سی دلکشی بخش دی تھی۔

میں نے سر گھما کر وقارالحسن کا چہرہ دیکھا۔ کتنا کرخت' کتنا پتھریلا اور کتنا بے رونق سا چہرہ تھا' وہ نوجوان ہونے کے باوجود بوڑھا لگ رہا تھا۔ نہ اس کے چہرے پر چمک تھی' نہ ملاحت' نہ جاذبیت تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کشش۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے' خالی آنکھوں کو چہرے پر ٹکائے سادھو کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے خلاؤں میں تک رہا ہو۔

میں پلٹ پڑا۔ میں شاید اس کی یہ بدصورتی برداشت نہیں کرپایا تھا۔ صرف ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ میں نے اسے اپنے مقابل پایا۔ مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوا کہ سادھو مجھے دیکھ لے گا مگر یوں لگا جیسے وہ میرے وجود سے ناواقف ہو۔ مجھے توقع تھی کہ مجھے یوں۔۔۔ یا وقارالحسن کو دو حصوں میں منقسم دیکھ کر وہ حیرت سے اچھل پڑے گا۔

مگر اس کی نگاہیں مجھ پر سے یوں گزر گئیں جیسے خلا کو تکتی ہوئی گزری ہو' البتہ وقارالحسن کی آنکھوں میں چونک اٹھنے کی سی بالکل خفیف کیفیت پیدا ہوئی پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"وقارالحسن! وہ پائل دے دو مجھے۔ دیکھو تو یہ دو میٹھے دریا میرے پہلو میں بہہ رہے ہیں اور میں ابھی تک پیاسا ہوں۔" اس کے نشے میں ڈوبی ہوئی سی آواز آئی۔

میں نے چونک کر وقارالحسن کو دیکھا۔ وہ ہچکچاہٹ میں مبتلا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ انکار کرنے والا ہے۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا سو پلک جھپکتے اس کے اندر اتر گیا۔

"وقارالحسن! وہ پائل اسے دے دو۔" میں نے سرگوشی کی۔ مجھے اس بار اس کا بدن اندر سے بالکل سرد لگا۔

مجھے وقارالحسن کا ہنکارا سنائی دیا۔ میں نے اس کے دماغ میں گھسنے کی کوشش کی مگر لگا جیسے میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاؤں گا۔ "پائل اسے دے دو وقارالحسن! دیکھو تو۔ کلپنا کی آنکھوں میں دیکھو' جیسے گرم ریت کے ذرے تپ رہے ہیں۔ اس معصوم کو بچاؤ وقارالحسن' بڈھے کی استخوانی انگلیاں اس کی کمر میں پیوست ہو رہی ہیں۔ بڈھے کے منہ سے بدبو آرہی ہوگی۔ اسے دیکھو تو۔۔۔ وہ کیسی ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔" میں بے چینی سے بولتا چلا گیا۔

"تم چپ ہوجاؤ۔" وقارالحسن نے ہونٹ ہلائے بغیر مجھے ڈانٹ پلائی۔ "اسے پائل دے دینے کا مطلب جانتے ہو تم؟ وہ ان دونوں کے معصوم جسموں سے کسی جونک کی طرح چمٹ کر ان کا سارا لہو نچوڑ لے گا۔"

"وہ لہو نہیں پی سکے گا وقارالحسن' ہاں۔ ان میں جلتے چراغوں کی لو ضرور بڑھ جائے گی اور پھر ان چراغوں کی لو تمہارے اندر بلا کی روشنی بھردے گی۔ دے دو۔ پائل دے دو۔ شکنتلا تمہیں دھمکی دے چکی ہے۔ وہ پائل لے کر بھی تمہاری جان نہیں چھوڑے گی۔ پرکاش اسے پھر باندھ لے گا وقارالحسن۔ یہ مت بھولو کہ اس کا جسم اب بھی تمہاری حویلی میں دفن ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وقارالحسن کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اس کے چہرے پر ناچتی کشمکش کی پرچھائیاں دھیمی پڑ گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کلپنا کے چکنے اور معصوم چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"دیکھو وقارالحسن۔ اس کے شہد بھرے ہونٹوں کو دیکھو۔ خوف سے خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ تم چاہو تو پائل دے کر اسے اس خبیث سے چھین سکتے ہو۔ تم جو طاقت حاصل کرچکے ہو' جو طاقتیں مزید حاصل کروگے' وہ تمہیں اس بوڑھے سے زیادہ اہم بنا دیں گی۔"

میں نے لوہا گرم دیکھ کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اچانک اس کا یخ بدن دھیرے دھیرے گرم ہونے لگا۔ ایک آرام دہ حرارت نے مجھے بھی کافی تقویت پہنچائی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑنے لگیں۔ سادھو اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"وقارالحسن!" اچانک مجھے شکنتلا کی سرگوشی سنائی دی۔

"اسے پائل نہیں دینا وقارالحسن! بھگوان کے لیے ایسا نہیں کرنا ورنہ تم سارا جیون پچھتاوے میں گزار

وہ نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ وقارالحسن اس کی آواز سن کر چونک اٹھا تھا اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہو گئے۔ اس کے چہرے کے عضلات بھی کھنچ گئے۔

"بکنے دو اسے وکارالحسن!"

جو جملہ میں کہنا چاہتا تھا' وہ سادھو نے ادا کر دیا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ بڑھ کر اس کا کریہہ منہ چوم لوں۔

"اس دنیا پر اس کا ادھیکار نہیں ہے مگر یہ پھر بھی سالوں سے یہاں بھٹک رہی ہے اور تم لوگوں کو پریشان کرتی رہی ہے۔ اس کا وناش ہو جانا دنیا سے اوجھل ہو جانا ہی اچھا ہے وکارالحسن! ورنہ جانے یہ کیا کرے گی۔"

میں نے بھی وقارالحسن کو ٹھوکا دیا۔ وقارالحسن کشمکش و پنج میں مبتلا تھا۔ میں اور سادھو اسے ایک جانب کھینچ رہے تھے' شکنتلا کی سسکیاں اور شاید اس کے ضمیر کی سسکیاں اسے دوسری جانب۔ مجھے تو یہی امید تھی کہ میں اور سادھو اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

"وہ پیش بند کہاں ہے سادھو؟"

اچانک وقارالحسن نے ایک غیر متوقع سوال کر ڈالا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔ میں اسے جانتا تھا' خوب واقف تھا یہ علامت تھی اس کی کمزوری کی۔ شکست مان لینے والی کیفیت کی۔

"تم کیا کرو گے اس پیش بند کا؟" میں نے اور سادھو نے دونوں نے ہی ایک ساتھ سوال کیا۔

"جو کچھ تم پائل کا کرو گے۔" وقارالحسن نے لہجے کو درشت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو تم سے نہیں پوچھا کہ تم پائل کا کیا کرو گے؟"

سادھو چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا تھا۔ اس کی توجہ ان حسیناؤں کے مرمریں بدن سے ہٹ چکی تھی۔ پھر اچانک اس نے دونوں بازوؤں کو ان دونوں کے کاندھوں سے ہٹا لیا اور کچھ آگے کی طرف لپک آیا۔ "وہ شکتی کا بھنڈارا ہے۔ تم چاہو تو۔ وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں پر وہ پائل۔"

"وہ پائل تمہارے لیے اتنی اہم کیوں ہے سادھو۔ ایک عرصہ ہو گیا تمہیں اس کے پیچھے پڑے ہوئے۔" وقارالحسن نے کھوجتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تمہیں اس سے کیا ہے؟" میں نے پھر اسے ٹھوکا دیا۔

"دے دو اسے۔ جان چھڑاؤ اپنی۔ تم بھی تو عرصے سے اسے سینے سے لگائے پھر رہے ہو۔ تم دونوں ہی نے بے وقوفی میں اتنا عرصہ ضائع کر دیا۔ اس اسرار کی دنیا میں اور بہت کچھ ہے وقارالحسن!"

"چپ رہو تم!" وہ جھنجلا کر چیخا۔

اس کے اس طرح جھنجلا کر چیخنے نے سادھو کو چونکا دیا۔ "کک۔ کون ہے۔؟ کس سے بات کر رہے ہو تم؟" اس نے چونکی نگاہوں سے چاروں جانب دیکھا تو وقارالحسن کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں ہے' میں تم سے کہہ رہا ہوں۔" اس نے بات بنانے کی کوشش کی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وقارالحسن کسی سے بات کر رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اس کی تیز نگاہوں میں گہری سوچ تھی۔ پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ "وقارالحسن! تم تو بڑی شکتیاں حاصل کر چکے ہو۔ مجھے بھی اب کچھ تیاریاں کر لینا چاہیے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ میرے بارے میں جان گیا ہے یا نہیں۔ وقارالحسن کے چہرے پر بھی الجھن کے آثار تھے۔ وقارالحسن اس معاملے کو بے وجہ طول دے رہا تھا۔ مجھے اس پر سخت غصہ تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو سادھو سے سودے بازی کر لیتا۔ پائل اسے دے کر اس سے وہ تمام چیزیں لے لیتا جن کی تڑپ نے مجھے بے کل کیا ہوا تھا۔ اب ایک ہی بات رہ گئی تھی۔

میں اس طویل جنگ سے تنگ آ چکا تھا۔ میں جلد سے جلد حالات کو تبدیل کر دینا چاہتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقارالحسن اور سادھو وقت کے کسی ایک لمحے میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں اس قید سے نکل کر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

سادھو اب بھی گہری سوچ میں ڈوبا وقارالحسن کو تک رہا تھا پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے دور رہی طاق تک ہاتھ بڑھایا' میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا ہاتھ یعنی اس کا بازو گزوں لمبا ہو گیا۔ اس طاق پر رکھا وہ پیالا اٹھا لیا جس میں خون بھرا تھا۔ "وقارالحسن۔ جانتے ہو یہ خون کس کا ہے؟" اس نے پراسرار لہجے میں سوال کیا۔

کیا مطلب ہے؟" وقارالحسن چونک اٹھا۔

مطلب یہ ہے بالک کہ یہ لہو کوثر کا ہے۔ اس کی ں سے ٹپکنے والا لہو۔ اس نے جو عمل کیا تھا وہ پائل ں کرنے کے لیے کیا تھا مگر اسے پیش بند مل گیا۔ یہ ناگیا ر کا پیش بند اڑھائی صدی پرانا ہے۔ اتنے ہی عرصے اگ دیوتا اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس نے ان ناگوں کو شکست دی تھی پر تو اس جاپ نے یعنی عمل اس کی نسوں سے لہو کھینچ لیا تھا۔ یہ پیش بند' جو بڑے گیانی 'منی' تانترک اور سادھو سنت حاصل نہ کر سکے مورکھ پاگل کنھیا نے پا لیا۔ وہ نہیں جانتی کہ اسے پانا شکتی پانا ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں اس کو پانے کے لیے کتنے لوگوں نے اپنی جان ہار دی ی آج رات میں تمہیں دکھاؤں گا۔ آج رات تم تیار ا۔"

نگران باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے' اور تم۔ اس کی بات کیوں کر رہے تھے؟ اگر یہ کوثر کا خون ہے تو۔ تو تم کیا چاہتے ہو اور کوثر کہاں ہے؟ میں اسے ابھی اور وقت دیکھنا چاہتا ہوں۔" وقارالحسن ایک دم بے چین یا۔

"ہاں۔ اسے میں دکھا دیتا ہوں۔ وقارالحسن لیکن تم پا نہیں سکو گے۔ اب وہ تمہیں اس روز ملے گی جب پائل مجھے دے دو گے۔"

اتنا کہہ کر سادھو نے اپنے ہاتھوں کو عجیب سے انداز جنبش دی۔ تیز سیٹی کی سی آواز کے ساتھ ہی سرخ رنگ دھواں سا اٹھا۔ پورا ہال اس دھوئیں سے بھر گیا۔ ارالحسن کے گلے میں شدید جلن ہوئی۔ اس جلن کو میں اپنے گلے اور نتھنوں میں بھی محسوس کیا۔ وقارالحسن پر ینکوں کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی کی ماریں بہنے لگیں۔ وہ نڈھال ہو گیا۔ یہ سب کچھ صرف سیکنڈز میں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کمرا ایک دم صاف ہو گیا۔ سامنے کوثر کو بیٹھا دیکھ کر حیرت اور خوف سے اچھل ا۔ وقارالحسن کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی بلکہ اس کے تو حلق سے عجیب سی چیخ بھی نکلی تھی۔ میں نے اتنا خوفناک منظر اب سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ خود نہ ہو بلکہ کسی نے بھربھری مٹی سے اس کا مجسمہ بنا کر کونے میں رکھ دیا ہو۔ اس کے مٹی میں اٹے بال لٹوں کی صورت میں اس کی شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ہونٹ خشک ہو کر سفید ہو گئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ بدن ویسے ہی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ زخموں پر جما ہوا خون سیاہ پڑ چکا تھا۔ سب سے زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ ایک بہت بڑی مکڑی نے کوثر کے بدن پر جالا بنا ہوا تھا۔ وہ سرخ رنگ کی مکڑی اتنی ہیبت ناک تھی کہ میں نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ جالا ہلتا تھا تو اس کے بدن سے چمٹی چمکدار لکیریں سی لہرا جاتی تھیں۔ وہ کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں جالا نہ بنا ہوا ہو۔ سرخ مکڑی اپنی گول گول آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے یہ آنکھیں میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ یہی۔ بالکل یہی چمکدار آنکھیں — وہ مجھے بہت قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے منہ سے نکلنے والا چمک دار تار صاف ہوا میں لہراتا نظر آ رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟" وقارالحسن چیخ اٹھا اور اس کی طرف لپکنے لگا۔

"دھیرج۔ دھیرج وکارالحسن! میری بات سن لو۔" وہ ایک دم چیخ اٹھا۔ وقارالحسن ٹھٹک کر رک گیا۔ "اسے چھونا نہیں بالک۔ یہ محفوظ ہے' میں نے اسے ناگوں سے بچایا ہے۔ اس ناگ دیوتا کو وش میں کرنے میں میرا بڑا نکسان ہوا ہے۔ اگر تم نے اسے چھوا تو۔"

"بے وقوف بناتے ہو مجھے؟" اچانک وقارالحسن طیش میں آ گیا۔

"نہیں۔ نہیں وقارالحسن۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم شکتی پا چکے ہو۔" وہ مضطرب ہو کر بولا۔ "کچھ نہ کرنا۔ تم چاہو تو جان سکتے ہو' ان ناگوں کو دیکھ سکتے ہو جنہیں میں نے ایک بڑے گار میں بند کر دیا ہے۔"

اس کے لہجے کی سچائی نے وقارالحسن کو پرسکون کر دیا۔ اس کے اندر کا یہ سکون بالکل بج کر دینے والا تھا۔ میں اس کے اندر کے اتار چڑھاؤ سے تنگ آ گیا تھا۔ اس کی تمام حرکتیں الجھا دینے والی تھیں۔ وہ چند لمحے آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ سادھو چونکنے انداز میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھی دونوں خوب صورت دوشیزائیں دم بخود کوثر کو تک رہی تھیں۔ ان کے چہرے خوف سے پیلے ہو چکے تھے۔

آنکھیں اپنے حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک نے ایک کرب ناک چیخ ماری اور وہیں لڑھک کر بے ہوش ہو گئی۔

"انھیں۔ انھیں آزاد کر دو سادھو۔" وقار الحسن جس نے چیخ کی آواز سن کر آنکھیں کھول دی تھیں' ایک دم کہا۔

سادھو نے اس بار آنکھیں پھاڑ کر وقار الحسن کو دیکھا۔ میں بھی اسی طرح آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کفران نعمت کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اس بار میرا جی چاہا کہ میں گھونسا مار کر اسے گرا دوں۔

"انھیں چھوڑ دوں؟" سادھو نے حیرت سے کہا۔ "پرنتو کیوں؟ میں نے ان میں اتنے دنوں بڑا شہد جمع کیا ہے وکار الحسن! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں انھیں چھوڑ دوں؟ میں۔ جس نے دنیا چھوڑ دی کہ اپنی کھوئی ہوئی شکتی پراپت کر کے جیون کا امرت پیوں۔ اپنے سوکھے ہوئے بنجر شریر کو سیراب کروں' میں کہ اتنی شکتی تو رکھتا ہوں جس نے تم ایسے منش کو بے بس کر دیا تھا۔ جس نے جیون کے اس امرت کے لیے تمھیں پھانسنے کو چار آدمیوں کا کھون کر دیا' میں انھیں چھوڑ دوں؟ اور ایک بات بتا دوں وکار الحسن! میں نے انھیں چھوڑ بھی دیا تو۔ تو یہ اس کھنڈر سے باہر نہیں جا سکیں گی۔ ان کی آنکھیں' ان کا ہر کدم ان کا پورا شریر صرف یہاں کے لیے ہے۔ بس یہاں کے لیے۔"

"تم اپنا کام کرو وقار الحسن! دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دو۔" اس بار میرا لہجہ بہت تلخ تھا' اتنا کہ وقار الحسن چونک اٹھا۔

"تم۔ تم۔ مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" وہ چیخ اٹھا۔

"کیا؟" سادھو پھر حیران ہو گیا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔" وقار الحسن پھر بوکھلا گیا۔ "کیا ہو گا اس کھنڈر سے باہر؟ انھیں تم کہاں سے لائے ہو۔؟" اس نے بات پلٹنے کو کہا۔

"میں انھیں کہیں سے بھی لایا ہوں' تمھیں مطلب نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔ "دیکھو وکار الحسن! میں تم سے جنگ نہیں چاہتا۔ میں تمھاری اور اپنی شکتی سے ایک ایسی مہا شکتی بنانا چاہتا ہوں جو دنیا پر راج کرے۔ مجھے مجبور نہ کرو کہ میں دوسری طرح سے سوچنے لگوں۔" اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"تمھیں کوثر کی فکر کرنا چاہیے وقار الحسن! اسے آزاد کرانے اور گھر بھیجنے کی فکر کرو۔ تم تایا اور اماں کو جلد لوٹ آنے کا کہہ آئے ہو۔ وہ تمھاری راہ دیکھتے ہوں گے۔" میں نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ میرا حربہ کامیاب رہا' وہ پھر کوثر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اسے۔ اسے آزاد کر دو۔" اس نے حتمی انداز میں سادھو سے کہا۔

"اسے آزاد کرنا صرف اسی وقت ممکن ہے جب تم پائل دینے کا وچن دو۔ پائل تمھارے پاس ہے اور پیچ بند کوثر کے پاس۔ اس نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے کچھ چیزیں تمھارے لیے رکھی ہیں۔ وہ تمھیں وش میں کرنا چاہتی ہے۔ تم چاہو تو میں اسے ابھی آزاد کر سکتا ہوں مگر وہی شرط ہے کہ تم کسی بھی طرح اس سے یہ چیزیں لے کر مجھے دے دو گے۔"

"ٹھیک ہے وقار الحسن! ہاں کر دو۔ وعدہ کر لو۔ وہ چیزیں تمھارے کسی کام کی نہیں ہیں۔ تمھیں یہاں جنگلوں میں زندگی نہیں گزارنا ہے۔ تمھیں کوثر کو لے کر چلے جانا ہے۔ شگفتہ بھی تمھاری منتظر ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا تو میری جان میں جان آئی۔ "اسے اسی وقت آزاد کر دو۔"

"وہ پائل۔؟" اس نے ندیدے پن سے پوچھا۔

"میرے پاس ہے۔ اس کے ہوش میں آتے ہی تمھیں دے دوں گا اور پیچ بند تو ظاہر ہے اس وقت ملے گا جب وہ میرے حوالے کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ پرنتو تم میرے ساتھ چالاکی نہیں کرو گے وکار الحسن! میں۔ میری کھوپڑی الٹ جائے گی۔ اور ہاں ایک کام تمھیں اور کرنا ہو گا۔ تم کوثر کو گھر لے جانا چاہتے ہو ناں پرنتو تم کماری کو یہاں لائے بنا اسے نہیں لے جا سکتے۔ کماری بالیکا مندر کی داسی ہے۔"

"مگر میں۔ میں اسے کیوں لاؤں گا اور پھر میں تو اسے جانتا ہی نہیں۔ وہ میرے ساتھ کہیں بھی کیوں جائے گی؟"

"اپائے میں بتاؤں گا وکار الحسن! اس کا یہاں آنا انیوارج ہے یہ مکڑی۔" اس نے اس سرخ مکڑی کی طرف اشارہ کیا جو اب کوثر کی پیشانی پر بیٹھی تھی اور اسی طرف دیکھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "اسے دیکھ رہے ہو؟ تم نے یہ لہو پیتی ہے۔" اس نے ڈرامائی انداز میں اپنا جملہ

مکمل کیا۔ "یاس کھاتی ہے۔"

"کک کر۔" وقار الحسن ہی نہیں میں بھی بے چین ہو گیا۔

"کیا مطلب ہے۔ یہ۔ یہ کوثر کے"

"نہیں۔ یہ مہینے میں ایک بار لہو پیتی ہے۔ اماوس کی پہلی رات کو۔"

میں نے جلدی جلدی حساب لگایا' خود وقار الحسن بھی یہی حساب لگا رہا تھا۔ اماوس کی راتیں شروع ہونے میں بس چند ہی دن رہتے تھے۔ "سادھو تم جو کچھ کر رہے ہو' جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو وہ تمھیں۔ تمھیں بہت نقصان پہنچائے گا۔" وقار الحسن غصے میں بل کھا رہا تھا۔ "تم میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو۔ یاد رکھو سادھو کہ میرا بچھایا ہوا جال تمھارے لیے موت کا پھندا ثابت ہو گا۔"

"موت۔ ہاہاہا۔" اس نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا۔ "موت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بالک۔ موت کے بعد تو میں بہت سے ایسے کام بھی کر سکتا ہوں جو آج میرے لیے مشکل ہیں۔ آج میں اس شریر کی وجہ سے بہت کام کرنے میں کٹھنائی محسوس کرتا ہوں لیکن موت کے بعد۔"

"تو پھر تم مر کیوں نہیں جاتے؟" وقار الحسن نے جل کر جواب دیا۔

"ہاں۔ مرنے کے بعد کی شکتیاں پانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میں آتما ہتھیا نہ کروں بلکہ میں مارا جاؤں۔ اپنی سانسیں پوری کروں اور یہ سانسیں میں امرت میں کھلے جیون میں پوری کرنا چاہتا ہوں ورنہ وہ تمام کام جو مجھے کرنے چاہییں وہ تو میں بعد میں بھی کر سکتا ہوں۔"

پتا نہیں وہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں تو بس اتنا ہی جان پایا تھا کہ وہ زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا ہے' اور اس کی یہی بات مجھے بھی پسند آئی تھی۔ اس سے زیادہ جاننے کی مجھے خواہش بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں یہ بات وقار الحسن کیوں نہیں سمجھ رہا تھا۔

"تم فوراً کوثر کو رہا کر دو۔ وہ پائل میں تمھیں دینے کو تیار ہوں۔" وقار الحسن کا جملہ سن کر مجھے بے پایاں خوشی ہوئی تھی۔

"شاباش وقار الحسن! یہ فیصلہ وقت کا بہترین فیصلہ ہے۔ کوثر کو جلد از جلد رہا کروا کر اموہہ بھیج دو۔" میں نے خوشی سے لبریز آواز میں کہا۔ سادھو کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"مگر۔ میں کسی کماری کو نہیں لاؤں گا۔ یہ۔ یہ کام تم خود کرو۔" وقار الحسن نے کہا۔

"ارے۔ چمپا کو تو میں بھول ہی گیا۔ وہ تو ویسے بھی ہوش میں نہیں ہے اور پھر۔ میں۔ جھوٹے برتن کا پانی نہیں پیتا۔" سادھو نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "لاؤ پائل دے دو۔"

پتا نہیں چمپا کا ذکر اس نے کیوں کیا تھا' اس کا کیا مقصد تھا مگر میں اس وقت کسی بھی فضول بحث یا سوچ میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا کس لئے ذہن کو جھٹک کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔

میری آنکھیں وقار الحسن پر گڑی تھیں۔ اس نے دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھایا اور جیب سے پائل نکال کر سادھو کی طرف بڑھا دی۔ اس کے چہرے پر افسردگی تھی۔ آنکھوں میں بے چینی اور ویرانی سی تھی۔ مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ میں تو بس چاہتا تھا کہ وقار الحسن ان چکروں سے نکل جائے۔ معاملے کو بے وجہ طوالت دینے سے سب کچھ الجھ گیا تھا۔

جس وقت پائل سادھو کے بدصورت ہاتھ میں گئی اس کے گھنگرو جھنجھنا اٹھے اور' پورا کمرا سسکیوں سے گونج اٹھا۔ ساتھ ہی تیز ہواؤں کے جھکڑ سے چلنے لگے۔ دھول اڑنے لگی۔ یوں لگا جیسے آندھی آ گئی ہو۔ اس آندھی میں' میں نے پرکاش کو لرزتے دیکھا۔ اس کا ہیولا اس قدر ہیبت ناک لگ رہا تھا کہ میں پوری جان سے لرز گیا۔ اس کا جلا ہوا جسم' ادھڑے ہوئے بدن پر جگہ جگہ سے جھانکتی چربی' یہ سب بڑا ہیبت ناک تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر بلا کا غیض و غضب دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔ مگر سسکیاں اس کی نہیں تھیں' سسکیاں شکنتلا کی تھیں۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس کے بین کرنے کی آواز سماعت کو زخمی کر رہی تھی۔

وقار الحسن نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ وہ شدید کرب میں مبتلا تھا۔ تاسف اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ سادھو وہ پائل غائب کر چکا تھا اور دونوں ہاتھوں کو فضا میں پھیلائے ہوئے زور زور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ تیز ہوا' شکنتلا کی سسکیاں

سادھو کے ہونٹوں سے نکلنے والے عجیب سے بے الفاظ شور برپا کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے طوفان جا رہا ہو۔ جیسے جیسے سسکیاں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

ویسے ویسے سادھو کی آواز بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آواز ہی اتنی ناگوار تھی' ایسی ہولناک کہ سادھو کے برابر بیٹھی دوسری لڑکی جو کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی بغیر آواز نکالے ایک جانب لڑھک گئی۔ اس کے دائیں بائیں دونوں خوب صورت لڑکیاں بے ہوش پڑی تھیں۔ وقار الحسن ادھ موا ہو گیا تھا۔ وہ بھی کانوں پر ہاتھ رکھے دوہرا ہو چکا تھا۔ میں بری طرح گھبرا چکا تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے وقار الحسن کا بدن چھوڑ دیا۔ اس کا بدن چھوڑتے ہی مجھے کچھ سکون سا ہو گیا' گو نہ تو آوازوں کی شدت میں کمی آئی تھی' نہ ان کی ہولناکی میں مگر میں وقار الحسن کے بدن میں ہونے والے انتشار سے محفوظ ہو گیا تھا۔ میں اندر سے بے پناہ پرسکون تھا۔ تیز آندھی ابھی رکی نہیں تھی' اڑتی ہوئی دھول میں پرکاش مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شکنتلا بھی مجھے یوں نظر آئی جیسے وہ کوئی روح نہ ہو بلکہ زندہ عورت ہو' ان دونوں کی نگاہ مجھ پر پڑی اور میں نے ان دونوں کو بری طرح چونکتے دیکھا۔ پرکاش اور شکنتلا لپک کر میرے قریب آ گئے۔ ان دونوں کے قدم زمین پر نہیں تھے بلکہ وہ ہوا میں معلق تھے۔

"وقار الحسن!۔ دیکھا۔ دیکھا تم نے' اگر تم میری بات مان لیتے تو آج یہ نہ ہوتا۔"

وہ رو رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر وقار الحسن کو دیکھا' اس وقار الحسن کو جس کا بدن میں چھوڑ چکا تھا۔ وہ اب بھی زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کانوں پر جمے ہوئے تھے۔

"کیا نہ ہوتا؟" میں نے کہا۔

ان دونوں نے میری آواز سن لی۔ "تم اپنے پریوار کے اکیلے جوان تھے۔ اب۔ اب۔ تم آکاش پر چلے جاؤ گے۔ کوثر کو یونہی سادھو کی کید میں چھوڑ کر۔ شگفتہ کو انتظار کا دکھ دے کر۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ تم یہاں۔ یہاں مر چکے ہو۔"

اب میں اس کی بات سمجھا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وقار الحسن مر چکا ہے اور میں۔ میں اس کی روح ہوں۔ یہ کہہ کر میں زور سے ہنس پڑا۔ ان دونوں نے مجھے حیرانگی سے دیکھا۔ اس دوران میں سادھو کے منتر پڑھنے کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ آندھی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ شکنتلا بھی رونا بھول چلی تھی۔

"تم۔ تم ہنس رہے ہو؟ تمہیں اپنی ماں اور دونوں بہنوں کا کچھ خیال نہیں ہے؟" وہ اب بھی حیران تھی۔

"وقار الحسن مرا نہیں ہے شکنتلا!" میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔

اس نے چونک کر زمین پر پڑے وقار الحسن کو دیکھا اور پھر خوشی کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر امڈ گئی۔ "آتی شکتی والا منش ہے تو!"

"وقار الحسن۔ تم نے جو کچھ کر دیا ہے۔ اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ وہ راکھشس ساری دھرتی کو آگ لگا دے گا۔ وہ ساری۔ ساری کنواری' پوتر ناریوں کو تباہ کر دے گا۔ تم جانتے نہیں ہو کہ کسی کا کسی روح پر قبضہ کر لینا کیسا اندھیر مچاتا ہے۔" وہ بہت اداسی سے بول رہی تھی۔

وقار الحسن یوں بیٹھا تھا جیسے بازی ہار گیا ہو۔ مجھے ڈر ہوا کہ شکنتلا ایسی باتیں کر کے اسے پاگل چھین لینے پر مجبور نہ کر دے۔

"شکنتلا! تمہارے مسئلے دور کرنا وقار الحسن پر واجب نہیں ہے۔ اس سے جو کچھ ہو سکا اس نے کیا' اس کے لیے تم اتنی اہم نہیں ہو جتنی کوثر ہے۔ وہ دیکھو۔ کوثر کس حال میں ہے۔ اس کی جان کو خطرہ ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ وقار الحسن کے لیے اسے ویداؤں سے نکالنا بڑی بات نہیں ہے۔ پرنتو اب۔ اب پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔"

وہ پھر روہانسی ہو گئی۔ ویسے اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ سادھو اب بھی دھیمی آواز میں کچھ بے معنی سے الفاظ ادا کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ نڈھال ہوتی جا رہی ہو۔ ایک بات پھر آپ کو یاد دلا دوں کہ شکنتلا اور پرکاش جب بھی بات کرتے تھے' ان کے لب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حال جان سکوں جس میں، میں اب تک ناکام رہا تھا۔ اب یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ کسی بھی طرح میں اس کے غ میں داخل ہو سکتا ہوں۔ کیسے۔۔۔؟ یہ میں ابھی نہیں کہہ تھا۔

"سادھو۔ کوثر کو۔ کوثر کو رہا کرو۔" وقار الحسن ہذیانی از میں چیخا۔

اس کی چیخ نے مجھے' شکنتلا کو اور پرکاش تینوں کو چونکا یا۔ میں نے کوثر کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے دھوئیں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کے نقوش مٹے مٹے سے لگنے لگے تھے۔ اس کا نچلا دھڑ دھوئیں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وقار الحسن کے ساتھ ہی میں بھی کوثر کی طرف لپکا۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے دلخراش چیخیں سنیں۔ اچانک ہال میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ شکنتلا اور پرکاش ان شعلوں کی زد میں تھے۔ بے پناہ شور نے پھر تھوڑی دیر پہلے والے طوفان جیسی اختیار کر لی تھی۔ سادھو پوری قوت سے حلق پھاڑ کر کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ میں اور وقار الحسن ان شعلوں سے محفوظ تھے مگر ہماری حالت دگرگوں تھی۔ ایک طرف شکنتلا' پرکاش جل رہے تھے اور دوسری طرف کوثر دھوئیں میں تبدیل ہو رہی تھی۔

ان دونوں کی کرب ناک چیخیں' سادھو کی آواز اور جانے کیسا شور تھا جو حواس معطل کیے دے رہا تھا پھر اچانک۔۔۔ جس تیزی سے یہ شور شروع ہوا تھا ویسے ہی اچانک تھم گیا۔ ایک خوفناک سناٹا تھا۔ ایک کرب ناک خاموشی۔ میں نے اور وقار الحسن نے لمحہ بھر پہلے ہی آنکھیں بند کی تھیں کہ اس سناٹے نے ہمیں ہولا دیا اور ہم نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ہمارے گرد بے پناہ اندھیرا تھا۔ یوں جیسے ہم کسی گہرے کنوئیں میں کھڑے ہوں۔ مجھے تو جلد ہی اندھیرے میں ہلکا ہلکا نظر آنے لگا تھا مگر وقار الحسن دونوں ہاتھوں کو پھیلائے اندھوں کی طرح چکرا رہا تھا۔

"کہاں ہو تم۔ کہاں ہو؟" وہ شاید مجھے پکار رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا۔ ایک نسوانی سرگوشی گونج اٹھی۔ "میں۔ میں یہاں ہوں۔"

وہ آواز۔۔۔ وہ آواز کسی بم کی طرح ہماری سماعتوں پر گری اور میں پلک جھپکتے ہی وقار الحسن کے اندر داخل ہو گیا۔

○ وہ آواز کوثر کی تھی۔ وقار الحسن کے بدن میں اترتے ہی میں جیسے اندھا ہو گیا۔ تبھی میں جان گیا کہ وقار الحسن ہاتھ پھیلائے اندھوں کی طرح کیوں چکرا رہا تھا۔

"تت۔۔۔ کوثر۔۔۔؟" وقار الحسن کے لبوں سے جیسے سسکاری نکلی۔

"وقار الحسن۔۔۔" وہ یوں بولی جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ رکھا ہو۔ "مجھے۔۔۔ بچاؤ۔"

شاید وہ کسی اذیت میں مبتلا تھی۔ میں نے اس کی آواز میں ایسا کرب محسوس کیا جو آدمی کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اندھیرا ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں وقار الحسن کے اندر کے اندھیرے سے الجھ کر دوبارہ باہر آ گیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر اوندھی پڑی تھی۔ اس کے بدن پر کچھ تھا۔ جو ہل رہا تھا یا ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ پانی کے اندر ساکت پڑی ہو' اوپر لہریں بہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں کیا تھا کہ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اسی لمحے میں نے وقار الحسن کو آیت الکرسی پڑھتے سنا۔ وہ سحر انگیز آواز میں آیت پڑھ رہا تھا اور اس کی آواز کے ساتھ ساتھ اندھیرا فضاؤں میں گھلتا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں جیسے کرنیں گندھی ہوئی تھیں جو دھیرے دھیرے کمرے میں پھیل کر اندھیرے کو چاٹ رہی تھیں۔

اس بار میں نے وقار الحسن کے اندر جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ میں ساکت کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ چمکتی ہوئی کرنوں کے ساتھ ہی کوثر کا مٹا مٹا سا وجود مجسم ہونے لگا۔ وہ زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اس کا جسم لہولہان تھا۔ جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ میرے خبیث دماغ میں اچانک ہی کھوپڑیاں گھومنے لگیں۔ یہ خیال شدت اختیار کر گیا کہ میں اسے وہ کھوپڑیاں نکال کر دوں اور۔۔۔ مگر اس سے قبل ہی کوثر کی کراہ نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ مجھے اپنی خباثت پر افسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ اسے سہارا دے کر بٹھا دوں مگر اس سے قبل ہی وقار الحسن جھپٹ کر اس کے قریب آ گیا۔ اب اندھیرا اتنا گہرا نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ وقار الحسن اسے سہارا دے کر بٹھا چکا تھا۔ یہ وہ ہال نہیں تھا جہاں یہ ڈراما ہوا تھا بلکہ یہ وہ جگہ تھی جہاں شگفتہ وقار الحسن کو زبردستی لائی تھی۔ وہ چھوٹے کھنڈر کا اندرونی حصہ تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں

نہیں آئی کہ آخر ہال میں ایسی کیا بات ہے کہ سادھو لوگ وہ ہال ہماری نگاہ سے اوجھل کر دیتا ہے۔ میں نے کوثر کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے اور کبھی اپنے قریب بیٹھے وقار الحسن کو گھور رہی تھی۔ گویا جو بات سادھو نہیں جان سکا تھا وہ جان گئی تھی۔ میں خود بھی اس کی شکتی پر حیران رہ گیا۔ وہ یقیناً سادھو کے مقابلے میں زیادہ تھی۔

"تت۔۔۔ تم۔ تم نے اتنی قوت۔۔۔ اتنی شکتی پالی وقار الحسن اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور مجھے یوں چھوڑ دیا۔" وہ وقار الحسن سے شکایتی انداز میں بولی۔

"یہ قوت میری کسی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے کوثر' یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔" وقار الحسن نے مسرت سے جواب دیا۔ "چھوڑو اسے۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا دماغ درست ہوا یا نہیں؟"

"اوہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ حادثہ میرے لیے کتنا خوش آیند ہے وقار۔۔۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بتاؤ کہ۔۔۔ کہ یہ مجسم ہے یا۔۔۔" وہ وقار الحسن کے سوال کو نظر انداز کر کے بولی۔ مجھے دیکھتے ہی ایک حیرت انگیز تبدیلی اس میں آئی تھی جس نے اسے قدرے چاق و چوبند کر دیا تھا۔ وہ اپنے زخمی وجود کی تکلیف تک بھلا بیٹھی تھی۔ ایک عجیب سرشاری سی کیفیت تھی جو اسے اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

وقار الحسن! اب۔۔۔ اب تمہارا حصول آسان ہو گیا ہے۔ اب۔۔۔ تم میرے ہو۔ میرے۔۔۔ اسے شگفتہ کے حوالے کر دو۔" اس نے بھرائی ہوئی' لرزتی اور انتہائی جذباتی آواز میں کہا۔ سرور اس کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ اس کی بات سن کر وقار الحسن ہی نہیں خود میں بھی غصے میں آگیا۔ "اب تمہاری اماں کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ وہ جہاں چاہیں گی اپنے بیٹے کا بیاہ رچا دیں گی۔" وہ ہمارے احساسات سے بے خبر اپنی باتیں کر رہی تھی۔

"تم ہوش میں تو ہو؟" وقار الحسن دھاڑا۔

وہ واقعی ہوش میں آگئی۔ "کیا۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اتنا کچھ سہہ کر بھی تمہارا دماغ درست نہیں ہوا۔ تم جانتی ہو کہ تائی پاگل ہو چکی ہیں تمہارے غم میں۔۔۔ تایا عمر کے پل گن گن کر گزار رہے ہیں۔ ان سے نہ تمہاری جدائی برداشت ہوتی اور نہ تائی کی حالت ہی ان سے دیکھی جاتی ہے۔ تم انھیں کس جرم کی سزا دے رہی ہو کوثر۔۔۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ان چکروں کو چھوڑ کر سیدھی طرح گھر چلی چلو۔"

"ہاں۔۔۔ میں گھر جاؤں گی۔ گھر جانے سے کب انکار کر رہی ہوں مگر جو کشٹ میں اٹھا چکی ہوں ان کا صلہ لینے کے بعد۔"

میرا جی چاہا کہ اس چڑچڑی سی لڑکی کا منہ نوچ لوں۔ آج وہ مجھے بہت بدصورت اور خبیث نظر آ رہی تھی۔ میری نگاہ میں چھپا' کلپنا اور اس تیسری لڑکی کا گداز سراپا گھوم گیا۔ کہاں وہ بادلوں ایسی ریشمی لڑکیاں اور کہاں یہ کرخت بدن والی' مکروہ صورت کوثر۔۔۔ اونہہ۔

"کوثر! تم پر اپنے ماں باپ کے بارے میں سن کر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تم اتنی خود غرض اور بے حس ہو۔ تم میری محبت کو حاصل کرنے کی بجائے مجھ پر قبضہ کرنا چاہتی ہو۔ مجھے قید کر لینے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہو' تمہیں شرم آنا چاہیے۔ تم اگر میری تایا زاد نہ ہوتیں' مجھے تایا اور تائی کا احساس نہ ہوتا تو میں تمہاری خاطر اپنی زندگی کو کبھی عذابوں میں نہ ڈالتا۔ بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ۔۔۔" وقار الحسن نے میری طرف اشارہ کیا۔ "یہ مجسم نہیں ہے۔ اس کا ٹھوس وجود نہیں ہے۔ یہ تو شگفتہ کے علاوہ نظر بھی صرف تمہیں آیا ہے' شاید اس لیے کہ۔۔۔ کہ تم کچھ طاقتیں حاصل کر چکی ہو۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ محبت چھینی نہیں جاتی' پیدا کی جاتی ہے۔ اس وقت میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تم مجھے فوری فیصلہ سناؤ کہ امروہہ چلنے کو تیار ہو یا نہیں؟"

"یہ۔۔۔ مجسم نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ اسے کیسے مجسم کیا جا سکتا ہے۔ چند جاپ کرنا پڑیں گے۔ کچھ کشٹ اٹھانا پڑے گا۔ خواب کی تعبیر پانے کے لیے میں نے اتنا کچھ کھو دیا' اتنے عذاب سہہ لیے' ایسی بدنامی مول لے لی تو۔۔۔ پھر یہ تھوڑا سا کشٹ اور سہی۔"

وہ خلاؤں میں تک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ وقار الحسن کو حاصل کرنے کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتی۔ اس نے باقی کسی بات پر دھیان نہیں دیا اور نہ ہی دینا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد وقار الحسن کو حاصل کرنا تھا' بس۔ اس کی سوچ ایک ہی دائرے میں چکرا رہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اب تو واقعی باہر جاؤں۔ سادھو کی منت کر کے چند کھوپڑیاں لے آؤں اور چپکے سے اس کے بدن پر چھوڑ دوں۔ چند ہی لمحوں میں وہ بھی اس برنش کی طرح لاش میں تبدیل ہو جائے اور میں کلپنا کے بدن میں تیرتے بادلوں میں ڈولنے لگوں مگر وقار الحسن میرا دفاع کر رہا تھا۔ اس لیے میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم ہوش میں نہیں ہو کوثر۔" وقار الحسن نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

"میں ہوش میں ہوں۔ بالکل ہوش میں ہوں وقار الحسن' تم سوچو۔۔۔ اتنی بڑی شکتی پانے کے بعد بھی تم بدھوؤں کی طرح زندگی گزار رہے ہو۔ اسے مجسم کر کے تم بہت سے معاملات سے بیک وقت نمٹ سکتے ہو۔ تم گھر میں بھی موجود ہوں گے اور۔۔۔ اور شگفتہ کے پاس بھی۔ شہر میں بھی معاملات نمٹا رہے ہوں گے اور جنگلوں میں بھی۔ تم گھر پر ہوں گے اور یہ۔۔۔ یہ جنگل میں سوامی جی کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔ سادھو سے مقابلہ کر رہا ہوگا اور تم۔۔۔ تم اور میں۔۔۔"

وہ مدہوش ہو چکی تھی۔ بول رہی تھی۔ وقار الحسن نفرت اور غصے سے اسے دیکھ رہا تھا اور میں۔۔۔ میں اچانک اچھل پڑا۔ یوں لگا جیسے میرے سامنے ہزاروں پر پیچ راستے نکل آئے ہوں پھر ایک نئی راہ میرے سامنے واضح ہوتی چلی گئی۔ کوثر جو کچھ کہہ رہی تھی وہ میرے لیے بہت پرکشش تھا۔ اگر میں مجسم ہو جاتا تو مجھے وقار الحسن کی منتیں کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس وقت میں اپنی کسی بھی خواہش کی تکمیل کے لیے وقار الحسن کا مرہون منت تھا مگر۔۔۔ ایک وجود حاصل کر لینے کے بعد' ایک جسم پالینے کے بعد کسی کا بھی حصول میرے لیے ناممکن کیا مشکل بھی تھا۔ اب یہ خیال آتے ہی میں چوکنا ہو گیا۔ میری تمام توجہ کوثر کی طرف تھی۔ اب وہ مجھے اتنی بدصورت اور خبیث نہیں لگ رہی تھی جتنی تھوڑی دیر پہلے محسوس ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"وقار الحسن۔۔۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کتنی بڑی طاقت حاصل کر چکے ہو۔ اب تم بادشاہوں کی طرح راج کر سکتے ہو اور یہ۔۔۔ یہ تمہارا بے دام غلام بن کر رہ سکتا ہے۔ تمہارا کام صرف حکم دینا ہوگا۔ تم ہر وہ چیز بیٹھے بٹھائے حاصل کر سکتے ہو جس کے لیے عذاب بھگتنا پڑتے ہیں۔ اور یہ کام۔۔۔ یہ کام میں کروں گی۔ میں۔۔۔ میں تمہیں

اور اسے اتنا مضبوط کر دوں گی کہ تم ہی نہیں بڑے بڑے عامل اور جوگی بھی تصور نہیں کر سکتے۔"

غلام بے دام بن جانے والی بات نے تو مجھے بھنا کر رکھ دیا۔ یہ خوف بھی دل میں جاگزیں ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ جو میں سمجھ رہا ہوں اس کا الٹ ہو جائے۔ میں واقعی وقار الحسن کی جنبش ابرو کا محتاج ہو جاؤں' کوئی ایسا کھلونا بن جاؤں جس سے وقار الحسن صرف اپنی مرضی سے کھیل سکے ورنہ میں کسی کونے کھدرے میں پڑا سڑتا رہوں۔ میں یہ سب سوچ رہا تھا اور وقار الحسن کوثر سے الجھا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بادشاہوں کی طرح رہنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں سیدھی سادی زندگی گزارنا چاہتا ہوں کوثر۔ تمہاری وجہ سے سارا خاندان بدنامی کا بوجھ اٹھائے نڈھال ہے۔ کیا تمہیں اپنے بوڑھے ماں باپ سے کوئی غرض نہیں' وہ محبت بھی نہیں جو اولاد کو اپنے ماں باپ سے ہوتی ہے۔ ہم سے تایا کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ تائی الگ بے حال ہیں۔ تمہاری وجہ سے جہانی آپا اور شنو آپا سر اٹھا کر خاندان میں آجا نہیں سکتیں اور تم۔۔۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا وقار الحسن! بس تم ہاں کر دو۔" اس نے جذباتی ہو کر وقار الحسن کا ہاتھ تھام لیا۔

شدید حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا پورا بدن زخموں سے چور تھا اسے نہ ناگپا جادوگر کے پیش بند کا خیال تھا نہ ان ناگ دیوتاؤں کے عتاب کا جن کی دسترس سے بقول سادھو کے اس نے کوثر کو چھڑایا تھا۔ نہ فیروزے کی انگوٹھی کا دھیان تھا نہ سادھو کا۔ مجھے اس لمحے اس پر ترس آیا۔ جی چاہا کہ وقار الحسن سے کہوں' اسے اپنا لے۔ شگفتہ کو تو اور بر مل جائے گا مگر جو حرکت کوثر کر چکی تھی اس کے بعد اس کا بر جڑنا تقریباً ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔

"کوثر۔۔۔ میرا واحد مقصد تمہیں امروہہ لے کر جانا ہے اور بس۔ کیا تم چلنے کو تیار ہو؟" وقار الحسن نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔ وقار الحسن اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ میں پلک جھپکتے اس کے اندر داخل ہو گیا۔ میں اسے اس بات پر تیار کرنا چاہتا تھا کہ وہ کوثر کی بات پر غور ضرور کرے یا کم از کم اس سے تفصیل پوچھ لے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا یا کیسا ہو سکتا ہے۔ میں جس وقت وقار الحسن

کے بدن میں داخل ہو رہا تھا' کوثر حیرت اور خوشی سے یہ عمل دیکھ رہی تھی۔ میں بہرحال اس کی طاقت کا قائل ہو چکا تھا۔

"وقار الحسن!" میں نے سرگوشی کی۔ میں اس دوران میں کوثر کی جانب متوجہ تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ میری سرگوشی سن سکتی ہے یا نہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں ایک گونا اطمینان ہوا کہ وہ میری آواز نہیں سن سکتی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس پر میرے مطمئن ہونے کی کیا بات تھی بہرحال میں خوش تھا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ وہ میری کسی نہ کسی بات سے لاعلم ضرور ہو۔

وقار الحسن نے میری سرگوشی کو نظر انداز کردیا مگر میرے اندر داخل ہونے پر بے چین ضرور ہو گیا تھا۔

"وقار الحسن! اگر کوثر کی بات پر غور کرو تو۔۔۔"

"چپ رہو۔" وقار الحسن نے مجھے جھڑک دیا۔

"کیا کہہ رہا ہے؟" کوثر ذرا قریب سرک آئی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ یہاں سے نکلنے کی سبیل کرو۔ تم زخمی ہو۔ تمہیں دوا کی ضرورت ہے۔ اور۔۔۔ اور کوثر تمہاری بکواس نے کام کی ساری باتیں میرے ذہن سے نکال دیں یہ بتاؤ کہ ناگیا جادوگر کا پیش بند کہاں ہے' فیروزے کی انگوٹھی اور اسم اعظم لیتے ہوئے تمہیں ذرا بھی میری فکر نہیں ہوئی۔ حالانکہ تم یقیناً جانتی ہوگی کہ وہ دونوں چیزیں میرے لیے کتنی ضروری تھیں۔ پھر بھی تم مجھ سے بے پناہ محبت کرنے کی دعوے دار ہو۔ مجھے پانے کے لیے دنیا تباہ کردی تم نے' اپنا یہ حشر کرلیا۔ اسے میں کیا سمجھوں؟" وقار الحسن کے لہجے میں طنز تھا۔

"پاگل ہو تم۔ وہ چیزیں۔۔۔ تم نے جس بے پروائی سے وہاں چھوڑ دی تھیں اسے سادھو حاصل کرلیتا۔ رہا ناگیا جادوگر کے پیش بند کا معاملہ تو اس کا یوں مل جانا ایک خوشگوار اتفاق ہے اور کچھ نہیں۔ میں جس جگہ جاپ کر رہی تھی وہ دوسرے مقصد کے لیے تھا مگر میرے جاپ نے اس مورتی کے پیٹ سے اسے اگل دیا۔ میں اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ اس کی حفاظت پر ناگ مامور ہیں۔

میں اس جاپ میں اتنی مگن تھی کہ احساس ہی نہ ہوا' کب اس کے پیٹ سے باہر آکر وہ پیش بند میرے سر پر گرا اور کب اس کے محافظوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ اسی دوران میں سادھو آگیا۔ وہ اس پیش بند کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ اس نے لگاتار بیس روز تک میری نگرانی کی اور جاپ ختم کرتے ہی مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ مکڑی۔۔۔ بڑی خطرناک تھی۔ ان دنوں اماوس کی راتیں تھیں۔ سادھو نے اس مکڑی کو اپنا لہو پلایا اور اپنا ماس کھلایا پھر اسے مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں اس سے بچاؤ کرنے سے پہلے اس پیش بند کو محفوظ کرنا چاہتی تھی اور جیسے ہی میں نے پیش بند کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کیا' مکڑی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے بعد کے حالات سے تم واقف ہو۔ تمہاری انگوٹھی اور اسم اعظم محفوظ ہے مگر میں انھیں ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ اب تم آگئے ہو تو ان چیزوں کو اپنے قبضے میں لے سکتے ہو۔"

"کہاں ہیں وہ چیزیں؟" وقار الحسن نے بے چینی سے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اتنا کہہ کر وہ زخموں سے چور ہونے کے باوجود یوں اٹھ کھڑی ہوئی جیسے وہ بالکل ٹھیک ہو۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس جگہ پہلے گہرا اندھیرا تھا پھر یہاں چاندنی سی پھیل گئی تھی۔ اس چاندنی میں' میں نے دیکھا تھا کہ یہ چھوٹے والے کھنڈر کا وہ حصہ تھا جہاں شکستہ وقار الحسن کو زبردستی لائی تھی اور اس سے اپنی پائل کا مطالبہ کیا تھا۔ اب یہاں کافی روشنی تھی۔ یہ روشنی نہ تو چاند کی تھی اور نہ ہی سورج کی' نہ ہی یہاں پر کسی موم بتی یا لائٹ کا اہتمام تھا۔ یہ عجیب ہی روشنی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور نرم نرم سی' میں اب بھی اس کے مخرج سے لاعلم تھا۔ وقار الحسن کو تو شاید یہ باتیں سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی مگر میں اس کا مخرج تلاش کرنا چاہتا تھا۔ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیسی روشنی ہے اور کہاں سے آرہی ہے؟

کوثر کی وجہ سے میں اس سوال کا جواب آسانی سے پاگیا۔ وہ وقار الحسن کو لے کر اس کھنڈر سے جونہی باہر آئی میں اچھل پڑا۔ اندر سے میں جسے اسی کھنڈر کا حصہ سمجھا تھا وہ ایک قطعی مختلف جگہ تھی۔ ایک میدان سا تھا جہاں سے کچھ فاصلے پر اونچے نیچے پہاڑی سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم نے جونہی قدم کھنڈر سے باہر رکھا تھا' فضا میں عجیب سے سنسناہٹ پھیل گئی۔ وقار الحسن ٹھٹکا' کیونکہ باہر نکلتے ہی کوثر نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرح پھیلا دیا تھا کہ

[...]الحسن اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ پھر وہ عجیب کرخت [...]میں' غیر مانوس زبان کے الفاظ دہرانے لگی۔ وہ جس [...]ن کے بھی الفاظ تھے بہت خراب زبان تھی۔ اس کی [...]ن سے ادا ہونے والے الفاظ سماعت میں خراشیں سی [...]ار رہے تھے۔

[...]میں اور غالباً" وقار الحسن بھی اسے آنکھیں بند کیے زور [...]رے بولتے دیکھ رہے تھے کہ بالکل اچانک ہماری نگاہ [...]نے کی قریب ترین پہاڑی پر جم گئی۔ وہاں ایک چمک دار [...]ر سترک تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ لکیر بہت سی پتلی پتلی [...]یوں میں بٹ گئی۔ یہ لکیریں دھیرے دھیرے پہاڑی سے [...]ے اترنے لگیں۔ وہ ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ چمک [...]اور رینگتی ہوئی لکیریں ایک ساتھ آگے کی طرف سرک [...]ی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لہریں سی بہتی ہوئی قریب [...]رہی ہوں۔ اور پھر۔۔۔ وقار الحسن اچھل پڑا۔ میں بھی [...]رت سے ان رینگتی ہوئی چمک دار لکیروں کو دیکھ رہا تھا جو [...]ب آئیں تو پتا چلا کہ وہ چار پانچ فٹ لمبے ناگ تھے۔ مجھے [...]سانپ یاد آگیا جس نے وقار الحسن پر حملہ کیا تھا۔ وہ [...]کل ایسا ہی سانپ تھا' فرق صرف اتنا تھا کہ یہ رینگ رہے [...]ے اور وہ ہوا میں چھلانگیں لگا رہا تھا۔ میں نے اس [...]ت وقار الحسن کو بتا دیا کہ ایسے ہی ایک سانپ نے اس پر [...]کیا تھا۔ ویسے یہ بات میں اسے پہلے بھی بتا چکا تھا۔

[...]اس وقت دہرائی جانے والی اس بات نے وقار الحسن کو [...]کا دیا۔ شاید وہ بھی وہی سوچ رہا تھا جو میرے دماغ میں آیا [...]مجھے یقین تھا کہ اس وقت اس پر حملہ اسی یا اسی جیسے [...]پ نے کیا تھا' ممکن ہے اسے کوثر ہی نے بھیجا ہو اس [...]کہ وہ تمام ناگ اس کے تابع لگ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی [...]ے چند قدم کے فاصلے پر پہنچے' کوثر نے بایاں ہاتھ اٹھایا [...]وہ سب وہیں رک گئے۔

"آؤ وقار الحسن!" کوثر نے پلٹ کر کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وقار الحسن نے منجمد ہو جانے [...]لے سانپوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ اس پیش بند کے محافظ ہیں' کیونکہ پیش بند میں [...]ل کر چکی ہوں اس لیے اب یہ میرے تابع ہیں۔" اس [...]سرسری انداز میں کہا۔ "اگر میں انھیں یہاں بلا کر [...]ت نہ کرتی تو۔۔۔ تو تم زندہ نہ رہتے۔"

میرا خیال تھا کہ وقار الحسن اسے وہ حملہ یاد دلائے گا مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اب ہم پہاڑی سے قریب ہو گئے تھے۔ تبھی مجھے پتا چلا کہ چاندنی ایسی روشنی انھی سانپوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی یا شاید یہ صرف میرے احساس کا دھوکا تھا۔ آسمان پر صرف ستارے تھے اور وہ بھی کچھ اتنے روشن ہرگز نہیں تھے کہ یوں روشنی پھیل جاتی۔ کوثر ہمارے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کا حلیہ اتنا خراب تھا کہ اگر ہمیں یہ نہ پتا ہوتا کہ وہ کوثر ہے تو شاید ہم ڈر کر اس کے قریب نہ آتے کہ جانے کس دنیا کی مخلوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقار الحسن سے سچی محبت کرتی تھی ورنہ اچھی بھلی لڑکی اس وقت گندگی کا ڈھیر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بدن پر جو کپڑے تھے یقیناً ان کا کبھی کوئی نہ کوئی رنگ رہا ہوگا مگر اس وقت تو وہ مٹیالے رنگ کے' میل سے اٹے ہوئے لبادے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ اس کے بال لٹوں کی صورت میں دھول میں اٹے لٹک رہے تھے۔ اس کے پیر سوج کر موٹے ہو گئے تھے اور وہ ننگے پیر تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچ کر حیران تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کرنے کے باوجود کیا پایا تھا؟ وہ صرف چند طاقتوں کے کچھ بھی تو حاصل نہیں کر پائی تھی۔ وقار الحسن کے دل میں اس کے لیے پیار کی ایک رمق بھی نہیں پھوٹی تھی۔

"آؤ۔" ایک غار کے چھوٹے سے دہانے کے منہ پر رک کر کوثر نے وقار الحسن سے کہا۔ میں وقار الحسن میں ضم تھا۔ ممکن ہے کسی خوف کی وجہ سے میں باہر نکلنے سے گھبرا رہا ہوں۔ وقار الحسن نے پہلے چاروں طرف دیکھا۔ ہم جس دہانے پر کھڑے تھے وہ اتنا چھوٹا تھا کہ عام آدمی بڑی مشکل سے اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا مگر کوثر بڑی آسانی سے اندر داخل ہو گئی۔ وقار الحسن کو اندر داخل ہونے میں کافی دشواری ہوئی' اس کے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئیں۔ میرا خیال تھا کہ غار کے اندر گھپ اندھیرا ہوگا لیکن یہاں اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ ہم کچھ اندر کی طرف بڑھے تو روشنی تیز ہو گئی۔ یہاں دیواروں پر بنی مورتیاں' سیاہ پتھر سے تراشی گئی تھیں۔ اس تراش میں کوئی ترتیب نہیں تھی یوں لگتا تھا جیسے بنانے والے کو جہاں ابھرا ہوا پتھر ملا اس نے مورتی تراش دی۔ وہ مورتیاں کام دیو اور رتی دیوی کی تھیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں' وکرم شیلا اور نالندہ کے وشویدالیہ میں اور سلطان گنج بھاگلپور کے گنگا مندروں میں ایسی بے حیائی کی عکاس مورتیاں بنی

ہوئی ہیں اور آج میں اپنی نظروں سے شیطانی جذبات کی تشریح کرتی ان مورتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایسے ایسے مناظر تھے جنھیں دیکھ کر بدن پگھلنے لگتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وقار الحسن ان مناظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے جب کہ کوثر نظر چرائے آگے بڑھ رہی ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وقار الحسن کے بدن میں حرارت بڑھنے لگی ہے۔ یہ بات میرے لیے خوش آیند تھی۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ وقار الحسن بہت جلد کسی برفانی تودے میں تبدیل ہو جائے گا۔

میں انہی مناظر سے پیدا ہونے والی گدگدی کو انجوائے کر رہا تھا کہ اچانک کوثر نے ایک پتھر پہ ہاتھ رکھ کر اسے دبایا۔ وہ پتھر اندر کی طرف لڑھک گیا۔ اس پتھر کی جگہ ایک بڑا گڑھا نمودار ہو گیا۔ میں اس گڑھے میں تیز روشنی دیکھ کر متجسس ہو گیا۔ روشنی ایسی تھی جیسے اندر کہیں پیٹرومکس جل رہا ہو۔ کوثر نے ہاتھ اندر ڈالا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو وقار الحسن اچھل پڑا۔ میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ پہلا خیال مجھے ان زندہ کھوپڑیوں کا آیا تھا۔ یقیناً وقار الحسن کو بھی انہی کا خیال آیا ہوگا۔

اس کے ہاتھ میں جو چیز تھی وہ پہلی نگاہ میں چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں سے بنا ہار لگا تھا مگر جب اس نے وہ پیش بند زمین پر بچھایا تو اس کی شکل چوکور تھی۔ اس میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی انسانی کھوپڑیاں پروئی ہوئی تھیں۔ اس پیش بند کے ساتھ ہی ایک بہت پرانے چمڑے پر کسی انجانی زبان میں کچھ لکھا تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے کوثر نے بتایا کہ یہ پیش بند ڈھائی ہزار سال پرانا ہے۔ ناگیا ایک مشہور جادوگر تھا جو سیاہ ٹوپی پہنتا تھا۔ اس کے چیلے اب بھی سیاہ ٹوپی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ نہ معلوم کتنے لوگ ہیں جو اس پیش بند کے حصول کے لیے اپنی جانیں ہار چکے ہیں۔ یہ پیش بند کوثر کے قبضے میں دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ گنگتلا نے وقار الحسن سے جھوٹ بولا تھا کہ سادھو اسے حاصل کر چکا ہے۔ اس پیش بند میں صرف اور صرف انسانی کھوپڑیاں اور انسانی ہڈیاں استعمال کی گئی تھیں۔ کوثر نے یہ بھی بتایا کہ ناگیا نے مختلف علوم محض انسانی لاشوں کے ذخیرے کے بعد حاصل کیے تھے۔ بعد میں ان انسانوں کی کھوپڑیوں کو وہ ایک خاص قسم کے محلول میں ڈال کر سکیڑ لیتا تھا۔ انھی کھوپڑیوں کا یہ پیش بند بنایا گیا ہے، یہ جس کے پاس ہو اس پہ کوئی جادو ٹونا، کوئی منتر جاپ یا کوئی چھکار اثر انداز نہیں ہوتا۔

"یہ تمھاری دسترس میں تھا پھر سادھو نے تمھیں کیوں مکڑی کے جال میں قید کر دیا تھا؟" جو سوال میرے ذہن میں تھا وہی وقار الحسن کے لبوں تک آگیا۔

"ہاں۔۔۔ ایسا ہونے کے لیے یہ پیش بند بدن پر ہونا ضروری ہے۔" کوثر نے اس پیش بند کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ بات پہلے نہیں جان پائی تھی۔ میں نے اسے سادھو کے خوف سے چھپا دیا تھا، اس سے پہلے کہ میں اسے اٹھا کر پہنتی اس نے مجھے قابو میں کر لیا تھا۔"

اتنا کہہ کر کوثر نے اس پیش بند کو گلے میں اس طرح سے پہن لیا کہ اس کی دو لڑیاں اس کی بغلوں سے ہوتی ہوئی اس کے سینے تک آگئیں پھر اس نے اسے قمیص کے اندر کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اسی گڑھے میں ہاتھ ڈال کر فیروزی انگوٹھی اور اسم اعظم بھی نکال لیا۔ اس اسم اعظم کو دیکھتے ہی وقار الحسن کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ کوثر نے بلا حیل و حجت وہ چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔

وقار الحسن کو سنہرے بابا کی ہدایات اچھی طرح یاد تھیں، اسی لیے کہ ان چیزوں کے لیتے ہی اس نے اپنی واسکوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر سنہرے بابا کی دی ہوئی وہ پڑیا نکال لی جسے سنہرے بابا نے اس ہدایت کے ساتھ دیا تھا کہ انگوٹھی ملتے ہی وہ اس پڑیا کے سفوف کو اس انگوٹھی پر اچھی طرح مل لے، باقی بچے ہوئے سفوف کو اپنے کپڑوں پر اور سر کے بالوں پر اچھی طرح لگا لے۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے لگا لینے سے کیا ہوگا مگر یہ بات یقینی تھی کہ اس سے وقار الحسن کو فائدہ ہی ہوتا تھا۔

کوثر وقار الحسن کی حرکات کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس پڑیا میں موجود سنہرے رنگ کے سفوف میں انگوٹھی کو ڈال کر رگڑا۔ وہ چاندی کی انگوٹھی سونے کے رنگ کی سی ہو گئی۔ وہ سفوف دیکھنے میں سونے کا بنایا ہوا پوڈر ہی لگ رہا تھا۔

بہرحال انگوٹھی کو دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں ڈال لینے کے بعد وقار الحسن نے اسم اعظم پہنا اور پھر بچے ہوئے سفوف کو اپنے کپڑوں پر ملنے لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرا دم گھونٹ دیا ہو بلکہ مسلسل میرا دم گھونٹ رہا ہو۔ میری بینائی بھی متاثر ہونے لگی تھی۔

مجھے عجیب سے خوف نے جکڑ لیا اور میں گھبرا کر وقار الحسن کے بدن سے باہر آگیا۔

بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی قبر سے باہر نکل آیا ہوں۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا، چاند کی سی ٹھنڈی روشنی نے گویا مجھے زندہ کر دیا تھا۔ میں نے گہرے گہرے سانس لیے۔ وقار الحسن وہ سفوف اب اپنے بالوں میں مل رہا تھا۔ میں اور کوثر اسے دیکھ رہے تھے۔ کوثر میری موجودگی سے بے نیاز اسے تکے جا رہی تھی۔ میری نگاہیں بھی اسی پر گڑی ہوئی تھیں، میں کسی تجربے کا منتظر تھا۔ شاید وہ بھی کسی چمتکار کے انتظار میں تھی، اور پھر۔۔۔ جو کچھ مجھے دکھائی دیا تھا وہ غالباً کوثر نے بھی دیکھ لیا۔

میرے ساتھ ہی وہ بھی وقار الحسن کی طرف لپکی جو بالکل ایسے جھوم رہا تھا جیسے بے ہوش ہونے والا ہو۔ میں نے اسے تھامنا چاہا مگر میرے ہاتھ اس کے بدن کے پار ہو گئے مگر دوسری طرف سے کوثر اسے تھام چکی تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ کوثر نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

"اسے لٹا دو۔" اس نے وقار الحسن کے بھاری بھرکم وجود کے وزن سے گھبرا کر کہا۔

میں نے سر ہلا کر اسے بتایا کہ میں مجبور ہوں۔ اسی دوران میں وہ اس کا وزن سہار نہیں سکی اور وقار الحسن کٹے ہوئے شہتیر کی مانند اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری آواز سننے سے قاصر ہے۔

وقار الحسن کی کیفیت میرے لیے بھی پریشانی کا باعث تھی۔ وہ سفوف جو کچھ بھی تھا بہرحال اسے نقصان پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتا تھا۔ سنہرے بابا بھلا اسے کیوں نقصان پہنچاتے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تھوڑی دیر تک ٹھیک ہو جائے گا پھر بھی اس کی طرف سے پریشانی تو تھی۔ میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کوثر وقار الحسن کے رخسار تھپتھپا رہی تھی۔ اچانک ہی وہ گھٹنوں کو موڑ کر، دونوں پیر قینچی کی طرح بنا کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی پہلی پور وقار الحسن کی پیشانی پر ٹکا دی اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھنے لگی۔

چند ہی لمحوں بعد وقار الحسن نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں، میں نے بے پناہ چمک محسوس کی۔ ایسی چمک جیسے ہیرے میں ہوتی ہے یا گہرے سیاہ آسمان پر چمکتے ستارے میں ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی

تر و تازگی، صحت مندی اور چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ تبدیلیاں اتنی واضح تھیں کہ کوثر اور میں دونوں اسے یوں دیکھتے رہے جیسے وہ وقار الحسن نہ ہو کوئی اجنبی ہو۔

اس میں پیدا ہونے والی یہ خوب صورت تبدیلی میرے لیے باعث حسد تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں کیوں باہر نکل آیا۔ گمان غالب تھا کہ اگر ان لمحوں میں، میں اس میں موجود ہوتا تو شاید یہ تبدیلی مجھ میں بھی آتی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کاش یہاں آئینہ ہوتا اور میں خود کو دیکھ سکتا۔ کیا معلوم یہ تبدیلی مجھ میں بھی آئی ہو۔ جی چاہا کہ کوثر سے اپنے بارے میں پوچھوں مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ وہ میری آواز سننے سے قاصر تھی۔ میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ مجھے وقار الحسن کے جسم میں چلے جانا چاہیے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس بار اس کے اندر کی تبدیلی بھی بہت واضح طور پر محسوس ہوئی۔ اس کے اعصاب پر سکون تھا۔ کسی قسم کا ہیجان یا انتشار نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بڑا آرام محسوس ہوا۔

کوثر اب وقار الحسن کو لیے ہوئے پھر اسی جگہ آگئی جہاں ہم پہلے تھے۔ مجھے وقار الحسن اور کوثر پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ دونوں جانے کب سے بھوکے تھے۔ ممکن ہے وقار الحسن بھی بھوک محسوس کر رہا تھا مگر اس نے کھانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہم لوگ جس جگہ تھے وہاں وقت کو دھیان میں لانے یا اس سے معاملہ رکھنے میں بالکل بے بس تھے۔ میں نے وقار الحسن کو احساس دلایا کہ وہ کئی روز سے بھوکا ہے۔ اسے کچھ کھا لینا چاہیے۔

وقار الحسن میری بات سن کر کچھ بے چین سا ہو گیا تھا شاید اسے بھی اپنے بھوکے ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے کوثر سے کہا۔ کوثر ہم لوگوں کو لے کر باہر آگئی۔ ایک بات بتانا میں بھول گیا کہ جب ہم لوگ وہ انگوٹھی اور پیش بند وغیرہ لے کر اس غار سے باہر آئے تھے وہ تمام سانپ جنھیں کوثر نے ساکت کر دیا تھا، وہاں نہیں تھے۔ اس بارے میں کوثر نے بتایا کہ وہ سب واپس اسی پہاڑی پر جا چکے ہیں اور اب وہ اسی وقت آئیں گے جب کوثر انھیں بلائے گی یا اس سے کوئی پیش بند لینے یا چھیننے کی کوشش کرے گا۔

اس بار ہم نے بڑا لمبا سفر طے کیا پھر ایک ایسے پرانے کھنڈر میں پہنچ گئے جس کی اینٹیں لال تھیں ورنہ عام طور پر تمام کھنڈر سیاہ ہو چکے تھے۔ "یہ میرا مسکن ہے۔" کوثر نے

اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا مسکن کب بنا؟" وقار الحسن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جب سے میں یہاں آئی تھی۔ درمیان میں کچھ عرصہ ایسا گزرا ہے کہ میں سادھو کی دسترس میں تھی۔"

وہ بتا رہی تھی۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں وقار الحسن کے بدن کو چھوڑ کر باہر آگیا۔ میں اس مسکن کو دیکھنا چاہتا تھا جب کہ وقار الحسن کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ میں نے باہر آتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوثر کی توجہ اس طرف نہ ہو۔ وہ ایک دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے موقع غنیمت جانا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو میں دوسری طرف نکل گیا۔ وقار الحسن نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے میری اس حرکت کو سمجھ گیا ہو مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

میں صرف چند ہی لمحوں میں وہ تمام کھنڈر دیکھ چکا تھا۔ اس کھنڈر کے اندرونی حصے میں وہ درخت تھا جہاں ایک بار وقار الحسن تصور کے زور پر پہنچا تھا اور کوثر کو اس درخت کی کھوہ میں بیٹھے جاپ کرتے دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کوثر کچھ عجیب و غریب قسم کی کھانے کی چیزیں لے آئی۔ جن میں زیادہ تر پھل قسم کی چیزیں تھیں۔ میں پھر وقار الحسن کے اندر داخل ہوگیا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا ختم ہوتے ہی وقار الحسن مطلب کی بات پر آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوثر اب کسی حیل و حجت کے بغیر امروہہ چلنے پر راضی ہو جائے اور کوثر اسے باور کرا رہی تھی کہ اسے امروہہ جانے پر کوئی اعتراض نہیں مگر وہ ایک بات مان لے۔

"تم جو باتیں کر رہی ہو وہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔" وقار الحسن نے اکتا کر کہا۔

"کوئی بات تمہاری سمجھ سے باہر نہیں ہے۔ کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ رہے ہو کہ سادھو کنواریوں کو تباہ کرنے پر اترا ہوا ہے۔ یہ گناہ تم جانتے ہو اور اس سے چشم پوشی گویا گناہ کرنے کے مترادف ہے، تمہیں اس کا یہ زور توڑنا ہے جب کہ پائل اس کے حوالے کرنے کے بعد تم دو طرف سے مصیبتوں میں گھر چکے ہو۔ ایک یہ کہ تم نے سادھو کو شکتی دے دی اور دوسری یہ کہ شگفتہ بے بس سہی مگر پر کاش بے بس نہیں ہے۔ وہ امروہہ جا کر ہمارے گھر والوں کو پریشان کر سکتا ہے۔"

تبھی مجھے یہ یاد آگیا کہ شگفتہ بتا چکی ہے کہ اس کے خاندان کو چاند کا قیدی بنانے میں سوامی جی کا ہاتھ ہے گویا اسے ابھی سوامی جی سے بھی نمٹنا تھا۔ میں نے وقار الحسن کو ٹہوکا دے کر یہ بات یاد دلائی۔

"پھر۔۔۔ تم کیا چاہتی ہو؟" وقار الحسن نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ جو طاقت تم حاصل کر چکے ہو اسے مکمل طور پر استعمال کرو۔ تم اپنے ہمزاد کو ٹھوس شکل دے دو اور اسے طاقت ور بنانے میں میری مدد کرو۔ اس طرح ہم دونوں محاذوں پر بیک وقت لڑ سکیں گے۔ گھر والوں کو صرف میری ہی نہیں تمہاری بھی ضرورت ہے۔ تم امروہہ میں رہ کر بھی سوامی جی تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔ تم سادھو کو بھی قابو میں کر سکتے ہو۔ اور میں تمہاری مدد کروں گی۔"

وہ معقول بات کر رہی تھی۔ وقار الحسن کو مان لینا چاہیے تھا مگر شاید وقار الحسن میری نفسانی خواہشات سے خوفزدہ تھا۔ یہ بات میں نے محسوس کی تھی۔ تب میں نے بھی اسے اکسایا اور کہا کہ وہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ میں جو کچھ بھی کروں گا اس کی عزت اور وقار کو دھچکا نہیں لگنے دوں گا۔ میری بات سن کر وقار الحسن تیار ہوگیا۔ کوثر نے پروگرام بتایا کہ وہ لوٹ امروہہ چلیں۔ وہاں پہنچ کر سکون سے وظائف کیے جائیں، وہاں سنہرے بابا کی دی ہوئی وظائف کی کتاب بھی تھی جس سے کافی مدد مل سکتی تھی۔ خود کوثر بھی جاپ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، مگر کیوں کہ اس کے لیے کافی وقت درکار تھا اور وقار الحسن جلد از جلد امروہہ جانے پر بضد تھا اس لیے اس نے بھی یہی سوچا کہ بعد میں جاپ کر لیے جائیں۔

یہ فیصلہ کرتے ہی کوثر ہمیں لے کر چل پڑی۔ میں سادھو کی طرف سے فکر مند تھا۔ مجھے تو یقین نہیں تھا کہ وہ اب ہمارے سامنے نہیں آئے گا لیکن یہ ممکن بھی تھا۔ وہ پائل حاصل کر چکا تھا۔ اس کے پہلوؤں میں لذتوں کے دریا بہ رہے تھے۔ اب وہ ان دریاؤں سے سیراب ہو رہا ہوگا۔ میں چمپا کی طرف سے بھی فکر مند تھا۔ پتا نہیں وہ مر چکی تھی یا بے ہوش تھی۔ مجھے کلپنا بھی یاد آ رہی تھی۔ پتا نہیں وقار الحسن کیا سوچ رہا تھا۔ بہرحال وہ گھر جاتے ہوئے خاصا پرجوش تھا۔ کچھ فاصلے کا سفر اختیار کرنے کے بعد کوثر او[ر وقار]

[وقا]ر الحسن کسی دفینے پر بیٹھ گئے۔ میں کچھ دیر کے لیے [آنکھ]یں بند کر کے خود کو آرام دینے لگا۔ جب آنکھ کھلی تو ہم [بالیکا م]ندر کے احاطے کی دیوار کے پاس تھے۔ گویا سادھو [کا سا]منا کیے بغیر ہم بالیکا مندر تک پہنچ گئے تھے۔

وقار الحسن نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کھنڈر سامنے تھا جہاں [سادھ]و کا مسکن تھا۔ اس کا آبنوسی دروازہ سختی سے بند تھا۔ [اند]ر اندھیرا پھیلا ہوا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس بڑے ہال [میں] رنگین روشنیوں کے دائرے زندگی کی بھرپور عکاسی [کر] رہے ہوں گے۔ وہاں موجود ہر بدن سے قوس قزح لپٹی [ہو]گی۔ کھوپڑیاں خون چاٹ رہی ہوں گی اور سادھو زندگی [کے] پرشباب دور سے گزر رہا ہوگا۔ میرے دل میں ہوک سی [اٹھ]ی۔ وقار الحسن اور کوثر اب بالیکا مندر کی اس دیوار کو [عب]ور کرنے ہی والے تھے کہ اچانک ہمارے سامنے گہرا [دھ]واں چھا گیا۔ وقار الحسن نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ [کوث]ر لمحہ بھر کو تو بوکھلائی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی کرخت [آوا]ز نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم نے ہمارے [رس]تے میں آنے کی جرات کیسے کی؟"

"وقار الحسن نے مجھے وچن دیا تھا۔" یہ سادھو کی آواز تھی۔

"کیسا وچن۔۔۔ کیا کوئی عمر بھر تمہاری قید میں رہنے کا [وچ]ن دے سکتا ہے؟" کوثر نے بپھر کر کہا۔

"نہیں، یہ وچن نہیں، اس نے کہا تھا کہ وہ پیش بند مجھے دے دے گا۔"

کوثر زور سے ہنس پڑی۔ آوازیں اس گہرے دھوئیں کے [اند]ر سے آ رہی تھیں۔ سادھو سامنے نہیں تھا۔ میں وقار [الح]سن کے اندر سے نکل آیا اور باہر آتے ہی سادھو مجھے نظر [آ]نے لگا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں میں دو [اج]لی مچھلیوں سی لڑکیاں الجھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے [س]راپے کو نگاہ بھر کر دیکھنا شاید آدمی کا سب سے بڑا کمال [تھ]ا، کوئی تاب ہی نہیں لا سکتا تھا۔ میں نے اتنے روشن [اور] شعاعوں میں لپٹے بدن اور شہد میں گندھا گداز بدن [اس] سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان میں نہ کلپنا تھی نہ وہاں [کی ا]ور دوسری لڑکی۔ وہ نئی لڑکیاں تھیں۔ میں نے حسرت [س]ے سوچا کہ کلپنا اور وہ لڑکی شاید اپنے دکھتے جوڑوں کی [اذی]ت برداشت کر رہی ہوں گی۔ میرا جی چاہا کہ میں فوراً [سا]دھو کا ساتھی بن کر انہی کھنڈر میں لوٹ جاؤں مگر یہ بھی میرے بس میں نہ تھا۔

"جو چیز وقار الحسن کی ملکیت نہیں ہے اسے کسی کو دینے کا وچن وہ کیسے کر سکتا ہے؟" کوثر تمسخرانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"دیکھ مورکھ کنیا، میں اگر چاہتا تو تجھے تباہ کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ وقار الحسن نے جو وچن دیا تھا وہ تیرے بھروسے پر ہی دیا ہوگا۔ وہ وچن اگر پورا نہیں ہوا تو۔۔۔ تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔" اس نے کھلی دھمکی دی۔

"تم سے اچھی طرح پیش آنے کی ہمیں کوئی امید بھی نہیں ہے۔" اس بار وقار الحسن نے جواب دیا۔ "وہ پیش بند میرا نہیں ہے، کوثر کا ہے۔ وہ مجھے دینے پر تیار بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں وہ تمہارے حوالے کرنے سے قاصر ہوں، دوسری بات یہ کہ میں تمہیں پائل دینے کا وعدہ کیا تھا جو میں پورا کر چکا ہوں، پیش بند دینے کا میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ تم میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

وقار الحسن اس سے بات کر رہا تھا اور کوثر اپنا دایاں ہاتھ گریبان میں ڈال کر پیش بند کو پکڑے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اچانک ہی سادھو کی نگاہ کوثر پر پڑی وہ چلایا۔

"نہیں۔۔۔ ایسا نہ کرو۔"

مگر دوسرے ہی لمحے ہم نے چمکدار لکیروں کو سادھو کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ میں اور وقار الحسن حیران رہ گئے تھے۔ نہ معلوم وہ سانپ چشم زدن میں کہاں سے آگئے تھے۔ سادھو بوکھلا کر غائب ہوگیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی وہ سانپ پھر شعاعوں کی مانند کوثر کی طرف بڑھے جو آنکھیں بند کیے کھڑی تھی پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام شعاعیں اس پیش بند میں جذب ہوگئیں۔

اب راستہ صاف تھا۔ کوثر نے آنکھیں کھول دیں اور ہمیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں وقار الحسن کے اندر ضم ہوگیا۔ بے وجہ باہر رہ کر سفر کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اندر باہر جانے کا اختیار میرے لیے نیا اور پرکشش تھا اس لیے میں ایسا بار بار کر رہا تھا۔ وقار الحسن کو میں نے اس سلسلے میں، یعنی مجھ پر پابندی لگانے یا روکنے کے سلسلے میں بے بس پایا تھا شاید اس لیے بھی میں اپنی انا کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ وہ میری کچھ باتیں نہیں مان رہا تھا سو میں بھی اس کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

ہم تینوں چند لمحوں بعد باہر آگئے۔ کوثر کا حلیہ بہت زیادہ خراب تھا۔ خود اسے بھی اس کا احساس تھا اسی لیے وہ بالیکا مندر کے کنارے بنے ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی جسے غالباً" وہاں آنے والے لوگ غسل خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو نہا چکی تھی۔ اس کے بال صاف تھے۔ اس نے ایک جوگیا رنگ کی ساری لپیٹ رکھی تھی۔ پتا نہیں اس نے یہ ساری کہاں سے لی تھی مگر بہرحال اب اس کا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ اسے دیکھنے والا ڈر جائے۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے بالوں کو سیدھا کیا اور ساری کے پلو سے سر ڈھک لیا۔ یہاں قدرے اندھیرا تھا' البتہ سامنے والے ہوٹل میں لالٹین کی مدہم روشنی تھی۔ ہم پہلے وہیں گئے۔ وقار الحسن کوثر کو راستے میں اس برٹش آدمی کا حشر بتا چکا تھا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ وہ اداس لڑکا اب بھی وہاں تھا۔ اب بھی اس کے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں تھے البتہ یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اب اس کی مدد کے لیے ایک اور لڑکا بھی وہاں موجود تھا۔

وقار الحسن نے اس سے اس برٹش کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر بتایا کہ اس کا مالک اب سے سترہ روز پہلے اس کھنڈر کی طرف گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ وقار الحسن نے اسے بتا دیا کہ وہ اب اس کا انتظار نہ کرے۔ یہ سن کر اس لڑکے نے کوئی تفصیل نہیں پوچھی بس ایک ٹک وقار الحسن کو دیکھے گیا۔

ویسے بھی وہ شاید ہمیں انہی کھنڈر کی طرف سے آتا دیکھ چکا تھا۔ کوثر کو وہ چور نگاہوں سے دیکھتا اور زرد پڑ جاتا تھا۔ پتا نہیں اسے کیا چیز خوفزدہ کر رہی تھی۔ بہرحال ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتے تھے۔ اس لڑکے کی زبانی پتا چلا کہ اب ایک لاری اس سڑک پر چلنے لگی ہے۔ وہ ہر تین گھنٹے بعد یہاں تک آتی ہے اور پھر واپس جاتی ہے۔ آج پوجا کا دن نہیں تھا پھر بھی کبھی کبھی سیاح اس مندر کو دیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے اسی لیے یہ لاری کسی ٹریول کمپنی نے چلائی ہے۔ اس کے مطابق وہ لاری آنے والی تھی پھر ہم وہاں انتظار کرتے رہے گو کوثر نے کہا تھا کہ ہمیں پیدل چل دینا چاہیے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اندھیری سڑک اچانک روشنی میں نہا گئی۔ وقار الحسن اور کوثر کنارے آکر کھڑے ہوگئے۔ چند ہی لمحوں بعد وہی لاری وہاں رکی۔ اس میں سے کچھ انگریز عورتیں اور مرد اترے۔ ان کے ساتھ کچھ افریقی لوگ بھی تھے۔ ان سب کے ساتھ بہت سامان تھا۔ وہ سب زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے کا دور تک چھایا ہوا سناٹا ٹوٹ چکا تھا۔ زندگی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ ہوٹل کا لڑکا مستعدی سے کام میں لگ گیا تھا۔ گاڑی سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے پھر ڈرائیور نے وقار الحسن سے پوچھا کہ وہ یہاں رہے گا یا شہر جائے گا۔ وقار الحسن نے بتایا کہ اسے شہر جانا ہے مگر ان کے پاس کرایہ ادا کرنے کو پیسے نہیں ہیں۔ ڈرائیور کچھ دیر تک اسے سر سے پاؤں تک دیکھے گیا پھر احسان کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلا کر اس نے ہمیں گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم جلدی سے پچھلی سیٹوں پر جا بیٹھے۔

اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے شہر تو چلے جائیں گے مگر لاری اڈے سے گھر تک کے لیے پتا نہیں کوئی رحم دل تانگے والا ملے گا یا نہیں۔ امروہہ کا کرایہ تو وقار الحسن کے چچا سے لے لیتا۔ وہ سیاح اب بالیکا مندر سے کچھ فاصلے پر اپنی چھولداریاں نصب کر رہے تھے۔ شاید ان لوگوں کا رات بھر یہیں رکنے کا پروگرام تھا۔ وقار الحسن صدق دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ان کھنڈر کی طرف نہ جائے۔ میں بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ ورنہ ان سب کا انجام اس برٹش آدمی سے مختلف نہ ہوتا۔

پندرہ بیس منٹ تک وہیں کھڑے رہنے کے بعد لاری شہر کی طرف چل پڑی۔ وقار الحسن نسبتاً" خوش تھا جب کہ کوثر کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لاری کے انجن کا شور بہت زیادہ تھا۔ اچانک وہ رخ موڑ کر بولی۔ "وقار الحسن! یہ۔۔۔ تمہارا ہمزاد تم سے بات کرتا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ تفصیل بتاؤ۔ میں سب کچھ جاننا چاہتی ہوں؟"

تب وقار الحسن نے اسے میرے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس کا طاقت ور تصور ہی شاید اس تقسیم کا سبب بنا ہے یا ممکن ہے کہ تصور میں جو وہ سفر کرتا تھا وہ اصل میں وہ نہیں' میں تھا۔ میں خود بھی اس موضوع پر سوچ چکا تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہے۔ وقار الحسن کا وہ حصہ جو تصور میں سفر کرتا رہا تھا وہ میں تھا۔

کوثر جوں جوں تفصیل سن رہی تھی اس کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ وقار الحسن نے میرے خبیث قسم کے خیالات کے بارے میں بھی اسے بتا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسا سن کر کوثر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی تھی۔ پھر وہ بولی۔ "میں اس کو دیکھ سکی ہوں مگر اس کی بات کیوں نہیں سن سکی؟"

"مجھے کیا پتا؟" وقار الحسن نے بیزاری سے کہا۔

"کوئی بات نہیں' ایسا کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں امروہہ پہنچتے ہی جاپ شروع کر دوں گی۔"

"ایک بات کان کھول کر سن لو کوثر۔" وقار الحسن کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا تھا۔ "تم گھر کو گھر سمجھ کر رہو گی' تمہیں ان تمام نقصانات کا ازالہ کرنا ہے۔ جو تمہاری وجہ سے ہمارے خاندان کو اٹھانا پڑے ہیں۔ تم وہاں کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کرو گی۔ وہ لوگ کسی نئی پریشانی کو یا تمہارے کسی چمتکار کو افورڈ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اپنے آپ کو ہر اچھی اور بری بات' بہتر اور خراب رویئے کے لیے تیار رکھو۔ لوگ تمہیں طعنے بھی دیں گے اور برا بھلا بھی کہیں گے۔ بالخصوص تم اماں کے رویئے کو ہر حال میں برداشت کرو گی کیونکہ تمہاری حرکت سے جہانی آپا اور شنو آپا کی عزت کو بھی دھچکا لگا ہے جسے اماں نے بہت محسوس کیا ہے اور پھر سونے پر سہاگا تمہارا وہ خط۔"

"میں جانتی ہوں وقار الحسن' میں پوری کوشش کروں گی کہ ایسی کوئی بات نہ ہو۔" اس نے وقار الحسن کی بات کاٹ دی۔ جس شرمندگی کا اظہار وہ زبان سے کر رہی تھی اس کا کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہ تھا۔

"تم جانتی ہو کہ تمہاری صحت کے لیے' یعنی تمہاری معذوری دور کرنے کے لیے سنہرے بابا نے دعا کی تھی۔"

"ہاں جانتی ہوں۔ ان سے ملنا بھی چاہتی ہوں مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔"

"ہاں۔۔۔ ایسا ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک تم یہ راستہ نہ چھوڑ دو۔ ویسے مجھ سے صلاح لو تو میں یہی مشورہ دوں گا کہ تمہیں ایک عام سی لڑکی بن کر رہنا چاہیے۔"

"اب ایسا ہونا ممکن نہیں ہے وقار الحسن!" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں۔۔۔ آخر کیا قباحت ہے؟"

"میری مراد پوری ہو گئی تو۔۔۔ تو یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہارے مشورے پر عمل کروں گی۔"

اس کی آنکھوں میں اچانک چراغ لو دینے لگے تھے۔ وقار الحسن اس سے نگاہ چرا گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں وقار الحسن سے کہوں کہ وہ بھی کچھ پتا مار لے۔ وہ اپنی محبت پانے میں حق بجانب تھا تو یہی بات کوثر کے لیے بھی ٹھیک تھی۔ رہا اماں کا سوال کہ وہ پسند نہیں کریں گی تو انہیں منانا وقار الحسن کے لیے اتنا مشکل نہ تھا۔ نہ ان کے منانے میں وہ عذاب نازل ہوتے جو کوثر کے حوالے سے ہوئے تھے۔ شگفتہ کو اچھا بر مل ہی جاتا مگر کوثر کے لیے تو اب ایسا سوچنا بھی مشکل تھا۔ اس کے خاندان میں کب محبت کی شادیاں ہوتی رہی تھیں۔ وہاں تو سمجھوتے کرنے کا رواج تھا۔ مزید کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے وقار الحسن کا سمجھوتا کرنا ہی بہتر تھا مگر وہ تو جانے کیا سوچے بیٹھا تھا۔ میں یہ جاننے سے قاصر تھا کہ اس روز سب کو بھاڑ میں جھونک دینے کی باتیں کرنے والے وقار الحسن نے شگفتہ کے بارے میں اب کیا سوچا ہے یا اس کے ذہن میں مزید کسی تبدیلی کا گزر بھی ہوا ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ باتیں جلد یا بدیر معلوم ہو جانا تھیں۔

مجھے تو صرف ایک اطمینان تھا کہ میں جب چاہوں سادھو کے پاس جا سکتا ہوں۔ آنے جانے میں اپنی مرضی کا مالک ہوں مگر میں چاہتا تھا کہ کوثر کی کوششوں سے میں ٹھوس وجود پا لوں۔ تب میرا وہاں جانا' میری خواہشات پوری کرنے کے لیے اچھا بھی تھا' لیکن وہاں جانا اور سادھو کو شد پیتے دیکھ کر چپ رہنا میرے بس میں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت وقار الحسن اور کوثر کے ساتھ محض اسی لالچ میں تھا کہ کوثر کی باتوں نے میری آس بندھا دی تھی۔ مجھے امید تھی کہ کوثر اس پر دباؤ ڈال کر ایسے وظائف پر بھی مجبور کرے گی جو میرے لیے کار آمد ہوں گے۔

وہ دونوں اب خاموش تھے صرف لاری کے انجن کا شور تھا۔ دور سے شہر کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں لاری شہر میں داخل ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ وقار الحسن کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہاں زیادہ تر تانگے والے ایسے تھے جو پیسے پہلے طلب کرتے تھے اور بالخصوص رات کو۔ میں لاری سے اترتے ہی وقار الحسن کے بدن کو چھوڑ چکا تھا۔

میں سیدھا اس ہوٹل پر پہنچا جو لاری اڈے پر بنا تھا۔ میں ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا سو سیدھا اسی موٹے سے بندو کے پاس پہنچ گیا جو لوہے کی تجوری کھولے دن بھر کی کمائی گن رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان نوٹوں میں سے کئی نوٹ اٹھا لیے۔ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ حالانکہ اس کی تمام تر توجہ انہی نوٹوں کی طرف تھی۔ اس سے ایک بات کا یقین ہوگیا کہ چیز میرے ہاتھ میں آتے ہی غائب ہوجاتی ہے۔ یعنی دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ اس تجربے نے مجھے ایک اور الجھن میں ڈال دیا کہ اگر میں نوٹوں کو ہاتھ میں لے سکتا ہوں' اگر میں بالیکا مندر کے باہر بیٹھ کر کھانا کھا سکتا ہوں۔ روٹی سالن اور پلیٹ ہاتھ میں لے سکتا ہوں' پانی پی سکتا ہوں تو آخر کیا وجہ ہے کہ انسانی جسم کو نہیں چھو سکتا۔

میں نے بالیکا مندر میں اس لڑکے کو چھونے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ میں نے وقار الحسن کو تھامنا چاہا مگر ایسا بھی نہیں کرسکا' کیوں؟ کیا میں جاندار چیزوں کو نہیں پکڑ سکتا؟ صرف بے جان چیزیں ہی میری گرفت میں آسکتی ہیں۔ یہ سوال مجھے الجھا رہا تھا مگر میں کچھ بھی سوچ کر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا اس لیے فی الوقت اس پر سوچنا بیکار تھا۔ پیسے چوری کرنے کا تجربہ کامیاب ہوچکا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے کافی تقویت کا باعث تھی۔ پیسے لیتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا' وقار الحسن غالباً" مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے وہ نوٹ چھپا لیے۔ پتا نہیں میری اس چوری کو وقار الحسن نے پکڑا یا نہیں مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ اس نے ایک تانگے والے سے بات کرلی تھی کہ وہ پیسے گھر پہنچ کر دے دے گا۔ میں بھی تانگے پر سوار ہوگیا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کار یا تانگا گزر جاتا تھا۔ ہم کافی دیر بعد چچا والی گلی میں داخل ہوئے۔ گھوڑا مریل سا تھا اس لیے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس وقت تو یہ بھی غنیمت تھا ورنہ لاری اڈے پر دوسری کوئی سواری نہ تھی۔ تانگا گلی میں داخل ہوا تو سوئی ہوئی گلی جیسے جاگ اٹھی۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اور پہیوں سے نکلنے والی چرخ چوں کی آوازوں نے سناٹے کو کاٹ دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چچا سے کوثر کے ملنے کا منظر کافی جذباتی ہوگا۔ پتا نہیں وہ کس رد عمل کا اظہار کریں۔

میں نے وقار الحسن اور کوثر کے اترتے ہی ایک نوٹ تانگے والے کے قریب سیٹ پر رکھ دیا اور چپکے سے ایک طرف ہوگیا۔ وقار الحسن نے آگے بڑھ کر دروازے کا کنڈا بجایا۔ کئی بار کنڈا بجانے کے بعد اندر کسی کے جاگنے کے آثار پیدا ہوئے پھر کچھ دیر بعد کسی کی آہٹ ہوئی پھر کچھ خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں چچا۔ وقار الحسن!" وقار الحسن نے قدرے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اندر ایک ہلچل سی مچی اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی چچا کے ہاتھ میں پکڑی لالٹین کی روشنی گلی میں رینگ آئی۔ انھوں نے جوگیا رنگ کی ساڑھی میں لپٹی کوثر کو حیرت سے دیکھا۔ انھیں یقیناً اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے کہ کوثر نے چہرے پر ساڑھی کا پلو جھکا رکھا تھا۔ شاید وہ بھی جانتی تھی کہ چچا اسے اچانک دیکھ کر حواس باختہ بھی ہوسکتے ہیں' غصے میں بھی آسکتے ہیں' کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

"وقار الحسن۔ تم۔ اور۔ یہ۔ یہ کون ہے؟"

"اندر تو آنے دیں چچا۔" وقار الحسن نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کوثر نے جو حرکت کی تھی اسے سب کی طرح چچا نے بھی پسند نہیں کیا تھا وہ تو اس کی تلاش پر نکلنے کے بھی خلاف تھے۔ ممکن تھا دروازے پر ہی اس کے بارے میں سن کر وہ آپے سے باہر ہوجاتے' چیختے چلاتے اور یوں ہمارا محلہ جاگ کر تماشا دیکھتا۔ "اور چچا۔ پیسے آنے ہیں آپ کی جیب میں۔ تانگے والے کو دینا ہیں۔" وقار الحسن نے مسکراتے ہوئے بات کو پلٹ کر کہا۔

"جیب میں تو نہیں اوپر ہیں اندر تو آؤ۔" وہ لالٹین رکھ کر اوپر کی طرف لپکنے لگے۔ وقار الحسن اور کوثر اندر آگئے۔ اسی وقت پیچھے سے چچی کی آواز سنائی دی۔

"ارے کون ہے۔ بتائیے تو سہی۔" وہ اوپر سے چلا رہی تھیں۔

"وقار الحسن ہے۔ تم پیسے آنے پھینکو۔"

مگر اس سے پہلے کہ پیسے آنے نیچے پھینکے جاتے' تانگے والا مڑ کر چلا گیا۔ وقار الحسن نے جھانک کر اسے حیرت سے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک دم میری طرف مڑا۔ شاید مجھے ڈانٹنا چاہتا تھا۔ وہ میری چوری اور تانگے والے کو پیسے دینے والی حرکت سے واقف ہوچکا تھا مگر چچا کی موجودگی میں وہ ایسا نہیں کرسکا۔ میں رخ پھیر کر انجان بن کر کھڑا ہوگیا۔

"چلا گیا؟" چچا نے پلٹ کر پوچھا۔

"جی۔"

"آؤ۔ تم ٹھیک تو ہونا۔ اتنا عرصہ لگا دیا تم نے۔ تمہیں پتا ہے' بھائی صاحب دو بار آچکے ہیں' ان کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی کمر بالکل دہری ہوچکی ہے۔" وہ وقار الحسن سے لپٹ کر کہہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "پرسوں ہی تو واپس گئے ہیں۔ کہتے تھے وقار الحسن ملے تو کہنا کوثر کو اس کے حالوں پر چھوڑ کر لوٹ آئے۔ اب ہمیں اس کی نہیں' وقار الحسن کی ضرورت ہے۔"

کوثر کو چچا کی بات سن کر دھچکا لگا تھا۔ وہ بے ساختہ سسکاری بھر کر رہ گئی تھی۔ اس سسکاری کی آواز نے چچا کو پھر اس کی طرف متوجہ کردیا۔ اس دوران میں چچی بھی جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر ہمارے پاس پہنچ گئیں۔

"یہ۔ یہ کون ہیں؟" چچا اور چچی دونوں نے بیک وقت پوچھا۔ چچا نے لالٹین نیچے رکھ دی تھی۔ اس لیے بھی وہ کوثر کو نہیں دیکھ پائے تھے۔

"چچا! آپ۔ آپ بیٹھ جائیں۔" وقار الحسن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آنے والی تشویش میں پیدا ہونے والے ہیجان کو کس طرح روکے۔ یہ بات میں بھی سمجھ رہا تھا کہ جب چچا کو پتا چلے گا کہ وقار الحسن کے ساتھ کوثر ہے تو طوفان تو آئے گا۔

"ارے تم بیٹھو ناں! اور حالت تو دیکھو اپنی۔" یہ کہہ کر وہ چچی کی طرف پلٹے۔ "جاؤ تم کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" وہ پھر وقار الحسن سے مخاطب ہوئے۔ "تم پہلے نہا دھو لو۔ آپ بھی بیٹھ جائیے۔" آخری جملہ انھوں نے کوثر سے کہا تھا۔

چچی باورچی خانے کی طرف بڑھ تو گئیں مگر وہ پلٹ پلٹ کر کوثر کی طرف دیکھ رہی تھیں جواب سر کو جھکائے غالباً" رو رہی تھی۔ میں اس کے بدن کی خفیف سی تھرتھری سے واقف تھا۔ چچا وقار الحسن سے حالات کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے تھے مگر وقار الحسن گھر والوں کی خیریت معلوم کرنے لگا۔ وہ فرداً فرداً ہر ایک کے بارے میں پوچھ رہا

تھا۔ چچا اسے بتا رہے تھے کہ تایا نے کچھ تفصیل نہیں بتائی تھی بس اتنا کہا تھا کہ وقار الحسن کی غیر موجودگی میں خیریت کہاں ہوسکتی ہے۔ چچا ان کے دوبار آنے کے بارے میں بہت پریشان تھے اور یہ واقعی پریشانی کی بات تھی۔ ان کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ بے وجہ امروہہ سے مراد آباد تک کے دو چکر لگالیں اور بقول چچا کے وہ دونوں بار صرف وقار الحسن کے بارے میں ہی پوچھنے آئے تھے۔ وقار الحسن یہ سن کر بہت پریشان ہوگیا۔

"تائی تو ٹھیک تھیں ناں!" اس نے شاید کوثر کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے کہا۔

"وہ تو کب کی سب سے بیگانہ ہوچکی ہیں۔ کاش اللہ انھیں اولاد ہی نہ دیتا۔ جو دی تھی تو اسے معذور ہی رہنے دیتا۔ اس کی صحت تو بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ کے لیے قاتل ثابت ہوئی۔ ان کے لیے یہی دکھ کافی تھا کہ وہ ایک معذور لڑکی کے ماں باپ ہیں۔ پل بھر کی بے پناہ خوشی کے بعد اس قدر بدنامی' بے غرتی اور اذیت تو نہ سہنا پڑتی۔" وہ جلے دل کے پھپولے پھوڑ رہے تھے۔

اتنی دیر میں چچی واپس آچکی تھیں۔ ان کے چہرے پر تجسس بھی تھا' حیرانگی بھی اور ماتھے پر بل بھی پڑے تھے۔ اتنی رات گئے نیند میں خلل پڑنے سے طبیعت بھی یقیناً" مکدر ہورہی ہوگی پھر بھی اس سر جھکائے پلو میں منہ چھپائے بیٹھی لڑکی نے انھیں کچھ اور سوچنے کا موقع نہ دیا تھا۔ ان کی نگاہیں اب بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ چچا کے چپ ہوتے ہی وہ وقار الحسن کے قریب سرک آئیں۔

"ارے بیاہ رچا لیا کیا؟" انھوں نے سرگوشی بھی اتنی اونچی آواز میں کی تھی کہ کوثر چونک اٹھی' کچھ کسمسائی اور پھر کچھ سوچ کر اس نے سر اٹھا کر پلو اونچا کرلیا۔ لالٹین کی ٹمٹماتی لو کی لرزتی ہوئی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو چچا اور چچی دونوں اچھل پڑے۔

"تت۔ تم۔" وہ دونوں ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اسے تک رہے تھے۔

"یہ۔ یہ کہاں سے ملی؟" چچا ایک دم طیش میں آگئے۔ انھوں نے وقار الحسن سے پوچھا۔

"چچا بیٹھ جائیے۔" وقار الحسن نے کھڑے ہوکر ان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ میں۔ میں کوثر کو لے کر ہی آؤں گا یا پھر۔ یا پھر نہیں آؤں گا۔"

"بے وقوف تھے تم تو۔" وہ ایک دم دھاڑے۔ "پاگل ہوگئے تھے۔ ہم نے تو کہا تھا کہ اسے بھول جاؤ۔ ایسی ذلیل اولاد کو تو صبر کرلینا چاہیے۔ اس بے غیرت نے ذرا بھی کچھ نہ سوچا۔ ارے ہمارے خاندان کی لڑکی تو اکیلی رشتے دار کے گھر تک جانے سے گھبراتی ہے۔ محلے میں بھی اجازت لے کر کسی کے ساتھ جاتی ہے اور یہ۔ یہ ہماری عزتوں کو بٹا لگا کر بھاگ گئی۔ ایسی ناشکری کہ ماں باپ کی اس خدمت کا حق بھی ادا نہ کیا جو وہ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک کرتے رہے۔ انھیں جیتے جی مار گئی۔ نہ باپ کی سفید داڑھی کا خیال آیا۔ نہ ماں کے سفید جھونڈے کا۔ کس منہ سے آئی ہے یہ یہاں۔" چچا بے قابو ہو رہے تھے۔

"چچا۔ چچا پلیز۔" وقار الحسن گھبرا گیا تھا۔ ان کی آواز رات کے گہرے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ "محلے والے کیا سوچیں گے چچا۔"

"اب اور محلے والے کیا سوچیں گے بھلا۔ جو کچھ سوچنا تھا وہ تو اسی روز سوچ چکے ہوں گے جب یہ بھاگی تھی۔" چچی بھی ہاتھ نچا کر بولیں۔

کوثر اب باقاعدہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے ہوئے تھے۔ پھر وہ اچانک اٹھی اور چچا کے پیروں سے لپٹ گئی۔ "مجھے معاف کردیں چچا۔ معاف کردیں۔ بھول ہوگئی تھی مجھ سے۔"

"بھول ہوگئی تھی۔ یہ بھول تھی؟ اسے بھول کہتے ہیں۔ جس نے میرے بھائی کا خون نچوڑ لیا۔ جس نے میری ماں اسی بھائی کو پاگل کردیا۔ جس نے ہمیں زمانے بھر میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔" چچا سفاک لہجے میں بولے۔ انھوں نے ٹھوکر مار کر کوثر کو خود سے الگ کردیا۔

ان کا ردعمل بڑا شدید تھا۔ شاید وقار الحسن کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ چچا پر کس طرح قابو پائے۔ کوثر کا رنگ پیلا پڑچکا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ شاید اسے اس وقت اپنی اس حرکت کی سنگینی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں اگر ردعمل کا یہ عالم ہے تو امروہہ میں کیا ہوگا۔ تایا کی کیا حالت ہوگی۔ وقار الحسن کی اماں کیا کریں گی۔ ان کی نفرت تو کوثر کے لکھے ہوئے خط نے دوچند کردی تھی جس میں اس نے انتہائی بے باکانہ انداز میں وقار الحسن کو اپنی منزل بتایا تھا۔

ساری دنیا سو رہی تھی اور یہاں۔ چچا کے گھر میں جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا۔ چچی بجائے چچا کو ٹھنڈا کرنے کے اپنا تاریخی کردار ادا کر رہی تھیں' ان کے اندر بھڑکتی چنگاریوں کو ہوا دے رہی تھیں۔ اب تو انھوں نے باقاعدہ ناک سڑک سڑک کر رونا شروع کردیا تھا کہ اب وہ محلے والوں کا دوبارہ سامنا کیسے کریں گی۔ کیسے ایک بار پھر خاندان والوں کی تھو تھو برداشت کریں گی جب کوثر کو دیکھ کر گزری ہوئی بدنامی ایک بار پھر لوٹ آئے گی حالانکہ ان پر تھو تھو ہونے کی اور دوسری بھی کئی وجوہات تھیں۔

"میں کہتا ہوں چپ ہوجائیے۔" وقار الحسن جب کسی طرح انھیں قابو میں نہ کرسکا تو پھٹ پڑا۔ چیخ اٹھا۔

اس کی تیز آواز نے گونج کر ایک دم سناٹا سا پھیلا دیا۔ چچا اور چچی سہم کر چپ ہوگئے۔

"آپ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ لوٹ آئی ہے۔ یہ کن عذابوں سے گزری ہے' اس نے اپنی حرکت کی کتنی سزا بھگتی ہے' یہ کب سے بھوکی پیاسی ہے' اس کا جسم کتنا زخمی ہے' کچھ نہیں سوچ رہے آپ لوگ۔ یہ۔ یہ دیکھیے۔" اتنا کہہ کر وقار الحسن نے جھٹکے سے کوثر کی کلائی تھامی اور اس پر لپٹا ساری کا پلو ہٹا دیا۔ اس کا جگہ جگہ سے کٹا ہوا بازو ننگا ہوا تو چچا کے چہرے سے ساری سفاکی' سارا غصہ ہوا ہوگیا۔ چچی منہ پھاڑ کر رہ گئیں۔

"آئے ہائے یہ کیا ہوا؟" انھوں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کے بازو پر جگہ جگہ لے چیروں سے رسنے والا لہو جم چکا تھا۔ کہیں کہیں خون کے تازہ قطرے بھی چمک رہے تھے۔ میں نے کوثر کی طرف حیرت سے دیکھا اور سوچتا رہ گیا کہ یہ لڑکی کتنی بے حس ہوچکی ہے' ایسے چیرے اس کے پورے بدن پر پڑے تھے مگر نہ تو اس پورے سفر میں اس کے منہ سے کراہ نکلی' نہ چہرے پر کسی قسم کی تکلیف کے آثار ہی نمودار ہوئے' شاید اسی وجہ سے میں اس کے زخموں کو بھول چکا تھا۔ وقار الحسن کو بھی بھول چکے ہوں گے مگر اسے بروقت یاد آگئے اور اس نے چچا چچی کو نفسیاتی چوٹ لگا کر پل بھر میں قابو کرلیا تھا۔

"تم کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ جلدی سے پانی گرم کرو۔ ٹنکچر اور روئی لا کر دو۔ زخم صاف نہ کیے تو ناسور بن جائیں گے جلدی کرو۔" چچا بوکھلا کر چیخے۔ چچی لمحوں پہلے والی ساری باتیں بھول بھال کر باورچی خانے کی طرف دوڑیں چچا کوثر کا

بدیکھ کر پھر نمناک نگاہیں اٹھا کر' بھرائے ہوئے لہجے میں لے "بہت تکلیف ہو رہی ہے؟ یہ۔ یہ ہوا کیسے؟

وقار الحسن نے گہرا سانس لیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سانس لینان بھرا تھا۔ کوثر نے بھنویں سکیڑ کر چہرے پر تکلیف ے تاثرات پیدا کرلیے اور بچوں کی طرح سر ہلا کر بولی۔ نی۔ چچا بہت تکلیف ہے۔"

"لیٹ جاؤ۔ یہاں لیٹ جاؤ۔" چچا نے پلنگ پر تکیہ کھتے ہوئے کہا۔ یہ بڑے برآمدے میں پڑا وہی پلنگ تھا جو ا کے لیے مخصوص تھا۔ چچا نے خود سہارا دے کر کوثر کو یا اور وقار الحسن سے بولے۔ "اتنی دیر سے بکواس کیے ارہے ہو۔ بتاتے نہیں کہ یہ زخمی ہے۔"

وقار الحسن دھیرے سے مسکرایا' ہنسی تو مجھے بھی آئی تھی ، بولے تو وہ چلے جا رہے تھے اور ڈانٹ وقار الحسن کو ہے ہیں۔ مشکل سے چھے سات منٹ ہی گزرے تھے کہ ی اپنے دوپٹے کے پلو سے ایک بگونا پکڑے آگئیں۔ اسے ھ کر اوپر بھاگیں اور جب نیچے آئیں تو ان کے ہاتھ میں ٹنکچر اور روئی تھی۔

وقار الحسن نے فوراً ہی صابن سے ہاتھ دھوئے اور آستینیں چڑھا کر کوثر کو طبی امداد دینے میں مصروف ہوگیا۔ ٹنکچر کی جلن کو کوثر بڑے تحمل سے برداشت کر رہی تھی۔ ہر رپھا رکھتے ہی اس کے چہرے پر کرب کا ہلکا سا عکس ابھر آتا۔

اس نے اب تک میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور چپکے سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو کبھی کوثر کا ہوا کرتا تھا۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ تایا امروہہ جاتے ہوئے اپنا کچھ سامان اس کمرے میں رکھ کر مقفل کر گئے تھے۔ اس کمرے میں کوثر کی کئی کتابیں بھی تھیں۔ میرا سارا تجسس ان کتابوں کی وجہ سے تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ان میں ایسی کون سی کتابیں ہیں جو میرے لیے کارآمد ہیں۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کتابوں میں لکھے وظیفے میں کرسکتا ہوں یا نہیں لیکن ایک اندازہ تھا کہ میں خود ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکوں گا' بہرحال دیکھنے میں کیا حرج تھا سو میں اندر جانا چاہتا تھا اور پھر جب میں نے دروازے کو کھولنا چاہا تو یاد آگیا کہ ہر ٹھوس اور بے جان چیز میرے لیے ویسی ہی ہے جیسی وقار الحسن' کوثر اور چچا وغیرہ کے لیے ہوسکتی ہے۔ صرف جاندار بلکہ میرا تجربہ تو اب تک صرف انسانوں تک محدود تھا کہ میں انھیں نہ چھو سکتا ہوں نہ پکڑ سکتا ہوں۔

میں ناکام واپس آگیا۔ چچی اب پھر باورچی خانے میں جا چکی تھیں۔ وقار الحسن کوثر کے زخم صاف کرچکا تھا۔ اس نے کوثر کے ہاتھوں اور ٹانگوں کے تمام چرکے صاف کرکے ان پر ٹنکچر لگا دیا تھا۔ چچا شرمندہ سے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر دکھ پھیلا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ذرا دیر بعد انھوں نے سر اٹھایا اور کوثر سے بولے۔ "کیا ملا تجھے یہ سب کرکے۔ ارے تجھے کیا پتا کہ اس دل پر کیسے زخم آئے تھے تیری جدائی سے' سارا دن آنکھیں تجھے ڈھونڈتی تھیں' نیچے اترو تو سناٹا کھانے کو دوڑتا تھا' تو چلی گئی تو میرا پورا گھر بھی ویران کرگئی۔ تجھے۔ تجھے وہ چچا یاد نہیں آیا جس نے بچپن سے تجھے گودوں میں کھلایا تھا۔"

اب وہ باقاعدہ رو رہے تھے۔ بار بار ایک زوردار آواز ان کی ناک سے خارج ہوتی۔ وہ جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کرتے اور پھر اسے جیب میں رکھ کر بولنے لگتے۔ ان کی جذباتی باتوں نے ماحول کو بڑا کربناک بنا دیا تھا۔

"چچا۔ بس کریں۔ ہم بڑے سفر سے آئے ہیں۔ بھوکے پیاسے ہیں۔ حالت خراب ہے۔ چلیے تو دیکھیے ہمارے۔ یہ۔ یہ کوثر کی ساری دیکھ رہے ہیں؟ یہ اس نے مندر کی داسی سے لی ہے۔ اس کے کپڑے تو چیتھڑے سے بن چکے تھے۔"

"ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا۔" انھوں نے فوراً ہی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ "میں تمھاری چچی کے کپڑے لے آتا ہوں۔ کوثر منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لے گی۔ "کیوں بیٹا! منہ ہاتھ دھوئے گی ناں۔ تکلیف تو نہیں ہوگی؟" آخری جملہ انھوں نے کوثر سے کہا تھا۔

"ہاں چچا' تکلیف تو ہوگی پر گندگی کچھ تو دھل جائے گی ناں۔ صبح نہالوں گی۔" کوثر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ چچا نے بالکل ایسے لپک کر اسے سہارا دیا جیسے وہ برسوں کی بیمار ہو۔ میرا جی چاہا کہ چچا کے کان میں کہوں' ڈراما کر رہی ہے۔ اس سے زیادہ مکار عورت میں نے دنیا میں نہیں دیکھی۔ مگر میں سوچ سکتا تھا اور بس۔

میں نے یہ سوچا اور وقار الحسن نے پلٹ کر مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا' میں جھنجلا گیا۔ وہ میرے اندر کا سارا حال جان جاتا تھا مگر میں اس معاملے میں کتنا

بے بس تھا۔ ویسے یہ بات میرے لیے کافی حیرت انگیز تھی کہ میں اس کے دماغ میں گھسنے سے معذور تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہ جان پاتا اور میں سب کچھ جان لیتا مگر میں جانتا تھا کہ اس نے سنہرے بابا کے دیئے ہوئے وظائف میں سے وہ وظیفہ بھی کیا ہوا ہے جس سے وہ اپنے اندر کو باہر کی ہر چیز سے محفوظ کرچکا ہے۔ یہ سب اس نے مجھ سے نہیں' سادھو سے محفوظ کرنے کے لئے کیا تھا مگر۔ خیر' میں جس قدر خود پر قادر تھا اس کا تو فائدہ اٹھا ہی رہا تھا۔ اب میری تمام امیدیں کوثر سے وابستہ تھیں۔ اب وہی میرے لیے کچھ کرسکتی تھی اور میں اس کے لیے اس کی ہزار خدمتیں کرنے کو تیار تھا۔

اتنا میں جانتا تھا کہ وقارالحسن اور کوثر کی ذرا سی توجہ میرے لیے کافی ہوگی۔ جو کچھ رکاوٹیں میرے لیے تھیں ان کا دور ہو جانا مشکل نہ تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ انھیں میں خود دور نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بات میں نے محسوس کی تھی' گو میں وقارالحسن کا وہ حصہ تھا جو لطیف شکل اختیار کرگیا تھا' لطیف شکل اختیار کرنے کے بعد تو بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو کسی بھی حال میں رکاوٹ نہیں بنتیں مگر وقارالحسن کا ضمیر میرے لیے یہ رکاوٹیں پیدا کررہا تھا۔ اسے اپنی راہ سے ہٹانا میرے لیے ضروری تھا مگر اس کا مقابلہ کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ کوثر کی موجودگی اور اس کے سوچنے کے انداز سے مجھے بڑی ڈھارس ہوئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس کے ضمیر کو ضرور کمزور کردے گی' بساط بھر کوشش تو میں بھر کر ہی رہا تھا۔

ذرا دیر کے بعد چچا اوپر سے چچی کے کپڑے لے آئے۔ چچی ابھی باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ کوثر نہانے دھونے چلی گئی۔ چچا وقارالحسن سے حالات کے بارے میں پوچھنے لگے۔ وہ انھیں الٹی سیدھی کہانیاں سناتا رہا۔ کوثر کے بارے میں بھی بڑی دردناک کہانی سنادی کہ اسے سادھو نے قید کر رکھا تھا ورنہ وہ اب تک واپس آگئی ہوتی بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے یہاں سے جانے میں اس کی مرضی کا دخل نہ تھا بلکہ اسے سادھو نے اپنے جادو منتر کے زور پر یہاں سے جانے پر مجبور کیا تھا۔ وقارالحسن کوثر کی پوزیشن بنانے میں لگا ہوا تھا۔ چچی بھی آچکی تھیں اور بڑے تاسف سے یہ سب کچھ سن رہی تھیں۔ چچا اپنے رویے پر بے حد شرمندہ تھے۔ کوثر سے باقاعدہ معافی مانگنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

جب تک کوثر آئی' یہ کہانیاں چلتی رہیں۔ میں بظاہر بے نیازی سے بیٹھا رہا مگر میرا سارا دھیان وقارالحسن کی باتوں کی طرف تھا۔ اس دوران میں چچی کھانے پینے کا کافی سامان لے آئیں۔ اس وقت میں نے بھوک محسوس کرنا چاہی مگر کوئی کیفیت محسوس نہ کی۔ میں چپکے سے وقارالحسن کے اندر اتر گیا اور اندر جاتے ہی میں نے بھوک کی شدت کو محسوس کیا' میں چونک اٹھا' پھر باہر نکل آیا اور بھوک کے احساس سے عاری ہوگیا اور تبھی مجھے خیال آیا کہ میں ٹھوس وجود نہیں رکھتا پھر بھلا مجھے بھوک اور پیاس کیسے لگ سکتی ہے اور پچھلی بار کیوں لگی تھی؟ یہ انکشاف جلدی ہوگیا کہ وہ بھوک اور پیاس اصل میں وقارالحسن کے ٹھوس بدن سے متعلق تھی اس کا تعلق مجھ سے نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اس انکشاف نے مجھے کچھ اور ہلکا پھلکا کردیا۔ ممکن ہے ان وظائف کا کرشمہ ہو کہ وقارالحسن کیونکہ اس دوران میں بھوک اور پیاس بجھانے کے لیے کہیں نہیں جاسکتا تھا لہٰذا یہ کام اس نے مجھ سے لیا ہو۔ میں یہ سب سوچتا رہا اور وہ سب کھانا کھاتے رہے۔ کوثر مجھے خاموش بیٹھے دیکھ چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں چھاگئی تھیں۔ میں نے اس کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کی' گو مجھے کامیابی کی امید نہیں تھی اس لیے کہ وہ وقارالحسن کے جسم کا حصہ ہونے کے باوجود اس میں ناکام رہا تھا مگر جونہی میں نے ایسی کوشش کی' میں ان تمام باتوں سے واقف ہوگیا جو کوثر سوچ رہی تھی۔ اس کامیابی نے مجھے جہاں حیران کیا وہاں بے پناہ خوشی بھی دی۔ وہ میرے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ وقارالحسن کی حد تک اس کے خیالات کافی خبیث تھے۔ وہ وقارالحسن کو مکمل طور پر حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ وہ مجھے طاقتور کرکے اپنے کام نکلوانا چاہتی تھی۔ وہ مجھ پر پورا کنٹرول حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے عہد کرلیا تھا کہ اس بارے میں مکمل معلومات حاصل کرے گی۔ اس نے مجھے وقارالحسن کے نفس امارہ کا نام دیا تھا۔ اس سے قبل وہ وقارالحسن کو بتاچکی تھی کہ میں اس کا ہمزاد ہوں۔ پھر وہ چچا کی طرف متوجہ ہوگئی جو اب اس سے باقاعدہ معافی مانگ رہے تھے اور پچھلے رویے پر شرمندگی کا اظہار کررہے تھے۔

اب میں نے چچا کے اوپر تجربہ کیا' یہاں بھی کامیاب ... وہ واقعی سچے دل سے معافی مانگ رہے تھے اور یہ بھی ... ج رہے تھے کہ انھوں نے ناحق معصوم بچی پر تہمت ... ی۔ وہ اس حرکت میں خود اختیار ہی کب تھی۔ یہ تو اس ... ث سادھو کا کام تھا جس نے ان کے خاندان کو بدنامی کے ... میں دھکیل دیا تھا۔

چچی کا دماغ میں پڑھ چکا تھا۔ وہ سادھو کو قصوروار مانتے ... کوثر کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

... اس کی کامیابی نے مجھے یقین دلادیا کہ میں اس بارے میں ... طور پر خود مختار ہوں لیکن وقارالحسن میرے لیے کٹھن ... ت ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ پڑھنے کی کوشش مجھے ادھ موا ... دیتی تھی اور یہی نہیں بلکہ وہ فوراً ہی جان جاتا تھا کہ میں ... ں کے دماغ میں گھسنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اس لیے میں ... ی الحال اسے تنگ نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں حالات کا ... خ دیکھ کر ہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وقارالحسن اب امروہہ جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ چچا ... ے ایک دو روز رکنے کا کہہ رہے تھے مگر وقارالحسن کو ... ں کی پریشانی تھی۔ کوثر سوچ رہی تھی کہ وہاں جاکر کس ... ح طوفان کا مقابلہ کرے گی۔ ویسے بنیادی طور پر وہ کافی ... ٹ واقع ہوئی تھی۔ اسے اس بارے میں کچھ زیادہ ... یشانی نہ تھی کہ ماں باپ کی حالت کیا ہوگی یا خاندان ... لے کیا سوچیں گے بلکہ وہ اس لیے پریشان تھی کہ اس ... ح اس کا کافی وقت ضائع ہوگا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہاں جاکر ... کو بھی نہ ہو بس وہ فوراً ایک کمرا اپنے لیے مخصوص کرلے ... ر یہاں سے ساتھ لے جانے والی کتابوں کا مطالعہ شروع ... کردے تاکہ میرے لیے جلد از جلد وظائف شروع ... سکے۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا' میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ... ت ضائع نہ ہو۔ مجھے رہ رہ کر کلپنا اور وہ دوسری لڑکی یاد ... رہی تھی۔ وہ کھوپڑیاں بھی مجھے نہیں بھولی تھیں بلکہ اس ... ت تو بہت یاد آئی تھیں جب وقارالحسن کوثر کے چہرے ... ف کررہا تھا۔ میں اس ماحول میں واپس جانا چاہتا تھا لیکن ... بور تھا۔ جانے کو تو میں جاسکتا تھا مگر وہاں جاکر کیا کرتا؟ میں ... دھورا تھا۔ مکمل ہونا چاہتا تھا۔

کوثر' چچا وقارالحسن اور چچی باتیں کررہے تھے پھر وہ ... ب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں بھی تھک چکا تھا ... وقارالحسن کے بدن میں واپس چلا گیا۔ چچا نے تایا کے پلنگ پر وقارالحسن کے لیے بستر لگا دیا تھا۔ کوثر کا پلنگ بھی وہیں لگا دیا گیا کچھ دیر بعد چچا اور چچی اوپر چلے گئے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ وقارالحسن کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں وہ بہت جلدی سو گیا۔ میں جاگ رہا تھا۔ مجھے اب شاید نیند آتی بھی نہیں تھی۔ اس کے بدن کی حرارت مجھے آرام تو دے رہی تھی مگر میں کچھ بے سکون سا تھا سو پھر باہر نکل آیا۔ میری نگاہ کوثر پر پڑی' وہ چت لیٹی ہوئی چھت کی بلیوں کو تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کہیں نیند نہ تھی۔ میں نے چپکے سے اس کے ذہن کو ٹٹولا اور اس کے خیالات جان کر چونکنا ہوگیا۔ وہ وقارالحسن کی گہری نیند کے انتظار میں تھی۔ اس کا ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پڑے قفل کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کی ایک چابی چچا کے پاس تھی اور دوسری تایا کے پاس۔ میں چاہتا تو اوپر جاکر چاچا کے کمرے میں چابی تلاش کرکے لاسکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوثر اس سلسلے میں کیا کرتی ہے۔

وہ بہت بے کل تھی۔ کچھ دیر تک وہ یونہی لیٹی رہی پھر اس نے گردن اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ وقارالحسن کو غور سے دیکھا۔ اسے بے خبر سویا دیکھ کر وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی پھر دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف چل دی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہاں ایک ٹوٹی پھوٹی میز رکھی تھی جس کی دراز میں ہتھوڑی' پیچ کس' کیلیں' تار اور کچھ ایسی ہی چیزیں تھیں۔ وہ اس دراز کو کھول کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک مڑا ہوا تار نکال لیا۔ اسے کھینچ کھانچ کر سیدھا کیا اور پھر دبے پاؤں پلٹ گئی۔ اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ قفل پر جھک گئی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ سیدھی ہوئی تو قفل کھل چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی' ایک کرخت قسم کی چرچراہٹ کی آواز گونج اٹھی۔ وہ ایک دم دبک گئی۔ اس نے دروازہ چھوڑ دیا پھر کچھ دیر انتظار کرتی رہی' شاید وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ چرچراہٹ کی آواز وقارالحسن یا چچا کی نیند میں خلل کا سبب تو نہیں بنی' مگر جب پورے گھر میں گہرا سناٹا طاری رہا تو وہ پھر اٹھی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ چند ہی منٹ بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی شیشی تھی۔ اس نے دروازے کے قبضوں میں تیل

ڈالا۔ اب دروازہ آسانی سے بغیر آواز کے کھل گیا۔ وہ تار اور تیل کی شیشی اندر لے آئی۔ اس نے دروازہ اسی طرح بھیڑ دیا پھر اندر سے کنڈی بھی لگالی۔ میں دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی اس وقت اندر داخل ہو کر اندھیرے کونے میں دبک چکا تھا۔ جب وہ تپائی پر تیل اور تار رکھ رہی تھی۔

میں چھت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ اس طرح اسے دکھائی دینے کا امکان کم ہی تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ باہر رکھی لالٹین کی نیچی لو کی اندر آنے والی روشنی بہت مدھم تھی اور دروازہ بند ہونے کے بعد تو وہ روشنی بھی باہر ہی رہ گئی تھی۔ اس نے ٹٹول کر موم بتی تلاش کی۔ مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے جلد ہی موم بتی جلادی اور فوراً ہی لکڑی کے اس ریک کی طرف بڑھ گئی جہاں کتابیں رکھی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی کچھ کتابیں نکالیں۔ ایک کپڑے کا تھیلا لے کر کتابیں اس میں رکھیں اور کمرے سے باہر آگئی۔ میں اس کے پیچھے ہی باہر آگیا۔ اس نے کتابوں کا تھیلا دروازے کے قریب اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کے نیچے پڑی ا۔سٹوں کے پیچھے چھپادیا۔

کتابیں چھپا کر وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی واپس پلنگ تک آگئی۔ میں چاہتا تو ان کتابوں کو دیکھ سکتا تھا مگر سب فضول تھا۔ ان حالات میں، میں کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے صبر و شکر کر کے فی الوقت وقارالحسن کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ میں صبح تک مختلف سوچوں میں غرق رہا۔ یہ بات مجھے بھی پریشان کر رہی تھی کہ تایا دوبار آکر جا چکے تھے۔ میں نے سوچ لیا کہ وقارالحسن کو مجبور کروں گا کہ وہ یہاں رکنے کی بجائے سویرے ہی امروہہ کے لیے روانہ ہو جائے۔

صبح کس وقت ہوئی مجھے پتا نہیں چلا۔ اذان کی آواز پر ہی وقارالحسن کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے یوں بھی نماز پڑھے بہت دن ہو گئے تھے۔ میرا جی چاہا کہ اسے تھپکیاں دے کر سلادوں۔ بے چارا اتنا تھکا ہوا تھا اس پر سویرے ہی اٹھ جانا بڑا مشکل کام تھا۔ میرے چاہنے کے باوجود وہ اٹھ بیٹھا۔ میں نے اس کے اندر جا کر اسے اکسانے کی کوشش بھی کی کہ نیند زیادہ اچھی ہے اس کے لیے مگر اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔

کوثر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ میرے معیار پر تقریباً پوری اتر رہی تھی شاید اسی لیے میری پسندیدہ شخصیت بنتی جا رہی تھی۔ وقارالحسن نے وضو کیا۔ اس دوران میں چچا بھی اٹھ چکے تھے اور وہ بھی وضو کرنے کے بعد مسجد جانے کو تیار تھے۔ وقارالحسن اور وہ باتیں کرتے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں چچا نے سنہرے بابا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ وقارالحسن کو ان سے مل لینے کا مشورہ دے رہے تھے مجھے ان کی یہ بات قطعاً پسند نہیں آئی۔ ان حالات میں وقارالحسن کو اپنے گھر اور ماں باپ کی فکر کرنا چاہیے تھی۔ سنہرے بابا کی نصیحتیں وہ بعد میں بھی سن سکتا تھا مگر وقارالحسن نے فوراً تائید کی اور نماز کے بعد ہی چچا کے ساتھ سنہرے بابا کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کسمسا کر رہ گیا۔

وہ نماز پڑھنے مسجد میں داخل ہونے لگے تو میں نے کچھ الجھن سی محسوس کی۔ دل نہیں چاہا کہ اس کے ساتھ اندر جاؤں اسی وقت وقارالحسن نے ناگواری سے کہا "تم اس قابل ہو بھی نہیں کہ اندر جاؤ۔ تم نفس امارہ ہو۔ بہکانے والے ورغلانے والے۔"

چچا اس سے دو قدم آگے تھے مگر وقارالحسن کی بڑبڑاہٹ ان کے کانوں تک پہنچ گئی وہ بولے کیا ہوا کس سے باتیں کر رہے ہو۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

کچھ نہیں چچا۔" اتنا کہہ کر وقارالحسن اور چچا مسجد میں چلے گئے میں باہر رک گیا۔ میرا تو سنہرے بابا کی طرف جانے کا بھی موڈ نہیں تھا مگر میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ وقارالحسن سے تو کسی طرح بھی پتا نہ چلتا، اس لیے میں نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد وقارالحسن اور چچا باہر آگئے اور سنہرے بابا کی طرف چل پڑے انھوں نے مسجد ہی کے پاس سے تانگا لے لیا۔ میں وقارالحسن میں داخل ہوا تو وقارالحسن نے کچھ حیران ہو کر مجھے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔ ہم سبز گنبد والی مسجد کے کنارے پہنچ کر تانگے سے اترے ہی تھے کہ جن بابا سامنے آگئے۔ ان کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ وقارالحسن کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکے اور اس کے دونوں کاندھے پکڑ کر اسے جھنجوڑنے لگے۔

"تو نے۔ تو نے وہ پڑیا ضائع کر دی۔ ضائع کر دیا سب کچھ۔ وہ جو بدن پر ملا تھا اور کپڑوں پہ۔ وہ سب بہا دیا پانی میں۔ جا۔ جا دور ہو جا یہاں سے، اب تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ چلا جا۔ نہیں ہیں بابا۔ اب وہ تجھے کبھی نہیں ملیں

۔ جا۔ جا۔"

وہ اتنی زور زور سے چیخ رہے تھے کہ وہاں موجود تمام لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ وقارالحسن فق کھڑا تھا۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا۔ مجھے بھی یاد آگیا کہ سنہرے بابا نے کسی سفوف کی ایک پڑیا دی تھی اور کہا تھا کہ جب اس کی انگوٹھی مل جائے تو وہ سفوف کو اس پر اچھی طرح رگڑ لے پھر بچا ہوا تمام سفوف اپنے بدن پر کپڑوں پر اور سر کے بالوں کی جڑوں میں لگا لے۔ وقارالحسن نے ایسا کیا تھا مگر چچا کے گھر آتے ہی وہ نہا لیا تھا اور اس نے کپڑے بھی بدل لیے تھے۔ یہی کچھ وقارالحسن سوچ کر بدحواس ہو گیا کہ غلطیاں اس سے بار بار ہو رہی ہیں۔

چچا سہم کر ایک طرف ہو گئے تھے۔ لوگ چاروں طرف جمع ہوتے جا رہے تھے۔ جن بابا کو لوگ مجذوب سمجھتے تھے کسی کو شاید ہی علم ہو کہ وہ انسان نہیں جن تھے کچھ لوگوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی مگر بعض لوگ وقارالحسن کو تاسف سے دیکھ رہے تھے یہ وہ لوگ تھے جو جن بابا سے عقیدت رکھتے تھے۔ انھیں پاگل مجذوب نہیں اللہ والا سمجھتے تھے اور ان کی بددعا سے ڈرتے تھے۔ جن بابا حجرے کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے ان کی آنکھوں سے لپکتے شعلوں کی تپش مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"وقارالحسن۔ چلو۔ چلو یہاں سے۔" چچا نے سہمے سہمے آگے بڑھ کر وقارالحسن کا بازو ہلایا۔

وقارالحسن چونک اٹھا۔ اس نے جن بابا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "بابا۔ میں۔ میں بھول گیا۔ بھول ہو گئی بابا۔ یہ جان بوجھ کر دانستہ نہیں ہوا۔"

"سب دانستہ نہیں ہوا۔ ناپاک۔ چل بھاگ یہاں سے۔ تو نے جو کچھ کیا ہے وہ گناہ ہے۔ تجھے تو خدا نے نجات کا راستہ بنایا تھا اور تو۔ تو نے سب کچھ لوٹ لیا۔ جا۔ جا۔ جا یہاں سے بابا۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہے تھے۔

چچا نے لپک کر وقارالحسن کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے دوسری طرف لے گئے۔ جن بابا اب دہرے ہو کر چیخ رہے تھے۔ ان کے بالوں کی لٹوں نے ان کے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ یہ موقع غنیمت جان کر ایک دو آدمی وقارالحسن کو پکڑ کر دور لے گئے اور بولے کہ اسے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیے ورنہ اگر وہ مزید طیش میں آگئے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

پھر چچا نے دیر نہیں کی، وقارالحسن واپس چلنے کو تیار نہ تھا مگر لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے سبز گنبد والی مسجد کے قریب لے گئے۔ چچا نے فوراً ہی ایک تانگے والے کو اشارہ کیا اور کسی نہ کسی طرح وقارالحسن کو اس میں بٹھا دیا۔ اب وقارالحسن باقاعدہ رونے لگا تھا۔ مجھے بہرحال اس کی بے وقوفی پر ہنسی آرہی تھی مگر میں برداشت کیے رہا۔

ہم گھر پہنچے تو وقارالحسن کچھ بہتر ہو چکا تھا مگر بہت دل گرفتہ تھا۔ چچا نے گھر پہنچتے ہی چچی اور کوثر کو سارا واقعہ سنا دیا۔ پھر وقارالحسن سے پوچھا کہ ہوا کیا تھا۔ اس وقت وقارالحسن نے بتایا تبھی اسے اپنے اتارے ہوئے کپڑوں کا خیال آیا۔ پتا چلا کہ چچی نے رات ہی وہ کپڑے دھو ڈالے تھے۔ انھیں یہ پریشانی ہو گی کہ کہیں اگلے روز وہ چچا کا جوڑا نہ لے جائے لہٰذا اس کے کپڑے دھو دیے۔ اب تک تو وہ کپڑے سوکھ بھی چکے تھے۔ وقارالحسن سر پکڑ کر رہ گیا مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میں ہی کیا وقارالحسن بھی اس بات سے ناواقف تھا کہ اس سفوف کو مل لینے سے کیا فائدہ ہونے والا تھا لیکن یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس سے کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا جو سنہرے بابا نے اتنی ہدایات کے بعد اسے دیا تھا۔

چچی ناشتا لے آئیں۔ سب نے بوجھل ماحول میں ناشتا کیا۔ وقارالحسن کسی لٹے ہوئے جواری کی طرح بیٹھا تھا۔ شاید اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔ کوثر نے اسے یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے امروہہ چلنے کو کھینچی ہوئی لکیر بن جاتی۔ ایک سانس اُدھر یا ایک سانس اِدھر، ان کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔

وقارالحسن نے کوثر کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ چادر کو اس طرح لپیٹ لے کہ اس کا چہرہ قطعی کسی کو دکھائی نہ دے۔ دن کا وقت نہ ہوتا تو اس قدر احتیاط کی ضرورت نہ ہوتی مگر سورج سر پر چمک رہا تھا ایسے میں یہ احتیاط ضروری تھی۔ چچی کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ محض یہی دیکھنے جا رہی تھیں کہ کوثر کا سواگت کس طرح کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان کے دل سے اب بھی نہیں نکلی تھی کہ کوثر آوارہ ہے۔ اس نے جو کچھ کیا اس میں قطعی کسی اور کا دخل نہ تھا وہ مرضی کی مالک تھی۔ گھر میں رہنا اسے گوارا نہ تھا جبکہ برسوں پلنگ تک محدود رہی تھی۔

تانگیں ملتے ہی اس نے وہی کیا جس کی خواہش مند تھی۔ انھیں وقتی طور پر جو ہمدردی کوثر سے ہوئی تھی وہ اب زائل ہو چکی تھی۔ انھیں رہ رہ کر لوگوں کے طعنے یاد آرہے تھے اور وہ بھی تماشہ دیکھنے جاری تھیں۔

کوثر نے وقارالحسن کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا۔ جوں جوں حویلی قریب آتی جارہی تھی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آنے والے لمحوں سے خوفزدہ ہو رہی تھی اب اسے ماں اور باپ، دونوں کے چہرے یاد آرہے تھے، اسے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ ماں اس کے غم میں پاگل ہو چکی ہے۔ ماں کی محبت بھی کچھ دل میں جاگ اٹھی تھی۔ شرمندگی کا ہلکا سا احساس اسے باپ کے سامنے جانے سے خوف زدہ کر رہا تھا۔

راستے میں وقارالحسن کے کئی جاننے والے ملے، سب نے دور سے انھیں سلام کیا مگر قریب آنے کی زحمت نہیں کی، ان سب کے چہروں پر ایک ہی قسم کے تاثرات تھے۔ یہ بات میرے علاوہ وقارالحسن نے بھی محسوس کرلی، ان لوگوں کے انداز میں وہ بات قطعی نہ تھی جو اب سے پہلے ہوتی تھی، یعنی وہ لوگ لپک کر آتے تھے۔ ہاتھ ملاتے اور خیریت پوچھتے تھے۔ ہر ملنے والے کے چہرے پر ایک ہی قسم کے تاثرات نے وقارالحسن اور مجھے، دونوں کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔

تانگا حویلی والی گلی میں داخل ہوا تو حویلی کا بڑا گیٹ دور ہی سے نظر آگیا۔ اس حویلی کے گیٹ پر جمی دھول نے مجھے اور وقارالحسن کو چونکا دیا۔ لگتا تھا جیسے ہم برسوں کے بعد کہا تھا۔ وہ خاموشی سے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ چچا نے بھی اچانک امروہہ جانے کا پروگرام بنالیا۔ جلدی جلدی تیاری کی گئی۔ چچا کا خیال تھا کہ وہ دو چار دن رہ کر سب کی خیریت معلوم کرکے واپس آجائیں گے۔ بقول ان کے انھوں نے یہاں کسی کی شراکت میں کاروبار کرلیا تھا۔ جس کی دیکھ بھال کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ وہ ذرا دیر کو اپنے شراکت دار کے پاس گئے اور اسے بتا کر لوٹ آئے۔ اس دوران میں تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں۔ چچا نے ایک اٹیچی کیس تیار کرلیا تھا۔ ایک تھیلا کوثر نے لے لیا تھا اور اس میں اپنے اور وقارالحسن کے کپڑوں کے بہانے اپنی چھپائی ہوئی کتابیں بھی رکھ لی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اب کسی نے اسے انھی کتابوں میں دلچسپی لیتے دیکھ لیا تو بڑی قیامت اٹھے گی۔

میں تو اس قیامت کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران پریشان تھا جو کوثر کے یوں اچانک ہی امروہہ پہنچنے پر اٹھنے والی تھی۔ میں اس وقت کوثر کے دماغ میں اٹھنے والی سوچ کی ہر لہر سے واقف تھا۔ وہ بہت خود غرضی سے سوچ رہی تھی۔ بہت عیار تھی اور ذرا بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ اس گھرانے کی فرد ہے جس گھرانے میں عزت و ناموس کو اہمیت دی جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ شروع سے ایسی تھی یا جنگلوں میں رہ کر جاپ کر کرکے اس کے اندر یہ خباثت بھر گئی تھی۔ بہرحال اس کی سوچوں کا مرکز اب بھی وقارالحسن کا حصول تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسی تمام قوتوں کو حاصل کرنا چاہتی تھی جس سے دنیا کو تسخیر کرلے۔ وہ مجھے مضبوط کرنے کے لیے بھی محض اس لیے سوچ رہی تھی کہ اس طرح وہ ساری دنیا کو دھوکا دے کر اس وقارالحسن کو اپنی ملکیت بنالے اور مجھے دنیا زمانے کے سامنے پیش کردے۔ وہ شاید مجھے بے وقوف سمجھ رہی تھی۔

ہم امروہہ پہنچے تو دن کے سوا تین بجے تھے۔ اسٹیشن سے لے کر گھر تک کا فاصلہ وقارالحسن کے لیے گویا پل صراط سے کم نہ تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ تایا اور اماں کا کیا حال ہوگا۔ گھر میں بھونچال آجائے گا۔ خاندان میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل جائے گی اور آنے والے اماں اور تایا کے کلیجے چھلنی کردیں گے۔ چچا بھی تایا کی طرف سے پریشان تھے۔ ان کی صحت پہلے ہی تشویش ناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ کوثر کی واپسی ان کے لیے زندگی اور موت کے ...

حویلی آئے ہوں، اس حویلی میں جو ہماری غیر موجودگی میں ویران پڑی رہی ہو۔ گیٹ کی وہی حالت تھی جیسی وقارالحسن اور شرف الدین نے اس وقت دیکھی تھی جب دونوں کافی عرصے بعد آئے تھے۔ پان کا کھوکھا بند پڑا تھا ورنہ پان والے چاچا یا ان کے بیٹے ہی سے کچھ نہ کچھ بات معلوم ہوتی۔ چچا اور چچی نے شاید اس بات کو اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ وقارالحسن نے تانگے والے کو پیسے دیے۔ سامان اٹھایا اور سب سے آگے بڑھ کر گیٹ کا کنڈا ہلایا۔ کنڈے کی آواز کافی دیر فضا میں ارتعاش سا رہا مگر اندر نہ کسی کے آنے کے آثار تھے نہ دروازہ کھولنے کی آہٹ۔ وقارالحسن کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے پھر دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھ سے کنڈا بجایا۔ اس بار وہ دیر تک کنڈے کو دروازے پر مارتا رہا۔ چھوٹا گیٹ بھی اندر سے بند تھا۔

اندر سارے گھر والوں کے علاوہ چاچا خورشید کے بھائی، ان کا بھتیجا اور بہو بھی تھی۔ تایا اگر اٹھنے کے قابل نہ تھے تو غلام رسول تو اکثر دروازے کے قریب ہی رہا کرتا تھا، اسے تو گیٹ فوراً ہی کھول دینا چاہیے تھا۔ یہ سوچ سوچ کر اب وقارالحسن پر دہشت طاری ہوتی جارہی تھی۔ چچا بھی کچھ کچھ ہراساں ہوگئے تھے۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا بات ہے، یہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا؟" وہ گھبرا گھبرا کر پوچھنے لگے۔

"پتا نہیں۔۔۔ اللہ خیر کرے۔" وقارالحسن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہٹو۔۔۔ میں دیکھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر چچا نے کنڈے کو پوری طاقت سے بجانا شروع کردیا۔ وقارالحسن نڈھال ہو کر دیوار سے ٹک گیا۔ کوثر نے تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر چہرے پر سے چادر ہٹالی تھی۔ کنڈا بجتا رہا، آواز گونجتی رہی۔ وقارالحسن کو لگا جیسے ہزاروں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جیسے طبل پر چوٹ ماری جارہی ہو۔ جیسے گھنٹا گھر کے بڑے گھڑیال کا پنڈولم ہل رہا ہو اور اس کے دماغ سے ٹکرا رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے اندر کے طوفان سے گھبرا کر چیخ اٹھتا۔ اچانک حویلی کا گیٹ تیز چرچراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا کھلا۔ خورشید چاچا کی بہو کا خوفزدہ چہرہ جھانکتا نظر آیا اور جب اس کی نگاہ وقارالحسن پر پڑی، اس نے جلدی سے پورا گیٹ کھول دیا۔ ہلدی اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی تھی۔ آنکھیں پھیل کر وحشت ناک انداز میں سکڑ رہی تھیں ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ وہ گوشت پوست کی بجائے صرف ہڈیوں کا پنجر نظر آرہی تھی۔ اس کی سانس بھی یوں پھولی ہوئی تھی جیسے وہ یہاں تک، میلوں کا سفر طے کرکے آئی ہو۔

وقارالحسن تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ "کیا۔۔۔ کیا بات ہے؟ اتنی دیر کیوں کردی کھولنے میں۔۔۔ سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔؟" پے درپے سوال کرتے ہوئے وہ چاروں جانب نگاہ دوڑا رہا تھا۔ لگتا تھا پوری حویلی ویران ہے، جگہ جگہ بکھرے ہوئے سوکھے پتے۔ ایک طرف لڑھکی ہوئی بالٹی، دھول میں اٹی پانی کی ٹنکی، خالی باورچی خانہ اور پلنگوں پر بکھرے سوکھے پتوں نے اسے وحشت زدہ کردیا۔ وہ ایک دم اس کی طرف پلٹ کر چیخ اٹھا۔ "کہاں ہیں سب؟ بولتی کیوں نہیں ہو۔"

وہ اب بھی نہیں بولی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے پانی سے بھر گئے اور اس نے دوپٹے کا پلو منہ میں ٹھونس لیا۔ چچا جو ہونقوں کی طرح کھڑے تھے، ایک دم جیسے ہوش میں آگئے۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو؟ دیکھو۔۔۔ اندر دیکھو۔" اتنا کہہ کر انھوں نے جھپٹ کر خورشید چاچا کی بہو کے دونوں کاندھے پکڑ کر اسے جھنجوڑ دیا۔ "ارے بولتی کیوں نہیں؟"

چچی اور کوثر زرد پڑ چکی تھیں۔ ہزار قسم کے اندیشے زہریلے سانپوں کی طرح ان کے دماغوں میں کلبلا رہے تھے۔

"کیا بات ہے زیب النساء۔۔۔ یہ کیسا شور ہے؟"

اچانک اندر کمرے سے نحیف سی آواز باہر آئی تو باہر جیسے ایک دم سناٹا چھا گیا۔ وقارالحسن اچھل کر پلٹا۔ آواز اماں والے کمرے سے آئی تھی جو گیٹ کے قریب ہی تھا مگر اس وقت دروازہ بند تھا، یوں جیسے کبھی کھلا ہی نہ ہو۔ وہ سب کے سب اس طرف لپکے۔ آواز کس کی تھی یہ پتا نہیں چلا۔ اندازہ ہی نہ ہوا کہ کون بولا ہے۔ جو بھی تھا شاید بہت بیمار تھا۔ بہت نقاہت تھی اس کی آواز میں۔

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ دروازہ کھولیں۔" وقارالحسن نے دروازہ اندر سے بند پا کر بری طرح پیٹ ڈالا۔

"کون ہے؟" اندر سے پھر وہی آواز آئی، کانپتی لرزتی اور بھرائی ہوئی سی۔

"میں ہوں۔۔۔ وقارالحسن" وقارالحسن زور سے چیخا۔

ذرا دیر اندر کھٹر پٹر کی آوازیں آتی رہیں پھر آہستگی سے دروازہ کھل گیا۔ وہ اماں ہی تھیں مگر ایسی حالت میں کہ وقارالحسن چیخ کر رو پڑا اور ان سے لپٹ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا ہو۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ خشک پپڑیاں جمے سیاہ پڑے ہوئے ہونٹ، اندر کو دھنسے ہوئے گال، بدن پر سوائے جھلسی ہوئی کھال کے اور کچھ نہ تھا۔

"اماں۔۔۔ اماں یہ کیا حالت ہوگئی آپ کی۔ یہ کیسے ہوگیا اماں؟" وہ اب بھی رو رہا تھا۔

مگر اماں سے کچھ بولا نہیں جارہا تھا۔ ان سے کھڑا ہی نہیں رہا جارہا تھا۔ ان کا بدن لرز رہا تھا۔

چچا چچی اور کوثر کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ

رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا' اس کمرے میں پڑے دوسرے پلنگ پر بھی کوئی تھا' چادر سے لپٹا گھریوں جیسے کوئی نہ ہو' جیسے صرف چادر پڑی ہو۔

"بیٹھو۔۔۔ بیٹا۔۔۔ ہم۔۔۔ بھوکے اور پیاسے ہیں۔ وہ جہانی اور۔۔۔" انھوں نے ہانپتے ہوئے دوسرے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ وقارالحسن کے ساتھ ہی چچا بھی اس طرف لپکے' چچی اور کوثر اماں کو سہارا دے کر پلنگ پر لٹانے لگیں۔ وقارالحسن نے آگے بڑھ کر چادر ٹٹولی تو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ نرم نرم ہڈیوں کا ڈھیر چادر میں کسمسا رہا تھا۔ اس نے چادر کا کونہ سرکایا اور پھر اس کے حلق سے نکلنے والی کرب ناک چیخوں نے پوری حویلی کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہاں جہانی آپا اور شنو آپا تھیں۔ بالکل ڈھانچوں کی شکل میں۔ چچا' چچی' کوثر سبھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

"یہ کیا ہوا ہے۔ خدا کے لیے کوئی مجھے بتاؤ۔" وقارالحسن زور سے' پوری قوت سے حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

جہانی آپا' شنو آپا کے سوکھے ہوئے لب بھی آپس میں سختی سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں وحشت زدہ ہونے کے باوجود وقارالحسن کو دیکھ کر چمکنے لگی تھیں۔ وقارالحسن ان دونوں سے لپٹ گیا۔

"ابا۔۔۔ ابا اور اماں کہاں ہیں؟" کوثر کی آواز نے دم بھر کو سناٹا سا پھیلا دیا۔ چچا' اور وقارالحسن ان لوگوں کو چھوڑ کر باہر بھاگے۔ وقارالحسن کے کمرے کے برابر والا کمرا تایا

انھوں نے وقار کو دیکھ کر اطمینان بھرا سانس لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ سبھی نے کوثر کو دیکھ لیا تھا مگر ان میں دم ہی کہاں تھا کہ وہ کسی جذبے کا اظہار کرتے۔

"یہ سب کیا ہوا ہے تایا؟" وقارالحسن نے روتے ہوئے پوچھا۔

"ہم۔۔۔ بھوکے ہیں۔۔۔ بیٹا۔۔۔ پیاسے ہیں۔" تایا نے بھی وہی جملہ دہرایا جو اماں کہہ چکی تھیں۔ ان کی بات پر تو شاید کسی نے دھیان نہیں دیا تھا مگر تایا کے جملے نے سب کو چونکا دیا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں تایا۔۔۔ کیوں؟" وقارالحسن چیخ پڑا۔ "میں۔۔۔ میں ابھی کچھ لاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ باہر جاکر بھی وہ رکا نہیں' کمرے سے نکلتے ہوئے چچا نے اس کے ہاتھ میں پیسے رکھ دیے تھے۔ وہ

کا تھا۔ وہ دروازہ بھی بند تھا۔ وقارالحسن نے پوری قوت سے اس پر کندھے مارے۔ شاید اسے یقین تھا کہ تایا اٹھ کر دروازہ کھولنے کے قابل بھی نہ ہوں گے۔ چچا بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ اب تو کوثر بھی آگئی تھی اور ان دونوں کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ کوثر ہے جو بقول سنہرے بابا اور سادھو کے بہت سی طاقتیں حاصل کرچکی ہے۔ میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس سے کہوں کوئی جادو منتر پھونکو۔ کوئی جاپ کرو کہ یہ ڈھانچے گداز بدن کے انسانوں کے روپ میں ڈھل سکیں۔ یہ پتا چل سکے کہ ان سب کو کیا ہوا ہے' وقارالحسن اور ہم تو بھری پری حویلی کو چھوڑ گئے تھے۔ یہاں انسان بستے تھے پھر یہ حویلی قبرستان میں کیسے بدل گئی۔ کوئی چمتکار دکھاؤ کہ سب کچھ پہلے ایسا ہوسکے مگر مشکل یہ تھی کہ اس تک میری آواز نہیں پہنچتی تھی۔ وقارالحسن حواس باختہ تھا' اسے تو کچھ ہوش ہی نہ تھا۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھل گیا۔ ٹوٹا نہیں تھا بلکہ کسی نے کھولا تھا۔ دروازہ کھلنے کے بعد جو کچھ نظر آیا اس نے سب کو پاگل کردیا۔ تایا تو ذرا نہیں پہچانے جاتے تھے۔ ان کا چہرہ تو ایسا ہوگیا تھا جیسے صرف اور صرف کھوپڑی ہو۔ ویسی ہی زندہ کھوپڑیوں میں سے ایک جیسی جو سادھو کے پاس موجود تھیں۔ وقارالحسن' چچا اور کوثر تینوں ان سے لپٹ گئے۔ چچا نے انھیں ایک دم سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید وہ گر جاتے۔

سیدھا حویلی سے باہر چلا آیا۔ اس کے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ گھر والے بھوک اور پیاس سے کیوں نڈھال ہیں۔ غلام رسول کہاں ہے' خورشید چاچا کے بھائی رشید چاچا کہاں ہیں پھر وہ تو جانے سے پہلے ہی گودام بھر کر گیا تھا۔ یہ کیسا قحط تھا جو صرف حویلی میں پڑا تھا۔ وہ یہ سب سوچ رہا تھا مگر اس کی بات کا جواب دینے کا کسی میں دم نہ تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا بازار پہنچا۔ اس نے بہت پھل' کھانے کی پکی پکائی چیزیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں لیں اور گھر اسی رفتار سے بھاگتا ہوا پہنچ گیا۔

اس نے فوری طور پر کیلا اور دوسرے پھل چچی اور کوثر کو دیے چاچا اور وہ خود بھی سب کو پھل کھلانے لگے۔ اماں' جہانی آپا' شنو آپا' تایا اور تائی ان پھلوں پر ایسے ٹوٹے تھے

جیسے برسوں کے فاقہ زدہ ہوں۔ ایک دم وقارالحسن کو زیب النساء کا خیال آیا۔ وہ کچھ پھل لے کر اس حصے کی طرف بھاگا۔ وہ سب بھی اسی حالت میں برآمدے میں پڑے تھے۔ ان کی حالت سانس لیتے ہوئے مردوں کی سی تھی۔ ان میں صرف زیب النساء ہی کچھ ہمت پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بچے کی حالت تو بہت ہی بری تھی۔ وقارالحسن نے فوراً ہی اس کے منہ میں سنگترے کا رس نچوڑا۔ رس حلق میں جاتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

زیب النساء زار و قطار رونے لگی اور پھلوں کو وقارالحسن کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وقارالحسن وہاں رکا نہیں' واپس اماں کے کمرے میں پہنچا۔ اتنی دیر میں چچا' تایا اور تائی کو بھی اماں والے کمرے میں لے آئے تھے۔ چچی' کوثر' وقار اور چچا سب ہی' سب کو کچھ نہ کچھ کھلا رہے تھے کچھ ہی دیر میں ڈھیروں پھل چٹ ہوچکے تھے۔ وہ سب نڈھال سے پلنگوں پر پڑے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے' اس وقت بھی ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ ان سے حالات کے بارے میں پوچھا جاتا اس لیے وقارالحسن نے چچی اور کوثر کو سبزی دی گوشت دیا جو وہ ابھی بازار سے لایا تھا۔ چچی وہ چیزیں لے کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ سارے برتن مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر دھول جمی تھی۔ چچی نے جلدی جلدی صفائی کی پھر سارے برتن ٹنکی کے نیچے جمع کردیے' خود سبزی کاٹنے لگیں اور کوثر سے برتن دھونے کو کہا۔

وقارالحسن اور چچا گھر والوں کے پاس بیٹھے بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں سانس لیتے دیکھ رہے تھے۔ تائی تو بالکل بے سدھ تھیں۔ وقارالحسن سب کچھ جلد از جلد جان لینا چاہتا تھا' اسے شرف الدین پر بھی حیرت تھی کہ کیا اس نے بھی ان لوگوں کی خبر نہ لی۔ وقارالحسن تو گھر والوں کو اس کے حوالے کرکے گیا تھا۔ غصہ وقارالحسن کے سینے میں بل کھانے لگا۔ اس نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ اس کے پاس جائے گا اور پوچھے گا کہ تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گھر والوں کا خیال رکھو گے پھر۔ پھر کیوں اتنی بے حسی دکھائی؟ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوسکتا تھا جب دوسرے بہت سے سوالوں کے جواب مل جاتے۔

چچا اور وقارالحسن ٹکٹکی باندھے اماں تایا اور دوسرے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ اماں کی طبیعت نسبتاً سب سے بہتر تھی۔ حلق تر ہوجانے اور پیٹ بھر جانے کے بعد سب

سے پہلے انھی میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ گو اب بھی ان کی سانس پھولی ہوئی تھی مگر وہ دوسروں کی نسبت بہتر تھیں۔ انھوں نے پہلی بار پوری آنکھیں کھول کر پاس بیٹھے ہوئے وقارالحسن کو غور سے دیکھا۔

"اماں۔۔۔ اماں اب کیسی ہیں آپ؟" وقارالحسن ان پر جھک گیا۔

انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی تو وقارالحسن ان کا سوکھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اپنے بھیگے ہوئے گالوں سے رگڑنے لگا۔ وہ اب بھی مسلسل رو رہا تھا۔ "اب ۔۔۔ اب تم آ۔۔۔ آگئے ہو۔۔۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔۔۔ سب بہتر ہوگا۔۔۔ اللہ۔۔۔ دعا کرو۔" وہ اب بھی بولنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی آواز سن کر تایا نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے پاس بیٹھے چچا کو تکتے رہے پھر نگاہیں گھما کر وقارالحسن کو دیکھا تو وقارالحسن اٹھ کر ان کے قریب جا بیٹھا۔ "آپ۔۔۔ سو جائیں تایا۔۔۔ سو جائیں۔" اس نے ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے گوشوں کو ہتھیلی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

جہانی آپا' شنو آپا اور تائی تو بے خبر سو چکی تھیں۔ وقارالحسن جانتا تھا کہ کئی روز کے فاقے کے بعد پیٹ بھرتے ہی کیسی نیند آتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ لوگ سو کر اٹھیں گے تو کافی بہتر ہوچکے ہوں گے۔

تایا نے بھی آنکھیں موند لیں۔ چچا نے بھی چپکے سے ان کے بدن پر چادر ڈال دی۔ اماں بھی آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ وقارالحسن ان کی پیشانی کو بوسہ دینے کے لیے جھکا ہی تھا کہ چچی اور کوثر کی چیخوں نے انھیں حواس باختہ کردیا۔ وہ دونوں بری طرح چیخ رہی تھیں۔

وقارالحسن اور چچا گرتے پڑتے باہر بھاگے۔ چچی اور کوثر باہر پانی کی ٹنکی کے پاس کھڑی تھیں بلکہ لرز رہی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چچی دھڑام سے فرش پر گریں۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا۔" وہ دونوں چیختے ہوئے اس طرف لپکے اور جیسے ہی ان کی نگاہ کوثر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر پڑی وہ دونوں ہی اچھل پڑے۔

وہاں دور تک تازہ خون بکھرا ہوا تھا۔ برتن خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ کوثر کے دونوں ہاتھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ کوثر پورے حواسوں میں تھی اور آنکھیں پھاڑے ہوئے ٹنکی کی ٹونٹی سے نکلتے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وقار الحسن نے کوثر کو تھام لیا۔

چچا چچی کی طرف بڑھ گئے جو فرش پر بے ہوش پڑی تھیں۔ ٹنکی سے تازہ تازہ خون پورے پریشر سے نکل رہا تھا۔ وقار الحسن نے آگے بڑھ کر ٹنکی کا ڈھکنا اٹھایا اور اندر جھانکا تو اسے ابکائیاں آنے لگیں۔ پوری ٹنکی خون سے لبا لب بھری ہوئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے اس کا ڈھکنا چھوڑ دیا۔

"یہ۔۔۔ یہ"

"کیا ہے؟" کوثر نے اسے یوں لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھی۔ وہ کسی حد تک نارمل تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے ہاتھوں پر بہتا لہو صاف کیا اور آگے بڑھ کر ٹنکی میں جھانکا۔

"ارے۔۔۔ پانی دو۔۔۔ پانی لاؤ۔" چچا ایک دم پلٹ کر چیخے اور پھر وقار الحسن پوری حویلی میں پانی تلاش کرتا رہا۔ ہر صراحی ہر گھڑے سے تازہ خون نکلا۔ پانی کا کہیں ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ وہ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اس کا جسم چھوڑ دیا۔ اب یہ کام میں ہی کر سکتا تھا۔ میں جگ لیے حویلی سے باہر کچھ دور لگے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ یہاں سرکاری نل لگا ہوا تھا۔ اس پورے محلے میں یہی سرکاری نل تھا جہاں سے ایسے بہت سے لوگ پانی لے جایا کرتے تھے جن کے گھروں میں پانی کی لائنیں نہیں لگی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے جگ کو اچھی طرح دھویا کیونکہ اس کا رنگ بھی سرخ ہو رہا تھا بلکہ سیاہی مائل سرخ ذرے تھے جو جا بہ جا اس پر جمے ہوئے تھے۔ جگ کو اچھی طرح دھو کر میں نے اسے پانی سے بھر لیا اور تیزی سے حویلی پہنچ گیا۔

میں نے جاتے ہی جگ باورچی خانے میں رکھ دیا اور اسی تیزی سے وقار الحسن کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ پانی وہاں رکھا ہے' وہ ایک لمحے کی دیر کیے بغیر جگ اٹھا لایا۔ چچی کو پانی پلایا۔ منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ جلد ہی ہوش میں آگئیں۔ ہوش میں آتے ہی انھوں نے پھر حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ بڑی مشکل سے انھیں چپ کرایا گیا بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے وقار الحسن سے کہا کہ وہ جلد از جلد سب کو پانی پلائے۔ گھر کا سارا پانی خون بن چکا تھا۔ جانے کب سے یہ سلسلہ جاری ہوگا۔ شاید اسی لیے ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی تھی۔ جب پانی ہی خون بن چکا تھا تو وہ کیا کھاتیں اور کیا پکاتیں؟ وقار الحسن جگ لے کر اندر دوڑا۔ کوثر بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس لمحے خود کو بے حد بے بس اور مجبور محسوس کیا۔ اگر وہ میری بات سن سکتی تو میں اسے کہتا کہ وہ جلد از جلد مجھے مجسم کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی آنکھوں میں ان حالات میں بھی سکون اور گہری سوچ تھی۔ ظاہر ہے پانی کے خون بن جانے کا واقعہ اس کے لیے ایسی اہمیت کا حامل نہیں ہوگا جیسا گھر کے دوسرے افراد کے لیے دہشت خیز ہوا ہوگا۔

اسی لمحے کوثر نے آگے بڑھ کر مجھے چھونے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا لمس محسوس نہیں کیا۔ نہ ہی اسے میرا لمس محسوس ہوا لیکن میں نے اور اس نے یہ دیکھ لیا کہ اس کا ہاتھ میرے بازو سے ہوتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہ میرے معاملے میں خاصی متجسس تھی۔ میں نے چچا کی طرف دیکھا' وہ اسے آواز دے کر اپنی مدد کے لیے بلا رہے تھے۔ چچی ہوش میں تو آچکی تھیں مگر ان کی ٹانگوں میں شاید جان نہیں تھی۔ ان سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ کوثر ان کی طرف بڑھ گئی' اس نے چچی کو کھڑا کرنے میں مدد دی اور انھیں لے کر اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ چچا بھی اس کے ساتھ تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کا منظر دیکھ کر دکھی ہو گیا۔ وقار الحسن ایک ایک کر کے سب کو پانی پلا رہا تھا۔ ہر کوئی سارا کا سارا پانی پی جانا چاہتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس پانی میں سب کی پیاس بجھا سکے۔ یہ دیکھ کر میں پھر ایک بڑا برتن لے کر باہر لگے نلکے پر پہنچ گیا۔ ذرا ہی دیر میں' میں نے دوسرا برتن بھی وقار الحسن کے قریب لا کر رکھ دیا۔ برتن زمین پر رکھتے ہی سب کو نظر آنے لگا۔ جہانی آپا اور شنو آپا کے بےصبرے ہو کر بستر سے اٹھے اور پانی پر جھپٹ پڑے۔ چچی اور چچا دونوں ان لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر باقاعدہ رو رہے تھے۔ وقار الحسن کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ بار بار ناک سڑک رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ برتن بھی خالی ہو گیا۔ اب سب کی حالت کافی

بہتر تھی۔ سب بستر پر پڑے لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ بے جان چہروں پر زندگی کی ہلکی سی رمق پیدا ہو چکی تھی۔ تایا کا سانس تو دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ چچا' چچی کو چھوڑ کر تایا کا سر زانو پر رکھے بیٹھے تھے۔

کوثر' تائی کے سرہانے بیٹھی تھی۔ تائی نے کئی بار آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا مگر ان کی آنکھوں میں پہچان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ وقار الحسن اماں کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی' صرف ان لوگوں کے سانس لینے کی آوازیں گونجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بہت سا وقت یونہی گزر گیا۔ اچانک وقار الحسن چونکا۔ اس نے زمین پر رکھے خالی برتن کو دیکھا پھر اسے اٹھا کر باہر کی طرف لپکا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ مزید پانی لینے جا رہا تھا کہ میں اس تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی مدد کرنے پر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں فوراً ہی اس کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ مجھے مجسم کر دے گا تو میں ہر معاملے میں اس کے کام آؤں گا۔ وہ مجھ سے خوفزدہ نہ ہو۔ جو کچھ وہ کہے گا' میں وہی کروں گا۔ اس وقت مجھ پر بہت سے ایسے کام کرنے کے تقاضے بھی ہیں جو آج میرے لیے ناممکن ہیں۔

وہ اب بھی میری طرف سے مشکوک تھا پھر بھی وہ چپ ہو گیا۔ اس کا چپ ہونا میرے لیے بہتر تھا۔ اگر وہ میری بات نہ مانتا تو ضرور جرح کرتا۔ میں اس کی طبیعت سے واقف تھا۔ خاموش ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب میری افادیت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

"میں ڈرتا ہوں۔ تم مجھے ذلیل بھی کروا سکتے ہو۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ اس دوران میں وہ نلکے سے برتن دوبارہ بھر چکا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا وقار الحسن' میں وعدہ کرتا ہوں۔" اس سے وعدہ کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ فی الوقت مجھے اپنے وعدے پورے کرنے کی نہیں' اپنے طاقتور ہو جانے کی فکر تھی۔ میں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کافی بے قرار تھا۔

"مجھے تمھارے وعدے پر بھروسا نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"وقار الحسن' تم جگہ جگہ پریشانیوں میں گھر سکتے ہو۔ تمہیں دوسرے لوگوں کی مدد درکار ہوگی۔ کوثر تمھارے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ تم اس پر بھروسا کر سکتے ہو' مجھ پر نہیں کر سکتے؟"

"وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ یوں بھی میں اس پر بھروسا نہیں کرتا۔"

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ تمھارے ساتھ آتو گئی ہے مگر اس کا دماغ کون سی چالیں سوچ رہا ہے' تم یہ جاننے پر قادر نہیں ہو وقار الحسن' مگر میں۔۔۔ میں جان سکتا ہوں' بلکہ جانتا ہوں کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ میں تمھارے دماغ کی باتیں نہیں جان سکتا لیکن دنیا کے کسی بھی شخص کے اندر کی تمام باتیں جان سکتا ہوں۔ تمھارے ذہن کو نہ پڑھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم نے جان بوجھ کر یہ پابندی مجھ پر لگائی ہے۔ ذرا دیر کو پابندی ہٹا دو پھر میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں۔"

میں اسے جو کچھ دکھانا چاہتا تھا۔ اس پر اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ طویل گہری خاموشی کے بعد بولا۔ "اس موضوع پر بات کرنے کو بہت وقت پڑا ہے"

"ہاں۔۔۔ ہم بعد میں بات کر لیں گے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ کوثر کیا چاہتی ہے۔"

"مجھے تو نہیں آتا کہ گھر والوں کی یہ حالت کیسے ہو گئی۔ شرف الدین نے ان کی خبر کیوں نہیں لی۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

اسی لمحے سامنے پان والے کھوکھے کے پاس پان والے چاچا کا بیٹا نظر آگیا۔ اس کی نظر جونہی وقار الحسن پر پڑی' وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ "ارے چھوٹے مرزا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کب آئے؟"

"میں۔۔۔ آج ہی۔۔۔ سب خیریت تو ہے نا۔" وقار الحسن کچھ اور بھی کہنے والا تھا مگر میں نے اسے خبردار کر دیا کہ فی الحال کچھ نہ بولے' اس کی سنے' اس کے چہرے پر اسی قسم کے تاثرات تھے جیسے ہم اب تک دوسرے لوگوں کے چہروں پر دیکھ چکے تھے۔

"بھیا۔ کیا سب لوگ آگئے؟" اس نے کچھ رازدارانہ انداز میں پوچھا پھر سیدھا ہو کر یوں چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ اس وقت گلی میں کوئی نہ تھا۔

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آگئے۔ کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"وہ بھیا۔۔۔ حویلی میں تو روز تماشے ہونے لگے ہیں۔ سارے لوگ گھبرا گئے ہیں۔ محلے کے لوگوں نے پنچائیت بھی

کی تھی کہ اب کی بار آپ لوگ آئیں گے تو سب آپ سے کہیں گے ما نو تو حویلی میں جھاڑ پھونک کروائیں ورنہ اسے خالی کرکے ڈھادیں۔"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔" وقارالحسن جھنجلا گیا۔ "حویلی کیسے ڈھادیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ حویلی ڈھے جانے کے بعد یہاں سے اثر ختم ہوجائے گا؟"

"اب یہ تو ہم نہیں بتاسکتے بھیا۔ وہ لوگ جو کچھ کہہ رہے تھے' ہم نے بتلا دیا ہے۔ آگے آپ لوگ جانو اور وہ۔ ویسے ایک بات بتلادیں۔" اتنا کہہ کر اس نے پھر چاروں طرف دیکھا اور وقارالحسن کا ہاتھ پکڑ کر ایک گھر کی دیوار کے سائے تلے پہنچ گیا۔ "اپنے منو بھائی ہیں ناں' وہ زور دے رہے تھے کہ اگر یہ حویلی آپ لوگوں سے خالی کرالی جائے تو وہ اپنے سسر کو بلا کر اس حویلی سے سارا اثر ختم کرادیں گے پھر اس کی ایک شرط رکھی تھی انھوں نے کہ حویلی انھیں دے دی جائے۔ بھیا ہمارے کلیجے پر تو چھریاں چل گئیں۔ ہم تو بڑے مرزا کے احسان مند ہیں۔ انھوں نے ہی یہ کھوکھا اور کام شروع کرنے کے لیے ابا کو پیسے دیے تھے۔ اسی سے دال روٹی چل رہی ہے۔ ہمیں تو منو بھائی کی یہ بات ذرا پسند نہیں آئی۔ آپ ذرا دیکھ بھال لو اور آپ کی اماں اور بہنیں وغیرہ تو سب خیریت سے ہیں ناں؟"

وہ بولے جارہا تھا۔ وقارالحسن کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔ میں نے انھیں تسلی دی۔ وہ پان والے کے بیٹے سے شام کو ملاقات کرنے کا کہہ کر پھر حویلی کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار وہ اماں کے کمرے میں جانے کی بجائے رشید چاچا والے حصے کی طرف جارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا برتن دیکھ کر رشید چاچا کی بہو نے برتن اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے بچے پھر رشید چاچا اور پھر اپنے میاں کو پانی پلایا۔ آخر میں اس نے برتن اپنے منہ سے لگایا تو وقارالحسن رو پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر جلدی سے باہر نکل آیا۔

ہم پھر اماں والے کمرے میں چلے آئے۔ وقارالحسن حکیم علی احمد کو بلانا چاہتا تھا تاکہ سب کو دکھا سکے مگر کوثر نے اسے روک دیا۔ اس کی بات معقول تھی۔ یہ بات باہر نکلتی تو مشکلات بڑھ سکتی تھیں اردگرد کے لوگ مزید دہشت زدہ ہوسکتے تھے۔ ان لوگوں کی حالت پراسرار حد تک بگڑی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو علاج کی نہیں' غذا کی ضرورت تھی۔ چچا اور میں نے بھی کوثر کی بات کی تائید کی۔ وقارالحسن بالٹیاں بھر بھر کر پانی لے آیا۔ چچی اور کوثر نے گھر کے تمام برتن دھوئے۔ ٹنکی کو خالی کرنا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ نکاسی کا پانی جس نالی سے گزرتا تھا وہ حویلی کی ایک دیوار کے ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے تک یہ نالی اوپر سے کھلی ہوئی تھی۔ باہر کے لوگ نالی میں بہتے خون کو دیکھ کر ہراساں ہونے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لیے دشواریاں بھی پیدا کرسکتے تھے۔ اس لیے وہ خون یوں بہایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس ٹنکی کو فی الحال یونہی چھوڑ دیا گیا۔ کوثر نے لائی ہوئی سبزی اور گوشت پکایا۔ چچا آٹا گودام سے نکالنے کی بجائے' بازار سے نیا لے آئے۔ چچی جو اب کافی بہتر ہوچکی تھیں' گو وہ اب بھی خوفزدہ تھیں مگر جانتی تھیں کہ ان حالات میں یہاں سے جانے کے لیے چچا سے کچھ کہنا قطعی غیر مناسب ہے اور چچا کسی بھی صورت میں یہ بات نہیں مانیں گے اس لیے وہ چپ چاپ کام میں لگی رہیں۔ انھوں نے آٹا گوندھ کر روٹیاں پکالیں۔ کھانا تیار ہوتے ہی وقارالحسن اور چچا نے سب کو کھانا کھلا دیا' ان لوگوں کے کھانا کھانے کا انداز بتا رہا تھا کہ اب نہ ان کے جبڑوں میں طاقت ہے نہ معدے میں مگر وہ قحط زدہ لوگوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔

زیب النسا یعنی رشید چاچا کی بہو نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ نقاہت محسوس کرنے کے باوجود کوثر اور چچی کا ہاتھ بٹانے آگئی۔ پھر گزرے ہوئے تمام حالات کا اس کی زبانی پتا چلا۔

اس نے بتایا کہ یہ خوفناک سلسلہ پچھلے ماہ کی چودھویں کی رات کو شروع ہوا تھا۔ جب ایک عجیب الخلقت جانور نے حویلی میں دہشت پھیلا دی تھی۔ یہ جانور بلی ایسا تھا یعنی اس کا بدن بلی کا تھا مگر چہرہ بے حد خوفناک تھا۔ وہ بڑی کریہہ آواز میں چیختا تھا۔ اس رات سب آنگن میں بیٹھے تھے۔ اوپر جانے والی سیڑھیاں جو حویلی کے اندرونی حصے کی طرف سے جاتی تھیں جن پر لوہے کی سلاخوں والا دروازہ لگا تھا' وہ دروازہ اچانک ہلنے لگا۔ سب اچھل پڑے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت طاقتور آدمی یا چیز اسے زور زور سے ہلا رہی ہے۔ مگر نظر کوئی بھی نہیں آرہا تھا۔ سب خوفزدہ ہوکر کمرے

میں جاگھسے۔ زیب النسا البتہ بڑے ستون کی آڑ میں ہوگئی تھی۔ وہ کافی جی دار عورت تھی۔ سب کے کمرے میں جاتے ہی اسے یوں لگا جیسے سیڑھیوں کے نیچے کہیں آگ لگ گئی ہے' زمین سے دھواں نکلنے لگا پھر دھواں چھٹا تو وہ اس خوفناک جانور کو دیکھ کر سہم گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں انسانی آنکھوں ایسی تھیں' ان میں غضب کا غصہ تھا۔ وہ اپنے پہلے دونوں پنجوں سے سلاخوں کو جھنجوڑ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے بس کچھ ہی دیر میں دروازہ جڑ سے اکھڑ کر گر پڑے گا۔ یہ دیکھ کر زیب النسا بھی کمرے میں جا چھپی۔ کمرے کے دروازے بند کرلیے گئے۔ تقریباً آدھا گھنٹا اس ہنگامے میں گزر گیا۔

آدھے گھنٹے بعد کمرے میں بھی دھواں بھرنا شروع ہوگیا۔ یہ دھواں کمرے کی دیواروں اور فرش سے نکل رہا تھا۔ اس دھوئیں کی وجہ سے سب بے ہوش ہوگئے۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک بے ہوش رہے اور جب ہوش آیا تو حالات معمول پر آچکے تھے۔ وہ سب سہمے سہمے باہر نکلے۔ رشید چاچا ان دنوں زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تین چار روز سکون سے گزر گئے۔ رشید چاچا کے واپس آتے ہی تایا مراد آباد گئے' وہاں وقارالحسن کا پتا کیا اور چچا سے کہہ کر کہ وقارالحسن جیسے ہی آئے اسے واپس بھیج دو' دوبارہ امروہہ واپس آگئے۔ چاند کی چوبیس تاریخ کو اچانک اوپر کی منزل میں آگ بھڑک اٹھی۔ سارا گھر پریشان ہوگیا۔ تایا نے مدد کے لیے محلے کے لوگوں کو بلایا۔ جب لوگ حویلی میں داخل ہوئے تو وہاں آگ تو کیا کسی چنگاری کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ محلے والوں کے واپس جاتے ہی آگ پھر بھڑبھڑا کر بھڑک اٹھی۔

یہ آگ اتنی شدید تھی کہ لگتا تھا منٹوں میں پوری حویلی کو بھسم کر ڈالے گی مگر گھر والے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ ان پے درپے واقعات نے جہانی آپا اور شنو آپا کو بے حد خوفزدہ کردیا تھا۔ جہانی آپا تو بیمار پڑ گئیں۔ یہ حالت دیکھ کر تایا نے مراد آباد واپس جانے کا قصد کیا۔ گھر کے سب افراد نے تیاری کرلی۔ اس روز غلام رسول اور رشید چاچا بھی گھر پر تھے۔ تایا انھیں بھی حویلی میں چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سب بھی مراد آباد جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ پھر غلام رسول نے تانگا لینے کے لیے حویلی سے باہر جانا چاہا تو بڑے گیٹ کو کھولنے میں ناکام رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے گیٹ میں باہر جانے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ وہ تایا کو اور رشید چاچا کو بتا کر اور اپنے ساتھ لے کر گیٹ کی طرف آیا تو وہاں سپاٹ دیوار تھی۔

پوری حویلی چھان لی گئی مگر باہر جانے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ کوئی روزن' کوئی کھڑکی اور کوئی گیٹ اس حویلی میں نہ تھا۔ یہ دیکھ کر تایا اور رشید چاچا اوپر کی منزل میں چلے گئے تاکہ اوپر کی کھڑکی سے باہر جھانک کر کسی کو مدد کے لیے بلا سکیں مگر چھت تک پہنچ جانے کے باوجود حویلی کے احاطے کی دیوار سے باہر نہ جھانک سکے۔ یوں لگتا تھا جیسے حویلی کی دیواریں زمین سے نکل کر آسمان میں پیوست ہوچکی ہیں جیسے گھر کے تمام لوگوں کو کسی نے ایک ایسے قید خانے میں بند کردیا ہے جہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہ صورت حال بہت خوفناک تھی۔ تایا اگر یہ بات عورتوں کو بتاتے تو جانے کیا ہوتا اس لیے نڈھال ہوکر رہ گئے۔ صرف اماں کو چپکے سے بتادیا کہ اب وہ لوگ کبھی حویلی سے باہر نہیں جاسکتے۔ تائی کو تو کسی بات سے کوئی مطلب نہیں تھا مگر جہانی آپا اور شنو آپا حویلی میں ہی رہنے کا پروگرام سن کر حواس باختہ ہوگئی تھیں۔ اماں نے کسی نہ کسی طرح ان دونوں کو مطمئن کردیا مگر کب تک۔۔۔؟

بہرحال حویلی سے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہی حویلی کی دیوار میں نصب گیٹ تو نظر آگیا مگر اسے کھولنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ اب حویلی والوں کا دنیا سے رابطہ ختم ہوچکا تھا۔ یہ شکر تھا کہ حویلی میں کھانے پینے کی اشیا اتنی تھیں کہ گزارا ہونے لگا۔ مگر حویلی میں ان دنوں ایک پراسرار خاموشی سی طاری ہوگئی تھی۔ ایک ایسا خوف تھا جس نے سب کو پتھر کا بت بنا ڈالا تھا۔ ایک دوسرے سے بات کرتے تو سرگوشیاں بھی گونج کر بازگشت پیدا کرنے لگتیں تب آپس میں بات چیت بھی بند ہوکر رہ گئی۔ اماں کسی نہ کسی طرح کچھ پکا کر زندگی سے ناتا جوڑے ہوئے تھیں۔ تمام لوگوں کی نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ وہ سب کے سب ایک ہی کمرے میں محصور ہوکر رہ گئے تھے۔

یہ حالات تقریباً" پندرہ روز تک رہے پھر زندگی معمول پر آنے لگی۔ وہ جو حبس کی سی پراسرار بوجھل فضا تھی' کچھ تبدیل ہوگئی یا شاید یہ لوگ ہی ان حالات کے عادی ہوگئے۔ اماں زیادہ تر عبادت میں مصروف رہتیں۔ کمرے کے گرد رات کو آیت الکرسی پڑھ کر حصار کھینچ دیا کرتیں۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ رات سکون سے گزرتی تھی۔ باہر کی

دونوں سے رابطہ اب بھی منقطع تھا۔ رشید چاچا اور تایا نے ہر طرح کوشش کی کہ گیٹ کو کھول سکیں مگر یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں ہو سکا۔ بلکہ یہاں تک کہ تایا اور رشید چاچا نے لوہے کے ہتھوڑے کو گیٹ پر پوری قوت سے ٹھونس مارا کہ شاید یہ آوازیں باہر کا کوئی شخص سن لے اور مدد کو آجائے مگر لگتا تھا جیسے یہ آواز باہر نہیں جا رہی ہے۔ بس اس حویلی کے اوپر آسمان تھا جو گہری چپ میں لپٹا حویلی کے لوگوں کی بے بسی کو تکتا رہتا تھا۔

گھر والوں کے چہروں سے پہلے رونق ختم ہوئی' اس کی جگہ خوف کی زردی نے لے لی۔ پھر خوف نسوں میں دوڑنے لگا اور آہستہ آہستہ وہ سب چلتی پھرتی خاموش لاشوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے زندگی معدوم ہوتی چلی جا رہی تھی مگر اماں اور زیب النسا غذا کے نام پر جو کچھ ان لاشوں کے منہ میں ڈالتی تھیں اس نے سانس کی ڈوری جوڑ رکھی تھی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے' اس خوف نے اماں کو نڈھال کر دیا تھا کہ کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ حویلی میں موجود ہر فرد کو یقین ہو چکا تھا کہ ان کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ یہ بے جان جسم اس روز زندگی سے یہ بے معنی سا رابطہ بھی ختم کر دیں گے جس روز راشن ختم ہو گا مگر اس سے پہلے ہی ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ اب تو کسی میں مزید خوف زدہ ہونے یا چیخنے چلانے کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اس لیے اس نئی قیامت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے اور اللہ کا آسرا کرنے کے سوا کوئی بھی کچھ نہ کر سکا۔
اس روز زیب النسا سب سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ وہ فجر اور مغرب کی نماز ضرور پڑھتی تھی۔ کیوں کہ سردیوں کے دن تھے اس لیے اماں کے وضو کا پانی وہ گرم کر دیتی تھی۔ جب سے وہ لوگ حویلی میں محصور ہوئے تھے' تایا بھی گھر ہی میں نماز پڑھ رہے تھے مگر وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کیا کرتے تھے۔ اس نے اٹھ کر صحن میں لگے سرکاری نلکے کے نیچے بڑی دیگچی رکھی اور نل کھولا تو اس میں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔ بس اسی دن کے بعد گھر میں موجود تمام پانی خون میں تبدیل ہو گیا۔ ایک تو نلکوں میں آنے والے خون کی دہشت' پھر بھوک اور پیاس نے سب کی جان ہی نکال دی۔ آج اس فاقے کو پانچواں روز تھا۔ آج پہلی بار زیب النسا نے گیٹ پر کنڈا بجنے کی آواز سنی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اٹھنے کی ہمت تو اس میں بھی نہ تھی' پہلی بار کنڈا بجنے کی آواز اسے اپنا وہم لگی پھر متواتر آنے والی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا اور وہ یہ یقین ہوتے ہی کہ آواز وہم نہیں بلکہ گیٹ پر واقعی کوئی ہے' کسی نہ کسی طرح گیٹ تک پہنچ گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ گیٹ کھول نہیں سکے گی مگر جونہی اس نے اندر لگے کنڈے ہٹائے گیٹ کھل گیا اور یوں آپ سب آ گئے۔"

یہ سب سن کر وقار الحسن اور چچا ساکت رہ گئے۔ کوثر کو شدید غصہ تھا۔ اس نے وقار الحسن سے کہہ دیا کہ وہ آج ہی اس کا کچھ بندوبست کرے گی۔ چچا اور چچی کافی پریشان تھے۔ اب کا انتظام تو وقار الحسن نے کر لیا تھا بعد کے لیے وہ محلے کے سقے سے کہہ آیا تھا مگر اب سارا مسئلہ ٹنکی میں بھرا خون بہانے کا تھا۔ چچی اماں وغیرہ کے پاس چلی گئیں۔ وقار الحسن' چچا اور زیب النسا شام کو آنے والے پانی کے لیے ٹنکی خالی کرنے کی ترکیبیں کرنے لگے۔ چچا نے مشورہ دیا کہ بڑے برآمدے کے پار کچے صحن میں گڑھا کھودا جائے اور تمام خون کو اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی جائے۔ وقار الحسن کہہ رہا تھا کہ فی الحال نئی ٹنکی خرید لی جائے کیونکہ گڑھا کھودنا آسان نہ تھا۔ اس کی بات پر سن کر چچا چپ ہو گئے۔ کام چور تو تھے ہی۔ اتنی محنت سے بچنا چاہتے تھے سو جلدی سے جیب سے پیسے نکال کر وقار الحسن کو دے دیے۔

وقار الحسن قریبی بازار سے ٹنکی خرید لایا۔ شام کو سقہ پانی لایا تو کچھ سکون ہوا۔ اماں' تایا اور بہنوں کی حالت پہلے سے بہتر ہونے کے باوجود اتنی بہتر نہ تھی کہ ان سے گفتگو ہو سکے مگر پھر بھی اماں اور تایا کوثر کو دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے تھے۔ دیکھا تو اسے ان لوگوں نے پہلے بھی تھا مگر شاید پہچانے نہ تھے یا انھیں اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ سوچ پاتے۔ کچھ بہتر ہوتے ہی تایا کی آنکھوں میں اچانک بھرپور زندگی کی قندیل سی جل اٹھی تھی جب کہ اماں اسے ٹکر ٹکر دیکھتی گئیں اور ان کے چہرے پر ناگواری کی لکیر سی پھیل گئی۔ تائی تو مسلسل آنکھیں بند کیے پڑی تھیں۔ میں بے وجہ ہی اماں کے دماغ کو کریدنے لگا' حالانکہ میں جانتا تھا کہ اماں کیا سوچ [illegible] میری توقع کے عین مطابق اماں اس کے آنے پر خوش نہیں تھیں۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ واپس نہ آئے بلکہ وہ اس کی وقار الحسن میں دلچسپی کی وجہ سے ناگواری محسوس کر رہی تھیں اور خدا سے دعا کر رہی تھیں کہ جس قدر جلد ہو حالات بہتر ہو جائیں تاکہ وہ جلد از جلد شگفتہ کو بیاہ لے آئیں۔ ان حالات میں بھی انھیں بیٹے کی فکر تھی۔ میں نے تایا کے ذہن میں جھانکا۔ ان کے اندر وقار کے لیے لاکھوں دعائیں جگمگا رہی تھیں۔ جہانی آپا، ن تو آپا اس کی واپسی سے خوش تھیں۔ اس نے ان کی بہت خدمت کی۔ تائی کو تو وہ اپنے ہاتھ سے کھلاتی تھی۔ ان سے باتیں کرتی مگر وہ اسے نہیں پہچانتی تھیں۔ ان کی خالی آنکھوں میں کسی جذبے کا کوئی عکس نہ تھا۔

اسی شام وقار الحسن شرف الدین کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو میں اس کے ساتھ تھا۔ راستے میں ہماری کسی جان پہچان کے آدمی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم شرف الدین کے دروازے پر پہنچے تو وقار الحسن کے اندر بے پناہ غصہ تھا۔ وہ تمام راستے یہی سوچتا آیا تھا کہ شرف الدین کو کھری کھری سنائے گا۔ اس سے کہے گا کہ اس نے دوستی کا حق ادا نہیں کیا پھر بھی وہ خود کو دوست کہتا ہے۔ اب تو دوست کے علاوہ بھی اس سے دو رشتے مزید استوار ہو چکے تھے۔ اس نے نہ ان رشتوں کا خیال کیا اور نہ اس کی دوستی کا۔ وہ تو وقار الحسن کے لیے جان تک دے دینے کا دعویدار تھا۔ وقار الحسن نے دروازے پر دستک دی تو اس کے ہاتھوں کی جنبش اور دستک میں اس کے مزاج کی تیزی شامل تھی۔

"کون ہے؟"

اندر سے آنے والی آواز نے وقار الحسن پر گویا جادو کی چھڑی گھما دی تھی۔ وہ پل کے ہزارویں حصے میں یکسر تبدیل ہو گیا۔ یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں کہ وہاں اس کی ملاقات شگفتہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو تمام راستے شرف الدین سے الجھا رہا تھا۔

شگفتہ کے فاختہ کے پروں ایسی نرم آواز نے تو مجھے بھی بے چین کر دیا تھا مگر میں ساکت رہا۔ جانتا تھا کہ میں نے کچھ بھی سوچا یا محسوس کیا تو وقار الحسن آگ بگولہ ہو جائے گا۔ یوں بھی میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں کھنڈر میں تو ایک وقت ایسا آ چکا تھا کہ وہ سب پر لعنت بھیجنے کو تیار تھا۔ پتا نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔ تب سے اب تک اس نے شگفتہ کے بارے میں کچھ سوچا تو نہیں تھا حتی کہ یہاں آتے ہوئے یا راستے میں بھی شگفتہ کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کچھ سنبھل کر جواب دیا۔ "کھولیے..... میں ہوں وقار الحسن!"

ایک دم دروازے کی کنڈی کھل گئی۔ اس کا بے رونق چہرہ سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔ رنگت زرد ہو گئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے یوں حیرت اور وحشت کے ساتھ وقار الحسن کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے وہ وقار الحسن نہ ہو بلکہ اس کی روح ہو' اس کا بھوت ہو۔

"آپ ..... آپ ..... آپ ٹھیک ہیں؟" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"جی ..... الحمد اللہ ..... آپ ..... کیسی ہیں' اور گھر والے .....؟"

"اوہ ..... آئیے ..... بھائی جی تو بہت پریشان تھے۔ اماں بھی۔" اس نے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا پھر سر پر دوپٹا جماتی ہوئی اندر چلی گئی۔

وقار الحسن اندر داخل ہو کر مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ کمرا ابتر حالت میں تھا۔ لگتا تھا جیسے کئی روز سے صفائی نہیں کی گئی ہے۔ مونڈھوں پر چڑھا ہوا کپڑا میلا تھا۔ تپائی پر جگہ جگہ چائے کے دھبے پڑے تھے۔ تکیے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ وقار الحسن بڑی باریکی سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی اسے بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شرف الدین اور اس کے پیچھے ہی بوکھلائی ہوئی ان کی اماں اندر داخل ہوئیں۔ "وقار ..... وقار ..... میرے دوست ....."

شرف الدین دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ بار بار اسے خود سے الگ کر کے غور سے سرتاپا دیکھتا پھر اسے سینے سے بھینچ لیتا۔ "یا اللہ ..... تیرا شکر ہے۔" اس نے منہ اٹھا کر کہا پھر وقار الحسن سے مخاطب ہوا۔ "گھر والے سب ..... ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہیں"۔ وقار الحسن ایسا کہتے ہوئے پھر بپھر گیا تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ شرف الدین نے اس کے گھر والوں کی خبر نہیں لی۔

اس کی اماں بھی پریشان حال اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔ شرف الدین کے ہٹتے ہی انھوں نے وقار الحسن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گلوگیر آواز میں بولیں۔ "بیٹے ہم سب بہت پریشان تھے۔ لگتا تھا جیسے تم سب کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم سب خیریت سے ہو۔ تمھاری

اماں کا کیا حال ہے؟"

"اماں کچھ بیمار ہیں لیکن ــــ بہت بہتر ہیں۔ اب ٹھیک ہیں۔" اس نے گول مول سا جواب دیا۔

شرف الدین کی اماں اسے بیٹھنے کا کہہ کر اندر چلی گئیں۔ ان کے اندر جاتے ہی شرف الدین پھر وقار الحسن سے لپٹ گیا اور بولا۔ "میں بہت پریشان تھا۔ نہ تمھاری کوئی خیر خبر مل رہی تھی نہ گھر والوں کی۔"

"گھر والوں کی خیر خبر لینے کے لیے تو تمہیں جانا پڑتا نا وہاں ــــ خیر خبر خود تو چل کر یہاں نہیں آتی۔ یا پھر تم اس انتظار میں تھے کہ اماں تایا کے ہاتھ تمہیں اپنی خیر خبر بھیجتیں؟" اس کے لہجے کی کاٹ نے شرف الدین کو چونکا دیا۔

"کیا ــــ مطلب؟" وہ کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔

"مطلب یہ کہ تمہیں دوستی کا اتنا تو حق ادا کرنا چاہیے تھا کہ پلٹ کر گھر والوں کی حالت پوچھ لیتے۔ وہ تو کہو کہ خدا کو رحم آگیا۔ میں پہنچ گیا ورنہ ــــ ورنہ شاید مجھے حویلی میں نولاشیں ملتیں۔" وقار الحسن کا لہجہ بھیگ گیا۔

"کک ــ کیا ــ کیا کہہ رہے ہو؟ حویلی میں ــ مگر ــ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں تو ــ میں تو ہر روز وہاں جاتا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے تم لوگ وہ حویلی چھوڑ گئے ہو جیسے وہاں برسوں سے کسی نے قدم نہیں رکھا ہو۔ وہ حویلی بالکل اجاڑ اور ویران تھی۔ میں نے گھنٹوں گیٹ کا کنڈا بجایا مگر کبھی جواب نہیں ملا تو میں مایوس ہو کر لوٹ آیا میں ہر روز وہاں جاتا اور لوٹ کر آتا رہا۔"

تب وقار الحسن نے دھیرے دھیرے اسے ساری کہانی سنائی۔ یہ سب سن کر وہ مضطرب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "خدا گواہ ہے وقار الحسن کہ میں ہر روز یہی آس لے کر جاتا تھا کہ شاید ــــ شاید وہ لوگ کہیں گئے تھے اور اب آگئے ہوں۔ میں حیران تھا کہ وہ لوگ آخر کہاں چلے گئے۔ ان کا تو یہیں رہنے کا پروگرام تھا۔ میں تمھارے جانے کے اگلے روز ہی مغرب کے بعد یہ سوچ کر گیا تھا کہ تایا سے کچھ گپ شپ کروں گا۔ انھیں میرے جانے سے کافی تسلی رہے گی۔ وہ تمھارے جانے پر بہت افسردہ تھے میں نے انھیں گھر چھوڑا تو وہ اس قدر دل گرفتہ تھے کہ میں رات بھر سو نہیں سکا تھا۔ میں حویلی پہنچا تو اس کا گیٹ بند تھا۔ باہر تالا نہیں تھا مگر میرے بہت دیر تک کنڈا بجانے کے باوجود کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ گھر میں کوئی ایک ہی آدمی ہوتا تو میں سوچتا کہ کہیں گیا ہوا ہے، سو رہا ہے یا نہ رہا ہے مگر گھر میں تو اتنے بہت سے لوگ تھے۔ بات میری سمجھ میں قطعی نہیں آئی کہ دروازہ کیوں نہیں کھولا جا رہا۔ پھر یہ خیال کیا کہ شاید رات میں کچھ ایسا واقعہ ہو گیا ہو کہ تایا سویرے ہی سب کو لے کر کسی رشتے دار کے گھر چلے گئے ہوں۔ یہی سوچ کر میں مطلوب چچا کے گھر گیا۔

مطلوب چچا خود بھی یہ سن کر پریشان ہو گئے اور مجھے ساتھ لیے پورے امروہہ میں گھر گھر پھرے۔ محلہ قریشی اور محلہ ملانا کا ایک ایک گھر چھان مارا۔ وہ کہیں بھی نہ تھے پھر میں مراد آباد بھی گیا۔ چچی سے ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ وہ سب لوگ امروہہ میں ہی ہیں۔ میں نے انھیں بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور لوٹ آیا۔ وقار، یقین کرو ایسا لگتا تھا سب کو زمین کھا گئی ہے۔ اماں کا تو رو رو کر برا حال تھا اور ــــ شگفتہ ــــ" وہ کہتے کہتے جھجک گیا۔ "اب ــــ اب میں جا سکتا ہوں وہاں؟" اس نے پھر بے قراری سے پوچھا۔

"ہاں ــــ چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ یہ سن کر کہ تم خبر لینے نہیں آئے، میرا غصے سے برا حال تھا۔" وقار الحسن نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"اسی لیے تو خدا کہتا ہے کہ بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دو۔ یہ زہر ہے۔ ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔" شرف الدین نے گہرا سانس لے کر کہا۔

کچھ دیر بعد شرف الدین کی اماں کھانے پینے کی چیزیں لے آئیں۔ شرف الدین آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے سے وقار الحسن کو منع کر دیا تھا کہ ان کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات نہ کرے اس لیے جب انھوں نے گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو وقار الحسن نے بڑی فراخدلی سے جھوٹ بول دیا کہ دھیرادون میں رشتے داروں کی شادی تھی، سب لوگ وہاں گئے ہوئے تھے۔

"مگر شرف الدین تو بتا رہے تھے کہ ــــ" انھوں نے مشکوک انداز میں بات شروع کی۔

شرف الدین نے ان کی بات کاٹ دی اور بولا۔ "مجھے ہی غلط فہمی ہوئی تھی اماں ــــ بھئی ان لوگوں کے جنوں بھوتوں، روحوں اور چڑیلوں سے تعلقات ہی اتنے گہرے اور پرانے ہیں کہ ہر بندہ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔" یہ بات اس نے ہنس کر کہی۔

اس بار اس کی ہنسی میں بلا کا اطمینان تھا۔ پھر اس کی اماں سب کی خیریت پوچھتی رہیں۔ گھر آنے کو کہا تو وقار الحسن ٹال گیا۔ اس نے کہہ دیا کہ کچھ لوگ لکھنؤ اور دھیرادون سے آئے ہوئے ہیں، جیسے ہی ان کی مہمان داری سے فراغت ہو گی، وہ انھیں اطلاع کر دے گا پھر وہ ضرور آئیں۔ وہ ڈرتا تھا کہ گھر والوں کی حالت کسی نے دیکھ لی تو کیا ہو گا۔ شرف الدین تو خیر ہر بات سے آگاہ تھا۔ اسے حقیقت بتانا یوں بھی ضروری تھا کہ وہ قدم قدم پر وقار الحسن کے ساتھ رہتا تھا مگر کوئی اور اگر گھر والوں کی شکل دیکھتا تو شاید دہشت سے مر جاتا۔

جہانی آپا کا چہرہ بھی کچھ کم خوفناک نہیں تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ سیاہ حلقوں میں ٹمٹماتے بلکہ بجھتے ہوئے چراغوں ایسی ہو گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال۔ اتنی بڑی ناک اور دانت۔ یہ سب کچھ آدمی کو ڈرانے کے لیے کافی تھا۔ وقار الحسن نے سوچ لیا تھا کہ وہ شرف الدین کو صرف تایا سے ملوائے گا۔ وہ تو پہلے بھی اتنے کمزور تھے کہ شاید انھیں دیکھ کر شرف الدین کو کچھ اندازہ نہ ہو۔ ورنہ گداز بدن کی جہانی آپا یا فربہی مائل بدن کی شنو آپا کو ڈھانچے میں تبدیل ہوا، وہ دیکھتا تو جانے اس کی کیا حالت ہوتی۔

خاطر مدارت کرنے کے بعد شرف الدین بھی وقار الحسن کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس دوران میں شگفتہ سامنے نہیں آئی۔ وقار الحسن نے کئی بار چاہا اور دل ہی دل میں یہ دعا مانگی کہ وہ آجائے۔ یہ شاید لمحہ قبولیت تھا یا شرف الدین وقار الحسن کے دل کا حال جان گیا تھا کہ اس نے شگفتہ کو آواز دے لی۔ اس کی اماں نماز کے لیے جا چکی تھیں۔

شگفتہ دروازے پر ہی پردے کی اوٹ میں ٹھہر گئی۔ میں نے وقار الحسن کے بدن کو چھوڑ دیا۔ میں شگفتہ کو قریب سے دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا تھا۔ میں اس میں اور کلپنا میں موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ کلپنا جس نے لمحہ بھر کو وقار الحسن کے حواسوں پر چھا کر اسے اندھا کر دیا تھا۔ مگر وہ بہت جلد اس اندھیرے سے نکل آیا تھا۔ اب اس کا دل شگفتہ کی مترنم آواز پر تال دے رہا تھا۔ میں نے جونہی وقار الحسن کا بدن چھوڑا، وہ مضطرب ہو گیا۔ اس کے انداز ہی سے لگا کہ وہ میری اس حرکت پر خوش نہیں ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس لیے میں دوبارہ اس کے اندر چلا گیا اور اس سے کہا کہ میں شرف الدین کے بادا کا احوال جاننا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اب تک وہ کوئی نیا پینترا بدل چکے ہوں۔ اتنا کہتے ہی میں پھر باہر آگیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے منع کرے۔ اس بار میں اس کی طرف توجہ دیئے بغیر شگفتہ کی جانب بڑھ گیا۔

پردے کی اوٹ میں کھڑی شگفتہ بڑی نکھری نکھری سی لگی۔ جو ویران آنکھیں میں نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھیں ان میں اس وقت دیپ سے جل رہے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر مسکان چھپی بیٹھی تھی۔ اس کی گول گول کلائیوں میں سبز کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ بکھرے ہوئے بالوں کو اس نے ربن سے باندھ لیا تھا مگر وہ اس کی پتلی کمر پر لہرا رہے تھے۔ اس کے زرد رخساروں پر شفق پھوٹ چکی تھی۔ وہ نازک سی، سادی سی لڑکی مجھے اچھی لگی۔ میں کلپنا کو بھول گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کلپنا سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے بدن کی کچی کچی خوشبو نے مجھے بے خود کر دیا تھا۔ اسے چھونے اور اسے محسوس کرنے کی خواہش طوفان کی طرح میرے اندر اٹھی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج میں کوثر کو اشاروں ہی اشاروں میں آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ جلد از جلد مجھے مجسم کرنے کا عمل شروع کر دے۔

میں اپنے ذہن کو وقار الحسن کی قید سے بھی آزاد کرانا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ چاہے تو میرے تمام کرتوتوں کے بارے میں جان سکتا ہے اور اس کی یہی طاقت میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تھی۔ میں وہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا کہ بادا، وقار الحسن کو شبہ ہو جائے اور وہ ارتکاز سے میرے اندر کی بات جان لے۔ اسے اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ میرے لیے ہزاروں رکاوٹیں پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ میں اس بے بسی کی حالت میں کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔

میں وہاں سے سیدھا شرف الدین کے بادا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہاں وہ پلنگ پر لیٹے کسی سوچ میں الجھے ہوئے تھے۔ انھیں وقار الحسن کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ ان کا خون کھول رہا تھا۔ وہ پاس رکھے حقے کے کش پر کش لگا رہے تھے۔ فضول، نامعقول، آوارہ اور لاابالی کے الفاظ کی گردان جاری تھی۔ وہ شرف الدین اور اپنی بیوی سے بھی نالاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں رشتہ کر کے یہ لوگ

خاندان کی عزت ڈبو رہے ہیں۔ شگفتہ کو تو بالخصوص خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ ویسے اب تک انھوں نے کوئی متبادل رشتہ نہ تلاش کیا تھا نہ ہی کرنا چاہتے تھے۔ شرف الدین کی اماں بتا چکی تھیں کہ خود شگفتہ بھی خوش ہے لہٰذا وہ بے بسی محسوس کر رہے تھے ورنہ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی' ان کے بھتیجے کے ساتھ زیادہ سکھی رہے گی۔

یہ باتیں وقار الحسن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھیں اس لیے میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکا اور واپس بیٹھک میں چلا آیا۔ بیٹھک' میں میں بڑے موقع سے پہنچا تھا۔ وہاں وقار الحسن اور شگفتہ اکیلے تھے۔ شرف الدین تیار ہونے اندر چلا گیا تھا۔ شگفتہ سمٹی اور سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا مگر پھر بھی آنکھوں میں بے پناہ پریشانی تھی۔ وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ "بھیا جی نے تو۔۔۔ پریشان کردیا تھا۔ آپ یوں۔۔۔ بنا کچھ کہے سنے چلے گئے۔ اتنی پریشانی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔"

وقار الحسن بڑے شوق سے اس کی لرزتی ہوئی آواز کو سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ دل میں میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہو رہا تھا اور اسے چھو کر محسوس کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں پل بھر میں اس کے اندر پہنچ گیا اور میں نے اسے اکسایا۔

"اس کا ہاتھ پکڑو وقار الحسن' دیکھو اس کے لمس میں کتنی مٹھاس ہے۔ انگ انگ سے شہد ٹپک رہا ہے۔ اس کے گداز بدن میں بھرا مقناطیس تمھیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ ابھی کوئی نہیں ہے وقار' میں نے اس کا ذہن پڑھ لیا ہے۔ وہ بھی تمھیں چھونے کو بے چین ہے۔ وہ تو تمھارا انگ انگ چھونا چاہتی ہے۔ آگے بڑھو۔۔۔ آگے بڑھو۔"

اور وقار الحسن یوں آگے بڑھنے لگا جیسے میں نے اس پر جادو کردیا ہو۔ وہ میرے وجود سے قطعی بے خبر' صرف میری آواز کے اتار چڑھاؤ میں جکڑ چکا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ میں اسے اکسا کر کہاں لے جا رہا ہوں۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے شگفتہ کی بانہہ پکڑ لی۔ شگفتہ تقریباً اچھل پڑی۔ اسے شاید وقار الحسن سے اتنی جرات اور ایسے والہانہ انداز کی توقع نہ تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کے گرم لمس نے اس کا چہرہ دھواں دھواں کردیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"چھوڑیے ہمیں' کوئی۔۔۔ کوئی آجائے گا۔" وہ زرد پڑ گئی۔

مگر وقار الحسن اسے چھوڑنے کی بجائے اس سے اور قریب ہو گیا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ اس کے سامنے شگفتہ کھڑی ہے۔ ایک ایسے گھرانے کی لڑکی جس کی نگاہیں بھی اگر کسی نامحرم کی نگاہوں سے ٹکرا جائیں تو اسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ وقار الحسن کے دماغ میں چمپا کے بدن کا گداز بھر چکا تھا۔ چمپا کے ساتھ گزارے ہوئے وہ خوابناک اور لذت آمیز لمحے اسے اپنے حصار میں جکڑ چکے تھے اس کے اندر شہد آگیں سے بھنور پڑنے لگے اور وہ اس بھنور میں گھرا تیزی سے چکرانے لگا مگر اس سے قبل کہ وہ مزید آگے بڑھتا' میں نے اسے ٹھوکا دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ یہ چمپا نہیں' کلپنا بھی نہیں ہے۔ یہ شگفتہ ہے۔ تمھاری منگیتر' تمھارے جگری دوست شرف الدین کی بہن' اس کی عزت۔" میرا لہجہ سخت تھا۔ وہ ایک دم ٹھٹک گیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں دوغلا پن کیوں کر رہا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں ابھی اسے اپنی طرف سے مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اسے خود ہی ہوش آجاتا اور وہ بعد میں مجھے الزام دیتا کہ میں اسے اکسا کر یہاں تک لے آیا یا میں نے اسے شرمندہ کروایا۔ میں اس کے نزدیک اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا کہ تم ایک غلط سمت میں بڑھ رہے تھے اور میں نے تمھیں ٹوکا اور یوں تمھاری عزت رکھ لی۔ وہ واقعی میرا ممنون ہوا۔ اس نے گھبرا کر شگفتہ کا ہاتھ چھوڑ دیا بلکہ اس سے معذرت بھی کی مگر اس نے کچھ سنا نہیں' وہ تیزی سے اندر بھاگ گئی۔ کچھ دیر تک وقار الحسن حیران و پریشان کھڑا رہا۔ ہاتھ ملتا رہا۔ سوچتا رہا کہ شگفتہ نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ پتا نہیں اس نے معذرت قبول کی ہوگی یا نہیں۔ وہ اپنی حرکت پر سخت شرمندہ تھا اور میں اسے جھاڑ رہا تھا۔

"تم سدھ بدھ کھو دیتے اگر میں نے تمھیں نہ ٹوکا ہوتا اور۔۔۔ اور تم مجھے ہی غلط سمجھتے ہو۔ اگر اس دوران میں کوئی آجاتا تو۔۔۔؟ شرف الدین دیکھ لیتا تو۔۔۔؟" میں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ ناصح بن گیا۔ اسے شرمندہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ میرا مقصد بھی پورا ہو چکا تھا۔ ابھی میں اسے لتاڑ ہی رہا تھا کہ شرف الدین آگیا۔ وہ نہا دھو کر تازہ دم ہو چکا تھا۔ اب اس کے چہرے پر پھیلے اطمینان نے اس کی وحشت کم کردی تھی۔ [illegible] وہ اب بھی سارے حالات سن کر کافی پریشان تھا مگر پھر بھی وہ بات نہیں تھی جو اس سے پہلے تھی۔

وہ اماں سے کہہ کر وقار الحسن کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے ابا یہ سنتے ہی کہ وہ وقار الحسن کے ساتھ جا رہا ہے فوراً بیٹھک میں پہنچ گئے۔

"آداب چچا۔" وقار الحسن نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا۔

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ جیتے رہو۔ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" انھوں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا بلکہ سوال کیا۔

"ابا میں تایا سے مل کر واپس آتا ہوں۔" وقار الحسن کے کچھ کہنے سے قبل ہی شرف الدین بول اٹھا۔

"یہ کوئی وقت ہے گھر سے نکلنے کا؟" وہ پھنکارے۔ "سویرے جا کر مل آنا۔"

"ابا میرا جانا ضروری ہے۔ میں جلدی واپس آجاؤں گا۔" شرف نے دو ٹوک انداز میں کہا اور وقار الحسن کا ہاتھ دبا کر اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ وقار الحسن کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ باہر نکل جاتا۔

"گویا' اب تمھاری آوارہ گردی شروع ہو گئی۔" انھوں نے وقار الحسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت شرف الدین کی اماں چھے گز کا دوپٹا سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"میں تو تمھیں اس طرف آتے دیکھ کر ہی کھٹک گئی تھی۔ میں نے کہا ہے اسے جا کر خیریت لانے کو۔ ارے رشتے داری بندھ گئی کچھ تو لحاظ کرلیا کرو۔"

انھوں نے بھنا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وقار الحسن موقع غنیمت جان کر غڑاپ سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد ہی شرف الدین بھی باہر آگیا۔ "ابا نہیں بدلیں گے۔ لگتا ہے مرزا صولت بیگ ان کی جائیداد ہڑپ کر گئے۔ انھیں تم لوگوں سے صرف اس لیے بیر ہے کہ تم مرزا صولت بیگ کی نسل سے ہو۔" اس نے لمبی سانس لے کر کہا۔

وہ لوگ حویلی کی طرف چل پڑے۔

راستے میں وقار الحسن نے شرف الدین کو سمجھا دیا کہ وہ گھر والوں کو دیکھ کر پریشان نہ ہو۔ جو کچھ ان کے ساتھ ہو چکا ہے' اس میں ان کا زندہ رہ جانا ہی بڑا غنیمت ہے۔ شاید اسے خوف تھا کہ ان کی حالت دیکھ کر شرف الدین حواس کھو بیٹھے گا۔ وہ لوگ گھر کے قریب پہنچے تو اندھیرا

پھیل چکا تھا۔ آج گھر سے نکلتے ہوئے وقار الحسن کوثر کو تاکید کر آیا تھا کہ سب کا بہت خیال رکھے۔ زیب النسا نے خود کو بڑی جلدی سنبھال لیا تھا اس لیے وہ بھی کوثر اور چچی کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وقار الحسن نے آج ہی صبح کافی گندم اور چاول وغیرہ خرید کر حویلی میں رکھوا دیے تھے۔ تمام پرانا غلہ محض وہم کی وجہ سے پھنکوا دیا تھا۔

حویلی کے دروازے پر دستک دینے کے کافی دیر بعد تک کوئی نہ آیا تو وقار الحسن کا چہرہ فق ہونے لگا۔ اس کی وحشت بڑھنے لگی۔ "کیا ہوا۔۔۔ یہ دروازہ۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے؟" وہ بڑبڑایا۔

"وقار الحسن!" میں نے پھر موقع غنیمت دیکھ کر اسے مخاطب کیا۔ "اگر تم مجھے طاقت دلا دو۔ میرے وجود کو ان پابندیوں سے آزاد کردو تو میں۔۔۔ میں تمھارے بڑے کام آسکتا ہوں۔ ایسے موقعوں کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے وقار الحسن اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ان دیواروں کو عبور کرلیتا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اب ایسا کرنا ضروری ہے۔" وہ پھر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"کیا۔۔۔ کیا ضروری ہے؟" شرف الدین اسے بولتا دیکھ کر چونکا۔

"یہ دروازہ۔۔۔" وقار الحسن نے اس کی بات سنے بغیر وحشت زدہ آواز میں کہا۔

اب میں بھی گھبرانے لگا تھا۔ میرا واقعی دل چاہ رہا تھا کہ میں دیواروں سے گزر کر اندر چلا جاؤں۔ عین اسی وقت کہ وقار الحسن کی وحشت بڑھ کر پاگل پن میں تبدیل ہونے والی تھی' دروازہ اچانک کھل گیا۔ ان دونوں کی جان میں جان آئی۔ دروازے پر زیب النسا تھی۔

"دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟" وقار الحسن نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "چھوٹے مرزا' میں دوسری طرف تھی۔ کوثر بی بی اوپر گئی ہیں۔ میں نے منع کیا تھا جی' باقی لوگ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ اٹھ نہیں سکتے۔ چچی نماز پڑھ رہی ہیں۔" وہ اپنے دیر سے آنے کی تاویلیں پیش کر رہی تھی اور وقار الحسن اس کی بات ختم ہونے کا منتظر تھا' بے چینی سے اندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے اس نے زیب النسا کی گفتگو پر دھیان نہیں دیا ہے پھر اس نے اماں کے کمرے کی طرف قدم

بڑھائے۔ یکایک وہ گھبرا کر پلٹا اور زیب النسا سے بولا۔ "کوثر... کوثر کہاں ہے؟"

"وہ اوپر گئی ہیں۔ میں نے منع کیا تھا جی۔ وہ نہیں مانیں۔ انھوں نے ہی کہا تھا کہ... کہ..." اس نے اتنا کہہ کر سر جھکا لیا اور دوپٹے کے پلو کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔

"کیا کہا تھا؟" وقارالحسن نے سختی سے پوچھا۔

"انھوں نے کہا تھا کہ اگر اس دوران میں آپ آجائیں تو... میں دروازہ جلدی نہ کھولوں۔ انھیں آواز دے کر بتا دوں پھر دروازہ کھولوں۔ میں نے انھیں آوازیں دیں... بہت آوازیں دیں مگر... پتا نہیں... کیا ہوا۔ وہ نہیں آئیں۔"

"اوہ..." وقارالحسن اور شرف الدین دونوں ہی یہ سن کر بوکھلا گئے۔ وقارالحسن تیزی سے ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا جو بڑے برآمدے کی دوسری طرف سے اوپر جاتی تھیں۔ اندرونی حصے والی سیڑھیاں تو بند تھیں۔ وقارالحسن جانتا تھا کہ وہاں سے جانے کے سوا کوئی راستہ اوپر جانے کا نہیں ہے۔ شرف الدین بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ ابھی سیڑھیوں کے قریب ہی پہنچے تھے کہ کوثر نیچے آتی ہوئی دکھائی دی۔ لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر رنگ سا لہرایا اور پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"کیوں گئی تھیں تم اوپر؟" وقارالحسن اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔ "اب کوئی نیا چکر شروع کرنا ہے کیا؟"

"میں وہاں کام سے گئی تھی۔" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"وہاں کوئی کام نہیں ہے تمھارا۔ خدا کے واسطے تم گھر والوں پر رحم کرو۔ ہم ابھی ایک ہی پریشانی سے نہیں نکلے اور تم..."

"وقارالحسن! میں انھی پریشانیوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہوں۔ تم بے وجہ الٹی سیدھی باتیں نہ کرو۔"

"پریشانیوں سے نکلنے کا راستہ اوپر تلاش کرنے گئی تھیں تم...؟" وقارالحسن نے طنز کیا۔

"ہاں..." اتنا کہہ کر کوثر کچھ دیر تک وقارالحسن کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے شرف الدین کی طرف دیکھا اور بولی۔ "تم ہی اسے سمجھاؤ۔ یہ چاہتا ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالے بغیر انگارہ اٹھا لے۔ سمندر میں اترے بنا ہی تہ میں بیٹھا موتی نکال لے۔"

"زیادہ ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وقارالحسن نے چڑ کر جواب دیا۔ "یہ بتاؤ کہ اوپر جانے کا مقصد کیا تھا؟"

پہلے تو کوثر نے گہرا سانس لیا پھر بولی۔ "مجھے سوامی جی کی تصویر چاہیے۔"

"کیوں؟" وقارالحسن بپھر گیا۔

"وقارالحسن! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس حویلی کو اور یہاں کے لوگوں کو چاند کی قید سے آزاد کرنے کے لیے ہمیں ہر حال میں سوامی جی تک پہنچنا ہے۔ ان تک پہنچے بغیر ہم اس قید سے رہائی کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کی حالت دیکھ کر بھی تمھیں ترس نہیں آیا؟ ان لوگوں کا جرم کیا ہے...؟ کیا کیا ہے ان لوگوں نے جو انھیں اتنی کڑی سزائیں دے رہا ہے وہ بڈھا۔ میں اسے چھوڑوں گی نہیں وقارالحسن... اسے ڈھونڈ کر اس کے کرتوتوں کی سزا دے کر ہی رہوں گی اور سن لو... کہ میں اس کنویں سے شکنتلا کی لاش بھی نکالوں گی۔ اس پرکاش کی ہڈیاں تک اکھاڑ کر پھینک دوں گی۔ میں اس حویلی سے ان لوگوں کی ایک ایک نشانی اکھاڑ پھینکوں گی۔"

وہ سخت طیش کے عالم میں بول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ "میں گھر والوں کو سکون دیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ اپنے لیے اس وقت تک کچھ نہیں سوچوں گی جب تک اس حویلی کو اس ان دیکھے خوفناک جال سے نکال نہیں لیتی۔"

"کوثر... کوثر... ہوش میں آؤ... یہ... یہ سب کچھ تو میں بھی چاہتا ہوں مگر اس طرح جذباتی ہو کر کچھ بھی کرنے سے کوئی بھی قدم اٹھانے سے حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں۔" وقارالحسن اس کی حالت دیکھ کر نرم پڑ گیا۔ ویسے بھی وہ کوئی غلط بات نہیں کر رہی تھی۔ میں اس کے ولولے سے خوش ہوا تھا۔ خود وقارالحسن تو اتنی شکتی اور طاقت حاصل کرنے کے باوجود کوئی ایک سمت اختیار نہیں کر سکا تھا۔ نہ اس نے کسی بھی سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت کی تھی۔ اب کوثر کے عزائم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ میں اپنے معاملے میں بھی کوثر سے مدد کا خواہش مند تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جس شہد کو میں چکھ چکا تھا اسے سیر ہو کر پینا ہی میرا مقصد بن گیا تھا مگر میں وقارالحسن کے کام بھی آنا چاہتا تھا۔ میں دل سے ان لوگوں کے دکھ دور

کرنے کا خواہش مند تھا۔

کوثر بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ وقارالحسن چاہتا تو اسے بتا دیتا کہ سوامی جی اور مرزا صولت بیگ کی وہ تصویر اس کے کمرے میں ہے، وہ اب سے کافی عرصہ پہلے جب پہلی بار گھر والے اس کے باوا کی برسی کے بعد مراد آباد گئے تھے۔ وہ تصویر حاصل کر چکا تھا مگر وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ یوں جذبات میں آکر فیصلہ کرنا اسے پسند نہ تھا۔ وہ اور شرف الدین اسے کسی نہ کسی طرح ٹھنڈا کر کے لے آئے۔ پہلے وقارالحسن نے اس سے گھر والوں کی خیریت پوچھی پھر شرف الدین کو آنکھ سے کوثر کی باتوں میں لگائے رکھنے کا اشارہ کر کے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اماں اس کی منتظر تھیں۔ تایا اور تائی اپنے کمرے میں تھے۔ اب وہ کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ تائی کو چچی سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے گئی تھیں۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ تائی کوثر کو پہچان گئی ہیں مگر دوسروں کے سامنے یوں ظاہر کر رہی ہیں جیسے وہ اب بھی اپنے حواسوں میں نہیں ہیں۔ یہ بات اماں نے وقارالحسن کو بتائی تھی۔ انھوں نے ہی چچی کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی جٹھانی کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ، شاید یہ کوثر سے لپٹ کر، جی بھر کر بولیں تو اچھی ہو جائیں۔ تایا بھی وہیں چلے گئے تھے۔ تایا نے اب تک کوثر سے بات نہیں کی تھی بلکہ صرف دیکھتے ہی رہے تھے۔ نہ کوثر نے ہی ان سے ایسی کوئی بات کی جس سے ماضی کے ڈانڈے ملتے۔ وہ انتہائی فرماں بردار اولاد کی طرح خاموشی سے ان لوگوں کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے تو اماں اور جہانی آپا وغیرہ کی بھی اتنی دیکھ

میں اکتا گیا، یکایک مجھے خیال آیا کہ مجھے کوثر کو اشاروں میں ہی سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ وہ ذہین لڑکی تھی ممکن ہے میری بات سمجھ جاتی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے وقارالحسن کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ میری بے چینی پر وقارالحسن میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں کوثر کی باتیں سن کر اسے بتاؤں گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ سچ ہے بھی یا یونہی ڈراما ہے۔ وقارالحسن جانتا تھا کہ کوثر بنیادی طور پر بے حس اور خود غرض ہے اس لیے اس کی طرف سے کچھ زیادہ مطمئن بھی نہ تھا۔ میری تجویز اسے پسند آئی اور اس نے مجھے مسلسل اسے کریدنے پر مامور

بھال کی کہ اماں کا دل نرم ہو گیا تھا۔

اماں کے پوچھنے پر وقارالحسن نے انھیں بتایا کہ وہ شرف الدین سے غصہ ہو کر اسے جھاڑنے گیا تھا مگر وہاں بات ہی الٹی نکلی۔ پھر اس نے انھیں وہ سب کچھ بتایا جو شرف الدین نے بتایا تھا۔

"مجھے بھی یہی خیال آیا تھا۔ دروازہ تو یوں بند ہو گیا تھا کہ ہم چاہتے بھی تو اسے نہیں کھول سکتے تھے۔ لیکن ہمیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہاں کوئی آیا ہو یا کسی نے باہر سے کنڈا بجایا ہو۔" اتنا کہہ کر اماں گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

"اماں! کیا آپ ان حالات میں بھی یہاں رہنے کے لیے تیار ہیں۔ اسی وجہ سے تو میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ یہاں آئیں۔" وقارالحسن نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ یہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" انھوں نے کمزور آواز میں کہا پھر چھت کو تکنے لگیں۔ "کیسے کیسے حالات میں گزارا کر لیا تھا میں نے سوچا تھا اب اس سے زیادہ کیا ہوگا مگر... یہاں تو جان کے لالے پڑ گئے۔" وہ پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں۔ "پانی کا کیا ہوا... کیا اب نلکوں سے خون آنا بند ہو گیا؟" اماں نے اچانک چونک کر پوچھا۔

"آں... ہاں... پتا نہیں اماں۔" وقارالحسن بوکھلا گیا۔ "میں دیکھتا ہوں۔ صبح تو پانی نہیں آرہا تھا۔ میں نے سقے سے چار مشکیں ڈلوالی تھیں۔ اب آپ فکر نہ کریں۔ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ یہاں کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔"

"یہ... کوثر... ان کے کیا ارادے ہیں؟" اماں کے لہجے میں شک اتر آیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ویسے وہ ہماری مدد کر رہی ہے۔ وہ جو کچھ سیکھ چکی ہے اس سے کام لے کر یہاں کے حالات درست کرنے کا اعادہ کر چکی ہے۔ فی الحال ہمیں اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیے اماں! وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اماں لیکن جو حالات ہمارے ساتھ گزر رہے ہیں ان میں اس کا علم ہمارے لیے بڑی ڈھارس ہے۔ وہ بہت طاقت حاصل کر چکی ہے۔"

وقارالحسن میرے حساب سے فضول باتیں کر رہا تھا۔

کر رہا۔ گویا اب میدان میرے لیے صاف ہو گیا۔ میں نے ذرا بھی دیر نہ کی اور وہاں سے شرف الدین اور کوثر کے پاس پہنچ گیا۔ کوثر کے عین سامنے پہنچا تو وہ ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں جوش اور تجسس تھا۔

"پھر۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟" شرف الدین نے اسے خاموش ہو کر خلا میں تکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"میں بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔" وہ ایک دم اکتائے ہوئے انداز میں بولی تو شرف الدین حویلی کے اس حصے کی طرف چل پڑا جہاں رشید چاچا اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ قیام پذیر تھے۔

اس کے جاتے ہی میں نے اشاروں میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میرے قریب آ گئی۔ پر تجسس نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ جان چکی تھی کہ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر شاید وہ میری بات نہیں سمجھی تھی۔ اس کی آنکھوں کی الجھن میرے شبے کو تقویت دے رہی تھی۔

"کیا تم بول سکتے ہو؟" وہ میرے اشاروں کو نہ سمجھ سکی تو بولی۔

میں نے سر کے اشارے سے بتایا کہ میں بول سکتا ہوں مگر وہ میری بات نہیں سن سکتی۔

"کتنا بے وقوف ہے یہ وقار۔" وہ سہلا کر بڑبڑائی۔

اتنا سنتے ہی میں نے زور زور سے سر ہلایا۔

"تم مجھ سے متفق ہو؟" اس نے پھر سوال کیا۔

میں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم اگر مجسم ہو گئے۔ انسانی روپ میں آ گئے تو۔۔۔ تو کتنا فائدہ ہو گا' اس کا وقار الحسن کو احساس ہے اور نہ وہ اس پر کچھ سوچنے کو تیار ہے۔" اس نے تاسف سے کہا۔ وہ رفتہ رفتہ اسی موضوع پر آ رہی تھی بالآخر وہ میری بات جان گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مجسم ہونا چاہتا ہوں میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ اندازہ لگاتے ہی کہ میں مجسم ہونا چاہتا ہوں وہ سمجھ گئی کہ میں اس بات کو فی الحال وقار الحسن سے بھی مخفی رکھنا چاہتا ہوں' پھر بھی اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے لیے مزید طاقت حاصل کرنے کی خاطر جاپ کرے گی اور میں یہ بات وقار الحسن کو نہ بتاؤں۔ میں خوش ہو گیا میں نے اشارے سے کہا کہ وہ اس کام کو جتنی جلدی ہو سکے کر ڈالے۔ اس نے بھی جلد ہی جاپ

کرنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ میری آواز سننے کو بے چین تھی۔ بہت سے معاملات میں ڈسکس کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے کھل کر کہہ دیا کہ پہلے وہ جاپ کرے گی تاکہ وہ میری بات سن سکے۔ اس کا خیال تھا کہ مجسم ہونے سے پہلے ہی مجھے چند معاملات میں اس کی شرطوں کو ماننا ہو گا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی شرائط کیا اور کس قسم کی ہوں گی۔

میں نے ہامی بھر لی اور اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ آج ہی جاپ شروع کر دے گی۔ وقار الحسن اس پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتا تھا۔ شرف الدین' تایا' اماں اور تائی کی حالت کو دیکھ کر خوف زدہ تھا۔ اس نے دبے دبے الفاظ میں وقار الحسن سے شنو آپا اور جہانی آپا کی خیریت بھی دریافت کی' وقار الحسن نے اسے ان لوگوں سے ملانے کی بجائے تسلی دے دی مگر اس کے انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ وقار الحسن کے صرف تسلی دینے سے مطمئن نہیں ہے۔

بعد کے حالات کی تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ امروہہ کی حویلی میں دن جس طرح گزرے وہ کافی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ وقار الحسن بے پناہ پریشان رہا۔ وہ بار بار یہاں سے جانے کا فیصلہ کرتا اور خود ہی رد کر دیتا۔ گھر والے آہستہ آہستہ رو بہ صحت تھے۔ وقار الحسن نے حکیم علی احمد کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ سب ہی کا علاج کر رہے تھے جو صرف طاقت کی معجونوں تک محدود تھا۔ سب لوگ سہمے ہوئے تھے مگر وقار الحسن اور کوثر کی آمد نے کافی ڈھارس بندھائی تھی پھر چاچا چچی بھی بڑی آس تھے۔ چچا نے تو تایا کا پیچھا پکڑ لیا تھا کہ واپس مراد آباد چلیں۔ اماں کو سمجھایا تھا کہ مراد آباد میں ہمارے ساتھ رہیں یا چاہیں تو اپنے خریدے ہوئے مکان میں منتقل ہو جائیں مگر یہاں نہ رہیں۔ گزرتے ہوئے حالات نے اماں کے حوصلے بھی کسی حد تک پست کر دیے تھے۔ وہ ایسا سن کر کچھ نہ کہتی تھیں۔ ان کے بہتر ہونے کے بعد جو باتیں معلوم ہوئی تھیں ان کا لب لباب یہی تھا کہ یہ سب کچھ پچھلی چاند کی چودھویں رات کو شروع ہوا تھا جبکہ اس سے قبل کی چودھویں رات کی خوفناکی صرف اوپر کی منزل میں آگ لگنے کی حرکت ہی تک محدود رہی تھی۔ سویرے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

وقار الحسن بھی اب سنجیدگی سے مراد آباد جانے کی سوچ رہا تھا۔ شرف الدین نے بھی اسے یہی صلاح دی تھی کہ

۔۔۔ وجہ خطروں سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ اس نے ۔۔۔ الفاظ میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ وہ آپس کے ۔۔۔ کو جلد ہی مضبوط بندھن میں بدلنا چاہتا ہے۔ یوں ۔۔۔ سے ملاقات نے وقار الحسن کو بھی بے خود کر دیا ۔۔۔ خود بھی اس کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ۔۔۔ بھی یقیناً ایسا ہی چاہتی تھیں مگر چپ تھیں۔ یہ سب ۔۔۔ ل رہا تھا۔ لوگ کچھ سوچ رہے تھے اور کچھ اور ۔۔۔ تھے مگر میں اپنے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ میں زیادہ تر ۔۔۔ کے ارد گرد چکراتا رہتا تھا۔ اس نے وعدے کے ۔۔۔ ن جاپ شروع کر دیے تھے۔

۔۔۔ ں نے وقار الحسن سے سوامی جی کی تصویر بھی مانگی اور ۔۔۔ چھوڑنے کی مخالفت بھی کی۔ وہ یہاں رہ کر حویلی کو ۔۔۔ کی قید سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ کوثر کی طاقت اور ۔۔۔ بند کی موجودگی وقار الحسن کو بھی یہ سوچنے پر مجبور ۔۔۔ ہی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی مگر وہ ۔۔۔ تایا اور چچا کو اس سلسلے میں کیا جواب دیتا جو اسے ۔۔۔ طور پر امروہہ چھوڑ دینے کو کہہ رہے تھے۔ وقار الحسن ۔۔۔ ک خیال یہ بھی آیا کہ وہ کوثر کو یہیں چھوڑ دے اور باقی ۔۔۔ کو لے کر مراد آباد چلا جائے مگر وہ جانتا تھا کہ تایا' ۔۔۔ چچا کوئی بھی اس کی تجویز سے متفق نہیں ہو گا۔

۔۔۔ وقار الحسن کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ صرف شرف ۔۔۔ ن ہی یہاں ایسا تھا جس سے وہ کوئی بات نہیں چھپاتا ۔۔۔ اس روز بھی اس نے شرف الدین کو اپنے خیالات ۔۔۔ آگاہ کیا تو وہ بول اٹھا۔

"تم تایا کو کوثر کے بارے میں تمام حقیقت بتا دو۔ مجھے ۔۔۔ ہے کہ وہ بہتر فیصلہ کریں گے۔ کوثر کے معاملے کو آخر ۔۔۔ سے کب تک چھپاؤ گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی بیٹی ۔۔۔ ر علوم میں دلچسپی لیتی رہی ہے۔ اتنے عرصے گھر سے ۔۔۔ رہ کر اس نے ظاہر ہے یہی کچھ کیا ہو گا۔ وہ بیش بند ۔۔۔ تایا کو دکھا دو۔ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شرف الدین مگر۔۔۔"

"تم چاہو تو میں ان سے بات کرتا ہوں۔ دیکھو ۔۔۔ الحسن' یہ معاملات ایسے نہیں رہے ہیں کہ تم اپنے ۔۔۔ رکھاؤ کے چکر میں انھیں نظر انداز کرو۔ خود ۔۔۔ سہ اگر ان چکروں میں پھر کسی کی جان چلی گئی تو؟"

۔۔۔ میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔ کوثر بضد ہے کہ وہ

یہیں نہیں جائے گی۔ وہ سوامی سے جنگ کا اعلان کر چکی ہے مگر۔ میں اس کی جان بھی داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ خاص طور پر اس صورت حال میں کہ تائی ابھی تک سب سے بیگانی ہیں۔"

"یہی تو موقع بہتر ہے۔" شرف الدین نے پر جوش انداز میں کہا۔ "اگر تائی کو ہوش آ گیا تو کیا وہ دوبارہ اس کی جدائی کو برداشت کریں گی؟ میرے خیال میں تو اس وقت کوئی بھی تمہاری اس تجویز سے متفق نہیں ہو گا۔"

بات وہ بالکل ٹھیک کر رہا تھا۔ وقار الحسن چند لمحے سوچتا رہا۔ میں نے بھی اسے اکسایا اور کہا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ اس وقت وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ سچی بات یہ تھی کہ اس طرح مجھے بھی بہت فائدہ تھا۔ وہ میرے لیے بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے وقار الحسن سے کہا کہ اگر وہ میرے لیے کچھ کر لیتا تو میں کوثر کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ یہاں رہ سکتا تھا۔ وہ تو میں اب بھی کر سکتا ہوں مگر اس وقت میں صرف اسے یہاں کے حالات سے باخبر رکھ سکتا ہوں۔ یعنی اگر وہ سب کو لے کر مراد آباد چلا جائے' کوثر یہاں رہ جائے تو میں صرف چند لمحوں میں ہی اس تک پہنچ کر یہاں کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہوں۔

میں نے اور شرف الدین نے اسے بری طرح گھیر لیا تھا۔ وہ اماں کی وجہ سے سخت پریشان تھا' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بھی ہمت ہار بیٹھی تھیں اور انھوں نے بھی چچا کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ دو جوان لڑکیوں کی موجودگی میں وہ یہاں رہ کر مزید خطرات مول نہیں لے سکتیں' پھر ان کی وجہ سے تایا یا تائی کو کچھ ہو گیا تو وہ خود کو ساری زندگی معاف نہیں کر سکیں گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ حویلی چھوڑ دی جائے۔

وقار الحسن کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آج تایا سے بات کرتے ہیں۔"

ان کے اس فیصلے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آپ مجھے بالکل ہی بدمعاش مت سمجھیے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے فائدے کے چکر میں تھا مگر وقار الحسن یا اس کے گھر والوں سے میرا جو ناتا تھا وہ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ بس مجھے وقار الحسن کے نظریات سے اختلاف تھا۔ وہ آخرت کے چکر میں دنیا کو ضائع کرنا چاہتا تھا اور مجھے آخرت کی نہیں دنیا

کی فکر تھی۔ میرے اندر دنیا کی کشش خدا نے کچھ اس قدر رکھی تھی کہ میں اس سے کنارہ کش ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بڑی صاف گوئی سے اتنا ضرور کہوں گا کہ وقارالحسن مضبوط کردار کا آدمی تھا جو مجھے کئی بار شکست دے چکا تھا اور اب بھی مجھے مسلسل دبا کر رکھنا چاہتا تھا۔ میرا مشن یہی تھا کہ میں وقارالحسن کو دنیا کی لذتوں سے آشنا کردوں اور کچھ اس طرح سے کروں کہ وہ گناہ ثواب کے چکر سے نکل جائے۔
ہاں، تو میں بتا رہا تھا کہ ان کے فیصلے سے میں خوش ہوگیا۔ کوثر کو جاپ کرتے ہوئے دو روز ہوگئے تھے۔ وہ یا تو گھر والوں میں گھری رہتی' ان کی خدمتیں کرتی رہتی یا پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر جاپ کرتی رہتی' یوں میری اس سے تنہائی میں ملاقات نہ ہو سکی اور میں یہ بات نہیں جان سکا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور اس کے نتائج کب تک سامنے آئیں گے۔

اسی رات وقارالحسن' حکیم علی احمد کو چھوڑ کر واپس آیا تو شرف الدین حویلی کے باہر اس کا منتظر تھا۔ میں وقارالحسن کے ساتھ ہی تھا۔ میں تایا سے بات چیت کے دوران میں اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا ورنہ بعد میں تو وقارالحسن کے دماغ سے کچھ نکال لینا ناممکن ہی تھا۔
گھر والے کھانا کھا چکے تھے۔ اب تک جہانی آپا اور شنو آپا بھی صحت پا چکی تھیں۔ کمزوری ابھی باقی تھی مگر وہ حالت نہیں تھی کہ دو قدم بھی نہ اٹھا پاتی ہوں۔ وہ سب سوائے اماں کے' کوثر کی خدمت دیکھ کر خوش تھے۔ تائی اب بھی اپنے خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھیں۔ شنو آپا اور جہانی آپا نے کئی بار دبے دبے انھیں کہا بھی کہ تائی آپ کی کوثر واپس آگئی ہے مگر وہاں تو لگتا تھا جیسے برف سی جمی ہے جو پگھلنے کا نام تک نہیں لے رہی تھی۔ وقارالحسن فی الوقت ایسی کوشش نہیں کر رہا تھا' پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا۔ تایا اکثر تائی سے ماضی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اسے یاد دلاتے تھے کہ انھیں کوثر کے رشتے کے لیے جانا ہے۔ شاید وہ بھی تائی کے دماغ میں جم جانے والی برف کو پگھلانا چاہتے تھے۔ شرف الدین اور وقارالحسن تایا کے کمرے میں پہنچے تو وہ تائی سے باتیں کر رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے۔ "وقارالحسن سے پوچھ لو۔"
"کیا تایا؟" وقارالحسن نے وہاں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"میں کہہ رہا تھا کہ گاجر گوشت کوثر نے پکایا ہے۔ بڑے مزے کا ہے۔ انھوں نے کھا تو لیا مگر بچی کی تعریف نہیں کی۔ اب کہتی ہیں سیدہ نے پکایا ہے۔"
"نہیں تائی' سالن واقعی کوثر نے پکایا ہے۔ آپ نے تو کوثر کو کچھ سکھایا نہیں تھا۔ دیکھیے اماں نے کتنی جلدی کھانا پکانا سکھا دیا۔" وقارالحسن نے پیار سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ پلنگ پر ایسی پوزیشن میں بیٹھی تھیں جیسے انھیں ابھی ابھی کہیں جانا ہے۔
"ہاں اور کیا۔" تایا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں کرب زیادہ تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑے بدنصیب تھے' بیٹی واپس آگئی تھی مگر وہ خوش ہونے سے پہلے کچھ تو اماں کے آگے شرمندگی کا احساس' کچھ اماں کی ناپسندیدگی کا بھی انھیں احساس تھا پھر بیوی جو بیٹی کی جدائی میں پاگل ہوئی تھی اس پر بیٹی کی صورت دیکھنے کے باوجود کچھ اثر نہ ہوا تھا۔
شرف الدین کو یہ دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا کہ تایا اب بھی دکھی ہیں۔
"تائی۔ آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔" وقارالحسن نے دھیرے سے کہا۔
تایا نے یہ سن کر' چونک کے وقارالحسن کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ وقارالحسن تائی کو کمرے سے بھیجنا چاہتا ہے۔
"ارے بیوی۔ بڑے روز ہوگئے تمھارے ہاتھ کا بنا ہوا پان نہیں کھایا۔ ذرا پان تو بنا دو۔ کچھ منہ کا ذائقہ ہی بدل لیں گے۔" تایا نے بھی انھیں کمرے سے بھیجنے کے لیے کہا۔
"ارے میں تو بھول گئی۔" تائی ایک دم کھڑی ہوگئیں۔ "مجھے تو عقیلہ کے گھر جانا ہے۔ وہاں کوثر کے سسرال والے ہوں گے۔ وہیں بات کروں گی کہ آخر کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ اتنے روز ہوگئے ہم نے بیٹی اس لیے تھوڑی بیاہی تھی کہ برسوں اس کی صورت کو ترستے رہیں۔ بھلا بتاؤ تو سہی' اتنے دن ہوگئے' کوثر کو بھیجا ہی نہیں۔" وہ سخت غصے میں آگئیں۔ انھوں نے پورا کمرا چھاننا شروع کردیا۔ ہر بستر کے نیچے' دو بکسوں کے اندر وہ پتا نہیں کیا ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔
"کیا تلاش کر رہی ہو؟" تایا نے پوچھا۔
"اے برقع رکھا تھا۔ ایک تو یہ کمبخت ماری میرا برقع پتا نہیں کہاں پٹک دیتی ہے۔ کہہ چکی ہوں کہ اسے میرے پائنتی رکھ دیا کرو کیا پتا کب جانا پڑ جائے۔"

"اب اسے کون سنبھالے گا۔" تایا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور سر تکیے پر یوں ٹکا دیا جیسے ان میں بیٹھے رہنے کا دم ہی نہ رہا ہو۔
"آپ پریشان نہ ہوں تایا۔ میں اماں سے کہہ دیتا ہوں سنبھال لیں گی۔" وقارالحسن اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ میں کمرے میں آنے کے بعد ہی باہر نکل آیا تھا۔ وقارالحسن کچھ دنوں سے مجھ سے کافی مطمئن تھا اس لیے میرے باہر جانے یا لوٹ آنے پر بے چین نہیں ہوا کرتا تھا نہ ہی مجھے گھورتا تھا۔ شگفتہ والے واقعے کے بعد سے وہ میرے سلسلے میں کچھ نرم ہوگیا تھا۔
"جاؤ دیکھو سیدہ کے کمرے میں ہوگا تمھارا برقع۔" تایا نے کہا تو تائی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کچھ دیر اثبات میں سر ہلاتی رہیں پھر تیز قدموں سے باہر چلی گئیں۔ "کلیجہ چھلنی ہوگیا۔" تایا نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بیٹی لوٹ آئی مگر اب تک اسے سینے سے لگا کر پیار نہیں کرسکا کہ پہلے اس کی ماں کا حق ہے۔ اس نے تو خون پلا کر پالا تھا' اس کو زیادہ محبت تھی جبھی تو حواس کھو بیٹھی۔ اب وہ سینے سے لگا کر پیار کرلے تو میں بھی دل میں بھرا طوفان نکال لوں مگر۔" وہ چند لمحے کو خاموش ہوگئے' کمرے میں بوجھل سی خاموشی طاری ہوگئی۔ "اولاد نافرمان ہو' دکھ دے یا بدنامی' اس کی محبت کم نہیں ہوتی۔ آدمی سوچ بھی لے کہ اب اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں مگر۔۔۔ یہ دل۔۔ یہ خون کی روانی چین نہیں لینے دیتی میری بیٹی بھی۔۔۔ وہ بھی نادان تھی نالائق نکلی۔ بدنامی بھی دی اور دکھ بھی دیا مگر۔۔۔ مگر میں کیا کروں؟ اس لمحے بات کرنے کے لیے' اسے سزا دینے کے لیے مجھے یہ دل۔۔ دل ہی نکالنا پڑے گا اور یہ دل۔۔۔" وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں گدلے پانی کے چند قطرے ٹھہر گئے تھے۔
"تایا۔۔۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں نہ آپ کا کوئی قصور تھا نہ کوثر کا۔ جن حالات سے یہ خاندان شروع ہی سے دوچار ہے اس نے کوثر کے دماغ کو بھی اپنی گرفت میں رکھا۔" شرف الدین نے آگے بڑھ کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ٹھیک ہے کہ وہ اس وقت حویلی میں نہ تھی مگر خاندان والوں پر گزرنے والے عذابوں سے ناواقف تو نہیں تھی' بڑی پھوپی اور پھوپا کی موت نے اس کے دل پر اثر نہیں کیا ہوگا؟ کیا دادی کی موت پر اسے دکھ نہیں ہوا ہوگا' کیا بڑے مرزا صاحب کی انہونی موت نے اس پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا ہوگا' وہ معذور تھی لیکن جسم سے' ٹانگوں سے معذور تھی' دماغ سے نہیں کہ اسے پتا چلتا اور نہ ہی اس پر کسی بات کا اثر ہوتا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ معذور ہے تو حالات سے اس کا کوئی واسطہ رہا نہ لگاؤ۔ انھی چیزوں نے اسے ایسے علوم میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا ہوگا تایا اور۔۔۔ اور آپ نہیں جانتے۔ وہ کتنی طاقت حاصل کرچکی ہے' آپ کو نہیں پتا۔" آخر میں شرف الدین نے اشارۃً انھیں کوثر کے بارے میں بھی بتا دیا تاکہ اس موضوع پر باقاعدہ بات شروع ہو تو انھیں اچنبھا نہ ہو۔
"ہاں بیٹا۔" انھوں نے گہرا سانس لیا اور شرف الدین کا بایاں ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں میں تھام لیا۔ "یہ بات تو اولاد والے بھی نہیں سمجھتے کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اسے سزا دوں۔" پھر وہ بات کرتے کرتے ٹھٹک گئے۔ "کیا۔ کیا کہہ رہے تھے تم؟ وہ۔۔۔ وہ طاقت حاصل کرچکی ہے؟ کیسی طاقت۔۔۔ وہ کتنی ہی طاقتور ہوجائے بیٹا! ہماری رسموں اور رواجوں سے' ہماری روایات سے زیادہ طاقتور نہیں ہوسکتی۔"
"نہیں تایا۔ آپ سمجھے نہیں' وہ واقعی بہت طاقت حاصل کرچکی ہے۔ بیٹا۔۔۔ وہ اس حویلی کو چاند کی قید سے آزاد کرا سکتی ہے اور۔۔۔"
ابھی اس نے بات پوری نہیں کی تھی کہ وقارالحسن اندر داخل ہوا۔ اس نے سن لیا تھا کہ شرف الدین تایا کو کوثر کے بارے ہی میں بتا رہا تھا۔
"نہیں بیٹا۔۔۔ اول تو ایسا ہونا ناممکن ہے' ہوسکتا ہے اس نے ایسی کوئی کہانی سنائی ہو۔ وہ مجھے نفسیاتی مریضہ لگتی ہے۔ تمھاری تائی کے علاج سے فارغ ہولوں تو اس کا بھی علاج کراؤں گا' یوں بھی اس نے ایسی کون سی طاقت پائی ہوگی۔" انھوں نے پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
"شرف الدین ٹھیک کہتا ہے تایا۔" وقارالحسن نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا پھر کچھ دیر کو چپ ہو کر ان کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ تایا نے پہلے تو اسے سرسری انداز میں دیکھا پھر اس کے دیکھنے اور چپ ہوجانے کے انداز نے انھیں بے چین کردیا۔
"کیا مطلب ہے تمھارا؟" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

شرف الدین نے آگے بڑھ کر گاؤ تکیے ایسے رکھ دیے کہ وہ ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ سکیں۔

"وہ واقعی بہت طاقت حاصل کر چکی ہے' تایا۔ میں اس موضوع پر فی الوقت آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب ایسا لگتا ہے کہ آپ کو بتائے بنا کچھ بھی کرنا محال ہوگا۔"

"وقار الحسن' دل بڑا کمزور ہو چکا ہے بیٹا۔ پہیلیاں بوجھنے کے چکر میں دماغ پر زور ڈالا جاتا ہے اور نہ بدنامی سہنے کا ہی یارا رہا ہے۔ ایسی باتوں سے دل ہولنے لگتا ہے۔ صاف صاف بتاؤ کہ۔"

دیکھیں تایا میں اور شرف الدین اس مسئلے پر اچھی طرح سوچ بچار کر چکے ہیں۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو اعتماد میں لے کر ہم آسانی سے مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ حویلی ہمارے بزرگوں کی نشانی ہے۔ پھر بھی میں اس سے دستبردار ہونے کو تیار تھا۔ یہ شرط کہ ہماری ان عذابوں سے جان چھوٹ جاتی مگر ایسا ہونا ممکن نہیں لگتا۔"

اتنا کہہ کر وقار الحسن نے دھیرے دھیرے تایا کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے خاص طور پر شگفتہ والی وہ بات بتادی کہ اس خاندان کو چاند کا قیدی بتانے والی شگفتہ کی روح نہیں بلکہ سوامی جی ہیں جو نہ معلوم کہاں بیٹھ کر مرزا صولت بیگ کی پشتوں سے بدلہ لے رہے ہیں۔ اس نے کوثر کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا۔ یہ سن کر کہ کوثر نے سادھو کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسے شکست دے دی' وہ حیران ہوگئے۔ ان کے چہرے پر کئی رنگ لہراتے رہے۔ کبھی ان کا چہرہ دمک اٹھتا اور کبھی تاریک سائے سے پھیلتے محسوس ہوتے۔

تمام تفصیل سن کر وہ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبے رہے اس دوران میں وقار الحسن اور شرف الدین دم سادھے انھیں دیکھتے رہے۔ وقار الحسن کا دل تو زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تایا جو بھی فیصلہ کرتے اسے ماننا پڑتا اس لیے وہ زیادہ پریشان تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ تایا بات کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے ایسا فیصلہ کریں جس سے عذابوں میں کمی ہونے کا امکان ہو تو بہتر ہے' ورنہ ان آفتوں سے جان چھوٹنا ممکن نہیں تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" انھوں نے سر اٹھایا تو ان کے چہرے پر کرب ہی کرب تھا۔

"آپ جو حکم کریں گے تایا ہم مانیں گے۔ ہم نے ساری صورتحال آپ کو بتادی ہے۔ اب فیصلہ کرنا نہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم آپ کی صلاح کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتے۔" وقار الحسن نے تمام ذمے داری ان پر ڈال کر انھیں مزید فکر مند کردیا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" انھوں نے اس بار شرف الدین سے پوچھا۔

"تایا۔ یہ عذاب کم ہونے والے نہیں لگتے اور شگفتہ بھی ہماری مدد کو نہیں آسکتی۔ سوامی جی کا توڑ ہمارے کیا' کسی کے بس میں بھی نہیں ہے۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ کوثر کو اجازت دے دی جائے۔ سوامی جی کی تصویر مانگ رہی تھی۔ مجھے قوی امید ہے کہ اس مسئلے کو حل کر دے گی۔" شرف الدین نے [illegible] ہوئے کہا۔

"یہ۔ کوثر۔ یہ کیا بن گئی ہے وقار! اتنی سیدھی سادی' معصوم سی لڑکی جس نے دنیا بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ کرلے۔" انھیں شاید کوثر والی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا۔

"تایا' اگر آپ کہیں۔ آپ تیار ہوں تو میں کوثر کو بلا سکتا ہوں۔ وہ پیش بند اس کے گلے میں ہے۔ اس کی پیش بند کے محافظ اس کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ وہ بڑے خوفناک سانپ ہیں تایا۔"

"یہ۔ یہ تماشے ہیں وقار الحسن' سب شعبدے بازی ہوگی۔ وہ جو کتابیں پڑھتی تھی ان میں یہ سب جادو ٹونے نظر بندی کے طریقے تھے' ایسے شعبدے باز گلیوں میں بچوں کو جادو کے تماشے دکھایا کرتے ہیں۔"

"نہیں تایا۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ۔ آپ نہیں جانتے تایا جب وہ ہمیں ملی تھی تو اس کا جسم زخموں سے چور تھا اب۔"

"مجھے تمہاری باتوں سے خوف آ رہا ہے وقار الحسن۔"

"تایا پلیز۔ ہم آپ سے اس موضوع پر اسی لیے بات کر رہے ہیں کہ آپ ہماری بات پر سنجیدگی سے غور کریں گے' معاملے کی حقیقت اور سنگینی کو سمجھ کر کوثر کو اجازت دیں گے۔ گھر والوں کو آپ سنبھال لیں گے۔ لیکن ایسا تو تبھی اس وقت کر سکتے ہیں جب آپ خود حقائق کو تسلیم کر کے اپنے اندر مضبوطی بھی پیدا کریں۔"

"وقار الحسن۔ ان چکروں سے نکل چلو۔ میں اب اس عمر میں کسی کا بھی نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ بالکل نڈھال ہو گئے۔ شاید وہ جان گئے تھے کہ ہم ان سے کیا کہنے والے ہیں۔

"مگر تایا ہم یہاں سے کہیں اور جا کر بھی چاند کی قید سے نہیں نکل سکتے' اور میں تو یہ حصار ہی توڑنا چاہتا ہوں۔ آپ ہمت کریں تو ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ کوثر ہماری مدد کرے گی اور ہم جلد ہی ان عذابوں سے چھوٹ جائیں گے۔"

"نہ نہیں۔ نہیں تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" انھوں نے بے قراری سے کہا۔

تب وقار الحسن نے انھیں صاف صاف بتادیا کہ انھیں سب گھر والوں کے ساتھ مراد آباد جانا ہوگا۔ کوثر یہاں رہ کر عمل کرنا چاہتی ہے۔ وقار الحسن خود بھی مراد آباد جائے گا لیکن وہ جلد ہی واپس آجائے گا۔ شرف الدین کوثر کا خیال رکھے گا۔ جوں ہی حویلی چاند کی قید سے آزاد ہوئی وہ انھیں اطلاع کریں گے۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو وقار بیٹا۔ کوثر نے گھر سے جا کر جو کالک ہمارے سر پر تھوپی ہے وہ کم ہے بھلا کہ اب میں اسے اس خالی حویلی میں چھوڑ کر مراد آباد چلا جاؤں۔ کیا تم چھوٹی دلھن اور اپنی اماں کو نہیں جانتے ہو؟ خاندان کے دوسرے لوگ بھی ایک بار پھر کلیجہ چھلنی کرنے آجائیں گے کہ اب جوان بیٹی کو لونڈوں کے رحم و کرم پر خالی حویلی میں چھوڑ آئے۔"

"خاندان والوں کو نہیں معلوم کہ کوثر واپس آئی ہے یا نہیں' اماں کو میں سمجھا لوں گا' چچا چچی کو آپ اعتماد میں لینے کی کوشش کریں۔ اگر وہ لوگ اپنا منہ بند رکھیں گے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"اور تمہارے چچا چچی ہی خاندان بھر میں پھریرے اڑاتے پھریں گے۔ تم کیا ان سے واقف نہیں ہو؟"

اتنا کہہ کر تایا چپ ہوگئے۔ وقار الحسن اور شرف الدین بھی اپنی جگہ گہری سوچ میں گم تھے۔ تایا کی بات غلط نہیں تھی۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد مزید کچھ ہونے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ چچا چچی کے علاوہ اماں بھی مسئلہ بن سکتی تھیں۔ انھوں نے تو دو جوان بیٹیوں کی موجودگی کو ایک بڑا ایشو بنالیا تھا۔

"ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔" اچانک تایا نے گہرے سناٹے کو توڑ دیا۔

"کیا؟" وقار الحسن سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہ کہ۔ میں یہیں رک جاؤں۔ کوثر کے ساتھ میری موجودگی زیادہ بہتر ہے۔ تم ان لوگوں کو مراد آباد چھوڑ آؤ۔"

"ہاں۔ یہ تجویز قابل عمل ہے وقار۔" شرف الدین کھل اٹھا۔

وہ تینوں اس پر متفق ہوگئے۔ تایا نے کہہ دیا کہ وہ آج ہی بھائی سے بات کریں گے۔ اماں کو بھی انھوں نے قائل کرنے کی ہامی بھرلی پھر بھی وقار الحسن نے ان سے بات کرنا ضروری سمجھا۔ وہ اماں کی فطرت سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ انھیں مسئلے کی سنگینی کا احساس دلائے گا تو وہ بات ضرور سمجھ جائیں گی۔

میں وقت کا منتظر تھا۔ تمام فیصلے ہو جانے کے بعد ہی میں اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا میں نے بھی یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی رات وقار الحسن نے اماں سے بات کی۔ تایا کی طرح انھوں نے بھی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ کوثر کوئی بڑا تیر مار سکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ چند شعبدے سیکھ کر یہاں اکیلی رہنا چاہتی ہے تاکہ وقار الحسن پر اپنی باتوں کا جادو چڑھا سکے۔ وہ اب بھی اس نہج پر سوچ رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر وقار الحسن کو غصہ آگیا۔

"اماں آپ اتنے سنگین حالات سے گزر کر بھی اس طرح سوچتی ہیں؟"

"یہ حالات بھی میرے لیے کم سنگین نہیں ہیں۔ میں اسے پسند نہیں کرتی۔"

"میں بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ شگفتہ سے منگنی میں نے اپنی خوشی سے کی ہے اماں۔ شرف الدین میرا عزیز دوست ہے' آپ سوچ سکتی ہیں کہ میں اسے دھوکا دوں گا؟ اس معصوم لڑکی کو برباد کر دوں گا جو مجھ سے منسوب ہو چکی ہے۔ میرا خاندان ہی نہیں اس کا خاندان بھی یہ بات جانتا ہے۔ پلیز میرے لیے مسائل پیدا نہ کریں۔ آپ کی ناراضگی مول لے کر میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ زچ ہو گیا۔

"کرنا کیا چاہتے ہو؟" انھوں نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ کوثر یہاں رہ کر عمل کرے اور حویلی کو اس قید سے آزاد کرالے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ایسا کر سکتی ہے؟ تمہارے بادا

کی زندگی برباد ہوگئی اسی چکر میں۔ انھوں نے پتا نہیں کتنے سادھوؤں، سنتوں اور پیروں کے چکر لگائے۔ کتنے عامل حویلی لے کر آئے۔ جانے کتنے بکرے ذبح کر کے ان کا خون چھڑکا گیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا، سب کچھ ضائع ہوگیا۔ اب یہ کون سا تیر مار لے گی۔ عورت یوں بھی یہ سب کچھ نہیں کرسکتی۔ تم کچھ زیادہ ہی متاثر ہو رہے ہو۔"

"اماں۔۔۔ اماں آپ کو نہیں پتا کہ وہ کیا کیا کرسکتی ہے۔ میں اتنا عرصہ وہاں اس کے پیچھے خوار رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، آپ کو سب تو بتایا بھی نہیں۔ اچھا آپ ایسا کریں۔۔۔ میں کچھ دیر میں آپ کو تایا کے کمرے میں لے چلوں گا۔ آپ۔۔۔ آپ خود دیکھ لیجیے گا مگر۔۔۔ حوصلہ رکھیے گا۔ گھبرایئے گا نہیں۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا، ٹھیک ہے؟"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟ سیدھی طرح بتاؤ۔" اماں ناگواری سے بولیں۔

تب وقارالحسن نے پیش بند اور اس کے محافظ سانپوں والی بات بتادی۔ پہلے تو وہ حیرت سے منہ کھولے اس کی باتیں سنتی رہیں پھر گھبرا کر بولیں۔ "تو کیا اب تم یہاں کوئی نیا تماشا کرواؤ گے؟ اب یہاں سانپ آیا کریں گے؟ پتا نہیں تم لوگ کیا کرو گے، کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

"اماں خدا کے لیے آپ تو اس طرح کی باتیں نہ کریں۔" وقارالحسن جھنجلا گیا۔ "آپ تو اتنا کچھ دیکھ اور جان چکی ہیں۔ ویسے اگر آپ راضی نہیں ہیں تو پھر ٹھیک ہے، میں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہوں اور انتظار کرتا ہوں کہ کب موت کا پنجہ میری گردن دبوچے گا۔"

اماں کا رنگ سفید ہوگیا۔ وقارالحسن نے ان کے چہرے کو سفید ہوتے دیکھا تو پھر بولا۔ "ظاہر ہے، ہم چاند کے قیدی تو ہیں ہی، اب اس خاندان میں تین ہی مرد رہ گئے، تایا، چچا اور میں۔ میرے بعد ان کی باری ہے یا ان کے بعد میری۔ بہرحال اب آپ جہانی آپا کو فوری رخصت کرنے کا سوچیں اور شنو آپا کا بھی کہیں رشتہ طے کردیں۔ میں مرنے سے پہلے کم از کم ان دونوں کو تو ٹھکانے بیٹھا دیکھ لوں۔"

"ارے اللہ نہ کرے۔ کیوں ہولائے دے رہے ہو؟" اب ان کے ہاتھوں میں خفیف سی تھرتھری بھی پیدا ہو چکی تھی۔ "ٹھیک ہے۔ جو تم لوگوں کا جی چاہے کرو، دیکھ لیتا تایا

ہامی بھریں گے نہ چچا اور وہ تمھاری چچی۔۔۔ وہ تو اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتی پھریں گی پورے خاندان میں۔"

"آپ سب کو چھوڑ دیں۔ یہ مسئلہ سلجھانا میرا معاملہ ہے۔ تایا سے میں بات کرچکا ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ جبھی۔۔۔ وہ تو خیر اپنی اولاد کے معاملے میں خاصے آزاد خیال ثابت ہوچکے ہیں مگر میں۔۔۔ میں اولاد کو آپے سے باہر ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"آپ کی اولاد کو کچھ نہیں ہوگا اماں۔۔۔ لیکن اگر آپ اس انداز سے سوچتی رہیں تو انھیں نقصان ضرور ہوگا۔ کیا آپ نہیں چاہتیں کہ ہم بھی پرسکون اور عام لوگوں کی سی زندگی گزاریں؟ ہماری زندگی میں ایسے انہونے واقعات نہ ہوں۔"

"اچھا بھئی کہہ تو دیا کہ جو جی میں آئے کرو۔"

وقارالحسن نے مزید کچھ کہنے کی بجائے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا رہتا، بات بڑھتی رہتی۔ مجھے وقارالحسن کا ان کے آگے کھسیانا بھی بہت برا لگ رہا تھا۔ اب ایسی بھی کیا فرمانبرداری اور سعادت مندی۔

وہ وہاں سے نکل کر سیدھا تایا کے پاس پہنچا۔ شرف الدین اب بھی ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کوثر پتا نہیں کہاں تھی۔ میں ان لوگوں کے درمیان ہونے والے فیصلے سے آگاہ ہونے کے چکر میں اس تک نہیں جاسکا۔ فیصلہ جلد ہی ہوگیا۔ وقارالحسن نے کوثر کو بلانے اور تایا، اماں دونوں کو اس کی طاقت دکھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے دل میں کہیں یہ بات جاگزیں تھی کہ تایا اور اماں کوثر کے معاملے میں اس پر شک نہ کر رہے ہوں۔ وہ اس شک کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ تایا خاموش ہوگئے۔ وقارالحسن نے کوثر کو بلایا اور اسے بتادیا کہ وہ اماں اور تایا سے کیا بات چیت کرچکا ہے۔ وہ یہ بات سن کر خوش ہوگئی تھی کہ اسے ان دونوں کی طرف سے اجازت مل گئی ہے۔

"اب تمھیں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔" وقارالحسن نے کوثر سے کہا۔

"گویا مجمعے میں مداری بن کر تماشا دکھانا ہے!" وہ مسکرائی۔

"انھیں یقین نہیں ہے کہ تم کسی بھی قسم کی طاقت رکھتی ہو۔ میں صرف انھیں یقین دلانا چاہتا ہوں تاکہ وہ

۔۔ ایک ایک فٹ جتنے ہوچکے تھے۔ کیچوے کی طرح کلبلاتے ۔۔جم بڑھتے ہی کسی خوفناک اژدھے کی طرح پھنکارنے لگے ۔۔لگا جیسے کمرے کا درجہ حرارت غیر محسوس انداز میں بڑھتا ۔۔ہے۔ یہی بات شرف الدین، وقارالحسن، تایا اور اماں بھی ۔۔ں کر رہے تھے۔ ان کی پیشانیوں پر چمکتے پسینے کے قطرے اس ۔۔کا ثبوت تھے کہ یہ حرارت ان تک بھی پہنچ رہی ہے۔

۔۔اماں دروازے کی طرف سرک رہی تھیں۔ وقارالحسن ان ۔۔قریب ہو کر ان کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ بند کراؤ تماشہ۔۔۔ بند کراؤ۔" وہ گھگھیا کر بولیں۔

"اماں کچھ نہیں ہوگا۔" وقارالحسن نے انھیں تسلی دی۔ "یہ ۔۔کوثر کے تابع ہیں۔"

۔۔سانپوں کا حجم مزید بڑھ رہا تھا پھر وہ سارے سانپ ایک ۔۔رے سے لپٹ کر اس طرح کوثر کی گود میں بیٹھ گئے جیسے کوئی ۔۔ہوئی رسی رکھی ہو۔ کوثر کا چہرہ تپ کر تانبے کے رنگ کا سا ۔۔ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کی کھال ایسے لرز رہی تھی جیسے وہ ۔۔زلزلے کی زد میں ہو۔ سانپوں کا رخ سامنے کی طرف تھا مگر وہ بار ۔۔جھٹکے سے سر گھما کر کوثر کے چہرے کی طرف بھی دیکھ رہے ۔۔تھے۔ پتا نہیں کیوں سب لوگوں کو ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے ۔۔کمرے بھر میں زلزلہ آیا ہوا ہے، بہت شور ہے، کان پڑی آواز ۔۔نہ دے رہی ہو۔ حالانکہ وہاں صرف اور صرف کوثر کے ۔۔منہ سے نکلنے والے ناقابل فہم الفاظ کی گونج تھی اور بس۔ پھر ۔۔ہی یہ گونج اس وقت دم توڑ گئی جب کوثر کے ہونٹ ۔۔ساکت ہوگئے۔ اس کی گود میں کلبلاتے سانپ بھی ساکت ۔۔ہوگئے۔ ان کی چمک دار آنکھیں تایا اور شرف الدین پر جمی ہوئی ۔۔تھیں۔ اماں تو دور جاچکی تھیں اور وقارالحسن ان کے قریب کھڑا

۔۔کوثر کے ایک دم چپ ہوجانے سے پورے کمرے میں گہرا ۔۔سناٹا چھا گیا۔ یہ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ۔۔ہوا۔ ایسے میں جب کوثر نے گہرا سانس لیا تو سبھی چونک اٹھے۔

"۔۔تایا! یہ بہت زہریلے ناگ ہیں۔" وہ ایسے پیار سے بولی جیسے ۔۔کسی بے پناہ خوبی کا ذکر کر رہی ہو۔ "یہ میرے حکم پر کہیں ۔۔بھی جاسکتے ہیں، کسی کو بھی ڈس سکتے ہیں اور۔۔۔ اور میں کہوں تو یہ ۔۔ڈسے ہو۔۔ آدمی سے زہر واپس نکال کر اسے بھلا چنگا بھی ۔۔کرسکتے ہیں۔"

"۔۔بس۔ یہ تم۔۔۔ تم کیا بن گئیں کوثر۔۔۔؟" تایا بے ساختہ رو ۔۔پڑے۔ انھوں نے یہ جملہ ایسے چیخ کر کہا تھا جیسے وہ بڑی دیر سے ۔۔ضبط کیے بیٹھے ہوں۔ جیسے منہ بھی نہیں کھولنا چاہ رہے ہوں مگر منہ ۔۔کھلتے ہی یہ جملہ کسی چیخ کی طرح نکل گیا ہو۔

۔۔پھر کوثر کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ اس نے ۔۔وقارالحسن کی طرف دیکھا۔

"تایا۔۔۔ اسے ایسا بننے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔" اس نے فوراً بات بنائی۔ "اگر یہ ایسا نہ کرتی، یہ پیش بند حاصل کرکے اس کے محافظوں کو اپنے قابو میں نہ کرتی تایا تو آپ پھر کبھی اس کی شکل نہ دیکھ پاتے۔"

انھوں نے لمحہ بھر کو سر اٹھا کر وقارالحسن کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی اور دکھ تھا۔

"ہاں تایا! خود کو اس سادھو کی قید سے رہائی دلانے کے لیے، اپنے آپ کو اس کی دسترس سے بچانے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ یہی سانپ تھے جنھوں نے کوثر کو باحفاظت یہاں تک پہنچنے میں مدد دی۔ میں نے یہ سب آپ لوگوں کو صرف اس لیے دکھایا ہے تاکہ آپ لوگ میری بات پر یقین کرکے کوثر کو حویلی آزاد کرانے کے لیے یہاں چھوڑ دیں۔" وہ کوثر کی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔

کوثر سب سے بے نیاز ان سانپوں کو اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر لپٹتا دیکھ رہی تھی۔ یہ خوفناک زہریلے سانپ اپنی لمبی لمبی پتلی زبانوں سے اسے چھو رہے تھے۔ محسوس کر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کشش پیدا ہوگئی تھی جو بدن میں سنسنی بن کر دوڑ جاتی ہے۔ شرف الدین تو کسی پتھر کے مجسمے کی طرح آنکھیں پھاڑے اسے تک رہا تھا۔

"آپ چاہیں تو۔۔۔"

کوثر نے کچھ کہنا چاہا مگر وقارالحسن نے اسے آنکھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔ وہ جھجک کر خاموش ہوگئی۔ تایا اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئے۔ ان سے بیٹی کو اس روپ میں دیکھا نہیں جا رہا تھا جبکہ اماں اب بھی خوفزدہ تھیں۔ اچانک انھیں کچھ ہوگیا۔ انھوں نے لپک کر وقارالحسن کا بازو پکڑ لیا پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔ "وقارالحسن۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ ایسا ہی تو تھا۔ وہ سانپ جس نے گنگوا کا گلا گھونٹا تھا۔"

ان کے یہ جملے سنتے ہی تایا بھی چونک اٹھے۔

"وہ ایسا ہی تھا اماں مگر۔۔۔ ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ یہ سب کے سب اس پیش بند کے محافظ ہیں۔"

"یہ۔۔۔ یہ آخر ہے کیا چیز؟" تایا گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

تب وقارالحسن نے مختصر الفاظ میں انھیں ناگپا جادوگر اور اس کے پیش بند کے بارے میں بتایا۔ میری تمام توجہ کوثر کی طرف تھی۔ میں چپکے سے وقارالحسن کے جسم سے باہر آگیا۔ وقارالحسن جس انتشار کا شکار تھا اس میں میرے باہر آنے کو محسوس نہیں کرسکا۔ نہ معلوم میرے دماغ میں کیا آیا کہ میں کوثر کے قریب پہنچ گیا۔ کوثر نے میری موجودگی کو محسوس کرکے چونک کر سر اٹھایا۔ میں نے اسے اشارے سے کہا کہ میں ان سانپوں کو چھونا چاہتا ہوں۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی، پھر اس نے ایک سانپ

تمھارے یہاں رکنے پر معترض نہ ہوں۔"

"چلو۔۔۔ یہ بھی سہی۔"

وہ وقارالحسن کے ساتھ تایا کے کمرے میں چلی آئی۔ وقارالحسن اسے وہاں چھوڑ کر اماں کے پاس چلا گیا اور جلد ہی انھیں بھی تایا کے کمرے میں لے آیا۔

تایا کی آنکھوں میں خوشی اور دکھ کا امتزاج تھا۔ وہ شرف الدین کی وجہ سے خود پر قابو پائے بیٹھے رہے ورنہ بیٹی کو سامنے دیکھتے ہی ان کا دل اسے سینے سے لگا کر بھینچ لینے کو چاہا تھا۔ اماں کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"ابا۔۔۔! میں آپ لوگوں سے شرمندہ ہوں۔ میں نے جو حرکت کی تھی اس کی معقول وجہ تھی ابا۔ چچی دلھن۔" اس نے اماں کو مخاطب کیا "آپ مجھ سے بہت ناراض ہوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اس طرح چلے جانے نے آپ لوگوں کی عزت پر بٹا لگا دیا تھا مگر میں۔۔۔ میں مجبور تھی۔ میں اگر یہ سب نہ کرتی تو۔۔۔"

"یہ سب باتیں چھوڑ دو کوثر۔" وقارالحسن نے کھنکھار کر کہا۔ "تایا کو وہ پیش بند اور۔۔۔ اس کے محافظ دکھاؤ۔"

اچھا کیا تھا وقارالحسن نے کہ اسے ٹوک دیا کیونکہ اس گفتگو سے تایا کے چہرے پر دکھ کے علاوہ غصے کے آثار بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ اماں کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے اور ان لوگوں کے زخم تازہ ہونے لگے تھے۔ شاید یہ بات خود کوثر نے بھی محسوس کر لی تھی جبھی وہ سر جھکا کر چپ ہو گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور گردن میں پڑے اس پیش بند کو قمیص سے باہر نکال لیا۔

اس پیش بند کو دیکھ کر شرف الدین' تایا اور اماں تینوں ہکا بکا رہ گئے۔ اس میں پڑی چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں نے مجھے بھی سادھو والی زندہ کھوپڑیاں یاد دلا دیں۔ بڑی شدت سے جی چاہا کہ میں بھی کسی طرح ان کھوپڑیوں کا مالک بن جاؤں۔ تایا آنکھیں پھاڑے اس کے سینے پر پھیلے انسانی ہڈیوں سے بنے اس ہار کو دیکھ رہے تھے۔ ان ننھی ننھی کھوپڑیوں کی آنکھوں کے حلقوں کے اندر کچھ ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلی نگاہ میں تو یوں لگتا تھا جیسے اندر حلقوں میں سکڑی ہوئی پتلیاں ہل رہی ہیں مگر جلد ہی میں نے دیکھ لیا کہ ان حلقوں کے اندر کچھ ہے' جو مسلسل ہل رہا ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ کیا ہے۔ کوثر اس وقت آنکھیں بند کیے' زانو موڑے اور دونوں گھٹنوں پر دونوں ہتھیلیاں رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ عجیب جھلسی جھلسی سی رنگت ہو گئی جیسے اس کے اندر دہکتے کوئلوں کی بھٹی جل رہی ہو اور اسے دھیرے دھیرے ۔۔۔ رہی ہو۔ پھر اچانک اس نے با آواز بلند کچھ غیر مانوس سے الفاظ دہرانا شروع کر دیے۔ ان الفاظ کی گونج سماعت کو حد ناگوار گزر رہی تھی۔ عجیب کرخت سے الفاظ اور کر۔۔۔ لہجہ تھا جسے سن کر حلق کے اندر اور کانوں میں خراشیں پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اماں دہشت سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ تایا کے چہرے پر گھبراہٹ زیادہ نمایاں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی چیخ اٹھیں گے۔ اچانک ہی انھوں نے شاید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کوثر نے آنکھیں کھول دیں۔ دونوں ہاتھوں کو سامنے پھیلا کر وہ ہوا میں انگلیوں سے دائرے سے بنانے لگی۔

"وہ۔۔۔ وہ دیکھو۔" اچانک شرف الدین چیخ اٹھا۔ اس کا ہاتھ کوثر کی طرف اٹھا ہوا تھا اور انگلی کا اشارہ اس پیش بند کی طرف تھا۔ سب کی نگاہ اس کے چیخنے پر پیش بند پروئی گئی کھوپڑیوں کی طرف ہو گئی اور تبھی سب کے منہ کھل گئے' آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں' وقارالحسن البتہ خود پر قابو پائے ہوئے تھا اور بڑے غور سے ان تبدیلیوں کو دیکھ رہا تھا۔

ان کھوپڑیوں کی آنکھوں کے خالی حلقوں سے ننھے سنہرے سانپ نکل کر اس کی گود میں گر رہے تھے۔ اماں خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کوثر سے کچھ فاصلے پر جا کھڑی ہوئیں۔ تایا حیرت اور پریشانی کے عالم میں اب بھی ساکت بیٹھے کلبلاتے' حلقوں سے باہر آ کر گود میں پیچ و تاب اور بل کھاتے ان سانپوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس پیش بند میں آٹھ انسانی کھوپڑیاں تھیں مگر ان حلقوں سے نکلنے والے سانپوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان سانپوں کا حجم بڑھنے لگا۔

کے سر کو ہتھیلی سے رگڑا۔ میں نے اس سانپ کے سر سے ہلکا سا دھواں نکلتے محسوس کیا پھر کوثر کے سر ہلا کر اشارہ دینے پر میں نے اسی سانپ کو اٹھا لیا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ سانپ میری گرفت میں آ گیا اور میرے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ لٹکتا ہوا' ہوا میں معلق ہو گیا۔ ہوا میں جھولتا یہ سانپ باقی سب کو نظر آ رہا تھا۔ یہ پہلی جاندار چیز تھی جسے میں اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور وہ میرے ہاتھ میں آ جانے کے باوجود دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا جبکہ ہر وہ غیر جاندار چیز جو میں اٹھا سکتا تھا میرے ہاتھ میں آتے ہی غائب ہو جاتی تھی اور اس وقت تک غائب ہی رہتی تھی جب تک وہ میرے ہاتھ میں ہو۔ سانپ کو اس طرح ہوا میں اٹھتے دیکھ کر اماں اور شرف الدین کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ وقارالحسن دیکھ چکا تھا کہ یہ میں ہوں۔ اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور چیخا۔ "پھینکو اسے۔"

میں نے دوسرے ہی لمحے اسے کوثر کی گود میں پھینک دیا۔ تایا اسے اور کبھی وقارالحسن کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک بولے۔ "بند کرو یہ تماشا۔"

کوثر نے وقارالحسن کی طرف دیکھا' اس نے آنکھ سے اشارہ کر دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام سانپ ننھے ننھے کیچوے جتنے بن کر پھر ان کھوپڑیوں کی آنکھوں کے حلقوں میں واپس چلے گئے۔

اس بار کوثر نے پھر کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا مگر وہ اب منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔

اس واقعے نے شرف الدین' تایا اور اماں کو حیران کم اور پریشان زیادہ کر دیا تھا۔ تایا بالکل گم صم ہو کر رہ گئے تھے۔ اماں اس سے خوفزدہ رہنے لگی تھیں ان کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ اب تو کوثر باقاعدہ جادوگرنی بن چکی ہے۔ وہ وقارالحسن پر کسی بھی وقت جادو کر سکتی ہے۔ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ وقارالحسن بھی کچھ شکتیاں پا چکا ہے۔ بہرحال اس بات کے بعد یہ فیصلہ ضرور ہو گیا کہ تایا سب کو لے کر مراد آباد چلے جائیں' شرف الدین انھیں با حفاظت پہنچا دے گا اور وہاں چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔ وقارالحسن' یہیں کوثر کے پاس رہے گا۔ مجھے یہ فیصلہ سن کر کچھ مایوسی ہوئی تھی مگر پھر بھی میں کوثر سے ناامید نہیں ہوا تھا۔ میرے سلسلے میں تو وہ جو بھی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی' وہ اپنے ہی فائدے کے لیے تھا۔

وہ رات پرسکون گزری۔ اگلی صبح تایا اور چچا نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ وقارالحسن نے خورشید چاچا کو زمینوں پر بھیج دیا تھا تاکہ وہ وہیں رہیں اور وہاں کا انتظام سنبھالیں۔ انھیں یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ امروہہ آنے کی بجائے مراد آباد چلے جایا کریں۔ تایا سے وقارالحسن نے کہہ دیا تھا کہ اپنا اور گھر والوں کا علاج اس وقت تک جاری رکھیں جب تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتے۔ پتا نہیں تایا نے چچا اور چچی سے کوثر کے بارے میں ایسا کیا کہا تھا کہ وہ اس کے یہاں رکنے پر قطعی پریشان تھے اور نہ ان کے چہروں پر کسی قسم کا تردد محسوس ہوتا تھا دن چڑھے تک وہ لوگ اسٹیشن کے لیے نکل گئے۔ وقارالحسن انھیں چھوڑنے اسٹیشن جانا چاہتا تھا مگر تایا نے اسے روک دیا۔ انھیں کوثر کی فکر تھی اس کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ جاتی۔ یہ دیکھ کر کوثر نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا کہ اس کے اکیلے رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وقارالحسن اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا جو بھی کرنا ہے اسے خود ہی کرنا ہے اس لیے وقار اگر چاہے تو اسٹیشن جا سکتا ہے۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وقارالحسن کو بھی معلوم تھا کہ وہ کتنی طاقت ور ہے۔ وہ گھر والوں کے زیادہ قریب رہنا چاہتا تھا اس لیے اسٹیشن پہنچ گیا۔ سب کو ریل میں سوار کرا کے اس نے شنو آپا اور جہانی آپا کو اپنا بہت خیال رکھنے کے لیے کہا تو وہ دونوں ہی رو پڑیں۔

"بھائی۔۔۔ تم زیادہ دنوں کے لیے تو ہم سے نہیں بچھڑ رہے ہو ناں؟" شنو آپا نے روتے ہوئے کہا۔

وقارالحسن تڑپ ہی تو گیا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو شنو آپا۔ میری تو جان آپ لوگوں میں اٹکی رہتی ہے۔ میں تین چار روز ہی میں آ جاؤں گا۔ آپ اماں' تایا' تائی کا خیال رکھیے گا۔"

شرف الدین کی آنکھیں اب بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے اتنے عرصے میں پہلی بار جہانی آپا کو دیکھا تھا بلکہ انھیں بھی کہاں ان کے پیلے پیلے بازو' ہڈیوں سے مزین ہاتھ یا برقعے میں کسی بانس کی طرح پتلا جسم دیکھ کر ہی وہ اچنبھے میں رہ گیا تھا۔ اس نے تایا کو کمزور پایا تھا مگر اسے تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ حویلی کے اندر ہونے والے خوفناک واقعات اس حد تک بھی خوفناک ہو سکتے ہیں کہ جہانی کے گول گول چکنے بازو ٹیڑھی ٹیڑھی لکڑیوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں' شنو کی تو اس نے صورت بھی دیکھ لی تھی اور تبھی سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

اماں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ ان پر عجیب سی بے قراری' ایک عجیب سی بے کلی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی گھبرائی گھبرائی سی نگاہیں' ان کے لرزتے ہوئے ہونٹ کپکپاتے ہاتھ' یہ سب ان کی بے پناہ بے قراری کا ثبوت تھے۔

"جلدی۔۔۔ جلدی چلے آنا وقارالحسن' ہمارا۔۔۔ ہمارا خدا کے سوا اور تمھارے علاوہ کوئی آسرا نہیں ہے۔" انھوں نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں وقارالحسن کا ہاتھ تھاما تو ایک یخ لہر سی وقارالحسن کی انگلیوں سے ہوتی ہوئی پورے بدن میں ٹھہر گئی۔ اس نے اماں کی آنکھوں میں بھڑک کر بجھتے ہوئے چراغ کی سی کیفیت محسوس کی۔

"خدا پر بھروسہ رکھیے اماں' اگر اس نے ہماری قسمت میں ان عذابوں سے پناہ لکھی ہے تو انشاءاللہ ہم اس بار کامیاب

ہو جائیں گے اور..... اگر ایسا نہیں ہے تو آپ نے مجھے صبر و شکر کرنا تو سکھا ہی دیا ہے وہی کام آئے گا اماں' اس کے کاموں میں کیسے دخل؟" وقارالحسن کا لہجہ مایوس کن تھا۔ وہ تو گاڑی چلنے کا وقت ہو گیا ورنہ جدائی کا یہ چکر پتا نہیں کب تک چلتا۔ اس بار وقارالحسن نے شرف الدین کو تاکید کردی تھی کہ وہ ان لوگوں کا ہر حال میں خیال رکھے۔ اس نے وعدہ کرلیا اور کہہ دیا کہ وہ انھیں مراد آباد چھوڑ کر سیدھا یہاں آئے گا اور ابا سے چند روز کی رخصت لے کر حویلی پہنچ جائے گا۔

گاڑی چلی گئی۔ وقارالحسن بہت نڈھال تھا۔ اس کے دل و دماغ مایوسی کا شکار تھے۔ میں اسے اس مایوسی سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں سے تانگا لینے کی بجائے پیدل ہی چل پڑا۔ اس کی حالت کسی لٹے ہوئے مسافر کی سی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جوے میں اپنی بہت ہی عزیز چیز ہار کر لوٹ رہا ہو۔ اس کی یہ کیفیت نئی تھی جس نے مجھے بھی پریشان کردیا تھا۔ اسے اماں کی آنکھیں یاد آرہی تھیں' جو کبھی جل اٹھتی تھیں اور کبھی بجھ جاتی تھیں۔ میں اسے اس کیفیت سے نکالنا چاہتا تھا مگر ایسی کوئی بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے وہ بھڑک اٹھے اور مجھے جھڑک دے۔ میرے حساب سے تو کامیابی سے ہمکنار ہونے کا وقت اب آیا تھا۔ اب وہ چاہتا تو سارے وظائف کرسکتا تھا۔ وظائف کی وہ کتاب جو سنہرے بابا نے اسے دی تھی وہ امروہہ میں تھی۔ اسم اعظم اس کے گلے میں اور فیروزے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں تھی۔ اس دوران میں کوثر میرے لیے جاپ کرنے کے علاوہ سوامی جی کو تلاش کرنے اور حویلی کو آزاد کرانے کی بھی کوشش کرسکتی تھی پھر پتا نہیں کیوں وقارالحسن یہ باتیں سوچنے' آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کی بجائے مایوسی کا شکار تھا۔

اس کی اس کیفیت نے مجھے بھی مضطرب کردیا تھا۔ میں اسے فعال دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے فعال ہونے' ذہنی طور پر پرسکون ہونے کا سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی ہوتا اس لیے میرا اضطراب بجا نہ تھا۔ میں کچھ کہہ کر اسے مزید جھنجلاہٹ میں جتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ اسے بالآخر پرسکون ہونا ہی تھا۔ وہ پیدل چلتے چلتے اچانک ٹھٹک کر رک گیا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے راکٹ کی سی رفتار سے چلنے لگا۔ ہمارے دائیں بائیں کی عمارتیں اور دکانیں اتنی تیزی سے گزرنے لگیں جیسے ہم کسی تیز رفتار ٹرین میں بیٹھے ہوں۔ میں پل بھر کو توہکا بکا رہ گیا لیکن جلد ہی خوشی سے بے حال ہو گیا۔ مجھے یاد آگیا کہ جب وقارالحسن پہلی بار سنہرے بابا کے حجرے میں وظائف پورے کرکے گھر کی طرف چلا تھا' تب جلدی گھر پہنچنے کے شدید احساس نے اسے یہی رفتار بخش دی تھی۔ گویا وہ واپس انھی لمحات میں اسی شکتی کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ گویا وہ بھی وہی سوچ رہا تھا جو میں سوچ رہا تھا۔ اب اسے مخاطب کرنا آسان ہو گیا تھا' سو میں نے اسے دھیرے سے آواز دی۔ اس دوران میں میری نگاہ دونوں جانب کسی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اس نے میری سرگوشی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ ہم بڑا لمبا راستہ پل بھر میں طے کرچکے ہیں۔ سامنے کی شاہراہ مصروف شاہراہ تھی۔ اس راستے پر تو اتفاق سے کوئی بھی نہیں ٹکرایا تھا مگر اس شاہراہ پر کوئی بھی وقارالحسن کو دیکھ کر حیران ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں مجمع لگ جاتا۔

"وقارالحسن! رفتار کو قابو میں کرو۔ آگے سڑک پر بہت لوگ ہوں گے۔" میں نے کچھ تیز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"تم جانتے ہو کہ... کہ مجھ میں اب بھی وہ طاقتیں پنہاں ہیں جو میں نے حاصل کی تھیں؟" وہ سرخوشی کے عالم میں بولا۔

"ہاں..... جو کچھ تم حاصل کرچکے ہو' اسے استعمال میں نہیں لاتے ورنہ وہ سب کچھ تمھارے اندر موجود ہے۔" میں نے بھی اسی خوشی سے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو کیا تم بھول گئے' میں جب پہلی بار اس رفتار سے چلا تھا تو وہ سڑک بھی مصروف سڑک تھی۔ وہاں صرف لوگ ہی نہیں بس سائیکل رکشا گاڑیاں سبھی کچھ تھیں' مگر نہ مجھے کسی نے دیکھا تھا نہ کسی کو احساس ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا مگر بعد میں میں بہت دن تک یہ سوچتا رہا تھا کہ کیا اس دوران میرا جسم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا؟ مگر میں اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب نہیں پاسکا تھا۔ آج..... آج میں اپنے اسی سوال کا جواب چاہتا ہوں۔" وہ بے خودی کے سے عالم میں بولا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس بات کا خیال آتے ہی میں بھی چونکنا ہو گیا۔ ہم بہت جلدی اس شاہراہ پر آگئے جو ہر وقت مصروف رہتی تھی۔ وہاں فٹ پاتھ پر لوگ بھی تھے۔ سڑک پر گاڑیاں' بسیں' تانگے اور سائیکل رکشا والے بھی تھے۔ وقارالحسن فٹ پاتھ پر چل رہا تھا اور اسی رفتار سے چل رہا تھا۔ اسی رفتار میں وہ لوگوں کے درمیان راستہ بنا رہا تھا' میں نے لوگوں کو چونکتے تو دیکھا لیکن یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ لوگ وقارالحسن کو دیکھ رہے ہیں یا نہیں۔ میں فوراً ہی وقارالحسن کے اندر سے باہر نکل آیا اور تب میں نے وقارالحسن کو ہوا کے تیز جھونکے کی طرح گزرتے محسوس کیا۔ وہ ہوا کی لکیر کے مانند نظر آرہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ رفتار کم ہونے کی صورت میں ضرور نظر آجاتا لیکن تیز رفتاری اسے بچائے ہوئے تھی۔ گویا وہ تقریباً لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ میں وقارالحسن ہی کی رفتار سے چل رہا تھا پھر جیسے ہی میں اس کے اندر واپس لوٹا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے کیا محسوس کیا۔ اب ہم حویلی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے محلے میں داخل ہونے سے قبل ہی اپنی رفتار کم کرلی۔

"وقارالحسن' اب تم مزید وظائف بھی جلد ہی شروع کردو۔" میں نے بات شروع کی۔ "اس وقت تم فارغ ہو پھر پتا نہیں حالات کیا رخ اختیار کرلیں۔ موقع غنیمت جانو اور کچھ کر ڈالو۔ کچھ شکتی مجھے بھی مل گئی تو میں بھی تم لوگوں کے کام آسکوں گا۔"

"ہاں..... آج میں وظائف کی کتاب دیکھوں گا۔ جو بھی میرے لیے کام کا ہو گا وہ عمل شروع کردوں گا۔"

وقارالحسن کی آمادگی میرے لیے نوید تھی۔ وقارالحسن نے حویلی کے گیٹ کا کنڈا بجانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ پل بھر کو ٹھٹکا' حیران ہوا پھر تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اماں والا کمرہ خالی تھا۔ پوری حویلی میں غضب کا سناٹا تھا۔ وقارالحسن کے قدموں کی چاپ گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دبے قدموں سے تایا والے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا مگر ہاتھ لگاتے ہی وہ دروازہ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ "کوثر...!" وقارالحسن نے دھیرے سے اسے پکارا مگر اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ تبھی مجھے خیال آیا اور میں نے وقارالحسن کے وجود کو چھوڑ دیا۔ پھر میں بھی اسے تلاش کرتا رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا وقارالحسن کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ اچانک وہ کوثر کو زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ اس کی ہیجانی کیفیت نے اس کے بدن میں لرزا پیدا کردیا تھا۔ میں نے اسے خود پر قابو رکھنے کو کہا۔ اسے سنبھالا اور تسلی دی کہ وہ ضرور مل جائے گی پھر ہم نے حویلی کا کونا کونا چھان مارا مگر کوثر کا کہیں پتا نہیں چلا۔ اب صرف اوپری کا حصہ دیکھنے سے رہ گیا تھا۔ نچلے حصے میں تو وہ نہیں ملی تھی۔ وقارالحسن بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی تمام تر ذمے داری وقارالحسن ہی پر تھی۔ اس کا گھبرانا بے سبب نہیں تھا اگر اسے کچھ ہو جاتا یا وہ پھر پہلے کی طرح کہیں چلی جاتی تو پورا خاندان وقارالحسن کی جان کھا جاتا۔ وہ اب بھی اسے آوازیں دے دے رہا تھا آخر اس نے اوپری حصے میں تلاش کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مجھے بھی یہی خیال آیا کہ وہ یقیناً اوپر ہی گئی ہو گی۔ اس روز بھی وہ سوامی جی کی تصویر کے چکر میں اوپر جارہی تھی مگر وقارالحسن کے پکارنے پر نیچے واپس آگئی تھی۔ میں نے وقارالحسن کو اوپر جانے سے روکنا چاہا مگر وہ تو باؤلا ہو گیا تھا۔ اس نے میری ایک بات نہ سنی اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ یہ وہی حصہ تھا جہاں دائیں جانب دو چھتی بنی تھی جہاں سے وقارالحسن نے پرکاش کی جلی ہوئی لاش نکال کر برگد کے پیڑ تلے دبائی تھی۔

دوسری طرف پھر سیڑھیاں اوپری منزل پر جارہی تھیں۔ دو چھتی کے کواڑ اسی طرح تختی سے بند تھے جیسے وقارالحسن نے خود' اپنے ہاتھوں سے بند کرکے اس کی کنڈی میں لوہے کی پتری اڑائی تھی۔ وہ سیڑھیوں والے حصے کی طرف مڑ گیا۔ میرے روکتے روکتے بھی وہ مرزا صولت بیگ کے کمرے کے دروازے پر جا ٹھہرا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ باہر بھی وقارالحسن کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز تھمتے ہی خاموشی چھا گئی تھی۔

"وقارالحسن! یہاں خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ سوامی کی چال ہو۔ وہ تمھیں یہاں تک لانا چاہتا ہو۔ آگے بڑھنے سے پہلے سوچ لو کہ یہاں تمھارے سوا کوئی نہیں ہے اور مجھے تم نے وہ طاقت نہیں دی کہ میں تمھاری لاش اٹھا کر کہیں لے جاسکوں یا کسی کو تمھاری موت کی اطلاع ہی دے سکوں۔ میری آواز بھی تمھارے سوا کوئی نہیں سن سکتا۔ تم یہاں بڑی بے بسی کی موت مرو گے وقارالحسن' میں تمھاری کوئی مدد بھی نہیں کرسکوں گا۔"

میں سرگوشی میں اسے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ یہ میں کوئی ڈراما نہیں کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی میں بالکل بے بس تھا۔ اس کے کسی کام نہیں آسکتا تھا۔ "وقارالحسن۔" میں نے اسے سوچتے دیکھ کر پھر کہا۔ "واپس چلو۔ کوثر کو آسانی سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ وہ اگر زندہ ہوئی تو لوٹ آئے گی' خود ہی تم تک پہنچ جائے گی ورنہ تم دنیا والوں کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرلینا مگر یہاں..... یہاں اگر تم مر گئے تو کسی کو بھی تمھاری موت کا پتا نہیں چلے گا۔ تمھاری لاش یہاں سڑ جائے گی اور گھر والے تمھارا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔"

میری باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ وہیں جما کھڑا رہا۔ میں کسی انہونی کے انتظار میں تھا مگر شکر ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ وہ دھیرے سے پلٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

"وقارالحسن' آنے والے پل کے بارے میں نہ تم کچھ جانتے ہو نہ میں..... میری بات مانو تو سب سے پہلے شکتی حاصل کرنے کی کوشش کرو پھر کوئی قدم اٹھانا۔ کیا تم میری باتوں کو سمجھ رہے ہو؟" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

"ہاں..... تم..... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ..... ایسا کرنا اب ضروری ہو گیا ہے۔ بہت ضروری۔" وہ بڑبڑایا۔

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ میں اس کے بڑے برآمدے کے پاس پہنچنے تک کسی حادثے یا کسی خوفناک واقعے کا منتظر رہا مگر جونہی وہ بڑا برآمدہ عبور کرکے رہائشی حصے کے پاس پہنچا' میری گویا جان میں جان آگئی۔ کوثر کا ابھی دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔ وقارالحسن نے صراحی سے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر گیا۔

"وہ کہاں جاسکتی ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ "کہاں جاسکتی ہے وہ؟"

"اپنے تصور کی طاقت کو آزماؤ وقارالحسن! کیا تم اس سوال کا جواب نہیں چاہتے کہ وہ طاقتور تصور میں ہی تھا یا کوئی اور..... تمھارے اندر چھپی ہوئی کوئی اور طاقت؟"

وہ چونک اٹھا۔ "ہاں..... وہ..... وہ کیا ہے؟"

اتنا کہہ کر وہ لیٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بدن کی

جان نکلتی جا رہی ہے۔ اسے چکر سے آنے لگے مگر وہ کوثر کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر... اچانک مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے اس کے اندر سے کھینچ لیا ہو۔ ایک جھٹکے سے میں اس کے اندر سے باہر آگیا۔ آج اس سے علیحدہ ہونے میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا اور پھر... پھر میں نے خود کو اس برگد کے پیڑ کے نیچے پایا جہاں پرکاش کا جلا ہوا ڈھانچہ دفن تھا۔ وہاں میں نے کسی کی سسکیاں سنیں۔ یہ سسکیوں کی آواز چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اب میں بڑے برآمدے کے اندر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ جگہ اس جگہ سے کافی دور تھی جہاں سے ابھی ہم گزر کر رہائشی حصے کی طرف گئے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وقار الحسن کا تصور میں ہی تھا مگر مجھ پر کوئی اور ہی طاقت مسلط تھی جو مجھے اپنی مرضی سے کہیں لے جا رہی تھی۔ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جوں جوں میں اندر کی طرف بڑھ رہا تھا، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ یخ لہریں میرے آر پار ہو رہی تھیں پھر میں نے ایسی بھاپ سی اپنے چاروں طرف پھیلی محسوس کی جیسی برف پر سے اٹھتی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی برف خانے میں داخل ہو گیا ہوں۔ یہاں اندھیرا بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ سسکیاں اب بھی میرا تعاقب کر رہی تھیں پھر اچانک، بالکل اچانک میرے سامنے دیوار آگئی۔ میں اس دیوار سے ٹکرا کر رک گیا۔ دیوار اتنی یخ تھی کہ میرے ہاتھ ٹھٹھر کر رہ گئے۔

میں ہاتھ ہٹانے لگا تھا کہ میرا ہاتھ دیوار پر کسی گرم چیز سے ٹکرا گیا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ کوئی جسم تھا۔ گرم جسم۔ پل بھر کو یوں لگا جیسے اس جسم میں حرکت ہوئی ہو۔ میں نے جلدی جلدی اسے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ بہت جلد میں جان گیا کہ جسم عورت کا ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں کوثر کا نام گونج اٹھا۔ میں نے اسے پکارا۔ میری آواز گونج دار بازگشت بن کر کئی بار دیواروں سے ٹکرائی اور لوٹی۔ ایک شور سا برپا ہو گیا جو میرے منہ سے نکلے ہوئے لفظ کو بار بار لوٹا رہا تھا جیسے کوثر کا نام وہاں کی فضاؤں میں رچ کر چکرا رہا ہو۔ ساتھ ہی میرے ہاتھ بڑی تیزی سے اس کا چہرہ تلاش کر رہے تھے۔ مجھے اب تک یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ وہ کوثر ہی ہے مگر پھر... میں ساکت رہ گیا۔ میرے ہاتھ میں پیش بند کی لڑیاں لہرا گئیں۔ یہ ثابت ہوتے ہی کہ وہ کوثر ہے میں نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا اور چیخا.... "کوثر!!!"

"یہ.... یہ.... لے لو.... یہ لے لو وقار.... یہ لے لو۔"

اس کی ٹوٹی ٹوٹی آواز، زخمی لہجے میں لپٹی ہوئی تھی۔ پتا نہیں مجھے کچھ نظر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہوا میں ہاتھ چلائے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پیش بند تھا۔ اس نے پیش بند میرے حوالے کر دیا اور بولی۔ "یہ لے کر.... جاؤ.... جاؤ...."

"کیا ہوا ہے تمہیں.... کہاں ہو تم....؟" میں پھر چیخا اور اسی لمحے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے زور سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ اب میں وقار الحسن کے اندر تھا اور وقار الحسن متوحش پلنگ پر بیٹھا اپنے ہاتھ میں پکڑے پیش بند کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ میرے اندر بات کرنے کی سکت بھی نہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی نے نچوڑ دیا ہو جبکہ وقار الحسن چاق و چوبند بیٹھا تھا اور وحشت ناک نگاہوں سے کبھی چاروں طرف دیکھتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے اس پیش بند کو۔

"کوثر...." اچانک وہ چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ اس برآمدے کی طرف تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگتا چلا گیا۔ دن کا وقت تھا اس لیے برآمدے کا اندرونی حصہ بھی قدرے روشن تھا۔ جیسے ہی وہ اس حصے کے قریب پہنچا پہلے تو وہ بھونچکا رہ گیا پھر اس کے

حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ جو کچھ ہم نے وہاں دیکھا، وہ سے ہی نہیں مجھے بھی حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس ملگجے اندھیرے میں کوثر کا بدن دیوار میں پیوست تھا۔ ایک بڑا سا بھالا پیٹ سے آر پار ہو کر دیوار میں دھنسا ہوا تھا۔ کپڑے خون میں تر تھے۔ اور آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل پڑ رہی تھیں۔ سانس جیسے سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ اس نے وقار الحسن کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ گو بھالا اس کے بدن کو چیر گیا تھا مگر وہ آسانی سے جان دینے والی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے یوں مرتا دیکھ کر وقار الحسن کی تو جو بھی حالت ہوئی ہو مگر میرا اپنا بھی برا حال تھا۔ وہ میری آخری آس تھی۔

"کوثر.... کوثر!" وقار الحسن حلق پھاڑ کر رو دیا۔ "یہ کیا ہو گیا.... کیسے ہو گیا.... کوثر تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ تم نہیں مر سکتیں کوثر، مجھ پر رحم کرو.... رحم کرو مجھ پر.... میں تایا اور تائی کو کیا منہ دکھاؤں گا.... یہ نہیں کرنا۔" وہ بالکل بچوں کی طرح اس کے خون میں لت پت بدن سے چمٹ کر رو رہا تھا۔

"سس.... سنو.... وقار.... میں.... بچ نہیں سکتی۔ وہ۔ وہ یہیں ہے.... یہیں.... اسی حویلی میں.... وہ بڈھا.... یہاں ہی ہے.... یہ بھالا اسی نے.... اس نے ہی.... سنو، میرا بدن.... میرا بدن اسے دے دو.... اسے اپنے ہمزاد کو.... وہ اسے زندہ رکھ سکتا.... ہے.... اسے شکتی دو.... طاقت.... دے دو.... میں نہیں جاؤں گی.... مگر اب یہاں.... اسی جسم میں رہنا.... ممکن نہیں ہے۔ وہ.... پرکاش.... ہڈیاں.... دو پچھتی میں.... چراغ ہے.... ایک دیا.... چمگادڑ.... خون میں ڈبو کر اسے.... اروو۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو کوثر نے شدید اذیت میں کہے۔ پتا نہیں، وقار الحسن کا دھیان ان الفاظ کی طرف تھا کہ نہیں مگر میں.... میں اس طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ وقار الحسن تو یوں رو رہا تھا جیسے زندگی کا سب سے بڑا سہارا، آسرا اس سے چھینا جا رہا ہو۔ کوثر کی آنکھیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ اب ہم قدرے صاف طور پر اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کا بدن بیچ دیوار میں پرو دیا گیا تھا۔ وہ بھالا اتنا بھاری اور اتنا بڑا تھا، یہ تصور ہی محال تھا کہ اسے عام انسان اٹھا سکتا ہے پھر میں اس بھالے کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ یہ بالکل ایسا بھالا تھا جو جنگوں میں استعمال کیا جاتا تھا، ان جنگوں میں جو بادشاہوں کے درمیان دو بدو لڑی جاتی تھیں۔

"کوثر.... کوثر کچھ کرو.... مت جاؤ۔ تمہیں کچھ نہ ہو.... تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے کوثر.... تایا.... تایا مجھے مار دیں گے.... میں.... میں خودکشی کر لوں گا۔ کوثر مگر.... مگر ان کا سامنا نہیں کروں گا۔" وقار الحسن پھر اس سے لپٹ کر رو دیا۔ زمین سے کچھ اوپر کوثر کی معلق ٹانگیں سرد ہو چلی تھیں۔

"تم نے.... سن لیا ہے ناں.... سن لیا.... یہی کرو۔ یہ محافظ تمہارا ہے.... تمہارے تابع۔ میرا بدن اسے.... اسے دے دو۔" وہ یوں بول رہی تھی کہ اس کی آواز کو سننا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

"وقار الحسن.... رونا چھوڑو۔ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سنو۔ تمہیں وہی کرنا ہے۔ سنو۔ اس سے پہلے کہ وہ ختم ہو جائے.... وہ مر رہی ہے یہ حقیقت ہے مگر تمہیں زندہ رہنا ہے۔" میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وقار الحسن جلد ہی میری بات مان گیا۔ اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس نے اچک کر اپنا کان اس کے ملتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔

مجھے اس کی وہ ٹوٹی ٹوٹی مدھم آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی مگر وقار الحسن کا یہ سب کچھ سننا ضروری تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ اب بچنے والی نہیں ہے، اس کے بدن سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ رنگت زرد ہو چکی تھی۔ اس کی باتوں سے جو اندازہ میں نے لگایا تھا، وہ یہی تھا کہ اسے مارنے والا خود سوامی جو گندر ناتھ ہے، اس نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ یہیں ہے مگر یہاں کہاں؟

"نہیں.... نہیں کوثر.... نہیں، خدا کے واسطے کوثر کچھ کرو۔ تم تو اتنی طاقت حاصل کر چکی ہو کوثر...." اچانک وقار الحسن کے چیخنے کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے نکال لیا۔ میں اس دوران میں وقار الحسن کے جسم کو چھوڑ چکا تھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ میری طرف لپک آیا۔ "دیکھو.... تم ہی کچھ کرو۔ تم میری مدد کرو۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا۔

"تم نے مجھے کچھ کرنے کے قابل بنایا ہی کب ہے وقار الحسن! میں کب سے کہہ رہا تھا کہ مجھے طاقت دے دو مگر تم تو مجھ سے خوفزدہ تھے ناں کہ میں تمہیں ذلیل کر دوں گا۔ تم تو مجھے دبا کر رکھنا چاہتے تھے۔ مجھے کمزور سے کمزور تر کرنے کی لگن میں رہے محض اس کہ میں نفس امارہ ہوں۔ شاید تم بھول گئے کہ یہی نفس امارہ آدمی کو دنیا میں اتنا طاقتور بنا دیتا ہے کہ دوسرا اس کے سامنے ٹک نہیں سکتا۔ اب دیکھو میری بے بسی اور اپنی لاچاری۔"

میں اس موقع پر طنز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے واقعی اس کی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ ترس بھی آ رہا تھا۔ کاش اس نے میرا فائدہ نہ ہونے دینے کے چکر میں خود کو اتنا بڑا نقصان نہ پہنچایا ہوتا۔ میں اس وقت اس کی مدد کرنے کے قابل ہوتا۔ میرے لہجے کی کاٹ نے اسے گویا نچوڑ کر رکھ

دیا۔ وہ ایسی بے بسی سے تڑپ کر رو دیا کہ میں بھی لرز کر رہ گیا۔ میں نے فوراً اسے سنبھالا۔ "وقار الحسن! حقائق کا سامنا کرو۔ کوثر مر رہی ہے' اسے مرنے دو۔"

"نہیں۔" وہ چیخ اٹھا۔ "وہ نہیں مر سکتی تم نہیں جانتے کہ۔۔۔ وہ مر گئی تو کیا ہوگا۔ اس نے اتنی شکتی پائی ہے۔ اتنی طاقت ور ہے وہ۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر کوثر کی طرف لپکا۔ کوثر کا بدن اب صرف بھالے کے زور پر لٹکا ہوا تھا مگر پھر بھی اس کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔ وہ مری نہیں تھی۔ موت کو شکست دینے کی کوشش میں اور نڈھال ہو چکی تھی۔

"کوثر۔۔۔ لوٹ آؤ۔ کچھ پڑھو۔ کوئی جاپ کرو۔۔۔ آواز دو اپنی شکتی کو۔۔۔ کچھ کرو کوثر۔" اس نے دم توڑتی ہوئی کوثر کو جھنجوڑا تو اس نے ساری ہمت جمع کر کے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی بے بسی تھی۔ دکھ تھا۔ اور ایک عجیب سا احساس تھا جیسے وہ خود پر ہنس رہی ہو۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک دوسرے میں پیوست ہونٹوں کو جدا کیا اور ٹوٹے بکھرے لہجے میں بولی۔ "وقار الحسن۔ خدا۔ خدا سب سے بڑی طاقت ہے۔ بہت بڑی شکتی۔ اس سے۔ کوئی۔ نہیں۔۔۔ لڑ سکتا وہ سب۔۔۔ سب کچھ بیکار۔ تھا۔ سب کچھ۔ تم۔ اس سے مدد۔۔۔ مدد لینا۔ حق۔۔۔ کے لیے وہ یہیں ہے۔ دو چھتی میں۔ وہ چمگادڑ۔ ہڈیاں۔ ل۔ یہ بدن۔ دے دو اسے۔۔۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر میری طرف اشارہ کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کے ہاتھ بے جان ہو کر جھول گئے۔

یوں لگا جیسے حویلی میں آندھی آ گئی ہو۔ تیز ہواؤں کا شور اچانک ہی بڑھنے لگا۔ برگد کے سوکھے پتے صحن میں ناچنے لگے۔ بیچ آنگن سے ریت کا بگولا اٹھا اور ہوا میں چکر کھاتا ہوا اوپر اٹھتا چلا گیا۔ پھر کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے حویلی کے سارے بام و در ہوا سے بجنے لگے ہوں۔ بڑا شور تھا۔ بے پناہ شور۔ وقار الحسن کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا کوثر کی لاش کو تک رہا تھا اور تبھی میں نے کوثر کے بدن سے اس کی روح کو نکلتے دیکھا۔ وہ سفید دھوئیں کی طرح تھی۔ ایک اجلا سایہ تھا جو اس سے جدا ہو رہا تھا اور لگتا تھا جیسے اسے اس بدن سے نکلنے میں شدید تکلیف ہو رہی ہو۔ شاید کوثر مرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کی روح اس کے بدن میں کہیں اٹکی ہوئی تھی۔ شاید وہ اب بھی موت کو شکست دینے کی جدوجہد میں لگی تھی۔ میں جو نکلنا ہو گیا۔ میں روح کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا جبکہ وقار الحسن اس سے بالکل لاعلم تھا۔ وہ صرف مجھے دیکھنے کی طاقت

رکھتا تھا یا پھر شکنتلا جو اسے اپنی مرضی سے دکھائی دے جاتی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کوثر کی روح کو ضرور دیکھ لیتا۔ یوں تو اس نے پرکاش کی روح کو بھی دیکھا تھا مگر وہ بھی شاید پرکاش کی مرضی سے۔ پتا نہیں کوثر اس مرضی پر یا اس بات پر قادر کیوں نہیں تھی کہ وہ اسے بھی روح کی شکل میں دکھ سکے۔

"کوثر!" میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے اس کی روح کو مخاطب کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری طرف متوجہ ضرور ہوگی۔ وہ مجھے بھی بالکل اس طرح دیکھ پائے گی جیسے شکنتلا نے مجھے دیکھ کر سمجھا تھا کہ وقار الحسن مر گیا' میں اس کی روح ہوں۔ میرے آواز دینے کے باوجود وہ سایہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ تو بدن چھوڑ دینے کی کشمکش اور اذیت میں تھا۔ اسے دیکھ کر میری پریشانی البتہ ضرور کم ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوثر کا بدن میرے لیے جس قدر کار آمد تھا اتنا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اس کی روح میرے لیے کام کی ہوگی۔ میں اس کے بدن سے آزاد ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وقار الحسن کو میں نے اسی کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسے کوثر کے مرنے سے جو صدمہ پہنچا تھا وہ اتنا کم نہ تھا کہ اتنی جلدی سنبھل سکتا۔ یوں بھی میں اسے بعد میں سنبھال لیتا' فی الوقت تو میں اپنے چکر میں تھا۔ میں اس کی روح سے بات چیت کر کے اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر تک رسہ کشی کی سی کیفیت کے بعد وہ اجلا سایہ آزاد ہو گیا۔ اس کی صورت بڑی مکروہ تھی۔ مجھے وہ ذرا بھی اچھی نہیں لگی مگر پھر بھی میں نے اسے مخاطب کیا۔ "کوثر! تم اب میری آواز سن سکو گی ناں؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا مگر اس کی آواز بڑی گھٹی گھٹی سی تھی۔ یوں' جیسے وہ بولنے میں بھی اذیت محسوس کر رہی ہو۔ میں نے دیکھا کہ وہ غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہی ہے "سنو۔۔۔ میرا بدن ابھی ضائع نہ کرنا۔ مجھے نہیں دفنانا۔۔۔ ورنہ ابا۔ اماں وقار الحسن کو۔۔۔ سب کو تکلیف ہوگی۔ میرا انتقام لینا۔۔۔ میرے بدن سے۔ میرے ہی ہاتھوں سے" وہ اب قدرے صاف آواز میں بول رہی تھی۔۔۔ اس کی آواز شاید وقار الحسن نے بھی سن لی تھی۔ وہ ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا اور ہونقوں کی طرح خلا میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"کوثر۔۔۔ کوثر!" وہ چیخ اٹھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اس کی آواز سن رہا ہے۔ "لوٹ آؤ کوثر۔۔۔ میں گھر والوں کو کیا جواب دوں گا۔۔۔ تمہیں کس نے مارا ہے کوثر۔۔۔ بتاؤ میں لوں گا اس سے انتقام۔۔۔ واپس آ جاؤ کوثر!" وہ ہواؤں میں ہاتھ چلا رہا تھا۔

"وقار الحسن۔۔۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اس کائنات کے [illegible] اور [illegible] سب سے طاقتور ذات خدا کی ہے۔ میں لوٹ [illegible] ہوں' نہ اپنے بدن کو دوبارہ حیات دے سکتی ہوں مگر [illegible] تم اسے جس قدر ہو سکے زندہ رکھنا۔ اپنے ہمزاد کو یہ [illegible] دے کر لوٹ جانا۔ ابا کے پاس۔۔۔ وہ سوامی ہے وقار۔۔۔ [illegible] زدہ۔ وہ یہیں ہے۔ وہ سب کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا [illegible] اور۔ سن۔۔۔ سن رہے ہو ناں؟" اس کی آواز اچانک ہی [illegible] معدوم ہونے لگی۔ اس کا اوپر اٹھتا ہوا سایہ بہت بلند ہو گیا۔ [illegible] اسے دیکھ رہا تھا جبکہ وقار الحسن صرف اس کی آواز سن [illegible] تھا۔

"کوثر۔۔۔ کوثر؟" وہ پھر دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔

میں خود بھی اسے یوں تیزی سے اوپر جاتا دیکھ کر حواس [illegible] ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوثر رکنا چاہتی ہو مگر کوئی [illegible] گھسیٹ رہا ہو۔ اس کی گھٹتی ہوئی آواز اچانک [illegible] خراہٹ میں بدل گئی مگر وہ شاید پھر بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ [illegible] کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ پھر یہی غرغراہٹ بھنبھناہٹ میں [illegible] تبدیل ہو کر اچانک معدوم ہو گئی۔

اس کی آواز معدوم ہوتے ہی پوری حویلی میں قیامت کا سناٹا چھا گیا۔ ہر چیز ساکت ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہوا [illegible] رک گئی۔ آنگن میں اڑتے سوکھے پتے جیسے پتھرا گئے۔ [illegible] آسمان سے زمین تک ہر چیز جیسے بے جان اور خاموش [illegible] ہو گئی۔ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے وقار الحسن کی [illegible] پلکیں تک جھپکنا بھول گئیں۔ مجھے اس بے پناہ خاموشی سے [illegible] خوف آنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے وقار الحسن بھی مر گیا ہو۔ [illegible] جیسے وہ میرے چھوتے ہی زمین پر لڑھک جائے گا' میں بے [illegible] چین ہو گیا۔ میں نے سناٹے کو توڑنا چاہا۔ دھیرے سے وقار [illegible] الحسن کو پکارا تو خود اپنی آواز کے دھماکے کی سی گونج سے [illegible] خوفزدہ ہو گیا۔ لیکن اس سے اتنا ہوا کہ وقار الحسن اپنے [illegible] حواسوں میں آ گیا۔ اس کی پلکیں لرزا اٹھیں۔ ہونٹ کانپ [illegible] گئے۔ اس وقت مجھے وہ بہت برا لگا۔ مردانگی تو اس میں جیسے [illegible] تھی ہی نہیں۔ اتنا کچھ حاصل کر کے بھی اس کی حالت [illegible] عورتوں والی تھی۔ ویسے ہی خوفزدہ ہونا' ویسے ہی بلک بلک کر [illegible] رونا' ویسے ہی ہمت ہار دینا اور مایوس ہو جانا۔

میں وقار الحسن کو ایک فولادی مرد کی صورت میں دیکھنا [illegible] چاہتا تھا۔ اپنی طاقت پر گھمنڈی' پُر اعتماد' اکڑ کر چلنے والا' ہر [illegible] خطرے میں بے سوچے سمجھے کود جانے والا مگر اس چھوٹی [illegible] سی ٹائپ کے وقار الحسن نے تو مجھے جھنجلا کر رکھ دیا تھا۔ [illegible] میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ اسے ایسا فولادی بنا کر [illegible] چھوڑوں گا کہ وہ خود بھی یاد رکھے گا۔ میں اگر اس کی جگہ [illegible] ہوتا اور اتنی طاقت حاصل کر چکا ہوتا تو پوری نہیں تو آدھی

دنیا کو تگنی کا ناچ نچا ہی دیتا۔ بہرحال میں اس وقت صدمے کے اس نشے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس نے اسے پتھرا کر رکھ دیا تھا۔ ویسے اس کا پتھرا جانا کوئی تعجب خیز نہیں تھا۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ کوثر اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ وہ کوثر جسے کچھ ہی دیر پہلے تایا اماں' چچا' چچی اور جمالی آپا وغیرہ صرف وقار الحسن کے کہنے میں آ کر یہاں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ وہ کوثر جسے سینے سے لگا کر رونے کی آرزو تایا کے دل میں اب بھی ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ وہ کوثر جس کی ماں ابھی اسے پہچانی بھی نہیں تھی۔ اور وہ کوثر جس کی تمام تر ذمے داری خود وقار الحسن پر تھی۔ جسے چھوڑ کر جانے والے لوگ ابھی مراد آباد پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ وہ دنیا چھوڑ گئی۔ اس کی موت کی خبر گھر میں کیسا کہرام اٹھائے گی' اس کا مجھے بھی خوب اندازہ تھا مگر میں اور وقار الحسن دونوں مجبور تھے۔ کاش وہ گھر والوں کے سامنے ہی مر گئی ہوتی تو آنے والے لمحوں کی چاپ اتنی خوفناک نہ ہوتی۔

میں جانتا تھا کہ وقار الحسن اس کی موت کی خبر دینے سے پہلے ہی مر جانا بہتر سمجھے گا مگر مجھے یہ بھی احساس تھا کہ حقائق سے پردہ پوشی زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے۔ وہ مر چکی تھی' یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی' میں اور وقار الحسن اسے ناقابل تسخیر اور لافانی سمجھ کر سب کچھ اس پر چھوڑ بیٹھے تھے' یہ ہماری بہت بڑی حماقت تھی۔ اب ہمیں اپنی اس حماقت سے باہر آ کر حقائق کا سامنا کرنا تھا۔ حویلی اب بھی سوامی کی دسترس میں تھی۔ مرزا صولت بیگ کی نسل' اس کے اقربا سب چاند کے اب بھی قیدی تھے۔ سنہرے بابا وقار الحسن سے ناراض تھے۔ جن بابا اس سے بیزار تھے۔ سادھو اب بھی پیش بند کے حصول کے لیے تڑپ رہا تھا اور وقار الحسن' بالکل بے بس تھا۔ اس سلسلے میں شرف الدین میری مدد کر سکتا تھا مگر یہاں پھر وہی مسئلہ تھا کہ شرف الدین کو سمجھانے کے لیے میرے پاس طاقت ہونا ضروری تھی اور طاقت حاصل کرنے کے لیے پہلے وقار الحسن کو نارمل کرنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے میں نے اسے سنبھالا۔ میں اس کے اندر پہنچ گیا۔ میرے اندر آنے سے اس کے ساکت وجود میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔

"وقار الحسن۔" میں نے موقع غنیمت جانا۔ "کیا تم خود کو کچھ تبدیل محسوس کر رہے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ ہاں۔" اس نے ٹوٹے ہوئے انداز میں جواب دیا پھر دیوار میں نصب کوثر کی لاش کو تکنے لگا۔

یہاں بلا کی ٹھنڈ تھی۔ یخ بستگی تھی۔ "چلو کمرے میں چلو۔ یہاں تو تم جم جاؤ گے۔" میں نے گویا اسے حوصلہ دیا۔

وہ اچانک وحشت زدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "ا۔۔۔ بے۔۔۔ اسے

یہاں۔ یوں چھوڑ کر چلا جاؤں؟" وہ چیخ اٹھا۔

"وقار الحسن! دیکھو... تم مرد ہو۔ تمہیں حالات کا مردانگی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ جو کچھ کوثر نے کہا ہے' اسے یاد کرو۔ اس کے کہے پر عمل کرو۔ اس کی خواہش کا احترام کرو۔ اب وہ نہیں ہے... سب کچھ تمہیں کرنا ہے۔ تمہیں اکیلے کرنا ہے سب کچھ اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے' مسلسل غیر معمولی عمل ہے جسے اس حالت میں جاری رکھنا ممکن نہیں۔ تمہیں ہمت پکڑنا ہوگی۔ وہ مرچکی ہے۔ یہ حقیقت ہے اور اسے تسلیم کرنا تمہاری مجبوری ہے کہ تم اس سے منکر بھی نہیں ہوسکتے۔ بہتر یہی ہے کہ خود کو سنبھالو سوچو اور اگلا قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤ تاکہ تمہارا نقصان کم سے کم ہو؟ وہ تمہیں بتاگئی ہے کہ سوامی یہیں ہے۔ اسی حویلی میں۔ اس کی کہی ہوئی باتیں یاد کرو' سب کچھ کھل کر تمہارے سامنے آجائے گا وقار الحسن۔ تمہیں اپنے پردادا' دادا اور باپ کا ہی نہیں اب کوثر کا انتقام بھی لینا ہے۔ وقت ضائع نہ کرو کہ اس گنتی میں اضافہ ہو۔ شرف الدین کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تایا بے تاب ہوکر خود ہی لوٹ آئیں۔ یہ نہ ہو کہ کچھ سوچنے سے پہلے ہی سب کچھ غلط ہوجائے۔ اس کی موت کی خبر کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں ہوگی وقار الحسن مگر تم اپنی حکمت عملی سے اس خبر کے بعد ہونے والی تباہی کی شدت کو کم کرسکتے ہو؟؟"

وہ بے چین ہوگیا۔ میری باتیں اس کے پتھریلے جسم کو موم بناگئیں۔ وہ جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے اضطراری کیفیت میں کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھا پھر اسے جھرجھری آگئی۔ یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اس نے برآمدے کے اس حصے کی یخ بستگی کو تو محسوس کرلیا ہے' گویا وہ پورے حواسوں میں ہے۔ "تم... ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں کچھ کرنا ہے... کچھ سوچنا ہے' اس سے پہلے کہ کچھ اور غلط ہوجائے..." وہ سرگوشی کررہا تھا۔ "مگر اسے یہاں چھوڑنا..." وہ اچانک ٹھٹک کر کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔ "تم... تم اس کے بدن کو زندہ رکھ سکتے ہو۔ ہاں اس نے بھی یہی کہا تھا۔" وہ اچانک ٹہلنے لگا۔ "کیا تم اس کے بدن میں داخل ہوسکتے ہو؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں اس سلسلے میں لاعلم ہوں۔" میں خود بھی اس کے اس سوال پر ششدر رہ گیا' یہ خیال مجھے نہیں آیا تھا حالانکہ کوثر نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کے بدن کو زندہ رکھا جاسکتا ہے۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ تم چاہو تو تمہارا ہمزاد میرے بدن کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ یہ میرے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے میں خود میں کچھ عدم محسوس کررہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کے کہے پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"تم ایسا کرسکتے ہو۔" وقار الحسن نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کرختگی تھی یوں جیسے وہ مجھے حکم دے رہا ہو۔ "میں... میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوگیا تو... تو بڑا معجزہ ہوگا کم از کم میرے لیے۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر کوثر کے بدن کو چھوا۔ اس کا بدن ابھی کچھ گرم تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس قدر ٹھنڈک میں مردہ ہوجانے کے باوجود اس کے بدن میں خفیف سی حرارت موجود تھی۔ میں نے اس کے بدن میں داخل ہونے کی کوشش کی اور میں اس کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا احساس مجھے اس شدید اذیت کی وجہ سے ہوا جو میں نے اپنے پیٹ میں محسوس کی' بالکل اس جگہ جہاں سے بھالا آرپار ہوا تھا۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ میں بے ساختہ چیخ مار کر پھر بدن سے باہر آگیا۔

"اوہ... اوہ... خدایا... تیرا شکر ہے۔" وقار الحسن خوشی سے بے قابو ہوگیا۔ "جاؤ... واپس جاؤ۔ کوثر زندہ ہوگئی تھی۔ زندہ ہوگئی تھی وہ۔"

"وہ کوثر نہیں تھی میں تھا۔" میں جھنجلا گیا۔ "اسے یہاں سے اتارو۔ میں اس تکلیف کو برداشت کرنے دوبارہ اس کے بدن میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ یہ ناگواری یہ ظاہر تھی ورنہ اس تجربے نے مجھے بھی اتنا ہی خوش کردیا تھا جتنا کہ وقار الحسن خوش ہوا تھا۔ اس کی خوشی اور میری خوشی میں فرق صرف اتنا تھا کہ مجھے خوشی کوثر کے زندہ ہونے سے نہیں ہوئی تھی یعنی اس کے بدن کے زندہ ہونے سے نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ خوشی کسی بھی مردہ جسم کو حاصل کرنے کی طاقت سے آگاہی پر ہوئی تھی۔ اگر میں یہ بات پہلے ہی جانتا تو مجھے وقار الحسن کی اتنی منت نہ کرنا پڑتی' پھر میں ایسے ہی دوسرے طریقے سوچتا۔ بہرحال اس سے اگر وقار الحسن کو بھی فائدہ ہورہا تھا اور وہ میرے لیے مزید طاقت بھی حاصل کرسکتا تھا تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ویسے کوثر کے بدن میں داخل ہونا میرے لیے کوئی بہت خوش گوار بات نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں' میں کسی تنومند اور جوشیلے مرد کے بدن میں جانا زیادہ پسند کرتا۔ بہرحال یہ شروعات تھی۔ میں اس وقت خود کو ذنی گاؤدی محسوس کررہا تھا محض اس لیے کہ میں اب تک وقار الحسن کو بودا! سمجھتا آیا تھا کہ وہ حاصل کی ہوئی طاقتوں سے کوئی کام نہیں لے رہا۔ خود میں بھی اس سے کچھ مختلف نہیں نکلا تھا بلکہ میں تو خود اپنی طاقتوں سے قطعی انجان تھا اور گویا لکیر کا فقیر بنا ہوا تھا۔

"اسے اتارنا آسان نہیں ہوگا۔" وقار الحسن کی خود کلامی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پھر کوثر کے بدن کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے بیچوں بیچ نصب تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد صرف اتنی ہی کرسکتا ہوں کہ باہر سے سیڑھی اٹھا لاؤں۔" اتنا کہہ کر میں برآمدے سے باہر چلا گیا۔

"باہر شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہم گھنٹوں سے برآمدے میں تھے اور وقت کے گزرنے سے قطعی بے خبر رہے۔ میں نے سیڑھی برآمدے میں پہنچادی۔ وقار الحسن نے کسی نہ کسی طرح تقریباً آدھے گھنٹے میں کوثر کی لاش سے وہ بھالا نکالنے کی بجائے اس کی لاش کو اس بھالے سے نکال لیا۔ ایسا صرف اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس بھالے کا پچھلا سرا بھی نوکیلا تھا۔ ورنہ شاید اس کے پیٹ کا باقی حصہ بھی پھٹ جاتا۔ خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ میں نے وقار الحسن کو مشورہ دیا کہ وہ حکیم علی احمد کو لے آئے۔ لے دے کر وہی قابل اعتبار تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ حویلی کے واقعات اور پراسراریت سے بھی کسی حد تک واقف تھے' بلکہ مجھے تو ان کی گہری خاموشی سے شبہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی جانتے ہیں مگر وقار الحسن نے کبھی ان سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی اس لیے انہوں نے بھی کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میں نے یکایک فیصلہ کرلیا کہ میں ان کے ذہن کو کرید کر اصل بات نکال لوں گا۔ اگر وہ وقار الحسن کے باپ دادا کے راز دار رہے ہیں تو انہیں کو حالات کی سنگینی کا احساس دلایا جاسکتا ہے بلکہ ان سے کافی مدد لی جاسکتی ہے۔ بہرحال وقار الحسن کو میں نے سمجھا دیا کہ وہ کوثر کے زخمی ہونے کی اطلاع دے کر انہیں لے آئے۔ اس موقع پر وہی ہماری مدد کرسکتے تھے۔ وقار الحسن کوثر کی لاش کو کاندھے پر ڈال کر ہال والے کمرے میں لے آیا۔ سخت سردیاں تھیں اس لیے لاش کے اتنی جلدی خراب ہونے کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ طے یہی ہوا کہ جب وہ حکیم علی احمد کو لے کر حویلی میں داخل ہوگا تو میں کوثر کے بدن میں چلا جاؤں گا۔

وقار الحسن کے جانے کے بعد میں نے کوثر کی کہی ہوئی بات اور ہر لفظ کو ذہن میں دہرا کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش شروع کردی جو اس کے ٹوٹے ہوئے الفاظ میں سنی تھی۔ میں جوں جوں سوچ رہا تھا' مجھ پر انکشافات ہورہے تھے۔ بات پوری طرح میری سمجھ میں آچکی تھی گو اس کے کہے ہوئے چند الفاظ اب بھی مفہوم سے ناآشنا تھے مگر پھر بھی مجھے ڈھارس تھی کہ میں اور وقار الحسن مل کر ان الفاظ کا مفہوم بھی جان جائیں گے۔ شاید میں کچھ اور دیر سوچتا تو جان ہی جاتا کہ اچانک حویلی کے گیٹ کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز نے مجھے چونکا دیا غالباً وقار الحسن حکیم علی احمد کو لے آیا تھا۔

"آیئے تشریف لایئے۔" وقار الحسن کی آواز دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ میں پل بھر میں کوثر کے بدن میں داخل ہوگیا اور شدید تکلیف سے میری کراہیں نکل گئیں۔ "آہ... آہ..."

"بس بیٹا بس۔ گھبراؤ نہیں۔" حکیم صاحب فوراً میرے قریب آبیٹھے۔ وقار الحسن کے ہاتھ میں ایک ڈبا نما اٹیچی کیس تھا۔ اس نے فوراً اسے کھول کر حکیم صاحب کی طرف بڑھادیا۔

"تم تو بہت بہادر بچی ہو۔ تم منجھلے مرزا کی بیٹی ہو نا۔ بھئی تمہاری ہمت کی تو بڑی تعریفیں سنی ہیں ہم نے۔" حکیم صاحب شاید نفسیات بھی پڑھے ہوئے تھے۔ اپنی نرم اور شفیق آواز سے وہ مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے اس ڈبے میں کچھ تلاش کررہے تھے۔

"بہت تکلیف ہے حکیم صاحب!" میں بولا تو خود ہی حیران پریشان ہوکر چپ ہوگیا۔ میں خود بھی دھوکا کھاگیا۔ مجھے لگا جیسے میں نہیں خود کوثر بولی ہو۔ وقار الحسن کی آنکھوں میں لحہ بھر کو حیرت چمکی پھر اس کی آنکھوں سے خوشی جھلکنے لگی۔ یہ دوسری کامیابی تھی' میری بھی اور وقار الحسن کی بھی۔ ثابت ہوگیا کہ میں جس بدن کو اختیار کروں گا اسی کی آواز دراصل میری آواز ہوگی۔

حکیم صاحب ذرا سا مسکرائے پھر بولے۔ "ہاں بیٹی تکلیف ہی تو ہوتی ہے جب کوئی کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بلاتا ہے' تکلیف نہ ہوتی تو بھلا وقار الحسن یہاں ہمیں کیوں بلاتے۔"

وہ باتیں کرکے میری توجہ ہٹانا چاہتے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئے تھے۔ میرے اندر اچانک ہی ان کا ذہن کریدنے کا خیال آیا۔ میں نے ان کے ذہن کو ٹٹولا تو جو جان پایا اس نے مجھے مبہوت کردیا۔ وہ بہت سے ان معاملات کے بارے میں جانتے تھے جنہیں وقار الحسن کے خاندان نے سب سے چھپایا ہوا تھا۔ مثلاً وہ جانتے تھے کوثر معذور تھی اور ٹھیک ہونے کے بعد گھر چھوڑ گئی وہ بہت سی طاقتیں حاصل کرکے لوٹی ہے اور اب حویلی کو چاند کی قید سے آزاد کرانے کے لیے یہاں رکی ہوئی ہے۔ وقار الحسن کے دادا کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ ان کے ساتھ اس سربستہ راز کو تلاش کرنے میں کوشاں رہے تھے۔ وہ سوامی جی سے بھی مل چکے تھے۔ وہ جانتے

کہ شکنتلا کی روح ایک عرصے تک حویلی میں چکراتی رہی۔ انھیں پرکاش کے قتل کا علم بھی تھا۔ وہ اب بھی ایک ایسے شخص سے واقف تھے جو کبھی سوامی کا دوست ہوا کرتا تھا مگر پھر کسی بنا پر اس کا دشمن بن گیا اور وہ چاہتے تھے کہ منجھلے مرزا ان سے اس موضوع پر بات کریں تو وہ انہیں اس شخص کے پاس لے جائیں جو سوامی سے ٹکر لینے کی پوری پوری ہمت اور طاقت رکھتا تھا۔ انہیں اس وقت میری حالت دیکھ کر حویلی والوں کی بے عقلی پر رونا آرہا تھا کہ انہوں نے ایک بچی اور ایک بچے کو اتنے سنگین معاملات سے نمٹنے کے لیے یہاں چھوڑ دیا تھا۔

"ہاں بیٹا۔۔ کچھ آرام ملا؟" اچانک ان کے پوچھنے پر میں یہ رابطہ توڑ بیٹھا۔ انہوں نے غالباً" میرے پیٹ کے زخم پر کوئی مرہم لگایا تھا۔ مجھے واقعی کچھ آرام محسوس ہو رہا تھا۔ تکلیف کی شدت اتنی نہیں تھی جتنی پہلے محسوس ہوتی تھی۔

"جی بہت۔ بہت فرق ہے۔" میں نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

"حکیم صاحب! یہ زخم یہ تو بہت بڑا ہے۔ اس مرہم سے ٹھیک ہو جائے گا؟" وقار الحسن نے آگے بڑھ کر زخم دیکھ کر پوچھا۔

"انشاء اللہ ہم پوری کوشش کریں گے۔ تم یہ نسخہ لے جاؤ۔ عطا الرحمٰن پنساری سے کہنا' میں نے مانگا ہے۔" اتنا کہہ انہوں نے ایک کاغذ وقار الحسن کی طرف بڑھا دیا۔

وقار الحسن نے جانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ میرے زخم کو روئی میں لگے مرہم سے تھپتھپاتے رہے۔ بڑی دیر تک مختلف دوائیں اور مرہم لگا کر انہوں نے میری تکلیف کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے دو گولیاں مجھے دیں کہ میں انہیں چبا کر کھالوں۔ میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا۔ گولیاں نسیلی تھیں۔ یہ گولیاں کھانے کے بعد میں نے کچھ غنودگی محسوس کی۔ پتا نہیں کس وقت میں سو گیا۔ میری نیند ٹوٹی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک کونے میں رکھی لالٹین کی ناکافی روشنی کمرے کے تھوڑے ہی سے حصے تک محدود تھی۔ کمرے میں وقار الحسن نہیں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پیٹ کی تکلیف حیرت انگیز حد تک کم تھی۔ میں نے وقار الحسن کو آواز دی۔ جواب میں دور تک سناٹا چھایا رہا۔ میں گھبرا گیا کہ وقار الحسن کو کچھ ہو نہ گیا ہو لیکن میری گھبراہٹ بڑھنے سے پہلے ہی وہ کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

"بجلی نہیں آرہی۔" اس نے مجھے بیٹھا دیکھ کر کہا۔

"تم اب کیسی ہو؟"

"کیسی ہو نہیں' کیسا ہوں۔" میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "وقار الحسن! یہ زخم قدرے بہتر ہو چکا ہے مگر میں اس کمزور اور خون کی کمی کے شکار بدن میں زیادہ عرصہ نہیں گزار سکتا۔ تم نے کچھ سوچا ہے کہ اب کیا کرنا ہوگا؟" میں فوراً" ہی مطلب کی بات پر آگیا۔

"میں ان آٹھ گھنٹوں میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔" اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا اور لالٹین تپائی پر رکھ کر میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب مجھے اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک انتہائی بوسیدہ اور موٹی سی کتاب نظر آرہی تھی جس کی جلد کا کافی حصہ جھڑ چکا تھا شاید اسے دیمک کھا چکی تھی۔

"آٹھ گھنٹے؟"

"ہاں۔۔ تم آٹھ گھنٹے تک سوتے رہے ہو۔ اس دوران میں' میں نے کوثر کی کتابوں میں سے یہ کام کی کتاب نکال لی۔ یہ بڑی کار آمد کتاب ہے۔ اس سے بڑی رہنمائی ملی ہے۔" وہ لمحہ بھر کو چپ ہو کر اس کتاب کو تکنے لگا۔ "ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے کوثر!"

"میں کوثر نہیں ہوں۔" میں جھنجلا گیا۔ "تم مجھے وقار کہہ کر مخاطب کرو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے بھی زیادہ جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ "تم وقار الحسن نہیں ہو اور یوں بھی اس وقت تم کوثر کے روپ میں ہو۔ تمہیں کوثر کہنا ہی مناسب ہے ورنہ کسی نے سن لیا تو مجھے پاگل سمجھے گا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ مجھے کوثر ہی کہے اور سمجھے سو میں چپ ہو گیا پھر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو وہ جان گیا ہے۔

"یہ کتاب دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ لگتا ہے کہ کوثر تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس میں جو کچھ بھی ہے' وہ تمہارے ہی بارے میں ہے یعنی نفس امارہ کے بارے میں۔ ہمزاد کیا ہوتا ہے؟ اسے کس طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ کس طرح اسے طاقت ور بنایا جاتا ہے اور وہ کیا کیا کچھ کر سکتا ہے' ساری تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔ اس سے پتا چلا ہے کہ تم کوثر کے بدن کو زیادہ عرصے تک اپنے استعمال میں نہیں رکھ سکتے۔ کسی بھی بدن کو تم ایک مقررہ وقت تک ہی استعمال میں لا سکتے ہو۔ بدن کی اصل روح نکل جانے کے بعد ہی اس میں ٹوٹ پھوٹ اور سڑ جانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کسی بھی بدن میں تم اس وقت داخل ہو سکتے ہو جب اس میں کچھ نہ کچھ حرارت موجود ہو۔ کسی ایسے جسم کو جو ٹھنڈا ہو چکا ہو تم استعمال

نہیں کر سکتے۔ اسے زیادہ سے زیادہ دیر تک استعمال کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اسے لمحہ بھر کے لیے بھی خالی نہ چھوڑو۔ اگر بہت مجبوری میں تم نے اسے خالی کر دیا تو اس میں دوبارہ داخل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کی حرارت پہلے کی نسبت بہت کم ہو جائے گی اس دوران میں اس میں تعفن بھی پیدا ہو سکتا ہے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب مجھے کوثر کے جسم کو خالی نہیں چھوڑنا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہم تایا کے پاس نہیں پہنچ جاتے۔ کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں کر دیتے کہ کوثر ان کے پاس جا کر مرے ہو۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم فوراً" مراد آباد چلے جائیں۔ وہاں ایسے حالات پیدا کر دیں کہ تم ان لوگوں کے سامنے اس کا بدن چھوڑ دو۔ اس طرح اس کی موت کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہو سکے گی۔ وہ لوگ خود سے مرتا ہوا دیکھ لیں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ پھر ہمارے مشن کا کیا ہوگا؟ سوامی جی کو تلاش کرنا' اس حویلی کو آزاد کرانا اور وہ سب کچھ جو کوثر نے تم سے کہا ہے' اسے کیسے پورا کرو گے؟"

"وہ' وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس دوران میں' میں تمہارے لیے ایسے وظائف کرلوں گا جس سے تم طاقت حاصل کرلو اور پھر تمہیں کسی بدن کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اس کتاب میں جگہ جگہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمزاد کسی بدن کو حاصل کرنے کے بعد ہی اپنی طاقتوں سے کام لے سکتا ہے۔"

میں تو یہ سن کر خوش ہو گیا تھا کہ وہ میرے لیے وظائف کرنے میں سنجیدہ ہو چکا ہے۔

"تم فکر نہ کرو۔ ہم کوثر کے معاملے کو بہت سوچ سمجھ کر حل کرلیں گے۔ اگر تم وظائف سے جلدی فارغ ہو جاؤ تو ہم مراد آباد چلے جائیں گے۔"

"ہاں۔۔ میں آج ہی شروع کر دوں گا۔"

"کیا شروع کرو گے؟"

"میں نے جو وظائف نکالے ہیں ان میں تم مجسم ہو سکتے ہو مگر یہ خیالی جسم اتنا طاقتور نہیں ہوگا جتنا کسی انسان کا۔ ہاں اتنا ضرور ہوگا کہ تم جسم حاصل کیے بغیر بھی جاندار چیزوں کو نہ صرف یہ کہ چھو سکو گے بلکہ اگر تم چاہو گے تو وہ تمہاری آواز بھی سن سکیں گے لیکن تمہاری آواز سننے کے لیے اس جگہ اندھیرا ہونا ضروری ہے۔ کسی چراغ سورج یا بلب کی روشنی میں تم اپنی آواز اس تک پہنچانے میں ناکام ہو گے۔"

اس نے بہت کچھ معلوم کرلیا تھا۔ یہ بڑا خوش کن واقعہ تھا۔ کم از کم میرے لیے تو اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات نہ تھی۔ میں پھر اس کی منت سماجت پر اتر آیا۔ اپنی تمام تکلیف بھول گیا۔ حکیم علی احمد کے مرہم اور دواؤں نے جادو کا سا کام کیا تھا۔ میں نے پٹی ہٹا کر اپنا پیٹ دیکھا۔ ادھڑی ہوئی کھال کو سی کر جوڑ دیا گیا تھا۔ اس حصے پر اس وقت بھی ہرے رنگ کا مرہم تھپا ہوا تھا۔

"تم کپڑے بدل لو۔" وقار الحسن نے ایک گلابی رنگ کا جوڑا مجھے دے دیا۔ یہ جہانی آپا کا سوٹ تھا۔ وقار الحسن ایک لالٹین لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ خون میں لتھڑے ہوئے کپڑوں میں عجیب سی بدبو بس گئی تھی۔ ان کپڑوں کو وقار الحسن نے آنگن میں رکھ کر اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ میں نے منہ ہاتھ دھولیا۔ وقار الحسن حکیم علی احمد کو چھوڑنے گیا تھا تو کچھ کھانے پینے کا سامان لے آیا تھا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے پھل کھلائے۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے اچھی غذا لینا چاہیے تاکہ کوثر کے جسم سے بہہ جانے والے خون کی کمی کو پورا کیا جاسکے۔ میں نے اس سے کوئی جرح نہیں کی۔ وقار الحسن ہی سے پتا چلا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ وہ کھانا کھانے کے بعد ہی وظائف کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ کوثر کی موت کے صدمے سے کسی حد تک سنبھل چکا تھا۔

اسی رات وقار الحسن وظائف کرنے بیٹھ گیا۔ وہ غالباً" اپنی ضرورت کی تمام چیزیں بازار سے لے آیا تھا۔ اس نے اماں کے کمرے میں بیچوں بیچ کافور سے سفید دائرہ کھینچ لیا۔ میں وہیں اماں والے پلنگ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک کٹورے میں پانی بھر کر دائرے کے اندر رکھ دیا تھا۔ چار موم بتیاں اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رکھ کر جلائی تھیں۔ کتاب اس کے پاس تھی اس کے عین سامنے اور بھی پتا نہیں کیا الم غلم رکھا ہوا تھا۔ جس میں نمک' سیاہ مرچ کے دانے' لوبان' کسی خاص درخت کے پتے اور پتا نہیں کیا کیا تھا مگر میری توجہ کا مرکز صرف ایک چیز تھی۔ یہ ایک گلاس تھا سفید چینی کا۔ اس کے تلے میں سیاہ مکڑی تھی جو گلاس کی چکنی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی اور پھر تلے میں گر جاتی۔

وقار الحسن نے وظائف شروع کرنے سے پہلے اس کمرے کے گرد آیت الکرسی کا حصار باندھ دیا تھا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا دی تھی۔ باہر رکھی پانی کی صراحی اور اس پر اوندھا ہوا چاندی کا کٹورا بھی اندر رکھ لیا تھا۔ میرے کھانے پینے کا وہ کافی انتظام کر کے بیٹھا تھا۔ موسمی پھل میرے سامنے تپائی پر رکھے تھے۔ اس نے وظیفہ شروع

کرنے سے پہلے ہی مجھے سختی سے تاکید کردی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے' مجھے دروازہ نہیں کھولنا ہے۔ اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ میرا کوئی بھی عمل اس کے وظائف اور توجہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ اس لیے میں اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گیا۔

وہ وظائف کس قدر سخت اور اذیت ناک تھے ان کا اندازہ مجھے بہت جلد ہی ہوگیا۔ کئی بار وقارالحسن کا چہرہ شدید اذیت کی وجہ سے مسخ ہوا' اس کی ناک سے خون کی پتلی سی دھار نکل کر اس کے ہونٹوں سے ہوتی ہوئی ٹھوڑی تک آگئی۔ کئی بار ایسا لگا جیسے کوئی اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھٹکے دے رہا ہو۔ اس کی گردن مروڑ رہا ہو مگر وقارالحسن کی ہمت دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے اس تمام تکلیف اور تشدد کے باوجود وظیفہ نہ توڑا۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہوچکی تھیں۔ پسینا اتنی سردی میں بھی اس کی کنپٹی سے نکل کر کان کی لوؤں تک پہنچ چکا تھا۔ پیشانی پر بھی پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ میں بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے کمرے کا دروازہ دھڑدھڑا دیا۔

"کون ہے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ مجھے یاد آگیا کہ وقارالحسن نے تاکید کی تھی کہ دروازہ کسی حال میں نہیں کھولنا ہے۔ وقارالحسن اسی طرح منہمک تھا بیٹھے بیٹھے میرے پیٹ کے زخم میں تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اس منحوس بدن سے فوراً" نکل جاؤں مگر یہ سوچ کر اس پر عمل نہیں کیا کہ وقارالحسن میرے لیے اتنی اذیت برداشت کررہا ہے تو مجھے بھی اس کی منشا کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس منحوس بدن کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اسی میں محبوس رہتا۔ میں لیٹ گیا۔

دروازے پر دستک کی آواز ہیبت ناک حد تک جا پہنچی تھی۔ مجھے بار بار خیال آرہا تھا کہ یہ آواز تو چار محلے آگے تک جارہی ہوگی۔ محلے والے خوف زدہ ہوچکے ہوں گے پھر اسی لمحے آواز اچانک بند ہوگئی۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں دم سادھے لیٹا رہا۔ وقارالحسن وظیفہ کرتا رہا۔ اب وہ آنکھیں گلاس پر جمائے کچھ پڑھ رہا تھا' اچانک اس گلاس کے اندر ایک شعلہ سا لپکا اور گلاس سے نکلنے کے لیے بے قرار لکڑی کو کوئلہ بنا گیا۔ اس کے جلتے ہی وقارالحسن نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ زور زور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والا ہر لفظ مجھ میں عجیب سی توانائی بن کر اتر رہا تھا۔ مجھے فرحت کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ گھٹن' وہ کراہیت جو میں اس بدن میں داخل ہونے کے بعد سے محسوس کررہا تھا' وہ زائل ہوتی جارہی تھی۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ میں بہت جلد اپنا مقصد حاصل کرلوں گا۔ وقارالحسن نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ ان وظائف سے کب تک فارغ ہوگا۔ اسے وظیفہ کرتے ہوئے تقریباً" دو گھنٹے ہوچکے تھے۔ اس کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی۔ وہ کسی شرابی کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اچانک اس نے پڑھنے کی رفتار تیز کردی۔ اس کی تیز ہوتی ہوئی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں دھواں بھرنے لگا۔ باہر سے کسی عورت کے بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی عورت زور زور سے رو رہی تھی۔ باہر ہواؤں کا شور بھی بڑھ گیا تھا۔ دھواں اتنا زیادہ ہوگیا کہ میرے لیے وقارالحسن کو دیکھنا بھی مشکل ہوگیا۔ میری آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں سی بھردیں۔

"بس کرو۔ بس کرو وقارالحسن۔" میں بے ساختہ چیخ اٹھا لیکن ایسا لگا جیسے اس قدر شور میں میری آواز گھٹ کر رہ گئی ہو۔ شور بے پناہ بڑھ چکا تھا۔ باہر کوئی سیڑھیوں پر لگا لوہے کا دروازہ بھی دھڑدھڑا رہا تھا۔ کسی بھیڑیے کے غرانے کی سی آوازیں بھی بڑھتی جارہی تھیں۔ پھر شاید بجلی کڑکی تھی۔ ایک زوردار کڑک کی آواز آئی تھی اور اس کے بعد جیسے پوری کائنات پر گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ گہری خاموشی۔ میں نے دیکھا' وقارالحسن اس دائرے کے اندر اوندھا پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا ہے۔ میں پلنگ سے اتر آیا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے آواز دی تو اس نے دھیرے سے ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے تسلی دی۔ میں دائرے کو عبور نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے وہیں کھڑا رہا۔

"تم ٹھیک تو ہو ناں وقارالحسن؟" میں نے پوچھا۔

وہ دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹکا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چند ہی گھنٹوں میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے بالکل سیاہ ہوچکے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا پھر پلکیں جھپک کر اپنے ٹھیک ہونے کی اطلاع دی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں بات کرنے کی بھی ہمت نہ ہو۔ چاروں موم بتیاں بجھ کر دھواں دے رہی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ گو وہ اب اتنا گاڑھا نہیں تھا جتنا کچھ دیر پہلے تھا۔ وقارالحسن نے کٹورے میں بھرے پانی میں انگلیاں ڈبو کر ان انگلیوں سے اپنے گرد کھینچا ہوا دائرہ مٹا دیا پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ تھام لیا۔ اسے سہارا دیا اور کھڑا کردیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پلنگ تک آیا اور پھر پلنگ پر ڈھے گیا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔

"پانی پیو گے؟" میں نے سوال کیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے وہاں رکھی صراحی سے پانی کا کٹورا بھرا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وقارالحسن بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازے کی جھریوں سے دن کی روشنی رینگ کر اندر آرہی تھی گویا صبح ہوچکی تھی۔ حویلی پر سناٹا طاری تھا۔ میں خود کو مسرور محسوس کررہا تھا۔ اس لمحے مجھے وقارالحسن پر بڑا پیار آرہا تھا۔ اس نے میرے لیے کتنی تکلیف برداشت کی تھی۔ میں نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ بال پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ میں ہاتھ کا پنکھا لے کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اسے پنکھا جھلنے لگا۔ پھر اس سچویشن پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس وقت اگر وقارالحسن کی اماں یہاں موجود ہوتیں تو شاید میرا منہ ہی نوچ لیتیں۔ ان کے خیال میں تو کوثر جادوگرنی بن کر اب پوری طرح وقارالحسن کو قابو کرچکی ہے۔ یہ منظر اگر شرف الدین صاحب دیکھ لیتے تو بھی بات سنگین حد تک بگڑ سکتی تھی۔ میں یہ سب سوچ کر خوش ہوتا رہا۔ میں کیونکہ کافی دیر سو چکا تھا اس لیے مجھ پر نیند کا غلبہ نہیں تھا لیکن کرنے کو اور کچھ تھا بھی نہیں اس لیے میں بھی برابر والے پلنگ پر جا لیٹا۔ میں وقارالحسن کو جی بھر کر سونے دینا چاہتا تھا کہ وہ تازہ دم ہوکر اٹھے پھر ہمیں آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

☆☆ ○ ☆☆

شاید میری بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ میں اٹھا تو وقارالحسن چائے پی رہا تھا۔

"تم۔۔۔ جاگ۔۔۔ گئے؟ اب کیسے ہو؟" میں فوراً" اٹھ بیٹھا۔

"چائے پیو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ کھانے پینے کا مزہ صحیح معنوں میں تو اب آرہا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں چائے اور پاپے تھے۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر وقارالحسن نے مجھے بتایا کہ میں بہت سی طاقتیں حاصل کرچکا ہوں۔ اب میں وہ سب کچھ کرسکتا ہوں جس کے نہ کرنے کا مجھے قلق تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اس کا ساتھ دوں گا۔ اس کے گھر والوں کی عزت اور احترام کا پاس کروں گا۔ ایسی کوئی حرکت کبھی نہیں کروں گا جس سے خود وقارالحسن کی عزت نفس پر زد پڑتی ہو یا اس کی عزت کو دھبا لگنے کا اندیشہ ہو۔

وعدے وید میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے اس لیے میں نے بلا کسی پس و پیش کے تمام وعدے کرلیے۔ ویسے میرا ارادہ کسی بھی طور اسے نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ ہاں وہ جو دنیا کی آسائشوں کو گناہ کے زمرے میں ڈال دیا کرتا تھا' یہ بات مجھے ناگوار گزرتی تھی لیکن اب مجھے اس سے بھی کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں اپنی کسی بھی خواہش کی تسکین کے لیے کوئی بھی مردہ جسم استعمال کرسکتا تھا۔ اس کے لیے اب مجھے وقارالحسن کو قائل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وقارالحسن اس بحث میں زیادہ گہرائی تک جائے اس لیے میں نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے کہا۔ "اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کس کے بارے میں؟" اس نے الٹا سوال کردیا۔

"کوثر کے بارے میں۔ تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ میں کچھ عرصے تک ہی اسے استعمال کرسکتا ہوں۔ بقول تمہارے اس بدن میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے۔"

"ہاں یہ بات کسی حد تک تشویش ناک ہے۔ اسے ٹوٹ پھوٹ کے قدرتی عمل سے بچانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ تم اسے مسلسل استعمال میں رکھو۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ ہم پہلی فرصت میں مراد آباد پہنچ جائیں' تایا وغیرہ کوثر کو دیکھ لیں یعنی تمہیں پھر تم کسی بیماری کا بہانہ کردو اور پھر رفتہ رفتہ اس کی موت کا ڈراما رچا کر اس کے بدن سے آزاد ہوجاؤ۔ میں سوامی جی کو یہاں تلاش کرنا چاہتا ہوں' وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہیں ہیں۔ میں اس پریشانی سے نجات پانے کے بعد ہی سوامی کو تلاش کرسکتا ہوں۔"

اس وقت اس نے عقل مندی کی بات کی تھی اگر وہ مجھے مزید اسی طرح محبوس رکھنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو میں صاف طور پر انکار کردیتا۔ اچھا ہوا کہ بات بنی رہی اور میرا مقصد بھی حل ہوگیا پھر ہم نے شرف الدین کی آمد تک یہیں رہنے کا پروگرام بنالیا۔ میں اپنی طاقت کو آزمانے کے لیے بے چین تھا مگر یہ کوثر میرے راستے کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس دن تمام وقت میں اور وقارالحسن کوثر کے کہے ہوئے الفاظ کی جوڑ توڑ اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس نے چند ایسے الفاظ کہے تھے جو اپنے اندر پراسراریت رکھتے تھے مثلاً اس نے کہا تھا ہڈیاں' پرکاش' دو چھتی' چمگادڑ اور خون میں ڈبو کر مارنا۔ سوامی جی کی موجودگی کی یہاں' اسی حویلی میں نشاندہی بھی کی تھی۔ یقیناً" ان الفاظ کا تعلق سوامی جی سے تھا۔

"ممکن ہے وہ دو چھتی پر ہو۔" اچانک وقارالحسن نے کہا۔ "اور ہاں اس نے چراغ اور دیے کا ذکر بھی کیا تھا۔

چراغ اور دیا ایک ہی چیز ہے پھر اس نے ایسے کیوں کہا؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"ممکن ہے وہ دو چھتی میں کسی چمگادڑ کی شکل میں موجود ہو۔" میں نے جواب دیا۔ میری بات سن کر وقار الحسن لمحہ بھر کو چونکا پھر اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں یوں جیسے وہ کوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یکایک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ جب میں پہلی بار مرزا صولت بیگ کے کمرے میں گیا تھا' شاید شرف الدین میرے ساتھ تھا۔ شاید اسے بھی یاد ہو گا کہ وہاں کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ایک چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی باہر نکلی تھی اور برآمدے میں لگی بڑے وال کلاک سے ٹکرائی تھی لیکن میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا کسی سے ذکر بھی نہیں سنا۔ چمگادڑیں یوں بھی ویران جگہوں پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ بات سو فیصد درست ہو کہ سوامی چمگادڑ کے روپ میں یہاں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع کئے بغیر اس کی تلاش شروع کر دینی چاہیے۔"

"شرف الدین کا انتظار نہیں کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے آج شام تک آجانا چاہئے۔" وقار الحسن نے کھڑکی سے باہر آسمان پر چھائی شفق کی سرخی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "شام تو ہو گئی۔ ارے ہاں' میں بالکل بھول گیا۔ حکیم علی احمد کو لانا ہے۔ تمہارا زخم اب کیسا ہے؟"

اس کے پوچھنے پر میں نے قمیص اٹھا کر اسے زخم دکھایا جو اب بہتر تھا مگر اسے دوا کی اب بھی ضرورت تھی۔ تکلیف قابل برداشت تھی۔ پھر میں حکیم صاحب کی دوائیں باقاعدگی سے کھا رہا تھا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ جب بقول وقار الحسن' بدن میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے تو پھر یہ زخم کیوں اور کیسے ٹھیک ہو رہا ہے۔ جب میں نے وقار الحسن سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ میری موجودگی کی وجہ سے کیونکہ بدن پوری طرح زندہ ہے اس لیے زندگی کا عمل جاری رہے گا مگر جیسے ہی میں اس بدن کو چھوڑوں گا' یہ بدن دو دن پرانی لاش میں تبدیل ہو جائے گا۔ شاید اسی لیے وہ جلد از جلد مراد آباد پہنچ کر کوثر کی موت کا ڈراپا کھیلنا چاہتا تھا تاکہ اس کی لاش زیادہ پرانی نہ ہو۔ بات صحیح تھی۔ یہ سن کر میں نے بھی اسے جلد از جلد مراد آباد چلنے کا مشورہ دیا۔ وقار الحسن کیونکہ شرف الدین کا منتظر تھا اس لیے ہمیں ایک روز کے لیے مزید رکنا پڑا۔ اس رات وقار الحسن نے پھر کچھ وظائف کرنے کا ارادہ کیا جو وہ اپنے لیے کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں' میں خوبصورت خواب دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک انتہائی مضبوط بدن والے تنومند اور خوبصورت نوجوان کے روپ میں اسی کھنڈر کی طرف بڑھ رہا ہوں جہاں میں سادھو کو ریشمی بانہوں اور گھنیری زلفوں کے سائے میں چھوڑ آیا تھا۔

وہ اپنے دونوں پہلوؤں میں' دو جلتے چراغوں ایسے روشن اور چمک دار جسم لیے راجہ اندر بنا بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر کراہیت اور بدن میں ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے دونوں جانب بیٹھی خوبصورت لڑکیاں میرے سنہرے بدن کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ سادھو سے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ وہ زندہ کھوپڑیاں اس کے قریب ہی رینگ رہی ہیں۔ تبھی میں ایک وزنی پتھر سے سادھو کا سر کچل دیتا ہوں۔ اس کا جسم خون میں نہا جاتا ہے۔ کھوپڑیاں اسے چمٹ جاتی ہیں۔ اس کا لہو چاٹنے لگتی ہیں اور میں ان دونوں کے حسن بے پناہ میں کھو جاتا ہوں۔ میرے اندر لذتوں کا آبشار پرشور انداز میں بہنے لگتا ہے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ میرا پورا وجود شہد آگیں ہو جاتا ہے۔ میں ہواؤں میں اڑتا ہوا' بادلوں کو چھوتا ہوا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

یہ میری خواہشات تھیں جو خواب بن کے آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھیں۔ میں اگلی صبح تک ان خوابوں میں گم رہا اور وقار الحسن شاید تمام رات وظائف کرتا رہا۔ میں نہ یہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور نہ ہی اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں تو جلد از جلد اس بدن سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ سو فیصد امید تھی کہ شرف الدین سویرے آجائے گا۔ رات میں اور وقار الحسن باتوں میں بھول گئے کہ حکیم علی احمد کو زخم دکھانا تھا۔ دوسرے دن وقار الحسن سویرے ہی حکیم صاحب کو لے آیا۔ انہوں نے مجھے دوا کھانے کی تاکید کی۔ زخم صاف کر کے مرہم لگایا پھر بڑی دیر تک مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چبھن تھی یوں جیسے وہ آنکھیں میرے آرپار ہو رہی ہوں۔ وقار الحسن اس وقت چائے بنا رہا تھا۔ میں الجھن محسوس کرنے لگا۔ میری الجھن کو شاید حکیم صاحب نے بھی محسوس کر لیا وہ ہلکے سے مسکرائے۔

"تمہاری آنکھوں میں ویرانی بہت ہے۔ لگتا ہے جیسے ان میں زندگی نہیں' موت سانس لے رہی ہے۔" انہوں نے اتنے عجیب لہجے میں کہا کہ میں سکتے میں رہ گیا۔ وہ یہ کہہ کر اپنی دوائیں وغیرہ سمیٹنے لگے یوں جیسے انہوں نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔

میں دم بخود تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ اس جملے سے ان کا کیا مطلب تھا۔ مگر وہ یوں انجان بن گئے تھے کہ مجھے الجھن ہونے لگی۔ "موت؟ میری آنکھوں میں؟" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

انہوں نے ایسی نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ "ہاں موت۔ جو برحق ہے۔ جس پر کسی کا بس نہیں۔ بیٹا اگر زندگی یوں اپنے ہاتھوں بنائی جا سکتی تو کوئی اپنے کسی پیارے کو مرنے نہیں دیتا۔ اسے زندہ رکھنے کو سارے جتن کر لیتا' جو تم لوگ کر رہے ہو۔ ایسی باتیں قدرت کے خلاف ہیں۔ میری یہ انگلیاں۔ ان انگلیوں کی یہ پوریں جب نبض چھوتی ہیں تو اندر کی بیماریاں جان جاتی ہیں پھر۔ پھر تم ایک مردے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہو کہ اسے کیا تکلیف ہے تو؟"

اور میں نے سر جھکا دیا۔ عین اسی لمحے وقار الحسن چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں کیا کہوں مجھے تو شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ احساس تھا کہ ہم نے حکیم صاحب کو دھوکا دینے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو چکی ہے۔ وہ ایسے واضع دار تھے کہ انہوں نے بڑی خاموشی سے یہ دھوکا کھا لیا۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو حویلی سے باہر جا کر قیامت مچا چکا ہوتا۔ ہزاروں داستانیں پھیل چکی ہوتیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کوثر کو مردہ تصور کر چکے ہیں' یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے پھر اس ہنستی بولتی اور کھاتی پیتی کوثر کو کیا سمجھا' کیا جواز دیا' کیا وہ میرے بارے میں جانتے ہیں؟ یہ سوال میرے دماغ میں اپنا پھن پھیلا چکا تھا۔

"حکیم صاحب! چائے۔" وقار الحسن ہمارے درمیان کی پراسرار خاموشی سے بے خبر' ہشاش بشاش تھا۔

"ہاں بیٹا۔ سردی بہت ہے۔ چائے تو بڑی تسکین دے گی۔" انہوں نے مسکرا کر چائے لے لی اور بولے۔ "منجھلے مرزا خیریت سے تو ہیں ناں۔ یہ اچانک مراد آباد کیوں چلے گئے۔ کہہ رہے تھے کہ اب یہیں رہیں گے۔"

"بس حکیم صاحب۔ یہاں کے حالات ہی ایسے ہیں کہ کوئی اپنی مرضی سے پروگرام بنا ہی نہیں پاتا۔ ارادہ تو نہیں تھا جانے کا مگر۔" وقار الحسن نے بھی گول مول جواب دیا۔

"اگر ملکر جاتے تو۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے پھر انہوں نے بڑی تیزی سے چائے پی لی۔ میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ وہ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تو ذرا جھجک کر بولے۔ "جتنی جلدی ہو سکے' اسے مراد آباد لے جاؤ۔" انہوں نے وقار الحسن سے کہا۔ "میں اسے زیادہ دیر تک

دوائیں نہیں دے سکتا بیٹا! قدرت کے آگے کسی کا بس نہیں ہے۔ اس نے حیات اور موت کے درمیان جو فرق اور فاصلہ رکھا ہے' اسے انسان پاٹ نہیں سکتا۔ کوثر کا خیال غلط تھا کہ کسی مردہ بدن کو زیادہ عرصے تک زندہ رکھا جا سکتا ہے اور ہاں۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئے۔ وقار الحسن منہ پھاڑے انہیں تک رہا تھا۔ میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اچانک وہ دوبارہ بولے۔ "اسے مراد آباد جانے تک منفی درجہ حرارت پر رکھو ورنہ۔" اتنا کہہ کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ساکت کھڑے وقار الحسن کے کندھے کو تھپتھپایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

نہ وقار الحسن میں ہمت تھی کہ انہیں روک کر کچھ پوچھتا' نہ میں نے ہی ایسی کوئی کوشش کی۔ وہ چلے گئے اور ہمارے لیے حیرتوں کا طلسم کدہ چھوڑ گئے۔ بڑی دیر بعد وقار الحسن چونکا۔ "چلے گئے؟"

"بہت دیر ہوئی۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"وہ۔ وہ۔ سب کچھ جان گئے ہیں مگر کیسے؟ انہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟" وہ خواب کے عالم میں بول رہا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے وقار الحسن! وہ امروہہ کے مشہور حکیم ہیں۔ سارا امروہہ جانتا ہے کہ وہ نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری کی تشخیص کرتے ہیں۔ کیا کوثر کا بازو تھام کر انہیں پتا نہیں چلا ہو گا کہ وہ مر چکی ہے۔"

"لیکن۔ تم۔ جب تم اس میں ہو تو۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ تم زندہ ہو۔ یہ بدن۔ یہ۔ یہ۔" وہ سخت پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔

"فضول باتیں سوچ کر خود کو ہلکان مت کرو۔ وہ جان چکے ہیں بس اتنا کافی ہے۔ اب اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ بھی جان جائیں یہاں سے نکل چلو۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

"اور شرف الدین۔؟"

"بھاڑ میں گیا شرف الدین۔" میں بری طرح جھنجلا گیا۔ "وہ دو دن اور نہ آیا تو تم یوں ہی بیٹھے رہو گے؟"

"آج وہ یقیناً آجائے گا۔" اس نے پریقین انداز میں کہا۔

شرف الدین کی عمر بہت بڑی تھی۔ وقار الحسن اتنا کہہ کر خاموش ہوا ہی تھا کہ حویلی کے گیٹ کا کنڈا بجنے کی آواز آئی۔ وقار الحسن باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اندر آیا تو شرف الدین اس کے ساتھ تھا۔ میں بڑی بے باکی سے لیٹا رہا۔ وقار الحسن نے مجھے آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا مگر میں نہیں سمجھا۔ شرف الدین میرے سامنے کچھ جھجک رہا تھا۔ بڑا

مودب تھا۔ وقار الحسن کچھ بوکھلایا ہوا تھا پھر اس نے قریب آکر چادر میرے اوپر ڈال دی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کوثر کے روپ میں ہوں۔ کوثر اس سے قبل شرف الدین کے سامنے آئی ضرور تھی مگر باادب رہ کر تھی جبکہ میں بڑی بے حیائی سے لیٹا ہوا تھا گویا یہ میرے لیے ایک الگ مصیبت تھی۔ مجھے قدم قدم پر یہ خیال رکھنا تھا۔ کہ میں لڑکی ہوں اور کوثر ہوں۔ میں مزید جھنجلا گیا۔ "وقار الحسن' جتنی جلد ہوسکے مراد آباد پہنچ جاؤ۔ اماں اپنے مکان میں شفٹ ہونے کا مصمم ارادہ کرچکی ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں یہ کہہ کر روکا ہے کہ وقار الحسن کے آنے کے بعد ہی ایسا کوئی قدم اٹھایئے گا۔ تم تو جانتے ہو کہ وہاں۔"

اتنا کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آچکا تھا کہ شرف الدین تو وقار الحسن کے اس قتل کا بھی عینی شاہد ہے جو اس نے نئے مکان میں کیا تھا' یا اس سے ہوگیا تھا۔ اس نے راز کو راز رکھا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں وقار الحسن کا دوست ثابت ہوا تھا۔ پھر اگر وہ اسے میرے بارے میں بھی بتا دیتا تو کوئی حرج نہ تھا۔ پتا نہیں وہ ایسا سوچ رہا تھا یا نہیں بہر حال میں نے فیصلہ کرلیا کہ اسے سب کچھ بتا دینا ہی عقل مندی ہے۔ اس طرح میں بھی بہت سے خرافات سے بچ جاتا اور شرف الدین کیونکہ سمجھدار آدمی تھا اس لیے وہ وقار الحسن کی بہت مدد کر سکتا تھا۔ ہم آئندہ کا لائحہ عمل طے کر سکتے تھے۔ یہی سوچ کر میں بول اٹھا۔ "وقار الحسن یہ بات بہت خطرناک بھی ہوسکتی ہے اور تم شرف الدین کو کوثر کے متعلق بھی بتا دو۔ یہ ہمیشہ کی طرح تمہاری مدد کرے گا۔"

میری بات سن کر وقار الحسن کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے گھبراہٹ پیدا ہوئی اور شرف الدین نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "کوثر کے متعلق۔؟" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں شرف الدین۔" وقار الحسن نے سر جھکا دیا۔ "یہ کوثر نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر اس نے دھیمے لہجے میں تمام بات اسے بتادی۔ میرے بارے میں تفصیل سے سن کر وہ حیرت زدہ تھا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے لہراتے اور پھر وہ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتا۔ میں نے کئی بار اس کی آنکھوں میں بے یقینی بھی دیکھی۔ شاید وہ اس ساری داستان کو جھوٹ سمجھ رہا تھا مگر میری بیباکی نے اسے کسی حد تک مطمئن بھی کردیا تھا۔

"وقار الحسن! ناقابل یقین ہے یہ سب کچھ۔" اس نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔

"تم تو بہت کچھ دیکھ چکے ہو پھر بھی ناقابل یقین کہہ رہے ہو؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"میں۔ میں نے ہمزاد کے متعلق پڑھا ہے مگر اسے کسی مردہ جسم میں۔"

"ہر ناقابل یقین بات کو درست سمجھا کرو شرف الدین۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ حویلی اور اس کے باسی اس دنیا کے نہیں کسی اور انجانی دنیا کے لوگ ہیں۔"

وہ لوگ کچھ دیر تک اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ وقار الحسن نے اسے حکیم علی احمد کے بارے میں بھی بتایا جسے سن کر وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا بلکہ اس نے صلاح دی کہ ہمیں پھر ان سے مدد لینا چاہئے جسے وقار الحسن نے مسترد کردیا۔ وہ مراد آباد جانے کے لیے بے چین تھا۔ اس بات نے اسے بھی پریشان کردیا تھا کہ اماں ایک خوفناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کرچکی ہیں۔ وہاں جانا گویا نئے عذابوں کو آواز دینا تھا۔ پھر اسی وقت یہ فیصلہ ہوگیا کہ اگلے روز صبح والی ٹرین سے مراد آباد روانہ ہوجایا جائے۔ شرف الدین کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ اب وقار الحسن کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا خود وقار الحسن نے بھی یہی اصرار کیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اماں اور ابا سے اجازت لے کر جلد ہی لوٹ آئے گا۔

اس کے جانے کے بعد وقار الحسن نے جیب میں پڑا پیش بند اپنے گلے میں ڈال لیا اور کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔ مجھے ساری فکر کلپنا اور چمپا کی تھی۔ ہمارے وہاں سے آنے تک چمپا بے ہوش تھی۔ پتا نہیں اس کا کیا ہوا مرگئی یا زندہ تھی۔ اچانک مجھے وقار الحسن کے خراٹوں نے چونکا دیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس لمحے مجھے خیال آیا کہ میں اس منحوس بدن سے باہر آکر دیکھوں۔ کچھ کھلی فضا میں سانس لوں' ان دیواروں سے پار گزر کر دیکھوں' میں نے فوراً ہی بدن چھوڑ دیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر میں اس دیوار کی طرف بڑھا جس کے دوسری طرف وقار الحسن کا کمرا تھا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ دیوار میرے لیے رکاوٹ نہیں بنی۔ میں ہوا کے جھونکے کی طرح اس دیوار کو عبور کرگیا۔ اب میں وقار الحسن کے کمرے میں تھا۔ یہ کمرا کافی دنوں سے بند تھا۔ اس کمرے میں کنگوا قفل ہوا تھا۔ اسی کمرے کے ایک بکس کے اندر سوامی جی اور مرزا صولت بیگ کی فریم شدہ تصویر رکھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس بکس میں ہے۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ میں نے اس میں پڑے قفل کو کھینچا تو وہ موم کی طرح میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے بکس کھولا اور پھر مجھے اچھل کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

بکس کے اندر آگ جل رہی تھی' ایک شعلہ سا تھا جو ... طرف لپکا تھا۔ غیر ارادی اور اضطراری انداز میں' ... پیچھے ہٹ گیا تھا مگر پھر میں نے اپنا ہاتھ بکس میں ڈال ... اوپر ہی وہ فریم شدہ تصویر تھی' میں نے اسے اٹھالیا۔ ... اٹھاتے ہی جیسے میرے چاروں طرف دھماکے ہونے ... تصویر میرے ہاتھ سے گر گئی۔ پوری حویلی میں گاڑھا ... بھرنے لگا۔ میں پل بھر لگائے بغیر اماں والے کمرے ... پہنچ گیا۔ وقار الحسن حواس باختہ سا ناچ رہا تھا۔ اس ... میں دھواں بہت زیادہ تھا۔ میں فوراً ہی کوثر کے ... میں داخل ہوگیا اور وقار الحسن کو آوازیں دینے لگا۔ ... شکر ادا کر رہا تھا کہ وقار الحسن نے مجھے کوثر کے بدن ... باہر نہیں دیکھا ورنہ وہ میری جان کھا جاتا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" وہ چیخا۔

"پتا نہیں۔ تم بیٹھ جاؤ۔ ابھی نہیں نکلنا۔" میں نے چیخ ... کہا کیونکہ اتنے دھماکوں میں ہمیں ایک دوسرے کی آواز ... میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ... ہی دیر بعد دھواں چھٹ گیا۔ گہری خاموشی طاری ... ہم دونوں دم سادھے بیٹھے تھے کہ اچانک میری ... بیعت مکدر ہوگئی۔ اسی وقت وقار الحسن بھی گھبرا کر میرے ... سے اٹھ گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ... میں نے خود میں سے تعفن سا اٹھتا محسوس کیا۔ ... ہی لمحے وقار الحسن نے بھی اپنی ناک دبالی۔

"یہ۔ یہ بدبو۔"

اور احساس ہوتے ہی میں سکتے میں رہ گیا۔ میں نے ... کا بدن چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یہ تعفن اسی ... بدن سے اٹھ رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا اگر وقار الحسن کو یہ ... چل جاتا کہ میں اس بدن کو چھوڑ کر گیا تھا تو وہ میرا دماغ ... کھا جاتا۔ بہر حال موجودہ صورتحال نے دونوں ہی کو بوکھلا ... میں نے اسے کہا کہ وہ فوراً مراد آباد چل پڑے۔ مسئلہ ... کا تھا۔ اتنی بدبو میں تو نہ ٹرین میں سفر کیا جا سکتا تھا اور ... بس میں۔ وقار الحسن فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ اس نے ... تاکید کی کہ میں گھبرا کر بدن نہ چھوڑوں ورنہ وہاں پہنچنا ... ہوجائے گا۔ یہ کہہ کر وہ شرف الدین کو بلانے چلا گیا۔ ... نے اماں کے ایک بکس سے عطر کی شیشی ڈھونڈ نکالی پھر ... عطر کوثر کے بدن پر چھڑک دیا۔ اب بدبو کچھ کم ہوگئی ... وقار الحسن بہت جلد واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ... ین بھی تھا۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ شرف

... دوست کی گاڑی لے آیا تھا۔ یہ فیٹ موٹر تھی۔ اس ... تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں مراد آباد پہنچا دیتی۔ ہم ... بھر کی دیر کیے بغیر مراد آباد روانہ ہوگئے۔ بدبو شرف ... دین نے بھی محسوس کرلی تھی۔ وقار الحسن نے اسے بتا دیا

تھا کہ بقول حکیم علی احمد کے کوثر کا بدن گلنے اور سڑنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ویسے وہ اس بات پر حیران تھا کہ ایسا میرے اس کے اندر موجود ہونے کے باوجود کیسے ہوگیا۔ صبح ہونے کے قریب ہم مراد آباد پہنچ گئے۔ ہم نے طے کرلیا تھا کہ یہی بتایا جائے گا کہ کوثر کی طبیعت اچانک بگڑ جانے کی وجہ سے ہم لوٹ آئے ہیں۔ راستے یہ بھی طے ہوگیا کہ یہاں کسی نہ کسی طرح ایک دو دن گزار کر میں یوں ظاہر کردوں گا کہ جیسے کوثر مر رہی ہے۔ وہ تایا کو بتائے گی کہ وہ حویلی میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی تاکہ وقار الحسن اور شرف الدین کی پوزیشن خراب نہ ہو۔ پھر گویا وہ مر جائے گی یعنی میں اس کا بدن چھوڑ دوں گا۔

ہم اذانوں سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے۔ اماں' تایا' چچا اور گھر کے دوسرے افراد ابھی سو رہے تھے۔ ان لوگوں کی آنکھ عموماً اذان کی آواز سے کھلتی تھی اور ابھی اذان ہونے میں دیر تھی۔ دروازہ تایا نے کھولا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ "تم۔ تم لوگ۔ کیا ہوا۔ خیریت تو ہے ناں۔ کیسی ہے بیٹا تو؟" وہ بالکل بوکھلا گئے تھے۔

"سب خیریت ہے تایا۔ آپ تسلی رکھیں۔" وقار الحسن نے جلدی سے کہا۔

"خیریت ہے تو۔ تو تم لوگ اتنی رات کو وہاں سے کیوں نکلے۔ بیٹا مجھے بتلاؤ کیا ہوا ہے؟" وہ بات کرتے کرتے شرف الدین کی طرف مڑ گئے۔ "تم تو کل ہی گئے تھے۔ بتاتے کیوں نہیں ہو؟" آخر وہ چیخ اٹھے۔ ان کی آواز پھٹ سی گئی۔ یہ آواز شاید اماں تک بھی پہنچ گئی۔ وہ گھبرا کر۔ "کیا ہوا؟ کون ہے؟" پکارتی ہوئی صحن میں نکل آئیں۔

"سب ٹھیک ہے تایا آپ بے وجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی جاگ جائیں گے۔ پریشان ہوجائیں گے۔" میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اماں ہمیں دیکھ کر ہماری طرف لپک آئیں۔ انہیں بھی بڑی مشکل سے یقین دلایا گیا کہ سب خیریت ہے۔ جب ان دونوں کو اطمینان ہوگیا تب وقار الحسن نے بتایا کہ کوثر کے پیٹ میں تکلیف تھی اس لئے ہم نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اس کی تیمارداری کرنا ایک تو مشکل تھا پھر اس بیماری میں یوں بھی وہاں رہنے کا مقصد فوت ہوچکا تھا۔ اب جب کوثر صحت مند ہوجائے گی تبھی وہاں جا کر کچھ کیا جا سکے گا۔

یہ بات تایا اور اماں کی سمجھ میں آگئی۔ وہ لوگ مطمئن ہوگئے۔ تایا البتہ میری تکلیف کا سن کر پریشان ضرور ہوئے۔ میں لیٹ گئی۔ اماں نے جلد ہی ناشتا بنادیا۔ اس دوران میں گھر کے باقی افراد بھی اٹھ گئے۔ سب ہمیں دیکھ کر خوش ہوگئے تھے۔ ناشتے کے دوران میں ہی اماں نے بتایا کہ

وہ اپنے گھر میں منتقل ہو رہی ہیں اور وقار الحسن نے اچھا کیا کہ یہاں چلا آیا۔ اب یہ کام وہ آسانی سے کر سکیں گی۔ وقار الحسن نے فی الوقت کوثر کی یعنی میری بیماری کی بنا پر ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ اماں بھی کچھ نہ کہہ سکیں اور خاموش ہوگئیں۔

شرف الدین کے لئے بیٹھک میں بستر لگادیا گیا تھا۔ وقار الحسن اور شرف الدین وہاں چلے گئے۔ میں برآمدے میں تایا کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد گھر کے دوسرے لوگ تو اپنے کاموں میں لگ گئے مگر تایا میرے قریب مونڈھا ڈال کر بیٹھ گئے۔

"کیا تکلیف ہے بیٹا؟ اور ذرا دن نکل لے تو میں حکیم کو بلا لاؤں گا۔"

"نہیں ابا میں حکیم علی احمد کی دوائیں لائی ہوں۔ وقار الحسن نے انہیں بلالیا تھا۔ انہوں نے دس روز کی دوائیں دی ہیں۔" میں نے صاف جھوٹ بول دیا حالانکہ اب میرے پاس ان کی کوئی دوا نہ تھی۔ دو گولیاں انہوں نے رات میں مجھے کھلادی تھیں اور زخم صاف کرکے مرہم بھی لگادیا تھا۔ دبے الفاظ میں وہ وقار سے کہہ گئے تھے کہ اب یہ ڈراما ختم کردو۔

"تو دوا کھالی ناں؟"

"جی!" میں نے مختصر جواب دے کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکلے جس سے کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے پھر گلوگیر آواز میں بولے۔

"بیٹا۔ تو خود اپنی ماں سے مل لے۔ اسے تو نے کس جرم کی سزا دی ہے۔"

"ابا میں نے بہت کوشش کی پہلے بھی مگر وہ مجھے پہچانتی ہی نہیں۔ میں کیا کروں۔ میں مجبور نہ ہوتی تو کبھی ایسا نہ کرتی۔" میرے انداز میں بیزاری کو شاید انہوں نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ اس بیزاری کا اظہار میں غیر ارادی طور پر کر گیا تھا۔

وہ گہرا سانس لے کر چپ ہوگئے پھر بولے۔ "ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔"

اتنا کہہ کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ نماز میں مشغول ہو جائیں گے۔ کوثر کے بدن کی بدبو کسی حد تک کم تھی۔ میرا خیال تھا کہ ایک دو روز میں گزار ہی لوں گا۔ یوں بھی میں جو غلطی کرچکا تھا اسے بھگتنا بھی مجھے ہی تھا۔ بہرحال دن چڑھنے تک میں نے کافی واویلا مچادیا تھا کہ شدید تکلیف میں ہوں۔ ہر بار تایا حکیم یا ڈاکٹر کو لانے کا ارادہ کرتے اور وقار الحسن، شرف الدین اور خود میں بھی انہیں ایسا کرنے سے منع کردیتا۔ ویسے وقار الحسن کافی گھبرایا ہوا تھا۔ میرے پیٹ کا زخم بھرا نہیں تھا بلکہ مزید خراب ہو گیا تھا۔ زیادہ بدبو وہیں سے آرہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر حکیم یا ڈاکٹر کو لایا گیا تو بات کچھ سے کچھ بن سکتی ہے۔ یہ بھی ڈر تھا کہ میرے جسم چھوڑنے کے بعد بھی یعنی کوثر کے مرنے کے بعد بھی تایا یوں کیسے مانیں گے کہ کوثر مرگئی مگر انہیں بہرحال بات گھر کے اندر ہی رکھنا تھی۔ وہ دن جیسے تیسے گزر گیا۔ تایا اور اماں وغیرہ نے وہ رات جاگ کر گزاری۔ میرے بدن سے اٹھتے ہوئے بدبو کے بھبکے اماں اور تایا کو بھی حیران کرگئے تھے۔ اماں نے تو دادی کی موت کا واقعہ بھی سب کو یاد دلادیا تھا اور پیش گوئی کردی تھی کہ کوثر کی اس حالت کے پیچھے شگفتہ کا انتقام کارفرما ہے۔ تایا بھی دم بخود تھے۔ گھر کے سبھی افراد سہمے ہوئے تھے۔ صرف تائی تھیں جو سب سے دور دور ہشاش بشاش گھوم رہی تھیں۔

اگلے روز تایا بگھر گئے کہ وہ مراد آباد کے سب سے قابل ڈاکٹر کو لینے جارہے ہیں۔ ان کی بات سن کر وقار الحسن، شرف الدین اور میں حواس باختہ ہوگئے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہمارا راز کھلے۔ اس حالت میں مجھے وقت سے پہلے ہی مرنا پڑا۔ عین اس وقت جب تایا سب سے لڑ کر باہر جانے ہی والے تھے کہ میں نے کوثر کا بدن چھوڑ دیا۔ وقار الحسن نے مجھے باہر نکلتے دیکھ لیا اور تایا کو آواز دی۔ "تایا۔ کوثر۔ کوثر ختم ہوگئی!"

یہ جملہ گویا بم کا دھماکا بن کر پھٹا تھا۔ گھر کے سارے افراد کوثر کی لاش کی طرف جھپٹے اور پھر چند ہی لمحوں بعد وہ سب کائی کی طرح پھٹ گئے۔ بدبو کے بھبکے اتنے شدید تھے کہ لگتا تھا جیسے پورا گھر ان بھبکوں سے بھر گیا ہو۔ ہر شخص نے غیر ارادی طور پر ناک بند کرلی۔ ہر ایک کی نگاہ میں دادی کی موت کا منظر گھوم گیا۔ ایک کہرام اٹھا مگر پھر سناٹا چھا گیا۔ موت ایسی خوفناک تھی کہ اس کا چرچا بھی نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ تایا تو لگتا تھا جیسے اب جی ہی نہیں سکیں گے۔ چچی دانتوں میں انگلی دبائے جہانی آپا سے سرگوشی کررہی تھیں۔ "جیسا کیا تھا اس نے ماں باپ کے ساتھ، دیکھ لو کیا حشر ہوا ہے۔"

جہانی آپا اور شنو آپا کے چہرے سفید ہورہے تھے۔ چچا دم بخود تھے۔ اور اماں وہ واحد ہستی تھیں جو نسبتاً "نارمل" تھیں اور سب کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ وہی سب انتظامات کررہی تھیں۔ میں وقار الحسن کے اندر پڑا گویا ہانپ رہا تھا۔ کوثر کے بدن کو چھوڑ کر مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی غلط جگہ تھا۔ تایا صدمے سے بے حال تھے اور جب اماں نے اطلاع دی کہ اسے غسل کرانا ممکن نہیں ہے تو جہاں تایا ادھ مرے ہوگئے وہاں وقار الحسن اور شرف الدین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس لئے کہ غسل کرایا جاتا

تو پیٹ کا سڑا ہوا زخم داستان کھول سکتا تھا۔ بات گھر سے باہر پھیل سکتی تھی۔ وقار الحسن نے اس دوران میں اماں کو بلا کر ہدایت کردی کہ آپ ہی اسے کفن دے دیں۔ یوں بھی اس پڑائد میں نہ کسی کو بلایا جاسکتا تھا نہ غسل و کفن کا انتظام کسی کو سونپا جاسکتا تھا۔ خاندان کے جتنے لوگ مراد آباد میں تھے سب کو اطلاع کرادی گئی تھی۔ عطر کی کتنی ہی شیشیاں اماں نے کچے صحن میں چھڑک دی تھیں پھر اگربتیوں اور لوبان کا دھواں اور خوشبو اتنی تھی کہ بات کچھ حد تک دبی رہی۔ حساس قوت شامہ والے لوگوں نے کچھ محسوس بھی کیا تھا تو کہہ نہ سکے۔ لاش زیادہ دیر نہ رکھی جاسکی اور جلد ہی دفن کے لیے کر روانہ کردی گئی۔

جن حالات میں اور جس طرح کوثر کی موت ہوئی تھی اس سے کہرام کم اٹھا اور خوف زیادہ پھیلا رہا اس لئے حلق پھاڑ کر، یا سینہ کوٹ کر کسی سے رویا نہ گیا، یوں بھی تائی کے سوا کون تھا جو پچھاڑیں کھاتا اور سینہ کوٹتا اور وہ تو یوں گھوم رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آنے والے کوثر کی موت پر کم اور ان کی حالت اور بے خبری پر زیادہ افسردہ تھے۔ اس کے گھر سے بھاگ جانے والی حرکت نے یوں بھی اس کی محبت میں کمی کردی تھی۔ کچھ لوگ تو بڑے مطمئن تھے کہ ایسی اولاد کا مرجانا ہی بہتر تھا جو ماں باپ کو اتنے دکھ دے گئی ہو۔ مراد آباد والوں کو تو اس کی واپسی کی خبر بھی نہ تھی اسی لئے کچھ لوگوں کو تو وقار الحسن کے کہنے پر اطلاع ہی نہ دی گئی کہ اس طرح پوری کہانی سنانا پڑتی کہ کیسے واپس آئی اور پھر کیوں اور کیسے مرگئی۔

وہ دن عجیب دھواں سا گزرا، گھر والے دم بخود تھے۔ تایا ایک ہی دن میں اتنے بوڑھے لگ رہے تھے جیسے اب ختم ہی ہونے والے ہوں۔ وقار الحسن، شرف الدین، اماں اور چچا سبھی ان کی دل جوئی میں لگے تھے۔ میں تو گویا لمبی تان کر پڑا تھا اور سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے اب کرنے کو کچھ نہ تھا۔ بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اگر حکیم علی احمد نے کسی موقع پر تایا کو کچھ بتادیا تو کیا ہوگا۔ یہ دوسری بات مجھے یوں بھی پریشان کررہی تھی کہ میں وقار الحسن کو اس کے کمرے میں ہونے والے واقعے کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر بتادیتا تو وہ مجھ پر برس پڑتا۔ سو میں نے سوچ لیا کہ اس واقعے کو بھول ہی جانا چاہئے۔ مجھے یوں بھی ان واقعات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں حالات کے معمول پر آنے تک سمجھیں کہ فارغ ہی فارغ تھا۔ اس بدبودار اور کریہہ بدن کو چھوڑ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں جہنم سے نکل کر جنت میں پہنچ چکا ہوں۔

حالات رفتہ رفتہ معمول پر آگئے۔ خوف یوں ہی پورے گھر پر مسلط تھا، اماں نے بتایا کہ چچی امروہہ میں تو کچھ نہ بولی تھیں مگر مراد آباد پہنچتے ہی ان کے طعنے تشنے شروع ہوگئے تھے۔ تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے آتے جاتے ایسے جملے کسنا شروع کردیے تھے، جو تایا کے علاوہ خود اماں کو بھی برے لگتے تھے۔ اس لیے کہ حویلی میں اکیلی کوثر ہی نہیں بلکہ میں بھی تھا۔ پھر شرف الدین کو بھی وہیں جانا تھا۔ ان کے رویے ہی نے اماں کو مجبور کردیا تھا کہ وہ اب اپنے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ تایا تائی کے لئے انہوں نے سوچا تھا کہ اپنے ساتھ ہی لے جائیں گی۔ تایا خود بھاوج کے رویے سے نالاں تھے۔ وہ یہ فیصلہ سن کر چپ ہوگئے تھے کہ ہم پہنچ گئے۔

اس وقت بھی اماں، وقار الحسن سے اپنے گھر منتقل ہونے کے بارے میں بات کررہی تھیں۔ "آخر وہ خریدا کیوں گیا تھا؟ کیا اس لئے کہ ہر وقت بند پڑا رہے؟"

"اماں! پے در پے آنے والی پریشانیوں نے اتنی مہلت ہی کب دی تھی کہ منتقلی کا سوچا جاسکے۔ اب میں آگیا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" وقار الحسن نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

"میرا خیال ہے اب حویلی سے ہاتھ دھولو۔ اب تو کوثر بھی نہیں ہے۔" اماں کافی دل گرفتہ تھیں۔

"نہیں اماں! میں حویلی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ کوثر نہیں ہے تو کیا ہوا؟ میں تو ہوں۔ اب میں ہی کچھ کروں گا۔"

"باولے پن کی باتیں نہ کرو وقار الحسن، اب مجھے ایسی کوئی آس نظر نہیں آتی کہ ہم کبھی وہاں جا کر بس سکیں اور یوں بھی میری لڑکیاں اتنی خوفزدہ ہیں کہ بس۔"

"ہاں انہیں لے کر جانا تو قطعی بے وقوفی ہے، ہم اب وہاں نہیں رہیں گے مگر میں اس حویلی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ اتنے نقصانات اٹھا کر، اتنے بہت سے لوگوں سے جدا ہو کر بھی اگر حویلی کو چھوڑ دیا تو کیا کیا؟ اگر ایسا تھا تو آپ بڑی پھوپی اور پھوپا والے واقعے کے بعد ہی فیصلہ کرتیں یا دادی کے انتقال پر ہی اسے چھوڑ دیا جاتا۔" وقار الحسن نے ناگواری سے کہا۔

"بیٹا جو کچھ ہوچکا اسے بھول جاؤ۔ میں تو کہتی ہوں کہ پہلی فرصت میں ہی جہانی کا بیاہ کرکے شنو کے بارے میں کچھ سوچو اور ساتھ شگفتہ کو بھی وداع کرکے لے آؤ۔"

"یہ بھی ہو جائے گا اماں، فی الحال آپ تایا اور تائی کا دھیان رکھیں۔ تائی کی طرف سے میں اتنا فکر مند نہیں ہوں مگر تایا۔ وہ تو اندر ہی اندر گھلتے جارہے ہیں۔"

"ہاں بیٹا، ان پر جو غم ٹوٹا ہے وہ ان کی برداشت سے کہیں زیادہ ہے۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سے پہلے کہ تمہاری چچی کی زہریلی زبان دوبارہ کھلے، ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے۔ اللہ انہیں اولاد دے دیتا تو شاید ان کے

دل میں بھی درد پیدا ہوجاتا۔“

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔“ وقارالحسن نے کہا۔ کہنے کو تو اس نے یہ کہہ دیا تھا مگر نہ معلوم کیوں اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب سادھو کا رخ پھر اس کی جانب ہوجائے گا۔ وہ پیش بند حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اس کے دماغ میں جو دنیا پہ راج کرنے کا خناس سوار تھا‘ وہ اتنی آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔

یہ بات میں بھی جانتا تھا کہ وہ ہوس پرست آدمی ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کوثر پہ نظر ضرور رکھی ہوگی۔ پچھلی بار تو کوثر نے اس کی پیش بند حاصل کرنے کی کوشش کو ناکام بنادیا تھا مگر اب شاید وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے گا۔ ممکن ہے کوثر کی موت کے بارے میں بھی وہ سب کچھ جان گیا ہو۔ میں ایسی ہی باتیں سوچتا رہا۔ اگر سچ بتاؤں تو آپ ناراض مت ہوجایئے گا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وقارالحسن کا پھر سادھو سے ٹکراؤ ہو۔ شاید یہ میں اس لئے چاہتا تھا کہ اس طرح میں پھر کھنڈر میں پہنچنا چاہتا تھا جانے کو تو میں اب بھی جاسکتا تھا مگر وقارالحسن کو چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتا تھا اور ابھی تو میں نے کوثر کے سڑے ہوئے بدن سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ آئندہ کا پروگرام ابھی بنایا ہی نہیں تھا۔ ابھی میں کچھ آرام کرکے اپنے پروگرام کو باقاعدہ ترتیب دے کر ہی کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

گھر کا ماحول بہت گھٹا گھٹا تھا۔ تایا باقاعدہ بیمار ہوگئے تھے۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ یہ بڈھا زیادہ عرصے جی سکے گا۔ میں تو وقارالحسن کی اماں سے بھی نالاں تھا۔ یہ دونوں مر جاتے تو وقارالحسن کو بہکانا آسان تھا۔ وہ انتہائی بے وقوف آدمی تھا جو اپنی جوانی کے اتنے سنہرے دن ایسی دقیانوسی باتوں میں ضائع کررہا تھا۔ یہاں تو ہر روز کوئی نیا چکر چل جاتا تھا۔ بہرحال مجھے خوشی تھی کہ میں نہ صرف کوثر کے بدن سے بلکہ حویلی کی قید سے بھی آزاد ہوچکا تھا۔ سادھو سے کسی موقع پر ٹکراؤ ہوجاتا تو ٹمپنا‘ پیپا یا انہی جیسی کچھ اور سنہرے بدن والی شہد آگیں لڑکیاں بھی دیکھنے کو ملتیں۔ سب سے بڑھ کر تو وہ کھوپڑیاں تھیں۔

لگتا تھا کہ میری جان ہی ان میں اٹک گئی ہے۔ بہرحال دن گزرنے لگے‘ ابھی تو دسواں بیسواں اور چالیسواں ہونا تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ مرنے کے بعد بھی مرنے والے کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ مجھے تو ان رسموں سے بڑی الجھن ہورہی تھی۔ گھر والوں پر اب بھی دہشت طاری تھی۔ وقارالحسن کی دونوں بہنیں تو جیسے پتھر بن کر رہ گئی تھیں۔ شرف الدین دل میں جہانی آپا کیلئے بہت افسردہ تھا۔ وہ دبے دبے انداز میں وقارالحسن سے کہہ چکا تھا کہ وہ اب ان معاملات سے کنارہ کرلے۔ وہ بھی جلد از جلد شادی کرنا چاہتا تھا۔ جہانی آپا کی حالت دیکھ کر خود وقارالحسن بھی اب اس معاملے میں کچھ سنجیدہ ہورہا تھا۔ اس نے اماں سے بھی کہا کہ اب وہ اپنی طرف سے تیاری شروع کردیں۔ وہ تو اپنی بہن کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا مگر حالات ایسے نظر نہیں آرہے تھے۔ اماں بھی چپ تھیں۔ ارمان تو ان کے دل میں بھی ہوں گے۔ ان کی پہلی اولاد کی شادی ہونا تھی اور پھر اس خاندان کی مالی پوزیشن سب کے سامنے تھی جو اچھی خاصی مضبوط تھی اس لئے خالی شربت پر تو نکاح کرنا گویا لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دینے کے مترادف تھا۔

کوثر کا چالیسواں بھی ہوگیا۔ حالات پرسکون رہے۔ تایا کو چپ لگ گئی تھی۔ تائی تو دنیا سے بے خبر زندگی گزار رہی تھیں۔ چالیسویں کے فوراً بعد ہی اماں نے چپکے چپکے جہانی آپا کا جہیز جوڑنا شروع کردیا۔ اس دوران میں شرف الدین دوبارہ امروہہ چلا گیا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو تیار کرنا چاہا کہ وہ مراد آباد برات لے جائیں مگر اس کے بادا کو تو جیسے موقع ہاتھ آگیا۔ انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہمارا سارا خاندان امروہہ میں ہے لہٰذا اگر وقارالحسن کو شادی کرنا ہے تو وہ امروہہ ہی میں کریں۔ گویا اسی حویلی سے‘ بات کچھ کھٹک رہی تھی مگر اب ایسی بھی بات نہ تھی کہ وقارالحسن نے امروہہ کی حویلی کو بالکل ہی چھوڑ دینے کا کوئی فیصلہ کرلیا ہو لہٰذا اماں کے منع کرنے کے باوجود اس نے ہامی بھرلی۔ اتنا ضرور کہہ دیا کہ وہ چوتھی کی رسم مراد آباد میں ہی کریں گے۔ ایک بات ان کی مانی گئی تھی اس لیے دوسری بات شرف الدین کے بادا کو ماننا پڑی۔ تایا سے پوچھ کر تاریخ لینے کا دن بھی مقرر کردیا گیا۔

شرف الدین بہت خوش تھا۔ وہ بات پکی ہوتے ہی امروہہ لوٹ گیا۔ سارے انتظامات اسے ہی کرنا تھے۔ اسی کے ہاتھ جہانی کے کپڑوں اور چوڑیوں کا ناپ بھی چلا گیا‘ حالانکہ ان دنوں ایسا درمیان کی دو عورتیں کیا کرتی تھیں‘ جو عام طور پر رشتے کروایا کرتی تھیں۔ جہانی آپا کی صحت کچھ تو پہلے ہی بہتر ہوچکی تھی‘ کچھ اس خوشی نے‘ اس خوفناک ماحول سے چھٹکارے کے احساس نے اس کے چہرے پر رنگ اور چمک پیدا کردی تھی۔ یہ بات میں بھی جانتا تھا کہ اس شادی کے بعد وقارالحسن ضرور حویلی کے چکر میں پڑے گا۔ وقارالحسن نے اپنا وہ پیش بند کوثر کے اس کمرے میں چھپا دیا تھا جہاں وہ معذوری کی حالت میں رہا کرتی تھی۔ وہیں اس کی کتابوں کا ذخیرہ بھی تھا۔ وہ کمرا مقفل رہتا تھا اس لئے وہ کافی حد تک مطمئن تھا۔ وہ انتظامات میں لگ کر سب کچھ بھول چکا تھا۔

ہوتے ہوتے طے شدہ تاریخ بھی قریب آگئی۔ شادی

سے چار روز قبل ان سب کو امروہہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ جہانی کے جہیز کا سامان بڑا شاندار تھا۔ مراد آباد میں تو جس نے بھی دیکھا‘ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وقارالحسن سارا سامان غلام رسول اور چاچا کے ہاتھ امروہہ بھجوا چکا تھا۔ زیور ابھی سنار نے دیا نہیں تھا۔ اماں بہت پریشان تھیں۔ کئی بار سنار کو کہلوا چکی تھیں کہ انھیں امروہہ کیلئے روانہ ہونا ہے‘ جلدی کردے مگر رات ڈھلے سنار گھر آکر اور ہاتھ جوڑ کر کہہ گیا کہ کاریگروں نے وقت پر دھوکا دے دیا۔ ابھی تیار نہیں ہوئے۔ وہ چاہیں تو امروہہ چلی جائیں۔ زیور وہ خود پہنچاوے گا مگر اماں مطمئن نہ ہوئیں۔

”آپ چلی جائیں اماں۔ میں ٹرین کے چار ڈبے بک کروا چکا ہے وہ۔ خاندان کے سبھی لوگ تیار ہیں۔ میں کل تو زیور لے کر پہنچ جاؤں گا۔“ اماں وقارالحسن کے رکنے کا سن کر کافی بولائی ہوئی تھیں مگر چچی اور تایا کے سمجھانے پر ان گئیں۔

اگلے روز اذانوں کے وقت سے سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ خاندان کے دوسرے لوگ بھی یہیں جمع ہوگئے تھے۔ تانگے آئے اور سب لوگ اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ وقارالحسن نے بڑی ذمے داری سے سب کو ٹرین پر سوار کرانے کے بعد سارا سامان بھی اپنی نگرانی میں چڑھایا اور اماں سے جلد آنے کا اور تمام معاملات کو اچھی طرح نمٹانے کا کہہ کر اس وقت لوٹ آیا جب ٹرین نے مراد آباد کا اسٹیشن چھوڑ دیا۔ اب وقارالحسن اکیلا تھا۔ میں اس کے اندر تھا۔ اتنے روز تک میں نے اسے قطعی پریشان نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ہونے کا احساس بھی نہیں دلایا تھا۔ وہ بہت تھکا تھکا واپس آیا تھا۔ تھکن نے برا حال کررکھا تھا۔ اگلے روز اسے بھی امروہہ روانہ ہونا تھا۔ وہاں کام بہت تھا اس لئے موقع غنیمت جان کر وہ سوگیا۔ میں بھی سوگیا۔

ہماری آنکھ دروازے کے دھڑدھڑانے سے کھلی۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ آنکھ کھلنے پر احساس ہوا کہ ہم سارا دن سوتے رہے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وقارالحسن ہڑبڑا کر اٹھا۔ ”کون ہے؟“ اس نے آواز دے کر پوچھا۔ باہر سے ایک اجنبی آواز آئی۔ وقارالحسن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پولیس کی اچھی خاصی نفری کو دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”جی فرمایئے؟“

”یہی ہے جی وہ۔“ اچانک پولیس کے ایک افسر کے پیچھے چھپا ہوا شخص سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر وقارالحسن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ پھر جو کچھ اس پولیس افسر نے کہا۔ اسے سن کر تو لگا جیسے وقارالحسن کا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔ وہ چکرایا اور اس سے پہلے کہ زمین پر گرتا‘ پولیس والے نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”یو آر انڈر اریسٹ۔“ یہ کہتے ہی اس نے وقارالحسن کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ ”آپ کو رحیمو کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“

وقارالحسن نے آنکھیں پھاڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا جو اچانک سامنے آگیا تھا۔ وہ وہی تھا‘ وہی جسے ایک بار دیکھ کر وقارالحسن ششدر رہ گیا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ یہ خود رحیمو ہے مگر اس نے بتایا کہ وہ رحیمو کا بھائی ہے اور اپنے بھائی کی تلاش میں نکلا ہے۔ میں نے وقارالحسن سے سرگوشی کی۔ ”انکار کردو۔ تم نے اسے قتل نہیں کیا۔ تم اسے قطعی نہیں جانتے۔ کہہ دو۔ کہہ دو تم کسی رحیمو کو نہیں جانتے۔“

”میں۔۔۔ میں کسی رحیمو کو نہیں جانتا۔۔۔ آپ کس کی بات کررہے ہیں؟“ وقارالحسن نے خود کو بڑی جلدی سنبھال لیا تھا۔

”آپ کو جو کچھ کہنا ہے‘ عدالت میں کہیے گا۔ ہم رحیمو کی لاش آپ کے مکان سے برآمد کرچکے ہیں۔ اسے آپ نے اپنے مکان کے ایک کمرے میں دفن کیا تھا۔ لاش تھانے میں ہے اور اس کا بھائی اسے شناخت کرچکا ہے۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔ خلاف دستور اس پولیس والے کی آواز نرم اور لہجہ شفیق تھا۔ ”آپ کے گھر میں کوئی اور نہیں ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔ [illegible]“

وقارالحسن نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے ٹوک دیا۔ نہ معلوم وہ کیا کہنے والا تھا۔ اس وقت اس کے منہ سے نکلا ہوا کوئی بھی لفظ اس کے گرد شکنجہ کس سکتا تھا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھا تھا کہ رحیمو کی لاش اتنے عرصے بعد کیسے برآمد کی گئی۔ اس کے قتل کی اطلاع پولیس کو یا اس کے بھائی کو کیسے ہوئی؟ اگر قتل کی اطلاع ہوئی بھی تھی تو یہ کیسے پتا چلا کہ اس کی لاش وقارالحسن کے مکان میں دفن ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے سادھو کا ہاتھ لگتا تھا۔ اس نے ایسی چال چلی تھی جو وقارالحسن کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ میرے ٹوکنے پر وقارالحسن چپ ہوگیا۔ انھوں نے وقارالحسن کو گاڑی میں بٹھایا اور علاقے کے تھانے لے گئے۔ میں راستے بھر اسے سمجھاتا رہا۔ سختی سے

میں آیا۔ اور آتا بھی کیسے، اسے کیا پتا تھا کہ وہ آٹھ دس ماہ پرانی لاش سے لپٹا ہوا ہے۔

اتنی دیر میں پولیس آفیسر سنجیدہ اور نارمل ہو چکا تھا۔ اس نے لمحوں میں کمرے سے سب کو نکال دیا۔ پھر کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے اس نے پولیس کے ڈاکٹر کو فون کرکے بلانے کا حکم دے دیا تھا۔

"کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟" اس نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں بمبئی میں تھا۔" میں نے بولنا شروع کردیا۔ "کل رات یہاں پہنچا تھا۔ اسٹیشن پر مجھے ایک آدمی ملا۔ میں نے اس سے یہاں کے کسی سستے ہوٹل یا سرائے کا پتا پوچھا جہاں میں رات گزار سکوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ایک مکان میں لے گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ مکان اس کے ایک جاننے والے کا ہے اور وہ وہاں چوکیداری کرتا ہے۔ میں اگر اسے دو آنے ایک رات کے حساب سے دوں تو جب تک دل چاہے وہاں رہ سکتا ہوں۔ میں نے اسے آٹھ آنے دے دیئے۔ میں یہاں کام کی تلاش میں آیا تھا۔ اسی رات سوتے میں مجھے لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ میں چیخ کر جاگا تو اس شخص کو خود پر وار کرتے دیکھا۔ میں نے خود کو سنبھالنے اور بچانے کی بہت کوشش کی مگر شاید بے ہوش ہوگیا۔ پھر۔۔۔ پھر مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ ابھی۔۔۔ یہاں آنکھ کھلی ہے۔"

میرے بیان دینے کے دوران میں وہ پولیس آفیسر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا تھا۔ میرے چپ ہوجانے پر اس نے کہا۔ "وہ آدمی کون تھا؟ کیا تم اسے پہچانتے ہو؟"

میں نے انکار میں سرہلایا۔ "میں اسے جانتا پہچانتا نہیں ہوں۔ میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔"

"اب اگر دیکھو گے تو پہچان لوگے؟"

"ہاں۔۔۔ میں اسے پہچان لوں گا۔ وہ عجیب و غریب قسم کا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ چونک گیا۔

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے جو حلیہ بتایا وہ سادھو کا تھا۔ وہ غور سے سنتا رہا پھر اس نے ایک سپاہی سے وقارالحسن کو وہاں لانے کے لیے کہا۔

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وقارالحسن رحیمو کو زندہ دیکھ کر کچھ بھی کرسکتا ہے یعنی پاگل ہوسکتا ہے۔ چیخ چلا کر بتا سکتا ہے کہ وہ تو بہت عرصے پہلے مرچکا تھا۔ بے ہوش ہوسکتا ہے اور۔۔۔ اور مر بھی سکتا ہے۔ یہ تو اسے گمان بھی نہیں ہوگا کہ اتنی پرانی لاش کے اندر میں ہوں۔ وہ کوڑ

کی لاش کا حشر دیکھ چکا تھا۔ یہ بات سوچتے ہی میں نے پولیس آفیسر سے کہا مجھے چکر آرہے ہیں۔ میری حالت بہت خراب ہے۔ یہ سن کر آفیسر نے بتایا کہ ان لوگوں نے مجھے زمین میں سے کھود کر نکالا ہے اور اسے حیرت ہے کہ میں رات بھر زمین میں زندہ دفن رہنے کے بعد بھی اب تک زندہ کیسے ہوں۔ پھر اس نے مجھے لیٹنے کی اجازت دے دی۔ میں پل بھر ضائع کیے بغیر رحیمو کے بدن کو چھوڑ کر وقارالحسن تک پہنچ گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ اسی لمحے ایک سپاہی نے وقارالحسن کو پولیس آفیسر کا پیغام دیا کہ اسے دوسرے کمرے میں طلب کیا گیا ہے۔ سپاہی اسے لے کر اسی کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں رحیمو کی لاش رکھی تھی۔ اس کمرے کے باہر رحیمو کا بھائی ایک بینچ پر حیران پریشان بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"صاحب مجھے تو اس آدمی نے بتایا تھا کہ آپ نے اسے قتل کرکے دفنادیا ہے، پھر اسی روز میں نے خواب میں دیکھا۔ سویرے میں تھانے آگیا جی۔"

"کس آدمی نے؟" وقارالحسن سے پہلے سپاہی بول اٹھا۔

"میں بڑے بازار میں ٹھیلا لگاتا ہوں۔ وہیں وہ آیا تھا اور اس نے پوچھا کہ کیا تم اپنے بھائی رحیمو سے ملنا چاہتے ہو۔ میں رحیمو کا سن کر بے قابو ہوگیا تھا۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے تو جوتے گھس چکے تھے۔ اب اب رحیمو کا انتظار کرتے کرتے قبر میں جا سویا تھا۔ اتنا سنتے ہی میں۔۔۔" ابھی وہ بات کررہا تھا کہ میں وقارالحسن سے کہہ کر کہ میں اندر جارہا ہوں۔ اندر چلا آیا۔ اگر میں دیر کرتا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر اگر میری غیر موجودگی میں آجاتا تو اس لاش کو کئی ماہ پرانی لاش بتادیتا یا ممکن ہے وہ یہ نہ بتاپاتا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ لاش اتنے عرصے دبی رہنے کے باوجود گوشت پوست سمیت نہیں نکلتی۔ وہاں تو رحیمو کا ڈھانچہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ کارستانی سو فی صد سادھو کی تھی۔ اس نے واقعی رحیمو کی لاش نکلوائی تھی یا اس جیسا کوئی اور بنا کر اسے دفن کیا تھا۔ یہ میں نہیں جانتا مگر اس کی شکتی سے اتنی توقع تھی کہ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ بہرحال اس نے وقارالحسن کو پھنسا دینے کے لیے اپنی طرف سے جال مضبوط بنا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اب وقارالحسن تنہا نہیں تھا، میں اس کے ساتھ تھا اور غنیمت تو یہ تھا کہ وقارالحسن کچھ نہ کچھ میرے لیے ضرور کرچکا تھا۔ اب سو فی صد امید تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر وقارالحسن آج ہی یہاں سے نکل جاتا تو سنار سے زیور لے کر رات تک امروہہ بھی پہنچ سکتا تھا اور یوں بات وہاں تک نہ پہنچتی۔

میں بڑے موقع پر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ پولیس

تاکید کی کہ وہ کوئی بیان نہ دے۔ کوئی لفظ منہ سے نہ نکالے۔ مجھے اور اسے ایک ہی پریشانی تھی کہ اس بات کا علم شرف الدین یا گھر والوں کو کیسے ہوگا۔ اس وقت وقارالحسن کی حالت دیدنی تھی۔ اسے سخت افسوس ہورہا تھا کہ وہ اب تک میرے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا۔ میں بھی اس وجہ سے بہت پریشان تھا مگر اس پریشانی کو دور کرنا بعد کی بات تھی۔

وہ تو کہیے کہ پولیس آفیسر شریف آدمی تھا۔ تایا وغیرہ کو براہ راست نہیں جانتا تھا مگر بلاواسطہ ہمارے خاندان سے واقف تھا۔ امروہہ کی حویلی کے بارے میں بھی اسے کچھ سن گن تھی۔ گنگوا کے قتل کے وقت جو امروہہ کا ایس ایچ او تھا وہ اس کا دوست تھا۔ اس نے جب وقارالحسن سے کچھ معلومات کیں اور اس نے تفصیل بتائی تو اس کا رویہ قطعی طور پر بدل گیا۔ رحیمو کا بھائی وہیں تھا۔ پولیس آفیسر جس کا نام سراج الدین رضوی تھا۔ اس نے رحیمو کے بھائی سے معلوم کیا کہ اسے اس قتل کی اطلاع کس نے دی، تو وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"صاف صاف بتاؤ میاں، ورنہ الٹا آنتیں گلے میں پڑجائیں گی۔"

"وہ جی۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا جی کہ یہ اسے اس مکان کی سیڑھیوں پر خنجر سے قتل کررہے ہیں۔" اس نے وقارالحسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور تم رپورٹ لکھانے آگئے۔ تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ لاش اسی مکان کے کمرے میں دفن ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم نے اسے قتل کرکے دفنادیا ہو اور کیونکہ یہ مکان وقارالحسن کا ہے اس لیے ان کا نام لگا رہے ہو۔" وہ خالص پولیس والوں کے سے انداز میں اسے گھور رہے تھے اور وہ گھبرا رہا تھا۔

"آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟" وہ بہت پریشان ہوگیا۔

"وہ مکان ایک عرصے سے خالی ہے۔ مجھے اس مکان کو خریدے کئی ماہ گزر گئے ہیں مگر میں چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر وہاں منتقل نہیں ہوسکا تھا۔" وقارالحسن نے فوراً ہی اس کے اس جملے کا فائدہ اٹھایا۔ میں نے بھی اسے ٹہوکا دیا کہ وہ اسی بات پر اڑ جائے۔ اب وقارالحسن کا اعتماد کسی حد تک بحال ہوچکا تھا۔ شاید یہ بات اس کے ذہن میں نہیں تھی کہ وہ ایسا کہہ سکتا ہے اور کیونکہ قتل اسی نے کیا تھا اس لیے بھی وہ بکھر گیا تھا۔ عین اس لمحے جب یہ لوگ باتیں کررہے تھے، میرے ذہن میں رحیمو کو دیکھنے کی خواہش ابھری۔ میں وقارالحسن کو بتا کر کہ میں کہاں جارہا ہوں اس کے بدن سے باہر آگیا۔ دوسرے کمرے ہی میں مجھے ایک لوہے کی بڑی سی

بینچ پر سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی لاش مل گئی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے چادر کا کونا اٹھایا اور رحیمو کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا کہ اسے مرے ہوئے کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ اس کی لاش پر مٹی ضرور لگی ہوئی تھی مگر لگتا تھا جیسے اسے مرے ہوئے زیادہ سے زیادہ چوبیس یا چھبیس گھنٹے گزرے ہیں۔ میں نے اس کے بدن کو ہاتھ لگایا۔ اس کا بدن یخ تھا۔ اس کے پاس سے بدبو بھی نہیں آرہی تھی۔ اس کا کیا مطلب تھا، میں حیران تھا۔ یک بیک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ وقارالحسن جو وظائف کرچکا تھا، میں نے اس میں سے صرف ایک ہی آزمایا تھا کہ میں دیوار عبور کرگیا تھا۔ اس وقت میں نے رحیمو کی لاش میں داخل ہونا چاہا گو مجھے وقار نے یہ بتایا تھا کہ میں صرف اس مردہ جسم میں جاسکتا ہوں جسے مرے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو مگر یہاں تجربہ کرنے میں کیا حرج تھا۔ میں نے "دا اکم" غنیمت جانا۔ اس کے مردہ جسم میں داخل ہونے کی کوشش کی اور حیرت انگیز طور پر کامیاب رہا۔ اس کے بدن میں داخل ہوتے ہی میں اٹھ بیٹھا اور یہ دیکھ کر مسرت سے چیخ اٹھا کہ رحیمو زندہ ہوگیا تھا۔

میری آواز کافی بلند تھی۔ باہر سے گزرتے ہوئے کسی سپاہی نے میری آواز سن لی اور کمرے میں جھانک کر دیکھا، پھر مردے کو بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ حواس باختہ ہوگیا اور چیختا چلا گیا۔ اس کی چیخ پکار نے پورے تھانے میں ہلچل مچادی۔ تمام لوگ اس کمرے میں جمع ہوگئے۔ میں اتنی دیر میں سوچ چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس پولیس آفیسر کے اندر آتے ہی جس نے وقارالحسن کو گرفتار کیا تھا، میں بینچ پر کھڑا ہوگیا۔ اس کا رنگ بھی سفید ہورہا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں سے اڈ رہا تھا۔

"میں۔۔۔ میں کہاں ہوں!" میں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں رحیمو ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو شدید الجھن پھیل گئی۔

"مگر رحیمو تو۔۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسرا سپاہی آگے بڑھا اور اس نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سرہلا کر کہا۔ "لے کر آؤ اسے۔" سپاہی سرہلا کر باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ رحیمو کا بھائی بھی تھا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جوں ہی میری طرف دیکھا۔ چیخ کر لپک آیا۔ وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ اسے مجھ سے ذرا بھی خوف

آفیسر رحیمو پر جھکا ہوا اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ ہاتھ سے وہ رحیمو کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوتے ہی رحیمو کے بدن میں داخل ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے آنکھیں کھول دیں۔

پولیس آفیسر اب بھی مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولا۔ "کیا بات ہے۔ کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ بس چکر آ رہے ہیں۔ کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔"

"ابھی ڈاکٹر آجائے گا۔" اتنا کہہ کر اس نے کسی سپاہی کو آواز دی۔ ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔

"یس سر!"

"ڈاکٹر صاحب آئے؟"

"آنے والے ہوں گے سر۔ کہہ رہے تھے کہ بس پہنچتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم ملزم کو لے کر آؤ۔"

"آگئے سر۔" اس نے پلٹ کر کہا۔

میں نے دیکھا کہ وقارالحسن ایک سپاہی کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ سفید ہوگیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ میں ہوں مگر وہ بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رحیمو کے بدن پر گوشت بھی تھا اور وہ بھلا چنگا تھا۔ میں نے دوسروں کی آنکھ بچا کر اسے اشارہ کیا۔ وہ جلد ہی سنبھل گیا۔

"دیکھو۔۔۔ کیا یہ آدمی تھا جس نے تمہیں مارا اور زمین میں دفنایا تھا۔" پولیس آفیسر نے مجھ سے پوچھا۔

"میں نے جو حلیہ آپ کو بتایا ہے کیا وہ اس پر فٹ بیٹھتا ہے؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"میری بات کا جواب دو، بس۔" اس نے کچھ برہمی سے کہا۔

"نہیں!" میں نے گہرا سانس لیا۔ "وہ آدمی یہ نہیں تھا۔"

"ہتھکڑیاں کھول دو۔" پولیس آفیسر نے سپاہی سے کہا۔ سپاہی نے فوراً ہی وقارالحسن کے ہاتھ میں پڑی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ وقارالحسن ہی نہیں بلکہ میری بھی جان میں جان آئی۔ پولیس آفیسر نے رحیمو کے بھائی کو بلایا۔ وقارالحسن سے معافی مانگی، اپنی معذوری ظاہر کی کہ ضابطے کی کارروائی قانونی طور پر ضروری تھی اس لیے اس نے ایسا کیا پھر مجھ سے اور رحیمو کے بھائی سے کہا کہ ہم رپورٹ لکھوا دیں۔ تاکہ وہ اس نامعلوم شخص کے خلاف کارروائی کرسکے جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

سارے سپاہی بھی اس بات پر فق تھے کہ میں مردہ تھا پھر زندہ کیسے ہوگیا۔ سب کے رنگ سفید تھے۔ سب یوں کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک رہے تھے جیسے اس کمرے میں بندر کا تماشا ہو رہا ہو۔ میں نے اور رحیمو کے بھائی نے اپنا بیان لکھوایا۔ اس نے بھی اس شخص کا حلیہ لکھوا دیا جس نے اس قتل کی اطلاع دی تھی اور اسے وقارالحسن کے مکان کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا کہ لاش یہاں ہے۔ اس کے بعد ہی وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تھا اور پولیس والوں کی جان کھالی تھی کہ میرا بھائی یہاں دفن ہے اسے نکالا جائے۔ بالآخر تلاشی کا وارنٹ اور مالک سے پوچھے بنا ہی مکان پر چھاپا مارا گیا اور علی الصباح اس کمرے کی زمین کھود کر مجھے نکال لیا گیا یعنی رحیمو کی لاش کو۔ پولیس آفیسر خود بھی اب تک شش و پنج میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کمرے کی زمین کھود کر سو فی صد ایک لاش نکالی گئی تھی مگر وہ اسے معجزہ قرار دے رہا تھا کہ رحیمو مرا نہیں تھا یا مر کر زندہ ہوگیا تھا۔ وہ اس پر بھی خوش تھا کہ اس کی وجہ سے رحیمو مرنے سے بچ گیا ورنہ اگر وہ کچھ دیر اور دفن رہتا تو یقیناً مر جاتا۔ اس بات کی اطلاع وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں بھی دے چکا تھا۔

اس کارروائی کے دوران میں ہی پولیس کا ڈاکٹر بھی آگیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا ایک جھکی آدمی تھا۔ جس نے گھنٹوں میرا معائنہ کیا پھر اس بات پر ناراض ہوگیا کہ وہ ابھی نہایا بھی نہیں تھا۔ اس نے بیڈ ٹی بھی نہیں لی تھی کہ پولیس نے بے وجہ ایک ہٹے کٹے آدمی کو پہلے مردہ پھر زندہ ظاہر کرکے اسے ناحق پریشان کیا ہے۔ اس وقت مجھے اس کی جھک جھک پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ پولیس آفیسر مصر تھا کہ یہ قطعی قانونی معاملہ ہے۔ اسے اوپر بھی جواب دینا ہے، رپورٹ بنانا ہے اس لیے وہ ذرا تحمل سے دیکھ بھال کر رپورٹ تیار کرے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جھکی ڈاکٹر نے پولیس آفیسر کی کسی بات پر کان نہیں دھرا اور رپورٹ بنانے لگا۔

"تم کتنے گھنٹے یا کتنی دیر زمین میں دفن رہے ہو؟" پولیس آفیسر نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"مجھے تو نہیں معلوم۔ مگر میری حالت اتنی خراب نہیں ہے۔ ممکن ہے وہاں زمین میں کوئی ایسا سوراخ بھی رہ گیا ہو جہاں سے مجھے ہوا بھی مل رہی ہو جس کی بنا پر میرا سانس بند نہیں ہوا اور نہ۔۔۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس نے کچھ ہی دیر پہلے مجھے دفنایا تھا۔ یقیناً" میں بہت کم عرصے دفن رہا ہوں۔" میں اسے ٹالنے کے چکر میں تھا۔

"تم بالکل ٹھیک ہو۔ اب گھر جا کر آرام کرو۔" اس جھکی ڈاکٹر نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

میرا بھائی، یعنی رحیمو کا بھائی اب میرا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا بازو پکڑ کر مروڑ دوں مگر اس بیچارے کا بھی تو کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تو وہ خبیث سادھو تھا جو ایک نئی چال لے کر پھر میدان میں آگیا تھا۔ ویسے اگر آپ میری دل لگتی پوچھیں تو سادھو کی یہ چال میرے لیے خوش آیندہ تھی یعنی مجھے اس کے دوبارہ میدان میں آنے پر خوشی ہوئی تھی۔ وجہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ مجھے تو اب بڑی شدت سے کلپنا اور چمپا یاد آنے لگی تھیں۔ بالخصوص چمپا، جس کی وجہ سے میں لذت سے آشنا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اس پولیس آفیسر نے بقول اپنے 'ضابطے کی کارروائی میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ضائع کردیا۔ وقارالحسن بہت خوش تھا۔ وہ مجھے اس قدر پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں رحیمو نہیں اس کی محبوبہ کے روپ میں ہوں۔ کافی دیر بعد جب ہماری جان چھوٹی تو ایک نیا مسئلہ سامنے آگیا رحیمو کا بھائی مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور وقارالحسن مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اچانک وقارالحسن بولا۔ "تم دونوں میرے ساتھ چلو۔ آج میرے ساتھ رہو پھر کل میں بھی امروہہ کے لیے روانہ ہوجاؤں گا تب تم دونوں میرے ساتھ ہی چلنا۔ تمہارا گاؤں بھی تو شاید اس طرف ہے نا؟" اس نے رحیمو کے بھائی سے پوچھا جس کا نام غالباً" کریم تھا۔

"اب اور شرمندہ مت کیجیے چھوٹے مرزا۔" کریمو نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اس میں شرمندہ ہونے والی کیا بات ہے؟" وقارالحسن نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "جانتے ہو شرف الدین کا نکاح ہے۔"

"ارے۔۔۔ آپ کو کیسے پتا؟ اور وہ ہیں کہاں؟" کریمو خوش ہوگیا۔

تب وقارالحسن نے اسے بتایا کہ شرف الدین کا نکاح میری بہن سے ہو رہا ہے۔ وہ خوش ہوگیا۔ اس نے اجازت چاہی کہ وہ گھر جا کر ٹھیلا ٹھکانے لگا دے پھر لوٹ آئے گا۔ میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ نقاہت کا بہانہ بنایا۔ وقارالحسن نے بھی کہہ دیا کہ وہ کسی اچھے حکیم کو دکھلا دے گا اور پھل وغیرہ کھلا دے گا اس طرح میری طبیعت بہتر ہوجائے گی۔ کریمو شکر گزار ہوا پھر میری ضد پر مجھے وقارالحسن کے ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ کہہ گیا کہ گھنٹے دو گھنٹے میں گھر پہنچ جائے گا۔ اس کے جاتے ہی ہم نے تانگا کرلیا۔ راستے میں اس موضوع پر بات کرنا نامناسب تھا۔

تانگے والا خود ہی اتنا باتونی تھا کہ ہمیں بولنے کا وقت ملا اور نہ کچھ سوچنے کا۔ راستے ہی میں سنار کی دکان پڑتی تھی۔ زیور تیار تھے۔ وقارالحسن نے اس سے کہہ دیا کہ آدمی ساتھ بھیج دے تاکہ اسے باقی رقم دی جاسکے۔ روپے وقارالحسن کی جیب میں ہی تھے۔ کچھ رقم ایڈوانس دی جاچکی تھی، کچھ باقی تھی۔ سنار نے آدمی ساتھ کردیا۔ گھر پہنچ کر وقارالحسن نے سنار کے آدمی کو رقم دے کر فارغ کیا اور مجھے لے کر سیدھا تایا والے پلنگ پر آبیٹھا۔ "اب بولو۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟"

"بس ممکن ہوگیا۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"دیکھو مجھے پریشان مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ جانتے ہو محلے کے کچھ لوگوں نے یہاں پولیس کو آتے اور مجھے گرفتار کرتے دیکھا ہوگا۔ اب میں کیا جواب دوں گا۔" وہ واقعی بہت پریشان تھا۔

"کسی نے نہیں دیکھا۔ نماز کا وقت تھا۔ اذان ہوچکی تھی اور لوگ مسجدوں کو جاچکے تھے۔ بچے اور عورتیں اتنی جلدی گھر سے نہیں نکلتے اور دکانیں بھی بند ہوتی ہیں۔" میں نے چڑ کر کہا۔ میں چڑا اس لیے تھا کہ میں اس کی پریشانی کا سبب رحیمو کی لاش کو سمجھ رہا تھا مگر وہ تو محلے والوں کی وجہ سے پریشان تھا۔ بہرحال میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ کہ میں نے انجانے میں یہ تجربہ کیا تھا جو کامیاب رہا۔ وہ یہ بات سن کر حیران ہوگیا۔ اس نے میرے قریب ہو کر گہرا سانس لیا مگر اسے کوئی بدبو بھی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ کوثر والی کتاب میں صاف طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ زیادہ دیر پہلے مرے ہوئے شخص میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ سراسر سادھو کی کارستانی ہے ورنہ وہاں تو ایک ڈھانچہ ہی ہوسکتا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر سادھو کو پتا چل گیا کہ میں نے رحیمو کو زندہ کرکے وقارالحسن کو صاف بچا لیا ہے تو عین ممکن ہے کہ یہ بدن دھواں بن کر ہواؤں میں تحلیل ہوجائے۔ میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار وقارالحسن سے بھی کردیا۔ وہ یہ سنتے ہی سراسیمہ ہوگیا پھر اس نے میرے یعنی رحیمو کے اور اپنے گرد حصار کھینچنے کا عمل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ رحیمو کو اس وقت تک ضرور اس حالت میں رکھنا چاہتا تھا جب تک جہانی آپا کی شادی نہ ہوجائے یا اس کا بھائی مطمئن نہ ہوجائے۔ یہاں بھی ہمیں وہی ڈراما رچانا تھا جو ہم کوثر کے سلسلے میں رچا چکے تھے۔

معاملہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جاتا مجھے یقین تھا کہ اب اگر سادھو آیا تو وہ بھی کوئی ایسا ہتھکنڈا استعمال کرے گا جس سے وہ وقارالحسن کو کسی بھی طور

شکست دے سکے۔ وہ بھی اتنے عرصے بیکار نہیں بیٹھا ہوگا' اس نے بھی کچھ نہ کچھ اپنے بچاؤ کے لیے ضرور کیا ہوگا' ورنہ وہ اتنے عرصے کی گہری چپ کے بعد اچانک اس طرح سامنے نہ آتا۔ فی الحال تو ہمیں وقت گزارنا تھا۔ میں نے وقارالحسن سے کہہ دیا کہ وہ وقت ضائع کیے بغیر حصار کھینچ لے۔ اس نے بھی دیر نہیں کی۔ یہ وظیفہ بقول اس کے ڈھائی تین گھنٹے کا تھا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ اگر رحیمو کا بھائی آگیا تو اس دوران میں میں اسے سنبھال لوں گا۔ وہ کسی بھی بات کی فکر کیے بغیر اپنا کام کرے۔ وقارالحسن کوثر والے کمرے میں چلا گیا۔ میں تایا والے پلنگ پر لیٹ کر آنے والے حالات کے بارے میں اندازہ لگاتا رہا۔

تقریباً آدھ یا پون گھنٹے کے بعد ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ جی تو چاہا کہ رحیمو کے بدن کو چھوڑ کر دیوار پار کر جاؤں اور دیکھوں کہ کون ہے مگر فوراً ہی یہ خیال آگیا کہ ایسا نہ ہو' میرے بدن چھوڑتے ہی رحیمو کا بدن پانی بن کر بہ جائے یا ہوا میں تحلیل ہوجائے اور وہاں صرف ڈھانچہ رہ جائے۔ اس خیال سے میں اٹھا۔ دروازے تک گیا اور آواز دے کر پوچھا کہ وہاں کون ہے۔ وہ کریمو ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس میں غالباً" اس کے کپڑے تھے۔

"میرے پاس سفر کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ کیا یہ۔ چھوٹے مرزا ہمارا بھاڑا لے لیں گے؟" اس نے برآمدے کی طرف جاتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں۔ میں انھیں بتا چکا ہوں کہ میرا سب کچھ وہ آدمی لوٹ کر لے گیا جس نے مجھے زخمی کیا تھا اور تمھارے پاس بھی کچھ نہیں ہوگا۔ وہ تو مجھے ڈانٹنے لگے تھے کہ میں ایسی چھوٹی سی بات پر کیوں پریشان ہوں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تم پر ہتک عزت کا دعویٰ کر دیتا۔"

میری باتیں سن کر وہ شرمندہ شرمندہ سا ہوگیا۔ اس نے وقارالحسن کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ عبادت میں مشغول ہے۔ کریمو کچوریاں اور آلو کی بھجیا لیتا آیا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ وہ وقارالحسن کا انتظار کرنا چاہتا تھا مگر میں نے کہہ دیا کہ وہ دیر سے کھائیں گے۔ پھر وہ بہت دیر تک مجھ سے اپنے باپ کی باتیں کرتا رہا' یہ بتاتا رہا کہ وہ کیسے میرے لیے تڑپا کرتا تھا۔ میں بھی رونی صورت بنا کر اس کی خرافات سنتا رہا۔ کئی بار جی چاہا کہ اسے ڈانٹ کر چپ کرا دوں۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر اس کی بک بک کی وجہ سے کچھ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں اٹھتے ہوئے ماضی کے بگولے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ میں جھنجلا گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں کچھ دیر کو سونا چاہتا ہوں اور پھر میں اس کی جانب سے کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ وقارالحسن کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں مختلف پروگرام بناتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اپنے پروگرام پر جہانی آپا کی شادی سے پہلے عمل کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ ہونے کو تو یہ ہو سکتا تھا کہ میں اکیلا ہی ان کھنڈر کی طرف نکل جاتا جہاں سادھو کلپنا اور چمپا کے حسن جہاں خیز میں ڈوبا ہوا تھا مگر وقارالحسن سے انسیت' اس کی ذات کا حصہ ہونے کا احساس مجھے اس کو چھوڑ دینے کی ہمت نہیں دے رہا تھا پھر سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ابھی میں اپنے بارے میں پورا ادراک نہیں رکھتا تھا۔ مجھے ہر حال میں وقارالحسن کے ساتھ ہی رہنا تھا سوچتا وقت اسے خاندان میں درکار تھا' میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں سوچوں کے بھنور میں گردش کرتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ میرے پیچھے گہری خاموشی تھی۔ لگتا تھا کہ کریمو سو گیا ہے مگر میں نے اس طرف رخ کرنے کا رسک نہیں لیا بلکہ آنکھوں پر بازو رکھ کر وقارالحسن کا انتظار کرنے لگا۔ اب سورج دھیرے دھیرے آکاش کے ڈھلوان پر سرک رہا تھا۔ وقارالحسن کا پروگرام آج ہی امروہہ روانہ ہونے کا تھا۔ گویا وہ رات کی گاڑی سے امروہہ جانا چاہتا تھا۔ ابھی رات میں بہت وقت پڑا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ سادھو اسی دوران میں کوئی گل کھلا سکتا ہے۔ میں بڑی بے چینی سے وقارالحسن کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ وقت گزرنا محال لگ رہا تھا۔ پتا نہیں یہ ڈھائی گھنٹے کتنی دیر میں گزرے' بہرحال وقت گزرتے ہی میں نے کوثر کے دروازے پر آہٹ محسوس کی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وقارالحسن دروازہ کھول کر باہر آرہا تھا۔ میں نے پلٹ کر کریمو کی طرف دیکھا۔ وہ منہ کھولے بے سدھ سو رہا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس دوران میں' میں وقارالحسن سے بات کر سکتا تھا۔ میں نے اسے بیٹھک کی طرف چلنے کا اشارہ کیا مگر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اندر بلایا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ مجھے لیے ہوئے اندر گیا وہاں کمرے میں ملگجے اندھیرے میں فرش پر سفید دائرہ کھنچا ہوا صاف نظر آرہا تھا اس لیے کہ اس دائرے کے اندر تین موم بتیاں روشن تھیں۔ اس دائرے کے قریب ایک اور دائرہ بنا تھا۔ وقارالحسن نے لب ہلائے بغیر مجھے اس چھوٹے دائرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس دائرے میں داخل ہوگیا۔ اس دائرے کے اندر جاتے ہی میں نے خود میں' نہیں رحیمو کے بدن میں توانائی اترتی محسوس کی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ توانائی کیسی تھی۔ نہ وقارالحسن سے کچھ پوچھنے کا وقت تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے

میرے قریب کھڑا تھا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ کریمو کسی بھی وقت اٹھ سکتا تھا۔ ہم اندر آتے ہوئے دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے' اس لیے میں نے بلند آواز میں پوچھ لیا۔ "میں جاؤں؟ کریمو اٹھ گیا تو۔"

وقارالحسن نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں کمرے سے باہر آیا' اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہوئی ہوتی تو کریمو کوثر کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا ہوتا۔ میں اسے لیے ہوئے پھر تایا کے پلنگ تک چلا گیا۔ اسے باتوں میں لگائے رہا۔ کچھ دیر بعد ہی وقارالحسن بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی ہم سے تیار ہونے کو کہا۔ وہ اسی وقت امروہہ کے لیے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ میں یہ سن کر خوش ہوگیا ورنہ اس بھاڑ جیسے اکیلے مکان میں میرا بھی دم گھٹ رہا تھا۔ لوٹ پھیر کر ذہن سادھو کی طرف چلا جاتا تھا۔ کلپنا اور چمپا کی یاد آتی تو سینے پر سانپ لوٹنے لگتے' ان کی یاد سے سینے پر سانپ نہیں لوٹتے تھے بلکہ یہ سوچ کر لوٹتے تھے کہ وہ اس خبیث بوڑھے کی سوکھی اور کھردری بانہوں میں ۔ کسمسا رہی ہوں گی اور پھر وہ کھوپڑیاں۔ میں ان باتوں سے فی الحال فرار چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں یعنی ایک اتنے پرانے سڑے ہوئے مردے بلکہ ڈھانچے کے جسم میں رہ کر میں بھلا کیا کر سکتا تھا جبکہ اس منحوس کا گندا سندا بھائی بھی جان کو ہٹلر ہوا بیٹھا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے ساتھ اگر مجھے گاؤں جانا پڑا تو راستے ہی میں چٹ سے کروں گا اور اس مردود کے بھائی کے جسم سے نکل جاؤں گا۔ پھر وہ جانے اور اس کے بھائی کا ڈھانچہ۔ جائے پھر کسی بھی تھانے میں رپورٹ لکھاوے۔

"رحیمو۔ تم تیار ہو؟" وقارالحسن نے اپنا اٹیچی کیس بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں بھیا' مجھے کیا تیاری کرنا ہے' میرا سب کچھ تو وہ لوٹ کر لے گیا۔" میں نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

"رحیمو تو میرے۔ یہ کپڑے پہن لے۔" کریمو نے ایک جوڑا پاجامہ کرتا نکال کر مجھے دیا۔ میں وہ کپڑے پہن کر آگیا۔ مجھے قبر سے نکالا گیا تھا تو میرے کپڑے گل چکے تھے۔ پولیس مجھے چادر میں لپیٹ کر لے گئی تھی بعد میں جب میں نے رحیمو کے جسم میں گھر کر لیا تو مجھے پولیس والوں ہی نے ایک بوسیدہ جوڑا دیا تھا جسے پہن کر میں یہاں پہنچا تھا۔ کریمو کے کپڑے صاف ستھرے تھے' انھیں پہن کر کچھ بہتر محسوس ہوا۔ کریمو پہلے ہی پوٹلی اٹھا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ ہم گھر سے نکلے تو ہوا میں خنکی اور سردی بڑھ چکی تھی۔ وقارالحسن نے ایک اٹیچی کیس مجھے دے دیا تھا۔ کریمو پہلے ہی چادر لپیٹ چکا تھا۔ ہم اسٹیشن پہنچے' امروہہ کے تین ٹکٹ لیے اور پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میری نگاہیں چاروں طرف کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ گھبراہٹ وقارالحسن کے چہرے پر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں بھی بے چین تھی۔ شاید اسے بھی میری ہی طرح سادھو کے کسی اچانک حملے کا خدشہ تھا۔ ویسے مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ ایسی بے مثال چال چل کر غائب کہاں ہوگیا۔ مجھے نہ معلوم کیوں یہ گمان تھا کہ وہ ہماری طرف سے بے خبر نہیں ہوگا بلکہ اسے پل پل کی خبر ہوگی۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا ہوگا کہ وقارالحسن کہاں تک مضبوط ہے۔ وہ کیا کچھ کر رہا ہے اور کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اب بھی ہمارے قریب ہی کہیں موجود ہو۔ کسی مناسب وقت کا منتظر ہو یا ہمارے خلاف کسی ایسی چال کا اہتمام کر رہا ہو جو ہمیں کمزور کر سکتی ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو' ہمیں اس کی طرف سے دھڑکا تھا۔ وقارالحسن بہت چوکنا تھا اور کریمو اپنی ہی بے وقوفی کی باتوں میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ شاید اس کے بیوی بچے بھی تھے جن کا ذکر وہ بار بار کر رہا تھا۔ میں سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھ کر اسے یہ احساس دلاتا رہا جیسے میں اس کی تمام باتیں سن رہا ہوں ورنہ میری نگاہوں کے ساتھ ہی میرا دماغ بھی پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے لوگوں کے چہروں میں الجھا ہوا تھا۔ گاڑی چلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اگر رحیمو کا بدن چھوڑنے میں کوئی خطرہ نہ ہوتا تو میں پل میں انجن ڈرائیور کے پاس پہنچ جاتا اور ٹرین کو دوڑا دیتا مگر میں ایسا کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

پتا نہیں وقت کبھی کبھی رک کیوں جاتا ہے۔ پلیٹ فارم پر لگا ہوا بڑا سا گھڑیال ساکت محسوس ہو رہا تھا۔ سوئیاں یوں سرک رہی تھیں جیسے گاڑی میں بیٹھے تمام لوگوں کے ضبط کا امتحان لے رہی ہوں۔ میں نے دانت کچکچا کر نگاہیں اس پر سے ہٹا لیں۔ یہ قیامت کی گھڑیاں' قیامت بن کر گزریں۔ اچانک ریل نے سیٹی بجائی پھر دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم پر رینگنا شروع کر دیا۔ میری جان میں جان آئی۔ وقارالحسن کے چہرے پر بھی اطمینان پھیل گیا۔ ایک موقع پر میں نے کریمو کو جھڑک کر خاموش کرا دیا تھا۔ وہ اس وقت سے چپ بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

ریل نے رفتار پکڑی۔ وقارالحسن گہرا... بولا۔ "ہم رات ہونے سے پہلے ہی پہنچ... نے تھے۔ سادھو کے... "ہاں۔ زیور لے لیا تھا؟"

"ہاں۔" اس نے ایسے ... ذانوں پر حاوی تھی اور سر رکھ کے لیٹتے ہوئے ... کے سے آثار تھے۔ اس آرام اس کے ... تھی۔ ہونٹ کانپ رہے تھے

میں اس کی ہوجاتی تھی اس کے بعد آرام کی یوں بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور امروہہ پہنچ کر تو آرام کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس نے آنکھیں موندیں تو بہت بے خبر سو گیا۔ ایک تو سویرے کا جاگا ہوا تھا' دوسرا جس عذاب سے گزرا تھا اس نے ویسے ہی اسے نچوڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ میں نے بھی اسے سونے دیا۔ کریمو اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی بے وجہ ہی مسکرانے لگتا تھا۔ میں نے ڈبے میں بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا۔ ہماری پچھلی طرف والی سیٹ پر دو برقعہ پوش خواتین بیٹھی تھیں جنہوں نے اب بھی چہروں پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک ہندو فیملی تھی' ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو صورت ہی سے بنیا لگتا تھا۔ ایک عورت جو غالباً" اس کی بیوی تھی۔ ایک دس گیارہ برس کا بچہ جو مسلسل اپنے باپ سے سوالات کر رہا تھا اور ایک نوجوان لڑکی جو بہت خوبصورت اور موہنی صورت کی تھی اور کسی فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ وہ محویت سے رسالہ دیکھ رہی تھی اور میری نگاہیں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں اسی محویت سے اسے تکے جا رہا تھا۔ اچانک وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگی یوں جیسے اس نے میری نگاہوں کے لمس کو اپنے چہرے پر محسوس کیا ہو۔ اس کی نگاہ ڈبے میں گھومتی ہوئی مجھ پر آ کر ٹھہر گئی۔

میں نے اس کے چہرے پر سخت ناگواری محسوس کی تو اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی ناگواری کی وجہ رحیمو کے بھدے نقوش کے علاوہ کریمو کے معمولی کپڑے ہیں۔ میں نے حسرت سے سوچا کہ اگر میں اس وقت کسی خوب صورت اور صحت مند جوان کے جسم میں ہوتا تو اس کی روشن چراغوں ایسی آنکھوں میں لو دے رہا ہوتا۔ میں نے اس طرف سے رخ پھیرا تو سامنے لیٹے ہوئے وقارالحسن پر نگاہ پڑی۔ سو جانے کے باوجود اس کے چہرے کے عضلات کھنچے ہوئے تھے۔ تھکاوٹ کا احساس باقی تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ یہ بیچارہ جس نے اپنا بچپن خوف کے پنجوں میں گزارا تھا اور اب اپنی جوانی پراسرار حالات اور غیر یقینی کیفیات میں گزار رہا تھا۔ ابھی تک زندگی کی سچی خوشیوں سے ناواقف تھا۔ جو لمحے اور جو وقت چاند کی دھیمی اور پرکشش روشنی میں سپنے دیکھنے کا ہوتا ہے وہ لمحے چاند تک ...میں گزرے اور آنکھوں میں خوابوں کی جگہ کیسے میرے ...بو دیے تھے۔

اس کی خرافات ... تو میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا لیا۔ چپ کرا دوں۔ میں پچھ... سے منہ کھولے سو رہا تھا اور وجہ سے کچھ سوچ ہی نہیں پایا کہ خراٹے بھی گونج رہے ہوئے ماضی کے بگولے ختم ہو۔

تھے۔ وہ شاید جلدی سو جانے کا عادی تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا بچہ سوالات کر کر کے شاید تھک چکا تھا اور اب اونگھ رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس فیملی کی طرف دیکھا۔ لڑکی منہ پر رسالہ رکھے سو رہی تھی یا غنودگی میں تھی۔ باپ ایک موٹی سی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا اور اس کی بیوی شاید سیٹ پر لیٹ چکی تھی کیونکہ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ڈبے کی خاموشی میں صرف اور صرف کریمو کے خراٹے گونج رہے تھے یا ریل کے پہیوں کے پٹڑی پر دوڑنے کی مخصوص آواز۔ میں نے اکتا کر کھڑکی کے شیشے سے پار دیکھنا شروع کر دیا اور عین اسی لمحے اچھل پڑا۔ کھڑکی کے شیشے پر سادھو کے چہرے کا عکس بہت واضح تھا۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص قسم کی انتہائی خبیث مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں کانٹوں کی سی چبھن اور چہرے پر فتح مندی کے آثار۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں مسل ڈالیں۔ شاید مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ واقعی وہی ہے یا شاید میں اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا۔

"اوہ... ہو ہو ہو..." اس نے قہقہہ لگایا۔ "وقارالحسن کے چھٹکارہو تم... کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ میری آواز آ رہی ہے تمہیں؟"

پہلے تو میں نے سوچا کہ میں چپ رہوں مگر پھر بول اٹھا۔

"ہاں... میں تمہاری آواز بھی سن رہا ہوں۔ تمہیں دیکھ بھی رہا ہوں بلکہ تمہارے من میں کلبلاتے خبیث منصوبوں سے بھی واقف ہوں۔"

میری بات سن کر لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر حیرت اور تعجب کے آثار پیدا ہوئے۔ شاید اسے یقین نہیں ہوگا کہ میں واقعی جیتا جاگتا انسان ہوں۔ ممکن ہے وہ سمجھا ہو کہ اس کا جیتا رحیمو' اس کا چھٹکارہ دیسا ہی ہے جیسا اس نے کیا تھا۔ ایک جسم جسے سہارا دے کر بٹھا دیا گیا ہے' جو نہ بات کر سکتا ہے' نہ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ سن اور سمجھ سکتا ہے۔

"وقارالحسن..." اس کی سرگوشی گونجی۔ "واقعی وہ بہت طاقت ور ہو چکا ہے مگر کتنا مورکھ ہے... بات نہیں سمجھتا جیون نرکھ بنا رہا ہے اپنا۔ مجھے بولتا بنا کر سمجھتا ہے کہ بڑا کچھ کر لیا اس نے..." وہ یوں بول رہا تھا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔

میں جانتا تھا کہ وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہوگا اس لیے میں نے پاؤں سامنے کی سیٹ پر ٹیک کر اپنی انگلیاں وقارالحسن کی پسلیوں میں گھسا دیں۔ وقارالحسن نے کسمسا کر کروٹ لی۔ میں نے پھر اسے ٹہوکا دیا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر میری نگاہوں کے

تعاقب میں شاید اس نے سادھو کو بھی دیکھ لیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے بھی میری ہی طرح اپنی آنکھوں پہ دھوکا ہوا۔ اس نے ایک دوبار آنکھیں ملیں اور کھڑکی کے شیشے پر چمکتے عکس کو گھورنے لگا۔ میں نے اس دوران میں اپنے ارد گرد دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر اس موٹے آدمی کے سوا سب بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ کریمو اپنی بائیں ٹانگ کھجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مچی ہوئی تھیں۔ یعنی وہ پوری طرح سویا نہیں تھا۔ وہ ہماری بات چیت سے اٹھا تھا یا اٹھنے والا تھا۔ سادھو کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ ان لوگوں نے بھی سن لی ہوگی اس لیے کہ وہ موٹا آدمی کتاب پکڑے مجھے گھور رہا تھا۔

"وقارالحسن! بڑا مان ہے ناں تمہیں اپنے چھٹکارے پہ۔" وہ متکبرانہ انداز میں بولا۔

"کیا چاہتے ہو؟" وقارالحسن نے دبے دبے انداز میں اس سے پوچھا۔ اسے بھی ڈبے میں موجود دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور ہاں... مجھے دکھ ہے کہ وہ مورکھ لڑکی مر گئی۔ چچ چچ چچ... کھواہ مخواہ اس نے اتنا کھڑاگ پھیلایا تھا۔ بے وجہ اتنے کشٹ اٹھائے تھے۔ اس نے وہ پیش بند حاصل کرنے میں لہو پانی کر دیا اپنا مگر سب بیکار... سب بے سود۔ لاؤ وہ پیش بند مجھے دے دو۔ میں چار جیون اور جینے والا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی گلی میں یا کمرے کے کسی کونے میں مر جاؤ اور وہ پیش بند پھر کسی بے وکوف کے ہاتھ لگ جائے۔ لاؤ... اس کے بدلے میں تم جو چاہو' میں دان کر سکتا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔" وقارالحسن نے دانت پیس کر کہا اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ اس موٹے آدمی پر پڑی جو اب کچھ ترچھا ہو کر شاید بولنے والوں کو تلاش کر رہا تھا۔

میں ساکت بیٹھا تھا اور کسی انہونی کا منتظر تھا۔ اس دوران میں کریمو یوں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا جیسے اسے کسی نے پکڑ کر بٹھا دیا ہو۔ وہ بونقوں کی طرح ہم سب کو دیکھ رہا تھا پھر بولا۔ "یہ... یہ کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے۔ تم سو جاؤ۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس نے میری طرف حیرت اور دکھ سے دیکھا۔ شاید رحیمو اس سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کرتا تھا۔ "سو جاؤ۔" اس بار میں نے نرم لہجے میں کہا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر لٹانے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑے۔

"کوئی زبردستی ہے تیری۔" اس نے جھٹکے سے اپنا بازو

چھڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ عین اسی لمحے اس کی نگاہ بھی اس چہرے پر پڑی جو شیشے پر چمک رہا تھا۔

"یہ... یہ... بھ... بھ... بھوت... بھوت ہے۔" وہ بے ساختہ چیخ اٹھا۔ اس کی چیخ سن کر وہ موٹا آدمی اپنی دھوتی کستا ہوا اٹھ گیا۔ "کیا بات ہے جی! یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔"

اسے اس طرف آتے دیکھ کر مجھے کچھ اور تو نہ سوجھا میں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب میں بھی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے چیخ رہا تھا۔ "بھوت... بھوت..."

وقارالحسن فوراً ہی میری چال سمجھ گیا۔ اس نے بھی گھگھیانا شروع کر دیا۔ سادھو دانت کچکچانے لگا اور پھر کڑک دار آواز میں بولا۔ "وقارالحسن' جو کچھ مجھے حاصل کرنا ہے وہ تو میں کر لوں گا مگر اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ دیکھ... اب دیکھ لے کہ تو شکتی والا ہے یا میں... یہ دیکھو۔"

اتنا کہہ کر اس کے کریہہ ہونٹ ہلنے لگے۔ آواز انتہائی ناگوار اور الفاظ عجیب و غریب تھے۔ وہ موٹا پہلے تو حیرت سے کھڑکی پر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اچانک اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی اور کریمو کی آوازوں میں دوسری آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس موٹے کی ساری فیملی اٹھ گئی تھی اور سبھی یہ تماشا دیکھ چکے تھے۔ سب کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سب چیخ رہے تھے۔ بدحواس تھے۔ ڈبے میں جیسے بھونچال آیا ہوا تھا مگر میں اور وقارالحسن سادھو کی طرف متوجہ تھے۔ وقارالحسن نے بھی کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے میرے جسم سے یعنی رحیمو کے جسم سے دھواں اٹھنے لگا ہے۔ میں تھوڑی دیر کو بدحواس ہو گیا مگر جلد ہی میری سمجھ میں بات آ گئی اس لیے کہ میں نے اپنے جسم کے اندر اپنی ہڈیوں کو کڑکڑاتے محسوس کیا' میری پسلیاں' میرے بازو' گھٹنے' ٹخنے سب آوازیں نکال رہے تھے۔ گوشت پوست دھواں بن کر دھیرے دھیرے تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ میری کیفیت کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ یہ سارا منظر کریمو' وہ موٹا اور اس کے بیوی بچے بھی دیکھ رہے تھے ان لوگوں کی حالت بہت خراب تھی۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' وہ سب حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے اور ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ کریمو مجھ سے لپٹ کر چیخ رہا تھا۔ اچانک موٹے کی آواز گونجی۔ "زنجیر... زنجیر کھینچو۔"

اور اس کے ساتھ ہی شاید کسی نے زنجیر کھینچ دی۔ دوسرے ہی لمحے ریل گاڑی کے بریک چرچرانے کی آواز آنے لگی۔ ڈرائیور نے شاید ایمرجنسی بریک دبا دیے تھے۔ سادھو کے غیر مانوس الفاظ کی گونج ساری آوازوں پر حاوی تھی اور وقارالحسن کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔ اس کے چہرے کی کھال لرز رہی تھی۔ ہونٹ کانپ رہے تھے

وہ بغیر آواز نکالے کچھ پڑھ رہا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے سادھو بازی لے جائے گا۔ اس لیے کہ میں نے اپنے جسم میں توڑ پھوڑ محسوس کرلی تھی۔ میں بیٹھا نہیں رہ سکا تھا بلکہ گر گیا تھا۔ میں نے خود پر نگاہ ڈالی' جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے لیے تو کچھ نہیں تھا اس لیے کہ میں سب کچھ جانتا تھا مگر دوسرے لوگوں کے لیے یہ ان کی زندگی کا خوفناک اور پراسرار ترین واقعہ تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا آدمی کھڑا تھا اور اس کے بدن کے اعضا دھواں بن کر تحلیل ہو رہے تھے۔ پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے بلکہ چیختے ہی چیختے فرش پر پڑا رحیمو آدھا رہ گیا تھا۔ اس کا دایاں بازو' بائیں ٹانگ دائیں طرف کے سینے کا حصہ غائب ہوچکا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر ساری ہڈیاں ٹوٹ کر ڈھیر بنتی جارہی ہوں۔ کریمو تو چیخ چیخ کر بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس موٹے کی بیوی نے دونوں بچوں کو گود میں چھپالیا تھا اور خود ابھی تک چیخ رہی تھی۔ گھگیا رہی تھی' رو رہی تھی۔ وہ موٹا گاڑی کی رفتار کم ہوتے دیکھ کر دروازے پر جاکھڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت سے لگتا تھا جیسے وہ چلتی ہوئی گاڑی سے چھلانگ لگادے گا۔ اس کی بیوی اسے پکار رہی تھی مگر وہ جیسے بہرہ ہوچکا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر رحیمو کی جگہ۔ ہڈیوں کا ڈھیر رہ گیا۔ میں آزاد ہوگیا تھا۔ اس تمام کھیل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ بدن تو یوں بھی نظر کا دھوکا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ عین اس لمحے کریمو کو ہوش آگیا۔ اس نے اپنے بھائی کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بلکہ ہڈیوں کا ڈھیر پڑا دیکھا تو اپنے حواس مکمل طور پر کھو بیٹھا اور اس نے اسی حالت میں ریل سے چھلانگ لگادی۔ ریل گاڑی رک گئی تھی۔ بہت سے لوگ جو ارد گرد کے ڈبوں میں تھے' وہ گاڑی کے رکتے ہی ادھر بھاگ آئے تھے۔ میں چپ چاپ وقارالحسن کے اندر اتر گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اب بھی آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ تو اس سے بھی بے خبر تھا کہ اب سادھو غائب ہوچکا ہے۔

اس کا کام ختم ہوچکا تھا۔ لوگ کریمو کو چھلانگ لگاتے دیکھ چکے تھے۔ جہاں گاڑی رکی تھی وہاں ایک ہنگامہ تھا۔ لوگ موٹے اور اس کی فیملی سے پوچھ رہے تھے۔ عورت بے دم پڑی تھی' بچے منہ پر ہاتھ رکھے اب بھی چیخ رہے تھے اور وہ موٹا پھولی ہوئی سانس کے دوران لوگوں کو اس پراسرار واقعے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

"وقارالحسن۔۔۔ سب بیکار ہے۔" میں نے سرگوشی کی اور وقارالحسن چونک اٹھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بہت سے لوگ' گارڈ اور ریلوے کی پولیس سب اندر گھس آئے تھے۔ کچھ لوگ نیچے پڑے کریمو کو دیکھ رہے تھے جو شاید مرچکا تھا اس کی ناک سے خون بہ رہا تھا اور گردن مڑی ہوئی تھی۔ وہ موٹا وقارالحسن کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہہ رہا تھا۔ چاروں طرف کھڑے لوگ پوچھ رہے تھے کہ میاں کیا ہوا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھیر دیکھ کر مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا تھا مگر سب کی نگاہیں اسی ڈھیر پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے وقارالحسن سے کہا کہ وہ بھی جلدی بے ہوشی کا ڈراما شروع کردے اب ایک ہی طرح بچت تھی کہ ہم بھی دہشت زدہ ہوجانے والوں میں شامل ہوجائیں۔ کریمو زندہ نہیں تھا کہ اس ہڈیوں کے ڈھیر سے ہمارا کوئی تعلق ثابت کرسکے۔ وقارالحسن نے فوراً میرے کہنے پر عمل کیا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ میں نے اس کا بدن چھوڑ دیا۔۔۔ کریمو کے پاس پہنچا جہاں پولیس کے لوگ اور دوسرے مسافر اسے گھیرے کھڑے تھے۔ وہ واقعی مرچکا تھا۔ موٹا بدحواسی میں بتا رہا تھا کہ کیا ہوا تھا اور اس نے کیا دیکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے بچے اور بیوی بھی ہوش میں آگئی۔ کچھ لوگ وقارالحسن کو بھی پانی کے چھینٹے ڈال کر ہوش میں لے آئے۔ پولیس نے جلد ہی ہڈیوں کا وہ ڈھیر اٹھالیا۔ وہیں ضروری کارروائی ہوئی اور اس کے بعد اس موٹے اور وقارالحسن کو تاکید کردی گئی کہ امروہہ کے اسٹیشن پر اتر کر وہ تھانے میں اپنا بیان لکھوا کر ہی کہیں اور جاسکیں گے۔

اس سارے معاملے میں' میں بہت خوش تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میری رحیمو اور کریمو سے جان بچ گئی تھی۔ دوسری یہ کہ اب وقارالحسن پر کوئی آنچ آنے والی نہیں تھی' اگر وہ موٹا اور اس کی فیملی ڈبے میں نہ ہوتی تو ضرور اس کی جان کے لالے پڑجاتے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ اب سادھو اتنی جلدی آنے والا نہیں تھا یوں کم از کم امروہہ میں گھر والوں تک کوئی کہانی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ورنہ وہ شادی کا گھر تھا' اگر وہاں یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو قیامت ہی آگئی ہوتی۔ شاید وقارالحسن کے چہرے پر بھی گہرے اطمینان کی وجہ یہی تھی۔

اس تمام کارروائی اور ہنگامے میں ڈھائی تین گھنٹے لگ چکے تھے۔ گاڑی آگے بڑھی تو کچھ سکون ہوا۔ وقارالحسن نے فوری طور پر صرف اتنا ہی بیان دیا تھا کہ وہ اکیلا سفر کر رہا تھا اور رحیمو اور کریمو کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا' وہ دونوں بھی اس کے لیے اس طرح انجان مسافر تھے جیسے وہ ہندو اور اس کی فیملی۔ اب اسے اتنا وقت مل گیا تھا کہ ہم اچھی طرح سوچ سمجھ سکتے تھے کہ ہمیں امروہہ پہنچ کر کیا بیان دینا ہے۔ موٹے نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ دونوں وقارالحسن کے ساتھ تھے مگر وقارالحسن نے انکار کردیا تھا اور کہا تھا کہ اس نے ان دونوں سے صرف رسمی گفتگو کی تھی جو لوگ عام طور پر اپنے ہم سفر سے کرتے ہیں۔

بہرحال اس دوران میں ہم یہ طے کرچکے تھے کہ وقارالحسن کو وہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے کہ وہ ان دونوں کو نہیں جانتا تھا۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح مراد آباد سے یا اس سے پہلے سے بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں کہنا ہے۔ گاڑی چلی تو موٹا وقارالحسن کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

میں نے وقارالحسن سے کہا کہ وہ اس سے بات چیت کرکے اس کے دماغ سے یہ بات نکالنے کی کوشش کرے کہ وہ دونوں اس کے ساتھی تھے۔ ابھی کافی راستہ پڑا تھا۔ وقارالحسن نے اس موٹے سے بات چیت کرنا شروع کی۔ پہلے وہ بہت اکھڑا اکھڑا اور خوف زدہ رہا مگر جلد ہی اس نے غیر ارادی طور پر تسلیم کرلیا کہ وقارالحسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے بچے بھی جو اب تک ڈرے بیٹھے تھے' اب قریب سرک آئے تھے اور لڑکی آنکھیں پھیلائے کہہ رہی تھی۔ "مسٹر وکار! وہ۔۔۔ جو دھواں بن گیا تھا نا۔۔۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے۔۔۔ وہ مجھے کھا جائے گا۔ مجھے تو اسی وقت اس سے اتنا ڈر لگا تھا۔ میری سکس سینس اتنی تیز ہے کہ میں اکثر ہونے والی باتیں ممی کو بتادیتی ہوں۔ بولو ممی!" اس نے ماں سے گواہی دلانا چاہی۔ "اس روز جب ڈیڈی کا آفس سے فون آیا تھا۔ جب وہ گھبرا گھبرا کر بات کر رہے تھے تو میں نے تم کو بولا تھا کہ جرور ڈیڈی کا کوئی نکسان ہوگیا ہے۔"

اس کی ماں نے بغیر سنے اور سمجھے سر ہلا دیا وہ پھر بولی۔ "مسٹر وکار' وہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ کوئی بہت کھترناک آدمی لگا تھا۔ کوئی جادوگر۔"

میرا جی چاہا کہ اس کے چٹکی لے لوں۔ اب رحیمو ایسا بھی نہیں تھا۔ سیدھا سادہ معصوم اور بھولا بھالا سا لڑکا تھا۔ وہ بے وجہ اپنی اہمیت جتانے اور خود کو واقعے سے منسلک کرنے کے لیے فضول باتیں کر رہی تھی۔

"وہ بیٹھے بیٹھے ہوا میں ہاتھ چلا رہا تھا۔ آئی تھنک کہ وہ پاگل تھا۔ ایک دم پاگل۔ میرا کھیال ہے کہ اس پر جرور کسی نے جادو کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں او بھگوان۔۔۔ ایسی کھترناک آنکھیں میں نے اپنی لائف میں نہیں دیکھیں۔" اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے دونوں گالوں کو چھوا اور آنکھیں میچ لیں۔ اس کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی مگر اس کے جھوٹ پر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اسے بہت پیار سے دیکھا تھا۔ نہ ہی میں ہوا میں ہاتھ چلا رہا تھا مگر اس وقت تو میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ماں' اس کا ڈیڈی اور اس کا بھائی ایسے اس کی طرف متوجہ تھے جیسے اس سارے جادو میں اسی کا ہاتھ ہو اور وہ کوئی بڑی اور مہان ہستی ہو۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ گیتا میں کہے اشلوک کے برابر ہو۔

تمام راستہ ایسے کٹا جیسے لمحوں کا فاصلہ ہو۔ عجیب پراسراریت سی قائم رہی مگر اتنا ضرور ہوا کہ جب ہم امروہہ کے اسٹیشن پر اترے تو وہ پوری فیملی وقارالحسن کی مٹھی میں تھی۔ وہ لوگ یہ تک گواہی دینے کو تیار تھے کہ وقارالحسن ان لوگوں کے ساتھ تھا اور وہ دونوں عجیب وغریب آدمی پتا نہیں کون تھے اور ایک کونے میں سکڑے بیٹھے رہے۔ نہ انھوں نے وقارالحسن سے بات کی اور نہ ہی وقارالحسن نے انھیں آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ خصوصاً" وہ موٹا جو مجھے اور وقارالحسن کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ چکا تھا اور جب ہم دونوں کھڑکی کے شیشے پر نظر آنے والے سادھو سے بات کر رہے تھے تو بھی وہ ہماری طرف متوجہ تھا' یہ بات ہی بھول چکا تھا۔ ہمیں اس کی باتوں سے اتنا یقین ضرور ہوگیا کہ اس نے کھڑکی کے شیشے پر نظر آنے والی سادھو کی مکروہ شکل نہیں دیکھی البتہ آواز سنی تھی اور وہ اس کو بھی رحیمو یا کریمو سے منسوب کر رہا تھا۔ بہرحال جو حقیقت اس نے دیکھی یا محسوس کی تھی اسے وقارالحسن نے اپنی باتوں سے گڈ مڈ کردیا تھا۔ ہم ان لوگوں کی طرف سے اب بالکل مطمئن تھے۔

امروہہ کے اسٹیشن پر بھی ہمیں ایک لمبی قانونی کارروائی سے گزرنا پڑا پھر وقارالحسن نے پولیس کو کارروائی کے مطابق اپنا ایڈریس لکھوادیا اور یہ بھی تاکید کردی کہ اس کی بہن کی شادی ہے۔ وہ ایسے وقت میں اس ہولناک حادثے یا واقعے کی اطلاع گھر پر نہیں کرنا چاہتا اس لیے اگر کسی کام سے اسے بلانے یا کچھ پوچھنے کے لیے پولیس کو بھیجا جائے تو سادہ لباس میں ہو تاکہ وہاں اس کی بے عزتی ہونے یا سراسیمگی پھیلنے کا امکان نہ ہو۔ پولیس آفیسر نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ ایک بات آپ کو بتاتا چلوں کہ آج پولیس کے محکمے میں جس طرح کی اکثریت ہے یا جو رویہ ہے' وہ اب سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ وہ لوگ شرفاء کی عزت کا پورا پورا خیال کرتے تھے۔ کسی کو بے جا تکلیف نہیں دیتے تھے اور کبھی ان کے گھر پر وردی میں جاکر انھیں ہراساں نہیں کرتے تھے۔ ہاں تو ساری کارروائی پوری ہونے تک رات ہوچکی تھی۔ شاید نو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ اس وقت یہ پہر بھیگی رات کا پہر کہلاتا تھا۔ مغرب کے بعد ہی لوگ گھروں میں چلے جاتے تھے اور عشاء کی نماز

پڑھتے ہی سونے کو لپٹ جاتے تھے۔

وقارالحسن کے گھر کا بھی یہی چلن تھا مگر آج کل شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اگلے روز جہانی آپا کو مائیوں بٹھانا تھا اس لیے جب ہم حویلی پہنچے تو وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ پوری کوٹھی میں چراغاں کا سا سماں تھا۔ اماں وقارالحسن کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔ اگلے روز مائیوں کی رسم کے لیے آنے والی سمدھن کو سونے کے گہنے پہنچانا تھے اور گہنے وقارالحسن کو لانا تھے۔ یوں بھی اتنا زیور تھا کہ وہ پریشان ہوگئی تھی اس لیے انھوں نے وقار الحسن کو تاکید کی تھی کہ وہ رات کا سفر نہ کرے۔ اس نے بھی رات کا سفر تو نہیں کیا تھا اگر یہ سارا چکر نہ چلا ہوتا تو ہم زیادہ سے زیادہ مغرب تک یا اس سے پہلے ہی پہنچ چکے ہوتے۔ ہم پہنچے تو اماں کی جان میں جان آئی۔ تایا کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا مگر جلد ہی وہ سنجیدہ ہوگئے۔ انھوں نے بڑے غور سے وقارالحسن کا چہرہ دیکھا جو اماں کو اٹیچی کیس میں سے زیور نکال کر دے رہا تھا۔ اماں کا سارا دھیان زیور پر تھا۔ اسے لیتے ہی وہ انتظامات کے بارے میں بتانے لگیں۔ کیا کیا ہوگیا ہے' اور کیا کیا ہونے سے رہ گیا ہے۔ وقارالحسن کو کیا کرنا ہے۔ کون سے کام ادھورے پڑے ہیں۔ وہ یہ سب بتانے میں مصروف تھیں اور تایا وقار الحسن کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یک بیک وہ چونکے اور پھر کھنکار کر بولے۔

"دلہن! بچہ تھکا ہوا آیا ہے۔ وہاں بھی فارغ تو نہیں بیٹھا رہا ہوگا پھر سفر کی تھکن بھی ہے۔ اسے چائے پانی کو پوچھو۔ کھانے کا انتظام کرو۔ یہ بکھیڑے تو یوں چٹکی بجاتے ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ میں نے مطلوب کے بچوں کو بلوایا ہے' آتے ہی ہوں گے' کچھ ذمے داریاں انھیں بھی دے دو۔"

"اوہ ہاں بھائی صاحب۔ میں تو بالکل گھن چکر بن کر رہ گئی ہوں۔ میں نے بھی دوپہر سے کھانا نہیں کھایا۔ یہی سوچتی رہی کہ بس ابھی کھاتی ہوں' شام ہوگئی تو سوچا کہ بس اب وقارالحسن آنے والا ہوگا اس کے ساتھ کھالوں گی مگر ۔۔۔ دیکھیے تو ۔۔۔ اسے بھی نہیں پوچھا۔" اتنا کہہ کر اماں وقارالحسن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "جاؤ تم ہاتھ منہ دھوؤ۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر اماں تیزی سے اندرونی حصے میں چلی گئیں۔

یہ چھوٹا برآمدہ تھا جس کے دائیں طرف صحن اور بائیں طرف کمروں کے دروازے تھے۔ اماں والے کمرے میں جہانی آپا اور خاندان کی دوسری لڑکیاں تھیں۔ اس کمرے کے دروازے پر گیندے کے پھولوں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ دوسرا کمرا جو بہنوئی کا تھا اس پر تائی اماں خاندان کی دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ چچی' غلام رسول کی بیوی اور مطلوب چچا کی بیوی اماں کے ساتھ باورچی خانے کے سامنے پلنگوں پر بیٹھی تھیں۔ رشید چاچا باہر کے کاموں میں مصروف تھے۔ خاندان میں مطلوب چچا کی فیملی کے علاوہ عقلیمہ تائی کی دونوں بچیاں' دونوں بیٹے اور ایک بہو آئی ہوئی تھیں۔ غوثیہ پھوپو اپنی اولاد کے ساتھ ڈیڑھ دن سے آئی تھیں۔ حکیم علی احمد کو تایا نے بہ اصرار بلوایا تھا۔ ان کی دونوں بیٹیاں اور بیٹا بھی آئے ہوئے تھے۔ حکیم علی احمد البتہ واپس گھر چلے گئے تھے۔ انھیں اپنے بستر کے سوا اور اپنے گھر سے باہر نیند نہیں آتی تھی۔ یہ تمام کچھ تھا مگر وقار الحسن اس ہنگامے سے دور' تایا کے پاس بڑے پلنگ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"اٹھو بیٹا ۔۔۔ تمھاری اماں کھانا لے آئیں گی۔ تم ہاتھ منہ دھوؤ۔" کچھ دیر بعد تایا نے اس کے پریشان بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ وقارالحسن نے آنکھیں کھول کر تایا کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ تھکن کے آثار' آنسوؤں کے سمندروں کا سا سکوت اور گہرائی تھی۔ ایک ایسے شور کا صرف احساس جو نہ سنائی دیتا ہو' دکھائی بھی نہ دیتا ہو صرف محسوس ہوتا ہو۔

"کیا بات ہے بیٹا ۔۔۔ سب ۔۔۔ ٹھیک ہے نا؟ سب کچھ' کوئی بات ۔۔۔ کوئی خطرہ ۔۔۔ کوئی پریشانی؟" وہ یہ پوچھتے پوچھتے ہی گھبرا گئے تھے۔

وقارالحسن اٹھا۔ "نہیں تایا ۔۔۔ یوں ہی' تھکن بہت ہے۔ لگتا ہے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔ برسوں سے سفر پر ہوں۔ پیروں کی تھکن جیسے روم روم میں بس گئی ہے۔ سفر اور صرف سفر' نہ ختم ہونے والا مسلسل سفر۔" وقارالحسن بولتے بولتے پھر لیٹ گیا۔

واقعی اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں اس کے بدن کی ہر حرکت میں' اس کی آنکھوں کی ہر جھپک میں بے پناہ تھکن تھی۔ وہ مسلسل سفر میں تھا' یہ اس نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ وہ تو آٹھ برس کی عمر سے ہی سفر پر روانہ ہوگیا تھا' خوف اور دہشت کا سفر' جہاں راستوں نے پلٹ پلٹ کر اسے کئی بار ڈسا تھا۔ جہاں سراب کی طرح جھلملاتی ہوئی منزل بار بار اپنی چھب دکھا کر دھندلکوں میں کھو جاتی تھی' جہاں اس کے ساتھ سفر کرنے والی ہر امید کی کرن پر سراسیت کی نذر ہوچکی تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسے مسافر کی طرح لٹا پٹا بیٹھا تھا جو ایک بے مقصد سفر میں اپنا سب کچھ ہار چکا ہو۔ جسے نہ منزل ہی ملی ہو نہ راستہ' جو بے وجہ جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر منزل کی سمت جانے والے رستے ہی کو تلاش کرتا رہا ہو اور ناکام لوٹ آیا ہو۔ وقارالحسن نے اتنا کچھ کیا' آبلہ پائی کی' دن کا چین اور راتوں کی نیند بیچ ڈالی۔ اپنی ذات میں برستی بوندوں کی ٹھنڈک محسوس کرپایا نہ محبت اور نفرت ایسے جذبوں کی سچائی ہی پاسکا۔ نہ رشتوں کے حق نبھا پایا' نہ دشمنی کی آگ کو ٹھنڈا کرپایا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کرسکا۔ یوں جیسے صدیوں پہلے جس جگہ کھڑا تھا اب بھی وہیں ہو۔ جیسے اپنی ذات کا ہر دکھ گہری رات کے زخمی ہاتھوں میں چھوڑ آیا ہو۔ جیسے اپنی ہر امید' ہر خواہش کا چراغ حالات کی تیز آندھی کی پیشانی پر ٹکا دیا ہو۔ میں سوچ رہا تھا' دیکھ رہا تھا اور اپنے دل میں لہریں سی اٹھیں۔ محسوس کررہا تھا۔ آج میں نے ایمان داری سے' پوری ایمانداری سے اپنے اندر وقارالحسن کا دکھ محسوس کیا تھا۔

مجھے دکھ تھا کہ وقارالحسن نے اپنے گرد ایسی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں جن کا مقصد قطعی اسے محفوظ کرنا نہیں ہے۔ وہ دیواریں محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کھینچی گئی ہیں۔ صرف اور صرف اتنا سننے کے لیے کہ وقارالحسن بہت شریف اور نیک لڑکا ہے۔ اس ایک جملے کو سننے کی تسکین اس کا سب کچھ چھین لے گئی تھی۔ کتنا بڑا سودا کررہا تھا وقارالحسن۔ کس قدر خسارے کا سودا تھا یہ' اور وقارالحسن کو قطعی احساس نہیں تھا۔ اسے قطعی ادراک نہیں تھا کہ اس کی اپنی ایک زندگی ہے' اس کی الگ ذات ہے' اس کا کردار اور اس کی سوچ ہے' اس کی خواہشات اور امنگیں ہیں۔ سارے جذبے ہیں۔ وہ اچھے ہوں یا برے' نیک ہوں یا بد ان کا تعلق اس کی ذات سے ہے اور اگر ذات سفر کرے گی' اپنے ارتقا کی طرف بڑھے گی تو اسے سب جذبے' سارے احساسات بھگتانے ہیں۔ سب پرکھنے ہیں۔ وہ ان جذبوں کو اپنے اندر سے نکال کر انسان نہیں رہ سکتا اور نہ ہی یہ جذبے اس سے باہر اپنی کوئی حیثیت رکھتے ہیں اور میں یہی اسے بتانا چاہتا تھا کہ نیک اور بد کا' اچھے اور برے کا وہ فلسفہ جو لوگوں نے خالی لمبی دوپہروں میں' حقہ پیتے ہوئے' برگد یا نیم کی گھنی چھاؤں کے نیچے بیکار لیٹے لیٹے تخلیق کیا تھا وہ غلط تھا۔ غلط ہے اور غلط رہے گا۔ وہ انسان ہے' اسے انسان ہی بن کر رہنا ہوگا۔ اگر لوگ دوسروں کے تجربوں اور مشاہدوں سے کچھ حاصل کرلیا کرتے تو پہلے بھی تو نیک لوگ گزرے تھے' ان کی جزا' اور بروں کی سزا دیکھ کر دنیا عبرت پکڑ چکی ہوتی' سبق حاصل کرچکی ہوتی ۔۔۔ معاف کیجیے گا' میں یہ سب اس لیے نہیں کہہ رہا کہ وقارالحسن بھٹک جائے' نہ میرا یہ مقصد ہے کہ انسان کو برا کرتا رہنا چاہیے۔ میں تو صرف یہ بتانے کی کوشش کررہا ہوں کہ اسے کم از کم اپنی سیدھے سادے جذبوں کو تو برتنے کا حق تھا' مثلاً" اسے محبت کا حق تھا' وہ محبت کرسکتا تھا' اسے شگفتہ سے پیار تھا' وہ محبت کررہا تھا مگر اس جذبے کی لطافت سے لطف اندوز نہیں ہورہا تھا۔ وہ اسے گناہ تصور کرتا تھا کہ وہ شگفتہ کو دیکھے' اس سے باتیں کرے یا اسے چھولے ۔۔۔ یا جس نے جو اسے لذتوں کی آگہی عطا کی تھی اسے وہ گناہ کہہ رہا تھا۔ ممکن ہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں' بالکل ایسے ہی جیسے وقارالحسن متفق نہیں ہے' اگر ایسا ہے تو آپ بھی زندگی کو ضائع کررہے ہیں۔ ہاں' ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ آپ کا نفس امارہ میری تائید ضرور کرے گا۔ کرے گا ناں؟

میں شاید فضول باتوں میں پڑگیا' خیر میں تو یہ بتا رہا تھا کہ اس وقت وقارالحسن کی حالت تو مجھے بھی پگھلا گئی۔ میں نے سوچا کہ اسے تبدیل کرنے میں قطعی جلدی نہیں کروں گا۔ وہ واقعی بہت تھک گیا تھا۔ مجھے اس کی مدد کرنا چاہیے تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اسے ہمت دلائی۔ "وقارالحسن' تم گزرنے والے لمحوں کا راز فاش کرنا چاہتے ہو کیا؟"

"نہیں ۔۔۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"تو پھر ہمت کرو۔ تمھاری حالت دیکھ کر تایا پریشان ہیں۔ انھیں شبہ ہے کہ کچھ ہوا ہے۔ ان کے حلق میں کانٹے پڑگئے ہیں۔ اٹھو ۔۔۔ اگر یہ حالت اماں نے دیکھ لی تو ابھی سارے گھر کی خوشیاں ساکت ہوجائیں گی۔"

میں اور وہ اندر ہی اندر باتیں کررہے تھے اور تایا نم آنکھوں سے اسے تک رہے تھے۔ "وہ اٹھو بیٹا ۔۔۔ کھانا کھا کر سوجانا ۔۔۔ صبح دیکھی جائے گی' ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔"

اس بار وقارالحسن دھیرے سے مسکرایا اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی اماں کھانا لے کر آگئیں۔ تایا نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ "دلہن اتنے سے بچے پر اتنی ذمے داریاں پڑچکی ہیں کہ بچے کے چہرے کی تروتازگی ختم ہوکر رہ گئی ہے' پھر جو عذاب اس نے بھگتے ہیں وہ بھلا کب کسی نے بھگتے ہوں گے' پھر بھی اس نے کبھی اف نہیں کی۔ اسے اپنی تمام ذمے داریوں کا پورا احساس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بہن کو بیاہنا آسان نہیں ہے۔ تم ایک دم' آتے ہی اس پر کاموں کا بوجھ مت ڈالو۔ کھانا کھا کر سوجائے گا' صبح جو چاہو کام بتادینا مگر ۔۔۔ ابھی کسی ادھورے کام کا ذکر نہ کرنا۔"

ہاں بھائی صاحب' میں جانتی ہوں۔ اس کی تکلیف کا احساس مجھے نہیں ہوگا تو پھر میں ماں ہی کب رہوں گی۔ بیاہ تو کچھ بھی نہیں ہے کہ میں ابھی اسے کھڑا کردوں۔ سویرے ہی وہ دیکھ بھال کرے گا سب کاموں کی۔

"اللہ خوش رکھے۔ اتنی سی بات تھی۔" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ دور سے آتے ہوئے وقار الحسن کی نگاہیں انہی کے چہرے پر تھیں۔ میں نے جو اسے تایا کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ آیا اور کھانا شروع کردیا پھر بولا۔ "اماں سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں' ماشا اللہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ بڑی رونق ہوگئی ہے حویلی میں' ایسی رونق تو برسوں سے ناپید تھی۔ یہ نیک شگون ہے' ورنہ میں نے کتنی ہی شادیاں ایسی دیکھی ہیں کہ سارے دھوم دھڑکے کے باوجود خاک اڑتی محسوس ہوتی تھی۔" اماں خوشی سے نہال ہو کر بولیں۔

ان کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان تھا جو وقار الحسن اور میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ جیسے سارا ماضی بھلا چکی تھیں۔ انھیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ بچی کو ہنسی خوشی رخصت کرنے کا تصور ان کے اندر ڈھیروں توانائی بھر گیا تھا۔ وقار الحسن کا جی خوش ہوگیا۔ اس کے چہرے کی تمام تھکن سمٹ سمٹا کر اس کی آنکھوں تک محدود ہوگئی۔

"باورچی کا اور قناتوں کا انتظام کرلیا؟ چاول اور گیہوں کا کیا ہوا؟" اس نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"باقی تو سب ہوگیا ہے' بس یہی دو کام رہ گئے ہیں۔ رشید چاچا کل چاول کی بوریاں لے آئیں گے۔ بکرے والا پرسوں بکرے بھی دے جائے گا۔ گیہوں آچکا ہے۔ چکی پر بھیجنا ہے۔ اب سویرے تم دیکھ لینا۔ بس سمجھو سب کچھ نمٹ گیا۔ اتنے بہت سے کام تھے' مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی مگر اللہ کا کرم ہے' پتا بھی نہیں چلا۔" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابھی گیہوں نہیں پسے' چاول نہیں آئے' بکرے نہیں آئے پھر کل مانجھے میں کیا ہوگا؟" وقار الحسن نوالہ توڑتے توڑتے رک گیا۔

"اونہونہہ۔" اماں نے نوالا نگلا۔ "کل کا تو سارا انتظام ہے۔ باورچی کو چیزیں بھی گئیں۔ سویرے تاج الدین قصائی گوشت بھی پہنچادے گا اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ سب کچھ تو تمھارے تایا ہی کرچکے۔ حکیم علی احمد کے بیٹے سعید اور مطلوب بھائی کے بچوں نے بڑا سنبھالا۔"

یہ سنتے ہی وقار الحسن مطمئن ہوگیا۔ تایا دھیرے سے مسکرائے۔ "میاں دیکھنے میں ہم بوڑھے لگتے ہیں۔ ہڈیوں میں گودا تو ویسے ہی جما ہوا ہے۔ جوانی بھی ابھی گئی نہیں ہے۔ تمھاری تائی ٹھیک ہوتیں تو ایسی خاک بھی اڑتی نہ دکھتی تمھیں۔" انھوں نے لہجے کو شوخ بنانے کی کوشش کی مگر ان کے لہجے کی شوخی کے پیچھے سسکاریاں سی ابھر کر معدوم ہوگئیں۔ لمحہ بھر کو اماں اور وقار الحسن کے چہرے پر بھی رنگ آکر گزر گیا۔

"بھئی یہی زندگی ہے۔ غم خوشی' دکھ درد سبھی کچھ آتا ہے۔ آدمی ختم تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ تو چلتا رہتا ہے اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ وقت بہت بڑا مسیحا ہے یا وقت سب سے بہتر مرہم ہے' وہ غلط نہیں ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے' اس نے جذبوں کو گہرا ہونے اور پھر مدھم پڑجانے کا جو سسٹم بنایا ہے اسے لمحوں سے باندھ دیا ہے۔ تو جب وقت گزرتا ہے۔ تو سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔ بچپن میں لگی ہوئی چوٹ یا زخم جس سے بہت خون بہا ہو اور بچے کو بڑی تکلیف ہوئی ہو وہ بڑے ہونے پر کب یاد رہتا ہے۔ سب بھول جاتا ہے' یہ نسیاں کا مرض آدمی کے لیے آب حیات ہے' بڑا فائدہ مند' سب کچھ بھلادیتا ہے۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوگئے پھر انھوں نے سر اٹھا کر اماں اور وقار الحسن کو دیکھا' دونوں ہاتھ روکے ہوئے ان کی باتیں سن کر مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر اب تم لوگ ترس کھانا چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ہوں۔ خوش بھی ہوں اور سب کچھ بھول چکا ہوں اسی لیے خوش ہوں۔"

"مم۔۔۔ مگر تایا۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔" وقار الحسن بوکھلا گیا۔ اماں کے چہرے پر بھی تردد پھیل گیا۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے' بس میں تو یونہی کہہ رہا ہوں۔ کھانا کیسا تھا یہ بتاؤ تم؟" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ شاید ماحول کی گمبھیرتا کو محسوس کرگئے تھے۔

"اچھا تھا۔" وقار الحسن اچانک تبدیل ہوجانے والے موضوع پر گڑبڑا گیا۔

"جانتے ہو کس نے بنایا ہے؟" انھوں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ہیں۔" وہ بے وقوفوں کی طرح بولا۔

"تمھاری چچی نے' بھئی اپنے چبانے کے لیے مرچیں نہیں رکھیں انھوں نے سب ڈال دیں۔ آج کل تو منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ جب بات کرتی ہیں تو مجھے خواہ مخواہ بچپن میں گزری شب براتیں یاد آجاتی ہیں۔ ایسی چٹر پٹر ہوتی ہے جیسے پھلجھڑیوں سے ستارے ٹوٹتے ہوئے ہوتی ہے۔"

وقار الحسن بات سمجھ کر زور سے ہنس دیا۔ ان کے لہجے میں وہی پہلے والی بات تھی۔ اسی وقت مطلوب چچا بڑبڑاتے ہوئے آگئے۔ وہ بار بار سر کو جھٹکے دے رہے تھے اور کہتے جارہے تھے۔ "ہاں نہیں تو سہی۔ بتاؤ تو سہی' ہاں نہیں تو۔"

"ارے بھئی کچھ ہمیں تو بتاؤ۔۔۔ ہاں نہیں تو۔۔۔" تایا چہکے۔ مطلوب چچا ان کی پاس ہی آبیٹھے۔

"ارے بھائی کیا ضروری ہے کہ ہر بیاہ کے موقع پر ذکیہ کی سسرال والوں کو صلوتیں سنائی جائیں یا مجھے نکھٹو اور بے پروا کہا جائے۔ اب کیا میں ان کے سینے پر سوار ہوجاؤں کہ وہ ذکیہ کو بیاہ کرلے جائیں' یا ذکیہ کو گھر سے نکال دوں۔۔۔ ہاں نہیں تو"

"یہ کیا بات ہوئی' ہاں نہیں تو۔" تایا مزے لینے کے موڈ میں تھے یا اپنے اندر جمے ہوئے زخموں کے کھرنڈ اکھاڑ رہے تھے۔ وقار الحسن کو ان کی ہر مسکراہٹ کے پیچھے سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ بے وقوف تھا وہ۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے کہ آدمی اگر اپنے زخم چاٹتا رہے تو زخم ہرے ہی رہتے ہیں اور کچھ غافل ہوجائے تو ناسور بھی بھر جاتے ہیں۔ وقت واقعی بڑا مسیحا ہے۔ وہ خود لکیر پیٹنے کا عادی بن چکا تھا اس لیے ان کی ہر خوشی کی آہٹ کو درد کی چاپ سمجھ لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ان کے موڈ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ٹوکا۔ اسے بتایا کہ تایا واقعی خوش ہیں۔ جہانی آپا کیا کوثر سے کم ہیں ان کے لیے' پھر اب تو وہ اسے رو چکے ہیں' وہ پہلے والی بات تو ہے نہیں کہ زندہ تھی اور آنکھ سے اوجھل تھی۔ اس کی تکلیف کا احساس ہی انھیں دکھی رکھتا تھا مگر اب تو وہ تمام تکلیفوں سے نجات پاچکی تھی' اب کا ہے کا غم ہوتا تھا۔ ہاں تائی کی حالت ضرور ان کے لیے تکلیف دہ رہی ہوگی مگر اب تو وہ ان کے رویے کے بھی عادی ہوچکے تھے۔ اب تو ان کی باتوں سے بھی مزے ہی لیتے تھے۔

میرے سمجھانے بجھانے سے وقار الحسن کی نگاہوں کا زاویہ کچھ بدلا۔ اماں کھانا کھا چکی تھیں اور چائے لانے کو کہہ گئی تھیں۔ غلام رسول کی بیوی برتن لے گئی۔ وقار الحسن ہاتھ دھو کر پھر تایا وغیرہ کے پاس آبیٹھا۔ مطلوب چچا اپنی بیوی کی شکایتیں کر رہے تھے۔ دراصل ان کی بڑی بیٹی ذکیہ کا نکاح ہوچکا تھا مگر رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ سسرال والے تھے تو خاندان ہی کے مگر کافی چھچھورے تھے۔ جہیز کے نام پر اپنا گھر بھرنا چاہتے تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا' دو بیٹیاں تھیں۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اسی بیٹے کا اتنا جہیز لے لیں کہ گھر بھرا رہے' بیٹیاں تو جھولیاں بھر کر جانے والی تھیں انھیں دیتے یا گھر کا سامان لیتے۔ ان کی اس حرکت پر سارے ہی خاندان نے لے دے کی تھی۔ بات نکاح کی نہ ہوتی تو کھڑے کھڑے جواب دے دیا جاتا مگر اب تو مطلوب چچا بری طرح پھنس چکے تھے۔ اس زمانے میں تو بات پکی

ہونے یا منگنی ہونے کے بعد میں رشتہ توڑنا معیوب سمجھا جاتا تھا یہ تو پھر نکاح تھا۔ طلاق لینا پڑتی اور ذکیہ عمر بھر طلاق یافتہ کہلاتی۔ چچی نے مطلوب چچا کی جان کھائی ہوئی تھی کہ وہ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں۔

ہر لڑکی کی شادی پر چچی کا دل بھر آتا۔ وہ دل کے پھپھولے پھوڑنے کو مطلوب چچا کے سر ہوجاتیں۔ آج جہانی کا اہتمام دیکھ کر بھی انھیں ذکیہ کے سسرال والوں کو صلوتیں دینا یاد آگیا تھا۔ وہ کام کرتے کرتے ایک دم دوپٹے کے پلو سے ناک صاف کرکے' بھرائی ہوئی آواز میں مطلوب چچا کے پیچھے پڑجاتی تھیں۔ اس وقت بھی شاید یہی ہوا تھا۔ مطلوب چچا کی باتیں سن کر تایا نے انھیں تسلی دی اور کہہ دیا کہ اب وہ تردد نہ کریں' جہانی کے نکاح کے بعد وہ ذکیہ کے سسر اور شوہر سے بات کریں گے۔ یہ سن کر مطلوب چچا خوش ہوگئے۔ چچی بھی یہی چاہتی تھیں کہ وہ کچھ بڑوں کو درمیان میں ڈال کر بات کریں کہ نکاح کو دو برس ہوگئے' ذکیہ کے چکر میں وہ دو لڑکیوں کی سل سینے پر دھرے بیٹھی تھیں۔ وہ بیاہی جاتی تو دوسری لڑکیوں کے لیے بھی در کھلتا۔

مطلوب چچا اور تایا بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ وقار الحسن سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کمرے کی صفائی کرادی گئی تھی۔ وقار الحسن نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اس کا بکس اس کونے میں' اسی طرح رکھا تھا۔ اسے یہ کمرا کھلا دیکھ کر اس تصویر کے بارے میں تشویش ہوئی تھی جو اس نے یہاں سے جانے سے پہلے اس بکس میں رکھی تھی۔ اس وقت اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ بکس کھول کر سوامی جی اور پردادے کی تصویر دیکھ کر اطمینان کرتا کیونکہ وہ اس کونے میں' اسی پوزیشن میں رکھا تھا اس لیے زیادہ پریشانی بھی نہ تھی۔ اماں نے اس پر سفید میزپوش ڈال کر دو گلدان رکھوادیے تھے۔ ان گلدانوں میں موتیا اور بیلے کی کلیاں سجی تھیں جس سے کمرا معطر ہو رہا تھا۔ وقار الحسن چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اور جلد ہی بے خبر ہوگیا۔

میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کی حالت دیکھ کر چپ رہا۔ اس کے سوتے ہی میں چپکے سے باہر آیا اور اماں والے کمرے میں جا پہنچا۔ سارے خاندان کی کنواری لڑکیاں یہاں جمع تھیں' بہت سی ایسی بھی تھیں جنھیں میں آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کمرے میں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ارغوانی' دھانی اور سنہرا رنگ' مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہ تینوں رنگ ان لڑکیوں کے آنچل میں تھے جو اوندھی لیٹی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ جہانی آپا کو دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ جو حویلی میں قید ہوجانے کے بعد ان کی

حالت ہوگئی تھی۔ اس نقاہت اور کمزوری کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ بجھی بجھی آنکھوں کی جگہ جیسے دو ہیرے جگمگا رہے تھے۔ نم اور گلابی ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ زرد رخساروں پر شفق پھوٹ چکی تھی۔ کلائیاں ویسی ہی گول چکنی اور بھری بھری تھیں جن میں سبز کانچ کی چوڑیاں بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ وہ بالوں کے کچے پیلے رنگ کے لباس میں سرسوں کے کھیت کی طرح مہکی مہکی لگ رہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ وقار الحسن کو اٹھا کر لاؤں اور اسے بتاؤں کہ دیکھو محبت آدمی کو کتنا حسین بنا دیتی ہے۔ جذبہ جنم لیتا ہے تو آدمی کو مہکا دیتا ہے اور جب اسی جذبے کو برتا جائے تو آدمی پر حسن برسنے لگتا ہے۔ جہانی آپا نے ابھی جذبوں کو برتا ہی کب تھا۔ ابھی تو جذبے ان کے اندر ہی چکرا رہے تھے' جیسے اندر ڈھیروں چراغ جگمگا رہے ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ جذبے برتے تو ان پر نگاہ ٹکانا مشکل ہوگا۔ پتا نہیں وقار الحسن کے دماغ میں یہ سب کیوں نہیں آتا تھا۔ اس کی بے وقوفی کے فلسفے اس کے بدن پر گہری لکیریں ڈال رہے تھے اس کی آنکھوں کی تمام چمک چھین چکے تھے۔ اس کے بدن کی توانائی' اس کے چہرے کی دمک اور اس کی تمام خوب صورتی' بدصورتی میں بدل رہے تھے۔ مرد تو اسی لیے زیادہ عرصے تک جوان رہتا ہے کہ وہ اپنے جذبوں کو مدھم نہیں پڑنے دیتا۔ شادی کے بعد اردگرد بکھرے جوان' کچے پکے رنگ کھنکھناتی ہوئی مسکراہٹیں اور سبک چال اسے کھینچے لیتی ہے۔ وہ الجھا ہی رہتا ہے' الجھا رہنا چاہتا ہے اسی لیے جوان رہتا ہے۔ جبکہ لڑکی کے سب جذبے' سب خواہشیں ایک مرد سے وابستہ کردی جاتی ہیں اور اس کی گھٹی میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ شادی کے بعد اس کے گرد کانٹوں کی باڑھ کھنچ جاتی ہے لہٰذا اسے اس سے آگے نہ کچھ دیکھنا ہے' نہ محسوس کرنا ہے اور نہ ہی سوچنا ہے۔ یہ قید' یہ پابندی اس کے سمندروں پر بند باندھ دیتی ہے اور..... اور پھر وہ کسی جوہڑ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اسی لیے جلدی بوڑھی کردی جاتی ہے۔

پتا نہیں وقار الحسن یہ سب کچھ کیوں نہیں سمجھتا تھا۔ بہرحال میں تو رنگینیوں میں مست تھا۔ اس پوری حویلی میں یہی کمرا تھا جہاں بیٹھ کر مزہ آرہا تھا۔ معصوم اور شرمیلی سرگوشیاں ہونٹوں سے ابھرتیں تو آنکھوں تک پہنچتے پہنچتے بھیگ جاتیں' چہروں پر ہنسی پھوٹ پڑتی' حنائی ہاتھ چہرہ چھپا لیتے' بدن ملنے لگتا جیسے ان دیکھے ہاتھ گدگدی کر رہے ہوں اور بدن کی یہ ہلچل میرے اندر اتھل پتھل سی کر دیتا' میں پتا نہیں کب تک یہاں بیٹھا رہا پھر جب ان روشن' سیاہ اور خوب صورت آنکھوں میں بوجھل پن اتر آیا' سرگوشیاں مدھم پڑ گئیں' بدن بے حال ہو کر لڑھک گئے تو میں کچھ دیر وہاں بے خبر حسن کو بے ترتیب سا بکھرا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ دھانی آنچل والی اب بھی مندی مندی آنکھوں سے چھت تک رہی تھی۔ بے وجہ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکان ٹھہر گئی تھی۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا جو اسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر آنے لگا تو بے اختیار اس کے قریب رک گیا۔ دل میں ایک لہر سی اٹھی اور میں نے بے اختیار اس کے خوب صورت ملائم سے رخسار کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اسے چھو نہیں پاؤں گا۔ مگر اتنا ہوگا کہ میرے اندر اٹھتی ہوئی لہریں تھم جائیں گی۔ جونہی میں نے اس کے رخسار کو چھوا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔

"کک..... کون ہے؟" اس کی سہمی ہوئی آواز سے جہانی آپا چونک اٹھیں جو شاید سوئی نہیں تھیں' سونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کیا بات ہے ندا؟" جہانی آپا نے اس سے پوچھا۔

میں ہکا بکا تھا۔ مجھے تو گمان بھی نہیں تھا کہ کوئی میرا لمس بھی محسوس کر سکتا ہے۔ میرا کوئی لمس بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس لڑکی کا جسے جہانی آپا نے ندا کہہ کر مخاطب کیا تھا' رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

"بولو ناں..... کیا بات ہے؟" اب جہانی آپا اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھی۔

"آپا..... یہاں کوئی ہے۔" وہ اور سمٹ گئی۔

"پاگل یہاں تو بہت سے لوگ ہیں۔ مطلب کیا ہے تمہارا؟" جہانی آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں جہانی آپا..... کسی نے ابھی ابھی..... یہاں ہاتھ رکھا تھا۔ ٹھنڈا..... بالکل یخ ہاتھ۔" اب اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"وہم ہے تمہارا..... یہاں کوئی نہیں ہے۔ ارے ہاں دیکھو تو..... یہ صفیہ ہوگی۔" جہانی آپا نے برابر میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا "اس کا ہاتھ لگا ہوگا۔ سو جاؤ۔" ندا نے پلٹ کر صفیہ کی طرف دیکھا' پھر چاروں طرف دیکھا' کچھ مطمئن سی ہو کر لیٹ گئی مگر اس بار وہ جہانی آپا کے قریب سرک گئی تھی۔

ندا نے کیا محسوس کیا؟ وہ ڈر رہی تھی یا نہیں' میرا یہ مسئلہ نہیں تھا میں تو الجھے میں تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا تھا تو یہ ایک نئی بات تھی یہ میں

اپنی اس خوبی سے بڑے بڑوں کو ناکوں چنے چبوا سکتا تھا۔ میں مسرور ہو گیا۔ جی چاہا کہ سب لڑکیوں کو چھیڑوں مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ فی الوقت ایسا کرنا خاندان والوں کے لیے نیا عذاب کھڑا کرنا ہوگا۔ شادی کا گھر تلپٹ ہو جائے گا۔ برسوں بعد تو لوگوں کے دماغ سے یہ باتیں نکلی ہوں گی۔ شادی میں بلانے کو اماں نے سب سے جانے کیسے کیسے جھوٹ بولے ہوں گے۔ اگر ایسی کوئی بات پھیل گئی تو اماں کو تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ لوگ ان باتوں کو بھی شکنتلا سے منسوب کردیں گے اور جب وقار الحسن کو حقیقت کا پتا چلا تو وہ باؤلا ہی ہو جائے گا' پتا نہیں میرے ساتھ کیا کرے۔ یہ سوچ کر میں باز رہا۔ خود کو قابو میں کیے ہوئے میں واپس وقار الحسن کے کمرے میں لوٹ آیا۔ چپکے سے اس کے اندر اترا اور سو گیا۔

☆☆ صبح اذانوں کے وقت ہی وقار الحسن کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اب کافی بہتر تھا۔ گھر میں چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ وضو کے لوٹے بھرے جا رہے تھے۔ جائے نمازیں بچھائی جا رہی تھیں' تایا اور گھر کے دوسرے مرد مسجد جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ سویرے سے اچھی خاصی سردی تھی۔ غلام رسول کی بیوی نے جانے کب اٹھ کر بڑا بھگونا بھر کر پانی گرم کر دیا تھا۔ ہر بار لوٹا بھر پانی نکلنے پر وہ ایک لوٹا پانی اور ڈال دیتی تھی۔ میں اس ساری کارروائی کو دیکھ کر الجھ گیا تھا۔ اتنا ٹھنڈا موسم تھا اور یہ سب ایسے وقت میں بستروں میں دبکے پڑے رہنے کی بجائے کانپتے' لرزتے' پھر رہے تھے۔ میں نے وقار الحسن کو اکسایا۔ "اتنی سردی میں باہر اٹھ گئے۔ اتنا گرم لحاف چھوڑ کر..... ایسی میٹھی نیند چھوڑ کر؟"

"بکواس مت کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہے مگر کبھی مجھے ورغلانے اور پھسلانے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔ اس کی یہی بات مجھے سخت ناپسند تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اسی کی فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔

"اس میں ورغلانے یا پھسلانے کی کیا بات ہے۔" میں ہوگا۔ "تم بتاؤ کیا تمہیں نیند نہیں آرہی۔ کیا لحاف گرم نہیں ہے؟ کیا باہر سردی نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں..... جانتا ہوں میں سب کچھ' سردی گرمی کی سب پتا ہے مجھے۔ مگر یہ نماز..... یار یہ بچپن کی عادت ہے۔ ویسے بھی نماز پڑھنا چاہیے۔" وقار الحسن نے اٹھنے کی بجائے لحاف کو اپنے چاروں طرف لپیٹتے ہوئے کہا۔ میں اس کی حرکت پر نہال ہو گیا۔

"ہاں تو پڑھ لینا..... ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" میں نے فوراً اپنے لہجے میں سوچ پیدا کر لیا۔ "قضا بھی تو پڑھ سکتے ہو۔" اور میری بات جیسے وقار الحسن کے دل میں اترتی چلی گئی۔ یہ میری سب سے زیادہ بڑی کامیابی تھی۔ میرا تو مقصد ہی یہی تھا کہ اسے ان بے وجہ کی محنتوں سے دور کردوں۔ وہ آرام کی اہمیت سے واقف ہو جائے۔ میرے یہ سب کہنے کے بعد سے اسے کچھ زیادہ ہی سردی لگنے لگی تھی۔ وہ لحاف کے اندر بھی سکڑ کر لیٹ گیا۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو اماں سر پر سوار ہو جاتیں مگر آج وہ بے حد مصروف تھیں۔ رشید چاچا سامان لے آئے تھے۔ غلام رسول اور دوسرے کچھ لڑکے جنہیں رشید چاچا اپنے ساتھ لائے تھے' گندم اور چاول کی بوریاں اندر رکھوا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وقار الحسن کو اٹھنا پڑا۔ تایا بھی دو بار دیکھنے آئے تھے اور دونوں بار "اٹھو بیٹا" کی آواز لگا گئے تھے۔

اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے میں بے بس ہو گیا مگر بہرحال کامیاب رہا تھا۔ وقار الحسن کا دل اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا' یہی میری کامیابی تھی۔

وہ تمام دن بہت مصروفیت کا تھا۔ تین بجے مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ آج جہانی آپا کا مانجھا تھا۔ وقار الحسن نے بڑے برآمدے کے گرد شامیانے کھنچوا کر اسے بالکل الگ کردیا تھا تاکہ کوئی اس طرف نہ جا سکے۔ یہ ہمیں آنے کے بعد یاد آیا تھا کہ اس کی اندرونی دیوار پر بھالا اب بھی پیوست تھا اور دیوار پر خون کی لکیریں بھی جمی ہوئی تھیں۔ جاتے ہوئے تو ہم اتنے حواس باختہ تھے کہ یاد ہی نہ رہا۔ اب یہ تو بڑا کرم ہوا کہ مصروفیت کی بنا پر کوئی اس طرف نہ جا سکا تھا ورنہ وقار الحسن کے گھر میں گھستے ہی اماں یا تایا ضرور باز پرس کرتے۔ وقار الحسن جب وہاں سے گزر کر اس اونچے پکے چبوترے کی طرف جا رہا تھا تو اسے خیال آیا۔ اس نے جا کر دیکھا تو یہ سب کچھ کسی کو بھی دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ تبھی اس نے اس کے چاروں طرف شامیانے کھنچوا دیے۔ پکے چبوترے کو بالکل پرانے ڈھب سے سجایا گیا۔ اس کے چاروں ستونوں کے نیچے بیلوں والے گملے رکھ کر بیلیں اس پر چڑھوا دیں۔ پانی کا چھڑکاؤ کرکے مٹی بٹھائی گئی۔ اسے چکنی مٹی سے لیپا گیا اور پھر اس پر دریاں اور سفید چاندنیاں بچھوا کر چاروں طرف گاؤ تکیے رکھے گئے۔ چاندی کے اگالدان اور پاندان سجائے گئے۔ چبوترے سے نیچے چاندی کی سلفچیاں اور چاندی ہی کے لوٹے رکھے گئے۔ یہاں بھی وقار الحسن نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اس کے آگے شامیانہ ایسے کھنچوا دیا کہ کہیں کوئی بچہ یا انجان آدمی اوپر نہ جا سکے۔ اس پر ہی بس نہیں کیا گیا وہاں سامنے کے ... پر

تخت بچھا کر اس طرف کا راستہ بالکل بند کر دیا گیا۔

وقار الحسن نے اپنے تئیں ہر احتیاط کر لی تھی جس کا چچا اور تایا بھی کئی بار معائنہ کر کے گئے تھے اور اب مطمئن تھے۔ اماں نے بھی اپنی تسلی کر لی تھی۔ کئی بار دبے دبے اپنے خوف کا اظہار بھی کیا تھا کہ کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ جہانی آپا کی تاریخ دیتے ہوئے اس بات کو خاص طور پر مد نظر رکھا تھا کہ یہ چاند کی درمیانی تاریخیں نہ ہوں' یا تو کچھ شروع کی ہوں یا آخر کی۔ گمان تھا کہ ان دنوں میں کچھ نہیں ہوگا۔ وقار الحسن گھبرایا ہوا تھا' اس کی گھبراہٹ کی وجہ سادھو کا دوبارہ فعال ہو جانا تھا۔ اگر سفر میں جو کچھ ہوا تھا نہ ہوا ہوتا تو وہ اس وقت بہت خوش اور ہلکا پھلکا ہوتا۔ اب تو اس نے سب کچھ خدا کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔ اماں پابندی سے ہر صبح اور ہر رات نماز کے بعد پابندی سے آیت الکرسی پڑھ کر حویلی کے چاروں کونوں کی طرف رخ پھیر کر پھونکتی تھیں اور زور زور سے تالی بجاتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تالی کی آواز جہاں تک جائے گی وہاں تک امان ہوگا۔ ان کا دل اس بات سے کسی حد مطمئن تھا مگر وقار الحسن جن حالات سے گزرا تھا انھوں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ ان تمام باتوں کے باوجود کہیں کوئی ایسا لمحہ ضرور ہوتا تھا جس پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی تھی اور اسے سادھو اچک لیتا تھا یا سوامی نے ایسے کتنے ہی لمحوں کو چرا کر ان پر عذاب نازل کیے تھے۔

جہانی آپا کے سسرال والے آئے تو جیسے پوری حویلی میں اور پورے محلے میں رونقیں بکھر گئیں۔ امروہہ کے لوگ اس حویلی میں اور اس گلی کو سنسان دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے' برسوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں رونق تھی۔ شادیانے بج رہے تھے۔ قہقہے جھلملا رہے تھے اور رنگینیاں بکھر رہی تھیں۔ اماں نے سارے ہی امروہہ کو جیسے مدعو کر لیا تھا۔ ہر محلے کے چار پانچ افراد تو شریک تھے ہی۔ اتنے لوگ اور ایسی رونق دیکھ کر تایا اور چچا تو کھلے پڑ رہے تھے۔ اماں اڑی اڑی پھر رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں سجے ہوئے تانگوں سے اتریں تو پائلوں کی جھنکار نے گلی بھر میں شور سا مچا دیا۔ دروازے پر استقبال کرنے والے وقار الحسن کی نگاہیں لڑکیوں کے جھرمٹ میں اٹک کر رہ گئیں مگر اسے وہ نظر نہ آئی جس کی تلاش تھی۔ اچانک تانگے پر گرا ہوا رنگین پردہ لہرایا اور ایک خوب صورت' فاختہ کے پروں ایسا ملائم اور سفید پاؤں فیروزی پٹیوں والے چپلوں سے جھانکا۔ وقار الحسن کی نگاہ جونہی اس پاؤں پر پڑی وہ نہیں' میں بھی چونک اٹھا۔ اس کے پیروں میں پائل تھی۔ وہی پائل جو وقار الحسن نے اسے دی تھی۔ شگفتہ کر اس پائل ایسی جسے شریف الدین نے چرا کر وقار الحسن کو لا دیا تھا اور وقار الحسن نے اسی ڈیزائن کی نقلی پائل بنا کر اسے پھر واپس کر دی تھی۔ وہ تانگے سے اتری تو لگا جیسے کسی ریاست کی شہزادی نے پاؤں زمین پر رکھ دیا ہو۔ فیروزی فنانزیز کے غرارے میں شیشہ جارجٹ کی قمیص اور ٹشو کا بڑا سا گوٹا لگا دوپٹا پہنے وہ کوئی حور لگ رہی تھی۔ وقار الحسن پل میں نڈھال ہو گیا۔ دل میں موجیں سی اٹھ کر شور مچانے لگیں۔ وہ پھر ساری دنیا پر لعنت بھیجنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر فوراً" ہی فیصلہ کر لیا کہ اب اسے بھی شادی میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔

میں اس کی حالت دیکھ کر ہنس دیا۔ جانتا تھا کہ شگفتہ کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی وہ پھر صحراؤں سا ہو جائے گا۔ اس وقت تو سب کچھ بھول کر لڑکیوں کے جھرمٹ کے پیچھے چل رہا تھا۔ اسے جی بھر کر دیکھ لینے کی تمنا لیے وہ آتے جاتے اسے دیکھتا رہا' مگر جی نہ بھر سکا۔ وہ اپنی اماں کے پہلو میں چپکی رہی ورنہ میرا ارادہ تھا کہ آج اگر تنہائی میں ملاقات ہو جائے تو کچھ شوخیاں ہی ہو جانے دوں مگر ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ پھولوں کے گہنے آ گئے۔ حویلی مہک اٹھی۔ عطر چھڑکا گیا ایسے میں وقار الحسن کو بڑی پھوپی کی شادی بھی یاد آئی اور پے در پے ہونے والی پراسرار اموات بھی' اگربتیوں اور لوبان کی خوشبو جیسے حویلی کا مقدر بن چکی تھی مگر آج وہ روایت ٹوٹ چکی تھی۔ آج سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ چہروں پر کھرنڈ کی طرح جم جانے والا خوف خوشیوں کی گلابوں ایسے رنگوں میں چھپ چکا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ یہ سب وقار الحسن کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کھانے سے کچھ پہلے وہ مردانے میں انتظامات دیکھنے آیا۔ اونچے چبوترے پر مردانے کا اہتمام تھا اور حویلی کے اندرونی حصے اور چھوٹے برآمدے میں زنانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ سیڑھیوں کے آگے بچھے تخت پر بیٹھے حکیم علی اسے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کی چبھن کو وقار الحسن سے پہلے میں نے محسوس کیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ کوئی ایسی بات بے چین کر رہی تھی۔ وقار الحسن نگاہیں چرانے کے چکر میں تھا مگر میں نے اسے سمجھایا کہ وہ یوں فرار کی راہ ڈھونڈنے۔ ان کا سامنا کرے۔ وہ کام آنے والے ہیں شفیق ہیں۔ جو کچھ جانتے ہیں یا جان چکے ہیں' اس پر ان سے بات کرنے سے حقیقت تو نہیں بدلنے والی۔ میری بات وقار الحسن کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ وقار الحسن کا رویہ میرے ساتھ دوستانہ ہو گیا ہے۔ وہ نہ مجھ سے اب بحث کرتا تھا نہ مجھے جھڑکتا تھا اور نہ ہی میری باتوں کو نظر انداز کرتا تھا۔ عمل کرنے والی ہوتی تھیں تو بے چوں و چرا عمل کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ حکیم صاحب کی طرف بڑھ گیا۔ انھیں دیکھ کر آداب کیا۔

"جیتے رہو بیٹا' کیسے ہو؟" انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

"دعا ہے آپ کی۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے' کوئی حکم کریں۔" اس نے بڑے مودب اور مہذب انداز میں کہا۔

"بس بیٹا۔ شکریہ' ایک چیز کی ضرورت ہے۔" انھوں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جی آپ حکم کریں۔" وقار الحسن ان کے قریب ٹک گیا۔

"جوان ہو' اتنی لمبی زندگی گزارنی ہے۔ ہولی بھی آئے گی اور دیوالی بھی۔ فکر کیوں کرتے ہو' تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔ پیدا کر سکتے ہو؟"

وقار الحسن نے چونک کر سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں تکتا رہا پھر سر جھکا دیا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔"

"ہم دعا گو ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ۔ ابھی مراد آباد جانے کا ارادہ تو نہیں ہے ناں؟"

"جی نہیں۔۔۔ فی الحال تو اس بارے میں نہیں سوچا ہے۔"

"تو سوچنے سے پہلے مجھ سے ضرور ملنا۔ شاید میں تمھارے کام آ سکوں۔ جاؤ اب مہمانوں کی آؤ بھگت کرو۔ لو گھر کے لوگ ہیں۔ ہماری فکر نہ کرو۔" انھوں نے اس کا کمر پر تھپکی دی۔ کچھ مسکرائے اور پھر وقار الحسن کا رخسار تھپتھپا دیا۔

"وقار الحسن۔ دال میں کچھ کالا ہے ضرور۔" میں نے وقار الحسن کے وہاں سے اٹھتے ہی اسے ٹہوکا دیا۔

"ہاں۔ لگتا ہے یہ ہماری توقع کے خلاف اس معاملے کو گہرائی تک جانتے ہیں۔ گویا چھپے رستم نکلے۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ یہ۔۔۔"

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ چچا نے وقار الحسن کو آواز دے لی۔ رسمیں ہو رہی تھیں۔ وقار الحسن کو اماں نے بلایا تھا۔ اس نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی منہ میٹھا کرایا۔ پھر سمدھیانے والوں نے ابٹن کی پوری کی۔ لڑکیوں نے لہک لہک کر گانے گائے۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وقار الحسن کی نگاہیں شگفتہ کے خوب صورت چہرے کا احاطہ کیے رہیں۔ وہ چپکے چپکے اسے دیکھتی اور پھر کسی نہ کسی لڑکی کے پیچھے چھپ جاتی۔ آسمانوں سے اترنے والی ساری دھنک آج اس کے چہرے پر تھی تو آنکھوں میں ہزاروں شکوے بھی تھے۔ گلے بھی تھے۔ جو گلے شکوے زبان پر نہیں آئے تھے وہ وقار الحسن کے دل میں اتر گئے تھے۔ آج مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ یہ محبت کرنے والے آنکھوں ہی آنکھوں بات کیوں اور کیسے کرتے ہیں' واقعی اس جذبے میں ڈوبے آدمی کی آنکھیں بولتی بھی ہیں اور سنتی بھی ہیں۔ جبھی تو وقار الحسن جان گیا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کس بات کا گلا ہے اس سے۔

رات کب آئی اور کب چپکے چپکے گزرنے لگی' اس کا احساس بالکل نہ ہوا۔ آٹھ بجے سو جانے والے رات بارہ بجے گھروں کو لوٹے اور جو رہ گئے تھے ان کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ شگفتہ کی ماں بے حد خوش تھیں' پتا نہیں سونے کے بانے پر یا سونے ایسی بہو ملنے پر۔

اگلے روز مایوں کی رسم شرف الدین کے گھر تھی۔ رات کو تھکے ہارے لوگ دریوں اور چاندنیوں پر آڑے ترچھے لیٹ کر رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ وہ رات سوتے جاگتے گزر گئی۔ اگلا دن پھر ہنگامے کا تھا۔ اس روز بھی حویلی میں رنگ بکھرے۔ سرگوشیاں ہوا کے دوش پر ہلکورے لیتی رہیں۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں گھنگھرو بن کر چھنکتی رہیں۔ میں پوری حویلی میں گھومتا پھرا۔ کبھی ہر آہٹ کے پیچھے لپکا تو کبھی ہر ہنسی کے آگے بھاگا۔ کبھی ہوا میں تیرتی سرگوشیاں پکڑتا رہا اور کبھی پائلوں کی چھنک سے الجھتا رہا۔ دن گزر گیا۔ شام آئی۔ تیاری ہوئی۔ کچھ بڑی بوڑھیاں گھر میں ٹک گئیں' لڑکیاں بالیاں جانے کو تیار تھیں۔ تایا شرف الدین کے بادا سے ملنے اور ان کی تیوریوں سے مزے لینے کے موڈ میں تھے' سو تیار ہو گئے۔ وقار الحسن کو تو جانا ہی جانا تھا۔ میں بھی جانے کے موڈ میں تھا۔

جہانی آپا تھکن سے نڈھال تھیں مگر جاگتی آنکھوں میں خواب بھرے نیند سے گریزاں تھیں۔ تائی جنھیں مہمانوں میں سب بھول گئے تھے۔ اس وقت جہانی آپا کے پاس بیٹھی اپنے برقعے کے بٹن سے کھیل رہی تھیں۔ برقعہ اب بھی ان کے جسم پر لٹکا ہوا تھا۔ اماں چاہتی نہیں تھیں کہ وہ بھی جائیں' وہاں بے وجہ کا تماشا بن جاتا اور تائی یوں سر تھیں کہ بقول ان کے وہاں کوثر آنے والی تھی اپنے سسرال کے ساتھ۔ وہ وہاں لوگوں کے درمیان یہ فیصلہ کرانے والی تھیں کہ سسرال والوں نے کوثر کو زر خرید سمجھ لیا' ماں باپ کے پاس بھی نہیں آنے دیتے۔ تایا نے بڑی مشکلوں سے یہ کہہ کر ٹالا کہ تم نہ جاؤ۔ میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔ اگر

تمہاری ضرورت پڑی تو وقارالحسن کو بھیج کر بلوالوں گا۔ وہ وقارالحسن کی واپسی کی منتظر تھیں حالانکہ ابھی وہ لوگ گئے بھی نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد بجے سجائے تانگے آگئے۔ لڑکیاں بڑی بڑی چادروں میں لپٹی تانگوں میں جا بیٹھیں۔ وہاں ہمارا والہانہ استقبال کیا گیا۔ شرف الدین پر بھی دھنک برس رہی تھی۔ وقارالحسن نے اسے بڑھ کر گلے سے لگایا تو اس نے سرگوشی کی۔ "وقارالحسن۔۔۔ دوست زندگی اس کا نام ہے۔۔۔ اس کا نہیں جو تم گزار رہے ہو۔"

وقارالحسن کی چمکتی ہوئی آنکھیں پل بھر کو بجھ کر رہ گئیں۔ مراد آباد سے یہاں تک کا سفر یاد آگیا۔ رحیمو کی لاش، پولیس کا آنا، گرفتاری اور پھر ریل میں سادھو کی جادوگری، سب کچھ نگاہوں میں پھرنے لگا۔ تمام منظر دھندلانے لگے۔ وہ دھیرے سے بولا۔ "ہاں دوست، زندگی اسی کا نام ہے مگر میں زندوں میں شمار ہی کب ہوں۔ میں تو روحوں اور لاشوں کے درمیان چکرا رہا ہوں۔ اس سے نجات کی کتنی ہی کوشش کرلیں یار، نہ موت پیچھا چھوڑتی ہے، نہ لاشیں اور نہ ہی روحیں۔"

وہ کندھا تھپتھپا کر اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا۔ دوسرے مہمان آگے بڑھ کر شرف الدین سے گلے ملنے لگے۔ پھر تایا نے اسے سینے سے لگالیا اور بولے۔ "بیٹا! اب یہی ہماری بیٹی ہے۔ بڑے نازوں میں پالنے کی تمنا تھی مگر قدرت نے ناز اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہر آدمی اپنے ہی چکروں میں پڑا رہا۔ اس کا۔۔۔ اس کا خیال رکھنا بیٹا۔ بڑی ترسی ہوئی خوشیوں کے لیے، ناز برداری کے لیے، محبتوں کے لیے۔" ان کا لہجہ بھیگ گیا۔ آنکھوں کے کونے آنسوؤں سے بھر گئے۔

"آپ فکر نہ کریں تایا۔ میں کبھی اس کے ہونٹوں تک حرفِ شکایت نہیں آنے دوں گا۔" اس نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر دبائے۔ یہ دباؤ اس کے جذبات کی شدت کا مظہر تھا۔

"اللہ خوش رکھے۔" تایا نے گہرا سانس لے کر کہا، آنکھیں رگڑیں پھر بڑے خوشگوار مگر معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر اس کی طرف جھک آئے۔ "میاں بادا کہاں ہیں تمہارے؟ ان کا چٹخارے دار لہجہ سننے کو کان ترس گئے۔"

شرف الدین بے ساختہ ہنس پڑا۔ "آج تو بدلے ہوئے ہیں، کل تک کافی قلق تھا انہیں اس شادی کا۔"

"اور تم میں سے کسی کو خیال نہ آیا ہوگا کہ کوئی ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیتا۔" تایا نے ایسے تاسف بھرے انداز میں کہا کہ شرف الدین جو سر جھکائے دھیمے دھیمے باتیں کررہا تھا، زور سے ہنس پڑا۔ "چلو ہم ہی پوچھ لیتے ہیں، ویسے یہ تو بتاؤ کہ ان سے افسوس کیا جائے یا مبارک باد دی جائے؟"

"تایا پلیز، ابھی قضیہ کھڑا کردیں گے۔" وقارالحسن جو دوسری طرف متوجہ تھا مگر کان انھی کی باتوں پر تھے، بول اٹھا۔

میں یہاں فضول باتوں میں الجھ کر بور ہو رہا تھا لہٰذا وقارالحسن سے شگفتہ کو دیکھنے کے بہانے اجازت لے کر اس سے باہر چلا آیا۔ اندر بکھرا حسن کل سے زیادہ تھا۔ بہت سے ایسے چہرے بھی نظر آرہے تھے جو کل دکھائی نہیں دیے تھے۔ میں گھومتا گھامتا شرف الدین کے بادا کے پاس پہنچ گیا جو باورچیوں پر اپنا سارا غصہ اتار رہے تھے۔ ان کی تیوریوں کے بل کم نہیں ہوئے تھے بلکہ بڑھ گئے تھے۔ سارے باورچی ہی شاید ان سے نالاں تھے۔ بار بار ہاتھ جوڑ کر کہتے تھے کہ وہ اندر چلے جائیں، کھانے کی کوئی شکایت ملے تو جو چور کی سزا وہ ہماری اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ بیاہ تک کی دوسری تقریبات کے لیے کسی دوسرے باورچی کا انتظام کریں۔

میں وہاں سے شگفتہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تیار ہورہی تھی۔ آج اس نے آتشی گلابی شرارہ پہنا ہوا تھا اور غضب ڈھا رہی تھی۔ آج میں نے اسے قریب سے دیکھا۔ وہ کلپنا اور چمپا سے کم نہیں تھی مگر جس طرح عام طور پر رہتی تھی اس سے اس کا حسن ماند پڑجاتا تھا۔ میں وہاں دیر تک رکنا چاہتا تھا مگر وقارالحسن کی بے چینی سے واقف تھا سو لوٹ آیا۔

رسمیں ہوتی رہیں۔ پھول مہکتے اور قہقہے بکھرتے رہے۔ رات گئے حویلی کو واپسی ہوئی۔ سب تھکے ہارے تھے۔ دو روز کا وقفہ دے کر مہندی کا انتظام تھا۔ یہ دو روز آرام کے لیے ضروری تھے، ورنہ کسی میں دم ہی نہ ہوتا کہ نکاح کے روز برات کی خاطرداری کرتا۔ اس رات بھی لوگوں کو ٹوٹ کر نیند آئی۔ وقارالحسن بے سدھ و بے خبر سویا ہوا تھا۔ میں اکتا کر اس کے کمرے سے باہر چلا آیا۔ اب تو حویلی میں لہراتے رنگ بھی مجھے پرانے اور پھیکے لگ رہے تھے۔ میں زندگی میں کوئی تبدیلی چاہتا تھا۔ کوئی پرکیف اور ہیجان انگیز تبدیلی۔ یہاں تو جو ہنگامے شروع ہوئے تھے وہ بھی اب یکسانیت کا احساس دلا رہے تھے۔ معاً میری نگاہ بڑے برآمدے پر پڑی، یہ وہی برآمدہ تھا جس میں کسی نے کوثر کو قتل کیا تھا۔ جسے وقارالحسن نے چاروں طرف سے قناتیں تان کر بند کردیا تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہاں کوثر کا

خون اب بھی دیواروں پر موجود ہے۔ وہ بھالا ویسے ہی دیوار میں نصب ہے اسی لیے وقارالحسن نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر بند کردیا تھا۔ یہ خیال مجھے ابھی ابھی آیا تھا کہ مجھے پھر اس برآمدے میں جانا چاہیے۔

مجھے دیکھنا تو چاہیے تھا کہ آخر وہاں کوثر کیوں گئی تھی۔ کیا کررہی تھی، پھر اگر اس کے کہنے کے مطابق اسے قتل کرنے والا سوامی تھا تو وہاں کہاں تھا۔ میں ہوا کے دوش پر قناتوں کو عبور کرکے برآمدے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

میں شاید پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اندھیرے میں بھی صاف دیکھ لیا کرتا تھا اور ہر ہلکی سی آہٹ یا سرگوشی مجھے صاف طور پر سنائی دیتی تھی۔ اس طرف بہت اندھیرا تھا۔ رات بھی آدھی گزر چکی تھی۔ چاروں طرف کھنچی قناتوں نے حویلی کے دوسرے حصے میں جگمگانے والی روشنیوں کا راستہ بھی روک لیا تھا۔ اس طرف اندھیرا بہت گہرا تھا۔

میں اب اس دیوار کے قریب پہنچ چکا تھا جہاں گڑے ہوئے بھالے سے کوثر کا جسم لٹکا ہوا تھا۔ میں اس جگہ پہلے بھی آیا تھا بلکہ آیا نہیں تھا، لایا گیا تھا۔ اس وقت کی اور اس وقت کی کیفیات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں دیوار کے قریب پہنچا۔ خون کا بڑا سا دھبا اب بھی دیوار پر گڑے بھالے کے چاروں طرف موجود تھا۔ پھر وہیں سے خون کی لکیریں فرش تک چلی گئی تھیں۔ میں نے وہاں چاروں طرف کچھ تلاش کرنا شروع کردیا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ گمان ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی ایسی چیز ضرور ہونا چاہیے جو کوثر کے قتل تک رہنمائی کرسکے۔

میں یہ دیکھتا ہوا جوں جوں اندر کی سمت جا رہا تھا ہوا میں ٹھنڈک گہری ہوتی جارہی تھی۔ پتا نہیں آگے کیا تھا۔ وقارالحسن بھی شاید کبھی اس برآمدے کے اندر کی طرف نہیں آیا تھا۔ ایک بار تو کوثر کی لاش لینے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس وقت یہاں سے گزر کر دوسری طرف پہنچا تھا جب اس نے پہلی بار پائل کی آواز سنی تھی۔ یہ شاید ابا کی برسی کے دنوں میں ہوا تھا۔ تب بھی اسے یہاں ایسی ہی ٹھنڈ محسوس ہوئی تھی جیسے وہ کسی برف خانے سے گزر رہا ہو۔ یہ برآمدہ کہاں تک جاتا تھا؟ اندرونی حصے میں کیا بنا ہوا تھا، یہ تو شاید کسی کو بھی نہیں پتا تھا۔ کم از کم میں نے اس سلسلے میں کسی کے اندر نہ کوئی تجسس محسوس کیا تھا اور نہ ہی کسی سے کوئی ذکر سنا تھا۔

شاید ان لوگوں نے اس حصے میں جانے کی کوشش کی ہو مگر ہڈیوں میں گودا جما دینے والی ٹھنڈ نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہو۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ بہرحال یہ خیال مجھے آج آیا تھا کہ اس حصے کو دیکھنا چاہیے اور گھر کے دوسرے افراد سے بھی پوچھنا چاہیے کہ انھوں نے کیا دیکھا یا اگر نہیں دیکھا تو کیوں نہیں دیکھا۔ آخر بنانے والے نے اس میں آگے کیا بنایا ہے یہ تو کسی کو پتا ہوگا۔

میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ اندر جانے کا ارادہ کیا۔ میں دھیرے دھیرے اپنے جسم کو آگے سرکانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کی یہ غیر فطری سی ٹھنڈک مجھے اتنی محسوس نہیں ہوگی، ظاہر ہے کہ میرا کوئی جسم تو تھا نہیں کہ حتمی درجہ حرارت میں لرزنے لگتا۔ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف اب کچھ ایسی دھند تھی جیسے برف کی بڑی بڑی سلوں سے بھاپ اٹھ رہی ہو۔ چاروں طرف کی دیواروں سے بھاپ نکل کر ہر طرف پھیل رہی تھی۔ سامنے کے منظر کچھ دھندلا گئے تھے۔ میں نے اپنی بصارت پر کچھ دباؤ ڈالا پھر بھی کچھ دکھائی نہ دیا۔ ٹھنڈک بھی کہیں اندر اترتی محسوس ہورہی تھی۔ پھر اچانک مجھے لگا جیسے میرے سامنے ہوا کا بلکہ اس یخ بھاپ کا دباؤ بڑھ گیا ہو۔ ایک رکاوٹ سی کھڑی ہوگئی تھی سامنے، جسے میں اپنی پوری قوت سے دھکیل کر آگے بڑھنا چاہ رہا تھا۔ میں کچھ ہی دور تک جاسکا پھر یوں لگا جیسے میں اب ذرا بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اچانک مجھے کچھ عجیب سی آوازیں آنے لگیں، یوں جیسے کوئی دھیرے دھیرے کچھ پڑھ رہا ہے۔ جیسے آواز کہیں دور سے آتے آتے ہوا کے رخ کی وجہ سے اچانک کہیں بھٹک جاتی ہے۔ یہ آواز سامنے کی طرف سے آرہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے میں کسی سرنگ کے دہانے پر کھڑا ہوں جو اندر ہی اندر دور تک چلی گئی ہے اور یہ آواز وہیں سے آرہی تھی۔ اسی سرنگ سے۔

پتا نہیں وہ کون سی قوت تھی جو مجھے ایک ہی جگہ جمے رہنے پر مجبور کررہی تھی۔ اب وہاں کھڑے رہنا بے سود تھا۔ میں آہستگی سے لوٹ آیا۔ اپنے یوں ناکام ہوجانے پر مجھے حیرت بھی تھی۔ میں جو دیواروں کو عبور کرگیا تھا۔ سائے کی طرح بند دروازے کو پار کرچکا تھا، ایک نظر نہ آنے والی قوت کے آگے بے بس ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی وقارالحسن کو کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔ اس کے وظائف پورے نہیں تھے۔ مجھ میں طاقت نہیں آئی تھی کہ میں واقعی خود کو کسی طور پر بااختیار کہہ سکتا۔ مجھے یقین ہو چلا کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ابھی وقارالحسن کو میرے لیے اور بھی ایسا کچھ کرنا ہے کہ میں بے بس نہ رہوں۔ میں بڑا مایوس تھا۔ حویلی میں پھیلا سناٹا یوں بھی دہلائے دے رہا تھا۔ ایسی حویلی جہاں ڈھیروں لوگ سو رہے ہوں۔ یخ فرش

پر آڑے ترچھے پڑے ہوں۔ منجلی لڑکیاں ہوں۔ وہاں ایک ایسا سناٹا جس میں لوگوں کے سانس لینے کی آواز بھی آتی نہ محسوس ہو' دل دہلا دینے کو کافی تھا۔ یوں لگا جیسے میرے سامنے بہت سی لاشیں پڑی ہیں۔ بے حس و حرکت' ان کے سانسوں کا زیر و بم بھی نہیں تھا۔ میں گھبرا گیا۔ ہوا میں رچا بسا یہ سکوت مجھے بھی خوفزدہ کرنے لگا تھا۔ میں تیزی سے وقارالحسن کے کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو یوں لگا جیسے وہ بھی سانس نہ لے رہا ہو۔ دم بھر کو میں نے سوچا کہ یہ سچ ہوا تو ــــ ممکن ہے میں آزاد ہو جاؤں یا ــــ ممکن ہے کہ میری بھی موت واقع ہو جائے۔ میں جو کچھ بھی تھا وقارالحسن کی ذات کا حصہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی مجھے ختم بھی ہو جانا چاہیے تھا۔

یہ وقت سوچنے کا نہیں تھا۔ میں اپنا اطمینان چاہتا تھا۔ میں دھیرے سے وقارالحسن کے اندر اتر گیا۔ اس کے ساکت وجود میں خفیف سی حرکت ہوئی تو مجھے یقین آیا کہ وہ زندہ ہے۔

"وقارالحسن! اٹھو۔" میں نے دھیرے سے پکارا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کک ــــ کیا ہوا ــــ کیا بات ہے؟"

"پتا نہیں وقارالحسن ــــ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم زندہ ہو تاں؟"

"تمہارا خیال تھا کہ میں مر چکا ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ "میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں اور ہاں' دوسری بات بھی غور سے سن لو۔ میں مر گیا تو تم مجھ سے یہ پوچھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے کہ میں زندہ ہوں یا مر گیا۔ سمجھے تم؟" اس بار اس نے کروٹ لے لی۔ شاید اسے بہت زیادہ تھکن اور نیند تھی۔ وہ اتنی جلدی اٹھا دینے پر جھلایا ہوا تھا۔

"بات یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ حویلی میں ــــ حویلی میں کوئی زندہ نہیں ہے۔ سب مر چکے ہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہ سن کر وہ اتنی زور سے اچھل پڑا کہ میں ڈر گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا کمرا تو خالی تھا۔ یہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کے انداز میں بے یقینی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے یہی محسوس ہوا تھا اور تم بھی ــــ تم بھی بالکل ویسے ہی ساکت تھے جیسے وہ سب' اسی لیے میں نے جانا کہ شاید تم ــــ"

اس نے میری پوری بات سنی نہیں۔ وہ پلنگ سے چھلانگ لگا کر باہر بھاگا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ سب سے پہلے اماں کے کمرے میں گھسا۔ اماں اپنے پلنگ پر بے سدھ پڑی تھیں۔ اس نے کمرے میں گھستے وقت ہی بلکہ اس سے پہلے ہی اماں کو آوازیں دینا شروع کر دیں تھیں مگر ہر بار یوں لگتا جیسے وہ کسی بہت پتلی اور تاریک سرنگ میں منہ ڈال کر چیخ رہا ہو۔ واپس آنے والی ہر آواز تیز تھرتھراہٹ لیے ہوئی اور عجیب سی گونج کے ساتھ اس کی سماعت سے ٹکراتی تھی۔ اس نے اماں کو جھنجوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر میں بھی سکتے میں رہ گیا کہ اماں کسی بے جان موی مورت کی طرح اس کے دونوں ہاتھوں کی جنبش پر ہلتی رہیں مگر اٹھیں نہیں۔ وقارالحسن بوکھلا کر پلٹا اور جہانی آپا کو جھنجوڑا' پھر باری باری ساری لڑکیوں کو ہلا ہلا کر' ان کا نام لے لے کر چیختا رہا۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔ اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے حویلی کے سارے لوگ ہی مر گئے ہوں۔ وقارالحسن کی چیخوں کے جواب میں وہی موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

وہ رو رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ کبھی وہ کسی کے رخسار تھپتھپاتا اور کبھی کسی کو گلے سے لگا کر رونے لگتا۔ اس کے گرد بکھرے تمام جسم بے جان تھے۔ میں نے اسے تسلی دینا چاہی تو وہ مجھ پر برس پڑا۔ پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور باہر بھاگا۔ میں اب بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس بار اس کا رخ تایا اور تائی کے کمرے کی طرف تھا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی حلق کی پوری قوت سے تایا کو آوازیں دیں پھر ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر تکتا رہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی وحشت نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ ــــ وہ آج مکمل طور پر پاگل ہو گیا ہے۔ وہ دوبارہ حواسوں میں آنے والا نہیں لگتا تھا۔

آج گویا سارا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ سوامی نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ اس نے صرف حویلی کے ہی افراد کو نہیں پورے خاندان کے ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اجاڑ دیا تھا۔ مرزا صولت بیگ کے پورے خاندان کو ــــ

میں پتھر کی طرح بت بنا کھڑا وقارالحسن کی پھٹی ہوئی وحشت ناک آنکھوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے ہونٹ لرزے اور سرگوشی ابھری ــــ "تایا ــــ اٹھ جائیے تایا۔ برات آنے والی ہے۔ کب تک آپ لوگ سوتے رہیں گے؟ ہزاروں کام پڑے ہیں تایا۔ یہ خوشی کا موقع ہے۔ برسوں بعد تو اس حویلی میں رونقیں جاگی ہیں تایا۔ اتنا سناٹا ــــ ایسی خاموشی سے میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جہانی آپا کیا سوچیں گی کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو ان کی خوشیوں پر خوش نہیں ہیں۔ اٹھ جائیے ــــ اٹھ جائیے ــــ" وہ کہتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا تھا۔ وہ سر کو زور زور سے جھٹکے دے کر تایا کو جھنجوڑ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا مگر تایا ــــ ان کے چہرے پر بلا کا سکوت تھا۔ موت کا سا اطمینان ــــ ایسا اطمینان جو سارے عذابوں سے چھوٹ جانے پر طاری ہوتا ہے۔

"اٹھتے کیوں نہیں ــــ یہ ــــ یہ اٹھتے کیوں نہیں ــــ" وہ چیخ کر میری طرف پلٹا ــــ اس کی حالت دیکھ کر جی چاہا کہ میں بھی چیخنا شروع کر دوں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں مگر میں نے ضبط کیا۔ تحمل سے کام لے کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"وقارالحسن ــــ صبر کرو۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ گھونسا بنا کر میری طرف لپکا۔

"چاچا ــــ ہاں چچا ــــ چچی ــــ پھوپی ــــ یہ سب اٹھائیں گے انہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے پھر چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ چچا والے کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھ میں اب سکت نہیں تھی کہ میں اس کی حالت کو دیکھ سکتا۔ رات گہری تھی۔ پتا نہیں صبح ہونے میں کتنی دیر تھی۔ میں وہیں باہر برآمدے میں رک گیا۔ جانتا تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر میں وقارالحسن کی چیخیں گونجنے لگیں گی۔ وہ چچا وغیرہ کو اٹھانے کی کوشش کرے گا۔

وہی ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی فلک شگاف چیخوں سے گھبرا کر میں اندر چلا گیا۔ وہ چچا کو سینے سے لگائے رو رہا تھا۔ قریب ہی چچی' غوثیہ پھوپی' عظیمہ تائی اور ان کی دونوں بچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں لوٹ آیا۔ اچانک مجھے غلام رسول' رشید چاچا اور ان کی بہو وغیرہ کا خیال آیا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا اور کمرے میں وہی موت کا سا سناٹا۔ نہ کسی کے سانس لینے کی آواز تھی نہ کوئی اور آہٹ۔ میں نے روشنی کر کے ان لوگوں کو دیکھنے کی حماقت نہیں کی۔ جس قدر مجھے اس اندھیرے میں نظر آ رہا تھا وہ حقیقت جاننے کو کافی تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ سب کچھ تباہ ہو چکا ہو۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا' اب کیا ہو گا۔ کل جب شرف الدین کو پتا چلے گا تو کیا ہو گا۔ پورے امروہے میں کہرام مچ جائے گا۔ وقارالحسن حواس کھو چکا تھا۔ اسے قابو کرنا اب میرے بس میں نہیں تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیسے کسی کو اطلاع دوں۔ شرف الدین کو کیسے خبر کروں۔ وہی ایسا تھا جو وقارالحسن کو سنبھال سکتا تھا۔ مگر ــــ مگر کیا خبر کہ وہ خود بھی حواس کھو بیٹھے۔ یہ حادثہ تو اس کے لیے بھی معمولی نہ ہو گا۔ وہ جس قدر خوش تھا' ایسے میں یہ سانحہ تو اس کی جان بھی لے سکتا تھا۔

میں پھر وقارالحسن کے پاس چلا گیا۔ وہ اب تک ایک ایک کا چہرہ دیکھتا پھر رہا تھا۔ ایک ایک کا نام لے کر آوازیں دے رہا تھا۔ سب سے کہہ رہا تھا کہ اٹھ جاؤ' صبح ہونے والی ہے۔ شادی کا انتظام کرنا ہے۔ میں اس کے اندر چلا گیا۔ اسے قابو میں کرنے کے لیے۔ اسے سنبھالنے کے لیے۔

میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ بتانا چاہا کہ وہ یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے شرف الدین کو اطلاع کرے۔ لوگوں کو بتائے۔ کسی ڈاکٹر کو بلائے تاکہ وہ ان لوگوں کو دیکھ سکے۔ معائنہ کر سکے مگر وہ تو جیسے بہرہ ہو گیا تھا۔ وہ میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ اچانک مجھے حکیم علی احمد کا خیال آیا۔ یہ خیال آیا کہ شاید میں ان تک یہاں ہونے والے حادثے کی اطلاع پہنچا سکوں۔ ان کے بچے رات عشا کی اذان کے بعد گھر جا چکے تھے۔ یہ بڑا غنیمت تھا ورنہ اگر ان کی بھی کوئی اولاد یہاں اس حادثے کا شکار ہو جاتی تو انہیں بھی سنبھالنا مشکل ہوتا۔ میں نے آخری کوشش کی کہ وقارالحسن کو ساتھ لے جا سکوں۔ اس کا ساتھ لے جانا بہتر تھا۔ پتا نہیں میں انہیں اطلاع کرنے میں کامیاب بھی ہو پاتا ہوں یا نہیں۔ میں نے وقارالحسن سے کہا۔ "وقارالحسن ــــ چلو' حکیم علی احمد کو بلا لاتے ہیں۔ دیکھو نا وہ کتنے پائے کے حکیم ہیں۔ انھوں نے کوثر کو بھی تو اچھا کر دیا تھا ناں' وہ آ گئے تو ان سب کو ٹھیک کر دیں گے۔"

لمحہ بھر کو بدحواس وقارالحسن ساکت ہو گیا پھر ایک دم بولا۔ "ہاں ــــ وہ ٹھیک کر دیں گے۔ ہاں ــــ انھوں نے کوثر کو بھی تو ٹھیک کر دیا تھا۔ چلو ــــ چلو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ہم فوراً ہی حویلی سے باہر آ گئے۔ حکیم علی احمد کا گھر یہاں سے دور نہیں تھا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وقارالحسن گھر کے ہلکے کپڑوں ہی میں نکل آیا تھا مگر اسے سردی کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ سنسان گلی میں اس کے تیز قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی اس کی بڑبڑاہٹ بھی گونج رہی تھی۔

"وقارالحسن! میری بات غور سے سنو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اگر تم یوں وحشت زدہ رہے تو انہیں کیسے بتا سکو گے۔ انہیں ساتھ لے کر آنا۔ وہ آ کر معائنہ کریں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا وقارالحسن۔" میں اسے جھوٹی تسلیاں اس لیے دے رہا تھا کہ وہ فی الحال خود کو سنبھال لے۔ اس کے دل میں پیدا ہونے والی امید اسے ہمت دے سکتی تھی ورنہ اب تک تو جو کچھ اس حویلی میں ہوا تھا اس میں سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کل کا سورج امروہہ کے لیے بڑا عذاب بن کر آئے گا۔ ہر محلے اور ہر گھر سے ایک جنازہ ضرور اٹھے گا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اسے بدلا تو نہیں جا سکتا تھا۔ سوائے یہ کہ وقارالحسن کو سنبھالا جائے۔ لے دے کے مجھے حکیم علی احمد سے کچھ امید تھی پھر مجھے یہ بات بھی یاد آئی تھی کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جو سوامی جوگندر ناتھ کا مخالف تھا اور کچھ نہ کچھ طاقت بھی رکھتا تھا۔ اب بھی یہ کیا جا سکتا تھا کہ وقارالحسن کو اس آدمی سے ملوا دیا جائے ورنہ وقارالحسن اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں یہ سب سوچتا رہا۔ اس دوران میں ہم حکیم علی احمد

وہ دروازے پر پہنچ گئے۔ دستک دینے کے کچھ ہی دیر بعد حکیم صاحب نے دروازہ کھولا۔ وہ وقارالحسن کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی چونک گئے۔ "کیا بات ہے۔۔۔ خیریت تو ہے؟"

وقارالحسن انہیں جواب دینے کی بجائے ساکت کھڑا ان کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ پھر حواس کھو رہا تھا۔ وحشت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" حکیم صاحب نے اس بار اسے کاندھوں سے پکڑ لیا۔ وہ خود بھی گھبرا گئے تھے۔ "اندر آؤ۔" اتنا کہتے ہی انھوں نے اسے اندر کھینچ لیا۔ دروازہ بند کر کے وہ وقارالحسن کی طرف پلٹے ہی تھے کہ وقارالحسن چیخ مار کر ان سے چمٹ گیا۔ وہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ پل بھر میں سارا گھر ان کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ سب بری طرح گھبرا گئے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنا ہاتھ وقارالحسن کے منہ پر رکھ دیا اور زور سے بولے۔ "چپ ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ سب مر گئے۔ سب مر گئے۔ حویلی کے سارے لوگ۔۔۔ سب مر گئے۔" وہ اپنے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا چیخا۔

"کیا۔۔۔؟" بہت سی آوازیں بیک وقت نکلیں اور ساتھ ہی ان کی بیوی اور بچیوں نے رونا شروع کر دیا۔

"چپ ہو جاؤ تم لوگ۔" حکیم صاحب نے غصے میں سب کو ڈانٹا۔ "جاؤ اندر۔" پھر وہ وقارالحسن کو سینے سے لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اسے تھپکتے رہے۔ وہ روتا رہا۔ بلک بلک کر روتا رہا۔ حکیم صاحب نے اسے پانی پلوایا، اسے اطمینان سے بٹھایا پھر بولے۔ "وقارالحسن! مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ ہوا کیا ہے؟ تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔ ایسے میں مجھے کیسے پتا چلے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"م۔۔۔ میں گھبراؤں نہیں۔۔۔ وہ سب ختم ہو گئے اور آپ کہتے ہیں کہ گھبراؤں نہیں۔ میں برباد ہو گیا اور آپ کہتے ہیں۔۔۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو بیٹا۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

میں نے وقارالحسن سے کہا کہ وہ خود کو سنبھالے پھر ہمیں تفصیل بتائے، یوں عورتوں کی طرح صرف بین کرتا رہا تو کیا ہوگا۔ وقارالحسن نے آنسو صاف کیے اور حکیم صاحب کو ساری تفصیل بتا دی۔ اتنی دیر میں ان کا بیٹا حکیم صاحب کی شیروانی اور جوتے لے آیا تھا۔ ایک موٹی سی شال بھی ساتھ لایا تھا۔ حکیم صاحب تیار ہوئے۔ ان کے بیٹے نے بھی ساتھ آنا چاہا مگر حکیم صاحب نے منع کر دیا اس لیے کہ گھر میں عورتیں اکیلی رہ جاتیں۔ سبھی خوفزدہ تھیں اور رو رہی تھیں۔ حکیم صاحب وقارالحسن کو لیے ہوئے گھر سے باہر نکلے تو اذانیں ہو رہی تھیں۔ وقارالحسن کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہی حیرت انگیز چال اختیار کر لے اور پل میں حویلی تک جا پہنچے مگر حکیم صاحب کی وجہ سے مجبور تھا۔ حکیم صاحب درمیانی رفتار سے چل رہے تھے۔ انھوں نے وقارالحسن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ رکھا تھا۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے شاید وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے وقارالحسن سے بھی کہا کہ وہ آیتہ الکرسی پڑھتا رہے۔ راستے میں مسجد پڑی تو حکیم صاحب رفتار کم کرتے ہوئے بولے۔ "نماز نہ پڑھ لیں؟"

"حکیم صاحب خدا کے واسطے۔۔۔ نماز ہم پڑھ لیں گے مگر۔۔۔" وقارالحسن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔" وہ فوراً ہی چل پڑے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم حویلی پہنچ گئے۔ وقارالحسن حویلی کا دروازہ باہر سے بند کر آیا تھا۔ اس نے فوراً ہی کنڈا ہٹایا اور گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ حکیم علی احمد اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

"وقارالحسن۔۔۔ وقارالحسن۔"

اندر داخل ہوتے ہی ایک آواز گونجی۔۔۔ لمحہ بھر کو وقارالحسن پتھرا کر رہ گیا۔ حکیم علی احمد بھی سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے تھے۔ اچانک وقارالحسن کمرے کی طرف بھاگا۔ اس نے جیسے ہی اماں کے کمرے میں قدم رکھا، ایک بے ساختہ چیخ اس کے منہ سے نکلی اور اس نے دروازے کا پٹ تھام لیا۔

جو عجیب الخلقت چیز کمرے میں تھی اسے دیکھ کر کسی کا چیخ اٹھنا تعجب خیز نہیں تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جس کے بدن پر کھال منڈھی ہوئی تھی۔ اس کے حلقوں میں دھنسی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں بلکہ صرف پتلیاں دھندلا چکی تھیں۔ وہ آلتی پالتی مارے کمرے کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا۔ اس کے ڈھلکے ہوئے کاندھے، لمبے لمبے بازو، ڈھانچے ایسے بدن پر جوگیا رنگ کا ایک گلا ہوا، میلا سا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ جبڑے ابھر کر خوفناک لگ رہے تھے۔ اس کی عمر تقریباً سو برس سے اوپر ہی ہوگی مگر اس کے تمام دانت موجود تھے۔ کمرے میں پلنگ پر اماں ابدی نیند سو رہی تھیں۔ فرش پر دائیں دیوار کے ساتھ بچھی چاندنیوں پر خوب صورت رنگوں میں لپٹی ہوئی وہ لڑکیاں جن کے اندر بھرپور زندگی کھنکھناتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اب بے جان لاشوں کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ انھی لڑکیوں کے قریب، ننگے فرش پر وہ ڈھانچہ بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چیخا تھا مگر اب تک یہ نہیں جان پایا تھا کہ مجھے آواز دینے والا کون تھا۔ میرے پیچھے ہی حکیم علی احمد نے کمرے میں قدم رکھا اور پھر میں نے ان کے چہرے پر جو کچھ دیکھا اس نے مجھے بوکھلا دیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے سامنے بیٹھے ڈھانچے کو ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گہرے سائے یوں لہرا رہے تھے جیسے اندر کوئی طوفان موجزن ہو۔ ان کا منہ کھلا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ سا پیدا ہو گیا تھا یا شاید کپکپی تھی کہ وہ لرز رہے تھے، یعنی مجھے لگا جیسے بس وہ گرنے والے ہوں۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر انھیں تھام لیا۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ کون ہو!" حکیم صاحب کے منہ سے نکلنے والی آواز مجھے اجنبی اجنبی سی لگی۔

"تم یقیناً پہچان گئے ہو گے علی احمد!" یہ آواز ڈھانچے میں سے آئی تھی، ہاں۔۔۔ اس کے ابھرے ہوئے جبڑوں، ہلتے ہونٹوں سے یہ آواز ابھری تھی ورنہ میں سمجھا تھا کہ سادھو نے رحیمو والے واقعے کی جانکاری کے بعد شاید اس کا ڈھانچہ سامنے لا بٹھایا ہے۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ سوامی جی!!!"

حیرت میں ڈوبی ہوئی اس آواز نے وقارالحسن کو اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سوامی اب تک زندہ ہوگا، وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وقارالحسن کے دماغ میں شکنتلا کے جملے گونجنے لگے کہ حویلی کے لوگوں کو میں نے قیدی نہیں بنایا ہے، انھیں قیدی بنانے والے جوگندر ناتھ سوامی جی ہیں۔ میں تو سوچتا تھا کہ شاید میں انھیں تمام عمر تلاش نہ کر پاؤں۔ وہ تو انھی کی تلاش میں نکلا تھا مگر اس کمبخت سادھو نے اپنے جال میں اس بری طرح پھانس لیا کہ وقارالحسن وہ کچھ بھی نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا یا جو مقصد حاصل کرنے کی اسے خواہش تھی۔ وقارالحسن آنکھیں پھاڑے اس ڈھانچے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی موجودگی اور پھر اسے سوامی کی حیثیت سے حکیم صاحب کا پہچان لینا، یہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ وقارالحسن ذرا دیر کو اپنے پیاروں کی بکھری ہوئی لاشوں کو بھی فراموش کر بیٹھا۔ اچانک۔۔۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ اس خوفناک حادثے کا ذمے دار یہ بوڑھا۔۔۔ یہ خبیث سوامی ہے۔ اسی کی وجہ سے وقارالحسن کے باپ دادا مرے، اسی کی وجہ سے گھر کے لوگ اتنی بڑی حویلی کے ہوتے ہوئے دربدر ہوئے۔ وہ لوگ حویلی نہ چھوڑتے، مراد آباد نہ جاتے تو شاید سادھو سے ٹکراؤ نہ ہوا ہوتا اور وقارالحسن مسلسل کرب میں نہ رہتا۔ پل بھر میں ہی دادا ابا، بڑی پھوپی، چھوٹی پھوپی، لڈن، خورشید چاچا، رحیمو سب کی لاشیں نگاہوں میں پھر گئیں۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر ہڈیوں کے اس ڈھیر کو ایسی لات رسید کروں کہ ساری ہڈیاں راکھ بن کر بکھر جائیں۔

"اگر آپ۔۔۔" وقارالحسن کے کچھ کہنے یا کرنے سے پہلے ہی حکیم صاحب وقارالحسن سے دو قدم آگے بڑھ گئے۔ "ان بچوں نے تو آپ کو اذیت نہیں دی تھی سوامی جی۔۔۔ آپ تو بڑے ہی نرم دل کے تھے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ۔۔۔"

"میں تو مسلسل اس کوشش میں رہا کہ آپ سے کسی طرح ملاقات ہو تو۔۔۔"

"کوئی سخت دل کا جنم نہیں لیتا حکیم جی۔ میں نے صولت بیگ کی بہت سی باتیں نظر انداز کیں۔ اسے ٹوکتا رہا، روکتا رہا مگر۔۔۔ اس کی عیاشیاں اسی کی آنکھوں کی دھول بن گئیں۔ اسے سوائے عیاشیوں کے نہ کچھ سوجھتا تھا، نہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ بیٹھنا کیا، بات کرنا تک چھوڑ دیا مگر وہ۔۔۔ بجائے اس کے کہ میرے اس رویے کو محسوس کر کے شرمندہ ہوتا اس نے مجھ ہی پر وار کیا اور وار بھی ایسا گھناؤنا۔ میری بچی جو اسے پتا سمان مانتی تھی اسی کو۔۔۔ تم نہیں جانتے حکیم صاحب۔۔۔ وہ کیسی اذیت میں میرے پاس آئی تھی۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا۔

"تمھارے پاس آئی تھی۔۔۔ مگر وہ تو۔۔۔"

"نہیں!" سوامی نے ہاتھ اٹھا کر حکیم علی احمد کی بات کاٹ دی۔ "وہ کنویں میں تو بعد میں کودی تھی۔ پہلے وہ میرے پاس آئی تھی۔ اگر تم اسے اس حال میں دیکھ لیتے تو۔۔۔ تو شاید تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔ میں نے۔۔۔ میں نے سوگند کھالی۔ اپنی بچی کو تڑپتے دیکھ کر سوگند کھالی کہ میں اپنے جیون کا سارا گیان تج دوں گا پر صولت بیگ کی نسل کو اس دھرتی پر پنپنے نہیں دوں گا۔ میں سوگند نہ بھی کھاتا تو کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ وہ خود سوگند کھا چکی تھی حکیم جی۔ جانتے ہو کہ وہ آج بھی اپنے اس پریت یونی سے چھٹکارا نہیں پا سکی۔ کیسی اذیت میں ہے وہ ادن۔۔۔ اور اس اذیت میں مبتلا کرنے والا بھی صولت کی اولاد ہے۔"

سوامی کی دھندلائی ہوئی پتلیاں وقارالحسن کے چہرے پر ٹک گئیں۔ میں نے اس کی کنپٹی سے پسینا پھوٹتا دیکھا۔ ایک بات بتا دوں کہ میں حکیم صاحب اور وقارالحسن کے پیچھے تھا۔ ممکن ہے کہ میں آگے بڑھ جاتا مگر اس سے پہلے ہی حکیم صاحب نے اسے پہچان لیا تھا اور میں نے اندر جانا مناسب نہ سمجھا بلکہ دروازے کے قریب ہی کھڑا سارا تماشا دیکھتا رہا۔

"اور اس نے میری پوتی۔۔۔ میری چمپا کے ساتھ کیا کیا۔۔۔ اس سے پوچھو۔ یہ لوگ اس یوگیہ نہیں ہیں کہ۔۔۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز بھرا رہی تھی شاید وہ رو رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ تو نہیں سوامی جی کہ آپ یوں۔۔۔ اس گھر میں لاشیں بکھیر دیں۔" حکیم علی احمد نے لرزتی ہوئی آواز میں ان نوجوان لڑکیوں کے جسموں کی طرف دیکھا جو چاندنیوں پر بکھری پڑی تھیں۔ انھی میں جہانی آپا بھی تھیں جن کی بند آنکھوں کی ساکت پتلیوں پر خواب نقش ہو گئے تھے۔ ان میں شنو آپا بھی تھیں جن کی جھکی جھکی بوجھل

پاؤں میں خفیف سی، شرمیلی سی لرزش پیدا ہو چلی تھی۔ جانے انھوں نے آنکھوں میں خواب سجائے تھے کہ نہیں۔ حکیم صاحب کا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔ وقارالحسن جیسے ہوش میں آگیا۔ یوں جیسے اب تک وہ خواب میں چل رہا ہو۔ حادثے کو حقیقت نہیں خواب سمجھ رہا ہو اور اب اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ وہ ایک دم تیزی سے سوامی جی کی طرف جھپٹا۔

"خبیث بڈھے۔۔۔ حرامزادے۔۔۔ میں بھی تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ کسی عقاب ہی کی طرح سوامی کی طرف جھپٹا تھا اس سے پہلے کہ حکیم صاحب اسے روکتے، سوامی جی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لڑکھڑایا اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے زور سے فرش پر گر پڑا۔

"اب ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا مورکھ۔" سوامی جی کے لہجے میں شعلے سے دہکتے محسوس ہوئے۔ "تو حکیم جی کے ساتھ نہ ہوتا تو۔۔۔ تو ان لاشوں کے درمیان پڑا ہوتا ویسے میں۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ تجھے نہیں مرنا چاہیے۔ تجھے ارتھیاں اٹھانی ہیں۔ تیرا مرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ بات کر رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وقارالحسن کا دایاں ہاتھ رینگتا ہوا اس کے گریبان کے اندر جا رہا ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ پیش بند کے محافظوں کو اپنی مدد کے لیے بلانا چاہتا ہے۔ شاید کوثر نے اسے کوئی خاص طریقہ بتایا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں تیز روشنی اور سرسراہٹ پھیل گئی۔ اس روشنی میں، میں نے دیکھا کہ پیش بند اب وقارالحسن کے سینے پر پھیلا ہوا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کی آنکھوں کے حلقوں سے باریک سی اور سنہری چمکدار سی لکیریں بلکہ لچھے سے اس کے قدموں میں گرتے جا رہے ہیں اور اسی تیزی سے ان کے حجم بڑھ رہے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھے ایک گونا خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ لپک کر وقارالحسن کے اندر داخل ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں میں باہر تھا تو ایک عجیب سے خوف میں مبتلا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے سوامی نے مجھے دیکھ لیا تو وہ مجھے نقصان پہنچائے گا۔ شاید میں ایسا اس لیے محسوس کر رہا تھا کہ اس کا اصل مجرم تو میں تھا۔

میں نے وقارالحسن کو ورغلا کر شکنتلا کی پائل اور دوسری چیزیں سادھو کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے ہی چمپا کے بدن کا سونا، اس کے جسم کا شہد وقارالحسن کے اندر انڈیلنے کے سامان پیدا کیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ خود وقارالحسن بہت مضبوط کردار کا شریف آدمی ہے۔ میرے بہکائے میں آنے سے پہلے اس نے کتنی مزاحمت کی تھی یہ میں ہی جانتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ کس قدر اندر شرمندہ تھا، اس نے مجھے کیسے کیسے لتاڑا تھا یہ بھی میں ہی جانتا تھا۔ گویا میری ہی داڑھی میں تنکا تھا اس لیے مجھے سوامی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جس وقت وقارالحسن کے سینے پر پھیلے ہوئے پیش بند سے باریک باریک سانپوں کے لچھے گر رہے تھے، اس وقت سوامی اور حکیم صاحب کی ساری توجہ ان سانپوں پر تھی، میں اسی لمحے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ میں نے وقارالحسن کو اس بروقت اقدام پر بڑی شاباشی دی مگر دوسرے ہی لمحے وقارالحسن کی طرح میں بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

سوامی جوگندر ناتھ کا خوفناک قہقہہ پوری حویلی میں گونج اٹھا۔ وقارالحسن ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ حکیم صاحب کی حالت بھی دیکھنے والی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیوار کا سہارا لیے زمین پر رینگتے اور ربر کی طرح بڑے ہوتے ہوئے سانپوں کو اور کبھی وقارالحسن کے سینے پر پھیلے اس پیش بند کو حیرت سے تک رہے تھے۔

"یہ چمتکار مجھے مت دکھا مورکھ۔ وہ ہزاروں برس پہلے کا شعبدے باز بچہ ہے میرے سامنے۔ جو شکتی اس نے پائی تھی وہ بچوں کا کھیل ہے۔ یہ تیرے لیے بڑا چمتکار ہو گا مگر میرے لیے نہیں۔ یہ لے۔۔۔" اتنا کہہ کر سوامی نے اپنا ہاتھ جھٹکا۔ یوں لگا جیسے اس کی مٹھی سے راکھ نکل کر سانپوں پر گری ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ سارے سانپ کٹی ہوئی رسیوں کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ وقارالحسن جس نے بڑے اعتماد سے اس پر انحصار کیا تھا، یہ حالت دیکھ کر لٹھے کی طرح سفید ہو گیا مگر یہ حالت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی۔ اب اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی اور چہرے پر پریشانی تھی جس سے لگتا تھا کہ وہ اب اتنا پُر اعتماد نہیں ہے جتنا پہلے تھا۔ حکیم صاحب کی حالت دیکھ کر میں پریشان ہو گیا اس لیے کہ وہ دھیرے دھیرے ڈول رہے تھے۔ لگتا تھا کہ جیسے اب گر کر بے ہوش ہو جائیں گے مگر ایسا ہوا نہیں، انھوں نے بڑی جلدی خود کو سنبھال لیا۔

"تو کچھ نہیں کر سکتا بالک۔ میری تپیا میں ایک صدی لگی ہے اور تو۔۔۔ تو ابھی بچہ ہے۔ یاد رکھ کہ تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میں چاہوں تو تجھے بھسم کر سکتا ہوں مگر۔۔۔ مگر ایک بات تجھے بچانے کے لیے میرے آڑے آتی ہے وقارالحسن کہ تو۔۔۔ بنیادی طور پر اپنے باپ دادے سے مختلف ہے۔ تو نے شکنتلا کے لیے پوری ایمانداری سے کوشش کی تھی مگر وہ تیرا ہمزاد۔۔۔ وہ تیرے کاوش میں نہیں آسکا بلکہ تو اس کے کاوش میں آگیا۔ مورکھ وہ تجھے بہت چھتی پہنچا چکا ہے اور اگر تو نے اس پر کاوش نہیں پایا تو وہ تجھے اور چھتی پہنچائے گا۔ ابھی میرا کام پورا نہیں ہوا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ یہ حویلی میں تیاگ دوں اسے کھالی کر دوا ہو تو تن۔" اتنا کہہ کر وہ لمحے بھر کو خاموش ہو گیا۔ "تجھے اس کنویں سے شکنتلا کا شریر نکالنا ہو گا۔ تجھے پرکاش کا شریر نکال کر ان دونوں کا کریا کرم کرنا ہو گا۔ تجھے سادھو سے شکنتلا کی پائل حاصل کرنا ہو گی۔ وہ کڑا پانا ہو گا جو شکنتلا کی نشانی تھی اور تیرے باپ نے اسے دے کر کہا تھا کہ یہ اسے سوامی کو تلاش کر کے اس تک پہنچا دینا۔ یاد ہے ناں تجھے۔۔۔؟"

وقارالحسن جواب تک کچھ پڑھنے میں لگا ہوا تھا بلکہ کوشش کر رہا تھا، وہ سب کچھ بھول گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنی ساری طاقت کھو چکا ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی اس کی حالت کی عکاس تھی۔ میں سوامی کی باتیں سن رہا تھا۔ پتا نہیں وقارالحسن بھی انھیں سن رہا تھا یا نہیں۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر عمل کرنے کا مطلب تو یہ تھا کہ وقارالحسن پلٹ کر واپس اسی جگہ پہنچ جائے جہاں سے چلا تھا۔ سادھو کا مقابلہ کرنا، اس سے ان چیزوں کو حاصل کرنا کوئی کھیل نہیں تھا۔ جو کچھ سوامی جوگندر ناتھ نے کہا تھا وہ عملاً وقارالحسن نے سن بھی لیا تھا اور اسے پوری طرح سمجھ بھی لیا تھا اسی لیے تو وہ ایک دم ڈھے گیا۔

"مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے سوامی۔۔۔ تم اگر سب کچھ جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں نے اسی کوشش اور مقصد کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔ اس شکنتلا کو سکون دینے کے لیے اپنی زندگی کا ہر سکھ چین داؤ پر لگا دیا تھا مگر۔۔۔ مگر اس کا پھل مجھے کیا ملا؟ یہ۔۔۔ یہ لاشیں؟ میں ان لوگوں کے بنا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک مہلت دو۔ انھیں ٹھیک کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ جان لڑا دوں گا مگر۔۔۔ مگر۔۔۔" وقارالحسن بہت کمزور ہو چکا تھا اس لیے کہ جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ایسا میں اس وقت کروں گا جب تم شکنتلا کا شریر کنویں سے نکال لو گے۔" اس نے سفاکانہ انداز میں جواب دیا۔

"سوامی جی! اگر میرا اعتبار کرو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ ایسا ہی کرے گا۔" وقارالحسن کے کچھ بولنے سے پہلے ہی حکیم علی احمد بول پڑے۔ "کل شام جہانی کی برات آنے والی ہے۔ بھرا گھر ماتم کدہ بن جائے گا سوامی اور مجھے۔۔۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اتنے پتھر دل ہو چکے ہو کہ۔۔۔"

"میرا پرکاش بھی تو برات لے کر آنے والا تھا حکیم جی۔ سپنے تو میری بچی کی آنکھوں میں بھی جگمگائے تھے۔ صولت بیگ نے میرے اور میرے بچوں کے ارمان ہی نہیں میری غیرت بھی جلا کر بھسم کر دی تھی۔ میرے دل پر کیا بیتی ہو گی۔۔۔ میری بچی۔۔۔ میری وہ دکھاری بچی جو آتم ہتیا کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی، سوچو تو۔۔۔ اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔"

"سب پرانی باتیں ہیں یہ۔" اچانک حکیم صاحب چیخ اٹھے۔ "صولت بیگ کی حرکتوں کا بدلہ تم ان معصوموں سے نہیں لے سکتے سوامی۔ میں تمھیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ ایک بات یاد رکھو کہ میں تم سے اپنے پرانے تعلقات اور ادب و لحاظ کا پاس کر رہا ہوں جو میرے اور تمھارے درمیان تھے مگر اس کی وجہ سے میں تم سے اتنا نہیں دبوں گا کہ تمھیں من مانی کرنے دوں۔"

نہ معلوم حکیم صاحب کو کیا ہو گیا کہ وہی حیران اور پریشان حکیم صاحب شیر کی طرح دھاڑ اٹھے۔ غصے سے ان کا چہرہ تمتما گیا۔ غیظ و غضب سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ میں ہی نہیں وقارالحسن بھی انھیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے لہجے میں بڑا دبدبا، بڑا اعتماد تھا۔ "یہ سب شعبدے بازی ختم کر دو۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ وقارالحسن ایسا ہی کرے گا۔" انھوں نے دوسرے ہی لمحے اپنے لہجے کی آنچ پر قابو پا لیا۔ "اور پہلے بھی وہ انھی چکروں میں پھنسا ہوا تھا۔ کیا تمھارے خیال میں سادھو سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی تھی؟ نہیں سوامی نہیں۔ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ سادھو نے اس پر محض شکنتلا کی وجہ سے عذاب نازل کیے۔ تم تو دور بیٹھے اس حویلی میں تماشے کرتے رہے۔ تمھیں ذرا احساس نہ ہوا کہ وہ نوجوان ہونے کے باوجود خرافات میں پڑ گیا۔ اسے کیا فکر تھی کہ وہ تمھارے بٹی کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے اپنا سکھ چین حرام کر لیتا۔ بہت احسان فراموش ہو سوامی تم۔"

حکیم جی کی باتوں نے سوامی کے چہرے پر نرمی پیدا کر دی تھی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وقارالحسن کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا وقارالحسن اور حکیم صاحب کو تکتا رہا۔

"سوامی!! تمھارے دکھ کا احساس مجھے ہے اور یقین کرو کہ وقارالحسن کو بھی پورا پورا احساس ہے۔ تم مرزا صولت بیگ اور اس کی اولاد کے ساتھ جو کچھ کر چکے ہو وہ کافی ہے۔ اس حویلی پر راج کر رہے ہو، یہ بہت ہے۔ تمھاری بٹی اب اگر کسی اذیت میں ہے تو وہ بھی اس کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے ہمزاد کی وجہ سے اور ہمزاد خباثت پر اتر آئے تو انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے، اسے تم بھی جانتے ہو۔ وہ اگر طاقت ور نہ ہوتا تو اسے قابو کرنے کی ہدایات نہ دی جاتیں۔ ایسا وقارالحسن کی کمزوری کی وجہ سے ہوا ہے مگر تم اسے اس سلسلے میں براہ راست الزام نہیں دے سکتے۔ تم جانتے ہو کہ شیطان باہر ہو تو آدمی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ باسانی اسے زیر کر سکتا ہے مگر جب شیطان لہو میں گردش کر رہا ہو۔ جب وہ اسے اندر سے کمزور کرے تو اس پر قابو پانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ تم نے تو جنگلوں میں جا کر برسوں تپیا کی تو اسے قابو کر سکے تھے مگر پھر بھی۔۔۔ پھر بھی

آج اس نے تمھیں زیر کردیا بلکہ تم تو برسوں سے اس کے آلہ کار بنے ہوئے ہو۔ انتقام کے لیے تم نے نہیں سوچا ہوگا۔ میں یہ بات جانتا ہوں۔ تم تو قدرت کی سزا کے قائل تھے مگر تمھیں تمھاری راہ سے بھٹکا دینے والا یہی نفس امارہ ہوگا' یہی خبیث ہمزاد جس نے تمھاری برسوں کی تپسیا کو اکارت کردیا۔"

یوں لگ رہا تھا جیسے حکیم علی احمد اپنے چاروں طرف سے ہی نہیں سوامی' وقارالحسن' سادھو اور مجھ سے بھی کبھی بے خبر نہیں رہے۔ یوں جیسے سب کچھ ان کے سامنے عیاں ہو۔ جیسے سبھی کچھ عین ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا رہا ہو۔ وقارالحسن انھیں منہ پھاڑے تک رہا تھا اور میں بھی کچھ کم حیران نہیں تھا۔

"بس کرو حکیم علی احمد!!" وہ بہت دھیرے سے بولا تھا مگر اس کے لہجے کی بھراہٹ وقارالحسن اور مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ "آج مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے اپنا جیون بھی تباہ کیا اور شاید آخرت بھی۔ ایک صدی کی ساری تپسیا سارا گیان' سب کچھ بیکار کردیا۔ مجھے۔۔۔ مجھے جانکاری ہی نہ تھی کہ میں کہاں تھا اور کہاں پہنچ گیا ہوں۔ سنو حکیم جی! میری اچھا ہے کہ میری بچی کی بھٹکتی ہوئی آتما آکاش کی اس بلندی پر چلی جائے جہاں سے دوسرا جنم شروع ہوتا ہے۔ میں تمھارے وعدے پر اعتبار کرتا ہوں حکیم جی۔ مجھ پر دیا کرنا۔ میں اس سمے کا انتظار کروں گا جب۔۔۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے وعدہ کیا ہے تو اسے نبھاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ بس ایک وعدہ تمھیں بھی کرنا ہوگا۔" حکیم صاحب نے پہلی بار قدم بڑھایا۔ وہ سوامی کے قریب پہنچ گئے۔

سوامی نے سر اٹھا کر حکیم صاحب کو دیکھا۔ "میرے قریب مت آنا حکیم جی۔۔۔ میرے گرد دہکتا ہوا چکر ہے۔ میں اس آگ کے درمیان کب سے سلگ رہا ہوں یہ تم نہیں جانتے۔ یہ میری سوگند کی آگ ہے۔ جب تک میری سوگند پوری نہیں ہوگی میں اسی طرح اس میں سلگتا رہوں گا۔ نہ مروں گا نہ زندہ رہ پاؤں گا۔"

"میں کوشش کروں گا سوامی کہ تمھیں اس جنم سے نکال لوں مگر میں تم سے ایک وعدہ چاہتا ہوں۔"

"بولو!" سوامی نے پوچھا۔

"ان بچوں کو دکھی مت کرنا۔ تم اگر ایسی کوئی قسم کھا چکے ہو تو اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے جو کچھ بھی کرسکتے ہو کرنا۔ حویلی پر قبضہ رکھنا چاہتے ہو تو شوق سے رکھو مگر ان معصوموں کی خوشیوں اور زندگیوں سے مت کھیلو۔ اس وقت تک انتظار کرو جب تک وقارالحسن اور میں تم سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کردیتے۔"

سوامی نے سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے حکیم جی! میں اس سمے کا انتظار کروں گا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

پھر اپنے اس جوگیا رنگ کے چغے میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور بند مٹھی کو سامنے کرکے کھول دیا۔ اس کی ہتھیلی پر چاندی کی بالکل ویسی ہی پائل رکھی تھی جیسی وقارالحسن کو اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پاس سے ملی تھی۔ جو شکنتلا کی پائل تھی اور جسے میرے بہکائے میں آکر وقارالحسن نے سادھو کے حوالے کردیا تھا۔ بالکل ویسی ہی پائل تھی۔ وقارالحسن اسے دیکھ کر چونک گیا۔ پہلا خیال تو مجھے بھی یہی آیا تھا کہ یہ وہی پائل ہے اور سوامی نے کسی طرح سادھو سے حاصل کرلی ہے مگر دوسرے ہی لمحے سوامی نے میرے اس خیال کی تردید کردی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ شکنتلا کی دوسری پائل ہے۔ اسے اس برگد کے نیچے داب دو جہاں تم نے پرکاش کا ڈھانچہ دبایا ہے۔ اس سے پرکاش شکتی پائے گا اور شکنتلا پل بھر کو ہی سہی سادھو کی قید سے نکل کر یہاں پہنچ جائے گی۔ تمھیں اس سمے کا انتظار کرنا ہوگا وقارالحسن! چاہے اس کے لیے تمھیں دن اور رات اس برگد کے نیچے بیٹھنا پڑے۔ شکنتلا کے یہاں پہنچتے ہی تم پرکاش کا ڈھانچہ نکالو گے۔ پرکاش کے ایک کان میں چاندی کی بالی پڑی ہے۔ وہ نکال کر اس پائل سے جوڑ دینا۔ وہ جوڑ دی تو شکنتلا سادھو کی نظر سے اوجھل ہوجائے گی مگر یہ زیادہ عرصے کے لیے نہیں ہوگا۔ سورج کے آکھری کنارے پر پہنچتے ہی تمھیں چاند نکلنے سے پہلے شکنتلا کے شریر کو کنویں سے نکالنا اور ان دونوں کی ارتھی کو ایک ہی چتا پر رکھ کر جلانا ہوگا۔ یاد رکھو' چاند چڑھتے ہی شکنتلا بے بس ہوجائے گی اور پھر۔۔۔ پھر میں اپنی سوگند کو پورا کرنے کے لیے مجبور ہوں گا۔"

اس نے کافی مشکل کام بتایا تھا۔ اسے پورا کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا محسوس ہورہا تھا مگر وقارالحسن ہر قیمت پر گھر والوں کی زندگی چاہتا تھا۔ ان کی خوشیاں چاہتا تھا۔ اس نے لمحے بھر کی دیر لگائے بغیر ہامی بھرلی اور ہاتھ بڑھا کر وہ پائل لے لی۔

"سوامی! کیا سادھو تم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ کیا اس نے بھی ایک صدی تپسیا کی ہے۔ کیا تم اس کے سامنے بے بس ہو؟" جو سوال میرے دل میں تھا' جو بات وقارالحسن کے دماغ میں ہوگی' وہ بات حکیم صاحب نے کہہ دی۔

"میں ہر بات تم لوگوں کو بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" سوامی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "ایسا کچھ تو ہوگا کہ یہ سب کام میں نہیں کرپاتا ہوں گا جبھی تو میں تم لوگوں سے مدد لے رہا ہوں۔ کچھ شکتیاں ایسی ہیں جو بھگوان نے انسانوں کو دی ہیں اور کچھ ایسی جو صرف آتما کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ راز بھی تمھیں اس وقت بتاؤں گا جب اس کا سمے آئے گا۔ جاؤ تم لوگ۔۔۔ اس پائل کو ابھی اسی سمے وہاں دبا دو۔ میری آتما کو شانتی ملے گی۔ جاؤ سمے برباد نہ کرو۔ آج یوں بھی اماوس کی رات ہے۔ شاید شکنتلا۔۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ حکیم صاحب نے وقارالحسن کو جانے کا اشارہ کیا۔

"نہیں حکیم جی! تم بھی جاؤ۔۔۔ وہ بچہ ہے۔ تم ساتھ ہو گے تو مجھے ڈھارس رہے گی۔"

یہ سن کر حکیم علی احمد وقارالحسن کے ساتھ ہی باہر آگئے۔ وقارالحسن نے گودام کے دروازے کے قریب بنی منڈیر سے پھاوڑا اٹھالیا جسے اس نے پرکاش کی لاش یعنی ڈھانچہ دبانے کے بعد یہاں رکھ دیا تھا۔ حکیم صاحب خاموش تھے' شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ دونوں سیدھے برگد کے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ وہ پائل کافی گہرا گڑھا کھود کر دبانے میں وقارالحسن کو شاید گھنٹا پون گھنٹا لگ گیا۔ آسمان پر تاریکی دھندلانے لگی تھی۔ حکیم علی احمد اب بھی گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پائل دبا کر وقارالحسن کھڑا ہوا تو انھوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔ "وقارالحسن! تم بہت بہادر آدمی ہو۔ تم نے جس طرح اپنی زندگی کے یہ دس بارہ برس گزارے ہیں۔ جن پراسرار حالات کو جھیلا ہے' وہ تمھارے عزم اور تمھاری بہادری کا ثبوت ہے بیٹا۔ میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے حالات میں آدمی کو اپنے جذبات پر پوری طرح قابو رکھنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ ہوچکا ہے وہ حقیقت ہو۔ ان تاریکیوں کو کاٹ کر طلوع ہونے والا سورج تمھارے دل کو بھی دولخت کردے۔ تم۔۔۔ تم حوصلہ رکھنا بیٹا۔ غلطی مجھ سے ہوئی۔ مجھے بہت پہلے تمھاری مدد کو آنا چاہیے تھا۔۔۔ میں اپنی اس غلطی پر سخت نادم ہوں۔"

پتا نہیں حکیم صاحب کی آواز میں کیا تھا۔ ان کے لفظوں میں کتنی ہولناکی تھی کہ وقارالحسن اندر تک لرز کر رہ گیا۔ پھاوڑا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ چند لمحے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ حکیم صاحب نے نگاہیں جھکالیں تو وہ ایک دم چیخ اٹھا۔ "کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم۔۔۔ میں مرجاؤں گا۔ مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ میں تھک چکا ہوں۔ خدا کے لیے۔۔۔ خدا کے لیے ایسا مت کیجیے۔ اس نے تو کہا تھا کہ اگر میں ایسا کروں۔۔۔ اس کی بات پر عمل کروں تو۔۔۔"

وقارالحسن کی آواز پھٹ گئی۔ اس کے گلے میں خراشیں پڑ گئیں۔

حکیم صاحب نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ "ہاں۔۔۔ اس نے کہا تو تھا مگر بیٹا۔۔۔ ان لوگوں کا بھروسا کرنا' خود کو فریب دینے کے مترادف ہے۔ تم خدا پر بھروسا کیوں نہیں کرتے' وہی تو ایک سہارا ہے ہمارا۔ تم نے سنہرے بابا کے کہنے پر عمل کیا ہوتا تو۔"

"کیا تھا۔۔۔ کیا تھا میں نے عمل۔" وہ پھر چیخ اٹھا۔ "میں۔۔۔ کچھ بھول ہوگئی تھی۔ میں نے دانستہ ان کے کہے سے روگردانی نہیں کی تھی حکیم صاحب اور پھر۔۔۔ یہ۔۔۔ میرا ہمزاد' اس نے مجھے۔۔۔" اس نے دانت کچکچا کر جواب دیا۔

میں اس کے اندر سمٹ کر رہ گیا۔ مجھے یہی ڈر تھا۔ جو حالات سامنے آرہے تھے وہ کسی بھی طرح میرے حق میں نہیں جاتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ بالآخر وقارالحسن کو احساس ہوجائے گا کہ اس سے ہونے والی تمام غلطیاں سراسر میرے بہکانے کا نتیجہ تھیں۔

"کچھ بھی ہو۔ بہرحال اب تو جو ہوچکا ہے اس پر کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آؤ چلیں۔ لیکن اس بات کو پھر سن لو کہ تم ایک حوصلہ مند مرد ہو۔ تمھیں ہر قسم کے حالات میں صرف اور صرف حوصلے سے کام لینا ہے۔"

وقارالحسن کو یوں بھی اندر جاکر حالات دیکھنے کی تڑپ پریشان کیے ہوئے تھی۔ وہ دونوں اماں کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اب صبح کاذب کا وقت تھا۔ اچانک وقارالحسن کو آہٹ محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے حویلی کے اس حصے میں کوئی ہے جہاں رشید چاچا اور اس کا گھرانا آباد تھا۔ اس آہٹ کو حکیم صاحب نے بھی محسوس کیا تھا کیونکہ وہ بھی ٹھٹک گئے تھے۔ "یہ آواز۔۔۔ تم نے سنی؟" انھوں نے وقارالحسن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔" وقارالحسن چونک گیا۔ اس کے کان اب پھر اسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ اچانک انھیں اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وقارالحسن پھرتی سے پلٹا اور پھر اپنے سامنے رشید چاچا کی بہو کو گھونگٹ نکالے' کھڑے دیکھ کر اچھل پڑا۔

"چھوٹے مرزا! وضو کا پانی گرم ہے۔"

"ہیں۔۔۔!!!" وہ اب بھی ہونقوں کی طرح کھڑا تھا جیسے جو کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ کوئی خواب ہو۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔" جیسے اسے ہوش آگیا۔

"منجھلی بیگم کو بھی اٹھا دیجیے گا۔" اس نے دھیرے سے کہا اور پھر باورچی خانے کی طرف پلٹ گئی۔ وقارالحسن کی حالت دیوانوں کی سی ہوگئی۔ اس نے جھٹکے سے پلٹ کر حکیم علی احمد کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر اطمینان اور ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں تشکر کے احساس سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ آسمان کو تک رہے تھے جیسے خدا کا شکر ادا کررہے ہوں۔ وقارالحسن ابھی تک جیسے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ ابھی ابھی اس نے واقعی رشید چاچا کی بہو دیکھا ہے۔ وہ زندہ تھی بلکہ صحیح سلامت ٹھیک ٹھاک

تھی جبکہ وہ ان سب کی موت کی تصدیق کر چکا تھا۔ اپنی آنکھوں سے ان کے بے جان جسم دیکھ چکا تھا۔ یک بیک وہ اچھلا اور اماں کے کمرے کی طرف بھاگ پڑا۔

اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا کمرے میں ہلچل دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ جہانی آپا کروٹ بدل رہی تھیں۔ انھوں نے کروٹ لیتے ہوئے پل بھر کو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے وقارالحسن کو دیکھا پھر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اماں ابھی نہیں جاگی تھیں مگر وہ اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھیں جس میں وقارالحسن انھیں دیکھ چکا تھا۔ اس وقت ان کا ہاتھ آنکھوں پر تھا۔ کمرے کے کونے میں لٹکی لالٹین کی ہلکی روشنی غالباً ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی جس سے بچنے کے لیے انھوں نے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ چاندنی پر لیٹی تمام لڑکیاں سانس لے رہی تھیں۔ بھرپور زندگی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ اب نہ کمرے میں ہولناکی کا کوئی احساس تھا' نہ قیامت کا سا سناٹا وقارالحسن کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ اس وقت اسے ان سب کے تنفس کا اتار چڑھاؤ صاف سنائی اور دکھائی دے رہا تھا یا شاید وقارالحسن نے اپنی تمام تر قوتیں یہی دیکھنے اور سننے میں صرف کر دی تھیں۔

اسی لمحے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اماں کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھیں اور اس آواز کے ساتھ ہی وقارالحسن وہیں دروازے پر سر بسجود ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ شکر ادا کر رہا تھا۔ اماں نے آواز سن کر پلٹ کر وقارالحسن کو دیکھا اور جلدی سے پلنگ سے اتر کر اس کی طرف لپکیں۔

"وقارالحسن!! کیا بات ہے بیٹا۔۔۔ سب خیریت تو ہے ناں؟" انھوں نے اس کے قریب بیٹھ کر سجدے میں رکھے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ ایک دم اٹھ کر اماں سے لپٹ گیا۔ "اماں۔۔۔ اماں اگر آپ لوگوں کو کچھ ہو گیا تو میں۔۔۔ میں مر جاؤں گا اماں۔ مر جاؤں گا۔" وہ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے وقارالحسن؟" ان کے لہجے میں الجھن تھی۔

وقارالحسن نے لمحہ بھر کو سر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا پھر بے اختیار ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ان کی پیشانی چوم لی۔ "اللہ نے اس وقت مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے اماں' میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ آپ نماز پڑھ لیں۔ میں بھی نماز پڑھ لیتا ہوں پھر بتاؤں گا اور اماں۔۔۔ میں ذرا حکیم صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

"حکیم صاحب!" اماں چونک اٹھیں۔ "خیریت تو ہے' حکیم صاحب اتنے سویرے کیسے آ گئے؟"

"میں واپس آ کر بتا دوں گا۔ سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ انھیں دلاسا دے کر باہر نکل آیا۔ یہاں سے وہ سیدھا باہر کھڑے حکیم صاحب تک پہنچا۔ وہ اس کے چہرے پر برستی خوشی کو دیکھ کر حقیقت جان چکے تھے۔

"بیٹا میں بڑے مرزا سے مل کر جاؤں گا۔ جو غلطی میں پہلے کر چکا ہوں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔"

یہ بات سن کر وقارالحسن خاموش ہو گیا۔ انھیں لے کر چھوٹے برآمدے میں چلا آیا۔ اماں حکیم صاحب سے پردہ تو نہیں کرتی تھیں مگر پھر بھی وہ کبھی ان کے سامنے یوں نہیں آئی تھیں کہ لحاظ ہی نہ ہو مگر اس وقت وہ سب کچھ بھول بھال کر سر پر دوپٹا جمائے برآمدے میں چلی آئیں۔ "خیریت تو ہے ناں حکیم صاحب!" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جی سیدہ بیگم! بس خیریت ہی گزر گئی۔ اب آپ گھبرائیے نہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ ساتھ خیریت کے جہانی کو ان کے گھر کا کر دے پھر کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔" حکم صاحب نے نگاہیں نیچی کیے جواب دیا۔

وقارالحسن تایا کے کمرے کی طرف بڑھا تو اماں وضو کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ رشید چاچا کی بہو زیب النسا چائے لے کر آئی۔ وقارالحسن نے اسے چائے رکھنے کو کہا اور تایا کو اٹھانے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اماں کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں لڑکیوں کی ہنسی اور سرگوشیوں کی آوازیں آئیں تو فرط مسرت اور تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ رات کے چند گھنٹے کس قیامت کے تھے یہ وقارالحسن ہی جانتا تھا۔ یہ کہاں گمان تھا کہ اب وہ یہ سرگوشیاں یا سریلی ہنسی کی آوازیں دوبارہ بھی سن سکے گا۔ اس کا دل تشکر سے بھرا ہوا تھا۔

وہ تائی کے کمرے میں پہنچا تو اس کی آنکھوں میں رات والا منظر جما ہوا تھا' جب وہ تایا کو جھنجوڑ رہا تھا مگر تایا تمام عذابوں سے پرے کہیں دور کسی پرسکون دنیا میں جا چکے تھے۔ لمحہ بھر کو دروازے پر ٹھہرا تو اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ پل کے ہزارویں حصے میں کہیں سے یہ خوف در آیا کہ کہیں وہی رات والا منظر نہ ہو مگر دروازے پر ہی تایا کی آواز نے اس کے اندر ڈھیروں سکون اتار دیا۔ وہ تائی سے کہہ رہے تھے۔

"اری نیک بخت' ایسا بھی کیا پاگل پن کہ خدا کو ہی بھول جائے۔"

وقارالحسن نے اندر جھانکا۔ تائی تو بے خبر سو رہی تھیں اور تایا اپنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے انھیں تک رہے تھے۔ آہٹ پر انھوں نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا پھر وقارالحسن کو کھڑے پا کر بولے۔

"اذانوں سے پہلے اٹھا کرتی تھیں اور آوازیں دے دے کر دل میلا کر دیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی میں جھنجلا کر جواب دیا کرتا تھا کہ بھئی نماز پڑھنا نہ پڑھنا میرا اور خدا کا معاملہ ہے۔ تمھیں اس نصیحت کے کتنے نمبر ملیں گے جو یوں وکالت کرتی ہو۔" پھر وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "پتا ہے کیا جواب دیتی تھیں تمھاری یہ تائی!! کہتی تھیں میری زندگی کا سارا سکون انھی نمبروں سے تو ملتا ہے۔ تم کیا جانو۔ پر مجھے یقین ہے کہ میرے خدا نے میرے حصے میں سکون ہی سکون لکھ دیا ہے۔ سچ ہی تو کہتی تھیں۔ دیکھو تو' ہم سب کتنے بے سکون ہیں اور خوش ہیں کہ ہم پاگل نہیں ہوئے۔ اس کے پاگل پن پر ترس کھاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ خدا نے اس کے حصے میں جو سکون لکھا تھا' یہ پاگل پن وہی سکون ہی تو ہے۔ لڑکی چلی گئی تھی' بڑا کرب سہا میں نے مگر یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہی۔ لڑکی لوٹی تو دل دکھ' شرمندگی اور غصے سے بے حال ہو گیا تب بھی اسے کچھ نہیں ہوا' ویسی ہی پرسکون رہی اور پھر لڑکی مر گئی۔ اسے دفنا دیا' دل پھٹ گیا۔ برسوں کے جمے ہوئے آنسو کیا پگھلے جیسے زندگی بھر کی جمع پونجی ہی بہا لے گئے پر یہ۔۔۔ یہ تو ویسی ہی پرسکون رہی اور اب۔۔۔ اگر یہ نماز نہیں پڑھتی' خدا کو بھی یاد نہیں کرتی تب بھی دل کتنا ٹھنڈا ہے اس کا۔ ابھی تھوڑی دیر میں اٹھے گی' اپنی خیالی دنیا میں گم ہو جائے گی' نہ فکر ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے' نہ دنیا میں۔ کیسا خوف' کہاں کا غم' کون سی خوشی اسے کچھ پروا ہی نہیں۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔

"تایا اٹھیں۔ نماز کا وقت نکل جائے گا۔" وقارالحسن نے قریب جا کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "حکیم صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ہیں۔۔۔ یہ اتنے سویرے حکیم صاحب کہاں چلے آئے!" انھوں نے پیروں میں کھڑاویں ڈالتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"تایا۔۔۔ رات ایک بڑی قیامت سے گزرا ہوں میں۔" ایسا کہتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز گئے۔ اس نے بے ساختہ تایا کے دونوں ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا۔

"کیا ہوا۔۔۔" وہ ایک دم گھبرا گئے۔ "سب خیریت سے تو ہیں ناں؟"

"جی ہاں۔ بڑا احسان کیا ہے خدا نے مجھ پر۔۔۔ آپ نماز پڑھ لیں پھر بتاؤں گا۔"

پہلے تو تایا ایک ٹک اسے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے ہزاروں سوال بے چینی سے چکراتے محسوس ہو رہے تھے مگر انھوں نے جلد ہی اپنی بے چینی پر قابو پا لیا۔ وہ لوگ وضو کر کے نماز کو چلے گئے۔ مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ اماں نماز سے فارغ ہو کر ناشتے پانی کے انتظام میں لگ گئی تھیں۔ وہ نماز پڑھ کر لوٹے تو حویلی میں زندگی عروج پر تھی۔ وقارالحسن نے جس سناٹے کو جھیلا تھا اس میں یہ رونق کسی ہنگامے سے کم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آج شام جہانی آپا کا نکاح تھا۔ رشید چاچا سویرے ہی نکل گئے تھے۔ ان کا بیٹا ان کے ساتھ تھا۔ بہت سے کام نمٹانے تھے مگر وقارالحسن کو جیسے فی الوقت کسی بات سے سروکار نہ تھی۔ وہ تو اماں اور تایا کو رات والے واقعے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ یہ سب انھیں بتانا ناگزیر تھا۔ حکیم صاحب کے رک جانے سے لگتا تھا جیسے وہ کوئی اہم بات گوش گزار کرنا چاہتے ہوں۔

میں وقارالحسن کو بتا چکا تھا کہ حکیم صاحب کسی ایسے شخص کے بارے میں اکثر سوچتے ہیں جو سوامی جوگندر ناتھ کا دشمن ہے۔ وہ ان پر قابو پا سکتا ہے۔ اسے حکیم صاحب جانتے ہیں۔ شاید حکیم صاحب اسی موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے۔ انھیں آتے دیکھ کر اماں نے برآمدے ہی میں دسترخوان لگوا دیا۔ حویلی میں خاصی چہل پہل تھیں۔ لڑکیاں اڑی اڑی پھر رہی تھیں۔ اماں نے شنو آپا سے کہہ کر ناشتا لگوا دیا۔ ہم نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد حکیم صاحب نے تایا سے درخواست کی کہ کسی ایسے کمرے میں چلیں جہاں سکون سے بات کی جا سکے۔ ان کی بات سن کر اماں اپنے بہت سے کام بھول گئیں۔ ناشتے کے دوران میں تایا بھی باتوں باتوں میں حکیم صاحب کی موجودگی پر کئی بار حیرت کا اظہار کر چکے تھے اور چاہا تھا کہ وہ اپنے اتنے سویرے یہاں موجودگی کا جواز بتائیں مگر حکیم صاحب نے محتاط رہنا زیادہ پسند کیا تھا۔ ان کی بات سنتے ہی اماں نے میرا کمرا کھلوا دیا جو اکثر بند رہتا تھا۔ اسے بند رکھنے کی ہدایت میری ہی دی ہوئی تھی۔

پتا نہیں اماں پر کیوں گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ حکیم صاحب کا رویہ بھی کچھ عجیب پراسرار سا ہو گیا تھا۔ وہ گہری چپ میں لپٹے خاموش بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خوفناک انکشاف کرنے والے ہوں۔ وقارالحسن اپنے طور پر اندازے لگانے کی کوشش میں کافی جھنجلا چکا تھا۔ میں چاہتا تو آ کر حکیم صاحب کے دماغ کو کرید سکتا تھا مگر اب میں محسوس کر رہا تھا کہ ایسا کوئی خطرہ مول لینا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ میری تو پوری کوشش یہ تھی کہ وقارالحسن مجھے بھول جائے۔ میری موجودگی کو فراموش کر دے تاکہ میں کسی بھی قسم کا نقصان نہ اٹھاؤں۔ کچھ دنوں تک اس کے اندر اتنا خاموش اور ساکت پڑا رہوں کہ وہ سمجھے اب میرا کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ اس طرح وہ میرے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا تھا کہ جس سے میرا وجود خطرے میں پڑتا۔

وہ لوگ وقارالحسن کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اماں اس سے قبل ہی زیب النساء کو ہدایات دے چکی تھیں کہ

"رشید چاچا آجائیں تو پھول والے کی دکان پر بھیج کر آرڈر دے آئیں۔ بادرچی کے پاس چلے جائیں تاکہ وہ نکاح کے دن کا تمام حساب کتاب دے دے اور ایسی ہی بہت سی ہدایات دے کر اماں پھر وقارالحسن کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ ذرا سکون سے بیٹھیں تو وقارالحسن نے دھیمے لہجے میں وہ سارا واقعہ سنادیا جو رات کو پیش آیا تھا۔ واقعات سنتے ہوئے اماں کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ انھوں نے درمیان میں کئی بار بولنے کی کوشش کی مگر تایا نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔ جب وقارالحسن نے بات ختم کی تو وہ بول اٹھیں۔

"خواب دیکھا ہوگا تم نے۔"

"خواب میں اکیلا دیکھ سکتا ہوں اماں۔ حکیم صاحب اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔" وقارالحسن کی بات سن کر ان کا چہرہ ایک دم سفید ہوگیا۔ انھیں فوراً ہی احساس ہوگیا کہ واقعہ سچا اور خاصا سنگین ہے۔

"سیدہ بیگم! وقارالحسن نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بہ حرف درست ہے۔" حکیم صاحب نے کھنکار کر بات شروع کی۔ "میں نہیں جانتا کہ سوامی کے ہاتھ میں ایسی کوئی طاقت ہے کہ وہ پہلے آدمی کو موت اور پھر زندگی بھی عطا کرسکتی ہے۔ اگر اس کے نزدیک یہ اس کی طاقت ہے بھی تو میں اسے محض نظربندی کا کھیل ہی سمجھوں گا۔ اس لیے کہ میرے اور میرا خیال ہے کہ ہم سب کے نزدیک ایک خدائے برتر کی ذات ہی مختار کل ہے۔ مگر جو حالات سامنے آتے رہے اس نے اور قرآن کی اس تصدیق نے کہ دنیا میں جادو ہے۔ یہاں بڑے بڑے جادوگر گزرے ہیں' یہ ثابت کردیا ہے کہ اسے محض کھیل نہ سمجھا جائے۔ وقارالحسن نے گو مجھے ایسی کوئی تفصیل نہیں بتائی جس سے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچوں پھر بھی میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اس وقت سے عذابوں میں ہے جب سے اس کے باپ نے اسے حالات سے آگاہ کرکے ایک کام اس کے حوالے کیا تھا۔ اس نے کام انجام دینے کا وعدہ کرلیا تھا اور مسلسل اس کوشش میں بھی لگا رہا شاید یہی اس کی بچت کا سامان بھی بن گیا مگر اب سوامی شدید اذیت میں ہے۔ وہ تمام کھیل کو کسی بھی طور ختم کرنا چاہتا ہے خواہ اس کے لیے اسے آپ کے پورے خاندان کو ختم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ اس زندگی سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے مگر جو قسم اس نے کھائی تھی اسے پورا کیے بغیر مرنا بھی اس کے بس میں نہیں ہے۔ کچھ ایسی قوتیں ہیں جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور وہ مردوں سے بدتر زندگی گزار رہا ہے۔"

"مگر اس معاملے میں ہم کیا کرسکتے ہیں؟ آپ مجھے بتائیے کہ وہ کہاں ہے۔ میں اس سے ملوں گی۔" اماں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارے مذہب میں جادو ٹونے کے بعد جس عذاب کا ذکر ہے' وہ اسے نہیں مانتے' ان کے خیال میں یہ ان کی شکتیاں ہیں جو مرنے کے بعد چوگنی قوت حاصل کرلیں گی اور اگلے جنم میں انھیں ناقابل تسخیر بنادیں گی۔ ان کے یہاں وہ تصور نہیں جو ہمارے ہاں ہے۔ فی الوقت ہمیں اپنی جان بچانا ہے۔"

"میری تو عقل ہی کام نہیں کرتی۔ ساری زندگی ہوگئی ہے مجھے دوسروں کے گناہوں کو ڈھوتے ہوئے۔" اماں کے لہجے کی تھکن نے وقارالحسن کو نڈھال کردیا۔ اس کا جی چاہا کہ انھیں اور بہنوں کو لے کر کہیں دور چلا جائے۔

"آپ جذبات سے کام نہ لیں۔ خدا پر بھروسا رکھیں۔ وہ کوئی نہ کوئی سبیل نکال دے گا۔ میں اس وقت پیرزادہ فیضل الرحمٰن کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وقارالحسن نے محسوس کیا کہ یہ نام سنتے ہی تایا اور اماں کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔ وقارالحسن نے یہ نام پہلی بار سنا تھا اس لیے اماں اور تایا کے ردعمل نے اسے حیرت زدہ کردیا۔ حکیم صاحب جس انداز میں ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اس سے لگتا تھا جیسے وہ ان باتوں سے واقف ہیں جن کے بارے میں وقارالحسن کچھ نہیں جانتا۔

"ان کا اس وقت کیا ذکر ہے؟" تایا نے جھجک کر پوچھا۔

"انھوں نے پہلے بھی اس معاملے میں مدد کا ارادہ ظاہر کیا تھا جسے چھوٹے مرزا یعنی وقارالحسن کے والد نے رد کردیا تھا۔ جو بھی معاملات تھے' میرا مطلب ہے کہ جو کچھ بھی اس سے قبل ہوچکا تھا' اس سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ یہ پیشکش خلوص دل سے کرچکے ہیں۔ میرا خیال یہی ہے کہ ان کی پیشکش پر اب سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ وہ سوامی کے تمام ہتھکنڈوں سے نہ صرف یہ کہ واقف ہیں بلکہ اسے شکست دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اگر آپ ان سے مل کر بات کریں تو بہتر ہے۔" آخری جملہ انھوں نے تایا سے مخاطب ہوکر کہا تھا۔ تایا چند لمحے سر جھکائے بیٹھے رہے پھر انھوں نے اماں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"جتنے نقصان اب تک ہوچکے ہیں وہ دشمنیاں نبھانے کے لیے کافی ہیں۔ اب ان بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ میں کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ ان کی زندگیوں کو اپنی دشمنی کی بھینٹ چڑھادیا جائے۔"

"تایا!" اچانک وقارالحسن بول اٹھا۔ "کیا ہے یہ سب۔۔۔؟ کیسی دشمنی۔۔۔ کون ہیں یہ پیرزادہ حفیظ الرحمٰن۔"

"تم انھیں نہیں جانتے بیٹا؟" تایا نے گہرا سانس لے کر کہا پھر اماں سے مخاطب ہوئے۔ "تم کیا کہتی ہو دلھن؟"

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" اماں نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کرلیا۔

"میرا خیال ہے کہ حکیم صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم تم تو زندگی گزار چکے۔ سچ پوچھو تو میں اب پرسکون موت کا منتظر ہوں' کسی بھی ہولناک واقعے کو دیکھنے سے پہلے مرنا چاہتا ہوں۔ میں اب اپنے کسی بچے کو اذیت میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ ان سے ملنے اور ان کی پیشکش کو قبول کرنے میں ہمیں اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

"پھر جیسی آپ کی مرضی۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

اتنا کہہ کر اماں اٹھ گئیں۔ انھیں جانے سے کسی نے بھی نہیں روکا۔ وقارالحسن ہونقوں کی طرح بیٹھا انھیں جاتے اور تایا کو سر جھکاتے دیکھتا رہا۔ اماں کے جاتے ہی حکیم صاحب سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔

"کل رات یہاں حویلی میں جو کچھ ہوا۔ وقارالحسن کی جو حالت ہوئی وہ اگر آپ دیکھ لیتے تو شاید۔۔۔ زندہ نہ رہ پاتے۔ میں نے اتنا کرب کبھی محسوس نہیں کیا مرزا صاحب! حالات ایسے ہیں کہ ہمیں سب کچھ بھول کر ان چکروں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ آپ ضروری کاموں سے فارغ ہولیں۔ اس معاملے میں ذرا سی تاخیر بھی مناسب نہیں ہے۔ خوشی کا گھر ہے' خدا کرے خوشی سے تقریب انجام پاجائے۔ ہمیں ابھی سے کچھ کرلینا چاہیے۔ میں اور وقارالحسن انھیں یہاں لے آتے ہیں یا پھر۔۔۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے گھر چلے چلیں۔"

"ہاں یہی مناسب ہے۔ مجھے سیدہ کی وجہ سے محتاط رہنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے بادل نخواستہ اس کی اجازت دی ہے۔" تایا نے کہا اور کھڑے ہوگئے۔

وقارالحسن کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ سب کچھ جان لینا چاہتا تھا مگر بقول حکیم صاحب کے' وقت بہت کم تھا۔ وہ کہانی سننے بیٹھتا تو اصل مسئلہ رہ جاتا یوں بھی آج نکاح کی تقریب تھی۔ اس تقریب سے نہ تو تایا لاتعلق رہ سکتے تھے اور نہ وہ خود۔ کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہی انھیں نکاح کی تقریب کا انتظام کرنا تھا۔ ڈھیروں کام تھے جنھیں دیکھنا ضروری تھا' محض یہی سوچ کر وہ خاموش رہا حالانکہ تجسس نے اسے بے چین کردیا تھا۔

"چلو!" تایا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔

"تایا۔۔۔!" اس نے اس کے سوا کچھ نہ کہا مگر اس ایک لفظ میں ہزاروں سوال تھے جو تایا سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔

"یہ لمبی کہانی ہے بیٹا' فی الحال وقت نہیں ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ چلو جلدی فارغ ہولیں کام بہت ہیں۔"

اس نے لمحہ بھر کو حکیم صاحب کی طرف دیکھا' انھوں نے بھی سر ہلا کر اسے تسلی دلائی۔ وہ لوگ تیار ہوکر باہر نکلے

تو سورج اپنی کچی کرنیں پھیلا چکا تھا' ہوا میں خنکی تھی۔ تایا شال لپیٹے ہوئے تھے مگر وقارالحسن تو حالات کی جس بھٹی میں سلگ رہا تھا' اس نے اس سے سردی گرمی کا احساس ہی چھین لیا تھا۔ گلی سے باہر آتے ہی واجد تانگے والا مل گیا جو اس محلے کے آخری سرے پر رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنا تانگا تیار کرکے کمائی کے لیے بس نکلنے ہی والا تھا۔ تایا کو دیکھتے ہی چہکا۔

"کہاں مرزا جی! اتنے سویرے سویرے کہاں چلے؟ آج تو شگون کا دن ہے۔ دیکھیے تو تانگے کو کیسا چمکایا ہے میں نے۔ دن ڈھلتے ہی گیندے کے پھولوں سے سجادوں گا۔ بس یہی ایک تانگا دکھائی دے گا پورے امروہہ میں۔ آپ کے سمدھیوں کے ہاں سے بھی ایسا تانگا نہیں آئے گا۔ آپ دیکھیے گا۔" پھر وہ وقارالحسن سے بولا۔ "بھیا! نیگ لیتے ہوئے ہمیں مت بھول جانا۔ ہم بھی بھیا ہیں تمھارے۔"

"ارے واجد میاں۔۔۔ بھئی واقعی ہم تو بھول ہی گئے تھے۔ ہمسائے کا حق تو سب سے زیادہ ہے۔۔۔ تم ابھی تو ہمارے ساتھ چلو' سہ پہر کو آکر اپنا جوڑا بھی لے جانا گھر سے۔" تایا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ جیتا رکھے مرزا جی! بھئی یہی وضع داری تو یاد رہ جاتی ہے اس حویلی والوں کی۔ پان والے کا پوتا بھی رات یہی کہہ رہا تھا۔ چلیے حضور تشریف رکھیے ہم کہاں چلیں گے؟" واجد تانگے والا گھوڑے کو پچکارتے ہوئے بولا۔ وہ لوگ تانگے میں بیٹھ گئے۔

"محلہ ملانا جانا ہے۔ پیرزادہ حفیظ الرحمٰن کے مکان پر۔" حکیم صاحب نے کہا اور تانگے والے نے تانگا بڑھادیا۔

وہ سوچتا رہا کہ محلہ ملانا میں حفیظ الرحمٰن نام کا کوئی ہے وہ نہیں جانتا۔

تمام راستے وقارالحسن کا دماغ الجھا رہا۔ اس نام کے ردعمل میں جو تاثرات اس نے اماں اور تایا کے چہرے پر دیکھے تھے وہ ایک عجیب سی پراسراریت پیدا کرگئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہیں جن کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا پھر بھی وہ گھر والوں کے لیے انجانے نہیں ہیں۔ یہ بھی تجسس تھا کہ وہ جانے کیسی شخصیت ہوگی جو سوامی جیسے آدمی کو شکست دے سکتی ہے۔ بہرحال راستہ طویل نہیں تھا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد محلہ ملانا میں داخل ہورہے تھے۔ واجد تانگے والے نے تانگا ریاض منزل کے گیٹ پر روک دیا۔ باہر ایک نوجوان سر پر ترکی ٹوپی پہنے کھڑا تھا۔ اس نے تانگا رکتے ہی آگے بڑھ کر ان لوگوں کا استقبال کیا۔ وقارالحسن کو یوں لگا جیسے وہ انھی کا منتظر تھا۔

"تشریف لائیے۔ بابا آپ ہی کے منتظر ہیں۔" اس کے جملے نے وقارالحسن کے خیال کی تصدیق کردی۔

"کیا آپ پہلے ہی اطلاع کر چکے تھے؟" تایا نے حکیم صاحب کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"نہیں۔۔۔ یہ ان کا کشف ہے۔ میرا نہ تو یہاں آنے کا پروگرام تھا نہ یہ پتا تھا کہ رات وقار الحسن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" حکیم صاحب نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

وہ نوجوان چند قدم آگے چل رہا تھا۔ ایک طویل راہداری تھی۔ جہاں راہداری ختم ہوتی تھی' وہاں دائیں جانب کچا صحن تھا۔ صحن میں انتہائی بائیں جانب لکڑی کے کواڑ تھے جو بند تھے۔ وہ کواڑ' ان پر لٹکی کنڈی' سامنے کا کچا حصہ' باہر رکھا پائیدان' یہ سب کچھ وقار الحسن کو جانا پہچانا سا لگا اور جب نوجوان نے دھیرے سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو بلی کی آواز نے وقار الحسن کے دماغ کو کئی قلابازیاں کھلادیں۔ بلی کی آواز اسے پشت پر سے آئی تھی۔ وہ اچھل کر پلٹا۔ سفید براق بلی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وقار الحسن کو یوں لگا جیسے اس بلی کی آنکھوں میں تمسخرانہ مسکراہٹ بھری ہو۔

"سنہرے بابا۔۔۔!!" بے اختیار وقار الحسن کے منہ سے نکلا' جبکہ تایا نے اسے حیرت سے مگر حکیم صاحب نے اسے معنی خیز مسکراہٹ کے درمیان دیکھا۔ اس اثنا میں نوجوان کواڑ کھول چکا تھا۔ وقار الحسن بت بنا کھڑا رہ گیا جبکہ تایا اور حکیم صاحب پائیدان پر جوتے اتار کر اندر داخل ہوگئے۔

"آؤ وقار الحسن!"

یہ آواز وقار الحسن ہزاروں آوازوں میں' بلا کے طوفانوں میں بھی پہچان سکتا تھا' قیامت کے شور میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ سو فیصد سنہرے بابا کی آواز تھی۔ دوسرے ہی لمحے وقار الحسن کوٹھری کے اندر تھا۔ اس کے سامنے بلاشبہ سنہرے بابا بیٹھے تھے۔ وہی مخملی جائے نماز' وہی ٹوپی' وہی سنہرے بال اور داڑھی اور ویسا ہی چہرے کا احاطہ کیے ہوئے سنہرا ہالہ۔ ان کے ہونٹوں پر نرم اور خوب صورت مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں بے پناہ شفقت

"سنہرے بابا؟" وقار الحسن یہ کہتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ پھر ان کے قریب بیٹھ کر اس نے ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پہلے آنکھوں اور پھر ہونٹوں سے لگالیا۔ تایا اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"آپ۔۔۔ آپ کہاں چلے گئے تھے سنہرے بابا؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔" وقار الحسن بے اختیار رو پڑا۔

"تمہارا صبر آزمانا ضروری تھا وقار الحسن۔ آدمی کچھ بھی نہ ہو تو بھلا کیا کرسکتا ہے۔ ہم تمہیں بھولے نہیں تھے۔ ہم تمہارے ساتھ تھے مگر تم نے ہمارے کہے پر عمل نہیں کیا۔ کیا ہم نے نہیں بتایا تھا کہ کسی حال میں خدا کو مت بھولنا۔ اس سے مدد مانگنا مگر تم۔۔۔ تم کوثر سے مدد چاہتے تھے۔ اپنے ہمزاد کے کہے پر عمل کرتے تھے۔ اس پیش بند کو اہم سمجھتے تھے۔ تم۔۔۔ تم سادھو بننا چاہتے تھے وقار الحسن جو تمہارے لیے کسی بھی طرح بہتر نہیں تھا۔"

وہ کہہ رہے تھے' میں تو اندر ہی اندر دبکا بیٹھا تھا' وقار الحسن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ واقعی پہلے تو وہ کلام اللہ کا سہارا لیتا تھا' محفوظ ہوجاتا تھا بلکہ دیکھ چکا تھا کہ سادھو اس کے عمل سے گھبراجاتا تھا پھر بھی وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ بہرحال اب تو میری شامت آنا تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وقار الحسن سے اپنے لیے معافی کی درخواست کرتا۔ سب سے زیادہ پریشان تایا تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ پیرزادہ حفیظ الرحمن سنہرے بابا کیسے ہوسکتے ہیں۔ وہ منہ کھولے' آنکھیں پھیلائے وقار الحسن کو ان کے سامنے جھکا اور روتا دیکھ رہے تھے۔ "یہ۔۔۔ سنہرے بابا۔۔۔۔" ان کے منہ سے بے ربط سے جملے نکلے۔

"ہاں تایا۔۔۔ یہ سنہرے بابا ہیں۔ انھوں نے ہی تو مجھے قدم قدم پر بچایا ہے۔ یہ انگوٹھی انھی کی دی ہوئی تو ہے۔" وقار الحسن نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھادیا۔ "اگر سنہرے بابا نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا۔ میں واقعی خدا کو بھول گیا تھا مجھے معاف کردیجیے سنہرے بابا۔ معاف کردیجیے۔" آخری جملہ اس نے سنہرے بابا سے کہا اور ان کے قدموں میں جھک کر پھر رونے لگا۔

"ٹھیک ہے وقار الحسن! آدمی خطا کا پتلا ہے' اگر کبھی اسے احساس ہوجائے بیٹا کہ وہ غلطی پر تھا تو توبہ کرکے راہ مستقیم اختیار کرنا چاہیے۔ لاؤ وہ پیش بند مجھے دے دو۔" انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وقار الحسن نے فوراً ہی گلے میں پڑا پیش بند ان کے حوالے کردیا۔ اس بار حکیم علی احمد کی نگاہوں میں تعجب تھا۔ وہ اس پیش بند کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ سب جادو ہے وقار الحسن اور جادو ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ کوثر بے وقوف تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ بھی ان ہندو سادھوؤں اور سنتوں کی طرح شکتیاں حاصل کرکے دنیا پر راج کرے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔ اس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔" سنہرے بابا دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

کوثر کے ذکر پر تایا کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ "مرزا صاحب! میں معذرت خواہ ہوں کہ۔۔۔ کہ شاید آپ کو میرے بارے میں جان کر دکھ ہوا ہو۔ میں نے مرزا صولت بیگ سے کہہ دیا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا میرے جذبات یا ذاتی زندگی سے متعلق کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو جان چکا تھا کہ انسان جب شخصیت کے سحر میں اتر جاتا ہے تو اپنے اصل سے دور ہوجاتا ہے۔ عشق وہی عشق ہے جو حقیقی ہو۔ میرے ہر معاملے کو ماضی کی بے وقوفیوں کے تناظر میں دیکھنا سراسر غلط ہے۔ میں بھٹکا تھا تو [illegible] بھی ہوں گا مگر وہ۔۔۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ شاید میں بددیانتی کررہا ہوں۔ شاید میں اتنا گر گیا ہوں کہ دشمنی کی بدترین شکل اختیار کررہا ہوں۔ ایسا نہیں تھا مرزا صاحب! محبت تو آدمی کو بلندی پر لے جاتی ہے محبت کا وہ بیج' وہ پہلی کونپل ہی تو اس مضبوط درخت کی بنیاد ہے جس کی وجہ سے میں آج عشق حقیقی کی راہ میں جان دینے کے قابل ہوا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئے۔

میں اور وقار الحسن دونوں ہی نہیں سمجھے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ ایسی کیا بات ہے جو ان خاندانوں کے درمیان غلط فہمی کی بنیاد بنی' آج یہ اندازہ ضرور ہوا تھا کہ سنہرے بابا کسی ایسی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو ان کے اور تایا کی درمیان براہ راست نہ ہونے کے باوجود بھی پچھلے حوالوں سے موجود تھی' پر تایا کے چہرے پر جو خجالت کے آثار نمودار ہوئے تھے' اس نے یہ احساس بھی دلادیا کہ انھوں نے کسی بغیر حیل و حجت کے پیرزادہ صاحب کی باتوں کو مان لیا ہے۔ وقار الحسن جواب سے پہلے کافی الجھ رہا تھا' اب سنہرے بابا کے شیریں لہجے میں ڈوبا کسی بدمست کی طرح بے خبر اور لاتعلق تھا۔

"میں شرمندہ ہوں پیرزادہ۔ کبھی ان باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ کبھی گہرائی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی بس اتنا سنا تھا کہ آپ۔۔۔" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئے۔

"ٹھیک ہے مرزا جی! یہ گلے شکوے پھر کبھی کرلیجیے گا۔" حکیم صاحب نے تایا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کی بات کاٹ دی۔ حکیم صاحب کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس تمام پس منظر سے واقف ہیں جو وقار الحسن اور میری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ میں چاہتا تو ان کے دماغ میں گھس کر اصل بات جان سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کے لیے مجھے وقار الحسن کے اندر سے باہر آنا پڑتا اور ایسا کرنا اس وقت میرے لیے خطرناک تھا۔ میں نے اس وقت فیصلہ کرلیا کہ یہاں سے باہر جاتے ہی میں پہلا کام یہی کروں گا۔ ابھی میرے اس فیصلے کی گونج میرے اندر ہی بل کھارہی تھی کہ میں نے سنہرے بابا کی کڑک دار آواز سنی۔

"باہر آؤ۔"

ان کی آواز نے سبھی کو چونکادیا۔ ان کا لہجہ تپ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر پھیلی نرم اور شفیق مسکراہٹ اچانک ہی غیض و غضب میں تبدیل ہوگئی تھی۔ وقار الحسن گھبرا کر پیچھے سرک گیا تھا۔ تایا اور حکیم صاحب حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں۔۔۔" انھوں نے وقار الحسن کی طرف اشارہ کیا۔ میں ان کا اشارہ اسی لمحے سمجھ گیا اور میرا جی چاہا کہ وقار الحسن کی اندر کوئی پاتال ہوتا اور میں وہاں جا چھپتا۔

"جی۔۔۔! مجھ سے؟" وقار الحسن حواس باختہ ہوگیا تھا۔

"تمہارے ہمزاد سے۔۔۔ باہر نکالو اسے۔"

"یہ میرے بس میں نہیں ہے سنہرے بابا۔" وقار الحسن نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"دیکھو!! مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اگر تم باہر نہ آئے تو۔ بہت من مانی کرلی ہے تم نے۔ وقار الحسن کو سب سے زیادہ نقصان تم ہی نے پہنچایا ہے۔ سوامی کو صرف شکنتلا کی پائل دینے پر ہی نہیں۔۔۔ چمپا کے حشر پر بھی بدبخت! سیدھی طرح باہر آجاؤ۔"

چمپا والی بات سن کر وقار الحسن کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میں وقار الحسن کے ساتھ یہاں تک آیا تھا۔ کاش میں باہر ہی سے رفو چکر ہوجاتا۔ یہ میرا لالچ ہی تھا جو مجھے یہاں تک لے آیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ ہربات سے باخبر رہنے کی خواہش نے آج میرے گرد جال بن دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں چاہوں بھی تو ان کے حکم سے روگردانی نہیں کرسکتا۔ میں خود باہر نہ آتا تو ان میں اتنی طاقت تھی کہ مجھے باہر کھینچ لاتے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب وقار الحسن بھی مکمل طور پر ان کا تابع تھا۔ اگر میں اس وقت یہاں نہ آتا تو وہ یقیناً وقار الحسن کو مجھ سے چھٹکارا پانے کی ہدایت کرتے مگر اسے سنبھالنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا' اس لیے میں سہا سکڑا وقار الحسن کے وجود سے باہر نکل آیا۔ میں نے وقار الحسن کی طرف دیکھا' وہ مجھ سے نگاہ نہیں ملا رہا تھا۔ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

حکیم صاحب اور تایا مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے' اسی لیے حیرت ان کی آنکھوں سے ابلی پڑتی تھی۔ سنہرے بابا سخت غصے میں تھے۔

"کیا تم سمجھتے ہو وقار الحسن کہ اسے معاف کردینا چاہیے؟" انھوں نے وقار الحسن سے پوچھا۔

میرا جی چاہا کہ وہ بس لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے رام کرلوں گا مگر میری قسمت خراب تھی۔ وہ نگاہیں جھکائے جھکائے بولا۔ "آپ جیسا مناسب سمجھیں سنہرے بابا! میں تو کافی ذلت اٹھا چکا ہوں۔ میں آپ کے' کسی اور کے بلکہ اب اپنے سامنے بھی نگاہ اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔"

"شاباش وقارالحسن! تم واقعی مضبوط کردار کے مالک ہو۔ اگر یہ تمہیں نہ بہکاتا تو تمہارا کسی بھی قوت کے آگے کمزور پڑجانا ممکن نہیں تھا اور ہمیں تمھاری اسی خوبی نے متاثر کیا تھا۔ اب ہم تمہیں نوید دیتے ہیں کہ تم بہت جلد ان عذابوں سے چھوٹ جاؤ گے۔"

ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے جملوں نے وقارالحسن کے چہرے پر خوشی چھلکادی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ تایا بھی ایک دم مطمئن سے ہوگئے۔ حکیم صاحب کے چہرے پر تو یہاں آتے وقت جو سکون تھا وہ اب بھی ویسے ہی موجود تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب سنہرے بابا میرے وجود کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے چاہا کہ میں ان قوتوں سے کام لے کر یہاں سے نکل جاؤں جو کوثر نے اور کچھ وقارالحسن نے میرے لیے حاصل کی تھیں مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا' مجھے لگا جیسے کسی نے میرے گرد لوہے کا جال سا بن دیا ہے اور اب وہ جال دھیرے دھیرے میرے گرد اپنی گرفت سخت کرتا جارہا ہے۔ میری اس تکلیف سے وقارالحسن بھی لاتعلق نہیں تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر عیاں تھے۔ جوں جوں لوہے کی باریک تاریں میرے وجود میں کھبی جارہی تھیں' وقارالحسن کی تکلیف میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔ میں شدید اذیت میں تھا۔ میں نے بے ساختہ وقارالحسن کو آوازیں دینا شروع کردیں۔

"مجھے بچاؤ وقارالحسن' میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمھارے تابع رہوں گا۔ مجھے چھوڑ دیں سنہرے بابا۔ چھوڑ دیں۔"

میرا خیال تھا کہ میری آواز میں وقارالحسن کے دل کو نرم کردیں گی۔ وہ ایک مرتبہ۔۔۔ صرف ایک مرتبہ میری طرف دیکھ لیتا' مجھے یقین تھا کہ میں اسے قابو میں کرلیتا مگر سنہرے بابا بھی ایک کائیاں تھے۔ وہ شاید جان گئے تھے کہ وقارالحسن کی کمزوری میرا مفاد بن جائے گی۔ انھوں نے تایا سے کہا کہ وہ وقارالحسن کو لٹاکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیں۔ تایا جو پہلے اس کی حالت دیکھ کر بوکھلا گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے جیسے ہوش میں آگئے۔ انھوں نے وقارالحسن کو اپنی گود میں کچھ اس طرح لٹالیا کہ اس کا چہرہ چھپ کر رہ گیا۔

میں اس وقت اپنی زندگی کی سب سے بڑی اذیت سہہ رہا تھا۔ خدا سے معافیاں مانگ رہا تھا مگر لگتا تھا کہ میرے اوپر توبہ کے تمام دروازے بند ہوچکے ہیں۔ اتنی اذیت تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب میں کوثر کے زخمی جسم میں داخل ہوا تھا۔ اس بھالے کی تکلیف تو اس اذیت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ مجھے نہ اس وقت چمپا اور کلپنا کے جسموں کا شہد یاد تھا نہ سادھو کی وہ چھوٹی چھوٹی پالتو کھوپڑیاں جن کے لہو چاٹنے کی آوازیں مجھے اب سے کچھ لمحے پہلے تک اسیر کیے ہوئے تھیں۔ میں آخری وقت تک اس لذت کو نہیں بھلاپایا تھا۔ پتا نہیں یہ وقارالحسن کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ شہد پی کر بھی لذت پاکر بھی اسے وہ سب کچھ فراموش ہوچکا تھا۔

میں آخری کوشش کے طور پر ہر حربہ آزمانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے سنہرے بابا کی منتیں کیں مگر وہ تو مجھے نیست و نابود کرنے پر تلے تھے۔ وقارالحسن غالباً" اس اذیت سے بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں نے سنہرے بابا کو اس کی اذیت کا احساس دلانے کی بھی کوشش کی مگر سب بے سود رہا۔ اور پھر۔۔۔ میں تڑپ اٹھا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے وجود میں دہکتے ہوئے انگارے بھر دیے ہوں۔ میری بصارت دھندلانے لگی۔ تمام حسیں برف بننے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے گرد بنا ہوا ان دیکھا لوہے کا جال مجھے کسی گہرے کنویں میں اتار رہا ہے جہاں صرف اور صرف گہرا اندھیرا تھا۔ گہری خاموشی تھی اور بلا کی ٹھنڈک میرے وجود کو جمائے دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میری آنکھ کھلی تو مجھے لگا جیسے کسی نے میرے جسم کو بٹی ہوئی رسیوں سے جکڑ رکھا ہو۔ تایا پریشانی سے میرے قریب بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب بھی تھے اور سنہرے بابا کا شفیق چہرہ میرے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ہلکی روشن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسے ہو بیٹا؟" انھوں نے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ان لوگوں کے درمیان خود کو لیٹا ہوا پایا تو بڑی بے ادبی محسوس کی اور تیزی سے اٹھنے کی کوشش میں کراہ کر رہ گیا۔ میرے تمام جوڑ دکھ رہے تھے۔

"لیٹے رہو۔" تایا نے دھیرے سے میرے سینے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا کچھ دیر لیٹے رہو۔" اتنا کہہ کر سنہرے بابا نے کسی بلال کو آواز دی۔ وہی لڑکا جس نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا تھا' کمرے میں داخل ہوا اور سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ "بیٹا وقارالحسن کے لیے شربت لے آؤ۔"

وہ سر خم کرکے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر تک تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ میں یہاں کیوں لیٹا ہوں۔ میرے بدن میں درد کی یہ کیفیت کیوں پیدا ہوئی اور میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور میں اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکا بلال' پیتل کے بڑے گلاس میں شربت لے آیا۔ اسے پی کر میں نے اپنے اندر حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی' یوں لگا جیسے مجھے آب حیات پلادیا گیا ہو۔

"میں احسان مند ہوں پیرزادہ! اپنے اور خاندان والوں کے رویے پر بھی شرمندہ ہوں' امید ہے آپ درگزر کریں گے۔" تایا نے سنہرے بابا کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔

"شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے مرزا جی! غلط فہمیاں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ آدمی ان پر سوچے' ...ی سی باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ بہرحال میرے دل میں کوئی بات نہیں ہے۔ آپ اپنا دل صاف کریں' خدا ہم ...کو معاف کردے گا۔ یہ وہ اذیتیں ہیں جنھیں ہم خود ...لیے پسند کرلیتے ہیں' یہ جانے بغیر کہ یہ اذیتیں ہمارے ...در توڑ پھوڑ کرتی ہیں۔"

تایا اور سنہرے بابا کے درمیان ہونے والی ذومعنی باتیں ...کر مجھے چند لمحوں پہلے کے تمام واقعات یاد آئے۔ یوں ...رہا تھا جیسے میں باتیں سنتے سنتے سوگیا تھا۔ نیند میں تھا ...لیے سمجھ نہیں پایا اب ان کی گفتگو سے مجھے وہ باتیں یاد ...ہیں جو اب سے پہلے ہوئی تھیں اور تایا اور سنہرے بابا ...چہرے کے تاثرات نے بھی میرے تجسس کو بھڑکادیا۔ ...تو مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سنہرے بابا اور ہمارے خاندان ...درمیان رشتہ یا جان پہچان رہی تھی جسے کسی غلط فہمی ...غالباً" دشمنی یا نفرت میں بدل دیا تھا۔

"اب جاؤ بیٹا۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ خدا ...تمھارے ساتھ ہے۔ بہن کو خوشی اور محبت سے رخصت ...اور یاد رکھو' کچھ بھی کیوں نہ ہوجائے پائے استقامت ...لغزش نہ آنے دینا۔ سوامی کی کسی بات پر عمل کرنے کی ...ضرورت نہیں ہے۔ سادھو تمہیں ڈرانے کی کوشش تو ...کرتا ہے مگر تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وقت ہوتا تو میں ...دونوں کا کام کردیتا مگر آج تو تمھارے گھر تقریب ہے۔ ...آج کا دن ذرا احتیاط سے گزارو۔ خود پر قابو رکھو۔ وہ ...ایسی حرکتیں کرکے تمہیں قابو کرنے کی کوشش کرسکتے ...جو تمھاری من پسند ہوں۔ کوئی بات بھی معمول سے ...ہٹ کر محسوس کرو تو خود کو وہاں سے ہٹادینا۔ صرف آج کے ...تمہیں تنہا یہ جنگ لڑنا ہوگی مگر کل سے میں تمھارے ...ساتھ ہوں گا۔"

...سنہرے بابا کے انداز' جملوں اور لہجے میں کوئی ایسی قوت ...تھی جو قطرہ قطرہ میرے اندر اتر کر مجھے توانا کررہی تھی۔ میرا ...اعتماد بحال کررہی تھی۔ مجھے حوصلہ اور عزم عطا کررہی ...تھی۔ شاید ان کی اس بات نے کہ آج کی جنگ مجھے تنہا ...لڑنا ہے' مجھے بے پناہ حوصلہ مند بنا دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب ...کوئی دکھ یا کسی جنگ میں تنہا رہ جاتا ہے' کسی کے ...آنے کی آخری آس بھی ٹوٹ جاتی ہے تو وہ ہر طرف سے ...بے بس ہوکر اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہوتا ہے ...اور کبھی ایسی حالت میں ہی بچ جاتا ہے۔ میری بھی کچھ ...ایسی ہی حالت تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں پہلے کے مقابلے میں ...طاقت ور ہوگیا ہوں۔ یہ بھی تو انھوں نے سچ کہا تھا کہ ...میں خود کو بھلا بیٹھا تھا۔ میں نے کوثر کی شکتیوں اور اپنے ...ہمزاد کے مشوروں پر انحصار کرلیا تھا ورنہ شروع میں' جب میں بے پناہ کمزور تھا اس وقت سادھو ایسے گھاگ آدمی کے سامنے ایک آیۃ الکرسی ہی مجھے اس جادو ٹونے سے نہ صرف محفوظ کردیتی تھی بلکہ بڑا حوصلہ بھی پاتا تھا' کاش میں وہ غلطی نہ کرتا جس سے میرا ہمزاد قوت پاگیا تھا تو شاید فیصلہ کرنے کی قوت کا بٹوارا بھی نہ ہوتا پھر کوثر نے اپنی بے وقوفی سے بھی مجھے کافی نقصان پہنچایا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں ہلکا پھلکا ہوں۔ میرا ہمزاد جو ہر وقت میرے اندر پنجے گاڑے رکھتا تھا اس وقت نہیں ہے۔

"ہاں بیٹا۔۔۔ اب تم زیادہ طاقت ور ہو۔" اچانک سنہرے بابا نے مجھے چونکادیا۔ "اب وہ تمھارے اندر چھپکے چھپکے وسوسہ ڈالنے والا نہیں ہے۔ اس شیطان کو ہم نے فنا کردیا ہے' اور یاد رکھو انسان چاہے تو اپنے اندر کے شیطان کو محض اپنی قوت ارادی سے ہی ختم کرسکتا ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے اگر ہر ایک کو کسی اور کی ضرورت پڑتی تو۔۔۔ تو شاید یہاں ہر طرف صرف شیطان ہی شیطان ہوتے۔ جو شخص خرافات میں پڑتا ہے' اپنی ذات' ادراک نہیں کرپاتا' خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے' وہ کمزور ہوکر اپنے اندر کے شیطان کو خود پر غالب ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کرتا ہے۔ تم ایک غلطی کرکے اس کا خمیازہ بھگت چکے ہو۔ اگر تم نے اب بھی خود پر قابو نہ رکھا تو اسے پھر جنم لینے میں دیر نہیں لگے گی۔ بیٹا ان شیطانوں کے بھی کئی جنم ہوتے ہیں۔ وہ ہر جنم کے اختتام پر خواہش رکھتے ہیں کہ اگلے جنم میں وہ اور زیادہ طاقت ور اور زیادہ حاوی ہوسکیں۔ جیسے تم کوئی خوب صورت بیل لگاتے ہو۔ پھول پودے لگاتے ہو تو کیاری کی صفائی' پانی اور دھوپ کا معقول انتظام ضروری ہوتا ہے' ایسے ہی انسان کو اپنی ذات اور اپنے کردار کی مضبوطی کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے' کچھ طاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم پودے سے غافل ہوجاؤ گے تو کوئی آکاس بیل تمھارے لگائے ہوئے اس پودے سے لپٹ کر اسے دھیرے دھیرے موت کے کنارے پہنچادے گی' بالکل اسی طرح ذات سے بیگانگی اس میں شیطانوں کو جنم دیتی ہے۔ جاؤ۔۔۔ اپنے اندر ادراک پیدا کرو۔ ذات کا' اس مکمل اور مضبوط ذات کا جسے خدا نے اپنے نائب کی حیثیت دی ہے۔ میں تم سے کل ملوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں کل جس وقارالحسن سے ملوں گا وہ آج کا وقارالحسن نہیں ہوگا۔"

انھوں نے دھیرے سے میرے کاندھے کو تھپکا۔ حکیم صاحب اور تایا اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی کھڑا ہوگیا۔

"بیٹی کا رسا دینا ضروری ہے مرزا جی مگر یقین کیجیے' اس میں خدا کی مصلحت ہے۔ البتہ ایک سفوف دے رہا ہوں' اسے زوجہ کو چٹادیجیے گا' اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ غم سے نڈھال ہوں تو تسلی دے دیجیے گا۔ باقی سب

کچھ خدا کی رضا سمجھ کر قبول کریجئے گا۔" ایسا کہتے ہوئے سنہرے بابا کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔ اتنا کرب کہ لمحہ بھر کو میں خوفزدہ ہو گیا۔ بے چینی پل بھر کو تایا کی آنکھوں میں بھی تیر گئی تھی مگر انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ سنہرے بابا نے پلٹ کر لکڑی کے صندوق میں سے ایک چاندی کی چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اسے تایا کی طرف بڑھا دیا۔ تایا نے احساس تشکر سے ان کے ہاتھ چوم لیے۔ ہم دروازے کی طرف بڑھے تو سنہرے بابا کی آواز نے پھر قدم تھام لیے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"وقار الحسن' یہ پیش بند میرے پاس امانت ہے۔ اور آتے ہوئے میری دی ہوئی کتاب کے علاوہ کوثر کی وہ تمام کتابیں بھی لیتے آنا جو وہ مراد آباد سے یہاں لائی تھی۔ کل سے ہمارا کام شروع ہو جائے گا۔ اپنی والدہ سے اجازت لے کر آنا۔"

میں نے سر تسلیم خم کیا اور تایا اور حکیم صاحب کے ساتھ باہر آ گیا۔ باہر واجد تانگے والا اب بھی منتظر کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہماری طرف لپکا۔

"میں نے سوچا آپ لوگ آئے ہیں تو واپس بھی تو لوٹیں گے۔ ویسے بھی آج تو بٹیا کا نکاح ہے۔ یہ کڑوا کسیلا منہ لے کر کیا کمائی کرنے نکلوں! چلیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ خوشی کے گھر کا نوالہ بابرکت ہوتا ہے۔ یہ بات میری دادی مرحومہ کہا کرتی تھیں۔ کوشش میں یہی کرتا ہوں کہ پہلا نوالہ خوشی کا مل جائے۔"

"ہاں بھئی۔ یہ تو تمہارا حق ہے۔ چلے چلو۔" تایا خوش تھے۔ پتا نہیں کیوں۔ نہ معلوم وہ کیسا اعتماد تھا جو سنہرے بابا کی باتوں نے میرے اور شاید تایا کے اندر بھی لبالب بھر دیا تھا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ تایا حکیم علی احمد صاحب کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ تانگا حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اندر کی رونق کا احساس باہر ہی سے ہو گیا۔ میں خدا کا شکر بجا لایا۔ ساتھ ہی میں نے خیریت سے دن گزر جانے کی دعا بھی مانگی۔ تایا نے حکیم صاحب کو آنے کے لیے کہا تو انھوں نے معذرت کرلی۔ ان کا کہنا تھا کہ گھر والے پریشان ہوں گے۔ ان کی بات درست تھی۔ میں جس حالت میں رات ان کے گھر گیا تھا اس نے سبھی کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ تو اب تک پریشان ہوں گے۔ تایا نے پھر اصرار نہیں کیا اور واجد تانگے والے سے کہا کہ وہ حکیم صاحب کو ان کے گھر پر اتار کر لوٹ آئے۔

حکیم صاحب نے شام کو جلد آنے کا وعدہ کر لیا تھا اور تایا کو تسلی دی تھی کہ اب نہ آپ اکیلے ہیں نہ وقار الحسن۔ میں خود بھی اس سلسلے میں ان کا احسان مند تھا۔ بس ایک الجھن تھی کہ سنہرے بابا پیرزادہ حفیظ الرحمٰن کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے تو تایا اس بات سے واقف کیوں نہ تھے اور ان دونوں کی ذو معنی باتوں نے بھی مجھے تجسس میں کیا ہوا تھا۔ میں اپنے ذہن میں آنے والے سوالوں کے جواب چاہتا تھا مگر فی الوقت اس تگ و دو میں لگنا میرے لیے ناممکن تھا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو سامنے ہی اماں کو ٹہلتے پایا۔ ان کے چہرے اور حرکات و سکنات سے اضطراری کیفیت عیاں تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکیں۔

"کیا ہوا؟"

"اللہ نے کرم کر دیا۔" تایا نے اطمینان بھرے انداز میں جواب دیا۔ "جانتی ہو پیرزادہ حفیظ الرحمٰن کون ہیں؟" وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئے پھر اماں کے سوال کرنے سے پہلے ہی بول اٹھے۔ "وقار الحسن کے استاد معظم۔ سنہرے بابا۔"

میں جانتا تھا کہ اماں یہ سن کر اچھل پڑیں گی۔ ایسا ہی ہوا مگر سب سے زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب یہ سن کر چونک جانے کے فوراً بعد اماں کی آنکھوں میں شکوک لہرانے لگے۔ "سنہرے بابا......؟"

"ہاں اماں...... وہ سنہرے بابا تھے' انھیں تو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔ اگر انھوں نے اس وقت میرا ساتھ نہ چھوڑا ہوتا اماں تو......"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب تم کچھ گھر کے معاملات بھی نمٹانے کی سوچو۔"

پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے اماں نے یہ جملہ انتہائی ناگواری میں کہا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ پلٹ گئیں اور تایا نے اس لمحے میرا ہاتھ دبا دیا۔

"تایا...... میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں۔" میرے اس جملے میں چھپے ہزاروں سوال تایا تک پہنچ گئے تھے شاید جبھی تو انھوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"وقت نہیں ہے بیٹا ورنہ...... بہرحال لمبی کہانی ہے۔ یہ دو ایک روز نمٹ جانے دو۔ خدا خیر سے جہانی کو اس کے گھر کا کر دے پھر تمہیں یہ کہانی بھی سنا دیں گے۔"

میں نے اپنے اس تجسس' اس پریشانی اور الجھن پر کیسے قابو پایا یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ واقعی کام بہت تھے۔ اتنا وقت پہلے ہی برباد ہو چکا تھا۔ رات اس حویلی میں برات اترنے والی تھی' کرنے والے لے دے کے ایک رشید چاچا ہی تھے' غلام سرور میں اتنی سمجھ بوجھ کہاں تھی کہ کوئی کام بغیر سمجھائے' بغیر بتائے کر لیتا۔ کاش اس وقت خورشید چاچا ہوتے' لڈن ہوتا۔ منظور چاچا ہوتے تو شاید مجھے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ خورشید چاچا تو دل میں کانٹے کی طرح ...... گڑے تھے۔ لڈن بھی کیا کم تھا۔ کسا بازوؤں کی مچھلیوں کو پھڑکایا کرتا تھا۔ کتنا بھی محنت طلب کام ہو' چٹکی بجاتے میں کر لیا کرتا تھا۔ اس موقع پر مجھے

بھی یاد آ رہے تھے۔ چھوٹی پھوپی کی یاد تو آنسو کی دھار بن کر بہہ گئی تھی۔ یوں تو بڑی پھوپی کی یاد بھی رلا رہی تھی مگر بڑی پھوپی سے میں اتنا بے تکلف نہیں تھا' نہ میرے اور ان کے درمیان وہ محبت پنپ پائی تھی جو میرے اور چھوٹی پھوپی کے درمیان تھی شاید اس لیے کہ بڑی پھوپی میری کم عمری میں ہی بیاہ دی گئی تھیں۔ ان کی محبت بھری باتیں اب ذہن کے پردے پر صرف مٹی مٹی لکیروں کی شکل میں ہی رہ گئی تھیں مگر چھوٹی پھوپی...... وہ تو جیسے ہم سب کی سہیلی تھیں۔ میں نے چپکے سے آنکھوں میں آئے آنسو آستین میں جذب کر لیے۔ تایا بھی گم صم بیٹھے تھے کہ اس وقت اماں نے مجھے آواز دے لی۔

"جاؤ بیٹا۔ کام دھندا دیکھو۔ تمہاری اماں اس وقت ت پی ہوئی ہیں۔ زیادہ دیر سامنے نہ رہنا ورنہ اپنے اندر سے کوئی انگارہ نکال کر دے ماریں گی۔" اس وقت تایا کے لہجے میں ہلکی سی شوخی کی رمق اچھی لگی۔ بڑے دنوں بعد جیسے فضا سے دھند چھٹنے لگی ہو۔ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ہنسی کی جو آواز میرے اندر سے پھوٹی تو لگا جیسے بچھڑی ہوئی ہو۔ لمحہ بھر کو تو اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے تایا کی ہنسی کی آواز بھی اس آواز میں شامل ہو گئی تو ساری اجنبیت دور ہوتی محسوس ہوئی۔

"میں بلا رہی ہوں تمہیں۔" اماں کی ڈانٹ پھر سنائی دی۔ وہ چھوٹے برآمدے میں بچھے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ رشید چاچا اور غلام سرور ان کے سامنے بچھی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر سخت تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار تھے۔ میں اٹھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

ان کے پاس آتے ہوئے جیسے میں اپنا سارا ماضی وہیں چھوڑ آیا جہاں سے اٹھا تھا۔

"وقار الحسن! باورچی کا انتظام ہو گیا ہے۔ تمام سامان پہنچا دیا گیا ہے مگر اب قناتوں کے بارے میں تمہیں دیکھنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بڑے برآمدے اور پیچھے والے کمرے کو ایک کر کے قناتیں لگوا دو۔ مردانے کا انتظام وہاں ہو جائے گا۔ زنانے کے لیے کافی جگہ ہے۔ بتاؤ تو اگر اوپری منزل قابل استعمال ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"اماں! مردانے کا انتظام اگر گلی میں کروا دیا جائے تو کیسا رہے گا؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"باؤلے ہوئے ہو کیا! پہلے ہی کم بے عزتی ہو چکی ہے کہ اتنی بڑی حویلی ہوتے ہوئے گلی میں قناتیں لگیں گی۔" وہ ناراض ہو گئیں۔

"اماں سبھی تو حویلی کے بارے میں جانتے ہیں۔ خیال ہے کہ بڑا برآمدہ اور برگد کے درخت والا کچا حصہ ٹھیک رہ جائے۔" میری آواز میں تیرتی تشویش نے انھیں چونکا دیا۔ انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا پھر شاید سمجھ گئیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ باپ دادے تمہارے تھے' میرے نہیں۔ لوگوں کی نگاہوں کا سامنا تمہیں کرنا ہے یا بھائی صاحب کو۔ بہرحال اس مسئلے کو تم حل کرو مجھے میوے منگوا کر بندھوانے ہیں۔"

اتنا کہہ کر اماں اندر چلی گئیں۔ میں نے رشید چاچا سے سارے انتظامات کے بارے میں تفصیل پوچھی اور پھر گھن چکر بن گیا۔ سہ پہر کو شرف الدین کا جوڑا جانا تھا۔ خاندان کے چند بزرگ خواتین' شنو آپا اور دوسری لڑکیوں بالیوں کے ساتھ جانے کو تیار تھیں۔ واجد تانگے والا حکیم صاحب کو چھوڑ کر آتے ہوئے تانگے کو گیندے کے پھولوں سے خوب سجا لایا تھا۔ میں نے اسی کے تانگے پر پھولوں کی لڑیوں سے پردہ بنوا دیا۔ اس تانگے میں لڑکیاں جوڑا' ہار پھول اور سہرے لے کر بیٹھ گئیں۔ دو تانگے اور سج کر آ چکے تھے۔ ان تینوں تانگوں کے ساتھ غلام سرور کو روانہ کر کے میں حویلی میں آ گیا۔

سارے انتظامات ہو چکے تھے۔ دیرہ دون' مراد آباد' دہلی' لکھنؤ اور دوسری کئی جگہوں سے خاندان کے دور پرے کے رشتے دار بھی آ چکے تھے۔ حویلی کا پچھلا حصہ۔ جس میں آٹھ کمرے تھے' اور بند پڑے رہتے تھے آج سب صاف ستھرے اور کھلے ہوئے تھے۔ رشید چاچا والا حصہ بھی مہمانوں کے لیے صاف کروا دیا گیا تھا۔ حویلی میں رونق دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے حویلی کے باہر لگے درختوں پر' چبوترے اور برآمدے کے ستونوں پر اور حویلی کی چھت سے نچلی دونوں منزلوں پر باہر کی طرف رنگین قمقموں کا جال سا پھیلا دیا تھا۔ امروہہ میں پہلی بار کسی شادی پر قمقموں سے چراغاں کیا گیا تھا۔ عام طور پر گھی اور تیل کے دیے جلائے جاتے تھے۔ جی تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ اصلی گھی کے چراغ روشن کروں مگر کرنے والا میں اکیلا تھا اس لیے ایسا ممکن نہ تھا۔

اس وقت خوشی کے جس احساس سے میں گزر رہا تھا شاید کوئی بھی نہ جانتا ہو کہ جہانی آپا کی شادی اس حویلی کی پہلی خوشی تھی جو دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی اور وہ بھی میرے عزیز ترین دوست شرف الدین کے ساتھ۔ پھر شرف الدین بھی کون؟ شگفتہ کا عزیز بھائی۔ میرا دوست' جو واقعی میرے لیے جان تک دینے کو تیار تھا۔ آج کی رونق نے میرے ذہن میں بڑی پھوپی کے نکاح کی رات اور اندھیری کر دی۔ اس رات کا سناٹا' حبس اور گھٹن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کاش...... کاش اس روز یہ نہ ہوا ہوتا۔ کاش اس رات بھی حویلی پر ایسی ہی رونق برسی ہوتی۔ یا کاش اس

وقت ان کی شادی نہ ہوئی ہوتی۔ آج ہوئی ہوتی انھوں نے جیسی گھٹی گھٹی زندگی گزاری تھی اتنی ہی گھٹی ہوئی موت بھی جینے سے لگالی۔

میں برآمدے میں لیٹا ماضی میں گم تھا۔ چھوٹی پھوپی کی باتیں' ان کی چھیڑ چھاڑ' ان کی ہنسی مجھے چاروں طرف فضا میں ناچتی محسوس ہو رہی تھی کہ اماں میرے پاس چلی آئیں۔ وہ بھی کافی تھک گئی تھیں۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" انھوں نے افسردہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے صاف گوئی سے بتادیا کہ پھوپیاں یاد آرہی ہیں۔

"اور باد آیاد نہیں آرہے؟؟" انھوں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں شرمندہ ہوگیا۔ واقعی ابا' دادا' دادی یا پردادا کا خیال مجھے نہیں آیا تھا۔ پردادا اور دادی کا تو یاد نہ آنے کی معقول۔۔۔ بلکہ بہت معقول وجہ موجود تھی مگر ابا۔۔۔ ابا تو بے چارے بے گناہ ہی مارے گئے تھے۔

بہت دیر ہمارے درمیان سناٹا چھایا رہا۔ میں اماں کے دکھ کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ آج مجھے پہلے سے زیادہ نڈھال اور اکیلی اکیلی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ شاید خوشی کے اظہار کے لیے یا غم کی شدت کو نکالنے کے لیے انہیں بھی کسی ایسے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی جو ان کا اپنا ہو۔ جس کے سامنے وہ کھل کر رو سکیں' کسی لحاظ اور ادب کا پاس ان کے جذبوں کی شدت کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ جس سے وہ خوشی کا اظہار کر سکیں کہ کوئی انھیں نہ ٹوکے۔ مجھے اس لمحے شدت سے احساس ہوا کہ آدمی بوڑھا ہو جائے تو اپنی اولاد بھی اس کی اپنی نہیں رہتی اور اگر بد قسمتی سے اس کا جیون ساتھی بچھڑ جائے تو وہ کتنا اکیلا کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔

"یہ دکھ اور یہ خوشی۔۔۔ ہماری ہوتے ہوئے بھی کتنی پرائی سی لگ رہی ہے یوں جیسے یہ بھی امانت ہو' جانے والے کی۔ جیسے ہم رو کر یا خوش ہو کر اس امانت میں خیانت کے مرتکب ہو جائیں گے۔"

ان کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کتنا کرب تھا شاید آپ جان بھی نہ پائیں۔ میں نے اپنے اندر اپنے کئی ٹکڑے ہوتے محسوس کیے۔ آنسوؤں کے نمکین گولے حلق میں پھنس گئے۔ زبان تالو سے چپک کر رہ گئی اور میں اماں کا ہاتھ تھام کر چپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ پتا نہیں غم یا خوشی کے اظہار کا یہ انداز کیسا تھا کہ نہ پلک تک آنسو آئے نہ ہونٹوں تک مسکراہٹ۔

تایا نہ آجاتے تو ہم جانے کب تک ان سناٹوں کے گہرے کنویں میں اندر ہی اندر اترتے چلے جاتے۔ تایا بہت بوکھلائے ہوئے تھے اس لیے ہمارے درمیان کی اس گمبیر کیفیت کو جان ہی نہ پائے اور گھبرائی ہوئی آواز میں سارا سناٹا چھن سے توڑ دیا۔

"بھئی واہ میاں۔۔۔ تم یہاں بیٹھے ہو۔ باہر قناتوں کی گاڑی کھڑی ہے۔ مزدور انتظار کر رہے ہیں۔"

"جی تایا! تھک گیا تھا۔" میں گہری سانس لے کر کھڑا ہوگیا۔ اماں چھپاک سے کمرے سے باہر چلی گئیں تو تایا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ شاید سناٹا ٹوٹنے کے چھناکے کی آواز بازگشت بن کر لوٹی تو تایا کی سماعت سے بھی ٹکرائی تھی۔ وہ پل بھر کو چپ کے چپ رہ گئے۔ آنکھیں دھندلائیں' ہلکا سا لڑکھڑائے اور پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"کیا۔ کیا ہوا۔۔۔؟" ان کی بکھری ہوئی سی آواز آئی۔

"کچھ بھی نہیں تایا۔ انسان کتنا کم ظرف ہے۔ نہ خوشی سنبھال پاتا ہے نہ غم' نہ دکھ جھیل پاتا ہے' نہ کرب۔ خوشی ہو تو اظہار میں بخل سے کام لیتا اور غم ہو تو خود پر پہرے لگا لیتا ہے۔ جو کنجوسی خود کرتا ہے' جو پابندی خود اپنے پر لگاتا ہے اسے کم ظرفی کا الزام دے کر بری الذمہ بھی ہو جاتا ہے۔"

"ہاں بیٹا! یہ انسان کی کمزوری ہے۔ یہی تو اسے دنیا اور آخرت میں ذلیل و خوار کرتی ہے۔ ہر عمل میں اس کا نتیجہ پوشیدہ ہوتا ہے' اگر یہ بات وہ سمجھ لے تو اسے کبھی یہ دکھ نہ ہو۔"

میں فضا کے بوجھل پن میں دب کر گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ تایا کو وہاں اس گہرے سناٹے کے گرداب میں چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوا تھا مگر اتنی تسلی دل کو سنبھالنے کے لیے کافی تھی کہ تایا یہاں سے اٹھیں گے تو نسبتاً" پر سکون ہوں گے۔ میں باہر چلا گیا۔ گدھا گاڑیوں میں قناتیں رکھی تھیں' مزدور اکڑوں زمین پر بیٹھے میرے منتظر تھے۔ تقریباً" دو گھنٹے بعد میں فارغ ہو پایا۔ میں نے پوری گلی کو گھیر کر قناتیں لگوادی تھیں۔ فرش اور چاندنیاں' گاؤ تکیے اور حقے' اگالدان اور پاندان کے علاوہ ڈیکوریشن کا باقی سامان میں نے احتیاط سے رکھوا دیا۔ رشید چاچا اور غلام رسول نے آج میرا جس قدر ساتھ دیا تھا مجھے خورشید چاچا کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

شام ڈھلتے ہی برات کی آمد کا شور مچ گیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس تقریب سے سو قدم دور اور کہیں اوپر بیٹھ کر اس حویلی میں برستی خوشیوں کو اور رونق کو دیکھوں۔ میں آج کے دن کا سارا سکون' ساری خوشی اور تمام رونق اندر اتار کر برسوں کا خالی پن بھر لینا چاہتا تھا مگر اس تقریب سے لاتعلق رہنا میرے لیے ممکن ہی نہ تھا سو مصروف رہا۔ برات آئی۔ نکاح ہوگیا' مبارک سلامت کی آوازوں میرے کنویں ایسے خالی پن میں مانو گھوں گھوں کرکے

چکی سی چلادی۔

شرف الدین اس روز اتنا خوب صورت لگ رہا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ وہی شرف الدین ہے یا کوئی اور۔۔۔ اس وقت میں جہانی آپا کی خوشی دیکھنے ان تک پہنچ گیا۔ سارے ستاروں کی چمک' تمام رنگوں کی شوخی اور سارے موسموں کی ملاحت ان میں موجود تھی۔

"جہانی آپا!!" میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ "آپ تو جانتی ہیں ناں کہ آپ کے لیے خوشیوں کا حصول کتنا کٹھن ہوگیا تھا۔ آج میں یوں سرفراز ہوا ہوں کہ آپ پرائی ہوگئیں' کہ پرائی ہونا ہی اس دنیا میں اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اس پرائے پن کا دکھ اپنے کفش اس آس پر جھیل لیتے ہیں کہ پرائی ہونے والی چند رشتے توڑ کر چند اور رشتے جوڑ لے گی۔ ایک گھر کی اجنبیت کو دوسرے گھر کی اپنائیت میں بدل دے گی۔ اور تو سب ٹھیک ہے مگر شرف الدین کے بادا کا خاص طور پر خیال کیجئے گا۔ انھیں اپنانا آپ کا پہلا اور اولین فرض ہے۔ اپنے گھر کی خوشیوں کو جنم دینا' انھیں بانا اور بانٹنا آپ کا کام ہے۔" پتا نہیں یہ سب کچھ کیسے کہہ گیا حالانکہ میرے حلق میں پھندے سے پڑ رہے تھے۔ ایک سیلاب سا تھا جو آنکھوں سے اندر کی طرف بہہ رہا تھا۔

"یہی کام آپ کو بھی تو کرنا ہے وقار بھائی۔ جہانی آپا جتنا کر پائیں گی کریں گی' باقی کسر آپ نکال لیجئے گا۔ وہ آپ کا بھی تو سسرال ہے۔"

میری پشت سے آواز آئی۔ تبھی مجھے کمرے میں خاندان کی دوسری لڑکیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں اٹھنے لگا تو جہانی آپا نے اپنی مہندی لگے ہاتھوں سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اتنی زور سے بھینچے کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"بھائی!! میں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ کتنی اذیتوں کے بعد۔۔۔ کتنی کٹھنائیوں کے بعد۔۔۔"

"نہیں آپا۔۔۔ کوئی اذیت نہیں۔۔۔ اگر تھیں بھی تو تھیں۔۔۔ آج میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ آپ کے چہرے پر یہ خوشی پائی تو شاید کبھی ان اذیتوں کا خیال ہی نہ آئے۔ اللہ۔۔۔ ہماری لاج رکھے گا۔" میں نے بے اختیار ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے جسے انھوں نے دونوں ہاتھ میں تھام کر ہونٹوں سے لگالیا۔ میں ضبط نہیں کر پا رہا تھا لگتا تھا کہ ابھی زور زور سے رو دوں گا اور خاندان کی لڑکیوں کے سامنے خواہ مخواہ سبکی ہوگی لہٰذا میں جلدی سے باہر آگیا۔ دروازے سے برآمدے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میرے پاؤں میں جیسے وزنی زنجیریں آگریں۔ سامنے شگفتہ گلنار چہرہ لیے' آسمانی غرارے سوٹ میں ملبوس چہرے پر ہلکوتی مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی۔

اس کی آنکھیں کسی لمبے رستے کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں رکھا' لو دیتا دیا محسوس ہوئیں۔ پہلی بار شگفتہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھا۔ اس کی لو دیتی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ ہزاروں سوال تھے۔ اب سے پہلے میں اس کے کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر آج۔۔۔ آج سنہرے بابا کے بخشے ہوئے اعتماد نے میرے قدم تھام لیے تھے ورنہ شاید ان زنجیروں کو آج بھی پہلے کی طرح توڑ کر نکل بھاگتا۔

"کیسی ہیں آپ؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ابھی تک تو اچھے ہیں۔۔۔" اس نے بہت دھیرے سے جواب دیا اور پھر خوف زدہ ہرنی کی سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ہمارے چاروں طرف خواتین تھیں مگر شاید کسی کی نگاہ بھی ہم پر نہ تھی۔

"میں سخت شرمندہ ہوں۔"

"کس بات پر؟" اس نے مصنوعی حیرت کے اظہار کے سے انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

"اس طویل انتظار پر۔"

"یہ تو ہماری قسمت ہے۔"

"نہیں۔" میں تڑپ اٹھا۔ "یہ آپ کی قسمت نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو میں تقدیر بدلنے پر اعتماد رکھتا ہوں۔"

"حوصلے بلند رکھیے شاید کامیابی ہو جائے۔" وہ ہلکے سے ہنسی۔ اس نے مجھ پر طنز کیا تھا۔

میں ابھی جواب دینے ہی والا تھا کہ دور سے چچی کی آواز سن کر خاموش ہوگیا۔ شاید اس نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ وہ شنو آپا کو پکار رہی تھیں۔ میں نے چچی کی آواز کی سمت دیکھا۔ شگفتہ جلدی سے غرارہ سنبھالتی ہوئی پاس سے گزر کر جہانی آپا کے کمرے میں چلی گئی' معطر سا ایک جھونکا تھا جسے گہرا سانس لے کر میں نے اپنے اندر اتار لیا۔

"وقار الحسن!" مجھ پر نگاہ پڑتے ہی چچی میری طرف لپکیں۔ "ارے وہ بھائی صاحب کو دیکھو۔ شرف الدین کی اماں سے لڑ رہی ہیں۔"

چچی خاصی بوکھلائی ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تائی کے کمرے میں ہیں۔ یہ وہ کمرا تھا جسے برات کی خواتین کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ میں اس طرف لپکا۔ تائی باہر آرہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئیں۔

"تائی! کیسی ہیں آپ؟" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے بھاڑ میں گئی تمھاری تائی وائی۔ ذرا بلا کر تو لاؤ اپنے تایا کو۔ اسے بتاؤ تو سہی' آج بھی کو شر کو نہیں لا۔۔۔

لوگ۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے' آج خود جاکر لاؤں گی اسے۔ لو بھیا اس کی بہن کی شادی ہو اور وہ سسرالیوں کی سیوا میں لگی رہے۔"

وہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ میں کھڑا رہ گیا۔ ایسی خوشی کی بوچھار میں تائی کا دکھ آنکھوں میں اور دل میں انگارے سے بھر گیا۔ "ارے آپ کیوں زحمت کرتی ہیں۔" میں نے پیار سے کہا۔ "میں خود جاکر اسے لے کر آتا ہوں۔ دراصل وہ تیار ہورہی تھی۔ دیر لگ رہی تھی اس لیے یہ لوگ آگئے۔ دوسرے تانگے میں وہ آرہی ہے۔"

میں جھوٹ بولتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ جب سنہرے بابا نے تایا کو سفوف دیا تھا تو انھوں نے تائی کو دیا کیوں نہیں! میری بات سن کر وہ ایک دم ہی مطمئن ہوگئیں۔ میں نے چچی سے کہا کہ انھیں کسی ایسی جگہ لٹادیں جہاں کم سے کم لوگ ہوں۔ چچی انھیں بہانے بہانے اندر لے گئیں' میں سیدھا تایا کے پاس پہنچا۔ پہلے اتنی رات گئے رخصتی نہیں ہوا کرتی تھی۔ مغرب کے بعد ہی کھانے کا انتظام کردیا گیا اور اس کے فوراً بعد رخصتی کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جوں جوں رخصتی کا وقت قریب آرہا تھا نہ معلوم کیوں میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ ایک نامعلوم سا خوف کہ اب کچھ ہو نہ جائے۔ سادھو اور خاص طور پر سوامی کی طرف سے دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ ان کی یہ پراسرار خاموشی سنسنی خیز تھی پھر بھی ایک ذرا سا خیال یہ تھا کہ سوامی میرے بارے میں مطمئن ہے' شاید وہ جانتا ہے یا سمجھتا ہے کہ اس فریضے سے فارغ ہو کر میں اس کی ہدایات پر ضرور عمل کروں گا لیکن سنہرے بابا کی باتیں ذہن میں چکرانے لگتیں کہ انھوں نے کہا تھا۔ "ایک دن' آج کا دن تمھیں اکیلے ہی جنگ لڑنا ہے۔" کیسی جنگ۔۔۔ کون سی جنگ کی بات کررہے تھے وہ۔ آج کا تمام دن سکون سے گزر گیا تھا بلکہ سارا وقت تو مجھے اس بارے میں خیال ہی نہ آیا۔ میں مکمل طور پر سب کچھ بھول گیا تھا مگر اس وقت نہ جانے کہاں سے یہ خوف رینگتا ہوا میرے دل میں سانپ بن کر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے بے اختیار خدا سے خیریت کی دعا مانگی۔ برات کے جانے تک کا وقت مانگا۔ بعد میں تو جو بھی ہوتا میں بھگت لیتا۔

"کہاں تھے تم! شرف الدین کے باوا جو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھے' انھیں موقع فراہم کردیا ناں تم نے!" تایا نے کہا مگر ان کا لہجہ سرسری تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں۔

"کہہ رہے تھے' آوارہ گردوں کی برات نہیں ہے یہ۔۔۔ رات گئے تک نہیں رک سکتے۔ رسم کریں اور رخصتی کی اجازت دیں۔" تایا نے انھی کے سے انداز میں کہا۔

اسی لمحے میری ان پر نگاہ پڑ گئی۔ وہ نسبتاً تاریک اور سنسان جگہ پر ببر شیر کی طرح ٹہل رہے تھے۔ بسکٹی رنگ کا سنہرے کناروں والا عبا پہنے سرخ شرف الدین تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے سر اٹھا رکھا تھا اور اس کی بے چین نگاہیں اپنے باوا کے ساتھ گردش کررہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ بے چارہ' سارا وقت باوا سے خوف زدہ رہا ہوگا کہ جانے کب' کہاں' کس کو لتاڑ دیں۔

آخر تایا نے اماں کا عندیہ لے کر رخصتی کی اجازت دے دی۔ پندرہ بیس تانگے پھولوں سے لدے باہر گلی میں قطار لگائے کھڑے تھے۔ واجد تانگے والا سب سے آگے تھا' اسی کے تانگے میں دلھن کو رخصت ہونا تھا۔ پھر رخصتی کی اجازت ملتے ہی برات کھڑی ہوگئی۔ اماں نے تین تانگوں میں میوے سے بھرے ہوئے تھیلے رکھوا دیے تھے۔ میرا دل کسی انجانے خوف میں جکڑا ہوا تھا۔ میں جلد از جلد ان لوگوں کو رخصت کروینا چاہتا تھا۔ عورتیں سہاگ گارہی تھیں۔ حویلی کے قمقموں کی روشنی ماند پڑتی محسوس ہورہی تھی۔ ہر آنکھ اشک بار تھی' آنسو میری آنکھوں میں بھی تھے مگر واللہ یہ دکھ اور جہانی آپا سے جدائی کے آنسو نہیں تھے بلکہ تشکر کے آنسو تھے' خوشی کے آنسو تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ خواتین کو ڈانٹ کر چپ کرادوں۔ دونوں طرف سے تھامے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لڑکیوں کو ہٹا کر جہانی سے کہوں کہ وہ بھاگ کر تانگے میں سوار ہوجائیں اور جلدی ہوسکے اس گلی سے نکل جائیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں کہ میں ایسا کیوں سوچ رہا تھا؟

نہ معلوم کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی سمت سے طوفا[ن] آرہا ہو۔ اس کا رخ اسی حویلی کی طرف ہو اور بس اب پہنچنے ہی والا ہو۔ یا جیسے ریڈیو سے زلزلے کا وقت بتا دیا ہو اور وہ وقت اب ہونے والا ہو۔ میں ان سب کو بچانا چاہتا تھا اس طوفان سے' اس زلزلے سے اور بس۔۔۔ اسی لیے میرا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ میں' میں اس وقت روایتی قسم کے رونے دھونے اور رسموں سے بہت اکتا رہا تھا۔ اماں جہانی آپا سے گلے مل کر زور زور سے رو رہی تھیں کہ میں آگے بڑھا۔ میں نے اماں کا بازو زور سے پکڑ لیا۔

"بس کریں اماں! اب رخصت کردیں۔" پتا نہیں میرے ہاتھ کی گرفت اماں کے بازو پر سخت تھی یا لہجے میں سختی تھی' اماں رونا بھول کر حیرت سے مجھے تکنے لگیں۔ میں نے جلدی سے ان کا بازو چھوڑ دیا۔

"وقارالحسن!!" ان کے انداز میں حیرت اور تنبیہ دونوں تھی۔

"اماں۔۔۔ شرف الدین کے باوا بڑی دیر سے بے چین ہیں۔ کافی غصے میں لگ رہے ہیں۔" میں نے بات بنائی۔ بہرحال ایسے وقت میں اماں کو اس اذیت ناکی کا احساس دلانا نہیں چاہتا تھا جسے شاید کچھ دیر کو وہ بھی فراموش کر بیٹھی تھیں۔

انھوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا لیکن ایسی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئیں کہ میں کٹ کر رہ گیا۔ جلدی سے جہانی آپا کی طرف بڑھا۔ اپنا دایاں ہاتھ ان کے سر پر رکھا۔ انھیں دعائیں دیں بس میری یہی پہلی اور آخری دعا تھی کہ خدا انھیں خیریت سے اپنے گھر تک پہنچادے۔ میرے ہٹتے ہی شنو آپا ان سے لپٹ گئیں۔ میں غصے میں باہر نکل آیا ورنہ شاید میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے۔ پتا نہیں کتنی دیر کے بعد (ہر پل میرے لیے تو صدی بن گیا تھا) جہانی آپا کو تانگے میں سوار کیا گیا۔ تانگوں کی روانگی تک میں اضطراب کے عالم میں بھاگا پھرا۔ خدا خدا کرکے وہ لمحہ بھی آگیا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سسکیوں کی آوازوں پر غالب آگئی۔ عورتیں دروازے سے لگی سسکیاں بھرنے لگیں جن میں اماں' چچی اور شنو آپا پیش پیش تھیں۔ اس طرف قنات تنی ہوئی تھی جس سے پردہ داری رکھی تھی۔ چچا اور تایا قریب کھڑے تھے اور جاتے ہوئے تانگوں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے قافلے سے بچھڑ جانے والے مسافر جاتے قافلے کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔

"یا اللہ۔۔۔ تیرا شکر ہے۔" آخری تانگے کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی میں بے اختیار کہہ اٹھا۔

"ہاں۔۔۔ وقارالحسن۔۔۔ خدا کا لاکھ احسان ہے کہ سب کچھ ساتھ خیریت کے انجام پاگیا۔ ارے ہاں' وہ عورت کہاں ہے؟" آخری لمحہ وہ چونک کر بولے۔

"عورت۔۔۔ کونسی عورت؟ کس کی بات کررہے ہیں!" میں نے حویلی کے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔ کہتی تھی بہت دور سے آئی ہوں۔ تم سے ملنے۔ تانگے میں آئی تھی اور لگتا تھا جیسے تم نے شادی پر بلایا ہے۔ شاید اندر گئی ہوگی۔" وہ سرسری انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ خاندان کے بہت سے لوگ ہماری ہی جانب آرہے تھے۔ تایا کو آگے بڑھتے دیکھ کر ہی مطلوب چچا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھائی صاحب' آج تو تاش کی بازی ہوجائے۔ یاد ہے کتنے برس ہوگئے؟"

"ارے میاں اب۔۔۔ ایسے وقت میں تاش واش کھیلنا ۔۔۔ میاں کی نگاہوں میں آچکے ہیں' مناسب نہیں" تایا نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں مطلوب چچا یا دوسرے لوگ کیا باتیں کرنے لگے

مگر میں تو الجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے تو یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے کسی عورت کو بلوایا ہو۔ مجھے تایا پر غصہ آگیا کہ پوری بات کہے بنا آگے بڑھ گئے۔ بتایا ہی نہیں کہ وہ اکیلی ہے یا کوئی اور بھی ہے اس کے ساتھ۔ وہ آئی تھی تو پھر مجھ سے ملی کیوں نہیں' اماں وغیرہ نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ الجھن تھی بلکہ الجھٹے تھے کہ میرے ذہن میں گرہیں سی ڈال گئے۔ میں تیزی سے حویلی کی طرف بڑھا۔ اندر قدم رکھتے ہی ہو کا سا عالم محسوس ہوا' وہ تمام روشنیاں جو آنکھیں چندھیائے دے رہی تھیں ایک دم مدقوق سی لگیں' مگر سناٹا تھا جس میں کہیں سے شنو آپا کی سہمی سہمی سی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ میں اماں کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ اماں' چچی تائی اور خاندان کی وہ خواتین جو رک گئی تھیں سبھی تھکی ماندی' آڑی ترچھی فرش پر بچھی چاندنیوں پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اماں بہت غم زدہ تھیں۔ چچی ان کے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھیں۔ مطلوب چچا کی بیوی شنو آپا کو گود میں لٹائے انھیں تسلیاں دے رہی تھیں۔ اس کمرے میں کوئی عورت بھی ایسی نہ تھی جو محض میری جان پہچان کی ہو یا بہت دور سے تنہا آئی ہو یا کوئی ایسی عورت ہو جس سے صرف میں واقف ہوں۔ سبھی خاندان کی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں بھی سب جانی پہچانی تھیں اور ابھی تک اپنے رومال ناک سے اور آنکھوں سے رگڑ رہی تھیں۔

مجھ پر جیسے دورہ سا پڑ گیا۔ میں نے حویلی کا ایک ایک کمرا چھان مارا۔ لگتا تھا جیسے خوف اس عورت میں مجسم ہوگیا ہو۔ میں اس خوف سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ پھر بھی اس کی تلاش میں تھا پوری حویلی چھان کر میں پھر تایا کے پاس پہنچ گیا۔ "تایا! وہاں تو کوئی ایسی عورت نہیں ہے۔" ایسا کہتے ہوئے شاید میرے پر خوف برس رہا تھا۔ وہ میری طرف نگاہ کرتے ہی چونک اٹھے۔

"تم۔۔۔ اتنے پریشان کیوں ہو۔۔۔ ہوسکتا ہے وہ جاچکی ہو۔ بہت سے مہمان جاچکے ہیں۔"

"مگر۔۔۔ میں نے کسی کو نہیں بلوایا تھا۔" میں تخت پر کنارے ہی ٹک گیا۔ حکیم صاحب مطلوب چچا سے محو گفتگو تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری باتیں وہ یا کوئی اور سنے۔

"اب اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔" تایا میری پریشانی کو بہت سرسری انداز میں لے رہے تھے۔ وہ شاید سمجھ نہیں پارہے تھے۔ کوئی بھی انہونی ہوسکتی تھی۔ پتا نہیں سنہرے بابا نے جس جنگ کی بات کی تھی وہ کب کہاں اور کس واقعے سے شروع ہوجائے۔ میں مضطرب سا اندر چلا آیا۔ تمام گھر والے تھکے ہارے لیٹے تھے۔

بڑا سکون تھا۔ ایسا پرسکون اور ٹھہرا ہوا سناٹا تھا جس سے طبیعت بوجھل ہو گئی تھی۔ مجھے یوں بے چین پھرتے دیکھ کر اماں نے مجھے آرام کرنے کا کہا اور شنو آپا سے کہا کہ بھائی کا کمرا ٹھیک کردو مگر میں نے منع کردیا۔ میں اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔ اسی وقت تایا کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی شاید گھر میں آگئے تھے۔ باہر کے کام سمیٹنے کے لیے رشید چاچا نے زمینوں سے کئی ہاریوں کے بیٹوں کو بلا رکھا تھا۔ وہ سب سمیٹنے میں لگے تھے۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ تایا نے ابھی تک وہ سفوف تائی کو نہیں دیا ہے۔ میں نے اسی وقت انھیں یاد دلایا۔ انھوں نے کہا کہ انھیں یاد ہے اور ان کا یہی ارادہ ہے کہ رات کو سفوف چٹادیں۔ انھیں قوی امید تھی کہ صبح تک سفوف کام کروے گا۔ میں ان سے رخصت لے کر کمرے میں چلا آیا۔ یہاں بڑا حبس اور گھٹن محسوس ہورہی تھی۔ میں نے چاہا کہ کمرے سے باہر نکل جاؤں۔ کسی کھلی جگہ جا بیٹھوں مگر وہی خوف غالب رہا اور میں نے لیٹ کر آنکھیں موندلیں۔ پھر شاید میں سوگیا تھا۔

پتا نہیں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ میری آنکھ اچانک کھل گئی یہی نہیں بلکہ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیسے اور کیوں اٹھ گیا۔ چند لمحے تو دماغ ماؤف رہا پھر یکایک میں اچھل کر بستر سے کھڑا ہوگیا۔ وہ سسکیوں کی آوازیں تھیں جو تیز ہوا کے جھونکے کی طرح میرے قریب آکر دور چلی گئی تھیں۔ وہ سسکیاں سونی صد شکنتلا کی تھیں۔ وہی آواز، وہی کرب اور وہی بے بسی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے سوامی میرے قریب بیٹھا بول رہا ہو۔ وہ باتیں دہرا رہا ہو جس کی اس نے مجھے ہدایت دی تھی۔ اس کی آواز کے کان میں پڑتے ہی میں بے اختیار باہر چل پڑا۔ کوئی بار بار مجھے تنبیہہ کررہا تھا کہ وقت کم ہے۔ پتا نہیں چاند نکلنے میں کتنی دیر تھی۔ پتا نہیں وقت کتنا بیت چکا تھا۔ یہ خیال مجھے ہولائے دے رہا تھا۔ صرف ایک بات دماغ میں سما گئی تھی کہ مجھے جلد از جلد کچھ کرنا ہے۔ میں تیز رفتاری سے اس طرف بھاگا جہاں برگد کا درخت تھا اور جس کے سائے میں میں نے کچھ عرصہ پہلے پرکاش کا ڈھانچہ بعد میں پائل دبائی تھی۔ پھاوڑا وہیں کنارے رکھ دیا تھا۔ اس وقت نہ مجھے کوئی خوف محسوس ہو رہا تھا اور نہ میں اپنے اکیلے پن سے گھبرایا تھا۔ وقت کی کمی کا خوف کچھ اس طرح سے مسلط تھا کہ تایا کو بھی اپنی مدد کے لیے اٹھانے کا خیال نہیں آیا۔ میں پھاوڑا اٹھاتے ہی زمین پر پل پڑا۔ پہلے پائل نکال کر جیب میں ڈال لی۔ کنپٹی سے بہتا پسینا آستین میں جذب کیا اور سانس لیے بغیر پھر زمین کھودنے میں جت گیا۔

میں نہیں جانتا کہ مجھے کتنا وقت لگا۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔ احساس اس وقت ہوا جب مجھے قریب ہی کسی سسکی کی آواز سنائی دی۔ میں ایک دم پلٹا۔ شکنتلا سامنے کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرا بدن شدید تھکن کے احساس سے نڈھال ہوگیا۔ یوں لگا جیسے اب میری ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ میں بے اختیار زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

"وکارالحسن۔۔۔ ذرا سی ہمت اور کرو۔ بس۔۔۔ یہ عذاب کٹنے والا ہے۔ میں تمھاری اس کرپا کو کبھی بھول نہ پاؤں گی۔ اب پرکاش مجھ سے بہت کریب ہے۔ کتنے عذابوں کے بعد، کتنی صدیوں کے گزر جانے کے بعد ہم ایک ہوجائیں گے۔ اٹھو وکارالحسن۔۔۔ سمے گزر گیا تو۔۔۔"

اور میرے جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ میں پھاوڑا چھوڑ کر اس کھدی ہوئی قبر پر جھک گیا۔ اب میں اپنے ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا۔ بہت جلد میری زخمی انگلیاں پرکاش کے ڈھانچے سے ٹکرا گئیں۔ پھر مجھے نہیں پتا کہ کیسے میں نے اس کی لاش نکالی۔ اب مجھے اس بالی کی تلاش تھی مگر وہ بالی کہیں بھی نہ تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ بالی۔۔۔؟" میں بے ساختہ شکنتلا کی طرف پلٹا۔

"میرے پاس ہے۔" اس نے کوئی چمکتی ہوئی چیز میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے ہوا میں ہی پکڑ لیا۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب گہرے اندھیرے کا احساس ہوا۔ اس گہرے اندھیرے میں، میں ہر چیز کو بہت واضح اور روشن دیکھ رہا تھا۔ مجھے پرکاش کا ڈھانچہ، شکنتلا اور وہ چھوٹی سی بالی بالکل ایسی دکھائی دے رہی تھی جیسے میں تیز روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ ڈھانچہ نکلتے ہی میں نے پائل اور بالی جو دی۔ اسے واپس جیب میں رکھا اور باہر بھاگا۔ اب مجھے ہر حال میں اس کنویں تک پہنچنا تھا۔ وقت کی کمی کا شدت سے احساس تھا شاید اسی لیے غیر ارادی طور پر میں نے اس قوت سے کام لینے کی خواہش کی کہ جس سے میری رفتار بہت تیز ہوجاتی تھی اور میں واقعی اسی رفتار سے گویا اڑتا ہوا کنویں تک پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے شکنتلا کی موجودگی کا بھی احساس ہوا۔ مجھے بڑی ڈھارس ہوئی۔ اب میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کررہا تھا، مجھے یقین تھا کہ وہ میری مدد کرے گی۔ وہاں ڈول موجود تھا۔ میں نے لمحہ بھر بھی ضائع کیے بغیر ڈول کنویں میں اتار دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شکنتلا کا شریر کیسے نکالوں گا۔ کیا وہ اوپر ہی تیر رہا ہوگا کہ میرے ڈول ڈالتے ہی آجائے گا یا اس کے لیے مجھے ناکو چنے چبانے پڑیں گے۔

قارئین! یقین کیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ میں یہ سب کچھ کیسے کرسکا ہوں۔ یقیناً اس معاملے میں خدا میرا مددگار تھا۔ میرے ساتھ سنہرے بابا کی دعائیں تھیں۔ شاید امی نے بھی میرے حق میں دعا کی ہو۔ کچھ بھی ہو، میں نے چاند نکلنے سے پہلے ہی شکنتلا کا جسم کنویں سے نکال لیا۔ اس جسم کو دیکھ کر میں ذرا دیر کو سکتے میں رہ گیا۔ لگتا تھا جیسے اس کنویں میں پانی کبھی رہا ہی نہیں اور شکنتلا بھی جیسے کچھ ہی دیر پہلے اس کنویں میں کود کر مری ہو۔ اس کا خوب صورت بدن صحیح سلامت تھا۔ اس کا حسن ملکوتی تھا جس نے مجھے مبہوت کردیا تھا۔ بہرحال ان باریکیوں میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں اس کی لاش کو کاندھے پر ڈال کر حویلی کی طرف بھاگا۔

برگد کے درخت کے نیچے پہنچا، دور ہی سے میں نے اس کے نیچے بالکل ویسی ہی چتا بنی دیکھی جو پہلی بار یہاں دیکھ چکا تھا جب میں نے پہلی بار بڑے برآمدے کو عبور کرتے ہوئے قیامت کی ٹھنڈک محسوس کی تھی اور وہاں چتا کے قریب پہلی بار شکنتلا کو جھکے اور روتے پایا تھا۔ شکنتلا اب بھی بالکل اسی روز کی طرح بیٹھی رو رہی تھی۔ چتا پر پرکاش کا ڈھانچہ نہیں بلکہ اس کی جلی ہوئی لاش رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

وقت اتنا نہیں تھا کہ میں اسے ضائع کرتا۔ میں نے دوسرے ہی پل شکنتلا کی لاش کو چتا پر لٹادیا بھاگ کر باورچی خانے سے تیل اور دیا سلائی لاکر اسے آگ دکھادی، چتا بھربھرا کر جلی، شعلے جیسے آسمانوں سے باتیں کرنے لگے، پوری حویلی میں شعلوں کی روشنی پھیل گئی۔ مجھے خوف ہوا کہ اس طرح گھر والے اٹھ جائیں گے مگر واقعی۔۔۔ سنہرے بابا نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ جنگ مجھے اکیلے لڑنا ہوگی۔ گہرے اندھیرے میں وقت گھٹنوں کے بل رینگ رہا تھا اور میں جلتی ہوئی چتا کے قریب بیٹھا اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پا رہا تھا۔ اس آگ کے شعلوں نے گھپ اندھیرے کو حویلی کے کونوں کھدروں میں دب جانے پر مجبور کردیا تھا مگر مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا تھا کہ اندھیرا گہرا ہے گویا چاند نکلنے سے پہلے ہی میں وہ تمام کام کرچکا تھا جس کی شرط پر سوامی نے گھر والوں کو جادو کے اس جال سے نکالا تھا جہاں زندگیاں پتھر میں تبدیل ہوگئی تھیں۔

جانے یہ سب کچھ میں نے اتنے سے وقت میں کیسے کرلیا؟ یقین کیجیے کہ میں آج تک حیرت زدہ ہوں۔ شاید خوف کبھی کبھی بے پناہ طاقت بن کر آدمی کے اندر حوصلہ پیدا کردیتا ہے۔ یہ وہی حوصلہ تھا، وہی طاقت تھی جس نے مجھے کسی دیو کے مانند بنادیا تھا۔ چتا ٹھنڈی ہونے سے پہلے

ہی میں اپنے کمرے میں آگیا، میرے بدن میں بے پناہ درد تھا۔ پسلیوں کے نیچے بھی شدید درد تھا۔ میں نڈھال سا آکر بستر پر لیٹ گیا۔ میرا سانس اب بھی پھولا ہوا تھا۔ ابھی مجھے لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے دروازے پر آہٹ محسوس کی۔ بڑی مشکل سے میں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا اور وہاں تائی کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت نہیں تھی۔ ان کے چہرے پر دکھ تھا۔ ایسا دکھ، ایسا کرب کہ میں اپنی تکلیف بھول کر اٹھ بیٹھا۔ ان کی آنکھوں کی وہ ٹھہری ہوئی پتلیاں اس وقت بہت بے چین تھیں۔

"وقارالحسن۔۔۔!!" وہ ایک دم بھاگ کر میرے قریب آگئیں۔ "وہ۔۔۔ کوثر۔۔۔"

"تائی!!" میں چیخ کر ان سے لپٹ گیا۔ انھوں نے پل بھر کو تھرا کر مجھے تھام لیا پھر شاید وہ سب کچھ جان گئیں۔ ان کا بدن ہچکولے لینے لگا۔ میرا دل پھٹنے لگا۔ آنسو میری آنکھوں سے سیلاب کی طرح بہ نکلے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس وقت کوثر کی موت پر نہیں بلکہ ان کے کرب پر رو رہا تھا۔ اس کرب پر جس سے وہ اس پل واقف ہوئی تھیں، کیسے؟ کیوں میں جان نہیں سکا۔

اچانک انھوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھے خود سے الگ کیا اور بھیگی ہوئی پلکیں صاف کرکے سرگوشی کی۔ "وقارالحسن! وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں انھیں کیسے بتاؤں گویا وہ صرف اس کے چلے جانے سے واقف تھیں اس کی موت سے نہیں یہ جنگ میں اکیلا نہیں لڑ سکتا تھا اس لیے انھیں بازوؤں میں تھامے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا تایا کے کمرے میں آگیا۔ شاید تائی وہاں نہیں جانا چاہتی تھیں۔ انھوں نے دروازے پر مجھے روکا تھا اور بڑے دکھ سے کہا تھا۔ "وقارالحسن انھیں کچھ نہ بتانا۔ وہ سنیں گے تو۔۔۔ تو شاید غم سے پاگل ہی ہوجائیں۔ مجھے صرف اتنا بتادو وقار میاں کہ ہماری عزت کے چیتھڑے کہاں کہاں بکھرے۔۔۔ میں۔۔۔ میں ان سب کا سامنا کیسے کروں گی۔۔۔؟"

کتنی انجان تھیں تائی۔ وہ تایا کے پاگل ہوجانے سے ڈر رہی تھیں، انھیں کیا پتا کہ پاگل پن کا سکھ تو انھوں نے سمیٹا ہے۔ تایا تو دکھ کے ایسے گہرے سمندروں میں جاکر ابھرے ہیں جہاں کی گہرائی اور جس کے بھنور آدمی کو ابھرنے ہی نہیں دیتے۔

"بولو۔۔۔ بولو وقارالحسن۔" وہ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بولیں۔ "ہمیں اس کی نہیں، اپنی عزت کی فکر ہے۔ بتاؤ۔۔۔ یا ایسا کرو اسے زہر دے دو۔ اسے کسی بھی طرح مار دو وقارالحسن۔ میری خاطر اسے

وعدہ ہار دو۔"

"وہ مر چکی ہے پگلی۔" یہ آواز تایا کی تھی۔ میں تایا کو قریب آتے دیکھ چکا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ ہماری آہٹ سے وہ اٹھ چکے ہیں' مگر تائی کی پشت ان کی طرف تھی اس لیے وہ یہ آواز سن کر اچھل پڑیں۔

"کک۔۔۔ کیا۔۔۔؟"

تائی کی آواز میرے دل کو چیر گئی تھی۔ مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ اب مجھ میں دم نہیں رہا تھا کہ تایا کے اندر چھپے طوفانوں کا دوبارہ سامنا کرسکوں۔ اور پھر تائی۔۔۔ ان کا دکھ۔۔۔ ان کا غم سہنے کا یارا تو مجھ میں تھا ہی نہیں۔ میں چپکے سے تائی کو دروازے کی چوکھٹ تھامے چھوڑ آیا۔ میں جانتا تھا کہ تایا اکیلے کمزور پڑ جائیں گے اس لیے میں نے جا کر اماں کو اٹھا دیا۔ انھیں صرف اتنا کہا کہ تایا بلا رہے ہیں۔ وہ میری حالت دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھیں مگر میں نے انھیں اپنی طرف سے اطمینان دلا کر تایا کے پاس بھیج دیا اور خود اپنے کمرے میں آکر کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

پھر سارا وقت کسی طوفان کے انتظار میں گزر گیا مگر حبس اور گھٹن بڑھنے کے سوا کچھ بھی نہ ہوا۔ میں جانے کب سویا تھا۔ دن چڑھے آنکھ کھلی تو تایا سرہانے بیٹھے تھے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "تایا۔۔۔"

"سب ٹھیک ہے۔" انھوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "وہ پاگل ہی اچھی تھی وقار الحسن۔۔۔ اب افسوس ہو رہا ہے کہ سفوف کیوں چٹایا تھا۔ سچ مانو تو میں نے پہلی رات اسی خوف میں گزار دی تھی کہ سفوف اسے دوں یا نہیں۔۔۔ جانتا تھا کہ بیٹی کا دکھ اسے ادھ موا کردے گا مگر۔۔۔ مگر وقار الحسن' ہر انسان خود غرض ہوتا ہے' اپنے اکیلے پن کا خیال بارہا آیا اور رات بھی۔۔۔ رات بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم لوگوں کے بعد۔ یعنی تمھاری بھی شادی ہوجانے کے بعد میں کیا کروں گا۔ کس سے باتیں کروں گا۔ کیسے غم ہلکا کروں گا' اور اسی وقت تم نے سفوف دینے پر اصرار کیا تو جیسے مجھے بہانہ مل گیا اور میں نے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بہت دکھی ہے۔ اسے کوثر کے مرنے کا نہیں' اس کے بھاگ جانے کا دکھ مارے دیتا ہے۔ اس میں دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے وقار الحسن! وہ۔۔۔ وہ بہت جلدی مر جائے گی۔" آخری جملہ کہتے ہوئے تایا کا لہجہ سپاٹ تھا' یوں جیسے اب وہ ہوش و حواس کھو رہے ہوں۔

"تایا۔۔۔ خدا کے واسطے۔ اب تو سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ میں نے وہ سب کچھ کردیا جو سوامی نے کہا تھا۔"

اتنا کہہ کر میں نے انھیں رات کی تفصیل بتائی۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے پھر انھوں نے ایک کپڑے کا لپٹا ہوا تھیلا مجھے دے کر کہا۔

"میں جانتا ہوں وقار الحسن! سویرے پیرزادہ حفیظ الرحمٰن آئے تھے۔ یہ دے گئے ہیں۔ تمھارے پاس دادا جی کی تصویر ہے' سوامی جی کے ساتھ۔ یہ اور پائل وغیرہ اس تصویر کے ساتھ رکھ کر برگد کے نیچے داب دو۔ سوامی انجام تک پہنچ جائے گا۔ بس انھوں نے اتنا ہی کہا تھا اور۔۔۔ اور انھوں نے چاند کی چودہ تاریخ سے پہلے ہی اس حویلی کو خالی کردینے کی ہدایت کی ہے۔ ابھی نو روز باقی ہیں۔"

میں نے تھیلا ہاتھ سے لیا تو اس میں وہ تمام چیزیں تھیں جو سادھو مجھ سے لے چکا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ چیزیں سنہرے بابا نے کیسے اور کب حاصل کیں۔ مجھ میں اب طاقت بھی نہیں تھی کہ میں اس بارے میں کچھ سوچتا۔ حویلی چھوڑ دینے کا سن کر مجھے اماں کا خیال آیا۔ مجھے اچانک سنہرے بابا کی دوسری حیثیت یعنی پیرزادہ حفیظ الرحمٰن کا خیال بھی آیا۔ جس تجسس نے مجھے کافی بے چین کیا تھا' پھر وہ سوال بن کر ہونٹوں پر آگیا۔

"تایا! یہ سنہرے بابا۔۔۔ پیرزادہ حفیظ الرحمٰن اور۔۔۔ آپ لوگ۔"

پھر جو کچھ تایا نے بتایا اس نے لمحے بھر کو مجھ میں سناٹا سا بھر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ اماں کی ان سے منگنی ہوئی تھی۔ وہ خاندان سے باہر کے تھے مگر نانا کے دوست کے بیٹے تھے۔ اماں سے شادی ہوجاتی اگر مرزا صولت بیگ درمیان میں نہ آجاتے۔ مرزا صولت بیگ کا انداز دولت مندوں بلکہ جاگیرداروں ایسا تھا وہ جس چیز کو حاصل کرنے کا سوچتے اسے ہر حال اور ہر قیمت میں حاصل کرلیا کرتے تھے۔ اماں کے بارے میں انھیں کسی نے بتایا کہ وہ نیک اور خوب صورت ہیں تو انھوں نے بیٹھے بیٹھے انھیں اپنے منجھلے بیٹے کے لیے بیاہ لانے کا خیال آگیا۔ ان کے خیال میں بیٹے کی خوش اخلاقی' ملنساری اور نرم طبیعت ان کے روایتی شاہانہ انداز اور شہرت کے لیے نقصان دہ تھی۔ وہ غریبوں کو اپنا جیسا سمجھتا اور ان سے ہمدردی کرتا تھا۔ زیادہ وقت باہر رہ کر اور بقول ان کے خراب صحبت کی وجہ سے برباد ہو رہا تھا اور ان کے نزدیک اسے قابو کرنے کا واحد حل شادی تھا۔ نانا امروہہ کے مشہور جاگیردار تھے۔ علی جان منزل انھی کی تھی جو انھوں نے بیٹی کے نام لکھ دی تھی۔ اس پرانی حویلی پر بادشاہوں کے قلعے کا سا گمان ہوتا تھا اور انھوں نے محض اس حویلی کو حاصل کرنے اور اپنے خیال میں بگڑے ہوئے بیٹے کو سدھارنے کے لیے پیرزادہ حفیظ الرحمٰن کے والد اور نانا کے درمیان دشمنی کا بیج بویا۔ شاطروں کی سی چالیں چل کر اس دشمنی کو ہوا دی اور بالآخر وہ رشتہ تڑوا کر اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ نانا ان کے جال میں آگئے اور نکاح

پہلے ہی حویلی ان کے حوالے کردی تھی۔

"کہانی تو اب بھی بڑی لمبی ہے۔ تمھاری اماں کا دکھ ان کی حرکتوں نے بہت بڑھا دیا تھا وقار الحسن مگر قابل قدر ہے وہ عورت جس نے سب کچھ سہہ کر بھی اپنے سسرال کی عزت نہ گھٹنے دی۔"

تایا یہ کہہ کر خاموش ہوئے تو میرا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا' تو دکھ مجھے بھی ہوا تھا۔ اسی احساس نے کہ مرزا صولت بیگ نے ساری دنیا ہی کو نہیں میری اپنی ماں اور نانا کو بھی کچھ کم دکھ نہیں دیا' جہاں میرے دل میں ان کی نفرت کو بڑھا دیا وہاں یہ خیال بھی کانٹے کی طرح چبھ کر رہ گیا کہ اماں نے اتنا کچھ سہہ کر بھی حویلی نہیں چھوڑی تھی تو اس کی وجہ کیا تھی۔ وہ واقعی بہت باظرف عورت تھیں کہ انھوں نے آج تک کبھی منہ سے یہ نہ بتایا کہ یہ حویلی مرزا صولت بیگ کی نہیں' ان کی ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں جا کر اماں کے ہاتھ چوم لوں۔ تایا خاموش ہوگئے تھے اور میں سکتے کی سی حالت میں بیٹھا تھا۔

قارئین! میرا خیال ہے کہ آپ لوگ میری کہانی کی طوالت سے اکتا چکے ہوں گے' خود میں بھی اب تو اکتاہٹ محسوس کرنے لگا ہوں۔ اکثر خیال آتا ہے کہ آپ میرے پل پل کی کہانی پڑھنے پر کتنا اکتا جاتے ہوں گے۔ آج میں سوچ کر بیٹھا ہوں کہ اسے ہر حال میں ختم کردوں گا۔ آپ کو بہت دیر تک الجھائے رکھنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ یہ میرے دکھ تھے۔ مجھے خوشی بھی مل گئی تھی مگر یہ خوشی بہت مہنگی پڑی تھی۔ جہانی آپا کے ولیمے کے تیسرے روز تائی چپکے سے دنیا چھوڑ گئی تھیں۔ ایسی خاموشی سے چلی گئیں کہ تایا بھی حیران بیٹھے رہ گئے۔ پھر جب انھیں ہوش آیا تو اس خیال نے ان کی زندگی حرام کردی کہ وہ نہ انھیں سفوف دیتے نہ وہ ہوش میں آتیں اور نہ یہ دکھ ان کی جان لیتا مگر سنہرے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ان کی قسمت میں تھا۔ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ تقدیر کا تو میں بھی قائل ہوں یقیناً آپ بھی ہوں گے۔ تائی کی موت کا دکھ تایا کی موت کا سبب بننا تھا سو یہ سب کچھ ہوگیا۔ حویلی چھوڑنے سے پہلے یعنی شرف الدین کے ولیمے سے لے کر نو دن کے اندر اندر ہی ہم ان دونوں کو اپنے آبائی قبرستان میں دفنا چکے تھے۔ اماں حویلی چھوڑنے کا سن کر باؤلی سی ہوگئی تھیں' میں انھیں سنبھالے رہا۔ شرف الدین نے جب سنا کہ ہمیں نو روز کے اندر اندر حویلی چھوڑنا ہے تو اس نے اصرار کرکے شگفتہ سے میرا نکاح بڑی سادگی سے کروا دیا۔ رنگوں' محبتوں اور خوشیوں کے سارے ارمان میرے دل میں رہ گئے۔ میں نے آپ سے شروع میں ہی کہا تھا کہ میں دکھ' اور سکون کے لمحوں کے لیے ترستا ہی رہا ہوں۔ شگفتہ میرے لیے دنیا کی اور اپنی زندگی کی پہلی خوشی تھی جس نے مجھے آج تک زندہ رکھا ہے اسے دھوم دھام سے بیاہ لانے کی میری بھی خواہش تھی مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ہمیں ہر حال میں جلد از جلد حویلی خالی کرنا تھی مگر اماں اس حویلی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ وہ چاند کی تیرہ تاریخ تھی۔ میں شگفتہ کے ساتھ سامان بندھوانے اور بھجوانے میں لگا ہوا تھا۔ رشید چاچا' غلام رسول اور اس کی بیوی کے علاوہ میرے ساتھ پان کے کھوکے والے کا بیٹا' واجد تانگے والا اور کچھ دوسرے لوگ بھی لگے ہوئے تھے۔ سب جان چکے تھے کہ ہم یہ حویلی چھوڑ رہے ہیں مگر اماں بار بار مجھے بلا کر کہہ رہی تھیں کہ تم یہ سب نہیں کرو' میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں نے انھیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر سب بے سود رہا ہم فوری طور پر امروہہ تو نہیں چھوڑ سکتے تھے اس لیے شرف الدین نے ہمارے لیے ایک ایسے مکان کا بندوبست کردیا تھا جو اس کے چچا کا تھا اور چچا وغیرہ کیونکہ مراد آباد میں شفٹ ہوچکے تھے اسی لیے خالی تھا۔ وہ حویلی سے دور نہیں تھا۔ میں نے اماں سے کہا کہ ہم صرف چند روز تک وہاں رہیں گے پھر واپس حویلی میں آجائیں گے مگر وہ ماں تھیں' جان چکی تھیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

رات کا آخری پہر تھا جب اماں کی حالت خراب ہوئی۔ شدید بخار تھا اور وہ ہذیان بول رہی تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سنہرے بابا کو لے آیا۔ انھوں نے اماں کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بس دعا کرو۔ حویلی سے محبت ہی ان کی زندگی تھی۔ پھر وہ آخری پہر ہم نے کیسے گزارا' اسے بیان کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں نے اس روز جو کچھ محسوس کیا' موت کی آہٹ کتنے قریب محسوس کی میں بتا نہیں سکتا۔ بس اتنا ہوا کہ جیسے کسی نے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ سنہرے بابا میرے پاس تھے۔ اماں نے آخری بار آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھوں میں ہزاروں دیے جل رہے تھے جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئے۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا اور اس وقت جب اسی رات سنہرے بابا نے اماں کی میت اٹھنے سے پہلے اپنے بیٹے کو بلا کر شنو آپا کا نکاح اس سے پڑھوا دیا تو لگا جیسے میرے دل کو کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ بڑی پھوپی کی طرح شنو آپا کا نکاح بھی اسی خوف' اسی گھٹن میں ہوا اور وہ روتی بلکتی اس حویلی سے رخصت ہوئیں تو ہم سب بھی ان کے ساتھ ہی حویلی چھوڑ آئے۔ اماں کو ان کی رخصتی سے پہلے دفنا دیا گیا۔ جہانی آپا' شنو آپا اور شگفتہ کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ہم سب کو سنبھالنے والے' تسلی دینے والے موجود تھے یہ بھی نہ ہوتے تو جانے ہم سب کا کیا ہوتا؟ جہانی آپا کو شرف الدین نے' شنو آپا کو پیرزادہ خلیق الرحمان نے اور مجھے

شگفتہ نے سنبھالا۔

چاند کی چودہ تاریخ کو چاند نکلتے ہی حویلی میں آگ لگ گئی۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور ہم سب تماشائی بنے اپنے اس مکان کے پیچھے سے اپنی حویلی کو جلتے دیکھ رہے تھے۔ ان جلتے شعلوں کے کم ہونے سے پہلے ہی ہندوستان میں فسادات کی آگ پھیل چکی تھی۔ میں تو عذابوں میں ایسا گھرا تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ سیاست کیا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ اس گرداب سے نکلا تو پتا چلا کہ پاکستان بن چکا ہے اور ہمارا وہاں رہنا دوبھر ہو چکا ہے۔ یوں بھی اب میرے لیے کیا رہ گیا تھا وہاں؟ چچا' چچی مراد آباد جا چکے تھے اور باقی سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ پیرزادہ خلیق الرحمٰن اور شرف الدین وغیرہ پاکستان آنے کو تیار تھے سو مجھے بھی رخت سفر باندھنا تھا' میں وہاں کس کے لیے رہتا؟ سنہرے بابا نے آنے سے انکار کر دیا تھا اور شاید وہ جانتے تھے کہ ان کا سفر طویل نہیں رہا۔ پتا نہیں کیسا دکھ تھا جس نے انھیں بہت جلد کھلا کر رکھ دیا تھا۔ ہم مشکل سے مہینا بھر وہاں رہے' وہ اسی عرصے میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔

انھوں نے ہمیں رخصت کیا اور رخصت کرتے ہوئے مجھے چند باتوں کی نصیحت کی تھی جس نے میری زندگی سدھار دی۔ انھوں نے کوثر والا ناگ یا جادوگر کا پیش بند یہ کہہ کر مجھے لوٹا دیا تھا کہ اب یہ ایک قیمتی نوادر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ رکھنا چاہو تو رکھ لینا اگر نہ رکھ سکو تو آثار قدیمہ والوں کے حوالے کر دینا۔ ہم خون کی ہولی سے بچتے بچاتے پاکستان پہنچ گئے۔ لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔ لاہور پہنچ کر میں نے وہ پیش بند آثار قدیمہ والوں کو دے دیا۔ اگر آپ بھی لاہور کے میوزیم میں جائیں تو اسے وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں لوگ مجھے شاہ جی کے نام سے جانتے ہیں۔ مجھ پر خدا کا کرم ہے۔ کچھ سنہرے بابا کی نصیحتیں ہیں کہ جنھوں نے میری زبان میں تاثیر پیدا کر دی ہے اور لوگ بڑی عقیدت سے ملتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں ان کے بہت سے کام صرف دعاؤں سے کروا دیتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ میری کوئی بھی حیثیت نہیں ہے' سارا کمال خدا کے کلام میں ہے جس نے مجھے اتنے عذابوں سے بچایا ہے۔

بندہ فضول باتوں کی بجائے دین سے انڈر اسٹینڈنگ پیدا کر لے تو وہ بہت طاقتور ہو سکتا ہے۔ یہ میرا آپ کو مشورہ بھی ہے اور نصیحت بھی۔ آپ اگر مضبوط بننا چاہتے ہیں تو خدا کے کلام کی تاثیر پر یقین رکھیں۔ اس کے سوا کوئی طاقت نہیں ہے۔ نہ کوئی سادھو' نہ کوئی جوگی نہ کوئی جادوگر۔ یہ سب ہماری نفسیات کی کمزوری ہے کہ ہم جس پر جتنا یقین کر لیں گے وہ ہم پر غالب آجائے گا پھر مسلمان ہونے کے ناتے ہم خدا پر اتنا یقین کیوں نہیں کرتے کہ بس وہ ہی وہ ہم پر غالب رہے۔

آج شگفتہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے اور سب سے بڑا سکھ۔ اس نے مجھے جس طرح سنبھالا ہے اسے بیان کرنا شاید بیکار ہی ہے۔ آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ اگر میں اب تک یہ سب بتانے کو موجود ہوں تو اس کا سبب کون ہے؟ جہانی آپا اور شنو آپا میرے ساتھ ہی پاکستان آگئی تھیں۔ دونوں نے بڑی اچھی زندگی گزاری۔ خوش رہیں اور مجھے سکون نصیب رہا کہ میں ان کی زندگیوں سے دکھ ختم کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ آج نہ جہانی آپا اس دنیا میں ہیں نہ میرا عزیز دوست شرف الدین' البتہ شنو آپا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں۔ پیرزادہ خلیق الرحمٰن بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میرے ہاتھ پیروں میں بھی اتنا دم نہیں ہے مگر شگفتہ آج بھی اتنی ہی پھرتیلی اور صحت مند ہے۔ اسی نے ہم سب کو سنبھالا ہوا ہے۔ وہی ہم سب کی تیمارداری میں لگی ہوئی ہے۔ آپ سے التماس کروں گا کہ اس کی صحت کے لیے دعا کرتے رہیے گا۔ آخر میں آپ سے اتنی طویل ملاقات کے بعد اجازت چاہتا ہوں۔ امید تو نہیں ہے کہ آئندہ کبھی ملاقات ہوگی پھر بھی اگر زندہ رہا تو کبھی ملاقات ضرور کروں گا۔

قارئین! وقار الحسن سید ان دنوں بہت بیمار ہیں۔ کہانی کا آخری حصہ ممکن ہے آپ کو بہت تشنہ لگے مگر اس کی واحد وجہ ان کی بیماری تھی۔ ان کی بیگم شگفتہ ان کی تیمارداری میں لگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو باتیں سید صاحب جانتے تھے وہ تو نہیں بتا پائیں گی اس لیے ہم نے ایسی حالت میں انھیں کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن وقار الحسن سید صاحب کو دیکھ کر دل میں شدت سے احساس جاگتا ہے کہ کاش ہمارے عقائد بھی اتنے ہی مضبوط ہو جائیں جتنے سید صاحب کے تھے۔ اتنی کٹھنائیوں سے گزرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہم نے ان کے دائیں ہاتھ میں فیروزے کی وہ انگوٹھی دیکھی جو سنہرے بابا کی نشانی تھی اور یقیناً "ان کی مددگار بھی رہی ہوگی۔" سنہرے بابا کے بارے میں شگفتہ بیگم سے پتا چلا کہ وہ بھی اب دنیا میں نہیں رہے تھے مگر مراد آباد میں سبز گنبد والی حویلی کے قریب ان کا حجرہ آج بھی ان کی خوشبو سے مہک رہا ہے اور آج بھی وہاں آس پاس ایک سفید رنگ کی' سنہری آنکھوں والی بلی گھومتی پھرتی ہے۔ آپ مراد آباد جائیں تو اسے ضرور تلاش کرنے کی کوشش کیجیے گا۔